عجائب خانہ
1
ایم اے راحت

تیسرا صفحہ

برِصغیر کی سرزمین مافوق الفطرت واقعات کی آماجگاہ ہے۔ پُراسرار علوم کی جتنی قسمیں اس خطہ ارضی پر مصروفِ عمل رہتی ہیں شاید ہی دنیا کے کسی اور حصے میں ہوں، جن کی وجہ سے خیر و شر کا بازار گرم رہتا ہے، اور نئی نئی کہانیاں معرضِ وجود میں آتی رہتی ہیں۔ اسی کو ہم نیکی اور بدی کا تصادم بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اہلِ خیر حق اور سچ کی بالادستی کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اور اہلِ شر ظلم، خودغرضی اور فساد کے لئے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔

انسانوں کو بہکانے کے لئے شیطان نے قدم قدم پر اپنا جال بچھا رکھا ہے۔ زیرِ نظر داستان بھی ایسے ہی مافوق الفطرت اور پُراسرار واقعات پر مشتمل ایک ایسی داستان ہے جس کا ایک ایک واقعہ پڑھتے ہوئے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ کہانی ان پانچ معصوم، حسن بے مثال کی حامل شریف گھرانے کی لڑکیوں کی ہے جنہیں ابلیس اپنی پُرفریب چال میں پھنسا کر سیدھے راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔ اور پھر انہیں پُراسرار قوتوں سے مالا مال کر کے شیطانیت کے فروغ کے لئے معاشرے پر مسلط کر دیتا ہے جہاں وہ تباہی و بربادی کے ایسے ایسے باب رقم کرتی ہیں کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ اور ان حالات میں ان کا حسن و جمال نہ صرف ان کا شریکِ سفر، بلکہ بہترین معاون بن جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک کہانی سے کئی کہانیاں جنم لیتی چلی جاتی ہیں۔ اور بالآخر شیطان کی ان شاگردوں کا ٹکراؤ اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ بندے سے ہو جاتا ہے۔ جس کے پاس ایک عظیم روحانی قوت کی مالک ''پُراسرار عورت'' کا آنا جانا تھا۔ جس کا تعین ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی رُوح تھی یا زندہ حقیقت۔ اور یہ کہانی کا وہ موڑ ہے جہاں دلچسپیاں اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔

اور پھر شیطان کے چیلوں اور بندگانِ خدا کے درمیان ایک انوکھی جنگ شروع ہو جاتی ہے اور چشمِ تصور کو وہ یادگار معرکے دیکھنے کو ملتے ہیں جن سے کہانی کے اختتام تک آنکھ ہٹائے نہیں ہٹتی۔

آیئے معزز قارئین، ہم بھی مصنف کے ساتھ ساتھ کہانی در کہانی کے اس جہانِ پُراسرار اور دکھائی نہ دینے والی دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

محمد علی قریشی

اس خوفناک داستان کا آغاز روہیل کھنڈ کی ریاست رام نگر سے ہوا اور پھر ہندوستان کے بے شمار علاقے اس ہولناک وبا کی لپیٹ میں آ گئے۔ ہوا یوں کہ رام نگر کے راوت رائے نے ایک بار سیر کرتے ہوئے سرسبز و شاداب باغ کو دیکھا جو انار، سیب اور سنگتروں کے درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ راوت رائے خود بہت بڑا زمیندار تھا، میلوں لمبی زمینوں پر زراعت ہوتی تھی اور بہت سے باغ مختلف پھلوں کے تھے۔ لیکن اُس کے کسی بھی باغ کا یہ حسن نہیں تھا۔ یہاں تو یوں لگتا تھا جیسے پھل اُبل پڑے ہوں۔

"لاکھن سنگھ، یہ باغ کس کا ہے رے؟"

"رسک لعل چورسیہ کا مہاراج، دیکھ رہے ہیں آپ اسے؟" لاکھن سنگھ نے رشک بھری نظروں سے لہلہاتے پھلوں کو دیکھ کر کہا۔

"غضب کی فصل ہے۔ ایسا کیسے ہو گیا؟"

"رسک لعل خود اس میں کام کرتا ہے۔"

"ہوں...... ایک ہی باغ ہے اُس کا؟"

"جی مہاراج۔"

"فصل کس کو دیتا ہے؟"

"بڑی منڈی کے آڑھتی رقم لئے لئے پھرتے ہیں مہاراج، سالوں پہلے کا بیعانہ دینے کو تیار رہتے ہیں، بڑے نخروں سے اپنی فصل بیچتا ہے رسک لعل۔"

"پھل بتا رہے ہیں کہ نخروں سے بکتے ہوں گے۔" راوت رائے کی آواز میں حسد تھا۔

"جو آڑھتی فصل خرید لیتا ہے، مالا مال ہو جاتا ہے مہاراج، کیونکہ پھر یہ پھل ریاستوں اور جاگیروں میں جاتے ہیں اور سونے کے بھاؤ بکتے ہیں۔"

"ضرور بکتے ہوں گے۔ کیونکہ یہ پھل ہیں بھی سونے کے بنے ہوئے۔ لیکن ایک بات بتاؤ، کیا یہ باغ ہمارا نہیں ہو سکتا؟"

"کہہ نہیں سکتا مہاراج، ویسے جہاں تک مجھے رسک لعل کے بارے میں معلومات حاصل ہیں، اُس کا یہ ایک ہی باغ ہے۔ وہ اس پر بڑی محنت کرتا ہے۔"

"تم ایسا کرو، رسک لعل کو ہماری طرف سے پیغام دے دو ہم اُس سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ باغ دیکھ کر تو ہمارے منہ میں پانی بھر آیا ہے۔ ایسا اچھا باغ کسی اور کے قبضے میں ہو تو ہم پر لعنت ہے۔ ہمارے اتنے سارے باغ ہیں، اتنے سارے نوکر ہیں، مگر ایسی فصل کوئی بھی نہیں پیدا کر پایا۔ اسے دیکھ کر تو ہم جل کر

راکھ ہو گئے ہیں۔ بلالو اُسے۔ اور بھی بہت سی باتیں کرنی ہیں مجھے اُس سے۔ نام بھی نہیں سنا ہم نے تو کبھی اُس کا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس طرف آئے بھی نہیں۔ یا آئے ہوں گے تو بغیر نظر ڈالے ہی گزر گئے ہوں گے۔ چلو، خیر ہر کام سمے پر ہی ہوتا ہے۔ رسک لعل بیچارے کو اس محنت سے نجات دلاؤ۔ بلاؤ اُسے۔ اور اکیلے میں بلاؤ۔ شام کو تو سب لوگ آجاتے ہیں۔ تم ایسا کرو کل دوپہر کو اُسے بلالو۔"

"جی مہاراج۔"

رسک لعل بیچارہ شریف آدمی تھا۔ وقت کا مارا ہوا۔ وقت نے اُس کے کندھے جھکا دیئے تھے۔ پانچ بیٹیوں کا باپ تھا۔ بیٹے کی آس میں بیٹیاں پیدا کرتا چلا گیا۔ خود تو ہمت والا تھا کہ بیٹیاں برداشت کرتا رہا اور بیوی سے یہی کہتا رہا کہ بھگوان کی دین ہے، چنتا کیوں کرتی ہو؟ اُس نے بیٹیاں دی ہیں تو ان کی تقدیر بھی اچھی ہی بنائی ہوگی۔ بس مجھے ذرا زیادہ محنت کرنی ہوگی۔ ایک ہی باغ چھوڑا ہے پتاجی نے۔ اسی میں ان بچیوں کی تقدیر کے درخت اُگاؤں گا۔ اور تو دیکھ لینا بھاگوان، ان ساری بچیوں کو آرام سے رُخصت کروں گا۔ لیکن اُس کی بیوی اس آخری بیٹی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکی۔ رُوپا، رما، راگنی، رادھا اور اس کے بعد رجنی۔ لیکن رجنی کے بعد رسک لعل کی دھرم پتنی اس سنسار سے سدھار گئی اور بیچارے رسک لعل کے کاندھوں پر پانچ بیٹیوں کا بوجھ چھوڑ گئی۔ البتہ بیٹیاں بڑی سمجھدار تھیں۔ سال سال بھر کا فرق تھا پانچوں میں۔ لیکن روپا، رجنی کی ماں بن گئی۔ ویسے بھی بہنوں کو سنبھالتی تھی۔ رما بھی اُس جیسی ہی سمجھدار تھی۔ دونوں بڑی بہنوں نے مل کر باقی تین بہنوں کو سنبھال لیا اور ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

رسک لعل جو پہلے بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا، بیٹیوں کی یہ کارکردگی دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور اُس نے سوچا کہ چلو بھگوان نے ماتا سمان بہنیں دے دیں، صرف اس لئے کہ وہ اپنا کام بخوبی سرانجام دیتا رہے۔ اُس نے اپنے بڑھاپے کو بھلا دیا، بیوی کی جدائی کو بھلا دیا۔ بس یہ باغ تھا جس کا ایک ایک درخت اُس نے اپنی بیٹیوں کے نام کر دیا تھا اور اُنہی کے نام سے ان پر محنت کیا کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ درختوں نے بھی جیسے رسک لعل سے تعاون کا فیصلہ کر لیا تھا اور اُس کی بیٹیوں کی تقدیر بنانے میں اُس کا ساتھ دینے لگے۔ چنانچہ مثالی پھل اُگائے گئے۔ رسک لعل کی بڑی ساکھ بن گئی، آڑھتی پیسے لئے پھرتے تھے کہ فصل بیچ دو لیکن رسک لعل جانتا تھا کہ فصل تیار ہوگی تو منہ مانگے دام ملیں گے۔ اور ایسا ہی ہو رہا تھا۔ بیٹیوں کے جہیز کے لئے اُس نے اچھا خاصا کام کر لیا تھا، سادھو باغ پر ہی رہتا تھا۔ رسک لعل سورج چھپے بچیوں کے پاس واپس آجاتا تھا اور اس کے بعد کوشش کرتے تھے کہ باپ بیٹیاں خوش رہیں۔ رسک لعل اس کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ زندگی کا ایک طویل وقت اُس نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ گزار لیا تھا۔ اور اب تو رجنی بھی سترہ سال کی ہو چکی تھی۔ بچیاں ساری کی ساری بڑی ہو گئی تھیں۔ ایک سے ایک سندر صورت کی مالک تھیں۔ لیکن رسک لعل نے اپنے اُوپر بڑھاپا نہیں طاری ہونے دیا تھا۔ اب اُس کی یہی آرزو تھی کہ جلدی جلدی بچیوں کے رشتے آجائیں اور وہ اُن کے ہاتھ پیلے کر دے۔

اس شام بھی باپ اور بیٹیاں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ باہر کسی کے آنے کی خبر ملی۔ رسک لعل نے کہا، دیکھوں ذرا کون آیا ہے؟ یہ کہہ کر وہ باہر دروازے پر آ گیا۔ دروازے پر لاگھن سنگھ دو آدمیوں کے

ساتھ کھڑا تھا، رسک لعل کو یہ بات معلوم تھی کہ لاگھن سنگھ بہت بڑے زمیندار راوت رائے کا ملازم ہے۔ راوت رائے تو خیر اتنا بڑا آدمی تھا کہ رسک لعل جیسے لوگ اُس کے چرنوں کی دُھول بھی نہیں تھے۔ اس لئے وہ بہت کم لوگوں کو جانتا تھا لیکن اُسے بہت سے لوگ جانتے تھے۔ لاگھن کو بھی رسک لعل اُس کے منہ چڑھے ملازم کی حیثیت سے جانتا تھا۔ لاگھن سنگھ نے کہا۔ "کیسے ہو رسک لعل، تم سے کام تھا۔"

"آیئے مہاراج، میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ تو بڑے مہاراج کے ساتھی ہیں۔ بڑا نام ہے ہمارے بڑے مہاراج کا۔"

"تمہارے منہ سے محبت بھرے یہ الفاظ سن کر بڑی خوشی ہوئی رسک لعل، اس وقت تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ٹھہروں گا۔ ایک سندیسہ بھیجا ہے مہاراج نے۔"

"حکم دیجئے مہاراج۔" رسک لعل ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"کل دوپہر کو سورج ڈھلنے سے پہلے تم مہارراج سے اُن کی حویلی پر مل لو۔ تم سے بڑا ضروری کام ہے۔"

"ہم سر کے بل آئیں گے مہاراج، ٹائم بتا دیجئے۔"

"دو بجے آجانا۔ بڑے مہاراج تمہارا انتظار کریں گے۔"

"ہمارا پرنام کہہ دیجئے اُنہیں۔ ہم ٹھیک دو بجے پہنچ جائیں گے۔" رسک لعل نے کہا، پھر بولا۔ "مہاراج، ہمارا منہ تو نہیں ہے اتنا بڑا کہ آپ سے کوئی بات کہیں۔ پر آپ آئیں، میں تھوڑا جل پانی......"

"کوئی بات نہیں رسک لعل، پھر آئیں گے۔ پھر سہی۔ تمہاری ہماری دوستی ہو گئی، جل پانی تو چلتا ہی رہے گا۔ اچھا اب چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر لاگھن سنگھ واپسی کے لئے مڑ گیا۔ رسک لعل اس وقت تک کھڑا لاگن سنگھ کو دیکھتا رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

اُس نے دروازہ بند کیا اور شانے ہلا کر بولا، پتہ نہیں راجہ بھوج کو گنگو تیلی سے کیا کام پڑ گیا۔ چلو ٹھیک ہے، ملنے جلنے میں کیا حرج ہے۔ مہاراج نے بلایا ہے تو ہمارا کام ہے کہ ہم جائیں۔ یہی بات اُس نے اپنی بیٹیوں کو بتائی تھی کہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جو قابل توجہ ہوتی۔ چنانچہ دوسری باتیں ہونے لگیں۔

اور پھر دوسرے دن دوپہر کو کام کرتے کرتے رسک لعل کو خیال آیا کہ آج بڑے مہاراج کے پاس جانا ہے۔ باغ میں مصروف تھا، سادھو سے کہا۔ "سادھو، کل بڑے مہاراج، جانتے ہو نا اُنہیں؟"

"سارے ہی بڑے ہیں مہاراج، کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"راوت رائے کی۔"

"جاگیردار راوت رائے کو تو میں جانتا ہوں۔"

"اُن کا آدمی آیا تھا مجھے بلانے کے لئے۔ میں ذرا وہاں جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے مہاراج، ادھر ہی واپس آئیں گے؟"

"ہاں ہاں، بہت زیادہ دیر کر دیتے ہیں یہ لوگ۔ یہ تو بہت بڑے لوگ ہوتے ہیں نا۔ آتا ہوں ابھی تھوڑی دیر میں۔" رسک لعل نے اپنے آپ کو سنوارا اور اس کے بعد چل پڑا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ لاگھن سنگھ وہاں موجود تھا۔ رسک لعل کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''بات یہ ہے رسک لعل، اصل میں کل ہم تمہارے باغ کی طرف سے گزرے تھے۔ تمہارے باغ کے پھل دیکھے، بڑے مہاراج نے بڑی تعریفیں کیں۔ کوئی بھی کام ایسے نہیں ہو جاتا۔ تمہیں دو بجے بلایا تھا اور اس وقت دو بجنے میں تیس سیکنڈ باقی ہیں، اتنا ذمے دار آدمی ہی ایسے پھل اُگا سکتا ہے۔''

رسک لعل نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگا دیئے تھے، اس کے بعد وہ راوت رائے کے سامنے پہنچ گیا۔ لاگھن سنگھ نے یہاں بھی رسک لعل کے ذمہ دار ہونے کی بات کی اور راوت رائے نے رسک لعل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ تم جیسا آدمی ہی اتنا خوبصورت باغ لگا سکتا ہے۔ لاگھن نے بتایا ہوگا کہ کل جب ہم تمہارے باغ کی طرف سے گزرے تو ہماری آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں۔ کتنا سندر باغ لگایا ہے تم نے۔ اور کیسے پھل کھلائے ہیں اس پر۔ ہم تو دیکھ کر حیران رہ گئے۔''

''بس دیا ہے مہاراج کی۔ دیا ہے بھگوان کی۔ پانچ بیٹیوں کا باپ ہوں۔ بھگوان نے جب پانچ بیٹیوں کا بوجھ کندھے پر دیا تو اسے ٹھکانے لگانے کا بندوبست اس باغ کی شکل میں کر دیا۔ غریب سا آدمی ہوں جناب، بس یوں سمجھ لیجئے کہ اپنی غربت کو چھپائے ہوئے محنت کر رہا ہوں اور بھگوان مجھے اس کا صلہ دیتا ہے۔''

''کیوں نہیں رسک لعل، کتنا کما لیتے ہو سال بھر میں؟''

''بس جو بھگوان دے دیتا ہے مہاراج۔''

''رسک لعل، میں اصل میں کھلی بات کرنے کا عادی ہوں۔ تمہارا باغ میں نے دیکھا، مجھے بہت اچھا لگا۔ اور بچپن سے میری عادت ہے کہ جو چیز مجھے پسند آتی ہے میں اسے اپنے پاس رکھتا ہوں، کسی اور کے پاس نہیں رہنے دیتا۔ تمہارا باغ بہت ہی اچھا ہے۔ اصل میں میرا باپ بھی بہت بڑا زمیندار تھا اور میں اُس کا اکلوتا بیٹا۔ ہر خواہش پوری کی اُس نے میری۔ اب اس کے بعد پتا جی اس سنسار میں نہیں رہے، لیکن خواہشیں زندہ ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے، خود ہی کرتا ہوں۔''

رسک لعل کا دل دھک سے رہ گیا۔ ان الفاظ کا مطلب اُس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اُس کے اندر ہول اُٹھنے لگے۔ لیکن پھر بھی وہ خاموشی سے بڑے مہاراج کی صورت دیکھتا رہا۔ راوت رائے نے کہا۔ ''رسک لعل، پانچ بیٹیاں ہیں تمہاری۔ ایک اچھی شادی کے لئے ایک بیٹی کے لئے دو لاکھ کافی ہوتے ہیں۔ دس، بیس، پچاس ہزار جہیز دے دو، اچھے سے اچھا لڑکا مل جائے گا۔ اور باقی پیسے ویسے خرچ کر دو تو پانچ بیٹیوں کا خرچہ بنتا ہے دس لاکھ۔ دو لاکھ تمہارے جیون کے لئے کافی ہوگا۔ کیونکہ بیٹیوں کے جانے کے بعد تمہیں اپنا جیون بِتانے کے لئے بھی کچھ چاہئے ہوگا، بارہ لاکھ ہو گئے۔ اس باغ کی قیمت میں تمہیں بارہ لاکھ دے سکتا ہوں، یہ باغ مجھے دے دو۔''

رسک لعل کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا، امن پسند اور شریف آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں کیا ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنا مان، اپنا ضمیر، اپنا دل، اپنا وجود بیچا تو نہیں جاتا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ''مہاراج، بھگوان نے آپ کو بہت سے باغ باغیچے دیئے ہیں۔ غریب کی تو یہی پونجی ہے۔ جس طرح آپ کے پتا

جی آپ کے لئے سب کچھ چھوڑ گئے ہیں اسی طرح میرے پتا جی بھی زمین کا یہ ٹکڑا میرے حوالے کر گئے ہیں۔ اور جب وہ اس سنسار سے گئے تھے تو اس ٹکڑے پر چھوٹے چھوٹے پودے لگا گئے تھے۔ بھگوان کی دیا سے آج یہ پودے اتنے بڑے ہو گئے ہیں اور میرا اور ان کا ایک رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ سمجھ لیجئے وہ میرے ماتا پتا ہیں، یا میں ان کا پتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے واقف ہیں مہاراج، کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''مہاراج، ماتا پتا بیچے تو نہیں جاتے۔ آپ خود سمجھدار ہیں۔''

''بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ لکڑی اور سبز پتے نہ ماتا ہوتے ہیں اور نہ پتا۔ بلاوجہ ان سے بے تکے رشتے قائم کر لئے جاتے ہیں۔ اگر وہ تمہارے ماتا پتا ہو سکتے ہیں تو ذرا میرے باغوں کو دیکھو، میرے تو ہزاروں ماتا پتا ہیں۔ مگر میں ان فضول باتوں کو نہیں مانتا۔ بارہ لاکھ روپے میں نے تمہیں پیشکش کی ہے۔ تین لاکھ اور بڑھا دیئے ہیں۔ چلو پندرہ لاکھ ہو گئے۔ اپنے گھربار میں آرام سے رہو، بیٹیوں کا بیاہ کرو اور باقی جیون سکون سے گزارو۔ ویسے بھی اب تمہاری عمر اتنی محنت کرنے کی نہیں ہے۔ ہاں، میں تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ اگر تم اپنی محنت کرنا ہی چاہتے ہو تو پھر زمین کے ایک ٹکڑے پر ہی کیوں کرتے ہو۔ میرے باغ ہیں، مجھے مشورے دو، اسکا میں معاوضہ دُوں گا۔''

''نہیں مہاراج، ہم یہ ساری باتیں نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اپنا باغ آپ کو دے سکتے ہیں۔ اور کوئی بات کریں، ہم آپ کے داس ہیں۔''

''ہوں...... مان لو میری بات رسک لعل، مان لو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ بچیاں بھی آرام سے ٹھکانے لگ جائیں گی۔ ایسا کروں گا میں خود تمہاری بچیوں کے لئے رشتے تلاش کروں گا۔''

''مہاراج، جو کام بھگوان نے جس کے سپرد کیا ہے، اسے ہی کرنا چاہئے۔ ہمیں اجازت دیجئے۔''

''سنو...... بات سنو، ایسے نہیں رسک لعل، ایسے نہیں۔ تم پھر سوچ لو۔ غور کر لو۔ تین دن دیتا ہوں میں تمہیں۔ تین دن کے بعد میں تم سے بات کروں گا۔''

''ٹھیک ہے مہاراج، جیسا آپ چاہیں۔ لیکن تین یا تیس دن کے بعد بھی میرا جواب یہی ہوگا۔ جے رام جی کی۔'' یہ کہہ کر رسک لعل بغیر کسی اجازت کے اُٹھا اور باہر نکل آیا۔ بہت بری لگی تھی اُسے راوت رائے کی یہ بات۔ راوت رائے نے اُسے دوبارہ آواز نہیں دی تھی۔ لاگھن سنگھ کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ اُس نے غصیلی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پکڑ کر لاؤں مہاراج اُس کو؟''

''نہیں۔ کسی بھی انسان کی آواز سے، اُس کے انداز سے اُس کی طبیعت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے لاگھن سنگھ، اب کیا، کیا جائے۔ تم خود دیکھو، انسان برا نہیں ہوتا، لوگ اُسے برا بنا دیتے ہیں۔ میں نے اُسے سوچنے کا موقع دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ نہیں سوچے گا اور سوچے گا تو یہی سوچے گا کہ مجھے انکار کر دے۔ چنانچہ کوئی ایسی بات نہیں۔ اس کے لئے دوسرا بندوبست کر لیتے ہیں۔''

”جی مہاراج۔“ لاگھن سنگھ نے جواب دیا۔

رسک لعل بہت پریشان تھا۔ روپا نے اُس سے کہا۔ ”پتا جی مہاراج، ضرور کوئی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے آپ پریشان ہیں۔ ہم بچے نہیں ہیں کہ آپ ہمیں بہلا دیں۔ بتایئے کیا بات ہے؟“

”بس، وہ راوت رائے کا نام سنا ہے تم نے؟“

”نہیں۔ کون ہے وہ؟“

”بہت بڑا زمیندار ہے۔ اور برا آدمی ہے۔ اچھا آدمی وہ ہوتا ہے جو بھگوان کے دیئے ہوئے دھن کو اپنی اچھی تقدیر سمجھ کر دوسروں کا بھی خیال رکھے۔ اور برا وہ ہوتا ہے جو دوسروں کے منہ کا نوالہ بھی چھین لے۔“ رسک لعل نے ساری بات روپا کو بتائی تو روپا نے کہا۔

”پتا جی مہاراج، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بات کروں راوت رائے سے؟“

”ارے پاگل، بھلا میں تجھے اس کی اجازت دُوں گا؟“

”دیکھئے، میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کو مجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ ایک بار آپ مجھے اُس سے مل لینے دیجئے۔ میں اُسے قائل کرلوں گی۔“ اور روپا نے کچھ اس طرح باپ کو قائل کیا کہ وہ اس بات پر آمادہ ہوگیا۔

اسی رات سورج چھپے روپا، رسک لعل کے ساتھ راوت رائے کی حویلی پہنچ گئی۔ راوت رائے کو جب معلوم ہوا کہ رسک لعل آیا ہے تو اُس نے حیرت سے لاگھن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لاگھن سنگھ، ایسا لگتا ہے کہ رسک لعل کے گھر میں کوئی سمجھدار ہستی موجود ہے۔ تین دن کے بجائے اگر وہ آج ہی ہمیں جواب دینے آیا ہے تو یہ تو اچھی بات ہے۔ بلاؤ اُسے بلاؤ۔“

پھر لاگھن سنگھ کے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کو دیکھ کر راوت رائے نے محبت بھرے انداز میں گردن ہلائی، پھر بولا۔ ”آؤ رسک لعل، یہ شاید تمہاری بیٹی معلوم ہوتی ہے۔“

”جی مہاراج۔ آپ ہی کی بیٹی ہے۔“

”ہاں کیوں نہیں؟ پتا سمان ہیں ہم اس کے۔ کتنی بیٹیاں ہیں تمہاری، پانچ ناں؟“

”جی مہاراج۔“

”آؤ بیٹھو۔“ راوت رائے نے روپا سے کہا اور روپا اُس کے پاؤں چھو کر بیٹھ گئی، پھر بولی۔

”مہاراج، میں آپ کے پاس ایک کام سے آئی ہوں۔“

”ہم نے رسک لعل کو سمجھایا تھا بیٹا، ہم نے کہا تھا اس سے کہ تمہاری بیٹیاں ہماری بیٹیاں ہیں، ان کے بھوش کی چنتا نہ کرو۔ ہم بھی ان کے لئے پتا سمان ہیں۔ پندرہ لاکھ روپے کی پیشکش کی تھی ہم نے۔ معمولی رقم نہیں ہوتی بیٹا، خیر چھوڑ، بات سمجھ میں آگئی تمہارے پتا جی کی؟“

”نہیں مہاراج، ہم اپنا باغ نہیں بیچیں گے۔ میں آپ سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ انسان کا دھرتی سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ دھرتی ماں اور اس پر اُگے ہوئے درخت ہمارے لئے بہن بھائیوں کی طرح ہیں۔ کوئی اپنا پریوار نہیں بیچتا، آپ ہم پر کرپا کریں۔ ایسا کوئی خیال اگر من میں ہے تو دل سے نکال دیں۔

میرے پتا جی لاوارث اور بے سہارا ہیں۔ انہیں وہاں رہنے دیں۔ ان درختوں کی سیوا کرنے دیں۔ ہمارے بھاگ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہمیں مل جائے گا، آپ انہیں کسی فکر میں نہ ڈالیں۔ آپ نے میرے سر پر بیٹی سمجھ کر ہاتھ رکھا ہے تو آپ کی بیٹی آپ سے دیا کی بھیک مانگتی ہے، ابھی انکار کردیں اس بات سے کہ آپ ہمارا باغ ہم سے نہیں لیں گے۔“

راوت رائے کے اندر کا شیطان اُبھر کر سامنے آیا۔ اُس کے چہرے پر مکاری پھیل گئی اور اُس نے کہا۔

”واہ رسک لعل واہ، بچی کو کیوں لے آئے؟ ہم نے تو تمہیں تین دن تک سوچنے کا موقع دیا تھا۔ بھئی تمہاری مرضی ہے، ہم تو رقم دے کر چیز خرید رہے تھے۔ کیا فائدہ؟ چلو بیٹا ٹھیک ہے۔ اگر تم نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔ اب کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ کیا سمجھیں؟“

”جے ہو راوت رائے مہاراج کی۔ میں نے کہا تھا پتا جی سے، جن لوگوں کے مان بڑے ہوتے ہیں، اُن کا من بھی بڑا ہوتا ہے۔ آپ نے میری بات مان لی، میں آپ کا بڑا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“

”بالکل ٹھیک ہے بیٹا، بالکل ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں ہے۔ ایسا کرو رسک لعل، کل شام کو بھوجن تم ہمارے ساتھ ہی کرو۔ کیا سمجھے؟“

”مہاراج، آپ ہی کا دیا کھاتے ہیں۔“

”ارے نہیں نہیں۔ بیکار باتیں مت کیا کرو۔ سمجھے؟ اب بٹیا کو لائے ہو، اس وقت تو ٹھیک سے خاطر مدارت بھی نہیں کرسکتے ہم تیری۔ کل شام کو تم اپنی پانچوں بیٹیوں کے ساتھ ہمارے ہاں آجانا۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے۔“

”جی مہاراج، جو آگیا۔“ رسک لعل نے کہا اور پھر خوشی خوشی اپنی بیٹی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ روپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پتا جی، آپ تو ہمیں بالکل ہی بیکار سمجھ رہے تھے۔ اصل میں بات کرنے کا بھی ایک فن ہوتا ہے۔ مان گیا نا راوت رائے۔“

”ہاں۔ بھگوان اُس کا بھلا کرے۔“ رسک لعل نے کہا۔

لیکن جب وہ چلا آیا تو لاگھن سنگھ نے حیران کن لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا ہوگیا مہاراج کو؟ آپ تو پانی کی طرح پگھل گئے اُس لڑکی کو دیکھ کر۔“

”نہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات مت کہنا۔ وہ لڑکی ذات ہے، کیا سمجھے؟ کسی کو بری نگاہ سے نہیں دیکھتے، بیٹی کسی کی بھی ہو۔ ہاں، ہم نے یہ محسوس کرلیا۔ اور پہلے بھی محسوس کرلیا تھا کہ رسک لعل ہماری بات نہیں مانے گا۔ مجبوری ہے۔ بالکل مجبوری ہے۔ کیا سمجھے؟“

”جی مہاراج، لیکن ......“

”بس کل آرہے ہیں وہ۔ سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ پہلا ہی وار ایسا کرو جو بھرپور ہو۔ تاکہ بعد میں کسی طرح کی مشکل پیش نہ آئے۔ اب یہ مجبوری تھی جو ہم نے اُس کے ساتھ کیا۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے ......اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

"مگر مہاراج، کل آپ کیا کریں گے؟"

"جو کروں گا، بتاؤں گا۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

بہر حال دوسرے دن جب رسک لعل ایک معزز مہمان کی حیثیت سے اپنی بیٹیوں کے ساتھ حویلی میں داخل ہوا تو خود اُسے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ راوت رائے دل کا اتنا اچھا آدمی ہے۔ روپا کی بات کو بھی وہ مانتا تھا۔ بڑے مان والے بڑے من کے مالک ہوتے ہیں۔ راوت رائے نے روپا کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھ کر اُس کی بات مان لی تھی۔ حویلی میں بھی اُس نے ان لوگوں کا بڑا اچھا سواگت کیا اور اُنہیں لے کر ایک بڑے کمرے میں پہنچ گیا۔ اُس نے ان لوگوں نے لئے بہترین کھانے کا انتظام کیا تھا۔ خود بھی وہ اُن کے ساتھ کھانے میں شریک رہا تھا۔ البتہ اُس نے اُنہیں اپنے اہل خاندان سے نہیں ملایا تھا، بلکہ حویلی کے اس گوشے میں ان لوگوں کی دعوت کا انتظام کیا تھا جہاں مہمان خانہ تھا۔ اور جہاں عام طور سے راوت رائے کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ مہمان آتے تھے اور وہیں پر اُن کی خاطر مدارت بھی ہوتی تھی۔ ناچ گانے، رنگ، شباب، کباب سب کچھ وہیں ہوتا تھا۔ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ اس بات کو رسک لعل نے بھی خاص طور سے محسوس کیا کہ اُس کی اپنی تو پانچوں بیٹیاں راوت رائے کے گھر آ گئی تھیں۔ لیکن راوت رائے کے گھر کی ایک بھی عورت وہاں شریک نہیں تھی۔ بہر حال یہ بات کہنے کی نہیں تھی۔

کھانے وغیرہ سے فراغت ہوئی تو راوت رائے نے کہا۔ "ہاں بھئی، بہت مہربانی ہے تمہاری کہ تم یہاں آئے۔ آؤ، میں تمہیں اپنی حویلی کا یہ حصہ اچھی طرح دکھاؤں۔ آؤ بیٹیو، تم بھی اُٹھو۔" راوت رائے نے کہا اور سب ہنسی خوشی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ راوت رائے اُنہیں مہمان خانے کے مختلف گوشے دکھاتا جا رہا تھا۔ اور لڑکیاں اور رسک لعل اس سے بہت متاثر ہوئے۔ پھر راوت رائے اُنہیں ایک تہہ خانے میں لے گیا۔ حویلی کا یہ حصہ بالکل الگ تھلگ تھا اور عام لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ بس راوت رائے کے اپنے کام دھندے تھے۔ اس تہہ خانے میں کیا ہوتا تھا؟ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد رسک لعل کو نجانے کیوں گھبراہٹ کا سا احساس ہوا۔ بڑی وسیع و عریض جگہ تھی، لیکن ہر طرف سے بند۔ صرف یہی ایک راستہ تھا جو نیچے کو آتا تھا۔ ویسے بھی سارے کا سارا تہہ خانہ خالی تھا۔ فرنیچر نام کی کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ ایک عجیب سا ماحول تھا وہاں کا۔ رسک لعل بالکل نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس تہہ خانے کو دکھانا کیا معنی رکھتا ہے۔

جیسے ہی وہ اس ہال نما جگہ کے بیچ و بیچ پہنچے، تہہ خانے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس کی اچھی خاصی آواز سنائی دی تھی۔ تہہ خانے میں مدھم سی پیلی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ رسک لعل کہنے لگا۔ "یہ تو بڑی عجیب جگہ ہے مہاراج، یہاں کیا ہوتا ہے؟"

"اصل میں رسک لعل، یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم اپنے خاص دوستوں کو لاتے ہیں۔ ان دوستوں کو جو شرافت سے ہماری بات نہیں مانتے۔ ہم نے تم سے کہا تھا نا رسک لعل، کہ باغ ہمیں دے دو، پندرہ لاکھ روپے دے رہے تھے اس کے۔ اور تمہیں تمہاری بیٹیوں کا مستقبل بھی دے رہے تھے، نہیں مانے تم۔ اب

بتاؤ، کیا کرتے اگر تمہیں یہاں نہ لاتے تو؟"

"میں سمجھا نہیں مہاراج؟"

"سمجھاتے ہیں ہم تمہیں۔ دیکھو، یہ کاغذ ہے، اس کے تحت تم پندرہ لاکھ روپے میں ہمیں یہ باغ بیچ رہے ہو، سارے کام تیار ہو گئے ہیں، بس تمہارے دستخط اور انگوٹھے کی ضرورت ہے۔ یہ کام تم کر دو۔ کوئی مشکل کام نہیں ہے، آسانی سے ہو جائے گا۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا رسک لعل، تو پھر سمجھ لو کہ تمہاری یہ پانچوں بیٹیاں یہیں ختم کر دی جائیں گی۔ اور ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، دیکھنا چاہتے ہو؟"

"مہاراج، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہوتا ہے، بہت زیادہ چالاکی کا نقصان ایسا ہی ہوتا ہے۔ رقم لیتے ہم سے، دستخط کرتے، باغ ہمارے حوالے کر دیتے۔ تم نہیں مانے۔ ضد کا انجام برا ہوتا ہے۔ چلو دستخط کر دو، ورنہ......" اچانک ہی دروازہ ایک بار پھر کھلا اور چار آدمی نیچے اُتر آئے۔ خوب لمبے تڑنگے آدمی تھے اور راوت رائے کے خاص ملازم تھے۔ راوت رائے نے کہا۔ "وہ الفاظ میں اپنی زبان سے نہیں ادا کرنا چاہتا رسک لعل، تم ایک سمجھدار آدمی ہو۔ خود سمجھو، عزت و آبرو بڑی چیز ہوتی ہے۔ میں خود بھی عزت دار آدمی ہوں۔ لیکن یہ چاروں کمینے ہیں، تمہاری بیٹیوں کے ساتھ اگر یہ کوئی بدسلوکی کریں تو اس میں مجھے الزام نہ دینا۔ اس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج؟"

"ہاں...... ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ روکوں انہیں، میں چلا جاؤں یا پھر انہیں واپس بھیج دوں؟ بولو۔" رسک لعل نے خاموشی سے ہاتھ آگے بڑھایا اور ان کاغذات پر دستخط کر دیئے جو راوت رائے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

راوت رائے نے دستخطوں کو غور سے دیکھا۔ انگوٹھا بھی لگایا گیا تھا اور اس کے بعد اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "منش خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ اب اگر زمین کے اُوپر تم یہ دستخط کر دیتے تو اس کے بدلے میں، میں پندرہ لاکھ تمہیں دیتا۔ میں جانتا ہوں دستخط تو تم نے کر دیئے ہیں۔ یہاں سے باہر جاؤ گے تو سیدھے تھانہ کچہری پہنچو گے، وہاں دہائی دو گے، فریاد کرو گے کہ نہ تو تمہیں کوئی رقم ملی ہے نہ ہی تم خوشی سے اس کام کے لئے تیار تھے۔ تمہارے اوپر ظلم کیا گیا ہے، زیادتی کی گئی ہے۔ نہ میں تھانے سے ڈرتا ہوں نہ کچہری سے۔ انتظامات ہیں میرے، مگر شور شرابہ بھی نہیں چاہتا۔ یہ بھی نہیں چاہتا کہ بلاوجہ لوگ ہنگامہ کرتے پھریں۔ سمجھتے ہو نا میری بات کو؟ تو مطلب میرے کہنے کا یہ ہے کہ اب میری مجبوری ہے رسک لعل، بھگوان نے اتنا ہی جیون لکھا تھا تمہارا۔"

"میں سمجھ نہیں رہا مہاراج؟"

"چلو، انہیں سمجھاؤ۔" راوت رائے نے اُن چار افراد سے کہا اور دوسرے لمحے وہ رسک لعل پر ٹوٹ پڑے۔ اُنہوں نے رسک لعل کو نیچے زمین پر گرا لیا۔ لڑکیاں بری طرح چیخنے لگیں۔ وہ اپنے باپ کی مدد کے لئے دوڑیں۔ لیکن دو آدمیوں نے اُن لڑکیوں کو سنبھال لیا اور اُنہیں مار مار کر پیچھے دھکیلنے لگے۔ باقی دو

آدمیوں نے رسک لعل کو زمین پر ڈال کر جانور کی طرح ذبح کر دیا...... رسک لعل کی گردن جھول گئی اور اُس کا بدن تڑپنے لگا۔ خون کے فوارے اُٹھ رہے تھے اور رسک لعل کا گردن کٹا ہوا دھڑ بری طرح تڑپ رہا تھا ...... لڑکیاں شدید دہشت کے عالم میں چیخ رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔ لیکن وہ دونوں آدمی جو انتہائی خونخوار تھے، اُنہیں مختلف حرکات کر کے پیچھے دھکیل رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد رسک لعل کا بدن سرد پڑ گیا۔ خود راوت رائے کافی پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن پھر بھی خون کی بہت سی چھینٹیں اُس کے بدن پر پڑی تھیں۔ جب رسک لعل سرد ہو گیا تو راوت رائے نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب اسے لے جاؤ۔ اور اس کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے، تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

وہ دو آدمی جو رسک لعل کو پکڑے ہوئے تھے، گردن جھول کر سیدھے ہو گئے۔ پھر اُن دونوں نے رسک لعل کی ایک ایک ٹانگ پکڑی اور اُسے گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب لے گئے۔ لڑکیاں بری طرح رو رہی تھیں، ہائے رام میرے پتا جی...... ہائے رام میرے پتا جی...... تمہیں اس طرح مرنا تھا۔ ارے ایسا نہ کرو پاپیو، بھگوان تمہارا ناش کرے۔ بھگوان تمہیں تباہ کر دے، بھگوان تمہیں فنا کر دے۔ ارے ارے ایسا نہ کرو...... لیکن وہ لوگ ان لڑکیوں کی دہائی اور فریاد سننے کی بجائے رسک لعل کو کھینچتے ہوئے سیڑھیوں پر لے گئے۔ رسک لعل کے خون کی لکیر فرش سے لے کر سیڑھیوں تک بن گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُس دروازے میں سے غائب ہو گئے۔ لڑکیاں بری طرح رو پیٹ رہی تھیں۔ اُن کے بدن کانپ رہے تھے، سب سے چھوٹی بیٹی رجنی تو فوراً ہی بے ہوش ہو گئی۔ باقی چاروں سینہ پیٹ رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد راوت رائے نے کہا۔

''برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ تمہارا پتا ضدی تھا، کھلا پلا کر مارا ہے میں نے اُسے۔ اور تم باپ کی ضد کا انجام بھگتو۔'' یہ کہہ کر راوت رائے نے اُن دونوں آدمیوں کو اشارہ کیا اور خود آگے اور پیچھے اپنے دونوں غلاموں کو لے کر آخر کار تہہ خانے سے باہر نکل گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ لڑکیاں اب بھی بری طرح رو رہی تھیں۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھیں اور وہاں آ بیٹھیں جہاں اُن کا باپ پڑا ہوا تھا۔ وہ اُس خون کو دیکھتی رہیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد تیسرے نمبر کی لڑکی راگنی بھی بے ہوش ہو گئی۔ باقی تینوں کا بھی برا حال تھا۔ روپا نے اپنی آنکھ کھولنے کے بعد اُن سب کی خدمت کی تھی۔ وہ اب بھی اُن سب کو سنبھالنے لگی، اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ آگے کیا ہوگا۔

اُدھر راوت رائے نے باہر آنے کے بعد اپنا لباس تبدیل کیا اور لاکھن سنگھ کو اپنے پاس بلایا۔ لاکھن سنگھ سے اُس نے کہا۔ ''لاکھن سنگھ، یہ خون آلود کپڑے ہیں۔ اُنہیں کہیں سنسان جگہ لے جا کر جلا دو۔ خبردار ان کی راکھ تک کسی کو نہیں ملنی چاہئے۔''

''مہاراج، خون؟''

''ہاں لاکھن...... میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ میرے سامنے ضد کرنے کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ کیا سمجھے؟''

''مگر مہاراج، کیا ہوا رسک لعل کا؟''

''ختم ہو گیا سسرا۔ اور اپنی ضد میں اپنی بیٹیوں کو بھی لے ڈوبا۔''

''وہ بھی ماری گئیں؟''

''ہاں۔ وہ بھی ماری گئیں۔ اب تک نہیں مریں تو مر جائیں گی بھوک پیاس سے۔ میں نے اُنہیں تاریک گھر پہنچا دیا ہے۔ بس سمجھ لو، وہیں اُن کا انتم سنسکار ہوگا۔ کیا سمجھے؟''

''جی مہاراج۔''

''اصل میں بات یہ ہے لاکھن سنگھ، کہ کبھی خطرے کو قائم نہیں رہنے دینا چاہئے۔ باپ مر گیا ہے۔ میں نے اُن کے سامنے ہی اُسے ذبح کرا دیا تھا۔ بیٹیاں یہ بات کبھی نہ بھولتیں۔ اُن کی زندگی کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔''

''مہاراج، مگر وہ ہیں کہاں؟''

''تاریک گھر، تہہ خانے میں۔''

''لیکن وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔'' لاکھن سنگھ نے تشویش زدہ لہجے میں کہا اور راوت رائے ہنستے ہوئے پھر بولا۔

''میں تمہیں وہاں پہنچائے دیتا ہوں۔ نکل کر آ جاؤ گے تو اپنی آدھی دولت تمہیں دے دوں گا۔''

''نہیں مہاراج، میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا کہ واقعی ایسا نہ ہو۔''

''نہیں ہوگا۔'' راوت رائے نے پُر اعتماد انداز میں کہا اور لاکھن سنگھ گردن ہلا کر خاموش ہو گیا۔

پانچوں بیٹیوں پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ باپ کو جس انداز میں اُن کے سامنے ذبح کیا گیا تھا، اس کو وہ مرنے کے بعد بھی نہیں بھول سکتی تھیں۔ محبت کرنے والا باپ جس نے اُنہیں ماں بن کر پالا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، بہت ہی دُکھ بھرا تھا۔ راوت رائے نے اُن کے ساتھ بڑا ظلم کیا تھا۔ اب بھی زمین پر باپ کے خون کی چپچپاہٹ نظر آ رہی تھی۔ کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ خون اُوپر سے جم کر کالا ہو گیا تھا، لیکن ذرا سا ہٹانے سے سرخ سرخ نظر آنے لگتا تھا۔ باپ کی لاش جس طرح کتے کی طرح گھسیٹی گئی تھی، وہ ان لڑکیوں کے دل پر زخم بنی ہوئی تھی۔ نجانے کتنے گھنٹے وہ سوگ میں ڈوبی رہیں، پھر ایک دم روپا ہی کو خیال آیا۔ چاروں بہنوں کی حفاظت کا تصور اُس کے ذہن میں آیا تو وہ ایک دم سنبھل گئی۔ آنکھوں سے دیکھ چکی تھی کہ باپ اس سنسار میں نہیں رہا۔ بڑی ذمہ داریاں آ پڑی تھیں اُس پر۔ رما سے کہنے لگی۔

''رما، میری بات سن۔ پتا جی اب اس سنسار میں نہیں ہیں۔ یہ سوچنا تو بالکل بیکار ہے کہ وہ دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ ہمیں اپنے جیون کی فکر کرنی چاہئے۔ میرے من میں تو بس ایک ہی بات ہے، کسی طرح میں اس کتے کو اسی طرح کاٹ کے ڈال دوں جس طرح اس نے میرے پتا کو کاٹا ہے۔ یہی کریں گے ہم...... یہی کریں گے۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے جو پتا جی کا بدلہ لے، ہم پر بھی فرض ہوتا ہے، دو ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں ہم، دماغ بھی رکھتے ہیں۔ اُس پاپی کو جس طرح بھی ہو سکے، نیچا دکھائیں گے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے روپا، وہ واپس آئے گا؟'' رجنی نے کہا۔ چھوٹی تھی، مگر سمجھدار تھی۔

اس سوال پر چاروں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔ اور پھر اُنہوں نے رجنی کو دیکھا۔ ''تیرا مطلب ہے کہ......؟''

''ہاں ...... میرا بھی خیال ہے کہ بجائے اس کے کہ اُس کا انتظار کرو، اپنے لئے یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرو۔''

''ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔'' رادھا نے اس کی تصدیق کی اور اس کے بعد وہ پورے تہہ خانے میں پھیل گئیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ...... ہر طرف دیکھتی پھر رہی تھیں۔ پھر اُنہوں نے اُس دروازے کو دیکھا، لگتا تھا پتھر کی سل سے بنا ہوا تھا۔ کہیں کوئی رخنہ، کوئی سوراخ نہیں تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کھولنے کی کوئی کوشش تو کامیاب ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کونہ کونہ دیکھ مارا اور تھک ہار کر بیٹھ گئیں۔ اندر دن اور رات کا کوئی پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ غم سے نڈھال تھیں۔ بھوک پیاس کا تصور بھی دل میں نہیں آیا تھا۔ اور ویسے بھی پاپی راوت رائے نے اُنہیں خوب کھلایا پلایا تھا۔

رات گزر گئی۔ کہیں کہیں رخنوں سے صبح کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لیکن یہ رخنے چھت کے پاس نالی کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں ان کا مصرف کیا تھا؟ وہ اتنے چھوٹے چھوٹے تھے کہ وہاں پہنچنے کا تصور ہی بیکار تھا۔ اور اگر انسان پہنچ بھی جاتا تو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ ان سے تو چڑیا بھی باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ ساری رات جاگتی رہی تھیں۔ صبح کو نڈھال ہو گئی تھیں۔ رونا پیٹنا الگ رہا تھا، ویسے ہی بدن دُکھ گئے تھے۔ چنانچہ دن کی روشنی میں وہ تہہ خانے میں سو گئیں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ دوپہر گزری، شام ہوئی۔ پانی کا قطرہ تک اُنہیں نہیں مل رہا تھا، کھانے کی تو خیر بات ہی اور تھی۔ سب کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر راگنی نے کہا۔

''رمارانی، کیا ہمارا سارا جیون یہیں گزر جائے گا؟''

''نہیں ...... ایسا نہیں ہوگا۔''

''پر یہ بتاؤ، ہم کریں کیا؟ ہائے رام، وہ پاپی تو پلٹ کر آیا بھی نہیں۔ کیا وہ ہمیں یہیں بھوکا پیاسا مار دے گا؟''

''بھاڑ میں جائے بھوک پیاس...... یہاں سے نکل کر ہم صرف اور صرف اپنے پتا جی کی موت کا بدلہ لیں گے۔''

''بات تو وہی نکل جانے کی ہے۔ نکلیں گے کیسے؟'' اور اس سوال پر سب خاموش ہو گئیں۔

دوسرا دن، تیسرا دن اور تیسری رات ...... وہ سب کچھ بھول گئیں۔ بھوک اور پیاس زندگی ختم کر رہی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔ سب کبھی کبھی سسکنے لگتیں۔ ہوش و حواس رُخصت ہوئے جا رہے تھے۔ روپا بھی دیوانی ہو رہی تھی۔ اس وقت کسی کو کسی کا خیال نہیں آ رہا تھا۔ روپا چاروں طرف چکراتی پھر رہی تھی۔ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئی تھیں۔ لیکن بس گھسٹ گھسٹ کر اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں۔ پھر اُس وقت رُوپا ایک دیوار کے پاس بیٹھی بے خیالی کے انداز میں اپنی اُنگلیوں سے دیوار کھرچ رہی تھی کہ اچانک ہی پتھر کی سل ایک جگہ سے ہٹنے لگی اور روپا اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے دیوار کو جگہ جگہ سے کریدا اور دبایا تھا جس کی وجہ سے پتھر کی یہ سل اپنی جگہ سے ہٹی تھی۔ روپا کے دل میں ایک دم خیال آیا کہ شاید باہر نکلنے کا کوئی راستہ یا دروازہ ہو۔ لیکن کچھ دیر بعد اُسے ایک چوکور

خلا میں ایک انتہائی مکروہ اور خوفناک مجسمہ نظر آیا جو سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ کالے رنگ کا یہ مجسمہ سفید سفید آنکھوں سے اُن لوگوں کو گھور رہا تھا...... روپا غور سے اُسے دیکھنے لگی۔ لیکن اس وقت اُس کے ہوش و حواس پھر سے رُخصت ہونے لگے، جب مجسمہ اپنی جگہ سے ذرا سا سرکا اور پھر اس خلا سے باہر نکل آیا ...... روپا پلٹ کر باقی لڑکیوں کی طرف دوڑ پڑی اور اُن کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ وہ سب بھی اُسی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مجسمہ جو انسانی قد و قامت کا تھا اور انسانوں جیسے بدن کا مالک ہی تھا۔ لیکن اُس کا چہرہ اتنا ہولناک اور ایسا بھیانک تھا کہ اُسے دیکھ کر بے ہوشی طاری ہوتی تھی۔ اگر یہ اپنی مصیبت میں گرفتار نہ ہوتیں تو یقینی طور پر اس مجسمے کو دیکھ کر اُن کے ہوش و حواس رُخصت ہو جاتے۔ مجسمہ ایک جگہ آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے اپنا سیدھا ہاتھ اُوپر اُٹھایا اور اُس کے منہ سے ایک بھیانک آواز نکلی۔

''ترنت سب گھائن لڑکیو، میں اشیش بھگونت ہوں۔ آؤ میرے چرنوں میں جھکو اور میرے چرنوں کو چاٹو۔ میں تمہارا نجات دہندہ بن سکتا ہوں۔ اشیش بھگونت ...... ہاں، کرم کرودھ کردھانی، سنسار والے مجھے شیطان کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ سارے کے سارے شیطان ہیں۔ مجھ سے زیادہ پاپی، مجھ سے زیادہ برے۔ میرا تو بس نام بدنام ہے۔''

پانچوں لڑکیاں خوفزدہ ہو گئیں۔ روپا نے کہا۔ ''تو تم شیطان ہو؟''

''اشیش بھگونت کہو مجھے ...... اشیش بھگونت۔ تمہاری مشکل میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ دیا آ گئی ہے مجھے تم پر۔ بولو، میرے سائے میں آؤ گی؟''

''ہمارے پتا جی کہتے ہیں کہ بھگوان ہمیشہ ہمیں شیطان سے بچائے۔''

کالے منہ والا مجسمہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''بھگوان، بھگوان، بھگوان ...... کتنا سمے ہو گیا تمہیں یہاں۔ بھگوان کی مدد سے تم باہر کیوں نہیں نکل گئیں؟ بولو، کیا تم نے گڑگڑا کر بھگوان سے پرارتھنا نہیں کی کہ وہ تمہیں باہر نکال لے؟ کیا تم نے مہادیو، شری کرشن اور ہنومان جی کا حوالہ نہیں دیا؟ کون تمہیں یہاں سے نکال کر لے گیا؟ بولو۔''

''ہم پھر بھی تم پر لعنت بھیجتے ہیں۔''

''ہوش و حواس میں نہیں ہو، پاگل ہو گئی ہو تم۔ مجھ پر لعنت بھیجنے کی بجائے میرا ہاتھ پکڑو۔ میں تمہیں پلک جھپکتے میں یہاں سے لے چلوں گا۔ تم نے دیکھا نا، کیا وہ میں تھا جس نے تمہارے پتا کی جان لی؟ بولو، جواب دو۔ میری شکل دیکھ رہی ہو۔ کیا وہ میں تھا؟ اُس نے تمہارے پتا پر کوئی دیا نہیں کی۔ چار دن سے اُس نے تمہیں بھوکا پیاسا رکھ چھوڑا ہے۔ اور اس وقت تک وہ نہیں آئے گا یہاں پر جب تک تم بھوک پیاس سے مر نہیں جاؤ گی۔ تمہارے پتا جی کی لاش اُنہوں نے ایک جگہ دبا دی ہے۔ وہاں گل سڑ جائے گی اور ختم ہو جائے گا تمہارا پتا، بلکہ ہو چکا ہے۔ اب بھلا اُس میں جیون کہاں؟ اور اس کے بعد جب تم مر جاؤ گی تو تمہاری لاشوں کو بھی وہ مٹی کا تیل ڈال کر جلوا دے گا۔ کیا سمجھیں؟ میں تمہیں یہاں سے نکال لے جا سکتا ہوں۔ آؤ، میرے چرنوں کو چھوؤ، میرے چرن چاٹو۔''

''نہیں ...... ہم اب بھی تیری صورت پر لعنت بھیجتے ہیں۔ تو ہمارا اشیش بھگونت نہیں ہے۔ تو شیطان

ہے شیطان۔"

"ٹھیک ہے، مگر سنو، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم پانچوں اتنی سندر ہو کہ اگر تم میرے سائے، میں میری پناہ آ جاؤ تو یہ سمجھ لو کہ سنسار میں بہت سوں کو بھٹکا سکتی ہو۔ میرا کام آسان ہو جائے گا۔ مجھے تو تم جیسوں کی تلاش ہی رہتی ہے پاگلو، اُس پاپی سے اپنے پتا کے خون کا بدلہ لینا چاہتی ہو تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ سمجھیں؟ میں تمہیں اس کا موقع دُوں گا کہ تم اُس سے ہی نہیں بلکہ اُس کے سارے پریوار سے بدلہ لو۔ ایسے ایسے گر، ایسی ایسی ترکیبیں بتاؤں گا تمہیں کہ جیون بھر میرا نام لو گی اور مجھے دُعائیں دو گی، مگر بھگوان کا نام لے کر نہیں۔ مجھے دُعا بھی تم میرا ہی نام لے کر دے سکتی ہو۔ اب بھی تیار ہو جاؤ، پہلے میں تمہیں کھانے کو دُوں گا تا کہ تمہارے شریر میں جان آئے۔ پھر تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں باہر لے جاؤں گا۔ کوئی تمہیں چھو بھی نہیں سکے گا۔ بولو...... جواب دو۔"

"نہیں نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے...... میں انتظار کروں گا۔ یہ میرا مجسمہ تمہارے سامنے ہے۔ جس سے تمہیں یہ احساس ہو جائے کہ میرا سہارا لے کر تم اچھا جیون گزار سکتی ہو، تو میرے چرنوں میں آنا اور میرے پیروں کی اُنگلیوں کو چوم لینا۔ میں آ جاؤں گا۔ اور اس کے بعد تمہاری سہائتا کروں گا۔" مجسمہ واپس اپنی جگہ چلا گیا۔ وہاں جا کر وہ پتھرا گیا۔ لیکن اب وہ دروازہ، وہ خلا بند نہیں ہوا تھا۔ مجسمہ ہر لمحے اُن کے سامنے تھا اور جیسے اپنی خوفناک آنکھوں سے اُن کی نگرانی کر رہا تھا۔ روپا اور اُس کی چاروں بہنیں اُس مجسمے کو دیکھتی رہیں۔ اُن کا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ اُس کے الفاظ اُن کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ لیکن پتا جی نے کہا تھا کہ ہمیشہ شیطان سے بھگوان کی پناہ مانگو اور بھگوان سے کہو کہ وہ تمہیں شیطان سے بچائے۔ ہے بھگوان، ہمیں اس جھوٹے بھگوان سے بچا۔ اشیش بھگونت سے ہمیں بچا بھگوان، تیری بڑی مہربانی ہو گی۔

رات گزر گئی۔ دوسرا دن آیا۔ پیاس سے اُن کی بری حالت تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ حالت رجنی کی خراب تھی۔ وہ اور رادھا زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ اُوپر ہی اُنہیں ایک سوراخ نظر آیا جس سے نجانے کیسی روشنی چھن رہی تھی۔ پھر اس کے بعد اچانک ہی اُس سوراخ سے پانی کی ایک دھار نیچے بہنے لگی اور وہ دونوں ایک دم اُٹھ گئیں۔ اس قدر پیاس کی شدت تھی کہ وہ جلدی سے ہاتھوں میں پانی لے کر اُسے پینے لگیں۔ پانی کا مزہ بڑا عجیب اور بڑا خراب سا تھا۔ لیکن پانچوں بہنوں کو بری طرح پیاس لگ رہی تھی۔ بدبودار اور سڑے ہوئے پانی کو پی کر وہ اپنے آپ کو پُرسکون محسوس کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پانی کی یہ دھار بند ہو گئی۔ جب اُن کی پیاس بجھ گئی تو رادھا نے راگنی سے پوچھا۔

"یہ پانی کہاں سے آیا؟ بدبودار اور سڑا ہوا۔"

دفعتہً اُنہیں مجسمے کے منہ سے ایک قہقہہ نکلتا ہوا سنائی دیا اور وہ چونک کر اُدھر متوجہ ہو گئیں۔ مجسمے کی آواز اُبھری۔ "یہ پانی نہیں پاگلو، یہ ایک ایسی چیز تھی جس کے بارے میں تمہیں بتایا تو تم اُلٹیاں کرنے لگو گی۔ پانی نہیں تھا یہ۔ لیکن یہ تمہارے شریر میں پہنچ چکا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ تمہارے خون میں دوڑنے لگے گا۔ اور پھر...... اور پھر تمہیں میری قدر معلوم ہو گی۔ میں اشیش بھگونت ہوں...... اشیش بھگونت۔"

"کیا کہہ رہا ہے یہ پاپی؟"

"اسے پاپی مت کہو، اپنے آپ کو محسوس کرو۔ اس سے ہمارے جیون میں نیا جیون دوڑ رہا ہے۔ گھٹ گھٹ کر مر جانے سے تو اچھا ہے کہ ہم اس کی مدد قبول کر لیں۔" یہ الفاظ رما کے تھے۔ روپا اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں، واقعی، یہاں تو کوئی بھی نہیں آ رہا، تو پھر آؤ اسی کی مدد قبول کر لیں۔ اس کی بات مان کر جیون تو ملے گا ہمیں۔ اور یہاں کون بچانے والا ہے۔"

"کیا کہتی ہو تم لوگ؟"

"ہم تیار ہیں۔" وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور تھوڑی دیر کے بعد وہ شیطان کے مجسمے کی اُنگلیوں کو چوم رہی تھیں۔ پھر اس کام سے فارغ ہو کر وہ پیچھے ہٹ گئیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ مجسمے کے اندر ایک بار پھر زندگی دوڑ گئی ہے۔ وہ خلا سے باہر نکل آیا۔ اور اب وہ گوشت پوست کا بنا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اتنا ہی خوفناک تھا، اُس کے ہونٹوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں پانچ لڑکیوں کو اپنی تحویل میں قبول کرتا ہوں۔ جس طرح میں کہہ رہا ہوں، اس طرح کرو۔ آ جاؤ میرے ساتھ...... آ جاؤ۔" اُس نے کہا اور تہہ خانے کے وسیع و عریض ہال میں چلتا ہوا ایک گوشے میں پہنچ گیا۔ پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور دوسرے لمحے زمین پر جو کچھ اُنہیں نظر آیا اُسے دیکھ کر اُن کی آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں۔ یہ کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ لذیذ چیزیں...... طرح طرح کے کھانے۔ اور اس وقت اس سنسار میں اُن کے لئے اس سے بڑی چیز اور کوئی نہیں تھی۔ وہ کھانوں پر ٹوٹ پڑیں۔ اور اُنہوں نے یہ لذیذ کھانے اپنے حلق میں اُتارنے شروع کر دیئے۔ اُن کی لذت بے پناہ تھی۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھ رہی تھیں کہ وہ ہے کیا، بس کھا رہی تھیں۔ اور کچھ دیر بعد وہ شکم سیر ہو گئیں۔ اب اُن سے نہیں کھایا جا رہا تھا۔ اُنہوں نے کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد بچے ہوئے کھانے کو دیکھا، پتہ نہیں کیا بھاجی ترکاری تھی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھاجی ترکاری اُچھل کر پلیٹوں سے باہر نکل آئی، مینڈکوں کی طرح اُچھلی ہوئی اِدھر سے اُدھر بکھر گئی۔ رجنی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ رادھا، راگنی، رما اور روپا ایک دم پیچھے ہٹ گئیں۔ تمام ڈشوں سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جو کچھ اُنہوں نے کھایا تھا وہ زندہ تھا۔ اور یہ زندہ چیزیں ہی وہ کھا گئی تھیں...... مینڈک، چھپکلیاں، کاکروچ، یہی تمام چیزیں تھیں جنہیں اُنہوں نے کھایا تھا۔ رجنی تو اپنا سینہ پیٹنے لگی۔ لیکن روپا اور رما ہنس رہی تھیں۔ پھر اُنہوں نے کہا۔

"پگلیو، یہ بتاؤ کہ جو کچھ ہم نے کھایا ہے اس نے ہمیں کوئی نقصان پہنچایا؟"

"ہائے رام یہ تو چھپکلیاں تھیں، مینڈک تھے، چوہے تھے۔"

"رام کا نام مت لو۔ رام سے اب ہمارا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اشیش بھگونت کہو، اشیش بھگونتی کہو۔" روپا نے رجنی کو ڈانٹا اور رجنی کو ایک دم ایسا محسوس ہوا جیسے روپا سب کچھ سچ کہہ رہی ہے۔ دفعتہً ہی اُنہوں نے اپنے پیچھے قدموں کی آوازیں سنیں۔ وہ اشیش بھگونت کو بھول گئی تھیں۔ پلٹ کر دیکھا تو شیطان اُن کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"اس سنسار میں جو کچھ بھی ہے اس کا ایک مصرف ہے۔ تمہیں یہ ساری باتیں بھلانی ہوں گی۔ تم اب تک نیکیاں کرتی رہی ہو نا۔ تم نے اپنے باغ میں بڑے بڑے پھول کھلائے ہیں۔ تم کیا جانو کہ بھوک پیاس کیا چیز ہوتی ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں، سنسار میں نیکیوں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ لوگ سارا الزام مجھے دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں باہر کے سنسار میں نکل کر دیکھو، اگر سنسار میں ہونے والی ساری برائیوں میں میرا ہاتھ ہے تو میری گردن کاٹ دو۔ بس نام لے لیتے ہیں وہ لوگ میرا، کرتے وہ خود ہیں جو کچھ بھی تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھو گی۔ کیا برا ہے؟ کیا اچھا ہے؟ یہ بھول جاؤ، تمہارا پیٹ کیسے بھرتا ہے؟ بس اسے یاد رکھو، جو کچھ تم نے کھایا ہے وہ میری پرشاد ہے۔ سمجھیں؟ میرا دیا ہوا مان ہے۔ تم دیکھو کیا سے کیا بن سکتی ہو؟ ابھی تو میں تمہیں بہت کچھ دُوں گا۔ سمجھیں؟ اس تہہ خانے میں لا کر اُس بیوقوف زمیندار نے یہ سوچا تھا کہ صرف تمہیں موت دے سکتا ہے۔ وہ بہت کچھ بھول گیا تھا...... بہت کچھ بھول گیا تھا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ میں ہر جگہ آ جا سکتا ہوں۔ مجھے اپنے چاہنے والوں کی ہر جگہ ضرورت ہوتی ہے۔ اور اب میں یہاں سے پانچ ایسی لڑکیاں لے کر جاؤں گا جو اس سنسار میں خوفناک ترین لڑکیاں ہوں گی۔ ہاں...... اس سنسار کو پانچ خوفناک لڑکیاں ملیں گی جو سنسار کے باسیوں کے بڑے کام آئیں گی...... بڑے کام آئیں گی۔" پھر شیطان ہنسنے لگا۔ اور اس کے ساتھ روپا بھی ہنسی۔

"اب تو ہم تمہارے داس بن ہی چکے ہیں اشیش بھگونت، ہمیں یہاں سے نکالو۔"

"ارے میں کیا نکالوں گا، اپنی شکتی کو تم نہیں جانتیں کہ کتنی بڑی شکتی حاصل ہو گئی ہے تمہیں۔ لیکن ابھی سمے یہیں گزارتی رہو۔ تھوڑا سمے یہاں بتانا ہوگا۔ دیکھتی تو جاؤ تماشا کیا ہوتا ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ یہاں آرام سے رُکو۔ سمے تمہاری سہائتا کرے گا۔ وہ واپس مڑا اور اُسی خلا میں غائب ہو گیا۔ اب وہاں مجسمہ موجود نہیں تھا۔

روپا، رما، راگنی، رادھا اور رجنی وغیرہ اپنے گرو دیو مہاراج کو دیکھتی رہیں۔ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو رادھا نے کہا۔ "روپا، کیا جو کچھ ہم پر بیت رہی ہے وہ سچائی ہے؟ ہم واقعی اشیش بھگونت کے داس بن گئے ہیں؟ کہیں یہ صرف ایک سپنا تو نہیں ہے؟"

"نہیں...... حقیقتوں کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھنا ہوتا ہے۔ اشیش بھگونت سچ ہی تو کہتے ہیں کہ ساری برائیاں ان کے نام سے منسوب کرنے والے خود کتنے برے ہیں۔ اب تو کھل کر بات سامنے آ گئی ہے۔ اس سمے ہمیں جو کچھ دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ یہ ہے کہ اس پاپی راوت رائے نے میرے پتا جی کو اس لئے ہلاک کر دیا کہ وہ اُن کی زمین ہڑپ کرنا چاہتا تھا، اُن کا باغ چھیننا چاہتا تھا۔ اگر وہ اشیش بھگونت کا پیروکار ہوتا اور اُن کے کہنے پر یہ سب کچھ کرتا تو بھلا اشیش بھگونت ہماری مدد کیوں کرتے؟ بولو، جواب دو، ہماری سہائتا کیوں کرتے؟ اس کا مطلب ہے کہ اُنہوں نے اُس کے خلاف ہماری سہائتا کی۔ اور وہ پاپی جس نے اتنا بڑا اجرم کیا اُن کا ساتھی نہیں تھا۔ وہ تو خود شیطان تھا۔ اب ایسی صورت میں جب اشیش بھگونت ہماری پیٹھ پر ہاتھ رکھ رہے ہیں تو ہمیں یہ ہاتھ ہٹانا تو نہیں چاہئے۔ ہم بالکل بے سہارا رہ گئے ہیں۔ اگر ہم کسی طرح یہاں سے نکل بھی جائیں تو تمہارا کیا خیال ہے کہ راوت رائے ہمیں جیتا چھوڑ دے

گا؟ اُس کے پاس بے پناہ طاقت ہے۔ تلاش کرے گا اور مار دے گا ہمیں۔ اپنے پتا جی کے قاتل سے ہم کبھی بدلہ نہیں لے سکتے۔ لیکن اگر اشیش بھگونت ہماری پیٹھ پر ہاتھ رکھ رہے ہیں تو پھر یہ سمجھ لو کہ بڑی بات ہے۔"

"ہاں...... یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"تو پھر نعرہ لگاؤ جے بھگونت......" اُن چاروں نے ایسا ہی کیا تھا۔ ابھی نعرے کی آواز ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پُراسرار وجود اُس کے سامنے دوبارہ آ موجود ہوا۔ وہ اُن کے عقب سے نمودار ہوا تھا اور پیچھے سے اُس کی آواز سنائی دی تھی۔

"لو...... یہ سب کچھ تمہارے لئے ہے۔" اُنہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو پانچ عورتیں ہاتھوں میں تھال لئے کھڑی تھیں اور اُن کے آگے اشیش بھگونت موجود تھا۔ "اس میں تمہارے لئے کپڑے ہیں۔ اپنے یہ گندے لباس اُتار ڈالو جو نیک اور حلال کمائی کے ہیں۔ انہیں اُتار کر پھینک دو، ان سے بدبو آ رہی ہے۔ میں نیکیوں کی کوئی چیز برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ یہ میرے لائے ہوئے لباس ہیں۔ انہیں پہن لو اور یہ سمجھ لو کہ سنسار کی بڑی شکتی تمہارے پاس آ گئی ہے۔ اپنے اپنے کپڑے اُتار دو۔"

گرو مہاراج کا حکم تھا، بھلا کیسے رُکتے؟ کچھ لمحوں بعد اُن کے جسم بے لباس ہو گئے۔ آنے والی عورتوں نے اپنے اپنے تھال اُن کے سامنے کر دیئے۔ اُن میں جگمگاتے ہوئے حسین لباس تھے جو اُن پانچوں کے لئے تھے۔ اُنہوں نے بڑے اطمینان سے وہ لباس پہن لئے۔ اشیش بھگونت مسکراتی نگاہوں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔ "اور اب تم جو کچھ بن گئی ہو سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اپنے من میں کوئی بھی نام ہو، من میں جو کچھ بھی چاہو، میری طاقتیں اسے قوت بخشیں گی اور وہی ہو جائے گا جو تم نے چاہا۔ کیا سمجھیں؟"

پہلے تو وہ کچھ نہیں سمجھی تھیں، لیکن پھر رفتہ رفتہ اشیش بھگونت کے الفاظ اُن کی سمجھ میں آنے لگے۔ راگنی نے خوش ہو کر کہا۔ "اس کا مطلب ہے بھگونتا کہ ہم جو کچھ چاہیں بن سکتے ہیں؟"

"ہاں...... میں اپنے داسوں کو ایسی ہی قوت دیتا ہوں۔ اچھا سنو، اب تم ایسا کرنا، ابھی تھوڑا سمے اور یہاں انتظار کرو۔ اس کے بعد تم پیلی مکڑی بن کر یہاں سے نکل جانا۔ وہ سامنے جو سوراخ دیکھ رہی ہو نا، دیوار پر سے چڑھ کر اُس سوراخ میں داخل ہونا اور پھر وہاں سے باہر نکل جانا۔ بعد میں تمہیں ایک ایک کر کے بتاؤں گا۔ حویلی کے مشرقی گوشے میں ایک پرانا کھنڈر پڑا ہوا ہے۔ تم پانچوں اُس پرانے کھنڈر میں آ جانا اور اپنا اصل رُوپ اختیار کر لینا۔ بس سمجھ لو، وہاں سے تمہارے کام کا آغاز ہوگا۔"

"جی مہاراج۔"

پھر اچانک ہی شیطان نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور اس کے بعد نہ تو اُن پانچوں عورتوں کا وجود رہا جو اُن کے لئے لباس لے کر آئی تھیں اور نہ شیطان کا۔ البتہ وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ سکتی تھیں۔ راگنی نے کہا۔ "ہائے روپا دیدی، کتنی سندر لگ رہی ہو تم ان کپڑوں میں۔"

"اور اگر تم اپنے آپ کو درپن میں دیکھو تو حیران ہی رہ جاؤ گی۔"

”کیوں...... ہم بھی اچھے لگ رہے ہیں؟“
”دیکھوایک دوسرے کواور بتاؤ۔“
اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس وقت شہزادیاں لگ رہی تھیں۔روپا نے ہنس کر کہا۔”دیکھنا نا، سمے نے ہمیں کتنا بڑاانعام دیاہے۔اصل بات یہ ہے کہ انسان کچھ سوچتاہےاور ہوتا کچھ ہے۔چلو،ٹھیک ہے۔ سمے کی یہ دین ہمیں قبول ہے۔اب دیکھواشیش بھگونت ہمیں کیا ذمہ داری سونپتے ہیں؟“
”مگر کیا میں پیلی مکڑی بن سکتی ہوں؟“ رادھانے سوال کیا۔
”کوشش کر کے دیکھو۔“
”کیا کروں؟“
”بس کہو کہ اے بھگونتا، مجھے مکڑی بنا دے۔“ روپا نے کہا اور اسی وقت اچانک ہی اُس کے پاؤں ٹیڑھے ہونے لگے۔اور وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔
اُس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہوتے چلے گئے۔سر اِدھر سے اُدھر گھوم رہا تھا۔پھر اُس کے بدن میں اور پاؤں نکلنا شروع ہوگئے۔بغلوں سے، کمر سے، پچھلے دو پیروں کے آس پاس بے شمار ٹانگیں روپا کے بدن میں نمودار ہوگئیں۔اُس کا چہرہ بھیانک سے بھیانک تر ہوتا جارہا تھا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کافی بڑی پیلی مکڑی رہ گئی۔باقی بہنیں خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی تھیں۔
”یہ کیا ہوا؟“ اچانک ہی رجنی کے منہ سے نکلا۔
”میں جانتی ہوں کیا ہوا۔“ رما نے کہا۔
”کیا...... بتاؤ۔“
”اس نے تمہیں کچھ بتانے کے لئے اپنے منہ سے کہا تھا، اے اشیش بھگونت، مجھے مکڑی بنا دے......“
اور دفعتہً ہی رما خاموش ہوگئی۔اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے بدن میں کچھ کلبلاہٹیں ہورہی تھیں۔ایسا لگ رہا تھا جیسے کندھوں کے پاس سے کوئی چیز رینگ رہی ہو۔اُس نے بوکھلا کر اپنے کندھے کو دیکھا، وہاں سے دو پاؤں نکل رہے تھے۔پھر بغل کے پاس سے دو پاؤں نکلے۔اس کے بعد کمرے میں اب باقی تین لڑکیاں اُسے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔راگنی نے جلدی سے کہا۔
”اپنے منہ سے کچھ نہ کہنا۔جیسے ہی تم اشیش بھگونت کا نام لے کر کہو گی کہ وہ ہو جائے تو وہ ہو جائے گا۔دیکھو، یہ دونوں مکڑیاں بن گئیں...... ہائے، اب کیا ہوگا؟“
”پتہ نہیں...... سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم بھی مکڑیاں بن جائیں۔اشیش بھگونت نے یہی کہا تھا۔“
”ہاں...... ٹھیک ہے۔جو انجام ہونا ہے سب کا ساتھ ہی ساتھ ہوگا۔“ تینوں نے وہی الفاظ دہرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ زہریلی مکڑیاں وجود میں آگئیں۔اُنہیں یاد تھا کہ شیطان نے اُن سے کیا کہا تھا۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ دیوار پر رینگنے لگیں اور ایک قطار سے دیوار پر چڑھتی ہوئی سوراخ کے پاس پہنچ گئیں جہاں سے اُنہیں باہر نکلنا تھا۔

کافی دن کے بعد اُنہوں نے کھلی ہوا دیکھی تھی۔تہہ خانے میں اُن پر جو دن گزرے تھے وہ بڑے کٹھن تھے۔لیکن اب اشیش بھگونتا کی مہربانی سے کھلی فضا میں آگئی تھیں اور اپنی اس آزادی سے بہت خوش تھیں۔ لیکن اُن کے اندر بے پناہ چالاکی بھی پیدا ہوگئی تھی۔وہ جانتی تھیں کہ پانچ پیلی مکڑیوں کو ایک ساتھ اس طرح چلتا دیکھ کر لوگ حیران ہو سکتے ہیں۔نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔حالانکہ وہ اس قدر زہریلی تھیں کہ اگر کسی انسانی جسم پر سے گزر جائیں تو وہ گلنا شروع ہو جائے اور وہاں پیدا ہونے والے زخم کبھی بھر نہ سکیں۔ لیکن یہ بعد کی بات تھی۔پہلے اُنہیں اپنے بچاؤ کا انتظام کرنا تھا۔چنانچہ وہ چھپتی چھپاتی حویلی کے ایک ایسے گوشے سے باہر نکل آئیں جو ویران اور سنسان تھا۔کسی کو نہیں پتہ چلا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔باہر آنے کے بعد وہ ایک درخت کی جڑ میں جمع ہوگئیں۔روپا نے کہا۔
”میری پیاری بہنو، اب ہم بالکل بدل گئے ہیں۔ہمیں ایک ایسی شکتی حاصل ہوگئی ہے جو موجودہ شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔اپنی مرضی سے ہم نے کیسی جون بدلی ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کرنا کیا چاہئے؟“
رادھا نے کہا۔”دیدی، پہلے ہمیں اپنے پتا کی لاش تلاش کرنی چاہئے۔اُن پاپیوں نے تو اُن کا اَنتم سنسکار بھی نہ کیا ہوگا۔ہمیں اُن کا اَنتم سنسکار کرنا چاہئے۔یہ ہمارا فرض ہے۔“ ابھی رادھا کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ ایک طرف سے اشیش بھگونت نمودار ہوگیا۔وہ سب اُسے دیکھ کر سیدھی ہوگئیں۔
”بیوقوف لڑکیو، اس سنسار کی بات کر رہی ہو؟ یہ ساری سنسار کی بیوقوفیاں ہیں۔جب شریر سے آتما نکل جاتی ہے تو شریر، مٹی کا ڈھیر رہ جاتا ہے۔مٹی کے ڈھیر کو مٹی میں ملا دو یا راکھ بنا کر ہوا میں اُڑا دو یا اپنی من مانی کے لئے، اپنی تسلی کے لئے ہانڈی میں بھر کر گنگا میں بہا دو۔کچھ نہیں ہوتا۔یہ سب تمہارے من کا کھیل ہے۔آتما، شریر سے نکلی تو سب کچھ اڑنچھو۔کس چکر میں پڑی ہو؟ جو کبھی تمہارا پتا تھا، وہ کچھ نہیں ہے، مٹی کا ڈھیر مٹی میں سڑ رہا ہے۔جینے کی بات کرو۔جیون کی کہانی الگ چیز ہے۔جب تک تمہارے شریر میں آتما موجود ہے سب کچھ تمہارا ہے۔اس سب کچھ کو تم جس طرح چاہو استعمال کرو۔چاہے اسے روتے پیٹتے بتاؤ اور آگ میں جل کر راکھ ہو جاؤ یا مٹی میں دب کر فنا ہو جاؤ۔اور اگر چاہو تو اسے اپنے سب لئے کچھ بنا لو۔حکمرانی کرو اس سنسار پر۔“
”آپ ٹھیک کہتے ہیں بھگونتا، بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ۔پر اب آپ یہ بتائیے کہ اب ہمیں آگے کیا کرنا ہے؟“
”تم نے دیکھ لیا تمہارے اندر جو شکتی پیدا ہوگئی ہے۔اب تم صرف لڑکیاں نہیں بلکہ خوفناک لڑکیاں ہو۔ایسی خوفناک لڑکیاں جن کا وجود اس سنسار کے لئے بہت کچھ ہو جائے گا۔تم میں سے ہر ایک سنسار پر حکمرانی کرے گی۔سب کو الگ الگ ہونا پڑے گا۔ہر ایک کو اپنے اپنے کام اُن کے سپرد کئے جائیں گے۔ کیا سمجھیں؟ چنانچہ اب جو تمہیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس سنسار میں بہت سے ایسے پاگل بکھرے ہیں جو سنسار کی بھلائی میں لگے ہوئے ہیں۔جنہوں نے نیکو کاروں کا رُوپ دھار کر بلاوجہ نیکیاں شروع کر دی ہیں۔اور جو اُن کی نیکیوں کا شکار ہو جاتے ہیں وہ بیچارے سنسار میں ادھورے ہی رہ جاتے ہیں۔سنسار

سے نیکیوں کو مٹاؤ۔ اشیش بھگونت کی بھگوتی سنسار میں پھیلاؤ۔ وہ سب کچھ کرو جو انسان کو نیکیوں کے جال سے نکال دے۔ یہی تمہارا کام ہے اور یہی میرا کام ہے۔ بہت سے شاگرد ہیں میرے...... بہت سے چیلے ہیں۔ وہ سب یہی کام کرتے ہیں۔ میں نے یہ نئی کھیپ تم پانچ لڑکیوں کی تیار کی ہے۔ تمہیں جگہ جگہ بکھر جانا ہے۔ بہت سی جگہوں پر جا کر تم کو اپنا کام سرانجام دینا ہے۔ تم سب کی ڈیوٹیاں لگیں گی۔ تمہارے لئے میں منگل کا دن مقرر کرتا ہوں اور ڈوبتے چاند کی آخری رات جب چندر ما ڈوب جاتا ہے، تمہیں ایک جگہ اکٹھا ہونا ہوگا۔ وہاں پر میں تم سے ملاقات کروں گا۔ یہ کام مہینے میں ایک بار ہوگا یا سال میں ایک بار، اس کے بارے میں تمہیں بتاؤں گا۔ تم سب کو الگ الگ رہ کر کام کرنا ہوگا۔ بولو تیار ہو؟"

"پر مہاراج، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم سب مل کر کام کریں؟"

"نہیں... کام بہت ہے اور میرے چیلے کم۔ لیکن میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ مہینے میں ایک بار تمہیں ایک مخصوص جگہ پر ملاقات کرنی ہے۔ ساری رات اور سارا دن وہاں رہ سکتی ہو۔ کیا سمجھیں؟"

"ٹھیک ہے۔ جو حکم مہاراج، ہمیں اعتراض نہیں ہے۔ پر آپ یہ بتائیے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"ہاں راگنی، میں نے تمہیں اس کام کے لئے مقرر کیا ہے کہ تم راوت رائے کو اُس کے کئے کی سزا دو گی۔ روپا، کیا تمہارے من میں یہ بات نہیں ہے کہ تم اپنے پتا کا انتقام لو؟"

"کیوں نہیں اشیش بھگونت، میں راوت رائے کے پورے پریوار کو نشٹ کر دینا چاہتی ہوں۔ میری آرزو ہے کہ میں اُس کے سارے خاندان کو ختم کر دُوں۔"

"یہ ذمہ داری میں نے راگنی کے سر ڈال دی ہے۔ یہ کام راگنی کرے گی۔ کیوں راگنی، تم کرو گی نا یہ کام؟"

"ہائے میرا تو من چاہتا ہے کہ ناگن بن کر راوت رائے کو ڈس لوں۔" راگنی نے کہا۔

"صرف راوت رائے کو نہیں۔ میں تمہیں پہلا کھیل بتاؤں گا لڑکیو، آؤ میں تمہیں اشیش بھون دکھا دُوں جہاں تمہیں ہر مہینے ڈوبتے چاند کی راتْ کو ملنا ہے۔ وہی جگہ تمہارے لئے مناسب رہے گی۔ اور میں وہیں تمہیں نئے نئے کام بتایا کروں گا۔ سنو، سنسار کا ہر عیش و آرام تمہارے لئے ہے۔ تم جو چاہو گی، تمہیں حاصل ہو جائے گا۔ میرا ہاتھ پکڑا ہے تم نے۔ یہ دور میرا ہے۔ پوجا پاٹ میرا ہے۔ پوجا پاٹ اور گیان دھیان کرنے والے سب کے سب گیان دھیان کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔ اب یہ سنسار میرا ہے۔ میرا تو ایک ہی مقصد ہے اس سنسار میں کہ جتنے نیکیاں کرنے والے ہیں اُن کو نشٹ کر دُوں، ختم کر دُوں۔ آؤ۔"

اشیش بھگونت اُن پانچوں کو لے کر جس جگہ پہنچا وہ عظیم الشان کھنڈرات تھے۔ تا حد نظر ویران کھنڈرات۔ ہر طرف دُھواں اُگلتی ہوئی دلدلیں۔ اُن کے درمیان ایک چھوٹا سا پتلا راستہ جس سے عام آدمی گزرنے کا تصور بھی نہ کر سکے۔ وہ لوگ بھی جب وہاں پہنچے تو خوف سے اُن کے دل دھڑکنے لگے۔ ان راستوں پر ایک ذرا سی لغزش ہو جائے تو دونوں طرف گہری دلدل میں انسانی جسم کا پتہ بھی نہ چل سکے۔ لیکن اشیش بھگونت اُن کے ساتھ تھا اور شاید اُن کے عزم کا امتحان بھی لینا چاہتا تھا۔ اس پتلی سی پٹی پر قدم رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ "مجھ پر اعتماد کرتی ہو تو میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔ یہی تمہارے اصل ہونے کی نشانی ہے۔"

اور وہ سب اشیش بھگونت کے پیچھے چل پڑیں۔ پھر جب وہ اشیش بھون پہنچیں تو اُن کی سانسوں میں سانس آئی۔ کھنڈرات کا یہ عظیم الشان سلسلہ ناقابل یقین حد تک پھیلا ہوا تھا۔ نجانے یہ کون سی جگہ تھی، کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ لیکن ہر طرح کے شیطانی عمل کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہاں پہنچ کر اشیش بھگونت نے کہا۔ "دیکھ لی تم نے یہ جگہ؟ یہیں ملنا ہے تمہیں۔ اور جب تم میرا نام لے کر سفر کرو گی تو ہر طرح کا خوف تمہارے دل سے نکل جائے گا۔" اور اُس نے اُن لوگوں کو مختلف رُوپ دکھائے اور رُوپ بتائے۔ اور اس کے بعد اُنہیں لے کر واپس اشیش بھون سے نکل آیا۔ پھر اُس نے کہا۔

"راگنی، سب سے پہلے تم اپنے کام پر جاؤ۔ سیدھی چلی جاؤ اور اس کے بعد تمہارے من میں ایک کہانی جنم لے گی، تم اُس پر کام کرنا۔ اور روپا، رجنی، رما اور رادھا، تم چاروں میرے ساتھ ساتھ چلی آؤ۔ تمہیں تمہارے کام بتاؤں۔ اور راگنی، اب اُس دن جب چاند ڈوبنے لگے تم آنکھیں بند کر کے آ جانا۔ تم وہاں تک کیسے پہنچو گی، اس کا بھید تمہیں وقت بتائے گا۔ جاؤ۔"

راگنی وہاں سے چل پڑی اور سفر کرتی رہی۔ ایک انتہائی لمبا سفر تھا۔ نہ تو اُسے کسی تھکن کا احساس تھا، نہ کوئی اور احساس اُس کے دل میں تھا۔ وہ تو اس وقت چونکی جب اُس کی نگاہوں کے سامنے اُس کا اپنا باغ آ گیا۔ یہ خوشبو اور یہ مہک تو اُس کے خون میں رچی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچنے کے بعد اُس کے قدم خود بخود رُک گئے۔ اور پھر نجانے کیوں اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسے اپنا باپ یاد آ گیا تھا۔ رسک لعل اُن لوگوں کو کبھی کبھی لے کر باغ میں آ جایا کرتا تھا۔ ساری بیٹیاں اُس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ساتھ میں برتن بھاڑے بھی لے آتے تھے یہ لوگ۔ لڑکیاں یہاں کھانا پکاتیں۔ ایک طرف چادر بچھا دی جاتی۔ رسک لعل اُس چادر پر دراز ہو جاتا۔ بچیوں سے باتیں کرتا رہتا اور اُنہیں کھانا پکاتے بھی دیکھتا رہتا۔ پھر وہ سب وہیں مل کر کھانا کھاتے۔ رسک لعل اُنہیں نئے پھلوں کے بارے میں بتاتا اور یہ بتاتا کہ کس طرح اُس نے پھلوں کی پیداوار میں کارنامے انجام دیئے۔ یہ ساری باتیں آج راگنی کو یاد آ رہی تھیں اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی اور اُس کے دل سے مختلف آوازیں نکل رہی تھیں۔ روتے روتے اُس کے منہ سے آواز نکلی۔ "ہائے پتا جی...... تم نے ہمیں ماں بن کر پالا۔ پر تم ہمارا ساتھ نہیں دے سکے۔ پاپیوں نے تمہیں ہم سے چھین لیا۔ اب تم نہیں۔ یہ باغ ہمارا نہیں۔ اس پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ تمہاری آتما کو کتنا دُکھ ہوتا ہوگا پتا جی، کتنا دُکھ؟" ابھی اُس کے منہ سے الفاظ نکلے ہی تھے کہ اچانک ہی اُس نے باغ کے گیٹ کے سامنے ایک بڑی سی جیپ رُکتے ہوئے دیکھی۔ اس جیپ میں سے کئی لڑکے اور لڑکیاں نیچے اُترنے لگے۔ راگنی نے جلدی سے اپنے آپ کو ایک چوڑے تنے کی آڑ میں پوشیدہ کر لیا۔

جیپ سے اُترنے والے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ دو لڑکوں کے ہاتھ میں گٹار دبے ہوئے تھے۔ باقی لڑکوں نے کچھ سامان اُٹھایا ہوا تھا۔ لڑکیاں چست لباس پہنے ہوئے تھیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ پکنک منانے آئے ہیں۔ راگنی نے اُن میں سے ایک لڑکے کو پہچان لیا۔ یہ راوت رائے کا بیٹا

یشونت رائے تھا، ایک بگڑے ہوئے باپ کا آوارہ منش بیٹا یشونت رائے جو یقینی طور پر اس وقت یہاں پکنک منانے آیا تھا۔ اس باغ کا ایک تقدس تھا۔ جب تک رسک لعل زندہ تھا اُس نے اپنے ہمراہی کو اطلاع کر دی تھی کہ کوئی بھی اس باغ میں پھاٹک کے اندر قدم نہ رکھنے پائے۔ اور آگے آئے تو باقاعدہ اجازت لے کر آئے۔ اور اس طرح آئے جیسے کسی عبادت گاہ میں داخل ہوا جاتا ہے۔ درختوں پر کوئی غیر ہاتھ نہ لگے۔ یہ ساری ہدایات رسک لعل نے یہاں دی ہوئی تھیں اور ان ہدایات کا احترام کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ آوارہ قسم کے لڑکے لڑکیاں یہاں ہنگامہ آرائی کرنے کے لئے آئے تھے۔ راگنی کے دل میں ایک تصور جاگنے لگا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ خوفناک لڑکیوں میں سے ایک، شیطان کی طرف سے سونپا گیا پہلا کھیل کھیلنے کے لئے تیار ہو گئی تھی اور یشونت رائے اس وقت سب سے بڑا شکار تھا۔ اس سے اچھا شکار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ کھانے پینے کی اشیاء، ناچ رنگ کا سامان، شراب کی بوتلیں، یہ ساری چیزیں اُن کے ساتھ تھیں۔ ایک بہت ہی خوبصورت خطے میں اُنہوں نے اپنا پڑاؤ جما لیا۔ وہ سب قہقہے لگا رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد شراب کی بوتلیں نکل گئیں اور وہ لوگ پینے پلانے میں مصروف ہو گئے۔ راگنی اپنی جگہ چھوڑتی جا رہی تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سارے کے سارے اُس کے مرے ہوئے باپ کا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ راگنی کی آنکھیں سرخ ہو گئیں تھیں اور وہ اُن کی حرکتوں کو دیکھ رہی تھی۔ شراب نے اپنا کام دکھایا تو ناچ رنگ کی محفل شروع ہو گئی۔ کھانے پینے کا سامان نکل گیا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ ناچ رنگ میں مصروف ہو گئے۔ یشونت رائے بھی اُن میں شامل تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یشونت رائے نے ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور دونوں تھرکتے ہوئے اُس جگہ سے ہٹ آئے۔ راگنی اپنی جگہ کھڑی خاموش نگاہوں سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ اُنہوں نے الگ تھلگ گوشے کی جانب رُخ کیا تھا۔

دفعتہً ہی راگنی کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور اُس نے اپنے ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے دل میں سوچا کہ اس وقت اُسے ناگن بن کر ان دونوں کو ڈسنا چاہئے۔ راوت رائے کا بیٹا یشونت رائے اس وقت اس کا شکار ہونا چاہئے۔ اور اس کے لئے راگنی کے ذہن نے ایک منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ لیکن اُسے اپنے پتلے ہوتے ہوئے بدن کا احساس نہ ہوا۔ اُسے تو تب تمام باتوں کا احساس ہوا جب اُس کے پیر دُم بن گئے اور ایک دُم سے اُسے نیچے بیٹھ جانا پڑا۔ اُس نے حیرت اور خوشی کے عالم میں اپنے آپ کو دیکھا، وہ ایک چمکدار سیاہ زہریلی ناگن بن چکی تھی...... راگنی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ کسی کو ایسی شکتی مل جائے تو وہ کیوں نہ خوش ہو۔ اشیش بھگونت نے اُنہیں کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ بہرحال راگنی کو اپنا کام یاد تھا۔ جب اشیش بھگونت نے اُسے یہ مہان شکتی دی ہے تو پھر بھلا اشیش بھگونت کی بات نہ ماننے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ البتہ ہر کام بڑی احتیاط کے ساتھ کرنا تھا۔ چنانچہ وہ تیار ہو گئی اور آہستہ آہستہ پتھروں کے درمیان رینگتی ہوئی اُس جانب بڑھ گئی جہاں یشونت رائے اپنی ساتھی لڑکی کے ساتھ بیٹھا رنگ رلیاں منا رہا تھا۔

زمیندار اور بگڑے ہوئے باپ کا بگڑا ہوا بیٹا اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ راگنی کے سامنے تھا۔ ایسے شخص کے لئے دل میں نفرت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ راگنی کو بھی اُس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آخر کار وہ

ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چھپ گئی جس کے پاس وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی سے اُسے کوئی غرض نہیں تھی۔ لیکن یشونت رائے کے لئے وہ اپنے ذہن میں پورا پورا منصوبہ رکھتی تھی۔ چنانچہ اُس نے بڑی احتیاط کے ساتھ یشونت رائے کی ران پر منہ مارا۔ اس وقت یشونت رائے ساتھی لڑکی سے اظہارِ عشق کر رہا تھا۔ اُس نے بے اختیار اپنے جسم پر پڑنے والے زخم کو دیکھا اور پھر زخم لگانے والے کو اور ایک دم اُس کے منہ سے دھاڑ نکلی۔ "سانپ......"

ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ راگنی کو یہ ظاہر کرنا تھا کہ یشونت رائے کو سانپ نے کاٹا ہے۔ چنانچہ وہ یشونت رائے کے اُوپر سے ہوتی ہوئی تیز رفتاری سے بڑے پتھر کے پیچھے پہنچ گئی اور پھر اُس نے ایک ایسی جگہ پناہ لے لی جہاں سے اُن سب پر نگاہ رکھی جائے۔ یہ ایک درخت تھا جس کے تنے میں سوراخ تھے اور ان سوراخوں میں سے ایک میں جا بیٹھی۔

اُدھر ایک دم یشونت رائے کی ساتھی لڑکی دہشت زدہ انداز میں چیخنے لگی تھی اور اُس کی چیخیں سن کر وہاں موجود سارے کے سارے افراد یشونت رائے کے پاس پہنچ گئے۔ یشونت رائے کا بدن نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اُس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی تھی اور اُس کی ساتھی لڑکی چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہی تھی کہ یشونت رائے کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے ناگن کو یشونت رائے پر سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ساری سیر و سیاحت خاک میں مل گئی۔ سب لوگ بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ قافلہ واپسی کے لئے چل پڑا۔ لیکن اُن میں سے کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ساتھ لائے ہوئے برتنوں میں سے ایک میں راگنی چھپ کر بیٹھ گئی ہے۔ یہ برتن گاڑیوں میں لدے ہوئے تھے اور گاڑیوں کے سفر کا اختتام راوت رائے کی شاندار حویلی پر ہوا تھا۔ ایک دم سے کہرام مچ گیا تھا۔ سب کے سب یشونت رائے میں مصروف ہو گئے تھے۔ چنانچہ راگنی کو آرام سے باہر نکلنے کا موقع مل گیا اور وہ تیز رفتاری سے رینگتی ہوئی ایک ایسی جگہ محفوظ سمجھ کر جا بیٹھی جہاں اُسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زہریلی ناگن انسان کا دماغ رکھتی تھی اور وہ بھی انتقام بھرا دماغ...... چنانچہ ہر کام سوچ سمجھ کر کر رہی تھی کہ کوئی غلطی اُسے نقصان نہ پہنچا دے۔ وہ ایسی جگہوں کو منتخب کر رہی تھی جہاں سے اُن لوگوں کی کارروائیوں کا بخوبی جائزہ لے سکے۔

راوت رائے شدتِ غم سے دیوانہ ہو گیا تھا اور چیختا پھر رہا تھا۔ "ہائے میرا بیٹا۔ بھگوان کی سوگند اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں جیتا نہیں رہوں گا۔"

لاکھن سنگھ بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ شہر سے، بستیوں سے، آبادیوں سے، جگہ جگہ سے ڈاکٹر، حکیم اور وید بلوا لئے گئے تھے اور سارے کے سارے یشونت رائے کا جائزہ لے رہے تھے۔ یشونت رائے کا رنگ نیلا ہو چکا تھا۔ لیکن یہ بات راگنی جانتی تھی کہ وہ مرے گا نہیں۔ شیطان نے راگنی کو یہ قوت دی تھی کہ وہ ایسا زہر اُس کے جسم میں داخل کرے جس کے اثرات تو پورے کے پورے ہوں لیکن اس سے موت نہ ہو۔ البتہ دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں یشونت رائے کی جو کیفیت تھی وہ ایسی تھی کہ چند ہی لمحوں میں اُس کی موت واقع ہو جائے۔ سارے کے سارے حکیم، وید اور ڈاکٹر یہی بتا رہے تھے راوت رائے کو، یشونت رائے کی حالت بہت خراب ہے۔ اور کوئی بھی لمحہ اس کی موت کا لمحہ بن سکتا ہے۔ بہنیں الگ رو رہی تھیں۔

دوسرے رشتہ دار بھی جو چچا تایا وغیرہ تھا، غم سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ یشونت اُن کے لئے بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل تھا۔ غرض یہ کہ ایک عجیب ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔

پوری رات، پورا دن اور پھر دوسرا دن بھی گزر گیا۔ یشونت رائے کی سانسیں تو چل رہی تھیں۔ لیکن اُس میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ ڈاکٹر، حکیم اور وید اپنی اپنی تمام کارروائیاں کر کے تھک چکے تھے۔ کچھ بزرگوں نے رائے دی تھی کہ کسی سپیرے کو بلایا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کام کا ثابت ہو۔ اور یہ وہ موقع تھا جب راگنی کو اپنا کام سرانجام دینا تھا۔ تیاریاں تو پہلے ہی تھیں۔ حویلی سے تھوڑے ہی فاصلے پر وہ ایک جوگن کے رُوپ میں نمودار ہوئی۔ اُس کے کندھے پر سانپ بند کرنے والا جھولا لٹکا ہوا تھا۔ ہاتھ میں بین تھی اور ایسی مست بین کہ دیکھنے والے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ فوراً ہی کچھ لوگ اُس کے پاس پہنچ گئے۔ اُن میں راوت رائے کا ایک بھائی بھی تھا۔ اُس نے راگنی کو روک کر کہا۔

"میری بات سنو گی دیوی جی، ہمارے ہاں کے ایک لڑکے کو ناگ نے کاٹ لیا ہے۔ کیا تم ناگ کا زہر اُتار سکتی ہو؟"

راگنی کا چہرہ ویسے ہی خوبصورت تھا اور اس وقت تو وہ شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی کہ دیکھنے والے پر ویسے ہی اثر پڑے۔ پھر وہ جانتی تھی کہ اُسے کس طرح ان لوگوں پر اپنے اثرات قائم کرنے ہیں۔ چنانچہ اُس نے مدھم لہجے میں کہا۔ "اشیش بھگونت نے مجھے یہی تو مان سونپا ہے۔ کہاں ہے وہ جسے ناگ نے کاٹا ہے؟"

"دیوی جی، چل کر دیکھ لو۔ اگر تم نے یشونت رائے کو ٹھیک کر دیا تو یوں سمجھ لو کہ تمہارا جیون بھی بن جائے گا۔"

راگنی نے نگاہیں اُٹھا کر راوت رائے کے بھائی کو دیکھا اور بولی۔ "تم سارے پاپی ایک جیسے ہوتے ہو۔ میرا جیون کیسے بناؤ گے؟ تم اپنے مریض کو ٹھیک نہیں کر سکتے اور میرا جیون فوراً بنانے پر تل گئے۔ تھو ہے تمہاری شکل پر۔"

"ارے نہیں نہیں دیوی جی، شما کر دیں، آپ برا مان گئیں۔"

"سنو...... میں تمہیں جو کچھ بتا رہی ہوں اسے غور سے سنو، میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ یہ بات تمہیں نہیں معلوم۔ خبردار مجھ سے لینے دینے کی بات نہ کرنا، ورنہ......"

"معاف کر دیجئے دیوی جی، معاف کر دیجئے۔" وہ لوگ اسے بڑے مان اور اہتمام سے اندر لائے۔

راوت رائے اب بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ راگنی نے خونی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ یہ اُس کے باپ کا قاتل تھا اور یقینی طور پر اس وقت اُس کی عقل اُس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ کیونکہ راگنی میں بہت ساری تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ اور اس کے باوجود راوت رائے کو کیا پڑی تھی کہ رسک لعل کی بیٹیوں کو غور سے دیکھتا۔ اُس نے تو بس اپنی شیطنت میں اپنا کام کر ڈالا تھا۔ راگنی کو دیکھ کر اُس نے کہا۔ "ارے یہ کسے پکڑ لائے؟ کون ہے یہ؟"

"مہاراج، یہ سپیرن ہے۔ اپنے یشونت رائے کا زہر اُتارے گی۔"

"پاگل ہو گئے ہو؟ ارے ملک بھر کے ڈاکٹروں اور ویدوں نے تو اپنا کام کر لیا۔"

راگنی نے نفرت بھری نگاہوں سے راوت رائے کو دیکھا اور پھر یشونت رائے کے قریب پہنچ گئی۔ اُس نے یشونت رائے کا جائزہ لیا اور اس کے بعد اُس کے زخم کے قریب بیٹھ گئی۔ دُودھ کا ایک پیالہ بھروا کر اُس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ پھر اُس نے یشونت رائے کی پنڈلی کے زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور دودھ بھرے پیالے میں یشونت رائے کا زہر چوس چوس کر تھوکنے لگی۔ دیکھنے والے غور کر رہے تھے۔ جیسے جیسے دودھ کا سفید رنگ نیلا پڑتا جا رہا تھا، یشونت رائے کے چہرے کی نیلاہٹ کم ہوتی جا رہی تھی۔ دودھ کا پیالہ نیلے رنگ سے بھر گیا اور یشونت رائے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اب خون کی روانی بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ راوت رائے آنکھیں پھاڑے ہوئے ادھر دیکھ رہا تھا۔ سارا زہر چوسنے کے بعد راگنی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُدھر یشونت رائے نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اُس کی کراہتی ہوئی آواز اُبھری۔ "میں کہاں ہوں؟" اور راوت رائے نے آگے بڑھ کر راگنی کے پاؤں پکڑ لئے۔

راگنی نے نفرت سے ٹھوکر ماری اور کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے تم کیا کہہ رہے تھے میرے بارے میں؟"

"دیوی جی، آپ مہان ہیں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ جو ہوا میری بیوقوفی کی وجہ سے ہوا۔"

"ٹھیک ہے...... میں چلتی ہوں۔"

"نہیں...... آپ نہیں جائیں گی دیوی جی، آپ یہیں رُکیے۔"

"تو پھر تم لوگ ایک نعرہ لگاؤ، میں رُک جاؤں گی یہاں۔"

"حکم کریں دیوی جی۔"

"کہو جے اشیش بھگونت۔"

وہ لوگ سمجھ تو کچھ بھی نہیں پائے تھے کہ اشیش بھگونت کون ہے؟ شیطان نے اپنا یہ نام صرف اُنہی لڑکیوں کو بتایا تھا۔ سب نے نعرہ لگایا اور راگنی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب ٹھیک ہے۔ بولو، کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"یہ ہمارا لڑکا بچ گیا تھا نا، بات کرو اس سے۔ پوچھو اندر سے کیسا ہے اب؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں پتا جی، مگر یہ سندر لڑکی کون ہے؟"

"یوں سمجھ لو کہ اس نے تمہاری جان بچائی ہے یشونت۔"

یشونت نے راگنی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ راگنی کا سحر کام کر رہا تھا۔ یشونت نے آہستہ سے کہا۔

"دیوی جی، آپ جائیے نہیں۔ آپ کو میری قسم ہے۔ تھوڑا سا انتظار کر لیجئے میرا۔"

اکلوتا بیٹا مرتے مرتے بچا تھا، حویلی میں خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ راگنی کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ حویلی کے ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ حویلی کی عورتیں رشک بھری نگاہوں سے راگنی کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک وہ تھیں جنہیں گھر کے جھگڑوں ہی سے فرصت نہیں تھی، کھانا پکانا، ہانڈی روٹی یا پھر اپنے آپ کو بنانا سنوارنا۔ ایک یہ جنگلوں میں پھرنے والی آوارہ ہرنی تھی جسے بڑے بڑے ایک انوکھا نام دے رہے تھے اور ویسے بھی راگنی نے جو رُوپ اختیار کیا تھا وہ ایسا تھا کہ دیکھنے والا اُسے ایک نگاہ دیکھ کر دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ جائے۔ بہرحال سارے کا سارا منصوبہ بڑی کامیابی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راگنی

کوعزت اوراحترام کا وہ مقام دیا گیا کہ اچھے اچھوں کو نہ ملے۔ راوت رائے تو اُسے دیوی مان رہا تھا۔

اُدھر یشونت رائے کے ذہن پر اُس کا تصور نقش ہو گیا تھا۔ آوارہ مزاج نوجوان تھا، ٹھیک ہونے کے بعد وہی تمام تصور اُس کے ذہن میں جاگ گیا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔ ''وہ لڑکی کہاں گئی لاکھن سنگھ، جس نے مجھے نیا جیون دیا ہے؟''

''مہاراج، آپ کو نیا جیون دینے والی کو نظر انداز کیسے کیا جا سکتا ہے؟ وہ یہیں ہے۔''

''دوبارہ کبھی میرے سامنے نہیں آئی۔''

''دیویاں آسانی سے کیا کسی کو درشن دیتی ہیں؟''

''لیکن داس تو دیوی کے درشن کر سکتے ہیں نا۔''

''کیوں نہیں؟ اور پھر دیوی بھی ایسی جسے دیکھ کر من کے سارے دروازے کھل جائیں۔''

''میں اُن کے درشن کو جاؤں گا۔'' اور پھر یشونت رائے کو بھلا کون روک سکتا تھا؟ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کمرے میں داخل ہو گیا جہاں راگنی موجود تھی۔ ہوش و حواس کے عالم میں یشونت رائے نے ایک بار پھر اُسے دیکھا اور اُس کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر جھکتے ہوئے کہا۔ ''جے دیوی جی کی۔''

''تم لوگ مجھے کیوں گناہ گار کر رہے ہو؟ میں کوئی دیوی نہیں ہوں۔ میں تو ایک غریب سپیرن ہوں جس کا اس سنسار میں کوئی بھی نہیں ہے۔ در بدر بھٹک رہی ہوں۔ یہاں آئی ہوں، یہاں سے کہیں آگے نکل جاؤں گی۔ میں تو کہتی ہوں کہ بس اب مجھے جانے دو۔ میری وجہ سے تم لوگوں کو کوئی فائدہ ہو گیا میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہے۔''

''جو کسی کو نیا جیون دیتے ہیں دیوی جی، اُنہیں اس طرح تو نہیں جانے دیا جاتا۔''

''دیکھو، میں نحوست کا نشان ہوں۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھے اپنے گھر سے نکال دو۔''

''ایسی نحوست جو کسی مرتے ہوئے کو نیا جیون دے، بھگوان سب کے گھروں میں پہنچائے۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں دیوی جی؟''

اسی وقت راوت رائے بھی اندر گھس آیا۔ ''میں نے آپ کی باتیں سن لی ہیں دیوی جی، مہان دیوی، اگر آپ کا اس سنسار میں کوئی نہیں ہے تو ہم تو ہیں۔ میرے بیٹے کو نیا جیون دے کر آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔ کاش میں آپ کو اس کا بدلہ دے سکوں۔''

''پتا جی، یہ یہاں سے جانے کے لئے کہہ رہی تھیں۔''

''تو اور کیا کروں؟ کون ہے میرا یہاں؟ میں تو بس سنسار میں جیون کے دن پورے کر رہی ہوں۔'' راگنی نے دُکھ بھری آواز میں کہا۔

''ہمیں اپنا دُکھ نہیں بتاؤ گی دیوی؟''

''خانہ بدوش سپیروں کی ایک آبادی میں پیدا ہوئی۔ ماں جنم دیتے ہوئے مر گئی۔ پتا کچھ عرصے کے بعد سنسار سے سدھار گئے۔ دوسروں کے رحم و کرم پر پلی بڑھی۔ ایک بار قبیلہ بارش میں گھر گیا۔ آدھے

سے زیادہ لوگ سیلاب میں مر گئے۔ جو بچے وہ بیمار ہو کر اِدھر اُدھر جا پڑے۔ مجھے بھی ایک ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ سولہ مہینے اُس ہسپتال میں رہی، پھر وہاں سے نکال دی گئی۔ نہ قبیلہ تھا اور نہ کچھ اور۔ اور سنسار میں کہیں جگہ نہیں ملی۔ سانپوں سے دوستی بچپن سے رہی تھی۔ یہ بینگی بنائی اور بس سنسار دیکھنے چل نکلی۔ آپ کا بیٹا میری وجہ سے جی گیا، یہ اشیش بھگونت کی کرپا ہے۔''

''یہ اشیش بھگونت کون ہیں؟''

''میرے مہاراج...... میرے دھرماتما...... میرے پرماتما۔'' راگنی نے جواب دیا۔

''خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ کیا نام ہے بیٹی تمہارا؟'' راوت رائے نے پوچھا۔

''راگنی۔''

''اسی لئے سُروں سے بھری ہوئی ہو۔'' یشونت رائے مسکرا کر بولا۔

''اب مجھے جانے دو یہاں سے۔''

''نہیں راگنی، تم جو کوئی بھی ہو، تمہارا ماضی جو کچھ بھی رہا ہے، سب کچھ بھول جاؤ۔ میرے پاس رہو میری بیٹی بن کر میری اور بھی بہت سی بیٹیاں ہیں، تم بھی اُنہی میں رہو گی۔ خبردار یہاں سے جانے کی بات نہ کرنا۔''

''آپ سوچ لیں مہاراج،'' راگنی نے کہا۔

''یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر ہی کر رہا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی۔'' راگنی بولی۔ اور اس کے بعد وہ آنسو بہانے لگی۔ باپ بیٹا دیر تک اُسے تسلیاں دیتے رہے اور اس کے بعد وہ دونوں چلے گئے۔ لیکن یشونت رائے تھوڑی دیر بعد ہی آ موجود ہوا۔ اندر داخل ہو کر اُس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''پتا جی تو بس سٹھیا گئے ہیں۔ ایسے اندر گھسے کہ باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ جبکہ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔''

راگنی نے نگاہیں اُٹھا کر یشونت کو دیکھا، یشونت کی نگاہوں میں گناہ ناچ رہا تھا۔ راگنی مسکرانے لگی۔ پھر بولی۔ ''مہاراج، راوت رائے تو بہت اچھے ہیں۔ تم اُنہیں میرے سامنے برا مت کہنا ورنہ میں اُن سے کہہ دُوں گی۔''

''ارے ارے...... برا کون کہہ رہا ہے اُنہیں؟ پر دیکھو نا، میں اکیلے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا اور وہ مجھے اس کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔''

''اکیلے میں کیا باتیں کرنا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''راگنی، میرے من میں تمہارے لئے ایک جگہ پیدا ہو گئی ہے۔''

''نہیں...... میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ میں نحوست کا نشان ہوں۔''

''میں اس نحوست کو اپنے جیون میں شامل کر لینا چاہتا ہوں۔''

''مطلب......؟''

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں راگنی۔"

راگنی کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے بعد اُس نے کہا۔ "سنو، یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس پر غور بھی کر لیا ہے؟"

"میں راوت رائے کا اکیلا بیٹا ہوں۔ ہماری اتنی بڑی جائیدادیں ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ سب میری ملکیت ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... مگر مہاراج راوت رائے تیار ہو جائیں گے اس بات پر؟"

"کہا نا، یہ میرا کام ہے۔"

"تو بات کر لو، لیکن سنو، اس کے بغیر میرے پاس کبھی مت آنا۔"

"میں بس دیکھنے کے لئے آیا کروں گا تمہیں۔ باقی کام میری ذمہ داری ہے۔ میں خود کر لوں گا۔"

یشونت رائے چلا گیا تو راگنی کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔ شکار اپنے جال میں پھنس گیا تھا۔ راگنی یہی تو چاہتی تھی۔ اور اشیش بھگونت نے اُسے جو ہدایات دی تھیں وہ اس سے مختلف تو نہیں تھیں۔ وہاں سے اُسے ہدایات ملی تھیں کہ راوت رائے کے پریوار میں داخل ہو کر اُس کے سارے خاندان کو ختم کرنا ہے۔ اور اب راگنی ان لوگوں کو اپنا دوسرا رُوپ دکھانے والی تھی اور اس کے لئے اُس کے پاس پورا پروگرام موجود تھا۔ راوت رائے کے خاندان پر واقعی نحوست کا نشان چھا گیا تھا اور اب موت اس کے اور اس کے گھر والوں کے نزدیک چکرا رہی تھی۔ راوت رائے نہیں جانتا تھا کہ وہ کس خوفناک بلا کو اپنے گھر لے آیا ہے۔ یہ بلا اب اُس کی شہ رگ کے قریب ہے اور ان لوگوں کا خون چوسنے کے لئے بے قرار ہے......!

❁❁❁

اشیش بھگونت نے راگنی کو ایک ذمہ داری دے دی تھی۔ باقی تمام خوفناک لڑکیاں اشیش بھگونت کے زیر اثر آ کر عیش کی زندگی گزار رہی تھیں۔ ابھی تک اُن میں سے کسی کو کوئی اور کام نہیں سونپا گیا تھا۔ لیکن اب اُن کے انداز بالکل بدل گئے تھے۔ جس جگہ اشیش بھگونت نے اُنہیں رکھا تھا وہ بڑی شاندار تھی، بالکل محل جیسی اور وہاں وہ لوگ بڑے عیش و آرام سے رہ رہی تھیں۔ نوکر چاکر، عیش و عشرت کی زندگی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ رسک لعل کے بارے میں جب بھی اُنہیں خیال آتا، اُن کا دل خون کے آنسو رونے لگتا تھا۔ لیکن اب جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا تھا۔ اُنہیں ایک بڑا سہارا مل گیا تھا۔ جس زندگی کا اُنہوں نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا وہ اُنہیں حاصل ہو گئی تھی۔ صبح عیش کے ساتھ اُٹھتیں۔ گھر کے کام کاج کے لئے نوکر چاکر موجود تھے۔ اُنہیں عمدہ قسم کا ناشتہ بنا کر دیا جاتا تھا اور وہ سب کچھ اُنہیں حاصل ہو جاتا تھا جو اُن کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا

پھر ایک دن یوں ہوا کہ روپا کچھ خریداری کے لئے بازار گئی تھی۔ ایک خوبصورت سے جنرل سٹور میں روپا نے اپنے لئے اور اپنی باقی بہنوں کے لئے بہت سے لباس خریدے اور جنرل سٹور کے دوسرے گوشوں میں جا کر اپنی پسند کی چیزیں دیکھنے لگی۔ ابھی وہ ان چیزوں کا انتخاب کر ہی رہی تھی کہ ایک انتہائی خوبصورت نوجوان اُس کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ اُس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ روپا کو ایک عجیب سی خوشبو محسوس ہوئی تو اُس نے پلٹ کر اُسے دیکھا اور پھر نوجوان کے حسین چہرے کو دیکھتی رہ گئی۔

"ہیلو......" نوجوان نے روپا کو مخاطب کر کے مسکراتے ہوئے کہا تو روپا کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ پھر وہ جلدی سے بولی۔

"کون ہو تم؟ میں تو تمہیں نہیں جانتی۔"

"میں اس سٹور کا جنرل منیجر ہوں میڈم، آپ ہماری بہت اچھی گاہک ہیں۔ نجانے کیوں میرا دل آپ کی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ معاف کیجئے گا، اگر مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

روپا کو اُس کے بولنے کا انداز بہت پسند آیا۔ وہ کہنے لگی۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تو آپ ہیں اس سٹور کے جنرل منیجر۔"

"ہاں...... آپ اپنی پسند کی چیزیں منتخب کیجئے۔ کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟"

"ہاں...... کیوں نہیں؟" روپا کو بہت سی سمجھ خود بخود آ گئی تھی۔ جب تک وہ اپنے باپ کے ساتھ رہنے والی معصوم لڑکیاں تھیں، اُنہیں کچھ نہیں آتا تھا۔ دنیا کو بہت کم دیکھا تھا اور دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھیں۔ لیکن جب سے شیطان کی قربت حاصل ہوئی تھی، اُنہیں خود بخود بہت سارے کام آ

گئے تھے۔ بہرحال وہ خریداری کرتی رہی۔ اور جب ان تمام چیزوں کی ادائیگی کا وقت آیا تو منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بے شک آپ ہماری گاہک ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ پہلی بار یہاں خریداری کے لئے آئی ہیں یا اکثر آتی رہتی ہیں۔ لیکن آج کی یہ خریداری میری طرف سے رہی۔"

"میں سمجھی نہیں؟" روپا تعجب سے بولی۔

"یہ میری طرف سے آپ کو تحفے کے طور پر۔"

"ارے نہیں نہیں...... میں کوئی غریب لڑکی نہیں ہوں۔ میرے پاس بہت کچھ ہے۔"

"یقیناً آپ غریب نہیں ہیں۔ شکل وصورت سے بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور میری دُعا ہے کہ آپ کو اس سے آٹھ گنا زیادہ مل جائے۔ لیکن اسے ایک غریب کا تحفہ سمجھ کر ہی قبول کر لیجئے۔"

"آپ نے شرمندہ کر دیا ہے مجھے۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"ہری لعل۔"

"مسٹر ہری لعل، میرا نام روپا ہے۔ بہرحال میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ اور صرف آپ کی خوشی پوری کرنے کے لئے میں نے یہ چیزیں قبول کر لی ہیں۔ مگر آپ یہ بتائیے کہ اس کے بدلے میں آپ کو کیا دُوں؟"

"انسان بہت خود غرض ہوتا ہے مس روپا، بے مقصد کبھی کسی سے تعلق قائم نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی بہرحال میں آپ سے ایک چیز مانگتا ہوں۔"

"جی......" روپا نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

"دوبارہ بھی اس سٹور پر آیئے گا۔ اور یہ بتایئے کب آئیں گی؟"

روپا مسکرادی۔ پھر بولی۔ "لیکن کچھ خریدوں گی نہیں۔ آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"بالکل نہیں......"

"تو پھر کل میں دوبارہ آؤں گی۔" روپا کو یہ نوجوان پسند آیا تھا۔

دوسرے دن وہ پھر سٹور پر پہنچ گئی۔ وہ اُس کا منتظر تھا۔ اُس نے کہا۔ "آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں گی۔ آپ پر کوئی پابندی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ چھوٹی بہنوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ ماتا پتا اس سنسار میں نہیں رہے۔ بس چھوٹی بہنوں کے ساتھ رہتی ہوں۔"

"چلئے، پھر یہ طے رہی کہ آپ مجھ سے ملاقات کرتی رہیں گی۔"

روپا نے زندگی میں پہلی بار ایک پُرتکلف ہوٹل دیکھا تھا۔ ہری لعل اُس کے ساتھ تھا۔ روپا کو ہری لعل پسند آیا تھا۔ پھر دوسرے، تیسرے، چوتھے دن بھی اُس کی ملاقات ہوئی۔ روپا نے ہری لعل سے اُس کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔ "بس میں بھی اس سنسار میں اکیلا ہوں۔ کوئی نہیں ہے میرا۔ اور یوں سمجھ لیجئے کہ اکیلا رہتا ہوں۔ اکیلا ہی جیون گزار رہا ہوں۔"

"کہاں رہتے ہیں آپ؟"

"ایک بہت ہی چھوٹا فلیٹ ہے میرا۔ اگر آپ کل میرے فلیٹ پر چلیں تو مجھے بے پناہ خوشی ہو گی۔"

روپا نے وعدہ کر لیا۔ لیکن دوسرے دن دوپہر کو اس وقت جب وہ آرام کرنے کے لئے لیٹی تھی، اچانک ہی اُسے اپنے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا تو اشیش بھگونت موجود تھا۔ روپا تعظیم کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی تو اشیش بھگونت نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سنو، تم لوگوں کے بارے میں سب کچھ جاننا میری ذمہ داری ہے۔ میں ہوشیار رہتا ہوں کہ کہیں کوئی تمہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ وہ لڑکا جو تمہیں ملا ہے بڑا نیک ہے۔ سنسار میں نیکیوں کے کام کرتا رہتا ہے۔ میں اُس کی نیکیوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ کل تم اُس کے ساتھ اُس کے فلیٹ پر جاؤ گی اور اس کے بعد اُس سے زندگی چھیننا تمہارا کام ہے۔ یہ لو خنجر۔ اپنے لباس میں چھپا کر رکھو، تمہارے ساتھ بیٹھے گا، ہنسے بولے گا، تھوڑا سے اُس کے ساتھ بتانا۔ اور اس کے بعد یہ خنجر نکال کر سینے میں گھونپ دینا۔ کیا سمجھیں؟"

روپا ششدر رہ گئی تھی۔ شیطان تو یہ کہہ کر غائب ہو گیا لیکن وہ سر پکڑ کر بیٹھی رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ غور کرتی رہی اور اس کے بعد اُس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ شیطان کی قربت باقی سارے کاموں سے اچھی ہے۔ سنسار کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ اگر نیکیاں کرنا چاہو تو یک طرفہ کرتے رہو، جواب میں کچھ نہیں ملے گا۔ وہ کرو جو دنیا چاہتی ہے۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناؤ۔ بہرحال یہ ساری باتیں سوچ کر اُس نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ اُس نے کہا ہے وہی کرے گی۔ خنجر اُس نے احتیاط سے اپنے پاس چھپا لیا۔

پھر دوسرے دن شام کو اس وقت جب سٹور بند ہوا تو وہ ہری لعل کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اُس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ ہری لعل نے پُرمسرت انداز میں اُس کا استقبال کیا، پھر وہ اُسے اپنی چھوٹی سی خوبصورت کار میں لے کر اپنے فلیٹ کی جانب لے چلا۔ ہری لعل نے اُسے چھوٹا سا فلیٹ کہا تھا لیکن وہ انتہائی خوبصورت تھا۔ روپا نے اس فلیٹ کی تعریف کی تو ہری لعل بولا۔ "بس یہ سنسان اور تنہا گھر ہے۔ اس گھر کو ایک مالکن کی ضرورت ہے۔ اگر تم اسے قبول کرو روپا، تو میرے اوپر احسان ہو گا۔"

"مگر تمہاری زندگی...... میرا مطلب ہے کہ تم نے اب تک جیون کیسے گزارا؟" روپا نے سوال کیا اور ہری لعل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بس یوں سمجھ لو، ماتا پتا بچپن میں ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ دنیا کی ٹھوکروں میں پلا بڑھا۔ دنیا کی ٹھوکروں میں ہی جوان ہوا۔ پھر تقدیر آہستہ آہستہ ساتھ دیتی گئی۔ میں نے ہمیشہ نیک کام کئے، کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور تقدیر نے میرا ساتھ دیا اور آخرکار یہاں تک پہنچ گیا۔"

"کیا تمہیں تمہاری نیکیوں کا پھل ملا؟"

"میں نہیں جانتا کہ نیکیوں کا پھل کیسا ہوتا ہے۔ بس جو کچھ بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔"

"سنسار بدل گیا ہے، انسان بدل گئے ہیں۔ نیکیوں کا پھل جیسا ملتا ہے میں تمہیں بتاؤں؟"

"ہاں کیوں نہیں؟" ہری لعل نے جواب دیا۔ وہ روپا کے بالکل قریب تھا اور اُس کی سانسیں روپا کی

سانسوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ دفعتہً ہی روپا نے اپنا ہاتھ نیچے کیا اور آستین میں چھپے خنجر کا دستہ اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔ ہری لعل کو کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ وہ تو اُس وقت چونکا جب خنجر کا پھل، نیکیوں کا پھل ثابت ہوا اور اُس کی پسلیوں کے درمیان اُتر گیا...... روپا نے لمبا چوڑا خنجر دستے تک ہری لعل کے سینے میں اُتار دیا تھا اور ایک دم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ وہ ہری لعل کے چہرے پر موت کا تاثر دیکھنا چاہتی تھی۔ اشیش بھگونت کا یہی حکم تھا۔ لیکن پھر اُس کے چہرے پر حیرت کے نقوش پھیل گئے۔ ہری لعل نے اچانک ہی خنجر اپنے سینے سے نکال کر ایک طرف ڈال دیا اور رفتہ رفتہ اُس کا چہرہ بدلنے لگا۔ اب روپا کے حیران ہونے کی باری تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ ہری لعل کو دیکھتی رہی جس کے جسم سے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکا تھا۔ پھر وہ اچانک چونک پڑی۔ ہری لعل کے چہرے میں تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جب اُس کے چہرے کے تمام نقوش بدل گئے تو دفعتہً ہی روپا کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ اُس کے سامنے اشیش بھگونت موجود تھا......!

روپا شدتِ حیرت سے منہ کھول کر رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اشیش بھگونت کو دیکھ رہی تھی اور اشیش بھگونت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔ تب روپا کے منہ سے نکلا۔ ”جے بھگونتا، جے روپ متی کی۔ یہ...... یہ کیا ہے بھگوان؟“

”ہاں...... ایک طرح سے اسے اپنا امتحان بھی سمجھ لو روپا، تم اس امتحان میں پوری طرح کامیاب ہوئی ہو۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اپنے من کے گھاؤ کے لئے تم اپنے اشیش بھگونت کو بھول سکتی ہو یا نہیں؟ اب مجھے تم پر اعتماد ہے۔ یہ میں ہی تھا جو تمہیں سٹور کے منیجر کی حیثیت سے ملا تھا۔ دیکھو، سنسار بڑا کٹھور ہے۔ یہاں تمہیں ایک سے ایک برا انسان ملے گا۔ پہلے ان انسانوں کو بہکانے میں مجھے بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ اپنے کام کا آغاز تو میں نے نجانے کب سے کیا ہوا ہے۔ ایک لمبے عرصے تک میں اپنی کوششوں میں اتنا ناکام اور پریشان رہا کہ تمہیں بتا نہیں سکتا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ گھوڑے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ جو لوگ میرے مرید بن چکے تھے وہ خود اتنے برے ہو گئے تھے کہ مجھے اُنہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ وہ برائیوں میں خود کفیل ہو گئے اور وہ سب کچھ کرنے لگے جو میں چاہتا تھا۔ کیا سمجھیں؟ اس سنسار میں بڑے بڑے قصے کہانیاں بکھرے پڑے ہیں۔ میں تمہیں نیکیاں کرنے والوں کا برا حال دکھانا چاہتا تھا۔ سمجھ لو جو لوگ بیوقوفی کرتے ہیں وہ اب بھی نقصان میں ہیں۔ سنسار کی کہانیوں میں سے کچھ کہانیاں تمہارے علم میں آنی چاہئیں۔“

”ایک سوال کر سکتی ہوں بھگونتا؟“

”ہزار سوال کرو، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”راگنی کہاں ہے؟“

”دیکھو، کبھی کبھی میں بھی کچھ نیکیاں کرنے پر تل جاتا ہوں۔ اب تم اسے کچھ بھی سمجھ لو، یہ کام میں اپنے چیلوں چانٹوں کے لئے ہی کرتا ہوں۔ راوت رائے نے تمہارے پتا جی کے ساتھ جو کچھ کیا، راگنی اس کا انتقام لینے کے لئے اس وقت راوت رائے کی حویلی میں موجود ہے۔ جیسا کہ میں نے تم سے کہا،

ڈوبتے چاند کی رات تم سب اس کھنڈر میں جمع ہو کر ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرو گی۔ چنانچہ اُس کی چنتا تمہیں نہیں کرنی چاہئے۔ تو میں جو تمہیں بتا رہا تھا، وہ یہ ہے کہ ایک جگہ ہے شام گڑھ۔ تم شام گڑھ چلی جاؤ، پہلا کام تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ ابھی میں نے صرف راگنی کو کام پر لگایا ہے اور وہ بھی اپنے کام پر۔ یعنی کہ وہ اپنے پتا کی موت کا انتقام لے۔ کھیل لمبا ہے اُس کا۔ تم یہ چھوٹا کھیل کھیلو اور تماشہ دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ شام گڑھ میں ایک جگہ ہے ہوا محل۔ ہوا محل اس وقت ایک آدمی نے خریدا ہے اور وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

”میرا......؟“

”ہاں...... اُس نے ایک اشتہار دیا تھا اپنی اسسٹنٹ کے لئے۔ اور ساری باتیں طے ہو چکی ہیں۔ وہ تمہیں مس کرن کہہ کر پکارے گا۔ کرن کماری سمجھ لو۔ سمجھ لو، ہوا محل ایک آسیب زدہ حویلی ہے۔ وہاں تمہیں جو واقعات پیش آئیں گے وہ سمجھ لو تمہارے لئے میرا اوردان ہیں۔ ریل میں بیٹھ کر جاؤ گی۔ شام گڑھ اُترو گی، وہاں سے تانگے والے سے ہوا محل جانے کے لئے کہہ دینا، وہ تمہیں پہنچا دے گا اور بس۔“ روپا عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اشیش بھگونت نے کہا۔ ”اور اب تم جاؤ۔ اگر دوبارہ اس فلیٹ کو تلاش کرنے کی کوشش کرو گی تو یہ یہاں نہیں ہو گا۔ اور اگر ہو گا تو یہاں کوئی اور خاندان رہ رہا ہو گا۔ اور اگر اُس سٹور میں جاؤ گی تو وہاں تمہیں ہری لعل نام کا کوئی منیجر نہیں ملے گا۔ تلاش بھی مت کرنا ایسی کسی چیز کو۔ میرے کام اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ چلو آؤ، باہر چلیں۔“

روپا عجیب سے انداز میں لڑکھڑاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ فلیٹ سے نیچے اُترتے ہی شیطان تو غائب ہو گیا لیکن روپا لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے آنے والے وقت کے بارے میں سوچتی ہوئی اپنے گھر کی جانب چلنے لگی۔ شیطان تو صدیوں سے اپنا یہ کھیل کھیلتا چلا آ رہا ہے۔ بس کوئی کمزور اُس کے جال میں پھنسا تو سمجھ لو زندگی سے گیا۔ پانچ خوفناک لڑکیاں پانچ ہزار داستانوں کو جنم دینے کے لئے شیطان کی شاگردی اختیار کر چکی تھیں اور رفتہ رفتہ شیطان اُنہیں اپنے تخریبی عمل کے لئے میدان میں لا رہا تھا۔ چنانچہ راگنی کے بعد اب روپا، ہوا محل جانے کے لئے تیاریاں کر رہی تھی۔ اور ہوا محل درحقیقت ایک دردناک لیکن سنسنی خیز داستان کا امین تھا...... وہ داستان جس میں درد، آنسو، آہیں اور اس کے بعد زندگی کے بھیانک ترین واقعات چھپے ہوئے تھے......!

ہوا محل کا مالک جاگیردار چندر بھان تھا۔ اور چندر بھان کی جاگیر بہت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں اُس کی سرحدوں کا خاتمہ ہوتا تھا وہاں سے ایک اور بڑے جاگیردار ویر سنگھ کی زمینیں شروع ہوتی تھیں۔ اور زر، زن اور زمین تو جھگڑے کی بنیاد ہمیشہ سے رہے۔ چنانچہ چندر بھان اور ویر سنگھ کے درمیان شدید ترین دشمنی چل رہی تھی۔ یہ دشمنی بہت ہی سنگین نوعیت کی تھی اور بیشتر بار اُن دونوں کے درمیان خونریز جھگڑے ہو چکے تھے جن میں دونوں طرف کے بے شمار آدمی مارے گئے تھے۔ لیکن پھر ایک دردناک کہانی نے جنم لیا۔ چندر بھان کی بیٹی سروجہ دیوالی کے دن سیر کو نکلی تو اُس کا گھوڑا بھڑک گیا اور وہ ویر سنگھ کی سرحدوں میں جا پہنچی جہاں ویر سنگھ کا بیٹا سورج سنگھ اُسے دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

سورج سنگھ نے سروجہ کے بھڑکتے ہوئے گھوڑے کو سنبھالا اور دونوں ایک دوسرے کے شیدائی ہو گئے۔ لیکن یہ معلوم کر کے کہ سورج، ویر سنگھ کا بیٹا ہے، سروجہ کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اُس نے غمناک نگاہوں سے سورج سنگھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور تم جانتے ہو میں کس کی بیٹی ہوں؟''

''جاننا چاہتا ہوں۔''

''چندر بھان ہے میرے پتا کا نام۔''

سورج مسکرا دیا، پھر بولا۔ ''یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں اپنے پتاؤں کی اس دشمنی کو ختم کرنے کا باعث بن جائیں۔''

''یہ دشمنی اتنی معمولی نہیں ہے کہ ختم ہو جائے۔ ہمیں خود ختم ہونا پڑے گا۔''

''تو خود ختم ہو جائیں گے۔'' سورج سنگھ نے دلیری اور بے خوفی سے کہا۔

''بھگوان نہ کرے۔ میں تو کہتی ہوں کہ بھگوان میری عمر بھی تمہیں لگا دے۔'' سروجہ نے محبت بھرے انداز میں کہا۔ اب یہ بتاؤ، ہمارے ملنے کی کیا ترکیب ہو؟ وہ تو میرا گھوڑا بھڑک کر سرحدوں کے پار آ گیا ہے ورنہ سرحدوں تک تو کوئی پہنچ نہیں سکتا۔''

''میں تم سے تمہاری حویلی میں آ کر ملوں گا۔'' سورج سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پاگل ہوئے ہو؟ اگر کسی کو شبہ بھی ہو گیا تو وہ سب تمہارے جیون کے دشمن ہو جائیں گے۔ بھگوان نہ کرے تمہیں ہماری حویلی میں کوئی نقصان پہنچے۔'' سروجہ محبت سے بولی۔

''اسے تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''نہیں، کوئی اور ترکیب سوچنا پڑے گی۔''

پھر دونوں جدا ہو گئے۔ سروجہ، سورج سنگھ کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی میں اُسے سورج سنگھ بہت یاد آ رہا تھا اور وہ مسلسل اُس کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ ''ہائے رام، کوئی ایسی ترکیب ہو جائے کہ سورج اس سمے میرے پاس آ جائے۔''

کاش تم بھگوان سے کہتیں کہ ہے بھگوان، سورج سارے جیون کے لئے میرا ہو جائے تو یقیناً اس سمے تمہاری یہ بات بھگوان مان لیتا۔'' یہ آواز سورج سنگھ کی تھی۔

سروجہ شدت حیرت سے دیوانی ہو گئی۔ سورج اُس کے سرہانے موجود تھا۔ سروجہ اُس سے لپٹ گئی۔ ''تم یہاں...... تم یہاں کیسے آ گئے؟'' اُس نے کہا اور سورج کی ہیئت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ''اور تم نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟ اس سے پہلے صرف سنا تھا کہ پریم کرنے والے اسی طرح ایک دوسرے کے لئے پاگل ہو جاتے ہیں اور ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ اب دیکھ بھی لیا...... مگر تم......؟''

''ہاں...... ضروری تھا۔ میں یہ بھیس بدل کر تمہاری حویلی کے ملازم کی حیثیت سے ہی اندر آ سکتا تھا۔''

''بھگوان تمہیں محفوظ رکھے۔'' سروجہ نے کہا۔ اور اس کے بعد وہ دونوں اسی طرح راتوں کو ملتے رہے۔ سورج سنگھ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک معمولی ملازم کا بھیس بدل کر حویلی میں آتا اور ساری

رات دونوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک رات جب سورج، قلعے میں داخل ہوا اور سروجہ کے پاس پہنچا تو کچھ لوگوں نے اُسے دیکھ لیا اور چاروں طرف سے گھیر کر اُسے پکڑ لیا۔ پھر جب سورج کو چندر بھان کے سامنے پیش کیا گیا تو چندر بھان اُسے دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ویر سنگھ کا بیٹا ہے۔ دونوں اس قدر دشمن تھے ایک دوسرے کے کہ چندر بھان نے ذرا بھی رحم نہیں کیا اور سورج کو قلعے کے مشرقی حصے میں قید کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد اُسے شدید اذیتیں دی جانے لگیں۔ لوہے کی سلاخیں گرم کر کے اُس کا جسم جگہ جگہ سے داغ دیا گیا۔ پھر اُس کی آنکھیں نکالی گئیں اور اس کے بعد اُسے سروجہ کے سامنے لایا گیا۔ سروجہ نے یہاں ایک عجیب و غریب کردار کا مظاہرہ کیا۔ چندر بھان نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ اس لڑکے کو جانتی ہے؟ کیا وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے؟ تو سروجہ نے باپ کے خوف سے جھوٹ بولتے ہوئے سورج سنگھ پر الزامات لگائے اور کہا کہ وہ زبردستی اُس کی خوابگاہ میں داخل ہو جاتا تھا اور اُسے پریشان کرتا تھا۔ وہ خود سوچ رہی تھی کہ کسی وقت مہاراج چندر بھان سے شکایت لگائے اور کہے کہ ان کے پہرے دار کیا کرتے ہیں۔ چندر بھان آگ بگولا ہو گیا۔ لیکن سورج کو سب سے زیادہ غم اور نقصان اسی وقت ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ اور اب وہ کسی کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک رات اُسے آتش دان کے اُوپر لٹکا کر آگ میں جلا دیا گیا۔ اس کے نیچے آگ روشن ہو گئی اور اُس کے سارے بال اور چہرہ جلنے لگا تو اُس نے چیختے ہوئے کہا۔

''سروجہ، تو نے مجھ سے اظہارِ محبت کیا تھا۔ تو نے کہا تھا کہ تو میرے لئے سارا جیون مار دے گی۔ لیکن تو نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے تو یہ سمجھ لے کہ میں تیرے اس خاندان سے انتقام ضرور لوں گا۔ اور اس وقت تک میری آتما شانت نہیں ہو گی جب تک اس خاندان کا ایک بھی فرد اس زمین پر زندہ ہے۔ تو نے سمجھ لیا سروجہ، تو نے سمجھ لیا۔ میں تجھے اور تیرے خاندان کو نہیں چھوڑوں گا۔''

یہ داستان سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔ اور ہوا محل کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ آسیب زدہ محل ہے۔ اور اس آسیب زدہ محل کو ایک بیوقوف امیر زادے نے خریدا تھا۔ لیکن قصور اُس کا بھی نہیں تھا۔ وہ یورپ سے آیا تھا بے پناہ دولت لے کر اور یورپ کی عقل لے کر۔ اُس نے یہاں آ کر جو کھیل کھیلا تھا وہ بڑا عجیب تھا۔ اور بہرحال اس کے بارے میں ساری تفصیلات تو رویا کو وہاں جانے کے بعد ہی معلوم ہو سکی تھیں۔ اشیش بھگونت نے اُسے تمام رموز سے آگاہ کر کے اپنے کسی خاص مقصد کے تحت شام گڑھ روانہ کیا تھا۔ ریل کا سفر شام گڑھ پر ختم ہو گیا۔ اور جب وہ اپنا مختصر سامان لے کر نیچے اُتری تو ایک لمبے قامت کے دُبلے پتلے چہرے والے شخص نے جس کا بدن چہرے سے بالکل مختلف معلوم ہوتا تھا، آگے بڑھ کر استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ''مس کرن، میرن نام پورن لعل ہے۔ اور شام گڑھ میں، میں ہی آپ کا میزبان ہوں۔ آپ آیئے، براہِ کرم میرے ساتھ چلئے۔'' پورن لعل کی آنکھوں میں اس طرح کی روشنی چمک رہی تھی جیسے اُس نے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر مستقبل کے بارے میں بہت سارے منصوبے بنا لئے ہوں۔ لیکن اُس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کس خوفناک لڑکی کو اپنے

ساتھ لے جا رہا ہے۔

جس مکان میں وہ داخل ہوا، وہ چھوٹا سا تھا اور وہاں زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔ بظاہر پورن لعل کا رویہ بہت ہی اچھا تھا۔ لیکن انسان کے اندر کیا کیا احساسات پل رہے ہوتے ہیں، اس کا اندازہ تو بعد میں ہی ہوتا ہے۔ کھانے پینے کے بعد جب پورن لعل اُس کے پاس بیٹھا تو اُس نے کہا۔ ''ہمیں اپنے دوست دیال سنگھ کے پاس چلنا ہے۔ اور مس کرن، آپ کو درحقیقت دیال سنگھ کے لئے ہی اِدھر بھیجا گیا ہے۔ دیال سنگھ کے بارے میں اتنا بتا دُوں کہ وہ نہایت نڈر اور بہادر انسان ہے۔ یورپ میں ساری زندگی گزاری ہے اور بے حد دولت مند ہے۔ مہم جوئی اُس کا شوق ہے اور دنیا کے دُشوار گزار حصوں اور انجانے علاقوں میں گھومنا اُس کا خاص مشغلہ رہا ہے۔ میری اُس سے بہت پرانی ملاقات ہے۔ اور اُس کے بیان کردہ واقعات اتنے پراسرار اور لرزہ خیز ہوتے ہیں کہ سننے والوں پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ دیال سنگھ ایک کہانی نگار ہے اور جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن وہ جس سنجیدگی، خلوص اور روانی سے یہ واقعات بیان کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ صحیح اور سچ ہے۔ اور میڈم، حقیقت ہے کہ میں پہلی بار اُس سے متاثر ہوا ہوں۔ وہ میرا بہت ہی اچھا اور گہرا دوست ہے اور اس کے لئے میں شام گڑھ آیا ہوں۔ یہاں سے ہمیں اُس تک پہنچنا ہے۔ میں آپ کو ذرا مختصر تفصیل بتا دُوں۔

ایک دن وہ اتفاقیہ طور پر مجھے ایک اور شہر میں دستیاب ہوا اور اُس نے مجھے دیکھ کر خوشی کا نعرہ لگایا اور اس کے بعد میرے ساتھ ایک ہوٹل میں چائے پیتا ہوا بولا۔ ''آہ، یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی پورن لعل کہ تم مجھے یہاں مل گئے۔ یقین کرو بہت بار میں نے تمہارے بارے میں سوچا اور غور کیا کہ تمہیں تلاش کرنے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کروں؟ میں تو تمہارے مل جانے پر یہی کہتا ہوں کہ قدرت جب کسی مسئلے میں کسی کا ساتھ دینے پر آتی ہے تو اسی طرح انتظامات ہو جاتے ہیں۔ دوست، مجھے شام گڑھ میں تمہاری ضرورت ہے۔''

''شام گڑھ......؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں...... شام گڑھ میں، میں نے ایک انتہائی قدیم حویلی خریدی ہے۔ اصل میں تم میرے شوق کے بارے میں تو اچھی طرح جانتے ہو۔ کچھ ایسے معاملات ہو گئے ہیں کہ میں اس حویلی میں دلچسپی لینے لگا۔ اس کا ایک پس منظر ہے جو میں تمہیں رفتہ رفتہ بتاؤں گا۔ تمہیں کسی پراسرار حویلی میں کچھ وقت گزارنے میں کوئی دلچسپی ہے؟''

''کیا بات کرتے ہو...... میری اور تمہاری دوستی کی بنیاد یہی پراسرار واقعات اور کہانیاں ہیں۔ اگر واقعی تم سچ کہہ رہے ہو اور ایسی کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ، اُس حویلی میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''کیا بتاؤں؟ یوں سمجھ لو کہ وہ نہایت عجیب اور پراسرار عمارت ہے۔ صدیوں پرانی، سینکڑوں کمرے ہیں اُس کے۔ گیلریاں، برآمدے، غلام گردشیں اور کمرے میں سجے ہوئے پرانے زمانے کے ہتھیار اور فرنیچر۔ کثیر رقم کے عوض میں نے یہ سب کچھ خریدا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اُسے عجائب گھر بنا دُوں۔

اگر تم کچھ دن کے لئے شام گڑھ آسکو تو بڑا لطف رہے گا۔ کیا کہتے ہو؟ کیا میں شام گڑھ کی اس حویلی میں تمہارا انتظار کروں؟''

''بہت ہی اچھا موقع ملا ہے ہمیں ساتھ رہنے کا۔ اگر تم مجھے دعوت دے رہے ہو تو میں وہاں آنے کے لئے تیار ہوں۔''

''یوں سمجھ لو میں نے تمہیں دعوت دے دی ہے۔ اور وہاں پہنچنے کے بعد میں ہر لمحے تمہاری آمد کا انتظار کروں گا۔ تمہیں ایک اور کہانی بھی سنانی ہے مجھے۔ سمجھ لو جنگل کا شیر اب پنجرے میں آ گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''نہیں...... بالکل نہیں۔ تم شام گڑھ کے بارے میں تفصیلات سن لو۔ ذرا سا وہاں سے پیچھے ٹھہرنا پڑے گا تمہیں۔ کیونکہ راستے دُشوار گزار ہیں اور اُن تک سفر کرنے میں مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔'' اُس نے مجھے تفصیلات بتائیں اور آخرکار ہم جدا ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ شام گڑھ کے اس مخصوص حصے تک پہنچنے میں مجھے خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جب میں اُس عظیم الشان اور ہیبت ناک حویلی پر پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ واقعی دیال سنگھ دیوانہ ہی ہے۔ کوئی ہوش مند آدمی اس حویلی کو کسی قیمت پر خریدنا پسند نہیں کرتا۔ انتہائی ہیبت ناک حویلی تھی۔ در و دیوار قدامت کے باعث سیاہ پڑ چکے تھے اور جگہ جگہ سے پلستر اُکھڑ جانے کی وجہ سے بدنما اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ حویلی کے چاروں طرف وسیع و عریض جنگل پھیلا ہوا تھا۔ بہرحال جب میں حویلی پہنچا تو دیال سنگھ نے میرا استقبال کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم یقین کرو مجھے یہ خوف تھا کہ اگر تم یہاں تک پہنچ بھی گئے تو دُور ہی سے اس حویلی کو دیکھ کر واپس چلے جاؤ گے۔ قرب و جوار کے رہنے والوں نے مجھے ایک پاگل اور دیوانہ شخص قرار دے دیا ہے۔ آؤ، اندر چلے آؤ۔'' وہ مجھے لئے ہوئے حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔ اتنی وسیع و عریض عمارت میں دیال سنگھ کے علاوہ دو آدمی اور تھے۔ ایک دیال سنگھ کا چھوٹا بھائی اور دوسرا باہر سے آیا ہوا ایک ملازم جو غالباً نیپالی تھا اور دیال سنگھ کے بہت کام آیا کرتا تھا۔ وہ دیال سنگھ کا ڈرائیور، خانساماں اور تھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد جو اندازہ ہوا وہ یہ کہ اُس کا خاص مشیر بھی تھا۔ میں نے حیرانی سے کہا۔ ''اتنی بڑی حویلی میں صرف یہ تین افراد۔ باقی کہاں گئے؟''

''بھاگ گئے۔'' دیال سنگھ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تھے۔''

''ہاں...... کیوں نہیں؟''

''مگر وہ بھاگ کیوں گئے؟''

''اس لئے کہ وہ اس حویلی کو بدروحوں کی قیام گاہ سمجھتے تھے۔''

بہرحال، میں اُس کی طرح دلیر آدمی نہیں تھا۔ میں نے اپنے جسم میں خوف کی ایک لہر محسوس کی۔ اور اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ حویلی کو دیکھ کر یہی احساس ہوتا تھا کہ اس میں بدرُوحیں ضرور رہتی ہوں گی۔

کیونکہ ایسی پراسرار، بدنما اور منحوس حویلی بدرُوحوں کا مسکن ہی ہوسکتی ہے۔ تاہم میں نے دیال سنگھ سے سوال کیا۔ ”میرا تو خیال ہے کہ اس قدیم اور خوفناک حویلی کو تم زبردستی بدرُوحوں کا مسکن بنانے پر تلے ہوئے ہو۔ ویسے ایک بات بتاؤ کہ تم اس حویلی کو آسیب زدہ کیوں کہتے ہو؟“

”اس کا اندازہ تمہیں خود ہو جائے گا۔“

”میرا مطلب ہے کوئی ایسا واقعہ؟“

”واقعہ تو کوئی خاص نہیں۔ لیکن کچھ پراسرار اور لرزہ خیز آوازیں یہاں ضرور سنی جاتی ہیں۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔“ دیال سنگھ نے میرے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کسی کی شرارت بھی ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ میرا یہاں قیام نہ چاہتے ہوں۔“

”وہ کیوں؟“

”ساری باتیں اسی وقت پوچھ لو گے؟ رفتہ رفتہ تمہیں ساری تفصیلات بتاؤں گا۔“

رات کو کھانے کی میز پر جب ہم سب جمع ہو گئے تو دیال سنگھ نے کہا۔ ”تم نے مختصراً یہ حویلی دیکھ لی ہو گی۔ اس کی تاریخ کے بارے میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ تقریباً چار پانچ سو سال پرانی ہے۔ اگرچہ اس کا بڑا حصہ کھنڈروں اور ویرانوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم دیکھ رہے ہو کہ اس کے بہت سے گوشے اب بھی رہائش کے قابل ہیں۔ میں نے اسے خرید لیا تھا اور میرے یہاں آنے کے تقریباً ایک ہفتے بعد کا ذکر ہے کہ مشرقی حصے میں واقع ایک کمرے سے عجیب طرح کی آواز بلند ہوئی۔ اُس وقت رات کے گیارہ یا بارہ بج رہے ہوں گے۔ ہر طرف پھیلے ہوئے دہشت ناک سناٹے کو چیرنے والی یہ آواز میرے کان میں آئی تو میں بھی حیرت سے اُچھل پڑا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مدھم سُروں میں ماؤتھ آرگن بجا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ آواز بلند ہونے لگی۔ اور پھر اس میں انسانی چیخیں شامل ہو گئیں۔ دو ڈھائی گھنٹے تک یہ آواز گونجتی رہی، اور پھر یہ آواز بند ہو گئی۔ میرے ساتھ آئے ہوئے ملازم میرے پاس آئے اور کہنے لگے، سر، یہاں تو عجیب و غریب آوازیں آ رہی ہیں۔ اور آخر کار لوگوں کی کہی ہوئی باتیں سچ ہی ثابت ہو رہی ہیں۔

”لوگوں کی کہی ہوئی باتیں؟“

”ہاں، آس پاس کے لوگ بتاتے ہیں کہ حویلی آسیب زدہ ہے اور اس میں بھوت پریت رہتے ہیں۔ سر، ہم غریب لوگ ہیں، پریشان ہیں۔ یہاں خوف محسوس ہو رہا ہے۔“

”اور کیا کہتے ہیں یہاں رہنے والے لوگ؟“

”وہ کہتے ہیں سر، کہ حویلی میں آج تک کوئی مستقل طور پر نہیں رہ سکا۔ اور جس نے یہاں رہنے کی کوشش کی، وہ پاگل ہو گیا یا اُسے جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔“

”تم لوگ خوفزدہ نہ ہو۔ کل دن کی روشنی میں ہم دیکھیں گے کہ کیا قصہ ہے۔ ویسے میں یورپ میں رہ چکا ہوں۔ وہاں بھی اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جب بھی کبھی ان واقعات کی تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ کچھ لوگ مجرمانہ کارروائیوں کے لئے ایسی عمارتوں کو آسیب زدہ قرار دے دیتے ہیں

اور اس کے بعد لوگوں کے وہم سے فائدہ اُٹھا کر وہاں اپنی مجرمانہ کارروائیاں جاری رکھتے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ کیا صورتحال ہے؟“

چنانچہ اگلے روز آدھی رات کے بعد پھر کمرے سے سیٹیوں، سسکیوں اور رونے کی آواز سنائی دی اور دیر تک اس حویلی کے در و دیوار ان سے گونجتے رہے۔ میں نے اپنی رائفل اُٹھائی اور اُس کمرے کی جانب چل پڑا جو خاص طور سے حویلی کے اُس گوشے میں تھا۔ آوازیں بلاشبہ اُسی کمرے سے آ رہی تھیں...... یورپ کی زندگی میں بھوت پریت کا تصور ذرا دُور کا تصور ہے۔ اور ہر شخص کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پڑتا۔ جبکہ یہاں بقول میرے دوست دیال سنگھ کے، آدھی آبادیاں آسیب زدہ ہیں۔ بہرحال یہ معاملہ خاصا دلچسپ معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے مکمل تفصیلات تو معلوم نہیں تھی۔ لیکن بہرحال یہ آوازیں میرے لئے بھی باعث دلچسپی تھیں۔ چنانچہ ہم لوگ اطمینان سے اُس کمرے کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گئے اور ہم نے سرچ لائٹ چاروں طرف پھینکی۔ اندر قدم رکھتے ہی آوازیں اتنی تیز ہو گئیں کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ خود میرا سر گھومنے لگا اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھر میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا اور دروازہ مقفل کر دیا۔ اُس دن سے لے کر آج تک روزانہ آدھی رات سے لے کر سورج طلوع ہونے تک اُس کمرے سے معمولی وقفے کے بعد آوازیں آتی ہیں۔ کبھی سیٹیاں بجتی ہیں، کبھی باجے اور کبھی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان چیخوں سے جو مجھے اندازہ ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے حلق سے نکلتی ہیں جسے شدید اذیت دی جا رہی ہو۔ دن میں روشنی میں، میں نے بارہا کمرے کا معائنہ کیا مگر کوئی قابل ذکر بات نظر نہیں آئی۔ اس خیال سے کہ شاید کسی نے شرارت سے کوئی مشین یا مائیکروفون دیوار یا فرش میں فٹ کر رکھا ہو، فرش اور دیوار کا بھی بغور معائنہ کیا ہے۔ لیکن ان پراسرار آوازوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اور اب......“ دفعتہً وہ چپ ہو گیا اور پھر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”سنو، آوازیں شروع ہو گئی ہیں۔“ حویلی کے مشرقی حصے سے ہوائی لہروں پر تیرتی ہوئی مدھم سی آواز میرے کانوں میں آئی۔ باہر کچھ فاصلے پر کوئی شخص باجا بجا رہا تھا۔ جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے، اُس کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکیاں کھول دیں اور آواز تیز ہو گئی۔ وہ ایک لمبی اور چیختی ہوئی آواز تھی۔ باہر پھیلی تاریکی کے بھیانک ماحول میں یہ آواز حد درجے خوفناک لگ رہی تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا اور ریڑھ کی ہڈی میں بچھو سے رینگتے محسوس ہونے لگے۔ یہ آواز سن کر مجھے بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ کوئی انسانی آواز نہیں تھی اور نہ کسی ایسی مشین سے نکل رہی تھی جو جان بوجھ کر کمرے میں چھپا دی گئی ہو۔ آواز کبھی مدھم اور کبھی تیز ہو جاتی۔ لیکن اس میں درد، کرب اور تکلیف کی شدت کا جو اظہار تھا وہ بدستور تھا۔ بہت دیر تک میں یہ آواز سنتا رہا اور پھر میں نے کھڑکی بند کر دی۔

سب میری جانب دیکھ رہے تھے۔ دیال سنگھ نے کہا۔ ”کہو، اب کیا کہتے ہو؟ تمہارے خیال میں کیا یہ کسی کی شرارت ہے؟“

”ابھی اس بارے میں تم سے بہت سے سوالات کرنے ہیں۔ پہلا سوال یہ کہ تم اسے شرارت کیوں

سمجھتے ہو؟ اور دوسرا یہ کہ کیا تمہاری یہاں کسی سے دشمنی ہے؟"

دیال سنگھ سوچ میں ڈوب گیا، پھر کہنے لگا۔ "عجیب سی بات ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہیں یہ تفصیل بتا دینی چاہئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں شام گڑھ میں ایک اتنی حسین لڑکی رہتی ہے جس نے میرے ذہن سے یورپ کی تمام یادوں کو چھین لیا ہے۔ ویسے بھی میں اپنے وطن کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں اور یورپ میں رہ کر بھی میں نے ان قصے کہانیوں میں اپنا نام شامل نہیں کیا جو رومان زدہ افراد یورپ سے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ جب میں یہاں پہنچا تو میری ملاقات اوشا کماری سے ہوئی اور اوشا کماری حسن و جمال کا ایک ایسا شاہکار ہے کہ اُسے دیکھ کر انسان اپنے دل کی دھڑکنوں کی تیزی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اوشا کماری میری جانب متوجہ ہو گئی۔ اُس کی عمر چوبیس پچیس سال کے قریب ہے۔ میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں میرے دوست پورن لعل کہ میں نے دنیا میں بڑی بڑی حسین و جمیل لڑکیاں دیکھی ہیں، لیکن اوشا کماری حسن و جمال کا وہ شاہکار ہے کہ اُس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ وہ حسنِ سیرت میں بھی بے مثال ہے۔ وہ یہاں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور یہ خاندان ہو امحل کے مالکان میں شمار ہوتا ہے۔ بہت بڑا اور خوبصورت خاندان ہے یہ۔ یوں سمجھ لو چندر بھان یہاں کے مالکان میں سے تھے، میرا مطلب ہے اس علاقے کے مالکان سے۔ لڑکی نہایت خوش اخلاق، تعلیم یافتہ، حاضر جواب اور مخاطب کی نفسیات سمجھ کر گفتگو کرنا جانتی ہے۔ اُس نے خود ہی میری جانب قدم بڑھائے اور چند ملاقاتوں کے بعد میں اُس کا گرویدہ ہو گیا۔ میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے جبکہ شام گڑھ اور اس کے نواحی علاقوں کے کچھ افراد جو بڑے صاحب حیثیت ہیں اُس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن میرے سامنے اُن کی دال نہیں گلی۔ اور پھر میں نے ایک دن اُس سے اظہارِ محبت کر دیا اور اُس نے میری محبت قبول کر لی۔ وہ صاحب اختیار ہے اور اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کر سکتی ہے۔ بہرحال ہم دونوں بہت جلد شادی کر لیں گے۔"

"اوہو...... ایک بات بتاؤ، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اوشا کماری کے سلسلے میں ہی کچھ لوگ تمہارے دشمن بن گئے ہوں اور تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہوں؟ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے تمہیں یہاں سے بھگانے کے لئے یہ سارا چکر چلایا ہو۔"

"ہاں...... ایسا ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی اس بارے میں سوچا ہے۔ لیکن ان آوازوں کا اس کہانی سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اور اگر ہے بھی تو بہرحال میں اُن کی اس سازش کو ناکام بنا دُوں گا۔"

"ایک بات بتائیے دیال سنگھ جی، آپ نے یہ حویلی خاص طور سے کیوں خریدی؟ شام گڑھ تو اچھا خاصا ترقی یافتہ علاقہ ہو چکا ہے۔ میں نے یہاں آنے کے بعد دیکھا ہے۔"

"ہاں...... میں یہ جانتا ہوں۔ یہ مشورہ مجھے کسی نے نہیں دیا بلکہ یہ خیال خودبخود میرے دل میں آیا تھا۔ اور تم سمجھتے ہو میرے دوست، کہ جب انسان کبھی کسی ایسے جال میں پھنس جاتا ہے تو نجانے کیا کیا عمل کرتا ہے۔ میں تم سے یہ بات کبھی نہیں چھپاؤں گا کہ میں نے اوشا کماری کو متاثر کرنے کے لئے یہ

حویلی خریدی تھی۔"

"اوشا کماری اس حویلی کے خریدنے سے متاثر ہوئی؟"

"اصل میں یہ حویلی میں اُسے تحفے کے طور پر دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ چندر بھان خاندان سے ہے اور یہ حویلی چندر بھان ہی نے بنائی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس تحفے پر وہ بہت خوش ہو گی۔ کیونکہ یہ ایک عجیب تحفہ ہو گا اُس کے لئے۔"

"کیا اُسے اس حویلی کے خریدنے کا علم ہے؟" میں نے سوال کیا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

"ہاں...... کیوں نہیں؟ ایک روز شام کے وقت جبکہ میں اُس کے گھر چند مشترکہ دوستوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا، ان دوستوں میں چند وہ افراد بھی تھے جو اوشا کماری سے قربت کے خواہش مند تھے۔ میں نے شیخی میں آ کر وہاں کہا کہ شادی کے بعد میں اسی حویلی میں ہنی مون مناؤں گا۔"

"اوہو...... یہ تو واقعی دلچسپ بات ہے۔ کیا وہ خوش ہوئی؟"

"نہیں۔ اس کے برعکس اُس کا رنگ فق ہو گیا اور اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے دیال سنگھ، کہ اُس کے ایک کمرے سے طرح طرح کی ڈراؤنی آوازیں آتی ہیں؟"

"ہاں...... میں نے بہت کچھ سنا ہے اس کے بارے میں۔ لیکن میں ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں نے ایک روشن خیال خطے میں زندگی گزاری ہے اور بھوت پریت وغیرہ مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔"

وہ لوگ جو وہاں شریک تھے ہنس پڑے۔ پھر اُن میں سے ایک نے کہا۔ "ایک بات کہیں آپ سے مسٹر دیال سنگھ، ہم آپ کے دوستوں میں سے ہیں، دشمنوں میں سے نہیں۔ ہمارا پُرخلوص اور ہمدردانہ مشورہ ہے کہ آپ یہ عمارت مت خریدیں۔ کیونکہ گزشتہ بیس برس میں یہ عمارت کتنی ہی مرتبہ فروخت ہوئی ہے اور اسے خریدنے والے یا تو پاگل ہو گئے یا نامعلوم طور پر موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ یہ حویلی بھوتوں اور بدرُوحوں کی حویلی مشہور ہے۔"

میں اُس شخص کی بات پر ہنس پڑا اور میں نے کہا۔ "یہ لوگ مجھے ڈرا رہے ہیں اوشا جی، لیکن میں نے ایسے بے شمار بھوتوں کا مقابلہ کیا ہے اور بہت سے بڑے بڑے بھوتوں کو نیچا دکھایا ہے۔ ممکن ہے یہ حویلی میں کبھی نہیں خریدتا، لیکن آپ لوگوں نے میرے شوق کو بھڑکا دیا ہے چنانچہ اب میں اسے ضرور خریدوں گا۔"

"آپ کی مرضی ہے۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں، کہ آپ اس میں نہیں رہ سکیں گے۔ اگر آپ اس میں رہ گئے تو میں آپ کو اُس کی قیمت پیش کر دُوں گا۔"

"آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی اُس حویلی کو خریدنے کے بارے میں سوچا؟"

"ایک بیوقوف ہی اُس حویلی کے لئے رقم خرچ کر سکتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میں بیوقوف نہیں ہوں۔" اُس نے کہا۔

بہرحال جب تنہائی میں اوشا کماری سے میری ملاقات ہوئی تو اُس نے ایک بار پھر مجھے سمجھانے کی

کوشش کی اور کہا کہ میں اُس حویلی کو نہ خریدوں۔ کیونکہ وہ واقعی آسیب زدہ ہے اور خاص طور سے اُس کا ایک مشرقی کمرہ تو واقعی بہت خطرناک ہے۔ میں نے اوشا کماری سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''مگر اوشا جی، یہ تو آپ کے آباؤ اجداد کی حویلی ہے۔ کیا آپ کے دل میں کبھی یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ آپ اس کی مالک بنیں؟''

اوشا کچھ دیر سوچتی رہی، پھر اُس نے کہا۔ ''میں حقیقتوں کی دنیا میں رہنے والی ہوں۔''

''اچھا یہ بتائیے، کہ کیا آپ نے وہ آوازیں اپنے کانوں سے سنی ہیں؟''

''نہیں۔ وہ آوازیں میں نے نہیں سنیں اور نہ ہی کسی اور حویلی سے باہر رہنے والے نے۔ اُن آوازوں کو اُس حویلی میں جانے اور رہنے والا ہی سن سکتا ہے۔''

بہرحال مس کرن، اس حویلی کے متعلق اتنی باتیں سن کر سچی بات یہ ہے کہ میں دہری کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو میرے ذہن پر یہ احساس بھی سوار تھا کہ کہیں یہاں مجھے اور میرے ساتھ دوست دیال سنگھ کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ لیکن دوسری طرف میں ان تمام حقیقتوں کو جاننا بھی چاہتا تھا۔ بہرحال میں نے اُس مشرقی حصے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ آسیب زدہ کمرے پر خصوصی توجہ دی، دیواروں اور فرش کو خوب اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا۔ دروازے اور کھڑکیاں دیکھیں لیکن کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ البتہ جب تک میں اُس کمرے میں رہا، میرے ذہن پر یہی احساس سوار رہا کہ اس کمرے میں کوئی نادیدہ ہستی موجود ہے جو میری حرکات کا گہرا جائزہ لے رہی ہے۔ ایک عجیب سی بے چینی اور انجانا خوف مجھ پر طاری تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کمرے کی دیواریں اور اُونچی چھت خونی نگاہوں سے مجھے گھور رہی ہوں۔ میرے پورے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور جسم پسینے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال ہم باہر نکل آئے اور میں حویلی کے اُس کمرے میں آ گیا جو دیال سنگھ نے میرے لئے مخصوص کیا تھا۔ میں سوچتا رہا لیکن کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکا۔ سورج چھپا اور پھر رات ہو گئی۔ میرا ذہن مسلسل اس مشکل کا شکار رہا تھا اور میں سوچوں میں ڈوبا رہا تھا۔ لیکن کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔

پھر اُس وقت رات کے دس بجے تھے جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے۔ ہمارے پاس اس آسیب زدہ حویلی کے علاوہ اور کوئی موضوع نہیں تھا اور ہم اس وقت بھی اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ دفعتہً دیال سنگھ کے بھائی وکرم سنگھ نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''رُکو، غور سے سنو۔ میرا خیال ہے آج یہ آواز وقت سے کچھ پہلے سنائی دی ہے۔'' میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، دس بج رہے تھے۔ اس سے پیشتر یہ آوازیں بارہ بجے کے بعد سنائی دیتی ہیں۔ ابتداء میں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی شخص دردانگیز سُروں میں گیت گا رہا ہے۔ لیکن گیت کے بول سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ ہم سانس روکے بے حس و حرکت بیٹھے یہ آواز سنتے رہے اور اچانک ہی یہ گیت بھیانک چیخوں میں تبدیل ہو گیا۔ یہ چیخیں ایک ایسے شخص کے حلق سے نکلتی معلوم ہوتی تھیں جو درد کی شدت سے تڑپ رہا ہو۔ دیال سنگھ پر نجانے کیا دیوانگی طاری ہوئی کہ یکایک وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ایک طرف رکھی ہوئی رائفل اُٹھا کر غصیلی آواز میں بولا۔

''موم بتیاں روشن کر کے میرے ساتھ آ جاؤ۔ یہ مذاق اب میری برداشت سے باہر ہے۔ آؤ، آج کچھ کریں گے۔'' کسی نے اُس کی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ میں نے بھی نہیں کیا۔ ہم نے موم بتیاں جلائیں اور دبے پاؤں مشرقی حصے کی جانب چل پڑے۔ کچھ لمحے بعد ہم ایک لمبی اور سنسان غلام گردش عبور کر کے آسیب زدہ کمرے کے پاس پہنچ گئے۔ آوازیں کمرے سے جیسے چھن چھن کر باہر آ رہی تھیں۔ ہم دھڑکتے دلوں سے آواز سنتے رہے۔ پھر چیخیں مدھم ہو گئیں اور ان کی جگہ سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ دیال سنگھ نے بندوق مجھے تھما کر جیب سے چابی نکالی اور آہستہ سے تالا کھولا۔ سسکیوں کی آواز جیسے فوراً بند ہو گئی۔ ہم آگے بڑھے اور کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔ ہر طرف جان لیوا اور گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور ہم سب سنسنی خیز نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ موم بتیوں کی پیلی اور مدھم روشنی میں دیواریں جیسے اپنی جگہیں تبدیل کر رہی تھیں۔ پراسرار آنکھیں اور ہلکے ہلکے سانس ہمیں سنائی دے رہے تھے۔ کچھ دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر اچانک ہی ایسی بھیانک چیخ بلند ہوئی کہ کوئی انسان اُسے برداشت نہ کر سکے اور ہم لوگ بھی انسان ہی تھے۔ سب سے پہلے دیال سنگھ نے ہی اپنی موم بتی پھینکی تھی اور اس کے بعد کمرے سے باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ پھر اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ اس کمرے میں رُکتا؟ سو میٹر کی ریس شروع ہو چکی تھی۔ ہم اُس راہداری کے آخری سرے پر پہنچ کر رُکے۔ سب بری طرح ہانپ رہے تھے اور کمرہ خون جما دینے والی چیخوں سے نہ صرف گونج رہا تھا بلکہ یہ آوازیں پوری حویلی کے در و دیوار کو لرزا رہی تھیں۔ وہاں سے بھاگنے کی ابتداء دیال سنگھ ہی نے کی تھی۔ اور انسان تو بہرحال انسان ہوتا ہے۔ وہاں دیال سنگھ کی بزدلی نے سب کو بزدل بنا دیا تھا۔ مجھے اُس پر غصہ آ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی، پھر تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیال سنگھ سے غصیلے لہجے میں کہا۔

''تم تو رائفل لے کر نکلے تھے مائی ڈیئر دیال سنگھ، کہ آج پتہ لگا کر ہی رہیں گے۔ یہ تم نے کیا کیا؟''

''یار، بس کمال ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو، میں دیکھتا ہوں۔''

''میری بات تو سنو، مجھے تمہاری زندگی بھی عزیز ہے۔ پلیز رُک جاؤ۔''

''چھوڑو یار، بیکار باتیں کر رہے ہو۔ مجھے بلایا کیوں ہے یہاں؟'' میں نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور دندناتا ہوا آسیب زدہ کمرے کی جانب چل پڑا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے کچھ لوگ چلے آ رہے ہیں۔ یہ وکرم سنگھ اور اُس کا دوسرا ساتھی تھا۔ کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی موم بتیاں اب بھی جل رہی تھیں اور موم تیزی سے پگھل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دیال سنگھ، اُس کا بھائی اور وہ تیسرا شخص جو نیپالی تھا وہ سب میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میں نے غراتے ہوئے کہا۔ ''یا تو واپس چلے جاؤ۔ یا آ سکتے ہو تو اندر آ جاؤ۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ کون ہے اور یہ ڈراؤنی آوازیں ہمارا کیا بگاڑ لیتی ہیں؟'' میرے ان الفاظ پر ایک دم کمرے میں گونجنے والی آوازیں مدھم ہو گئیں۔ میں نے گری ہوئی موم بتیاں سیدھی

کیس اوران میں سے ایک اُٹھا کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ مدھم مدھم آوازیں اب بھی کانوں میں آ رہی تھیں۔ لیکن یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کس رُخ سے آتی ہیں؟ میں نے باری باری ہر دیوار سے کان لگائے اور ہر بار یہی محسوس ہوا کہ آواز اسی دیوار کے اندر سے آ رہی ہے۔ لیکن اندر سے آنے والی ان آوازوں کا راز کیا تھا؟ اس کا مطلب تو یہ تھا مجھے دیواریں کھودنی پڑیں گی۔ نجانے کیوں اب مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ لوگ جو اوشا کماری کے طلب گار ہیں، یہ نہیں چاہتے کہ اوشا کماری کی شادی دیال سنگھ سے ہو۔ اور انہوں نے دیال سنگھ کو خوفزدہ یا کوئی اور کارروائی کرنے کے لئے ان دیواروں میں سپیکر وغیرہ فٹ کر رکھے ہوں۔ بہر حال میرے دل میں اب خوف کا وہ گزر نہیں تھا جو پہلے تھا۔ میں بڑے اطمینان سے کمرے کی دیواریں ٹٹول رہا تھا۔

میری اس ہمت پر ان لوگوں کے اندر بھی ہمت پیدا ہوئی تھی اور وہ کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ تینوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں ریوالور پکڑے ہوئے تھے جیسے شکار کھیلنے آئے ہوں۔ ابھی اُنہوں نے کمرے میں قدم ہی رکھا تھا کہ ایک بار پھر بھیانک اور خوفناک چیخوں کا طوفان بلند ہوا اور جلتی ہوئی موم بتیاں ہمارے ہاتھوں میں بجھ گئیں۔ حالانکہ اُن کے بجھنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور نہ ہی یہ بات سمجھ میں آئی تھی کہ یہ موم بتیاں کیسے بجھ گئیں۔ ساتھ ہی کمرہ پہلے سے زیادہ خوفناک اور زوردار چیخوں سے گونج رہا تھا اور یہ آوازیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کانوں کے پردے پھٹتے جا رہے ہوں اور کمرے کی چھت گرنے ہی والی ہو۔ ہمارے پیروں کے نیچے فرش بھی لرز رہا تھا اور زمین ہمیں اپنی جگہ سے ہلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک ہی میں نے چیخ کر دیال سنگھ سے کہا۔

”دیال سنگھ، تم باہر آ جاؤ۔“

موم بتیاں تمام بجھ گئی تھیں۔ دیال سنگھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں ہے؟ کمرے کی بلند چیخوں میں میری آواز بالکل گم ہو گئی تھی۔ میں نے تاریکی میں ٹٹول کر دیال سنگھ کو زوردار دھکا دیا اور دروازے سے باہر جا پڑا۔ ایک بار پھر دیال سنگھ کے بھائی اور نیپالی کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ بھی کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب اس تاریکی میں اس کمرے میں مزید رہنا بیکار تھا۔ دل میرا بھی لرز رہا تھا ان خوفناک آوازوں سے۔ اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگر ہم کمرے سے نہ نکلے تو مر جائیں گے۔ چنانچہ میں بھی کمرے سے باہر نکل آیا اور جیسے ہی میں کمرے سے باہر نکلا اچانک ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ ہم لوگ سکتے کے عالم میں کھڑے ہوئے تھے۔ اتنی بار ہمت کر کے ہم کچھ کرنے کے لئے یہاں تک پہنچے تھے، لیکن کچھ نہیں کر پائے تھے۔ بہر حال چند لمحے یہ خاموشی طاری رہی، اور پھر اچانک ہی ایک خوفناک قہقہہ بلند ہوا اور اس کے بعد بدستور قہقہے اُبلنے لگے جیسے حویلی کا آسیب ہمارے خوف پر مذاق اُڑا رہا ہو۔ آخر کار ہم وہاں سے چل پڑے اور جب ہم راہداری کے آخری سرے پر پہنچے تب وہ قہقہے بند ہوئے۔ دیال سنگھ کی قیام گاہ جنوبی حصے میں تھی۔ ہم وہاں پہنچ کر بڑے اور وسیع کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے کی دیواریں، چھت اور فرش سیاہ پتھر کا تھا۔ ایک بہت بڑا لیمپ روشن تھا۔ نہ صرف دیال سنگھ بلکہ باقی دونوں افراد کے چہرے بھی خوف سے ہلدی کی طرح زرد ہو رہے تھے۔ دیال سنگھ نے آنکھیں بھینچ

کر گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پتہ نہیں چلتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی پتہ چلے گا بھی نہیں۔ میں کل ہی اس کمرے کو کھدوا دوں گا۔“

”اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔“ میں نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ”اس لئے مائی ڈیئر دیال سنگھ، کہ اب ہمیں کسی بدرُوح کی موجودگی کے امکان پر بھی غور کرنا ہوگا۔“

”کیا تم بدرُوحوں پر یقین رکھتے ہو؟“ وکرم سنگھ نے سوال کیا اور میں مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

”کیوں، تمہارا کیا خیال ہے وکرم سنگھ، کیا تم بدرُوحوں پر یقین نہیں رکھتے؟“

”ہرگز نہیں۔ لیکن بس......“

”تو پھر تم مجھے بتاؤ کہ کیا کہتے ہو اس سلسلے میں؟ کیا یہ کام کسی انسان کا ہے؟“

”فرض کرو، ہم کمرہ کھدوا بھی دیتے ہیں اور اگر یہ آوازیں اس کے بعد بھی بند نہ ہوئیں تو کیا ہوگا؟ میں سمجھتا ہوں کہ جذبات یا جوش میں آئے بغیر ٹھنڈے دل و دماغ سے اس معاملے پر غور کریں۔ اگر یہ ہمارے جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے کسی انسان کی شرارت ہے تو آخر کار ہم اس کا سراغ لگا ہی لیں گے۔ اور اگر یہ کسی مافوق الفطرت کا کارنامہ ہے تب بھی کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہے۔ آخر کار ہم اس مشکل کا حل بھی دریافت کر لیں گے۔“

”اور اگر ان کوششوں میں ہم میں سے کسی کی زندگی چلی گئی تو؟“ ہم سب سوچ میں ڈوب گئے۔

کچھ دیر بعد دیال سنگھ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”بات انا کی آجاتی ہے۔ اگر اوشا کماری سے شادی کا معاملہ نہ ہوتا تو میں خاموشی سے پریم گڑھ چھوڑ دیتا یا اس عمارت کو کبھی نہ خریدتا۔ اب اگر میں اس سے دست کش ہوتا ہوں تو یہ میری بے عزتی ہے۔ اور پھر کچھ لوگوں سے شرط بھی لگی ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، میں اس حویلی میں ہی ہنی مون مناؤں گا۔ اور میرے دوست پورن، اب یہ معاملہ تمہارے علم میں ہے اور تم ہی اس سلسلے میں کوشش کر سکتے ہو۔ میں سچ بات کہہ رہا ہوں کہ اب میری ہمت ٹوٹ گئی ہے اور میں آئندہ اس کمرے میں قدم نہیں رکھ سکوں گا۔“ پھر اُس نے نیپالی ملازم سے درخواست کی کہ وہ سب کے لئے کافی بنائے۔ اور نیپالی کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کافی لے کر آ گیا۔ ہم کافی پی کر اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

قلعے کے مشرقی حصے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ کمرے کا بھوت بھی غالباً چیختے چیختے رُک گیا تھا۔ بہر حال میرا سارا تجربہ یہاں آ کر فیل ہو جاتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ کمرے کے اندر اگر کوئی مائیکرو فون یا ٹیپ ریکارڈر یا اس قسم کی کوئی چیز لگائی گئی ہے تو آخر وہ ہے کہاں؟ اور کس طرح نصب کی گئی ہے؟ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو مجھے اس شخص کے باکمال ہونے میں کوئی شبہ نہیں جس نے کسی کو بھی اس حویلی میں آنے سے روکنے کا انتظام کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ڈاکوؤں کا کوئی گروہ ہو جو یہاں کوئی کام کر رہا ہو۔ ڈاکوؤں کو پرانی عمارتوں اور کھنڈروں میں خفیہ اڈے بنا کر کام کرنے کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ بہر حال میں اس بارے میں جتنا سوچتا، نئی نئی باتیں ذہن میں آ جاتیں۔ یہ تو طے تھا کہ ان

بھیانک آوازوں اور خوفناک چیخوں کا کوئی مقصد ضرور تھا اور اس حویلی کے اندر کچھ ایسی قوتوں نے اپنا کھیل شروع کر رکھا تھا جن کے بارے میں یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتی ہیں؟ البتہ ایک بات نجانے کیوں میرے ذہن پر مسلط تھی اور وہ یہ تھی کہ جو کچھ بھی ہے، لیکن دیال سنگھ کی زندگی ضرور خطرے میں ہے۔

بہرحال، ایسے بہت سے تصورات بھی ذہن میں آتے تھے جو ذرا عجیب تھے اور ان کا تذکرہ تک میں دیال سنگھ سے نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی یہ کہ ممکن ہے خود اوشا کماری اس بھیانک کھیل میں شریک ہو۔ اور اُس نے دیال سنگھ کا مال ہضم کرنے کے لئے یہ کھیل کھیل رکھا ہو۔ بہرحال جو بھی تھا لیکن میری دلچسپی اپنی جگہ برقرار تھی اور میں ہر قیمت پر ان خوفناک آوازوں کا راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اُس رات بھی یہی سوچتے سوچتے مجھ پر ہلکی ہلکی سی غنودگی طاری ہو گئی تھی۔ میری یہ خوابگاہ حویلی کے اس حصے میں واقع تھی جو زیادہ بہتر حالت میں تھا۔ اگرچہ اس کی دیواروں اور چھتوں کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا، لکڑی کے بنے ہوئے دروازے اور اُونچی اُونچی کھڑکیاں خستہ حالت میں تھیں۔ لیکن یہ کمرہ بالکل محفوظ تھا۔ غالباً دیال سنگھ اس دوران کوٹھی کے حصوں کی تزئین و آرائش کرتا رہا تھا۔ چنانچہ اس میں بھی اعلیٰ درجے کا فرنیچر موجود تھا۔ لیکن زمانہ قدیم کی چند کرسیاں، میزیں، لیمپ اور کراکری کا کچھ سامان بھی یادگار کے طور پر رکھ دیا گیا تھا۔ میرے کمرے کا دروازہ ایک راہداری میں کھلتا تھا۔ اور اس راہداری میں لاتعداد روغنی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ پتہ نہیں یہ تصویریں کس کس کی تھیں؟ لیکن اُن کے رنگ اور نقوش مدھم پڑ چکے تھے۔ اس جگہ کو زیادہ خوبصورت بنانے کے لئے تصویروں کے گرد لمبی لمبی سفید موم بتیاں روشن کی جاتیں اور اُن کی جھلملاتی اور کانپتی روشنی ان دیواروں پر پڑتی اور تصویریں زیادہ بھیانک نظر آتیں۔ البتہ اُن کے فریم خوبصورت اور مضبوط تھے۔ اس گیلری کے آخری سرے پر دوسرا دروازہ تھا جو اس حویلی کے آخری سرے پر کھلتا تھا، اور آسیب زدہ کمرے تک پہنچنے کے لئے تقریباً پانچ فٹ لمبی ایک اور راہداری عبور کرنی پڑتی تھی۔ اس گیلری اور راہداری کے دونوں دروازے بند کر دیئے جائیں تو مشرقی حصے میں پیدا ہونے والی آوازیں میرے کمرے تک آسانی سے نہیں آ سکتی تھیں۔

لیکن ٹھیک دو بجے جب میں نے ساز کی ہلکی ہلکی آواز سنی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ آواز میرے بالکل قریب بلکہ میرے کمرے کے دروازے کے سامنے سے آ رہی ہے۔ آواز اس قدر تیز تھی کہ میرے ہوش و حواس پوری طرح جاگ گئے اور میں بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اُس ساز پر غور کیا۔ اندازہ یہ تھا کہ یہ ساز اس سے پہلے کبھی نہیں سنا گیا، یا پھر اگر فلموں وغیرہ میں اس طرح کی آوازیں سنیں تو خاص طور سے جیسے عرب کے صحراؤں میں بدو دف بجاتے ہیں۔ کانپتی، لمبی اور سریلی آواز...... بجانے والا یقیناً ماہرِ فن تھا کیونکہ کچھ ہی لمحوں کے بعد مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت چھانے لگی۔ بالکل اسی طرح جیسے ناگ، بین بجانے والے کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، میرا بھی یہی حال ہوتا جا رہا تھا۔ رات کے دو بجے اس ویران اور سنسان قلعے میں کسی نا معلوم ہستی کے یوں ساز بجانے سے مجھ پر دہشت اور خوف کا جو غلبہ ہونا چاہئے تھا وہ بالکل نہیں تھا۔ اس کے برعکس دل میں ایک عجیب نوعیت کی فرحت اور

طبیعت میں اطمینان سا پیدا ہو رہا تھا۔ میں آہستہ سے اپنے بستر سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا، دروازہ کھولا تو گیلری میں روشنی نظر آئی لیکن یہ روشنی موم بتیوں کی نہیں تھی۔ دروازہ کھلا تو یوں لگا کہ جیسے ساز کی آواز پیچھے ہٹ کر گیلری کے دوسرے دروازے کی طرف چلی گئی ہو۔ اب مجھے کچھ ہوش آیا۔ میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا، پھر ایک دم میرے اندر خوف کا ایک احساس بیدار ہوا اور میں پھرتی سے کمرے میں واپس آ گیا۔ تکیے کے نیچے سے پستول نکال کر ہاتھ میں لے کر جب میں پلٹا تو گیلری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ البتہ ساز کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ میں دوبارہ کمرے میں گیا اور اس مرتبہ ٹارچ بھی لے آیا۔ مگر روشن نہیں کی، بلکہ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیلری کے دوسرے دروازے تک پہنچ گیا اور یہ جان کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ آواز اب اس آسیب زدہ کمرے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں ایک دم پیٹ کے بل فرش پر لیٹ گیا اور رینگ رینگ کر آگے بڑھنے لگا، دروازے کے پاس رُکا اور کان اُس کواڑ سے لگا دیئے۔ بلاشبہ ساز بجانے والا اندر موجود تھا۔ میں کچھ دیر تک کھڑا رہا، پھر سوچ کر میں نے دروازے پر ایک زوردار لات ماری۔ ایک شور کے ساتھ دروازہ کھلا اور دوسرے ہی لمحے میں نے ٹارچ روشن کر دی۔ آواز رُک گئی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ کمرہ بالکل خالی ہے۔ حالانکہ میرے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے یہ احساس ہو گیا کہ ان حالات میں یہ ریوالور میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

ٹارچ کی تیز روشنی کمرے کے تمام حصوں کو روشن کئے ہوئے تھی۔ جدھر بھی نگاہ ڈالتا، یوں محسوس ہوتا کہ یہ کمرہ تو صدیوں سے بند پڑا ہے، یہاں بھلا کوئی آواز کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ سناٹا اتنا ہولناک تھا کہ اعصاب زخمی ہوتے جا رہے تھے، رُوح تڑپ رہی تھی۔ ویسے آوازوں کا ایک دم ٹھہر جانا یقیناً خطرے یا کسی نئے عمل کا اظہار کرتا تھا۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ اس خاموشی میں کوئی راز ہے، میرے دل میں ایک ہی آواز اُبھر رہی تھی کہ کاش کمرے کی اس اعصاب شکن خاموشی میں شگاف پڑ جائے اور چیخنے چلانے اور سسکیوں کی آواز سنائی دے۔ یہ خاموشی تو ان آوازوں سے زیادہ بھیانک ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ آوازوں کے بغیر کمرے کی اس ہیبت کا احساس شعور کو نہیں ہوتا تھا جو دل و دماغ میں بیٹھ گئی تھی۔ میرے اندر جوش و خروش کی ایک ناقابلِ بیان لہر دوڑتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ جلتی ہوئی ٹارچ دیوار کے ساتھ رکھ کر کمرے کا چکر لگایا اور پاگلوں کی طرح دیواروں پر گھونسے مارنے اور پیروں سے فرش بجانے لگا۔ لیکن سنگین دیواروں اور سنگین فرش کے اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ جنوبی دیوار پر بہت بڑے آتش دان کے بائیں جانب کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے ان کھڑکیوں کے بند دروازوں کو خوب ٹھونک ٹھونک کر معائنہ کیا، لیکن کوئی نتیجہ خیز بات معلوم نہیں ہوئی۔ جنوبی دیوار پر بہت بڑے آتش دان کے دائیں بائیں کھڑکیاں تھیں۔ ان کھڑکیوں کو بھی میں نے اچھی طرح دیکھا۔ پھر میں نے اپنے سر کے کچھ بال اُکھاڑے اور زبان کے ذریعے کھڑکی کے بند دروازوں کے عین درمیان چپکا دیئے تاکہ کھڑکیوں کے کھلنے کا پتہ چل سکے۔ اگر اس خوفناک اور سنگین ڈرامے کے پس پردہ کچھ پراسرار لوگوں کی حرکت ہے اور وہ کھڑکیوں کے راستے باہر آتے جاتے

ہیں تو ان بالوں کے ہٹنے سے اس حقیقت کا سراغ مل سکتا ہے۔ کھڑکیوں سے فارغ ہو کر میں نے آتش دان کا معائنہ کیا، اس میں جلی ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر اب بھی موجود تھا۔ حیرت اور خوف کی ایک لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی اور میں آتش دان کو دیکھنے لگا۔

کمرے کی لمبائی اور چوڑائی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ آتش دان بہت بڑا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں اندازہ لگایا، پھر ٹارچ اُٹھائی اور آتش دان کے اندر قدم رکھے۔ پھر گردن اُوپر کر کے چمنی کی طرف دیکھا۔ آتش دان کی چمنی اتنی اُونچی اور تاریک تھی کہ ٹارچ کی روشنی تھوڑے ہی فاصلے پر جا کر بے اثر ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک چیز جو مجھے نظر آئی وہ ایک موٹا سا رسہ تھا، جو آگ میں جھلسنے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بوسیدہ اور چھوٹا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آتش دان کی دیوار کے ساتھ لوہے کے کئی مضبوط کڑے گھڑے ہوئے تھے اور ان کڑھوں سے دو دو فٹ لمبی آہنی زنجیریں بندھی ہوئی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر ان کڑوں اور رسیوں کا مقصد کیا ہے؟ بہت دیر تک میں ٹارچ کی روشنی کی مدد سے اُسے دیکھتا رہا، پھر فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں اس چمنی کا جائزہ ضرور لیا جائے گا۔ ممکن ہے ان آوازوں کا پراسرار راز چمنی کے سینے میں چھپا ہوا ہو۔ اچانک ہی آتش دان کے اندر مجھے ایک اور چیز دکھائی دی جس پر نظر ڈالتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ آتش دان کو کریدنے اور راکھ ہٹانے کے کام آنے والی لوہے کی موٹی اور لمبی سلاخ تھی جس کے ایک سرے پر پتھر لگا ہوا تھا۔ لیکن ٹارچ کی روشنی نے جو منظر میری آنکھوں کے سامنے نمایاں کیا تھا وہ یہ تھا کہ اس سلاخ کی ہتھی کے سرے پر گہرا سرخ خون جما ہوا تھا۔ بالکل تازہ اور خاصی تعداد میں...... میں نے ایک لمحے تک اپنے اعصاب پر قابو پایا۔ بھلا اس کا کیا سوال ہے کہ اس طرح یہ تازہ تازہ خون لوہے کی سلاخ کی اس ہتھی پر نظر آئے؟ چنانچہ میں نے ہاتھ لگائے بغیر اُس کو جھک کر اور قریب سے دیکھا۔ خون نہ صرف ہتھی پر جما ہوا تھا بلکہ سلاخ کے نچلے اور درمیانی حصے پر بھی موجود تھا۔ میں نے دماغ پر زور دیا، کیا یہ سلاخیں اس سے پہلے بھی یہاں پڑی ہوئی تھیں؟ اُس وقت اس پر تازہ خون کے دھبے کہاں سے آ گئے؟ یہ خون انسان کا ہے یا کسی جانور کا؟ اس قسم کے بہت سے سوالات بجلی کی طرح میرے ذہن میں آئے۔ اگر سلاخیں اس سے پہلے یہاں نہیں تھیں تو انہیں یہاں کون لایا؟ اور جو انہیں لایا وہ کمرے میں کس وقت اور کس راستے سے اندر داخل ہوا؟ جبکہ دروازہ تو باہر سے مقفل رہتا ہے۔ آنے والا یقیناً کھڑکی یا چمنی کے راستے اندر آ سکتا ہے اور یہ خون سو فیصدی یہاں موجود لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے لگایا گیا ہے۔ یہ سوچ کر میرا دل اُس نادیدہ دشمن کے خلاف نفرت اور حقارت سے بھر گیا اور میں نے بلند آواز سے کہا۔

"کر گئے نا غلطی دوستو، پتہ چل گیا تم کتنے پانی میں ہو؟ اگر تم یہ خون لگانے والی حماقت نہ کرتے تو شاید میں تمہیں بھوت سمجھتا۔ مگر اب نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اگر تم میری آواز سن رہے ہو تو سن لو، تمہارا مدمقابل دیال سنگھ نہیں بلکہ پورن لعل ہے۔ اور میں اچھے اچھے بھوتوں کو بھگانے کی سکت رکھتا ہوں۔" میں نے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور یوں لگا جیسے کمرے کی دیوار کا ایک ایک پتھر مجھے گھور رہا ہے، کچھ کہہ رہا ہے۔ لیکن میں پتھروں کی زبان نہیں جانتا تھا۔ میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بولو، کیا کہنا

چاہتے ہو تم؟" اپنی دیوانگی کا احساس ہونے کے باوجود میں چیخنے پر مجبور تھا۔ کمرے کا پُر ہول سناٹا میری رُوح میں سرایت کر رہا تھا۔ میں بپھرے ہوئے جنگلی سانڈ کی طرح کمرے میں پھرنے لگا۔ اس وقت میرے اندر کی جو کیفیت تھی میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ دل چاہ رہا تھا کہ یہ بھوت میرے سامنے آ جائیں اور میں انہیں اپنے دانتوں سے چبا جاؤں۔ انسانی فطرت کا ایک یہ انداز تھا جسے اس وقت میرے علاوہ دیکھنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن میں خود اپنی فطرت کو دیکھ رہا تھا، سوچ رہا تھا، سمجھ رہا تھا۔ میرے حلق سے پھر ایک آواز نکلی۔ "ڈر گئے نا...... اب ساز کیوں نہیں بجاتے؟ روؤ، چیخو، تمہارے رونے اور چیخنے سے میرا ارادہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اور جہاں تک دیال سنگھ کا تعلق ہے تو بس یہ سمجھ لو کہ اب اُسے میری حمایت حاصل ہے۔ وہ اوشا کماری سے شادی کرے گا اور ضرور کرے گا اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ تم میں سے کوئی اس قدر ذہین، سمجھدار اور چالاک نہیں ہے جو ہمیں اس کام سے روک سکے۔ ہمت ہے تو اب ہمیں روک لینا میرے پیارے بھوتو، کیا سمجھے؟" میں آتش دان کے پاس رُکا اور بری طرح ہانپنے لگا۔ میرا جسم پسینے سے تر تھا۔ اسی جوش کے عالم میں میں نے رِیوالور پھینک کر لوہے کی خون آلود سلاخ اُٹھا لی اور سلاخ کو چھوتے ہی جیسے بھونچال آ گیا...... کمرہ دفعتہً ہولناک آوازوں سے گونج اُٹھا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے آوازوں کے برچھے اور تلواریں چاروں طرف سے مجھ پر چل رہی ہیں۔

میں نے سلاخ فرش پر دے ماری اور لوہے کی مضبوط نہایت موٹی سلاخ نازک شیشے کی مانند فرش پر گری اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اُس کے اندر کے خون کے فوارے اُبل پڑے اور میں نے اُس اُبلتے ہوئے خون کو دیکھا۔ میرے اعصاب ایک دم سے کشیدہ ہو گئے اور میں نے کمرے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ دروازہ دھماکے سے بند کیا اور اپنی رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔ مگر گیلری کے سرے پر کوئی کھڑا ہوا تھا۔ میں اس قدر تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا کہ سنبھالنے کے باوجود کھڑے ہوئے پراسرار وجود سے ٹکرا گیا...... لیکن دوسری جانب سے جو چیخ سنائی دی تھی وہ اُس نیپالی ملازم کی تھی۔ نیپالی ملازم میری ٹکر سے بری طرح دیوار سے ٹکرایا تھا۔ پھر اسی وقت اور دوسری آوازیں سنائی دیں۔ "کون ہے...... کیا ہے......؟"

یہ آوازیں دیال سنگھ اور وکرم سنگھ کی تھیں۔ وہ خوفزدہ انداز میں باہر نکل آئے تھے۔ "کیا ہو گیا...... کہاں گئے تھے تم؟ کہاں سے آ رہے ہو......؟" بے شمار سوالات اُن لوگوں نے مجھ سے کئے اور میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُنہیں روکا کہ مجھے ذرا سانسیں لینے دو۔ پھر میں اُن کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا۔ "تم چلے کہاں گئے تھے؟ اور اس وقت تمہیں...... میرا مطلب ہے یہ آوازیں...... آخر تم کہاں تھے؟"

میں نے اندر جانے کے بعد ایک گلاس پانی طلب کیا اور پانی پینے کے بعد میں نے مختصر الفاظ میں اُنہیں یہ سارا قصہ سنا ڈالا۔ اُن کے چہرے بھی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ لمحوں کے بعد دیال سنگھ کے اندر بھی ایک جوش اُبھر آیا اور دیال سنگھ نے کہا۔ "کچھ بھی ہو جائے، واقعی کچھ بھی ہو جائے میرے دوست، تم میرا بہترین ساتھ دے رہے ہو۔ اگر تم جیسا ساتھی میرے ساتھ رہا تو یہ سمجھ لو کہ میں اوشا کماری سے شادی کر کے رہوں گا۔ میں اپنا ارادہ کبھی نہیں بدل سکتا بلکہ تمہاری اس کاوش سے تو مجھے اب

یقین ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بدرُوح نہیں بلکہ میرے وہی رقیب اور بدمعاش ہیں جو مجھ سے یہ حویلی خالی کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہو گا، اب ایسا بالکل نہیں ہو گا۔ اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ کمرے میں ہی سو جاؤ۔"

"بالکل نہیں...... میں ڈرتا نہیں ہوں۔ میں یہیں سوؤں گا، اور آرام سے سوؤں گا۔" میں نے کہا اور کافی دیر اُن سے باتیں کرنے کے بعد میں بستر پر سونے کے لئے لیٹ گیا۔

دوسرے دن صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے دیال سنگھ کو پیشکش کی کہ وہ میرے ساتھ چلے۔ چنانچہ ہم آسیب زدہ کمرے کی جانب چل پڑے۔ دیال سنگھ کو میں نے رات کے تمام واقعات بتا دیئے تھے اور میں اُسے سلاخ کے ٹکڑوں اور خون کے دھبے دکھانا چاہتا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو کمرہ پہلے کی طرح صاف اور خالی تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سلاخ آتش دان کے اندر پڑی ہوئی تھی لیکن اس پر نہ خون کے دھبے تھے اور نہ وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکیوں پر جس طرح بال چپکائے تھے وہ اسی طرح چپکے ہوئے تھے۔ میرا ریوالور ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا اور میں دیر تک وہاں حیران کھڑا رہا۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ "آؤ......!" دیال سنگھ اس طرح مجھے دیکھ رہا تھا جیسے اُسے میری دماغی حالت پر کچھ شبہ ہو گیا ہو۔

بہرحال یہ سارے معاملات اسی طرح چل رہے تھے۔ اُسی دوپہر کو دیال سنگھ، اوشا کماری سے ملنے چلا گیا۔ اُس کا بھائی وکرم سنگھ بندوق لے کر شکار کھیلنے چلا گیا تھا۔ نیپالی ملازم اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس حویلی کے اردگرد کوئی بستی، کوئی آبادی نہیں تھی، نہ کسی شخص کو میں نے ادھر سے گزرتے دیکھا تھا۔ نزدیک ترین بستی تقریباً سات کلومیٹر دُور تھی۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس حویلی میں مزید معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ ہو سکتا ہے مجھے کوئی ایسا عمر رسیدہ شخص مل جائے جو اس کے بارے میں جانتا ہو۔ چنانچہ میں نے فیصلہ دل میں کر لیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں ایک بار پھر اُس کمرے کی طرف چل پڑا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ مجھے بھی اس کمرے سے عجیب سی دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس مرتبہ میں نے سیڑھی لگا کر اُس کی چھت اور دیواروں کے مختلف حصوں کا بغور اور ٹھونک بجا کر جائزہ لیا۔ پھر میں حویلی کی چھت پر چڑھا، وہاں بھی کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو قابل ذکر ہوتی۔ چمنی کے اندر جھانکا، کچھ پتہ نہ چلا۔ اصل میں مجھے آواز کا مرکز درکار تھا اور وہ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اگر وہ آواز کسی مشین سے پیدا ہوتی ہے تو وہ مشین آخر کہاں چھپائی جا سکتی ہے؟ سلاخ میں سے خون کا نکل آنا تو خیر ایسی کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ بہت سے شعبدے باز ایسی چیزیں تیار کر سکتے تھے۔ یکایک مجھے ایک چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر کا خیال آیا جو میرے اٹیچی میں رکھا ہوا تھا۔ وہ بیٹری سے کام کرتا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر سخت غصہ آیا کہ مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہ آیا؟ میں اس کے ذریعے بڑی آسانی سے کمرے کی آوازیں ٹیپ کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں بے صبری سے رات کا انتظار کرنے لگا۔

شام کو جب دیال سنگھ واپس آیا تو وہ بے حد خوش تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اوشا کماری کے دل سے کمرے کی آوازوں کا ڈر نکال آیا ہے۔ دیال سنگھ نے اُسے جھوٹ موٹ مطمئن کر دیا کہ وہ آواز بدرُوح

کی نہیں بلکہ چمنی کے اندر سوراخ ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اب یہ سوراخ بند کر دیئے گئے ہیں۔ دیال سنگھ نے مجھے بتایا کہ اگلے اتوار کو اوشا کماری سے اُس کی شادی ہو جائے گی۔

"آج میں نے ساری باتیں اُس سے کر لی ہیں اور وہ میرے ساتھ اس حویلی میں رہنے کے لئے تیار ہو گئی ہے۔"

میں نے تشویش زدہ نگاہوں سے دیال سنگھ کو دیکھا اور کہا۔ "لیکن اس کے باوجود میں تمہیں اس کام سے منع کرنا چاہتا ہوں دیال سنگھ، ابھی جلد بازی سے کام مت لو۔ کیونکہ آوازیں تو بہرحال رات کو سنائی دیتی ہیں۔ اگر اوشا کماری نے یہ آوازیں سن لیں تو اُسے نہ صرف رنج ہو گا بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ تمہیں دغا باز سمجھ کر نفرت بھی کرنے لگے۔"

"اس کا حل میں نے سوچ لیا ہے۔" دیال سنگھ نے کہا۔

"کیا......؟"

"شادی کے بعد میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ میں اپنی بیوی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اب یہ بتاؤ کہ اس سلسلے میں کچھ اور کارروائی ہوئی ہے؟"

"نہیں۔ مگر میں مسلسل کارروائی کرنے کے موڈ میں ہوں۔" میں نے دیال سنگھ کو ٹیپ ریکارڈر لگانے کی سکیم سے آگاہ کیا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر ہم آوازوں کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ ٹھیک گیارہ بجے کمرے سے رونے کی ہلکی ہلکی آواز اُبھری جو بتدریج بلند ہوتی چلی گئی۔ ہم نے فوراً ہی ٹیپ ریکارڈر ساتھ لیا، ٹارچیں روشن کیں اور دبے پاؤں کمرے کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے رونے کی آوازیں لرزہ خیز چیخوں میں تبدیل ہو چکی تھیں اور گہرے سناٹے میں بلا مبالغہ دُور دُور تک سنی جا سکتی تھیں۔ لیکن یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ یہ آوازیں صرف قلعے میں رہنے والے ہی سن سکتے ہیں۔ بہرحال میں نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبایا اور مشین کے ایک خانے میں جلتی ہوئی سبز روشنی تھرتھرانے لگی۔ جس کا مطلب تھا کہ آواز ریکارڈ ہو رہی ہے۔ پندرہ منٹ تک رونے اور چیخنے کی آوازیں اور اس کے ساتھ ملی جلی ساز کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر میں نے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا اور اُسے اُٹھا کر ہم خوابگاہ میں لے آئے۔

میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر کو ریوائنڈ کر کے چلایا لیکن اس وقت ہم پر حیرت کے ساتھ جو دہشت طاری ہوئی، اس کا اندازہ ناممکن تھا...... ٹیپ ریکاڈر کا فیتہ ہماری نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا لیکن اس میں کوئی آواز نہیں تھی۔ دیال سنگھ نے رُومال سے چہرے پر آ جانے والا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"کہیں یہ ٹیپ ریکارڈر خراب تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ اس میں وہ تمام تر علامات موجود ہیں جو ریکارڈنگ کے وقت ہو جاتی ہیں۔"

"لیکن پھر وہ آواز کہاں گئی؟"

"دیکھو، یہ رہا مائیکروفون۔ تم کچھ بولو۔ دیکھیں، آواز بھرتی ہے یا نہیں؟"

دیال سنگھ کی آواز ریکارڈ ہوگئی تھی۔ یہ کیا راز تھا کہ ٹیپ ریکارڈر نے کمرے کی آوازیں ریکارڈ نہیں کیں؟ شاید اس لئے کہ وہ آوازیں اس بے جان مشین نے سنی ہی نہیں۔ دیال سنگھ کی حالت خراب ہوگئی اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس کے دانت بج رہے تھے اور جسم کا سارا خون چہرے پر آتا جا رہا تھا اور آہستہ آہستہ اُس پر بے ہوشی سی طاری ہوگئی۔

میں نے فوراً ہی وکرم سنگھ اور نیپالی ملازم کو اطلاع دی اور ہم سب نے رات کا باقی حصہ دیال سنگھ کے سرہانے بیٹھ کر کاٹا۔ صبح سے پہلے اُس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے گھورنے لگا۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن عجیب وغریب کیفیت ہو رہی تھی اُس کی۔ پھر اُس کی آواز اُبھری۔ ''جاؤ..... اوشا کماری کو بلا لاؤ۔ تم نے سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟ اُسے بلا لاؤ۔'' یہ کہہ کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں اور وکرم سنگھ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''سرسامی کیفیت ہے۔'' وکرم سنگھ نے کہا۔ پھر بولا۔ ''کیا اوشا کماری کو بلا لایا جائے؟'' میں سمجھتا ہوں کہ یہ ضروری ہے۔ ورنہ یہ ہمیشہ کے لئے پاگل ہو جائے گا۔'' یہ الفاظ سن کر دیال سنگھ کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ یقیناً اُس نے یہ جملہ سن لیا تھا لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ وکرم سنگھ اسی وقت اوشا کماری کو لانے کے لئے تیار ہوگیا۔ وہ قریبی قصبے میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔

بہرحال جب سورج نکلا تو دیال سنگھ گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس کا تھرتھراتا جسم ساکت ہوگیا تھا۔ میں چونکہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لئے نیپالی ملازم کو دیال سنگھ کی نگرانی پر چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹتے ہی بے خبر سو گیا۔ شام کو آنکھ کھلی تو وکرم سنگھ میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا۔ ''اوشا کماری اس حویلی میں آنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لیکن جب اُس نے دیال سنگھ کی بیماری کا حال سنا تو وہ آ گئی اور اب وہ دیال سنگھ کے کمرے میں موجود ہے اور اُس کی تیمارداری کر رہی ہے۔ دیال سنگھ کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ ویسے میں ڈاکٹر کو بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اُس نے بڑے عجیب وغریب انداز میں دیال سنگھ کا جائزہ لیا ہے اور خاص طور سے اُس لڑکی سے کہا ہے کہ وہ وہیں قیام کرے اور اس کی دیکھ بھال کرے۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ اس وقت وہاں اُس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ ادھر ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ میں ایک خاص شخصیت سے رابطہ قائم کر لوں اور اُسے یہاں طلب کر لوں۔ چنانچہ یوں سمجھ لو کہ میں یہاں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ اب مجھے بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟''

پورن لعل کے ان الفاظ پر روپا چونک پڑی۔ اشیش بھگونت نے اُسے یہاں بھیجا تھا لیکن اس قدر تفصیلات نہیں بتائی تھیں۔ جو صورتحال پورن لعل نے بتائی تھی اس کے تحت تو بالکل ہی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خود روپا کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہے؟ پورن لعل نے کہا۔

''اور ڈاکٹر تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں نے ساری تفصیل تمہیں بتا دی۔ یہ میری ڈیوٹی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے یہ ہدایات دی تھیں۔''

روپا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کون ہے؟ بہرحال اُس نے کہا کہ اب یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟

''میرا خیال ہے ہمیں وہاں پہنچنا ہے۔ ڈاکٹر وہاں تمہارا منتظر ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو میں تیار ہوں۔''

''میں نے ایک گھوڑا گاڑی تیار کر رکھی ہے تمہیں وہاں تک سفر کرانے کے لئے۔'' پورن لعل بولا۔

''میں تیار ہوں......!'' اور اس کے بعد روپا گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر پورن لعل کے ساتھ روانہ ہوگئی۔

اشیش بھگونت کی منتخب کردہ دوسری لڑکی نجانے اُس کے عمل کا کون سا حصہ پیش کر رہی تھی؟ گھوڑا گاڑی تیز رفتاری سے حویلی کی جانب روانہ ہوگئی۔ رات انتہائی سرد اور تاریک تھی۔ ابھی مشکل سے آدھا ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ آسمان پر بادل گرجنے لگے اور بجلی کی کڑک چمک تیز ہوتی چلی گئی۔ طاقتور گھوڑے اس طوفان سے بدحواس ہو کر سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ اگر گھوڑے ٹھوکر کھا کر گر پڑے تو سواریوں کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ طوفان کا شور لحہ بہ لحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بجلی ایسے چمک رہی تھی جیسے زمین سے آسمان تک اس نے رابطہ قائم کر لیا ہے۔ گھوڑے اس کے باوجود دوڑتے رہے۔ بارش آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ بہرحال بارہ بجنے میں سات منٹ باقی تھے جب بگھی حویلی کے نزدیک پہنچ گئی۔

سیاہ بادل چھٹ چکے تھے اور اب پھوار بھی بند ہو چکی تھی۔ سفید سفید بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا چاند حیرت سے گرد و پیش کا منظر تک رہا تھا۔ انتہائی پراسرار اور ہولناک منظر طاری تھا جو حویلی کے ماحول کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ اس بڑے کمرے میں روشنی تھی جہاں دیال سنگھ، کرم سنگھ اور نیپالی ملازم اوشا کماری کے ساتھ موجود تھے۔ روپا اور پورن لعل کمرے میں داخل ہو گئے۔ مدھم روشنی اوشا کماری کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور ایسا سلگتا ہوا سا حسن اس پر قائم تھا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے۔ پورن لعل نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

''ڈاکٹر کہاں گئے؟ انہوں نے اپنی خاتون کو طلب کیا تھا، یہ آ گئی ہیں۔ غالباً یہ نرس ہیں جو دیال سنگھ کی تیمارداری اور اس کی دیکھ بھال کریں گی۔ یا ہو سکتا ہے یہ ان ڈاکٹر صاحب کی اسسٹنٹ ہوں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کدھر گئے؟''

''ابھی واپس آ رہے ہیں۔'' وکرم سنگھ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ نجانے کیوں اُس پر ایک عجیب سی ہیبت طاری ہوگئی تھی۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر دروازے سے ڈاکٹر اندر داخل ہوا اور روپا اُسے دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ یہ اشیش بھگونت تھا جو اپنے اصل رُوپ میں اُن کے سامنے آیا تھا...... پورن لعل اور دوسرے لوگ اُسے دیکھ کر چونک پڑے، کیونکہ اس وقت اُس کے جسم پر ایک لمبا سیاہ لبادہ تھا اور وہ ایک عجیب سی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ پیلا اور چمکدار آنکھیں وحشت زدہ انداز میں سیدھی اور پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ سب اُسے دیکھ کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ پھر وکرم سنگھ کے منہ سے نکلا۔

''ڈاکٹر صاحب......''

''نہیں...... وہ جانتی ہے میں کون ہوں؟'' اشیش بھگونت کی آواز اُبھری اور پھر اُس نے اپنے

مخصوص انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''تم یہاں کے اس ماحول میں پناہ کی تلاش میں ہو۔ لیکن اُس وقت جب اُس بیچارے لڑکے کی لاش اُلٹی لٹکی ہوئی تھی جس کا نام سورج سنگھ تھا تو تم میں سے کوئی اُس کی دیکھ بھال کے لئے موجود نہیں تھا۔ دیال سنگھ، تمہیں پتہ ہے تم کون ہو؟ تم چندر بھان کے بیٹے سورج سنگھ ہو۔ اور ویر سنگھ کی بیٹی سروجہ یہ دیکھو موجود ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ کیا تمہیں یاد نہیں ہے؟ کیا تم بھول گئے ہو سورج سنگھ کہ اس لڑکی نے تم پر الزام لگایا تھا کہ تم زبردستی اسے بہکا کر اپنے قبضے میں کرنا چاہتے ہو اور اس کے باپ نے اپنی دشمنی تم سے نکالی تھی۔ اُس وقت سورج سنگھ، تم نے سوگند کھائی تھی کہ تم ان لوگوں سے بدلہ لو گے۔ اور اس سمے تم میرے سائے میں آ گئے تھے۔ کیا سمجھے؟ یاد کرو تم اپنی سوگند کو۔ میں نے تمہیں اُسی وقت اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور سمے تیار کر رہا تھا کہ وقت آنے پر تم اپنی قسم پوری کر سکو اور دیکھو، اس سے اچھا وقت اور کوئی نہیں ہو گا۔ روپا، چلوان کا انتم سنسکار کر دو۔ ہمارا کھیل ایسا ہی ہوتا ہے۔''

روپا مشینی انداز میں واپس مُڑی اور اس کے بعد اُس نے پورے کمرے میں پٹرول ڈال دیا۔ پٹرول کے یہ ڈبے اُسے باہر سے مل گئے تھے۔ دیال سنگھ، وکرم سنگھ، اوشا کماری اور خود پورن لعل شدتِ دہشت سے کھڑے ہو گئے تھے۔ اسی وقت رونے اور چلانے کی بھیانک آوازیں اُبھرنے لگیں اور اچانک ہی دیال سنگھ کا جسم زمین پر گر پڑا۔ اُس میں سے ایک اور وجود نمایاں ہوتا جا رہا تھا...... شکل و صورت دیال سنگھ کی تھی۔ لیکن یہ...... یہ انوکھی بات تھی کہ دیال سنگھ لاش کی صورت میں پڑا تھا اور دوسرا دیال سنگھ جو اُس کی آتما تھی سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ روپا نے اُسے ماچس پیش کی تو وکرم سنگھ چیخ پڑا۔ ''نہیں نہیں...... ہمارا قصور کیا ہے؟''

''تم سب اس بات کے گواہ ہو کہ سورج سنگھ نے اپنا بدلہ لے لیا اور وہ میرا چیلا بن گیا تھا۔''

''ہاں اشیش بھگونت، میں تیرا غلام ہوں۔'' یہ کہہ کر اُس نے ماچس کی تیلی جلائی اور زمین پر پھینک دی۔ شعلوں نے اس طرح آگ پکڑی کہ کسی ایک کو بھی وہاں سے نکلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اوشا کماری، خود دیال سنگھ، پورن لعل سارے کے سارے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے...... وہ کمرے کا دروازہ تلاش کر رہے تھے، لیکن دروازہ گم ہو گیا تھا۔

تب اشیش بھگونت نے روپا کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ، تمہارا پہلا کام ختم ہوا ہے۔ تمہیں اسی طرح کے کام سرانجام دینے ہیں۔ میں ہر اُس شخص کا ساتھی ہوں جو نیکیوں کی جانب قدم نہیں بڑھائے گا اور برائیوں کا ساتھ دے گا۔ آ جاؤ...... انہیں جلنے دو۔'' یہ کہہ کر اشیش بھگونت واپس مُڑا۔ دروازہ صرف اُسے اور روپا کو نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ وہ اس دروازے سے باہر نکل گیا۔ آہستہ آہستہ حویلی کے در و دیوار آگ پکڑ رہے تھے اور سات آٹھ میل دُور بستی سے اس حویلی سے بلند ہونے والے شعلے نظر آ رہے تھے۔ شیطان اپنا کام کر چکا تھا اور خوفناک لڑکیاں شیطانی ارادوں کو عملی جامہ پہنا رہی تھیں، جیسے روپا نے اپنا کام سرانجام دیا تھا۔

لیکن راگنی ابھی تک راوت رائے کے محل میں اپنے کام میں مصروف تھی۔ یہاں اُسے بے پناہ

عزت ملی تھی۔ راوت رائے کے لئے اس سے بڑی شخصیت کسی اور کی کیا ہو سکتی تھی جس نے اُس کے بیٹے کا جیون بچا لیا تھا۔ ورنہ وہ تو اولاد سے محروم ہو رہا تھا۔ ادھر یشونت رائے، راگنی سے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کر چکا تھا اور راگنی نے ابھی تک اُسے کوئی مناسب جواب نہیں دیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے؟ راوت رائے اُس کے سامنے تھا۔ اُس کا بیٹا یشونت رائے اور اُس کا سارا خاندان سب لوگ موجود تھے۔ راگنی سوچ رہی تھی کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اسے آغاز کہاں سے کرنا چاہئے؟ پھر ایک دن اُس نے فیصلہ کیا کہ راوت رائے کو ناگن بن کر ڈس لے اور اسے زندگی سے محروم کر دے۔ وہ اس فیصلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہی تھی کہ اچانک ہی اُسے اپنے عقب میں سرسراہٹ سنائی دی۔ جس کمرے میں وہ مقیم تھی اُس کا دروازہ بند تھا۔ چنانچہ اُس نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو اشیش بھگونت اُس کے سامنے موجود تھا۔ راگنی کے چہرے پر عقیدت کے آثار بیدار ہو گئے۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر جھکی اور اُس کے منہ سے آواز نکلی۔ ''جے بھگونتا۔''

''ہمارا اشیرباد رہے تجھے۔ جو کچھ تو اس وقت سوچ رہی تھی اس نے ہمیں تیرے پاس آنے پر مجبور کر دیا۔''

''اشیش بھگونت کی داسی جو کچھ سوچ رہی تھی، کیا اشیش بھگونت کے خیال میں وہ سب مناسب نہیں ہے؟''

''نہیں......'' شیطان کی آواز اُبھری اور راگنی نے چونک کر اُس مکروہ صورت والے کو دیکھا۔ شیطان کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ راگنی سوالیہ انداز میں اُسے دیکھتی رہی تو کچھ دیر کے بعد اُس نے کہا۔ ''دیکھ، راوت رائے تیرے پتا کا قاتل ہے۔ راوت رائے نے تیرے اور تیری بہنوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بھی تجھے یاد ہے۔ تو راوت رائے کو مار دے گی، اس کے بیٹے یشونت رائے کو مار دے گی تو کیا فائدہ ہو گا تجھے؟ کبھی کبھی سمے کہتا ہے کہ دشمن کی بھی رکھشا کی جائے۔ دشمن جیتا رہے تو دشمنی جیتی رہے گی۔ دشمن مر گیا، دشمنی ختم۔ راوت رائے کو ابھی بہت عرصے زندہ رہنا ہے۔ اُس کے بیٹے یشونت رائے کو بھی زندہ رہنا چاہئے۔ تو نے کبھی مجھ سے پوچھا نہیں کہ کیا صرف اس مسئلے میں راوت رائے ہی شریک تھا۔ میں تجھے بتاؤں راوت رائے کا مشیر ہے لاکھن سنگھ۔ وہ راوت رائے کے ساتھ ساتھ رہا ہے۔ اور لاکھن سنگھ کا ایک بیٹا ہے سورن سنگھ۔ کھیل، لیکن اتنا لمبا کھیل کہ کھیلنے کا مزہ آئے۔ یہ سب وہ عمل پسند ہیں جو اپنے کام کر کے سوچتے ہیں کہ جیون میں انہوں نے سب کچھ پا لیا۔ اور جو یہ سوچے وہ ہی میرا دشمن ہے۔ پہلے میرا اور تیرا کام تو یہ ہے کہ اس سنسار میں بسنے والے جتنے لوگ سکھی ہیں اُنہیں دُکھ کا شکار کر دیا جائے۔ سکھی لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ اب تو دیکھ، رام نام جپتے رہتے ہیں، جے رام، جے رام، جے رام۔ ان لوگوں کو اگر دُکھوں میں مبتلا کر دیا جائے تو یہ اپنے آپ کو ہی نہیں بھگوان کو بھی گالی دیں گے۔ اور میرا تو زندگی کا مقصد ہی یہ ہے۔''

''جے بھگونتا، تو پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟''

''کھیل لمبا کھیل۔ تیری ڈیوٹی میں نے یہیں لگا دی ہے۔ بہت بڑا پریوار ہے راوت رائے کا۔ اور

اپنے آپ کو بڑا بلوان سمجھتا ہے۔ بس اُس سے اُس کی شکتی چھیننی ہے، دربدر بھٹکا دینا ہے۔ سڑکوں پر کتوں کی طرح مارا مارا پھرے گا، زمین پر گھسٹتا پھرے گا تو سمجھ لے تیرا بدلہ بھی پورا ہو جائے گا اور میرا کام بھی۔"

"مجھے صلاح دیتے رہا کریں مہاراج، میں خود اتنی چالاک نہیں ہوں۔ بے شمار باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اب آپ نے یہ سارے نام لئے ہیں تو مجھے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"نہیں...... بالکل نہیں۔ جب تو میری پیروکار بن گئی ہے تو میرا دماغ بھی تیرے پاس ہونا چاہئے۔ عقل کی شکتی بھی تیرے پاس ہونی چاہئے۔ تبھی تو میرا مقصد پورا ہوتا ہے۔ بس، میں نے دو نام لے دیئے ہیں تیرے سامنے لاکھن سنگھ اور سورج سنگھ۔ دونوں یہیں رہتے ہیں، فاصلہ نہیں ہے۔ ذرا کھل کر ہاتھ پاؤں نکال۔ یہ لوگ تو تیری بڑی عزت کرتے ہیں۔ تیرا راستہ روکنے والا تو کوئی بھی نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے مہاراج، میں جانتی ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے۔" اچانک ہی راگنی کے ہونٹوں پر بھی ایک بھیانک مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ لڑکیاں جو کبھی کسی زمانے میں انتہائی معصوم، خوش اخلاق اور ہنس مکھ ہوا کرتی تھیں، اب انتہائی خوفناک لڑکیاں بن چکی تھیں۔ بہرحال شیطان تو غائب ہوگیا۔ راگنی سوچنے لگی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے؟ پھر وقت نے اُسے خود ہی موقع فراہم کر دیا۔

حویلی میں ایک جشن منایا جا رہا تھا۔ راوت رائے کی بیٹی جو شادی شدہ تھی، اُس کی سالگرہ تھی۔ اُس کا پتی اور پتی کا پریوار بھی آیا ہوا تھا۔ تیاریاں ہونے لگیں اور ایک بہت ہی اچھی محفل سجی۔ اس محفل میں راگنی نے پہلی بار سورن سنگھ کو دیکھا۔ سچ بات تو یہ تھی کہ یشونت رائے سے زیادہ خوبصورت تھا۔ دودھ جیسا سفید رنگ، بھرے بھرے بدن کا مالک۔ ایک عجیب سی مردانہ شان جھلکتی تھی اُس میں۔ راگنی نے گہری نگاہوں سے اُس کا جائزہ لیا تو اُسے یہ نوجوان بہت پسند آیا۔ لیکن یہ بات اپنی پسند کی نہیں تھی، یہاں تو انتقام کا کھیل ہو رہا تھا۔ یہ بات اشیش بھگونت کے ذریعے ہی راگنی کو پتہ چلی کہ خود لاکھن سنگھ بھی اُس کے پتا کی موت میں شریک تھا۔ چنانچہ اُس کے دل میں محبت کی بجائے نفرت کا طوفان امڈ آیا۔ پھر وہ اپنا اسلحہ تیار کرنے لگی۔ اُس نے ایک سپیرن کا لباس پہنا اور کچھ اس انداز میں اپنے آپ کو بنایا سنوارا کہ دیکھنے والی آنکھ ایک نگاہ دیکھنے کے بعد اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائے اور بار بار دیکھنے کی حسرت کرے۔ محفل لگ چکی تھی۔ یشونت رائے کا خاص ملازم راگنی کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک دی تو راگنی باہر آئی۔ ملازم کہنے لگا۔

"مہاراج یشونت رائے اور راوت رائے نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے دیوی جی۔ اُن کا کہنا ہے کہ آپ ابھی تک سبھا میں نہیں آئیں۔ کیا بات ہے؟"

"بس، اُنہیں اطلاع دو میں پہنچنے والی ہوں۔"

ایک بہت ہی خوبصورت جگہ یہ سارا پنڈال سجایا گیا تھا۔ راگنی آہستہ آہستہ اُس پنڈال میں پہنچ گئی۔ اور جب وہ پنڈال میں پہنچی تو دیکھنے والی نگاہیں بے خود ہوگئیں۔ راگنی خاص طور سے سورن سنگھ کے سامنے سے گزری تھی اور سوران سنگھ نے پہلی بار اُس مجسمۂ حسن کو دیکھا تھا اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ادھر

یشونت رائے کی آنکھیں بھی راگنی پر لگی ہوئی تھیں۔ راوت رائے نے راگنی کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور کہا۔ "تم اتنی دیر سے کیسے آئیں بیٹی؟ کیا انتظار کر رہی تھیں کہ تمہیں اس سبھا میں آنے کی دعوت دی جائے؟"

"نہیں مہاراج، دیر ہوگئی۔ معافی چاہتی ہوں۔"

"تم ہمیں اتنی پیاری ہو کہ اب تم سے یہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس حویلی میں جو کچھ ہے، اور لوگ جس طرح رہتے ہیں، تمہارے لئے بھی یہاں وہ سب کچھ موجود ہے۔ کسی طرح کی چنتا مت کرنا۔ بیٹھو، آرام سے بیٹھو۔"

پھر رقص و موسیقی شروع ہوگئی۔ راگنی کو آج اپنا کام پورا کرنا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی رقص کرنے کے لئے کھڑی ہوگئی۔ اور شاید یہ اس شیطان کی دی ہوئی شکتی ہی تھی کہ اُس نے ایسا ناچ ناچا کہ دیکھنے والے دانتوں میں اُنگلیاں دبا کر رہ گئے۔ سورج سنگھ تو جیسے پتھرا گیا تھا۔ یشونت رائے کی آنکھوں میں کامیابی کی مسکراہٹ تھی۔ وہ یہ جانتا تھا کہ راگنی اُس کی ملکیت ہے، اور اب بھلا کون راگنی کو اس سے چھین سکتا ہے۔ وہ راگنی کو اس نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن سورن سنگھ کے دیکھنے کے انداز میں خاصی تبدیلی تھی۔ بہرحال رات گئے خوب دیر تک یہ سبھا جمی رہی اور اس کے بعد ختم ہوگئی۔

راگنی اپنی آرام گاہ میں آ گئی تھی۔ وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ اُس نے اپنے کام کا آغاز صحیح انداز میں کر دیا ہے۔ سورن سنگھ شکل و صورت سے ہی زخمی نظر آ رہا تھا اور یہی ہوا۔ راگنی رات دیر تک جاگی تھی۔ دیر تک سوتی رہی۔ جاگی تو اُس کی خاص خادمہ نے اُسے اطلاع دی۔

"دیوی جی، مہاراج سورن سنگھ صبح سے آئے بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا کہ دیر سے سونے کی وجہ سے آپ دیر سے اُٹھیں گی۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ جب وہ جاگ جائیں گی تب اُن سے مل کر جائیں گے۔" راگنی نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔ پھر اس کے بعد اُس نے تیار ہونے میں بھی خاصا وقت لیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گئی جہاں سورن سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔

سورن سنگھ کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ساری رات نہیں سویا۔ اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔ راگنی نے دونوں ہاتھ جوڑے تو سورن سنگھ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا، پھر بولا۔ "دیوی جی، شما چاہتا ہوں آپ مجھے بے شک نہیں جانتی ہوں گی، لیکن میں آپ کو جانتا ہوں۔ اور ویسے بھی دیویاں اپنے داسوں کو نہیں جانتیں جبکہ داس ان کی پوجا کرتے ہیں۔ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں دیوی جی، آپ نے یشونت رائے کا علاج کیا تھا اور وہ ٹھیک ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سے آپ یہیں حویلی میں رہنے لگیں۔ دیوی جی، پہلے میں نے کبھی آپ پر غور نہیں کیا تھا۔ لیکن کل جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے میرے اوپر ایک عجیب سی دیوانگی سوار ہوگئی ہے۔ دیوی جی، میں سوچتا ہوں کہ انسان کو من کی ہر بات صاف گوئی سے کر دینی چاہئے۔ اس طرح تقدیر کے فیصلے آسان ہو جاتے ہیں۔ میرے من میں آپ کے لئے بہت بڑی جگہ پیدا ہو چکی ہے۔ آپ بھگوان کے لئے کچھ کریں۔ میرے سینے پر تسلی کا ہاتھ رکھیں دیوی جی، میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جیون بھر

سکھی رکھوں گا آپ کو۔ آپ جو چاہیں گی وہ کروں گی۔ آپ اگر چاہیں گی تو یہ حویلی چھوڑ دُوں گا۔ آپ اگر الگ گھر لے کر رہنا چاہیں گی تو اس گھر میں آپ کو سنسار کی تمام خوشیاں اکٹھی کر دُوں گا۔"

راگنی خاموشی سے یہ ساری باتیں سنتی رہی، پھر جب وہ خاموش ہوئی تو وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ نے تو اتنا کچھ دے دیا مجھے سورن سنگھ مہاراج، کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس میں سے کیا کیا لوں؟"

"کیا دیا میں نے آپ کو؟"

"اتنی ساری باتیں کر دی ہیں آپ نے۔ یہ دُوں گا، وہ دُوں گا، یہاں رکھوں گا، وہاں رکھوں گا۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ میں آپ سے کیا کہوں؟"

"آپ صرف اتنا کہہ دیجئے کہ آپ بھی مجھے ناپسند نہیں کرتیں۔"

"نہیں نہیں...... بھلا ناپسند کرنے کا کیا سوال ہے؟ آپ سندر ہیں، جوان ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس حویلی کے ایک اہم آدمی ہیں۔ ناپسند کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ پھر بھی ابھی اس بارے میں اتنا فاصلہ طے نہ کریں۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھ تو لیں، ایک دوسرے سے مل کر بات تو کریں۔ کون کیا ہے اور کیسا ہے یہ تو پتہ چلنا چاہئے۔"

"ہاں بالکل۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھ لینا چاہئے۔ اچھا، یہ بتایئے رات کو باغ میں مجھ سے ملیں گی نا؟ باغ کے پچھلے حصے میں جہاں تین درخت سر جوڑے کھڑے ہیں وہ بہت اچھی جگہ ہے۔"

راگنی نے سحر خیز نگاہوں سے سورن سنگھ کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔ "میں آ جاؤں گی۔ اب آپ جایئے، کوئی آپ کو یہاں دیکھ نہ لے۔"

"مجھے اس بات کی کوئی چِنتا نہیں ہے۔ دیکھتا ہے تو دیکھ لے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہئے۔"

"کیوں؟"

"اس کی وجہ میں آپ کو رات کو ہی بتاؤں گی۔"

کام پورا ہو گیا تھا۔ راگنی خوش تھی کہ وہ اشیش بھگونت کے بتائے ہوئے اشاروں پر صحیح انداز میں کر رہی ہے۔

رات کو پھر سولہ سنگھار کر کے وہ درختوں کے اس جھنڈ کے پاس پہنچ گئی جہاں سورن سنگھ پہلے سے موجود تھا۔ پتہ نہیں کب سے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ راگنی نے اُسے دیکھا اور چونک کر بولی۔ "ارے، میں سوچ رہی تھی کہ میں ہی وقت سے پہلے آ گئی۔ مگر آپ......؟"

سورن سنگھ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "میں تو نجانے کب سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"اس طرح مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

"نہیں نہیں، میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہا۔ میں سچ مچ تم سے اتنا ہی پریم کرنے لگا ہوں۔ کہیں جی ہی نہیں لگتا۔ اچھا، یہ بتاؤ تم نے میری بات پر غور کیا؟"

"غور تو کر لیا ہے میں نے۔ پر ایک بڑی مشکل ہے میرے لئے۔"

"کیا؟"

"آپ نہیں جانتے؟"

"مگر مجھے بتاؤ تو سہی۔"

"یشونت رائے مہاراج میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ میں اُنہیں بالکل پسند نہیں کرتی۔ پر وہ دن رات ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہیں، مجھ سے شادی کر لو، مجھ سے شادی کر لو۔ میرا من تو یہ چاہتا ہے کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر کیا کروں، راوت رائے مہاراج نے روکا ہوا ہے۔ وہ مجھے جانے ہی نہیں دیتے۔"

سورن سنگھ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اُس نے خونی آنکھوں سے راگنی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یشونت رائے تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی کسی کو مجبور نہیں کر سکتا۔ تم نے تو اُس کا جیون بچایا ہے۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ جو چاہے کر ڈالے۔ اگر تم اُسے پسند نہیں کرتیں تو کھل کر کہہ دو۔"

"میں جانتی ہوں وہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ بہت خطرناک ہے۔"

"خاک خطرناک ہے۔ میں اُسے اپنے راستے میں نہیں آنے دُوں گا، یہ بات میں بتائے دے رہا ہوں تمہیں، اور خاص طور سے اس شکل میں کہ تم اُسے پسند بھی نہیں کرتیں۔"

"جو کچھ بھی ہے سورن سنگھ مہاراج، میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ میں بتا چکی ہوں کہ میں اس سنسار میں بالکل اکیلی ہوں، ماتا پتا مر چکے ہیں۔ کوئی بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں میرے لئے کوئی ایسا کام کرنا بڑا مشکل ہے جس سے مجھے کسی کی دشمنی مول لینا پڑے۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر یہ کام میں خود کر لوں گا۔" سورن سنگھ نے کہا۔ راگنی کافی دیر تک سورن سنگھ سے باتیں کرتی رہی۔

خوب رات ہو گئی تو اُس نے کہا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"من تو چاہتا ہے کہ میں سارا جیون اسی طرح بیٹھا رہوں۔"

"آپ حویلی کے کون سے حصے میں رہتے ہیں؟" راگنی نے سوال کیا۔

"کیا میرا کمرہ دیکھو گی؟"

"کیا حرج ہے؟" وہ بولی اور سورن سنگھ خوشی خوشی ایک خفیہ راستے سے اُسے اپنے کمرے تک لے گیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

اُس نے کہا۔ "من چاہتا ہے سارا جیون اسی طرح گزار دُوں۔"

"یہ تمہاری مسہری ہے؟" راگنی نے ایک بہت ہی خوبصورت اور بڑی سی مسہری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... اور اگر تم نے مجھے من سے سویکار کر لیا تو پھر یہ تمہاری بھی ہو گی۔"

راگنی مسہری پر جا کر لیٹ گئی۔ سورن سنگھ اُس کے پاس آ بیٹھا۔ وہ محبت بھری نگاہوں سے راگنی کو دیکھ رہا تھا۔ راگنی کو بھی بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ سورن سنگھ نے محبت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا اور اُس پر ایک سحر سا طاری ہونے لگا۔ پھر اُس کے ہوش و حواس رخصت ہو گئے۔ وہ مسہری پر آ کر لیٹ

گیا۔ راگنی اُسے دیکھتی رہی۔ سورن سنگھ کو پوری طرح اپنے جال میں پھانسنے کے لئے اس پر اپنی محبت کا بہت زیادہ اثر ڈالنا ضروری تھا۔ جو کھیل اشیش بھگونت نے اُسے سونپا تھا اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا اب اُس کا فرض تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سورن سنگھ گہری نیند سو گیا تو راگنی اُسے دیکھتی رہی۔ اُس کے ذہن میں نجانے کون کون سی منصوبے آ رہے تھے اور اپنے منصوبوں کی بنا پر وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ نجانے کہاں سے نیند اُس کی آنکھوں میں داخل ہو گئی۔ اور اُس نے جو آخری لمحات میں سوچا تھا وہ یہ تھا کہ پہلے اس پریوار کو ختم کرے گی اور اس کے بعد ناگن بن کران سب کو ڈس لے گی۔ آخری آدمی راوت رائے ہو گا۔ میں ناگن بن کران کو ڈس لوں گی...... اُس نے دل میں سوچا اور اُسے نیند آ گئی۔ لیکن اُس کی سوچ عمل پذیر ہو گئی۔ یہی اشیش بھگونت نے کہا تھا۔ ایک طرف سورن سنگھ سو رہا تھا اور اُس کے برابر سیاہ رنگ کی ایک ناگن تکیے پر سر رکھے پڑی ہوئی تھی...... یہاں تک کہ رات چپکے سے گزر گئی۔ اور جب سورج کی پہلی کرن نے کمرے میں جھانکا تو سورج سنگھ جاگ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا کہ اُسے رات کو اچانک نیند کیسے آ گئی؟ اس کے بعد جب اُسے راگنی یاد آئی تو اُس نے گردن گھما کر دیکھا، اُس کے برابر ہی بستر پر ایک کالی ناگن سو رہی تھی......سورن سنگھ کے حلق سے نکلنے والی دہشت بھری چیخ اس قدر زوردار تھی کہ باہر موجود نوکر نوکرانیاں بھی اُچھل پڑے تھے......!

❁❁❁

سورن سنگھ اس ناگن کو دیکھ کر بے اختیار چیخ پڑا تھا۔ لیکن ایک دم اُسے احساس ہوا کہ کہیں یہ صرف اُس کا سپنا تو نہیں ہے؟ اُس نے دوسری بار ناگن کو دیکھا اور پھر اس طرح مسہری سے نیچے چھلانگ لگا دی کہ دھڑام سے زمین پر گرا۔ مسہری زور سے ہلی تو ناگن بھی جاگ گئی۔ اُس نے پھن اُٹھا کر زمین پر پڑے ہوئے سورن سنگھ کو دیکھا، پھر دفعتہً ہی وہ تیز رفتاری سے دوسری جانب سے مسہری سے نیچے اُتر گئی۔ سورن سنگھ زمین پر گرنے کے بعد اُٹھنے کی کوشش میں کئی بار زمین پر گرا اور اسی دوران بہت سے ملازم جو آس پاس موجود تھے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگے۔ کیونکہ سورن سنگھ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ بمشکل تمام سورن سنگھ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس نے خوفزدہ نگاہوں سے مسہری کی طرف دیکھا۔ ناگن وہاں موجود نہیں تھی۔ لیکن کوئی اور ایسا راستہ بھی نہیں تھا جہاں سے وہ باہر نکل جائے۔ چنانچہ سورن سنگھ بے اختیار دروازے کی طرف دوڑا اور اُس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھول کر وہ اس طرح باہر نکلا کہ کئی ملازموں کو لپیٹ میں لیتا ہوا نیچے گر پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ ملازم بھی چیخنے لگے۔ تب سورن سنگھ نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مرے کیوں جا رہے ہو کتو؟ اندر سانپ گھس آیا ہے۔“

”سانپ......؟“ ملازموں نے کہا اور اُچھل کر پیچھے پلٹ گئے۔

”ہاں، سانپ......“

”ارے دیا رے دیا اب کیا کریں؟“

”جلدی سے دروازہ بند کر دو۔“ سورن سنگھ نے کہا اور ملازموں نے اُس کے اس حکم کی تعمیل کر دی۔ لیکن سب کے سب باہر کھڑے کانپ رہے تھے۔ سورن سنگھ نے کہا۔ ”لعنت کے مارو کم بختو، تم ٹھیک سے صفائی بھی نہیں کرتے اندر کی؟ آخر یہ سانپ کہاں سے گھس آیا؟“

”مم...... مہاراج، آپ کے کمرے کی تو ایک ایک چیز کی صفائی ہوتی ہے۔ بھلا سانپ یہاں کہاں سے گھس سکتا ہے؟“

”تو میں جھوٹ بول رہا ہوں کیا؟“

اتنی دیر میں لاگھن سنگھ بھی آ گیا اور اُس کی دھرم پتنی بھی۔ صورت حال معلوم کر کے لاگھن سنگھ نے کہا۔ ”اگر تمہارے سونے کے کمرے میں سانپ گھس آیا تو یہ بڑی ہی حیرت کی بات ہے۔ وہ آ کہاں سے گیا؟“

”پتا جی، سب لوگ مجھ سے پوچھے جا رہے ہیں۔ میں خود سانپ پکڑ کر لایا تھا؟ میں کہتا ہوں اندر دیکھئے، سانپ یہیں کہیں موجود ہو گا۔ میرے بستر پر تھا وہ۔“

''ہیں...... تمہیں کہیں کاٹا تو نہیں؟'' لاگھن سنگھ کی دھرم پتنی نے پوچھا۔
''کاٹ لیتا تو میں آپ کے سامنے کھڑا ہوتا؟'' سورن سنگھ غصے میں بولا۔
''ارے دوڑو...... ارے دوڑو۔ دیکھو میرے بیٹے کے کمرے میں سانپ کہاں سے گھس آیا؟''
ادھر راگنی کو اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ نجانے کیسے نیند آ گئی تھی اور وہ سونے سے پہلے ناگن کے بارے میں سوچ رہی تھی سو ناگن بن گئی تھی۔ اب کیا، کیا جائے؟ جانتی تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد سانپ کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ اس سے پہلے کچھ کر لینا چاہئے۔ اور کچھ کر لینا اُس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اُس نے ایک دم مکڑی کا رُوپ دھارا اور لوٹ پیٹ کر چھوٹی سی مکڑی کی شکل اختیار کر گئی۔ پھر اس مکڑی کو ایک روشن دان سے باہر نکلنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ رینگتی ہوئی چھت پر پہنچ گئی۔ لیکن اس کے بعد مکڑی کی حیثیت سے ایک لمبا سفر طے کرنا اُس کے لئے مشکل تھا۔ چنانچہ چھت پر پہنچنے کے بعد اُس نے گلہری کی شکل اختیار کی اور اُچھل کر ایک درخت پر پہنچ گئی۔ گلہری بن کر وہ اپنی منزل کی جانب چل پڑی۔
لیکن ادھر کا ہنگامہ توقع کے مطابق تھا۔ ملازم تو ڈر کے مارے کمرے میں نہیں گھسے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد دو سپیرے کہیں سے بلوا لئے گئے اور پھر خوب بین بجی۔ خوب ناگن کی تلاش ہوئی مگر ناگن ہوتی تو ملتی۔ وہ لوگ ناگن تلاش کرتے رہے۔ لاگھن سنگھ بھی مصروف رہا تھا۔ اُس نے بیٹے سے کہا۔
''سورن! ناگن کا تو یہاں تیرے کمرے میں نشان نہیں ہے۔ جتنی باریکی سے تیرے کمرے کا جائزہ لیا گیا ہے، کیا اس کے بعد تیرے کمرے میں ناگن کی یہاں موجودگی کا امکان ہو سکتا ہے؟ میرے خیال میں تو تُو نے کوئی سپنا دیکھا ہوگا۔''
''سپنا......؟'' سورن سنگھ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ حیرانی سے اُس کی بھی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ راگنی رات کو اُس کے کمرے میں تھی اور اُس کے دل میں نجانے کیسے کیسے خیالات گردش کر رہے تھے۔ لیکن اتنا اہم مسئلہ ہونے کے باوجود وہ اتنی گہری نیند سو گیا تھا اور صبح کو وہ ناگن...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرتا۔ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کے۔ پھر اُسے یشونت رائے یاد آیا۔ یہ ساری کارروائی یشونت رائے ہی کی معلوم ہوتی تھی۔ پتہ نہیں بیچاری راگنی پر کیا بیتی؟ یشونت رائے طاقت رکھتا ہے۔ راوت رائے کا بیٹا ہے۔ لیکن محبت کی طاقت ان تمام چیزوں سے مختلف ہوتی ہے۔ جو کچھ بھی ہو جائے، میں دیکھ لوں گا اُسے آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ سورن سنگھ کے دل میں نفرت کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ لیکن اُس نے برداشت کر لیا۔ بہرحال یہ جانتا تھا کہ یشونت رائے، لاگھن سنگھ کے مالک کا بھی بیٹا ہے۔ راوت رائے بہرحال ایک خطرناک آدمی ہے۔ یہ بات اُس کا پتا لاگھن سنگھ اُسے کئی بار بتا چکا تھا۔ اس یشونت رائے سے تو میں اچھی طرح نمٹ لوں گا۔ لیکن پہلے ذرا راگنی سے تو ملاقات ہو جائے۔ اور یہ پتہ چل جائے کہ ہوا کیا تھا؟ اور راگنی سے ملاقات کرنے میں اُسے بہت زیادہ دقت نہیں ہوئی۔
راگنی اُسے پائیں باغ میں مل گئی تھی۔ اُداس اُداس سی بیٹھی ہوئی تھی۔ سورن سنگھ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُسے آواز دی۔ ''راگنی......'' راگنی نے چونک کر پلٹ کر دیکھا تو سورن سنگھ بولا۔

''راگنی! تمہیں پتہ ہے کہ رات کو کیا ہوا؟''
''کیا ہوا مہاراج، آپ نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ میں تو آپ کے پاس پہنچ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد آپ گہری نیند سو گئے۔ جب آپ سو گئے تو میں اُٹھ کر چلی آئی۔ کیا کرتی وہاں؟''
''راگنی، تمہیں پتہ ہے کہ صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو میرے پلنگ پر ایک ناگ سو رہا تھا بالکل سیدھا سیدھا۔''
''کیا......؟'' راگنی نے حیران نگاہوں سے اُسے دیکھا۔
تم یقین کرو راگنی، میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ بڑی مشکل ہے میری جان بچی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ سوتے ہوئے میں میرا اشریر اگر اُس ناگ پر جا پڑتا تو وہ کیا کرتا؟''
راگنی نے آنکھیں بند کر لیں۔ مسکرانے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن چالاک تھی۔ سورن سنگھ کو شبہ کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''ایک بات کہوں، تھوڑا سا گیان منتر مجھے بھی آتا ہے۔ اگر میرا خیال غلط نہیں ہے مہاراج تو یشونت رائے جی آپ پر کوئی جادو وغیرہ کرا رہے ہیں، یہ اس کی علامت ہے۔''
''مگر کیوں......؟''
''مجھے شبہ ہے کہ انہیں ہمارے پریم کے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔''
''میں اُسے قتل کر دُوں گا۔ بچ نہیں سکے گا وہ میرے ہاتھ سے۔ وہ مصیبت میں پھنس جائے گا۔''
''مہاراج، جو کچھ بھی کریں سوچ سمجھ کر کریں۔ جلدی نہ کریں۔ میں ایک جاپ کروں گی اور ساری صورت حال معلوم کر کے کل شام کو آپ کو اسی جگہ ملوں گی۔ پھر جیسا میں کہوں ویسا کیجئے۔''
''ٹھیک ہے راگنی، جیسا تم کہو گی میں ویسا ہی کروں گا۔ بس سنسار میں اب مجھے تمہارے علاوہ اور کسی سے دلچسپی نہیں رہی ہے۔'' سورن سنگھ نے کہا اور راگنی مسکرانے لگی۔
شیطان کے زیر اثر آ جانے والے ایک شریف گھرانے کی لڑکیاں اب مکمل طور پر شیطان بنتی جا رہی تھیں۔ ابھی تک اشیش بھگونت نے روپا اور راگنی کو استعمال کیا تھا۔ باقی تینوں لڑکیاں عیش کر رہی تھیں۔ اُن کے لئے جو رہائش گاہ مہیا کی گئی تھی اس میں اُنہیں دنیا کی ہر سہولت میسر تھی۔ اور وہ بڑی امیر زادیوں کی حیثیت سے زندگی گزار رہی تھیں۔ اکثر تینوں مل کر بیٹھتیں تو آپس میں باتیں کرنے لگتیں۔ اُن کا کہنا یہی ہوتا کہ پتا جی کے جیون میں تو ہمیں ایسے عیش و آرام نہیں ملے جو ان کی موت کے بعد ملے ہیں۔ یہ سب اشیش بھگونت کی مہربانی ہے۔ اور ہم ان کے ہر حکم کو ماننے کے لئے دل و جان سے تیار ہیں۔ بہرحال یہ ساری کہانیاں چل رہی تھیں اور اُدھر راگنی اپنا کام پوری دینداری کے ساتھ سرانجام دے رہی تھی۔
آخر کار اُس نے سورن سنگھ کو بتایا۔ میں نے جاپ کر لیا مہاراج، اور یہ معلوم کیا اشیش بھگونت سے کہ کیا ہونا چاہئے تو مجھ پر عجیب انکشافات ہوئے۔''
''وہ کیا؟'' سورن سنگھ نے سوال کیا۔

"یشونت رائے مہاراج کو اس بات کا شبہ ہو گیا ہے تھوڑا تھوڑا کہ میرے من میں وہ نہیں کوئی اور ہے۔ اصل میں بات یہ ہے سورن، کہ میں کون سے من سے اُن کے پریم بھرے الفاظ کا جواب دُوں! میرے من میں تو تم ہو۔ اس بات سے وہ بڑے دُکھی ہو رہے ہیں۔ مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ کیا بات ہے راگنی تم مجھ سے دُور کیوں رہتی ہو؟ ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے من میں کوئی اور ہے۔ پر میری بات سُن لو۔ سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ جس سمے مجھے یہ پتہ چل گیا کہ تم کسی اور کو چاہتی ہو تو میں تمہارے پریمی کو قتل کر دُوں گا، چھوڑوں گا نہیں اُسے۔"

سورن سنگھ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اُس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس سے پہلے کہ وہ میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے میں خود اُسے اس سنسار سے دُور کر دُوں گا۔"

"میں نے جاپ میں یہ بات معلوم کی ہے کہ آپ کو کیا کرنا ہے مہاراج۔ ہر کام کسی کے ہوش میں لا کر جوش کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لیا جائے۔ میں آپ کو جو جگہ بتا رہی ہوں آپ وہیں جائیں۔ وہ باغ جو ڈھلانوں پر ہے اور ڈھلانوں والا باغ کہلاتا ہے۔ اس کام کے لئے ضروری ہے آپ اُسے ڈھلانوں والے باغ میں لے جائیں اور اُس سے یہ کہیں کہ کچھ انوکھے پھل تم نے دیکھے ہیں اور انہیں بھی دکھانا چاہتا ہوں۔ سو دھوکے سے یشونت رائے کو وہاں لے جائیں اور پھر اُسے قتل کر دیں۔ اگر آپ نے یہ نہ کیا تو یہ سمجھ لیں کہ وہ قتل نہیں ہو گا۔ اور جب آپ اُسے وہاں لے جائیں تو زیادہ دیر نہ کریں اور اپنا کام کر ڈالیں۔ جاپ میں مجھے جو سپنا آیا ہے وہ یہی ہے۔"

بہرحال سورن سنگھ، راگنی کی ہدایت پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ یشونت رائے کی اس سے کوئی خاص دوستی نہیں تھی۔ بس ایک قدرتی بیر تھا دونوں کے درمیان اور زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن کوئی براہِ راست جھگڑا ابھی دونوں کے درمیان نہیں ہوا تھا۔ بہرحال سورن سنگھ، یشونت رائے کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ "جے ہو مہاراج کی۔ مہاراج، یہ بتائیں کہ کبھی آپ ڈھلان والے باغ پر گئے ہیں؟"

"کیوں...... خیریت؟"

"وہیں جا رہا تھا میں۔ میں نے سوچا آپ سے تذکرہ کر دُوں۔ ایک انوکھی چیز دیکھی ہے میں نے وہاں۔ آپ نے کبھی سونے کے پھل دیکھے ہیں؟"

یشونت رائے نے حیرت سے سورن سنگھ کو دیکھا اور بولا۔ "سونے کے پھل؟"

"ہاں مہاراج۔"

"نہیں، میں نے تو نہیں دیکھے۔ تم کوئی کہانی سنانا چاہتے ہو مجھے؟"

"نہیں مہاراج، بس بتا رہا تھا۔ جا رہا ہوں۔ توڑ کر لاؤں گا، آپ کو دکھاؤں گا۔"

"ہیں...... کہاں؟"

"میں نے کہا نا، آپ کے ڈھلان والے باغ میں۔"

"میں اس مذاق کی وجہ نہیں سمجھا۔"

"لا کر دکھاؤں گا تو یقین آ جائے گا۔"

"نہیں...... میں خود چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

"آپ آنا چاہیں تو آ جائیے۔"

"ٹھہرو، چلتے ہیں دونوں۔" تھوڑی دیر کے بعد یشونت رائے، سورن سنگھ کے ساتھ اُس باغ کی جانب چل پڑا جو درحقیقت رسک لعل کا تھا اور اسی باغ کی وجہ سے رسک لعل کا جیون گیا تھا۔ حالانکہ یہ بات اشیش بھگونت نے راگنی کو نہیں بتائی تھی کہ یشونت رائے کا قتل کہاں ہونا چاہئے؟ لیکن شیطان کی قربت حاصل کرنے کے بعد بہت سے شیطانی خیالات خود بخود ذہن میں آ جاتے ہیں۔ چنانچہ راگنی بھی جانتی تھی کہ اُسے کیا کرنا ہے؟ انتقام کے طور پر اُس نے وہی باغ منتخب کیا تھا جو اُس کے باپ کا باغ تھا۔ بہرحال یشونت رائے اور سورن سنگھ دونوں باغ میں پہنچ گئے۔ سورن سنگھ، یشونت رائے کو لے کر باغ کے اندر گھستا چلا گیا۔ دونوں نے گھوڑے وہیں چھوڑ دیئے تھے اور ایک ایسے گوشے کی جانب جا رہے تھے جو خاصا گھنا اور دُور دراز تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد سورن سنگھ رُک گیا۔ یشونت رائے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں سورن سنگھ...... کدھر ہیں وہ سونے کے پھل؟"

"میں سارے پھل تمہیں دے دُوں گا یشونت رائے، پہلے مجھے میری بات کا جواب دو۔"

"کون سی بات؟"

"تم راگنی سے پریم کرتے ہو؟" سورن سنگھ نے پوچھا اور یشونت رائے کے چہرے پر غصے کے آثار پھیل گئے۔ پھر اُس نے کہا۔

"ہاں۔ کیوں؟"

"کبھی راگنی سے پوچھا تم نے کہ وہ تم سے پریم کرتی ہے یا نہیں؟"

"پوچھنے کی کوئی ضرورت باقی ہے؟ تم جانتے ہو کہ اُس نے میرا جیون بچایا۔"

"آخر کیوں؟ جیون بچانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے پریم کرنے لگی؟"

"وہ مجھ سے پریم کرنے لگی ہو یا نہ لگی ہو، تم پر کیا مصیبت نازل ہوئی ہے؟"

"مصیبت مجھ پر نہیں، تم پر نازل ہوئی ہے۔" سورن سنگھ نے کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"راگنی صرف میرا پریم ہے اور کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"اپنی اوقات یاد ہے؟ جانتے ہو میرے سامنے تم کیا حیثیت رکھتے ہو؟"

"ہاں، اور یہی تمہیں بھی بتانے والا ہوں۔" سورن سنگھ نے کہا اور اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا۔ یشونت رائے کو اس بات کی اُمید نہیں تھی کہ سورن سنگھ اس طرح غداری کرے گا۔ وہ بالکل نہتا تھا۔ اُس نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سورن سنگھ، کیا بدتمیزی ہے یہ؟ تم جانتے ہو، تم میرے غلام ہو...... صرف غلام۔"

"میں تیرا غلام ہوں۔ لیکن پریم کسی کا غلام نہیں ہوتا۔ تجھے میرا راستہ صاف کرنا ہو گا۔" یہ کہہ کر سورن

سنگھ نے ایک زبردست وار یشونت رائے کے سینے پر کیا اور اُس کی بائیں پسلی سے اُس کا سینہ کاٹتا ہوا اُ[illegible] کی گردن تک لے گیا۔ یشونت رائے کے پورے بدن سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا اور اُس کے حلق سے ایک دردناک کراہ نکلی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ پھیل گئے۔ تب سورن سنگھ نے غراتے ہوئے کہا۔
''کسی کے پریم پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش اسی طرح جیون بھی چھین لیتی ہے۔''

ادھر یہ خونی ڈرامہ ہو رہا تھا، اُدھر راگنی اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی تھی۔ [illegible] آنکھیں ملتی ہوئی راوت رائے کے پاس پہنچی اور اُس نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''مہاراج، آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''ارے، راگنی بیٹا تم؟ کیا ابھی تک سو رہی تھیں؟''

''ہاں مہاراج، نیند آ گئی تھی مجھے۔ اور ایک بھیانک سپنا دیکھ کر جاگی ہوں۔''

''بھیانک سپنا؟''

''ہاں مہاراج...... یشونت رائے کہاں ہیں؟''

''پتہ نہیں، اندر ہوں گے۔''

''مہاراج، دیکھیں۔ جلدی دیکھیں۔''

''کیوں، کیا ہوا؟''

''عجیب سپنا دیکھا ہے میں نے۔ آپ دیر نہ کریں۔ جلدی کریں مہاراج۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''میں نے دیکھا کہ لاکھن سنگھ مہاراج کے بیٹے سورن سنگھ نے یشونت رائے مہاراج کو بہکایا اور اُنہیں ڈھلان والے باغ میں لے گئے۔ وہاں اُنہوں نے اُن پر پے در پے وار کئے تھے اور یشونت رائے مہاراج شدید زخمی ہیں مہاراج۔ میں آپ کو بتاؤں میرے خواب سچے ہوتے ہیں۔ میں نے آج تک کبھی جھوٹا سپنا نہیں دیکھا۔ میرا من ڈر رہا ہے۔ جلدی کریں۔''

راوت رائے جلدی سے اُٹھ گیا۔ اتنا اندازہ اُسے ضرور تھا کہ یشونت رائے کا جیون بچانے والی یہ پراسرار لڑکی یقیناً روحانی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر بیٹے کا معاملہ تھا، ذرا سی دیر میں بے شمار خادم یشونت رائے اور سورن سنگھ کی تلاش میں پورا گھر چھاننے لگے۔ اور پتہ یہ چلا کہ گھوڑوں پر سوار ہو کر دونوں کہیں گئے ہیں۔ یہ پہلی بات تھی جو سچ نکلی تھی۔ راوت رائے نے فوراً گھوڑے تیار کرائے۔ راگنی نے اُسے ڈھلان والے باغ کے بارے میں بتایا تھا۔ چنانچہ راوت رائے اپنے چھ وفادار ساتھیوں کے ساتھ ڈھلان والے باغ میں داخل ہوا تو اُسے دونوں گھوڑے نظر آ گئے۔ اور اس کے بعد اُس کے آدمی اندر گھستے چلے گئے۔ پھر راوت رائے اس وقت درختوں کے گھنے جھنڈ کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک ہی اُسے ایک دلدوز چیخ سنائی دی اور وہ اُچھل پڑا۔ بیٹے کی چیخ اُس نے صاف پہچان لی تھی۔ چنانچہ وہ اُس طرف دوڑا۔ اور پھر وہ یشونت رائے کو آوازیں دینے لگا۔

دوسری چیخ سنائی دی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک ہولناک منظر راوت رائے کی نگاہوں کے سامنے آ

گیا...... اُس نے یشونت رائے کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھا اور سورن سنگھ کو ہاتھ میں خنجر لئے اپنی طرف دیکھتے پایا تھا۔ راوت رائے کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی اور سورن سنگھ نے پیچھے چھلانگ لگا دی۔
راوت رائے چیخا۔ ''دوڑو...... پکڑو۔''

راوت رائے کے آدمی جو چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے، سمٹنے لگے۔ لیکن سورن سنگھ نے باغ کے احاطے کی دیوار کودی اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ راوت رائے دم توڑتے ہوئے بیٹے کے پاس پہنچ گیا اور زار و قطار روتا ہوا بولا۔ ''یشونت...... یشونت ارے یہ کیا...... یہ کیا ہوا؟''

''پ...... پتا جی...... سورن سنگھ دھوکے سے مجھے یہاں لایا...... اور......'' اور یہ کہہ کر یشونت رائے نے دم توڑ دیا۔ راوت رائے بلک بلک کر رونے لگا تھا اور چاروں طرف دیکھ دیکھ کر چیخنے لگا تھا۔ بچاؤ...... میرے بیٹے کو بچاؤ...... پکڑو اُس پاپی کو...... پکڑو اُس آستین کے سانپ کو...... لیکن آستین کا سانپ اس وقت تو کم از کم اُس کے چنگل سے نکل گیا تھا۔ شیطان ہنس رہا تھا۔ ایسے کھیل اُس کے لئے بے دلچسپ ہوا کرتے ہیں۔ کائنات کے گوشے گوشے میں برائیاں پھیلانا اُس کا مقصد ہے اور اسے اس بات سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اس کے پیروکار اس کے حکم کی اس طرح تعمیل کریں کہ اسے شکایت کا کوئی موقع ہی نہ ملے۔

اس وقت بھی وہ اس شاندار رہائش گاہ میں چاروں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہنس رہا تھا۔ چاروں لڑکیاں عقیدت سے گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی ہاتھ جوڑے اُس کے سامنے گردن جھکائے ہوئے تھیں۔ تب اُس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''میں نے تمہاری محبت قبول کی۔ بہت اچھی جا رہی ہو تم۔ حالانکہ ابھی میں نے صرف روپا اور راگنی سے کام لیا ہے۔ رجنی، رادھا اور رما تینوں کی تینوں ابھی آرام کر رہی ہیں۔ روپا اپنا کام کر چکی ہے۔ اسے کسی دوسرے کام پر لگانے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ یہ تھوڑا سا آرام کرے۔ راگنی بڑی کامیابی سے اپنے کام پورے کر رہی ہے۔ اصل میں یہ بات میں نے اچھی طرح دیکھ لی تھی کہ تم سب کی سب میرے مقصد کو پورا کرنے کے لئے بڑی کارآمد ہو اور تمہارا انتخاب میں نے بے مقصد نہیں کیا تھا۔ میں تو دُور دُور تک کی بات جانتا ہوں۔ راگنی نے پہلا خون کر لیا ہے اور یوں سمجھ لو کہ تمہارے پتا جی کے قاتل کو پہلا زبردست صدمہ اُٹھانا پڑا ہے۔ تم سب کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ راوت رائے کا اکلوتا نوجوان بیٹا یشونت رائے تمہارے پتا جی کے باغ میں ہلاک ہو گیا ہے۔ اُس کی انتڑیاں باہر نکال دی گئی ہیں اور راوت رائے پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ یہ سب راگنی نے میرے مشورے اور میری ہدایت پر کیا ہے۔ تمہارے دل میں اپنے پتا کے انتقام کا جو جوالہ مکھی اُبل رہا ہے اس کا ایک کونا شانت ہو جانا چاہئے۔''

جے بھگونتا......'' چاروں لڑکیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔''

''میں صرف جے جے کار نہیں چاہتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرا جو مشن ہے وہ پورا ہوتا رہے۔ سنسار میں خوف، دہشت، بے اطمینانی، بے چینی پھیلتی رہنی چاہئے۔ سنسار کے رہنے والوں کو تو دُکھ اور تکلیفوں میں مبتلا کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا مشن ہے۔ اچھا لڑکیو، اب یہ بتاؤ میرے نئے کام کے لئے تم

میں سے کون اپنے آپ کو پیش کرتی ہے؟"

"راگنی اور روپا کے سوا ہم تینوں تیار ہیں مہاراج۔"

"رما، تم......" شیطان نے ایک لڑکی کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا اور رما اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

"جے بھگونتا۔"

"رما، میں تمہیں تمہارا کام سمجھائے دیتا ہوں۔ اور تمہیں وہ کرنا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں، ایک خاص علاقے میں ایک خاص جگہ ایک دلچسپ کام تمہیں سونپا جا رہا ہے۔ اسے ہوشیاری سے سرانجام دو۔ یہ تمہا کام ہوگا۔"

"چنتا نہ کریں مہاراج، رما آپ کے قدموں کی دُھول ہے۔ جیسے آپ کہیں گے ویسا ہی کرو گی۔"

"تو پھر آؤ...... میں تمہیں وہاں تک پہنچا دُوں۔" شیطان نے رما کا ہاتھ پکڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے باقی تینوں بہنوں سے دُور ہوگئی تھی۔ تینوں بہنیں مسکرا رہی تھیں۔

روپا نے کہا۔ "پتا جی کے قاتل کا بیٹا مر گیا۔ خوشی مناؤ۔ اس سے زیادہ خوشی کی خبر ہمارے لئے کون سی ہوسکتی ہے۔" تینوں بہنیں خوشی سے ناچنے لگیں۔

لیکن رما، شیطان کے ساتھ ہواؤں میں اُڑی جا رہی تھی۔ معصوم لڑکیاں اب اس قدر خوفناک لڑکیاں بن چکی تھیں کہ دنیا والوں کو اگر ان کے دہشت ناک کارناموں کا پتہ چل جائے تو اُن کے دل دھڑکنا بند ہو جائیں۔ یہ ایک سرد اور تاریک رات تھی۔ شہر کی آبادی انتہائی سردی میں لپٹی ہوئی جیسے موت کی نیند سو رہی ہو۔ کسی گھر سے کسی بچے کی روتی ہوئی آواز اُبھرتی تو یوں لگتا جیسے بم پھٹ گیا ہے۔ سردی اس بار بے حد شدید تھی۔ مختلف طبقات کے لوگ مختلف طریقوں سے وقت گزار رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس شدید سردی میں زندگی کی گاڑی دھکیلنے کے لئے اب بھی محنت مزدوری میں لگے ہوئے تھے۔ بہت غریب تھے تو بدن سے چیتھڑے لپیٹے ہوئے تھے۔ کچھ بہتر تھے تو گرم کپڑوں میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یہ سب کے سب محنت مشقت کے لئے ہی جاگ رہے ہوں۔ بلکہ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لئے مصروف تھے۔ بس انسان کے مختلف مسائل ہوتے ہیں۔

ایسا موت کا سناٹا تھا کہ سانسوں کی آوازیں بھی سنائی دے جائیں۔ لوگ گرم لحافوں میں یا گھاس کے ڈھیر میں لپٹے ہوئے سردی سے اپنی حفاظت کے لئے سرگرداں تھے۔ اس وقت رات کے تقریباً تین بجے تھے اور زندگی پوری طرح سو رہی تھی۔ خاص طور سے پارک ایریا میں سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ کیونکہ قرب و جوار میں ایک وسیع و عریض مصنوعی جھیل پھیلی ہوئی تھی۔ اور پھر پارک ایریا کا حسین پارک جو ہوس ناک لوگوں کے لئے گرمیوں کے موسم میں عیش گاہ ہوا کرتا تھا اور سردیوں کے موسم میں ایک پراسرار رومانی جگہ، اس علاقے میں سردی زیادہ ہی شدید تھی۔ سنسان تنگ گلیوں میں لیمپوں پر لگی ہوئی پیلی روشنی کہر میں لپٹی ہوئی سہمی ہوئی نگاہوں سے ماحول کی ہیبت ناکی کو دیکھ رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔

مکانوں کے دروازے سختی سے بند تھے۔ کھڑکیوں میں سے روشنی کی کوئی کرن باہر جھانکتی نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ کچھ اُونچے مکانوں کی کھڑکیوں سے مدھم مدھم روشنی ضرور چھلکتی نظر آ جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی اس روشنی میں ہلکی پھلکی کپکپاہٹ بھی طاری ہو جاتی تھی جو اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ ان مکانوں کے اندر ابھی تک باورچی خانوں کی آگ روشن ہے۔

پارک ایریا کا یہ علاقہ ذرا غلط قسم کا علاقہ تھا۔ یہ خاص طور سے ایک ملی جلی آبادی تھی۔ نچلے طبقے کے لوگوں کی گھنی اور گندی آبادی اور اس سے بالکل قریب طوائفوں کا محلہ جہاں مختلف انداز فکر کی بوڑھی اور نوجوان لڑکیاں جسموں کا کاروبار کر کے زندگی کی گاڑی گھسیٹتی تھیں۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے شریف آدمی کا صحیح صورت گزر جانا ممکن نہیں تھا۔ گھٹیا قسم کی دُکانیں تھیں جہاں خفیہ طریقے سے خباثتوں کی ماں بھی دستیاب ہو جاتی تھی، کچی اور صحت کے لئے قاتل۔ بہت سے ایسے گھر بھی تھے جن میں چوری چھپے جوئے بازی ہوتی تھی اور یہاں غنڈوں کے اکھاڑے ہوا کرتے تھے۔ ایسے لوگ جو کسی حادثے سے متاثر ہو کر کوئی جرم کرانا چاہتے تھے وہ یہاں کرائے کے غنڈے حاصل کر لیا کرتے تھے بشرطیکہ اُنہیں یہ جگہ معلوم ہو۔ ایسی خفیہ جگہیں جہاں سے کچی شراب دستیاب ہو جائے تقریباً ساری رات کھلی رہا کرتی تھیں۔ البتہ اس وقت شدید سردی کے عالم میں ان جگہوں پر بھی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کیونکہ نشے میں بدمست گاہک گرتے پڑتے اور ایک دوسرے کو فحش گالیاں بکتے اپنے ٹھکانوں کو جا چکے تھے۔ سخت سردی نے اُن کے بھی مزاج پوچھ لئے تھے۔

ایک چھوٹے دروازے سے نیچے ایک قہوہ خانہ جسے شبینہ کلب کا نام دیا جاتا تھا اس وقت بھی کھلا ہوا تھا اور وہاں سے نشے میں بدمست قہقہوں اور فحش گالیوں کی آوازیں بھی اُبھر رہی تھیں۔ لیکن انتظام ایسا رکھا گیا تھا کہ گالیوں کی یہ آوازیں یا روشنی باہر نہ جا سکے۔ کیونکہ داخلے کا چھوٹا سا دروازہ بند رہتا تھا اور اس کے اطراف میں اس طرح کا انتظام کیا گیا تھا کہ روشنی باہر نہ جانے پائے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ اگر کسی وجہ سے علاقے کا افسر ناراض ہو جائے اور پولیس کا ریڈ ہو تو یہاں موجود لوگوں کو خفیہ دروازوں سے باہر نکل کر بھاگنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ قہقہوں اور باتوں کی آوازوں میں لڑکیوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ سب کی سب جسم فروخت کرنے والی لڑکیاں تھیں، بے حیا اور شراب کی رسیا جن کے جسم سے گندے پیپ بھرے پھوڑوں کی بو آتی تھی۔ اور تاریک اور سیلے ہوئے لکڑی کے فرش پر پڑی ہوئی بوسیدہ کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھی وہ آپس میں اتنی فحش گفتگو کرتیں کہ کوئی بھی اجنبی اُن کی باتیں سن کر حیران رہ جاتا اور سوچتا کہ یہ کون سے سیارے کی مخلوق ہے؟

یہ ماحول اور یہ منظر اس وقت پارک ایریا کے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اس زیرزمین قہوہ خانے کے دروازے سے کچھ فاصلے پر تاریکی اور کسی قدر سردی سے محفوظ گوشے میں ایک شخص اپنے گھٹنے پیٹ سے لگائے اور سڑا ہوا کمبل اوڑھے اطمینان کی نیند سو رہا تھا۔ یہ مداری تھا۔ ایک بندر کا باپ یا ایک بندر کا مالک...... مالک باپ ہی کی مانند ہوتا ہے۔ دن بھر گلیوں اور بازاروں میں بندر کا تماشہ دکھا کر لوگوں سے پیسے حاصل کرتا۔ لیکن شام کو آ کر سارے پیسے شراب اور جوئے کی نذر کر دیتا۔ یہ اُس کی زندگی کا مقصد

تھا۔ اور بیچارہ بندر جس نے پتہ نہیں کہاں اور کن حالات میں جنم لیا ہوگا صرف اپنے مالک کے اشاروں کا پابند لیکن عقل سے دُور نہیں۔ مالک کی تمام کیفیات کو وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ اُس کی زندگی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب مالک نشے میں دھت ہو کر کسی گوشے میں پڑا رہتا ہے۔ اس وقت رات کی ہولناک تاریکی اور سردی کے اس خوفناک ماحول میں وہ بیچارہ قریب ہی بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اُس کے اپنے ہاتھ میں ٹین کا ایک چھوٹا سا ڈبہ دبا ہوا تھا۔ یہ کام اُسے مداری نے ہی سکھایا تھا اور بندر کو بھکاری بنا دیا تھا۔ ایسے لمحات میں جب مداری شراب کے نشے میں مست ہو کر خراٹے بھرنے لگتا تو بندر اپنی ڈیوٹی سے غافل نہیں ہوتا تھا۔

اس ایریا میں گاہکوں کی تلاش میں نکلنے والی طوائفیں اور ان کے تعاقب میں نظر آنے والے غنڈے جوں ہی بندر کو نظر آتے تو وہ نہایت عاجزی سے ڈبہ آگے بڑھا دیتا اور کوئی نہ کوئی اس ڈبے میں کوئی چھوٹا سا سکہ ڈال دیتا۔ اس وقت بھی اس بھیانک ماحول میں بندر اُمید بھری نظروں سے ہر دروازے کو تک رہا تھا کہ شاید کوئی دروازہ کھلے اور اس دروازے سے باہر نکلنے والا اُس کے ڈبے میں کوئی سکہ ڈال جائے۔ مداری اپنی جگہ چالاک لیکن بندر اُس سے بھی زیادہ چالاک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شام کا ایک چھوٹا سا حصہ خریدنے کے لئے اس ٹین کے ڈبے میں کتنے سکے ہونے چاہئیں۔ بری صحبتوں کا برا نتیجہ جس انداز میں ظاہر ہوتا ہے وہ اس بندر کو دیکھ کر پتہ چل سکتا تھا۔ کیونکہ مداری نے اُسے بھی اپنی طرح شراب کا عادی بنا دیا تھا۔ اور جب مداری شراب کے نشے میں غرق ہو کر دنیا سے بے خبر ہو جاتا تو بندر کو یہ آزادی حاصل ہو جاتی تھی کہ وہ اپنی شراب کے لئے بھی پیسے خود ہی جمع کرے۔ وہ جانتا تھا کہ کتنے پیسے اُس کے پاس جمع ہو جائیں تو اس ڈبے میں آدھی شراب بھری جا سکتی ہے۔ جب یہ کام ہو جاتا تو وہ خوشی سے اُچھلتا کودتا اُن میں سے کسی دُکان کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور ڈبے کے سکے نیچے اُلٹ دیتا۔ ایسی دُکانوں کے مالک جو خفیہ طور پر شراب بیچتے تھے اس بندر کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ڈبے کے پیسے کاؤنٹر پر چھنچھناتے ہوئے گرتے، دُکاندار اُنہیں گن کر صندوقچی میں ڈالتا، الماری میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر بندر کو تھما دیتا یا الگ بڑی بوتل ہوتی تو اُس میں سے شراب کی مقدار ڈبے میں انڈیل دیتا اور بندر وہیں بیٹھے بیٹھے اسے منہ سے لگاتا اور خالی کر کے چل دیتا۔ یہ معمول نجانے کب سے جاری تھا؟ غالباً اس وقت سے جب سے بندر اور مداری نے اس علاقے میں ڈیرہ ڈالا تھا۔

زیرِ زمین قہوہ خانے کے چھوٹے سے دروازے سے روشنی کی چند کرنیں باہر آئیں اور گہری تاریکی کا سینہ چیر کر دُور تک پھیل جانے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ لیکن پھر کسی شخص نے گالی دے کر دروازہ بند کیا اور بندر ڈبہ سنبھال کر ہوشیار ہو گیا۔ زیرِ زمین قہوہ خانے سے نکلنے والی ایک دُبلی پتلی طوائف تھی۔ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور وہ عالمِ سرمستی میں کوئی بے تکا سا گانا غلط سلط طریقے سے گاتی ہوئی اپنے آپ سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی اور اپنی بھدی آواز کا جادو جگاتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی جدھر مداری نشے میں موسم کی سختیوں سے بے نیاز پڑا سو رہا تھا۔ بندر پھرتی سے طوائف کے قریب پہنچ گیا اور اُس نے خوشامدانہ انداز میں ٹین کا ڈبہ آگے بڑھایا اور زور زور سے منہ سے آوازیں نکالنے لگا۔

طوائف، بندر کو پہچانتی تھی اور بندر اُس طوائف کو۔ معمول کے مطابق اُس نے بندر کو موٹی موٹی فحش گالیاں دیں اور پھر اپنا پرس بغل سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ ”بدمعاش کہیں کا...... جانتی ہوں نشہ کرے گا تو۔ ہم سے تو، تو ہی اچھا ہے۔ نہ محنت نہ مشقت بس ڈبہ سامنے کیا اور پیٹ بھر لیا۔ ہماری طرح کچھ کرنا پڑتا تو پتہ چلتا تجھے۔“ یہ کہہ کر زور سے ہنسی۔ ”لے اپنے باپ کا مال۔“ یہ کہہ کر اُس نے ایک سکہ پرس سے نکال کر ڈبے میں ڈال دیا اور آگے بڑھی۔ لیکن اندھیرے میں اُس کا پیر سوئے ہوئے مداری سے ٹکرا گیا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ پھر اُس کے منہ سے شرمناک گالیوں کا ایک سیلاب اُمنڈ پڑا۔ اُس نے مداری کو ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ مگر نشے میں دھت پڑے ہوئے مداری کو جب اس سخت سردی کا احساس نہیں تھا تو یہ ٹھوکر بھلا اُس پر کیا اثر دکھاتی؟

”کتے کے پلے...... سور کی اولاد...... راستے میں سو جاتے ہیں پڑ کر جیسے ان کی ماں نے ان کے لئے بستر بچھا رکھا ہو۔“ گالیوں کی رفتار بڑھتی گئی۔ ٹھنڈی ہوا اثر دکھا رہی تھی۔ اُس نے اپنے جسم کے قریب جھولتا ہوا پرانا کوٹ اچھی طرح لپیٹنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اور کچھ لمحے اندھی گلی میں ٹھوکریں کھانے کے بعد وہاں سے آگے بڑھ کر کسی قدر اُجالے میں پہنچ گئی۔ سردی سے اُس کے حلق سے آوازیں نکل رہی تھیں اور پھوپھو کی آوازیں کچھ ہنسی جیسی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ وہ وقت پر ہنس رہی تھی۔ اپنے آپ پر ہنس رہی تھی۔ ماحول پر ہنس رہی تھی۔ اپنے وجود پر لگنے والی ان ٹھوکروں پر ہنس رہی تھی جنہیں کھاتے کھاتے اُسے پوری زندگی گزاری پڑ گئی تھی۔ اُس کی ہنسی تمام تر بے معنی تھی۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا میں کچی شراب کا نشہ ہوا پا رہا ہے۔ چنانچہ وہ سنبھل سنبھل کر قدم آگے بڑھانے لگی۔ اُس کا گھر یہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ بس سامنے گلی کا موڑ مڑ کر وہ اپنے مکان میں پہنچ جائے گی اور اس کے بعد گرم بستر، آرام دہ چارپائی، جسم کے ہر حصے کو لپیٹ کر وہ اپنے جسم کو اپنا محسوس کرے گی۔ اس سے پہلے تو یہ جسم نجانے کس کس کی ملکیت ہوتا ہے۔ اچانک ہی وہ ایک کھمبے سے ٹکرائی اور کھلا ہوا پرس اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ پرس کی چیزیں نیچے بکھر گئیں تو اُس کے حلق سے ایک افسوس بھری آواز نکلی۔ ”ہائے...... یہ کیا ہوا؟ خدا غارت کرے ان کم بختوں کو اُلٹے سیدھے کھمبے نجانے کہاں کہاں لگا دیتے ہیں۔ کوئی تمیز ہی نہیں ہے کہ علاقے میں رہنے والوں کو کس طرح تکلیف ہوگی۔“ گالیاں دل کو بڑا سکون دیتی ہیں۔ اور اس بے سکونی کو دُور کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ گالیاں یاد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ جتنی گالیاں اُسے یاد تھیں اُس نے دے ڈالیں اور زمین پر بیٹھ کر اپنی بکھری ہوئی زندگی تلاش کرتی رہی۔

وہ اندھوں کی طرح ایک ایک چیز کو ٹٹول کر اپنے پرس میں ڈال رہی تھی۔ پھر اپنی دانست میں جب اُس نے تمام چیزیں پرس میں جمع کر لیں اور اُٹھنے کی کوشش کی تو اُس کی ٹانگیں اُس کا ساتھ نہ دے سکیں۔ گھٹنوں کے جوڑوں میں شدید درد ہونے لگا تھا اور وہ اپنے وزن کو اپنی ٹانگوں پر سنبھالنے میں دقت محسوس کر رہی تھی۔ سہارا لینے کے لئے اُس نے کھمبے کو پکڑا اور ہمت کر کے اُٹھنے ہی والی تھی کہ اُس کے کانوں میں ایک گہری سرد آواز آئی جس کے بارے میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ زنانہ ہے یا مردانہ؟ عجیب

جھنجھناتی ہوئی سی آواز تھی۔

"ٹھہرو...... کیا تم میرا سہارا چاہتی ہو؟"

بیٹھی ہوئی بدنصیب عورت نے آنکھیں اُٹھا کر پکارنے والے کو دیکھا۔ دُھندلائی ہوئی آنکھوں جو منظر اُس کے سامنے پیش کیا اُسے دیکھ کر اُس کا کلیجہ تھرا گیا۔ اُس کی آنکھیں ڈوبنے لگیں۔ تین قدم فاصلے پر سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس ایک انسانی جسم نظر آ رہا تھا جس کا قد و قامت ضرور سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ چمکدار سرخ آنکھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ کھلا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس ہاتھوں پر بھی سیاہ دستانے چڑھے ہوئے تھے جن میں چاندی کی مانند چمکتی ہوئی کوئی چیز عورت کو نظر آ وہ پتھر کے بے جان بت کی طرح آدھی بیٹھی اور آدھی کھڑی اُس انوکھے وجود کو گھورنے لگی۔

"کیا نام ہے تیرا؟" آواز پھر سنائی دی۔ اس آواز میں ایک ایسا حکم اور دبدبہ تھا کہ شراب کے میں مدہوش ہونے کے باوجود جبکہ بہت سے احساسات دل و دماغ میں قائم نہیں رہتے وہ عورت کا لگی۔ اُس نے جسم کی پوری کوشش جمع کر کے کھمبے کا سہارا لے کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر اُس کی ٹانگیں طرح کانپ رہی تھیں اور گردن جھٹکے کھا رہی تھی۔ اُس نے خوف دُور کرنے کی کوشش کی لیکن اجنبی وجو سرخ چمک دار بھیڑیئے جیسی آنکھیں اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں بن کر دوڑ رہی تھیں۔ بمشکل تم اُس نے ایک سہارا تلاش کیا اور کھمبے سے پشت لگائے لرزنے لگی۔ اجنبی وجود اپنی جگہ بے حس و حرکر تھا۔ اُس کے ہونٹ پھر کھلے اور اس مرتبہ اُس نے ایک قدم آگے بڑھا کر ایک بھیانک سرگوشی کی۔ "بو نہیں...... کیا نام ہے تیرا......؟"

"اصل نام تو کچھ اور تھا۔ اب لوگ مجھے ریما کہتے ہیں۔" نجانے یہ آواز کس طرح اُس کے منہ نکل گئی۔ پھر وہ گڑگڑاتی ہوئی بولی۔ "لیکن میں...... میں اُٹھ کر اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ میں خود ا جاؤں گی۔ مجھے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے واقعی اس بار اُٹھنے کی کوشش کی لیکن بمشکل تم وہ ذرا آدھی سے زیادہ سیدھی ہوئی تو اجنبی وجود نے خوفناک انداز میں اپنے لبادے کے ایک حصے ہاتھ ڈالا اور ایک لمبا سا چمکدار خنجر نکال لیا۔ عورت کے چہرے پر دہشت کی ایک شدید سنسنی پھیل گئی۔ لمبا چمکدار خنجر دیکھ کر سہم گئی تھی۔ تب وہ اجنبی وجود ایک بار پھر آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ عورت حلق سے چیخ نکلے، سیاہ لبادے میں ملبوس اجنبی وجود کا بایاں فولادی پنجہ عورت کے گلے میں گڑ چکا تھا دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر آہستہ آہستہ اُس کی شہ رگ کی طرف بڑھ رہا تھا...... عورت کے دانت سختی بھینچ گئے اور اُس کے منہ سے خون کی ایک پتلی دھار بہہ نکلی۔ تیز دھار والا خنجر اُس کی شہ رگ کاٹ چکا تھا...... خون میں نہائی ہوئی بدنصیب عورت نے آخری بار اپنے قاتل کی طرف دیکھا اور اُسے عجیب احساس ہوا۔ اس وقت قاتل کا چہرہ تھوڑا سا کھل گیا تھا۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی...... بلاشبہ حسین، نوجوان اور نوعمر۔ لیکن اس وقت اُس کے چہرے پر جو سفاکی نظر آ رہی تھی وہ ناقابل یقین تھی۔ وہ خوفناک لڑکی اپنی چمکدار آنکھوں سے اُسے گھور رہی تھی اور اُس کے پتلے پتلے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر درندوں جیسی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے مظلوم عورت کی رُوح جسم کے پنجرے سے ہمیشہ کے لئے آزاد

ہو گئی۔ سیاہ لبادہ پوش عورت نے خنجر سے ٹپکتے ہوئے خون کی بوندوں کو اپنی اُنگلیوں پر لیا اور پھر اُس کی سرخ اور لمبی زبان باہر نکل آئی۔ وہ خون کی ان بوندوں کو چاٹنے لگی۔ اُس کی ہولناک آنکھوں سے تیز روشنی کی شعاعیں خارج ہو رہی تھیں۔ خوفناک لڑکی نے بعد میں اپنی اس زبان سے خنجر پر لگا ہوا لہو صاف کیا، پھر اُس کے منہ سے آواز نکلی۔ "جے اشیش بھگونتا......" اور اس کے بعد وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی تاریکی میں گم ہو گئی۔ مظلوم عورت کی لاش جو اس شدید سردی میں نجانے کیسی کیسی مشقتوں سے گزرنے کے بعد اپنے گھر کے آرام دہ بستر کا تصور کرتی ہوئی اپنے گھر کی جانب بڑھ رہی تھی اب بے گور و کفن پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد گشتی سپاہیوں کی ایک ٹولی اس طرف بڑھنے لگی۔ اور اُن میں سے ایک سپاہی نے رات کی اس تاریکی میں بھی کسی اجنبی شے کو ادھر پڑے ہوئے دیکھ لیا۔ ان میں سے ایک نے سرد لہجے میں کہا۔

"رحیم بخش...... وہ کیا چیز پڑی ہے؟"

رحیم بخش نے نگاہیں اُٹھا کر اُدھر دیکھا، پھر بولا۔ "آؤ، قریب سے دیکھیں۔" چنانچہ وہ آگے بڑھ گئے۔ اور پھر اُن کی تجربہ کار نگاہوں سے بھانپ لیا کہ وہ کوئی انسانی لاش ہی ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے اُس کے قریب پہنچے اور جھک کر اس لاش کو دیکھنے لگے۔ خون میں نہایا ہوا انسانی بدن انتہائی بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ گردن دھڑ سے تقریباً علیحدہ ہو چکی تھی، پیٹ چاک تھا اور انتڑیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں...... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قاتل نے کسی قصائی کی طرح اپنا خنجر لاش پر آزمایا ہے اور اس کی بوٹی بوٹی الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے دونوں گردے ایک ماہر سرجن کی طرح آپریشن کر کے باہر نکال دیئے گئے تھے اور دل چیر کر باہر پھینک دیا گیا تھا۔ قتل و غارت گری کے بہت سارے کیس ان سپاہیوں کی نگاہوں سے گزرے تھے۔ ان میں کبھی کبھی بڑی بے دردی سے انسانی زندگی ختم کر دی جاتی تھی۔ لیکن یہ ایک انتہائی بھیانک واردات تھی۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ جاری ہو گیا...... تھوڑے ہی دن کے اندر تین یا چار لاشیں وہاں مل چکی تھیں۔ پھر ایک دن بندر والے مداری نے پولیس کو بتایا۔

"مائی باپ، کالے کپڑوں میں لپٹی ہوئی وہ خوفناک بلا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اُس دن میں ایک دُکان کے تختے کے نیچے سو رہا تھا اور میرا بندر سرا شراب کی تلاش میں ڈبہ لے کر بھیک مانگنے نکل گیا تھا۔ لیکن اُسے بھیک کہاں سے ملتی؟ اُس دن تو مجھے بھی شراب نہیں ملی تھی جس کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تب میں نے اُس خوفناک بلا کو دیکھا۔ چمکدار خنجر سے اُس نے ایک لڑکی کو مار ڈالا تھا۔ اور جب وہ اُس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد کھڑی ہوئی تو اُس کے منہ سے ایک آواز نکلی تھی جے بھگونتا۔"

یہ نام پولیس کی لسٹ میں پہنچ گیا۔ دو مہینے کے اندر چھ وارداتیں ہو چکی تھیں البتہ اس دوران کسی نے بھی قاتل کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ بس مداری کی بات پہلی اور آخری تھی۔ حالانکہ اس علاقے میں پولیس کا زبردست گشت شروع ہو گیا تھا اور پارک ایریا کی طوائفیں دہشت سے کانپنے لگی تھیں۔ لیکن پولیس سر توڑ کوشش کے باوجود ابھی تک اس قاتل کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی جس کے بارے میں یہ اندازہ

ہو گیا تھا کہ تمام طوائفوں کو اُس نے ختم کیا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ان طوائفوں کو قتل کر کے
کی لاشوں کے ٹکڑے کر دینے والی شخصیت کس کی ہے؟ اس کے بارے میں بے شمار کہانیاں
ہوئیں۔ لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کیں لیکن ''جے بھگونتا'' کہنے والے کا کوئی سراغ
مل سکا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اُس کا اصل حلیہ کیا ہے؟ پارک ایریا ہی کے علاقے
ان طوائفوں کو کیوں قتل کرتا ہے؟ ایسی وارداتوں کے پیچھے اصل مقصد کیا ہے؟ اور واردات کر کے وہ
غائب ہو جاتا ہے؟

اس پراسرار قاتل نے زبردست شہرت حاصل کر لی تھی اور محکمہ پولیس کی ناک میں دم آ گیا
بہرحال اب اُس کے نام سے کانپنے والے تعداد میں بڑھتے ہی جا رہے تھے اور لوگوں نے طرح
کے قصے مشہور کیے ہوئے تھے۔ بہرحال اس علاقے پر قہر خداوندی ٹوٹ چکا تھا اور ڈھائی ماہ کے عر
میں آٹھ طوائفیں اُس کے خون آشام خنجر کا شکار ہوئیں اور پورے شہر میں زبردست دہشت اور افرا
اور ابتری پھیل گئی۔ بے شمار طوائفوں کے خاندان یہ علاقہ خالی کر کے جانے لگے۔ علاقے کے باز
دُکانیں سرِشام ہی بند ہونے لگیں۔ بھگونتا، بھیانک بھوت بن کر اُن کے ہوش و حواس پر چھا چکا تھا۔
بھوت جسے پکڑنے کے لئے پولیس والوں کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ اخبارات
بے شمار خبریں چھپ رہی تھیں اور ہر شخص بھگونتا، بھگونتا کی گردان کر رہا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ
کسی ایک شخص نے بھی اس طویل مدت میں ''جے بھگونتا'' کو نہیں دیکھا تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا
آدمی تھا یا شیطان؟ ان طوائفوں کی لاشیں جن حالات میں پائی گئی تھیں انہیں دیکھ کر نڈر سے نڈر
راتوں کی نیندیں حرام کر بیٹھتا تھا۔ شہہ رگ کاٹنے کے بعد وہ دوسرا وار گردن پر کرتا اور پیٹ ادھیڑ
صرف آنتیں باہر نکال دیتا بلکہ گردے اور کلیجہ بھی ایک ماہر سرجن کی طرح آپریشن کر کے الگ الگ
ڈالتا۔ ماہرین سرجری کا یہ خیال تھا کہ یہ کام کسی جنونی سرجن کا ہے جو پاگل خانے سے کسی نہ کسی
بھاگ آیا ہے اور اب عورتوں پر خنجر کی دھار آزما رہا ہے۔ کچھ ماہرین نفسیات کا کہنا تھا کہ یہ شخص کی
سے طوائفوں کا جانی دشمن بن گیا ہے۔ ضرور اُسے ان عورتوں سے کسی حرکت کے باعث تکلیف پہنچی
ممکن ہے اُس کی دیوانگی میں کسی طوائف کا ہاتھ ہو اور وہ اب اُن سے بدلہ لے رہا ہو۔ غرض جتنے منہ
باتیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر یہ ہولناک وجود کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ انسان
بھی یا نہیں؟ کہیں کوئی آوارہ رُوح نہ ہو۔ اگر انسان ہوتا تو پولیس کے اتنے گشت کے باوجود بھی نہ
نظر تو آتا۔ سوائے اُس مداری کے جس نے کئی معنوں سے بھگونتا کا نام مشہور کیا تھا اور اس وقت صو
حال یہ تھی کہ اخبارات میں جے بھگونتا کا تذکرہ، ہر گھر میں جے بھگونتا کا تذکرہ۔ خاص طور سے طوائف
کی آبادیوں میں تو باقاعدہ بھگونتا کے نام کی پوجا ہونے لگی تھی۔ طوائفوں نے نذر نیاز چڑھانا شروع
دی تھیں۔

ابھی تک قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ صرف پارک ایریا کے علاقے میں محدود تھا۔ لیکن ایک دن
وہاں سے بھی نکل گیا۔ وہ ایک پرانا سا محلّہ تھا جہاں کی آبادی انتہائی گنجان تھی۔ یہ علاقہ بھی خاصا

تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد یہاں بنے شراب خانوں اور جوئے کے اڈوں پر خوب رونق ہو جاتی
تھی۔ البتہ گلیاں اکثر تاریک رہتی تھیں جن کے مختلف گوشوں اور ناکوں پر طوائفیں بنی سنوری گاہکوں کی
تلاش میں سرگرداں ہوتی تھیں اور یہ سلسلہ سورج نکلنے تک جاری رہتا تھا۔

مائی بھاگ بھری بھی زمانہ قدیم میں اپنی شکل و صورت میں یکتا تھی۔ اُس کے شکار کے بے شمار قصے
مشہور تھے اور اعلیٰ درجے کی شکاری عورتوں میں شمار ہوتی تھی وہ۔ لیکن ڈھلتی ہوئی عمر اور بدلنے والا وقت
اب صرف اُس کا مذاق اُڑاتا تھا۔ عام طور سے وہ گلی کے کونے پر چارپائی بچھائے خاموشی سے بیٹھی
گزرے ہوئے ماضی کو تکتی رہتی تھی۔ لیکن ایک رات اُس کی بھی شامت آ گئی اور قتل کی واردات کے فوراً
بعد اُس کی لاش دیکھ لی گئی۔ اس وقت تو اُس کا جسم تندرست تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اچھی خاصی
تندرست ہونے کے باوجود اُس نے اپنے بچاؤ کی کوشش کیوں نہیں کی تھی؟ چلو جسمانی طور پر وہ اگر کسی
سے کمزور پڑ گئی تھی تو ایک مرتبہ بھی بلند آواز سے مدد کے لئے پکار دیتی تو قریب پڑے ہوئے لوگ فوراً
جاگ جاتے۔ ان گلیوں اور بازاروں میں آوارہ اور بیکار قسم کے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو یقینی طور
پر بھاگ کر بھاگ بھری کو بچانے کی کوشش کرتے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قاتل کی پراسرار غیر معمولی
شخصیت نے اُس کے اوسان خطا کر دیئے تھے اور وہ شکار ہو گئی تھی۔ قاتل نے پہلا وار اُس کی گردن پر کیا
اور شہہ رگ کاٹ دی۔ اور پھر اُس نے ایک کان سے دوسرے کان تک گردن اچھی طرح کاٹ ڈالی۔ اس
کے بعد عورت کا پیٹ چاک کیا اور اُس کے جسم کے تمام اعضاء نکال کر چاروں طرف بکھیر دیئے۔ بات
بالکل ویسی ہی تھی اور یہ بات اب پورے اعتماد کے ساتھ کہہ دی جاتی تھی کہ یہ سارا کام بھگونتا کا کیا ہوا
ہے۔ پھر جگہ جگہ یہ اُدھڑی ہوئی اور خون میں لت پت لاشیں ملنے لگیں۔ لاش کو ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ
ہو جاتا تھا کہ یہ جے بھگونتا کا کام ہے۔ پولیس ماری ماری پھر رہی تھی۔ شہر میں آگ لگ گئی تھی۔ لوگ اپنے
اپنے کام دھندے بھول گئے تھے۔ اور اب ہر طرف جے بھگونتا کا ذکر تھا۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں
کی جا رہی تھیں۔

اخبارات الگ سنسنی خیز کہانیاں پھیلا رہے تھے۔ اس کے علاوہ بے شمار نوجوانوں نے اپنے طور پر رضا
کارانہ پارٹیاں بنا ڈالی تھیں اور رات کی تاریکی میں گلیوں اور بازاروں میں پھرتے رہا کرتے تھے۔
بہرحال کوئی بات نہیں پتہ چل رہی تھی۔ کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھلاوا کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا
جاتا ہے؟ مجرموں اور بدمعاشوں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ کیونکہ اُن میں سے ہر شخص اس بات سے ڈر رہا
تھا کہ کہیں اس پر الزام نہ آ جائے۔ لیکن قاتل ایسی جگہوں کا انتخاب کرتا تھا جہاں شبہ نہ ہو۔ غالباً آخری
واردات ایک ایسے علاقے میں ہوئی تھی جو انتہائی فحش تھا اور یہاں ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی جو کلب
ڈانسر تھی اور حال ہی میں اُس کی ایک فلم بھی ریلیز ہوئی تھی، بستر پر اس طرح پڑی تھی کہ اُس کا سارا جسم
لباس سے بے نیاز تھا۔ گردن ایک کان سے دوسرے کان تک کٹی ہوئی تھی اور چاک زدہ پیٹ پر خون کے
بڑے بڑے لوتھڑے پڑے ہوئے تھے۔ یہ ایک ایسا بھیانک منظر تھا کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ قاتل نے اُس
کے جسم سے انتڑیاں نکال کر چاروں طرف پھیلا دی تھیں اور اُس کا لباس بنڈل بنا کر مسہری کے سرہانے

رکھ دیا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کے دونوں ہونٹ اور کان بھی کاٹ ڈالے گئے تھے۔ یہ ایک ایسی خوفناک اور سنسنی خیز واردات تھی کہ اس کے بعد محکمہ پولیس کے کئی بڑے افسران کو استعفیٰ دینا پڑا تھا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا قصہ ہے؟

البتہ ان تمام معاملات سے دُور اس پراسرار اور خوبصورت مکان میں اس وقت بھی تین لڑکیاں آرام سے بیٹھی ہوئی ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں۔ یہ روپا، رجنی اور رادھا تھیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ رادھا نے کہا۔ ''راگنی کا کام تو لمبا ہی ہو گیا ہے۔ چلو، مہینہ پورا ہونے والا ہے۔ ساری باتیں اپنی جگہ، ہم لوگ مہینے کی پورن ماشی کو تو ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے ہی۔''

''ہاں...... کیوں نہیں؟'' اسی وقت اُنہوں نے اپنے عقب میں سرسراہٹیں سنیں۔ پلٹ کر دیکھا تو اشیش بھگونت اپنی تمام بھیانک صورتوں کے ساتھ اندر سے نکل کر اُن کے سامنے آ رہا تھا۔ تینوں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ تینوں کے منہ سے ''جے بھگونتا'' کے الفاظ نکلے اور شیطان نے دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ پھر وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ آیا۔

''کہو، یہ جیون اچھا ہے یا وہ اچھا تھا جو تم گزارتی رہی ہو؟ اشیش بھگونتا کے چرنوں میں آنے کے بعد تم کو کیسا لگا ہے؟''

''جے ہو بھگونتا کی۔ ہم بہت خوش ہیں۔'' رادھا نے گردن جھکائے ہوئے کہا۔

''اور ہمیشہ خوش رہو گی۔ سنسار میں تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو تمہارے دل کی خواہش ہے۔''

''ہمیں سب کچھ مل چکا ہے۔''

''نہیں...... ابھی کہاں؟ ابھی تو تم صرف میرے لئے چھوٹے چھوٹے کام کر رہی ہو۔ کچھ عرصے کے بعد میں تمہیں آزادی دُوں گا اور تم اپنے لئے کام کرنا۔ کیا سمجھیں؟ اس سنسار کو ہلا کر پھینک دو۔ جتنے نیکیاں کرنے کے شوقین لوگ اس سنسار میں موجود ہیں، ان سب کو ایسا سبق دو کہ وہ بھی یاد کریں۔''

''ہم بھگونتا کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ ویسے راگنی اور رما ابھی تک واپس نہیں آئیں؟''

راگنی کو تو میں نے تم سب کے کام کے لئے چھوڑا ہوا ہے۔ اور سنسار کا تجربہ حاصل کر رہی ہے۔ یعنی جو دشمنی کرے اُسے کیسے نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ طے کر لیا ہے اُس نے کہ راوت رائے کے پورے پریوار کو وہ اس طرح ملیامیٹ کرے گی کہ اس کا کوئی نام لیوا اس سنسار میں نہیں رہے گا۔ روپا نے اپنا کام کر دیا ہے اور اب رما اپنا کام ختم کر چکی ہے اور واپس لوٹنے والی ہے۔ جاؤ، دروازے پر دیکھو۔ وہ آ گئی ہو گی۔''

روپا دوڑتی ہوئی دروازے کے پاس گئی۔ اپنی چھوٹی بہنوں سے اُسے سب سے زیادہ پیار تھا۔ واپس آئی تو رما اُس کے ساتھ تھی۔ اشیش بھگونت کو دیکھ کر رما نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گردن جھکا دی اور بولی۔

''جے بھگونتا......''

شیطان ہنس پڑا۔ اُس نے کہا۔ ''رما، یہ الفاظ تو، تو نے پورے شہر سے کہلوا دیئے۔ اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔''

''میں سمجھی نہیں مہاراج؟'' رما نے کہا۔

''تمہیں ایک خونخوار اور سفاک قاتل کی حیثیت سے بھیج کر میں نے تمہارا نام جے بھگونتا مشہور کیا اور دیکھ لو، اس وقت سارا شہر جے بھگونتا، جے بھگونتا کی گردن کر رہا ہے۔ اس سے تمہیں کچھ اور بھی اندازے ہوئے ہوں گے۔''

''سنسار میں ہم نے دیکھا ہی کیا ہے مہاراج...... اس لئے ہمیں کیا اندازے ہو سکتے ہیں؟''

''یہ سنسار طاقتور کا پجاری ہے۔ اور جہاں طاقت ہے وہاں جے جے کار ہے۔ قتل و غارت گری کر کے تم نے دہشت پھیلائی اور لوگ جے بھگونتا کرنے لگے۔''

''مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی مہاراج۔''

''کیا؟''

''یہ صرف ایسی بری عورتوں ہی کو کیوں نشانہ بنایا گیا؟''

''بات اصل میں یہ ہے کہ پرانے زمانے میں دنیا بہت کم عقل تھی۔ بڑے سے بڑا کام ہو جائے، کان کے پاس سے گزر جاتا تھا۔ اب یہ دور تجسس کا دور ہے۔ تم دیکھو، لوگ کس طرح اس چکر میں پڑے رہے کہ صرف بری عورتوں کو ہی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مگر اصل کام تھا جے بھگونتا کا نام اتنا مشہور کرنا۔ ویسے تم ایک بات بتاؤ رما، ان عورتوں کو قتل کرتے ہوئے تمہیں کوئی دقت تو نہیں پیش آئی؟''

''سچ تو یہ ہے بھگونتا، جب میں ایسا کام کرتی تھی تو میرے شریر میں آپ ہوا کرتے تھے۔ اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے ہاتھ خود نہیں چل رہے، میرا دماغ خود نہیں سوچ رہا بلکہ میرے اندر کوئی اور بیٹھا ہوا یہ سارے کام کر رہا ہے۔ میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔''

''بے وقوف، وہ ہم ہی تو تھے۔''

''میں جانتی تھی مہاراج...... اب بتایئے ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''آرام...... میں اپنے لئے کام کرنے والوں کو اس طرح تھکا کر نہیں مارتا۔ اب صرف رجنی اور رادھا رہ گئی ہیں۔ لیکن ابھی تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا کہ اچھا کام کر کے میں تم دونوں میں سے کسی ایک کو معروف کروں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' شیطان نے کہا اور لمحوں کے اندر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ چار خوفناک لڑکیاں اپنے رہنما کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ اُن کی عقلوں پر پردے پڑ گئے تھے اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے؟ شیطان کے جال میں پھنسنے والے اسی طرح عقل سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

۞

راوت رائے کے گھر کا چراغ بجھ چکا تھا، معمولی بات نہیں تھی۔ دُور دُور تک کہرام مچ گیا تھا۔ راوت رائے نے سورن سنگھ کی تلاش میں آدمی دوڑا رکھے تھے۔ واپس آتے ہی اُس نے اپنے آدمی لاکھن سنگھ کی طرف دوڑائے جو تھوڑی دیر کے بعد لاکھن سنگھ کو ساتھ لئے راوت رائے کے پاس پہنچ گئے۔ راوت رائے شدتِ غم سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ لاکھن سنگھ کو ابھی تک صورت حال کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ لیکن جس طرح راوت

رائے کے آدمی اُسے گرفتار کر کے لائے تھے وہ اس پر شدید حیران تھا۔ اُس نے راوت رائے کو
غصیلے لہجے میں کہا۔

''مہاراج، کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ راوت رائے مہاراج کسی بات پر ناراض ہو کر ہم
ساتھ ایسا سلوک کریں گے۔''

راوت رائے نے زہریلی نگاہوں سے لاکھن سنگھ کو دیکھا اور غرا کر بولا۔ ''لاکھن سنگھ، اپنی دھرم
سے پوچھ، تیرے بیٹے کی رگوں میں تیرا ہی خون دوڑ رہا ہے یا کہیں منہ کالا کر بیٹھی تھی وہ؟''

لاکھن سنگھ نے یہ الفاظ سنے، حیرت سے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور پھر ان الفاظ پر غور کر کے ا
چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''مالک ہیں مہاراج...... جتنی چاہیں گالیاں دے سکتے ہیں۔ لیکن کم از کم
دینے سے پہلے یہ تو بتا دیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟''

''وجہ...... تیرے اس پاپی کتے نے، تیرے بیٹے سورن سنگھ نے یشونت رائے کو مار دیا۔ میرے
کو مار دیا، اُس نے۔'' راوت رائے بلک بلک کر رو پڑا۔

لاکھن سنگھ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں مہاراج؟''

''لاش رکھی ہے اُس کی۔ دیکھ لے، سورن سنگھ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ یہ تھا تم لوگو
کھلانے کا نتیجہ۔ ارے کیسے پالا ہے میں نے تمہیں اس کا تمہیں خود اندازہ ہوگا۔ اپنے ساتھ بٹھا
ہے، کبھی نوکر نہیں سمجھا۔ اور اُس پاپی ہتیارے کو تو خاص طور سے میں نے اپنے یشونت رائے کی طرح
رکھا ہے۔ مار دیا اُس نے...... مار دیا میرے بیٹے کو۔''

لاکھن سنگھ ششدر رہ گیا تھا۔ اُس کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ تب راوت رائے نے
''لاکھن، اُسے تلاش کر کے میرے سامنے لے آ۔ بدلہ لوں گا میں اُس سے لاکھن۔ میں اُس سے بدلہ
گا۔ چھوڑوں گا نہیں اُسے میں تجھ سے کہے دیتا ہوں۔'' پھر اپنے آدمیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''
لاکھن سنگھ کی پتنی اور اس کے تمام بچوں کو گرفتار کر کے قید کر دو۔ سو آدمیوں کا پہرہ لگا دو ان کے گرد۔
نہ جانے پائیں۔'' پھر لاکھن سے کہا۔ ''جا، لاکھن سنگھ۔ تو اپنے بیٹے کو تلاش کر کے لا۔ تین دن کے اندر
اگر تو نے سورن سنگھ کو میرے حوالے نہ کر دیا تو اس کے بعد جب تو میرے پاس آئے گا تو میں تجھے
دھرم پتنی اور بچیوں کی لاشیں پیش کر دوں گا۔ اسے باہر نکال دو...... جاؤ، تین دن کے اندر اندر سورن
گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کر دو۔ یہ تم زیادہ بہتر جانتے ہو کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔''

''شما کریں مہاراج...... شما کریں۔''

''اسے باہر نکال دو۔'' راوت رائے نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔ لاکھن سنگھ کو
سے باہر نکال دیا گیا اور اُس کے گھر والوں کو قید کر دیا گیا۔

پھر یشونت رائے کے کریا کرم کی تیاریاں ہونے لگیں اور پاگل لاکھن سنگھ چاروں طرف بھٹکنے لگا۔
پر دیوانگی سی طاری ہو رہی تھی۔ یہ کیا ہو گیا، اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سورن سنگھ کو کہاں تلاش
لوگوں سے معلومات حاصل کیں کہ یشونت رائے کو کس طرح ہلاک کیا گیا؟ اور عینی گواہوں نے لا

کو بتایا کہ صورت حال کیا ہوئی۔

''ہرے رام، ہرے رام۔ وہ لڑکی تو بہت اچھی ہے۔ کیا اُس کی وجہ سے ایسا ہوا ہے؟ یہ تو بہت برا
ہوا۔ اب کیا ہوگا؟ کیا، کیا جائے؟''

بہر حال، یشونت رائے کی ارتھی جلا دی گئی تھی اور راگنی نے محل میں جو سوگ دیکھا اس سے اُسے دلی
سکون حاصل ہوا۔ زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی۔ اسی راوت رائے نے اُس کے پتا کو بری طرح اذیتیں
دے کر مار دیا تھا اور ان سب کو تہہ خانے میں بند کر دیا تھا۔ وہ تو اگر اشیش بھگونت کی مہربانی نہ ہوتی تو اسی
تہہ خانے میں اُن کی لاشیں بھی سوکھے ہوئے ڈھانچوں کی شکل میں پڑی ہوتیں۔ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا
ملنی ہی چاہئے۔ اور بڑی بات ہے اشیش بھگونت کی کہ وہ دشمنوں کی سزا کے لئے بھی ایسے فیصلے کرتا ہے کہ
دشمن تلملا کر رہ جائیں۔

بہر حال راگنی اپنا کام بخوبی انجام دے رہی تھی اور وقت گزر رہا تھا۔ لاکھن سنگھ اپنے بیٹے کی تلاش میں
ناکام ہو گیا تھا۔ لیکن راوت رائے کے آدمیوں نے آخر کار سورن سنگھ کو تلاش کر لیا۔ وہ جنگل میں چھپا ہوا
تھا۔ اس وقت کسی انسان کا سہارا لینا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔ چنانچہ اُس
نے کافی فاصلے پر جنگل میں پناہ لی تھی۔ لیکن راوت رائے کے آدمیوں نے اُسے تلاش کر لیا تھا، اور پھر
رات کو بڑی چالاکی سے اُسے پکڑ لیا گیا۔ یہ خبر پوری آبادی میں پھیلی ہوئی تھی اور لوگوں کو جب یہ بات
معلوم ہوئی کہ سورن سنگھ پکڑا گیا ہے تو ساری خلقت اُسے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ لاکھن سنگھ کو اس
وقت محل میں آنے کی اجازت تھی جب سورن سنگھ پکڑا جائے۔ خود تو بیٹے کو تلاش نہیں کر سکا تھا لیکن اس خبر
نے اُس کے حواس پر بجلی گرا دی تھی۔ روتا پیٹتا راوت رائے کے سامنے پہنچ گیا اور جھک کر راوت رائے
کے قدم پکڑ لئے۔

''مہاراج، آپ کا مجرم پکڑا گیا ہے، مہاراج آپ کا مجرم پکڑا گیا ہے۔ پر میری اولاد ہے وہ۔ میں
نے جیون بھر آپ کا نمک کھایا ہے اور آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی ہے مہاراج۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل
کرتے ہوئے کبھی یہ نہیں سوچا کہ حکم کیا ہے۔ بس آنکھیں بند کر کے عمل کیا ہے۔ سارے جیون کی خدمت
کا صلہ دے دیں مجھے۔ میرے بیٹے کو معاف کر دیں...... معاف کر دیں مہاراج، میرے بیٹے کو۔''

''معافی مانگنا چاہتے ہو اپنے بیٹے کے لئے؟ کر دیں گے معاف۔ ذرا سوچ لیں کہ سورن سنگھ کے
ساتھ کیا، کیا جا سکتا ہے؟''

''اسے آزادی دے دیں مہاراج۔ اپنے بیٹے کو اس طرح نقصان پہنچتے میں نہیں دیکھ سکتا۔''

''ٹھیک ہے...... میرا بیٹا واپس لا دو۔ کیا سمجھے؟ میرا بیٹا واپس لا دو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سمجھے
مہاراج لاکھن سنگھ؟ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آہ...... میں یشونت رائے کو کہاں سے لاؤں؟''

''تو پھر سورن سنگھ کو بھی بھول جاؤ۔ کیا سمجھے؟''

بہر حال، لاکھن سنگھ خوشامد کرتا رہا لیکن راوت رائے پر دیوانگی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی

موت کو کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتا تھا یہاں تک کہ لاگھن سنگھ مایوس ہوگیا۔ سورن سنگھ کو بند کر دیا گیا اور راوت رائے یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح اپنے بیٹے کی موت کا انتقام لے۔

بہرحال یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں۔ پھر اُس دن ٹھیک دوپہر کے وقت راوت رائے نے اعلان کیا کہ سورن سنگھ کو یشونت رائے کے قتل کے الزام میں موت کی سزا دی جائے گی۔ سزا کا یہ بندوبست حویلی ہی کے ایک حصے میں کیا گیا تھا۔ راگنی خاموش تماشائی کی طرح سارے منظر دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں خوش تھی کہ وہ سب کچھ ایک سسٹم کے تحت ہو رہا ہے جو ہونا چاہئے تھا۔ اُس کی ہر چال کامیاب ہو رہی ہے۔ چنانچہ راوت رائے کے اشارے پر ایک چھوٹا سا چبوترا بنایا گیا اور اس کے چاروں طرف لکڑیاں چن دی گئیں۔ درمیان میں ایک کھمبا نصب کر دیا گیا تھا۔ لاگھن سنگھ پاگلوں کی طرح ایک کونے میں بیٹھا رہا کرتا تھا۔ اُس کے گھر والوں کو تو قید کر دیا گیا تھا اور راوت رائے نے اُنہیں آزادی نہیں دی تھی۔ لیکن لاگھن سنگھ آزاد تھا۔ البتہ اُس کے بھی باہر نکلنے پر پابندی تھی کہ کہیں بیٹے کی رہائی کے لئے کوئی سازش نہ کر ڈالے۔ غرض یہ کہ مقررہ وقت سورن سنگھ کو اس چبوترے پر لے جا کر کھمبے سے باندھ دیا گیا۔ لاگھن سنگھ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

''ہے بھگوان...... ہے مہاراج، کیا کرو گے میرے بچے کے ساتھ، بتا تو دو مجھے؟

لیکن راوت رائے نے جو کچھ کیا وہ اُس کی وحشیانہ فطرت اور دیوانگی کا اظہار تھا۔ وقت مقررہ پر سورن سنگھ کے پورے بدن پر گھی انڈیلا گیا اور پھر چتا میں آگ لگا دی گئی...... سورن سنگھ کی وحشیانہ چیخیں وہاں موجود ہر شخص کو لرزا رہی تھیں۔ لاگھن سنگھ چیخ مار کر بے ہوش ہوگیا تھا۔ پھر جب اُسے ہوش آیا تو سورن سنگھ کا جلا ہوا جسم کھمبے سے بندھا ہوا تھا...... یہ جسم کوئلہ بن چکا تھا۔ تب راوت رائے نے لاگھن سنگھ کو اجازت دی کہ سورن سنگھ کی راکھ سمیٹ کر اس کا کریا کرم کر دے۔ لاگھن سنگھ میں بھلا اتنی ہمت کہاں تھی؟ بہرحال دوسرے لوگوں نے یہ سارا کام کر ڈالا۔

حویلی میں موت کا سا سکوت طاری ہوگیا تھا۔ ہر شخص خوف و دہشت کا شکار تھا۔ اور اُدھر راگنی اپنے طور پر نئے راگ سوچ رہی تھی۔ لاگھن سنگھ گوشہ نشین ہوگیا تھا۔ بس ایک جگہ پڑا رہتا تھا۔ اُس نے راوت رائے سے کہا۔

''مگر مہاراج...... میری پتنی اور بچوں نے تو آپ کا کچھ نہیں بگاڑا۔ آپ نے سورن سنگھ کو مجھ سے چھین لیا پر دوسروں کو تو چھوڑ دیجئے۔''

''لاگھن سنگھ! تیرے تو دوسرے بچے بھی ہیں۔ میرا تو یشونت رائے کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔''

''ٹھیک ہے مہاراج، سورن کو تو آپ نے مار دیا۔ کیا دھرا تو اُسی کا تھا۔''

''دیکھوں گا...... سوچوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔ سوال کروں گا اپنے من سے۔ جو بھی جواب ملے گا، اس پر عمل کروں گا۔'' راوت رائے نے بے رحمی سے کہا تھا۔

لیکن راگنی کوئی نئی چال چلنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔ اور آخر کار ایک ترکیب اُس کے دل میں آ گئی۔ اُس نے ایک شام راوت رائے سے ملاقات کی۔ اپنے چہرے کو اُس نے اتنا غمزدہ بنا لیا تھا کہ راوت

رائے اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''یہ تجھے کیا ہوا؟''

''مہاراج...... آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یشونت رائے مہاراج اتنے معمولی تھے کہ اس طرح نظر انداز کر دیئے جائیں؟ میں تو جب بھی کبھی باغ جاتی ہوں، گھنٹوں اس جگہ بیٹھی رہتی ہوں جہاں مہاراج یشونت رائے کو مارا گیا۔ مہاراج، آپ سے کچھ نہ کہتی میں، پر میں نے وچن دیا ہے یشونت رائے مہاراج کو کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ آپ تک پہنچا دوں۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟'' راوت رائے نے سوال کیا۔

''مہاراج، جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں باغ میں جاتی رہتی ہوں اور اُس جگہ جا کر بیٹھ جاتی ہوں جہاں یشونت رائے مہاراج کو ہلاک کیا گیا۔ کل بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی کہ میں نے یشونت رائے کی آتما دیکھی۔ سفید کپڑے پہنے اتنے سندر لگ رہے تھے وہ کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ فضا میں تیرتے ہوئے میرے پاس آئے اور بولے کہ راگنی، ہم اس سنسار سے چلے گئے اور پتا جی نے ہمارے قاتلوں سے صحیح بدلہ بھی نہ لیا۔ ہماری آتما شانت نہیں ہوئی ہے۔ پتا جی سے کہنا کہ باغ میں اسی جگہ ہم سے کل رات کو مل لیں ساڑھے نو بجے جب چندرما آکاش پر بکھرا ہوا تھا۔ ہم پتا جی سے ملاقات کرنے آئیں گے اور اُن سے اپنے دل کی بات کریں گے۔''

''کیا کہہ رہی ہے تو؟''

''سندیس تھا مہاراج، جو میں نے آپ کو دے دیا۔ باقی آپ جانیں اور آپ کا کام۔''

''رات کو ساڑھے نو بجے آج؟''

''ہاں مہاراج۔''

''جائیں گے ہم۔ ہم اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو دیکھیں گے۔ پوچھیں گے اُس سے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ راگنی، تو ہمارے ساتھ چلے گی۔''

''آتمائیں جب اپنوں سے ملتی ہیں مہاراج، تو کوئی دوسرا ساتھ نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ ہم جائیں گے۔ اُس سے ملیں گے۔'' اور پھر راوت رائے نے تیاریاں شروع کر دیں۔ اندر ایک ہلکا سا خوف بھی تھا لیکن بیٹے کا پیار دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ اور پھر راگنی کی پراسرار شخصیت بھی اُس کے سامنے تھی۔ بہرحال تیار ہو کر چل پڑے۔

اکیلے ہی باغ میں گئے تھے اور اُس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں یشونت رائے کی لاش دستیاب ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ رونے کی آواز اُبھر رہی تھی اور وہ چندرما کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

اُدھر راگنی اپنے بھیانک کھیل کے دوسرے حصے پر عمل کرنے کے لئے ہر طرح سے اپنے آپ کو تیار کر چکی تھی۔ شیطان نے اُسے جو شکتی دی تھی اس شکتی کو کام میں لاتے ہوئے وہ حلیہ بدلنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پھر ایک درخت کی آڑ میں اُس نے اپنے آپ کو تبدیل کیا اور اب وہ یشونت رائے کی صورت اختیار کر چکی تھی...... سر سے پاؤں تک ایک بہت ہی ہلکا خوبصورت لبادہ، یشونت رائے کی آواز،

اُس کا چہرہ۔ پھر وہ فضا میں تیرتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ راوت رائے گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا ہچکیوں سے رو رہا تھا کہ راگنی نے اپنے پاؤں سے آہٹیں پیدا کیں اور راوت رائے نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ یشونت رائے کی آتما کو دیکھ کر راوت رائے ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ پھیلے اور وہ روتے ہوئے آگے بڑھا۔

''میرے بچے...... میرے لعل۔''

لیکن راگنی اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی اور راوت رائے سے دس گز دُور پہنچ کر بولی۔ ''پتا جی...... آتمائیں کبھی جیتے انسانوں سے نہیں ملتیں۔ آپ اگر مجھ سے دُور نہ رہے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔''

''میرے بچے... میرے لعل... میرے یشونت رائے، کیا ہوا تھا تیرے ساتھ؟ مجھے بتا تو سہی۔''

''جو کچھ ہوا تھا آپ کو پتہ چل گیا ہے اس کا پتا جی۔ بس ظلم ہوا تھا میرے ساتھ۔ دھوکے سے مار دیا پاپی سورن سنگھ نے مجھے۔ پر آپ نے اُس سے بدلہ میری مرضی کے مطابق نہیں لیا پیا جی۔ میری آتما آج تک پیاسی ہے۔''

''زندہ جلا دیا تھا میں نے سسرے کو...... زندہ جلا دیا تھا میں نے۔''

''اس سے میری آتما شانت نہیں ہوئی۔''

''تو بول، کیا چاہتا ہے تو، مجھے بتا؟'' راوت رائے بولا۔

''لاکھن سنگھ کی دھرم پتنی اور اُس کی بچیاں اور دوسرے بچے کیوں محفوظ ہیں؟ آپ نے اُنہیں جیتا کیوں چھوڑ دیا؟''

''مار دُوں گا اُن پاپیوں کو میں...... مار دُوں گا۔ میں نے قید تو کر رکھا ہے اُنہیں۔''

''نہیں پتا جی...... آپ اُن سب کو لے کر یہاں آیئے، اس جگہ جہاں مجھے مارا گیا۔ اور پھر لاکھن سنگھ کے سامنے سب کو مار دیجئے۔ بس لاکھن سنگھ کو جیتا چھوڑ دیجئے تاکہ وہ جیون بھر اپنے پریوار کا سوگ مناتا رہے۔ تب میری آتما شانت ہوگی پتا جی... بولئے، کریں گے آپ میرے لئے ایسا؟''

''اوش کروں گا میں میرے بچے...... تیری آتما کی شانتی کے لئے میں سارے سنسار کو زندہ جلا سکتا ہوں۔ میں اوش ایسا کروں گا۔''

''میں انتظار کروں گا۔''

''دو دن کے بعد...... صرف دو دن کے بعد تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ تیری ساری باتوں پر عمل ہوگا۔''

''میری آتما دیکھے گی پتا جی۔ اور تبھی مجھے سکون حاصل ہوگا۔''

''ٹھیک ہے...... ایسا ہی ہوگا...... ایسا ہی ہوگا۔ لیکن کیا لاکھن سنگھ کو بھی یہاں لانا پڑے گا؟''

''ضروری نہیں ہے پتا جی...... ضروری نہیں ہے۔ اگر آپ نہ لانا چاہیں تو نہ لائیں اُسے۔''

''ٹھیک ہے...... تو چنتا مت کر۔ جیسی تیری خوشی ہوگی، ویسا ہی ہوگا۔'' یہ کہہ کر راوت رائے پھر رونے لگا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے دُھندلا گئیں۔ پھر جب اُس نے آنکھیں صاف کر کے یشونت

رائے کو دیکھنے کی کوشش کی تو اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ یشونت رائے کی آواز اُس کے خیال کے مطابق فضا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

راوت رائے روتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ لیکن بیٹے نے جو مانگ کی تھی اس کے بارے میں وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے؟ لاکھن سنگھ تو ایک طرح سے گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ لیکن راوت رائے، لاکھن سنگھ کی بیوی اور بچوں پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ لاکھن سنگھ کے بیوی بچوں کو باغ میں لے جا کر قتل کر دے۔ اور پھر تیسرے دن کی شام اُس نے تیاریاں کر لیں اور خاموشی کے ساتھ وہاں پہنچ گیا جہاں لاکھن سنگھ کے بیوی بچے قید تھے۔ وہ سب کے سب بری حالت میں تھے۔ تین بیٹیاں اور دو چھوٹے بچے، چھ اولادیں تھیں لاکھن سنگھ کی۔ ساتویں اُس کی بیوی تھی۔ اب اس وقت بیوی اور پانچ بچے راوت رائے کے قیدی تھے۔

راوت رائے نے چالاکی سے لاکھن سنگھ کی دھرم پتنی سے کہا۔ ''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم سب کو خاموشی کے ساتھ حویلی سے باہر نکال دُوں۔ اس کے بعد تم اپنا رہن سہن کا انتظام کہیں اور کر لو۔ یہاں تم جب تک رہو گے میرے من میں بدلے کی آگ سلگتی رہے گی۔''

لاکھن سنگھ کی بیوی نے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا۔ ''دوش ہمارا نہیں ہے مہاراج...... جس نے جو کیا اُس کو سزا دے دی آپ نے۔ بھگوان کے لئے آپ ہمیں یہاں سے نکال دیجئے۔''

''ٹھیک ہے...... تیار ہو جاؤ۔ لاکھن سنگھ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ میں خاموشی سے تمہیں وہاں پہنچا دُوں گا۔''

لاکھن سنگھ کی دھرم پتنی بیچاری سیدھی سادھی عورت تھی۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی اُسے موت کی طرف لے جا رہی ہے۔ اُسے علم تھا کہ اُس کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ غم وہ پی گئی تھی کیونکہ باقی بچوں کی زندگی بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی اُسے۔ بہرحال تیار ہو گئی تو راوت رائے خود اُسے ایک گاڑی میں لے کر چل پڑا۔ تین آدمی اُس کے ساتھ تھے اور پھر کچھ دیر کے بعد وہ اُس باغ میں داخل ہو گیا جو رسک لعل کا باغ تھا۔ یہاں اُس نے لاکھن سنگھ کی بیوی اور بچوں کو نیچے اُتارا اور اُنہیں لے کر اس جگہ چل پڑا جہاں یشونت رائے قتل ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے لاکھن کی دھرم پتنی سے کہا۔ ''دیکھ رہی ہے...... یہ ہے وہ جگہ جہاں تیرے بیٹے نے میرے بیٹے کا جیون لیا تھا۔ وہ سسرا تو مارا گیا لیکن اپنے پریوار کے لئے موت کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑ گیا۔ اب یہ موت تیرا راستہ تک رہی ہے۔''

''م...... مہاراج، میں سمجھی نہیں؟''

''سمجھاتا ہوں میں تجھے۔'' راوت رائے نے کہا اور اپنے ساتھیوں کے ہاتھ سے بندوق لے لی۔ پھر پہلی گولی اُس نے لاکھن سنگھ کی ایک بیٹی کو ماری تھی...... وہ ہائے رام کہہ کر زمین پر گری تو دوسری گولی دوسری بیٹی کے سینے میں داخل ہو گئی۔ لاکھن کی دھرم پتنی جلدی سے آگے آئی تو راوت رائے کی چلائی ہوئی گولی نے اُسے بھی چاٹ لیا۔ اور کچھ دیر کے بعد وہاں چھ لاشیں تڑپ رہی تھیں...... اور راوت رائے خونخوار نگاہوں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ ''میرے بیٹے کا جیون اتنا سستا نہیں کہ اتنی آسانی سے اسے چھوڑ دیا

جائے۔ تم سب کو اس کی قیمت چکانی پڑی ہے۔ ہوتا ہے...... ایسا بھی ہوتا ہے۔''
راگنی ایک ایک لمحے پر نگاہ رکھ رہی تھی۔ راوت رائے کو اُس نے جس راستے پر لگا دیا تھا اُسے یقین
کہ راوت رائے کے دل میں انتقام کی جو آگ سلگ رہی ہے اس کے تحت وہ وہی سب کچھ کرے
راگنی نے اُس سے کہا تھا۔ اور جب اُس نے راوت رائے کو اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں جاتے
دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بس اُس نے اتنا وقفہ کر دیا کہ راوت رائے باغ میں پہنچ
اپنا کام کر لے۔ اور جب اُس کے اندازے کے مطابق اتنا وقت گزر گیا تو پھر وہ اپنی جگہ سے نکل
اب اُسے لاکھن سنگھ کی تلاش تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہاں آنے کے بعد جو خوفناک کھیل
نے کھیلا تھا اس نے اس حویلی کی شکل ہی بگاڑ دی تھی۔ ورنہ کچھ عرصے قبل یہاں زندگی کی ہر خوشی
تھی۔ سب ہنستے بولتے، کھاتے پیتے نظر آ رہے تھے اور ایک دلچسپ اور دلکش ماحول تھا۔ لیکن اب یہاں
کے سایوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

یشونت رائے کی موت کے بعد حویلی میں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ کوئی ہنستا بولتا نہیں
تھا۔ اُدھر لاکھن سنگھ کے ساتھ راوت رائے کا رویہ انتہائی سخت تھا۔ راوت رائے نے لاکھن سنگھ کی کوئی
ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اُدھر لاکھن سنگھ کی بیوی اور بچوں کو بھی قید کر دیا گیا تھا اور کسی بھی طرح لاکھن
سنگھ کو اُن کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ راوت رائے کوئی رعایت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا
ویسے لاکھن سنگھ کو خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ جو کچھ ہوا وہ انتہائی دردناک تھا۔ اور اگر انتقامی طور
راوت رائے نے یہ سارے اقدامات کئے ہیں تو بہرحال ایک طرح سے وہ اس میں حق بجانب بھی ہے
دونوں اپنے چشم و چراغ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور دونوں کے دلوں میں غموں کی پرچھائیاں گرا
کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی لاکھن سنگھ بیٹھا رو رہا تھا کہ راگنی بری طرح بدحواس اُس کے پاس پہنچی
لاکھن سنگھ اُسے دیکھنے لگا۔

''لاکھن جی مہاراج...... جلدی اُٹھئے لاکھن سنگھ مہاراج، دیر کر دی تو انرتھ ہو جائے گا۔''
لاکھن سنگھ گھبرا گیا۔ راگنی کو دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ ''اب کیا انرتھ ہو گا پگلی۔ میرا تو سارا جیون نا
ہو گیا۔ پتہ نہیں بھگوان نے مجھے کون سے کئے کی سزا دی جبکہ میں نے خود تو کچھ بھی نہیں کیا۔ پر میری آ
میرے شریر سے نکل گئی۔ ہائے، میرا بیٹا مجھ سے دُور ہو گیا ہے بھگوان۔''
''آپ میری بات سن ہی نہیں رہے، اپنی لگائے جا رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں کچھ معلوم بھی ہے آپ
اپنی دھرم پتنی اور بچوں کے بارے میں؟''
لاکھن سنگھ خوف سے اُچھل پڑا۔ اُس نے کہا۔ ''کیا ہوا بھگوان...... کیا ہوا اُنہیں؟ کوئی نقصان پہنچ
گیا؟''
''پہنچا تو نہیں ہے، لیکن پہنچ جائے گا۔ آپ جلدی سے باغ میں چلے جائیے۔''
''کون سے باغ میں؟'' لاکھن سنگھ نے وحشت بھرے انداز میں پوچھا۔
''ارے اُسی میں جہاں یہ سارا کھیل ہوا ہے۔'' راگنی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''لیکن، کک...... کیوں...... کیا ہوا؟''
''راوت رائے مہاراج آپ کی پتنی اور بچے بچیوں کو وہیں باغ میں لے گئے ہیں۔ پتہ نہیں اُن کا کیا
ارادہ ہے؟ میں نے اُن کے ہاتھ میں بندوق بھی دیکھی تھی۔''
''ہے بھگوان...... ہے بھگوان......'' لاکھن سنگھ کے منہ سے نکلا۔ اور اس کے بعد اُس نے دوڑ لگا دی۔
تھوڑی دیر کے بعد اُس کا گھوڑا اُس منحوس باغ کی طرف دوڑ رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں کہتا جا رہا تھا۔
''نہیں یہ باغ کس کس کا جیون لے کر رہے گا؟ ارے یہ تو وہی منحوس باغ ہے جس کی وجہ سے بیچارے
رسک لعل کا جیون گیا۔ رسک لعل کے باغ میں اب گندی آتماؤں کے ڈیرے ہیں۔ وہاں بہت کچھ ہو رہا
ہے...... بہت کچھ ہو رہا ہے وہاں...... ہے بھگوان، میرے بچوں کی رکشا کرنا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا آخرکار
باغ میں پہنچ گیا۔ لیکن اُس نے کافی فاصلے پر راوت رائے اور اُس کے چند خاص آدمیوں کو باغ سے واپس
جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اصل میں راگنی بہت چالاک تھی۔ اُس نے اتنی دیر کا تعین کرنے کے بعد لاکھن
سنگھ کو اس بارے میں اطلاع دی تھی جتنی دیر میں راوت رائے اپنا کام کرنے کے بعد آسانی سے نکل
جائے۔ البتہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اہم بات ہوئی تھی کہ لاکھن سنگھ نے راوت رائے کو باغ سے جاتے
دیکھا تھا۔ اُس کا دل دھک سے ہو گیا تھا۔ پھر اُس کی نگاہیں باغ کی جانب اُٹھ گئیں۔ نجانے کیوں اُس
کے دل نے کہا کہ باغ میں داخل ہو کر دیکھا جائے۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا باغ میں داخل ہو گیا۔ فطرت اُس
کی رہنمائی کر رہی تھی۔ اہل خاندان کا خون اُسے پکار رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ اُس قتل گاہ میں پہنچ
گیا جہاں چھ لاشیں پڑی تھیں۔ لاکھن سنگھ کا پورا خاندان۔ اُس کی بیوی، اُس کے بچے۔
لاکھن سنگھ کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ اپنے ایک ایک بچے
کے پیروں کو چوم رہا تھا۔ نجانے کیا کیا الفاظ اُس کے منہ سے نکل رہے تھے جو بڑے غم انگیز تھے۔ وہ رو رو
کر کہہ رہا تھا۔ ''ہے بھگوان...... ہے بھگوان...... میرا پورا پریوار ختم ہو گیا...... پورا پریوار ختم ہو گیا میرا......
ہائے کوئی بھی باقی نہیں بچا۔ یہ کیا ہو گیا؟ سورن گیا اور سب چلے گئے...... میں کیوں جیتا ہوں؟ ہائے میں
کیوں جیتا ہوں؟ ہے بھگوان، مجھے بھی مر جانا چاہئے۔'' وہ بری طرح سر پیٹتا رہا۔ پھر اُس نے آگے بڑھ
کر ایک درخت سے سر مارنے کی کوشش کی لیکن ایک نرم و نازک ہاتھ اُس کے اور درخت کے درمیان میں
آ گیا۔ لاکھن نے رُک کر اُس ہاتھ کو دیکھا تو اُسے راگنی نظر آئی۔
''یہ کیا کر رہے ہیں لاکھن سنگھ جی مہاراج...... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''
''دیکھ لو...... ارے دیکھ لو، اُس پاپی نے دیکھو میرا پورا ہی پریوار ختم کر دیا۔ نام و نشان مٹا دیا میرا اس
سنسار سے...... ہے بھگوان یہ میرے بچے ہیں، یہ میری پتنی ہے۔ اب کوئی بھی نہیں رہا میرا۔ ارے بھگوان
ناش کرے اُس کا۔ پر بھگوان اُس کا ناش کیوں کرے؟ میں خود اُسے کتے کی موت ماروں گا۔ اب کیا رکھا
ہے میرے جیون میں؟ اب کس کے لئے جیوں میں؟ اور بھگوان کی سوگند، اُسے بھی نہیں چھوڑوں گا میں۔
ارے نہیں چھوڑوں گا رے راوت رائے تجھے۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔ جیسے تو نے میرا پریوار ختم کیا ہے
ایسے ہی میں بھی تیرا پریوار ختم کروں گا۔ کیا سمجھتا ہے تو...... کیا سمجھتا ہے۔ اے بھگوان کی سوگند ان سب کی

چتا نہیں جلاؤں گا میں اس سمے تک جب تک اس پاپی کو بھی جان سے نہ ماردوں۔ نہیں چھوڑوں گا میں اُسے۔'' لاگھن سنگھ جوش کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ راگنی اب اُس کے سامنے آ گئی تھی۔

''کیا کرو گے لاگھن جی؟''

''ماردوں گا ایک ایک کو۔''

''حویلی میں جا کر؟''

''ہاں...... ایک ایک کو حویلی میں جا کر ماروں گا۔''

''تم نے سوگند کھائی ہے کہ تم اس سمے تک ان سب کی چتا نہیں جلاؤ گے جب تک اُنہیں مار نہ دو۔''

''ہاں......''

''پاگل تو نہیں ہو تم لاگھن سنگھ؟''

''ہاں پاگل ہو گیا ہوں میں۔''

''تو پھر تم اپنی سوگند کبھی پوری نہیں کر سکو گے۔'' راگنی نے کہا اور لاگھن سنگھ اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

''ہاں...... حویلی راوت رائے کی ہے۔ پوری حویلی میں اُس کے آدمی بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ بات مجھ سے زیادہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اگر حویلی میں تم اُس کے کتے کو بھی ہلاک کرو گے تو وہ اپنے کتے تم پر چھوڑ دے گا۔ اور وہ کتے خود تمہاری تکہ بوٹی کر دیں گے۔''

''کتنے آدمی ہیں وہاں راوت رائے کے، تم کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے۔ مگر میرے من میں جو چتا سلگ رہی ہے اس کے لئے میں کیا کروں؟''

''اسے اور آگ دو...... اور بھڑکاؤ...... ابھی جلد بازی نہ کرو۔ ابھی یہاں کوئی نہیں ہے، اور کوئی نہیں آئے گا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ چلو، سوکھی لکڑیاں جمع کرو اور چتا بنا دو ان سب کی۔ مگر اس چتا کو آگ مت دکھاؤ۔ اس چتا کو آگ اسی وقت دکھانا جب تم اپنی سوگندی پوری کر لو۔'' لڑکی کی بات لاگھن کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ واقعی اتنا آسان کام نہیں تھا یہ سب کچھ کرنا۔ اور لاگھن سنگھ راگنی کو دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''دیکھو، پاپی نے چھوٹے بڑے سب ختم کر دیئے۔ کسی کو جیتا نہیں چھوڑا۔ ارے اب میں کیا کروں گا جی کر؟''

''تم جانو۔ لیکن اگر تم بدلہ لئے بغیر مر گئے تو یہ تو کوئی بات نہیں ہو گی۔''

''میں بدلہ ضرور لوں گا...... ضرور لوں گا میں بدلہ۔ چھوڑوں گا نہیں اس پریوار کو۔''

''تو پھر سنو...... چپ چاپ واپس چلے جاؤ۔ جیسا کہ میں نے کہا پہلے سوکھی لکڑیاں جمع کر کے یہاں چتا بنا دو، پھر واپس چلے جاؤ۔ یہ کام رات میں تم خاموشی سے کر سکتے ہو۔ ایک ایک سسرے کی گردن کاٹ دو، ایک ایک کا جیون نشٹ کر دو اور اس کے بعد یہاں واپس آ کر چتا جلاؤ۔ کیا سمجھے؟ ورنہ دوسری صورت میں تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔''

''ٹھیک ہے...... تیری بات میری سمجھ میں آتی ہے۔'' لاگھن سنگھ نے کہا اور اس کے بعد وہ لکڑیاں جمع

کرنے لگا۔ راگنی اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔ دل ہی دل میں وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ یہ سسرے بے وقوف بھلا میرا مقابلہ کیا کر سکیں گے؟ میں انہیں وہ سبق سکھاؤں گی کہ جیون بھر یاد رکھیں گے۔ پاپی کہیں کے۔ دوسروں کا جیون لے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ ہتیارے

بہرحال، چتا تیار ہو گئی۔ لکڑیوں کے انبار میں چھ لاشیں رکھ دی گئیں۔ لاگھن سنگھ کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اپنے پورے پریوار کو اس طرح زندگی سے محروم دیکھ کر۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ سارے سنسار کو آگ لگا دے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں سنسار کو آگ لگانے سے۔ آگ تو ان لوگوں کی چتا کو لگنی چاہئے جن لوگوں نے اس کے بچوں کی چتا بنائی تھی۔ بہرحال ان تمام کاموں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ خاموشی سے واپس چل پڑا۔

حویلی میں چونکہ وہ خود بھی ایک نمایاں حیثیت کا مالک تھا چنانچہ اُس کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور کوئی غور بھی نہیں کرتا تھا کہ وہ کہاں سے آیا اور کہاں گیا؟ چنانچہ وہ خاموشی سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔

راوت رائے کے دل کا غبار اب بھی دُور نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو وہ لاگھن سنگھ کو بھی اسی طرح ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ابھی یہ مناسب نہیں سمجھا تھا کہ لاگھن سنگھ کو اُس کے بیوی بچوں کی موت کے بارے میں بتائے۔ البتہ خود وہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے اپنی جگہ سے نکلا اور لاگھن سنگھ کے پاس پہنچ گیا جو ایک جگہ سوگوار بیٹھا ہوا تھا۔ حالانکہ اُس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا اور اُس کا دل چاہتا تھا کہ ابھی اُٹھے اور اپنے دانتوں سے راوت رائے کا نرخرہ دبا دے۔ لیکن راگنی کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ راگنی کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور راگنی نے اُسے جو مشورہ دیا تھا وہ اس پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ راوت رائے اُس کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے لاگھن سنگھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب کیا سوچ رہے ہو لاگھن سنگھ؟''

''جیون بھر آپ کا نمک کھایا ہے پر آپ نے اس نمک کا خیال نہیں رکھا۔''

میرا اکلوتا چراغ بجھ گیا ہے لاگھن سنگھ۔ اب بھلا خیال رکھنے کا کیا سوال ہے۔ وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ کیا سمجھے؟''

''ٹھیک کہتے ہیں مہاراج، بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ چلئے ٹھیک ہے آپ نے میرا چراغ بجھا دیا۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں آپ سے؟''

راوت رائے اُسے گھورتا رہا، پھر وہاں سے واپس چلا گیا۔ ابھی لاگھن سنگھ کو اپنے اس بڑے نقصان کا علم نہیں ہے جو ہو چکا ہے۔ پر ابھی میرا من شانت کیوں نہیں ہے؟ اب کیا چاہتا ہوں میں؟ راوت رائے نے خود سے سوال کیا۔

اُدھر لاگھن سنگھ نے بڑی مشکل سے اپنے دل کی یہ آگ دبائی تھی البتہ رات کو وہ تیار ہو گیا۔ اُس نے اپنے چہرے پر ایک کپڑا باندھا اور اس وقت حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا جب حویلی میں تقریباً تمام لوگ سو چکے تھے۔ سب سے پہلے وہ راوت رائے کی دھرم پتنی کے کمرے میں داخل ہوا۔ راوت

رائے گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس نے خوب نشہ چڑھایا تھا اور نشے میں دھت ہو کر وہ اپنے غم کو بھولنے کے لئے گہری نیند سو گیا تھا۔ اُس کی دھرم پتنی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اُس نے خوفزدہ نگاہوں سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے لمبے چوڑے آدمی کو دیکھا جس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ اُس کے منہ سے نکلا
''کون ہو تم......؟''

''تیرے پتی نے تیرے لئے موت مانگی ہے اور میں وہ موت تیرے لئے لایا ہوں۔''

راوت رائے کی دھرم پتنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھاگی تو لاگھن سنگھ نے اُس کے بال پکڑ لئے اور اُسے کھینچ کر زمین پر ڈال دیا۔ پھر وہ اُس کے سینے پر سوار ہو گیا اور پھر دوسرے لمحے اُس نے راوت رائے کی دھرم پتنی کی گردن اُس کے شریر سے جدا کر دی۔ راوت رائے اب بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ لاگھن سنگھ نے اُس کی طرف دیکھا اور غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کتے کے بچے...... اتنے ٹکڑے کر سکتا ہوں میں تیرے شریر کے کہ سنسار کا کوئی بھی انسان انہیں گن سکے۔ پر ایسے نہیں۔ پہلے تو اپنی آنکھوں سے اپنے پریوار کی موت دیکھ، ان کے لئے رو رو کر آنسو بہا اور پھر تیرا میں تیا پانچا کروں گا۔ سمجھا؟''

اس کے بعد وہ وہاں سے نکل آیا اور پھر اُس نے راوت رائے کے خاندان کے جتنے بھی افراد اُسے مل سکے ان سب کو موت کی نیند سلا دیا۔ نو افراد قتل کئے تھے اُس نے رات بھر میں۔ یہ سب راوت رائے کے چچا، تایا اور بھائی وغیرہ تھے۔ ان سب کو زندگی سے محروم کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور باہر نکل آیا۔ پھر اُس نے ایک جگہ آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی وہ راوت رائے کی آہ وزاری سننا چاہتا تھا۔

دوسری صبح راوت رائے جاگا اور سب سے پہلے اُس نے اپنی دھرم پتنی کی مسہری کی طرف دیکھا، پھر نیچے زمین پر۔ اور پھر جو بھیانک منظر اُسے نظر آیا اُس نے راوت رائے کا دل دہلا دیا۔ ''ارے پریما...... یہ کیا ہوا؟''

پھر تو راوت رائے کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔ لیکن بے شمار چیخیں اُسے باہر سے سنائی دی تھیں۔ یہ وہ سارے ملازم تھے جنہوں نے راوت رائے کے رشتہ داروں کو خون میں ڈوبے ہوئے اور بغیر سر کے دیکھ لیا تھا۔ حویلی میں کہرام مچ گیا۔ راوت رائے سینہ پیٹتا پھر رہا تھا اور اُس کے منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

لاگھن سنگھ نے حویلی کا کہرام دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اُٹھا، باہر جا کر اُس نے گھوڑا لیا اور وہاں سے چل پڑا۔

راوت رائے پاگلوں کی طرح چیختا پھر رہا تھا۔ اپنے ایک ایک آدمی کو آواز دیتا پھر رہا تھا کہ راگنی اُسے نظر آئی۔ راوت رائے اُس کی طرف دوڑا اور بولا۔ ''راگنی دیکھ، کیا ہو گیا...... ارے سب مر گئے میرے۔ گردنیں کٹ گئیں ان کی۔''

''میں جانتی ہوں مہاراج۔''

''ایں...... تجھے کیسے معلوم؟''

''بس مہاراج، یہ بات مت پوچھیں۔ لاگھن سنگھ کو ابھی آپ نے جاتے ہوئے نہیں دیکھا؟ کہتا ہے راوت رائے نے میرا پریوار ختم کر دیا اور میں نے اس کا۔ اب وہ باغ کی طرف گیا ہے۔ وہاں اُس نے اپنے پریوار کی چتا بنائی ہے۔ اور اُس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس وقت چتا کو آگ نہیں لگائے گا جب راوت رائے کے پریوار کے ایک ایک انسان کو ختم نہیں کر دے گا۔ اب وہ چتا کو آگ لگانے گیا ہے۔''

''بھگوان کی سوگند...... بھگوان کی سوگند اُسے خود بھی اسی چتا میں جلنا ہو گا۔'' راوت رائے نے کسی کو کچھ نہیں بتایا، اُس نے خود بھی جوش کے عالم میں گھوڑا نکالا اور باغ کی جانب چل پڑا۔ راگنی کے ہونٹوں مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ پھر اُس نے خود بھی پراسرار طریقے سے ایک گھوڑا اپنے لئے طلب کیا اور اُس کا گھوڑا بھی باغ کی ہی جانب دوڑنے لگا۔ اُس کی نگاہیں دُور دُور تک کا جائزہ لے رہی تھیں، کافی فاصلے پر راوت رائے دیوانہ وار گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ آخر کار راوت رائے باغ میں داخل ہو گیا۔ اُس نے گھوڑا باغ کے کنارے ہی چھوڑ دیا اور نیچے اُتر کر تیز رفتاری سے اُس طرف چل پڑا جہاں دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ راگنی نے بھی وہ دُھواں اُٹھتے ہوئے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لاگھن سنگھ نے چتا کو آگ لگا دی تھی۔ وہ چھپتی چھپاتی درختوں کی آڑ لیتی اُس جگہ تک پہنچ گئی جہاں لاگھن سنگھ ایک مشعل ہاتھ میں لئے کھڑا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور سامنے چتا جل رہی تھی۔ جلتے ہوئے گوشت کی بو دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔ پھر اچانک ہی شاید لاگھن سنگھ کو قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اور راوت رائے کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آؤ راوت رائے...... آؤ۔ واہ، خوب آئے تم۔ دیکھو جن لوگوں کو تم نے زندگی سے محروم کر دیا اُن کی چتا جلا رہا ہوں۔ اور تمہیں یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ اُن کی چتائیں اسی حویلی میں جلا دو جہاں وہ سب زندگی سے محروم پڑے ہوئے ہیں۔ تم نے کیا سمجھا تھا راوت رائے...... دوش میرا تو نہیں تھا۔ لڑکوں لڑکوں کی بات تھی۔ سورن سنگھ نے یشونت کو قتل کر دیا اور تم نے سورن سنگھ کو مار دیا۔ میں مانتا ہوں کہ تم نے اپنے من کی آگ اس طرح بجھائی۔ لیکن ذرا یہ تو سوچو کہ اس کے بعد تم نے میری دھرم پتنی اور بچوں کا جو قتل کیا اس کا کیا جواز تھا؟ بتاؤ، اُنہیں کیوں مار دیا تم نے؟ اُنہوں نے تو تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔ اُن کا جیون تم نے کیوں لے لیا؟ بھگوان تمہارا ناش کرے۔ کتے کی طرح حکم مانا ہے میں نے تمہارا۔ جو کہا ہے جیون بھر وہی کیا ہے۔ اور تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔ میں...... میں اب بھی اپنے من کو شانت نہیں محسوس کر رہا۔ یہ تو بڑا ہی اچھا ہوا کہ تم یہاں آ گئے۔ تمہیں بھی اسی چتا میں جلاؤں گا میں...... تمہیں بھی زندہ اسی چتا میں ڈال دُوں گا میں۔''

اچانک ہی لاگھن سنگھ نے اُچھل کر راوت رائے پر حملہ کر دیا۔ راوت رائے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لاگھن سنگھ نے چتا جلانے کے لئے جو آگ جلائی تھی اس کے لئے اُس نے لکڑیاں توڑ کر ڈالی ہوئی تھیں۔ راوت رائے نے ان میں سے ایک لکڑی اُٹھا لی اور لاگھن سنگھ کے ہاتھ میں دبی ہوئی مشعل کا وار اس لکڑی پر روکا۔ جلتی ہوئی مشعل کا کچھ حصہ راوت رائے کے لباس پر گرا تو اُس نے آگ پکڑ لی۔ لیکن راوت رائے نے جوش کے عالم میں لکڑی دبک کر لاگھن سنگھ کے پیروں پر ماری اور

لاگھن سنگھ کی ایک پنڈلی ٹوٹ گئی۔ لیکن گرتے گرتے ہی اُس نے مشعل راوت رائے کے منہ سے
راوت رائے کا لباس تو آگ پکڑ ہی چکا تھا، اُس کا چہرہ بھی بری طرح جل گیا اور اُس کے حلق سے
دہاڑ نکلی۔ اُس نے لکڑی گھما کر لاگھن سنگھ کو مارنے کی کوشش کی لیکن لاگھن سنگھ بھی بچ گیا تھا۔ دونوں
زخمی تھے۔ لاگھن سنگھ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو سنبھال کر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور راوت رائے اپنے
میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی وقت راگنی درخت کے پیچھے سے نکل آئی۔ اُس کا زوردار قہقہہ اُن دونوں کے لئے حیرانی کا
باعث بن گیا اور دونوں ہی اُس طرف دیکھنے لگے۔ راگنی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

"راگنی...... مار دے اس پاپی کو...... مار دے اسے۔" لاگھن سنگھ نے راوت رائے کی طرف اشارہ
کر کے کہا۔

"راگنی تیری بہن نہیں ہے، تیری ماں نہیں ہے...... راگنی، میرے بدن کی آگ بجھا، میری مدد کر،
میں دیکھتا ہوں اس پاپی کو۔" راوت رائے نے کہا۔

لیکن راگنی کا قہقہہ ایک بار پھر اُبھرا اور دونوں حیرت سے اُسے دیکھنے لگے۔

"تو ہنس رہی ہے راگنی؟"

"تم دونوں کتوں پر ہنس رہی ہوں میں۔ راوت رائے مہاراج، لاگھن سنگھ مہاراج، پہچانا نہیں،
بھول گئے؟ تم لوگ تو پرانے پاپی ہو، تم کیا پہچانو گے۔ یاد نہیں ہے تمہیں رسک لعل جس کے باغ میں
کھڑے ہو؟ یاد نہیں ہے تمہیں وہ مظلوم جس کا باغ ہتھیانے کے لئے تم نے اُس کی ہتیا کر دی تھی؟ اور
یاد نہیں ہیں تمہیں اُس کی وہ پانچوں بیٹیاں جنہیں تم نے بے گناہ قید خانے میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا
تھا۔ اگر ان بیٹیوں کے نام تمہیں یاد ہوتے یا تم نے ان سے ان کے نام پوچھے ہوتے تو معلوم ہوتا
تمہیں کہ ان میں سے ایک کا نام راگنی تھا۔ اور وہ راگنی میں ہوں... سمجھے؟ میں نے اپنے پتا کا بدلہ
کے لئے تم لوگوں کو آپس میں لڑایا۔ سورن سنگھ اور یشونت رائے کے درمیان رقابت کرا دی۔
رقابت کی آگ میں جلنے لگے۔ اس کا کارن میں تھی۔ سو میں نے دونوں کو آپس میں لڑایا اور اس کے
میں نے تم دونوں کو اپنے جال میں پھانس کر ایک دوسرے کا بدترین دشمن بنا دیا۔ لاگھن سنگھ نے سورن
موت کا اور اپنے پریوار کی موت کا بدلہ لینے کے لئے تمہارے سارے خاندان کو قتل کر دیا راوت رائے
اور اس سے پہلے تم نے لاگھن سنگھ کے پریوار کو ختم کر دیا۔ میں دونوں کے درمیان راستہ بنی رہی اور دونوں
کو انتقام کے لئے اُکساتی رہی۔ اور آج دیکھو، تم دونوں بھی اپنا جیون کھونے کے لئے تیار ہو۔ اس باغ کو
پہچانتے ہو نا؟ یہ رسک لعل کا باغ تھا اور اسی باغ کے لئے تم نے اپنے جیون کا سب سے بڑا نقصان کر
لیا۔ بولو، کیا کرو گے اس باغ کا تم؟...... کیا کرو گے؟"

"تو رسک لعل کی بیٹی ہے......؟"

"ہاں...... میں رسک لعل ہی کی بیٹی ہوں۔ ایک معصوم اور چھوٹی عمر کی لڑکی۔ لیکن اب......
اشیش بھگونت کی داسی ہوں۔ سمجھے؟ سنسار کو تم نے پانچ خوفناک لڑکیوں کا تحفہ دیا ہے اور جانے کون

اس سنسار میں اب تمہارا دیا ہوا تحفہ قبول کرے گا۔ پہلے تو تم اس سنسار سے جاؤ۔"

"ارے ارے، کیا کرے گی تو...... کیا کرے گی؟"

"ہم نے پوچھا تھا تم سے کہ کیا کرو گے تم ہمارے ساتھ؟ پانچوں کو تم نے زندہ در گور کر دیا تھا۔ تہہ
خانے میں دفن کر دیا تھا تم نے۔ ہم نے تو تم سے کچھ نہیں پوچھا۔"

"معاف کر دے راگنی...... معاف کر دے۔" راوت رائے چیخا۔

لاگھن سنگھ جو ابھی تک خاموش تھا بولا۔ "دیکھا تو نے راگنی، بزدل کون ہے، قائیر کون ہے؟ ارے میں
نے تو صرف اس کے نمک کا حق ادا کیا تھا۔ مار دے ہم دونوں کو۔"

"ماردوں گی لاگھن سنگھ، تم کیا سمجھتے ہو رحم کھاؤں گی تم پر؟" یہ کہہ کر راگنی نے وہ مشعل اُٹھائی اور لاگھن
سنگھ کے کپڑوں میں بھی آگ لگا دی۔ راوت رائے کا جسم تو آگ پکڑ ہی چکا تھا۔ راگنی نے مشعل، راوت
رائے کے پیروں پر ماری اور اُس کی پنڈلیاں توڑ دیں۔ پھر اُس نے اُن کے ہاتھ، شانے، گردن، پسلیاں
ایک ایک چیز اس لکڑی سے توڑنا شروع کر دی۔ دونوں کے حلق سے ہائے ہائے کی آوازیں نکل رہی تھیں
لیکن راگنی کی آنکھوں میں خون جوش مار رہا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے دونوں کو مار مار کر ختم کر دیا۔ پھر اس
کے بعد اُس نے چتا سے جلتی ہوئی لکڑیاں اُٹھائیں اور باغ کے ایک ایک گوشے میں درختوں کی جڑوں
میں اُنہیں رکھنے لگی۔ آگ سوکھی ہوئی لکڑی میں پھیلتی جا رہی تھی اور دُھوئیں کے بادل فضا میں بلند ہوتے
جا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے باغ سے شعلے اُٹھنے لگے۔ یہ رسک لعل کا باغ تھا۔ اور راوت رائے
نے اسے رسک لعل سے چھین لیا تھا۔ نہ صرف چھین لیا تھا بلکہ ان درختوں اور زمین کے ٹکڑے کے لئے
راوت رائے نے اتنا غیر انسانی سلوک کیا تھا رسک لعل کے ساتھ کہ بیان سے باہر۔ لیکن شیطان کے لئے
اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ زمین پر بسنے والے انسان تکلیف اور اذیت میں مبتلا ہوں۔

❁❁❁

آخر کار راگنی واپس اُس جگہ پہنچ گئی جہاں اُس کی چاروں بہنیں موجود تھیں۔ ساری بہنیں گلے ملیں اور ایک دوسرے سے ملاقات پر خوشی کا اظہار کرنے لگیں۔ راگنی نے اپنی بہنوں کو بتایا۔

"میں نے نہ صرف راوت رائے کے پریوار کو بلکہ لاکھن سنگھ کے پریوار کو بھی ختم کر دیا ہے اور انہیں اُسی باغ میں جلا دیا ہے جو اُس نے ہمارے پتا جی سے چھینا تھا۔ ہم کمزور لڑکیاں بھلا کیا کر سکتی تھیں؟ یہ صرف اشیش بھگونت کی دیا ہے اُس کے چرنوں میں آنے کے بعد ہم نجانے کیا سے کیا بن چکے ہیں۔ کتنا بڑا مان ملا ہے ہمیں۔ کتنا بڑا وردان ملا ہے۔ ہم اپنی مرضی سے انسان اور جانور بن سکتے ہیں۔ ہم اپنی مرضی سے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ صرف اشیش بھگونت کا وردان ہے۔"

"جے اشیش بھگونتا......" پانچوں نے مل کر نعرے لگائے تو انہوں نے دیکھا کہ شیطان اُن کے درمیان موجود ہے اور اُس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ہے۔ اُس نے اُن سب کے سروں پر ہاتھ رکھ کر انہیں اشیرواد دیتے ہوئے کہا۔

"تم جیسے چیلوں پر مجھے ناز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سنسار سے نیکیوں کا خاتمہ میرا کام ہے۔ جہاں بھی نیکیوں کا وجود ہو، وہاں میرے دل کو جو تکلیف ہوتی ہے تم نہیں جانتیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہر بات کے لئے مجھے تمہیں ہدایت نہ دینی پڑے۔ بلکہ اپنا کام خود کرو اور اس انداز میں کرو کہ میرے مقصد کی تکمیل ہوتی رہے۔ یہ تو تمہاری ابتداء تھی جو میں نے کی۔ اب اپنے لئے کام تمہیں خود تلاش کرنا ہوگا۔ اور تم دیکھو گی کہ تمہیں کتنا انند ملتا ہے۔"

"ہم آگے کے لئے معلومات کرنا چاہتے ہیں بھگونتا کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"اب تک بس تم صرف میری نگرانی میں رہیں اور میں تمہیں بتاتا رہا کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟ لیکن اب اپنے لئے جگہیں تلاش کرنا تمہارا اپنا کام ہے۔"

"ہمارے لئے یہ ضروری تو نہیں ہے کہ ہم اسی جگہ رہ کر سارے کام کریں؟"

"میں محدود نہیں ہوں۔ تم جہاں دل چاہے چلی جاؤ۔ جس کا جہاں سینگ سمائے وہاں آرام کرے۔ جب بھی تم میری پسند کا کوئی کام سرانجام دو گی میں تمہیں بدھائی دینے کے لئے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔" پھر وہ غائب ہو گیا اور پانچوں لڑکیاں خوشی سے مسکرانے لگیں۔ پھر روپا نے کہا۔

"حالانکہ پہلے اشیش بھگونتا نے ہم سے کہا تھا کہ ہم ایک جگہ مہینے کی پورن ماشی کو ملا کریں گے، ایک دوسرے سے من کا حال کہیں گے۔ اور اب اُس نے ہمیں خود ہی آزاد بھی کر دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ اُس نے دیکھ لیا کہ ہم لوگوں نے اُس کے احکامات کی کیسی پابندی کی ہے۔ اب سوال یہ

پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ آؤ، جب یہ سنسار ہمارے لئے کھلا ہے تو کیوں نہ باہر کی دنیا کی سیر کریں۔ چلو چلتے ہیں۔ ذرا دیکھیں تو سہی باہر کیا کیا ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے......"

اور اس کے بعد وہ اپنی تمام تر خوفناک نحوستوں کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑی ہوئیں......! دھن دولت کی اب کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ان میں سے کوئی بھی فضا میں پرواز کر کے، ہوا میں تحلیل ہو کر، چیونٹی، مکھی، مکڑی یا شیرنی بن کر سب کچھ کر سکتی تھی۔ یہ اُن کے لئے انتہائی آسان ہو گیا تھا۔ اشیش بھگونتا کی سربراہی میں اب انہیں سنسار کی ساری شکتی حاصل ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں وہ بڑے سے بڑے شکتی مان سے ٹکرا سکتی تھیں۔

ریل کا سفر پانچوں کے لئے انتہائی خوشگوار ثابت ہوا۔ اعلیٰ درجے کی معزز عورتوں کی حیثیت سے انہوں نے ریل کے ایک ڈبے میں اپنے لئے جگہ بنائی اور چہلیں کرتی ہوئی سفر کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک بڑے شہر میں آ گئیں۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلا عمل جو سوچا وہ کسی مکان کے حصول کا تھا۔

روپا نے کہا۔ "ہمیں ایک جگہ قیام کرنا ہوگا۔ یہ تو بڑا ہی خوبصورت شہر ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ پتا جی نے سنسار میں ہمارے لئے جو بھی کام کئے، لیکن تم ایک بات بتاؤ، کیا اگر یہ سب کچھ ہمیں حاصل نہ ہوتا تو سنسار ہمارے لئے اتنا آسان ہو جاتا؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہم اپنے جیسی دوسری لڑکیوں کو دیکھتے ہی بڑی ہوئیں، ماں باپ کے زیر اثر رہیں۔ یہ کرو، وہ نہ کرو، ایسا کرو، ویسا نہ کرو، یہاں نہ جاؤ وہاں نہ جاؤ۔ یہ ساری باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن وہی مسئلہ ہے کہ انہی کے بیچ جوان ہو کر وہ اپنی مرضی سے ہاتھ پکڑ کر کسی کے حوالے کر دیتے۔ اب وہ کیسا ہو، کیا ہو اس کی کوئی پرواہ نہ ہوتی ماتا پتا کو۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ بس لڑکی بوجھ ہے، جلدی سے ان کے کندھوں سے اُترے۔ پھر ادھر کا ایک پریوار ملتا ہے۔ ساس ہوتی ہے، نندیں ہوتی ہیں، دیور، جیٹھ پتہ نہیں کون کون۔ سب کی مصیبتیں بھگتو، سسر جی، چائے پی لیجئے۔ دیور جی، آپ کے جوتے پالش کر دوں، کپڑے استری کر دوں۔ یہ جیون ہوتا ہے۔ لیکن اب......اب کیا نہیں ہے ہمارے پاس؟ ہم عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم عام لڑکیاں نہیں ہیں۔ ہاں، ہم خوفناک لڑکیاں ہیں۔ ہمیں سنسار کی کسی شے کی چنتا نہیں۔ پہلے یہ سوچو کسی گھر کے لئے کیا بندوبست کیا جائے؟" پانچوں لڑکیوں نے تھوڑی دیر تک سوچا اور اس کے بعد وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر سفر کرنے لگیں۔ اُن کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ ایک انتہائی خوبصورت مکان کے سامنے انہوں نے اپنی ٹیکسی رُکوائی اور ڈرائیور کو پیسے دینے کے بعد نیچے اُتر آئیں۔

"اس کوٹھی میں ہم بھوت بن کر رہیں گے۔" رجنی نے تجویز پیش کی اور ہنس پڑی۔

"بھوت بن کر کیوں؟"

"ارے مزہ آئے گا۔ دیکھیں گے پہلے کہ اس کوٹھی میں کون کون رہتا ہے؟ اور کیا کر سکتے ہیں ہم یہاں؟"

وہ سب رجنی کی تجویز پر غور کرنے لگیں۔ پھر روپا نے کہا۔ ''بات تو تقریباً ٹھیک ہی ہے۔ لطف آئے گا۔ ایسا کرتے ہیں کہ چڑیاں بن کر اس کوٹھی میں داخل ہو جاتے ہیں۔''

پانچوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، قرب و جوار میں اور کوئی نہیں تھا۔ پھر وہ ہاتھ پھیلا کر زمین پر بیٹھ گئیں۔ اُنہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ اُنہیں خوبصورت چڑیاں بننا چاہئے۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد وہاں پانچ چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھر سب نے ایک دوسرے کی طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھا اور پھر دوسرے لمحے پر پھیلا کر فضا میں پرواز کر گئیں۔ حویلی کے احاطے میں بہت سے درخت لگے ہوئے تھے۔ بڑی عظیم الشان حویلی تھی یہ۔ شہری آبادی میں اتنی بڑی حویلی کسی معمولی آدمی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن بہرحال ہر گھر کی ایک کہانی ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی یہ کہانی اتنی انوکھی اور عجیب ہوتی ہے کہ انسان کو اس پر یقین نہ آئے۔

یہ حویلی زمانہ قدیم میں جس کی بھی ہو لیکن زمانہ حال میں یہ دھرم داس کی تھی اور دھرم داس کا ماضی بڑا اچھا تھا۔ ایک اچھے خاندان سے تعلق تھا اُس کا۔ ملی جلی آبادی کا علاقہ تھا۔ ہر دین دھرم کے لوگ رہا کرتے تھے اور اپنے اپنے طور پر زندگی گزارتے تھے۔ انسان بہرحال کسی بھی دین، کسی بھی دھرم سے تعلق رکھتا ہو، ہوتا انسان ہی ہے۔ اور انسان کی فطرت میں محبت شامل ہے۔ جہاں مولوی ایمان علی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے وہاں ناگ چندر بھی اُن سے زیادہ فاصلے پر نہیں رہتا تھا۔ دونوں کی اپنی اپنی زندگی تھی۔ جہاں مولوی ایمان علی کو اللہ نے ایمان سے نوازا تھا وہیں ناگ چندر اپنی نٹ کھٹ اور شریر فطرت کی بنا پر برائیوں کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ بچپن کے دوست تھے دونوں۔ حالانکہ مولوی ایمان علی کا خاندان بہت زیادہ مذہبی نہیں تھا لیکن نجانے کیوں بچپن ہی سے ایمان علی کو اپنے گھر والوں کے مزاج کے برعکس مذہب سے ہمدردی اور دلچسپی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہوں نے باقاعدہ دینی تعلیم کے حصول کے لئے ایک مدرسے میں داخلہ لے لیا اور اندر ہی اندر نجانے کیسے کیسے وظائف اور چلہ کرتے رہے یہاں تک کہ اچھے خاصے مولوی بن گئے۔ ماں باپ نے ایک نیک اور دیندار لڑکی نادرہ سے شادی کر دی اور قدرت نے اُنہیں ایک معصوم سے وجود سے نواز دیا جس کا نام اُنہوں نے امینہ رکھا۔ زندگی سکون کے ساتھ گزر رہی تھی اور کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جو پریشانی کا باعث ہو۔ وہ دینی اور روحانی علوم سے آراستہ تھے لیکن روحانیت کے نام پر ایک پیسہ بھی کسی سے قبول نہیں کرتے تھے۔ بچوں کے ایک دینی مدرسے میں ملازمت کرتے تھے اور وقت گزر رہا تھا۔

دوسری جانب ناگ چندر کو اُس کے ماں باپ نے گھر سے نکال دیا تھا چنانچہ وہ طویل عرصے تک واپس نہیں آیا یہاں تک کہ واپس آیا تو شیطان کا سب سے قریبی ساتھی بن گیا تھا۔ اُس نے بہت سے سادھو سنتوں سے بہت سے کالے علم سیکھے تھے اور اچھی خاصی کالی طاقت حاصل کر کے واپس آیا تھا۔ بچپن کے دونوں دوستوں میں ملاقات ہوئی تو ناگ چندر نے ایمان علی کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ ''واہ...... اسے کہتے ہیں ماں باپ کی غلطی۔ اُنہوں نے تیرا نام ایمان علی رکھ کر سچ مچ تجھے مولوی بنا دیا۔ تیرے حق میں اچھا تو نہیں ہے۔''

''میرے حق میں کیا اچھا ہے، کیا برا ہے یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن تو نے یہ اپنے آپ کو کیا کر لیا ناگ چندر؟''

''سنسار بنالیا ہے میں نے اپنا۔ اسی میں سنسار کی بڑائی ہے۔''

''جو کمرو پن تیرے چہرے سے ٹپک رہا ہے وہ تو اچھا نہیں ہے۔''

''دیکھ، میں تجھے ایک بات بتاؤں کہ اپنے اور میرے درمیان فاصلہ رکھنا۔ میں جانتا ہوں کہ تو سارے روحانی کھیل کھیلتا ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ یہاں تیرا اور میرا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ اس مقابلے سے بچنا ہے تو پھر میں تجھے ایک بات بتاؤں، جہاں تجھے اس بات کا خدشہ ہو کہ تیری پھیلائی ہوئی برائی سے مجھے یا میرے کسی شناسا کو نقصان پہنچ سکتا ہے، وہاں تو بھی میرے داؤ سے بچنا ایمان علی۔ میں تجھے ایک بات بتائے دیتا ہوں کہ میرے راستے میں کبھی مت آنا۔''

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بہرحال، ایمان علی کو تھوڑا سا دُکھ ضرور ہوا تھا۔ لیکن پھر وہی ہوا۔ ناگ چندر کالا جادو کیا کرتا تھا اور لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لئے کمینے لوگ اُس سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور وہ رقم لے کر لوگوں کے لئے کالے علم کیا کرتا تھا۔ لیکن اگر کوئی خوش قسمت مولوی ایمان علی کے پاس پہنچ جاتا تو ایمان علی اُس کے کالے جادو کا ہمیشہ توڑ کیا کرتے تھے۔ ناگ چندر نے بھی شادی کر لی تھی اور اتفاقیہ طور پر اُس کی بھی ایک ہی بیٹی تھی۔ بہرحال ابھی تک ایسا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا تھا جس سے ایمان علی اور ناگ چندر کے درمیان براہ راست تصادم ہو جاتا۔ لیکن حالات بتا رہے تھے کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ایمان علی اور ناگ چندر کے درمیان بھی ٹھن جائے گی۔ ادھر ایمان علی کی کارروائیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور وہ دینی کاموں میں بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا تھا، اُدھر ناگ چندر بھی اپنا گھر بھر رہا تھا اور کالے جادو کے ماہر کی حیثیت سے لوگ اُس سے خوف کھانے لگے تھے۔

پھر ایک دن ٹھاکر دھرم داس ایمان علی کے پاس پہنچ گئے۔ اور ٹھاکر دھرم داس نے جو اچھے خاصے عمر رسیدہ تھے، آگے بڑھ کر ایمان علی کے پاؤں پکڑ لئے۔

''ارے ارے...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں ٹھاکر صاحب؟ میں تو آپ کے بچوں کی طرح سے ہوں۔ خیریت؟ بتائیے، کیا پریشانی ہے آپ کو؟''

''بیٹا...... نہ میں تمہارا کوئی پرانا شناسا ہوں، نہ میں نے تم پر کوئی احسان کیا ہے۔ لیکن یہ بھی بھگوان کی مہربانی ہوتی ہے کہ کس سے احسان کرائے اور کس پر احسان کرے۔ بیٹا، میرا تعلق نہ تو تمہارے دین دھرم سے ہے اور نہ میرا تم پر کوئی زور ہے۔ البتہ تمہارا نام ایمان علی ہے اور بس یہی سن کر میں تمہارے پاس آ گیا ہوں۔''

''آپ بتائیے تو سہی ٹھاکر صاحب، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''بیٹا، بس کیا بتاؤں؟ دنیا میں تین چیزوں کا کھیل ہمیشہ ہمیشہ سے جاری ہے، زر، زن اور زمین۔ میرا ایک دشمن ہے۔ ویرو کرم نام ہے اُس کا۔ بس دشمنی اسی کو کہتے ہیں۔ ویرو کرم نے میرا جینا مشکل کر دیا ہے۔ بہت نقصان پہنچاتا رہا ہے وہ مجھے۔ بس یوں سمجھ لو کہ کچھ عرصہ پہلے میری زمینوں پر ہی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ لیکن اب اُس نے میری زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ مجھے ہمیشہ دھمکیاں دیتا رہتا

ہے۔ اور اب تو اُس نے بڑا ہی خطرناک قدم اُٹھایا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہاں تمہارے پڑوس میں کچھ فاصلے پر ایک کالے دھرم والا رہتا ہے۔ ناگ چندر ہے اُس کا نام۔ اور ویروکرم نے اُس کا سہارا لیا ہے۔ بہت دن سے وہ میری زمینوں کو اپنے قبضے میں کرنے کی فکر میں تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں زمینوں کے کاغذات پر دستخط کر دُوں۔ میں نے اُسے برا بھلا کہا۔ لیکن اب اُس کے آدمی میرے پاس پہنچے ہیں اور اُنہوں نے مجھے آ کر اطلاع دی ہے کہ اگر میں اپنے پریوار کو مصیبت سے بچانا چاہتا ہوں تو شرافت سے زمینوں کے کاغذات پر دستخط کر دُوں ورنہ ناگ چندر شدید نقصان پہنچا دے گا۔ بال بچوں والا آدمی ہوں، ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی مشکل پیش نہ آ جائے۔ کسی نے مجھے تمہارا نام اور پتہ بتایا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ کوئی بہت ہی عمر رسیدہ مسلمان بوڑھا ہو گا۔ لیکن تم تو نوجوان ہو۔ پر بھگوان نے تمہارے چہرے کو اپنا عکس دے دیا ہے اور اس عکس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تم میرے لئے کچھ کر ہی دو گے۔ بیٹا، یہ بھول جاؤ کہ میرا دھرم ہندو ہے۔ ہوں تو انسان ہی۔ انسان کا ستایا ہوا ہوں اور تم سے مدد مانگنے آیا ہوں۔ تمہارے دھرم کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ کم از کم اتنا مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔"

انسانیت کے رشتے سے مولوی ایمان علی سوچ میں ڈوب گیا۔ حالانکہ ناگ چندر سے اُس کی پرانی شناسائی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مسئلے چلتے رہتے تھے۔ لیکن ناگ چندر اتنا گر جائے گا اُسے یہ اندازہ نہیں تھا۔ اُس نے کہا۔ "ایسا ہے ٹھاکر صاحب، میں ناگ چندر کی خوشامد کرتا ہوں۔ اُس سے کہتا ہوں کہ وہ ویروکرم کے لئے ایسا کوئی کام نہ کرے۔ بہرحال آپ یہ بتائیے کہ آپ رہتے کہاں ہیں؟"

اسی شہر کے آخری سرے پر گھر ہے اور وہیں سے میری زمینیں شروع ہو جاتی ہیں۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر ویروکرم رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے.... میں آپ کے بارے میں ناگ چندر سے بات کر لوں گا۔" ایمان علی نے ٹھاکر دھرم داس کو دلاسا دیتے ہوئے کہا اور ٹھاکر دھرم داس بہت سی اُمیدیں لے کر وہاں سے گئے۔

ایمان علی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ آخر کار اُس نے نادرہ سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔ "نادرہ جو زندگی ہم گزار رہے ہیں تم اس سے مطمئن ہو یا نہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے۔ اس میں غیر مطمئن ہونے کی کیا بات ہے؟"

"میں سوچتا ہوں کہ کہیں تم کبھی کبھی پریشان نہ ہو جاتی ہو کہ ایمان علی کچھ آگے ہی نہیں بڑھا۔ ایک جگہ ساکت ہے اور زندگی ایک معمول پر ٹھہری ہوئی ہے۔ بات اصل میں یہ ہے نادرہ، کہ حاصل کرنے کو بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ اللہ کی خوشنودی کے بغیر زندگی گزارنا کوئی زندگی ہے؟"

"نہیں......"

"اللہ نے ہمیں ایک ہی بیٹی دی ہے۔ امینہ ہماری خوشیوں کا مرکز ہے۔ ہم اُسے بھی نیکیوں کے راستوں پر چلائیں گے، نیک بنا کر پروان چڑھائیں گے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ ایسا کرنا چاہئے یا نہیں؟"

"آپ اتنی ساری باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس لئے نادرہ، کہ کسی وقت کوئی مشکل مرحلہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ تم جانتی ہو ہمارے پڑوس میں ناگ چندر رہتا ہے اور ناگ چندر کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ برا تو خیر وہ شروع ہی سے تھا لیکن اتنا برا ہو جائے گا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اب وہ یہ کرتا ہے نادرہ، کہ لوگوں سے پیسے لے کر ان کے لئے گندے علم کیا کرتا ہے اور دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ کئی افراد ایسے آئے میرے پاس جو ناگ چندر کے ستائے ہوئے تھے۔ جو کچھ میں کر سکا تھا، وہ تو میں نے کر دیا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کب تک میں ناگ چندر کے چکر میں پڑا رہوں گا اور اُس سے اس طرح مقابلہ کرتا رہوں۔"

"کوئی نئی بات ہو گئی ہے کیا؟"

"ہاں......ایک شخص میرے پاس آیا تھا۔ ہندو دھرم سے تعلق رکھتا تھا۔ نام بھی ٹھاکر دھرم داس ہی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ اُس کا ایک دشمن ہے اور ٹھاکر دھرم داس کالے جادو کے مقابلے میں مجھ سے مدد مانگ رہا ہے۔ مجھے بس یہ خوف ہے کہ کہیں بات سخت نہ ہو جائے۔"

"بہرحال وہ بھی شیطانی علوم رکھتا ہے تو ڈر کس بات کا ہے؟ آپ جو کرتے آئے ہیں وہ کیجئے۔ باقی اللہ مالک ہے۔"

"نہیں، میں یونہی تم سے پوچھ رہا تھا کہ تم تو اس زندگی سے غیر مطمئن تو نہیں ہو؟"

"نہیں۔ جو کچھ آپ کر رہے ہیں میں اس پر مطمئن ہوں۔"

"وعدہ کر لیا ہے میں نے دھرم داس سے۔ مل لیتا ہوں ناگ چندر سے۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔"

اور مولوی ایمان علی ناگ چندر کے پاس پہنچ گیا۔ ناگ چندر نے خوب سوانگ رچا رکھا تھا۔ جو گھر اُس نے اپنے لئے بنایا تھا اس پر کالا رنگ پھروایا ہوا تھا۔ دروازے پر تین بڑے بڑے مجسمے نصب کئے ہوئے تھے جو بھیانک شکلوں کے تھے۔ انہی میں سے ایک مجسمے کے پیٹ سے گزر کر اُس کے گھر میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ برابر میں ایک چھوٹا سا نقلی جوہڑ بنوایا ہوا تھا اُس نے جس میں گندگی پڑی ہوا کرتی تھی۔ بہرحال درختوں کے جھنڈ کے درمیان سے گزر کر مولوی ایمان علی وہاں پہنچے۔ اُنہوں نے ناک پر رومال رکھا ہوا تھا۔ پھر اُنہوں نے ناگ چندر کو پکارا تو وہ آ گیا۔

"اوہو... مولوی صاحب آئے ہیں، مولوی صاحب۔" وہ مذاق اُڑانے والے انداز میں بولا۔

"اور تجھے میں کیا کہوں ناگ چندر؟" ایمان علی نے مسکرا کر کہا۔

"ناگ دیوتا......لوگ یہی کہنے لگے ہیں اب مجھے۔"

"ناگ چندر......سانپ کو ہم لوگ موذی کہتے ہیں۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ موذی کو دیکھو اور ہلاک کر دو۔ تعجب کی بات ہے تو اپنے آپ کو ایک موذی دیوتا کہلاتا ہے؟"

"تم مُسلے کہتے ہو ایسا۔ ہندو دھرم میں تو ناگ پوجا جاتا ہے۔"

"خیر، میں دین دھرم کی بات نہیں کروں گا۔ تجھ سے ایک کام آ پڑا ہے ناگ چندر۔"

"بڑی بات ہے...... بڑی بات ہے۔ چلو ٹھیک ہے، دوستی تو ہے نا ہماری۔ کہو کیا کام ہے، کچھ پیسے

چاہئیں؟ ارے میں تو تم سے ایک بات کہوں ملا جی، یہ جو تم نیکیوں کا ڈھول گلے میں ڈالے گلی گلی
رہتے ہو اور لوگوں کے لئے اُلٹے سیدھے کام کرتے رہتے ہو، لوگ تمہیں کیا دیتے ہیں مجھے بتاؤ؟
ان بے وقوفی کے کاموں کو۔ سنسار میں عیش کرو۔ مجھے دیکھو، اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی ہے میرے پاس
اپنی ایک حویلی بنوانا شروع کر دی ہے میں نے۔ تم دیکھنا اس علاقے کی سب سے اچھی حویلی ہوگی
گی۔ میری بیوی اور میری بیٹی اس میں رہیں گی۔ نام ہوگا ہمارا ایک۔ اور تم...... تم اسی جھونپڑے میں
پڑے رہو گے جیون بھر۔ سنا ہے تم لوگوں سے پیسے بھی نہیں لیتے۔ کتنا لیتے ہو نیک کام کرنے کے؟"

"ناگ چندر...... تو میرا بچپن کا دوست ہے۔ اب تو خیر تو میرا دوست نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے
میرے اور تیرے راستے بالکل الگ الگ ہیں۔ لیکن پھر بھی پرانی شناسائی کے طور پر میں تجھے بتا رہا ہوں
کہ اگر تجھے یہی سارے کالے دھندے کرنے ہیں تو پھر یہاں سے چلا جا۔ جس دن بھی میرے صبر کا پیمانہ
لبریز ہوگیا اُس دن تیری زندگی کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا۔ اور یہ جو تو مجھے پیسوں کی پیشکش کر رہا ہے تو
دنیاوی دولت میرے جوتوں کے نیچے ہے۔ جب چاہوں پیسوں کے انبار لگا سکتا ہوں۔ یہی تو شیطانی
کھیل ہے۔ اور میں اس شیطانی کھیل میں شریک نہیں ہوسکتا۔ چل خیر، اتنی ساری باتیں کرنے کی بجائے
میں تجھے یہ بتا دوں کہ تو کسی ویرو کرم کے لئے کوئی کام کر رہا ہے ٹھاکر دھرم داس کے خلاف۔ دونوں
تیرے دین دھرم کے ہیں۔ لیکن میں صرف انسانیت کے راستے سے تجھ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ تو دھرم داس
کے خلاف کام نہ کر۔ یہ تیرے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔"

"دیکھو، سنو، میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ اگر ٹھاکر دھرم داس تمہیں کچھ پیسے دے رہا ہے تو لے لو
میں اپنا کھیل بدل لوں گا۔ یہ تمہاری مدد ہوگی۔ اور اگر تم صرف یہ کام بھی دین دھرم کے نام پر کر رہے ہو
تو مت کرو ایسا۔ تمہیں نقصان پہنچ جائے گا۔ کیونکہ ویرو کرم مجھے بڑی اچھی رقم دے رہا ہے۔"

"تو تم میری بات نہیں مانو گے؟"

"پاگل ہوئے ہو ملا جی؟ کہہ رہا ہوں تم سے کہ مت پڑو ایسے چکر میں۔ کوئی فائدہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے...... میں اس بات سے ڈرتا نہیں کہ کہیں میرے اور تمہارے درمیان براہ راست کوئی
معرکہ نہ پڑ جائے۔ بہتر ہے کہ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ آخری بار کہہ رہا ہوں۔"

"تو پھر سن لو ملا جی۔ بہت دن سے تمہارے گندے تعویذ بھگت رہا ہوں۔ اب تمہارا یہ کھیل ختم ہو جانا
چاہئے۔ میں برداشت نہیں کرسکوں گا۔ جاؤ، اگر ذرا بھی قدم آگے بڑھایا تو نقصان اُٹھا لوگے۔ بس اس
سے زیادہ میں کچھ اور نہیں کہہ سکتا۔"

"تمہاری مرضی ہے۔ اور کچھ نہیں کہہ سکتا میں۔" مولوی ایمان علی وہاں سے چلا آیا۔ گھر آ کر نادرہ کو
ساری تفصیل بتائی تو نادرہ کہنے لگی۔

"مگر اب کیا کرو گے؟"

"اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔"

سارے کام ہو رہے تھے۔ ٹھاکر دھرم داس بہت زیادہ پریشان تھے کیونکہ ناگ چندر نے اپنا کام

شروع کر دیا تھا۔ کوئی چار دن کے بعد کی بات ہے کہ ٹھاکر دھرم داس اپنے باغ کی کیاری میں زمین کھود
رہے تھے کہ اچانک ہی زمین سے بالشت بالشت بھر کے سانپ نکلنے لگے...... ایک، دو، تین، چار،
پانچ...... ٹھاکر دھرم داس وہاں سے اُٹھ کر بھاگے تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ لیکن جب دوسرے لوگوں نے
دیکھا تو سانپ غائب ہو چکے تھے۔ ٹھاکر دھرم داس نے اپنے ملازموں سے کہہ کر پوری کیاری کھدوا کر
پھینک دی لیکن پھر ایک بھی سانپ برآمد نہیں ہوا۔ پھر اُسی دن ٹھاکر دھرم داس اپنی حویلی کے واش رُوم
میں تھے کہ چھت پر سے ایک لمبا سانپ نیچے گرا...... ایک لمحے کے لئے پھن اُٹھا کر کھڑا ہوا۔ ٹھاکر دھرم
داس سے اُس کا اتنا فاصلہ تھا کہ اگر سانپ اُنہیں کاٹنا چاہتا تو دھرم داس جی اپنا دفاع بھی نہ کرسکتے تھے۔
لیکن سانپ اپنی جگہ سے ہٹا اور سنڈاس میں گھس کر غائب ہوگیا۔ ٹھاکر دھرم داس جی وہاں سے نکل کر
بھاگے اور پھر اُنہوں نے وہ سنڈاس ہی بند کرا دیا۔

اس دن کے تیسرے دن کی بات ہے کہ ٹھاکر دھرم داس رات کو اپنے بستر پر سو رہے تھے کہ اُن کے
سرہانے کوئی چیز گری۔ یہ چھوٹی ٹائم پیس تھی جس میں اُنہوں نے الارم لگا رکھا تھا۔ ٹائم پیس کے گرنے کی
آواز سے وہ اُٹھ گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو اُن کے سرہانے بنی کھڑکی کے ایک سوراخ سے ایک سانپ کی لمبی
دُم لٹک رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ واپس جا رہا تھا۔ اور چند لمحوں کے بعد اُس کی دُم غائب ہوگئی۔ ٹھاکر
دھرم داس کے ہوش و حواس رُخصت ہوگئے تھے۔ یہ مسلسل سانپوں نے اُن کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ پھر
اُنہیں ویرو کرم کا پیغام موصول ہوا۔

"کہئے ٹھاکر دھرم داس جی...... کیسی گزر رہی ہے؟"

"کون...... کیا تم ویرو کرم بول رہے ہو؟"

"اپنے دوست کی آواز نہیں پہچان سکے ٹھاکر صاحب؟"

"ویرو کرم...... آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"بس وہی زمینوں والی بات۔"

"وہ میں تمہیں کبھی نہیں دُوں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے ٹھاکر جی...... جب آپ اس سنسار میں نہیں ہوں گے تو زمینیں ہمیں مل جائیں گی۔
اب ایسا ہے آج دو تاریخ ہوگئی ہے۔ ہم آپ کو دس تاریخ تک کی مہلت دیتے ہیں۔ دس تاریخ کی رات کو
انتظار کر لینا۔ ہماری طرف سے بڑا کام شروع ہو جائے گا۔"

ویرو کرم کا یہ دھمکی آمیز پیغام ٹھاکر دھرم داس کے لئے بڑا سنسنی خیز تھا۔ بہرحال ٹھاکر دھرم داس کے
سامنے اور کوئی عمل نہیں تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ویرو کرم کے اپنے بھی تعلقات تھے۔ ایک
بدمعاش آدمی کے تعلقات کچھ زیادہ ہی ہوا کرتے ہیں جبکہ ٹھاکر صاحب بے چارے خاموشی سے زندگی
گزارنے کے عادی تھے۔ اور اُن کی اگر کسی سے شناسائی تھی تو صرف محبت کی باتوں تک۔ دوسری بات یہ
کہ ویرو کرم نے ایک شیطان کا سہارا لیا تھا جو ان دنوں کافی مشہور ہو رہا تھا۔ ٹھاکر دھرم داس ایک بار پھر
مولوی ایمان علی کے پاس پہنچے اور سوگواری شکل بنا کر اُن کے سامنے کھڑے ہوگئے۔

''آئیے آئیے ٹھاکر صاحب...... کہئے، کیسے حال ہیں آپ کے؟''

ٹھاکر صاحب نے اُداس نگاہیں اُٹھا کر مولوی ایمان علی کو دیکھا، پھر بولے۔ ''بس مولوی صاحب زندگی شاید ختم ہونے کو ہے۔ ان دنوں میرے ساتھ بہت برا ہو رہا ہے۔ وہ پاپی اپنا کام کر رہا ہے۔ مجھے سانپوں نے گھیر رکھا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اب میرا بچنا مشکل ہو جائے گا۔''

''نہیں ٹھاکر صاحب...... زندگی موت انسان کے ہاتھ میں کہاں ہے؟ آپ اس قدر بددل اور مایوس نہ ہوں۔ مجھے بتایئے بات کیا ہے؟''

''دس تاریخ دی ہے اُس نے آخری۔ اس کے بعد ہم پر مصیبتیں شروع ہو جائیں گی۔'' ٹھاکر دھرم داس نے پوری تفصیل مولوی ایمان علی کو بتا دی تو مولوی ایمان علی نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... اللہ مالک ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں کروں گا۔'' ٹھاکر صاحب کو مولوی ایمان علی نے بڑے دلاسے دے کر رُخصت کیا۔ لیکن ٹھاکر صاحب پر جو بیت رہی تھی اُن کا دل مرزا دلاسوں کو کہاں مانتا؟ رفتہ رفتہ دس تاریخ آتی جا رہی تھی۔ اور ٹھاکر صاحب کے حواس رُخصت ہوتے رہے تھے۔

بہرحال آخرکار دس تاریخ آ گئی...... ٹھاکر صاحب کی حویلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ بہت پریشان تھے۔ بڑا گیٹ بند کیا ہوا تھا۔ دو پہرے دار بھی رکھ لئے تھے اور اُن کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ باہر سے کسی کو نہ آنے دیا جائے۔ لیکن جب مولوی ایمان علی وہاں پہنچے تو ٹھاکر صاحب کو بڑا اعتماد ہوا۔ اُنہوں نے حویلی کے گیٹ کے سامنے بنے ہوئے ایک ایسے درّے میں مولوی صاحب کو بٹھایا جہاں سے دُور دُور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ حویلی میں ایک ہولناک سناٹا اور ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ سب خوف کا شکار تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ دیکھو قیامت کب اور کس انداز میں آتی ہے۔

یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں، لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ کالے جادو کے ان ماہروں کے لئے کوئی قانون آج تک نہیں ہے۔ طرح طرح کے اشتہار ان کے اخباروں میں شائع ہوتے ہیں اور ان میں جادو کا توڑ کرنے کی باتیں کی جاتی ہیں۔ قانون جانتا ہے کہ یہ سب انسانیت کو نقصان پہنچانے والی باتیں ہیں۔ لیکن اُن کے خلاف کوئی بھی کچھ نہیں سوچتا۔ کوئی بھی کچھ نہیں کرتا۔ کالے جادو کے ماہر یہ کام کرتے ہیں اور دولت کے حصول کے لئے نجانے کیسے کیسے گندے عمل کئے جاتے ہیں۔ بہرحال مولوی ایمان علی کو اس بات کا شبہ تھا کہ ناگ چندر اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ بہرحال وقت گزرتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف دھرم داس اور اُس کے گھر والے آسمان پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے ہوں گے کہ اچانک ہی پہرے داروں کی چیخیں سنائی دیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ایک آتشی پتلا جس کا قد ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا لیکن جس کے بدن سے آگ کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں، انسانوں کی طرح چلتا ہوا دروازے کی جانب آ رہا تھا۔ پہرے دار چیختے ہوئے گیٹ پر سے بھاگ رہے تھے۔ پتلا انسانوں کی طرح چلتا ہوا دروازے کی جانب آ رہا تھا۔ پہرے دار چیختے ہوئے گیٹ پر سے بھاگ گئے۔ کوئی آدمی ہوتا، کوئی اور چیز ہوتی تو شاید وہ اُس سے مقابلہ بھی

کرتے۔ لیکن ایک آگ کا انسان آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ اور جب وہ گیٹ پر پہنچا تو گیٹ بھی خود بخود کھل گیا۔

پہرے دار جی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے لیکن کم از کم وہ اُنہیں ہوشیار کر گئے تھے۔ جادو کا یہ پتلا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ سب دہشت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہی مولوی ایمان علی اپنی جگہ سے اُٹھے۔ اُنہوں نے پاس پانی کا ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ اُنہوں نے پانی کا گلاس اُٹھا کر اُس پر پڑھے ہوئے وظیفے کی برکتوں کو اُس پر پھونک دیا اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ اُنہوں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر یہ پانی اُس پتلے پر پھینک دیا...... اچانک ہی انتہائی خوفناک آوازوں سے دھرم داس کی حویلی گونج اُٹھی۔ آتشی پتلے کا وجود کالا پڑتا جا رہا تھا اور وہ کسی انسان ہی کی طرح چیخ رہا تھا۔ پھر دفعتہً ہی وہ فضا میں بلند ہوا اور تیز رفتاری سے اُڑتا ہوا بڑے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی دفعتہً حویلی کی بجھی ہوئی روشنیاں جل گئی تھیں اور یہ ایک ایسا عمل تھا جس نے وہاں موجود سب کو دنگ کر دیا تھا۔ حویلی تیز روشنیوں میں نہا گئی تھی۔ دھرم داس اور اُس کے سارے گھر والے یہ سارا عمل دیکھ رہے تھے۔ اُن کے حلق سے خوشی کی آوازیں نکل گئیں۔ دھرم داس زور سے چیخا۔ ''وہ مارا......'' اور پھر دوڑتا ہوا مولوی ایمان علی کے پاس آ گیا۔

''مولوی صاحب، کیا بلا ٹل گئی؟''

''ہاں...... انشاء اللہ اُس کا جادو اب فیل ہو جائے گا۔ اور یہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہو گیا ہے جس کا میں اعلان نہیں کروں گا۔ لیکن بس اتنا کہوں گا کہ ہو سکتا ہے اب ہماری بستی کے لوگوں کو ناگ چندر سے نجات مل جائے۔''

ٹھاکر دھرم داس کی تو عید ہو گئی تھی۔ وہ سب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے اور خوشیاں منا رہے تھے۔ اور اس کے بعد ساری رات گزر گئی۔ صبح فجر کی نماز کے وقت مولوی صاحب نے اجازت مانگ لی اور بولے۔ ''اب مجھے اُمید ہے کہ کوئی اور گڑبڑ نہیں ہو گی۔ اُس نے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا تھا اس کا توڑ ہو گیا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر مولوی صاحب اپنے گھر کی جانب چل پڑے۔

مولوی ایمان علی کی بیوی کو معلوم تھا کہ مولوی صاحب دھرم داس کے ہاں اُس کے کسی مشکل مسئلے کے حل کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی رات بھر جاگ کر شوہر کی کامیابی کی دُعائیں مانگتی رہی تھی۔ صبح کو جب مولوی صاحب گھر پہنچے تو اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ مولوی صاحب کی بیٹی امینہ جواب تیرہ چودہ سال کی ہو چکی تھی گھر کے سارے کام کاج کر رہی تھی۔ بہرحال حسین بچی تھی۔ باپ کے ساتھ بہت سے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی اور مولوی صاحب کہتے تھے کہ وہ بیٹی ہی نہیں میرا بیٹا بھی ہے۔ دونوں ماں بیٹیوں نے مولوی صاحب کا استقبال کیا اور مولوی صاحب پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

''تم دونوں کیوں جاگ رہی ہو؟ خیر، ویسے تو نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ مگر تمہارے چہروں سے یوں لگ رہا ہے جیسے تم ساری رات سوئی نہیں ہو۔''

’’تو اور کیا؟ آپ وہاں ضروری کام میں مصروف تھے۔ ہم نے سوچا کہ چلو عبادت ہی کر لیں۔‘‘

’’بہت اچھا کیا۔‘‘

’’آپ بتائیے، کیا رہا؟‘‘

’’بس نادرہ...... بات اصل میں یہ ہے کہ کسی کی بھلائی کے لئے تو میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن کس کے خلاف کوئی عمل کرنا مجھے ناپسند ہے۔ خاص طور سے ناگ چندر تو میرا بچپن کا دوست ہے۔ پتہ نہیں کمبخت کس طرح ان برے راستوں پر پڑ گیا۔ ٹھیک ہے، دولت تو وہ خوب کما لے گا اور کما رہا ہے۔ لیکن اس کی نسلوں کی عاقبت خراب ہو جائے گی۔ کیا فائدہ ان باتوں سے؟ آج جو میں نے کیا ہے وہ پہلے نہیں کیا۔ لیکن اگر وہ نہ کرتا تو پھر دھرم داس کے بے گناہ خاندان کو بڑی مشکلوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس خاندان کا ایک بھی فرد زندہ نہ بچتا۔‘‘

’’کیا، کیا آپ نے؟‘‘

’’بس، اُس نے دھرم داس کے ساتھ زیادتی کرنا چاہی تھی۔ سمجھایا تھا میں نے اُسے، نہیں مانا۔ بس گندا علم کبھی کبھی جادو کرنے والے کو بھی نقصان پہنچا دیتا ہے۔‘‘

’’مجھے تو کوئی بات ہی نہیں پتہ۔ بہر حال آپ یہ بتائیے ہوا کیا؟‘‘

’’بس، ہم نے اُس کا ایک جادو ٹونا کام بنا دیا ہے۔ یہ مجبوری تھی۔ ہم نے اُس کا جادو اُسی پر اُلٹ دیا ہے۔ بس ہمارے دل میں یہ خیال ہے کہ کہیں اُلٹا ہوا جادو اُسے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ صرف اتنی پریشانی ہے ہمیں۔‘‘ مولوی ایمان علی نے کہا اور پھر بولے۔ ’’ذرا نماز وغیرہ پڑھ لیں۔ ناشتہ تیار کر دو۔‘‘ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔ ماں بیٹیاں باورچی خانے میں چلی گئی تھیں۔

اُدھر ایمان علی کے اپنے خیال کے مطابق ناگ چندر کے اپنے گھر پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ناگ چندر کا الگ تھلگ گھر جس میں وہ بھی اتفاق سے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ہی رہتا تھا، عام آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ کیونکہ کالے جادو کے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو آبادیوں میں نہیں ہو سکتے۔ جہاں ڈھلتی ہوئی شام اور اُبھرتی ہوئی صبح مسجدوں میں اذان کی آوازیں اُبھرتی ہیں اور مندر میں گھنٹے بجتے ہیں وہیں کالے جادو کے ماہروں کے ہاں غلاظت کی پوجا ہوتی ہے، شیطان کو بلی دی جاتی ہے، خون کے چھینٹے شیطان کے مجسمے پر ڈال کر اُس سے طاقت مانگی جاتی ہے اور غلاظتوں سے اُس کے پورے جسم کو جاتا ہے۔ بہر حال یہ سارے کام اب ناگ چندر کے گھر میں ہوا کرتے تھے۔ بیوی اور بیٹی کو بھی اُس نے اپنے کاموں میں شامل کر رکھا تھا اور دونوں اُس کی دست راست تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہیں صرف اس کے عمل کی پیروی کرنا ہوتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ بہت سے معاملے ہوا کرتے تھے، بہت سے لوگ اپنے مخالفوں پر جادو ٹونے کرانے آتے تھے اور بہت ہی بڑے بڑے کام ہوتے تھے۔ آج بھی ایک دیوی جی اپنے کام کے لئے اُس کے پاس آئی تھیں۔ کہیں دور سے آئی تھیں یہ دوسرے شہر میں رہتی تھیں۔ اُنہیں پریشانی تھی کہ اُن کے پتی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ چاہتی تھیں کہ اُن کی سوکن کتے کی موت مر جائے۔ بڑی بھاری رقم دے کر اُنہوں نے کالے جادو کے

ذریعے اپنی سوکن کی موت کا بندوبست کیا تھا۔ بہر حال، یہ کام تو کرنا ہی تھا، وہ دیوی جی بھی یہیں ٹھہری ہوئی تھیں اور ساری رات مصنوعی جوہڑ سے اُٹھنے والی بدبو سے بے چین رہی تھیں۔ اُدھر ناگ چندر نے اپنی عادت کے مطابق اپنا کالے جادو کا پتلا اپنے بیر کو بنا کر دھرم داس کی طرف روانہ کر دیا تھا اور اس اُس کی کامیابی کا انتظار کر رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ خاموش رہا۔

اس وقت وہ بیٹھا ہوا صرف یہ انتظار کر رہا تھا کہ اُسے دھرم داس کی تباہی کی اطلاع ملے۔ اُس کے اپنے سامنے بالکل ویسا ہی ایک پتلا جو آٹے کا بنا ہوا تھا، رکھا ہوا تھا اور وہ اُس کے ساتھ جادوئی عمل کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس میں ثابت ماش کے دانے بھرے ہوئے تھے۔ برابر ہی خون کے دو چراغ جل رہے تھے۔ یہ خون تیل میں شامل کیا گیا تھا اور کسی ایسے شخص کا تھا جو اپنے دشمن کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ آٹے کا ڈیڑھ فٹ اُونچا پتلا، ناگ چندر کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور چندر اُس پر کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ماش کے دانے اُس پر مارتا جا رہا تھا۔ ماش کے جو دانے وہ اپنی مٹھی میں بھر کر پتلے پر مارتا وہ پتلے کے جسم پر لگتے اور اس طرح غائب ہو جاتے جیسے اُن کا وجود ہی نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی پتلے کے اندر ایک عجیب سی لرزش پیدا ہو جاتی تھی اور وہ پھر ساکت ہو جاتا تھا۔ بہت ہی مہارت سے یہ پتلا بنایا گیا تھا۔ ایک نگاہ دیکھنے پر ڈیڑھ سال کا کوئی بچہ معلوم ہوتا تھا، بجائے اس کے کہ وہ آٹے کا لگتا۔ یہ ناگ چندر کے ہاتھوں کا کرشمہ تھا۔ بہر حال وہ عمل پڑھتا رہا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اچانک ہی پتلے کے اندر لرزش پیدا ہوئی۔ دیکھنے والے اگر اس وقت اس بھیانک عمل کو دیکھ لیتے تو شدتِ دہشت سے شاید اُن کے دل کی حرکت ہی بند ہو جاتی۔ کیونکہ اب پتلا دونوں ہاتھ بھی ہلا رہا تھا، گردن بھی ہلا رہا تھا اور اُس کی گردن پھرکنی کی طرح گھوم رہی تھی۔ ناگ چندر کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھال میں ماش کے چند دانے رہ گئے تھے۔ اُس نے تھال پورے کا پورا پتلے پر پھینک دیا۔ اور دفعتہً ہی پتلے کے بدن میں سرخی پیدا ہونے لگی۔ یہ آگ کی سرخی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ آتشی پتلا بالکل جاندار ہو گیا اور اُس نے ناگ چندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ناگ چندر کے منہ سے ایک مدھم آواز نکلی۔

’’ہاں...... ابھی تک ہمیں پتہ نہیں چلا کہ ہمارے دشمن کی کیا حالت ہوئی؟‘‘

دفعتہً ہی ناگ چندر چونک پڑا۔ اُس کے سامنے کھڑا ہوا پتلا تھوڑا سا آگے بڑھا اور پھر ایک دم زمین پر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ ناگ چندر چونک پڑا۔ اُس کی ہنسی رُک گئی تھی۔ اُس نے سامنے دیکھا اور اُس کے انداز میں شدید دہشت پیدا ہو گئی...... سامنے سے وہ آتشی پتلا تیز رفتاری کے ساتھ واپس آ رہا تھا جسے اُس نے دھرم داس کی طرف بھیجا تھا۔

ناگ چندر کے پورے وجود میں وحشت کی لہریں دوڑ گئیں اور اُس کے ہاتھ پھیل گئے۔ پھر وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔ ’’یہ کیسے ہو گیا...... کالی ماں، یہ کیسے ہو گیا؟‘‘

اچانک ہی آتشی پتلا ناگ چندر کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اُس کے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

’’لے...... کمینے...... کالے...... تو نے مجھے ایسی جگہ بھیج دیا تھا جہاں تیرا دشمن پہلے سے موجود تھا۔ تو نے میری جیون شکتی بھسم کر دی۔ اب تو تیار ہو جا کوئی بڑا نقصان اُٹھانے کے لئے۔‘‘

ناگ چندر نے منہ ہی منہ میں کچھ منتر پڑھا اور دوسرے لمحے اُس کی زبان سانپ کی زبان کی طرح لپلپاتی ہوئی پتلے کی جانب بڑھی اور اپنی اس لمبی زبان سے اُس نے پتلے کو چھولیا۔ پھر غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کون ہے وہ میرا دشمن جسے دیکھ کر تو واپس آ گیا۔''

''وہ مُسلا...... وہ، جو تجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ دھرم داس پر حملہ ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''اوہو...... وہ مولوی ایمان علی؟''

''جو بھی ہے اُس نے مجھ پر اپنا منتر آزمایا اور جیسے ہی اُس نے میرے شریر پر پانی پھینکا، میرا پورا شریر سرد ہو گیا۔ اور اگر میں واپس نہ آ جاتا تو وہیں پر راکھ کا ڈھیر ہو گیا ہوتا۔ اس لئے تیری بڑائی تو ختم ہو گئی مجھ پر سے۔ اب میں تیرا بیر نہیں رہا...... ہاں، جو کچھ اُس نے واپس کیا ہے اب وہ تیرے لئے ہے۔ سمجھا! تیرے لئے۔'' پتلا اچانک اپنی جگہ سے بلند ہوا اور ناگ چندر کی جانب جھپٹا۔ لیکن ناگ چندر زمین پر لیٹ گیا تھا۔ پتلا برق رفتاری سے اُس کے اُوپر سے گزر گیا اور سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ دوسرے لمحے ناگ چندر نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایک لمبی چھلانگ لگا دی۔ پتلا جو سامنے والی دیوار سے ٹکرایا تھا، اس سے ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور دیوار درمیان میں سے پھٹ گئی جبکہ پتلا اُس میں سے گزر کر دوسری طرف پہنچ گیا تھا۔ دوسری طرف جو کمرہ تھا وہ ناگ چندر کی بیٹی دھرم وتی اور اُس کی دھرم پتنی بھاگ بھری کا کمرہ تھا۔ دونوں عورتیں اپنی جگہ سے اُٹھ گئیں تھیں۔ اچانک ہی دھرم وتی کی چیخ فضا میں اُبھری۔ پتلا اُس کے جسم سے ٹکرایا اور اُس کے پورے بدن میں آگ لگ گئی...... دوسرے لمحے وہ اپنے آپ کو نوچتی کھسوٹتی ہوئی وہاں سے باہر نکل آئی۔ اُس کے بدن سے شعلے نہیں اُٹھ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز سلگ رہی ہو۔ ہلکی ہلکی تپش، ہلکا ہلکا دُھواں...... لیکن دھرم وتی کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ ایک ہی جملہ اپنے منہ سے ادا کر رہی تھی۔

''جل گئی میں...... مجھے بجھاؤ...... ارے مجھے بجھاؤ...... بجھاؤ مجھے......''

ناگ چندر نے یہ الفاظ سنے اور وہ تیزی سے واپس پلٹا۔ پھر وہ اُس جگہ پہنچا جہاں اُس کی بیٹی چیخ رہی تھی تو اُس کے حلق سے دھاڑیں نکلنے لگیں۔ ''بجھاؤ اسے...... بجھاؤ...... کیا ہو گیا...... ارے یہ کیا ہو گیا۔'' دھرم وتی چاروں طرف دوڑ رہی تھی۔ بھاگ بھری پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ بس ساکت کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی لٹ جانے والی دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ ناگ چندر اِدھر سے اُدھر دوڑتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پانی کے برتن اپنی بیٹی پر اُنڈیلنا شروع کر دیئے۔ اُس کی بیٹی چیختے چیختے زمین پر بیٹھ گئی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد اُس کا بدن بھی راکھ کی مانند زمین پر ڈھلکتا جا رہا تھا۔ ناگ چندر نے اُسے دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ بری طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ''یہ کیا ہوا...... ارے یہ کیا ہو گیا کالی مائی...... یہ کیا ہو گیا...... یہ تو نے کیا کر دیا...... میں اپنے ہی جادو کا شکار ہو گیا...... میں اپنے ہی جادو کا شکار ہو گیا۔'' وہ غم واندوہ کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ لیکن اب اُس کی نوجوان بیٹی کی جگہ راکھ کا ایک ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ وہ اس ڈھیر کو دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگا۔ اور پھر اُس نے اپنی دھرم پتنی کی طرف قدم بڑھائے اور اُس کے پاس پہنچ گیا۔

''بھاگ بھری...... دیکھ بھاگ بھری...... ہماری بیٹی ہم سے دُور ہو گئی۔ دیکھ، ہماری بیٹی......''

اب اچانک ہی بھاگ بھری ایک جانب لڑھک گئی اور ناگ چندر کے حلق سے ایک اور چیخ نکل گئی۔

''بھاگ بھری تو...... تو بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ ارے تو بھی ساتھ چھوڑ گئی۔'' وہ بیوی کی لاش سے لپٹ گیا اور پھر اُس کے منہ سے ایک غراہٹ سی نکلی۔

''بہت برا کیا تو نے...... تو نے بہت برا کیا ہے رے...... بہت ہی برا کیا ہے تو نے مولوی ایمان علی۔ ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ خاموشی سے لوگوں کے کام دھندے کریں گے، دولت اکٹھی کریں گے اور خاموشی سے وقت گزار دیں گے۔ پر ساری باتیں اپنی جگہ، ہماری بیوی اور بیٹی ہمارا پیار تھیں۔ انہیں بھلا ہم کہاں بھول سکتے تھے؟ تو نے ان دونوں کو ہم سے چھین لیا۔ بہت برا کیا ہے تو نے مولوی ایمان علی...... کسی اور کے لئے تو نے ہمارا گھر برباد کر دیا۔ اور اب...... اب ایسا نہیں ہوگا۔ سمجھا؟ اب ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس کے بعد اُس نے بیٹی کی راکھ ایک ہانڈی میں بھری، بیوی کی لاش اُٹھا کر کاندھے پر ڈالی اور اُن دونوں کو لئے ہوئے وہ ایک اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اُس نے جو گھر بنایا تھا اس کے اندرونی کمرے میں گہرا، تاریک اور بڑا وسیع تہہ خانہ تھا۔ وہ بیوی کی لاش اور بیٹی کی راکھ لے کر اس تہہ خانے میں اُتر گیا۔

تاریک تہہ خانے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے وہ نیچے پہنچا تو اُس نے تہہ خانے کے بیچوں بیچ دونوں چیزیں رکھ دیں۔ اور پھر ایک ماچس اُٹھائی اور دیواروں میں بنے ہوئے سوراخوں میں اڑسی ہوئی مشعلیں روشن کر دیں۔ دُھوئیں کی بدبو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ مشعلوں کی لرزتی روشنی میں بھاگ بھری کی لاش اور وہ ہانڈی عجیب سی لگ رہی تھیں۔ پھر ناگ چندر ایک کالے سے صندوق کے پاس پہنچا جس پر تالا لگا ہوا تھا۔ اُس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کوئی منتر بدبدایا اور تالے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تالا کھل گیا۔ تب اُس نے صندوق کا وزنی ڈھکنا کھولا اور اُس میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکال لی۔ یہ بھی ایک پتلا تھا جو نجانے کون کون سی چیز سے بنا ہوا تھا۔ بے نقش، بے رنگ...... بس انسانی جسم کی مانند۔ ایسے بے شمار پتلے اس صندوق میں رکھے ہوئے تھے۔ ناگ چندر ایک ایک کر کے یہ پتلے نکالتا رہا اور اُنہیں زمین پر ڈھیر کرتا رہا۔ لاتعداد پتلے زمین پر ڈھیر ہو گئے اور صندوق خالی ہو گیا تو ناگ چندر نے اپنا دوسرا عمل شروع کر دیا۔ ان تمام پتلوں کو وہ بیوی کی لاش کے گرد سجا رہا تھا۔ بھاگ بھری کی لاش لمبی لٹا دی گئی تھی۔ ابھی اُس کا جسم نرم تھا اس لئے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اُس کا جسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ یہ پتلے اُس نے بھاگ بھری کی لاش کے گرد سجائے اور اس کے بعد ہانڈی میں سے وہ راکھ نکال لی جو اُس کی بیٹی کی تھی۔ اُس نے اس راکھ کو بھی بھاگ بھری کے برابر برابر زمین پر پھیلانا شروع کر دیا اور اُسے ایک انسانی جسم کی شکل میں پھیلا دیا۔ بڑی خوفناک صورت حال تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کام سے فارغ ہو گیا اور پیچھے ہٹ کر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر کے وہ کوئی منتر پڑھنے لگا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد اُس نے پتلوں پر پھونک ماری اور یہ پتلے آگ کی طرح روشن ہو گئے۔ تب ناگ چندر کی آواز اُبھری۔

''جے اکال سندریتا جاگ جاؤ......''

"ہم جاگ رہے ہیں سوامی......"

"تم میرے کس کام کے ہو؟ جاگتے کہاں ہو تم؟"

"ہم سے کیا بھول ہو گئی سوامی؟"

"میرا پریوار ختم ہو گیا اور تم پوچھ رہے ہو کہ تم سے کیا بھول ہو گئی۔ کیا اتنی بھر سوتری کے گیان میں تمہیں یہ سوچنا نہیں دی گئی تھی کہ تم میرے یہ محلّہ کی رکھشا کرو؟"

"دی گئی تھی سوامی۔"

"تو پھر؟"

"ہم سے بھول ہو گئی۔" پتلے بولے اور ناگ چندر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اُس نے غصے میں آکر پھونک ماری اور تمام پتلوں میں آگ لگ گئی۔ مجسموں کے جسم سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ چیخ رہے تھے۔ "نہیں سوامی...... نہیں مہاراج...... ہمیں مت مارو...... ہم نے کیا، کیا ہے؟ ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا...... شما کر دو...... شما کر دو ہمیں۔" ننھی ننھی ہولناک چیخیں اور آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور ناگ چندر خونی نگاہوں سے ان پتلوں کو دیکھ رہا تھا جو ایک ایک کر کے خاک ہوتے جا رہے تھے۔ زمین پر اُن کی راکھ پھیل رہی تھی۔ یہ بھیانک کھیل دیر تک جاری رہا۔ پتلے اب بھی چیخ رہے تھے، فریاد کر رہے تھے۔ "نہیں مہاراج...... تم جو کچھ کر رہے ہو اس میں ہمارا دوش نہیں ہے۔ آخر ہم نے کیا، کیا ہے؟"

"تم میرے چہیتے بیر تھے...... میں نے تمہاری رکھشا کے لئے کیا نہیں کیا؟ لیکن تم نے میرے لئے کیا، کیا؟ میری پتنی اور بیٹی مر گئی۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکے...... کچھ بھی نہیں کر سکے تم میرے پریوار کے لئے۔ تو پھر تمہارے جیون سے مجھے کیا فائدہ؟"

"ہم کیا کر سکتے تھے مہاراج؟ جس نے تمہارا منتر تمہیں لوٹایا وہ ہمارے دھرم کا تو نہیں ہے، دوسرے دھرم کا ہے وہ۔ وہ جو کچھ کرتا ہے ہمارے پاس اس کا توڑ نہیں ہے۔ ہمیں کیوں مار رہے ہو؟"

"تمہارے پاس اگر اس کے کئے کا توڑ نہیں ہے تو پھر میں تمہارا کیا کروں گا؟ اس جیسے بہت سے مجھے نقصان پہنچاتے رہیں گے۔ اس لئے تم بھسم ہو جاؤ۔ مر جاؤ تم سب۔ میرا منتر چھوٹا نہیں ہے۔ کالی کا پجاری ہوں میں...... میں اُس سے نئی شکتی مانگ لوں گا پر تمہیں پال کر میں کیا کروں؟ تم کیا سمجھتے ہو تمہاری حفاظت کرنا کوئی آسان کام ہے؟ سنسار میں لاکھوں ایسے سادھو سنت گھومتے پھرتے ہیں جو دوسروں کی شکتی چھیننے کے لئے ان پر جیون تنگ کر دیتے ہیں۔ ان سب سے لڑتا ہوں میں تمہارے لئے کہ کہیں تم کسی دوسری پیڑھ میں نہ چلے جاؤ اور وہ تمہیں مجھ سے چھین نہ لیں، تمہیں نقصان نہ پہنچا دیں۔ میں اُن کے خلاف ہر وقت جنگ کرتا رہتا ہوں، کس کے لئے؟ تمہارے لئے نا...... اور تم میرا چھوٹا سا پریوار نہیں بچا سکے...... میرے جیون میں پتنی اور بیٹی کے سوا کیا تھا؟ جو کچھ سیکھا، جو کر رہا تھا اُنہی کے لئے تو کر رہا تھا۔ اب تمہارا کیا میں اچار ڈالوں گا؟"

"کیا کرو گے تم؟"

"میں تو نئی شکتی حاصل کروں گا۔ کالی دیوی سے میں نیا سنسار مانگوں گا۔ وہ تم سے اچھا رہے گا۔

بہر حال، آخری پتلا بھی زمین پر پانی کی مانند بہہ گیا تو ناگ چندر اپنی جگہ سے اُٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک دوسرے گوشے میں پہنچ گیا۔ یہاں کالی کا بھیانک مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ یہ مجسمہ شاید تانبے کا بنا ہوا تھا۔ کالی دیوی کا پورا رنگ اس سے نمایاں تھا اور یہ بولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اُس نے مجسمے کو ایک اُونچی جگہ رکھا اور اس کے بعد اپنے بدن کے سارے کپڑے اُتار کر پھینک دیئے۔ آہستہ آہستہ اُس کا بدن لرزنے لگا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بھیانک شکل اختیار کر گیا اور پھر اُس نے کالی دیوی کے سامنے بری طرح اُچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ اُچھلتے ہوئے وہ ایک جگہ آیا اور اُس نے ایک خنجر اُٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر کالی دیوی کے سامنے ایک بھیانک ناچ ناچنے لگا۔ اتنا بھیانک ناچ کہ اگر اس وقت اُسے کوئی دیکھ لیتا تو ایک ننگے دیوتا کو دیکھ کر اُس کا کلیجہ پانی بن کر بہہ جاتا۔ جادو کی دنیا کا یہ خوفناک عمل تھوڑی دیر تک جاری رہا۔ اور اچانک ہی کالی دیوی کے کانسی کے مجسمے سے ایک دُھواں سا خارج ہونے لگا۔ سفید رنگ کا دُھواں پھیلتا چلا گیا اور چھوٹا مجسمہ اس دُھوئیں میں لپٹ کر ایک نئی شکل اختیار کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کافی بڑا ہو گیا تھا۔ اور پھر اُس کے کاندھوں پر بچھو رینگنے لگے۔ تب ناگ چندر نے رُک کر دونوں ہاتھ جوڑے اور جھکتا چلا گیا۔

"جے مہا کالی...... تو جانتی ہے کہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے...... کالی، مجھے شکتی دے...... مجھے شکتی دے کہ میں اُس سے مقابلہ کر سکوں جو میرا دشمن ہے...... میں اُسے نیچا دکھا دُوں۔ اگر تو نے مجھے یہ شکتی دے دی تو تیرا یہ داس تیرے نام کی بلی دے دے گا...... خود اپنے شریر کی بلی...... خود اپنے شریر کی بلی۔"

اُس نے اپنے شانے پر خنجر سے ایک زخم لگایا اور اس زخم سے بہنے والا خون اپنے ہاتھ کا پیالا بنا کر لے لیا۔ پھر اُس نے یہ سارا خون کالی کے متحرک مجسمے پر انڈیل دیا۔ کالی کا مجسمہ جواب کافی بڑا جسم اختیار کر گیا تھا، بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ خون اُس کے چہرے سے بہہ کر سینے تک آ رہا تھا۔ تب ناگ چندر آگے بڑھا اور اُس نے اپنی زبان نکال کر یہ خون چاٹنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اُس نے کالی کے بدن کا سارا خون صاف کر دیا تو اچانک ہی ایک غیر انسانی آواز اس بھیانک ماحول میں گونجی۔

"کیا چاہتا ہے...... بول، کیا چاہتا ہے؟"

"کالی دیوی...... مجھے ان دونوں کے شریر میں جیون چاہئے۔ میں ان کے شریر میں آتماؤں کی واپسی چاہتا ہوں۔ تھوڑے وقت کے لئے ان کے جسموں کو آتماؤں کی شکتی دے دے۔"

"پاپی...... کسی مرے ہوئے کو جیون دینا میرا کام نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔"

"مگر میں...... مگر میں انہیں جیتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر ایک کام ہو سکتا ہے کہ میں اپنے بیران کے شریر میں داخل کر دُوں۔ اور میرے بیران کا شریر جیتا رکھیں۔"

"یہی میں چاہتا ہوں...... ایک خاص وقت تک یہ شریر جیتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں تجھے تیرا یہ اُدھار واپس کر دُوں گا۔ یہ شریر مجھے دے دے مہا کالی...... ایسا ہی کر، اپنے بیروں کو انکے جسموں میں داخل کر دے۔"

''ٹھیک ہے......'' کالی کی آواز اُبھری۔ پھر اچانک ہی ایک تیز چمک کمرے میں اُبھری۔ ایسی تیز چمک کہ آنکھوں کی روشنی چھن جائے۔ ناگ چندر کی آنکھیں بھی ایک دم بند ہو گئی تھیں۔ دیر تک ہر آنکھوں میں جھائیاں رقص کرتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ چمک معدوم ہو گئی۔ سامنے کالی کا مجسمہ اپنی جگہ موجود تھا۔ لیکن ناگ چندر نے ان دونوں جسموں کی طرف دیکھا جن میں سے ایک کے بدن کی راکھ اور دوسرے کا بھرپور بدن موجود تھا۔ اب صورتحال بالکل مختلف تھی۔ ناگ چندر کی بیٹی دھرم وتی بھی اپنی جگہ مجسم موجود تھی اور بھاگ بھری بھی...... دونوں کے جسموں میں جنبش ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ دونوں اُٹھ کر فرش پر بیٹھ گئیں اور اچانک ہی ناگ چندر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اُس کے منہ سے روتی ہوئی آواز نکلی۔

''میری بیٹی...... میری بھاگ بھری...... آہ، تم دونوں چھوڑ گئیں نہ مجھے۔ آخر تم مجھے بھی چھوڑ گئیں۔''

وہ رو رہا تھا لیکن وہ دونوں عورتیں بت کی مانند خاموش تھیں۔ ناگ چندر دیر تک روتا رہا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ اس طرح ان دونوں سے پیش آ رہا تھا جیسے وہ اصل میں اُس کی پتنی اور بیٹی ہوں۔ جبکہ وہ تو صرف بیر تھے جو ان کے شریر کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ ناگ چندر کے منہ سے روتی ہوئی آواز نکلی۔

''میری وجہ سے تم پر یہ مصیبت پڑی۔ میری وجہ سے تم اس سنسار سے دُور ہو گئیں۔ آہ، میں جانتا ہوں میری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا۔ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ میں نے کالا جادو سیکھ کر جو کچھ بھی کیا وہ اپنے لئے نہیں، تمہارے لئے کیا تھا۔ صرف تمہارے لئے۔ لیکن تم ہی مجھ سے دُور ہو گئیں۔ اب میں تمہارے بنا کیا کروں گا؟ کیا کروں گا میں؟'' وہ روتا اور چیختا رہا۔ لیکن دونوں عورتوں کے چہروں پر نہ تو کوئی تاثر اُبھرا نہ یوں لگا جیسے اُنہیں اُس کے رونے سے کوئی دلچسپی ہو۔ تب اُس کی ٹوٹی ہوئی آواز اُبھری۔

''ہاں...... میں جانتا ہوں کہ اب تم اس سنسار میں نہیں ہو۔ یہ تمہاری آتمائیں بھی نہیں ہیں جو تمہارے جسموں کو متحرک کر رہی ہیں۔ بلکہ اب تم کالی دیوی کی بیر ہو۔ ہاں...... مہا کالی، تو نے میری بات مان لی ہے۔ مگر...... مگر میں برداشت نہیں کر پا رہا۔ ان کی جدائی میں، ان کے بغیر اپنا علم بھی نہیں آزما سکتا تھا۔ سمجھیں؟ میں اپنا علم بھی نہیں آزما سکتا تھا۔ اب میں ان سے شکتی حاصل کر کے اپنا علم پورا کروں گا۔ چلو، آؤ...... تم میرے ساتھ آ جاؤ۔'' اُس نے کہا اور تہہ خانے سے واپسی کے لئے چل پڑا۔

دونوں عورتیں خاموشی سے اُس کے پیچھے چل رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ اُس جگہ پہنچا جو اُس کی اپنی رہائش گاہ تھی اور اُس نے آگے بڑھنے کے بعد ایک الماری سے کچھ چیزیں نکالیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی سوئیاں تھیں، انسانی کھوپڑیاں تھیں، چھوٹی بڑی ہڈیاں تھیں۔ ان تمام چیزوں کو اُس نے ایک تھیلے میں ڈالا اور پھر تھیلے کا منہ باندھ کر اُسے ہاتھوں میں لٹکایا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ اُس نے اپنے گھر کے اُس پچھلے حصے کا رُخ کیا جہاں اُس نے اپنا خوفناک جادو گھر بنا رکھا تھا۔ یہاں بڑی لمبی لمبی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، بدنما اور خوفناک جھاڑیاں...... ان جھاڑیوں میں ایک کنوئیں کا دہانہ چھپا ہوا تھا جو بالکل زمین کے برابر کی سطح پر تھا۔ اس طرف آنے جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ کوئی بھی ان جھاڑیوں سے نہیں گزرتا تھا۔ لیکن اگر کوئی بھولا بھٹکا ادھر آ گیا یا کسی نے جان بوجھ کر یہاں سے گزرنے کی کوشش کی

یہ اندھا کنواں اُس کا استقبال کرتا تھا اور اس کنوئیں کی گہرائیوں میں کئی انسانی ڈھانچے جو سوکھ کر خشک ہو گئے تھے، اُوپر سے بھی تکتے نظر آتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ناگ چندر کی حکم عدولی کی تھی۔ اُس نے ہڈیوں اور کھوپڑیوں سے بھرا ہوا وہ تھیلا اُس کنوئیں میں اُچھال دیا، دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگاتے ہوئے بولا۔

''دیوی دیوتاؤں کی قسم...... ایک دن میں مولوی ایمان علی کی لاش کو بھی اسی کنوئیں میں ڈالوں گا۔ میرا وعدہ ہے...... میرا وعدہ ہے......'' پھر وہ خاموشی سے وہاں سے چل پڑا۔ جو کچھ کھو بیٹھا تھا اب اسے واپس لانا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن اپنے طور پر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب مولوی ایمان علی سے انتقام لینا ہی اُس کی زندگی ہے۔ اُس کی بیوی اور بیٹی اب اُس کی نہیں رہی تھیں۔ وہ تو دو بیر تھے جو اُن کے شریر میں جی رہے تھے۔

اِدھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا اُدھر مولوی ایمان علی بے حد پریشان تھا۔ اُسے اتنا پریشان دیکھ کر اُس کی بیوی نادرہ نے اُس سے کہا۔ ''ایمان علی، یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ چہرہ اُترا ہوا ہے۔ نہ کھا رہے ہو نہ پی رہے ہو۔ ہر وقت سوچ میں ڈوبے رہتے ہو۔ آخر کیا بات ہے؟''

''تمہیں نہیں معلوم نادرہ؟''

''مجھے صرف ایک ہی بات معلوم ہے۔''

''کون سی بات؟''

''تمہاری یہ حالت اسی وقت سے ہے جب سے تم نے دھرم داس کی مدد کی ہے۔''

''ہاں...... میں اُسی وقت سے پریشان ہوں۔''

''کسی کی مدد کر کے پریشان ہونا تو عقل کی بات نہیں ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن میں ناگ چندر کو نہیں بھلا سکتا۔ وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔''

''آخر اُسے کیا ہوا ہے؟''

''اصل میں نادرہ، پیسے کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ لیکن جو کچھ اللہ تعالیٰ عطا کرے اس پر قناعت کرنا ضروری ہے۔ یہ جائز و ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اس کے باوجود لوگ نہیں سوچتے، یہ ان کا فعل ہے۔ مجھے ایک خطرہ ہے۔''

''کیا؟''

''کہیں ناگ چندر کو کوئی نقصان نہ پہنچ گیا ہو۔''

''اس کی کوئی وجہ ہے؟''

''ہاں......''

''کیا وجہ ہے......؟'' نادرہ کے اندر بال کی کھال اُتارنے کی عادت تھی۔

مولوی ایمان علی دیر تک سوچتا رہا، پھر اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''بس نادرہ، میں جادو وغیرہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ ایک آتشی پتلا، دھرم داس کی حویلی میں داخل ہوا تو میرے دل نے

کہا کہ یہ دھرم داس کے اہل خانہ کو جلا کر خاکستر کر دے گا۔ میں نے اُس پر قرآنی آیات کا دم کیا
ڈال دیا۔ میرا خیال تھا وہ وہیں فنا ہو جائے گا۔ مگر وہ واپس چلا گیا اور مجھ پر قدرتی طور پر ایک انکشاف

"کیا......؟"

"یہ کہ یہ آتشی پتلا یہاں کامیاب نہ ہوا تو اس کا ردِعمل اس کے عامل پر ہوگا۔ یعنی یہ کہ ناگ
اس سے نقصان پہنچے گا۔ اور پھر بس یہی خیال مجھے پریشان کئے ہوئے ہے۔"

"آپ کو کچھ معلوم ہوا کہ ناگ چندر کو کوئی نقصان ہوا یا نہیں؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"تو معلوم کرلو اُس کے گھر جا کر۔ مسئلہ پولیس تک جانا نہیں چاہئے۔"

"ہاں...... آنکھ کی شرم ہے، بچپن کی دوستی ہے۔ جانا تو پڑے گا۔" ایمان علی نے کہا۔ اور اسی
دروازے پر دستک ہوئی تو نادرہ نے کہا۔

"میں دیکھتی ہوں۔"

"نہیں رُکو...... میں خود چلا جاتا ہوں۔" ایمان علی نے جا کر دروازہ کھولا تو ٹھاکر دھرم داس ا
اور ایک بیٹے کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ایک ملازم پھلوں کا ٹوکرا اور مٹھائی لئے کھڑا تھا

"ارے ٹھاکر صاحب آپ...... آئیے آئیے۔"

"آؤ......" ٹھاکر صاحب نے ساتھ آنے والوں سے کہا اور وہ اندر آ گئے۔ اُنہوں نے نادرہ

"بھائی ایمان علی نے ہمارا گھر بچا لیا۔ یہ کچھ مٹھائی لایا ہوں بھابھی۔ اور یہ اپنی ینہ کے لئے سونے کا ہار
اس کی شادی کا جہیز میں دیتا ہوں۔" ٹھاکر صاحب کی معصوم پتنی نے ایک خوبصورت ڈبہ تھال کا کھولا
دکھانے لگی۔ قیمتی ہار تھا۔ مولوی صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"ٹھاکر صاحب...... یہ تو آپ نے کمال کر دیا۔ نادرہ، کیسا ہار ہے؟"

"بہت خوبصورت۔" نادرہ نے کہا۔

"کیا کہتی ہو تم اس کے بارے میں؟"

"وہی جو آپ کہتے ہیں۔"

"تو پھر کہہ دو۔" ایمان علی نے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ ٹھاکر صاحب۔ ایمان علیؒ اگر یہی کام کرے تو ہمارے پاس بھی ا
ہوتا جتنا ناگ چندر کے پاس ہے۔ مسلمان اللہ کا کلام بیچتے نہیں ہیں۔ یہ تو اُس کی امانت ہے جو
کے حکم کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ یہ مٹھائی اور ہار ہمارے کام کا معاوضہ نہیں ہے اور ہمارے
قیمت نہیں ہے۔"

"ارے نہیں...... آپ نے میرے گھر کو بچایا ہے۔ ان کی جان کی تو کوئی قیمت ہی نہیں ہے
ہماری خوشی ہے۔"

"آپ ہمارے دوست ہیں ٹھاکر صاحب۔ لیکن ہم یہ سب کچھ نہیں لیں گے۔"

"کوئی بات نہیں ایمان علی...... ہم یہ واپس لے جائیں گے۔ لیکن تمہیں کبھی ہماری ضرورت پڑے تو
ہمیں یاد رکھنا۔"

مولوی ایمان علی نے کچھ نہ کہا۔ ٹھاکر پھر بولا۔ "تو ہم چلیں۔"

"ٹھاکر صاحب، ایک بات بتائیں؟"

"ہاں...... پوچھو۔"

"اُس دشمن نے پھر تو کوئی کوشش نہیں کی؟ میں نے کئی دن سے زیادہ تو آپ کی طرف رُخ نہیں کیا۔"

"نہیں۔" ٹھاکر دھرم داس نے جواب دیا۔

دھرم داس اپنے سامان سمیت چلے گئے تو مولوی صاحب جوش میں آ کر بولے۔ "مجھے تم سے یہی
اُمید تھی نادرہ۔ واقعی اللہ کا کلام فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ اب ناگ چندر کے گھر جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر
ایمان علی، ناگ چندر کے گھر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

پانچوں چڑیاں حویلی کے ایک درخت کی شاخ پر جا کر بیٹھ گئیں۔ یہ جگہ اُنہیں کافی پسند آئی تھی۔ بہت
دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر روپا نے کہا۔ "تم سب خاموش کیوں ہو؟"

"ایسے ہی...... بس اپنے بارے میں سوچ رہی ہیں۔" راگنی بولی۔

"کیا؟"

"بہت سی باتیں۔"

"مثلاً......؟"

"کوئی ایک یا خاص بات نہیں۔"

"پھر بھی۔"

"میں تو سوچ رہی تھی روپا، کہ سنسار میں ہماری جیسی بپتا کسی اور پر پڑی ہوگی؟" رجنی بولی۔ "جو
جیون ہم بتا رہے ہیں کیا وہ ہمارا ہے؟"

"بالکل نہیں......" رما جلدی سے بولی۔

"میں تمہیں من کی ایک بات بتاؤں؟" رما بولی۔

"ہاں...... ضرور۔"

"بچپن میں کبھی میں گھر کے آنگن میں چارپائی پر لیٹ کر آسمان کو دیکھتی تھی، آکاش میں بہت سے
پرندے اُڑتے نظر آتے۔ پروں کو پھڑپھڑاتے، اُوپر نیچے غوطے لگاتے۔ جب وہ مجھے نظر آتے، میرے
من میں ایک آرزو اُبھرتی، کاش میں کوئی پرندہ ہوتی اور اسی طرح فضا میں اُڑ سکتی۔ اور آج میں فضا میں اُڑ
سکتی ہوں۔" رما نے خوشی سے بھری آواز میں کہا۔ "کیوں رجنی، تجھے یہ اچھا نہیں لگتا؟ ابھی تو ہمیں یہ
یقین نہیں آ رہا کہ ہمیں یہ شکتی مل گئی۔ ابھی تو ہم اپنے آپ کو آزما رہے ہیں۔ جب ہمیں اپنی قوتوں کا پورا
علم ہو جائے گا تب جیون کا مزہ آئے گا۔"

''ہاں دیدی......'' رجنی نے جواب دیا۔

''کتنی خوبصورت حویلی ہے۔ ہم اُداسی میں کھو گئے ہیں۔'' روپا نے کہا۔ پانچوں خوبصورت چڑیا حویلی کی فضاؤں میں اُڑنے لگیں۔ اُنہیں یہ حویلی بہت خوبصورت لیکن بے حد پراسرار لگ رہی تھی راگنی بولی۔

''دیدی......ایک بات پر غور کیا تم نے؟''

''کیا......؟'' روپا نے پوچھا۔

''یہ حویلی بہت خوبصورت ہے۔ لیکن یہاں ایک عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا اس حویلی میں انسان رہتے ہیں؟''

''کیوں نہیں رہتے؟ دیکھو، وہ سامنے دیکھو، وہ ایک عورت اندر جا رہی ہے۔'' روپا نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیدی......ہم نجانے کیوں خاص طور سے اس حویلی کی طرف آئے ہیں۔''

''ہاں......نجانے کیوں؟'' وہ چاروں پرواز کرتی رہیں۔ رجنی کے اندر ایک عجیب سی اُداسی پائی جا رہی تھی۔ وہ اپنی چاروں بہنوں کو دیکھ رہی تھی جو خوشی سے فضاؤں میں پرواز کرتی پھر رہی تھیں۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ خود رجنی کو بھی اس ہوا میں اُڑنے کا بڑا مزہ آ رہا تھا۔

رادھا کہنے لگی۔ ''دیدی، فضا میں اُڑنا تو بڑا اچھا لگتا ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو پہلے سے سمجھ میں نہیں آتیں، بعد میں اس کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔''

''کیا سوچ رہی ہے تو؟''

''دیدی، ہم اس حویلی کے اندر نہیں جا سکتے۔ میرا مطلب ہے اُڑتے ہوئے۔''

''کیا تمہارے من میں یہ خیال ہے کہ تم حویلی کے اندر کی باتوں کو بھی جانو؟''

''ہاں، یہ تو ہے۔''

''لیکن رادھا، یہ کون سا مشکل کام ہے؟ ہم لمحوں میں جو چاہیں بن سکتے ہیں۔ کوئی بھی رینگنے والا جانور بن کر ہم حویلی میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس میں کون سی پریشانی ہوگی ہمیں؟''

''ہاں، یہ تو ہے۔ اب وہی بات ہے نا دیدی، کہ عقل ساتھ کہاں دیتی ہے؟ یاد ہی نہیں رہتا کہ ہم کیا ہیں، کیا بن چکے ہیں۔''

''جو کچھ بھی بن چکے ہیں، ابھی تو اس کا فائدہ اُٹھائیں گے۔''

''ہاں دیدی...... کیوں نہیں؟''

پھر وہ پانچوں بہت دیر تک اُڑنے کے بعد ایک درخت پر جا بیٹھیں کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک بدصورت کوا اُن کے سامنے آ کر بیٹھ گیا تو رما کہنے لگی۔ ''ارے دیکھو، یہ یہاں کیوں آ کر بیٹھ گیا؟''

اچانک ہی کوے کے منہ سے ہنسی کی آواز نکلی۔ اور پھر یہ آواز ایک بھاری آواز میں تبدیل ہو گئی۔ ''بے وقوفو، میں تمہارا اشیش بھگونت ہوں۔'' پانچوں ایک دم سنبھل گئیں۔ اُنہوں نے اشیش بھگونت کے

سامنے سر جھکایا اور شیطان کہنے لگا۔

''اس حویلی کی ایک کہانی ہے جو خود بخود تمہارے سامنے آ جائے گی۔ ابھی کہانیاں سننے کا وقت نہیں ہے۔ تم نے بڑا اچھا فیصلہ کیا کہ یہاں بھی آئیں۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ رفتہ رفتہ تم اپنا کام بھی سمجھو۔ ہمارا کام صرف نیکیوں کو مٹانا ہے یا پھر ایسے انسان کو نقصان پہنچانا ہے جو نیکیوں کا پرستار ہو۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہی ہم اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اب بار بار میں تمہارے پاس آ کر تمہیں یہ نہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ بس سمجھ لو، انسانوں کو نقصان پہنچانا ہی تمہارا دھرم ہے۔ تمہیں اس کے مطابق کام کرنا ہے۔ اور یہ بھی دیکھ لو کہ میں نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا...... کیا نہیں مل گیا ہے تمہیں اس سنسار میں۔ اس سنسار سے نمٹنا اب تمہارا کام ہے۔ میں تمہیں تمہارا آخری کام بتا رہا ہوں، اس کے بعد تمہیں جو کچھ بھی کرنا ہے، سمجھ لو اس انداز میں کرنا ہے کہ انسان تڑپتے اور سسکتے رہ جائیں۔ وہ دیکھو، وہ سامنے کیا ہے۔''

پانچوں بہنوں کی نگاہیں دُور حویلی کی جانب اُٹھ گئیں۔ وہ تقریباً ایک چار ساڑھے چار سال کا بچہ تھا۔ گول مٹول۔ رنگین لباس میں۔ اُس کے سر کے بال گھنگھریالے تھے۔ ایک گیند سے کھیلتا ہوا وہ باہر آ رہا تھا اور بہت ہی خوش نظر آ رہا تھا۔

''یہ اس گھر کا اکلوتا بچہ ہے، ماں باپ، دادا دادی اور تین چچاؤں کا منظورِ نظر۔ گھر کے پہلے فرد کا پہلا بچہ تمہیں نظر آ رہا ہے نا؟''

''ہاں......''

''کتنا خوبصورت ہے یہ، ہے نا؟ اگر اس بچے کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو گھر کے لوگ آدھے مر جائیں گے۔ تین چچا، ایک باپ، ایک ماں اور دو دادا دادی، سات افراد۔ کیا ہی بڑا کام ہوگا۔ اور پھر یہ حویلی تمہیں رہنے کے لئے مل جائے گی۔ کیا سمجھیں؟ تمہیں جگہ کی تو ضرورت ہوگی نا؟''

''ہاں، کیوں نہیں؟ بڑا بھرپور علاقہ ہے۔''

''سمجھ لو تم اس حویلی کو اپنا مرکز بنا سکتی ہو اور یہاں اپنی کارروائیاں جاری رکھ سکتی ہو۔''

''ہمیں کرنا کیا ہے؟''

''میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' اشیش بھگونت نے کہا اور آہستہ آہستہ اُن لوگوں کو اُن کے آگے کے اقدامات کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ خاموشی سے سن رہی تھیں۔ اشیش بھگونت نے کہا۔ ''ہاں، سمجھ گئیں نا میری بات؟''

''ہاں بھگونتا......'' روپا نے کہا۔

''بس، تو پھر اپنا کام شروع کر دو۔ چلو جاؤ......'' اور اس کے بعد وہ فضا میں اُڑا اور اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ روپا کے حلق سے ہنسی کی آواز نکل گئی تھی۔

''اشیش بھگونت بھی خوب ہے۔ ایسے انوکھے کام بتاتا ہے کہ انسانوں کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔ چلو، اُس کے حکم کی پابندی کرنا اور اُس کی سیوا کرنا ہی ہمارا دھرم ہے۔ آ جاؤ......''

ننھا سا بچہ کھیلتا ہوا آگے آ رہا تھا۔ پانچوں چڑیاں اپنی جگہ سے اُڑیں لیکن درخت سے نیچے اُتر
وہ رنگ برنگی حسین تتلیاں بن گئیں اور پانچوں کی پانچوں خوبصورت بچے کے سامنے سے گزرتی ہو
چھوٹی سی پھولوں کی ڈال پر آ بیٹھیں۔ ننھے بچے نے ان حسین تتلیوں کو دیکھا اور گیند کو بھول گیا
ننھے ننھے قدموں سے اُن کی جانب دوڑا اور اُس نے اُنہیں پکڑنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھائے
تتلیاں اپنی جگہ سے اُڑ کر آگے والے درخت پر بیٹھ گئیں۔ بچہ وہاں تک پہنچا تو وہ اور آگے آ گئیں۔
تک کہ وہ حویلی کے پچھلے حصے میں آ گئیں جہاں ایک ٹوٹی پھوٹی کھنڈر نما جگہ تھی۔ بچہ حسین تتلیوں
کرتا ہوا ہنستا مسکراتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس کے لال رُخسار ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔ وہ بار
لگتا تھا اور اُس کے ننھے ننھے سفید چمک دار دانت سرخ باریک ہونٹوں کے درمیان جھلکنے لگتے
آنکھوں کی چمک دیکھنے کے قابل تھی۔ یہاں تک کہ وہ تتلیوں کا پیچھا کرتا ہوا کھنڈر میں داخل
لڑکیاں اُسے اور آگے لے گئیں۔ پھر اچانک اُن لوگوں نے کالے رنگ کی لمبی مونچھوں والی چ
رُوپ دھار لیا اور بچے کے چاروں طرف اُڑنے لگیں۔ حسین بچہ ایک لمحے کے لئے سہم گیا تھا۔ وہ
رونے لگا اور سہمی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ویران کھنڈر کے ایک اندرونی حصے میں
دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ سہم کر رو رہا تھا۔

دفعتہً ہی روپا نے اُس پر غوطہ لگایا اور اُس کی لمبی نوک دار چونچ بچے کی گردن میں گھس گئی۔
سے چیخا تو رما نے اُس کی آنکھ میں چونچ ماری۔ روشن سفید حسین آنکھ خون میں رنگ گئی۔ رادھا ا
بھی اُس پر ٹوٹ پڑیں اور بڑی تیزی سے اُس پر وار کرنے لگیں۔ بچہ اُنہیں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں
رہا تھا لیکن وہ اُس سے چپک گئی تھیں۔ اُن کے تیز لمبے نوکیلے پنجے اُسے نوچ رہے تھے اور رجنی ا
تھوڑے ہی فاصلے پر چڑیا ہی کی شکل بنائے ہوئے سہمی ہوئی نگاہوں سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ نجا
اُس کے دل میں اُس بچے کے لئے شدید غم کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ حالانکہ وہ پوری طر
بھگونت کے جال میں گرفتار تھی لیکن نجانے کیوں اس وقت اُسے یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا
سوچ رہی تھی کہ یہ معصوم بچہ تو ابھی برائیوں میں پڑا بھی نہیں ہے۔ اسے کیوں اس طرح زندگی سے
جا رہا ہے؟ رجنی کا دل غم کے آنسو روتا رہا۔

چاروں بہنیں چونکہ اپنا کام کر رہی تھیں اس لئے اُن کی توجہ رجنی کی طرف نہیں گئی تھی۔ بچے
اور شفاف خون چاروں طرف بکھر رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا لیکن چاروں خوفناک اور خونخوار لڑکیاں ا
جسم میں ننھے ننھے خنجر اُتار رہی تھیں اور اُس کا گوشت نوچ نوچ کر اور جھٹکے لے کر کھا رہی تھیں
ہوئے بچے کے جسم میں جابجا سوراخ ہو گئے تھے اور ان سوراخوں سے تھوڑا سا خون بار بار اُچھل
وہ تڑپتے تڑپتے اب ساکت ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ رما نے اپنی لمبی چونچ اُس کے سینے میں عین دل
مقام پر اُتار دی تھی اور اُس کے دل پر کئی شدید زخم آ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ بچے کی نسیں ڈوبنے لگیں اور
جان ہونے لگا......

پھر رجنی ہی چونکی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی بہنوں کو اس کام سے منع کر دے۔ لیکن وہ ایسا

پائی۔ چاروں خوفناک لڑکیاں پوری طرح شیطان کے زیر اثر تھیں۔ اچانک ہی رجنی کو خیال آیا کہ جب وہ
اُسے دیکھیں گی کہ اُس نے اُن کے کام میں حصہ نہیں لیا ہے تو وہ اس سے بات کریں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو
کہ روپا اُس سے ناراض ہو جائے۔ بحالت مجبوری وہ آگے بڑھی اور اُس نے اُن چاروں سے نگاہیں بچا
کر اپنی چونچ پر بچے کا ایک طرف پڑا ہوا تھوڑا سا خون مل لیا اور چونچ اُس پر رگڑ دی۔ لیکن خون کا ایک
قطرہ بھی اُس نے اپنے حلق سے نیچے نہیں جانے دیا تھا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

اُن چاروں لڑکیوں کو شاید بہت مزہ آ رہا تھا۔ چنانچہ وہ مسلسل بچے کے جسم کے مختلف حصے زخمی کر رہی
تھیں اور اُن سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہی تھیں۔ پھر چاروں ہی اس کام سے فارغ ہو گئیں۔ وہ اچھی
خاصی بوجھل ہو گئی تھیں۔ پانچوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، اُنہیں شبہ بھی نہیں ہو سکا تھا کہ رجنی نے اُن
کے کام میں حصہ لیا ہے یا نہیں لیا ہے؟ اس لئے اُنہوں نے رجنی سے کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا۔ روپا نے
بھاری لہجے میں کہا۔

"چلو، یہاں سے آگے بڑھ کر کسی اور درخت پر جا کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔ درخت
پر ہی سوئیں گے۔"

چاروں اپنی جگہ سے اُڑیں تو رجنی نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ لیکن اس کے بعد وہ اُن سے ذرا الگ
فاصلے پر بیٹھ گئی تھی اور اُس کا دل غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ آخر اُس معصوم بچے کا کیا قصور
تھا......؟

رو با، رما، راگنی اور رادھا اونگھنے لگی تھیں۔ وہ ایک گھنے درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور ساری حرکتیں چڑیوں جیسی تھیں۔ لیکن رجنی جاگ رہی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اُس نے بچے کا خو... تک نہیں تھا، نہ ہی اُس کے گوشت پر چونچیں ماری تھیں۔ اُس کا دل تو ویسے ہی اس معصوم بچے کی پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ ساری کی ساری تو انسان سے جانور بن چکی تھیں لیکن نجانے کیو... کے ذہن پر ابھی تک شیطان کے اثرات مکمل طور سے حاوی نہیں ہوئے تھے اور اشیش بھگونا کی ہدایات اُس کے لئے ابھی تک بے اثر رہی تھیں۔ چنانچہ اس وقت بھی اُس کے دل پر اُس بچے کی کا گہرا اثر تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو کچھ اُن کے ساتھ ہوا تھا وہ بڑا دردناک تھا۔ ا... نہیں کہا جا سکتا کہ شیطان اگر اُن کا ساتھ نہ بھی دیتا تو اُن کی زندگی ہی مشکل ہو جاتی۔ لیکن یہ سچ... وہ بے سہارا رہ گئی تھیں۔ نہ صرف بے سہارا بلکہ اگر وہاں گہرے تہہ خانے میں وہ شیطان کا سہارا ن... کر لیتیں تو بظاہر تو کوئی ایسی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی کہ اُنہیں زندگی مل جاتی۔ اب یہ الگ بات... بھگوان کے تو کھیل ہی نیارے ہوتے ہیں۔ اگر بھگوان نے اُن کا جیون لکھ دیا تھا تو کوئی نہ کوئی ... اُنہیں مل ہی جاتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی ایمان بہت کمزور ہوتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان لڑ... کی زندگی بچانے کے لئے ایک ناپاک وجود نے عمل کیا تھا اور کیونکہ زندگی کو ختم کرنا کسی کے بس کی نہیں تھی اس لئے شیطان اُن کی زندگی بچانے کا باعث بنا۔ البتہ اگر انسانی ایمان پختہ ہو تو یہ بات جا سکتی ہے کہ ڈور تو کہیں اور ہی ہلتی ہے۔ اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں یہ بھی سب کچھ سوچا ہ... ہے۔ بات صرف صحیح عقیدے کی ہے۔ بہرحال، رجنی جاگ رہی تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد اُس نے... عورت کو دیکھا جو نوجوان تھی، اچھا لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے آگے آ رہی تھی... آوازیں دے رہی تھی۔

"رمیش...... کہاں ہے رے تو؟ رمیشی...... او رمیشی...... کہاں چھپ گیا؟ اتنی دیر سے میرے ... نہیں آیا۔ رمیشی...... رے رمیشی۔ ہے رام، کدھر چلا گیا تو رمیشی؟"

اندر سے ایک بھاری سی آواز اُبھری۔ "کیا ہوا پوجا...... کہاں ہے رمیشی؟" ایک بوڑھی عورت نکل آئی۔ وہ شاید نابینا تھی۔ کیونکہ لکڑی کا سہارا لے کر آگے بڑھ رہی تھی اور لکڑی ٹک ٹک کر کے بڑھ رہی تھی۔ اُس نے زور سے آواز لگائی۔ "ارے پوجا، بولتی کیوں نہیں ہو؟ کہاں ہے رمیش؟"

"میری گود میں تو نہیں ہے۔ مل نہیں رہا، اسی لئے تو آوازیں دے رہی ہوں۔" جوان عورت ... بہت خراب تھا۔ نابینا عورت وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اُس کے جسم پر قیمتی ساڑھی تھی۔ لیکن ...

عورت کے سامنے اُس کی حیثیت کمزور نظر آئی تھی۔ جوان عورت پھر رمیشی، رمیشی پکارتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ نجانے کہاں کہاں وہ بچے کو تلاش کرتی رہی؟ رجنی سمجھ گئی کہ وہ اُسی بچے کو تلاش کر رہی ہے۔ بہرحال، وہ اپنی جگہ سے اُڑی اور تھوڑے فاصلے پر جا کر ایک ایسے درخت پر جا بیٹھی جو اُس کھنڈر نما جگہ سے قریب تھی۔

پوجا نامی عورت بچے کو آوازیں دیتی اُدھر پہنچ گئی اور پھر اُسے بچے کی لاش نظر آ گئی۔ اُس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی تھی اور وہ رمیش کہہ کر اُس کے پاس جا بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر ماں نے بچے کو پہچان لیا تھا۔ حالانکہ اُن چاروں لڑکیوں نے مکروہ چونچیں مار مار کر بچے کے پورے وجود کو مسخ کر دیا تھا۔ لیکن ماں کا اولاد سے الگ کا رشتہ ہوتا ہے۔ عورت کے حلق سے دلدوز چیخیں نکلنے لگیں تو بوڑھی اور اندھی عورت پاگلوں کی طرح لاٹھی ٹیکتی ہوئی آگے بڑھی اور زور زور سے چیخنے لگی۔

"پوجا...... ارے پوجا...... کیا ہوا؟ کیوں چیخ رہی ہو؟ کیوں رو رہی ہو؟" وہ آگے بڑھتی رہی۔ قدرت جب انسان سے اُس کی کوئی حقیقی قوت چھین لیتی ہے تو لازمی طور پر اُس کے وجود میں کچھ ایسی چیزیں پیدا کر دیتی ہے جو اس کی کمی کو پورا کر دیں۔ عورت کی حِس بہت تیز تھی چنانچہ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی ٹیکتی ہوئی اُس کے پاس پہنچی۔ اُدھر جوان عورت پر روتے روتے غشی سی سوار ہو گئی تھی۔ اندھی عورت نے کہا۔ "پوجا، بولتی کیوں نہیں؟ کیا بات ہے پوجا؟ ارے پوجا، او پوجا...... ہے بھگوان، میں کیا کروں...... کیا کروں میں؟ پوجا، کہاں ہے تو؟ کیا ہو گیا تجھے پوجا؟ تیری آوازیں تو ادھر سے آ رہی تھیں۔ بولتی کیوں نہیں پوجا؟ میں پریشان ہوں۔ تو بولتی کیوں نہیں ہے؟" وہ چیختی ہوئی کھنڈر میں داخل ہو گئی۔ اور پھر شاید انسانی بو پر قدم آگے بڑھائے اور آخر کار اُس نوجوان عورت کے پاس پہنچ گئی جو گھٹنوں میں سر دیئے بچے کے پاس نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت کے ہاتھ کی لکڑی اُس کے بدن پر لگی تو اُسے ایک دم احساس ہو گیا کہ یہ انسانی جسم ہے۔ لکڑی پیچھے ہٹا کر وہ وہیں بیٹھ گئی اور جھک کر پوجا کو دیکھنے لگی۔ اُس کے ہاتھ پوجا کو ٹٹولنے لگے تھے۔ "پوجا...... ارے او پوجا، کیا ہو گیا؟"

"امی......"

"ارے کیا ہو گیا؟ چکر آ گیا ہے کیا؟"

لیکن پوجا کی کوئی آواز نہیں اُبھری تو اُس نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے اور پھر اُس کے ہاتھ بچے کے جسم سے ٹکرائے۔ بوڑھی عورت بچے کے جسم کو ٹٹولنے لگی اور پھر اُس کے حلق سے دلدوز چیخ نکلی۔

"رمیشی...... رمیشی...... میرا رمیشی...... ہے بھگوان...... ہے بھگوان......" اور پھر وہ بری طرح چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ اُس کے رونے پیٹنے کی آوازوں سے پوجا کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ اُس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور پھر آگے بڑھ کر بچے کی لاش ہاتھوں میں اُٹھا لی۔

"کسی سے نہیں ڈرتی میں۔ بھوت ہو، پریت ہو، تمہارا ستیاناس۔ میرے سامنے آؤ، مجھ سے بڑی ڈائن اس وقت اور کوئی نہیں ہو گی...... کلیجہ چبا جاؤں گی میں اُس کا جس نے میرے بچے کا یہ حال کیا

ہے۔ آؤ، دیکھو تو سہی کون کتنے پانی میں ہے۔ ریشی، میری جان، میرے جیون......"

"پوجا، کیا ہو گیا ریشی کو؟" بوڑھی عورت نے کہا۔

"تمہارا ستیاناس...... نرکھ میں جاؤ تم۔ کیڑے پڑیں تمہارے بدن میں۔ اپنے ریت رواج مان مریادہ میرے بچے کا جیون لینے پر خرچ کر دی تم نے۔ چولہے میں جاؤ تم...... مرجاؤ کرے موت...... بھگوان کرے تم مر جاؤ......" پوجا، بچے کی مسخ لاش کو اُٹھائے ہوئے وہاں سے چل پڑی بوڑھی چیختی رہ گئی۔

"اری پوجا...... میری بات تو سن لے۔ میری بات تو سن۔ مجھے لے چل۔ مجھے سہارا دے، سے اُٹھا نہیں جا رہا۔" لیکن پوجا پر اس وقت دیوانگی طاری تھی۔

رجنی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان دونوں عورتوں کا کیا رشتہ ہے آپس میں؟ بچے کا مسئلہ تو اُس میں تھا۔ بوڑھی عورت اپنی جگہ سے بمشکل تمام کھڑی ہوئی اور اپنی لاٹھی ٹیکتی ہوئی وہاں سے چل پڑی روتی اور چیختی جا رہی تھی۔ "پوجا...... میری بات تو سن لے...... کیا ہو گیا ہے ریشی کو، مجھے بتا تو دے؟ حالت ہے اس کی...... کیا زیادہ خراب ہے؟ ڈاکٹر کو فون کر لے پوجا، جلدی سے بنسی کو بلا لے پوجا۔ لیکن پوجا اندر جا چکی تھی۔ رجنی کو بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ اُس بوڑھی عورت کا پیچھا کرنے لگی اُس کے سر پر کچھ فاصلے پر اُڑتی ہوئی حویلی کے دروازے تک پہنچ گئی۔ بوڑھی عورت نے جونہی در کھولا، رجنی بھی پھر سے اندر چلی گئی تھی یہ سوچے سمجھے بغیر کہ باہر نکلنے کے راستے کون سے ہو سکتے ہیں اُسے اس سارے معاملے سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور خاص طور سے بچے کی موت پر تو اُس کا دل تک خون کے آنسو رو رہا تھا۔

پوجا یقیناً اُس بچے کی ماں تھی اور بچے کا نام ریشی تھا۔ اور بنسی شاید اُس کے باپ کا نام بہرحال، بوڑھی عورت کی حسیات قابل تحسین تھی۔ حویلی میں ٹیلی فون بھی لگا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت فون کے پاس پہنچی، لاٹھی زمین پر رکھی اور پھر ٹٹول ٹٹول کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف سے را قائم ہوا تو وہ جلدی سے بولی۔ "بنسی...... بنسی کیا کر رہا ہے رے تو؟ جلدی سے آ جا حویلی میں۔ دیر نہ کرنا۔ ریشی کو کچھ ہو گیا ہے۔ جلدی آ جا تو۔" دوسری طرف سے آواز جو بھی آئی ہو وہ رجنی نے سنی۔ لیکن بہرحال اُس نے پوجا کو تلاش کر لیا تھا جو بچے کی لاش گود میں لئے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی اس آواز پر ہی چلتی ہوئی بوڑھی اُس کے پاس پہنچ گئی۔

"پوجا، کیا ہو گیا؟ کیسی طبیعت ہے اس کی؟ بتا تو دے۔"

"طبیعت پوچھ رہی ہو ڈائن کہیں کی...... تم...... تم کھا گئیں میرے بچے کو۔ میرے بچے کو کھا گئیں تم۔ بھگوان تمہارا ناس کرے۔ اپنی عمر دیکھ اور اپنی حرکتیں دیکھو۔ اس ویران حویلی میں جہاں کتے لوٹتے ہیں، جہاں اُلو اور چمگادڑیں لوٹتی ہیں، تم نے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ صرف اپنے اُس مرے ہوئے کی یاد میں تم یہاں مر رہی تھیں جس کا اب اس سنسار میں کوئی وجود نہیں ہے جس کی راکھ بھی ہوا میں اُڑ کر ہو چکی ہو گی۔ اس کے لئے تم نے ہمیں مروا دیا۔ ناس جائے بنسی کا بھی۔ کمینے کتے نے ماں کے

میں آ کر مجھ سے میرا بچہ چھین لیا...... ہائے رام، میں کیا کروں؟" پوجا زار و قطار پھر رونے لگی۔

باتیں آہستہ آہستہ رجنی کی سمجھ میں آ رہی تھیں اور وہ یہ اندازہ لگا رہی تھی کہ سلسلہ کیا ہے۔ ابھی تک بنسی نامی شخص نہیں آیا تھا اور پوجا روتے روتے بوڑھی کو برا بھلا کہنے لگی تھی۔ "میرے ماتا پتا بھی چولہے میں جائیں۔ یہ نہیں سوچا کہ بیٹی کو کہاں جھونک رہے ہیں۔ پاگلوں کی بستی میں بھیج دیا مجھے۔ ارے کیا رکھا ہے اس ویران حویلی میں؟ بس تین انسان۔ نوکر بھی یہاں نہیں ٹکتے۔ ہائے رام، کیا لکھ دیا تھا تو نے میری تقدیر میں؟ سب کچھ برداشت کر لیا میں نے۔ لیکن میرا ریشی......"

"پوجا، ریشی کیسا ہے؟"

"جیسا بھی ہے اب اس سنسار میں نہیں ہے۔ سمجھیں تم؟ مرجاؤ اگر بہت زیادہ محبت کرتی ہو اپنے پوتے سے۔ مرجاؤ تم بھی۔ تاکہ ہماری جان تو چھوٹے اس حویلی سے جس میں تمہارے پتی کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ ارے ساری یادیں تم سمیت بھاڑ چولہے میں جائیں۔ وہ مر کر نرکھ میں چلا گیا اور یادیں چھوڑ گیا تمہارے لئے اور لپیٹ میں آئے ہیں ہم۔ میں تو ایک دن کے لئے بھی یہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ پر وہ ذلیل میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا، ماتا جی کے جیون میں اس حویلی کو چھوڑنا ممکن نہیں ہے میرے لئے۔ تمہیں یہیں رہنا ہو گا پوجا۔ تمہیں یہیں رہنا ہو گا۔ ماتا جی کو بھگوان جیتا رکھے جب تک وہ جیتی ہیں میں یہ حویلی نہیں چھوڑ سکتا۔ اور میرے ماتا پتا نے کہا کہ بیٹی، سسرال بھیج دیا تمہیں۔ وہاں سے نکلنا تو مر کر ہی نکلنا۔ میں تو مر گئی اب۔ تم جیو۔ ہائے ریشی...... ہائے میرا ریشی۔"

پھر ساری کہانی رجنی کے علم میں آ گئی۔ یہ بوڑھی عورت پوجا کی ساس تھی۔ اُس کا پتی مر چکا تھا۔ یہ حویلی اُن کی آبائی حویلی تھی۔ بنسی بوڑھی عورت کا اکیلا بیٹا تھا۔ کپڑے کا کاروبار کرتا تھا اور بہت بڑا کاروبار تھا۔ اُس کی ایک بہت بڑی دُکان تھی جو بنسی سٹور کہلاتی تھی۔ یہاں وہ صرف اس لئے رہ رہا تھا کہ اُس کا باپ اس حویلی میں مرا تھا۔ بوڑھی عورت اُس سے بہت زیادہ پیار کرتی تھی اور اس حویلی کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ پوجا کے ماتا پتا کسی دوسرے شہر میں رہتے تھے اور اُنہوں نے پوجا کی شادی بنسی کے ساتھ کی تھی۔ بنسی اچھا خاصا صاحب حیثیت آدمی تھا۔ حویلی میں نوکر رکھے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ حویلی آسیب زدہ مشہور تھی۔ چنانچہ کتنی ہی بار ملازموں کو یہاں بلایا گیا لیکن اُن میں سے کوئی بھی حویلی میں نہیں ٹکا اور ڈر کر بھاگ گیا۔ رشتے دار بھی یہاں نہیں آتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دو بار پوجا کے گھر والے بھی یہاں آئے اور پوجا نے اُن سے شکایتیں کیں۔ بنسی سے بھی بات کی گئی لیکن بنسی نے یہی کہا کہ وہ اپنی ماتا جی کے جیون میں یہ حویلی نہیں چھوڑ سکتا۔ بہرحال یہ تھی ساری کہانی اور رجنی کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی۔ ویسے جہاں تک آسیب اور بھوت پریت کا تعلق تھا اُس نے یہاں نہ تو کوئی آسیب دیکھا تھا، نہ بھوت، نہ پریت۔ بہرحال تھوڑی دیر کے بعد بنسی آ گیا۔ ایک بڑی سی کار میں بیٹھ کر آیا تھا۔ دو آدمی اُس کے ساتھ تھے جن میں سے ایک شاید ڈاکٹر تھا۔ وہ اندر پہنچا۔ رجنی وہیں سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پوجا اُسے دیکھتے ہی دھاڑیں مارنے لگی اور بنسی اُس کے قریب پہنچ گیا۔

"مار دیا اس بوڑھی ناگن نے میرے بیٹے کو...... مار دیا۔ جاؤ اس کے چرن چاٹو۔ میرا بیٹا تو مار دیا تم

نے۔تم ماں بیٹے نے مل کر مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔بھگوان، میں کیا کروں؟''
ادھر بنسی جو رمیشی کے پاس بیٹھ چکا تھا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔وہ پوجا کے
پہنچ کر بولا۔''کیا ہوا اسے؟''
''تمہاری ماں کھا گئی اس کو۔دیکھو، تمہاری ماں کھا گئی اسے۔''
''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے پوجا... میں پوچھتا ہوں اسے ہوا کیا؟ ڈاکٹر صاحب، آپ
اسے۔''
''اب کیا دیکھوں؟ آپ اسے خود بھی غور سے دیکھ رہے ہیں۔لیکن یہ ہوا کیسے ہے؟''
''مجھے کیا معلوم؟ میں تو خود آپ کو لے کر ابھی آیا ہوں۔پوجا، کیا ہوا تھا؟ بتاؤ تو سہی۔''
رو رو کر پوجا نے سارا واقعہ بتایا کہ کس طرح رمیشی تتلیوں کے پیچھے دوڑتا یہاں سے چلا گیا
نجانے کب پرانے کھنڈر میں پہنچا۔اور جب بہت دیر تک وہ واپس نہ آیا تو پوجا اُس کی تلاش میں
یہاں تک کہ کھنڈر میں اُسے اس شکل میں اس کی لاش نظر آئی۔بوڑھی عورت کو بھی پتہ چل گیا کہ
گیا۔وہ دھاڑیں مار مار کر چیخنے لگی۔لیکن پوجا خونخوار ہو رہی تھی۔
''اسے میرے سامنے سے ہٹا دو۔ورنہ میں اسے جان سے مار دوں گی۔''
''کیا بکواس کر رہی ہو پوجا؟ ہوش میں آؤ۔''
''ہوش میں تھی۔اب ہوش میں نہیں ہوں اور نہ ہوش میں رہوں گی۔نکل جاؤں گی یہاں
جا رہی ہوں میں...... جا رہی ہوں اپنے رمیشی کو لے کر۔تم لوگ...... تم لوگ مجھے بھی کھا جاؤ گے۔
پر دیوانگی سوار ہو گئی۔اُس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔
بہر حال اس کے بعد کے مناظر بڑے دلدوز اور سنسنی خیز تھے۔رجنی کو تو ساری صورت حال
تھی۔بچے کے کریا کرم کا چکر چلا۔دوسرے شہر سے پوجا کے ماں باپ بھی آ گئے۔چاروں لڑکیوں
صورت حال کا پتہ مل چکا تھا۔اُن کے انداز میں دلچسپی تھی۔وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ اس کے بعد
ہے۔لیکن رجنی اُن لوگوں کے غم سے آشنا تھی اور خود بھی غمزدہ تھی۔بہر حال وہ یہ بات ظاہر نہیں
تھی۔اُس نے اپنی کسی بھی بہن سے اپنی اندر کی کیفیت کا ذکر نہیں کیا تھا۔
طے یہ ہوا کہ پوجا اپنے ماتا پتا کے ساتھ واپس چلی جائے۔بوڑھی عورت بستر سے جا لگی تھی
تو اپنے ماتا پتا کے ساتھ چلی گئی۔بوڑھی عورت کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور حویلی کو تالا لگ گیا
اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اب کبھی اس حویلی میں واپس نہیں آئیں گے۔
روپا نے ہنستے ہوئے کہا۔''اور اگر وہ واپس بھی آئے تو صحیح معنوں میں یہ حویلی اب آسیب زدہ
گئی۔اور آسیب انہیں ایسے ایسے کارنامے دکھائیں گے کہ اُنہیں مزہ آ جائے۔''
بہر حال چاروں لڑکیاں بہت خوش تھی۔حویلی کے اندر عیش و عشرت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔
رما نے کہا۔''ضرورت کی تمام چیزوں کی فہرست بنا لیں۔ویسے ہمیں کار اور ملازم کی ضرورت
پیش آئے گی۔اشیش بھگونت نے ہمیں ہماری مرضی کا جیون گزارنے کی اجازت دے دی ہے۔

جیون معمولی انداز میں کیوں گزارا جائے؟''
''میں تو صرف ایک بات سوچتی ہوں۔'' راگنی ہنسنے لگی۔
''کیا......؟''
''یہ کہ ہمارے پتا جی بیچارے ہمارے لئے بہت کچھ تھے۔لیکن اپنے جیون میں تو وہ ہمیں کوئی ایسی
حویلی نہ دے سکے جیسی اب ہمیں ملی ہے۔اگر وہ جیتے رہتے تو ہم وہیں پڑے سڑتے رہتے۔وہ ہمارے
لئے رشتے تلاش کرتے رہتے اور پھر وہی پرانی بات۔ہم میں سے ایک ایک اُن کے گھر سے نکل جاتی
اور وہ ہمیں جہنم میں جھونک دیتے۔شوہروں کی وفاداری کرنی پڑتی، ساسوں کے نخرے اُٹھانے پڑتے اور
روتے پیٹتے جیتے رہتے۔پر پتا جی کی موت کے بعد یہ سب کچھ ہمیں حاصل ہوا ہے یہ تو واقعی بہت اچھا
ہے۔اور اشیش بھگونت ہماری سرپرستی اسی طرح کرتے رہے تو زندگی کے تمام عیش ہمیں حاصل ہو
جائیں گے۔''
''اچھا، تو ایک بات بتا۔'' رادھا نے پوچھا۔
''ہاں بولو۔'' راگنی نے کہا۔
''کیا ہم ایسے ہی سارا جیون کنواری بیٹھی رہیں گی؟''
''ابھی ذرا صبر سے بیٹھی رہو۔تھوڑا سا سمے بیت جانے دو، سوچیں گے اس بارے میں بھی۔ہاں،
یہاں حویلی میں ہماری خدمت گاری کے لئے کچھ نوکروں وغیرہ کی موجودگی ضروری ہے۔جہاں تک اس
حویلی کے آسیبوں کا تعلق ہے تو پہلے ہم اُنہیں تلاش کر لیتے ہیں۔اگر یہاں کچھ ہے بھی تو اشیش بھگونت
کی مدد سے ہم ان کا خاتمہ کر دیں گے۔دیکھتے ہیں کہ کون آسیب ہمارے سامنے ٹکتا ہے۔''
''ہاں، یہ تو ہے۔یہ بات اشیش بھگونت سے ہی معلوم کرنی پڑے گی کہ آسیب مارنے کا کیا طریقہ
ہوتا ہے؟'' چاروں لڑکیاں ہنسنے لگی تھیں۔پھر رما نے رجنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''تجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ اُداس اُداس سی کیوں رہتی ہے؟ کہیں کسی سے پریم روگ تو نہیں لگا لیا؟''
''چلو، بے کار باتیں مت کرو تم لوگ۔'' رجنی نے کہا اور وہ سب کی سب بے غیرتی سے ہنسنے لگیں۔
اب وہ شیطان کی اولادیں تھیں۔شیطان نے اُن سے اُن کی عقل و غیرت چھین لی تھی۔دنیا کی کسی بات
پر انہیں کوئی دُکھ نہیں ہوتا تھا اور وہ خوشی کا جیون گزار رہی تھیں۔آگے کے منصوبے بنا رہی تھیں۔
کوئی دس دن کے بعد بنسی لال کچھ لوگوں کے ساتھ حویلی میں آیا۔یہ لوگ حویلی دیکھنے آئے تھے۔
بڑے بڑے موٹے سیٹھ تھے اور بڑی بڑی شاندار گاڑیوں میں آئے تھے۔لڑکیاں فوراً ہی اپنا بہروپ
بدل کر پرندوں کی شکل اختیار کر گئیں۔وہ اُن کی باتیں سننا چاہتی تھیں۔حویلی میں پرندوں کے آنے
جانے کے بہت سے راستے تھے۔بڑے بڑے روشن دان جو کھلے ہوئے تھے اور اُنہیں اندر آنے جانے
میں کوئی دقت نہیں تھی۔آنے والے شاید اس حویلی کو خریدنا چاہتے تھے۔
''بنسی لال جی، حویلی تو بہت شاندار ہے۔اور آپ نے اس میں بہت مال جمع کر رکھا ہے۔یہ سب
کا سب آپ یونہی چھوڑ دیجئے۔بتائیے کیا لیں گے حویلی کا؟ ویسے واقعی لگتا ہے بھوت محل ہی ہے۔''

"کیا باتیں کر رہے ہو؟ ابھی اس کا سودا مت کرو۔ بنسی لال جی، ہمیں کچھ روز یہاں رہنے کی اجازت دیں۔ یہاں کا ماحول دیکھیں گے، اس کے بعد فیصلہ کریں گے۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔ کیوں بنسی لال جی، کیا کہتے ہیں آپ؟"

"دیکھو، میں ایک لمبے عرصے سے اس حویلی میں رہ رہا ہوں۔ مجھے یہاں کبھی نہ بھوت نظر آیا اور نہ پریت۔ بس یوں سمجھ لو میری زندگی میں ایک حادثہ ہوا ہے۔ اس حادثے نے میرا گھر برباد کر دیا۔ پتنی ناراض ہو کر میکے چلی گئی۔ ماں نے ہسپتال میں دم توڑ دیا۔ اب میں اُسی شہر جا رہا ہوں جہاں میری پتنی رہتی ہے۔ جیون میں اور کچھ نہیں رہ گیا میرے لئے۔ آپ لوگ دیکھ لیجئے۔"

"ہم نے حویلی خریدنے سے انکار تو نہیں کیا ہے بنسی لال جی۔ لیکن پھر بھی جو کچھ ہے وہ تو ہی۔ دیکھنا ہے کہ حویلی کی کیا کیفیت ہے؟ ہم ایسا کرتے ہیں ایک مہینہ اس حویلی میں رہ کر دیکھتے ہیں۔ آپ کو اگر رقم کی ضرورت ہے تو ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ باقی اگر ایسی کوئی بات نہیں تو آپ چنتا نہ کریں۔"

"بدری ناتھ جی، آپ بہت ہی بری باتیں کر رہے ہیں۔ کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے؟ بہت کچھ ہے میرے پاس۔ دولت کی کمی نہیں ہے۔ بس میں اس حویلی سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ پتنی اس بات پر میرے ساتھ رہے گی کہ حویلی بیچ کر رقم مجھے اُس کے حوالے کرنا ہوگی۔"

"پھر بھی آپ دیکھ لیجئے۔ آپ ہمیں ایک مہینے کی مہلت ضرور دیں گے۔"

"آپ اچھے آدمی ہیں اور میں آپ کو مانتا ہوں بدری ناتھ جی۔ اگر آپ اس میں خوش ہیں تو مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے۔ آپ یہاں رہ سکتے ہیں۔" آخر کار بنسی لال نے کہا۔ اور اس کے بعد معاملہ طے ہو گیا۔ بنسی لال، بدری ناتھ کو اور اُس کے ساتھ آنے والے کو حویلی دکھانے لگا۔ اُس نے کہا۔

"آپ اگر اپنی فیملی کے ساتھ یہاں آنا چاہتے ہیں تو آ جائیے۔ ایک مہینے کے بعد آپ سے رابطہ ہوگا۔"

"اور کوئی ہے یہاں پر؟"

"نہیں...... کوئی نہیں ہے۔ یہ چابی آپ رکھئے اور جس طرح بھی آپ چاہیں آ جائیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"آیئے چلتے ہیں۔" پھر وہ لوگ چلے گئے اور جب اُن کی گاڑیاں حویلی سے دُور چلی گئیں تو اینڈ کمپنی پھر سے انسانی رُوپ میں آ گئی۔ روپا کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے۔ "یہ موئے حویلی خرید رہے ہیں۔ یہی بات ہے نا؟ اس خوبصورت حویلی میں بھلا کوئی اور رہ سکتا ہے؟ یہ ہماری ملکیت ہے۔ ہم رہیں گے اس میں۔"

"بالکل روپا دیوی، بھلا کسی کی مجال ہے جو اس میں آ جائے؟"

"یہ لوگ یہاں رہنے کے لئے آ رہے ہیں۔ ان کی ایسی خاطر مدارت کرنی ہے کہ زندگی بھر یاد رکھیں۔"

"ٹھیک ہے......" سب نے کہا اور پھر وہی آپس میں ہنسی مذاق اور قہقہے شروع ہو گئے۔

ایمان علی طویل فاصلہ طے کر کے ناگ چندر کے اُس جادو بھون میں پہنچ گئے جو اُس نے شہر سے دُور بنا رکھا تھا۔ حالانکہ یہ جگہ مولوی ایمان علی کے لئے نہایت قابل نفرت تھی لیکن بس گزرے ہوئے لمحات کا احساس تھا۔ اُنہوں نے دُور ہی سے ناگ چندر کو دیکھ لیا جو اپنے گھر سے تھوڑے فاصلے پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ ناگ چندر نے بھی کسی کی آمد کو محسوس کیا اور نگاہیں اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ مولوی ایمان علی کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ لیکن پھر اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ جو منصوبہ اُس نے اپنے ذہن میں بنایا تھا اسے آگے بڑھانے کے لئے ایمان علی سے کوئی ایسی بات نہیں کرنی تھی جس سے وہ ہوشیار ہو جائے۔ اور یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ مولوی ایمان علی خود بھی صاحب علم ہے اور ہر جادو منتر کا توڑ کرنا جانتا ہے۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا اور اب دشمنی کی ایک ایسی دیوار کھڑی ہو گئی تھی جس کے گرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بات بیچارے مولوی ایمان علی کو بالکل معلوم نہیں تھی۔ ناگ چندر نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر مولوی صاحب کے سامنے آ گیا۔

"ارے، ارے ارے...... پوتر لوگوں کو ناپاک جگہوں پر نہیں آنا چاہئے۔ کیسے تکلیف کی آپ نے مولوی جی؟"

"طنز کر رہا ہے...... لیکن کتنا سچ بول رہا ہے تو۔ تیرا بچپن تھا جب تو ایک اچھا اور سچا انسان تھا۔ ارے پاگل، روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے دھرم نہیں بیچ دینا چاہئے۔"

"یار مولوی ایمان علی، تو نے زندگی بھر یہی باتیں کی ہیں۔ اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ عقل مند کیوں سمجھتا ہے تو؟ کس نے کہا ہے تجھ سے کہ تو مجھ سے زیادہ عقل مند ہے؟ جھک مار رہا ہے...... بیوی اور بیٹی کو کیا دیا تو نے؟ روٹی کے کچھ ٹکڑے ناں؟ سنسار اس سے کہیں آگے ہے۔"

"یہ اُونچے اُونچے محل، اُونچی اُونچی کوٹھیاں، یہ عظیم الشان حویلیاں، چمچماتی کاریں، ہوا میں اُڑتے ہوئے جہاز ان سب سے تیرا یا میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ سب انسانوں ہی کے ہیں ناں۔ میرے اور تیرے جیسے انسانوں ہی کے۔ ایک طرف ہمارے بیوی بچے ہیں اور دوسری طرف اُن لوگوں کے۔ ذرا فرق دیکھو مولوی ایمان علی، تمہارا دین دھرم، گیان دھیان کیا تمہیں تمہاری مرضی کے مطابق زندگی نہیں دے سکتا؟ اتنے مجبور اور لاچار ہو تم کہ اپنے لئے نہ سہی اُن کے لئے جنہیں تم اپنا کہتے ہو کچھ کر کے دیکھو۔ ارے میرے جادو کا توڑ تو کر لیا تم نے، اپنے لئے بھی کچھ کیا ہے؟ جاؤ، ذرا ایک حویلی بنا کر دکھا دو۔ مان لوں گا کہ تمہارا گیان دھیان سچا ہے۔"

"اور تو کیا کر رہا ہے باؤلے؟" ایمان علی نے پوچھا۔

"تعمیر کر رہا ہوں اپنے آپ کو۔ تم جیسے لوگ آڑے آتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا راستہ روک لو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں چل پڑا ہوں ترقی کے راستوں پر۔ مگر بہت برا کر رہے ہو تم ایمان علی۔ بہت برا کر رہے ہو۔"

"بہت سے طعنے دے چکا ہے تو مجھے۔ دیکھ، بات دین دھرم کی ہوتی ہے۔ چل میں مان لیتا ہوں

کہ تو ہندو دھرم سے ہی تعلق رکھتا ہے اور تیرے ماتا پتا نے تجھے یہی دھرم دیا ہے۔ لیکن یہ دھرم بھی تو نہیں ہے۔ دنیا کا ہر مذہب نیکی اور سچائی کے راستے دکھاتا ہے۔ تو، تو ان راستوں سے بھی ہٹ گیا ہے۔ جہاں تک میرے دین دھرم کا تعلق ہے تو باولے کبھی اس کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھ۔ یہ مٹی اور گارے سے بنی ہوئی اُونچی اُونچی عمارتیں ہماری نگاہوں میں کچھ نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ دنیا میں ہمارے قدم صرف چند دن کے ہیں۔ اس کے بعد ایک ابدی زندگی ہے۔"

"تو یہ بتا کہ اگر کوئی تجھ سے کہے کہ سونے کا ایک بہت بڑا ڈھیر ہے جو تجھے کچھ عرصے کے بعد ملے گا اور یہ تھوڑا سا سونا ہے، اگر تو یہ چاہے تو ابھی لے لے۔ اور اگر بڑا ڈھیر لینا چاہتا ہے تو ذرا انتظار کر لے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ تھوڑا سا انتظار کر لینا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ سونا دیکھا اور لپک پڑے۔ ہمارا یہ مسئلہ ہے ناگ چندر، ہمیں کہا گیا ہے کہ دنیا کو دُکھ پہنچائے بغیر زندگی گزار لو اور سونے کا وہ بڑا ڈھیر پا لو۔ تو بتا، یہ چھوٹی چھوٹی حویلیاں ان بڑی حویلیوں کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہیں جو ہمیں ملیں گی۔"

"بڑی لمبی تقریر کر لی مولوی جی۔ بڑی لمبی تقریر کر لی۔ لیکن سب بے وقوفی کی باتیں ہیں۔ بے وقوفی کی باتیں۔"

"اپنا اپنا نظریہ، اپنا اپنا خیال ہے۔ چلو ٹھیک ہے میں تمہاری خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ بس یہ کہ مجھے تمہارے سلسلے میں فکر تھی۔ جو کام تم نے دھرم داس کے سلسلے میں کیا تھا میں نے اُسے واپس کر دیا تھا۔ تو ٹھیک تو ہے ناں؟ کوئی نقصان تو نہیں پہنچا تجھے؟"

"نہیں...... کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ سب خیریت ہوئی تھی۔ تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی۔"

"کیوں؟"

"یہی کہ تو، تو واقعی بڑا گیانی بن گیا ہے۔ یہ تو بہت بڑے بڑے لوگوں کا کام ہے کہ کسی کے چلائے ہوئے تیر اُنہی کو واپس لوٹا دیں۔ تو نے تو یہ کمال ہی کر دکھایا۔ اب تو بھی میری ایک بات کان کھول کر سن لے۔ میں لوگوں کے لئے کام کروں گا اور تو انہیں ناکام بنا۔"

"کیسی بات کر رہے ہو؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہیں نقصان پہنچانے کے لئے نہیں سوچا۔ بس یوں سمجھ لے کہ برائی ناپائیدار چیز ہے اور نیکی مضبوط ترین۔ بس اتنی ہی بات ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اپنا کام کرتے رہو۔ میرے پاس کیوں آئے تھے؟"

"بس تمہاری خیریت معلوم کرنے۔ یہ بتاؤ سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، کیوں نہیں؟ کیا تم ہمارے منتر کا توڑ کر کے سمجھ رہے تھے کہ ہم مر گئے ہوں گے؟"

"خدا کی قسم میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ تصور نہیں تھا۔ میں نے دھرم داس کے لئے زندگی مانگتے ہوئے تمہارے لئے بھی دُعائیں مانگی تھیں کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

ناگ چندر ہنسنے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔ "کالے جادو کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"لعنت ہے ان الفاظ پر۔ کالا، نیلا، پیلا جادو کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بس یہ ناپاک قوتوں کا کھیل ہے۔"

"بے وقوف ہو...... بے وقوف، اگر جانتے اس بارے میں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے تمہارے۔ میرے جو پتلے تم نے واپس کئے اُنہوں نے واپس آ کر وہ تباہی مچائی ہوتی کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جاتا۔ وہ تو میری کالی طاقتیں تھیں جنہوں نے مجھے اس تباہی سے روک لیا۔"

"تو تم خیریت سے ہونا؟ بس مجھے یہ بتا دو۔"

"ہاں، تم کیا سمجھتے ہو کیا تم نے میرا گھر تباہ کر دیا؟ برباد کر دیا تم نے مجھے؟ ارے سن بھاگ بھری، کہاں ہے ری تو؟ ادھر آ...... دھرم وتی، تو بھی آ جا۔ دیکھ، تیرے چاچا جی آئے ہیں جنہوں نے تم لوگوں کی موت کا پورا پورا بندوبست کر دیا تھا اور اب یہ دیکھنے آئے ہیں کہ تم زندہ ہو یا مر گئیں؟ ذرا آؤ اور ان کا منہ کالا کر دو۔" ناگ چندر اپنے دل کی آواز نہیں روک سکا۔ مولوی ایمان علی سکتے کے عالم میں کھڑے سامنے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد دونوں عورتیں آ گئیں اور ناگ چندر نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔ "بھاگ بھری، دھرم وتی، انہیں بتاؤ کہ ہمیں کیا نقصان پہنچا؟"

"ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ نقصان کیا ہونا ہے؟" دونوں کی منمناتی ہوئی آواز اُبھری۔

"اللہ کا شکر ہے آپ ٹھیک ہے بھابھی جی۔ بیٹی دھرم وتی، تم تو ٹھیک ہونا؟"

"ہم دونوں ٹھیک ہیں۔" دھرم وتی نے جواب دیا۔

"آؤ، میں تمہارے سر پر ہاتھ پھیر دُوں۔"

"نہیں چاچا جی، بس اتنا ہی ٹھیک ہے۔ میں کسی کے آگے سر نہیں جھکاتی۔" دھرم وتی نے کہا اور ایمان علی ہنسنے لگا۔

"اچھا اچھا، اب اتنی لمبی ہو گئی ہے تو کہ ہمارے سامنے سر نہیں جھکائے گی؟ کل تک ہماری اُنگلی پکڑ کر کھیتوں پر جایا کرتی تھی۔ چلو ٹھیک ہے۔ بس یہ معلوم کرنے کے لئے آیا تھا کہ تم لوگ خیریت سے ہو نا۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔"

"اطمینان ہو گیا ہے نہیں مولوی ایمان علی۔ اتنے اطمینان سے بھی مت بیٹھا کرو۔ وار کیا ہے تم نے مجھ پر۔ جواب کے لئے تیار رہنا، دوستی تو ختم ہو گئی۔ دشمنی شروع ہوئی ہے اب۔ کھیل ہو گا لمبا۔"

ایمان علی نے رُک کر ناگ چندر کو دیکھا، پھر سرد لہجے میں بولے۔ "دیکھو ناگ چندر، ایک برائی کرنے جا رہے تھے تم۔ دھرم داس نے مجھ سے مدد مانگی۔ میرا دین یہی کہتا ہے کہ جب کوئی تم سے مدد کا طلب گار ہو اور تم اُس کی مدد کر سکتے ہو تو اُس کی مدد سے گریز مت کرو۔ میں نے حکم الٰہی پر گردن جھکائی ہے۔ اب اگر تم برائی پر آمادہ ہو تو صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ میرے خلاف کچھ کرنے سے پہلے اپنی حفاظت کر لینا۔ مجھے اپنی بجائے تمہاری تکلیفوں کا خوف رہے گا۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟"

جواب میں ناگ چندر ہنسنے لگا تھا۔ مولوی ایمان علی وہاں سے چلا آیا۔ نجانے کیوں اُس کے ذہن میں ایک خلش سی باقی رہ گئی تھی۔ ناگ چندر اپنی شکست پر بہت زیادہ بپھرا ہوا تھا۔ بہت عرصے سے جانتے تھے وہ اُسے۔ شروع میں اُس کی طبیعت کچھ اور تھی۔ اب وہ برائیوں کا دیوتا بن چکا تھا اور برائیاں

اُس کے وجود میں شامل ہوگئی تھیں۔ حقیقت میں بات یہ تھی کہ اُس نے اپنا ذریعہ معاش ہی یہ جادو
لیا تھا۔ اگر بات منظر عام پر آئے گی اور پھیلے گی تو اس کی ساکھ متاثر ہوگی۔ اپنی روزی بچانے کے
جس کا تعین وہ کرچکا ہے اُسے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ پھر گھر واپس پہنچے تو نادرہ نے اُن سے ناگ
کی خیریت پوچھی۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔ لیکن جب دل کالا ہوجاتا ہے انسان کا تو وہ انسانیت سے بہت دُور چلا
ہے۔ خیر اُس کے گھر میں سب خیریت ہے۔'' مولوی ایمان علی اپنے گھر میں یہ ہدایت نہ کر گئے
لوگ ہوشیار رہنا۔ اس طرح بیوی اور بیٹی خوف کا شکار ہوجاتیں۔ وقت گزرتا رہا۔

ابتدائی کچھ ہفتے تو مولوی صاحب نے بہت محتاط ہوکر گزارے۔ لیکن اس کے بعد وہ سب بھول
اور اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ لیکن ناگ چندر نہیں بھول سکتا تھا۔ اُس کے دل کو لگی ہوئی تھی
بہت دن سے اُس نے ایک ایسی جگہ ڈیرا ڈال رکھا تھا جہاں ایک اُونچا اور گھنا درخت تھا۔ پیپل کے
درخت کے نیچے پوجا پاٹ ہوا کرتی تھی۔ لیکن ناگ چندر اس گھنے درخت کے ایک ایسے حصے میں
رہتا تھا جو دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ ہوتا تھا اور جہاں سے وہ مولوی ایمان علی کے گھر کے درواز
پر نظر رکھ سکتا تھا۔

اُسے مولوی ایمان علی کے تمام معمولات معلوم ہوگئے تھے کہ وہ کب گھر سے جاتے ہیں اور ا
آتے ہیں؟ ایمان علی کی بیٹی امینہ کئی بار گھر سے نکلتی تھی۔ اس وقت نادرہ اُس کے ساتھ ہوا کرتی تھ
البتہ یہ دن ناگ چندر کے لئے خوشی کا دن تھا جب اُس نے تنہا امینہ کو گھر سے نکلتے اور کھیتوں کی جا
جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ امینہ کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور فاصلے طے کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اور
امینہ سرسوں کے کھیت کے پاس پہنچ گئی تو ناگ چندر آگے بڑھ کر امینہ کے قریب پہنچا۔ امینہ نے اُس
قدموں کی آواز سنی تو ٹھٹھک کر رُک گئی۔ لیکن ناگ چندر کو دیکھ کر وہ مطمئن ہوگئی تھی۔

''سلام چاچا جی۔''

''کیا کر رہی ہے ری تو یہاں اکیلی؟''

''کچھ نہیں چاچا جی۔ دین دیال کو دیکھنے آئی تھی۔ امی نے کہا تھا، دین دیال چاچا جی سے سرسو
ساگ لے کر آؤ۔ ابا جی نے اُن سے بات کی تھی، وہ یہیں کہیں کھیتوں پر کام کر رہے ہوں گے۔''

''ارے ہاں، دین دیال تو کام سے گیا ہے۔ تو آ میرے ساتھ۔ سرسوں کا بہت سا ساگ میر
پاس رکھا ہے۔ اُس میں سے لے آنا تو۔ دین دیال کام سے گیا ہوا ہے، دو تین گھنٹے کے بعد واپس آ
گا۔ میں اُس سے اور ساگ لے لوں گا۔ آ جا بیٹی، میرے ساتھ آ جا۔''

''جی چاچا جی...... آپ کو تکلیف ہوگی۔''

''پاگل، اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟ ویسے تو بہت دن سے دھرم وتی سے بھی نہیں ملی۔ کتنا
یاد کر رہی تھی تجھے۔''

''میں آؤں گی چاچا کسی وقت۔''

''کسی وقت کی کیا بات؟ چل آ جا۔'' ناگ چندر نے کچھ اس طرح ضد کی کہ امینہ اُس کے ساتھ چل
پڑی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ناگ چندر کے گھر پہنچ گئی۔

''آ جا بیٹا...... آ جا۔'' ناگ چندر نے کہا اور امینہ کو اندر اُس بڑے کمرے میں لے گیا جو اُس کے
لئے مندر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی کمرے میں کالے علم کا سارا کھیل ہوتا تھا۔ یہاں بھاگ بھری اور دھرم
وتی ہاتھ جوڑے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کالی دیوی کا مجسمہ اُن کے سامنے تھا اور وہ اپنے جادو کی پوجا کر رہی
تھیں۔ بس اتنی ہی بات رہ گئی تھی اُن کے اندر۔ وہ تو بیر تھے جنہوں نے ان دونوں جسموں کو زندہ رکھا
ہوا تھا۔ ورنہ باقی اور کیا تھا؟ بہر حال، اُن دونوں کو دیکھ کر امینہ نے کہا۔

''ارے، یہ دونوں تو شاید پوجا کر رہی ہیں۔''

''پوجا نہیں کر رہیں امینہ، اپنے جیون کا خراج ادا کر رہی ہیں۔ یہ میری بیٹی ہے دھرم وتی۔ تیری سہیلی
ہے نا یہ؟''

''ہاں...... مگر اس وقت تو یہ پوجا کر رہی ہیں چاچا جی۔ آپ نے بلاوجہ انہیں بھی پریشان کیا۔''

''یہ پوجا نہیں کر رہیں۔ میں نے تجھ سے کہا ناں، بس یہ سمجھ لے کہ یہ اپنے جیون کا خراج ادا کر رہی
ہیں۔ مجبور ہوگئی ہیں بیچاریاں۔ بالکل مجبور کر دی گئی ہیں۔ کچھ باقی نہیں رہا ان کے جیون میں۔''

''جی میں سمجھی نہیں چاچا جی؟''

''آہ، کاش میں تجھے سمجھا سکتا۔ تیرے پتا جی نے سب کچھ چھین لیا ہم سے ہمارا۔ میری بیٹی اور
میری پتنی کا جیون بھی چھین لیا اُنہوں نے۔ یہ دوستی کا صلہ دیا ہے تیرے پتا جی نے مجھے۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں چاچا جی؟ میری سمجھ میں تو خدا کی قسم کچھ بھی نہیں آیا۔''

''بس وہی کہہ رہا ہوں جو ہوا ہے میرے ساتھ۔ یہی کیا ہے تیرے پتا نے۔ دھرم وتی اور بھاگ
بھری کی جان لے لی انہوں نے۔ یہ جیتی نہیں ہیں باولی، یہ زندہ نہیں ہیں۔ بس زندہ درگور ہیں یہ۔''

''چچا جی، میری سمجھ میں کچھ بھی تو نہیں آ رہا۔ کچھ تو بتائیے مجھے۔''

''بتاؤں گا تجھے...... بتاؤں گا۔ مار دیا ہے تیرے باپ نے ان دونوں کو۔ مار دیا ہے۔ آ میں تجھے
بتاؤں کیا ہوا ہے، آ۔''

''چچا جی......''

''ادھر آ...... لیٹ جا۔''

''مم...... مگر کیوں؟''

''میں کہتا ہوں لیٹ جا۔'' ناگ چندر کا لہجہ بدلنے لگا اور امینہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

''مم...... مجھے دیر ہو رہی ہے چاچا جی۔'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

''دیر تو مجھے بھی ہو رہی ہے...... مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔ جلدی کر جو میں کہہ رہا ہوں۔''

''مگر چاچا جی، میں...... چچا جی کیا کہہ رہے ہیں؟'' امینہ نے سامنے موجود بھاگ بھری سے کہا۔
اس دوران ناگ چندر، امینہ کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے امینہ کے لمبے اور سیاہ بال پکڑے، ایک زوردار

جھٹکا دے کر اُسے زمین پر لٹا دیا۔ امینہ کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔ ناگ چندر نے کہا۔

''خاموشی سے یہاں لیٹ جا۔ ورنہ گردن کاٹ کر باہر پھینک دُوں گا۔'' ناگ چندر نے ایک چاقو نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور امینہ کی آواز خوف سے بند ہو گئی۔ ناگ چندر نے اُسے زمین پر لٹا دیا۔ پھر اُس نے اُنہی کی طرف دیکھا۔ ''چل، تو بھی یہاں آ کر لیٹ جا۔ اسی جگہ۔'' چنانچہ دھرم وتی رُوپ میں ایک بیر اپنی جگہ سے اُٹھا اور امینہ کے برابر لیٹ گیا۔ ناگ چندر کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ''میں جانتا ہوں دھرم وتی...... میں جانتا ہوں میری بچی، میں تجھے جیون دے سکوں گا۔ موت تو تجھے میری ہی وجہ سے آئی ہے۔ پر جیون میں تجھے اپنی وجہ سے نہیں دے سکا کروں، مجبوری ہے۔ میرے من میں بدلے کی آگ لگی ہوئی ہے وہ اس طرح سرد ہو سکتی ہے کہ اِ لڑکی جو مولوی ایمان علی کی بیٹی ہے تیرے بدن میں زندہ رہے گی۔ میں تجھے تو زندہ نہیں رکھ سکا بچی، مگر تیرے شریر کو میں تیرے دشمن کی بیٹی کے جیون سے زندہ رکھوں گا۔ اور کیا کہہ سکتا ہوں میں ہی ہو سکتا ہے۔'' وہ اُن دونوں کے پیروں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند اور اس کے بعد ایک منتر شروع کر دیا۔

جوں جوں منتر آگے بڑھتا جا رہا تھا، امینہ کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ ناگ چندر کی آنکھ سے نکلتی ہوئی شعاعوں کو دیکھ رہی تھی جو اُس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ ایک نہ آگ آہستہ آہستہ سلگتی ہوئی، جو اُس کے پاؤں کے انگوٹھوں کو جلا رہی تھی اور یہ جلن بڑھتی ہی جا تھی۔ پھر یہ جلن اور بڑھ گئی...... اور بڑھ گئی۔ اُس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اُس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ تھوڑی دیر بعد اچانک ہی اُس کا ذہن سو گیا اور وہ دنیا سے بے خبر ہو گئی، لیکن صرف چند لمحوں کے لئے۔ اس کے بعد اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے ماحول کو بدلا ہوا دیکھا۔ رفتہ رفتہ اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ ناگ چندر اس وقت یہاں موجود نہیں تھا۔ نہ ہی اُس کی دھرم پتنی یہاں تھی۔ لیکن اُس کے برابر جو کچھ موجود تھا اسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو اپنے پاس لیٹے ہوئے دیکھا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو میں ہوں۔ یہ سب کیا قصہ ہے؟ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اُس نے پھٹی آنکھوں سے اپنے برابر لیٹے ہوئے جسم کو دیکھا جس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن یہ تو میں خود ہوں...... میں ہی ہوں۔ لیکن پھر میں کون ہوں؟ ایک عجیب سا سوال تھا جو دماغ کو چکرائے دے رہا تھا۔ امینہ پھٹی آنکھوں سے برابر لیٹی ہوئی امینہ کو دیکھتی رہی۔ اگر امینہ یہ ہے تو میں کون ہوں؟ پھر اُس نے برابر لیٹی ہوئی لڑکی کے شانے کو جھنجھوڑ کر اُسے جگایا تو امینہ نے آنکھیں کھول دیں اور...... اور اُسے دیکھنے لگی۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور مسکرانے لگی۔

''تت...... تم...... تم کون ہو؟''

''یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتی ہوں۔''

''میں تو امینہ ہوں۔''

''اور میں بھی امینہ ہوں۔'' دوسری لڑکی بولی۔

''یہاں تو دھرم وتی لیٹی ہوئی تھی۔''

''وہ تم ہو۔''

''کیا......؟''

''تم دھرم وتی ہو اور میں امینہ ہوں۔''

''پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہو تم؟ یہ سب کیا ہے...... میرے خدا، یہ سب آخر ہے کیا؟ مگر تو یہ بتا کہ تو کون ہے؟''

''میں؟ چلو ٹھیک ہے۔ میں دھرم وتی ہوں۔ اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟''

''میں امینہ ہوں۔ مگر تم میرے جسم میں کیوں ہو؟''

''نہیں، یہ تم، مم...... میرا...... میرا ہی جسم ہے۔''

''اُٹھ کر شیشہ دیکھو۔ سامنے سے دیکھو، کیا ہوا ہے۔ تم میرے بدن میں ہو اور میں تمہارے بدن میں۔''

''مگر یہ کیسے ہو گیا؟''

''یہ تو ہونا تھا...... ضروری تھا یہ۔'' امینہ کا دوسرا وجود کہنے لگا۔

''مگر کیسے؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔''

''ٹھہرو، میں یاد کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔'' امینہ کے دوسرے جسم نے کہا۔ امینہ حیرت سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا جسم دو حصوں میں کیسے منتقل ہو گیا؟ پھر کچھ دیر کے بعد اُس کے دوسرے وجود نے کہا۔

''سنو، حقیقت یہ ہے کہ تم امینہ ہو اور میں کون ہوں یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لیکن اس وقت میں تمہارے شریر میں ہوں اور تم دھرم وتی کے شریر میں۔ آئینہ دیکھو گی تو پتہ چل جائے گا تمہیں کہ تم اپنے اصل جسم میں نہیں ہو۔ تمہارا اصل جسم میرے پاس ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ تمہارے اور میرے پتا جی میں چل گئی ہے۔ میں اس وقت چندر جی کو اپنا پتا ہی کہوں گی۔ حالانکہ وہ میرے دیوتا ہیں۔ بس اس سے زیادہ تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔ دونوں میں جو جنگ چل رہی تھی، اس میں تمہارے پتا جی نے ناگ چندر مہاراج کی بیٹی اور اُن کی دھرم پتنی کو ہلاک کر دیا۔ وہ دونوں ماری گئیں اور ناگ چندر مہاراج ایک عجیب و غریب مشکل میں گرفتار ہو گئے۔ مجبوری کی حالت میں انہوں نے اپنے بیر اپنی بیٹی اور پتنی کا شریر قائم رکھنے کے لئے اُن کے جسم میں داخل کر دیئے، صرف تمہارے پتا جی سے انتقام لینے کے لئے۔ ایک دشمنی چل رہی تھی جس میں تیرے پتا نے ایک منتر اُلٹ دیا اور دھرم وتی اور بھاگ بھری مر گئیں۔ پتا جی اپنے منتر میں ناکام ہو گئے اور پھر انہوں نے ہمیں اُدھار کا جیون دیا۔ اپنے جادو منتروں سے انہوں نے ہمیں تھوڑے دنوں کے لئے زندہ کر دیا۔ ہمیں کچھ دن کے بعد پھر سے اپنے شریر کو چھوڑ کر مر جانا ہے۔ لیکن کیا مزے کی بات ہے۔ اب ہم نہیں مریں گے بلکہ تو مرے گی امینہ...... تو مرے گی۔ تیرے شریر میں، میں ہوں۔ اس لئے تیرا شریر مر جائے گا اور میرا شریر جیتا رہے گا۔ بے شک میں

بھی کچھ دنوں کے بعد مر جاؤں گی اور تیرا شریر بھی مر جائے گا۔ مگر میرا شریر زندہ رہے گا اور تو
شریر میں قید رہے گی۔ یہ ہے ناگ چندر کا انتقام۔"

"آہ...... میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ لیکن خدا کے لئے ایسا تو نہ
امینہ زار و قطار رو پڑی۔ اور اسی وقت ناگ چندر اندر آ گیا۔ اُس نے دونوں کو اُٹھتے ہوئے دیکھا
کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"دل ٹھنڈا ہو گیا...... جی ٹھنڈا ہو گیا۔ تو مولوی ایمان علی کی بیٹی ہے ناں؟ اب تو میری بیٹی کے
میں ہے۔ اور میری بیٹی جی رہی ہے۔ اگر تو اپنے ماتا پتا کا جیون چاہتی ہے، اگر یہ نہیں چاہتی
اُنہیں جلدی ہلاک کر دُوں تو جو میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کر خاموشی سے۔ تو اپنے آپ کو دھرم وتی
گی...... دھرم وتی سمجھے گی تو اپنے آپ کو۔ اگر تو نے اس کے خلاف کیا تو سمجھ لے مجھ سے برا کوئی
ہو گا۔ میں آنکھ بند کر کے تیرے ماتا پتا کو ختم کر دُوں گا۔ کتے کی موت ماردُوں گا میں اُنہیں۔"

"نہیں...... خدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔ خدا کے لئے میری امی اور میرے ابو کو......"

"خدا نہیں، بھگوان کا نام لینا پڑے گا تجھے۔ جو کچھ میں کہوں گا وہ کرنا پڑے گا۔"

"مگر میری بات تو سنو چاچا جی۔ ایسا مت کرو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو جادو منتر
جانتی۔ میرا بدن مجھے واپس دے دو۔ تمہارا جھگڑا تو میرے ابو سے ہے۔ میرا تو کوئی معاملہ ہی نہیں
چاچا جی۔ مجھے معاف کر دو۔"

"اور میری پتنی اور بیٹی کا کیا معاملہ تھا تیرے پتا جی سے؟ اُس نے کیوں میری دنیا اُجاڑ دی
سنسار اُجاڑ دیا۔ بیٹی اور پتنی کھو چکا ہوں۔ کیسے معاف کر دُوں گا تجھے؟ میرا کلیجہ زخم بن چکا ہے۔
باپ کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہئے۔ کیا سمجھیں؟ اب تیار ہو جا، مجھے کیا کرنا ہے یہ میں تجھے بتاؤں
یہ کہہ کر ناگ چندر نے ہاتھ میں پکڑی رسّی سے امینہ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور خود اب
کے وجود میں آنسو بہانے لگی۔ جبکہ اُس کے بدن میں دھرم وتی کو جگا کو چندر نے اُس سے کہا۔

"دھرم وتی، اب تیرا یہ شریر مولوی ایمان علی کی بیٹی امینہ کا شریر ہے۔ ساگ کا یہ ڈھیر لے کر
جا۔ اب وہی کرنا ہے تجھے جو میں چاہتا ہوں۔ شرمندہ ہوں میری بچی میں تجھ سے۔ میں تیری حفا
نہیں کر سکا۔ میری وجہ سے تجھے یہ سنسار چھوڑنا پڑ گیا۔ پر اب تیرا یہ شریر میرے ساتھ رہے گا اور
شریر کو ایک لمبا جیون دے چکا ہوں میں۔ چل تو اُٹھ جا۔" یہ کہہ کر اُس نے امینہ کے جسم کو اُٹھایا، ساگ
ڈھیر اُس کے ہاتھوں میں تھمایا اور امینہ وہاں سے چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر میں داخل ہو
کسی کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ امینہ نہیں بلکہ امینہ کے جسم میں دھرم وتی ہے۔ اس وقت ا
علی وہاں موجود نہیں تھا۔ چنانچہ دھرم وتی نے امینہ کی آواز میں نادرہ سے پوچھا۔

"ماتا جی، یہ ساگ کہاں رکھوں؟"

نادرہ بری طرح اُچھل پڑی تھی۔ اُس نے حیرت سے اپنی دانست میں امینہ کو دیکھا اور بولی۔
کہا تو نے...... ماتا جی؟"

دھرم وتی کو ایک لمحے کے اندر اندر اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور بولی۔ "ماں جی...... ماں۔"

"کیا بک رہی ہے تو؟ تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ ماتا جی، ماں جی۔"

"اب اتنا کیوں برا مان رہی ہیں امی۔ کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو ماتا جی کہوں، کبھی دل چاہتا
ہے ماں جی کہوں۔ ماں کتنا پیارا لفظ ہوتا ہے۔"

"بے وقوف ہے تو۔ ماتا جی تو بالکل مت کہنا مجھے۔ یہ لفظ تو ہندوؤں کی زبان سے نکلتا ہے۔"

"مگر مجھے تو ماں پسند آتا ہے۔"

"اچھا چل، ساگ دے مجھے۔ اور اندر کمرے کی صفائی کر دے۔" نادرہ نے کہا اور دھرم وتی اندر
چلی گئی۔ نادرہ ایک عجیب سے احساس کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس سے پہلے کبھی امینہ نے
اُسے ماتا جی کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شرارتیں تو بچپن کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔
لیکن یہ شرارت بھی نہیں تھی۔ اُس نے فوراً ہی لڑکھڑا کر اُسے ماں جی کہا تھا۔

شام کے کھانے پر جب ایک ساتھ بیٹھنے کی باری آئی تو امینہ نے ایک دم کہا۔ "ماتا جی، نجانے کیوں
میرے پیٹ میں درد سا ہو رہا ہے۔ آج میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ پچھلے کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی
ہوں کہ میں جب بھی ماس کھاتی ہوں میرے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے۔"

"کیا......؟" ایمان علی حیرت سے بولے۔ دھرم وتی وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی تھی۔ "کیا کہہ رہی تھی
یہ؟ ماتا جی، ماتا جی اور گوشت نہیں کھاتی؟"

نادرہ کا ہاتھ بھی کھانے پر رُک گیا تھا۔ وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا...... کیا بات ہے؟" ایمان علی نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیا ہے؟ میرا تو کلیجہ حلق میں آ رہا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟ کچھ
سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کے سامنے اس نے مجھے دو بار ماتا جی کہا۔ اس کے علاوہ کچھ اور نئی باتیں اس
نے کی ہیں۔ زمین کو دھرتی، آسمان کو آکاش، پاک کو پوتر۔ پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا میری۔ اور اس وقت
گوشت کھانے سے انکار کر رہی ہے۔"

"ہوا کیا اسے؟ تم ذرا اس کے بارے میں مجھے تفصیل بتاؤ۔"

"کوئی تفصیل ہو تو بتاؤں۔ ٹھیک ٹھاک گئی تھی۔ ساگ لے کر آئی۔ اس کے بعد گھر کے کام کاج
کئے۔ مگر پتہ نہیں کیا قصہ ہے؟"

"ہوں...... حیرت ہو رہی ہے مجھے۔" پھر اس کے بعد سے ایمان علی نے خصوصی طور پر امینہ پر نگاہ
رکھنا شروع کر دی تھی۔ اور تھوڑے ہی دن میں اُنہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ امینہ کے اندر ایک بہت ہی
اہم تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ دل میں ایک شدید کھوج پیدا ہو گئی تھی۔

پھر اُس دن رات کا وقت تھا۔ معمول کے مطابق وہ تہجد پڑھنے کے لئے اُٹھے تھے کہ اُنہوں نے
امینہ کے کمرے میں روشنی دیکھی۔ امینہ اس وقت سو چکی ہوتی تھی اور رات کو نہیں اُٹھتی تھی۔ مولوی ایمان
علی یہ سوچ کر اُس کے کمرے کی طرف چل پڑے کہ کہیں اُسے کوئی تکلیف نہ ہو رہی ہو اور اُس نے ماں

باپ کی نیند خراب ہونے کے خوف سے اُنہیں نہیں جگایا ہو۔ آہستہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھ
اینہ کے کمرے کے دروازے پر جا پہنچے۔ اور پھر اُنہوں نے دروازے سے جھانک کر جو کچھ دیکھا
دیکھ کر اُن کے ہوش و حواس رخصت ہونے لگے...... اندر روشنی تھی اور اینہ پالتی مارے بیٹھی ہوئی
اُس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ سینے کے قریب جڑے ہوئے تھے۔ لیکن اُس کے سامنے جو
رکھی ہوئی تھی اس نے ایمان علی کے سینے کو لرزا دیا۔ یہ کالی دیوی کا مجسمہ تھا جس کو اُس نے ایک بلند
رکھا ہوا تھا۔ دیوی کے قدموں میں تین چراغ روشن تھے اور اینہ کی آواز اُبھر رہی تھی۔ "جے کالی ماتا
جے کالی ماتا...... میرا کام کر دے...... میرا جیون ختم ہو چکا ہے۔ پر میں جینا چاہتی ہوں...... تو میرا جیون
امر کر دے۔ چاہے میں اسی شریر میں کیوں نہ رہوں، میرا جیون امر کر دے کالی ماتا...... میرا جیون امر کر
دے۔" اور اس کے بعد وہ نجانے کون سے جنتر منتر پڑھنے لگی۔

مولوی ایمان علی کا سانس رُک گیا تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب انکشاف تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح
آنکھیں پھاڑے بیٹی کو دیکھ رہے تھے جو مسلسل وہی الفاظ دہرائے جا رہی تھی۔ لیکن کوئی بات ایمان علی
کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر وہ وہاں سے ہٹ گئے۔ لیکن بڑی پریشان کن کیفیت تھی۔ باقی رات
جاگ کر گزاری تھی اور دماغ سوزی کرتے رہے تھے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر اس کے بعد انہوں
نے اس سلسلے میں ایک فیصلہ کیا اور دوسرے دن وہ اپنی بیوی سے بولے۔ "میں آج رات ایک وظیفہ
پڑھ رہا ہوں۔ برکت کے لئے ہے۔ براہ کرم، مجھے پریشان نہ کرنا۔"

پھر اُنہوں نے وہ وظیفہ رات کے ساڑھے بارہ بجے پڑھنا شروع کیا۔ اس سے حاضرات ہوا کرتی
تھے اور انکشافات ہوا کرتے تھے۔ مولوی ایمان علی کی آنکھیں بند تھیں۔ رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر
رہی تھی۔ کتنی ہی بار اُن کے کانوں میں بھیانک آوازیں اُبھریں۔ پھر ایک دفعہ یوں لگا جیسے کوئی
پرندہ اُن کے کاندھے پر آ کر بیٹھ گیا ہو۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ اس وظیفے کے اثرات ہیں۔ انہوں
نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں اور اپنا وظیفہ مکمل کرتے رہے تھے۔ پھر اُس وقت صبح کی روشنی نمودار ہونے
میں تھوڑی دیر باقی رہ گئی تھی کہ اُنہیں اپنی بند آنکھوں میں ایک روشنی سی چمکتی محسوس ہوئی۔ یہ اشارہ تھا
اس بات کا کہ وظیفے کی تکمیل ہوگئی ہے اور اب موکل اُن کے سامنے ہے۔

"اے پُراسرار وجود...... مجھے بتا میری بیٹی کو کیا ہوا ہے؟ میں اُس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

تبھی ایک عجیب سی آواز ایمان علی کے کانوں میں اُبھری۔ "ایمان علی...... بہت بڑا دھوکا ہو چکا
تیرے ساتھ۔ بہت بڑا جادو کا عمل ہو چکا ہے۔ شیطان زادے نے تیری بیٹی کا جسم حاصل کر کے اس کی
رُوح نکال لی ہے اور اینہ کے اصل وجود کو اپنی بیٹی دھرم وتی کے وجود میں تبدیل کر دیا ہے۔ کیونکہ
دن جو تیرے اور اُس کے درمیان تبادلے ہوئے تھے اس میں جب وہ شیطانی پتلے واپس گئے تو اُنہوں
نے ناگ چندر کی بیوی اور بیٹی کو ہلاک کر دیا اور جب تم اُس کے پاس گئے تو اُس نے جن دو انسانی
جسموں کو تمہارے سامنے پیش کیا تھا وہ جسم تو اُس کی بیٹی اور بیوی کے تھے۔ لیکن اُن میں جادو کے
شیطان حلول کر گئے تھے اور اُنہوں نے ہی انہیں زندگی کا راستہ دکھایا تھا۔ پھر اس کے بعد ناگ چندر

نے ایک عرصے کی مہلت مانگ لی تھی اور وہ عرصہ اب پورا ہونے والا ہے۔ ناگ چندر تمہاری بیٹی کو
دھوکہ دے کر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اُس نے تمہاری بیٹی کا وجود اپنی بیٹی کو دے دیا ہے۔ اور جو لڑکی
تمہاری بیٹی اینہ کے وجود میں ہے وہ اصل میں دھرم وتی ہے اور دھرم وتی معیاد پوری ہونے کے بعد مر
جائے گی اور تمہاری بیٹی کا شریر مر جائے گا۔ جبکہ دھرم وتی کے جسم میں تمہاری بیٹی کی رُوح زندہ رہے
گی۔ یہ کھیل کھیلا ہے ناگ چندر نے اُس دن کا انتقام لینے کے لئے۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

"آہ، میرے خدا، یہ تو بڑا ظلم ہو گیا۔ کیا کروں میں؟ میری رہنمائی کی جائے۔ میری رہنمائی کی
جائے۔"

"ہاں...... اس کا ایک طریقہ ہے۔ کسی ایسی جگہ اپنی بیٹی کے جسم کو محفوظ کر دو جہاں اس کی حفاظت
ہو سکے۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس بدن کو کیسے محفوظ کرو گے۔ پھر تمہیں رہنمائی ملے گی کہ تمہیں
کیا کرنا چاہئے۔ خاص طور سے اپنی بیٹی اینہ کے وجود کو محفوظ کرنے کی کوشش کرنا جو اس وقت تمہارے
سامنے ہے۔ لیکن اس میں دھرم وتی کی رُوح ہے۔ تمہیں ضرور موقع ملے گا کہ تم اپنی بیٹی کو واپس لے
آؤ۔"

وظیفے کا عمل پورا ہو چکا تھا۔ لیکن ایمان علی کو شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا تھا کہ صورت حال
بڑی خوفناک ہو گئی ہے۔ کیا کرنا چاہئے، کس طرح سے اس مشکل سے چھٹکارا پائیں؟ اُن کی حالت
خراب ہو گئی۔ کچھ نہیں کیا جا رہا تھا اور بڑی عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

دوسری صبح اُنہوں نے اینہ کو دیکھا جو گھر کے کام کاج میں مصروف تھی۔ لیکن اب مولوی ایمان علی یہ
بات جانتے تھے کہ یہ ایک ہندو لڑکی ہے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے یہاں رہ رہی ہے۔ اس
انکشاف کے بعد بہت سے ایسے کام ہو سکتے تھے جو مولوی ایمان علی کر سکتے تھے۔ مثلاً وہ بیٹی سے کہتے کہ
وہ اُن کے سامنے نماز پڑھے۔ بات کھل کر سامنے آ جاتی۔ ساری باتیں اب اُن کے علم میں آ رہی تھیں۔
اینہ کی بدلی ہوئی زبان، ایسے الفاظ جو وہ پہلے ادا نہیں کرتی تھی، ماں کو ماتا جی وغیرہ کہنا، یہ سارے کام
وہ ایک لمحے کے اندر ختم کر سکتی تھی۔ لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ ناگ چندر کو اس بات کا علم ہو کہ وہ
حقیقت سمجھ گئے ہیں اور یہ بھی نہیں چاہتے تھے وہ کہ نادرہ کو اس بات کا پتہ چلے کہ جو لڑکی اینہ کے رُوپ
میں اُن کے سامنے موجود ہے اصل میں اینہ نہیں ہے۔ ایک عجیب و غریب مشکل تھی۔ ایک ایسی اندھیر
نگری تھی جو سمجھ میں نہ آنے والی تھی۔ مولوی ایمان علی جس برے عالم سے گزر رہے تھے، اُن کا دل ہی
جانتا تھا۔

❁

سیٹھ بدری ناتھ ایک بڑا کاروباری آدمی تھا۔ ہر قسم کے کاروبار کر لیا کرتا تھا۔ باپ نے ایک بڑا
ترکہ چھوڑا تھا جو تین بھائیوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ بدری ناتھ کو ایک بھرے پرے علاقے میں دو بلڈنگیں،
ایک سنیچ ہاؤس اور دوسرے چھوٹے موٹے کئی کاروبار ملے تھے۔ ہر وہ چیز جو کوڑیوں کے دام مل جائے،
خرید لیا کرتا تھا اور پھر سونے کے بھاؤ بیچتا تھا۔ خالص کاروباری ذہن کا آدمی تھا۔ جہاں خرچ کرنے کی

بات ہوتی تھی وہاں خرچ بھی کرتا تھا اور جہاں دو پیسے بچانے کی بات ہوتی تھی وہاں دو پیسے بچانے
لئے جان لڑا دیتا تھا۔ بنسی لال کی یہ حویلی بہت عرصے سے اُس کی نگاہ میں تھی۔ علاقہ بڑا اچھا تھا۔
حویلی کو توڑ کر اگر کوئی بلڈنگ بنوالی جاتی تو بہت بڑا منافع ہو سکتا تھا۔ یا پھر کسی ایسی کنسٹرکشن کمپنی کو
جگہ بیچ دی جاتی جو رہائشی منصوبے بناتی ہے تو اُسے دس بیس لاکھ کا فائدہ ہو جاتا۔ بہرحال جب
اس بات کا علم ہوا کہ بنسی لال یہ حویلی بیچنا چاہتا ہے تو وہ اپنے خاص مشیر کے ساتھ بنسی لال کے پا
پہنچ گیا اور بنسی لال نے اُسے یہ حویلی دکھائی۔ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں، حویلی بے حد شاندار تھ
بدری ناتھ کو حویلی بے حد پسند آئی تھی۔ لیکن بھوت پریت کی بات سن کر وہ ٹھٹھک گیا تھا اور بہرحال اُ
نے بنسی لعل سے بات کی تھی کہ ایک آدھ مہینے کے بعد وہ اس حویلی کا سودا کرے گا۔ لیکن جب وہا
سے واپس اپنی رہائش گاہ پہنچا تو اُس نے اپنے مشیر سے کہا۔

''جیون سنگھ، کیا کہتے ہو اس بارے میں؟''

''مہاراج، بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے آپ نے۔ پہلے اس حویلی میں چل کر ایک مہینے تک رہتے ہیں
دیکھیں گے کہ وہاں بھوت پریت ہیں یا نہیں؟ اور اگر ہیں تو کیا سلوک کرتے ہیں پتہ تو چلنا چاہئے۔''

''بالکل بے وقوف ہو۔ اگر بھوت پریتوں نے اپنا ہی کام کر دیا تو نہ رہے گا بانس نہ بجے
بانسری۔''

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں جانتا ہوں اس کے بارے میں اچھی طرح سے۔''

''بس تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ بنسی لال کو بیعانہ دے دیتے ہیں اور امر سنگھ کو بلا کر اس بات پر آما
کر لیتے ہیں۔ بلکہ پہلے ایسا کرو امر سنگھ سے بات کر لو۔''

''مہاراج، میں تو کہتا ہوں کہ پہلے بیعانہ دے دیجئے۔ امر سنگھ سے بات نہ بھی ہوئی تب بھی حو
چھوڑنے کی چیز نہیں ہے۔''

''تو پھر جاؤ۔ ایسا کرو دونوں کام تم ہی کرتے آؤ۔ بنسی لال کے پاس چلے جاؤ، ایک پچاس ہزا
روپے اُسے دے دو اور اُس سے کہو کہ حویلی تو ہماری ہو گئی ہے۔ لیکن ایک مہینے تک سب تجربہ کریں گے۔
پچاس ہزار روپے صرف تسلی کے لئے اپنے پاس رکھ لے۔ اور اگر حویلی کا سودا نہ ہوا تو یہ پیسے اُس
واپس مانگ لیں گے۔ کیا سمجھے؟''

''حویلی کا سودا تو کرنا ہی ہے مہاراج۔''

''ارے یہ تو ہم جانتے ہیں۔ اور اس طرح سے پتہ ہے کیا ہوا؟ کوئی اُلٹی سیدھی بات کر کے تھوڑ
سی رقم کم کرا لیں گے۔''

''ٹھیک ہے مہاراج...... جیسا آپ پسند کریں۔''

''تو پھر کیا کہتے ہو اس بارے میں؟''

''میں چلا جاتا ہوں۔''

بنسی لال کو پچاس ہزار روپے دے دیئے گئے۔ اور پھر جب جیون سنگھ واپس لوٹا تو امر سنگھ اُس ک

ساتھ تھا، بہترین شخصیت کا مالک، ایک تندرست و توانا آدمی تھا۔ اور اُس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ
کھیلتی رہتی تھی۔ بدری ناتھ کے پاس پہنچا تو مسکرا کر بولا۔

''کہئے لالہ جی...... کیسے یاد کیا امر سنگھ کو؟''

''رانا امر سنگھ، آؤ بیٹھو۔ تم سے ایک کام آپڑا ہے۔''

''رانا امر سنگھ تو ہمیشہ ہی کسی نہ کسی کام کے لئے تیار رہتا ہے بدری ناتھ جی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ آپ اپنی جیب سے تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں نکالتے۔''

''مر جاؤ گے کوڑیاں جمع کر کر کے۔ میں کہتا ہوں کہ تمہارے آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں۔ کیا کرو گے
اتنی رقم کا؟''

''اسی لئے تو رقم جمع کرتا ہوں بدری ناتھ جی کہ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اگر آگے پیچھے کوئی ہوتا تو
مجھے اتنی زیادہ چنتا بھی نہ ہوتی۔''

''اچھا بھائی، اچھا...... باتیں مت بناؤ، بیٹھو۔''

''بیٹھ گئے مہاراج۔ حکم کریں آپ۔''

''ایک دن تم بڑی ڈینگیں مار رہے تھے۔ کہہ رہے تھے بڑے بڑے بھوت پریت دیکھے ہیں تم نے۔
پھر جب میں نے تم سے کہا کہ تمہیں بھوت پریت دکھاؤں تو تم اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔''

''ہاں تو پھر کیا آپ نے پولیس میں رپورٹ کرا دی ہے؟'' رانا امر سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''رانا، ایک حویلی خریدی ہے میں نے۔ لیکن اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں بھوت پریت
رہتے ہیں۔ حویلی بہت اچھی ہے اور بڑے مہنگے داموں خریدی ہے میں نے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ
دن کے لئے وہاں جا کر رہو۔ یہ اندازہ لگاؤ کہ وہاں واقعی کوئی گڑبڑ ہے یا پھر یہ سب اُڑائی ہوئی باتیں
ہیں؟''

''ہوں...... سیٹھ جی، تصوراتی بھوت الگ چیز ہیں اور سچ مچ کے بھوت الگ۔ اگر آپ واقعی سچ مچ
کے بھوتوں سے میرا ٹکراؤ کرانا چاہتے ہیں تو یہ بتائیے کہ معاوضہ کیا دیں گے؟''

''اس کا معاوضہ بولو کیا مانگتے ہو؟''

''کتنے دن وہاں رہنا ہوگا اور بھوتوں سے کیا مذاکرات کرنا ہوں گے؟''

''مذاق مت اڑاؤ۔ مہینہ بھر ہے تمہارے پاس۔ مہینے بھر میں مجھے یہ معلوم کر کے بتا دو کہ وہاں واقعی
بھوت پریت رہتے ہیں یا نہیں؟''

''ایڈوانس؟'' رانا امر سنگھ نے کہا۔

''دس ہزار روپے دوں گا تمہیں۔ پانچ ہزار ایڈوانس رکھ لو'' بدری ناتھ نے کہا اور رانا امر سنگھ کا منہ
بگڑ گیا۔

''بدری ناتھ جی، کنجوس ہونا الگ بات ہے اور کمینہ ہونا الگ۔ ایک ایسی حویلی میں بھیج رہے ہو تم
مجھے جہاں تمہیں بھوت پریتوں کا خطرہ ہے۔ اور اگر واقعی اس حویلی میں بھوت ہوئے تو زندگی بھی جا سکتی

ہے میری۔اور دے رہے ہو اس کے دس ہزار روپے؟''

''ارے بھائی پندرہ لے لینا۔''

''بدری ناتھ جی...... پہلی بار تم مجھے کوئی کام دے رہے ہو۔ اس لئے تمہاری یہ بک بک میں
ٹال دی ہے۔ پچاس ہزار روپے لوں گا۔تیس ہزار ایڈوانس، بیس ہزار بعد میں۔''

''ارے بھائی، کیا کہہ رہے ہو؟''

''بس جو کہہ دیا وہ کہہ دیا۔ایک پیسے کی کمی نہیں ہوگی اس میں۔ یا تو تیس ہزار روپے ایڈوانس نکالو
پھر یہ سمجھ لو کہ یہ بات اب تک مذاق میں ہی ہو رہی تھی۔ چائے پلاؤ مجھے اور اس کے بعد میں چلا
ہوں۔''

''دیکھو رانا......''

''کچھ نہیں۔تیس ہزار روپے ایڈوانس یا چائے کی ایک پیالی۔''

''یار، تم تو عجیب آدمی ہو۔اچھا چلو کچھ کم کر لو۔''

''کمال کرتے ہو بدری ناتھ جی۔ خود جس طرح کے انسان ہو، دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہو۔ کہ
دیا نا میں نے کہ رقم ایڈوانس لوں گا اور ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔رُکوں یا جاؤں؟''

''ارے ارے، برا ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔بس ایسے ہی، چلو ٹھیک ہے۔تمہاری ہی بات ما
لی ہے۔لیکن اس کے بعد جو کچھ کرو گے، ایمانداری کے ساتھ کرو گے۔ہم تمہاری رپورٹ کا انتظار کریں
گے۔ یہ جیون سنگھ جی تمہیں ابھی لے چلتے ہیں اور حویلی دکھلاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... چلئے جیون سنگھ جی۔''

''مہاراج، آپ بھی آ جائیے۔ایک بار اور غور سے حویلی کا جائزہ لے لیں۔''

''آپ جائیے جیون سنگھ جی۔ لے جاؤ انہیں۔رانا ڈر رہے ہیں بیچارے۔''

''ارے اب ایسا بھی نہیں ہے۔چلیں جیون سنگھ جی۔'' جیون سنگھ نے برابر کا دروازہ کھول دیا اور
اُس کے برابر بیٹھ گئے۔رانا نے کار سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ جیون سنگھ نے حویلی کا پتہ بتا دیا تھا۔
دل میں ایک عجیب خوف، ایک عجیب سی دہشت جنم لے رہی تھی۔ بہر حال یہ سب کچھ اپنی جگہ تھا اور
خوف اپنی جگہ۔حویلی تک کا فاصلہ طے ہوا۔ چابی جیون سنگھ کے پاس تھی۔ بڑے سے پھاٹک پر لگا ہوا
موٹا سا تالا کھولا اور امر سنگھ نے حویلی کو دُور سے ہی دیکھتے ہوئے کہا۔

''واہ جیون جی واہ۔ یہ جو آپ کا بدری ناتھ ہے نا یہ تو واقعی بڑا کنجوس آدمی ہے۔ کیا شاندار حویلی
ہے۔سودا ہو گیا اس کا؟''

''ہاں رانا جی مہاراج، سودا ہو چکا ہے۔''

''ویران پڑی ہوئی ہے۔لیکن کتنی بڑی اور کتنی عالیشان جگہ ہے۔ اس سے بدری ناتھ جی کروڑوں
روپیہ کما سکتے ہیں۔ غلطی ہو گئی مجھ سے پچاس ہزار مانگے اُن سے۔ اس کے لئے تو زیادہ معاوضہ ہونا
چاہئے تھا۔ چلو خیر کام کر دیں بدری ناتھ جی کا، انعام بھی تو دیا جاتا ہے کسی بات پر۔'' رانا خود بخود ہی

اور وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ پھر رانا امر سنگھ، حویلی کا ایک ایک گوشہ دیکھتا پھرا تھا۔جیون سنگھ کی ہوا
کھسکی جا رہی تھی۔ نجانے کیوں اُنہیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ کچھ آنکھیں اُن دونوں کی نگرانی کر رہی
ہیں۔اُن کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔لیکن رانا امر ناتھ، حویلی کی شان و شوکت دیکھ کر
مرعوب ہو گیا تھا۔

بہت دیر کے بعد وہ دونوں باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر جب جیون سنگھ جی کار میں بیٹھے تو اُنہوں نے
رانا سے کہا۔''رانا امر سنگھ، حویلی میں بھوت پریت رہتے ہیں یا نہیں؟ یہ تو حویلی میں آنے کے بعد ہی
معلوم ہو گا۔لیکن بہر حال حویلی شاندار ہے۔''

''ہاں...... اس میں کوئی شک نہیں ہے۔'' اس کے بعد رانا امر سنگھ نے جیون سنگھ کو اُن کی رہائش گاہ
پر اُتار دیا اور خود اپنے کام سے چل پڑا۔ پچاس ہزار روپے کا کام ملا تھا۔ معمولی چیز نہیں ہوتے یہ پچاس
ہزار۔تیس ہزار ایڈوانس بھی مل گئے تھے۔ بہر حال مقررہ وقت پر وہ تمام تیاریاں کر کے حویلی چل پڑا۔
اب اُسے کیا پتہ تھا کہ حویلی کے اندر پانچ خوفناک رُوحیں اُس کے استقبال کے لئے تیار ہیں اور ایک
بہترین منصوبہ بندی کر چکی ہیں۔اس وقت بھی اُنہوں نے امر سنگھ کو دیکھ لیا تھا جب وہ حویلی کا جائزہ
لینے کے لئے دن کی روشنی میں یہاں آیا تھا۔

اس وقت شام کے دُھندلے سائے تیزی سے تاریکی میں تبدیل ہو رہے تھے۔ چاروں طرف ایک
عجیب خاموشی اور افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔ رانا امر سنگھ نے کار کی بتیاں بجھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ درختوں کی
ٹہنیوں سے پتے جھڑ چکے تھے اور دُور دُور تک ان پتوں کا فرش سا بچھا ہوا تھا۔ فضا میں رفتہ رفتہ خنکی
بڑھتی جا رہی تھی۔ امر سنگھ نے منہ کھول کر ہلکی سی جمائی لی۔ اُس کے ذہن میں نجانے کیا کیا تصورات آ
رہے تھے۔ اُسے حویلی کے اطراف بھی انتہائی ویران لگ رہے تھے۔ غالباً اس کی وجہ حویلی کے آسیب
زدہ ہونے کا تصور تھا۔ قرب و جوار میں آبادی تھی لیکن حویلی سے کافی فاصلے پر۔ بیچارہ بنسی لعل تو صرف
ایک طرح سے اپنی ماں کی خواہش نبھا رہا تھا۔ یہ اُس کی آبائی حویلی ہی تھی۔ اُس کا دادا، پردادا اور پھر
باپ اسی حویلی میں پیدا ہوئے تھے اور پھر مرے تھے۔ ماں کو حویلی سے بہت محبت تھی۔ جبکہ بیوی بیچاری
جب سے آئی تھی اس بات کا رونا روتی رہی تھی کہ اس حویلی میں اُسے ڈر لگتا ہے۔ درجنوں بار اُس کی
بیوی نے خوف کا اظہار کیا تھا لیکن بنسی لعل ماں کے آگے مجبور تھا۔ یہاں تک کہ یہ بیچارہ اپنے معصوم
بچے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ پھر اس کے بعد شیرازہ ہی منتشر ہو گیا۔ بحالت مجبوری اُسے حویلی چھوڑنی پڑی
تھی۔ بہر حال اب وہ اس حویلی میں نہیں رہتا تھا اور یہ حویلی بدری ناتھ نے ایک طرح سے خرید ہی لی
تھی۔ وقت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ رانا امر سنگھ کے ساتھ اس حویلی میں کیا واقعات پیش آتے ہیں؟ وہ آہستہ آہستہ
حویلی میں داخل ہو گیا اور ایک لمحے کے بعد اُس کے دل میں یہ خیال آیا کہ حویلی کتنی ویران اور سنسان
ہے۔ اس کے احاطے میں لگے ہوئے درخت ننگ دھڑنگ...... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ لوگ لباس
اُتار کر کھڑے ہوں۔ ہیبت ناک سناٹا...... پرندوں کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی ورنہ درختوں پر

پرندے بھی ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے خزاں رسیدہ درختوں پر پرندے بھی بسیرا نہ کرتے ہوں۔ بہرحال رات آہستہ آہستہ اپنا بھیانک منہ کھولے آگے بڑھتی آ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اُس کی نگاہ ایک طرف پڑی۔ حویلی کے ایک گوشے میں روشنی جل رہی تھی۔ یہ روشنی کہاں سے آئی؟ اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ دن میں تو یہ روشنی نظر نہیں آئی تھی۔ بہرحال وہ اس حویلی کے بارے میں سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا۔ پھر اُس نے سوچا کہ نجانے کتنے عرصے سے یہ حویلی خالی پڑی ہے۔ یہ اکتوبر کا مہینہ اور خزاں موسم ہے۔ اس موسم میں تو عام طور سے ویرانی اور سناٹے کا راج رہتا ہے۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے اندرونی جیب ٹٹولی، نرم چمڑے کے بنے ہوئے خوبصورت بٹوے سے اُس کی اُنگلیاں ٹکرائیں اور اُس کے جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُس نے بٹوا باہر نکالا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ وہی رقم تھا جو بدری ناتھ نے اُسے ادا کیا تھا۔ اُس نے نوٹوں کو احتیاط سے گن کر دوبارہ بٹوے میں رکھ لیا۔ دل ہی دل میں وہ حساب لگا رہا تھا کہ پچاس ہزار روپے بدری ناتھ سے ملیں گے۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے اُس کے بینک اکاؤنٹ میں موجود ہیں۔ اگر یہ پچاس ہزار روپے محفوظ رہیں تو اُس کے پاس دو لاکھ روپے ہو جائیں گے۔ ان دو لاکھ روپے سے وہ یقینی طور پر کوئی منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ بہرحال وہ پر اطمینان انداز میں آگے بڑھا اور ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں اس وقت خوشگوار تصورات آ رہے تھے اور یہ جان بوجھ کر نہیں کیا تھا اُس نے۔ بس خیالات کی رو بھٹک گئی تھی۔ ورنہ اگر وہ حویلی کے بارے میں سوچتا تو ممکن ہے کہ اُس کے ذہن پر خوف کی فضا پیدا ہو جاتی۔ اُس نے سوچا کہ اب اُسے شادی کر ہی لینی چاہئے۔ حالانکہ وہ عمر کے اس دور سے گزر رہا تھا جہاں جوانی رخصت ہونے لگتی ہے اور ادھیڑ عمر شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اُس نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ اگر جیب میں رقم ہو تو عمر کوئی نہیں دیکھتا اور حسین اور تعلیم یافتہ عورت آسانی سے مل جاتی ہے۔

یہ تمام باتیں سوچتا ہوا وہ ایک خوبصورت کمرے میں ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ دفعتہً ہی اُس نے چونک کر سوچا کہ یہاں روشنی کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ دن میں جب وہ یہاں آیا تھا تو جیون سنگھ نے اُسے بتایا تھا کہ یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ روشنی کے بارے میں پہلے تو اُس نے یہی سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے یہاں ضرورت کی بناء پر کوئی روشنی مسلسل جلائی رکھی گئی ہو۔ لیکن اس وقت وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہاں کوئی ہے یا نہیں؟ پتہ نہیں اُس کی کون سی حِس اُسے یہ احساس دلا رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی یہاں موجود ہے۔ بہرحال، یہ احساس کتنا ہی پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جاتی اُس پر مسلط ہو رہا تھا کہ یہاں اس عمارت میں اُسے یہ پتہ لگانا ہے کہ اس میں آسیب وغیرہ ہے یا نہیں؟ عمارت کی ویرانی تو اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ کیفیت خطرناک ہے۔ لیکن بہرحال وہ ایک دلیر آدمی تھا اور اُس نے یہ چیلنج بلاوجہ نہیں کر لیا تھا۔ زندگی میں خوف، دہشت نام کی کسی چیز سے اُس کا کبھی گزر نہیں ہوا تھا۔ لیکن بہرحال بھی انسان تو انسان ہی ہوتا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کمرے سے باہر نکل آیا اور پھر اُس کمرے میں پہنچا جہاں روشنی جل رہی تھی۔ کمرہ خاصا وسیع اور صاف ستھرا تھا۔ اُس میں ایک ڈائننگ ٹیبل اور اس کے گرد کرسیاں پڑی

تھیں۔ لیکن وہاں کوئی تھا نہیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر بہت ہی خوبصورت قسم کے برتن بھی سجے ہوئے تھے اور کچھ چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈائننگ ٹیبل کے قریب پہنچ گیا۔ ہر چیز صاف ستھری اور عمدہ تھی۔ فرنیچر بھی خاصا بہترین نظر آتا تھا۔ بیچارہ بنسی لعل ہر چیز اُسی جگہ چھوڑ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور میز کے گرد پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اگر اس وقت یہاں کوئی موجود ہوتا تو کیا ہی اچھی بات تھی۔ ابھی اُس نے یہ خیالات ذہن میں لائے ہی تھے کہ اچانک ہی اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ چونک پڑا۔ اُس کی نگاہیں سامنے کی جانب اُٹھ گئیں۔ واقعی اس وقت صورتحال تو کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ خاص طور سے اس احساس کے ساتھ کہ اُسے بتایا گیا تھا کہ اس عمارت میں کوئی نہیں ہے۔ پھر قدموں کی چاپ بالکل قریب آئی اور کھلے دروازے سے ایک شخص اندر داخل ہوا...... یہ چھوٹے قد کا ایک موٹا اور گنجا سا آدمی تھا۔ جس نے اندر آ کر کہا۔

"معاف کیجئے گا جناب...... میں باورچی خانے میں کام کر رہا تھا۔"

"تت...... تم...... تم کون ہو؟" رانا امر سنگھ کے منہ سے نکلا۔ اب حیرت کی جگہ اُس پر خوف غالب آتا جا رہا تھا۔

"میں...... جناب مجھے بدری ناتھ جی نے بھیجا ہے آپ کی سیوا کرنے کے لئے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ یہاں آنے والے ہیں، کم از کم آپ کے کھانے پینے کا ہی خیال رکھوں۔"

"اوہو...... اچھا، اچھا۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"کیول۔" اُس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے کیول...... مجھے تمہارے یہاں آنے سے خوشی ہوئی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کر رہا تھا۔" رانا امر سنگھ نے گہری نگاہوں سے کیول کا جائزہ لیا۔ پہلی نظر میں وہ انسانی شکل وصورت کا ہیبت ناک جانور نظر آیا تھا۔ اُس کے چہرے پر نیلے رنگ کی گول گول آنکھیں تھیں۔ کانوں پر سیاہ موٹے موٹے بال اُگے ہوئے تھے۔ گنجے سر پر اُس نے تیل مل رکھا تھا اور اُس کے دانت انتہائی بھیانک تھے، اِدھر اُدھر مُڑے ہوئے، کوئی کسی طرف اور کوئی کسی طرف۔ ہاتھوں کی اُنگلیاں مکڑی کی طرح پتلی پتلی، بال دار اور مُڑی ہوئی تھیں۔ وہ آگے بڑھا، اُس نے برتن صاف کرنا شروع کر دیئے تو امر ناتھ کو یہ محسوس ہوا جیسے کوئی بڑی سی مکڑی برتنوں سے چمٹی ہوئی ہے۔ اُس نے اپنے دل میں بڑی نفرت سی محسوس کی تھی۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "کیول، تم اچھے آدمی ہو۔ یہ بتاؤ کھانے پینے کے لئے کیا بندوبست کر سکتے ہو؟"

"بھاجی، ترکاری، پراٹھے، پوڑیاں، آپ جو کچھ چاہیں گے میں آپ کو بنا کر دے سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے...... میں تمہیں آواز دُوں تو تم آ جاؤ گے؟"

"ایک آواز لگا دیجئے گا سرکار۔ کیول آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہو جائے گا۔" کیول نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ اور اب تم آ ہی گئے ہو تو مجھے بتاؤ کہ میرے آرام کے لئے کون سا کمرہ زیادہ مناسب ہے؟"

"ٹھیک ہے مہاراج...... ہم آپ کا کمرہ ٹھیک ٹھاک کر کے آپ کو بتائے دیتے ہیں۔ کھا
آپ بتایئے کیا کھائیں گے؟"

"جو کچھ بھی تم کھلاؤ گے ہم کھالیں گے۔ ہم کھانے پینے کے سلسلے میں کوئی خاص با
سوچتے۔"

"ٹھیک ہے مالک۔" اُس نے کہا اور پھر آگے بڑھ کر رانا امر سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ اُس
امر سنگھ کے کوٹ کے کالر پر چڑھ جانے والی ایک مکڑی کو ہٹایا۔ مکڑی اُچھل کر کھانے کی میز پر
کیول کا سر رانا امر سنگھ کی گردن کے کھلے حصے سے ٹکرایا تو رانا امر سنگھ کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سو
میں چبھ گئی ہے۔ اُس نے ایک دم سے اپنی گردن پیچھے کی اور سوچنے لگا کہ عجیب کمبخت ملازم ہے
یہ تو حویلی کا آسیب ہی لگتا ہے۔ اس کے ہاتھوں پر بال ہیں یا سوئیاں؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے کو
چبھ گئی ہو۔ گردن میں کیول نے جو مکڑی میز پر جھاڑی تھی وہ آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی تیزی س
بڑھی اور میز کے نچلے حصے پر اُتر گئی۔ تب کیول بولا۔ "اصل میں کافی دن سے یہ جگہ خالی پڑ
مالک۔ یہاں رہنے والے بھی بیچارے بنسی لعل، اُن کی ماتا جی اور اُن کی پتنی تھے۔ تین آدمی اور ا
حویلی۔ سارے کمرے خالی ہی پڑے رہتے تھے۔ اچھا تو پھر میں آپ کے لئے بندوبست کر
ہوں۔ اچھی سی خوابگاہ اور اچھا سا کھانا۔ یہی کہا ہے نا آپ نے؟"

"ہاں کیول...... یہاں مجھے کافی دن رہنا ہوگا۔ تم مجھے ایک اچھے ساتھی محسوس ہوئے ہو۔"
آہستہ سے مسکرایا اور آگے بڑھ کر اُس نے دروازہ کھولا۔ لکڑی کا بھاری دروازہ بغیر آواز کے اس
کھل گیا جیسے وہ ہاتھ کے اشارے کا منتظر تھا۔ اور اس کے بعد کیول باہر نکل گیا تھا۔ رانا امر سنگ
سنجیدگی سے اس حویلی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پچاس ہزار روپے تو کمائے تھے اُس نے
بٹھائے۔ اسی طرح کے کام وہ کرلیا کرتا تھا۔ کسی نے کبھی کسی مہم جوئی پر بھیج دیا، یا کوئی ایسا مشک
اُس کے حوالے کر دیا جو سخت ہو۔ لیکن اس کا معاوضہ اچھا مل جاتا ہے اور اس وقت بھی یہ پچا
روپے کا مالک تھا اور دس بارہ دن کی بات۔ مہینہ تو بنسی لعل نے بدری ناتھ کو دیا تھا۔
باقی سارے مسائل تو بدری ناتھ کے تھے۔ یہاں صرف دس پندرہ دن گزار کے یہ رپورٹ د
کہ حویلی آسیب زدہ ہے یا نہیں؟ اور بہرحال، حویلی کا پہلا کردار ہی جو اُس کی نگاہوں کے سامنے
وہ کسی آسیب سے کم نہیں تھا۔ رانا امر سنگھ یہ تمام باتیں سوچ رہا تھا۔ اُدھر وہ موٹا اور بھدے جسم کا
جس نے اپنا نام کیول بتایا تھا، کمرے سے باہر نکل کر اندر پہنچ گیا تھا۔ وہ مکڑی جو رانا امر سنگھ کی گر
چڑھ گئی تھی، میز سے اُترنے کے بعد تیز رفتاری سے اُسی سمت چلی گئی تھی جدھر کیول گیا تھا۔ وہاں
نکل کر وہ راہداری میں آ گئے۔ راہداری میں روپا، رما اور رجنی ایک بڑی سی دیوار کے پیچھے چھ
تھیں۔ کیول آہستہ آہستہ چلتا اُن کے پاس پہنچا تو اچانک ہی وہ چکر لگا کر گھوما اور اُس کی شکل را
بن گئی...... راگنی نے مکڑی کی جانب دیکھا تو مکڑی بھی سیدھی ہوگئی اور اُس کا جسم بڑھنے لگا۔ پھرا
بعد وہ رادھا کی شکل اختیار کرگئی۔ وہ ہنس رہی تھی۔

روپا نے پوچھا۔ "کیوں کھی، کھی کر رہی ہے؟ وہ سن لے گا تیری آواز۔"

"اُس کا تو پہلی کوشش میں ہی حلیہ خراب ہو گیا ہے۔ وہ کیا کرے گا ہمارا، سمجھ رہی ہو نا تم؟"

"کیا ہوا؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔"

"ارے یہ راگنی بڑی نٹ کھٹ ہے۔ ایسی شکل بن کر اُس کے سامنے پہنچی کہ اُس کا تو کریا کرم ہی
ہوگیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ بری طرح ڈر رہا ہے۔ وہ تو مکڑی بن کر اس کے کندھے پر چڑھ گئی تھی۔
میں کہتی ہوں آہستہ آہستہ ڈراؤ اُسے۔ ایک دن میں ہی بھاگ جائے گا تو کیا مزہ آئے گا؟"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔ تفریح کرلیں گے اُس کی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... تم لوگ ذرا احتیاط رکھو۔ اور رادھا، تم زیادہ شرارتیں نہیں کرو۔ راگنی کو جو
کچھ وہ کر رہی ہے کرنے دو۔"

"میں اب چلتی ہوں۔ اُسے ذرا اُس کا کمرہ دکھا دُوں۔" راگنی نے کہا اور اس کے بعد وہ لوٹ
پوٹ کر کیول کی شکل اختیار کرگئی۔ بالکل کارٹون بن گئی تھی۔ وہ چاروں لڑکیاں پیٹ پکڑ کر ہنسنے
لگیں۔ رجنی نے کہا۔

"تم لوگوں نے جو کچھ کیا ہے، بس یہ سمجھ لو کہ حد کر رکھی ہے۔ اب بتاؤ یہ کوئی شکل ہے بننے کی جو
راگنی بنی ہے؟"

"اے رجنی، تو ہر وقت ہمیں نصیحتیں مت کیا کر۔ سب سے چھوٹی سب سے کھوٹی۔ ابھی تک تو ہی
بچی ہوئی ہے۔ کوئی کام نہیں دیا ہے تجھے اشیش بھگونت نے۔ اب کے ہمیں ملیں گے تو اُن سے کہیں گے
کہ یہ اتنی منی بھی نہیں ہے کہ ابھی تک اسے کوئی کام ہی نہیں دیا گیا۔"

رجنی خاموش ہوگئی تھی۔ بہرحال راگنی، کیول کے رُوپ میں آگے بڑھی۔ کوٹھی کا انہوں نے پوری
طرح جائزہ لے رکھا تھا۔ چنانچہ راگنی نے اپنے طور پر ایک کمرہ رانا امر سنگھ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔
کچھ دیر کے بعد وہ رانا امر سنگھ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ رانا اُس کا منتظر تھا۔ جلدی
سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کیول...... تم نے میرے لئے کمرہ منتخب کرلیا؟"

"آیئے مہاراج، میں آپ کو آپ کے کمرے تک لے چلوں۔" چنانچہ وہ رانا امر سنگھ کو ساتھ لے کر
چل پڑا۔ رانا امر سنگھ، کیول کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ پھر کیول جس کمرے میں پہنچا اُس کا دروازہ کھول
کر اُس نے رانا امر سنگھ کو اندر آنے کے لئے کہا۔ رانا امر سنگھ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔
کمرے میں اُسے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اُسے اپنے قدموں تلے کسی نرم نرم چیز کا احساس ہوا اور اُس
نے سوچا کہ یہ کوئی دبیز قالین ہے۔ اتنی دیر میں کیول نے آگے بڑھ کر روشنی کر دی تھی۔ رانا امر سنگھ نے
پوچھا۔

"کیول...... تمہارے علاوہ یہاں کوئی اور نہیں ہے؟"

"بتایا تھا نا مالک، یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ ہم بھی اس حویلی میں نئے نئے آئے ہیں۔ پہلے کبھی
یہاں نوکری کرتے تھے۔ بعد میں نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔"

''اچھا یہ کوٹھی تو سنا ہے کسی بنسی لعل کی تھی؟''

''جی مہاراج۔ چار افراد رہتے تھے اس میں۔ تین بڑے اور ایک چھوٹا۔ پھر یہ گھر چھوڑ دیا گیا۔ ہم سو نوکروں کے ایک نوکر ہیں اس لئے آپ چنتا نہ کریں۔ جو چیز بھی آپ کو چاہئے ہوگی وہ ہم کو......''

اچانک ہی ایک روشن دان سے کوئی چیز رانا امر سنگھ کے کندھوں پر کودی اور رانا امر سنگھ کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ یہ کالے رنگ کی ایک بلی تھی جو اس تاریک کمرے میں روشن دان سے اندر گھس آئی تھی اور اچانک ہی اُس نے چھلانگ لگا دی تھی۔ کیول نے اُسے دیکھا تو اُس کے چہرے پر غصے کے تاثرات پھیل گئے۔ لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھل کر بولا۔

''معافی چاہتا ہوں مالک...... اس بلی کو میں اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ میرے بغیر نہیں رہتی کہیں کی۔ جہاں میں جاتا ہوں وہیں آمرتی ہے۔ بلی بھی کیا چیز ہوتی ہے مالک۔ بچپن سے ہی ساتھ ہے۔ اتنی سی تھی ننھی سی۔''

''ٹھیک ہے......'' رانا امر سنگھ نے بے صبری سے کہا۔ ''ذرا میں اس کمرے کا جائزہ لوں۔''

''ہاں...... آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی مالک۔ بڑا آرام دہ کمرہ ہے۔ وہ دیکھئے، وہ رہا غسل خانہ بھی نظر آ رہا ہے۔ آپ یہاں رُکیں گے تو آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔''

''ہاں کیول۔'' رانا امر سنگھ نے مدھم لہجے میں کہا۔ ابھی تک وہ جو دیکھتا آیا تھا اس سے اُسے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ حویلی انتہائی باکمال چیز ہے۔

''آیئے، میں آپ کو ادھر کا منظر بھی دکھا دُوں۔ یہ پیچھے کا راستہ ہے۔ ادھر آیئے۔'' کیول نے کہا اور مغربی جانب کھلنے والے دروازے سے نکل کر باہر آ گیا۔ اُس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ برآمدے میں کچھ اندھیرا سا ہے۔ لیکن آپ چنتا نہ کریں، تھوڑی دیر کے بعد چاند نکل آئے گا۔ یہاں کا ماحول خوبصورت ہوتا ہے مالک کہ بس۔ آپ رات میں یہاں نکل آئیں تو دیکھنے دکھانے کے قابل جگہ ہے۔ ویسے اگر آپ کہیں تو میں برآمدے میں ایک چھوٹا بلب اور لگا دُوں تاکہ مدھم روشنی پھیل جائے یہاں۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو کمرے کا دروازہ کھول دیجئے، باہر روشنی آ جائے گی۔ ادھر دیکھئے، یہ رہا غسل خانہ ہے۔ اب آپ ایسا کریں منہ ہاتھ دھولیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

رانا امر سنگھ نے اُس کے جانے کے بعد اطمینان کی گہری سانس لی۔ پتہ نہیں کیسی طبیعت ہو رہی ہے۔ اُس نے دل میں سوچا اور خاصی اُلجھن محسوس کرنے لگا۔ کمرے کی نسبت برآمدے کی فضا زیادہ آرام دہ تھی۔ گھٹن تو خیر کمرے میں بھی نہیں تھی لیکن برآمدے میں مدھم مدھم ٹھنڈی ہوا طبیعت کو فرحت بخش رہی تھی۔ رانا امر سنگھ نے ایک ستون کے ساتھ ٹک کر باہر نگاہیں دوڑاتے ہوئے سوچا کہ اگر پہلے ہی دن خوف کی یہ کیفیت اُس پر طاری رہی تو پھر بھلا وہ یہاں کیا قیام کر سکے گا؟ اور یہ سیدھی سی بات ہے کہ جو رپورٹ اُسے دینی ہے وہ سچائی اور دیانتداری پر مبنی ہوگی۔ ویسے تو نہیں چھوڑا جائے گا۔

بدری ناتھ بھی بالآخر ایک کاروباری آدمی ہے اور اُس نے بلاوجہ پچاس ہزار کی ایک بڑی رقم خرچ نہیں کر دی ہوگی۔ اس رقم کو حلال تو کرنا ہی ہوگا۔ لیکن کہیں اس کوشش میں خود ہی حلال نہ ہو جاؤں۔ اُسے اپنی گردن پر کسی کے ہاتھ محسوس ہوئے اور اُس نے جلدی سے چونک کر پیچھے دیکھا۔ لیکن یہ صرف اُس کا وہم تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''رانا امر سنگھ...... بڑی بڑی مہمات سر کی ہیں تم نے۔ بڑے بڑے خطرناک لمحات سے گزرے ہو۔ یہ تم پر آخر خوف کیوں طاری ہوتا جا رہا ہے؟ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو، ہمت سے کام لو اور ذرا دیکھو، ابھی تو کچھ بھی نظر نہیں آیا تمہیں۔ جبکہ حویلی اچھی خاصی کہانی گھر معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس حویلی میں واقعی بھوتوں کا بسیرا ہو۔ یہ پہلا بھوت تو بار بار نظر آ رہا ہے۔ اور وہ کالی بلی، خدا کی پناہ کس طرح میرے کندھے پر کودی تھی۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ویران حویلی میں بڑا پراسرار ماحول ہے۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ اسے فوری طور پر بھوت گھر کہہ دیا جائے۔'' بہرحال کیول کے جانے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو بہت زیادہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور اُس کے منہ سے ایک بڑبڑاتی سی آواز نکلی۔

''یہ شخص جب بھی قریب آتا ہے مجھے اس کے قرب سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ کہیں یہ بھی کوئی بدرُوح نہ ہو۔ اندھیرے میں بالکل ایک مکڑی کی طرح چلتا ہے وہ کمبخت۔ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے کوئی مکڑی جا رہی ہے۔''

برآمدے سے نکل کر وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ مدھم سا بلب جل رہا تھا اور اس کی زرد سوگوار روشنی نے کمرے میں ایک نامکمل اُجالا پھیلا رکھا تھا۔ ایک بار پھر اُس نے کمرے کا جائزہ لیا اور یہ فیصلہ کئے بغیر نہ رہ سکا کہ بنسی لعل جو کوئی بھی تھا، اُس نے بہرحال فرنیچر کے معاملے میں بہت سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ نہایت بیش قیمت اور عمدہ فرنیچر تھا۔ شمالی گوشے میں ایک مسہری پڑی ہوئی تھی۔ زمین پر موٹا قالین بچھا ہوا تھا، مینٹل پیس پر رکھے ہوئے چینی مجسمے، کھڑکیوں اور دروازوں کے ریشمی پردے، چھت سے لٹکتا ہوا ایک بہت بڑا فانوس۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی انتہائی دولت مند رئیس کی عالی شان آرام گاہ ہو۔ بڑی عجیب سی کیفیت تھی یہاں کی۔ ایک طرف تو یہ عالی شان فرنیچر اور زبردست کمرہ اور دوسری طرف مقامی ماحول۔ نجانے کیوں امر سنگھ کو یہ کمرہ گھومتا ہوا سا محسوس ہوا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سر کو جھٹک کر آگے بڑھا۔ وہ پوری ہمت اور ہوشیاری کے ساتھ یہاں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ کمرے کی دیواروں پر نہایت حسین اور قیمتی فریموں میں جڑی ہوئی نادر تصاویر بھی آویزاں ہیں۔ وہ ان تصویروں کے قریب پہنچ گیا اور باری باری اُنہیں دیکھنے لگا۔ لیکن پہلی تصویر پر نظر پڑتے ہی دہشت سے کانپ گیا۔ یہ ایک بڑی بھورے رنگ کی مکڑی کی تصویر تھی جو اپنی گول گول نیلی آنکھوں سے امر سنگھ کو گھور رہی تھی...... امر سنگھ کو یوں محسوس ہوا جیسے مکڑی میں آہستہ آہستہ جان پڑتی جا رہی ہے۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور اُس کی ٹانگیں زور زور سے لرزنے لگیں.... چہرہ پسینے میں تر ہو گیا۔ یہ اُس کا وہم نہیں تھا، مکڑی جنبش کر رہی تھی.... اُس کی پتلی پتلی بال دار ٹانگیں حرکت میں تھیں۔ لیکن صرف ایک لمحہ، دوسرے لمحے وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔ امر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور

خود سے مخاطب ہو کر بولا۔

"یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ کہیں میں پاگل تو نہیں ہو گیا؟ کیا فریم کے اندر لگی تصویر حرکت
ہے؟ بھلا ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اصل میں میرے ذہن پر یہ تصور سوار ہے کہ میں بھوتوں کے
ہوں...... اُس کمبخت بدری ناتھ نے میرے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ یہ حویلی آسیب زدہ
یہاں میری ملاقات آسیبوں سے ہو سکتی ہے۔ کہانیاں ہیں سب کی سب بنی ہوئی۔ بھلا مرنے
ہڈیاں تک تو سوکھ جاتی ہیں۔ یہ جسم کہاں سے حاصل کر سکتی ہیں؟ اور پھر یہ ساری باتیں پھیلائی ہوئی
کہانیاں ہیں کہ لوگ خوفزدہ ہوں۔ ذرا دیکھوں تو سہی کہ کاغذ کی یہ مکڑی کس طرح جنبش کر سکتی ہے؟

وہ دوبارہ تصویر کی طرف گیا اور اُس نے تصویر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ بے جان...... "بالکل بکواس
خواہ مخواہ میرے اپنے ذہن پر ایک خوف طاری ہے۔" اُس نے خوفزدہ انداز میں پلٹ کر دیکھا۔
اپنے بھدے ہاتھ میں ایک لکڑی پکڑے ہوئے کھڑا تھا۔ یہ لکڑی بھی عجیب شکل کی تھی، بالکل
میڑھی۔ بالکل سانپ کی مانند۔ وہ جلدی سے بولا۔

"آپ تصویریں دیکھ رہے ہیں مہاراج...... ویسے آپ کو یہ کمرہ پسند تو آیا ہو گا۔ میں دعوے
ہوں کہ اتنا خوبصورت اور آرام دہ کمرہ آپ نے پہلے نہیں دیکھا ہو گا۔ آپ منہ ہاتھ دھو چکے ہو
میرے ساتھ آ جائیے، میں کھانا لگائے دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے...... لیکن کیا پکایا ہے تم نے کھانے میں؟"

"مہاراج، وہی بھاجی، ترکاری اور کچھ نہیں۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے آپ نے ابھی منہ بھی نہیں دھو

"ہاں......"

"میں سمجھتا ہوں ایسا کیوں ہوا۔ انسان کسی بھی نئی جگہ جاتا ہے تو پہلے اس کے بارے میں
معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ براہ کرم منہ ہاتھ دھو لیجئے، میں کھانا تیار کر چکا ہوں
ٹھنڈا ہو جائے گا تو سارا مزہ خراب ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے...... میں ابھی منہ ہاتھ دھوئے لیتا ہوں۔" امر سنگھ نے کہا اور غسل خانے کی جانب
پڑا۔ پھر اُس نے غسل خانے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی بیسن لگا ہوا تھا۔ اُس
بیسن کے پاس پہنچ کر ٹونٹی گھمائی تو پانی کی ایک دھار نکل پڑی۔ ہاتھ منہ دھونے کے بعد اُس کے
کچھ ٹھکانے آئے تھے۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے اُس نے اپنے سامنے لگے آئینے میں اپنی
دیکھی اور اُس کے حلق سے ایک آواز نکل گئی۔

"یہ...... یہ کون ہے؟" اُس نے پلٹ کر دیکھا، لیکن پورا غسل خانہ خالی تھا۔ آئینے میں
جو صورت نظر آ رہی تھی وہ ایک زرد ستا ہوا چہرہ تھا۔ "بھگوان...... یہ میں ہوں کیا؟" امر سنگھ ایک سرخ
سفید اور بہترین شکل و صورت کا مالک تھا۔ لیکن اس وقت جو صورت اُسے نظر آ رہی تھی وہ انتہائی ہولناک
تھی۔ زرد چہرہ، اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے گال......

"یہ میں نہیں ہوں......" وہ ایک بار پھر چیخا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دفعتہً ہی اُس کے منہ سے ایک

چیخ نکل گئی۔ کیونکہ دیوار کے اوپر بھورے رنگ کی ایک مکڑی بیسن کے پیچھے سے نمودار ہوئی، اس کے
اور بعد ایک اور...... اُس نے محسوس کیا کہ غسل خانے کی دیوار اور فرش پر مکڑیاں ہی مکڑیاں ہیں۔ وہ پاگل ہو
گیا اور اُس نے خوفزدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اُس نے اپنے پاؤں سے جوتا اُتارا اور اُن مکڑیوں
کو مارنے کے لئے دوڑ پڑا۔ لیکن مکڑیاں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھیں اور ایک مکڑی بھی اُس کے
جوتے کی زد میں نہیں آئی تھی۔ اتنی پھرتیلی مکڑیاں اُس نے پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے
ابھی یہ مکڑیاں دیوار پر سے چھلانگیں لگائیں گی اور اُس کی گردن اور چہرے پر چمٹ جائیں گی، اُس کی
آنکھوں کو کھا جائیں گی۔ اُس کے حلق سے وحشت زدہ آوازیں نکل رہی تھیں کہ دفعتہً ہی غسل خانے کا
دروازہ کھلا اور کیول کی صورت نظر آئی۔

"کیا ہو گیا...... کیا ہو گیا مہاراج...... آپ تو ان سب کو مار ڈالنے پر تل گئے ہیں۔"

"کیا ہے یہ سب کچھ؟ یہ غسل خانہ ہے؟ تم نے کبھی اسے صاف نہیں کیا؟"

جواب میں کیول کے ہونٹوں پر بھدی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ مہاراج...... کیا
کہہ رہے ہیں؟ یہ سب تو حویلی کا ایک حصہ ہیں۔ جس طرح کسی گھر میں انسان رہتے ہیں اسی طرح
بہت سی چیزیں یہاں رہتی ہیں۔ سانپ، بچھو، مکڑیاں اور دوسری بہت سی چیزیں۔ ویسے آپ نے ان
مکڑیوں پر غور نہیں کیا کہ دنیا کی سب سے خوبصورت مکڑیاں ہیں۔ اور مہاراج، مجھے ان سب سے بڑی
محبت ہے۔ میں ان سے پیار کرتا ہوں۔ یہ سب میری پالتو مکڑیاں ہیں۔ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ یہ
دیکھئے، میں آپ کو ایک تماشہ دکھاؤں۔" وہ آگے بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی مکڑیاں غسل خانے کی
دیواروں پر نمودار ہوئیں اور اُچھل اُچھل کر کیول کی ہتھیلی پر آ گئیں۔ امر سنگھ کا کلیجہ حلق میں آ گیا تھا۔
اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر وہ اس وقت کیول کی طرف دیکھتا تو اُسے اس شخص کی نیلی نیلی آنکھوں
میں وہی وحشیانہ چمک نظر آتی جو مکڑیوں کی آنکھوں میں موجود تھی۔

"میں...... میں...... تم...... تم......" ابھی اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کیول نے ساری مکڑیاں دیوار کی
طرف اُچھال دیں اور پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"جاؤ ری جاؤ...... جب ہمارا مہمان تمہیں ناپسند کرتا ہے تو پھر کیا فائدہ اس کے سامنے آنے سے؟
چھوڑیئے صاحب، آپ منہ ہاتھ دھو کر آ جائیے۔" اُس نے کہا اور مایوسی کے سے انداز میں غسل خانے
کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ امر سنگھ کا کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ بلاشبہ اُس نے پچاس ہزار کی رقم تو
حاصل کی تھی لیکن جو کچھ اُس پر بیت رہی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اُس نے سوچا کہ سارے پیسوں
پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل بھاگے۔ تیس ہزار جیب میں آ گئے ہیں، بس انہی پر انحصار کرے، اس سے
زیادہ اُس کی تقدیر میں نہیں ہے نہ سہی۔ لیکن پھر دوسری بات بھی تھی۔ ظاہر ہے اُسے ایک رپورٹ تو دینا
ہی تھی۔ اور بدری ناتھ اس رپورٹ پر انحصار کرے گا۔ تھوڑا سا وقت گزار لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
ایک مہینے کا کہا ہے اُس نے۔ میرا خیال ہے یہ ایک رات ہی کافی ہے۔ اور اس کے بعد جو ہو گا دیکھا
جائے گا۔

چنانچہ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا، ایک بار پھر آئینے میں اپنا غیر یقینی چہرہ دیکھا اور پھر غسل خا سے باہر نکل آیا۔ باہر کیول موجود تھا۔ اُس نے کہا۔ ''آئیے سرکار، کھانے کے کمرے میں چلیے۔ مَیں لگا دُوں۔ آپ بلاوجہ یہاں پریشان ہو رہے ہیں۔ ہر جگہ کی ایک رِیت رواج ہوتی ہے، مان مر ہوتی ہے۔ آپ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ابھی تک۔ پھر پریشان ہونے سے کیا فائدہ؟ آیئے۔''

امر سنگھ خاموشی سے اُس بدرُوح کے ساتھ چل پڑا اور اس کے بعد اُس ڈائننگ ہال میں آیا۔ یہ آ کر بھی اُسے چونکنا پڑا۔ اُس نے دیکھا کہ ہال اتنا بڑا ہے کہ اس میں بیک وقت دو سو آدمی کھانا کھا ہیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک رہائش گاہ میں اتنی بڑی میز لگانے کی کیا ضرورت تھی اور میز پر کون کھانا کھاتا ہوگا؟ اس عظیم الشان آبنوسی میز پر بڑے بڑے خوبصورت ڈیکوریشن کے رکھے ہوئے تھے۔

''بیٹھیے سرکار۔ سمجھ جائیے مہاراج، جو میں آپ سے کہہ چکا ہوں اُس پر غور کیجیے۔ آپ بلا پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ آرام کریں، میں ابھی کھانا لاتا ہوں۔ یقین کیجیے اس میں کسی کی کوئی نہیں ہے۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ آپ کو مکڑیوں سے اتنی نفرت ہے تو اس غسل خانے میں کبھی نہ جا دیتا۔ اچھا، اب غصہ تھوک دیجیے، میں آپ کے لئے بہترین کھانا لاتا ہوں۔'' وہ باہر نکل گیا اور امر نے ایک نگاہ پھر اُس پر ڈالی۔ لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ کیا کرنا چاہیے...... بڑا عجیب ہے سب کچھ۔

تھوڑی دیر کے بعد کیول آ گیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹرے اُٹھائے ہوئے تھا۔ ٹرے لگے برتن اُس نے اُس کے سامنے سجا دیئے۔ صاف ستھرے نفیس برتن تھے۔ گندگی کا ایک زرّہ بھی برتن پر نہیں تھا۔ اور پھر کھانا اتنا لذیذ اور فرحت بخش کہ امر سنگھ کو تھوڑی دیر پہلے ہونے والی تمام تکلیف معمولی لگنے لگیں۔ اُس نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور اچھی طرح سیر ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے اُس فیصلہ کیا کہ بلاوجہ اتنی بڑی رقم چھوڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر وہ اس طرح سے فرار ہونے کوشش بھی کرے تو بدری ناتھ اُسے بھلا کہاں چھوڑے گا؟ کونے کھدروں سے کھود کر نکال لے گا۔ پھر اُس کا تو کام ہی یہی ہے۔ اس طرح وہ ایک بڑی رقم حاصل کر کے اپنی زندگی کے نئے کھیل کو شر کرنا چاہتا تھا۔ کیول غلاموں کی طرح کھڑا تھا۔

امر سنگھ نے کہا۔ ''سنو...... اب مجھے کسی ایسے کمرے میں پہنچا دو جہاں کوئی مکڑی وکڑی نہ ہو۔''

''صاحب، اس کمرے میں اب کوئی مکڑی نہیں آئے گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔'' کیو نے کہا۔ امر سنگھ کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا سر گھوم ہو۔ ایک سرور آمیز سی کیفیت اُس پر طاری تھی۔ وہ آگے بڑھا تو اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے اور کیو جلدی سے آگے بڑھا۔ اُس نے امر سنگھ کو سہارا دینا چاہا تو امر سنگھ چلایا۔

''نہیں نہیں...... مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ میں خود چل سکتا ہوں۔''

''آپ اگر چاہیں تو میں آپ کو دوسرے کمرے میں پہنچا سکتا ہوں۔ یہ کمرہ میں نے آپ کے

لیکن اس کے غسل خانے میں اگر کوئی مکڑی نکل آئی تو آپ اسے مارنے کی کوشش کریں نتخب کیا تھا۔ گے۔ آیئے۔'' کیول اُسے لے کر ایک طویل راہداری سے گزرا۔ جس دوسرے کمرے میں وہ پہنچا، وہ بھی انتہائی شاندار تھا۔ یہاں ایک حسین بستر لگا ہوا تھا اور بستر کے سامنے چھوٹی چھوٹی تپائیوں پر پھولوں کے گلدستے سجے ہوئے تھے۔ بیڈ نہایت ہی شاندار اور اس پر بچھا بستر نرم اور گداز تھا۔

''آپ کو یقیناً یہ کمرہ اور بستر پسند آئے گا۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔'' امر سنگھ نے کہا اور کیول ایک بار پھر اُس کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیکن اُس کے جانے کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُس نے دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر یا۔ پھر اپنے بدن سے کپڑے اُتارے اور بستر پر لیٹ گیا۔ نجانے یہ کیسا سرور تھا؟ جبکہ اُس نے کوئی نشہ آور چیز بھی نہیں کھائی تھی۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا اور اب اُس کی خواہش تھی کہ اُسے نیند آ جائے۔ لیکن بستر پر لیٹنے کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُس کے اعصاب پُر سکون نہیں تھے اور وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سی بے چینی اور اضطراب محسوس کر رہا تھا۔ کئی بار اُس نے اُٹھ کر کمرے کا چکر لگایا، کھڑکی سے لگ کر باہر جھانکتا رہا جہاں تاریکی اور سناٹے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر پرانے اخبارات کے ڈھیر سے اُس نے کچھ اخبارات اُٹھائے اور بستر پر آ گیا۔ سرہانے رکھا ہوا لیمپ جلایا اور پرانے اخبارات پڑھتا رہا۔ نجانے کب کب کی خبریں اُن اخبارات میں چھپی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ ان میں کھو گیا۔ اُس کے ہاتھ پیر آہستہ آہستہ بے حس ہوتے جا رہے تھے۔ اُسے یوں لگا جیسے لیمپ کی روشنی آپ ہی آپ مدھم ہوتی جا رہی ہے...... تھوڑی ہی دیر کے بعد لیمپ بجھ گیا اور اب وہ گھپ اندھیرے میں تھا۔ اُس نے بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بمشکل تمام اُس نے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی اپنی گھڑی اُٹھائی۔ اندھیرے میں گھڑی کی سوئیاں چمک رہی تھیں۔ رات کے ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ اچانک ہی دائیں جانب سے ایک عجیب سی آواز اُس کے کان میں آئی۔ کر...... کر...... کی آواز۔ جیسے کوئی جاندار شے دیوار پر رینگ رہی ہو......

وہ کان لگا کر یہ آواز سننے لگا۔ پھر دہشت سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پُراسرار آواز آہستہ آہستہ اُن کے نزدیک آ رہی تھی۔ اُس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ کچھ لمحوں کے لئے آواز رُکی اور پھر شروع ہو گئی۔ امر سنگھ کا جسم اب سن ہو چکا تھا انتہائی کوشش کے باوجود وہ بستر سے جنبش نہ کر سکا۔ آواز اور قریب آ گئی۔ کر...... کر...... اور امر سنگھ کے ذہن میں صرف ایک ہی تصور اُبھرا۔ ''مکڑی......'' اُس نے اپنی پوری قوتِ ارادی جمع کر کے اپنی گردن اس آواز کی طرف موڑی۔ اندھیرے میں نیلے رنگ کی دو ننھی ننھی چمک دار آنکھیں نظر آئیں۔ پھر اچانک ان آنکھوں کے سامنے ایک عجیب مکڑی کا جیتا جاگتا ہیولا بن گیا...... مکڑی جس کی آٹھ بڑی بڑی ٹانگیں تھیں اور انڈے کے برابر بڑا جسم۔ نیلی اور گول گول آنکھیں جو امر سنگھ کو گھور رہی تھیں...... امر سنگھ کی گردن پر کن کھجورے رینگنے لگے۔ اُس کا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے اُچھل کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ خوفناک مکڑی اب اُس کے سرہانے سے تقریباً دو فٹ دُور تھی...... امر سنگھ پتھر کا بت بنا جا رہا

تھا۔ کر، کر...... کی آواز کے ساتھ مکڑی نے اپنی بال دار ٹانگیں چلائیں اور اُس کے قریب آ گئی
کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔ وہ پوری قوت سے چیخا اور دو
لمحے مکڑی اپنی جگہ سے اُچھلی اور اُس پر آ گری...... امر سنگھ کو محسوس ہوا کہ جس جگہ مکڑی گری ہے
ہوئے کوئلے آ پڑے ہیں...... اُس کے حلق سے ایک لرزہ خیز چیخ نکلی اور اچانک ہی اُس کے
زندگی دوڑ گئی۔ اُس نے بستر سے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اس کے بعد پاگلوں کی طرح چیختا ہوا
آیا...... اب اُسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اُس کے اعصاب کام کر رہے تھے، دماغ سن ہو چکا تھا او
رفتاری سے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔

اُدھر حویلی کے پُراسرار اور ہولناک ماحول میں جہاں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی، اچانک
کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پھر حویلی کے تمام کمرے روشن ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد پانچوں لڑ
جگہ جمع ہو گئیں۔ وہ جنہوں نے مکڑیوں کا رُوپ دھارا ہوا تھا اور جو اپنی ہر کیفیت بدل سکتی
پانچوں خوفناک لڑکیاں ایک ہال کمرے میں جمع ہو کر پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہی تھیں۔

"چلو یہ بہادر تو گیا۔ مگر مشغلہ دلچسپ ہے۔ ایسے بہادروں کو ہم اس طرح ڈرائیں گے
والوں اور سننے والوں کے کلیجے پانی ہو کر بہہ جائیں۔ یہ حویلی اشیش بھگونت نے ہمارے لئے
ہے۔ بھلا مجال ہے کسی کی کہ اس میں آ کر ٹِک جائے؟"

بہر حال، امر سنگھ بھلا رپورٹ دیتا تو کیا دیتا؟ سڑک پر دوڑتے دوڑتے اُس کا حادثہ ہوا او
وحواس سے بے گانہ ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔

ایمان علی کا وقت جس انداز میں گزر رہا تھا، وہ بڑا ہی دُکھ بھرا تھا۔ اپنی بیٹی کی شکل وصورت اُس کے سامنے تھی۔ لیکن اب وہ یہ بات جانتا تھا کہ وہ امینہ نہیں ہے۔ نادرہ ان تمام باتوں سے بے نیاز بس اس احساس کا شکار تھی کہ اچانک ہی امینہ کے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں نادرہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھیں۔ وہ بس حیران ہو کر رہ جاتی تھی۔ جبکہ کتنی ہی بار اُس نے ایمان علی کو امینہ کو دیکھتے پایا تھا۔ ایک دن وہ ایمان علی سے کہنے لگی۔ "سنئے...... آپ مجھے اپنے دل کی بات نہیں بتائیں گے؟"

ایمان علی چونک کر نادرہ کو دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔ "دل کی بات...... کون سی دل کی بات؟"

"کچھ ہے آپ کے دل میں۔ میں بیوی ہوں آپ کی۔ آپ کے دُکھ اور آپ کی تکلیف کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے اندر ہی اندر کوئی پریشانی پل رہی ہے۔ مجھے اپنی پریشانی میں شریک نہیں کریں گے؟"

"اچھی بیوی ہو...... بہت اچھی بیوی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہیں یہ احساس آخر کیوں ہوتا ہے؟"

"بس مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ خاموش بیٹھے امینہ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے بارے میں آپ کسی تشویش کا شکار ہوں۔"

ایمان علی نے دل ہی دل میں اس بات کا اعتراف کیا کہ نادرہ واقعی ایک سمجھدار عورت اور اچھی بیوی ہے۔ شوہر کے ہر احساس کا خیال رکھنا اچھی بیویوں کا ہی کام ہوتا ہے۔ بہر حال نادرہ کو تو ایمان علی نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ اُس کی حد سے زیادہ محبت نے اُسے یہ احساس دلایا ہے ورنہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ لیکن خود ایمان علی کانٹوں کے بستر پر لوٹ رہا تھا۔ سارے وجود میں انگارے بھرے ہوئے تھے۔ اُسے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ اُس کی وجہ سے اُس کی بیٹی مصیبتوں میں گرفتار ہو گئی ہے۔ بہر حال، اولاد کے لئے انسان دنیا کی ہر شے قربان کر سکتا ہے۔ ایمان علی نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، بیٹی کو اپنی زندگی میں ہر قیمت پر واپس آنا ہو گا۔ بجائے اس کے کہ دل کو دُکھ اور درد کا شکار کر کے وقت گزاری کی جائے، بہتر یہ ہو گا کہ جو رہنمائی کی گئی ہے اس کے زیرِ اثر کام کیا جائے۔ اور اس سلسلے میں اُس نے فوری فیصلہ کیا کہ ناگ چندر کے خلاف کوئی کام شروع کیا جائے۔

بیٹی کی زندگی کے لئے اُس کا بدن محفوظ کر دینا دنیا کا اہم ترین کام تھا۔ حالانکہ ایک زندہ وجود اُس کے سامنے تھا۔ لیکن جو کہانی اس سے منسلک تھی، اس کے تحت اپنی بیٹی کے ساتھ ہی ایک زیادتی کرنا ہو گی۔ اُس کے ساتھ نہیں بلکہ اُس کے جسم کے ساتھ جس کے اندر ایک اور رُوح پل رہی ہے۔ اپنی اس چھوٹی سی

رہائش گاہ میں یہ عمل نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ کوئی ایسی جگہ تلاش کی جائے۔ اور پھر شاید یہ بھی تقدیر کی رہ
تھی کہ ایک گزرا ہوا واقعہ ایمان علی کو یاد آیا۔ بہت پرانی بات تھی، ایک دن کہیں گیا ہوا تھا اور وہاں
واپس آرہا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور جس سڑک پر وہ سفر کر رہا تھا وہ ناہموار تھی۔ ایمان
سائیکل پر سفر کر رہا تھا۔ اور جب تیز بارش شروع ہوگئی تو پناہ لینے کے لئے ایمان علی نے اِدھر اُدھر دیکھ
سڑک سے کوئی آدھے کلومیٹر پر ایمان علی کو ایک عمارت نظر آئی۔ زمانہ قدیم کی کوئی یادگار تھی، لال اینٹ
سے بنی ہوئی جس پر اب کائی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک بڑا سا گنبد، ایک بڑا سا در۔ بارش سے
کے لئے بہر حال ایک چھت موجود تھی۔ وہ عمارت کے پاس پہنچ گیا۔ عمارت باہر سے بوسیدہ لیکن اندر
نہایت مضبوط تھی۔ اُس پر نقش ونگار کا کام ہورہا تھا۔ لیکن ایمان علی جس دیوار کے پاس جا کر بارش
بچنے کے لئے کھڑا ہوا وہاں ایک تحریر پوشیدہ تھی اور اس تحریر سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ایک تہہ خانے
رہنمائی کرتی ہے۔ چنانچہ ایمان علی کے دل میں تجسس پیدا ہوا اور تحریر کے مطابق بتائی ہوئی پراسرار جگہ
میں پہنچ کر اُس نے ایک تہہ خانہ دریافت کیا۔ تہہ خانے میں عجیب وغریب اشیاء موجود تھیں۔ لیکن ای
کوئی چیز نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ ان نقوش میں جو رہنمائی کی گئی ہے وہ کسی خاص چیز کی طرف اشا
کرتی ہے۔ ویسے تہہ خانے میں چھوٹے چھوٹے پتھر کے بت نظر آئے تھے۔ کسی ہندو دولت مند نے
عمارت بنوائی تھی۔ بہر حال اس تہہ خانے کو دیکھ کر ایمان علی کو عجیب وغریب سے احساسات ہوئے تھ
اس تہہ خانے سے اُس نے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا تھا۔ لیکن آج اُس کے ذہن میں یہ تہہ خانہ آیا تو اس ن
سوچا کہ کیوں نہ اس تہہ خانے سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ پھر اس سلسلے میں کام شروع کر دیا گیا۔

یہ سارا کام ایمان علی انتہائی رازداری کے ساتھ کر رہا تھا۔ وہ کچھ ایسی چیزیں لے کر وہاں پہنچ گیا
اس سلسلے میں ضروری ہوسکتی تھیں۔ بڑا عجیب سا کام تھا۔ ایسا کام جس کا کسی زندہ انسان نے خواب م
بھی تصور نہ کیا ہو۔ ایمان علی کا دل کٹ رہا تھا لیکن اُس کا سرمایہ حیات اُس سے چھن گیا تھا۔ اور وہ اس
کے لئے سخت افسردہ تھا۔ بہر حال اس سلسلے میں اور کوئی عمل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کسی کو اگر اس بارے م
کچھ بتاتا تو لوگ خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ناگ چندر کے بارے میں سبھی جانتے تھے ک
گندے علوم کرتا ہے۔ لوگ اُس سے ڈرتے بھی تھے۔ اگر کسی کو اس کے بارے میں بتایا بھی جاتا تو وہ ک
کرسکتا تھا؟

بہر حال، یہ سارا کھیل شروع ہونے والا تھا اور دھرم وتی جواب امینہ کے وجود میں پوشیدہ تھی، ان تمام
باتوں سے بے نیاز اپنے کام کر رہی تھی۔ تھوڑا سا وقت باقی رہ گیا تھا اور اس کے بعد جو ہونا تھا وہ ایک
پراسرار عمل تھا۔ چنانچہ ایمان علی کو یہ کارروائی کرنا پڑ رہی تھی۔ پھر اُس نے تہہ خانے میں جانے کے سلسلے
میں جو نقوش تھے وہ مٹا دیئے تاکہ کوئی اور ان کو پڑھ کر وہاں تک نہ جاسکے۔ زندگی کا یہ عجیب وغریب کھیل
شروع ہوگیا تھا۔ کبھی کبھی ایمان علی انتہائی افسردگی کے عالم میں سوچتا تھا کہ اس کھیل کے لئے اس کا
انتخاب کیوں کیا گیا؟ بہر حال، پھر ایک دن نادرہ، ایمان علی سے کہنے لگی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں؟ مجھے اپنی بیٹی، اپنی اپنی سی نہیں لگتی۔''

''اور میں سمجھتا ہوں کہ جیسے اس عمر میں تمہاری عقل خبط ہوگئی ہے۔ بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو۔
یں خود ذہنی طور پر پریشان ہوں۔''

''آپ ایک بات بتایئے، آپ کو امینہ میں کچھ تبدیلی محسوس ہوتی ہے؟''

''جب تم نے کہا تھا تو مجھے عجیب عجیب سا لگا تھا۔ لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اُس سے
ات کر چکا ہوں۔ ویسے اب میں تمہیں ایک بات بتاؤں، میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ غیر معروف اور دنیا کی نگاہوں سے چھپی
ہوئی۔ لیکن وہاں ایک ایسے بزرگ رہتے ہیں جو زبردست عالم ہیں اور اُن کے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔
یں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ کچھ عرصے کے لئے امینہ کو اُن کے پاس بھیج دوں۔''

''کیا مطلب...... وہاں کیوں بھیج رہے ہو؟''

''بس حصول علم کے لئے۔ تم نہیں سمجھ سکتی۔ میں نے عالم تصور میں یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ بلکہ ایک
لرح سے یہ سمجھ لو کہ مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ امینہ کو علم وفضل حاصل کرنے کے لئے وہاں بھیجا جائے۔''

''مگر اکیلی وہ رہ سکے گی وہاں؟''

''ظاہر ہے وہ اکیلی رہنا پسند نہیں کرے گی۔ لیکن ایک بزرگ کے پاس پورا خاندان تو نہیں جاسکتا۔
ہاں وہ علم سیکھ لے گی۔ اُس کے کام آئے گا۔ بیٹیوں کو ہم اور کیا دے سکتے ہیں؟''

''میں ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟''

''نہیں...... کیوں؟''

''حصول علم کے لئے تو بیٹے جایا کرتے ہیں۔ بیٹیوں کو کسی جگہ بھیجنا کیا معنی رکھتا ہے؟''

''نہیں نادرہ...... میں نے زندگی جس انداز میں گزاری ہے تمہیں اس کا علم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ
یری بچی دینی علوم سے واقفیت حاصل کرے۔''

''مگر وہ ہماری اکلوتی بچی ہے۔''

''اسی لئے تو ہم پر ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے۔ بیٹیاں ماں باپ کے ساتھ سدا کہاں رہتی ہیں؟
ہانا تو انہیں دوسروں ہی کے گھر ہوتا ہے۔''

''آپ اگر یہ بات زیادہ بہتر سمجھتے ہیں تو میں بھلا کیسے روکوں گی؟''

''ہاں نادرہ، دیکھو ایک کام کرنا ہے تم نے۔ ہمیشہ ہر بات مانی ہے میری۔ اور میں نے بھی تمہیں اپنی
ندگی کا ہر راز بتا دیا ہے۔ اب کچھ مجبوریاں ہیں۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، تم اس سے اختلاف بالکل نہیں
کرنا۔''

''میں نے تو کبھی آپ سے اختلاف نہیں کیا۔''

''تو پھر سنو...... میں چاہتا ہوں کہ امینہ کو ہمارے اس منصوبے کا بالکل بھی پتہ نہ چلے۔ اُسے بالکل یہ
لم نہ ہونے پائے کہ ہم اُس کے لئے دل میں کیا خیال رکھتے ہیں۔''

"تو پھر کیسے مانے گی وہ؟"

"بس میں اُسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا جہاں لے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں لے جا کر اُس
اُن بزرگ سے کراؤں گا۔ اور بہر حال مجھے یقین ہے کہ اس کا دل وہاں لگ جائے گا۔"

نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اُس نے کہا۔ "ٹھیک ہے...... میں جانتی ہوں کہ آ
اپنی بچی کے لئے کریں گے وہ اچھا ہی ہوگا۔"

پھر ایمان علی رات کو ساری رات روتے رہے تھے اور اُنہوں نے بیٹی کے لئے صرف دُعائیں
تھیں۔ غرض یہ کہ تمام تیاریاں مکمل ہوگئی تھیں اور اب صرف امینہ کو لے جانا باقی تھا۔ ایمان علی کا
تھا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ تقدیر بعض اوقات جو فیصلہ کرتی ہے اس پر عمل تو کرنا ہی پڑتا
بحالت مجبوری ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس وقت ایمان علی کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں
بیٹی کو لے کر وہاں سے نکل جائیں۔

باپ تو ناگ چندر بھی تھا۔ اور اُس سے اُس کی بیٹی بھی چھن گئی تھی اور بیوی بھی۔ غم تو اُس
میں بھی اتنا ہی تھا۔ تڑپ بھی اتنی ہی تھی۔ لیکن فرق صرف اتنا سا تھا کہ اُس نے دوسروں کو نقصان
ہوئے کبھی یہ بات نہیں سوچی تھی کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اس سے کسی کو کیا تکلیف پہنچے گی یا کیا نقص
گا؟ دھرم داس کو اُس نے مٹی میں ملا دینے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بات صرف تھوڑ
پیسوں کی تھی۔ رزق تو ہر کوئی کماتا ہے، اپنی زندگی کے لئے نہ سہی اپنوں کے لئے سہی۔ لیکن بہر حا
اور حلال بھی کچھ ہوتا ہے۔ اور جو لوگ اسے بھول جاتے ہیں اور دوسروں کو تکلیف دے کر اپنا پیٹ
ہیں، اُنہیں بہر حال تکلیف تو ہوتی ہی ہے۔

بہر حال، وہ اپنی تمام تر برائیوں کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف تھا اور پوری طرح مولو
علی کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ اُس نے عارضی طور پر اپنے جادو منتروں سے کام لے کر اپنی
بیٹی کے وجود میں امینہ کو قید کر کے بیٹی کو زندہ کر رکھا تھا اور اس کے بعد وہ مسلسل اپنی کوششوں میں
تھا۔ بے شک دھرم وتی، امینہ کے بدن میں ایمان علی کے گھر میں موجود تھی اور جادو منتروں سے کام
ناگ چندر دن رات اس چکر میں لگا ہوا تھا کہ کوئی خاص طریقہ کار استعمال کیا جائے۔ کالے جادو
میں وہ کافی آگے نکل چکا تھا۔ اُس کے قبضے میں گندی رُوحیں تھیں اور وہ اُن سے مسلسل معلومات
کرتا رہتا تھا۔ بہر حال یہ جانتا تھا کہ بیٹی کسی عام گھر میں نہیں ہے، بلکہ وہاں بھی علم و عمل کا راج
مولوی ایمان علی بھی کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔ بہر حال اس وقت بھی وہ اپنی جادو نگری میں بیٹھا
کام کر رہا تھا۔ اُس کے سامنے بدصورت اور بدنما مخلوق بھیانک شکلوں میں موجود تھی اور وہ اُ
سوالات کر رہا تھا۔

"ہاں...... کیا کر رہا ہے اس وقت وہ مسلمان بوڑھا؟"

"اکال کنڈ، وہ اپنی ہائش گاہ کے گرد حصار قائم کر چکا ہے۔ ہم وہاں جاتے ہیں تو جلتی لکیریں
بدن کو چھونے لگتی ہیں۔ لیکن جب ہم ان لکیروں کو عبور کرتے ہیں تو ہمارے پیر مل جاتے ہیں اُ

اندر نہیں جا سکتے۔"

"ابھوما...... تو بتا۔ تیرے اندر تو بڑی شکتی ہے اور تو کہیں جائے بغیر ساری باتیں معلوم کر لیتا ہے۔"

"ہاں اکال کنڈ، میرا اپنا اندازہ ہے کہ مسلمان عالم اپنی بیٹی کے بارے میں جان چکا ہے۔"

"کیا......؟" ناگ چندر چونک پڑا۔

"ہاں...... وہ جان چکا ہے کہ اُس کی بیٹی کے شریر میں تیری بیٹی کی آتما موجود ہے۔"

"کیا بک رہا ہے...... کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا وہ دھرم وتی کو پہچان چکا ہے؟" ناگ چندر نے
دہشت بھری آواز میں کہا۔

"ہاں...... وہ پہچان چکا ہے۔"

"اب کیا ہوگا ابھوما...... اب کیا ہوگا؟"

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے سوامی۔ اب اور کیا ہوگا؟"

"کیا ہو چکا ہے؟" ناگ چندر نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ اب دھرم وتی اُس کے قبضے میں ہے۔"

"تو کیا اُس نے اپنی ہی بیٹی کے بدن کو ختم کر دیا ہے...... ہلاک کر دیا ہے کیا اُس نے اُسے؟"

"نہیں......"

"تو پھر کیا، کیا ہے اُس نے؟"

"ہمیں نہیں معلوم۔ کیونکہ وہاں بڑے پہرے ہیں۔ جلتی لکیروں سے ہم نہیں گزر سکتے۔ پر ہمارا
گیان ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جو تو نے کیا وہ اُسے معلوم ہو چکا ہے۔"

"اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا۔ اب بتا، کیا کریں؟ کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ سارا کام ہو جائے۔ بولو، کوئی
ترکیب ہے ابھوما، بتاؤ؟"

"ہاں ترکیب ہے۔"

"کیا ہے...... بولتے کیوں نہیں؟"

"سنو، دھرم وتی، امینہ کے شریر میں ہے۔ تم نے کالی ماتا سے اُن دونوں کا جیون اُدھار مانگا ہے۔ یہ
اُدھار کا جیون تمہیں مل گیا ہے۔ اب نہ تو دھرم وتی کو کوئی خطرہ ہے نہ امینہ کو۔"

"وہ کیسے؟"

"اس لئے کہ اُن کے شریر بدل گئے ہیں۔ جب تک وہ دونوں اپنے اپنے شریر میں نہیں آ جائیں،
دونوں کے جیون کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"تیرا مطلب ہے کہ دھرم وتی بھی جی سکتی ہے؟"

"ہاں...... تم نے امینہ کو دھرم وتی کے شریر میں رکھ لیا ہے۔ آتما امینہ کے لئے، شریر دھرم وتی کا۔ اس
طرح دھرم وتی کا شریر محفوظ ہو گیا اور امینہ کی آتما اور تمہاری دھرم وتی جو امینہ کے شریر میں ہے۔ چونکہ امینہ
کالی شکتی کے زیر اثر ہے اس لئے وہ بھی نہ مر سکے گی اور دھرم وتی اُس کے شریر میں جیتی رہی گی۔ پر ایک

بات اور بتاؤں تمہیں۔"

"ہاں بول۔"

"اشیش بھگونت سے رابطہ قائم کرو۔ شیطانوں کا شیطان، سب سے بڑا شیطان، مہاشیطان۔ جو شکتی رکھتا ہے۔ سنسار میں بہت سے گندے کام کر دیا کرتا ہے۔ جتنے گندے کام ہوتے ہیں سب اُس کے ہاتھوں ہوتے ہیں۔ تمہیں شیطان کو جگانا پڑے گا۔ اشیش بھگونت کے چرنوں میں جانا پڑے گا۔ لیکن اگر تم اشیش بھگونت کے قدموں میں چلے گئے تو پھر سارے کام آسانی سے ہو سکیں گے۔ ویسے ایک ترکیب بھی ہے۔ اشیش بھگونت کا حساب تم بعد میں کر سکتے ہو۔ جو ترکیب میں بتا رہا ہوں، اس پر عمل تمہیں بڑا فائدہ مل جائے گا۔"

"وہ کیا ہے؟"

"تم اپنی دھرم پتنی کو زمین میں دفن کر دو اور اُسے بھول جاؤ۔ پر ایک بات میں تمہیں بتاؤں، جو زمین سے کہو گے کہ تمہاری دھرم پتنی کا شریر خراب نہ ہو اور زمین اسے محفوظ رکھے تو سمجھ لو، تمہاری دھرم پتنی کا شریر اُس سمے تک خراب نہیں ہوگا جب تک تم نے اُسے زمین کی حفاظت میں دیا ہوا ہے۔ کیونکہ بڑی امانت دار ہے۔ تم اُس سے کہہ دو کہ جب بھی تمہیں فرصت ملی اپنی دھرم پتنی کو اس سے لے لو گے کے بعد وہ سمے ٹل جائے گا جو اُن کی موت کا سمے ہوگا۔ اور ایک بات اور سن لو۔"

"ہاں، بولو......"

"اگر مسلمان کو پتہ چل گیا تو تم کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے۔"

"اوہ...... میں تو اُسے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ مرنے کے بعد بھی یاد رکھے گا۔ اور اُس نے جو کیا ہے اس کے لئے جیون بھر افسوس کرتا رہے گا۔"

"بس یہاں تک ہماری عقل تھی۔ آگے تمہاری عقل ہوگی۔ تمہاری عقل جہاں تک تمہارا ساتھ دے سکتی ہے اسے استعمال کرو۔"

"وہ کروں گا جو سنسار میں کسی نے نہ کیا ہوگا۔ میری عقل بہت آگے ہے اور اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے...... اپنی عقل کو آزماؤ اور دیکھو کہ تم کیا کر سکتے ہو؟"

بہر حال، بہت سے مشورے اُن بدرُوحوں نے دیئے تھے۔ اور پھر وہ اُس جسم کے سامنے پہنچ گیا جو اُس کے قبضے میں تھا۔ یہ اُس کی بیٹی دھرم وتی کا جسم تھا لیکن اس میں رُوح امینہ کی تھی۔ وہ اُس کے پاس پہنچا اور اُس نے اپنے علم سے اُسے جگایا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"دھرم وتی...... دھرم وتی......" لیکن دھرم وتی نے آنکھیں نہیں اُٹھائی تھیں۔ تب اُس نے کہا

"امینہ...... بول امینہ۔"

"ہاں چاچا جی...... اب بولو، کیا بات ہے؟" دھرم وتی کے جسم میں امینہ کی آواز اُبھری۔

"چاچا نہیں ہوں میں تیرا۔"

"بچپن میں جب بھی میں نے تجھے دیکھا، چاچا کہا۔"

"ہاں...... لیکن تیرے پتا نے مجھ سے سارے رشتے توڑ دیئے۔"

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے چاچا جی۔ ایک بات میں جانتی ہوں، میرا باپ کبھی غلط کام نہیں کرتا۔ ضرور تم نے کوئی ایسی بات کی ہوگی جس سے میرا باپ تم سے ناراض ہو گیا۔"

"میں اُسے اُس کی ناراضگی کا مزہ چکھاؤں گا۔"

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ مگر یہ بتاؤ، تم نے میرے ساتھ کیا، کیا ہے؟"

"وہی جو تیرے پتا نے میری بیٹی کے ساتھ کیا۔"

"مگر اس میں میرا قصور تو نہیں ہے۔"

"تیرے پتا کا تو ہے۔"

"ہاں...... اگر میرے باپ کی سزا مجھے مل رہی ہے تو یقین کرو چاچا جی، میں بڑی خوشی سے اس سزا کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اب یہ بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"جو میں چاہتا ہوں وہ سنسار میں سب سے انوکھا ہوگا۔"

"یہ بھی تمہاری مرضی ہے۔"

"تو اب دھرم وتی کے رُوپ میں جیون گزارے گی۔ اور میں...... میں ایک مندر بناؤں گا یہاں۔ جو اشیش بھگونت کا مندر ہوگا...... تیرے پاس میری بیٹی کا شریر ہے۔ تو مسلمان ہے نا، تو نے اپنے دھرم میں جیون گزارا ہے۔ پر ذرا غور کر، تو اشیش بھگونت کی داسی ہوگی...... سمجھی؟ اشیش بھگونت کی داسی۔ میں تجھے گیان دھیان سکھاؤں گا اور وہ کر دُوں گا تیرے ساتھ جو کبھی کسی نے کسی کے ساتھ نہیں کیا ہوگا۔ اور پھر تو خود اشیش بھگونت کی مدد سے اپنے پتا، اپنے باپ کے مقابلے پر آئے گی۔ سمجھی؟ باپ بیٹی کا مقابلہ ہوگا۔ اور یہ دنیا کی بدترین سزا ہوگی ایک عالم کے لئے ایک جادوگر کی طرف سے۔"

"تم ایسا کبھی نہیں کر سکو گے چاچا جی......" امینہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تو کیا روکے گی مجھے؟ کیسے روکے گی تو؟"

"ایک بات کہوں چاچا جی؟"

"ہاں ہاں ضرور...... بول۔"

"میں ایک مسلمان کی بیٹی ہوں۔ مجھے بچپن ہی سے اللہ اور اُس کے رسول کا نام سکھایا گیا ہے۔ میں نے کلام پاک کے تھوڑے سے سپارے بھی حفظ کئے ہیں۔ اگر میں ان کا وِرد شروع کر دُوں تو تمہارا ستیاناس ہو جائے گا۔ لیکن چاچا جی، میں کہتی ہوں کہ تم خود مجھے آزاد کر دو۔"

"تجھے آزاد کر دُوں گا میں...... کر دُوں گا ضرور۔ لیکن میری بیٹی کو کون آزاد کرے گا؟"

"چاچا جی، یہ اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی کسی کو نہیں مار سکتا۔ یہ جادو ٹونے، یہ سارے کھیل عارضی ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا نام اللہ کا ہے۔ اور چاچا جی، اس نام کے سہارے ساری دنیا چل رہی ہے۔ تمہاری ایک سانس بھی تمہاری اپنی نہیں ہے۔"

"بس...... بک بک شروع کر دی اپنے باپ کی طرح؟"

"نہیں چاچا جی۔ صرف میرا باپ ہی یہ بک بک نہیں کرتا۔ بلکہ کائنات کا پتا پتا یہی سب کچھ کہتا ہے۔ بس کان چاہئیں ان آوازوں کو سننے کے لئے۔ سمجھ لو کہ ساری کائنات کا مرکز یہی سب کچھ ہے۔"

"میں اس مرکز کو ختم کر دوں گا۔"

"تم کیا کر سکو گے چاچا جی......؟ دنیا میں بڑی بڑی کہانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ شداد، فرعون، نمرود نے ایسے ہی دعوے کئے تھے۔ لیکن کوئی کچھ نہ کر سکا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... ابھی بہت سا سمے باقی ہے۔ میں تجھے ایک منتر بتاتا ہوں۔ وہ پڑھ۔ تیری آتما کو شانتی ملے گی۔"

"پاگل ہو تم چاچا جی۔ اب تو مجھے یہی کہنا پڑ رہا ہے تمہارے لئے۔ میری رُوح پوری طرح پُرسکون ہے۔ اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو انسان کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے۔ اگر میں اس امتحان میں پوری اُتر گئی تو زندگی میں اس سے بڑا کام میرے لئے اور کوئی نہیں ہوگا۔ تم بالکل فکر مت کرو کہ کیا ہوگا۔"

"جو منتر میں بتا رہا ہوں وہ یاد کر۔" ناگ چندر نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور ایک منتر دہرانے لگا۔ دھرم وتی کے رُوپ میں امینہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا چاچا جی...... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

"ہوگا تو ایسا بیٹی کہ سارا سنسار دیکھے گا۔ بس تھوڑا سا وقت نکل جانے دے۔ میں ذرا تیرے باپ سے نمٹ لوں۔ کیا سمجھی؟" ناگ چندر نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ امینہ کو ڈرا دھمکا کر کام نکال لے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ بدستور ناکامیوں میں گھرا رہا۔ دونوں ہی یہ بات جان گئے کہ کیا کارروائی کرنی ہے۔ مگر سب سے زیادہ دُکھ بھری بات یہ تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی ہار نہیں مان سکتا تھا۔

برائی دوسری شکل اختیار کر گئی تھی۔ لیکن بیچارہ مولوی ایمان علی بھی مصیبتوں میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اور بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے بھی وہی سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ بہر حال، وہ ناگ چندر کی چالوں سے ہوشیار تھا اور حالات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ناگ چندر اپنے شیطانی ذہن سے نئے نئے منصوبے بنا رہا تھا۔ پھر اُس نے ایک بالکل ہی نیا منصوبہ بنایا اور ایک دن صبح اُس نے اعلان کیا کہ رات کو اُس کی بیوی اور بیٹی کا اچانک ہی انتقال ہو گیا۔ اُس نے اپنے جاننے والوں کو اس بات کی اطلاع دی اور دونوں لاشوں کی ارتھی بنا دی اور ان ارتھیوں کو لے کر وہ شمشان گھاٹ پہنچ گیا۔ بہت سے لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ البتہ جب ایمان علی کو اس کی اطلاع ملی تو اُن کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ وہ بری طرح دوڑا۔ اُس نے سوچا کہ اگر ناگ چندر نے دھرم وتی کے بدن کو بھی جلا دیا تو امینہ کی رُوح اُس کے ساتھ ہی جل جائے گی۔ اور پھر وہ اُس رُوح کو حاصل کرنے سے محروم ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ برق رفتاری سے شمشان گھاٹ کی طرف دوڑ پڑا۔ لیکن دیر ہو گئی تھی۔ دونوں لاشیں شعلوں میں گھری ہوئی تھیں اور کوئلہ بن چکی تھیں

دہرے لوگ تک جا چکے تھے۔ صرف ناگ چندر وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ ایمان علی پیچھے آ رہا ہے۔ ناگ چندر اکیلا کھڑا اُن نقلی چتاؤں کو دیکھ رہا تھا جو اب جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ پھر اُسے ایمان علی کی آواز سنائی دی۔ "ناگ چندرا......"

ناگ چندر چونک کر پلٹا تو دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایمان علی نے کہا۔ "تو...... تو نے میری بیٹی کی رُوح کو خاکستر کر دیا۔"

ناگ چندر کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اُس نے کہا۔ "اور تو نے کیا، کیا ایمان علی؟"

"ناگ چندر، تو نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے کبھی کسی کے لئے زندگی میں کوئی برا کام نہیں کیا۔"

"اگر دھرم داس کے معاملے میں تو مجھ سے تعاون کر لیتا تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا ایمان علی۔ لیکن تو بھی کیا یاد کرے گا زندگی بھر کہ کس سے واسطہ پڑا تھا۔"

"میں تو خیر زندگی بھر یاد ہی کروں گا۔ لیکن تو نے جو کچھ کیا ہے، میں زندگی میں پہلی بار تیرے خلاف کچھ کروں گا۔" یہ کہہ کر ایمان علی نے ناگ چندر کے منہ پر تھوک دیا۔ ناگ چندر کی خوفناک آنکھیں ایمان علی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اُس نے کہا۔

"تم نے مجھ پر تھوک دیا۔ لیکن میں تم پر وہ منتر کروں گا کہ زندگی بھر یاد کرو گے ایمان علی۔"

"اے زندگی بھر تو اب تو یاد رکھے گا کہ تیرے ساتھ کچھ ہوا تھا۔ اب اپنا حشر دیکھو۔ اب جو کچھ بھی ہوا اس کا ذمہ دار تو خود ہے۔ مجھے الزام نہ دینا۔" یہ کہہ کر ایمان علی واپس چلے گئے۔ ناگ چندر خونی نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا تھا۔ پھر اُسے اُس تھوک کا خیال آیا جو اُس کے چہرے پر پڑا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے کندھے پر پڑا ہوا موچھا اُٹھایا اور چہرے سے تھوک صاف کرنے لگا۔ لیکن اچانک ہی اُس نے محسوس کیا کہ کپڑے کے ساتھ ساتھ اُس کا گوشت بھی اُتر رہا ہے اور اس کی جگہ زخم پڑتا جا رہا ہے۔ ناگ چندر خوف سے اُچھل پڑا۔ جہاں سے گوشت اُترا تھا وہاں چہرے پر شدید تکلیف پیدا ہو گئی تھی...... وہ دیوانوں کی طرح دوڑتا ہوا اپنی رہائش گاہ پر پہنچا اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر اُس کا دہشت سے رواں رواں کانپ اُٹھا کہ اُس کے چہرے کا گوشت آہستہ آہستہ گلتا جا رہا ہے اور نیلاہٹیں پیدا ہو رہی ہیں...... اُس کے منہ سے دھاڑیں نکلنے لگیں...... جلن اور تکلیف تو پہلے ہی تھی لیکن اب اپنا چہرہ دیکھ کر اُسے بڑی دہشت ہو رہی تھی۔ رخسار کا گوشت لٹک گیا تھا۔ اندر کے دانت اور زبان وغیرہ نظر آنے لگے تھے۔ وہ جلدی سے پانی کے پاس گیا اور پانی اپنے اُوپر اُنڈیلنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ اور بھی وحشت ناک ثابت ہوا...... پانی اُس کے بدن پر بہہ رہا تھا اور جس جگہ سے یہ پانی گزر رہا تھا اُس جگہ سے اُس کے جسم کا گوشت گل کر پانی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ وہ پانی سے نکلی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا...... چیخنے دھاڑنے لگا۔ اور پھر روتا ہوا کالی کے مجسمے کے پاس پہنچا اور کہا۔

"جے مہا کالی...... جے مہا کالی...... یہ کیا ہوا دیوی؟ یہ تیرے داس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ مجھے بچا لے...... مجھے بچا لے...... آہ، بچا لے مجھے...... میں مر رہا ہوں۔" لیکن بدن کی جلن اور تکلیف

اُسے دیوانہ کئے دے رہی تھی۔ پانی کی لکیریں جدھر سے گزر رہی تھیں، اُس کا گوشت وہیں سے
نیچے گرنے لگتا۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی تالاب میں چھلانگ لگا دے
جائے۔ ''آہ، کیا کروں میں...... کیا کروں......؟'' تکلیف نے اُسے وہاں بھی نہ رُکنے دیا۔ وہ
آگے بڑھا اور ایک تالاب کے کنارے پہنچ گیا۔ پھر اُس نے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ لیکن
والے اگر اُس کو ایک نظر دیکھتے تو دہشت سے دیوانے ہو جاتے۔ کیونکہ جیسے ہی وہ پانی میں گرا، پانی
بھاپ اُٹھنے لگی۔ اس بھاپ کے ساتھ ہی اُس کا گوشت پورے کا پورا پانی پر بہنے لگا...... اُس کے
وجود میں آگ دوڑ رہی تھی اور وہ تالاب کے اندر حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اُس کی ہولناک چیخیں
میں دُور دُور تک گونج رہی تھیں اور وہ پاگلوں کی طرح چیخ چلا کر اِدھر سے اُدھر تیر رہا تھا...... جلن اور تکلیف
سے پانی سے باہر نکلنا اُس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ اُس کے بدن کی یہ جلن اور تکلیف کم ہوتی چلی گئی۔ اُس نے سکون کی گہری گہری سانس
لیں اور آہستہ آہستہ اُس کے بدن کی تکلیف اور جلن کم ہو گئی۔ اُس نے مدھم لہجے میں کہا۔
''میں ٹھیک ہو جاؤں گا...... مجھے یقین تھا کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کالی دیوی مجھے اکیلا نہیں چھوڑے
گی ایمان علی...... لیکن تو یہ سمجھ کہ اگر تجھے بھی اتنی ہی تکلیف نہ دی تو میرا نام بھی ناگ چندر نہیں ہے۔''
آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور تالاب کے کنارے پہنچ گیا۔ پھر وہ پانی سے باہر نکل آیا۔ لیکن اچانک اُس کی
ناک ہی اپنی ہاتھ کی کلائی پر آ پڑی اور ایک بار پھر اُس کا کلیجہ اُچھل کر حلق میں آ گیا...... کلائی پر گوشت
کی کوئی چیز نہیں رہی تھی...... صرف ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اُس نے دوسرے ہاتھ کو، پیروں کو اور
ہاتھوں سے اپنے بدن کو ٹٹول کر دیکھا، یہاں تک کہ اپنے چہرے کو بھی دیکھا۔ اس کے بعد تالاب میں
جھانکا اور ایک بار پھر اُس کے منہ سے ایک دہشت ناک چیخ نکل گئی۔
''نہیں...... نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔ آہ، یہ نہیں ہو سکتا...... ایمان علی، تو نے یہ کیا، کیا...... ارے پاپی،
تو نے یہ کیا، کیا؟'' تالاب کے پانی میں اُسے اپنا جو عکس نظر آ رہا تھا وہ اس قدر بھیانک تھا کہ خود اُس
دل کی دھڑکن بند ہوئے جا رہی تھی۔ اب وہ انسان نہیں تھا، صرف ایک ڈھانچہ تھا...... ایک بھیانک
ڈھانچہ جو زندہ سلامت تھا۔ صرف اُس کے سینے کی تھوڑی سی جگہ ڈھکی ہوئی تھی جس میں اُس کا دل
اندرونی اعضاء جو اُسے متحرک کر سکتے تھے محفوظ تھے۔ ورنہ باقی سارے جسم کا گوشت گل کر پانی میں بہہ
تھا۔ اب وہ انسان کی بجائے ایک ڈھانچہ تھا...... اپنے آپ کو اس حال میں دیکھ کر اچانک ہی اُس کے
سے آواز نکلی اور پھر وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ اور روتے ہوئے یہی کہہ رہا تھا۔ ''بدلہ لوں گا ایمان
سے...... ایسا بدلہ لوں گا پاپی کہ تو بھی جیون بھر یاد رکھے گا۔'' جو افتاد اُس پر آ پڑی تھی اس نے اُس کے
حواس چھین لئے تھے۔ اب وہ انسانوں کے درمیان رہنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ اُس نے اپنے
سامان کو دیکھا اور پھر سوچنے لگا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے؟ اب تک جو کوشش اُس نے کی تھی، اس میں
ناکام رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے کچھ فیصلے کئے، اپنے بیروں سے مشورہ کیا۔ اور اُس کے بیروں نے اُسے
بتایا کہ اگر وہ مہا کال اشیش بھگونت سے رابطہ قائم کرے تو اُس کا کام بن سکتا ہے۔ اشیش بھگونت

کچھ دے دیں گے۔
''مگر میں...... میں کیسے یہ کام کروں؟''
''دیکھ، اگر تو یہ بکتا ہے کہ تیری دھرم پتنی اور تیری بیٹی کو نیا جیون مل جائے گا تو یہ جیون تو اشیش بھگونت
بھی تجھے نہیں دے سکتا۔ ہاں، یہ الگ بات ہے کہ دوسری آتمائیں تیری بیٹی اور تیری دھرم پتنی کے شریر میں
رہ کر وہ شریر تیرے لئے کھول دیں۔ تیری دھرم پتنی بھی جوں کی توں رہے گی اور تیری بیٹی بھی۔ اب اُس
کے شریر میں امینہ کی رُوح ہے تو وہ ایک الگ بات ہے۔''
''اگر میں اپنی بیٹی کے وجود میں امینہ کی رُوح کو قید نہ رکھوں تو؟''
''وہ تیری مرضی ہے۔ تیرا جو دل چاہے کر۔ لیکن اشیش بھگونت تجھے بہت کچھ دے سکتے ہیں۔''
''تو پھر میں اشیش بھگونت کے پاس جانا چاہتا ہوں۔''
''یہاں سے نکل جا اور جو پتہ تجھے بتایا جا رہا ہے وہاں پہنچ جا۔''
''ٹھیک ہے...... میں ایسا ہی کروں گا۔ پر یہ بتاؤ کہ امینہ کے شریر میں میری بیٹی کی آتما ہے۔ اس کا
میں کیا کروں؟''
''ابھی اس کی طرف توجہ نہ دے۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ لیکن تو
اشیش بھگونت کے چرنوں میں پہنچ جا۔''
چنانچہ اس تمام منصوبے کے تحت ناگ چندر نے تیاریاں کیں۔ خود تو وہ ایک ڈھانچہ بن چکا تھا۔ اُس
نے اپنے پورے جسم کو کمبل میں لپیٹ لیا۔ پھر اپنی دھرم پتنی اور بیٹی کو جنہیں اُس نے انتہائی خفیہ طریقے
سے چھپا رکھا تھا کمبل اوڑھا کر گاڑی میں بٹھا لیا اور ان دونوں کو لے کر وہ چل پڑا۔ وہ بہت ہی خفیہ طریقے
سے اپنا یہ سفر طے کرنے لگا۔ ساری رات وہ بیلوں کو دوڑاتا رہا۔ اور بیل گاڑی کے پچھلے حصے میں وہ
دونوں گندی رُوحیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دیکھنے والا اگر اُنہیں دیکھ لیتا تو اُس کے حواس ہی خراب ہو جاتے۔ وہ
چلتا رہا اور راستے طے ہوتے رہے۔ اب یہ صرف اتفاق تھا کہ ایک بھری بس اُنہیں راستے میں مل گئی۔ کوئی
بارات تھی جو ایک بستی سے دوسری بستی تک جا رہی تھی۔ ڈرائیور راستہ بھول چکا تھا اور بڑی عجیب صورت
حال تھی۔ پھر بس کے ڈرائیور نے بیل گاڑی والے کو دیکھا تو جلدی سے بس کو بیل گاڑی کے سامنے لا کر
روک دیا۔ ڈرائیور اور کچھ لوگ نیچے اُتر آئے۔
''بھائی جی، ذرا ہمیں نئی بستی کا راستہ بتا دو۔ ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔''
''مجھے نہیں معلوم۔ بس ہٹاؤ سامنے سے۔ تم نے میری بیل گاڑی کیوں روک دی؟''
''یار، کیسے آدمی ہو؟ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ راستہ بتا دو۔ یہ تو اچھا کام ہوتا ہے۔''
''میں کوئی اچھا کام نہیں کر سکتا۔''
''تمہارا دماغ خراب ہی ہو گیا ہے شاید اب تو۔ تمہارے باپ کو بھی راستہ بتانا پڑے گا۔ دو تین
نوجوان لڑکوں نے غصیلے لہجے میں کہا۔
''ہٹ جاؤ میرے راستے سے ورنہ......''

"ورنہ کیا کرے گا تو؟" لڑکوں نے کہا اور آستینیں چڑھالیں۔

ناگ چندر نے غصے میں آ کر کمبل پھینک دیا اور اپنی جگہ سے نیچے اُتر آیا۔ اب جو انہوں نے ناگ چندر کو دیکھا تو اُن سب کے ہوش و حواس رُخصت ہو گئے...... جو لوگ بس سے نیچے اُترے تھے وہ پلٹ کر ایسے بھاگے کہ بس کو بھی بھول گئے اور جو بس میں تھے وہ بری طرح چیخنے چلانے لگے۔ دروازے بند کر لئے گئے تھے۔ ڈرائیور بھی بھاگنے لگا تو ناگ چندر نے آگے بڑھ کر اُس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ ڈرائیور کٹتے ہوئے بکرے کی طرح چیخا۔ "معاف کر دے...... مہاتما، معاف کر دے...... ارے دیا رے دیا...... مر گیا۔"

"چل، بس کو پگڈنڈی سے ہٹا۔ ورنہ یہیں تجھے اس بس کے نیچے دے کر ماردوں گا۔" ناگ چندر بولا اور ڈرائیور جلدی سے بس میں چڑھ گیا۔ پھر اُس نے بس اسٹارٹ کر کے ایسی بھگائی کہ وہ کئی جگہ ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

ناگ چندر دوبارہ کمبل اوڑھ کر اپنی گاڑی میں آبیٹھا تھا اور اُس نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا تھا۔ گاڑی سفر کرتی رہی اور راستے طے ہوتے رہے۔ ناگ چندر کی پتنی اور بیٹی کو کھانے پینے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ بس سفر کر رہی تھیں وہ۔ چنانچہ ناگ چندر بھی اپنا سفر طے کرتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ بہت وقت گزر گیا تو سامنے سے وہ کھنڈر نما عمارت نظر آنے لگی جس کا پتہ ناگ چندر کو بتایا گیا تھا۔ ایک انتہائی بھیانک اور خوفناک عمارت تھی۔ یہ لوگ آگے بڑھتے رہے اور تھوڑی دیر کے بعد ناگ چندر نے بیل گاڑی شیطان بھون کے سامنے روک دی۔ پھر اُس نے اپنی بیٹی اور بیوی سے کہا۔ "تم لوگ بھی اُتر آؤ...... وہ جو سامنے جگہ ہے وہاں بیٹھ جاؤ۔ خبردار وہاں سے کہیں جانے کی کوشش مت کرنا۔" چنانچہ دونوں عورتیں وہاں بیٹھ گئیں اور ناگ چندر اپنا کمبل پھینک کر شیطان بھون میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچا تو ایک بڑے سے ہال میں جہاں نیم تاریک ماحول پھیلا ہوا تھا اُس نے شیطان کے مجسمہ کو نصب پایا۔ ناگ چندر ایک طویل عرصے سے کالے علم کر رہا تھا۔ بیر، بھیروں اور نجانے کون کون سے ناپاک وجود اُس کے سامنے آتے رہتے تھے۔ اور اب اُس نے اُن سے خوفزدہ ہونا چھوڑ دیا تھا۔ انسان تو بہرحال انسان ہی ہوتا ہے۔ ابتداء میں وہ بھی اُن سے خوفزدہ ہوا تھا۔ لیکن بعد میں اُس کے سامنے بڑی بڑی بھیانک شکلیں آتی رہیں لیکن وہ اُن سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ لیکن شیطان کے اس مجسمے کو دیکھ کر اُس کے سارے وجود پر کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور شیطان کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح اشلوک پڑھتا رہا، تب اُسے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔

"اُٹھ...... کون ہے تو...... کیا چاہتا ہے؟ اُٹھ جا...... مہا کالی تیرے سامنے ہے۔" تین بار یہ آواز سنائی دی تو ناگ چندر ہمت کر کے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ آواز تھی یا قیامت...... لگتا تھا کہ پوری عمارت ہل رہی ہے۔ ناگ چندر نے خوفزدہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ شیطان کے مجسمے کی آنکھیں روشن تھیں اور اُن سے روشنی خارج ہو کر فضا کو منور کر رہی تھی۔

"جے مہا کال...... جے اشیش بھگونتا......"

"کیوں اتنا کشٹ اُٹھا کر یہاں تک پہنچا ہے؟"

"بھگونتا، تجھ سے زیادہ میرے من کی بات اور کون جان سکتا ہے؟ باہر دو پاپا کی ماریاں بیٹھی ہیں اور اُن کے شریر میں ایک میں بیر ہے اور ایک میں ایک مسلمان لڑکی کی آتما۔ مہا کال، میرے ساتھ انیائے ہوا ہے۔ میں کالی کا پجاری ہوں اور کالی تیری پجاری ہے۔ مجھے بدلہ چاہئے...... روشنی چاہئے تجھ سے۔"

"ہوا کیا ہے...... ہمیں تفصیل سے بتا۔"

"اشیش بھگونتا...... میں سنسار باسیوں کے ہر طرح کے کام کر دیا کرتا تھا۔ کالی دیوی کی مدد سے میں ایسے لوگوں کے بگڑے کام بناتا تھا جو کسی کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے اور خود نہیں کر سکتے تھے۔ اس کام کے لئے میں نے بہت سے بیر اپنے ساتھ ملا رکھے تھے۔ یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ پر اشیش بھگونتا، ایک سسرا مسلمان جو بچپن سے میرا دوست تھا میرے آڑے آ گیا۔ اُس نے میرا منتر مجھے لوٹایا اور جب میرا منتر مجھے لوٹا تو میری پتنی اور میری بیٹی اُس کی زد میں آ گئیں اور جیون کھو بیٹھیں......" ناگ چندر نے ساری تفصیل شیطان کو سنا دی اور شیطان خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اُس نے کہا۔

"تو اب تو کیا چاہتا ہے؟"

"بھگونتا، اب میں نے تجھے اپنا بھگونت بنا لیا ہے۔ جیسی تیری روشنی ہو گی ویسے میں کرتا رہوں گا۔"

"تو چاہتا ہے کہ تیری بیٹی اور تیری پتنی کا شریر جیتا رہے؟"

"ہاں مہاراج...... میں یہی چاہتا ہوں۔"

"ایسا ہوتا رہے گا۔ پر اس کے لئے تجھے ایک منتر کرنا ہو گا۔ جب بھی تیری پتنی اور تیری بیٹی کے شریر سے کوئی آتما نکل جائے تو، تو دوسری آتما ان کے شریر میں ڈال سکتا ہے۔ تیری پتنی تیرے لئے ہر طرح تیری پتنی ہی ہو گی۔ مگر اصل میں وہ تیری پتنی نہیں ہو گی بلکہ کوئی اور عورت اُس کے شریر میں جیتی رہے گی۔ شرط یہ ہو گی کہ جب کوئی عورت مر رہی ہو تو اس سمے تو اپنا منتر اُس پر پڑھے گا تو وہ مر جائے گی۔ لیکن اُس کی آتما تیرے قبضے میں آ جائے گی اور تو اُسے اپنی پتنی کے شریر میں داخل کر سکتا ہے۔ یہ کام تجھے بیٹی کے ساتھ بھی کرنا ہو گا۔ کیا سمجھا؟"

"مہا کال، مجھے میری اصل بیٹی اور پتنی واپس نہیں مل سکتیں؟"

"نہیں...... جب آتما شریر کو چھوڑ جاتی ہے تو آزاد ہو جاتی ہے۔ اسے شریر میں واپس نہیں لایا جا سکتا۔ یہ جیون مرن کا عمل ہے۔ اور بس یہی میرے بس میں نہیں ہے۔ ویسے تو میں سنسار باسیوں کو اپنی مرضی کے مطابق بھٹکاتا رہتا ہوں، اُن سے اپنے کام لیتا رہتا ہوں۔ پر بہت سے کام ایسے ہیں جو مجھ سے بھی نہیں ہو پاتے۔ البتہ میں تجھے اُس مسلمان سے انتقام لینے کے بہت سے منصوبے بتا سکتا ہوں۔ اُن پر عمل کر کے تو اپنے شریر کو شانت کر سکتا ہے۔"

"یہی یہی بھگونت...... مجھے دونوں چیزیں چاہئیں۔ جب میں تیرے چرنوں میں آیا ہوں تو پھر تجھ سے کچھ لے کر ہی جاؤں گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے...... تجھے اس منتر کا حساب کرنا ہو گا۔ اور اس کے بعد یہ وعدہ کرنا ہو گا

کہ سنسار میں کسی کے ساتھ بھلائی نہیں کرے گا۔ جسے نقصان پہنچا سکتا ہے، ضرور پہنچائے گا۔ کسی
بندے کو جو نیکیوں کے راستے پر جاتا ہو روکنا تیرا کام ہوگا۔ بول، یہ سب کچھ کرنے پر آمادہ ہے؟“

”دل و جان سے بھگونتا...... سنسار نے میرے لئے کچھ نہیں چھوڑا تو میں سنسار میں کسی کے لئے نہیں چھوڑوں گا۔“

”ٹھیک ہے...... منتر یاد کر۔“ مجسمے کے ہونٹوں سے آواز نکلی اور ناگ چندر اُن الفاظ کو یاد کرنے پھر بہت دیر تک وہ یہ الفاظ اپنے ہونٹوں میں دہراتا رہا تھا۔ شیطان کی آنکھیں بدستور روشن تھیں۔ کچھ کے بعد شیطان نے کہا۔ ”اس سے تیری بیٹی کے شریر میں اس مسلمان کی بیٹی کی آتما ہے۔ کیا وہ تجھ کچھ کہتی ہے؟“

”اپنے شریر میں واپس جانا چاہتی ہے۔“

”اور اس کے شریر میں تیری بیٹی کی آتما ہے؟“

”ہاں اشیش بھگونتا......“

”خیر، کام تجھے ہی کرنا ہوگا۔ لیکن ہم اپنی ایک داسی تیری مدد کے لئے بھیج دیں گے۔ وہ تیرے پا پہنچے گی اور تیری ہر طرح سے سہائتا کرے گی۔“

”میں ان دونوں کو لے کر کہاں جاؤں اشیش بھگونتا؟“

”کوئی بھی نئی جگہ اپنا لے...... نئے سرے سے وہاں رہ۔ کالا جادو جانتا ہے۔ تیرے لئے کوئی مشـ نہیں ہوگی۔ تو نے اپنے جیون میں ایک نئے کھیل کا آغاز کرنا ہے۔ اس لئے کسی بھی طرح اپنا کوئی عمل لے۔ کیا سمجھا؟“

”ٹھیک ہے مہاراج...... آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ شریر بھی گل سڑ گیا ہے۔“

شیطان نے ہاتھ اُٹھایا اور ناگ چندر کو ایک دم احساس ہوا کہ اُس کا جسم گوشت سے بھر گیا ہے۔ ا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ اس عمل کو اپنی کامیابی سمجھ رہا تھا۔ اس کے بعد شیطان کی آنکھوں کی روشنی گئی۔ گویا اُس کی اب یہاں موجودگی نہیں تھی۔ ناگ چندر نے اپنے دل میں خوشی کا احساس محسوس کیا تھا اب وہ شیطان کی پناہ میں آ چکا تھا۔ پہلے ہی گندا اور غلیظ انسان تھا، لیکن اب اُس نے اپنے آپ غلاظتوں کے انبار ڈال لئے تھے۔ برائی اس دنیا میں جس طرح فروغ پا رہی ہے اس سے یہ انداز ہے کہ شیطان کے پیروکار بڑھتے جا رہے ہیں اور شیطانی عمل بڑی تیز رفتاری سے جاری ہے۔

مولوی ایمان علی کی زندگی میں ایک انقلاب آ چکا تھا۔ جو انکشافات اُن پر ہوئے تھے انہوں مولوی ایمان علی کی دنیا بدل کر رکھ دی تھی۔ بہت ہی غمزدہ تھے وہ۔ جس طرح بیٹی کو ویرانوں میں پہنچایا اُن کا دل ہی جانتا تھا کہ کیا بیت رہی تھی اُن پر۔ لیکن بس تقدیر کے فیصلے بھی کبھی ایسے ہی ہوتے ہیں انسان کچھ سوچتا ہے شیطان کچھ کرتا ہے۔ لیکن مشیت ایزدی اگر مختلف انداز میں فیصلے کر رہی ہوتی بھلا شیطان کی کیا مجال ہے کہ اس میں دخل اندازی کر سکے؟ ادھر تو یہ ساری ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی۔

طرف مولوی ایمان علی ایمان کے سہارے اللہ کی مدد کا انتظار کر رہے تھے۔

دوسری طرف ناگ چندر نے نیکی کا وہ آخری لمحہ بھی کھو دیا تھا جو اُسے صحیح راستے پر لا سکتا تھا اور وہ برائی کا منبع بن کر باہر نکلا تھا۔ اس جیسے شخص کے لئے جو بے انتہا جادو منتر جان چکا تھا کوئی کام کر لینا کون سا مشکل تھا؟ چنانچہ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر اُسی بیل گاڑی میں وہاں سے واپس چل پڑا جس میں وہاں تک پہنچا تھا۔ اور اب اُسے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں رہ کر وہ اپنے جاپ کر سکے۔ فاصلے طے کر رہا تھا اور کچی پگڈنڈیوں سے گزر رہا تھا کہ اچانک اُس کی نگاہ ایک طرف اُٹھ گئی۔ بہت ہی قیمتی اور خوبصورت کار تھی جو ایک گڑھے میں پھنس گئی تھی۔ دو آدمی اُس کے آس پاس کھڑے اُسے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ناگ چندر نے اُسے دیکھا اور اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ چنانچہ بیل گاڑی کا رُخ اُس نے اُس جانب موڑ دیا اور تھوڑی دیر کے بعد پھنسی ہوئی کار کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں افراد جن میں ایک بھاری بھرکم قسم کا ایک سیٹھ قسم کا آدمی تھا اور دوسرا اپنے حلیے اور لباس سے اُس کا ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ وہ ناگ چندر کو دیکھنے لگے۔ ناگ چندر گاڑی سے اُتر کر اُن کے پاس پہنچ گیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ کار کی پچھلی سیٹ پر دو عورتیں بھی بیٹھی ہوئی ہیں، ایک نوجوان اور خوبصورت سی لڑکی تھی اور ایک ادھیڑ عمر عورت۔ نوجوان لڑکی کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ ناگ چندر کو ایک لمحے کے اندر اندر معلوم ہو گیا کہ اُس لڑکی پر جادو کرایا گیا ہے۔ لیکن اس وقت وہ دوسرا خیال رکھتا تھا۔ اُن لوگوں کے پاس پہنچا اور اُس نے کہا۔

”گاڑی پھنس گئی ہے مہاراج؟“

”ہاں...... دیکھو، سڑک کا یہ حصہ اچانک بیٹھ گیا۔ وہ تو شکر ہے رفتار بہت سست تھی۔ ٹائر اس میں چلے گئے دوطرف کے۔ اگر رفتار تیز ہوتی تو گاڑی یقیناً لڑھک جاتی۔“

ناگ چندر نے نگاہیں اُٹھا کر موٹے جسم والے سیٹھ کو دیکھا اور کہا۔ ”مہاراج، ایسے وار تو آپ پر نجانے کب سے ہو رہے ہیں۔ بس کوئی اچھائی ہے جو آپ کو بچائے ہوئے ہے۔ ورنہ آپ کے دشمن تو آپ کو کب کا کھا گئے ہوتے۔“

سیٹھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اُدھر کار میں بیٹھی ہوئی بھاری بدن والی خاتون بھی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ”تت...... تم کون ہو؟“

”مسافر ہوں مہاراج۔ اپنی پتنی کے ساتھ کسی ٹھور ٹھکانے کی طرف جا رہا ہوں۔ دُور دراز کی ایک بستی میں رہتا تھا۔ پر اُس بستی کی فضا مجھے راس نہیں آئی۔ میں تو لوگوں کے من شانت کرنے کا کام کرتا ہوں۔ پر کیا کروں، سنسار کسی کی اچھائیوں کو قبول نہیں کرتا۔“

”بھائی، بڑے گیانی معلوم ہوتے ہو۔ تم نے یہ جو الفاظ میرے بارے میں کہے ہیں تمہیں کیسے معلوم کہ میں مشکلات کا شکار ہوں؟“

”ایک بات کہوں مہاراج، انسان کی پریشانیاں اُس کے ماتھے پر لکھ دی جاتی ہیں۔ کوئی گہری نگاہ سے دیکھنے والا ہو تو ان لکیروں کو پڑھ سکتا ہے۔ آپ بڑے دیالو ہیں۔ بڑے نیک انسان ہیں۔ پر خرابی تو

یہی ہے سنسار میں۔ کوئی محنت سے کچھ کرتا ہے اور بہت سے کھانے والے اُس کے گرد مکھیوں کی
پھیل جاتے ہیں، اُس کا کمایا کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کے پریوار میں بھی کچھ ایسے ہی
ہیں۔ آپ کے ماتھے کی لکیریں پڑھ لی ہیں میں نے۔"

اتنی دیر میں عمر رسیدہ خاتون اُتر کر اُس کے پاس پہنچ گئیں۔ "بھائی، ایک اجنبی ہو تم۔ بھگوان نے
تمہیں اتنا گیان دیا ہے تو ہماری مدد کیوں نہیں کرتے؟ یہ میری بچی ہے۔ پتھر کا بنا دیا ہے اُنہوں نے
اسے۔ دھرم یاترا کرنے گئے تھے ہم۔ وہیں سے واپس آ رہے ہیں۔ دشمنوں نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا
ہے بھائی۔ اگر بھگوان نے تمہیں اتنا گیان دیا ہے تو ہماری مدد کرو۔"

"ارے ارے، بہن جی، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

"کوئی بھی چکنی چپڑی باتیں کر کے کسی کا من اپنی طرف موڑ سکتا ہے۔ ہر ایک فرد پر اعتبار نہیں کرنا
چاہئے۔ پر میرا من کہتا ہے کہ تم ہمارے کام آ سکتے ہو۔"

"مجھے بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ ٹھہریں، میں پہلے آپ کی کار نکال دُوں۔"

"کار بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔"

"ایک معمولی سے آدمی کو بھی کوشش کر لینے دیں مہاراج۔" ناگ چندر اُن لوگوں پر اپنا پورا پورا
قائم کرنا چاہتا تھا۔ ڈرائیور اور سیٹھ صاحب پیچھے ہٹ گئے۔ ناگ چندر نے دل ہی دل میں اپنے ہمزاد کو
آواز دی اور اُن سے کہا کہ گاڑی کو دھکا لگا کر باہر نکلوا دیں۔ پھر اُس نے ہلکے سے ہی ہاتھ لگائے تھے کہ
گاڑی گڑھے سے باہر نکل گئی تھی۔ سیٹھ صاحب اور ڈرائیور حیرت سے منہ پھاڑ کر رہ گئے۔ سیٹھ صاحب
نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"بس...... مجھے لگ رہا ہے کہ بھگوان نے میری سن لی ہے۔ مجھے ایک مہان دیوتا مل گیا ہے جو میرے
لئے سب کچھ کر سکتا ہے۔ مہاراج، کیا آپ مجھ پر کچھ اور دیا نہیں کر سکتے؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں سیٹھ صاحب آپ؟"

"نہیں مہاراج، بس میں یہ جانتا ہوں کہ...... کہ آپ ہی میری مشکلوں کا حل بن سکتے ہیں۔"

"اگر میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو ضرور آؤں گا۔"

"آپ جیسے مہاپرش کا ساتھ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔" سیٹھ صاحب اور اُن کی دھرم پتنی بڑی خوشی کا
اظہار کر رہے تھے اور ناگ چندر یہ سوچ رہا تھا کہ چلو پہلے کام کا آغاز تو ہوا۔ اُس نے کہا۔

"مہاراج، ہمارا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہے۔ یہ بیل اور گاڑی بس ہماری ملکیت ہیں۔ سنسار میں اپنے
لئے کوئی ٹھکانہ تلاش کرنے جا رہے تھے کہ آپ مل گئے۔ ہمارے لائق کوئی کام ہو تو بتائیے۔ ورنہ آپ کی
گاڑی نکل گئی ہے آپ اپنے کام سے جائیے، ہم اپنے کام سے جا رہے ہیں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

"ارے کہاں یہ بیل گاڑی اور کہاں یہ آپ کی چمچماتی موٹر کار۔"

"کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ ہمارے ساتھ جائیں گے مہاراج۔

"مگر سنئے تو سہی...... ہمارا ساتھ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے...... اور وہ ایسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ آپ کی بیل گاڑی میں چلوں گا۔
ڈرائیور، مانسری اور دیوا سری کو لے کر چلا جائے گا۔ میں آپ کے ساتھ بیل گاڑی میں آؤں گا۔ سنا
ڈرائیور تم نے؟ بلکہ ایسا کرو، دونوں دیویوں کو بھی کار میں بٹھا دو۔ چاروں آ جائیں گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" آخر کار ناگ چندر نے کہا۔ اور اس کے بعد یہ ہوا کہ ناگ چندر کی دھرم پتنی
اور اُس کی بیٹی دونوں کار میں ان کے ساتھ بیٹھ گئیں اور سیٹھ صاحب بیل گاڑی میں آ گئے۔ کار آگے بڑھتی
گئی اور ناگ چندر نے بیل گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کیسی انوکھی بات ہوتی ہے۔ بھگوان کی لیلا ہی نرالی ہے۔ جسے جو چاہے دے سکتا ہے۔ اب ہمیں کیا
معلوم تھا کہ آپ اس طرح ہمیں مل جائیں گے؟ ہم تو تھانیسر کے مندر گئے تھے مانسری کو لے کر۔ بڑی
پریشانی ہے ہمیں۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا مہاراج مانسری کے بارے میں۔ اصل میں بس کبھی کبھی بہت
ساری دولت بھی جی کا جنجال بن جاتی ہے۔ اپنے پرائے ہو جاتے ہیں۔ اس دولت کی ہوس میں دشمنوں
کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ بڑا مشکل ہوتا ہے مہاراج اس دولت کے پھیر سے بچنا۔"

"وہ تو ہے...... آپ کا نام کیا ہے؟"

"ست پرکاش...... ست پرکاش ہے میرا نام۔ بس، بیٹا کوئی نہیں ہے۔ یہ اکلوتی بیٹی ہے۔ سارا پریوار
میرے ساتھ ہی میری حویلی میں رہتا ہے اور سارے کے سارے عجیب و غریب چکر چلاتے رہتے ہیں۔
کیا بتاؤں مہاراج، آپ کو۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جیون جی کا جنجال بن چکا ہے۔ بیٹی پر کسی نے ایسا جادو کر
دیا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں کیا نہ کروں؟ اتنی ہنستی بولتی لڑکی تھی یہ مانسری۔ بس اب دیکھئے،
پتھر کا بت بن کر رہ گئی ہے۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ جگہ جگہ لئے پھر رہے ہیں۔ وید، حکیم، ڈاکٹر کچھ نہیں
چھوڑا ہم نے۔ وید حکیموں سے علاج کراتے کراتے تھک گئے ہیں۔ پھر بھی کچھ نہیں ہوتا۔ آپ بتائیے کیا
کریں اور کیا نہ کریں؟"

"ہاں، یہ تو ہے...... خیر ہو جائے گا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مہاراج، آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"ناگ چندر ہے ہمارا نام۔ وہ ہماری دھرم پتنی اور ہماری بیٹی ہیں۔ بس ٹھور ٹھکانہ تلاش کرنے جا
رہے تھے۔ جہاں رہتے تھے وہاں رہنے سے من اُکتا گیا۔ آبادی چھوڑ آئے۔ برے لوگوں کی بستی تھی۔
برائیاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ دل وہاں نہیں لگتا تھا۔ اپنی عزت بچا کر چل پڑے اور سوچ رہے تھے کہ کسی
دور دراز جگہ ڈیرا جما لیں۔"

"مہاراج، حویلی اتنی بڑی ہے کہ اس میں سو خاندان اور آ سکتے ہیں۔ آپ ہمارے معزز مہمان کی
حیثیت سے وہاں رہیں۔ جو کرنا چاہیں گے وہ کروا دیں گے آپ کو۔ ہمارے بڑے کاروبار ہیں۔ اور پھر
مہاراج آپ کی دیا سے بھگوان نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے کہ دو تین آدمیوں کا خرچہ تو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ پر
مہاراج، آپ گیانی ہیں۔ ہماری بیٹی کے لئے کچھ کریں۔"

"دیکھیں گے چل کر۔ کون، کون ہے؟ کیا، کیا ہے؟ دشمن کو تلاش کر کے آپ کے حوالے کر دیں۔ اور کچھ بتائیے سیٹھ صاحب؟"

"نہیں بھائی۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔" ست پرکاش نے نیاز مندی سے کہا۔

بہر حال ناگ چندر کو اس طرح کے لوگوں کی زیادہ پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دولت اکٹھی کرنے کے چکر میں یہ سارے چکر چلاتا رہتا تھا۔ لیکن اب اُسے دولت کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جن لوگوں کے لئے دولت اکٹھی کرنا چاہتا تھا ان لوگوں کا ہی اب سنسار سے کوئی رابطہ نہیں تھا تو بلاوجہ کی دولت جمع کرنے سے کوئی فائدہ؟ اُس نے اپنے دل میں یہ سوچا تھا کہ بس اُس کی زندگی کا مقصد تو صرف انتقام لینا ہے مولوی ایمان علی سے۔ انتقام......

کار کب کی حویلی پہنچ چکی تھی۔ بیل گاڑی بڑا لمبا سفر طے کرنے کے بعد جب اس عالی شان حویلی کے سامنے پہنچی تو ناگ چندر نے سوچا کہ سیٹھ ست پرکاش بہت بڑا سیٹھ ہے۔ اور یہ بات غلط نہیں تھی۔ حویلی بھی اتنی دُور تک پھیلی ہوئی تھی کہ اُس میں واقعی سو خاندان اور سما سکتے تھے۔ بہر حال ناگ چندر کو مہمان خانے لے جایا گیا اور پھر مہمان خانے میں ایک رہائش گاہ اُسے دے دی گئی جہاں وہ اپنی بیوی بیٹی کے ساتھ منتقل ہو گیا۔

بدری ناتھ کو اُس حویلی میں اچھی خاصی دلچسپی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حویلی کا جائے وقوع اچھا تھا کہ بدری ناتھ کے ذہن میں بہت سے منصوبے اُس کے بارے میں تھے۔ امر سنگھ کو وہاں گئے ہوئے دو تین دن گزر چکے تھے۔ بدری ناتھ نے جیون سنگھ سے کہا۔

"جیون سنگھ جی...... ذرا خبر تو لے لیجئے جا کر، امر سنگھ خیریت سے تو ہے؟ تین دن ہو چکے ہیں، کوئی کوئی رابطہ تو ہونا چاہئے۔ خبر تو لینی چاہئے اُس کی۔"

"جیسے آپ پسند کریں مہاراج۔ پر کہاں؟ حویلی جا کر معلوم کروں اُس کے بارے میں؟"

"تو اور کیا؟ اُس کا گھر تو خالی ہی ہوگا۔ اکیلا رہتا تھا وہ اپنے گھر میں۔ اب حویلی میں رہ رہا ہوگا۔"

"ہاں مہاراج، وہ تو حویلی ہی میں رہا ہوگا۔ پر میں اکیلا حویلی نہیں جاؤں گا۔"

"تو کسی کو اپنے ساتھ لے جائیے۔"

"آپ کیوں نہیں چلتے مہاراج؟"

"ارے، آپ کو نہیں معلوم میں کتنا مصروف ہوں؟"

"تھوڑا سا وقت نکال لیجئے۔ آخر حویلی کا سودا کرنا ہے آپ کو۔"

"ہوں...... چلئے ٹھیک ہے۔" پھر بدری ناتھ اور جیون سنگھ دونوں ہی حویلی پہنچے تھے۔ لیکن حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ دروازہ تک کھلا ہوا تھا۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے بنے ہوئے بنگلے اسی حویلی کا ویران منظر پیش کرتے تھے۔ بڑے رہائشی علاقوں میں رہنے والے آدھے بھوت ہیں۔ نہ کسی سے ملنا نہ کسی سے جلنا۔ اپنے آپ میں مست۔ یہی کیفیت اس علاقے کی تھی۔ بہر حال

تھوڑی دیر کے بعد یہ اندازہ ہو گیا کہ امر سنگھ حویلی میں نہیں ہے۔ وہ لوگ سخت پریشان ہو گئے تھے۔

"اِس کا مطلب ہے کہ حویلی میں امر سنگھ آیا ہی نہیں۔ ارے وہ پاپی تو بڑا بے ایمان نکلا۔ چلو اُسے اُس کے گھر پر پکڑتے ہیں۔ تیس ہزار روپے لے گیا میرے۔ ایسے تھوڑی چھوڑوں گا؟" بدری ناتھ، جیون سنگھ کو ساتھ لے کر امر سنگھ کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ امر سنگھ کی رہائش گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بدری ناتھ نے دروازہ بجایا تو امر سنگھ خود اُٹھ کر آیا۔ برا حلیہ ہو رہا تھا۔ شیو بڑھا ہوا تھا، حالت خراب تھی۔ کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ اُن دونوں کو دیکھ کر غصیلے لہجے میں بولا۔

"آئیے...... اندر آ جائیے۔"

"یہ تم گھر میں آرام کر رہے ہو؟ کہہ کر گئے تھے کہ حویلی جا رہا ہوں، وہیں رہوں گا۔"

"مہاراج، پچاس ہزار میں سودا ہوا ہے میرا آپ سے۔"

"ارے کیسا سودا؟ کہاں کا سودا؟ بے ایمانی کا سودا کر رہے تھے تم۔ کہہ رہے تھے کہ حویلی میں جا کر معلومات حاصل کروں گا اور اطلاع دُوں گا۔ یہ معلومات حاصل کر رہے ہو تم؟"

"میری بات سنئے جو میں کہہ رہا ہوں۔ پچاس ہزار میں سودا ہوا تھا نا آپ سے میرا؟"

"ہاں...... اور تیس ہزار تم نے ایڈوانس لے لئے تھے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ اب آپ ایسا کریں، میں ایک لاکھ میں آپ سے سودا کرتا ہوں۔ آپ پندرہ دن رہ آئیے وہاں جا کر۔"

"کیا مطلب......؟" بدری ناتھ نے چونک کر پوچھا۔

"ذرا میرا ہاتھ تو دیکھئے۔"

"کیوں...... کیا ہوا تمہارے ہاتھ کو؟"

"پکڑ کر تو دیکھئے۔" بدری ناتھ نے امر سنگھ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو اُنہیں پتہ چلا کہ امر سنگھ تو سخت بخار میں مبتلا ہے۔

"بخار آ رہا ہے تمہیں۔"

"ہاں۔"

"تو اس سے میرا کیا واسطہ؟"

"حویلی میں رہا تھا ایک رات۔ اور اُس رات میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا اسے دیکھ کر بھاگا تو آج تک بخار میں پڑا ہوا ہوں۔"

"ہیں...... کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟"

"جو کچھ ہوا تھا آپ کو بتاؤں تو آپ کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔"

"پہلے بتاؤ تو سہی بابا۔ لاکھوں روپے کا مسئلہ ہے۔ کیا ہوا تھا؟" بدری ناتھ نے کہا اور امر سنگھ نے اُسے پوری کہانی سنا دی۔ جیون سنگھ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ اُس نے کہا۔

"ارے باپ رے باپ...... بچ گئے سیٹھ صاحب ہم بال بال۔"

لیکن بدری ناتھ گہری نگاہوں سے امر سنگھ کا جائزہ لے رہے تھے۔ ''کہانی تو اچھی سنائی امر سنگھ جی۔ پر میں نہیں مانتا تمہاری اس کہانی کو۔ جھوٹ بول رہے ہو تم۔''

''تو کہہ دیا نا میں نے کہ ایک لاکھ روپے دُوں گا میں آپ کو۔ جا کر رہ آئیے وہاں۔''

''رہ تو میں آؤں لیکن ایک لاکھ تم سے وصول کون کرے گا؟''

''تو پھر بھاڑ میں جائیے میری طرف سے۔ حویلی آسیب زدہ ہے۔ اور نہ صرف آسیب زدہ اُسے مکڑی محل کہا جا سکتا ہے۔ وہاں ایسی ایسی ہولناک مکڑیاں ہیں کہ آپ دیکھیں گے تو دم ہی نکل آپ کا۔''

''تیرا مطلب ہے کہ وہ حویلی خریدنے کے قابل نہیں ہے؟''

''آپ ضرور خرید لیں۔ آپ جیسے کنجوس لوگوں کو ایسا ہی نقصان پہنچا چاہئے۔''

''ارے کمال کرتا ہے تو۔ ہم نے تیرا کیا بگاڑا ہے بھئی؟ یہ تو ایک کام تھا۔ چل کوئی بات نہیں۔ نہ سہی۔ ہمارے پیسے ہمیں واپس کر دے۔''

''سیٹھ جی، بیس ہزار روپے اور دے دیجئے مجھے۔ آپ کا کہنا ہی تھا کہ میں یہ معلوم کر کے بتا حویلی آسیب زدہ ہے یا نہیں؟ تو میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ وہاں آسیب ہے۔''

''ہم کیسے یقین کر لیں؟''

''ہاں، وہی ترکیب تو میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ میں نے تو یہ بات آپ کو بتا دی کہ وہاں آسیب اور آپ کو یقین کرنے کے لئے صرف ایک کام کرنا پڑے گا۔ اپنے ان جیون داس جی کو ساتھ لے ایک رات گزار آئیں۔ بس ایک رات میں آپ کو پتہ چل جائے گا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا جھوٹ۔''

''ارے تو کمال کرتا ہے۔ بھائی، میرا کیا قصور ہے اس میں؟ میں تو مان رہا ہوں یہ بات آسیب زدہ ہے اور میں نے پہلے ہی سیٹھ صاحب کو یہ بات بتائی تھی۔'' جیون سنگھ نے کہا۔

''اب سیٹھ صاحب ہر تجربہ خود کرنے کے عادی ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''مگر دیکھ، بات یہ ہوئی تھی کہ تو وہاں مہینہ بھر رہے گا تب ہم تجھے پچاس ہزار روپے ادا کر اب تو، تو ایک رات بھی وہاں نہیں رہا۔ اب کاہے کے پیسے لے گا؟ چل تیس ہزار میں سے بیا واپس کر دے۔ دس ہزار تو رکھ لے۔ تجھے پریشانی ہوئی ہے۔''

''سیٹھ جی، بے ایمانی کر رہے ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم میرے بیس ہزار کھا جاؤ گے تو ایک با تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ میرا نام بھی امر سنگھ ہے۔ اور تو کچھ نہیں کروں گا، کسی دن پکڑ کر لے جا آپ کو اور حویلی میں چھوڑ دُوں گا۔ دروازہ باہر سے بند کر دُوں گا۔ پھر دیکھئے تماشہ کیا ہوتا ہے۔''

''تیرا ستیاناس۔ بھائی، چل یہ کچھ نہیں دے گا۔ ڈوب گئے تیس ہزار۔ حویلی پر لعنت بھیج۔ ایسی زدہ حویلی خرید کر ہم لوگ کیا کریں گے؟ جان کا اکال بنی رہے گی۔ بنسی لعل آئے تو اُسے منع کر دینا نہیں خریدنی۔''

بہر حال، ایسا ہی کیا گیا۔ تیس ہزار کی یہ چوٹ سیٹھ کو لگ گئی تھی۔ سخت مغموم ہو گئے تھے۔ بنسی

تو اُسے برا بھلا کہنے لگے۔

''بنسی لعل، اپنی برائی ہمیں سونپ رہے ہو۔ بھلا کیا کرنا ہے ہمیں اس حویلی کا جس میں آسیب ہی آسیب ہے۔''

''آپ کی مرضی ہے سیٹھ صاحب۔ میں نے تو آپ کو مجبور نہیں کیا۔ پڑی رہنے دیتا ہوں۔ اگر اس کا کبھی گاہک لگ گیا تو ٹھیک ہے ورنہ تقدیر۔'' بنسی لعل نے گردن ہلائی۔ ویسے بھی اب اُس کے جیون میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بیوی میکے میں تھی، اکلوتے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، ماں مر گئی تھی۔ حویلی کی نحوست کا اُسے پورا پورا احساس تھا۔ غم کا مارا بنسی بڑی مشکل سے اپنے کاروبار کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

ادھر پانچوں خوفناک لڑکیاں حویلی میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی تھیں۔ اُنہوں نے امر سنگھ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس پر خود ہی پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستی رہی تھیں۔ اُن کے لئے خود مکڑی بن جانا اور بہت سی مکڑیوں کو جمع کر لینا بھلا کون سا مشکل کام تھا؟ امر سنگھ بھاگ گیا تو روپا نے کہا۔

''ایک بات میں نے ابھی ابھی سوچی ہے۔ تم لوگ کیا کہتی ہو اس سلسلے میں؟''

''کون سی بات؟''

''دیکھو لوگ یہاں آتے رہیں گے اور ہم اُنہیں ڈرا ڈرا کر بھگاتے رہیں گے۔ اس طرح ہم حویلی کو وہ شکل نہیں دے سکیں گے جو ہم اسے دینا چاہتے ہیں۔ زندگی کو اچھے انداز میں آگے بڑھانے کے لئے اور اپنے ماحول کو اچھا بنانے کے لئے اس حویلی کی شکل بھی بدلنا ہوگی۔ لیکن ایسے چوری چھپے تو ہم اسے بھوت محل کی شکل ہی دے سکیں گے، کیا خیال ہے؟''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔ مگر پھر کیا، کیا جائے؟''

''بنسی لعل سے اس حویلی کو خریدتے ہیں ہم۔''

''ارے ہاں، ایسا تو ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر اشیش بھگونت سے بات کی جائے؟''

''ہاں...... اشیش بھگونت نے جو ہمیں آزادی دی ہے وہ کیوں نہ ہم استعمال کریں؟ دولت کا حصول کون سا مشکل کام ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ میں مل لیتی ہوں بنسی لعل سے۔ اور رما، تم میرے ساتھ چلو گی۔'' روپا نے ایک عمر رسیدہ عورت کی شکل اختیار کی اور رما اُس کا ڈرائیور بن گئی۔ ایک شاندار گاڑی کا حصول اُن کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ چنانچہ کار میں بیٹھ کر وہ بنسی لعل کے پاس پہنچیں۔

''تمہاری ایک حویلی وہاں پڑی ہوئی ہے۔ بڑا ویران کر رکھا ہے تم نے اُسے۔ اگر وہاں رہنا چاہتے ہو تو دوسری بات ہے ورنہ مناسب سمجھو تو اسے ہمارے ہاتھ فروخت کر دو۔''

''میں اُسے بیچنا چاہتا ہوں۔''

سودے بازی ہوئی اور روپا نے ایک بڑا بیعانہ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''تم اس کے کاغذات بنوا کر ہمارے نام منتقل کر دو۔ اور یہ رقم وصول کر لو۔ یہ مسئلہ طے ہو گیا۔''

روپا اپنی اُسی شکل میں واپس آئی تھی۔ رما مردہ بنی ہوئی تھی۔ روپا نے کہا۔ ”حویلی میں ہمیں ملازم رکھنے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس کی صفائی ستھرائی اور ساز و سامان کی تیاری شروع ہیں۔“

”ہاں یہ مناسب ہے۔“ بھلا شیطان کے شاگردوں کے لئے یہ کون سا مشکل کام تھا؟ چنا روپ بدلنے لگا۔ درجن بھر مالی وہاں کام کرنے لگے۔ بہت سے ملازم بھی آ گئے اور روپ دیو وتی حویلی کی مالک کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آتی۔ باقی چاروں لڑکیاں پھر سے اپنی اصل گئی تھیں۔ گھر میں دو دو شاندار چمچماتی کاریں۔ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر لڑکیاں خوشی سے دیوا تھیں اور سوچتی تھیں کہ اُن کا باپ تو اُنہیں اس کا ایک فیصد بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اب چونکہ ا ذہنوں پر شیطان مسلط تھا اس لئے ماں باپ کی اُن کے ذہنوں میں کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔

ست پرکاش کی شاندار حویلی میں زندگی رواں دواں تھی۔ شیطان نے ناگ چندر کو ایک نیا دیا تھا۔ اب اُس کے جسم پر گوشت تھا لیکن یہ سب کچھ شیطان کا دیا ہوا تھا۔ زندگی کے چند چندر نے ایک انسانی ڈھانچے کی شکل میں گزارے تھے اور اُس پر جو بیتی تھی اُس کا دل ہی جانت طرح سے وہ موت سے آشنا ہو گیا تھا۔ اشیش بھگونت کے سلسلے میں اُس کی جو رہنمائی ہوئی تھی جواب نہیں تھا۔ پھر اس کے بعد اشیش بھگونت کے اشارے پر ہی وہ سیٹھ پرکاش کے گھر آ گیا کام دکھا دیئے تھے اُس نے جنہوں نے ست پرکاش کو ناگ چندر کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ کے چند گھنٹوں کے بعد ہی ست پرکاش اور اُس کی دھرم پتنی دیوا سری، ناگ چندر کے پاس پہنچ

ناگ چندر نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اُن کا سواگت کیا اور بولا۔ ”مہاراج نے بڑی عزت دی۔

”آپ تو اس سے کہیں زیادہ عزت کے حق دار ہیں مہاراج۔ ہماری مشکل میں ہمارا سا جیون بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھول سکیں گے۔“

”آپ نے اپنی مشکل نہیں بتائی مہاراج؟“

”بس، جیسا کہ میں نے معمولی سی بات آپ کو بتائی تھی کہ پریوار میں ایسے دشمن بھی آستین بنے بیٹھے ہیں جو جینے نہیں دینا چاہتے۔ مانسری میری اکیلی بیٹی ہے۔ اس پر جادو کرایا گیا ہے۔ اس جادو کا توڑ کرنا ہے آپ کو۔“

ناگ چندر کے اندر چھپی ہوئی تمام شیطانی قوتیں اُبھر آئیں۔ اور اب تو وہ شیطان کا پیروکار بن گیا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”یہ کون سی بڑی بات ہے مہاراج؟ دودھ کا دودھ اور پانی کا میں ہو جائے گا۔ میں تین دن کا جاپ کروں گا اور مانسری پر کیئے گئے جادو کا توڑ ہو جائے گا۔ آپ سن لیجئے، جب توڑ کیا جاتا ہے تو پھر دوسرے آدمی کو نقصان پہنچتا ہے۔ وہ جو کچھ کر چکا ہ اپنے کرموں کا پھل ملتا ہے۔ اگر وہ آپ کا کوئی اپنا ہی ہے تو آپ سمجھ لیجئے کہ اُس کا نقصان نقصان نہ پہنچا دے۔“

”مانسری میری اکلوتی بیٹی ہے۔ کوئی بھی اگر میری بیٹی کا دشمن ہوتا ہے تو پھر وہ میرا دوست تو نہیں ہوا، دشمن ہی ہوا میرا۔ اور دشمن کو اگر نقصان پہنچ جائے تو پھر چنتا تو نہیں کرنی چاہئے۔“

”ٹھیک ہے مہاراج..... تو پھر آپ تماشہ دیکھئے۔ لیکن ایک بات ہے، ابھی کسی کو کچھ بتائیے نہیں میرے بارے میں۔“

”نہیں..... کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

”اچھا یہ بتائیے کہ شمشان گھاٹ کہاں ہے؟“

”بالکل پیچھے ہی ہے۔“

”بس ٹھیک ہے۔ میں تلاش کر لوں گا۔“ ناگ چندر تو ان کاموں کا ماہر ہی تھا۔ اُس نے سوچا کہ یہاں قدم جمانے کے لئے ضروری ہے کہ ست پرکاش کا کام کر دیا جائے اور یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال اسی رات وہ بارہ بجے حویلی سے باہر نکل آیا اور شمشان گھاٹ کی جانب چل پڑا۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا، درختوں پر پرندے تک سوئے ہوئے تھے۔ بہت دُور کسی مرگھٹ میں جلی ہوئی چتا کے کچھ انگارے راکھ میں چھپے ہوئے رہ گئے تھے اور رات کی تاریکی نے اُنہیں روشن کر رکھا تھا۔ کہیں سے گیدڑوں کی ہو ہو کی آوازیں بھی آ رہی تھیں..... ایک درخت کی جڑ میں ناگ کی پھنکار بھی سنائی دی تھی جیسے کوئی گراری چل رہی ہو۔ ناگ چندر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ شمشان گھاٹ پہنچ گیا۔ اُس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ جلی ہوئی ہڈیاں، بجھی ہوئی چتائیں، انسانی جسم کے مختلف اجزاء، بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہڈیاں چمک رہی تھیں۔ فاسفورس کا پاؤڈر جگہ جگہ پھیلا ہوا تھا۔ اور پھر ناگ چندر کو اُس کی مطلوبہ چیز مل گئی..... یہ ایک انسانی کھوپڑی تھی جو ایک پتھر کی اوٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ ناگ چندر آگے بڑھا اور اُس نے یہ کھوپڑی اُٹھا لی۔ خوب غور کر کے اُسے دیکھا اور پھر اس کے بعد اُسے اپنی پسند کی چیز سمجھ کر وہاں سے لے چلا۔

لیکن ابھی چند قدم چلا ہوگا کہ اُسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک غبار سا اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا..... ناگ چندر مڑ کر بولا۔

”کیا ہے رے..... کھوپڑی مانگ رہا ہے اپنی؟ ارے یہ تو ویسے بھی تیرے کام کی نہیں تھی۔ ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی یہ۔ اب میں اس پر اپنا منتر پڑھوں گا اور یہ کھوپڑی کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ جا بھاگ جا..... میرا پیچھا مت کر۔“

”نہیں..... یہ مجھے دے دے..... یہ میرا سر ہے۔ بڑی حفاظت کی تھی میں نے اس کی..... دے دے۔ مجھے دے دے.....“ منمناتی آواز اُس کا تعاقب کرتی رہی۔ کوئی اور ہوتا تو اب تک اُس کے دل کی حرکت بند ہو چکی ہوتی۔ لیکن ناگ چندر ایسی باتوں کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ کھوپڑی لئے ہوئے وہ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ حویلی میں داخل ہو گیا۔ یہ کھوپڑی اُس کے کام کی چیز تھی۔ کم از کم ست پرکاش جی کا کام کرنے کے لئے اُسے یہ کھوپڑی درکار تھی۔ اُس نے اُسی رات اپنے عمل کا آغاز کر دیا۔ کھوپڑی پر

اُس نے منتر پڑھنا شروع کر دیا اور صبح کی روشنی پھوٹنے سے پہلے تک وہ منتر پڑھتا رہا۔ اس کے بع
نے کھوپڑی کو ایک الماری میں بند کر دیا۔ پھر یہی عمل اُس نے دوسرے دن کیا۔ تیسرے دن کا عمل کر
سے پہلے اُس نے ست پرکاش جی سے کہا۔

''ہاں ست پرکاش جی...... میرا اپنا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اب آپ یہ بتایئے کہ آپ تیار ہیں کہ
آپ کے دشمن کو آپ کے سامنے پیش کر دُوں؟''

''ہاں مہاراج، کیوں نہیں۔ ایسا ہی کرنا ہے آپ کو۔''

''ٹھیک ہے...... تو پھر تیار ہو جایئے اور آدھی رات گزرنے کے بعد میرے پاس آ جایئے۔ دیوا
جی چاہیں تو اُنہیں بھی لیتے آیئے۔''

''میں آ جاؤں گا۔'' ست پرکاش نے کہا۔ اُسے ناگ چندر سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔

آدھی رات کو ست پرکاش، ناگ چندر کے پاس آ گیا۔ دیواسری بھی ساتھ تھیں۔ ناگ چندر ا
لئے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آ گیا۔ اس دوران اپنی پتنی اور بیٹی سے اُس کا کوئی رابطہ نہیں رہا
دھرم وتی کی شکل میں امینہ موجود تھی اور بھاگ بھری بے چاری تو کچھ تھی ہی نہیں۔ عام طور سے بے
تھلگ ہی رہا کرتی تھیں۔ امینہ بھی بالکل خاموش رہتی تھی۔ اُس نے بڑی منتیں کی تھیں ناگ چندر کی
ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہا تھا کہ اُس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ناگ چندر اسے کیوں مصیبت میں ڈالے ہوئے
لیکن ناگ چندر کے دل میں انتقام کا جو جوالا مکھی اُبل رہا تھا اس کو کہیں قرار نہیں تھا۔ البتہ اس طرف
اُلجھ گیا تھا۔ اور اُدھر امینہ نے اپنے طور پر ایک اور فیصلہ کیا تھا، وہ فیصلہ یہ تھا کہ جیسے بھی بن پڑے اس
سے نکل جائے۔ ویسے تو ناگ چندر نے اُن لوگوں کو ایک طرح سے قیدی بنا لیا تھا لیکن یہاں اس
میں آ کر اس بات کے مواقع مل رہے تھے کہ اگر تھوڑی سی ہمت کرے تو وہ حویلی کی دیوار کود کر بھاگ
ہے۔ اور جس وقت اُسے موقع مل گیا تو وہ جو کر سکتی ہے وہی کرے گی۔ چنانچہ وہ بھی آج ہی کی ا
تیاری کئے ہوئے تھی۔

اُدھر ناگ چندر مہاراج بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے تھے۔ جب دیواسری اور ست پرکاش ا
کر بیٹھ گئے تو ناگ چندر نے الماری سے وہ کھوپڑی نکالی اور اُس پر اپنا آخری منتر پڑھنے لگا۔ ست پرا
اور دیواسری یہ کھوپڑی دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ناگ چندر نے کہا۔

''اب وہ رسیوں سے بندھ کر چلا آئے گا جس نے آپ کی بیٹی پر جادو کرایا ہے۔ آپ اُسے دیکھ
اور جو کچھ بھی اُس پر گزرے آپ برداشت کر لیجئے۔''

بہر حال اس کے بعد ناگ چندر نے اپنا منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ دیواسری اور ست پرکاش
خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ہی کھوپڑی کا منہ کھلا اور اُس میں سے شعلے نکلنے لگے...... پھر اُس
آنکھوں سے روشنی کی ایک لکیر نکلی اور یہ لکیر اپنی جگہ سے بلند ہو کر ایک روشن دان سے باہر نکل گئی۔
دیر نہیں گزری تھی کہ دروازہ کھلا اور کوئی چیختا چلاتا اندر داخل ہو گیا۔ ''ہرے رام...... ہرے میری ما
ہرے یہ کیا ہو گیا رے...... کیا ہے رے...... کون ہے...... ارے کس نے مجھے پکڑ رکھا ہے......

رے...... چھوڑو۔'' آنے والی کوئی عورت تھی۔ بھاری جسامت کی مالک۔ دھوتی باندھے ہوئے۔ آخر کار
دروازے سے اندر آ گئی اور ست پرکاش کے منہ سے حیرت بھری آواز نکلی۔

''نندی...... تو؟''

''ہرے رام...... یہ کیا ہو رہا ہے بھیا جی...... یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ دیکھیں تو سہی کسی نے مجھے پکڑ رکھا
ہے...... میرے بدن میں آگ لگ گئی ہے...... کسی نے مجھے پکڑ رکھا ہے۔ مجھے چھڑایئے۔''

''مہاراج...... مہاراج...... یہ...... یہ تو میری بہن ہے...... یہ تو میری بہن ہے نندنی۔''

''کیوں نندنی...... کس سے کرایا تھا تو نے مانسری پر جادو؟''

''ہرے مجھے چھوڑ تو دو...... ارے مجھے چھوڑ دو...... میرا شریر جل رہا ہے۔''

''ابھی تو تیری شکل بگڑ جائے گی۔ تو اندھی ہو جائے گی۔ تیرے سارے دانت ٹوٹ جائیں گے۔
تیرے ہاتھ مڑ جائیں گے۔ صرف تیرے پیر باقی رہیں گے جن سے تو چل سکے گی۔ یہ سارے کام ہونے
والے ہیں تیرے ساتھ۔''

''ارے نہیں...... معاف کر دو مجھے...... معاف کر دو۔''

''میں پوچھ رہا تھا کہ مانسری پر جادو کس سے کرایا ہے؟''

''بھگوان کی سوگند...... غلطی ہو گئی مجھ سے...... مجھے معاف کر دو......''

دیواسری اور ست پرکاش حیرت سے منہ کھول کر رہ گئے تھے۔ ناگ چندر نے کہا۔ ''کیوں جادو کرایا
تھا تو نے اُس پر۔''

''مارنا چاہتی تھی میں اُسے...... مارنا چاہتی تھی۔ میں ست پرکاش کی بہن ہوں...... سگی بہن۔ میری دو
بیٹیاں ہیں۔ بیوہ ہوں میں۔ ان بیٹیوں کا سرپرست اور کوئی نہیں ہے۔ ست پرکاش میری بیٹیوں سے
بہت محبت کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر مانسری بیچ میں نہ رہے تو پھر ست پرکاش کے لئے میری بیٹیوں
کے علاوہ اور کوئی نہیں رہ جائے گا اور وہ اپنی ساری دولت انہی پر خرچ کر دے گا۔ لالچ تھا مجھے...... اس
لالچ میں، میں ایک کالے علم والے کے پاس گئی اور اُس سے مانسری پر جادو کروا دیا۔ پر اب مجھے معاف
کر دو...... غلطی ہو گئی مجھ سے۔''

''نندنی...... میری بہن ہو کر تو نے میری اکلوتی بیٹی پر وار کیا ہے۔''

''غلطی ہو گئی...... غلطی ہو گئی۔''

''تو پھر اس کی سزا بھگت نندنی...... ٹھیک ہے مہاراج، بہن تھی یہ میری۔ اب نہیں ہے۔ آپ اس کے
ساتھ جو من چاہے کریں۔''

اچانک ہی نندنی کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ اُس کے دونوں ہاتھ مفلوج ہو گئے تھے۔ پھر اُس کی
آنکھیں بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئیں...... اُس کے سارے دانت ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے اور اب وہ
کچھ بول بھی نہیں رہی تھی۔

''یہ نتیجہ نکلا ہے اس کا...... آپ کہیں تو میں اسے بالکل جان سے مار دُوں؟''

"نہیں، اسے زندہ رہنے دو۔ تاکہ یہ سوچتی رہے اور غم کرتی رہے۔ اسے احساس ہو کہ اس نے
تھا اور اس کا صلہ پایا ہے۔ جاؤ دیواسری، اسے اس کی جگہ چھوڑ دو۔ جے ہو مہاراج کی، آپ کا
ہے کیا اب میری بیٹی ٹھیک ہو جائے گی؟"
"وہ ٹھیک ہو گئی ہے۔ آرام سے سو رہی ہے، مگر اُسے ابھی جگانا نہیں۔ صبح کو اپنی مرضی سے جا
تب دیکھ لینا۔"
"اگر ایسا ہو گیا ہے مہاراج، تو آپ نے ہمارے اوپر بڑا احسان کیا ہے۔"
"آپ کی ایک بات مجھے بڑی عجیب لگ رہی ہے مہاراج۔"
"ایں...... کون سی بات؟"
"آپ کی بیٹی پر جس نے جادو کرایا ہے وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے اور اسے سزا بھی مل گئی ہے
کے باوجود آپ کہہ رہے ہیں کہ اگر ایسا ہو گیا ہے تو، آپ کو اب بھی شبہ ہے۔"
"یہ بات نہیں ہے مہاراج۔ اصل میں کسی گہرے زخمی کو اپنے زخم میں جو تکلیف ہوتی ہے وہ
آسانی سے تو نہیں بھول جاتا۔ اگر اچانک ہی اس کے زخم ٹھیک ہو جائیں تو مہاراج اُسے اس پر یقین
آتا۔ میں بھی ایسا ہی ایک گھائل ہوں۔ آپ میری بات پر غور نہ کریں بے شک، نندنی ایک
حیثیت سے میرے سامنے آئی ہے۔ آپ نہیں جانتے مہاراج میں نے اسے بہن کا پورا پورا مان دیا
اور کبھی اسے غیر نہیں سمجھا۔ لیکن اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔ میں نے تو اس کی بیٹیوں کو اپنی
سے کم نہیں سمجھا تھا۔ پر یہ سب کچھ ہتھیانے کے چکر میں پڑ گئی۔"
"سنسار میں کس کے لئے کیا کہا جائے مہاراج۔ مجھے بھی آپ اسی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔"
"ارے نہیں نہیں...... بھول ہو گئی۔ پیروں میں گر کر معافی مانگتے ہیں ہم آپ سے۔" ست پرکاش
بچ ناگ چندر کے پیروں میں گر گیا تھا۔ ناگ چندر نے جلدی سے اُسے اُٹھایا اور بولا۔
"چلئے کوئی بات نہیں۔ بہر حال، ٹھیک ہے۔ آپ نتیجہ دیکھ لیجئے اور مجھے بتایئے۔"
اور ایسا ہی ہوا تھا۔ ناگ چندر کی کوششوں سے ست پرکاش کی بیٹی بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ اور دوسرے دن
ہی صبح ست پرکاش نازل ہو گیا تھا۔ اُس نے ناگ چندر کے پاؤں چھوئے اور خوشی بھری آواز میں بولا
"مہاراج...... بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ نیا جیون دے دیا مجھے تو آپ نے۔ میری بیٹی ٹھیک ہو گئی
مہاراج۔"
ست پرکاش حسرت بھرے انداز میں سوچنے لگا کہ سب کچھ تو ٹھیک ہو گیا لیکن میں اب اُسے ٹھیک
نہیں کر سکتا جس کے ٹھیک ہونے سے مجھے نئی زندگی مل سکتی ہے......!
ادھر یہ سارے کام ہو رہے تھے۔ ناگ چندر کو شیطانی قوتیں حاصل ہوتی جا رہی تھیں اور وہ شیطان کا
پیروکار بنتا جا رہا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ شیطان نے اُسے یہاں کس مقصد کے تحت بھیجا ہے؟ لیکن
پر شیطان کی کوئی ایسی کوشش ہو گی جسے وہ یہاں پوری کرنا چاہتا ہو گا۔ لیکن ابھی تک ناگ چندر کو اس کے
بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

البتہ دھرم وتی کے جسم میں قید امینہ کو یہاں آ کر کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ کئی دن گزر چکے تھے اور وہ
معمول کے مطابق یہاں رہ رہی تھیں۔ ناگ چندر کی کیفیت عجیب تھی۔ وہ اُس کے پاس آتا تھا، اُس کا سر
سینے سے لگاتا تھا اور پھر زار و قطار رونے لگتا تھا۔ وہ اُسے دھرم وتی کہہ کر پکارتا تھا اور بلک بلک کر روتے
ہوئے کہتا تھا۔
"پیسہ تو ملا مجھے اس کام سے۔ میری بچی، تو مجھ سے چھن گئی۔ ہائے کیسے صبر کروں؟ دل چاہتا ہے
ساری دنیا کو کوئلے کا ڈھیر بنا دوں...... تو کہاں سے آئے گی اب میرے پاس؟ تجھے کیسے حاصل کروں؟
اب تو سمے بھی بیتا جا رہا ہے۔ اشیش بھگونت ہی تیرا شریر قائم رکھ سکتا ہے۔ کیسے اُس سے تیرا جیون مانگوں؟
وہ تو جیون دے بھی نہیں سکتا۔"
بہر حال، امینہ کو کبھی کبھی اُس کی آہ و زاری پر ترس بھی آ جاتا تھا۔ لیکنی دوسری طرف اُسے اپنے ماں
باپ یاد آتے تھے۔ پتہ نہیں بیچاروں کا کیا حال ہو گا؟ بات اُس کے علم میں آ گئی تھی۔ جسم بدل گئے تھے،
روحیں جسموں کی قیدی بنا دی گئی تھیں۔ بس اس سے زیادہ ناگ چندر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ جو بھی ہو
گیا تھا وہ بڑا دردناک تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا، کیا جائے؟ یہاں تک کہ امینہ اس جسم میں قید ہو کر
یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ ست پرکاش کی حویلی میں ذرا آزادی کا احساس ہوا تھا۔ ویسے تو ناگ چندر کی
رہائش گاہ میں بھی ناگ چندر ہر وقت اُس پر مسلط نہیں رہتا تھا لیکن یہاں کی صورتحال دوسری تھی۔ وہاں
دو جادو کے بیر اُن کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ یہاں ناگ چندر ذرا مطمئن ہو گیا تھا۔ چنانچہ امینہ سوچنے
لگی کہ کیوں نہ اب یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی جائے؟ تقدیر جہاں بھی لے جائے یہ بعد کی بات
ہے۔ کم از کم اس جادوگر کے چنگل سے تو نکلنا چاہئے۔ اور اب وہ دن رات حالات پر نظر رکھنے لگی تھی۔
کچھ نہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی وہ۔
آخر کار ایک رات جب ناگ چندر گہری نیند سو رہا تھا اور ایک گوشے میں بھاگ بھری بھی سر جھکائے
اونگھ رہی تھی، امینہ نے نگاہیں اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد
وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ سن گن لیتی رہی۔ اس کے بعد اُس نے دروازہ کھولا اور پھر مہمان خانے کے
عقبی حصے کی جانب چل پڑی۔ حویلی کے دروازے پر تو پہرے دار ہوا کرتے تھے، لیکن کی اس داہنی سمت
مٹی کا ایک ایسا ڈھیر پڑا ہوا تھا جو دیوار تک پہنچنے میں مدد دے سکتا تھا۔ وہ اس ڈھیر پر چڑھ کر دیوار پر
چڑھی اور پھر اللہ کا نام لے کر دوسری جانب کود پڑی۔ کوئی چوٹ وغیرہ تو اُسے لگی نہیں تھی۔ دوڑتی ہوئی
وہاں سے آگے بڑھ گئی اور اس کے بعد تو اُس نے اپنے جسم کی پوری قوت سے دوڑنا شروع کر دیا۔ اُس
کے دل میں ایک ہی تصور تھا، اس وقت کہیں سے اُسے کوئی ایسی مدد مل جائے جو اُسے بچا لے۔ بس برق
رفتاری سے دوڑ رہی تھی اور اپنے بدن کی پوری قوت سے دوڑ رہی تھی۔
نجانے کتنا فاصلہ طے ہوا؟ اُس کا جسم بری طرح تھک گیا تھا۔ پھر اُسے ہوش آیا اور اُس نے حیران
ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ جنگل بیابان تھا...... دُور دُور تک کسی کا وجود نہیں ملتا تھا۔ اُسے ایک دم اپنے بدن کی
تھکن کا احساس ہوا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک درخت کی جانب بڑھ گئی۔ بڑا چھوٹا درخت تھا جس کی

ڈالیاں بہت لمبی تھیں۔ وہ درخت کی جڑ میں بیٹھ گئی۔ بدن دُکھ رہا تھا، دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا، حواس رخصت ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔

دفعتہً ہی ایک آہٹ سی ہوئی اور اُسے یوں لگا جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو اور پاؤں رگڑ رہا ہو...... وہ ایک دم اُچھل پڑی اور اُس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی پرندہ یا جانور ہو...... لیکن اُس نے اس مسئلے کو اس طرح نہیں چھوڑا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گئی تھی اور پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر درخت کے عقبی حصے میں پہنچی اور دوسرے لمحے آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں......

پچھلی سمت ایک نوجوان اور خوبصورت سی لڑکی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ وہ ہوش میں تھی اور رحم طلب نگاہوں سے امینہ کو دیکھ رہی تھی جو دھرم وتی کے جسم میں تھی۔ کچھ لمحے تو امینہ کے ذہن پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی، لیکن پھر اُسے ہوش آیا۔ وہ جلدی سے جھکی اور اُس نے پہلے لڑکی کے منہ سے کپڑا نکالا، پھر اُس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔ لڑکی سسکنے لگی تھی۔ امینہ اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس نے لڑکی کا سر اپنی گود میں رکھا۔

"رو نہیں۔ کیا ہوا؟ کون ہو تم...... کیسے یہاں پہنچیں کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ...... مجھے بتاؤ، سنبھالو اپنے آپ کو......"

"نکل چلو یہاں سے...... نکل چلو۔ اگر وہ واپس آگئے تو ہم مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے...... نکل چلتے ہیں۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ وہ تمہیں باندھ کر یہاں ڈال گئے ہیں!! ہم یہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی جگہ چلتے ہیں جہاں دوبارہ اگر وہ آبھی جائیں تو ہم اُن کی نگاہوں میں نہ آ سکیں۔ آؤ اُٹھو، میرا ساتھ دو۔" امینہ نے لڑکی کو اُٹھایا اور اس کے بعد دونوں وہاں سے چل پڑیں۔ کچھ دُور نکلنے کے بعد ایک ایسی جگہ نظر آئی جہاں پہاڑی ٹیلے سے بنے ہوئے تھے اور ان ٹیلوں میں چھپنے کے لئے محفوظ جگہ تھی۔ ایک جگہ تو بہت ہی اچھی تھی جہاں لمبی لمبی جھاڑیاں تھیں اور ایسا کٹاؤ بنا ہوا تھا جس میں دو کیا دس آدمی بھی چھپ جائیں تو ان کے بارے میں پتہ نہ چلے۔ جھاڑیوں کی آڑ میں یوں دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ان جھاڑیوں کے پیچھے چلی گئیں یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہاں کوئی کیڑا یا سانپ وغیرہ بھی ہو۔ بہرحال یہاں پہنچنے کے بعد لڑکی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"میرا نام شہزادی ہے اور میں ایک بستی نظام پور میں رہتی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ نظام پور کس طرف ہے؟ بس یوں سمجھ لو کہ نظام پور کے آس پاس چنوں کے کھیت بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ کھیت میرے ابا کے ہیں۔ میرے باپ چنوں کے بہت بڑے بیوپاری کہلاتے ہیں۔ بس جو لوگ مجھے یہاں پر اُٹھا کر لائے ہیں وہ ڈاکو تھے اور میرے باپ سے رقم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس وقت سب کے سب گئے ہوئے تھے کہ تم وہاں پہنچ گئیں۔"

"اگر وہ ڈاکو ہیں تو اُن کا کوئی ڈیرا ویرا نہیں ہے؟ یہاں کھلے علاقے میں تمہیں کیوں ڈال دیا انہوں نے؟"

"میرے باپ کے بہت وسیع تعلقات ہیں۔ اُنہوں نے دُور دراز تک آدمی پھیلا دیئے ہیں۔ ڈاکوؤں کا ڈیرا بھی اُنہیں پتہ چل گیا ہے۔ یہ بات اُنہی ڈاکوؤں کی باتوں سے مجھے پتہ چلی ہے۔ اور ڈیرے پر اس وقت میرے باپ کے آدمیوں کا قبضہ ہے۔ ڈاکو ڈیرے پر واپس نہیں جاسکتے۔ پکڑے جائیں گے۔ اس وقت بھی وہ اپنی جان بچاتے پھر رہے ہیں۔ لیکن بہرحال اُنہوں نے مجھے یہاں اسی لئے ڈال رکھا ہے۔"

"مجھے بہت افسوس ہوا شہزادی تمہاری یہ کہانی سن کر۔"

"مگر تم کون ہو؟ اور یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایسے ویران جنگل میں جہاں ڈاکو اسے اتنا محفوظ سمجھتے ہوں کہ باندھ کر ڈال دیں تم کیسے پہنچ گئیں؟"

امینہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ پھر اُس نے کہا۔ "بعض مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں بتاتے ہوئے خود اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے۔ بس سمجھ لو کہ میں ایک ایسی ہی مصیبت زدہ ہوں۔ میرے بھی کچھ دشمن ہیں جن سے جان بچا کر بھاگی ہوں۔"

"ماں باپ نہیں ہیں؟" شہزادی نے پوچھا تو امینہ ایک دم سسک پڑی۔

"ہیں...... اللہ تعالیٰ اُنہیں قائم و دائم رکھے۔ سب ہیں۔"

"اوہو...... نہیں، میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ وہ تو تمہارے لئے بے حد پریشان ہوں گے۔"

"ہاں بالکل...... میرا ہی سارا معاملہ ہے۔"

بہرحال، وہ باتیں کرتی رہیں۔ بہت وقت گزر گیا اور اس کے بعد امینہ نے کہا۔ "ڈاکو تو نظر نہیں آئے۔ کیا خیال ہے، ہم تمہاری بستی تلاش کریں؟"

"اور اگر وہ راستے میں مل گئے تو؟"

"سب کچھ اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے۔ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ وہ یہاں بھی ہم کو تلاش کرسکتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔ میرے ابو میرے لئے دیوانے ہو رہے ہوں گے۔ وہ مجھے بے پناہ چاہتے ہیں۔"

اِدھر یہ دونوں لڑکیاں یہ باتیں کر رہی تھیں اور اُدھر درحقیقت زاہد علی جو جاگیردار اور زمیندار ہونے کے باوجود ایک نیک دل انسان تھا بیٹی کے غم میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ رو رو کر دُعائیں مانگ رہا تھا، ڈاکوؤں کو رقم دینے پر بھی آمادہ تھا۔ اپنے طور پر بھی اُس نے انتظامات کر رکھے تھے۔ لیکن بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ تب اُس نے آنکھیں بند کر کے اپنے بزرگ کا بخشا ہوا وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس سے یہ انکشاف ہو جاتا تھا کہ گمشدہ انسان یا چیزیں اُسے حاصل ہو جائیں گی یا نہیں؟ رات کو خواب میں اُس نے دیکھا کہ اُس کی بیٹی اپنے قدموں سے چلتی ہوئی اُس کے پاس پہنچی۔ اور اُس کے ساتھ ایک ایسی شخصیت ہے جس کے چہرے کا کوئی نقش نہیں ہے۔ وہ بالکل گمنام سا وجود ہے۔ لڑکی اُسی کا ہاتھ پکڑے چلی آرہی ہے۔ اس سے زاہد علی کو یہ اطمینان ہوا کہ بہرحال شہزادی واپس آجائے گی۔ لیکن پھر بھی باپ

کے دل کو کہاں قرار ہوتا ہے۔ صبح کو اُس نے یہ خواب اپنی بیوی کو سنایا۔ بیوی کی حالت بھی خراب ہو رہی تھی
لیکن دوپہر کو بارہ بجے کے قریب بہت سے لوگ حویلی کے سامنے شور مچاتے ہوئے نظر آئے
دوڑے دوڑے اس طرف آ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''زمیندار صاحب...... زمیندار صاحب
شہزادی واپس آ گئی...... وہ واپس آ گئی۔''

شہزادی، امینہ کے ساتھ طویل ترین فاصلہ طے کر کے آخر کار نظام پور بستی تلاش کرنے میں کامیاب ہو
گئی تھی۔ پھر امینہ کو بھی وہ عزت اور احترام دیا گیا کہ اُسے ایک لمحے کے لئے خوشی محسوس ہوئی۔ اُس نے
سوچا کہ ان لوگوں سے کم از کم یہ کہے گی کہ اُس کا ایک دشمن اُس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ سکتا ہے
اُس سے اُس کا بچاؤ کیا جائے۔ لیکن یہ کام اس قدر جلدی کا نہیں تھا۔ یہاں اُسے بے حد عزت اور احترام
دیا جا رہا تھا اور یہ بھی اللہ کی عنایت تھی۔

امینہ نے سوچا کہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا جائے۔ فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں
ہے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اُس کا اپنا بدن اپنا نہیں تھا۔ جب بھی وہ دھرم وتی کے بارے میں سوچتی
تو اُسے احساس ہوتا کہ یہ اُدھار کا بدن اُس کے لئے بڑی مصیبتوں کا باعث ہے۔ اس بدن میں وہ اپنے
آپ کو صحیح طور پر ایک مسلمان لڑکی نہیں کہہ سکتی تھی۔ بہر حال یہاں آنے کے بعد جس طرح اُس کی پذیرائی
ہوئی وہ اُس کے لئے ایک حیران کن اور خوشگوار واقعہ تھا۔

رات کو کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اُسے آرام کرنے کے لئے ہدایت کی گئی۔
یہاں ایک عمر رسیدہ خاتون نے اُس سے ملاقات کی۔ اُن کی عمر اسّی سال کے قریب ہو گی اور وہ چہرے
سے بڑی نورانی شخصیت معلوم ہوتی تھیں۔ اُنہوں نے اُسے دیکھا اور اس کے بعد دفعتہً ہی اُن کے
چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ یوں لگا جیسے اُنہوں نے کوئی انہونی بات محسوس کر لی ہو۔ امینہ
تعجب سے اُن کی شکل دیکھنے لگی۔ تب عمر رسیدہ خاتون نے کہا۔

''تم...... تم...... تمہاری شخصیت ایک تو نہیں ہے۔ دو ہو تم۔''

یہ الفاظ امینہ کے لئے بڑے تعجب خیز تھے۔ وہ حیران سی نگاہوں سے اُن بزرگ خاتون کو دیکھنے
لگی......!

❁❁❁

اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس بزرگ خاتون کی آنکھوں سے ایک تیز روشنی خارج ہو رہی ہے۔ وہ
روشنی اُس کے دماغ میں اُتر رہی ہے اور اُسے آمادہ کر رہی ہے کہ وہ زبان کھولے۔
بزرگ خاتون کی آواز دوبارہ اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''تم ایک تو نہیں ہو...... کیا سمجھیں؟
تمہاری رُوح کچھ اور ہے اور جسم کچھ اور...... میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟''
امینہ کی زبان جیسے خود بخود کھل گئی۔ اُس نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''
''مجھے اپنے بارے میں تفصیل بتاؤ بیٹی۔ میرے ذریعے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اطمینان رکھو،
میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے کسی کام آ جاؤں۔ تم مجھے اپنی داستان
سناؤ۔''
''مگر آپ کون ہیں؟''
''دیکھو بیٹی، تجسس انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی کچھ باتوں کا نہ جاننا زیادہ اچھا
ہوتا ہے۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ یہاں جہاں تم موجود ہو، کوئی مجھے نہیں جانتا، بس پھیرا ہوتا ہے میرا۔
گزرتی ہوں میں کسی جگہ سے اور جو بھی خدمت کسی کی سرانجام دے سکتی ہوں دے لیتی ہوں۔ کرنے
والی ذات معبود باری کی ہوتی ہے، کہاں سے کون گزر جائے۔ لیکن کبھی کبھی بڑے کی بات مان لینی
چاہئے۔ مجھ سے میرے بارے میں نہ پوچھو۔ مجھے صرف اپنے بارے میں بتاؤ۔ اگر تیار ہو تو مجھ سے کہو
میں انتظار کرتی ہوں۔ اور اگر دل مجھ سے تعاون کرنے پر گواہی نہ دے تو بھی مجھے بتا دو۔ کیونکہ بیٹی،
مجھے تعین کرنا ہوتا ہے اپنے کام کا۔''
''نہیں نہیں بزرگ خاتون۔ مجھے بچپن سے ہی تربیت دی گئی ہے کہ اپنے سے ہر بڑے کا احترام کیا
جائے۔ یہی راہِ نجات ہے۔''
''پھر مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''
''خاتون، آپ کی اس بات سے مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ صاحب کرامت ہیں۔ آپ نے
میری شخصیت کو دوہری شخصیت کہا ہے۔ ہاں، ایسی ہی بات ہے۔ قصور میرا نہیں ہے۔ بلکہ کچھ برائیوں کا
شکار ہو گئی ہوں میں۔''
''ہاں ایسا ہی ہے...... مگر میں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔ بتانا پسند کرو گی مجھے؟''
''میرے والد کا نام ایمان علی ہے۔ وہ ایک سیدھے سچے مسلمان ہیں۔ مکر و فریب کی باتیں بالکل
نہیں جانتے۔ وہ کچھ ایسے حالات میں گرفتار ہو گئے کہ ایک کالے علم والا شخص اُن کا دشمن بن گیا۔ اُس کا

نام ناگ چندر تھا۔ وہ کسی کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ جس شخص کو وہ نقصان پہنچانا چاہتا تھا وہ
والد کے پاس گیا اور اُس نے اُن سے مدد مانگی۔ ہم لوگ اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں۔ مدد
مانگنے والا ہندو تھا، لیکن بات ہندو اور مسلمان کی نہیں ہوتی۔ ہمارا ایمان ہے کہ تکلیف میں مبتلا ہر
کی مدد جس حد تک ممکن ہو کی جائے۔ اسی بنیاد پر میرے والد نے اُس شخص کی مدد کی۔ ناگ چندر
اُس شخص پر کالا جادو کیا تھا، جو میرے والد نے توڑ دیا اور جس کے نتیجے میں ناگ چندر کی بیوی اور
ختم ہو گئی۔ ناگ چندر نے غصے کے عالم میں مجھے دھوکہ دے کر میری رُوح اپنی بیٹی کے جسم میں ڈال
اور میرا جسم اپنی قید میں کر لیا۔ اور پھر اُس نے کچھ ایسے پُراسرار عمل کئے کہ اُس کی بیٹی میرے جسم
داخل ہو کر میرے باپ کے پاس پہنچ گئی۔ اور میں اُس کی بیٹی کے جسم میں قید ہوں۔ یہ کیا ہے
نے۔ میں بڑی مشکل سے اُس کی قید سے بھاگ گئی ہوں اور یہاں تک آ گئی ہوں۔ میں بہت مظلوم
ہوں۔ آہ...... میں مسلمان ہوں۔ لیکن یہ جسم ایک ہندو لڑکی کا ہے اور وہ بڑی مشکل میں ہے، یقین
میں آپ کو بتا نہیں سکتی بزرگ خاتون کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ بھاگ آئی ہوں، اور اتفاق
بات یہ ہے کہ ان واقعات کا شکار ہو گئی اور شہزادی میرے ساتھ یہاں تک آ گئی۔ بس یہ ہے
داستان۔'' امینہ نے نگاہیں اُٹھا کر بزرگ خاتون کو دیکھا تو یوں لگا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی ہیں۔ اُن
آنکھیں بند تھیں لیکن چہرے کا نورانی تقدس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

امینہ سحر زدہ نگاہوں سے اس خوبصورت نورانی چہرے کو دیکھتی رہی۔ بہت کم اس عمر کی عورتیں
قدر حسین نظر آتی ہیں جتنی یہ بزرگ خاتون نظر آ رہی تھیں۔ امینہ یہ بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ وہ کون
بہر حال، تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور سرد لہجے میں بولیں۔ ''آہ...... شیطان
کس کس طرح اپنے جال بچھائے ہیں۔ تم سب شیطان کے سحر کا شکار ہو گئے ہو۔ تمہارے باپ
علی نے ناگ چندر کو شدید نقصان پہنچایا ہے، مگر وہ مجبور تھے۔ ناگ چندر اپنے جسم کا گوشت کھو بیٹھا
اور ایک ڈھانچے کی شکل میں پھر رہا تھا کہ شیطان سے اُس کا رابطہ قائم ہو گیا اور اب وہ کمبخت شیطان
چیلا بن گیا ہے۔ لیکن فکر کی بات نہیں۔ آؤ، شاید مجھے اسی لئے یہاں بھیجا گیا ہے کہ تمہاری مشکلات
خاتمہ ہو جائے اور شیطان کو ایک بار پھر شکست سے دوچار ہونا پڑے۔''

امینہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اُس نے کہا۔ ''تو کیا مجھے اس مشکل سے نجات
سکے گی؟''

''ہاں، آؤ میرے ساتھ۔'' بزرگ خاتون نے کہا۔ امینہ کھڑی ہو گئی۔ اُس نے کہا۔ ''اور یہاں کے لوگ

''وہ اب پُر سکون ہیں۔ انہیں اُن کی بیٹی واپس مل گئی ہے اور کیا چاہئے؟ تم اب چلو یہاں

امینہ کو یوں لگا جیسے اُس کے قدم خود بخود اُٹھ گئے ہوں۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بزرگ خاتون
کے ساتھ اُس عظیم الشان گھر سے باہر نکل آئی۔ باہر لق و دق ویرانہ پھیلا ہوا تھا...... لگتا ہی نہیں تھا
یہاں کوئی آبادی ہو۔ امینہ حیران قدم آگے بڑھانے لگی۔

کوئی دس پندرہ قدم چلنے کے بعد اُس نے پلٹ کر اُس حویلی کو دیکھا۔ لیکن اُسے تو پہلے ہی اندازہ

لینا چاہئے تھا کہ حویلی سے باہر نکلتے ہی ماحول بدل گیا تھا۔ خاتون اُس کے آگے آگے جا رہی تھی اور امینہ
کے قدم اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بہر حال جن حالات سے گزری تھی انہیں سامنے رکھتے
ہوئے کوئی بھی بات اب انوکھی نہیں لگتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ عمل کی اس دنیا کے پس پردہ ایک ایسی
پُراسرار دنیا بکھری ہوئی ہے جس کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کہیں بھی اور کچھ بھی ہو
سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امینہ ناگ چندر کی قید سے نکل آئی تھی۔ لیکن اب بھی اُسے بہت سے
عجیب عجیب احساسات ہو رہے تھے اور وہ آنے والے وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد امینہ نے ایک عظیم الشان کھنڈر دیکھا۔ کھنڈر اُس کے لئے
بالکل اجنبی تھا۔ کالے رنگ کی اُس بدنما عمارت کے بیشتر حصے ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ اینٹوں کے
ڈھیر اور کائی کے انبار...... عورت اُس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اور امینہ کا جسم تو خود اُس کے قابو میں تھا
ہی نہیں۔ وہ تو بس اُس بزرگ عورت کے ساتھ ساتھ اس طرح کھنچی جا رہی تھی جیسے پتنگ کے ساتھ ڈور
ہوتی ہے۔

کھنڈرات میں داخل ہونے کے بعد بوڑھی کچھ عجیب راستوں سے گزر کر ایک ایسی جگہ پہنچی جو نیچے
گہرائیوں میں جاتی تھی۔ یقینی طور پر کوئی تہہ خانہ تھا...... امینہ کو اب کسی بات سے خوف محسوس نہیں ہوتا
تھا۔ جس خوف سے وہ گزر رہی تھی، اس سے بڑا خوف بھلا اور کیا ہو سکتا تھا؟ اُس کا جسم اُس کا اپنا نہیں
تھا بلکہ ایک غیر جسم میں وہ زندگی گزار رہی تھی۔ بہر حال، اس عظیم الشان تہہ خانے میں پہنچ کر بزرگ
عورت رُک گئی۔ اُس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں، تہہ خانہ تاریک تھا، لیکن اتنا بھی نہیں کہ ایک
دوسرے کی شکلیں نہ دیکھی جا سکیں۔ اس نیم تاریک ماحول میں ایک عجیب و غریب کیفیت رچی ہوئی
تھی۔ ایک ہولناک سناٹا اس احساس کا حامل تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ لیکن امینہ کے ساتھ جو کچھ ہو چکا
تھا اس کے علاوہ اب کچھ اور ہونے کی کیا گنجائش تھی؟

بزرگ عورت نے کہا۔ ''امینہ، میں تیرے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ تجھے ڈر تو نہیں لگے گا؟''

''نہیں بزرگ خاتون۔ بھلا اب میرے دل میں خوف و دہشت کی کیا گنجائش ہے؟ میں تو خود جن
حالات کا شکار ہوں ان میں خوف میرے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل چکا ہے۔ ایک اجنبی بدن کا
بوجھ لئے پھر رہی ہوں، اس سے زیادہ خوفناک بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور بدن بھی وہ جو رُوح سے
آزاد ہو چکا ہے اور جس بدن کی رُوح اب کالے جادو کے اثر میں ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہے تو امینہ۔ لیکن بہر حال اللہ پر بھروسہ رکھ۔ تیرا باپ ایک نیک اور دین دار آدمی ہے،
بہت بڑی بات ہے یہ۔ کسی دین دار آدمی کے منہ سے نکلی ہوئی کوئی دُعا خالی نہیں جاتی اور اس کا کچھ نہ
کچھ اثر ہوتا ہی ہے۔ بہر حال، اللہ پر بھروسہ رکھ۔ تو اس طرف بیٹھ جا۔ میں تیرے گرد حصار قائم کئے
دیتی ہوں تاکہ بُری قوتیں اور گندی رُوحیں تیرے بدن کو نہ چھو سکیں اور تجھے خوف کا احساس نہ ہو۔
آ...... اِدھر آ جا۔'' بزرگ عورت نے امینہ سے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر اُس کے
گرد چکر لگانے لگی۔ وہ ایک دائرے کی شکل میں منہ میں کچھ پڑھتی ہوئی امینہ کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

پورے سات چکر لگائے تھے اُس نے۔ اوراس کے بعد مطمئن ہو کر وہاں سے آگے بڑھ گئی تھی۔

امینہ اُس دائرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت نے اُسے اور کوئی خاص ہدایت نہیں دی تھی۔ بوڑھی عورت اُس سے کوئی چار گز کے فاصلے پر خود بھی فرش پر بیٹھ گئی۔ اُس نے تھوڑی دیر تک کچھ پڑھا، اس کے بعد دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے تو ایک عجیب و غریب زناٹے جیسی آواز فضا میں اُبھرنے لگی۔ سفید رنگ کا ایک غبار بوڑھی عورت کے گرد چھاتا چلا گیا۔ یہ غبار پیلا گاڑھا سفید تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ہلکا ہوتا چلا گیا اور پھر اُس کی بلندی عمارت کی چھت تک پہنچ گئی جو کافی اُونچی تھی۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے کسی سرچ لائٹ سے روشنی ڈالی جا رہی ہو۔ روشنی کا دائرہ ایک عجیب مرکز بناتا رہا۔ امینہ خاموش نگاہوں سے اس سارے عمل کو دیکھ رہی تھی۔ بوڑھی عورت مطمئن ہو گئی۔ سفید دائرے کے اندر کی ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی اور امینہ دیکھ رہی تھی کہ بوڑھی عورت آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہی ہے۔ کئی بار اس نے اپنے باپ کو چلہ کشی کرتے ہوئے دیکھا تھا، یہ انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

بہت دیر اسی طرح گزر گئی۔ اوراس کے بعد اچانک ہی فضا میں تیز روشنیاں گردش کرنے لگیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب موسیقی کی آواز اُبھرنے لگی۔ امینہ دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ایک عجیب تماشا سا ہو رہا تھا اُس کی نگاہوں کے سامنے۔ باپ کو یقیناً اُس نے وظیفے کرتے دیکھا تھا، لیکن ان وظیفوں کا ردِعمل کبھی سامنے نہیں آیا تھا۔ لیکن آج وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی وہ ذرا مختلف قسم کا تھا۔ بہرحال یہ روشن دھبے اور خوبصورت آوازیں آتی رہیں۔ اور اس کے بعد ایک جگہ ایک عجیب دُھواں اکٹھا ہونے لگا۔ جب یہ دُھواں اپنی جگہ سے چھٹا تو امینہ نے دیکھا کہ یہ سنگ مرمر کا ایک تخت ہے جس پر حسین نقش و نگار بنے ہوئے ہیں...... آہستہ آہستہ اس تخت پر کوئی نمودار ہونے لگا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ انسانی جسم کا خاکہ مکمل ہو گیا۔ لیکن جب اس خاکے کے چہرے کے نقوش سامنے آئے تو وہ انسانی نہیں تھے۔ بلکہ ایک عجیب بھیانک شکل تھی...... انتہائی ہیبت ناک۔ جسے دیکھ کر انسانی دل کی دھڑکنیں بند ہونے لگیں۔ اتنا خوفناک چہرہ امینہ نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس خوفناک چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو عجیب و غریب قسم کے پرندے نظر آ رہے تھے جنہیں دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ پھر اس چہرے کے ہونٹوں سے آواز نکلی۔

''انا زبیدہ...... کیا مصیبت نازل ہوئی ہے تجھ پر؟ میں نے تو تیرے راستے کبھی نہیں کاٹے۔ پھر تو نے مجھے کیوں طلب کیا ہے؟''

''مردود، لعین، لعنت کے مارے، خدائی درگاہ سے نکالے ہوئے بے ایمان بزدل غدار، لعنت ہو تجھ پر۔''

''شکریہ انا زبیدہ۔ مجھے کیسے بلایا؟''

''تجھے ہوش دلانے کے لئے کہ اللہ والوں کے راستے میں نہ آیا کر۔ نقصان کے سوا کچھ نہیں پائے گا۔''

''انہی راستوں کے لئے تو میں نے یہ طویل زندگی حاصل کی ہے انا زبیدہ۔ لیکن اے پُراسرار

عورت، تو کس چکر میں یہاں پر ہے؟ ارے، وہ کون ہے؟ اوہو، اچھا اچھا...... سمجھ گیا۔ اسے کہاں لے آئی؟ کیوں بیچاری کی موت چاہتی ہے تو؟''

''لعنت کے مارے تجھ پر ہزار بار لعنت ہو۔ بھلا تو اسے کیا موت دے گا؟ زندگی موت تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تو لاکھ اپنے آپ کو طاقتور کہہ لے، لیکن جو طاقتیں تجھے دی گئی ہیں ان کا توڑ تیری طاقتوں سے زیادہ مضبوط ہے۔''

''ہوگا...... ہوگا۔ میں خود کہاں ان مصیبتوں میں پھنستا ہوں؟ میں تو خود یہ کہتا ہوں کہ جو طاقتور ہے اور جو مجھے نیچا دکھا سکتا ہے وہ مجھ سے برتر ہے، بھاگ جاتا ہوں میں وہاں سے۔ تم لوگوں کے پاس ایسے ہی ہتھیار ہیں۔ مگر تو کس مشکل کا شکار ہو کر یہاں آئی ہے؟''

''اِدھر دیکھ...... وہ لڑکی جو بیٹھی ہے، اُسے جانتا ہے؟''

''اس کا باپ ناگ چندر میرا نیا نیا داس بنا ہے۔ مشکل کا شکار ہے، اُس کی کہانی میرے علم میں آ چکی ہے۔ یہ دھرم وتی ہے نا، ناگ چندر کی بیٹی؟ اور اس کے جسم میں مولوی ایمان علی کی بیٹی کی رُوح موجود ہے نا؟ اس طرح یہ ڈبل وجود ہے۔ اور ایسا ہی ایک ڈبل وجود اور بھی ہے جسے تجھے تلاش کرنا ہے اور جسے کسی نامعقول شخص نے جس کے بارے میں میرا اندازہ یہی ہے کہ ایمان علی کے علاوہ اور کوئی نہیں کسی ایسی جگہ محفوظ کر دیا ہے جہاں میرے جاسوس نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے؟ ایمان علی خود میری رہنمائی وہاں تک کرے گا اور میں ناگ چندر کے لئے اور بھی بہت کچھ کروں گا۔''

''تو کچھ نہیں کر سکے گا ناپاک وجود... تیرے لئے بڑا مناسب بندوبست کر رکھا ہے میں نے۔''

''تم جیسی بہت سی آئی ہیں انا زبیدہ۔ اور تم خود یہ بات جانتی ہو کہ میری طاقت لازوال ہے، لامحدود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے خلاف کچھ ایسے ہتھیار نصب کر دیئے گئے ہیں جو بہرحال مجھے نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو میں بتاؤں تمہیں۔ دیکھوں کہ یہ تمہاری دنیا کیسے رہ سکتی ہے۔''

''بس یہی تو ہے...... یہاں تیری طاقتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ خیر، میں تجھ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ یہ جسمانی تبدیلیاں کرا اپنے علم سے، اپنے شیطانی عمل سے۔''

''کیوں...... میرا دماغ خراب سمجھتی ہے تو انا زبیدہ؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے ان میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ تو خود اپنے مارے ہوئے ہیں۔ ناگ چندر تو اب آیا ہے میرے پاس، اس سے پہلے تو یہ خود شیطانی عمل کرتے رہے ہیں۔ اور تم دیکھو انا زبیدہ، اس دور میں شیطانی عمل کرنے والے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ میری اس کامیابی کے بارے میں تم کیا کہو گی؟''

''پاپ کا گھڑا ایک دن ٹوٹ جاتا ہے۔ اور تو دیکھنا، تیرے ساتھ بھی ایک دن ایسا ہی ہوگا۔''

جواب میں اس ہولناک وجود نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہوگا انا زبیدہ۔ خیر، تو اپنی بات کر۔ کیا چاہتی ہے اس لڑکی کے سلسلے میں؟''

''اس کی رُوح اسے واپس مل جانی چاہئے۔ کیا سمجھے؟''

''واہ...... تیرے خیال میں اس کی رُوح میں نے اپنے قبضے میں کر رکھی ہے؟ اری بیوقوف، وہ تو خود

ناگ چندر نے اپنی بیٹی کو وہاں اس عالم میں بھیجا تھا۔''
''ناگ چندر سے کہہ کر یہ رُوحوں کا ادل بدل کر لے۔ وہ تیری شاگردی میں آ چکا ہے، تیری با[ت]
ضرور ماننے لگا۔''
''جو ہدایات میں نے اُسے خود دی ہیں، اُنہیں واپس لے کر اُسے نیکیوں کا درس دُوں؟ تمہارا دما[غ]
خراب ہو گیا ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم نے مجھے بلایا ہے عمل پڑھ کر۔ میں آ گیا ہوں۔ یہ میری مجبو[ری]
ہے۔ لیکن اس کے بعد تم کسی اور کام کے لئے مجھے مجبور نہیں کر سکو گی۔''
''دیکھ، مان لے میری بات۔ یہ سب کچھ تیرے لئے کہیں بھی فائدہ مند نہیں ہے۔''
''کمال کرتی ہو تم...... ایک بات بتاؤ مجھے، یہ ایمان علی کی بیٹی ہے نا؟''
''ہاں۔''
''اور ایمان علی کے دل میں اس کے لئے محبت ہے۔''
''کیوں نہیں ہو گی؟ ظاہر ہے وہ اس کا باپ ہے۔ اور بیٹی کے ساتھ یہ سلوک ہونے سے اُسے دُ[کھ]
ہو رہا ہو گا۔''
''بالکل...... تو پھر اور کیا چاہتی ہو تم؟ انسانوں کو دُکھ پہنچانا ہی تو میرا کام ہے۔ اگر اُسے دُکھ ہو رہا
ہے تو میرے لئے سکون کی بات ہے۔ ویسے بھی بڑا دین دار آدمی ہے وہ۔ روزے نماز کا پابند، نیکیوں کا
پتلا۔ اور نیکیوں کے پتلے مجھے زہر لگتے ہیں۔ کیا سمجھیں تم؟''
''لعنت ہو تجھ پر...... لعنت ہو۔''
''وہ تو ہوتی ہی ہے۔'' خوفناک مجسمے سے ہنس کر کہا۔ پھر بولا۔ ''تو پھر اب میں چلوں؟''
''ٹھیک ہے...... دیکھوں گی میں کیا کر سکتی ہوں۔ تو نے مجھے غضبناک کر دیا ہے۔''
جواب میں اُس خوفناک وجود کی ہنسی سنائی دی۔ اس کے بعد وہ اچانک سنگ مرمر کے تخت سمیت
غائب ہو گیا......!

انا زبیدہ جس کا نام اب امینہ کو معلوم ہوا تھا کچھ دیر تک اسی انداز میں سوچتی رہی، پھر اُس نے کہا۔
''ٹھیک ہے...... میں بھی دیکھوں گی کہ کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔'' اُس نے کہا اور اس کے بعد
آنکھیں بند کئے بہت دیر تک کچھ پڑھتی رہی۔ اس کے بعد اُس نے امینہ کی طرف رُخ کر کے کہا۔
''امینہ، ڈر تو نہیں لگ رہا؟''
''نہیں......''
''بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہو گی؟''
''کوئی خاص نہیں۔''
''اچھا سن، میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے، اب کچھ اور کرنے جا رہی ہوں۔ اور اگر مجھے تجھ [سے]
کچھ درکار ہو تو کیا تو وہ عمل کرے گی؟''
''ہاں، کیوں نہیں؟''

''میں تجھے تیرا جسم بھی واپس کر دُوں گی اور تیرا گھر بار بھی۔ انشاء اللہ میں ایسا کر لوں گی۔''
''جی......'' امینہ نے جواب دیا۔
''بس، تو پھر تیار ہو جا...... ویسے میں تجھے بتا دُوں کہ تیرے باپ نے بھی تیری بقاء کے لئے ایک
بہت ہی اچھا عمل کیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ناگ چندر ضروری ہے۔ کیونکہ اُس نے اس شیطان کی نئی
نئی شاگردی حاصل کی ہے اور اس وقت وہ مکمل طور پر شیطان کے تحفظ میں ہے۔ بہرحال، ڈرنا مت۔
جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہونے دے۔''
امینہ خاموشی سے گردن ہلا کر رہ گئی۔ تب انا زبیدہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور اُس نے ہال میں چاروں
طرف گھومنا شروع کر دیا۔ وہ جگہ جگہ سے چھوٹے چھوٹے پتھر اُٹھا رہی تھی جو اینٹوں کے ٹوٹے ہوئے
ٹکڑوں کی شکل کے تھے۔ پھر اُس نے اُن پتھروں پر کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکا اور اُنہیں جگہ جگہ رکھنے لگی۔
اس کے بعد ایک پتھر ہی سے اُس نے ایک جگہ نشان بنایا اور اس کے بعد اس سے کچھ فاصلے پر ہٹ کر
بیٹھ گئی اور پھر پڑھنا شروع کر دیا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہال میں ایک تیز روشنی پیدا ہوئی۔ یہ روشنی
سفید رنگ کے ایک عجیب سے غبارے جیسی چیز سے بلند ہو رہی تھی جو کہیں سے رینگتا ہوا آیا تھا اور
چھت میں ٹنگ کر رہ گیا تھا۔ یہ روشنی اتنی تیز تھی کہ ہر چیز صاف نظر آنے لگی تھی۔ پھر اچانک ہی انا زبیدہ
نے زور زور سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ اُس کی آواز انتہائی ہیبت ناک تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ
آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے اور اُس کا خوبصورت چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس
کے چہرے پر آہستہ آہستہ سرخی چھاتی جا رہی ہو...... اُس کی آنکھیں بجلی کی مانند چمکنے لگی تھیں اور اُس کا
حسین چہرہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ اُس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ہاتھ فضا میں بلند تھے۔ کافی دیر تک وہ ہاتھ
فضا میں بلند کئے کچھ پڑھتی رہی۔ اور اس کے بعد اُس نے دونوں ہاتھ زمین پر زور سے جھٹک دیئے۔
پہلے تو امینہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے دائرے میں ایک انسانی وجود کو دیکھا جو
دونوں گھٹنے موڑے، چہرہ چھپائے ہوئے بیٹھا تھا۔ امینہ اُسے دیکھتی رہی۔ کچھ لمحوں بعد اُس انسانی وجود کو
جیسے زندگی ملی ہو، اُس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور چاروں طرف دیکھا۔ لیکن امینہ یہ دیکھ کر بری طرح
دنگ پڑ گئی تھی کہ یہ ناگ چندر تھا......
ناگ چندر آہستہ آہستہ جیسے ہوش و حواس میں آتا جا رہا تھا۔ پھر گردن اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کے
بعد اُس کی نگاہیں بوڑھی انا زبیدہ کی جانب اُٹھ گئیں اور وہ حیرانی سے اُسے تکنے لگا۔ پھر اچانک ہی وہ
سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''تم کون ہو...... اور یہ جگہ؟ آہ...... یہ میں کہاں آ گیا؟ ارے مجھے تو کچھ لوگ اُٹھا کر
فضا میں اُڑتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ وہ کون تھے؟ اُڑنے والے کون تھے......؟'' ناگ چندر
عجیب و غریب لہجے میں سوال کر رہا تھا اور انا زبیدہ خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے
کہا۔
''ناگ چندر...... میرا نام زبیدہ ہے۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ یہ تو کبھی نہیں جان سکے گا۔ لیکن
تجھے جو کچھ میں بتا رہی ہوں اسے غور سے سن۔ اس پر عمل کر۔ اسی میں راہِ نجات ہے، اسی میں تیری بقاء

ہے۔''
ناگ چندر خاموشی سے انا زبیدہ کو دیکھتا رہا۔ انا زبیدہ نے پھر کہا۔ ''ناگ چندر...... مولوی ایمان
تیرا بہت پرانا دوست اور ساتھی تھا۔ میں تم دونوں کی پوری ہسٹری معلوم کر چکی ہوں۔ بڑی محبت کر
تے تم دونوں آپس میں ایک دوسرے سے۔ حالانکہ ایک ہندو اور ایک مسلمان تھا۔ لیکن پھر ناگ چن
بھٹک گیا۔ ایک ذلیل انسان نے جو شیطان کا شاگرد تھا، اُس نے تجھے بہکا دیا اور تجھ سے کہا کہ کا
سیکھ لے، کالی ناپاک کا غلام بن جا۔ تاکہ دولت تیرے پاس بے انتہا آ جائے۔ ناگ چندر...... ا
بات تو جانتا ہے کہ یہ دولت جو ہوتی ہے نا یہ بھینٹ لیتی ہے۔ کبھی عزت و آبرو کی، کبھی جان و مال
کبھی ایمان کی اور کبھی اُن کی جو اپنے پیارے ہوتے ہیں۔ تو نے کالا علم سیکھ لیا اور کالا جادو کر کے لوگو
پریشان کرنے لگا۔ لیکن یہ نہیں سوچا تو نے کہ اس روئے زمین پر ایک اور طاقت بھی ہے۔ ایسی طا
جو انسان کی نگہبان ہوتی ہے اور جسے پکارنے سے ہر مشکل دُور ہو جاتی ہے۔ ناگ چندر، یہ ساری با
اپنی جگہ تھیں۔ تو نے جس آدمی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی، اُس نے ایمان علی سے مدد مانگی او
یقین کر کہ ایمان علی پورے خلوص سے تیرے پاس آیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ دھرم داس کے ساتھ ا
عمل نہ کر۔ تو نے اصل میں ایمان علی کی قوت کا اندازہ ہی نہیں لگایا۔ وہ ایک عالم تھا اور بہت کچھ کر
تھا۔ لیکن اُس نے وہ تمام پابندیاں قبول کر لی تھیں جو اُس پر دین نے عائد کی تھیں۔ یعنی کسی کو اپ
ہاتھوں سے نقصان نہ پہنچانا۔''

''کیا باتیں کرتی ہو بڑی بی...... تم نہیں جانتیں اُس نے کیا، کیا ہے؟ ارے اُس نے میرا جادو مجھ
واپس کر دیا اور میری بیوی اور بیٹی ماری گئیں۔ اُس نے مجھے بدن کے گوشت سے محروم کر دیا اور
ایک ڈھانچہ بن کر بھاگتا پھرا۔ کیا نہیں کیا اُس نے میرے ساتھ اور تم کہہ رہی ہو کہ وہ میرا دوست تھا
دشمن تھا وہ میرا...... بدترین دشمن۔ اور ہم لوگ یہی دشمنی نبھا رہے ہیں۔

''مگر ناگ چندر...... اب تجھے یہ سب کچھ ختم کرنا پڑے گا۔ دیکھ، میں تجھے بتاؤں تیری بیٹی بھی ا
دنیا میں نہیں ہے اور بیوی بھی نہیں ہے۔ حادثے بھی ہو جاتے ہیں کبھی کبھی۔ اور بہرحال تو، تو ا
حادثے کی وجہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اب ایسا کر، اس جھگڑے کو ختم کر۔ برے عمل چھوڑ دے اور کوئی ا
شادی کر لے۔ یہ سامنے دیکھ رہا ہے، جو لڑکی بیٹھی ہے یہ امینہ ہے۔ اور اس کا بدن تیری بیٹی کا بدن ہے؟
جا اُس لڑکی کو لے آ جو اس لڑکی کے بدن میں ہے اور اُس کی روح تیری بیٹی دھرم وتی کی ہے۔ ا
دونوں کو یکجا کر دے۔ اپنی بیوی کو بھی لے آ۔ اور پھر اپنے مذہب کے مطابق ان کی آخری رسومات ا
کر دے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ تو مسلمان ہو جا اور ان کا آخری عمل ایک مسلمان کی حیثیت سے کر
لیکن بہرحال، پہلے انسانی نیکیاں ذہن میں آئیں، اس کے بعد مذہب اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جا
ہے۔ میری مان ناگ چندر تو اب وہی کر جو میں کہہ رہی ہوں۔''

''کیا بکواس کر رہی ہے تو بڑھیا؟ اب میں طاقتور ہو چکا ہوں۔ مجھے میرے گرو کا آشیرواد حا
ہے۔ کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا میرا۔ ایمان علی کو خون کے آنسو رُلاؤں گا میں۔ اور جب وہ میرا مقابلہ کر

رنے تھک کر چور ہو جائے گا تو میں اُسے ہلاک کر دوں گا۔ بس اس کے علاوہ میری زندگی کا اور مقصد
نہیں ہے۔ جہاں تک میری بیٹی کا سوال تو اس کی بات کسی نہ کسی طرح بن ہی جائے گی۔''

''ناگ چندر...... تو زندگی کھو بیٹھے گا۔''

''کون ہے اس وقت جو میری زندگی مجھ سے لے سکے؟''

''چل ٹھیک ہے...... کوئی بھی کسی کی زندگی اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں لے سکتا۔ مگر میں جو تجھ سے کہہ
رہی ہوں وہ کر ڈال۔''

''کیا کہہ رہی ہے تو؟''

''جا...... میں تجھے پتہ بتاتی ہوں اُس جگہ کا جہاں تیری بیٹی موجود ہے۔''

جواب میں ناگ چندر ہنس پڑا اور بولا۔ ''بڑی بی وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔''

''نہیں پتہ تجھے بیوقوف۔''

''ٹھیک ہے...... تم کوئی ڈرامہ مت کرو۔ اور کوئی کام ہے مجھ سے؟''

''ارے پاگل، یہی بہت بڑا کام ہے۔ مان لے میری بات۔ دیکھ، میری بات مان لے۔''

''اپنا بھی دماغ خراب کر رہی ہو اور میرا بھی۔ کوئی ماننے والی بات ہو تو مانوں۔''

''یہ امینہ ہے نا اور اس کے پاس تیری بیٹی کا بدن ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ اس کے بدن کے
ٹکڑے تیرے سامنے ڈال دیتی ہوں۔ جہاں تک اس کی رُوح کا تعلق ہے تو ویسے بھی یہ کون سی خوش
ہے۔ میں یہ کام کر ڈالتی ہوں ناگ چندر...... میں یہ کام کر ڈالتی ہوں۔''

ناگ چندر چونک کر بزرگ خاتون کو دیکھنے لگا، پھر اُس نے کہا۔ ''کیا چاہتی ہے؟''

''جا...... اگر تو اپنے آپ کو بڑا گیانی سمجھتا ہے تو اپنی بیٹی کو لے آ، جو ایمان علی کی بیٹی امینہ کے جسم
میں قید ہے۔ جا، لے کر آ۔ پھر میں تجھے باقی باتیں بتاؤں گی۔''

''آتا ہوں ابھی۔ جے اشیش بھگوتا......'' اُس نے کہا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

انا زبیدہ پُرسکون انداز میں سامنے نگاہیں جمائے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھتی رہیں۔ کوئی دس
منٹ گزرے تھے کہ ناگ چندر پھر وہیں آ موجود ہوا۔ اب اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔
اُس نے کہا۔ ''کون سا پتہ بتانا چاہتی تھی تو مجھے...... کہاں ہے میری بچی؟ اُس مولوی کے بچے نے اُسے
غائب کر دیا ہے۔ میری تمام کوشش اُسے تلاش کرنے میں ناکام ہو گئی ہے۔''

''اس معمولی سی طاقت پر تو اپنے آپ کو مہان سمجھتا ہے۔ یہ تو ایک نمونہ تھا۔ اب میں تجھے بتا رہی
ہوں۔ جا اور اُس لڑکی کو اُٹھا کر یہاں لے آ۔ ایک بات دھیان میں رکھنا، کوئی ایسی عہد شکنی کی تو کتے کی
موت مارا جائے گا۔ چھوڑوں گی نہیں میں تجھے۔''

''ٹھیک ہے...... میں دیکھوں گا اس کے بعد تو کیا کرے گی۔'' اور ایک بار پھر وہ آنکھوں سے اوجھل
ہو گیا۔ امینہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی ہوئی یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ انا
زبیدہ کون ہے؟ اور اب یہ کیا کرنے والی ہے؟ لیکن حالات بتا رہے تھے کہ جو کوئی بھی ہے بہت ہی علم

والی ہے۔ اور اس نے جہاں ایک طرف مردود شیطان کو ناکام بنا دیا تھا وہیں ناگ چندر بھی آخر کار اس
کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد ناگ چندر آ موجود ہوا۔ اُس کے ہاتھوں میں امینہ کا بے ہوش جسم موجود تھا
اور اُس کے جسم میں دھرم وتی کی آتما۔ ناگ چندر کے دل میں محبت کے کنول کھل رہے تھے۔
احتیاط سے اُس نے امینہ کے جسم کو زمین پر لٹا دیا۔ امینہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے بدن کو دیکھ رہی تھی۔
جواب اُس کا نہیں تھا۔ اُدھر انا زبیدہ خاموشی سے ناگ چندر کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے کہا۔

"ناگ چندر، اب اس سے آگے کا کام شروع ہوتا ہے۔ اُدھر دیکھو، وہ کیا ہے؟"

ناگ چندر نے پلٹ کر دیکھا تو اُسے بھاگ بھری کا جسم نظر آیا۔ بھاگ بھری اُس کی دھرم پتنی
زندگی سے محروم وہاں موجود تھی۔ ناگ چندر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ...... یہ ایک بہت اچھا مشورہ دے رہی ہوں میں تجھے۔ اب تک برائیوں میں زندگی گزاری
ہے۔ اب ایک اچھا اور نیک کام کر لے۔ وہ نیک کام یہ ہے کہ دونوں کی آتمائیں بدل دے۔ امینہ
کی رُوح دے دے، دھرم وتی کا جسم ادھر اپنی دھرم پتنی کے پاس رکھ دے اور اس کی آتما اس
میں داخل میں داخل کر دے جو اب بے جان ہے۔ اور پھر اپنے دین دھرم کے مطابق ان دونوں کو
جلا دے۔ کریا کرم کر دے ان کا۔ یہی تیرے حق میں بہتر ہے۔"

"پاگل بڑھیا...... بالکل ہی سٹھیا گئی ہے...... کیا دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا؟ تجھے پتہ ہے میں
بھگونت کا پیروکار ہوں اور اگر میں چاہوں تو اشیش بھگونت کی مدد سے تجھے یہیں جلا کر بھسم کر سکتا
ہوں۔"

"نہ کر ایسی باتیں ناگ چندر...... نہ کر۔ بری بات ہے۔ زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔
کتنے دعویٰ سے تو یہ بات کہہ رہا ہے کہ تو اگر چاہے تو میری زندگی چھین سکتا ہے۔ ناگ چندر، میں یہ
بات نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ میں اللہ کی مرضی کے بغیر ایسا نہیں کر سکتی اور نہ ہی تو۔ اب بھی کہتی ہوں ایسی
کی باتیں چھوڑ دے۔ ورنہ پھر جو کچھ ہو گا اس کا ذمہ دار تو خود ہو گا۔"

"لے...... تو پھر سنبھال۔" ناگ چندر نے اچانک ہی مٹھی بند کی اور اُس پر کچھ پڑھا اور اس کے
بعد اُسے انا زبیدہ کی طرف کھول دیا۔ یہ لمبی چونچوں والے چھوٹے چھوٹے پرندے تھے۔ اُن کی چونچیں
کوئی ڈیڑھ انچ لمبی اور بدن کوئی ایک ایک انچ کے ہوں گے...... بڑی خوفناک شکلیں تھیں۔
چھوٹے چھوٹے پر پھیلا کر وہ انا زبیدہ پر لپکے۔ لیکن وہ حصار جس میں انا زبیدہ موجود تھی، انا زبیدہ کے
لئے کسی قلعے کی فصیل ثابت ہوا۔ پرندے اُس حصار سے ٹکرائے اور پٹ پٹ کر کے زمین پر
گرے۔ ناگ چندر نے یہ منظر دیکھا تو خونخوار لہجے میں بولا۔ "جادوگر بڑھیا...... اگر ہمت ہے تو چل
اس خول سے باہر نکل کر مجھ سے مقابلہ کر۔ میں تجھے بتاؤں گا کہ اشیش بھگونت کی دی ہوئی قوتیں کیا
ہیں۔"

"میں تو ایک کمزور سی عورت ہوں بیوقوف آدمی۔ لیکن بہرحال تو نے مجھ سے کہا ہے تو میں اللہ کا نام

لے کر تیرے سامنے آتی ہوں۔ بتا، کیا کر سکتا ہے تو؟" یہ کہہ کر انا زبیدہ حصار سے باہر نکل آئیں۔
ناگ چندر نے پھر اپنی دونوں مٹھیاں بند کیں اور ایک بار پھر لمبی چونچوں والے پرندے فضا سے
نمودار ہوئے اور انا زبیدہ پر لپکے۔ اُنہوں نے اپنی چونچیں انا زبیدہ کے جسم میں داخل کر دیں اور بری
طرح چیخنے لگے۔ اُن کی چونچیں انا زبیدہ کے جسم میں پھنس گئی تھیں۔ ڈیڑھ انچ لمبی چونچیں انا زبیدہ کے
جسم میں داخل تھیں لیکن خون کا ایک قطرہ نہیں نکل رہا تھا۔ البتہ پرندے ہی نکلنے کے لئے پر مار رہے
تھے۔ انا زبیدہ ہنسیں اور پھر انہوں نے ایک پرندے کو نوچ کر ایک سمت پھینک دیا۔ وہ زمین پر تڑپ کر
ایک لمحے کے اندر سرد ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انا زبیدہ نے اپنے جسم سے تمام پرندے نوچ کر نیچے
پھینک دیئے۔ ناگ چندر دہشت زدہ نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ تب انا زبیدہ نے کہا۔

"دونوں کے جسم ایک دوسرے سے بدل دو اور پھر اپنی بیٹی اور بیوی کا کریا کرم کر دو۔ بولو، ایسا
کرنے پر تیار ہو یا نہیں؟"

ناگ چندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اچانک ہی وہ اپنی جگہ کھڑا کھڑا گھومنے لگا۔ وہ کوئی جادو کا کمال
کر رہا تھا کہ انا زبیدہ آگے بڑھیں۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھ پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور پھر مٹھی ناگ چندر
کے سامنے کھول دی۔ اچانک ہی ناگ چندر کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور اُس نے اپنے دونوں
ہاتھوں سے گردن پکڑ لی اور بری طرح چیخنے لگا۔ "میں مر گیا...... مر گیا...... ارے چھوڑو میری گردن......
چھوڑ دو......" پھر وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ بہت بری حالت ہو رہی تھی ناگ چندر کی۔ انا
زبیدہ خاموش کھڑی ہوئی ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ ناگ چندر بری طرح ایڑیاں رگڑتا
رہا اور اس کے بعد اُس کا جسم سرد ہو گیا۔ آنکھیں پھٹ گئیں...... زبان باہر نکل آئی۔ انا زبیدہ نے افسوس
بھرے انداز میں کہا۔

"زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر انسان کو اپنے وقت پر ہی جانا ہوتا ہے۔ لیکن بعض
لوگوں کی تقدیر میں موت کا اچھا انداز نہیں ہوتا۔ اب میں کیا کر سکتی ہوں؟" انا زبیدہ نے امینہ کی جانب
دیکھا اور بولیں۔ "کھڑی ہو جاؤ امینہ۔"

امینہ کھڑی ہو گئی اور انا زبیدہ کے اشارے پر اُس حصار سے نکل آئی تو انا زبیدہ نے دھرم وتی کی
طرف دیکھ کر کہا۔ "لڑکی...... تو بھی کھڑی ہو جا۔ تجھے پتہ ہے کہ تو مر چکی ہے۔ اور مرنے والے دوبارہ
سنسار میں نہیں آتے۔ جا...... اپنے جسم میں داخل ہو جا اور یہ جسم خالی کر دے۔ مجھے تجھ پر بھی افسوس
ہے۔ لیکن کیا کریں؟ پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اللہ جسے جتنی زندگی دیتا ہے وہ اتنا ہی جیتا ہے۔ اور کوئی
بھی کوشش اُسے بچا نہیں سکتی۔ جا۔"

اچانک ہی امینہ کے جسم سے ایک دھواں سا خارج ہوا اور پھر امینہ سیدھی سیدھی لیٹ گئی۔ تبھی دھرم
وتی کا جسم جس میں امینہ موجود تھی، ایک دم لرزنے لگا اور امینہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے پورے بدن
میں کوئی چھریاں سی اُتار رہا ہے۔ وہ کرب سے چیخی۔ لیکن ایک دو منٹ کے بعد وہ ساکت ہو گئی۔ اُسے
یوں لگا جیسے اُس کا سارا وجود ایک دم ٹھنڈے پانی میں ڈوب گیا ہو...... پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن اب

وہ امینہ کے جسم میں تھی۔ اُس نے حیرت اور خوشی سے اپنے جسم کو دیکھا اور پھر وہاں پڑی ہوئی اُس کی لاش کو جو آہستہ آہستہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اُس سے شدید بو اُٹھنے لگی اور انا زبیدہ نے ناک پر رومال رکھ لیا اور کہا۔

"آؤ امینہ......" یہ کہہ کر وہ امینہ کا ہاتھ پکڑ کر اُس کھنڈر نما عمارت سے باہر نکل آئیں۔ امینہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فضا میں پرواز کر کے اپنے گھر پہنچ جائے۔ اپنے باپ کے گلے لگ جائے۔ لیکن بہرحال، اُس نے خود پر قابو پایا اور انا زبیدہ سے بولی۔

"آپ اب بھی نہیں بتائیں گی مجھے اپنے بارے میں انا زبیدہ کہ آپ کون ہیں؟"

انا زبیدہ نے نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا اور بولیں۔ "بس...... میں تمہیں جتنا بتا چکی ہوں اُس بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"اچھا یہ بتا دیں، اُن لوگوں سے آپ کا کیا تعلق تھا؟"

"وہی جو تم سے ہے۔"

"مطلب......؟"

"وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ میں وہاں موجود ہوں۔ لیکن بہرحال، قدرت کو ایک کام کرانا منظور تھا مجھ سے۔ میں وہاں پہنچی تو شہزادی وہاں آ گئی اور پھر تم مجھے مل گئیں اور مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کر دی گئی کہ تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا دوں۔"

امینہ اُس پُراسرار عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکی تھی۔ لیکن بہرحال اُسے خاموش ہونا پڑا۔ اور کچھ دیر کے بعد وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ تب انا زبیدہ نے کہا۔ "باقی باتیں تم خود ایمان علی کو بتاؤ گی۔ وہ خود بھی نیک دل اور علم والا انسان ہے۔ حقیقتوں کو سمجھ جائے گا۔ میں چلتی ہوں۔"

"اگر آپ......" امینہ نے کچھ کہنا چاہا مگر اب وہاں کون تھا؟ چاروں طرف خاموشی...... نہ کوئی آدم نہ آدم زاد کا وجود۔ نجانے یہ پُراسرار عورت کون ہے؟...... کون ہے یہ؟ امینہ نے دل میں سوچا اور پھر خوشی سے لرزتی آواز میں اپنے باپ کو پکارا۔

روپا، رما، رادھا، راگنی اور رجنی بڑے عیش کی زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ حویلی اب مکمل طور پر اُن کی تحویل میں آ گئی تھی اور اُنہوں نے اُسے کچھ سے کچھ بنا لیا تھا۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ شیطان نے اُن کے سامنے دولت کے انبار لگا دیئے تھے اور دولت بلکہ بے پناہ دولت شیطان کی قربت کا نتیجہ ہوتی ہے اور بس انسان اس میں پھنس کر سب کچھ بھولتا چلا جاتا ہے۔ رسک لعل ایک شریف آدمی تھا اور ان پانچوں لڑکیوں کی زندگی کا آغاز ایک شرافت کے ماحول سے ہوا تھا۔ لیکن بات وہی شیطان کی قربت، دولت کے انبار...... لڑکیاں آہستہ آہستہ بھٹکتی جا رہی تھیں اور اُن کے کردار میں بھی بڑی عجیب عجیب کیفیتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ دھن دولت کا کھیل انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ اعلیٰ درجے کی کاریں، ملازم، شاندار زندگی۔ حویلی کا بھی حلیہ بدل گیا تھا۔ اس کے آس پاس ہی بہت سی صاحب حیثیت لوگوں کی

تھیں۔ جبکہ حویلی تو ویسے ہی آسیب زدہ مشہور ہو گئی تھی۔ لیکن اب جب یہاں دولت کے یہ کھیل شروع ہوئے تو لوگوں کے ذہنوں سے یہ خیال ہٹتا چلا گیا کہ یہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ لڑکیوں نے اپنے طور پر ایک کہانی سنا دی تھی۔ اُنہوں نے بتایا کہ وہ ایک پہاڑی ریاست کی باشندہ ہیں اور اُن کے ماتا پتا مر چکے ہیں۔ کروڑوں کی جائیداد زمینیں چھوڑ گئے ہیں وہ۔ اپنے علاقے سے اُن کا دل گھبرایا تو وہ سب یہاں چلی آئیں اور یہاں انہوں نے یہ نئی رہائش اختیار کی ہے۔ دولت کی کوئی کمی نہیں ہے ان کے پاس۔

ایسا کوئی مسئلہ ہو تو لالچی مکھیاں شہد کے چھتے پر آ کر بیٹھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بڑے بڑے رئیس زادوں اور نوجوانوں نے اُن سے میل ملاقات کی کوششیں شروع کر دیں تھیں۔ اور شیطان خوش تھا کہ اُس نے اپنے لئے جن شاگردوں کا انتخاب کیا ہے وہ اس کے معیار پر پوری اُترتی ہیں۔

منوہر ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ معصوم سی فطرت کا مالک تھا۔ اُسے ریس کھیلنے کا شوق تھا۔ ذاتی گھوڑے بھی تھے جو ریس میں دوڑتے تھے۔ اصل میں یہ شوق اُسے ورثے میں ملا تھا۔ پہلے دادا، پھر باپ اور اب وہ خود۔ باپ تو ویسے بھی ریس کورس کی دنیا کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اور ان لوگوں کی شان اور سج دھج سچی بات یہ ہے کہ ریس ہی کی وجہ سے تھی۔ چنانچہ منوہر بھی ریس کورس جایا کرتا تھا اور خوب کھیلتا تھا۔ پھر ایک دن منوہر، رما کو ٹکرا گیا۔

رما کسی کام سے حویلی سے نکلی تھی اور پیدل ہی پیدل چلتی ہوئی دُور تک چلی گئی تھی۔ منوہر اُسے آتا ہوا نظر آ گیا۔ رما نے ایک نگاہ اُسے دیکھا، شیطان نے فوراً ہی اُس کے دل میں گدگدی کی۔ "اچھا لڑکا ہے۔ کیا کہتی ہے......؟"

"ہاں اَشیش بھگونت......"

"بات کراس سے۔" رما رُک گئی۔ اور منوہر اُسے دیکھ کر عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا۔

"ہیلو......" رما نے کہا تو منوہر جیسے چونک سا پڑا۔

"وہ میں سامنے تیس نمبر......"

"جی کیا کہہ رہے ہیں آپ...... تیس نمبر کی کوٹھی؟ وہ لال پتھروں والی، اچھا اچھا وہ تو بہت خوبصورت کوٹھی ہے۔ آپ وہاں رہتے ہیں منوہر جی؟ اور وہ جو سامنے......"

"ہاں...... میں آپ کو جانتا ہوں۔ کتنی ہی بار دیکھ چکا ہوں۔" منوہر نے اُس کی بات کاٹ دی۔ رما اُسے اپنی کوٹھی کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔

"چلیے...... یہ تو اچھی بات ہے۔ مگر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

"نہ صرف میں بلکہ اس وقت تو سچی بات اس علاقے کے سارے لوگ ہی آپ کو جانتے ہیں۔ معاف کیجئے گا رما جی، رما بتایا ہے نا آپ نے اپنا نام؟"

"پتہ نہیں...... میں نے بتایا ہے یا نہیں؟"

"چلیے، آپ نے نہیں بھی بتایا تو مجھے معلوم ہے۔"

"مگر کیسے؟"

"میں نے کہا نا اس وقت سارے علاقے میں آپ ہی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ لوگ آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں، آپ کے بارے میں تذکرے کرتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی آپ کا نام اسی طرح معلوم ہے۔"

"کمال کی بات ہے۔ ہم نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ہم اتنے مشہور ہو گئے ہیں۔"

"رما جی...... وہ جگہ دیکھ رہی ہیں...... وہ جو درختوں کے ایک جھنڈ میں ہے۔ آپ جانتی ہیں جھنڈ کے درمیان کیا ہے؟"

"نہیں۔"

"سنگ مرمر کی ایک بنچ۔"

"تو پھر؟"

"اور اتنی اچھی جگہ ہے وہ کہ ایک دفعہ جب آپ وہاں بیٹھیں گی تو آپ کا دل بار بار چاہے گا آپ وہاں آئیں۔"

"کیا مطلب بھئی...... میں سمجھی نہیں؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آیئے کچھ دیر وہاں بیٹھتے ہیں۔"

"اوہو...... اچھا آیئے۔" رما نے کہا اور منوہر کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ واقعی جگہ بہت خوبصورت تھی۔ رما نے کئی بار یہاں سے گزرتے ہوئے درختوں کے اس جھنڈ کو دیکھا تھا جس کے سرے آپس میں ملے ہوئے تھے اور ایک کٹیا سی بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن اس کے درمیان سنگ مرمر کی یہ بنچ نجانے کس خوش ذوق نے ڈلوائی تھی؟ خاص طور پر رومان کرنے والے جوڑوں کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ رما نے اس جگہ کی پسندیدگی کا اظہار کیا اور اپنے ساتھ منوہر کو بھی بیٹھنے کی پیشکش کی۔ منوہر بیٹھ کر بولا۔

"اور یہاں کی یہ خوبی ہے رما جی، کہ جو کوئی یہاں، میرا مطلب ہے کوئی نوجوان جوڑا یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہے تو ان کے درمیان محبت لازمی طور پر ہو جاتی ہے۔"

"اچھا جی...... آپ کا مطلب ہے کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے؟"

"نہیں...... مجھے آپ سے ہو گئی ہے۔"

"بہت تیز رفتاری ہے آپ کے اندر مسٹر۔"

"زندگی ہی اتنی تیز رفتار ہے۔ میں کیا کروں؟"

"کہیے، آپ کے کیا کیا مشاغل ہیں۔"

"کچھ نہیں...... بھگوان کی دیا سے پتا جی کا کاروبار بہت اچھا ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ میں ابھی تعلیم ختم کر چکا ہوں۔ پتا جی کہتے ہیں کہ کاروبار میں لگ جاؤ۔ میں نے اُن سے ایک سال کی مہلت مانگ لی ہے۔ میں نے اُن سے کہا ہے کہ پتا جی، کم از کم ایک سال تو مجھے ایسا دے دیجئے کہ

جوانی کی لذتوں سے آشنا ہو جاؤں۔ کام دھندا تو ساری عمر ہی کرنا ہے۔ چنانچہ ان دنوں آرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

"ملک سے باہر نہیں گئے؟"

"کئی بار جا چکا ہوں۔ جگہ جگہ جا چکا ہوں۔ لیکن اپنا دیس اپنا ہی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ تو اس وقت آپ اپنے دیس میں ہیں۔"

"ہاں۔"

"چلئے ٹھیک ہے۔ میرے لائق اور کوئی خدمت؟"

"رما جی، ایک اجازت چاہتا ہوں آپ سے۔"

"کہئے۔"

"کیا کبھی کبھی آپ سے ملنے آ سکتا ہوں آپ کے گھر؟"

"کیوں نہیں؟ ویسے بھی آپ میرے پڑوسی ہیں۔ اب یہ تو اتفاق ہے کہ ابھی تک ہماری ملاقات پڑوسیوں سے نہیں ہوئی۔ بلکہ میری بڑی بہن تو یہ سوچ رہی تھی کہ کسی وقت سارے پڑوسیوں کو اکٹھا کر کے ایک پارٹی دی جائے اور ان سب سے تعارف حاصل کیا جائے۔"

"روپا جی......؟" منوہر نے کہا اور رما نے سر پکڑ لیا۔

"کمال ہے۔ ہمارے گھر کو تو ہم سے زیادہ تم جاننے لگے ہو ڈیئر منوہر۔"

منوہر، رما کے اس انداز تخاطب پر بہت خوش ہوا تھا۔ اُس نے کہا۔ "ہاں رما جی، ایسی ہی بات ہے۔ آپ لوگ اتنی ہی دلکش ہیں کہ آپ کے بارے میں جاننا بڑا ضروری ہو جاتا ہے۔"

بہرحال، کافی دیر تک رما اور منوہر آپس میں باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد رما منوہر سے اجازت لے کر واپس اپنے گھر چلی گئی۔

گھر میں زندگی رواں دواں تھی۔ اب تو ساری کی ساری لڑکیاں اپنے اپنے طور پر جدید ترین مشاغل سے دلچسپیاں لیتی تھیں۔ ہر چیز موجود تھی اُن کے پاس، اور کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس طرح کی لڑکیاں ہیں۔ بہرحال یہ ساری باتیں ہوتی رہیں۔ رما گھر واپس پہنچی تو اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ سب سے پہلے رادھا نے اُسے دیکھا اور کہنے لگی۔ "کیا ہوا رما...... خیریت؟"

"کیوں، میں تمہیں خیریت سے نظر نہیں آ رہی؟"

"نہیں۔ تمہارے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر ہے۔"

"اچھا؟" اتنی دیر میں روپا بھی آ گئی۔ "ادھر آؤ رما، آ جاؤ۔ کیا بات ہو رہی تھی منوہر سے؟"

رما نے یہ الفاظ سنے تو حیرانی سے منہ پھاڑ کر رہ گئی۔ "تم منوہر کو کیسے جانتی ہو؟"

جواب میں روپا ہنسنے لگی اور پھر کہنے لگی۔ "بیٹا، تمہیں میں نے اُس کے ساتھ درختوں کے جھنڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ مگر تم نے اُس پیلے رنگ کی چڑیا کو نہیں دیکھا ہو گا جو سامنے والے درخت کی

شاخ پر بیٹھی تم دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔“

”پہلی چڑیا؟“

”ہاں......“

”کون تھا وہ؟“

”میں۔“ روپا نے جواب دیا اور ہنسنے لگی۔ رما آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکنے لگی۔ پھر اُس نے

”یہ تو بڑی مشکل ہے۔“

”کیوں......اس میں مشکل کی کیا بات ہے؟“

”بھئی اب انسان اپنے طور پر کوئی عمل بھی نہ کرے۔ اور اگر کرے تو اس بات کا خوف اُٹھائے کہ اسے دیکھنے والے نجانے کس کس شکل میں اسے دیکھ رہے ہوں گے۔“

”تمام لڑکیوں کو بلا لو۔ میں تم سے ایک بات کروں گی۔“

”ہاں بولو۔“

”سب کو تو بلا لو۔“ تھوڑی دیر میں تمام لڑکیاں ایک ہال میں تھیں۔ روپا نے کہا۔

”میری پیاری ساتھیو، بلکہ میری باقی چاروں بہنو...... بلکہ اب تو میں تین سے مخاطب ہوں مسئلہ تو رما کا ہے۔ میں اصل میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتی ہوں۔ اور یہ تجویز میری اپنی نہیں ہے اشیش بھگونت کی ہے۔ کیا تم لوگ غور سے میری بات سن رہی ہو؟“

”کیوں نہیں دیدی......“

”تو پھر سنو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم زندگی کے ایک ایسے رنگ سے آشنا ہو گئے ہیں جو کسی شخصیت کو حاصل نہیں ہے۔ ہمارا روپ بدل چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عرصہ پہلے ہم عا اندام کنواری لڑکیاں تھیں اور اپنے باپ کے سائے میں زندگی گزار رہی تھیں۔ ہم جب بھی اپنے بار میں سوچتے تھے تو یہی بات ہمارے ذہن میں آتی تھی کہ پتاجی ایک ایک کر کے ہمارے لئے لڑکے تل کریں گے اور ہمیں بیاہ دیں گے۔ جس گھر میں جائیں گے وہاں ساس سسر کی خدمت کرنا ہوگی، سے رابطے رکھنا ہوں گے، پتی سے پریم کرنا ہوگا۔ بچے ہوں گے، ہم بچے پالیں گے۔ خود بوڑھے جائیں گے، بچے بڑے ہو جائیں گے۔ اور جیون کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا ایسے ہی جیسے ہم دوسروں کو د ہیں۔ لیکن تم لوگ یہ بھی جانتی ہو کہ اس دنیا میں رہنے والوں ہی نے ہمارے لئے ایک نئے جیون انداز پیش کیا۔ ہمیں عام انسانوں سے ہٹا دیا گیا۔ اور پھر اگر ہمیں اشیش بھگونت کا سہارا نہ ملتا تو جانے کیا ہوتا؟ میں سچ کہہ رہی ہوں تم سے، ہم بھٹکتے ہوئے نجانے کہاں سے کہاں نکل جاتے۔ جوان جسم پر جس کی نگاہ پڑتی ہے اچھی نہیں پڑتی۔ کون جانے کون ہمیں زندگی کے اس بدترین حادثے سے دو کر دیتا؟ خیر میں تمہیں کوئی لیکچر نہیں دے رہی، میں صرف یہ بتا رہی ہوں کہ ہم اب بدلے ہو راستوں کے راہی ہیں اور ہمیں انہی راستوں پر چلنا ہوگا۔ ہم کنواری کنیائیں نہیں ہیں کہ اپنے لئے کسی پریمی کو پسند کریں، اُس کے لئے جیون وقف کر دیں۔ اشیش بھگونت کہتے ہیں سنسار اتنا بڑا کیوں؟

اگر سنسار چار آدمیوں پر مشتمل ہوتا تو بات الگ ہوتی۔ اب اتنے بڑے سارے سنسار میں کسی ایک کے لئے جیون کو وار دینا کوئی عقل کی بات نہیں ہے، جیسے پتی پتنی، سمجھ رہی ہو نا تم؟ اب رما، اتنی لمبی چوڑی بات کرنے کے بعد میں تم سے ایک بات کہہ رہی ہوں۔ وہ لڑکا ہم سب ہی کو پسند ہے۔ جس کا نام منوہر ہے۔ چنانچہ جو کچھ بھی کرو مل بانٹ کر کرو۔ کیا سمجھیں؟“

رما حیرانی سے روپا کو دیکھ رہی تھی۔ یہ روپا تو بڑی پاکیزہ فطرت کی مالک تھی۔ بہت وقت پہلے یہ نجانے کیا کیا عبادتیں کرتی رہتی تھی؟ اور آج یہ جس رنگ میں بول رہی ہے وہ بالکل ہی عجیب ہے۔ خیر اُسے یہ رنگ ناپسند تو نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ روپا جو کچھ کہہ رہی ہے کیا وہ مناسب ہے؟ لیکن بات وہی تھی، مناسب اور غیر مناسب کا کھیل تو اب ختم ہو گیا تھا۔ شیطان کی قربت نے اُن کے دلوں سے ہر طرح کا احساس نکال دیا تھا۔ چنانچہ رما بھی تیار ہو گئی۔

اِدھر منوہر جب رما سے ملنے کے بعد اپنے گھر پہنچا تو اُس کے دل و دماغ پر ایک عجیب سا سحر طاری تھا۔ رما ویسے ہی حسین لڑکی تھی۔ لیکن اب جن حالات سے وہ گزر رہی تھی انہوں نے اُسے اور بھی زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ زندگی کی کون سی آسائشیں اُنہیں حاصل نہیں تھیں؟ منوہر دوسرے ہی دن پھر رما کی تلاش میں اُس کی کوٹھی پہنچ گیا اور اس بار اُسے راگنی نظر آئی۔ راگنی بھی اپنی مثال آپ ہی تھی۔ منوہر بھٹکتا بھٹکتا سا اندر داخل ہوا تو اُس نے راگنی کو دیکھا جو پھولوں کے ایک کنج کے پاس کھڑی تھی۔ اتفاق سے اُس نے جو لباس پہنا ہوا تھا اس کے پس منظر میں پھول اور سبز پتوں میں حسن بے مثال نظر آ رہا تھا...... راگنی بالکل ایک مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔ منوہر آہستہ آہستہ اُس کے قریب پہنچ گیا۔ راگنی بھی اُسے جانتی تھی۔ پڑوسیوں سے اُن لوگوں کی کافی واقفیت ہو گئی تھی۔ جبکہ پڑوسی اُنہیں دُور دُور سے ہی جانتے تھے۔ لیکن وہ بہت سے لوگوں کو بہت قریب سے دیکھ چکی تھیں اور اُنہیں پتہ بھی نہیں لگا کہ کوئی اُن کا اس قدر آشنا ہو چکا ہے۔

راگنی اپنی جگہ کھڑی مسکراتی رہی، منوہر آہستہ آہستہ اُس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کیں اور زور سے گردن جھٹک کر بولا۔ ”نہیں...میرا خیال غلط ہے۔“ راگنی کی آنکھوں میں سوالیہ تاثرات پیدا ہو گئے تو منوہر بولا۔ ”معاف کیجئے گا دیوی جی، شاید گستاخی کی ہے میں نے۔“

”کون ہیں آپ؟“

”منوہر ہے میرا نام...... رما جی سے ملنے آیا تھا۔ لیکن آپ کو دیکھ کر یہ گمان گزرا کہ پتھر کا کوئی بہت ہی حسین مجسمہ کسی ماہر سنگ تراش نے بنا کر یہاں کھڑا کر دیا ہے۔ بھگوان کی سوگند جھوٹ نہیں بول رہا۔ دل و دماغ پر ایک جادو سا طاری ہو گیا ہے۔“

”آپ بغیر تعارف کے ہی بڑی اچھی اچھی باتیں کر لیا کرتے ہیں منوہر جی۔“

”معافی چاہتا ہوں۔ آپ راگنی ہیں؟ بھگوان کی سوگند آپ راگنی ہی ہیں۔ بلکہ ساتوں سُر آپ میں جمع ہو گئے ہیں۔“

”اب آپ کا کیا خیال ہے میں آپ کو رما سے ملنے دُوں گی؟“ راگنی نے شرارت بھری آواز میں

کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''مطلب یہ ہے کہ اتنی سندر باتیں کرنے والے کو میں رما کے حوالے تو نہیں کر سکتی۔''

منوہر ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ''میں تو داس ہوں آپ کا۔''

''تو داس جی، آیئے...... آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ آپ کو رما سے ملوا دوں۔ نہیں ملوایا ... ہوں گی وہ۔''

منوہر ہنسنے لگا۔ پھر راگنی اُسے لے کر اندر چلی گئی۔ رما ہی نہیں بلکہ ساری بہنیں موجود تھیں ... نے اُنہیں دیکھا اور بولا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے آکاش سے ساتوں سُر نیچے اُتر آئے ہیں۔ کتنی ہیں ...''

''یہاں آپ سے غلطی ہو گئی۔'' رادھا نے کہا۔

''کیوں؟''

''سُر تو سات ہوتے ہیں اور ہم پانچ بہنیں ہیں۔''

''اچھا اچھا، چلئے سُر تبدیل کئے دیتے ہیں سب کے۔'' سب ہنستے رہے۔ منوہر تھوڑی دیر ... خوب بے تکلف ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ''میری تقدیر بھی کیا چیز ہے۔ آپ یقین کریں کسی بھی چیز پر ... بھگوان نے اسے سونا بنا دیا۔ اب اس وقت مجھے ہیرے لعل مل گئے ہیں۔ پہلے تو سونا ہی سونا ... لیکن اب ہیروں کے بیچ جیون گزار رہا ہوں۔''

خوب خاطر مدارت کی گئی تھی منوہر کی اور منوہر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تھا۔ یہ لڑ... کے سارے عیش کر رہے تھے۔ منوہر کو خوب عزت دی جانے لگی تھی۔ ایک دن اُس نے اُن لو... کہا۔ ''آپ کو گھوڑوں کی دوڑ سے دلچسپی ہے؟''

''نہیں منوہر جی۔ کیا مطلب ہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ریس دکھاؤں۔ میرے اپنے گھوڑے بھی دوڑتے ہیں اس میں۔ ... ریس کے بہت رسیا ہیں۔''

''ہاں، اگر ایسی بات ہے تو ہم آپ کے ساتھ ضرور چلیں گے۔'' پھر تیار ہو کر تمام بہنیں ... ساتھ ریس کورس پہنچ گئیں۔ زندگی کی ہر دلچسپی سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں وہ۔

یہاں کی دنیا بھی عجیب دنیا تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُنہیں گھوڑوں کی دوڑ کے بارے ... معلومات حاصل ہو گئیں تو روپا نے مسکراتے ہوئے رادھا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''رادھا... مزیدار کھیل ہے۔ اور اس کھیل میں تھوڑی جدت بھی کی جا سکتی ہے۔''

''کیا؟''

''یہ گھوڑے ہار جیت کرتے ہیں اور اس ہار جیت پر بڑا سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ اگر ہم منوہر جی ... کروڑ پتی اور اس کے بعد کنگال بنا دیں تو کیا اشیش بھگونت مہاراج خوش نہیں ہوں گے؟''

اچانک ہی روپا کے کان میں اشیش بھگونت کی سرگوشی سنائی دی۔ ''بیوقوف لڑکیو، تم اب بلا...

ضائع کرنے لگی ہو۔ حالانکہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ سنسار میں رہنے والوں کو کسی بھی طرح نقصان پہنچے، خاص طور سے اُنہیں جو پہلے سے میرے احکامات کی پابندی نہیں کرتے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ یہ گھرانہ بڑا خوشحال ہے، بڑے عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں یہ۔ خاص طور پر منوہر کا باپ جواہر تو ریس کا بڑا رسیا ہے۔ کروڑوں روپے میں کھیلتے ہیں یہ لوگ۔ گھر کے تمام لوگ مزے سے زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر تم اُنہیں کنگال کر دو تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ گھرانہ جو اپنی پشتوں سے کھاتا پیتا چلا آیا ہے اگر بھوکوں مرے گا تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو گی؟ سڑکوں پر رگڑتے پھریں گے یہ لوگ۔ واہ، اور تم ہو کہ ابھی سوچ رہی ہو۔''

روپا مسکرانے لگی۔ پھر اُس نے کہا۔ ''جے اشیش بھگونتا...... جیسا تم چاہتے ہو ایسا ہی ہو گا۔'' اور اس کے بعد منوہر لال کی زندگی کے بدترین دن شروع ہو گئے۔ وہ خود کو راجہ اندر سمجھتا تھا۔ لڑکیوں میں روپا، رما، راگنی اور رادھا اُسے خوب کھیل کھلا رہی تھیں۔ بس ایک رجنی تھی جو زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی رہا کرتی تھی اور اُس نے منوہر سے بہت کم ملاقاتیں کی تھیں۔ منوہر اب ان لوگوں کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ ایک دن اُس نے کہا۔

''آپ لوگ بھی ریس کھیل کر دیکھیں۔ بڑا اچھا لگتا ہے۔''

''اب یہ بات نہ کریں منوہر جی۔ ہم ریس کھیلتے نہیں ہیں بے شک۔ لیکن آپ یہ سمجھ لیجئے کہ جس گھوڑے کی طرف اشارہ کر دیں گے وہی جیتے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''بس یہی تو کمال ہوتا ہے۔''

''تو پھر آج ہو جائے نظارہ؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔''

اُس دن بھی ریس تھی۔ لڑکیاں تیار ہو کر ریس کورس پہنچ گئیں۔ رجنی اُن کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ اُس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا تھا۔ لیکن باقی لڑکیاں خوب سج دھج کر منوہر کے ساتھ گئی تھیں اور ریس کورس پہنچ گئی تھیں۔ رما نے کہا۔

''منوہر، ایک بات پوچھوں تم سے؟''

''ہاں ضرور پوچھو رما جی؟''

''تمہاری پہلی ملاقات مجھ سے ہوئی تھی۔ اور بعد میں تم سب کے دوست بن گئے۔ خود تمہارے دل میں کس کے لئے کیا گنجائش ہے، بتانا پسند کرو گے؟''

منوہر نے حیرت سے رما کو دیکھا اور بولا۔ ''آج یہ نیا سوال آپ نے کیسے کیا رما جی؟''

''بس یونہی دل میں آیا تھا۔ پوچھنا چاہتی تھی آپ سے۔''

''رما جی، بات اصل میں یہ ہے کہ آپ سب اتنی اچھی ہیں کہ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ کس کو میں زیادہ چاہتا ہوں۔''

"حالانکہ یہ فیصلہ ضروری ہوتا ہے۔"

"رما جی، بہرحال ان سب سے ملاقات تو آپ ہی کے ذریعے ہوئی تھی اور آپ کا جو مقام ہے دوسرا کوئی ذرا مشکل ہی سے لے سکتا ہے۔"

رما نے اُسے باتوں میں لگا لیا تھا اور رادھا ٹہلتی ہوئی دُور نکل گئی تھی۔ راگنی تھوڑے فاصلے پر پہنچ ہوئی تھی۔ ریس شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ سارا پروگرام پہلے سے طے شدہ تھا۔ روپا گھوڑوں کے درمیان پہنچ گئی اور پھر اُس وقت جب سائیس اور جوکی گھوڑوں کو نکالنے میں مصروف تھے اچانک ہی انہوں اور رادھا نے اپنے جسم بدل لئے۔ اور وہ خوبصورت گھوڑیاں بن گئیں اور گھوڑوں میں شامل ہو گئیں۔ انسان کی آنکھ بہت کمزور ہوتی ہے۔ جانور اس سے زیادہ دیکھ سکتا ہے۔ گھوڑے بہک رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کے درمیان جو مخلوق ہے وہ اُن میں سے نہیں ہے۔ لیکن اُن کے مالکان بھی اُن کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے۔

بہرحال اُنہوں نے اپنے لئے جگہ بنالی تھی۔ ادھر منوہر رما اور راگنی کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ پھر ریس شروع ہونے میں کچھ دیر ہوئی تو اُس نے کہا۔ "یہ دونوں کہاں گئیں؟ نظر نہیں آ رہیں؟ کہیں دُور نکل گئی ہیں شاید۔ ریس شروع ہونے والی ہے۔"

"ہاں، بات ہو رہی تھی آپ کے جیتنے کی۔ بولیں کتنی رقم ہے آپ کے پاس؟"

"کافی پیسے لے کر آیا ہوں۔ کوئی بیس لاکھ روپے ہیں۔" منوہر نے اپنے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ایسا کیجئے کہ اس میں سے پانچ لاکھ روپے اُس سات نمبر گھوڑے پر لگا دیجئے۔" رما نے اشارہ کیا اور منوہر چونک کر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے حیرت سے کہا۔

"مگر یہ تو بڑا ہی ناکارہ گھوڑا ہے۔ جبکہ آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس مقابلے کے گھوڑے بہت شاندار ہیں۔ بلکہ وہ گھوڑا تو بڑا فیورٹ ہے۔ اُس کا نام تیس مار خان ہے۔"

"آج وہ اپنی تیس مار خانی بھول جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے آپ سے کہا منوہر جی، آپ کا دل چاہے تو لگا دیجئے ورنہ آپ کی مرضی۔"

"نہیں نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پانچ لاکھ روپے آپ کے لئے ضائع کرنا بھلا کون سی بڑی بات ہے؟ لیجئے، لگائے دیتا ہوں۔" منوہر جب یہ رقم لگانے کے لئے بکی کے پاس پہنچا تو وہاں اُس کا باپ کھڑا ہوا تھا۔ منوہر نے جب سات نمبر گھوڑے پر پانچ لاکھ کی رقم لگائی تو اُس کے باپ نے اُس کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

"ابے اُلو کے پٹھے، پاگل ہو گیا ہے کیا؟ کیوں اس گھوڑے پر رقم لگا رہا ہے؟"

"پتا جی...... بس میں......"

"نہیں...... اس پر نہیں لگاؤ۔"

"پتا جی، اس پر لگانے دیجئے مجھے۔"

"میں کہتا ہوں اس پر مت لگاؤ...... باپ میں ہوں یا تو؟"

"آج مجھے باپ بن جانے دیجئے پتا جی۔ پانچ لاکھ روپے لگا رہا ہوں۔ اگر ہار گیا تو جیون بھر آپ کی بات مانوں گا۔ میرا وعدہ ہے۔"

"باپ کی کمائی ہے بیٹا، پھونکو، پھونکو۔" اور منوہر نے سات نمبر کے گھوڑے پر پانچ لاکھ روپے لگا دیئے۔

ریس شروع ہوئی۔ منوہر نے ایک بار پھر روپا کو تلاش کیا تھا، لیکن روپا اور رادھا تو اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ ایک ریس میں روپا شریک تھی سات نمبر کی حیثیت سے تو دوسری ریس میں رادھا نے اپنا نمبر گیارہ رکھا تھا۔ دوڑ شروع ہوئی۔ سات نمبر کی گھوڑی بہرحال تجربہ نہیں رکھتی تھی لیکن اپنی پراسرار قوتوں سے روپا جانتی تھی کہ کیسے باقی گھوڑوں کو پیچھے چھوڑا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی گھوڑے بدکے ہوئے تھے۔ ریس شروع ہونے کے چند ہی منٹ بعد روپا باقی گھوڑوں سے آگے نکلنا شروع ہو گئی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے یہ سارا فاصلہ طے کر لیا۔ جبکہ دوسرے گھوڑے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ تیر کی طرح نکلی تھی اور فنشنگ پورچ سے کافی آگے نکل گئی تھی۔ لوگ حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے۔ لیکن منوہر کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔ معمولی سی گھوڑی پر لوگوں نے زیادہ رقمیں نہیں لگائی تھیں، اُس کے بھاؤ بہت زیادہ تھے۔ منوہر کے پانچ لاکھ اس وقت اتنے بڑھ گئے تھے کہ اُسے چکر آ گئے تھے۔ اُدھر اُس کا باپ پاگلوں کی طرح منوہر کو ڈھونڈ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ منوہر کے پاس پہنچ گیا۔

"ابے...... ابے یہ کیا ہو گیا منوہر؟ کیا ہوا، بتا مجھے...... کیسے جیتی وہ گھوڑی؟"

"پتا جی، دوڑ کر جیتی اور کیسے جیتی؟"

"مگر تجھے اس کا ٹپ کہاں سے ملا؟ اور یہ کون ہیں؟"

"یہ رما جی ہیں اور یہ راگنی۔"

"کون ہیں یہ؟"

"پتا جی، میری دوست ہیں۔ اور آپ یقین کریں کہ اس وقت جو ہوا ہے انہی کی وجہ سے ہے۔" منوہر نے تھوڑی سی تفصیل اپنے باپ کو بتا دی۔

"جے دیوی جی...... آپ نے واقعی وہ کر دکھایا ہے جو بے مثال ہے۔"

"پتا جی، یہ ہمارے پڑوسی ہیں اور پانچ بہنیں ہیں۔ ایک ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے ماتا پتا کا دیہانت ہو چکا ہے۔"

"ارے پاگل، اگر انہوں نے یہ ٹپ تجھے دی ہے تو پھر یہ دیویاں ہوئیں۔ ان کی تو پوجا کرنی چاہئے۔"

"ہاں پتا جی۔ پوجا تو کرنی چاہئے۔ لیکن ہم نے یہ پوجا یہاں ریس کورس میں شروع کر دی تو آپ جانتے ہیں کہ بہت سے پجاری یہاں جمع ہو جائیں گے۔ اس لئے ان لوگوں کو کسی دن گھر پر بلا کر ان کی پوجا کیجئے گا۔"

''ہاں ہاں.... وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن دیوی جی، یہ تو بتائیے کہ اگلی ریس میں ہم کیا کریں؟''
راگنی ہنسنے لگی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔ ''آپ منوہر جی کے پتا ہیں۔ جتنی رقم آپ کے پاس ہے، گیارہ
نمبر گھوڑی پر لگا دیجئے۔ گھوڑی جیت جائے گی۔''
''گیارہ نمبر؟'' جواہر نے دوسری ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں پر نگاہیں ڈالیں تو گیارہ نمبر
گھوڑے کو دیکھا۔ خوبصورت تو تھا لیکن دوسرے گھوڑوں کے مقابلے میں بہت کمزور۔
''وہ بات اصل میں یہ ہے کہ وہ گھوڑا تو بالکل سات نمبر گھوڑے کی طرح سے ہی ہے۔''
''تو آپ کے خیال میں سات نمبر نہیں جیتا؟''
''جیتا ہے۔''
''تو پھر جائیے...... لگا دیجئے۔''
جواہر کے ساتھ منوہر بھی بکی کے پاس پیسے لگانے گیا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کہئے
جی...... کتنے پیسے لگا رہے ہیں آپ؟''
''یار میرے پاس پیسے تو بہت سارے ہیں۔ لیکن سارے لگا دُوں؟''
''مرضی ہے آپ کی پتا جی۔''
''ایسا کرتا ہوں میں بھی پانچ لاکھ روپے لگا دیتا ہوں۔ یہ بہت بڑا رسک ہے۔ کیونکہ وہ گھوڑا تو
بالکل انجانا ہے۔''
''ٹھیک ہے۔''
منوہر نے خود پچیس لاکھ کی رقم لگائی تھی اور جواہر نے پانچ لاکھ۔ منوہر نے جواہر کو نہیں بتایا تھا کہ
اُس نے کتنی رقم لگائی ہے۔ بہرحال جیتنا تھا گیارہ نمبر کے گھوڑے کو اور وہ جیت گیا۔
جواہر تو شدتِ غم سے ایک گوشے میں جا بیٹھا لیکن منوہر خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ بمشکل تمام جواہر
اُس نے زبان کھولنے پر مجبور کیا تو جواہر نے کہا۔
''بیٹا، تو نے کتنے لگائے تھے؟''
''پچیس لاکھ پتا جی۔''
''ہائے رام، میں اپنے سارے پیسے لگا دیتا تو اس وقت نجانے ہم کیا سے کیا بن چکے ہوتے۔ لیکن
یہ تو بتا کہ یہ لوگ ہیں کون؟''
''پتا جی، کوئی کچھ بھی ہے ہمیں اس سے کیا غرض؟ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ آم کھانے سے مطلب
چاہئے۔ پیڑ گننے سے کیا فائدہ؟''
''مگر بیٹا، ان سارے پیڑوں کو لے کر اپنے گھر ضرور آنا۔''
اور اس کے بعد اور بھی ریسیں ہوتی رہیں۔ لیکن روپا اور رادھا انسانی شکل میں آنے کے بعد
کے پاس واپس پہنچ گئی تھیں۔ البتہ اب منوہر کا باپ جواہر ان لوگوں کا منوہر سے زیادہ دیوانہ ہو گیا تھا۔
جواہر اور اُس کا بیٹا پوری طرح اُن لوگوں کے جال میں پھنس گئے تھے۔ خوب ایک دوسرے

ہاں آنا جانا ہو گیا تھا۔ لڑکیاں خوب عیش کر رہی تھیں اور اُن لوگوں کو ریس کورس لے جا کر خوب جتا رہی
تھیں۔ اُن کے اپنے ذہن میں جو منصوبہ تھا وہ بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔ اور اگر دیکھنے والے دیکھتے تو اُنہیں یہ
اندازہ نہ ہوتا کہ یہ شاطر لڑکیاں یقینی طور پر کوئی بڑا کھیل کھیلنے جا رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک قابلِ غور بات
تھی کہ رجنی ان لوگوں میں شریک نہیں تھی۔ وہ عام طور سے الگ تھلگ ہی رہا کرتی تھی۔ اور کئی بار جواہر
اور منوہر نے اس بارے میں اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ رجنی دیوی شاید ہم لوگوں کو پسند نہیں کرتیں۔
جس کے جواب میں روپا نے کہا تھا۔ نہیں جواہر جی۔ یہ بچپن ہی سے علیحدگی پسند ہے۔ اور اپنی ڈیڑھ
اینٹ کی کٹیا الگ ہی بنائے رکھتی ہے۔
روپا نے رجنی سے کہا بھی تھا۔ ''رجنی، آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ تم کیوں اس طرح سے بجھی بجھی سی
رہتی ہو؟ ایسا لگتا ہے جیسے تمہیں یہ زندگی پسند نہ ہو۔''
رجنی تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کو جو لگتا ہے بالکل ٹھیک لگتا
ہے۔ واقعی مجھے یہ زندگی پسند نہیں ہے۔ یہ کوئی بات ہوئی، اپنا کوئی من ہی نہیں ہے۔ بس ہلا گلا کرتے
رہو اور اشیش بھگونت جو بھی کہیں آنکھیں بند کر کے مانتے رہو۔''
''پاگل، یہ نہیں سوچتی کہ اشیش بھگونت ہماری پشت پر نہیں ہوتے تو ہمارا کیا ہوتا۔ سارا جیون ختم ہو
جاتا، بدنصیبی کی موت مارے جاتے اُس غار میں۔''
''وہ تو ٹھیک ہے دیدی۔ لیکن آپ سوچئے، جو کچھ ہم کر رہے ہیں، کیا وہ ٹھیک ہے؟''
''ارے...... تو، تو ہمیں بھی مروائے گی رجنی۔ ایسا نہ کہو۔ ہر بات میں دلچسپی لو۔''
پھر اتفاقیہ طور پر شیطان اُن لوگوں کے درمیان آیا تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں وہ آ موجود ہوا
تھا۔ اور جب رما کسی کام سے وہاں گئی تو اُس نے شیطان کے مجسمے کو اس کمرے کے بیچوں بیچ رکھا ہوا
دیکھا۔ اشیش بھگونت کی آنکھوں سے سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ رما دونوں ہاتھ جوڑ کر اشیش بھگونت
کے سامنے جھک گئی تو اشیش بھگونت نے کہا۔
''تم لوگوں سے ملنے آیا ہوں۔ سب کو یہاں بلا لو۔''
پانچوں لڑکیاں وہاں پہنچ گئیں۔ اور شیطان مسکرا کر بولا۔ ''تم لوگ جو کچھ کر رہی ہو، میں اس سے
اچھی طرح واقف ہوں اور خوش ہوں اس بات سے کہ مجھے تمہیں کچھ نہیں بتانا پڑ رہا۔ اصل میں میرے
چیلے اتنی بڑی تعداد میں اس دنیا میں موجود ہیں کہ میں ان سب پر نگاہ نہیں رکھ سکتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ
میرا موقف سمجھنے کے بعد وہ خود ہی اپنے طور پر یہ سب کچھ کرتے رہیں اور ہر مسئلے میں مجھے اُنہیں ہدایت
نہ دینی پڑے۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''
''جے بھگونتا، ہم آج کل......''
''ہاں ہاں...... مجھے معلوم ہے۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔ بالکل ٹھیک کر رہی ہو تم۔ اُن لوگوں کو
زمین پر لٹا دو اور اپنا کام جاری رکھو۔''
''اور کوئی ہدایت ہمارے لئے؟''

''رجنی سے ایک کام ہے مجھے۔ رجنی، یہ چاروں لڑکیاں کچھ نہ کچھ کر چکی ہیں۔ اب تمہاری با
ہے۔ اور تمہارے سپرد ایک بہت اہم ذمہ داری کر رہا ہوں۔''

''جے بھگونتا......'' رجنی نے ہاتھ جوڑ کر گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ بہرحال، یہ بات بھی طے تھی
اتنے عرصے سے جو کچھ ہو رہا تھا اشیش بھگونت کے چرنوں کی دھول ہی تھی۔ بس رجنی اپنے طور پر
قدر سنگدل نہیں تھی جس طرح اُس کی باقی بہنیں۔ کسی کو نقصان پہنچا کر اُس کا دل دُکھتا تھا۔

تمام لڑکیاں یہ جاننے کی کوشش کرنے لگیں کہ رجنی کے سپرد کیا ذمہ داری کی جاتی ہے؟ تب اشیش
بھگونت نے کہا۔ ''سنو...... جگہ، پتہ سب کچھ میں تمہیں بتاؤں گا۔ ایک مسلمان ہے، اُس کا نام
ایمان علی۔ بڑا ایماندار بنتا ہے سسرا۔ تھوڑا بہت دین دنیا کا علم بھی جان لیا ہے تو اپنے آپ کو ولی سمجھے
ہے۔ ایسے ہی ولیوں کو مٹی میں ملا کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ تھوڑے دن پہلے ایک واقعہ ہوا ہے اُس کے
ساتھ۔ میرے ایک چیلے نے ایک آدمی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے جادو بنا کر بھیجا
اُس کے گھر۔ لیکن ایمان علی نے اُسے واپس کر دیا اور جب جادو کا توڑا ہوا تو اُس کی دھرم پتنی اور
موت کے گھاٹ اُتر گئیں۔ میرا چیلا خاصا گیانی دھیانی تھا۔ اُس نے بدلہ لینے کے لئے ایمان علی کی
کا جسم اُس سے چھین لیا اور ایک عمل کر کے اپنی بیٹی کو اُس کی بیٹی کے جسم میں داخل کر دیا اور اُس کی
کی آتما اپنے قبضے میں کر لی۔ لیکن پھر ایک عورت میرے راستے میں آ گئی۔ وہ پراسرار عورت آج تک
میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ بس یوں سمجھ لو کہ اُس پراسرار عورت کی وجہ سے
سارا منصوبہ فیل ہو گیا۔ اُس نے میرے چیلے کو مروا دیا۔ میرا چیلا ایک کھنڈر میں پڑا ہوا ہے اور میں اُس
کے شریر کی رکھشا کر رہا ہوں یہ سوچ کر کہ اس میں شیطانی زندگی دوڑا دی جائے اور وہ ایک مکمل شیطان
بن جائے۔ ادھر تو میں یہ کام کر رہا ہوں جس میں بہت وقت لگے گا۔ لیکن اُدھر میں یہ نہیں چاہتا کہ
مولوی ایمان علی سکون سے بیٹھ جائے۔ اُس کی بیٹی اُسے واپس مل چکی ہے اور اس کی وجہ انا زبیدہ ہے
انا زبیدہ وہی پراسرار عورت ہے جس کا میں تم سے تذکرہ کر رہا تھا۔ تو رجنی، اب تم وہاں جاؤ گی اور ایک
مسلمان لڑکی بن کر ایمان علی کے گھر میں داخل ہو جاؤ گی۔''

''مسلمان لڑکی بن کر؟'' رجنی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''پر میں تو ہندو ہوں۔''

''اب تم نہ ہندو ہو اور نہ مسلمان۔ تم شیطان کی عبادت کرتی ہو۔''

''ٹھیک ہے...... پھر؟''

''مسلمان نام رکھنا ہے تم نے۔ کوئی بھی اچھا سا نام رکھ لینا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے
سلوک کرنا ہوں گے تمہیں اُس کے ساتھ۔ وہاں جاؤ گی تو میں تمہیں نئی ہدایات دُوں گا۔ ان ہدایات
کے تحت تم مولوی ایمان علی کے گھر گندگی پھیلاؤ گی اور ایک ایک شخص کو ملیچھ بنا دو گی۔ جب وہ ملیچھ ہو
جائیں گے تو، تو انا زبیدہ تمہارے پاس آئے گی۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بات معلوم کر لے کہ تمہارے

ذریعے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ لیکن انا زبیدہ کے چہرے پر تھوک دینا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اسے میں
سنبھال لوں گا۔ بولو، تم یہ کام کر سکتی ہو؟''

''مہاراج کا اگر حکم ہے تو میں یہ کام ضرور کروں گی۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ میں بہت ڈرپوک
ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کام میری وجہ سے خراب ہو جائے۔''

''نہیں ہوگا...... یہ وعدہ ہے میرا تم سے۔''

''ٹھیک ہے اشیش بھگونتا...... جیسا آپ کا حکم ہو۔''

''اور باقی لڑکیو، تم اپنا کام جاری رکھو۔ چاروں ایک ساتھ کام کرتی ہو۔ اگر ایک ایک اِدھر اُدھر
پھیل کر کام کریں تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔''

''مہاراج، آپ ہمیں کوئی کام بتا دیں۔ یا پھر یہ بات ہم پر چھوڑ دیں۔ جو بھی کام ہوگا، ہم خود کر
لیں۔''

''بس ٹھیک ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ سنسار میں رہنے والوں کو سکون کا ایک لمحہ بھی میسر نہ ہو۔
جتنے لوگ اس سنسار میں رہتے ہیں سارے کے سارے مشکل کا شکار ہو جائیں۔ میرے سارے چیلے یہ
کام کر رہے ہیں اور میں اُن کی حفاظت بھی کرتا ہوں۔ اسی لئے میرا چیلا ناگ چندر جو انا زبیدہ کے
ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر گیا ہے، اُسے ایک نیا جیون دینا ہے مجھے۔ گو یہ جیون شیطانی جیون ہوگا۔
لیکن پھر بھی ضروری ہے یہ۔ کیا سمجھ رہی ہو؟ تو رجنی، تم اس کام پر روانہ ہو جاؤ۔ اور روپا، تم یہ سارا پتہ
اپنے ذہن میں اُتار لو۔ رجنی کو یہاں تک پہنچانا تمہاری ذمہ داری ہوگی۔''

''جے بھگونتا......''

شیطان اُن لوگوں کو اپنے منصوبے کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا۔ اور پھر پتہ وغیرہ بتانے کے
بعد وہ وہاں سے غائب ہو گیا اور لڑکیاں اس سلسلے میں منصوبہ بندی کرنے لگیں۔

۞

مولوی ایمان علی بہرطور ایک صاحب علم آدمی تھا۔ بیٹی جس طرح اپنی اصلیت میں واپس آئی تھی،
مولوی ایمان علی کی نگاہوں سے خود یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ اور اس کے بعد امینہ نے اپنے بارے میں
ساری تفصیلات بتائیں اور مولوی ایمان علی سجدے میں گر گیا۔ اللہ نے مدد کی تھی۔ بیٹی واپس مل گئی تھی۔
ہر چند کہ اُسے ناگ چندر کے گھرانے کی تباہی کا بھی افسوس تھا لیکن بہرحال برائی کا خاتمہ کسی نہ کسی شکل
میں تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایسے ہی انتظامات کرتا ہے۔ ویسے بستی کے لوگ بھی خوش
تھے۔ بہت سی جگہوں پر اس بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ اور برے لوگ جو ناگ چندر سے
برائیاں کراتے تھے اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ کیونکہ اب اُن کے پاس ایک گندی
طاقت موجود نہیں تھی۔

بہرحال، یہ تمام معاملات چل رہے تھے۔ اُدھر شیطان اپنی کارکردگی میں مصروف تھا۔ اُس کا تو کام
ہی دنیا کو برائیوں کے راستے پر لانا ہے۔ رجنی کو اُس نے بڑی تیاریوں کے بعد یہاں بھیجا تھا اور روپا کو

ہدایت کی تھی کہ کسی طرح وہ رجنی کو وہاں تک پہنچائے گی۔ بہر حال، رجنی اپنے کام پر روانہ ہو چکی تھی
وہ انتظار کر رہی تھی کہ مولوی ایمان علی اُس کے ہاتھ لگے۔
اُس دن صبح ہی صبح وہ ایک ایسی جگہ بیٹھ گئی جہاں سے مسجد جانے کا راستہ گزرتا تھا۔ یہ تما
معلومات اُنہوں نے حاصل کی تھیں۔ مولوی ایمان علی مسجد سے نماز پڑھنے کے بعد اسی راستے سے
لوٹتا تھا۔ رجنی کے جسم سے جگہ جگہ خون بہہ رہا تھا اور اُس کا لباس خون میں بھیگا ہوا تھا۔ مولوی ایمان
وہاں سے گزرا تو اُس نے ایک نوجوان لڑکی کو سادہ سے لباس میں بیٹھے دیکھا۔ اُس کے لباس پر
کے دھبے بھی نظر آ رہے تھے۔ مولوی ایمان علی کا دل لرز گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا اُس کے پاس آ
ہمدردی سے بولا۔ ”ارے بیٹا، کیا بات ہے؟ کیوں بیٹھی ہو یہاں؟ اور یہ تمہارے بدن پر خون کے
کیسے ہیں؟“
رجنی نے کوئی جواب نہیں دیا، ہلکی ہلکی آواز میں رونے لگی تو مولوی ایمان علی اور بے قرار ہو
اُس کے پاس بیٹھ کر بولا۔ ”بتاؤ تو سہی، کیا ہوا؟ گھر والوں نے مار کر نکال دیا ہے؟ زخمی کر دیا ہے
ارے خدا کی پناہ، کیسا خون نکل رہا ہے۔ اُٹھ بیٹی، اُٹھ۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔
پہلے تیرے زخموں کا علاج کیا جائے۔ فکر مند نہ ہو، تیرے برابر میری بیٹی بھی ہے اور بیوی ہے،
موجود ہیں۔ تجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اُٹھ بیٹا، اُٹھ۔“ ایمان علی نے ہاتھ سے لڑکی کو سہارا دیا
رجنی اُس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اُٹھ گئی۔ ایمان علی اُسے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اپنے گھر لے آیا۔
بڑی عمدگی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، ماں بیٹیاں جاگ رہی تھیں۔ امینہ باورچی
میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ یہ اُن کے روز کے معمولات تھے۔
مولوی ایمان علی دروازے سے اندر داخل ہوا اور اُس نے جلدی سے آواز دی۔ ”امینہ......
چھوڑ دو سارے کام۔ دیکھو، یہ بچی زخمی ہے۔ اس کے زخموں کا علاج کرو۔ امینہ، اسے دوسرے کپ
دے بیٹا۔ تیرے ہی برابر ہے۔“
ماں بیٹیاں دونوں دوڑ پڑیں۔ پھر اُنہوں نے اس طرح رجنی کی دلجوئی کی کہ رجنی اندر ہی
شرمندہ ہونے لگی۔ کتنے اچھے لوگ ہیں یہ۔ کیسی عزت کر رہی ہیں اُس کی۔ یہ زخم مصنوعی تھے۔
دیکھنے والوں کو یہ مصنوعی نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اس لئے امینہ اور اُس کی ماں نے ان زخموں کی مر
کی۔ زیادہ گہرے زخم نہیں لگائے گئے تھے، ورنہ پھر ڈاکٹر وغیرہ کا مسئلہ آ جاتا۔ مولوی ایمان علی با
رجنی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ نادرہ نے کہا۔
”نہیں...... زیادہ زخم نہیں ہیں۔ بس چوٹ لگی ہے۔ شاید کسی نے مارا ہے۔ پٹیاں باندھ دی
ہم نے۔“
”کپڑوں کا کیا ہوا؟“
”ابھی امینہ کپڑے نکالنے گئی ہے۔“
”اچھا، جب یہ کپڑے بدل لے تو مجھے بتا دینا۔“

”جی۔“
تھوڑی دیر کے بعد نادرہ نے ایمان علی کو آواز دی۔ ”اندر آ جائیے۔ اس نے کپڑے تبدیل کر لئے
ہیں۔“ ایمان علی اندر داخل ہو گیا اور اُس نے پہلی بار رجنی کا چہرہ دیکھا۔ معصوم سی، سیدھے سادھے
نقوش کی مالک ایک خوبصورت سی لڑکی جو سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اُسے اداکاری کرنی تھی اور
اپنا سکہ یہاں جمانا تھا۔
بہر حال، رجنی کی خوب خاطر مدارت کی گئی۔ گرم دودھ پلایا گیا۔ اور جب مولوی ایمان علی نے اُس
کے بارے میں پوچھا تو رجنی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”کوئی نہیں ہے میرا اس دنیا میں...... کوئی بھی
نہیں ہے۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ چا چا جی نے مجھے ایک ظالم کے ہاتھوں بیچ دیا۔ وہ ظالم میری ہی بستی
کا آدمی تھا اور اُس نے مجھے یہاں لا کر شدید زخمی کر دیا۔ بہت مارا اُس نے مجھے۔ وہ مجھ سے اپنی بات
منوانا چاہتا تھا مگر میں نے اُس کی بات نہیں مانی۔ مار پیٹ کرنے کے بعد اُس نے مجھے ایک اندھیری
کوٹھری میں بند کر دیا۔ چار دن تک میں اُس اندھیری کوٹھری میں بند رہی ہوں۔ اور بڑی مشکل سے
دروازہ کھول کر نکل سکی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں؟“ یہ کہہ کر رجنی زار و قطار رونے لگی۔
امینہ، نادرہ اور ایمان علی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ نیک دل اور محبت کرنے والے لوگ تھے۔ رجنی
کے چہرے پر اس قدر معصومیت تھی کہ اُنہیں اُس کی بات پر کوئی شبہ ہی نہیں ہوا۔ نادرہ نے آگے بڑھ کر
رجنی کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
”بڑے بڑے ظالم لوگ ہیں بیٹی اس دنیا میں۔ لیکن اب تم فکر مت کرو۔ قدرت نے ہم پر بڑا
احسان کیا ہے، ہمیں تم جیسی پیاری بچی کی خدمت کا موقع دیا ہے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ اب یہ بات کبھی
مت کہنا کہ اب تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ دیکھو، یہ امینہ ہے اور یہ تمہارے ابو ہیں۔ میں ماں
ہوں تمہاری، ہم سب تمہارے ہیں۔ بیٹا، امینہ تمہاری بہن ہے۔ تمہیں بھلا کس چیز کی پرواہ رہ جاتی ہے
اب؟ اللہ نے تمہیں صحیح جگہ بھیج دیا ہے۔ اس گھر میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اس گھر میں تمہاری
جگہ بالکل امینہ جیسی ہے۔“
”ہاں بیٹی، ہمیں اپنی خدمت کا موقع دو۔ پہلے اللہ نے ہمیں ایک بیٹی دی تھی، اب اُس کی عنایت
سے دو بیٹیاں ہو گئی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟“
”ستارہ ہے میرا نام۔“
”مسلمان ہو؟“
”ہاں......“ رجنی نے جواب دیا۔ اُسے شیطان کی یہی ہدایت تھی کہ مسلمان بن کر اس گھر میں رہے۔
”اگر تم مسلمان نہ بھی ہوتیں بیٹی، تو بیٹیاں تو بہر حال بیٹیاں ہی ہوتی ہیں۔ دین دھرم تو سب اللہ
کے کام ہیں۔ اُس نے جو ہدایت دی ہے انسان کو اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔ سب سے بڑا عمل
انسان کا، انسان کی خدمت کرنا ہے۔“
رجنی ان باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی، ویسے بھی نرم طبیعت کی مالک تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد

اُسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ امینہ اور اُس کا جسم ایک جیسا تھا۔ امینہ نے جلدی سے اپنا ایک لباس نکالا اور لے کر اُس کے پاس آ گئی۔ اُس نے کہا۔ ''یہ کپڑے پہن لو۔ چلو میں تمہیں غسل خانہ بتا دُوں۔ باہر آؤ گی تو میں تمہارے بال باندھ دُوں گی۔ کتنی پیاری بہن دی ہے اللہ نے مجھے۔ چلو جلدی سے غسل خانے میں جا کر غسل کر لو۔'' اور رجنی نے امینہ کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔

غسل خانے میں پانی سے نہاتے ہوئے اُسے ایک دم سے خیال آیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ شیطان کے کہنے پر یہاں آئی ہے اور شیطان نے اُسے حکم دیا ہے کہ اس گھر کو ملیا میٹ کر دیا جائے۔ کیا یہ اچھا عمل ہو گا؟ اندر سے اُس کے دل نے ایک عجیب سے انداز میں دھڑک کر کہا۔ نہیں...... یہ مخلص لوگ جنہیں تم سے کوئی لالچ نہیں ہے، تمہارے لئے ہر طرح اپنا سینہ کھول کر حاضر ہو گئے ہیں۔ کیا تم ان لوگوں کو تباہ کرو گی جہاں تین معصوم افراد رہتے ہیں؟

رجنی ایک دم سنبھل گئی۔ اُسے اشیش بھگونت یاد آ گیا، اپنی بہنیں یاد آ گئیں، وہ تہہ خانہ یاد آ گیا جہاں وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھیں۔ اُنہیں وہاں سے نکالنے والا اشیش بھگونت ہی تو تھا۔ ایسی صورت میں وہ اپنے دل میں ایسے خیال کیسے لا سکتی تھی؟ چنانچہ وہ جلدی سے سنبھل گئی۔

نہانے کے بعد اُس نے لباس تبدیل کیا، تولیے سے بال خشک کرتے ہوئے باہر آ گئی۔ باہر امینہ اس کی منتظر تھی، اُسے لے کر ایک طرف بیٹھ گئی اور بڑے اہتمام سے اُس کے بال سنوارنے لگی۔

''میں بنا لوں گی امینہ...... تم تکلیف مت کرو۔''

''نہیں جناب، میں آپ کی بہن ہوں۔ اب بڑی ہوں یا چھوٹی یہ بات جانے دیجئے۔ لیکن دونوں بہنیں ہیں۔ چنانچہ میں آپ کے بال بناؤں گی اور آپ میرے بنایا کریں۔''

ستارہ کی حیثیت سے رجنی خاموش ہو گئی۔ امینہ نے اُس کے بہت اچھے بال بنائے۔ تھوڑی دیر کے بعد نادرہ اندر داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے کے برتن اور کچھ گھر کی بنائی ہوئی چیزیں تھیں۔

''دیکھو، میں نے تمہارے لئے یہ آلو کی پوریاں بنائی ہیں۔ بہت اچھی لگیں گی چائے کے ساتھ۔ بیٹی، ہم بہت زیادہ دولت مند لوگ نہیں ہیں۔ بس یوں سمجھو کہ اللہ کے فضل سے گزارہ ہو جاتا ہے۔ یہاں اپنی تمام چیزوں سے ہم لوگ گزارہ کر لیا کرتے ہیں۔''

''میں آپ کو امی کہوں یا چچی جان؟''

''جو تمہارا جی چاہے۔''

''تو پھر ماں کہوں گی میں آپ کو۔''

''ہاں...... یہ بہت اچھا لفظ ہے۔ اس لفظ میں تو ساری کائنات سمٹ جاتی ہے بیٹا۔ چلو، خیر یہ شروع کرو تم۔ چلو امینہ، بہن کے ساتھ تم بھی مصروف ہو جاؤ۔ تاکہ یہ بلا تکلف کھا پی لے، ورنہ یہ تکلف کرے گی۔''

''نہیں ماں، میں کوئی تکلف نہیں کروں گی۔'' رجنی نے کہا اور اس کے بعد امینہ کے ساتھ کھانے میں

مصروف ہو گئی۔

''ایک بات سنو بیٹا، کھانے سے پہلے تم نے بسم اللہ نہیں پڑھی۔''

''جی......؟'' رجنی چونک پڑی۔

''دنیا کا ہر کام بسم اللہ پڑھ کر شروع کیا کرو۔ ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔''

''جی......'' رجنی آہستہ سے بولی۔ کھانا تو شروع کر چکی تھی، چنانچہ اس وقت خاموش رہی۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ بسم اللہ کا مطلب کیا ہے؟ یہ بات وہ پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ مسلمان گھرانہ تھا۔ اُسے مسلمان گھرانوں کے بارے میں کوئی خاص تفصیل نہیں معلوم تھی۔ بہر حال، جو کھانا پینا دیا گیا تھا وہ کھا پی لیا گیا۔ اور اس کے بعد امینہ اُسے کمرے سے باہر لے آئی۔ ان لوگوں کی محبتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور رجنی قدم قدم پر پریشان ہو رہی تھی۔ اتنا پیار، اتنی محبت دے رہے تھے وہ اُسے کہ رجنی کا دل شرم سے ڈوب رہا تھا۔

ایک دن...... دو دن...... تین دن گزر گئے۔ رجنی کو ایک دم سے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے اس کا کھویا ہوا گھر دوبارہ مل گیا ہو، ماں باپ مل گئے ہوں، سب کچھ مل گیا ہو اُسے۔ وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔

ادھر مولوی ایمان علی اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ''اس سے بڑا ثواب اور کوئی نہیں ہو سکتا نادرہ۔ اور پھر بھی وہ جوان ہو۔ پتہ نہیں کہاں اور پہنچ جاتی تو کیسے کیسے غلط ہاتھوں میں چلی جاتی۔ اُس کا دل اپنی مٹھی میں لو اور اُسے کوئی تکلیف نہ ہونے دو۔''

''کوشش تو میں کر رہی ہوں۔''

''ہاں، جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کچھ دیتا ہے تو بندوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اُس کے احکامات کی تعمیل کریں۔ اب دیکھو نا، اللہ نے تمہیں تمہاری بچی واپس کر دی۔ کس کی مجال تھی کہ وہ شیطان ناگ چندر کو شکست دے کر بچی کو حاصل کر سکتا؟ یہ اللہ کی ذات ہی تھی جس نے ہماری امینہ ہمیں واپس کر دی۔ تمہیں ساری تفصیل بتا چکا ہوں۔''

مولوی ایمان علی نے تو شروع میں اپنی بیوی کو کچھ نہیں بتایا۔ لیکن جب امینہ واپس آ گئی اور اُس کی بیوی ان حالات سے کافی اُلجھ گئی تو مولوی ایمان علی نے اُسے ساری تفصیل بتا دی۔ اصل میں اُس نے بہت سے ایسے عمل کئے تھے جس کی وجہ سے اُسے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ناگ چندر کا جادو ختم ہو چکا ہے اور امینہ اب اصل امینہ ہی ہے۔ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوئے تھے اور مولوی ایمان علی نے نجانے کب تک اپنی پیشانی زمین سے ٹکائے رکھی تھی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا۔ جس مشکل سے وہ گزر رہا تھا اس کا کوئی حل اُس کے پاس نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مشکل کا حل کر دیا۔ چنانچہ رجنی کے لئے وہ اپنے دل میں بڑی ہی محبت پا رہا تھا۔ اُس کے دل میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ رجنی کوئی غلط شخصیت ہو سکتی ہے۔ برے انداز میں سوچنے کا وہ عادی ہی نہیں تھا۔

لیکن اب رجنی کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اکثر راتوں کو جاگتی رہتی تھی۔ اشیش بھگونت

نے یہاں آنے کے بعد اُس سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا اور یہ اشیش بھگونت کا ایک انداز تھا
اس طرح کا کوئی عمل نہیں کرتا تھا، بلکہ اپنے شاگردوں کو ایسے ہی اُن کی مرضی پر چھوڑ دیا کرتا
ایک بار اُنہیں ہدایت دی جاتی تھی، اور پھر اُنہیں اپنا کام کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ رجنی کے ذہن
ایسی بات نہیں آسکی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اس دوران وہ ایک بار بھی باہر نہیں نکل سکی تھی
اُس نے سوچا کہ کسی بھی طرح تھوڑی دیر کے لئے باہر تو نکلے۔ چنانچہ وہ انتظار کرتی رہی۔
سارے لوگ سو گئے تو اُس نے ایک چڑیا کا رُوپ دھارا اور اس کے بعد پھدکتی ہوئی ایک روشندا
باہر نکل آئی۔

باہر وہ کافی دیر تک فضا میں پرواز کرتی رہی اور اس کے بعد نیچے اُتر آئی۔ یہ ایک حسین جگہ تھی
خوبصورت سا باغ اور اس باغ میں اُس نے ایک روشنی دیکھی۔ وہ اپنی جگہ سے پرواز کرتی ہو
طرف چل پڑی۔ باغ میں باقاعدہ بجلی کا انتظام تھا، پھولوں کی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں۔ جس جگہ
تھی وہاں اُس نے ایک آٹھ نو سال کی بچی اور نوجوان لڑکے کو دیکھا۔ بچی کے ہاتھ میں خربوزہ تھا
کھا رہی تھی اور نوجوان محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ منظر کچھ اتنا خوبصورت تھا
پرواز کرتی ہوئی اُس درخت پر پہنچ گئی جس کے نیچے وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑے ہی فا
خربوزوں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں، نوجوان کے چہرے سے اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا جیسے ڈ
ہو۔ جبکہ بچی بڑے مزے سے خربوزہ کھا رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔

”تم بھی کھا لو نا بھیا.....تم بھی تو کل سے بھوکے ہو۔“

”ارے نہیں پگلی۔ تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ میں بھوکا ہوں؟“

”لو، یہ کوئی کہنے والی بات ہے؟ میں جانتی نہیں ہوں کیا؟“

”روما، تم کھاؤ بیٹا۔“

”اور خربوزہ توڑ لو بھیا۔“

”پاگل ہو تم؟ خربوزے ہمارے باپ کے نہیں ہیں۔ اگر مالی آگیا تو مصیبت بن جائے گی۔“

”بھیا، ایک بات بتاؤ۔ خربوزے ہمارے باپ کے کیوں نہیں ہیں؟“

”اس لئے کہ ہمارے باپ ہی نہیں ہیں۔“ نوجوان نے کہا اور ہنس پڑا۔

”خیر وہ الگ بات ہے۔ مگر ایک بات بتاؤ بھیا، کس آدمی کے ہیں؟“

”کیا تم جانتی نہیں ہو بابا نواب کو؟ یہ بابا نواب کے ہیں۔ اور بابا نواب مالک ہیں اس کے۔“

”مگر بھیا، پھر ہم چوری کر کے خربوزہ کھا رہے ہیں؟“

”روما بیٹا، خربوزہ کھا لو۔ جلدی سے نکل چلتے ہیں، ورنہ مصیبت آجائے گی۔“

”اچھا ایک بات بتائیے بھیا، یہ کچھ لوگ بڑے اور کچھ چھوٹے کیوں ہوتے ہیں؟“

”پہلے تم مجھے ایک بات بتاؤ، تم چھوٹی ہو یا بڑی؟“

”میں تو بڑی ہوں۔“

”کوئی نہیں۔ اتنی سی تو ہو۔ میں تم سے بڑا ہوں۔“

”مگر میں یہ کہہ رہی ہوں بھیا، کہ کچھ کے باغ ہوتے ہیں اور کچھ کے نہیں ہوتے۔ اور ہمارے پاس تو کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے بھیا، تم کل سے بھوکے ہو۔ وہ جو نیاز کا سامان آیا تھا، بس وہی کھایا تھا ہم نے آخری بار۔ تم نے وہ روٹی بھی مجھے کھلا دی تھی۔“

”ہاں ہاں، اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے بیٹا۔ مل جائے گا۔ سب کچھ مل جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔“

”بھیا مجھے تو بہت ہی فکر ہوتی ہے۔“

”پگلی، بس جیسے ہی نوکری لگی ہمارے حالات ایک دم سے اچھے ہو جائیں گے۔ اور یہاں نوکری نہ ملی تو پھر کہیں اور چلیں گے۔“

”بھیا، یہ نوکری کیوں نہیں ملتی؟“

”اب اللہ کی مرضی۔“

”جب تمہاری نوکری لگ جائے گی نا بھیا، تو ہمارے گھر بھی کھانا پکا کرے گا نا؟“

”ہاں تو اور کیا؟“

”کھانا کون پکائے گا، میں پکاؤں گی نا؟ مجھے سب کچھ آتا ہے۔“

”بس پھر سمجھ لو، نوکری لگنے ہی والی ہے۔ بس تھوڑے دن کی بات ہے۔“

رجنی یہ ساری باتیں حیرت اور دلچسپی سے سن رہی تھی۔ بچی اُسے بہت پیاری لگی تھی۔ لیکن جو باتیں وہ کر رہے تھے وہ بڑی دُکھ بھری تھیں۔ اس کا مطلب ہے صورتحال بڑی پریشان کن ہے ان بیچاروں کے لئے۔ نجانے کیوں رجنی کے دل میں ایک تڑپ سی اُبھری۔ اُس نے بڑے پیار سے بچی کو دیکھا۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ اُڑ کر بچی کے کاندھے پر بیٹھے اور اُس کے کان میں کہے کہ پیاری بچی، تمہاری مشکلوں کے دن گزر گئے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن ظاہر ہے یہ سب کچھ مناسب نہیں ہوتا۔

اچانک ہی رجنی نے دو آدمیوں کو دیکھا، اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھا اور دوسرا ایک شیطان صورت کا آدمی تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔ اور پھر وہ لڑکی اور نوجوان اُس وقت چونکے جب وہ اُن کے سر پر پہنچ گئے۔

”کیوں بے اُلو کے پٹھے.....اپنے باپ کا مال سمجھ کر مزے اُڑا رہا ہے؟“ لٹھ والے آدمی نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور نوجوان دہشت سے اُچھل پڑا۔ بچی کے حلق سے بھی ایک چیخ نکل گئی اور خربوزہ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

”اُلو کی پٹھی، تیرے باپ نے بھی کبھی کوئی ایسا پھل نہیں کھایا ہے۔ جانتی ہے اس باغ کی ایک ایک چیز قیمتی ہے۔ یہ ہمارے مالک ہیں بابا نواب۔ ان کا باغ ہے یہ۔ اور تو کون ہے؟“

”بھائی، معافی چاہتا ہوں۔ آپ دیکھیں میں نے صرف ایک ہی خربوزہ توڑا ہے۔ حالانکہ میں بھی کل سے بھوکا ہوں مگر میں نے دوسرا خربوزہ نہیں توڑا، بس ایک خربوزہ اپنی بہن کو توڑ کر دے دیا ہے۔ بالکل مجبوری سمجھ لیجئے یہ آپ میری۔ معافی چاہتا ہوں۔“

''ہوں...... والد صاحب کا گھر سمجھ کر یہاں آ گئے تھے؟ میں کہتا ہوں تم نے اجازت کے بغیر خ
توڑا ہی کیسے؟ ایک یا دو کی بات نہیں۔'' اب کی بار بابا نواب نے کہا۔

''ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں جناب۔''

''معافی نہیں...... چل بے، کپڑے اُتار اس سسرے کے اور ڈنڈے لگا اس کے۔ تا کہ آئندہ
نہ ہو۔''

''دیکھئے جناب، میں نے معافی مانگ لی ہے۔ آپ اگر مجھے موقع دیں تو میں آپ کو اس خربوز
کی قیمت ادا کر دُوں گا۔ بلکہ بابا نواب صاحب، آپ مجھے اپنے ہاں نوکر رکھ لیں۔''

''اچھا اچھا... وہ تو بعد میں رکھ لوں گا تجھے۔ اوئے، تو نے سنا نہیں؟ چل کپڑے اُتار اس کے۔''

''دیکھئے جناب، میں معافی مانگ چکا ہوں۔ آپ ایسا نہ کریں۔'' بچی رونے لگی تھی۔

رجنی کو شدید غصہ آنے لگا۔ ایک خربوزے کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے؟ اُس نے سوچا کہ کہیں
کمبخت اس نوجوان اور اس کی بہن کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ لیکن کیا کرنا چاہیئے؟ دوسرے لمحے رجنی
ذہن میں ایک خیال آیا اور اُس نے درخت کی شاخ پر لوٹ لگائی اور ایک براؤن اور پیلے بھڑ کی
اختیار کر گئی۔ اس وقت اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ بھڑ بن کر وہ اُڑتی ہوئی آئی اور بابا
نواب کی گردن پر اُس نے اس زور سے کاٹا کہ بابا نواب بری طرح چیخ پڑا۔ اتنی زوردار چیخ ماری
اُس نے کہ ساتھ کھڑے آدمی کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ گیا اور وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا......؟'' وہ وحشت زدہ آواز میں چیخ رہا تھا اور بابا نواب اس طرح لوٹیں لگا رہا
تھا جیسے کسی نے اُس کی گردن ہی کاٹ دی ہو۔ ''کیا ہوا صاحب......؟''

بابا نواب نے تو کچھ نہ بتایا، رجنی نے اُس آدمی کی گردن میں بھی زور سے کاٹا۔ اصل میں گردن کا
حصہ ہی کھلا ہوا تھا اور پھر جگہ بھی بڑی عمدہ تھی۔ دوسرا آدمی بھی چیخنے لگا۔ اتنی دیر میں نوجوان نے بہن کا
ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ رجنی کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب ہنسے اور کاٹ کاٹ کر انہیں ادھ
موا کر دے۔ لیکن پتہ نہیں کیا سوجھی تھی اُسے وہ اُن دونوں کے اُوپر پرواز کرنے لگی اور اُن دونوں کا تعاقب
کرتی ہوئی باغ سے باہر نکل آئی۔

وہ دونوں بھاگتے رہے تھے۔ رجنی اُن کے سروں پر پرواز کرتی رہی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے
اُن کو ایک کچے مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ رجنی کے لئے بھلا اس مکان میں داخل ہونا کون
سا مشکل کام تھا؟ مکان میں ایک ہی چھوٹا سا دالان اور صحن تھا۔ بے رونقی یہاں ڈیرے ڈالے ہوئے
تھی۔ دالان میں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی اور ایک طرف تخت پڑا ہوا تھا۔ نوجوان نے اندر داخل
ہونے کے بعد بچی سے کہا۔

''بچا دیا بس اللہ نے۔''

''میں آپ سے نہیں بولتی۔''

''معافی چاہتا ہوں روما...... کیا کرتا بیٹا؟ بھوکی تھیں بالکل تم۔ مجبوری تھی یہ۔ بس یہی ایک دماغ میں
آئی تو میں نے کر ڈالا۔''

''میں اس بات پر ناراض نہیں ہوں۔''

''تو پھر؟''

''آپ نے تو کہا تھا کہ آپ بھوکے نہیں ہیں۔ آپ نے کیوں نہیں وہ خربوزہ کھایا؟''

''چلو ٹھیک ہے۔ اب جو کچھ بھی کھائیں گے ساتھ کھائیں گے۔ کیا سمجھیں؟''

''بھیا، کہاں سے کھائیں گے؟ ہمارے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔''

''آ جائے گا...... آ جائے گا۔ پیسہ بھی آ جائے گا۔''

رجنی یہ ساری باتیں سنتی رہی۔ اور پھر وہ بچی کہنے لگی۔ ''لیکن بھیا، وہ چیخے کیوں تھے؟''

''یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ لگتا ہے اُنہیں کسی چیز نے کاٹ لیا تھا۔'' نوجوان نے کہا اور رجنی کچھ
سوچتی ہوئی وہاں سے واپس اُڑ گئی۔ اُس نے اس گھر کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ یہ گھر واقعی مصیبت زدہ
افراد کا تھا۔ یہ ساری باتیں اُس کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ اُسے اپنے گھر کے حالات کا خیال آیا۔ بڑی اچھی
زندگی گزرتی تھی اُس کی۔ لیکن برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک بابا نواب نے رجنی کے
ماتا پتا کو ختم کر دیا تھا۔ بہرحال یہ ساری باتیں سوچتی ہوئی وہ وہاں سے اُڑتی رہی اور ایک بار پھر باغ
میں پہنچ گئی۔

اب وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ جو کام رجنی نے کر دکھایا تھا وہ رنگ لایا تھا۔ بابا نواب نیم غشی
کی سی حالت میں تھا۔ یہی کیفیت غالباً مالی کی تھی۔ رجنی کو خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی زہریلی ہے۔
بہرحال ان لوگوں کو باقاعدہ گاڑی میں ڈال کر لے جایا گیا تھا۔ یہ بات پتہ چل چکی تھی کہ نواب صاحب
کو صرف ایک بھڑ نے کاٹا ہے۔ رجنی اُن کے ساتھ ساتھ پرواز کرتی رہی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک
شاندار حویلی میں پہنچ گئی۔ بابا نواب صاحب کو اس حویلی میں لے جایا گیا۔ رجنی نے سوچا کہ اگر وہ بھڑ
کی شکل میں رہی تو صورتحال خراب ہو جائے گی۔ چنانچہ اس بار اُس نے اس سے بھی چھوٹی ایک مکھی کا
روپ دھار لیا تھا اور ایک جگہ چپک کر بیٹھ گئی تھی جہاں بابا نواب صاحب لائے گئے تھے۔ لوگ دوڑے
پھر رہے تھے اور بابا نواب صاحب نیم غشی کی کیفیت میں چیخ رہے تھے۔

پھر شاید ڈاکٹر آیا اور اُس نے بابا نواب صاحب کے زخم کا علاج کیا اور اُن کے جسم سے مکھی کا زہر
ختم کرنے کے لئے انجکشن وغیرہ لگائے۔ خوب دیکھ بھال ہو رہی تھی۔ اور رجنی اس شاندار حویلی کو دیکھ
رہی تھی۔ بابا نواب سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ بابا نواب کی دولت کا کچھ حصہ
اس بیروزگار نوجوان تک ضرور پہنچنا چاہیئے جو بیچارہ اپنی بہن کے لئے مصیبتیں اُٹھا رہا ہے۔ بہرحال اس
کا طریقہ کار اُسے دریافت کرنا تھا۔ بابا نواب کی حویلی بہت زبردست تھی، اور وہ تھوڑی دیر کے بعد
وہاں سے ہٹ کر ایسی جگہوں کا جائزہ لینے لگی جہاں بابا نواب کی دولت پوشیدہ ہو سکتی تھی۔ اس وقت اور
کوئی ذریعہ اُسے نظر نہیں آیا، ایک جگہ اُس نے کچھ رقم رکھی ہوئی دیکھی اور اس پر غور کرنے لگی۔ تھوڑی
دیر کے بعد ایک ترکیب اُس کے ذہن میں آ گئی۔ وہ ایک سنسان جگہ تلاش کرنے لگی۔ اور پھر اُس نے

اپنے آپ کو چوہے کے روپ میں ڈھال لیا۔ چوہے کی شکل میں وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ زیادہ وزن اُس کے لئے اُٹھانا مشکل کام تھا۔ انسانی شکل میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ اُس نے صرف دو بڑے بڑے نوٹ اپنے منہ میں دبائے اور وہاں سے چل پڑی۔ ایک چھوٹے سے سوراخ سے نکل کر وہ مختلف راستے طے کرکے آخر کار باہر آ گئی۔ یہاں آ کر اُس نے انسانی رُوپ دھار لیا اور آہستہ آہستہ وہ نوٹ لے کر اُس جانب چل پڑی جہاں وہ بچی رو رہی تھی۔ یہاں پہنچنے کے بعد ایک بار پھر اُسے اُلجھن کا شکار ہونا پڑا، وہ سوچنے لگی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے؟ لیکن بہرحال وہی چوہے کا معاملہ صحیح تھا۔ وہ چوہا بن کر ہی اُس کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس وقت وہ نوجوان اُس بچی کے ساتھ صحن میں بیٹھا ہوا اُسے کوئی کہانی سنا رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا بھیا؟"

"بس جناب، اُس لڑکے نے دُعا مانگی کہ اللہ میاں اسے کچھ دے۔ اس کی بہن بھوکی ہے۔ چنانچہ پھر یہ ہوا کہ ایک فاختہ اُڑتی ہوئی آئی، اُس کی چونچ میں دو نوٹ دبے ہوئے تھے۔ فاختہ نے وہ نوٹ اُن کے سامنے رکھے اور پھر اپنی جگہ سے اُڑ گئی۔ نوجوان نے جب نوٹوں کو دیکھا تو اُس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی، اللہ میاں نے اُس کی فریاد سن لی تھی۔ بس جناب اُس نے اطمینان سے نوٹ اُٹھائے دوسرے دن اپنی بہن کے لئے بہت ساری چیزیں لے آیا۔"

رجنی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ایک بار پھر اپنی جون بدلنے لگی۔ اور اُس نے فاختہ کا رُوپ دھار لیا۔ اُس نے دونوں نوٹ چونچ میں دبائے اور پھڑ پھڑاتی ہوئی اپنی جگہ سے اُٹھی اور نوجوان اور لڑکی کے پاس جا بیٹھی۔ نوجوان نے چونک کر اُسے دیکھا اور اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رجنی نے دونوں نوٹ چونچ سے ہٹا دیئے تھے۔ لیکن نوجوان کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ البتہ روما خوشی سے چیخ پڑی۔ "لو بھیا...... نوٹوں والی فاختہ آ گئی۔"

نوجوان جیسے پتھر کا بن گیا تھا۔ رجنی اپنی جگہ سے اُڑی اور اس کے بعد پرواز کرتی ہوئی وہاں سے نکل آئی۔ اُسے یقین تھا کہ نوجوان ان نوٹوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھائے گا۔ اس کے بعد وہ نہیں رُکی تھی اور فاختہ کی حیثیت سے ہی پرواز کرتی ہوئی مولوی ایمان علی کے گھر پہنچ گئی تھی۔

یہاں گہری خاموشی اور سناٹا طاری تھا، سارے سو رہے تھے۔ لیکن نجانے کیوں رجنی کے دل و دماغ پر ایک شدید سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی جون بدلی، یہاں کسی کو اُس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ اپنے بستر پر وہ آ کر لیٹ گئی اور اُس کا دماغ سوچوں میں ڈوب گیا۔ وہ اپنے اس آج کے کارنامے پر غور کر رہی تھی، باہر نکلنا تو بڑا ہی اچھا ثابت ہوا۔ اُس بیچارے نوجوان کی کیا کیفیت تھی؟ بچی کا نام تو روما تھا لیکن اُس نوجوان کا نام کیا تھا؟ وہ دماغ پر زور دینے لگی لیکن اُس نوجوان کا نام سامنے نہیں آیا تھا۔ لیکن نام سامنے آنے یا نہ آنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ تو اس بات پر خوش تھی کہ اُسے کسی کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔

دفعتہً ہی وہ چونک پڑی۔ اشیش بھگونت تو کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ اُس نے تو کہہ رکھا تھا کہ زمانے

بسنے والوں کو جتنا نقصان پہنچایا جا سکتا ہے، پہنچایا جائے۔ یہ اُس کا نظریہ حیات ہے اور اسی میں ان کی نجات ہے۔ اگر اشیش بھگونت کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے کسی کا اس طرح کام کیا ہے تو کیا وہ اس بات سے خوش ہوگا؟ ارے دیا رے دیا...... یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ یہ سب کچھ تو اشیش بھگونت کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ بھگوان کرے کسی طرح اشیش بھگونت کو اس بارے میں معلوم ہی نہ ہو۔ پتہ نہیں سنسار کی ہر بات اُس تک پہنچ جاتی ہے یا نہیں؟ ویسے اُس کے ہاتھ تو لمبے ہی تھے، ہر اچھی اور بری بات کو جان لیتا تھا۔ لو بھیا، یہ تو گڑبڑ ہو گئی۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ مصیبت ہی آ جائے۔ خوف کے عالم میں نجانے وہ کتنی دیر تک سوچتی رہی۔ اُس کا ذہن بری طرح اُلجھ گیا تھا، نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ آج کی رات تو بڑی ہی پریشانی کی بات ہے۔ اب کیا کروں؟ وہ ان سوچوں میں ڈوبی رہی۔ جب پوری طرح بے کل ہو گئی تو اپنی جگہ سے اُٹھی اور اُس کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔ اُس نے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے لئے کھڑکی کھول دی اور ہوا اندر آنے لگی۔ پیچھے جھاڑ جھنکاڑ بکھرے ہوئے تھے، ایک بڑا سا درخت بھی تھا جو برگد کا تھا اور اُس کی داڑھیاں نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ نجانے کیوں رجنی کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اُس کی نگاہیں برگد کے درخت کے تنے پر جم گئیں جہاں دو ننھی ننھی روشنیاں چمک رہی تھیں...... یہ روشنیاں عجیب سے انداز کی تھیں۔ رجنی حیرت سے اُنہیں دیکھنے لگی۔ اور جب اُس کی نگاہیں اُن روشنیوں کو صحیح طرح جاننے میں کامیاب ہو گئیں تو اُس نے دیکھا کہ وہ دو آنکھیں تھیں۔ دو انسانی آنکھیں...... جو برگد کے درخت کے تنے پر جمی ہوئی تھیں۔ کیا وہاں کوئی انسان کھڑا ہوا ہے؟ لیکن اگر انسان ہے بھی تو اُس کی آنکھیں اس طرح کیوں چمک رہی ہیں؟ رجنی پھٹی پھٹی نگاہوں سے برگد کے تنے پر چمکتی ہوئی اُن نگاہوں کو دیکھتی رہی۔ جب اُس کی آنکھیں اچھی طرح دیکھنے کی عادی ہو گئیں تو اُس نے محسوس کیا کہ ان آنکھوں کے اُوپر یا نیچے کوئی انسانی سر یا جسم نہیں ہے، صرف دو آنکھیں ہیں جو برگد کے تنے میں ٹکی ہوئی ہیں۔

یہ نظر کا وہم نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی، ایک ٹھوس حقیقت۔ ایک لمحے کے لئے تو اُس کے دل میں خوف کا احساس پیدا ہوا۔ یہ چکر کیا ہے؟ لیکن جن حالات سے گزر چکی تھی اس کے بعد یہ سب کچھ بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی ہمت کو قائم کیا اور آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے چل پڑی۔ برگد کے درخت کے پاس پہنچ کر اُس نے تنے کو دیکھا، وہاں کچھ نہیں تھا۔ ایک سیدھا سادھا سپاٹ تنا۔ وہ پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا۔ "بلاوجہ خوامخواہ کی اُلجھنیں پال لیتی ہوں میں۔ واپس چلنا چاہئے۔" کچھ دیر کے بعد وہ پھر اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی اور سوچوں کے دھارے نجانے کہاں سے کہاں بہہ رہے تھے۔ خیالات دُور دُور تک کا سفر کر رہے تھے، ماضی نجانے کیوں آج بری طرح یاد آ رہا تھا۔ بچپن کی یادیں تو خیر ہوتی ہی سنہری ہیں۔ لیکن اِن میں زندگی کے ایسے ایسے خوشنما رنگ چھپے ہوتے ہیں کہ انسان ان رنگوں میں کھو جائے تو کہیں اور جانے کو دل نہ چاہے۔

وہ بچپن کی یادوں سے آگے بڑھی اور پھر برے حالات کا اندازہ ہوا۔ ہاں، جو کچھ ان پر بیتی تھی وہ بڑی سنسنی خیز تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر اشیش بھگونت وہاں اُس قید خانے میں اُن کی مدد نہ کرتا تو وہ سب وہیں مرکھپ گئی ہوتیں۔ لیکن اس کے بعد اشیش بھگونت کے جال میں پھنس کر جو کچھ کرنا پڑ رہا تھا کیا وہ کوئی اچھا عمل تھا؟ نہیں...... انسانوں کو نقصان پہنچانا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ اُنہیں جو نقصان پہنچا تھا، اس کا اندازہ اُنہیں تھا اور جو ہوتا رہا تھا وہ بہت ہی بھیانک تھا۔ انسان تو انسان سے محبت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ بھلا شیطان کا یہ انداز اُنہوں نے کیوں قبول کر لیا ہے؟ روپا، رادھا، رما، راگنی ساری کی ساری شیطان کے جال میں پھنس گئی ہیں۔ بے شک اس میں جیون کا حسن چھپا ہوا ہے، زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔ لیکن کیا یہ آرام ہی زندگی میں سب کچھ ہے؟ اس کے علاوہ بھی تو زندگی میں اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ محبت...... اور محبت کے نام کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک چہرہ گزر گیا۔ یہ چہرہ اُس نوجوان کا تھا جو روما کا بھائی تھا اور جس کی مدد کر کے رجنی کو ایک عجیب سے سرور اور سکون کا احساس ہوا تھا۔ اُس کا دل دھک سے ہو گیا......! کہیں ایسا تو نہیں کہ اُس کے دل میں اُس نوجوان کی محبت کا پودا اُگ آیا ہو...... اس تصور نے اُس کے بدن پر ہلکی ہلکی کپکپی طاری کر دی۔ ہم سب زندگی سے کتنا دُور ہو گئے ہیں۔ انسانی زندگی تو کچھ مخصوص تحریروں سے عبارت ہوتی ہے، ان تحریروں میں بچپن کی معصومیت، جوانی کا پیار اور بڑھاپے کا سکون ہوتا ہے۔ ہم جوانی کے پیار اور بڑھاپے کے سکون سے کس قدر دُور ہو گئے ہیں؟ نہ ہی ہمارے اندر نسوانیت رہی ہے نہ محبت کا تاثر۔ ہم تو ایک طرح سے بدرُوحیں بن گئے ہیں۔ یہ تو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ کیا، کیا جائے؟ کچھ سوچنا ہو گا...... کچھ سوچنا ہو گا۔
اُس کی نگاہیں چھت کے قریب بنے ہوئے ایک روشندان کی طرف اُٹھ گئیں اور وہ اُچھل پڑی...... اُس روشندان سے اُسے دو آنکھیں نظر آ رہی تھیں...... بالکل ویسی ہی آنکھیں جو اُس نے برگد کے درخت پر دیکھی تھیں......

ہے بھگوان...... ہے بھگوان...... یہ کیا؟...... یہ سارا قصہ کیا ہے؟...... کیا ہو رہا ہے یہ سب کچھ؟......
وہ سوچ میں ڈوب گئی......!!

❁❁❁

منوہر اُن لڑکیوں کے جال میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اب اُس کا زیادہ تر وقت اُن کی کوٹھی میں ہی گزرتا تھا، تحفے تحائف لانا اُس کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ لاکھوں روپے کے تحفے دے چکا تھا اُنہیں۔ لیکن یہ مسئلہ تھا کافی اُلجھا ہوا، اور یہ فیصلہ نہیں ہو سکا تھا یا منوہر کم از کم یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ ان چاروں لڑکیوں میں سے اُسے کون پسند ہے؟
اُدھر وہ چاروں کی چاروں اپنی شرارتوں میں مصروف تھیں۔ منوہر اُن کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا تھا۔ اُسے اچھی خاصی رقمیں جتا دی تھیں اُنہوں نے۔ اور ادھر منوہر کا باپ جواہر جو بے شک ایک عمر رسیدہ آدمی تھا، الگ سوچوں میں ڈوب گیا۔ وہ لڑکیاں اُس کے لئے بھی بڑی عجیب وغریب بن گئی تھیں۔ لیکن وہ یہ محسوس کر چکا تھا کہ اُس کا بیٹا منوہر ان لوگوں سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ یہاں باپ بیٹے کے دل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہو چکا تھا اور جواہر سوچ رہا تھا کہ منوہر کا پتا کس طرح سے وہاں سے کاٹا جا سکتا ہے؟ بے شک جواہر کے لئے اُن لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اُن کی جو خوبیاں تھیں وہ ناقابل یقین تھیں اُس کے لئے۔ بہت سوچتا رہا، آخر کار اُس نے اپنے بیٹے ہی کو مخاطب کر کے کہا۔
”بیٹا منوہر، ان جوان لڑکیوں کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟“
منوہر جو کئی بار غور کر چکا تھا کہ اُس کا باپ اس سلسلے میں کچھ غلط اقدام کرنے میں مصروف ہے چونک پڑا۔ پھر اُس نے باپ کا احترام سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”پتا جی، کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ بس ہماری نئی پڑوسی ہیں۔ اس سے پہلے یہ حویلی بنسی لعل کے پاس تھی، مگر بنسی لعل اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ سنا ہے اُس نے یہ حویلی اُن لوگوں کے ہاتھ بیچ دی ہے۔“
”ہاں، بڑی عجیب سی بات ہے۔ ویسے منوہر، بڑی حیران کن بات ہے کہ وہ ریس کے معاملے میں کتنی ہوشیار ہیں۔ اس بارے میں تم کیا کہتے ہو؟“
”پتا جی اُن کی پرکھ بڑی زبردست ہے۔ وہ صحیح گھوڑے کو تاڑ لیتی ہیں۔“
”بیٹا میں یہ بات نہیں مانتا۔“
”کیا مطلب؟“ منوہر نے چونک کر کہا اور جواہر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اُس نے کہا۔
”جادو منتروں کے بارے میں تو تم جانتے ہی ہو۔“
”میں تو کچھ نہیں جانتا پتا جی۔ مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“
”میرا مطلب ہے جو گھوڑے جیت جاتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ جیت جائیں۔ معمولی

سے گھوڑے ہوتے ہیں اور پہلے کبھی اُن کی جیت کا کوئی کارنامہ سامنے نہیں ہوتا۔ یہ اجنبی گھوڑے اُ
کیسے جیت جاتے ہیں؟"
"پتا جی، آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"
"بیٹا، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ وہ لڑکیاں بہت پراسرار ہیں۔ اُن میں سے کسی کو جادو منتر آتا ہے
جس کے ذریعے وہ گھوڑا جتا دیتی ہیں۔"
"اگر ایسی ہی بات ہے پتا جی، تو بہرحال ہمارے لئے کیا بری ہیں؟ ہم تو لاکھوں کما چکے ہیں ان کی
وجہ سے۔"
"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اُنہیں اور قریب لانے کا کیا ذریعہ ہے؟"
"آپ کے خیال میں کیا ہو سکتا ہے پتا جی؟"
"نہیں...... میرا مطلب ہے تم تو وہاں جاتے آتے رہتے ہو۔"
"ہاں......"
"اور ایک بات کہوں، یہ حویلی پہلے آسیب زدہ مشہور تھی۔"
"تو پھر آپ کا کیا خیال ہے، کیا یہ حویلی کے آسیب ہیں۔" منوہر نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا
اور جواہر ہنسنے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔
"اگر یہ حویلی کے آسیب ہیں تو بڑے سندر ہیں۔ ایسے آسیب تو ہمارے گھروں میں ہونا چاہئیں۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ کوئی لڑکی اگر اُن میں سے تمہیں پسند ہے تو تم اُس سے شادی کر لو۔"
"پتا جی...... آپ کہہ رہے ہیں یہ بات؟"
"ہاں، کیوں؟"
"آپ تو اُنہیں حویلی کا آسیب سمجھتے ہیں۔"
"میں نے کہا نا حویلی کے آسیب نہیں ہیں وہ۔"
"تو پھر جادو منتر والی بات؟"
"ہاں، اُن میں سے کسی کو جادو منتر ضرور آتا ہے۔"
"کسے؟"
"یہی تو پتہ نہیں چل سکا۔"
"تو اس کا پتہ کیسے چلے؟"
"مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"
"کہاں؟"
"حویلی میں۔"
"آپ وہاں جا کر کیا کریں گے؟"

"میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ میں یہ دیکھوں گا کہ اُن میں سے جادو منتر کرنے والی لڑکی کون ہے؟"
"ہوں...... ٹھیک ہے پتا جی۔ آپ چلئے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"
"بس، تو پھر آج شام کو تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔" جواہر نے کہا اور منوہر نے گردن ہلا دی۔ لیکن نجانے کیوں اُس کے ذہن میں ایک اُلجھن کا سا احساس ہو رہا تھا۔ بہرحال، باپ کا معاملہ تھا۔ وہ خود بھی ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اُس کے ذہن میں کس لڑکی کے لئے بہت زیادہ گنجائش ہے؟ ویسے رما اُس کے بہت زیادہ قریب رہا کرتی تھی اور رما نے اس طرح اُس پر اپنی محبت کا جال پھینکا تھا کہ منوہر اُس میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ حالانکہ ابھی تک دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ لیکن بہرحال بہت سی باتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھ لی جاتی ہیں۔ جہاں تک رما کا تعلق تھا تو وہ پوری طرح شیطان کے پھیر میں تھی اور جو کچھ کر رہی تھی وہ صرف اشیش بھگونت کے اشارے پر کر رہی تھی، ذاتی مسئلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اور اُس کے دل میں کسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ ایک طرح سے غیر انسانی شخصیتیں بن چکی تھیں۔ چونکہ وہ شیطان کی شاگرد تھیں۔ اس لئے نہ تو اب اُنہیں کسی چیز سے خوف محسوس ہوتا تھا اور نہ ہی اُن کے دلوں میں کسی کے لئے گداز یا محبت پیدا ہوتی تھی۔ وہ پوری طرح شیطانی رنگوں میں رنگی جا چکی تھیں اور اُن کے نزدیک کوئی اخلاقی حیثیت قائم نہیں رہ گئی تھی۔

بہرحال، اُس شام جواہر اور منوہر دونوں ایک ساتھ ہی اُن کے گھر پہنچے تھے۔ روپا نے دُور ہی سے اُن دونوں کو دیکھا اور بری طرح ہنسنے لگی۔ رادھا اور رما بھی آ گئی تھیں۔
"لو...... دو گدھے آ رہے ہیں۔ پہلے تو ایک ہی گدھا ہمارے سر پر سوار رہتا تھا، اب ان کی تعداد بڑھ کر دو ہو گئی ہے۔"
"واہ...... یہ تو بڑے مزے کی بات ہے۔ آنے دو، آنے دو۔" رادھا نے کہا۔
اُنہوں نے بڑی محبت سے اُن دونوں کا سواگت کیا تھا۔ "آیئے جواہر جی...... آج تو آپ نے ہمارے دل کی مراد پوری کر دی۔ یعنی یہ کہ ہم سوچتے تھے کہ پتہ نہیں جواہر لعل مہاراج ہمارے بارے میں کیا ارادے رکھتے ہیں؟ کیسے خیال ہے ان کے دل میں ہمارے لئے؟"
"ارے ارے، دیوی جی، کیسی باتیں کرتی ہیں؟ آپ تو پجاری ہیں آپ کے۔ دیویوں کی تو پوجا ہی کی جاتی ہے۔"
"ارے واہ...... یہ آپ نے ہمیں دیوی بھی بنا دیا؟"
"لو، نہ بناتے تو کیا کرتے دیوی جی؟ آپ نے تو جو کر دکھایا ہے وہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔"
"کیا، کیا ہے ہم نے جواہر جی ایسا؟"
"یہ تو کوئی میرے دل سے پوچھے۔ آپ نے ہمیں حیران کر کے رکھ دیا ہے۔ ویسے آج آپ سے ایک سوال کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے ہم۔"

"کیسا سوال جواہر جی؟"

"یہ گھوڑے بلاوجہ تو نہیں جیت جاتے دیوی جی۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ بھی آپ کے حسن سے م
ہوں۔"

لڑکیاں خوب ہنسی تھیں۔ پھر رما نے کہا۔ "جواہر جی، گھوڑے بھی کسی کے حسن سے متاثر ہو
ہیں؟"

"نہیں دیوی جی۔ خیر، یہ آپ کی ناتجربے کاری کی بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جتنے جا
ہوتے ہیں ان پر ہر طرح کے اثرات ہوتے ہیں۔ رنگوں کے، پیار کے، محبت کے۔ اب آپ دیکھ
ایک سیدھی سادھی مثال ہے۔ آپ پیار سے کسی کی گردن پر ہاتھ پھیریئے، میرا مطلب ہے کسی جا
کے تو وہ بھی آپ سے پیار کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پیار کو سمجھتا ہے۔"

"آپ واقعی صحیح کہہ رہے ہیں اور بہت بڑی بات کہہ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیا
اپنا ایک روپ ہوتا ہے۔"

"بالکل ہوتا ہے دیوی جی...... بالکل ہوتا ہے۔"

"اچھا چلئے چھوڑیئے۔ یہ بتایئے کیا کھلائیں پلائیں آپ کو؟"

"جو دل چاہے۔" جواہر ہی بول رہا تھا۔ منوہر خاموش تھا۔ "چاہے وہ زہر ہی کیوں نہ ہو۔ بھگوان
سوگند، آپ کے ہاتھوں سے زہر بھی پیا جا سکتا ہے۔"

"چلو رما، ان کی کچھ خاطر مدارت کرو۔"

"آیئے منوہر جی، آپ میرے ساتھ آیئے۔" رما نے کہا اور منوہر جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھ
اصل میں رما ہی منوہر سے بہت زیادہ ملتی جلتی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی اپنی ڈیوٹیاں باندھ لی تھیں۔
کی ذمہ داری یہی لگائی گئی تھی کہ وہ منوہر کو سنبھالے۔ وہ منوہر کو ساتھ لئے آگے بڑھ گئی۔

"یہ کیا ہوا...... آج پتا جی کیسے نازل ہو گئے؟"

"اُن کے من میں ایک خیال آیا ہے۔" منوہر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا......؟"

"وہ کہتے ہیں کہ یہ پراسرار دیویاں ہیں جو جادو منتر جانتی ہیں اور گھوڑے انہی کی وجہ سے
ہیں۔"

"ارے ارے، نہیں...... اب ایسی بھی کیا بات ہے منوہر جی؟ ویسے جواہر لعل جی بھی ہیں بڑ
تیز۔"

"کیوں......؟"

"منوہر، برا تو نہیں مانو گے اگر میں کچھ کہوں؟"

"لو، تمہاری بات کا برا مانوں گا رما؟"

"میں نے جواہر لعل کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ہوس دیکھی تھی۔ کئی بار اُن کی نگاہیں میری

اٹھی ہیں اور مجھے شرم آئی ہے۔"

منوہر نے سنجیدگی سے رما کے چہرے کو دیکھا اور کہا۔ "حالانکہ پتا جی کو یہ کرنا نہیں چاہئے۔ پہلی بات
تو یہ ہے کہ وہ میری ماتا کے پتی ہیں۔ میں تو خیر غیر شادی شدہ ہوں، مجھے تو کہیں نہ کہیں شادی کرنی ہے
رما جی۔ لیکن کیا پتا جی کو اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے؟"

"منوہر، میں تمہاری دوست ہوں۔ مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس مسئلے کو روکو۔"

"تم چنتا نہ کرو رما۔ پتا جی دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے۔"

"نہیں نہیں...... یہ تو خیر ہمارا گھر ہے، تمہارا گھر ہے منوہر۔ لیکن بس ذرا اُن پر نگاہ رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔" منوہر نے غصیلے لہجے میں کہا۔ رما اپنا کام کر چکی تھی۔ خوب مدارت کی گئی۔ ویسے یہ
بھی سچ ہے کہ جواہر لعل بھی رما کی جانب متوجہ تھے اور کئی بار وہ رما کو گہری نگاہوں سے دیکھ چکے تھے۔
ایک دو بار منوہر نے بھی اس بات کو محسوس کیا تھا۔

پھر جب دونوں باپ بیٹا گھر پہنچے تو منوہر نے کہا۔ "پتا جی، آپ پتا ہیں میرے۔ میرا حق نہیں بنتا
کہ میں آپ کے سامنے زبان کھولوں۔ لیکن بعض معاملات میں کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔"

"کیا؟"

"آپ نے وہاں جا کر اچھا نہیں کیا۔"

"ارے کیوں......؟"

"پتا جی، برا تو نہیں مانیں گے؟ جو کچھ آپ وہاں کر رہے تھے وہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"آپ رما کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔"

"ہاں منوہر...... تم ٹھیک کہتے ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ویسے تو جیون میں بہت سارے الٹ
پھیر آتے رہتے ہیں۔ یہ بات تم ہی نہیں تمہاری ماتا جی بھی جانتی ہیں کہ میں کوئی برا آدمی نہیں رہا ہوں۔
لیکن ایک کاروباری محرومی ضرور ہے۔ تم ابھی بچے ہو، کوئی بات نہیں سمجھ پاؤ گے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ رما
کو میں اپنے جال میں پھانسوں۔" جواہر لعل نے بالکل صاف ستھرے لہجے میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں...... میں اُسے اپنی دھرم پتنی بنانا چاہتا ہوں۔ اس طرح میرے ایک نئے جیون کا آغاز ہو
گا۔"

منوہر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ "اور اگر میں آپ سے یہ کہوں پتا جی، کہ یہی کام
میں بھی کرنا چاہتا ہوں تو؟"

"تو تم بیوقوفی کرو گے۔"

"کیوں......؟"

"اس لئے کہ تم ابھی کچھ بھی نہیں ہو۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم میرے ہی بل پر جی رہے ہو۔ نہ تمہارا کوئی کام ہے اور نہ کچھ کرتے ہو۔ ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ ایسا کوئی عمل کر سکو۔"

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں پتاجی تو میں آپ سے علیحدگی ہی اختیار کئے لیتا ہوں۔"

"یہ بھی ممکن نہیں ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے...... آپ دیکھئے کہ میں کیا کرتا ہوں؟"

"کیا کرے گا تو؟"

"رما کو بتا دوں گا کہ پتاجی ایک پُر ہوس آدمی ہیں، ان سے ہوشیار رہے۔"

"اگر تو نے ایسا کیا تو میں تیرا سر پھاڑ دوں گا۔"

"جو کچھ بھی آپ کا من چاہے کریں۔"

"دیکھ لوں گا تجھے۔"

"میں بھی دیکھ لوں گا۔" منوہر نے کہا اور غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اپنی جگہ سے باہر نکل آیا۔

ویسے تو شیطان کی ضروریات کائنات کے چپے چپے میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ مسلسل اپنی کوششوں میں مصروف ہے۔ نتیجے میں جو کچھ ہو رہا ہے، دنیا جانتی ہے۔ انسان، انسان کا دشمن بن گیا ہے۔ بڑی بڑی ایجادات ہوئی ہیں ایک دوسرے کو فنا کرنے کے لئے۔ محبتیں ختم ہو گئی ہیں، ہوس اور دیوانگی نے عروج پایا ہے۔ یہ دور شیطان کی کامیابیوں کا سب سے بڑا دور ہے اور شیطان خوش ہے کہ اُس کی نسل میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بہر حال وہ کہیں ایک جگہ محدود نہیں ہے۔ اُس کے ہولناک کارنامے نجانے کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن ہم جن کرداروں کے گرد گردش کر رہے ہیں وہ رما، روپا، رادھا، راگنی اور رجنی ہیں۔ یہ شیطان کی نئی نئی شاگردیں ہیں، اپنے کام بخیر و خوبی سرانجام دے رہی ہیں اور ان کا ردِعمل اور عمل انسانوں کے لئے انتہائی ہولناک ہے۔ بہت سے گھر تباہ کر چکی ہیں اور ابھی نجانے کتنے گھروں کی تباہی ان کے ہاتھوں سے ہونے والی ہے۔ بہر حال، ان میں ذرا مختلف طبیعت رجنی کی ہے جو اپنی زندگی میں ایک کھیل میں مصروف ہے۔ رما، منوہر اور جواہر کے درمیان جھگڑا ڈلوا چکی ہے اور شیطان اس سے خوش ہے۔ یہ اپنی جگہ خوش ہیں۔

اس وقت بھی یہ چاروں اپنی شاندار حویلی کے ڈائننگ ہال میں بیٹھی ہوئی آپس میں خوش گپیاں کر رہی تھیں۔ رما نے کہا۔ "رجنی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس حال میں ہے؟"

"جس حال میں بھی ہوگی ٹھیک ہی ہوگی۔ اشیش بھگونت خود ہم سب کے نگران ہیں اور ہم اُنہی کی ہدایت پر عمل کر رہے ہیں۔ نتیجے میں جو زندگی ہم لوگوں کو حاصل ہے وہ اچھے اچھوں کو حاصل نہ ہوگی۔ تمہیں اشیش بھگونت کی ایک بات یاد نہیں؟"

"کون سی بات؟"

"اُنہوں نے کہا تھا کہ اگر ہم میں سے سب الگ الگ اُن کے لئے کارنامے سرانجام دیں تو انہیں

خوشی ہوگی۔"

"ہاں کہا تھا اُنہوں نے۔"

"مگر یہ ہو رہا ہے کہ ہم صرف اُن کی ہدایت پر عمل کر رہے ہیں۔ یعنی وہ جو کچھ کہتے ہیں ہم وہی کرتے ہیں، اپنی طرف سے ہم نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔"

"یہ بات تو ہے۔"

"تو پھر سوچو۔ ہمیں خود بھی اپنے طور سے کچھ کرنا چاہئے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو......" اچانک عقب سے ایک بھاری آواز اُبھری اور اُن سب کی گردنیں گھوم گئیں۔ ڈائننگ ہال کے کمرے کی دیوار پر کچھ نقش اُبھر رہے تھے...... اس سے پہلے یہ دیوار صاف شفاف اور پوری طرح حسین تھی۔ لیکن اب اس دیوار پر کچھ اُبھار پیدا ہو رہے تھے اور یہ اُبھار اشیش بھگونت کے مجسمے کے اُبھار تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مجسمہ دیوار پر نمودار ہو گیا اور وہ سب اپنی جگہ کھڑی ہو گئیں۔ اُن کے چہروں پر احترام پیدا ہو گیا تھا۔ پھر اُنہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور جھک گئیں۔ چاروں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"جے بھگونتا......"

"آشیرواد دیتا ہوں میں تمہیں میری اچھی شاگردو...... بڑے اچھے طریقے سے تم اپنا کام سرانجام دے رہی ہو۔ اور جو کچھ تم سوچتی ہو وہ بھی بہت کچھ ہے۔"

"بھگونتا، کیا آپ ہمیں رجنی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔"

"رجنی کو میں نے جس کام پر بھیجا ہے وہ بہت مشکل کام ہے۔ خاص طور پر کسی مسلمان عالم کو بیوقوف بنانا بڑا مشکل کام ہے۔ ابھی تک اُس نے کوئی ایسا اہم کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ لیکن بہر حال تم میں سے ہر لڑکی ذہین ہے اور اپنا کام بخوبی کرنا جانتی ہے۔ سنو رما، روپا، رادھا اور راگنی۔ تم چاروں بہترین کارنامے سرانجام دے چکی ہو۔ اس وقت میں تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپ رہا ہوں۔ مگر تم میں سے کسی ایک کو، رما تو منوہر اور جواہر کے درمیان تنازعہ بن گئی ہے، تم تینوں میں سے کون یہ کام سرانجام دے گا؟"

"جسے آپ پسند کریں بھگونتا۔"

"روپا...... تم نے سب سے پہلے اپنا کام کیا تھا۔ میں تم سب کو آزما چکا ہوں۔ بہت مشکل کام نہیں ہے۔ بس کچھ لوگ ہیں جو ایک عمارت میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ بلکہ داخل ہونے والے ہیں۔ یہ عمارت زمانہ قدیم سے ایک آسیبی مندر تھی اور یہاں میری پوجا ہوا کرتی تھی۔ پھر زمانہ جدید کے لوگوں نے اس کا حلیہ بدل دیا۔ پہلے یہ عمارت ایک ویرانے میں تھی، لیکن آہستہ آہستہ یہ ویرانے آباد ہوتے چلے گئے۔ اور پھر یہ عمارت بھی خرید کو توڑ دی گئی اور اس کی جگہ ایک نیا مکان تعمیر کر لیا گیا۔ وہ مکان برسوں سے ویران پڑا ہے۔ لیکن اب یہ سنا ہے کہ وہ آباد ہونے والا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جس جگہ میری پوجا ہوتی رہی ہے وہاں انسان آباد ہوں۔ اُنہیں پریشان کرنا ہے۔ اور یہ کام روپا، میں تمہارے

سپرد کر رہا ہوں۔ تمہیں تو ایسے کام کی مشق ہے جس کے نتیجے میں یہ حویلی تمہاری ہے۔ جاؤ، وہاں اُس
مکان میں اپنا کام سرانجام دو۔ تم جانتی ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟"

"جے اشیش بھگونتا...... آپ کا جو حکم ہو۔" روپا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے۔

پھر شیطان نے باقی لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ "رما، تم اپنا کام سرانجام دیتی رہو۔ اور راگنی اور رادھا تم
بھی اپنے لئے کوئی ایسا کام تلاش کرو جو دلچسپ اور پرکشش ہو۔ کیا سمجھیں؟"

"جی، ہم آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر مانتی ہیں بھگونتا......" رادھا اور راگنی نے کہا۔

"بس تو ٹھیک ہے۔ تم کام سرانجام دو۔ روپا، میں تمہیں تمام تفصیلات بتائے دیتا ہوں۔ آؤ میرے
ساتھ۔" مجسمے کے نقوش دیوار میں گم ہو گئے اور پھر ایک سایہ چلتا ہوا اُس کے سامنے سے گزر گیا۔ روپا
اس سائے کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

اشیش بھگونت نے اُسے جو ہدایت کی تھی وہ اب اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے لئے تیار تھی
چنانچہ اب وہ اس مکان کی جانب چل پڑی جس کا پتہ اشیش بھگونت نے اُسے بتایا تھا۔ شیطان کی
عبادت گاہ کی تاریخ نجانے کیا تھی؟ لیکن وہ جگہ تھی بڑی حسین۔ سڑک کے اختتام پر کھیتوں کے بیچوں بیچ
یہ شاندار اور پراسرار عمارت واقع تھی۔ اس کے پیچھے انتہائی خوبصورت درختوں کے جھنڈ تھے۔ مکان دو
منزلہ بنا ہوا تھا اور سورج کی روشنی میں خوب اچھی طرح چمک رہا تھا۔ روپا نے اُس مکان کا جائزہ لینا
شروع کر دیا۔ مکان کافی بڑا تھا اور اس کی آرائش دیکھنے کے قابل تھی۔ شاندار باغیچہ، سنگ مرمر
چبوترے، اس قدر شاندار مکان تھا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔ ویسے اس میں عبادت گاہ جیسی
چیز نظر نہیں آتی تھی۔ ہو سکتا ہے زیرِ زمین کوئی عظیم الشان تہہ خانہ ہو جس میں شیطان کی عبادت کی
رہی ہو۔ مکان میں پرانی چیزوں کا خزانہ بھرا ہوا تھا۔ شاندار ٹائلوں کی انگیٹھیاں، گنبد دار چھت جس
درمیان خوبصورت زنجیروں کی سات مورتیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ حسین بالکونی نے مکان کا حسن دوبالا کر
تھا۔ بہرحال روپا نے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اس کے بعد اُس نے اپنے لئے آرام کا بندوبست
اور آنے والے جوڑوں کا انتظار کرنے لگی۔ وہ کون تھے؟ کیا تھے؟ اس کے بارے میں اُسے کچھ معلوم نہ
تھا۔ لیکن پھر ایک صبح اُس نے بہت سے لوگوں کو اس مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور اُس نے
اپنے آپ کو ایک سائے کی شکل میں تبدیل کر لیا جو کسی کو دیکھے سے نظر نہ آ سکے۔ بس ایک ہلکا سا سایہ
ہیولا۔ اگر دیکھنے والا بہت گہری نگاہوں سے دیکھے تو اُسے نظر آئے۔

روپا نے اُن میں سے تین جوڑے دیکھے جو مکان میں داخل ہو کر بہت خوش نظر آ رہے تھے اور آپس
میں اس سلسلے میں باتیں کر رہے تھے۔ روپا اُن کے اتنے قریب ہو گئی کہ اُن کی تمام باتیں سن سکے۔ اُن
کے بارے میں جاننے کے لئے اُن کے اس قدر قریب ہونا بے حد ضروری تھا۔ کسی کے فرشتوں کو بھی
معلوم نہیں تھا کہ کوئی ایسی عجیب و غریب چیز اُن کے پاس موجود ہے جو نہ تو بدروح ہے، نہ مُردہ ہے
لیکن وہ ایک پراسرار عورت ہے۔ ایسی عورت جس کے بارے میں ابھی اُنہیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ اُن
کی گفتگو سے روپا نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ سب الگ الگ لوگ ہیں اور یہاں مل جل کر رہنے آئے ہیں۔

اُن کے ساتھ کچھ بزرگ بھی تھے۔ بہرحال روپا اپنا کام انجام دینے میں مصروف ہو گئی۔

اِدھر آنے والے بہت خوش تھے۔ یہ مکان اُن کی توقع سے کہیں زیادہ حسین تھا اور اس کے حصول
میں اُنہیں کافی دُشواری پیش آئی تھی۔ اُن میں سے ایک جوڑا نادر خان اور شمیرہ تھے۔ اُن کی نئی نئی شادی
ہوئی تھی اور اس نئے نویلے جوڑے کو مکان کے حصول میں سخت دُشواری پیش آ رہی تھی۔ پھر اُن کا رابطہ
دو اور جوڑوں سے ہوا۔ اُن کی شادی کو بھی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہاں تک کہ اُن سب نے مل
جل کر فیصلہ کیا کہ کوئی ایسا مکان لے لیا جائے جس میں سب مل کر رہ سکیں۔ اس بات پر سب متفق ہو
گئے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے بہت تلاش کے بعد یہ مکان کرائے پر حاصل کیا۔ ہر جوڑے کے لئے اس
مکان میں ایک کمرہ تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس مکان کا کرایہ بہت کم تھا۔ بس اتنی سی بات
تھی کہ یہ ایک سڑک کے اختتام پر کھیتوں کے بیچ و بیچ واقع تھا اور تھوڑا سا عام آبادی سے ہٹ کر الگ
تھلگ تھا۔ بہرحال، وہ سب انتہائی خوش تھے کہ ایک اتنا اچھا مکان اُن کے حصے میں آ گیا۔

نادر اور شمیرہ کے والدین کے حصے میں وسیع ہال کے سرے کا ایک کمرہ آیا۔ مکان کافی بڑا تھا اور
اوپری منزل تقریباً بند ہی تھی۔ ویسے گرمی سے بچاؤ بھی تھا اور سامان بھی زیادہ بکھرنے نہیں پایا تھا۔
سامان کو ترتیب دینے اور مکان کی آرائش میں زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھے کہ
مکان خوب اچھی طرح سجا ہوا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مالکوں نے اس قدر شاندار مکان چھوڑنا
کیوں گوارا کر لیا؟ اس مکان میں پرانی چیزوں کا خزانہ دیکھ کر اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سامنے کی
خوابگاہ میں شاندار ٹائلوں کی انگیٹھی بنی ہوئی تھی۔ کمرے عام طور سے بیضوی تھے اور چھت گنبد دار۔
بہرحال مکان بہت ہی خوبصورت تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے اس میں اپنی مرضی کے مطابق کام کرنا شروع
کر دیا۔ ابھی اُنہیں اس مکان میں آئے ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ شمیرہ اور دو اور لڑکیاں
سیڑھیوں کے دروازے پر رنگ کرنے لگی تھیں۔ اچانک ہی اُنہوں نے بل کھاتی آہنی سیڑھیوں پر کسی
کے دوڑنے کی آواز سنی اور تینوں حیرت سے چونک پڑیں۔ وہ مڑیں تو پوری سیڑھیاں اُن کی نگاہوں کے
سامنے آ گئیں۔ پیروں کی چاپ اب بھی سنائی دے رہی تھی، لیکن اس پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تینوں کے
چہرے خوف سے سکڑ گئے۔

"یہ کیا ہے......؟" اُن میں سے ایک نے سوال کیا۔ تینوں عورتیں دہشت زدہ ہو گئی تھیں۔ اُنہوں
نے رنگ کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہاں سے ہٹ کر ایک گوشے میں آ بیٹھی تھیں۔

"میں تمہیں سچ بتاؤں، مجھے تو کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے۔" اُن میں سے ایک لڑکی نے کہا۔

"کیسا احساس؟" شمیرہ نے پوچھا۔

"کئی بار مجھے یوں لگا ہے جیسے کچھ پراسرار قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔" دوسری لڑکی بولی۔

"تم یقین کرو، کئی بار میں نے ایک پراسرار عورت کو اُس سامنے والے صحن میں گردش کرتے دیکھا۔ بس،
ایک سایہ سا نظر آتا ہے اور کچھ نہیں۔"

"ارے باپ رے...... اتنا خوبصورت مکان اگر یہ آسیب زدہ ہوا تو؟ اس میں اگر بھوت پریت

رہتے ہوں تو...... تو کیا وہ ہمیں یہاں رہنے دیں گے؟'' لیکن بس یہی الفاظ اُنہوں نے ادا کیے۔ کوئی خاص تبصرہ نہ کرسکیں۔ البتہ رات کو شمیرہ نے نادر کو یہ تفصیل بتائی اور نادر مسکرا دیا۔

''خواتین کے لئے ظاہر ہے کوئی نہ کوئی کہانی گھڑنا ضروری ہوتا ہے شمیرہ۔ ان خیالات کو دل سے نکال دو۔ اور خبردار کسی سے اس کا تذکرہ بھی مت کرنا۔ چونکہ بڑی مشکل سے ہمیں یہ مکان حاصل ہوا ہے۔ اگر تم نے دوسرے لوگوں سے کہہ دیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خوفزدہ ہوکر یہ مکان چھوڑ دیں۔ اکیلے تو اس مکان میں رہ بھی نہیں سکتے۔''

''وہ دونوں بھی وہاں موجود تھیں۔''

''کون؟''

''نائلہ اور رافیہ۔''

''اچھا...... وہ دونوں بھی موجود تھیں؟''

''ہاں۔''

''تو پھر اُنہوں نے بھی اپنے شوہروں سے اس کا تذکرہ کیا ہوگا۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟'' لیکن نادر کو اس وقت اطمینان ہوا جب اُس نے اپنے دونوں ساتھیوں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دیکھی۔ اُن کا بھی یہی خیال تھا کہ عورتیں حماقت کررہی ہیں اور اس مکان کے الگ تھلگ ہونے سے خوفزدہ ہیں۔ رافیہ کے شوہر نے کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔ بھلا اس خوبصورت مکان کو ہم کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ چاہے ہمیں اس میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ کافی عرصے کے بعد ہمیں یہ مکان حاصل ہوا ہے۔ چھوڑنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بس عورتوں کے دل سے خوف نکالنا ہوگا۔''

دو یا تین دن گزر گئے۔ ان لوگوں نے اپنے لئے پُرسکون آرام کا بندوبست کرلیا تھا۔ اُن کے کمرے بھی ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ حالانکہ اس بڑے مکان کو اگر وہ چاہتے تو عمدگی کے ساتھ استعمال کرسکتے تھے۔ لیکن ابھی اس وقت تک زیادہ پاؤں نہیں پھیلائے جاسکتے تھے جب تک کہ یہاں تھوڑا سا پُرسکون وقت نہ گزر جائے۔

چوتھا دن تھا اس واقعہ کو۔ نائلہ اپنے کمرے میں آرام کی نیند سو رہی تھی کہ اچانک ہی اُس کے شوہر عظیم نے نائلہ کے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں سُنیں۔ وہ ایک دم دہشت سے چونک پڑا۔ اُس نے جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھ کر روشنی جلائی اور نائلہ کو دیکھا۔ نائلہ اس وقت خوفزدہ انداز میں بستر پر تڑپ رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی آنکھیں نکلی پڑ رہی ہوں۔ وہ خوفزدہ انداز میں اپنے گلے پر کسی کے نادیدہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کررہی تھی۔ عظیم اُس کے قریب پہنچ گیا اور اُسے زور زور سے پکارنے لگا۔

''نائلہ...... نائلہ کیا ہے؟ کیا بات ہے؟''

''کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے...... مجھے بچاؤ۔ میں اُٹھ نہیں سکتی۔'' نائلہ کی آواز بمشکل تمام سنائی دی اور عظیم بری طرح چیخ پڑا۔ اُس کی چیخوں کی آواز سن کر رافیہ، شوکت، نادر اور شمیرہ بھی آوازیں دیتے

گھس آئے۔ اُنہوں نے کسی نادیدہ طاقت سے نائلہ کو اُلجھتے ہوئے دیکھا۔ وہ وحشیانہ انداز میں ہاتھوں کو فضا میں لہرا رہی تھی جیسے ہوا سے لڑ رہی ہو۔ اور عظیم کا چہرہ خوف سے زرد ہورہا تھا۔ وہ نائلہ کو بستر سے اُٹھانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ اچانک ہی اُس نادیدہ قوت نے زور کے دھکے سے عظیم کو فرش پر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی نائلہ بھی بستر سے اُچھل کر نیچے آگری۔ اُس کے ٹخنے پر موچ آگئی اور سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ بمشکل تمام سب نے اُسے اُٹھایا۔ اُس پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اُسے بستر پر لٹا دیا گیا اور پھر ساری رات وہیں کمرے میں گزر گئی۔ بڑی خوفناک صورتحال تھی۔ صبح نجانے کتنی دیر کے بعد ہوئی تھی؟ اُنہیں یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ایک رات صدیوں کی رات ہو...... دوسری صبح شوکت نے پیشکش کی۔

''میں آبادی میں جاکر ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں۔''

''ہاں...... نائلہ کو ڈاکٹر کو دکھانا لازمی ہے۔''

''یہاں سے تھوڑے فاصلے پر جہاں سے باقاعدہ آبادی کا آغاز ہوتا ہے میں نے ایک ڈاکٹر کا بورڈ لگا ہوا دیکھا ہے۔ ڈاکٹر سرفراز ایم بی بی ایس۔''

''ہاں، وہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ کیا تم تنہا چلے جاؤ گے میرے دوست؟''

''کیوں نہیں؟'' شوکت نے کہا اور ہمت کے ساتھ باہر نکل گیا۔

اُدھر نائلہ کی طبیعت اب کچھ بہتر تھی۔ رات کے تجربے کو اب وہ خوفزدہ لہجے میں اُنہیں سنا رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔ ''نہیں عظیم...... میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔''

''نائلہ...... اس گھر میں رہنا ہماری مجبوری ہے۔ واقعات جو بھی حیثیت رکھتے ہیں، ہمیں ان سے بچنے کے لئے محنت کرنا ہوگی۔''

''میں بھی یہی کہتا ہوں۔'' نادر نے کہا۔

بہرحال کچھ دیر کے بعد شوکت، ڈاکٹر کو لے کر آگیا۔ ڈاکٹر سرفراز اس علاقے کا پرانا رہنے والا تھا اور شاید اُسے اس مکان کے مالکوں سے اچھی طرح واقفیت تھی۔ اُس نے نائلہ کو دیکھا، ایک دو انجکشن لگائے اور اس کے بعد آہستہ سے بولا۔ ''عجیب بات ہے یہ مکان....'' پھر وہ خاموش ہوگیا۔

''ہاں ڈاکٹر سرفراز...... آپ اس مکان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے تھے؟''

''نہیں...... کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ آپ ان کا خیال رکھئے، انہیں کسی ذہنی صدمے سے دوچار نہیں ہونا چاہئے۔'' ڈاکٹر اپنی فیس لے کر چلا گیا۔ بہرحال، بات آئی گئی ہوگئی۔

لیکن چند دن کے بعد سیڑھیوں سے کسی کے اُوپر جانے کی آواز سنائی دی...... اور یہ چاپ سیڑھیوں کے سرے پر جاکر کچھ لمحوں کے لئے رُک گئی۔ پھر جب دوبارہ سنائی دی تو غسل خانے کا دروازہ زور سے بند ہوا اور پانی گرنے لگا۔ ایک بزرگ جو نادر کے والد تھے سیڑھیوں کی طرف لپکے اور غسل خانے میں جا پہنچے۔ اندر کوئی نہیں تھا لیکن پانی پوری تیزی سے گر رہا تھا۔ اُنہوں نے اسے بند کردیا اور واپس آ

گئے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ کسی کے اُوپر جانے کی آواز سنائی دی اور بزرگ اُس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ نائلہ کی کیفیت کا اُنہیں اندازہ تھا اور جو کچھ تصورات اس گھر کے بارے میں قائم کئے تھے بزرگ نے اس کی تردید کی تھی۔ اور اس تردید ہی کی تصدیق کے لئے وہ یہ کوشش کر رہے تھے۔ وہ اوپر جانے کی آواز کے تعاقب میں دوڑے اور سیڑھیوں کے اوپر جا کر یہ آواز کچھ دیر کے لئے بند ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ غسل خانے کی جانب بڑھی اور پھر اُن کو دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ لیکن دروازے پر کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ پھر پانی گرنے اور نہانے کے ٹب میں پانی گرنے کی آواز سنائی دی۔ حالانکہ پانی بالکل بند تھا۔ بہر حال یہ صورت جاری تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس صورتحال کا ذمہ دار کون ہے اور کس مقصد کے تحت یہ تمام کارروائی کی جا رہی ہے؟ لیکن شام کے وقت جب گھر کے تمام لوگ کھانے کی میز پر جمع ہوئے تو سیڑھیوں سے کسی کے اُترنے کی آواز بڑی نمایاں تھی۔ سب چونک پڑے۔ اس وقت بالکل یہی محسوس ہوا کہ جیسے کوئی گھر میں داخل ہوا ہو اور سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا ہو۔ وہ سب کے سب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سامنے والے ہال کی جانب دوڑے۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکل گیا۔ حالانکہ اس دروازے میں پہلے تالا لگا ہوا تھا۔ عظیم نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

"آہ...... شاید اوپر کوئی موجود ہے۔"

"کون؟" ثمیرہ کی آواز اُبھری۔

"تم لوگ ذرا یہاں رُکو، ہم دیکھتے ہیں۔" شوکت بولا۔ یہ رافیہ کا شوہر تھا۔ لیکن رافیہ چیخ پڑی۔

"نہیں شوکت۔ تم نہیں جاؤ گے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ آؤ نادر، دیکھتے ہیں۔ عظیم تم یہاں رُکو۔" شوکت نے کہا۔

نادر اور شوکت آگے بڑھنے لگے۔ ابھی اُنہوں نے چند ہی سیڑھیاں طے کی تھیں کہ اچانک اُنہیں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی نیچے آ رہا تھا۔ اُن کی نگاہیں آنے والے کا جائزہ لینے کے لئے بھٹک رہی تھیں، مگر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ اُنہیں ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا جیسے کوئی اُن کے جسم کو چھوتا ہوا گزرا ہو...... اس کے علاوہ ٹھنڈے سانس کی ہوا بھی شوکت کے چہرے سے ٹکرائی تھی۔ پھر ساری سیڑھیوں پر ایسی بدبو پھیل گئی کہ اُن کے لئے وہاں رُکنا مشکل ہو گیا...... وہ تیزی سے واپس نیچے اُترے اور بڑے وحشت ناک انداز میں عظیم اور عورتوں کے پاس پہنچ گئے۔

عظیم نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ "کیوں...... کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں...... اچانک ہی ایک بدبو پھیل گئی ہے وہاں۔"

"کیسی بدبو؟"

"یار مجھے کیا معلوم؟" شوکت نے کسی قدر جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ اور اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ لوگ اپنے اپنے کمروں میں آ گئے تھے۔ لیکن وہ سرانڈ کئی روز تک پھیلی رہی تھی۔ اب وہ اکثر سر جوڑے بیٹھے رہتے تھے۔ اُن کے چہروں پر شدید پریشانی کے آثار تھے۔ ان واقعات کے بعد

مکان چھوڑ دینا انتہائی ضروری تھا۔ لیکن وہی بدنصیبی، کرایہ بہت کم تھا اور اب تک وہ اپنے آپ کو اس بات میں رکھے ہوئے تھے کہ یہ صرف وہم ہے۔ عموماً ساتھ بیٹھے ہوا کرتے تھے۔ عورتوں کی تو بری حالت ہوتی تھی۔ وہ لوگ یہ طے کر رہے تھے کہ اب کیا کرنا چاہئے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم میں سے کسی کو جانی نقصان پہنچ جائے۔ کیا کہا جا سکتا ہے، واقعی یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہو گئی ہے۔

"میں کہے دیتی ہوں اگر تم لوگوں نے یہ مکان نہ چھوڑا تو کم از کم ہم عورتیں تو یہاں سے چلی جائیں گی۔" ثمیرہ نے کہا۔

"نہیں نہیں...... تھوڑا سا وقت یہاں اور گزارو۔ ہو سکتا ہے ہماری غلط فہمی دُور ہو جائے۔"

لیکن غلط فہمی ہوتی تو دُور ہوتی۔ ایک رات جب وہ گہری نیند سو رہے تھے تو اچانک ایک گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ گھوڑا گاڑی کی آواز تھی۔ اور اُس کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سے ایک عجیب سا شور پیدا ہو رہا تھا۔ یہ شور آہستہ آہستہ مکان کے پیچھے جا کر بند ہو گیا...... پھر انسانوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں اور یوں لگا جیسے گھوڑا گاڑی سے کوئی چیز اُتاری جا رہی ہو۔ پھر یہ ہنگامہ ساری ساری رات جاری رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے تختے اُتار اُتار کر پھینکے جا رہے ہوں۔ لیکن پھر جیسے ہی اُجالے کی پہلی کرن پھوٹی، گھوڑا گاڑی آگے بڑھی۔ گھوڑے ہنہناتے ہوئے آگے بڑھے تھے، اور گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ فضا میں تحلیل ہونے لگی تھی۔ یہ نیا کھیل تھا۔ اسے بھی برداشت کر لیا گیا۔

پھر ایک دن ایک اور افتاد پیش آئی۔ مکان کے عقب میں ایک پرانا کنواں تھا جو خشک تھا۔ اور اُس کے اردگرد جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک روز پھر وہی واقعہ پیش آیا۔ اس وقت سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ گھر کے مکین پہلے سے اُٹھ گئے تھے۔ اچانک ہی کنویں کے اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں...... کوئی بدحواسی سے چیخ رہا تھا۔ "بچاؤ بچاؤ......" ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی کنویں میں گر پڑا ہو۔ شوکت ذرا بہادر آدمی تھا۔ وہ اکیلا ہی دوڑ پڑا تھا اور کنویں کے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔

"کون ہے...... کون ہے......؟" اُس نے چیخ چیخ کر پکارا، لیکن نہ تو کچھ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی اس کے بعد آواز سنائی دی تھی۔ بہت دیر تک وہ وہاں کھڑا رہا۔ پھر جب واپس پلٹا تو ایک بار پھر چیخیں سنائی دیں۔

"بچاؤ...... بچاؤ......"

اتنی دیر میں عظیم اور نادر بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ نادر نے شوکت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "واپس آ جاؤ شوکت...... واپس آ جاؤ۔" بہر حال وہ وہاں سے واپس چل پڑے۔ لیکن بری حالت ہو گئی تھی۔

کچھ وقت اور آگے بڑھا لیکن اب ایک نئی بات رونما ہوئی تھی وہ یہ کہ جو کچھ ہو رہا تھا اس کے عادی ہوتے جا رہے تھے اور نجانے کیوں اب عورتیں بھی وہاں سے واپسی کے تقاضے نہیں کرتی تھیں۔ جو کارروائی ہو رہی تھی اس کا پس منظر اُن میں سے کسی کو نہیں معلوم تھا۔ اور شاید روپا صحیح انداز میں ان لوگوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی یا پھر وہ لوگ اپنے حالات کا شکار تھے اور اس قدر بہادر

تھے کہ صورتحال کو برداشت کر گئے تھے۔

روپا کے لئے اس سے زیادہ کچھ کرنا بڑا مشکل سا تھا۔ لیکن بہرحال وہ اپنے معاملات میں م...
تھی۔ ایک صبح عظیم اپنے کمرے سے نکلا اور باورچی خانے میں داخل ہوگیا۔ باورچی خانے میں...
اُونچی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان الماریوں پر ان لوگوں کا سامان بھی چنا ہوا تھا۔ چنانچہ اُس نے
چھوٹے سے بکس پر کھڑے ہو کر ایک اُونچے طاق سے کوئی چیز اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ
اچانک زمین حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ یہ سمجھا کہ شاید ہلکا سا زلزلہ آیا ہے اور وہ سرد ہو گیا...
زلزلے میں شدت پیدا ہوگئی اور وہ ایک دھماکے سے سر کے بل گرا۔ جھٹکا رُکا تو تاریک کمرے...
کی آہیں سنائی دینے لگیں جیسے کوئی گہری گہری سانسیں لے رہا ہو۔ بمشکل تمام وہ مرتبان اُٹھا کر
پلٹا۔ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ آوازیں اور آہیں دوبارہ سنائی دینے لگیں۔ اب یہ آہیں نیم...
اضطراب کی کیفیت اختیار کرتی جارہی تھیں۔ دروازہ بند ہونے کے بعد شور بھی رُک گیا اور بڑی عج...
غریب کیفیت ہوگئی تھی۔ اور جب اُس نے یہ بات دوسروں کو سنائی تو اُنہوں نے اُسے اُس کا وا...
اور وہم قرار دیا۔ بہرحال وہ لوگ اب ان باتوں کا مذاق اُڑانے لگے تھے اور ایک دوسرے...
ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔

پھر ایک دن نادر کی والدہ اور شمیرہ تیسری منزل کو جانے والی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ تیسری...
کی برساتی بہت خوبصورت منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ دروازے کھلے چھوڑ کر اُوپر چھت پر چلی گئیں
جب وہ اندر پہنچیں تو دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہوگیا تھا...... اُنہوں نے بہت کوشش کی لیکن درو...
کھل سکا۔ اس طرح اُنہیں کئی گھنٹے وہاں گزارنا پڑے۔ وہ دروازہ پیٹتی رہیں۔ نیچے موجود لوگوں کو
کے دروازہ پیٹنے کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ شاید وہ لوگ زیادہ...
رُک گئی ہیں۔ بہرحال جب دروازے پر غور کیا گیا تو اُس کی چٹخنی لگی ہوئی تھی اور اسے اس طرح...
گیا تھا کہ وہ آسانی سے نہ کھل سکے، جبکہ پہلے وہ بالکل ٹھیک تھی۔

چند روز کے بعد ایک خاندان اُن سے ملاقات کے لئے آیا۔ یہ نائلہ اور عظیم کے رشتہ دار تھے...
کی والدہ اُنہیں ملنے آئی تھیں۔ وہ ایک چھوٹے قد کی عورت تھیں، لیکن بلا کا مضبوط ارادہ رکھتی...
اُن کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کے تمام افراد روحانیت کا علم رکھتے تھے اور اُن کے شوہر...
چیزوں کو روحانی قرار دیتے تھے۔ خشک سالی میں یہ لوگ دادی اماں کی خدمت میں حاضر ہوتے اور...
سے مدد چاہتے اور وہ کسی تالاب کے پاس جا بیٹھتی اور اپنی توجہ آسمان پر مرکوز کر دیتی۔ تھوڑی دیر...
بارش ہونے لگتی۔ وہ اپنی قوتِ ارادی سے بے جان چیزوں کو کمرے میں گھومنے، لڑھکنے اور ناچنے...
کر دیتیں۔ یہ اُن کی ایک خاصیت تھی۔ اور پھر اُس دن جب وہ سب وہاں بیٹھے ہوئے تھے تو نا...
مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی آمد ہمارے لئے باعث سکون بھی ہو سکتی ہے دادی اماں۔ کیا آپ
گھر میں موجود بری رُوحوں سے ملاقات کر سکتی ہیں؟''

''اس کے بارے میں معلوم کرنا ہوگا'' نائلہ اور اُس کے شوہر کو تو اس بارے میں معلوم تھا کہ...

اماں یعنی یہ معمر خاتون اس سلسلے میں ماہر ہیں لیکن دوسرے لوگ اس بات کو ذرا مشکل سے ہی تسلیم
کرتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے دادی اماں سے کہا۔

''آپ یہاں معلومات حاصل کر کے بتائیں کہ کیا اس عمارت میں کوئی ہے؟ مطلب یہ کہ کیا یہ
آسیب زدہ عمارت ہے یا صرف ہم اپنے وہم کا شکار ہو گئے ہیں؟'' حالانکہ جتنے واقعات یہاں پیش آ
چکے تھے اس کے بعد ان کو وہم قرار دینا بھی ایک حماقت کی بات تھی۔ لیکن بہرحال وہ لوگ اس سلسلے میں
اب بھی اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔

دادی اماں نے تھوڑی دیر تک خاموشی اختیار کی اور اس کے بعد کہنے لگیں۔ ''اس کمرے میں ہمارے
علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔'' اُن کے سامنے بنے ہوئے ایک آتش دان پر سنہرے بالوں والی
ایک خاتون کی تصویر لٹک رہی تھی۔ اُس کے خدوخال دلکش اور رنگ حسین تھا۔ بال خوبصورت انداز میں
شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ دادی اماں نے کہا۔ ''میں یقین سے کہتی ہوں کہ اس خاتون کی موت طبعی
نہیں ہوئی تھی۔ اسے آہستہ آہستہ زہر دے کر مارا گیا تھا۔ مگر لوگوں نے اسے طبعی موت سمجھا۔''

اچانک ہی دادا ابا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے۔ اُنہوں نے گھور کر دادی اماں کو
دیکھا اور آہستہ سے بولے۔ ''تمہیں اپنا وعدہ یاد رکھنا چاہئے۔'' دادی یہ دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

دوسری صبح نائلہ نے دادی سے کہا کہ وہ مزید کچھ بتائیں۔ اس وقت دادا ابا شہر گئے ہوئے تھے۔
رائلہ اور شمیرہ بھی موجود نہیں تھیں۔ دادی اماں اور نائلہ وغیرہ وہاں تھیں۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد دادی اماں
نے کہا۔ ''اگر تم واقعی اس بارے میں جاننا چاہتی ہو تو آؤ میرے ساتھ۔ ایک کمرے میں ہم خاموشی سے
کچھ وقت گزاریں گے اور اُن کا انتظار کریں گے جو یہاں ہنگامہ آرائی کر رہے ہیں۔''

آخر کار دادی اماں نائلہ کو لے کر ایک خالی کمرے میں جا بیٹھیں۔ نائلہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا
تھا۔ دادی اماں کے بارے میں اُسے معلوم تھا کہ وہ انتہائی عالم فاضل قسم کی خاتون ہیں اور یقیناً وہ کوئی
اہم انکشاف کریں گی۔ کمرے کے عین درمیان پہنچ کر دادی اماں ایک کرسی پر بیٹھ گئیں، اُنہوں نے
آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ نائلہ اُن سے کچھ فاصلے پر بیٹھی
ہوئی تھی۔ نجانے کیوں نائلہ کو ایک عجیب سے خوف کا احساس ہو رہا تھا۔ دادی اماں کچھ دیر تک پڑھتی
رہیں، اس کے بعد اُنہوں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اُن کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں
اور ضرورت سے زیادہ بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔ نائلہ یہ سب کچھ دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ تب دادی اماں کی
آواز اُبھری۔

''وہ ایک عورت ہے...... ایک خوبصورت عورت۔ لیکن افسوس وہ کوئی بدرُوح نہیں ہے، بلکہ وہ
شیطان کی مدد کے لئے یہاں آئی ہے۔ اور شیطان چاہتا ہے......'' ابھی دادی اماں نے اتنے ہی الفاظ
ادا کئے تھے کہ اچانک شور کی سی آواز سنائی دی۔ یہ شور بتدریج اُونچا اور کئی آوازوں میں بدلتا چلا گیا......
نائلہ نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا مگر کمرے میں خوفناک شور بدستور جاری تھا۔ ہوا اتنی سرد اور تیز تھی کہ
رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے تھے۔ دادی اماں کے ہونٹ بند ہو گئے تھے اور وہ سکتے کے سے عالم میں

کرسی پر بیٹھی بے حس و حرکت ہوگئی تھیں...... نائلہ گھبرا کر آگے بڑھی۔ اُس نے دادی اماں کا ہاتھ چھو کر دیکھا، اُن کا ہاتھ برف کی مانند سرد ہو رہا تھا...... پھر اسی وقت اچانک ہی دادا ابا اور دوسرے افراد کمرے میں داخل ہوگئے۔ دادی اماں کی کیفیت دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئے۔ بمشکل تمام اُنہیں اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لایا گیا، کافی دیر تک کوشش کرنے کے بعد دادی اماں کو ہوش آیا تھا اور وہ بری طرح تڑپنے لگی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی اُن کے جسم میں سوئیاں چبھو رہا ہو۔ لیکن اُن کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بہت دیر تک اُن کی یہی کیفیت رہی، اس کے بعد تھکن سے نڈھال ہو کر وہ گہری نیند سو گئیں۔ نائلہ نے ساری صورتحال بتائی تھی اور وہ سب تشویش بھری نگاہوں سے اُنہیں دیکھتے رہے تھے۔ دادی اماں کا چہرہ بالکل زرد پڑا ہوا تھا، اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی تھیں۔ بہرحال، تمام لوگ خاموشی سے اُن کی صورتحال کا جائزہ لیتے رہے۔

دوسرے دن دادا جان نے کہا۔ ”چلو...... ہم لوگوں کو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ایسا کوئی عمل نہیں کرنا چاہئے جس سے ہم کسی بڑے المیے سے دوچار ہوں۔“ آخرکار اُنہوں نے یہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

درحقیقت روپا نے جو کچھ کیا تھا وہ اس میں مکمل طور پر کامیاب رہی تھی اور یہ لوگ گھر چھوڑنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ اس طرح شیطان زادی یا شیطان کی شاگرد کا ایک اور عمل پایۂ تکمیل تک پہنچنے والا تھا......!!

❁

اِدھر یہ ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی، اُدھر شیطان زادیاں اپنے اپنے کاموں میں معروف تھیں۔ صرف ایک رجنی تھی جو ابھی تک اس عمل کے لئے قدم نہیں اُٹھا سکی تھی۔ مولوی ایمان علی کے گھرانے نے اُسے روک دیا تھا۔ اور بات یہیں تک نہیں تھی بلکہ وہ کچھ اور صورتحال سے دوچار ہوگئی تھی۔ روما اور اُس کا نوجوان بھائی جس کا نام ابھی تک اُسے نہیں معلوم تھا بھی رجنی کے پاؤں کی زنجیر بن گئے تھے۔

دوسرے دن صبح رجنی پھر اپنی جگہ سے نکل آئی اور فاختہ بن کر پرواز کرتی ہوئی بابا نواب کی حویلی پہنچ گئی۔ یہ جگہ اُس کے لئے بڑی اہمیت کا مرکز تھی۔ اُس جگہ پہنچنے کے بعد جہاں وہ بقیہ نوٹ چھوڑ آئی تھی، اُس نے دو اور نوٹ چونچ میں دبائے اور اُڑتی ہوئی وہاں سے باہر نکل آئی۔ اب اُس کا رُخ اُس مظلوم گھرانے کی جانب تھا جہاں زندگی بڑی تنگ ہوگئی تھی۔ روما اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اُس کا بھائی گھر پر موجود نہیں تھا۔ دُور سے ہی رجنی نے دیکھ لیا، روما خوش نظر آ رہی تھی۔ رجنی اُس کے قریب پہنچی اور اپنی چونچ سے دونوں نوٹ نکال دیئے۔ روما چونک کر اُس حسین فاختہ کو دیکھنے لگی تھی۔ معصوم بچی نے مدھم آواز میں کہا۔

”ارے تم یہ نوٹ کہاں سے لے آئیں؟ پتہ ہے کل بھی ہمیں ایسے ہی نوٹ ملے تھے اور اس کی وجہ سے آج ہمارے گھر میں کھانے پینے کی چیزیں بھی آگئیں۔ ورنہ کب سے ہم کھانے پینے سے محروم تھے۔“

فاختہ کی حیثیت سے رجنی، روما کو کیا جواب دیتی؟ البتہ اُس نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر یہ دیکھ لیا تھا کہ اس وقت روما گھر پر اکیلی ہے۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے پیچھے ہٹی اور روما کے سامنے حقیقتوں کو اختیار کرنا اُس کے لئے کوئی مشکل عمل نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے فوراً اپنے آپ کو انسانی جسم میں تبدیل کرلیا اور روما یہ دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی...... معصوم بچی لمحے کے لئے تو خوفزدہ رہی، پھر جب اُس نے اپنے سامنے ایک خوش شکل لڑکی کو دیکھا تو اُس کے ننھے ننھے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”تم پری ہو...... فاختہ پری ہو تم۔“

رجنی آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئی اور اُس نے پیار سے روما کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، بس یہی سمجھ لو۔“

”ارے واہ، میں نے تو صرف کہانیاں سنی تھیں اس طرح کی کہ بچے جب دُعا مانگتے ہیں تو اللہ میاں اُن کے پاس ایک پری کو بھیجتا ہے اور وہ پری اُنہیں بہت سی اچھی چیزیں لا کر دیتی ہے اور بچے خوش ہو جاتے ہیں۔ میں ساحل بھیا کو بتاؤں گی کہ ہمارے گھر ایک پری آئی تھی۔ اور پہلے بھی کیا تم نے ہی یہ دونوں نوٹ ہم لوگوں کو دیئے تھے؟“

روما کی معصوم معصوم باتوں نے رجنی کو بہت متاثر کیا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو تمہارے بھائی کا نام ساحل ہے؟“

”ہاں......“

”تمہارے امی ابو کہاں ہیں؟“

”پتہ نہیں...... وہ تو بہت پہلے مر گئے تھے۔ بس ساحل بھیا ہیں۔“

”اچھا روما، یہ بتاؤ تمہیں اور کیا چاہئے؟“

”مجھے تو پتہ نہیں۔ ساحل بھیا کو معلوم ہوگا خوبصورت پری، کیا تم ہمیں بہت ساری چیزیں دو گی؟“

”ہاں...... میں تمہیں بہت ساری چیزیں دُوں گی۔ تم بے فکر رہنا، اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنے ساحل بھیا سے بھی کہہ دینا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔“ بہت دیر تک رجنی، روما سے باتیں کرتی رہی۔ بچی بہت ہی خوبصورت، بہت ہی پیاری تھی اور رجنی کو اُس سے باتیں کرتے ہوئے لطف آ گیا تھا۔ وہ اُس کے پاس بیٹھی رہی۔ بچی نے بتایا کہ بہت دن کے بعد اُن کے لئے کھانے پینے کا انتظام ہوا ہے، ورنہ اُن کے پاس کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں تھا۔

بہرحال، پھر تھوڑی دیر کے بعد جب دروازے پر دستک ہوئی تو روما جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ساحل بھیا آگئے ہیں۔ میں تمہیں ساحل بھیا سے ملاؤں گی فاختہ پری۔“

رجنی نے کوئی جواب نہیں دیا، بس وہ روما کو دروازے کی جانب جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر اُسے ایک دم ایک خیال آیا اور دوسرے لمحے اُس نے ایک ننھی سی مکھی کا رُوپ دھار لیا اور دیوار سے چپک کر بیٹھ گئی۔ ظاہر ہے ساحل کے سامنے وہ اس طرح نہیں آ سکتی تھی۔ روما تو ناسمجھ بچی تھی، لیکن ساحل سمجھدار تھا اور خواہ مخواہ اُلجھنیں پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ساحل اندر آیا، روما کی تیز تیز آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ساحل بھیا، آپ کو فاختہ پری سے ملاتی ہوں میں ساحل بھیا۔ کل اُس نے ہمیں دو نوٹ دیئے تھے آج پھر وہ ہمارے لئے دو نوٹ لائی ہے۔ دیکھو ساحل بھیا، کتنی خوبصورت ہے وہ۔" چھوٹا سا کمرہ تھا چند قدم کا فاصلہ۔ روما پلٹی تو پھر اُس کے چہرے پر حیرت کے نقوش پھیل گئے۔ "ارے کہاں گئی روما... کہاں ہے فاختہ پری؟ فاختہ پری......"

"کیا ہوا روما...... کیا بات ہے بیٹا؟"

"دیکھو بھیا، وہ دو نوٹ لائی ہے۔ وہ رکھے ہوئے ہیں۔"

"ارے یہ تو بالکل ویسے ہی نوٹ ہیں جیسے ہمیں کل ملے تھے۔"

"میرے سامنے لائی تھی فاختہ پری۔ پہلے وہ فاختہ بن کر اُڑتی ہوئی آئی، اُس کی چونچ میں دو نوٹ دبے ہوئے تھے، پھر اُس نے اپنا اصل رُوپ دھار لیا، بہت دیر تک بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی۔"

"روما بیٹا، سچ بولو کہاں سے آئے یہ پیسے؟"

"کیا مطلب بھیا...... کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں آپ سے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن فاختہ پری ہے کہاں؟"

"پتہ نہیں...... اُڑ گئی۔ میرا خیال ہے تمہیں دیکھ کر اُڑ گئی۔ ویسے اتنی خوبصورت تھی بھیا کہ بتا نہیں سکتی۔"

رجنی دیوار پر چپکی ہوئی ساحل کو دیکھ رہی تھی اور اُس کے دل میں عجیب وغریب احساس اُبھر رہے تھے۔ پھر اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنی جگہ سے اُڑ کر باہر نکل آئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئی۔ روما سے بات کر کے آئی تھی۔ وعدہ کر چکی تھی کہ اُسے بہت کچھ دے گی۔ لیکن اپنے بستر پر لیٹ کر اُس کے دل میں جو گداز پیدا ہوا تھا وہ بہت ہی سنگین تھا۔ وہ اپنی کیفیت کا جائزہ لیتی رہی، پھر اچانک اُس کی نگاہ ایک کھڑکی کی جانب اُٹھ گئی اور ایک بار پھر اُس کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا...... وہی دو پراسرار آنکھیں...... آہ، یہ پراسرار آنکھیں کس کی تھیں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رات کو وہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔ اُسے وہ آنکھیں بار بار نظر آ رہی تھیں۔ کبھی کہیں، کبھی کہیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ بہرحال، یہ ساری باتیں اپنی جگہ، ابھی تک وہ اس کام کا آغاز نہیں کر سکی تھی جس کے لئے اشیش بھگونت نے اُسے یہاں بھیجا تھا بلکہ اب تو وہ یہ سوچ رہی تھی کہ مولوی ایمان علی جیسے نیک نفس انسان کے گھر میں کیا وہ کوئی ایسا غلط کام سرانجام دے سکتی ہے جس سے مولوی کو تکلیف پہنچے؟

اُس دن صبح ناشتے کے وقت مولوی ایمان علی نے کہا۔ "بیٹا ستارہ، تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"نہیں چچا جان... میں تو یہاں بہت خوش ہوں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے بیٹا کہ اُس نے ہمیں تمہاری خدمت کا موقع دیا۔ بیٹے ایک بات بتاؤں، انسان کو ہر حالات میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ زندگی چند لمحوں کے لئے دی جاتی ہے، اس میں نیکیوں اور برائیوں کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ نیکیاں ہمیں اس دائمی زندگی کے لئے تیار کرتی ہیں جو ہمارا اول و آخر ہے۔ یہ تو صرف امتحان گاہ ہے۔ یوں سمجھ لو کہ جس طرح کوئی بچہ پڑھائی کرنے کے بعد امتحان دینے کے لئے کمرۂ امتحان میں جاتا ہے، اپنا پیپر حل کرتا ہے اور واپس نکل آتا ہے بس دنیا کی زندگی اتنی ہی ہے۔ ابتداء اور آخرت کی زندگی تو اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ بہتر ہے کہ دنیا کی زندگی میں عیش و آرام کی پرواہ نہ کی جائے بلکہ دائمی زندگی کے لئے محنت کی جائے تاکہ امتحان میں کامیابی نصیب ہو سکے۔"

رجنی کے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کا پورا بدن تھر تھرا رہا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے سردی سے بخار چڑھتا آ رہا ہو۔ بہرحال اُس نے یہ سب کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ اُسی دن دوپہر کی بات ہے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور امینہ دروازہ کھولنے کے لئے دروازے کی جانب چل پڑی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور اُس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔

"ارے انا زبیدہ آپ......؟" دفعتہً ہی آنے والی نے امینہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ امینہ کی آواز بند ہو گئی۔ آنے والی نے مسکرا کر کہا۔

"تم مجھے نہیں جانتی پیاری بچی۔ میں تو بس ادھر سے گزر رہی تھی، ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ تمہارے دروازے پر دستک دُوں اور تم سے ایک گلاس پانی مانگوں۔ وہ جو لڑکی پیچھے موجود ہے، ذرا اُس سے کہو ایک گلاس پانی لے آئے۔"

رجنی دُور سے یہ آواز سن رہی تھی۔ بوڑھی عورت کی آواز کا مفہوم سمجھ کر اُس نے جلدی سے پیچھے قدم اُٹھائے، ایک گلاس میں پانی بھرا۔ اس دوران بوڑھی اندر صحن میں آ گئی تھی۔ نادرہ اس وقت پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ مولوی ایمان علی بھی کسی کام سے نکلے ہوئے تھے۔ رجنی نے پانی کا گلاس انا زبیدہ کی طرف بڑھایا تو انا زبیدہ نے ہاتھ بڑھا کر گلاس لے لیا اور اُسے دیکھتی رہی۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ذرا اس میں جھانک کر دیکھو۔ کیا یہ پانی ٹھیک ہے؟"

امینہ پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اُس کا ذہن انا زبیدہ کی گرفت میں تھا۔ رجنی نے گلاس میں جھانک کر دیکھا، پورے گلاس میں ننھے ننھے سفید کیڑے پانی کے اندر تیر رہے تھے...... رجنی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "ارے ارے...... یہ کیڑے کہاں سے آئے؟ پانی تو میں بالکل صاف لے کر آئی تھی۔"

"ہاں...... جہاں سے تم نے یہ پانی حاصل کیا ہے وہاں تو یہ پانی صاف تھا۔ لیکن تمہارے ہاتھ میں آنے کے بعد یہ ایسا ہو گیا ہے۔"

"میرے ہاتھ میں آنے کے بعد؟" رجنی نے بوڑھی عورت کا چہرہ دیکھا اور اچانک ہی اُس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ بوڑھی عورت کے چہرے پر جو آنکھیں نظر آ رہی تھیں یہ وہی آنکھیں تھیں جو

رجنی کو جگہ جگہ نظر آ رہی تھیں...... کتنی ہی بار اُس نے ان آنکھوں کو مختلف طریقوں سے اپنی طرف دیکھ
ہوئے دیکھا تھا۔ آہ...... یہ وہی آنکھیں تھیں، سو فیصدی یہ وہی آنکھیں تھیں...... رجنی کے بدن پر ایک
تھرتھری سی طاری ہوگئی۔ انا زبیدہ نے کہا۔

''اور اس کی وجہ میں تمہیں اطمینان سے بتاؤں گی۔''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ آنے والا مولوی ایمان علی ہی تھا۔ بوڑھی کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک
گیا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہوگئے، پھر اُس نے کہا۔ ''بزرگ خاتون، آپ کو یاد
ہے ایک بار میری آپ سے ایک مزار پر ملاقات ہوئی تھی؟ ایک بزرگ کے عرس کا موقع تھا، آپ نے
وہاں مجھے ایک پہاڑی پر سے گرنے سے بچایا تھا۔ میں سو گیا تھا اور جس جگہ سویا تھا وہ پہاڑی کا کنارہ
تھا۔ اگر میں کروٹ بدل لیتا تو سینکڑوں فٹ نیچے کھائی میں جا گرتا۔ آپ نے مجھے جگا کر اُٹھایا تھا اور
وہاں سے دُور لے جا کر ایک جگہ پر لٹا دیا تھا۔''

انا زبیدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے کہا۔ ''مولوی ایمان علی، بہت سی چھوٹی چھوٹی
باتیں بعض اوقات انسان کے ذہن سے چپک جاتی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے تم نے مجھے یاد رکھا۔''

''آپ یاد رکھنے کی بات کر رہی ہیں، بعد میں، میں آپ کو تلاش ہی کرتا پھرا تھا۔ اگر آپ مجھے مل
جاتیں تو میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا۔''

''چلو ٹھیک ہے، وہ ایک فرض تھا جو میں نے پورا کر دیا۔ ایک گلاس پانی پلوا دو، میرا قرض پورا ہو
جائے گا۔''

''آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟ میں تو آپ کو یہاں مہمان رکھے بغیر نہیں جانے دُوں گا۔ آپ جہاں
کہیں بھی مصروف ہوں کم از کم میری اس خواہش کو ضرور پورا کیجئے۔''

''ارے نہیں بابا، سڑک پر چلتے لوگوں کو اس طرح مہمان نہیں رکھ لیتے۔''

''بزرگ خاتون...... میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ میری یہ بات مان لیں، مجھے دلی خوشی
ہوگی۔'' جواب میں انا زبیدہ ہنسنے لگی، پھر اُس نے کہا۔

''یہ تو اچھی بات ہے، ایک چھوٹا سا کام کرو کسی کے لئے اور اس کے گھر آ کر مہمان رہو۔''

''بخدا میرے دل میں یہ بات نہیں ہے۔ بس میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کو کچھ وقت کے لئے
مہمان رکھوں۔''

''چلو ٹھیک ہے...... تمہاری اگر یہی خواہش ہے تو ظاہر ہے خواہشیں ٹھکرائی تو نہیں جاتیں۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

''ارے تم یہاں کھڑی ہوئی ہو امینہ؟ چلو انتظام کرو۔ خاتون، میں آپ کو کس نام سے مخاطب
کروں؟''

''لوگ مجھے انا زبیدہ کہتے ہیں۔''

''جی، میں بھی آپ کو یہی کہوں گا۔'' اور اس کے بعد انا زبیدہ کے لئے ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔

رجنی پر نجانے کیسا سحر طاری تھا؟ یہ عورت اُسے بہت اچھی لگی تھی۔ لیکن پانی میں نظر آنے والے سفید
کیڑے اُس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ جب امینہ، انا زبیدہ کے کمرے کی جانب بڑھ گئی تو رجنی تیزی
سے اُس برتن کی جانب لپکی جس میں سے وہ پانی نکال کر لائی تھی۔ برتن کا پانی صاف شفاف تھا۔ رجنی
نے یہ برتن دھویا بھی تھا، پھر یہ کیڑے کیسے تھے؟ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔

اِدھر انا زبیدہ کمرے میں پہنچ کر امینہ سے کہہ رہی تھی۔ ''امینہ بیٹے...... میں نے تمہارے منہ پر ہاتھ
رکھ دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم کسی کو میرے بارے میں بتاؤ۔ میری بچی، میں ایک بہت ضروری کام
سے آئی ہوں یہاں۔ تمہارے پاس قیام کرنا تھا مجھے۔ شکر ہے کہ میرا کام بن گیا۔ تم اپنے آپ کو مجھ سے
لاعلم رکھو اور بالکل پریشان نہ ہو۔ جو ہوا ہے اچھا ہوا ہے۔ اور اچھا ہی ہوگا۔''

''جی......'' امینہ نے کہا۔

بہرحال، رجنی کی سمجھ میں کیڑوں والی بات بالکل نہیں آئی تھی۔ لیکن نادرہ کے آنے کے بعد گھر کا
ماحول بہت ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔ اب گھر میں چار عورتیں تھیں اور مولوی ایمان علی، اپنی محنت اور مزدوری
سے جو کچھ کما لاتے تھے وہی گھر میں خرچ کیا جاتا تھا۔ اچھے حالات تھے، زندگی خوشگوار طریقے سے گزر
رہی تھی۔ بہت سے لوگ اُس کی مدد کرنا چاہتے تھے لیکن مولوی ایمان علی کو صرف اللہ کا سہارا منظور تھا اور
وہ اسی پر بھروسہ کرتا تھا۔

اُدھر انا زبیدہ نے ایک اور ہی نیا کام شروع کر دیا تھا۔ تیسرے یا چوتھے دن کی بات ہے کہ ایک
دن رجنی تنہا خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ امینہ اور نادرہ گھر سے باہر کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں انا
زبیدہ اور رجنی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ انا زبیدہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رجنی کے پاس پہنچ گئی۔ اُس
کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ رجنی نے انا زبیدہ کو دیکھا اور نجانے کیوں اُس
کے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ حالانکہ انا زبیدہ کے چہرے پر اس وقت انتہائی نرم مسکراہٹ پھیلی
ہوئی تھی۔ لیکن رجنی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ انتہائی خوفناک نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی ہو۔ رجنی سمٹ کر
رہ گئی تو انا زبیدہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اُس کے پاس پہنچ گئی۔

''ستارہ......'' اُس نے رجنی کو آواز دی۔ رجنی نے ایک دم سے جھرجھری لی اور چونک کر انا زبیدہ کو
دیکھنے لگی۔ پھر اُس کے منہ سے آہستہ سے آواز نکلی۔

''جی......؟''

''تمہارے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں؟'' انا زبیدہ نے انتہائی نرم اور محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جی......'' رجنی آہستہ سے بولی اور انا زبیدہ بیٹھ گئی۔ ''ستارہ...... ستارہ کے نام کا مقصد جانتی ہو کیا
ہے؟''

''جی......'' رجنی نے چونک کر پوچھا۔

''آسمان پر چمکنے والا ستارہ۔ اور آسمان پر وہی چمکتا ہے جس نے دنیا میں کوئی اچھا کام کیا ہو۔
ستارہ، تمہارے والد کا کیا نام تھا؟''

""جی......؟"" ستارہ ایک بار پھر خوفزدہ ہوگئی اور اُس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔
""ستارہ، جو کچھ تم حاصل کر چکی ہو کیا تمہارے خیال میں وہ اتنا ہے کہ تمہیں زندگی کی ساری خوشیاں دے دے گا؟""
""آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟""
""چلو چھوڑو، تم مجھے اپنے باپ کا نام بتاؤ گی؟""
""نہیں۔"" ستارہ نے سخت لہجہ اختیا کرتے ہوئے کہا۔
""اور اگر ایمان علی پوچھے گا تب بھی نہیں بتاؤ گی؟""
""اُنہوں نے آج تک مجھ سے میرے بارے میں نہیں پوچھا۔"" رجنی نے جواب دیا اور انا زبیدہ پھر مسکرا دی۔
""جانتی ہو کیوں؟""
""نہیں...... میں نہیں جانتی۔""
""اس لئے کہ وہ تمہیں بھرپور اعتماد دینا چاہتا ہے، بے لوث، بے غرض۔ وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا سوال تم سے کر ڈالے جس کا جواب دینے میں تمہیں پریشانی ہو۔ جانتی ہو اس بات کو کیا کہتے ہیں؟"" رجنی خاموش رہی تو انا زبیدہ نے پھر کہا۔ ""شرافت، اچھائی، نیکی۔ کسی کے ساتھ اگر کوئی چھوٹا موٹا سا احسان کیا جائے تو اسے پریشان نہ کیا جائے۔""
""آپ مجھے کیوں پریشان کر رہی ہیں؟""
""نہیں...... میں تمہیں پریشان نہیں کر رہی۔ اصل میں بیٹی، تم اندر سے اچھی ہو۔ شیطان نے تم پر بھرپور جال ڈالے ہیں لیکن تم مجبور ہو کر اُس کے جال میں پھنسی ہو، دل سے تم اُس کی پیروکار نہیں ہو۔ یہ بہت بڑی سچائی ہے۔"" رجنی کا دل دھک سے ہو گیا...... یہ عورت اس کے اندر کی باتیں بھی جانتی ہے۔ وہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی، پھر انا زبیدہ نے کہا۔ ""تمہارے دل میں محبت کا گزر ہے۔ تم اس گھر کو آباد کرنا چاہتی اور اسی غرض سے تم نے ایک چھوٹا سا کام شروع کیا ہے۔ میں روما کی بات کر رہی ہوں۔ روما، جو تمہیں فاختہ پری کہتی ہے۔ کیا سمجھیں؟""
""دیکھو، تم مجھے پریشان مت کرو۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ میں کچھ بھی نہیں کر رہی۔""
""ہاں...... تم واقعی اس قدر شاطر نہیں ہو، جتنا وہ تمہیں بنانا چاہتا ہے۔ بلکہ باقی لڑکیاں تم سے کہیں زیادہ تیز، چالاک اور غلط ہیں۔ دھوکا تو ہر ایک کو ہوتا ہے، تمہارے سلسلے میں اُس نے غور نہیں کیا، اس لئے دھوکا کھا گیا۔ مگر میری بچی، میں تمہیں کچھ دینا چاہتی ہوں۔ ستارہ ہے نا تمہارا نام؟""
""کیوں مجھ سے بار بار میرا نام پوچھ رہی ہو؟"" رجنی نے پریشان ہو کر کہا۔
""ستارہ ہے نا تمہارا نام؟"" زبیدہ کا لہجہ انتہائی کرخت ہو گیا اور رجنی خوفزدہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ""بولو، مسلمان لڑکی ہو نا تم؟""
""ہاں...... میں مسلمان ہوں۔""

""تو کلمہ پڑھو۔""
""کلمہ......؟""
""ہاں...... میں تمہیں بتاتی ہوں، جو میں کہتی ہوں، وہ کرو۔ بولو، کرو گی؟""
""ہاں...... کیوں نہیں؟"" رجنی نے اپنی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔
""تو جو کچھ میں منہ سے کہہ رہی ہوں، وہ کرو۔"" اور پھر انا زبیدہ کی زبان سے کلمہ نکلا۔ رجنی چونکہ ہر قیمت پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا چاہتی تھی چنانچہ اُس نے انا زبیدہ کے الفاظ دہرانے شروع کر دیئے۔ اور جب پہلی بار کلمہ مکمل ہوا تو رجنی کے پورے وجود میں جیسے طوفان آ گیا...... اُس کی بوٹی بوٹی کانپنے لگی، اس پر وحشتوں کا دورہ پڑ گیا، آنکھیں پھٹ گئیں، کانوں سے دُھواں نکلنے لگا، ہاتھ پاؤں شدید تشنج کا شکار ہو گئے۔ وہ زمین پر لیٹ گئی۔ لیکن انا زبیدہ نے اُس پر توجہ نہیں دی۔
""پڑھو...... کلمہ پڑھو۔ جو میں کہہ رہی ہوں کہتی جاؤ۔""
رجنی کے منہ سے وہ الفاظ نکل رہے تھے جو انا زبیدہ کہہ رہی تھی اور اُس کی کیفیت اب خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی...... اُس کا دماغ پھٹتا جا رہا تھا، دل سینے سے باہر نکل آنے کے لئے بے چین تھا۔ وہ بمشکل تمام کہنا چاہتی تھی کہ ""اشیش بھگونتا......"" لیکن اس وقت اُس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر دو تین بار اُس نے اپنے منہ سے اشیش بھگونتا کی آواز نکالی تو انا زبیدہ نے کہا۔ پڑھو لاحول ولاقوۃ الا باللہ، لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔"" اور رجنی کے منہ سے وہی الفاظ نکلنے لگے۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن سے اشیش بھگونتا کا خیال نکلتا جا رہا ہے...... پھر وہ آہستہ آہستہ سکون پذیر ہوتی چلی گئی۔ اب اُس کے منہ سے ایک ہی ورد نکل رہا تھا۔
""لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ...... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ......"" وہ دیوانگی کے عالم میں یہ پڑھتی جا رہی تھی۔ اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا وجود آسمانوں میں پرواز کر رہا ہو...... وہ بلند سے بلند ہوتی جا رہی ہو۔ انا زبیدہ کی آواز اُسے آسمانوں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ پُرسکون ہوتی چلی گئی اور اُس نے انا زبیدہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ انا زبیدہ کی آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔ اور وہ مسکرا رہی تھی......!!

❁❁❁

رجنی کی زبان سے کلمہ پاک کا ورد اُس کی مرضی کے بغیر ہو رہا تھا۔ اور انا زبیدہ آسودہ نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ جب بہت دیر گزر گئی تو اُس نے رجنی کو آواز دی۔ ''رُکو...... رُک جاؤ۔ میری بات سنو۔'' رجنی کو جیسے ہوش آ گیا تھا۔ اُس نے نشہ آلود نگاہوں سے انا زبیدہ کو دیکھا تو انا زبیدہ مسکرا کر بولی۔

''اب تم جھوٹ نہیں بولو گی۔ کیونکہ تمہارے سینے میں نورِ ایمانی بھر گیا ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''رجنی......''

''ہندو ہو؟''

''پہلے تھی، اب نہیں ہوں۔'' رجنی نے جواب دیا اور انا زبیدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تمہیں ستارہ نام پسند ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''مگر میں جانتی ہوں۔'' انا زبیدہ نے پراسرار مسکراہٹ سے کہا۔

''کیا......؟''

''غلطی کس سے ہوئی تھی؟ یہ میں نہیں جانتی۔ لیکن بڑی خوبصورت غلطی کی اُس نے۔''

''میں نہیں سمجھی؟''

''تمہارا نام ستارہ کس نے تجویز کیا؟ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن وہیں سے تمہاری تقدیر کے ستارے بدل گئے اور آخر کار سچ مچ تم ایک ستارہ بن گئیں۔''

''میں اپنے بارے میں تمہیں اور بھی بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' رجنی نے کہا۔

''ہاں ضرور...... لیکن اب ہم ایمان علی کو بھی شریک کریں گے۔ وہ بھی عالم انسان ہے، ہمیں صحیح مشورے دے سکے گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' رجنی نے کہا۔ اب وہ پورے ہوش میں آ گئی تھی۔ ایمان علی کو شاید اپنے طور پر انا زبیدہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ رجنی کے بارے میں وہ بالکل نہیں جانتا تھا۔ انا زبیدہ نے ایمان علی کو ایک ایسی جگہ بلایا جہاں سے کچھ فاصلے پر رجنی موجود تھی۔ انا زبیدہ فوراً ایمان علی کو ساری تفصیل نہیں بتانا چاہتی تھی۔ ایمان علی کے پاس پہنچ گئی۔

''کیسے ہو ایمان علی؟''

''ٹھیک ہوں انا زبیدہ۔''

''ایمان علی، تم سچ بولتے ہو، میں جانتی ہوں۔ ایک سچ بولو میرے سامنے۔''

''جی انا زبیدہ......؟''

''میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟''

''پہلے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ آپ میری محسن خاتون ہیں۔ اور ایک بار آپ نے میری زندگی بچائی تھی۔ لیکن اب مجھ پر کچھ اور انکشافات ہوئے ہیں۔ کیا آپ یقین کریں گی، اگر آپ مجھے نہ بلاتیں تو بھی میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔''

''کوئی خاص بات تھی؟''

''ہاں......''

''وہ کیا؟''

''انا زبیدہ، آپ نے میری بیٹی امینہ کو شیطان کے چنگل سے نکالا ہے۔ اور ناگ چندر کو اُس کے اعمال کی سزا دی ہے۔''

''یہ کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اور یوں سمجھو ایمان علی کہ اللہ تعالیٰ ہر کام کے لئے کسی کو ذریعہ بناتا ہے۔ شیطان مردود کو شکست ہوئی، ناگ چندر موت کے گھاٹ اُتر گیا۔ اُس کی بیوی اور بیٹی کی موت افسوسناک ہے۔ لیکن ناگ چندر کی وجہ سے نقصان اُس کے پورے خاندان کو اُٹھانا پڑا۔ ناگ چندر یا اُس کے خاندان کی موت بہر حال ایک المیہ ہے، لیکن شیطان کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا۔''

''یقیناً......'' ایمان علی نے کہا۔

''ایک اور غم شیطان کے لئے بڑا بھاری تھا۔ ناگ چندر شیطانی گروہ میں تازہ تازہ شامل ہوا تھا اور اُس نے شیطان پر بھروسہ کیا تھا، لیکن وہ مارا گیا اور شیطان کو اس سے دلی صدمہ پہنچا۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔'' ایمان علی نے کہا۔

''شیطان بھلا کسی کو کہاں معاف کرتا ہے؟ تمہارے خلاف اُس کے دل میں نفرت کا ایک طوفان برپا ہو گیا اور وہ سوچنے لگا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے؟ چنانچہ اُس نے اس لڑکی کو اپنا آلہ کار بنا کر بھیجا اور اس کے ذریعے ایک خطرناک منصوبہ تمہارے خلاف بنایا گیا۔ یہ لڑکی یہاں ستارہ کے نام سے آئی اور اتفاق کی بات یہ کہ مجھے اس کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یہ نرم دل لڑکی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ کیونکہ بذات خود یہ اندر سے بری نہیں تھی۔ بس اللہ کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ امینہ اپنے اصل جسم میں واپس آ گئی اور شیطان کو ایک اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری ناکامی بھی اُس کا مقدر بنی اور اُس کی ایک پیروکار اسلام کی پناہ میں آ گئی۔ میں نے تمہیں اس سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا ایمان علی۔ یہ لڑکی اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہے۔ اگر یہ اپنے آپ کو راز میں بھی رکھنا چاہے تو رکھ سکتی ہے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ لڑکی، جو کچھ کہنا چاہتی ہو اب ایمان علی کے سامنے کہو۔'' انا زبیدہ نے کہا۔

رجنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اُس نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''چھوٹا سا گھر تھا ہمارا۔ پانچ بہنیں تھیں ہم۔ ہمارے باپ کا نام رسک لعل تھا۔ ہم بھی معصوم تھے، زندگی کی پُرسکون آغوش میں جھولا

جھول رہے تھے کہ ہماری بدنصیبی نے ہم پر حملہ کیا۔ راوت رائے نامی ایک زمیندار نے ہمارے باپ کو قتل کر دیا اور ہمیں زندگی سے محروم رکھنے کے لئے قید خانے میں قید کر دیا۔ وہاں ہمیں شیطان ملا۔ اُس نے ہمیں کچھ عمل سکھائے اور یہ زندگی ہمیں شیطان کا حکم ماننے پر مجبور کرنے لگی۔ ہم پانچوں بہنیں آزاد ہو گئیں اور اس کے بعد ہم شیطان کے لئے شیطانی کام کرنے لگیں۔ میری چاروں بہنیں بھی اُس کی آلۂ کار ہیں اور اُس کے لئے کام کر رہی ہیں۔ مجھے شیطان نے ایمان علی کے ہاں بھیجا کہ ان سے ان کا ایمان چھین لوں، بہت برے راستے سمجھائے گئے تھے مجھے۔ لیکن پھر انا زبیدہ میرے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئیں اور اب میری دنیا بدل چکی ہے۔ بس، ایک آخری بات کہنا چاہتی ہوں میں آپ سے، میں بُری تھی ہوں۔ میں شیطان کے زیر سایہ نہیں رہنا چاہتی۔ اور اب جبکہ میرا دھرم بدل چکا ہے تو میں یہی چاہتی ہوں کہ مجھے شیطان کے چنگل میں نہ پھنسنے دیا جائے۔ میری مدد کریں آپ۔ انا زبیدہ، آپ نے مجھے اس نئے مذہب کی روشنی سے منور کیا ہے تو میں یہ کام آپ پر چھوڑنا چاہتی ہوں کہ مجھے اور آگے بڑھائیے۔ اب میں برائی کے کسی راستے پر نہیں چلنا چاہتی۔ مجھے اشیش بھگونت کے چنگل سے نکالا جائے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی، بس میری یہ آرزو ہے کہ جو برائیاں مجھ سے میری زندگی میں ہو چکی ہیں، میں ان کا ازالہ کر دوں۔"

ایمان علی نے آگے بڑھ کر رجنی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم بالکل بے فکر رہو۔ اللہ نے جب تمہیں نیکیوں کی جانب قدم بڑھانے کی توفیق دی ہے تو ہم سب تمہارے مددگار ہیں۔ انا زبیدہ، بہت بڑا کام کیا ہے آپ نے۔ مجھ پر تو خیر آپ نے احسانات پر احسانات کئے ہیں، لیکن اس بچی کو بھی بہت کچھ دے دیا ہے آپ نے۔ اس کا صلہ تو آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔ ہم معذور بندے کیا دے سکتے ہیں؟ بہرحال بیٹی، انا زبیدہ بہت بڑی بزرگ ہیں۔ وہ تمہیں راستے دکھائیں گی۔ میں صرف تمہیں شیطان کے چنگل سے محفوظ رہنے کے لئے کچھ ورد بتائے دیتا ہوں جس میں سب سے بڑا ورد لاحول کا ہے۔ لاحول پڑھتی رہو، مردود تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ باقی فیصلے وقت خود کر لے گا۔" انا زبیدہ نے بھی اس بات سے اتفاق کیا تھا۔

بہرحال، رجنی ستارہ بن گئی۔ انا زبیدہ اور ایمان علی اُسے نماز وغیرہ سکھانے لگے۔ رجنی کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ انا زبیدہ نے ایک دن کہا۔ "آنے والے وقت میں تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ جو عمل تمہیں شیطان نے سکھائے ہیں یعنی یہ کہ تم اپنے جسم کو تبدیل کر سکتی ہو، انہیں تم اب بھی استعمال کرتی رہنا۔ ان کے لئے تمہیں کچھ گندے الفاظ تو نہیں ادا کرنا پڑتے؟"

"نہیں انا ماں، بس ہم سوچتے ہیں اور ہو جاتا ہے۔"

"اچھا، تم اس وقت سوچو کہ تم ایک چھوٹا سا ننھا سا پودا بن جاؤ۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد تمہاری یہ کیفیت رہتی ہے کہ نہیں؟"

رجنی نے آنکھیں بند کیں اور ایک لمحے کے اندر اندر زمین پر ایک خوبصورت سی کونپل نظر آنے لگی۔ انا زبیدہ کے ہونٹوں پر ایک مدہم سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ "اب اپنی اصل شکل میں آجاؤ۔"

رجنی نے نیند بھری آنکھوں سے انا زبیدہ کو دیکھا اور بولی۔ "کیا میں پودا بن گئی تھی؟"

"ہاں، ایک خوبصورت کونپل۔"

"اب تو یہ سب کچھ بڑا عجیب لگتا ہے، کیونکہ میں اب شیطان زادی نہیں ہوں۔"

"تم پہلے بھی شیطان زادی نہیں تھیں۔ جانتی ہو میں نے یہ تجربہ کیوں کیا ہے؟"

"نہیں...... میں نہیں جانتی۔"

"اصل میں مستقبل میں تمہیں اپنی انہی طاقتوں کو شیطان کے خلاف استعمال کرنا ہے اور اس کے منصوبوں کو اسی پر ناکام بنانا ہے۔ دیکھو، اس کائنات میں غلاظتوں کے انبار لگے ہوئے ہیں، شیطان نے اپنی نسل کو اس حد تک پھیلا دیا ہے کہ اب خود شیطان کو یہ یاد نہیں ہے کہ اُس کے پیروکار کہاں کہاں موجود ہیں؟ تم یہ سمجھ لو کہ کائنات اس وقت مکمل طور پر شیطان کے قبضے میں ہے۔ بس کچھ ہی اللہ والے ہیں جو ان شیطانی قوتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں، ایک ایک فرد قیمتی ہے۔ ستارہ، تمہیں بہت کچھ کرنا ہے آگے چل کر۔ شیطان کی قوتوں کے خلاف تمہیں اپنی ایمانی قوتوں کو استعمال کرنا ہے اور یہ ایک ملی جلی کوشش ہو گی۔ یعنی شیطان کو یہ احساس ہوگا کہ تم اُس کے لئے کام کر رہی ہو، لیکن اصل میں تم بہتری اور بھلائی کے لئے کام کر رہی ہو گی۔ یہ نیا منصوبہ ہے ہمارا۔ فی الحال یہاں آرام سے رہو اور جب تمہیں حکم دیا جائے کہ نکلو تو نکل جانا۔ تمہاری عقل تمہاری رہنمائی کرے گی اور تمہیں وہ ذرائع حاصل ہوں گے جو آگے چل کر تمہارے لئے مشعل راہ بنیں گے۔"

"میں آپ کی شکر گزار ہوں انا ماں......"

"رہا سوال تمہاری بہنوں کا تو دیکھو، جس کے تقدیر میں روشنی ہے اُسے روشنی ہی ملتی ہے۔ سارے ستارے ایک ساتھ روشن نہیں ہو جاتے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے۔" انا ماں نے کہا اور رجنی نے سر جھکا دیا۔

❁

اشیش بھگونت کی مملکت میں لڑکیاں عیش کر رہی تھیں۔ زندگی ہی زندگی تھی۔ کسی چیز کی فکر ہی نہیں رہی تھی۔ اور پھر شیطانی ذہن شیطانی منصوبے سوچتا رہتا تھا۔ یہی اشیش بھگونت کی ہدایت تھی۔ رما منوہر اور جواہر کے کھیل میں مست تھی۔ رجنی کو اشیش بھگونت نے کام سے بھیج دیا تھا، باقی رہ گئی تھیں روپا، راگنی اور رادھا۔ ان تینوں کی آج کل چھٹی تھی اور کوئی کام اُن کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن شیطان نے اُن سے کہا تھا کہ اب وہ اُس کی تربیت یافتہ شاگرد ہیں، چنانچہ خود اپنے لئے کام تلاش کیا کریں اور شیطان کا نام اونچا کریں۔ چنانچہ تینوں اپنے شکار کی تلاش میں تھیں۔ اس وقت بھی تینوں فیشن ایبل لڑکیاں بن کر ایک انتہائی قیمتی کار میں باہر نکل گئی تھیں۔ کوٹھی میں صرف رما تھی جو آرام کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے؟ اُس کا ذہن بہت سے شیطانی منصوبے بنا رہا تھا۔ پھر کسی خیال کے تحت اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے ٹیلی فون پر جواہر لال کی کوٹھی کے نمبر ڈائل کئے اور کچھ لمحوں بعد کسی عورت نے فون اُٹھا لیا۔

"کون......؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"منوہر لال جی موجود ہیں؟"

"منوہر تو نہیں ہیں، جواہر لال جی موجود ہیں۔"

"ذرا بات کرا دیجئے۔"

"آپ کون ہیں؟"

"اُن سے کہہ دیجئے، رما بول رہی ہے۔"

"جی بہت اچھا۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد جواہر لال کی آواز سنائی دی۔

"ارے رما جی...... بڑی خوشی ہوئی آپ کی آواز سن کر۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ آپ کی آواز میں میرے لئے کتنی کشش ہے۔"

"کیوں بناتے ہیں جواہر لال جی؟ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ ہم تو آپ کے چرنوں کی دُھول بھی نہیں ہیں۔"

"ہے بھگونت، ہے بھگونت، چرنوں کی یہ دُھول میرے ماتھے پر لگ جائے تو میری تقدیر چمک اُٹھے۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں رما جی؟ آپ کے لئے میرے من میں جو محبت ہے، جو پریم ہے اگر اس کی ایک جھلک بھی آپ دیکھ لیں تو یقین کریں مجھ سے پریم کرنے لگیں۔"

"آپ سے پریم تو ہم اب بھی کرتے ہیں جواہر لال جی۔"

"نہیں رما جی، میں اس قابل کہاں ہوں؟ کہاں آپ، کہاں میں۔ پھر میری اور آپ کی تو عمر میں بھی بڑا فرق ہے۔"

"لیجئے، کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ سو جوانوں کے ایک جوان لگتے ہیں آپ۔ کوئی میری آنکھوں سے تو دیکھے آپ کو۔"

"میں......؟" جواہر لال جی تو اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"تو اور کیا؟ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ منوہر جیسے جوان بیٹے کے باپ ہوں گے۔ بھائی بھائی لگتے ہیں سال دو سال کے فرق سے۔"

"ارے رما جی، آپ نے تو سچ مچ میری عمر بڑھا دی ہے۔"

"بڑھا نہیں دی، گھٹا دی ہے۔" رما نے ہنستے ہوئے کہا، پھر بولی۔ "جانتے ہیں میں نے کیوں فون کیا ہے؟"

"بس میرے بھاگ جگانے کے لئے۔ آپ کے ان الفاظ نے تو مجھے نیا جیون دے دیا ہے۔"

"اصل میں ماتا پتا تو ہمارے مر چکے ہیں، کوئی بھائی وغیرہ بھی نہیں ہے۔ اب کون ہمیں یاد رکھتا ہے؟ لیکن ایسے ہی میں منوہر کو بتا رہی تھی کہ پرسوں میری برتھ ڈے ہے۔"

"ہیں......؟" جواہر لال جی نے زبردستی خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں، لیکن ہم لوگ کچھ کرتے نہیں ہیں۔ بلکہ میری بہنوں کو تو کچھ یاد بھی نہیں ہوگا۔ البتہ یونہی مجھے یاد آ گیا تھا۔"

"بڑا اچھا ہوا آپ نے بتا دیا۔"

"منوہر کو بھی ضرور بتا دیجئے، بلکہ میں اُسے خود فون کر دوں گی۔ آپ لوگوں سے ہمارے ایسے ات ہو گئے ہیں کہ بس دل چاہا کہ آپ کو فون کر کے بتا دوں۔ کوئی آئے یا نہ آئے میری برتھ ڈے لیکن آپ ضرور آ جائیے۔"

"سر کے بل آؤں گا سر کے بل۔"

"پرسوں پانچ بجے۔ منوہر کو ضرور بتا دیجئے گا۔"

"ہاں ہاں...... بتا دوں گا۔" جواہر لال جی منہ بنا کر بولے۔ پھر جب فون بند ہو گیا تو جواہر لال کی یوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ اُدھر رما تنہائی میں بھی خوب ہنس رہی تھی۔

رات کو جب ڈنر پر ساری بہنیں اکٹھی ہوئیں تو رما نے کہا۔ "جانتی ہو تم لوگ پرسوں میری برتھ ڈے ہے؟"

"کیا......؟" روپا نے ناک چڑھا کر کہا۔

"برتھ ڈے...... یعنی سالگرہ۔"

"لے، تیری سالگرہ کہاں سے آ گئی؟ تو تو بیساکھ میں پیدا ہوئی تھی۔"

"ایسے ہی بیساکھ کی؟ بس، پرسوں میری سالگرہ ہے۔"

"یہ سوجھی کیا ہے تجھے؟"

"ارے کچھ نہیں سوجھی۔ بس جواہر لال جی کو میں نے اپنی سالگرہ کی دعوت دی ہے پرسوں پانچ ۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ وہ سر کے بل آئیں گے۔"

"ہرے رام...... ہرے رام۔ اگر وہ سر کے بل آئے تو اُن کی تو چندیا ہی گھس جائے گی۔ چار تو بال اُن کی کھوپڑی پر۔" راگنی نے کہا اور سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

پھر روپا نے کہا۔ "مگر چکر کیا چلایا ہے تو نے؟"

"بھئی کچھ تو انت ہونا اس ساری کہانی کا۔ ریس کھیل رہے ہیں سسرے، پیسے کما رہے ہیں میرے لیے۔ ہم لوگ گھوڑے بن کر دوڑ رہے ہیں۔ اب ان کی کہانی ختم ہونی چاہئے تا کہ کسی نئی کہانی کا آغاز" رما نے کہا۔

"تو کہانی ختم کیسے کرے گی؟"

"کچھ نہیں۔ پرسوں تو بس میں نے ایسے ہی تقریب کا بتایا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے، تھوڑی سی تفریح رہے گی۔ پرسوں انتظام کر لیں گے تھوڑا سا۔ ایک آدھ کمرہ سجا لیں گے۔"

"ہاں، اور پھر باپ بیٹے کا تماشہ دیکھیں گے۔ ظاہر ہے منوہر لال جی بھی آئیں گے۔ ویسے کہا تو میں نے جواہر لال سے ہے لیکن کل کا دن اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ اگر جواہر لال اپنے بیٹے سے بات نہ کریں تو میرا مطلب ہے کل منوہر کو بھی اطلاع دے دی جائے اس سلسلے میں۔"

"ہاں، ٹھیک ہے۔"

اِدھر تو یہ لوگ یہ منصوبہ بنا رہی تھیں، اُدھر جواہر لال پوری طرح پریشان تھے کہ رما کو تحفے میں کیا پیش ے لئے سونے کی چڑیا تھی۔ خاص طور سے ریس کورس میں اُس نے اُن لوگوں کو جتنی رقم

جتائی تھی وہ بے مثال تھی۔ باپ بیٹے ریس کے رسیا تھے۔ اگر ایسی کوئی لکشمی دیوی اُنہیں مل جائے تو ہم کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔ منوہر تو خیر ابھی باپ کے بل پر پل رہا تھا لیکن جواہر لال کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر رما کسی طرح ان لوگوں کے قبضے میں آجائے تو وہ دھنوان بن سکتے ہیں۔ لیکن رما نوجوان لڑکی تھی، اور ظاہر ہے اُس کا رُخ منوہر ہی کی طرف ہو گا۔ اگر جواہر لال اُس پر قابو پالیں تو لطف ہی آ جائے۔ ویسے بھی وہ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اور پھر کسی کے اندر ایسے گُن ہوں تو وہ تو بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں سوچ کر جواہر لعل نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ منوہر کو اس فون کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ اُسے پتہ ہی نہیں چلنا چاہئے کہ پرسوں رما کی برتھ ڈے ہے۔ دوسرے دن وہ دفتر سے اُٹھے اور باہر نکل آئے۔

اتفاق کی بات ہے کہ جس جوہری کی دُکان پر وہ پہنچے اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر منوہر کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اُس نے باپ کی کار کو جوہری کی دُکان پر رُکتے ہوئے دیکھا تو اُسے حیرت ہوئی، اس جوہری سے جواہر لال جی کا کیا تعلق ہے؟ نجانے کیوں اُس کے ذہن میں ایک تجسّس سا بیدار ہو گیا۔ شیشوں سے اُس نے جواہر لال کو زیورات کے ڈبے پلٹتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر جواہر لال نے بھاری رقم کے عوض کوئی زیور خریدا اور واپس چل پڑے۔ منوہر چھپ گیا تھا۔ بات ویسے زیادہ تجسّس کی نہیں تھی، لیکن جواہر لال بھلا ایسے زیورات وغیرہ کے چکر میں کہاں پڑتے تھے؟ ماں کو اگر کبھی زیورات کی ضرورت ہوتی یا بہنوں کے لئے کوئی چیز درکار ہوتی تو خود ہی یہ کام کر لیا کرتی تھی۔ بہرحال جواہر لال جی ایک نہایت خوبصورت سونے کا ہار خرید کر گھر لوٹے تھے اور اُنہوں نے اُسے چھپا کر رکھ دیا تھا۔ چونکہ منوہر کے دل میں یہ شدید تجسّس تھا کہ جواہر لال جی آخر سونے کا ہار کس لئے لائے ہیں؟ اُس نے بہت دیر تک سوچا۔ وہ جگہ اُس نے دیکھ لی تھی جہاں جواہر لال نے سونے کے ہار کا وہ ڈبہ چھپایا تھا۔ منوہر تاک میں لگ گیا، پھر اُسے موقع مل گیا اور اُس نے جواہر لال جی کے کمرے میں گھس کر مسہری کے نیچے بنی ہوئی جگہ پر چھپائے ہوئے ہار کے ڈبے کو دیکھا۔ سونے کا قیمتی ہار اس ڈبے میں جگمگا رہا تھا...... منوہر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آخر جواہر لال جی اس ہار کا کیا کریں گے؟

ان دنوں چونکہ باپ بیٹا ریس کو جا رہے تھے اور رما دونوں کی توجہ کا مرکز تھی اس لئے منوہر کو زیادہ شبہ ہو رہا تھا۔ بہرطور وہ ماں کے پاس پہنچا۔ جواہر لال جی اس وقت کسی کام سے نکلے ہوئے تھے۔ اُس نے ماں سے کہا۔ ”ماتا جی، آج کل آپ پتا جی کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی ہیں؟“

”کیا مطلب اے......؟“

”ماتا جی، برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں آپ سے۔ ویسے تو پتا جی ہمارے بڑے رنگین مزاج ہیں۔ لیکن ان دنوں کچھ زیادہ ہی رنگین ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔“

”ہاں، بولو۔“

”وہ ماتا جی، پتا جی ایک سونے کا ہار خرید کر لائے ہیں۔ کیا آپ نے ایسا کوئی ہار منگوایا ہے؟“

”نہیں...... مجھے بھلا ہار کا کیا کرنا تھا؟“ دیوی جی نے کہا۔

”ماتا جی، پتا جی ایک ہار خرید کر لائے ہیں اور اُنہوں نے اُسے چھپا کر رکھا ہے۔“

”کیا بکواس کر رہا ہے؟“

”آیئے، میں آپ کو دکھاؤں۔ ذرا اس ہار کا راز معلوم ہونا چاہئے۔“

ماں نے ہار دیکھا اور اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”ہائے، ایسا سندر ہار؟“

”اس کی رسید بھی پتا جی کی جیب میں ہو گی۔ آپ چاہیں تو اسے دیکھ سکتی ہیں۔ یہ آج ہی خریدا گیا ہے۔“

”مگر کس کے لئے؟“

”یہی بات تو میرے لئے حیران کن ہے ماتا جی۔“

”یہ تو پتہ چلنا چاہئے۔ کہیں بری عورتوں کے راستے پر تو نہیں لگ گئے؟“

”یہی مجھے خطرہ ہے۔ لیکن ایک بات کہوں آپ سے؟“

”ہاں بولو۔“

”بتایئے نہیں پتا جی کو۔ اور نہ ہی ابھی کوئی ایسی بات کیجئے۔ پہلے میں ذرا پتہ لگا لوں کہ چکر کیا ہے۔ جو میں نے آپ کے کانوں میں ڈال دیا ہے، خیال رکھئے گا۔ اگر آپ نے بتا دیا تو پھر ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔“

”نہیں بتاؤں گی اُسے۔ بالکل نہیں بتاؤں گی۔“

”نہ ہی کوئی ایسی ویسی بات ظاہر کریں۔“

”بالکل نہیں ظاہر کروں گی۔“

”ٹھیک ہے...... یہی مناسب رہے گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں آپ کو ساری معلومات اکٹھی کر کے دُوں گا۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے اس کے بعد کریں۔“

”ٹھیک ہے......“

منوہر کو مسلسل کرید لگی ہوئی تھی۔ پھر رات کے دس بجے کا وقت تھا جب اُسے رما کا فون ملا۔ ”منوہر، میرا پیغام مل گیا تھا نا؟“

”اوہو رما دیوی آپ؟ خیریت؟“

”ہاں خیریت ہے...... میرا پیغام تو مل گیا تھا نا؟“

”کیسا پیغام؟ کس سے؟“

”کیا......؟“ رما حیرت سے بولی۔ ”تمہیں جواہر لال جی نے میری سالگرہ کے بارے میں نہیں بتایا؟“

”سالگرہ......؟“ منوہر اُچھل پڑا۔

”ہاں...... کل میں نے فون کیا تھا۔ تم موجود نہیں تھے، میں نے جواہر لال جی سے کہا کہ منوہر کو میرا یہ پیغام دے دیں کہ پرسوں میری سالگرہ ہے۔ اب کل ہے میری سالگرہ۔“

منوہر تو بری طرح اُچھل پڑا تھا۔ اب یہ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ سونے کا وہ قیمتی ہار کس کے لئے خریدا گیا ہے؟ رقابت کا شدید جذبہ اُس کے دل میں اُبھرا۔ لیکن رما کو اس سلسلے میں شامل کرنا

مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”رما جی، وہ تو مجھے پتہ چل گیا۔ اصل میں آپ کو فون کرنے والا تھا معلوم کرنے کے لئے کہ کل پروگرام کس وقت ہے؟“

”شام کو پانچ بجے۔ اور سنو کوئی بھی نہیں ہوگا۔ ہم بہنیں ہوں گی۔ پانچویں بہن تو کام سے گئی ہوئی ہے، چار بہنیں ہوں گی اور تم ہو گے بس۔“

”کیوں...... کسی اور کو کیوں نہیں بلایا؟“

رما کچھ لمحے خاموش رہی، پھر اُس نے کہا۔ ”بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ صرف وہ آ جائیں تو محفل پوری ہو جاتی ہے۔ اور وہ تم ہو۔“

”بہت بہت شکریہ رما جی...... میں بس آپ سے کیا کہوں؟“

”کچھ نہیں، کل پانچ بجے تمہارا انتظار کروں گی۔“

”میں پہنچ جاؤں گا۔“

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد رما نے فون بند کر دیا۔ لیکن منوہر کے ذہن میں انگارے سلگ رہے تھے۔ سونے کا ہار خریدنے کی بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی اور یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ جواہر لال نے منوہر کو اس بارے میں جان بوجھ کر اطلاع نہیں دی ہے اور خود اس سالگرہ میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

”ٹھیک ہے پتا جی...... میں آپ کو احساس دلاؤں گا کہ کیا ہونا چاہئے اور کیا مناسب ہوتا ہے؟“ منوہر نے آہستہ سے کہا۔

❁

انا زبیدہ کی حقیقت سب کو معلوم ہو گئی تھی۔ ایمان علی پر تو اُس نے پہلے ہی ایک بہت بڑا احسان کیا تھا، اُس کی زندگی بچائی تھی۔ وہ تو پہلے ہی انا زبیدہ کا عقیدت مند تھا۔ اُدھر امینہ کو بھی انا زبیدہ نے بڑی مشکل سے نجات دلائی تھی۔ اور پھر یہ آخری احسان جو اُس نے رجنی پر کیا تھا اور اُسے ستارہ بنا دیا تھا، بڑی قدر و قیمت تھی اُس کی، بڑا عزت اور احترام تھا۔

اُدھر رجنی اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنا جائزہ لیتی تو اُسے احساس ہوتا کہ بے شک اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ شیطان کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ قید خانے میں شیطان نے اُن کی زندگی بچائی تھی اور اُنہیں باہر نکلنے کا راستہ دکھایا تھا۔ لیکن اس کے بعد اُنہیں اس زندگی کا کتنا بڑا معاوضہ ادا کرنا پڑ رہا تھا، اس کا احساس رجنی کی چاروں بہنوں کو تو نہیں لیکن رجنی کو تھا۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ زمین پر بسنے والے روتے، سسکتے انسانوں کو مزید اذیت میں گرفتار کر دینا کم از کم کسی انسان کا کام تو نہیں ہے۔ لیکن شیطان کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد وہ انسان رہی کہاں تھیں! ساری کی ساری شیطان بن گئی تھیں اور شیطانی عمل میں اُن کے لئے زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی تھی۔ رجنی شروع سے ہی ان سب سے نفرت کرتی تھی۔ مجبوراً اُسے بھی اُن لوگوں کے ساتھ ہنسنے بولنے میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ لیکن اُس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ اور آخر کار اُسے ایک بڑے، سچے اور حقیقی دین کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ اب وہ صحیح معنوں میں ستارہ تھی۔ انا زبیدہ نے اُس سے کہا تھا کہ کچھ عرصے تک

وہ آرام کرے اور دین کا مطالعہ کرتی رہے، اس کے بعد اُسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے نکلنا ہوگا۔

چنانچہ ان دنوں مولوی ایمان علی اُس کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ انا زبیدہ نے ایک دن مولوی ایمان علی سے کہا۔

”ایمان علی...... اصل میں ہر چیز کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ یہ بچی ایک لڑکے سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس کے دل میں محبت کا پودا پھوٹا ہوا ہے اور یہ اُس لڑکے کو چاہنے لگی ہے۔ وہ ایک غریب لڑکا ہے اور یہ اُس کی غربت دُور کرنا چاہتی ہے۔ بات یہ نہیں ہے مولوی ایمان علی، کہ ہم کسی کو نیکی اور بھلائی کرنے سے روکتے ہیں۔ لیکن اپنا مقصد، اپنا عمل اوّل اور باقی سب کچھ آخر۔ تاہم میرا دل چاہتا ہے کہ اس لڑکی کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ کم از کم اپنے محبوب کی مشکلات دُور کر دے اور اس کے بعد ایک ہدف اُسے دیا جائے کہ یہ اپنے عمل کرے اور اس کے بعد کچھ اور۔“

”جی انا زبیدہ...... آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“

”بہت پرانی بات ہے مولوی ایمان علی کہ میں کچھ سفر طے کر رہی تھی۔ راستے میں مجھے ایک کھنڈر نما عمارت نظر آئی جو ایک ہندو بنیئے کی تھی۔ اُس ہندو نے اپنی بہت سی دولت اس عمارت میں دفن کی تھی اور اس پر ایک سانپ کی نگرانی قائم کر دی تھی تاکہ اس دولت کو کوئی چرا نہ سکے۔ میں وہاں ٹھہری تو مجھے اُس سانپ کی پھنکاریں سنائی دیں۔ اور پھر میں نے اُس دولت کو دیکھا۔ سانپ میں نے مار کر پھینک دیا۔ وہ دولت اب جوں کی توں پڑی ہوئی ہے۔ میری ملکیت تو نہیں ہے وہ لیکن بیکار پڑی ہوئی چیز کو جس کے بارے میں کسی کو بھی علم نہ ہو اگر کسی کے کام میں لے آیا جائے تو کوئی بری بات نہیں ہے۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ستارہ کے ذریعے یہ دولت ساحل کو دلوا دی جائے۔ ایک انسان کی زندگی میں بہار آ جائے گی، ستارہ بھی خوش ہو جائے گی۔“

”بہت اچھی بات ہے انا زبیدہ...... اگر آپ یہ مناسب سمجھتی ہیں تو ضرور ایسا کیجئے گا۔“

”ہاں یہی سوچ رہی ہوں میں کہ مجھے یہ کرنا چاہئے۔“

انا زبیدہ نے ستارہ سے ملاقات کی، رجنی نماز سے فارغ ہوئی تھی۔ انا زبیدہ کو دیکھ کر وہ مسکرا دی، جائے نماز اُٹھائی اور انا زبیدہ کے پاس پہنچ گئی۔ ”کسی کام سے آئی ہیں آپ؟“

”ہاں، کام ہی سمجھ لو۔ تمہیں کچھ یاد دلانے آئی ہوں۔“

”جی...... میں سمجھی نہیں؟“

”ستارہ، اگر کسی پر احسان کیا جائے تو اسے دل میں ضرور رکھنا چاہئے۔ خاص طور سے ایسی شکل میں جب وہ ضرورت مند ہو۔“

”میں سمجھی نہیں انا ماں؟“

”اُس لڑکے کا نام ساحل ہے جسے تم نے دو بار دو دو نوٹ دیئے ہیں۔ مہنگائی کے اس دور میں بھلا ان نوٹوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اور پھر وہ بھی ایسے لوگوں کے لئے جن پر ضرورتوں کے بہت سے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں اور وہ اپنی ضرورتوں کو پورا نہ کر پا سکتے ہوں۔ ایسی شکل میں تمہیں اُن کی بھرپور مدد کرنی چاہئے تھی۔“

رجنی کی گردن جھک گئی۔ ساحل اس دوران اُسے بہت یاد آتا رہا تھا۔ اُس کے دل میں ساحل کی صورت گردش کرتی رہتی تھی۔ لیکن اب مذہب کا یہ درس حاصل کرنے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو روکا اور ساحل کی یاد کو سینے میں دبا لیا تھا۔ مگر وہ یہ بات جانتی تھی کہ انا ماں بہت سی باتوں سے واقف ہے۔ جب اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تو انا ماں نے کہا۔ ”سنو، دیکھو ہم انسانوں سے انسانوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ انسان اور فرشتوں میں فرق ہوتا ہے۔ فرشتے ہر طرح سے صبر بھی کر سکتے ہیں اور خوش بھی رہ سکتے ہیں اور ان کی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں جنہیں پوری کرنے کے لئے وسائل اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے ہیں۔ لیکن انسان، انسان ہوتا ہے بیٹی۔ میں یہ بات جانتی ہوں کہ اُس کے لئے تمہارے دل میں محبت ہے اور تم اُسے چاہنے لگی ہو۔ لیکن سب سے پہلے فرض کی ادائیگی ہوتی ہے اس کے بعد دنیا کا کام۔ جو لوگ فرض کو چھوڑ کر دنیا داری کرنے لگتے ہیں وہ اپنی صحیح منزل پر نہیں پہنچ پاتے۔ تم اُس کی محبت دل میں رکھو، اُس سے ملو جلو۔ تمہیں یہ وقت دیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد تم اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے جاؤ گی اور اپنے کام پورے کرو گی۔ سمجھ رہی ہو نا تم؟ یوں تمہیں عمل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ سنو، میں تمہیں جو تفصیل بتا رہی ہوں، اس پر عمل کرنا ہے۔ جیسا کہ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ شیطان نے جو تو تم تمہیں دی ہیں ان میں سے کچھ کا استعمال تم اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے جاری رکھ سکتی ہو۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم شیطان کا عمل اُس پر اُلٹنا چاہتے ہیں۔ تو مقصد یہ ہوا کہ جو کہانی میں تمہیں سنا رہی ہوں اور جس انداز میں تمہیں عمل کرنا ہے وہ عمل کرو اور اس کے بعد یہاں سے نکل چلو۔“

”میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں انا ماں۔“

”اور جب تم اپنا عمل مکمل کر لو گی تو تمہیں مکمل طور پر اجازت دی جائے گی کہ ساحل سے رجوع کرا اور اپنی پسند کو پا لو۔“

رجنی کی گردن جھک گئی تھی۔ پھر انا ماں اُسے تفصیل بتانے لگی کہ اُسے آگے چل کر کیا کرنا ہے؟ رجنی خاموشی سے سن رہی تھی۔

ساحل اور اُس کی بہن روما بہت خوش تھے۔ جو رقم اُنہیں ملی تھی اس نے اُن کی بہت سی مشکلات دُور کر دی تھیں۔ روما کے کپڑے پھٹ چکے تھے، ساحل کے پاس بھی پہننے کے لئے لباس نہیں تھا۔ بدنصیبی یہ تھی کہ وہ ہر ممکن کوشش کر چکا تھا کہ اُسے محنت مزدوری کرنے کا کوئی ذریعہ مل جائے لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ حالات برے سے برے ہوتے چلے گئے تھے۔ بہر حال، یہ چار نوٹ اُن کی زندگی کے لئے ایک بہت بڑا خوشگوار واقعہ بن چکے تھے۔ لیکن بھلا ایسے نوٹوں کی اہمیت ہی کیا؟ ختم ہو گئے تھے، اور اب ساحل پھر پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے؟ روما اس وقت اُس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ روما نے کہا۔

”نجانے وہ فاختہ پری کہاں چلی گئی ساحل بھیا؟ اب ہمارے پاس پیسے پھر ختم ہو گئے ہیں نا ساحل بھیا؟“

”ہاں روما...... مگر میری سمجھ میں آج تک نہیں آ سکا کہ وہ فاختہ پری کیا تھی؟ یہ تو سب قصے کہانیوں کی باتیں ہوتی ہیں، جیتی جاگتی زندگی میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا بھیا۔“ روما بولی۔

”پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کی کیا مرضی تھی؟“

”بھیا، ایک بات بتایئے، کیا آپ کا دل چاہتا ہے کہ فاختہ پری کو دیکھیں؟“

”بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“

اچانک ہی روما کی نگاہ اوپر دیوار پر پڑی۔ اُس نے دیکھا کہ دیوار پر فاختہ بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کی چونچ میں ایک چھوٹا سا پرچہ دبا ہوا ہے۔ روما ایک دم سہم گئی۔ اُس کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تب اُس کی نگاہوں کے تعاقب میں ساحل نے بھی دیوار پر دیکھا۔ فاختہ نے وہ پرچہ اپنی چونچ سے چھوڑ دیا۔ اُس پرچے پر ایک تحریر لکھی ہوئی تھی جسے ساحل نے اُٹھا لیا۔ فاختہ اس دوران اُڑ گئی تھی۔ ساحل نے پڑھا، اس پر لکھا تھا۔

”ننھی سی روما اور اس کے بھائی ساحل...... تم لوگ یوں کرو کہ اپنی بستی سے سیدھے نکلتے چلے آؤ۔ جہاں بستی ختم ہوتی ہے وہاں ایک پرانا مندر بنا ہوا ہے۔ اس جگہ آ کر کھڑے ہو جاؤ اور پھر سامنے کی سمت اُرخ کرو، وہاں چلتے رہو۔ کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد تمہیں ایک کھنڈر نظر آئے گا، اُس کھنڈر میں داخل ہو جاؤ، وہاں تمہاری تقدیر کی روشنی موجود ہے۔“

ساحل نے اگر اُس پرچے کو اپنی آنکھوں سے فاختہ کو پھینکتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو وہ یہی سمجھتا کہ کسی نے مذاق کیا ہے۔ لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد روما کو ہوش آیا اور وہ بولی۔

”فاختہ پری کچھ نہیں لائی ہمارے لئے؟“

جواب میں ساحل نے روما کو وہ ساری تفصیل بتائی تو روما بولی۔ ”بھیا، ہم چلیں گے۔“

”مگر روما، بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”آ جائے گی بھیا...... سمجھ میں آ جائے گی۔“

”ٹھیک ہے...... چلو، تقدیر آزما لیتے ہیں۔“ ساحل نے تیاریاں کیں اور بہن کو لے کر چل پڑا۔ راستے میں بہت سے خیالات اُس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر یہ پرچہ ایک فاختہ نے نہ پھینکا ہوتا تو وہ یہی سوچتا کہ کوئی سازش ہے، کوئی چکر چلنے والا ہے۔ لیکن جو کچھ ہوا تھا اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ یہ کسی انسان کا کارنامہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کیا تقدیر اُس کے لئے کوئی بہتر راستہ منتخب کر رہی ہے؟ ساحل نے سوچا تھا۔

بہر حال، وہ چلتا رہا۔ راستے میں روما نے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں بھیا؟“

”تقدیر کا فیصلہ سننے۔“ ساحل نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ معصوم روما کچھ نہیں سمجھ سکی تھی اس لئے خاموش ہو گئی۔ ساحل چلتا رہا، یہاں تک کہ اُسے وہ کھنڈر نظر آئے۔ وہ رُک گیا۔

”کیا ہوا بھیا؟“

”جگہ تو وہی ہے۔“ ساحل چونک پڑا تھا۔

”کون سی جگہ ہے بھیا؟“

"وہی جو پرچے میں لکھی ہوئی تھی۔" ساحل نے کہا اور پھر وہ کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچا تو اچانک اُسے ٹھٹھک جانا پڑا۔ تاریک ماحول میں اُسے کوئی کھڑا نظر آیا۔

"کون ہے......؟" وہ لرزتی آواز میں بولا۔ لیکن کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ وہ اُس جگہ پہنچ گیا جہاں اُسے کوئی کھڑا نظر آیا تھا۔ لیکن آہ، یہ تو کوئی مجسمہ تھا...... پتھر کا ایک بت۔ اور اس بت کو دیکھ کر ساحل پتھرا کر رہ گیا۔ یہ صورت اُس کے دل میں اُتر گئی تھی...... وہ سب کچھ بھول گیا تھا اور اُس صورت کو دیکھتا رہا۔ تب روما نے اُسے چونکایا۔

"بھیا......"

"ہوں......؟" وہ سنبھل کر بولا۔

"کون ہے یہ؟"

"میں نہیں جانتا روما۔"

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"اِس...... ہاں......" ساحل چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت اُسے آواز سنائی دی۔

"اُس طرف، وہاں اُس سائے والی دیوار کو کھودیں، سامنے کدال رکھی ہے۔"

ساحل بری طرح اُچھل پڑا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کون بولا تھا روما؟"

"پتہ نہیں بھیا......"

"آہ، کتنی خوبصورت آواز تھی؟" ساحل نے کہا۔ بہر حال، اُس نے اُس دیوار کے برابر زمین کھودی تو اُسے ایک عظیم الشان خزانے کے صندوق نظر آئے۔ ساحل آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا تھا۔

"یہ تمہارے لئے ہے...... اسے بڑی احتیاط سے خرچ کرو اور اپنی بہن کی زندگی بنا لو۔ تھوڑی تھوڑی کر کے یہاں سے لے جاؤ اور بے فکر رہو۔ اسے تمہارے علاوہ اور کوئی نہ لے سکے گا، یہ میرا وعدہ ہے۔"

ساحل نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس بار اُس نے دیکھ لیا تھا کہ مجسمہ ہی بول رہا ہے......!

۞

منوہر سخت جلن کا شکار تھا۔ باپ نے اپنی دولت سے یہ قیمتی ہار رما کے لئے خریدا تھا جبکہ منوہر کے پاس ایسے وسائل نہیں تھے کہ وہ بھی اتنی ہی قیمتی کوئی چیز خرید لیتا۔ اور پھر پچھلے دنوں ریس سے جو پیسے حاصل ہوئے تھے جواہر لال نے بڑی چالاکی سے منوہر کو لالچ دے کر اُس کے تمام پیسے کاروبار میں لگا دیئے تھے۔ منوہر کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر جواہر لال اتنا قیمتی ہار نہ خریدتا۔ اور پھر اس کے بعد اس نے منوہر کو رما کا پیغام بھی نہیں دیا تھا۔ منوہر کا ذہن مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آدھی رات کو وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بڑی چالاکی کے ساتھ جواہر لال کے کمرے میں داخل ہوا۔ ہار کی جگہ اُسے معلوم تھی۔ چنانچہ اُس نے خاموشی سے ڈبے میں سے ہار نکال لیا اور اس کی جگہ ایک نہایت بھدا اور سستا ہار رکھ دیا جو اُسے گھر میں ہی پڑا ہوا مل گیا تھا۔ ڈبے کو اُس کی جگہ رکھنے کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ پھر دوسرے دن اس نے بازار سے ایک بہت ہی خوبصورت ڈبہ خریدا اور ہار کو پیک کر لیا۔ اُس نے اپنے ذہن میں ایک مکمل منصوبہ

بنا لیا تھا۔ چنانچہ وہ اس منصوبے کے تحت ٹھیک چار بجے رما کے گھر پہنچ گیا۔ رما کی دوسری بہنیں اس وقت بھی موجود نہیں، البتہ کمرہ خوب سج گیا تھا اور رما مزید تیاری میں مصروف تھی۔ منوہر کو دیکھ کر چونک پڑی۔

"ارے منوہر جی، آپ؟"

منوہر ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "ہاں...... آپ بھی سوچ رہی ہوں گی رما جی کہ کیسے مہمان ہیں جو وقت سے ایک گھنٹہ پہلے آ گئے۔"

"آپ مہمان کہاں ہیں منوہر جی؟ میں نے تو آپ سے پہلے کہہ دیا تھا کہ آپ کے علاوہ اس پارٹی میں اور کوئی نہیں آ رہا۔"

"غلط رما جی...... میرے علاوہ بھی اس پارٹی میں کوئی آ رہا ہے۔"

"نہیں آ رہا۔"

"آ رہا ہے...... میں کہہ رہا ہوں نا۔" منوہر نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"کون......؟" رما حیرت سے بولی۔

"میرے پتا شری جواہر لال جی۔"

"اوہ، اچھا وہ آ رہے ہیں؟"

"ہاں، وہ آ رہے ہیں۔ اور اگر وہ آ رہے ہیں تو میں نہیں ہوں گا۔ یہ ایک چھوٹی سی بھینٹ آپ کے لئے ہے۔" منوہر نے ہار کا ڈبہ سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"آپ اس سے نہیں آئیں گے تو مجھے افسوس ہوگا۔"

"نہیں...... جب پتا جی یہاں سے چلے جائیں گے تو میں آؤں گا۔"

رما نے حیران نگاہوں سے منوہر کو دیکھا، پھر بولی۔ "جیسی آپ کی مرضی۔ میں آپ سے ضد تو نہیں کر سکتی۔"

"رما جی، میری ایک خواہش ہے۔"

"جی بتایئے۔"

"یہ ہار آپ اپنے گلے میں پہن لیجئے۔" منوہر نے کہا اور رما نے ڈبہ کھول کر ہار دیکھا اور پھر بولی۔

"ہائے رام...... کتنا خوبصورت ہے۔"

"آپ کو پسند ہے؟"

"بالکل...... اس طرح جیسے آپ مجھے پسند ہیں۔" رما نے کہا اور منوہر خوش ہو گیا۔

"میں آپ کو پسند ہوں؟"

"پسند نہ ہوتے تو آپ کو راتوں کو یاد نہ کیا کرتی۔"

"ہیں...... آپ مجھے یاد کرتی ہیں؟"

"آپ کب بھی سوال کریں گے؟" رما نے اٹھلاتے ہوئے کہا اور منوہر خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اپنی دیوانگی کے بے شمار ثبوت اُس نے رما کی پیشانی، آنکھوں، رُخسار، ہونٹوں اور ٹھوڑی پر درج کئے اور پھر اُس سے

اجازت لے کر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔
ادھر وہ مسکرا رہا تھا اور اُدھر رما مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''بیٹے، بھول گئے تم کہ یہ کام اشیش بھگونت کے ہیں...... نانی یاد آجائے گی تمہیں۔ ذرا پھنسو تو ہمارے جال میں۔''
پھر رما تیاریوں میں معروف ہوگئی۔ اُس نے اپنا منصوبہ تکمیل دے دیا تھا۔ ادھر اپنے مہاراج جواہر لال جی نے ڈبے کو بڑی خوبصورتی سے پیک کیا۔ کھول کر نہیں دیکھا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ خیال بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی حرکت ہوگئی ہوگی۔ غرض یہ کہ مکمل تیاریوں کے ساتھ پانچ بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ خوبصورت لباس پہنا، خوب سینٹ چھڑکا۔ منوہر چالاک نگاہوں سے ساری تیاریوں کا جائزہ لے رہا اور دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔
اُدھر جواہر لال جی نے بھی منوہر کی نگرانی کی تھی اور یہ دیکھ لیا تھا کہ منوہر سونے کے لئے لیٹ گیا ہے اب پانچ چھ بجے سے پہلے نہیں اُٹھے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے رما کی سالگرہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ مقررہ وقت پر بنے سجے، ڈبہ بغل میں چھپائے باہر نکل آئے اور پھر کار میں بیٹھ کر چل پڑے چند قدم کا فاصلہ تھا لیکن دوسروں کو دھوکہ دینے کے لئے اُنہوں نے کار ہی استعمال کی تھی۔
ادھر رما اور اُس کی تینوں بہنیں کمرے میں موجود تھیں۔ جواہر لال جی کا استقبال بڑے پر تپاک انداز میں کیا گیا اور جواہر لال جی کو لے کر وہ لوگ کمرے میں پہنچ گئیں۔ سالگرہ کا کیک تیار تھا۔ جواہر لال جی نے پوچھا۔ ''اور کوئی نہیں آئے گا؟''
''آپ آگئے، اب بھلا کسی اور کی کیا گنجائش رہتی ہے؟'' روپا نے کہا۔
''محبت ہے آپ کی۔ یہ ایک چھوٹی سی بھینٹ۔'' جواہر لال جی نے ہار کا ڈبہ سامنے کرتے ہوئے کہا۔
''اس کی کیا ضرورت تھی جواہر جی؟ چلئے آئیے، کیک کاٹتے ہیں۔''
یہاں بھی جواہر لال جی کو منظر عام پر رکھا گیا۔ کیک کاٹا گیا، اُنہیں کھلایا گیا، خود بھی کھایا گیا۔ جواہر لال جی نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ یہ ہار میں آپ کی گردن میں ڈالوں۔'' جواہر لال جی نے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''ضرور...... آپ کی محبت ہے۔'' رما نے کہا اور جواہر لال جی نے ڈبے کا کاغذ پھاڑا، پھر ڈبہ کھولا لیکن اندر کانچ کا ایک معمولی سا ہار دیکھ کر خود اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... رما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے جواہر جی؟ ہار پہنائیے مجھے۔''
جواہر لال نے رما کی گردن کو دیکھا۔ یہ معمولی چند روپوں کا ہار دیکھ کر اُن کا چہرہ پتھرا گیا تھا۔ لیکن جب اُن کی نگاہیں رما کے گلے پر پڑیں تو وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگے، پھر بولے۔ ''رما جی...... یہ
''کیا بات ہے جواہر لال جی؟''
''مم...... میرا یہ ہار......''
''کوئی بات نہیں۔ آپ نے ہمیں جس قابل سمجھا۔''
''نن...... نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔''

''میں نے کہا نا، کوئی بات نہیں ہے جواہر لال جی۔ تحفہ دو روپے کا ہو یا دو لاکھ کا، تحفہ ہی ہوتا ہے۔''
''آپ سمجھی نہیں مجھے...... بھگوان کے واسطے ایک بات بتا دیجئے، یہ ہار آپ کی گردن میں کہاں سے آیا؟''
''کیوں...... خیریت؟''
''بتا دیجئے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔''
''منوہر لال جی لائے تھے ابھی ایک گھنٹہ پہلے۔ وہ ڈبہ پڑا ہوا ہے اس کا۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ اُن کی خواہش ہے کہ یہ ہار میں اپنی گردن میں پہن لوں۔''
''مم...... منوہر لایا تھا؟''
''جی......''
''بھگوان کی سوگند یہ میں نے خریدا تھا۔''
''تو پھر......؟''
''پتہ نہیں یہ اُس نے کیسے چرا لیا اور ڈبہ بدل دیا۔''
''ارے چھی، چھی، چھی...... آپ لوگ آپس میں چوریاں بھی کرتے ہیں؟'' راگنی نے کہا۔ جواہر لال پر گھڑوں پانی گر گیا تھا۔ پھر اُس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔
''میں شرمندہ ہوں...... اس ڈبے کو یوں ہی بند کر دیجئے۔ آپ کا تحفہ مجھ پر قرض رہا۔''
''میں نے کہا نا جواہر لال جی، آپ کی محبت کافی ہے۔ تحفوں سے کیا ہوتا ہے؟''
''کیا آپ نے اس پاپی کمینے کو دعوت دی تھی؟''
''آپ ہی کی معرفت دی تھی۔ مگر وہ کہہ رہے تھے آپ نے اُنہیں نہیں بتایا۔''
''مجھ...... جھوٹ بول رہا تھا سس...... سسرا۔'' جواہر لال نے ہکلاتے ہوئے کہا۔
''آئیے آپ ہمارے ساتھ چائے پیجئے۔''
جواہر لال بیٹھا رہا، لیکن اُس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ غصے سے اُس کی اندر سے طبیعت خراب ہونے لگی منوہر لال نے یہ کمینہ پن کیا ہے، دیکھ لوں گا پاپی کو...... دیکھ لوں گا۔ پھر اس کے بعد واپسی میں جواہر لال نے منوہر لال کو طلب کیا۔
''تم نے میرے کمرے سے ہار چرایا تھا؟''
''جی...؟''
''ہار چرایا تھا تم نے......؟''
''نہیں، کوئی چوڑی ڈھیلی ہوگئی ہے کیا کھوپڑی کی؟'' منوہر نے غصے سے کہا۔
''ٹکڑے کر دوں گا تیرے میں۔ سمجھا؟''
''بڑا اچھا کریں گے آپ۔ مگر اب آپ کو یہ حق نہیں رہا ہے۔ اپنے آپ کو ذرا سنبھال کر رکھئے۔'' منوہر نے کہا۔ جواہر لال غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا لیکن عقل نے ساتھ دیا، خاموش ہوگیا۔
اور رقابت کا یہ سلسلہ بڑا طویل چل پڑا اور بڑے دلچسپ واقعات پیش آنے لگے...... منوہر نے رما کو

رات کے کھانے کی دعوت دی اور اُس کے ساتھ ہوٹل پہنچ گیا۔ مگر جواہرلال جی تاک میں لگے ہوا کرتے تھے۔ پیچھے ہی پیچھے ہوٹل پہنچے اور منوہر سے کہا۔ ''تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو؟ جاؤ، چمن لال جی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم نے اُن سے شام کا وعدہ کیا تھا۔''

''میں نہیں جا رہا پتا جی۔ آپ اُن سے بات کر لیجئے۔''

''لاکھوں روپے کا سودا ہے چمن لال سے۔ سوچ لو، تمہاری وجہ سے خراب ہو جائے گا۔''

مجبوراً منوہرلال کو جانا پڑا اور جواہرلال جی رما کے ساتھ بیٹھ گئے۔

''یہ منوہرلال ہمیشہ آپ کا راستہ کاٹتے رہتے ہیں۔''

''ہاں رما جی...... میں محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن اب جو کچھ کر سکتی ہیں، آپ ہی کر سکتی ہیں۔''

''بتائیے، میں کیا کروں؟''

''صاف صاف کہہ دیجئے اُس سے کہ آپ اُس سے نہیں ملنا چاہتیں۔''

''میں ایک بات سوچتی ہوں جواہرلال جی۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے؟''

''نہیں، آپ کہئے۔''

''وہ آپ کے بیٹے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آپ کی محبت میں اُن سے سخت رویہ اختیار کر لوں اور بعد میں آپ باپ بیٹے ایک ہو جائیں۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

رما چالاکی سے اپنے کام کرتی رہی۔ ریس کورس میں کبھی وہ جواہرلال کے ساتھ ہوتی تو کبھی منوہرلال کے ساتھ۔ باپ بیٹے ایک دوسرے کے شدید دشمن ہوتے چلے گئے۔ جواہرلال نے سوچا کہ منوہرلال جوان ہے، رما صرف اُس کی جوانی کی جانب متوجہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ منوہر رما سے شادی کر لے۔ کچھ کرنا چاہئے، کچھ کرنا چاہئے۔ اور پھر ایک رات شیطان شدت سے جواہرلال کے سر پر سوار ہوگیا۔ اُس نے ایک تیز دھار چھری خریدی اور پھر رات کو منوہر کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

اُن دنوں منوہر اپنی ماں سے جواہرلال کی باتیں کرتا رہتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ پتا جی اُس کے دشمن ہو گئے ہیں اور اس کا کارن ایک لڑکی ہے۔ چنانچہ جواہرلال کی بیوی بھی ہوشیار رہتی تھی۔ رات کو جب اُس نے شوہر کو چوروں کی طرح اُٹھتے دیکھا تو چونک پڑی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ جواہرلال کے ہاتھ میں دبا ہوا چھرا نہیں دیکھ سکی تھی۔ البتہ وہ جواہرلال کے پیچھے پیچھے منوہرلال کے کمرے میں داخل ہوئی، اور اُس وقت چونکی جب منوہرلال کے تڑپنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں...... اُس کے حلق سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے بکرے کو ذبح کیا جاتا ہے۔ جواہرلال کی بیوی نے جلدی سے روشنی کی، پھر ایک دلدوز منظر دیکھا...... بیٹا خون میں لت پت پڑا ہوا تھا اور اُس کی گردن جھول رہی تھی۔ اور چھرا جواہرلال کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شدت غم سے دیوانی ہوگئی اور چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ سارے ملازم جاگ گئے۔ جواہرلال کے بدن میں خون ہی نہیں رہا تھا۔ ایک دم سے بیٹے کی کٹی ہوئی گردن کو دیکھا تو خود سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ پھر اس کے بعد کیا کیا کارروائی ہوتی رہی اُسے کوئی علم نہیں تھا...... جواہرلال کی بیوی بیٹے کے غم میں پاگل

ہوگئی۔ جواہرلال کو ملازموں کے ذریعے پولیس نے پکڑ لیا اور اُسے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ لاک اپ میں جواہرلال کو یہ احساس ہوا کہ اُس نے کیا کر ڈالا ہے...... بیٹے کی موت کی اطلاع مل چکی تھی۔ اُس کے دل و دماغ میں ایک خوفناک طوفان برپا ہوگیا۔ پھر رات کو اُس نے اپنی دھوتی کھولی اور ایک رسّی کی طرح بٹ کر گردن میں پھندا لگایا اور لاک اپ کے کنڈے سے لٹک گیا...... تھوڑی دیر میں اُس کی جان نکل گئی۔ بیٹا زندگی سے گیا، ماں پاگل ہوگئی اور باپ نے تھانے میں خودکشی کر لی......!

ان سارے کاموں سے فراغت حاصل ہوگئی تو رما کی ملاقات اشیش بھگونت سے ہوئی جو اچانک ہی اُس کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں چاروں بہنیں بیٹھی ہوئی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ اشیش بھگونت کمرے میں پہنچا اور اُن چاروں کو گھورنے لگا۔

''تم بالکل نکمّی اور ناکارہ ہوتی جا رہی ہو...... کوئی کام نہیں ہو رہا تم سے۔ مفت کے عیش کر رہی ہو۔''

''جے بھگونتا...... میں نے تو اپنا کام کر لیا ہے۔ کیا آپ نے سنا نہیں کہ جواہرلال نے تھانے میں آتما ہتیا کر لی۔ اُس کی دھرم پتنی پاگل ہوگئی اور منوہرلال قتل ہوگیا۔''

''ہاں، ابھی ابھی یہ معلوم کر کے آیا ہوں۔''

''جے بھگونتا، کیا یہ کام نہیں ہے؟''

''صرف رما اپنا کام کر رہی ہے۔ جو بات میں تمہیں بتانے والا ہوں اسے سن کر تم غصے سے پاگل ہو جاؤ گی۔''

''ارے ارے...... کیوں، کیا ہوا؟''

''اب یہ بتاؤ، دوش کس کا ہے، میرا؟ وہ لوگ باپ بیٹے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ میں نے تم سے کہا تھا، اصل میں سنسار میں رہنے والے اب ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ میرے کچھ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ خیر یہ ساری باتیں اپنی جگہ، میں بڑا دکھی ہوں اپنے اس شاگرد کے لئے جو مر گیا ہے۔ اور میں اُس کے لئے کچھ کرنے والا ہوں۔ مگر تمہاری بہن رجنی تم سے الگ ہوگئی۔''

''کک...... کیا ہوا؟'' چاروں بہنوں نے بیک وقت کہا۔

''کیا وہ مر گئی؟'' رادھا نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہمارے لئے مر گئی ہے وہ۔''

''کیا مطلب اشیش بھگونت......؟''

''مسلمان ہوگئی ہے وہ۔ مسلمانوں کے جال میں پھنس گئی ہے۔ دھرم چھوڑ دیا ہے اُس نے اپنا۔''

''مگر کیوں......؟''

''بہت سی وجوہات ہیں اس کی، مولوی ایمان علی اور وہ پراسرار عورت جو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر رجنی...... اب اُس کا نام ستارہ ہے۔ محبت کر رہی ہے۔ مگر میں بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا، دیکھوں گا کہاں سے کہاں تک جاتی ہے؟ اور تم لوگ...... تم لوگ اب اپنے لئے خود کام تلاش کرو اور اس

بات کا ثبوت دو کہ تم میری وفادار ہو۔ ورنہ...... ورنہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ میں نے تم
ساتھ رعایت کر کے غلطی کی ہے۔"

"نہیں اشیش بھگونتا...... آپ چنتا نہ کریں، ہم بہت کچھ کریں گے آپ کے لئے...... بہت کچھ"
نے کہا اور اشیش بھگونت تھوڑی دیر کے لئے اُنہیں گھورتا رہا اور پھر خاموشی سے لوٹ کر واپس چلا گیا۔

چاروں بہنیں سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں، چاروں کے چہروں پر عجیب سے تا
پھیلے ہوئے تھے۔ بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد روپا نے کہا۔ "رجنی اس طرح بدل جائے گی؟
تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔"

"تم نے نہ سوچا ہو روپا دیدی، مگر جب ہم اشیش بھگونت کے کہنے پر کوئی کام کرتے تھے تو رج
دل سے ہمارے کام میں شریک نہیں ہوتی تھی۔"

"ارے، تو نے اُس کے دل میں کیسے جھانک لیا؟"

"کمال کرتی ہو دیدی، دل کی باتیں چہرے پر تو آ ہی جاتی ہیں۔"

"چھوڑو ان باتوں کو...... ان میں کیا رکھا ہے؟ اشیش بھگونت نے جو کچھ کہا ہے، غلط تو نہیں کہا
یقیناً رجنی نے اپنا دھرم بدل دیا ہو گیا۔ اور اگر اُس نے دھرم بدل لیا ہے تو پھر اب وہ ہم میں کہاں رہ

"ہاں، یہ بات تو ہے۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ کہیں اشیش بھگونت ہم میں سے ہی کسی کی ڈیوٹی نہ لگا د
ہم رجنی کو ختم کر دیں۔ خیر...... اب اتنے برے ہو گئے ہیں ہم کہ اپنی بہن ہی کو مار ڈالیں۔" راگنی نے

"راگنی، سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ویسے اشیش بھگونت کے بارے میں اب میرا یہ اندازہ ہے کہ وہ
ہم میں نہیں آئیں گے۔ کوئی بڑی ہی ضرورت پیش آ گئی تو ہم تک پہنچیں گے۔"

"ظاہر ہے سارے سنسار میں اُن کا کام پھیلا ہوا ہے۔ ہم چار پانچ ہی تو نہیں ہیں جن کے ارد گر
منڈلاتے رہیں۔ وہ تو اصل میں ہماری تربیت کا معاملہ تھا اس لئے ہمارے قریب وہ زیادہ رہے۔
یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم کیا کریں؟"

"دیکھو، رما، رادھا، راگنی...... یہ بات تو طے ہے کہ ہماری جان اشیش بھگونت نے ہی بچائی
سارے کے سارے اُسی قید خانے میں مر گئے ہوتے۔ اور اس کے بعد اشیش بھگونت نے ہمیں جو شکتی
وہ مہان شکتی ہے۔ ہم کوئی بھی رُوپ دھار سکتے ہیں، یہ ہمارے لئے معمولی بات ہے۔ سنسار بھر کی دو
ہمارے چرنوں میں ہے، جتنا من چاہے لے لیں۔ جسے من چاہے بے وقوف بنا دیں، یہ ساری
ہمیں اشیش بھگونت نے دی ہیں اور ہم ابھی تجرباتی دور میں ہیں ورنہ سارے سنسار میں جس جگہ
چاہے اپنے لئے دھرتی سجا لیں۔ پھر ابھی دنیا دیکھ رہے ہیں ہم۔ نئے نئے جہان تلاش کر رہے ہیں۔
ہم سے بچھڑ گئی ہے، وہ جانے اور اُس کا کام۔ اب صرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم ستی ساوتری
جینا چاہیں تو یہ تو مشکل ہے۔ سنسار اپنا لو اور سنسار والوں کو اُن کی منزل سے بھٹکاؤ یہی اب ہمارا
ہے۔ ایسا ہی کرتے ہیں ہم سب...... الگ الگ کچھ نہ کچھ کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں۔"

"کیا سوچو گی روپا؟ یہ بتاؤ۔"

"بھئی میں اپنی طرف سے سوچ سکتی ہوں اپنے لئے۔ تم لوگ اپنی اپنی سوچو۔ میں تو جا رہی ہوں۔"

"جا رہی ہو......؟"

"ہاں......"

"کہاں دیدی؟"

"کوئی منزل نہیں ہے میرے سامنے۔"

"تو پھر؟"

"بس جدھر منہ اُٹھے گا چلی جاؤں گی۔"

"مگر آخر کیوں؟"

"میں نے کہا نا، اپنے لئے اس سنسار میں خوشیاں تلاش کرنے۔"

"مگر دیدی...... تم تو ہمارا سہارا ہو۔"

"نہیں...... اب تم خود اپنا اپنا سہارا بنو۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔" روپا نے کہا اور پھر وہ
یاں کرنے لگی۔ درحقیقت اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کوئی ایسا نیا اور انوکھا کام کیا جائے جس سے زندگی
ف ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنی تمام تر قوتوں کو سمیٹ کر وہاں سے چل پڑی۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے
اُس نے اپنے رنگ و روپ کو بدل لیا اور اب وہ ایک معصوم اور خوبصورت دوشیزہ نظر آ رہی تھی۔ اپنا
سا سامان اُٹھائے وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔ حالانکہ اس سامان کی اُسے کوئی ضرورت نہیں تھی، لیکن
مسافر نظر آنے کے لئے اُس نے یہ سب کیا تھا۔ بہرحال ٹرین کے ایک ڈبے میں وہ جا بیٹھی۔ اس
ایک خوبصورت نوجوان دوشیزہ کی حیثیت سے کوئی بھی اُسے دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو سکتا تھا۔

وہ بہت دیر تک سوچوں میں ڈوبی رہی۔ ٹرین میں اُس نے کسی کی جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ البتہ
ٹرین ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تو اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُس نے ایک گہری سانس لی
پھر ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ آرام دہ سیٹ سے ٹِک کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جب آنکھیں
کھلیں تو ٹرین ایک جنگل میں سفر کر رہی تھی۔ بادل گھر رہے تھے اور موسم بڑا دلکش ہوتا جا رہا تھا۔ روپا
کی کے پاس آ بیٹھی۔ پرندوں کے غول موسم کا لطف اُٹھانے کے لئے نکل آئے تھے اور فضا میں پرواز
رہے تھے۔ روپا کے بدن میں مستیاں اُمنڈنے لگیں اور وہ اس موسم سے لطف اُٹھانے لگی۔ اپنے
لوں میں وہ نجانے کہاں کہاں کی سیر کر رہی تھی؟ بہرحال، نجانے کتنی دیر تک وہ آنکھیں بند کئے اسی
بیٹھی رہی اور پھر نیند کہیں سے اُس کی آنکھوں میں آ گھسی۔ پھر آنکھ اس وقت کھلی جب کانوں میں
کی آواز پڑی۔ اُس نے کروٹ بدل کر دیکھا تو ریلوے افسر اور دو تین آدمی اُس کے بالکل قریب
ڑے تھے۔ وہ جلدی سے اُٹھ گئی، عجیب سی نگاہوں سے اُنہیں دیکھنے لگی۔ ایک ریلوے افسر نے کہا۔

"آپ یہاں کہاں آ بیٹھیں دیوی جی؟ جلدی سے نیچے اُتر جائیے۔"

"کیوں......؟" روپا نے پیشانی پر شکنیں ڈال کر پوچھا۔

"کسی اور ڈبے میں جا کر بیٹھ جائیے۔ آپ کو نہیں معلوم ڈبہ ریزرو ہے؟"

"ریز رو کیا ہوتا ہے؟" روپا نے سوال کیا۔
"معلوم ہوتا ہے آپ کسی دیہات سے آ رہی ہیں۔ ارے بابا جلدی کریں، رائے صاحب آ
والے ہوں گے۔"
"کون رائے؟ کیا فضول باتیں کر رہے ہو تم؟"
"رائے گرودت جی کو آپ نہیں جانتیں کہ وہ کتنے بڑے آدمی ہیں۔ بہت بڑے رئیس ہیں ا
زمیندار ہیں۔"
"ہوں گے اپنے گھر کے۔ مجھے اس سے کیا؟ تم دفع ہو جاؤ۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ دیوی جی؟ یہ تو ریلوے کا قانون ہے۔ آپ بلاوجہ دیر کر رہی ہیں۔ ا
آپ عورت نہ ہوتیں تو ہم آپ کو اُٹھا کر نیچے پھنکوا دیتے۔"
"ہوں، نیچے پھنکوا دیتے...... پھنکوا سکتے ہو تم مجھے نیچے؟"
"ارے بابا کیوں خواہ مخواہ بحث کر رہی ہیں؟ جلدی کریں، ورنہ سچ مچ ہی...... ارے چلو تم لوگ میرا
شکل کیا دیکھ رہے ہو؟ اُٹھاؤ انہیں اور نیچے اُتار دو۔ رائے صاحب آتے ہی ہوں گے۔"
روپا نے گہری نگاہوں سے اُسے دیکھا اور دوسرے لمحے ریلوے کا وہ آفیسر اپنی جگہ سے اُچھل کر دُ
جا گرا...... روپا کی پراسرار قوتوں نے اُسے اُٹھا کر پھینک دیا تھا۔
وہ بدحواسی سے نیچے سے اُٹھا اور اس بار پھر اُس نے قلابازی کھائی لیکن اس بار وہ منہ کے بل نیچے آ
تھا۔ اُس کا ناک اور منہ چھل گئے تھے۔ وہ دوسرے دونوں آدمی جو روپا کی طرف بڑھ رہے تھے، ہم کر
رُک گئے اور پھر اُنہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ریلوے افسر پورے ڈبے میں قلابازیاں کھاتا پھر رہا
تھا اور اُس کے چہرے پر سخت دہشت کے آثار تھے۔ اتنی دیر میں ایک شاندار شخصیت کا مالک آدمی ٹرین
میں چڑھا، اُس کے ساتھ کئی اور دوسرے افراد بھی تھے۔ پہلے آنے والا لمبے چوڑے بدن کا ایک
خوبصورت سا آدمی تھا جس نے انتہائی قیمتی لباس پہنا ہوا تھا۔ اُس کے گلے میں ہیروں کی مالائیں پڑی
ہوئی تھیں۔ ہاتھوں کی اُنگلیاں انگوٹھیوں سے بھری پڑی تھیں۔ دیکھنے ہی سے کوئی اعلیٰ درجے کی شخصیت
معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے جو اندر کا منظر دیکھا تو حیران رہ گیا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے نگاہیں اُٹھا کر پوچھا۔
"پپ...... پتہ نہیں مہاراج۔" لیکن چند لمحوں کے بعد ریلوے کے دوسرے افسران نے صورت حال
بتائی اور سہمے ہوئے انداز میں روپا کی جانب اشارہ کیا۔
"اوہو...... ان لوگوں کو ایسی مہان ہستیوں کا خیال تو کرنا چاہیے۔" اُس شخص نے کہا۔ پھر اپنے
آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "دیوی جی سے معافی مانگو اس کے لئے۔ ورنہ مر جائے گا یہ۔"
لیکن ریلوے افسر تو نیم مُردہ ہو ہی چکا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تو آنے والے شخص
نے دونوں ہاتھ جوڑ کر روپا سے کہا۔ "دیوی جی...... شما کر دیں اسے۔ یہ اس بیچارے کی ڈیوٹی ہے۔ آپ
اس کی بدتمیزی پر شما کر دیں۔ میں اس کی بدتمیزی پر اس کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔"

"یہ ہمیں نیچے اُتار رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ یہ ریل کا ڈبہ رائے گرودت کے لئے ہے۔ اب آپ بتایئے
ہم اکیلے سفر کر رہے ہیں، ہم بھی تو انسان ہیں۔"
"کیوں نہیں دیوی جی...... کیوں نہیں؟ آپ اسے معاف کر دیں۔ چلو اسے اُٹھا کر لے جاؤ ورنہ کہیں
مر نہ جائے۔ مہان دیویوں کا اپمان کریں گے تو یہی نتیجہ ہوگا۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں دیوی
جی۔ اگر آپ حکم دیں تو میں اپنے پریوار کو اوپر بلا لوں؟"
"ہاں، کیوں نہیں؟"
تھوڑی دیر کے بعد رائے گرودت کا خاندان ڈبے میں آ گیا۔ حسین ترین عورتیں اور مرد۔ سب کے
سب ہنسنے بولنے والے۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ گرودت نے کہا۔ "دیوی جی، اگر ان میں سے کسی
سے غلطی ہو جائے تو آپ انہیں شما کر دیں۔"
"آپ بتایئے، ہم آپ کے ساتھ سفر کر سکتے ہیں یا نہیں؟"
"ہاں، کیوں نہیں؟ میرا نام گرودت ہے۔ اور یہ میری چھوٹی بہن سادھنا ہے۔ ہم لوگ زمینداری
کرتے ہیں۔ گاؤں گوٹھ ہیں، حویلیاں ہیں۔ ایک شادی میں آئے ہوئے تھے اور اب واپس اپنے گھر جا
رہے ہیں۔ آپ مہان ہیں، ہماری آنکھیں آپ کو کہاں پہچان سکتی ہیں؟ اس بیچارے کو معاف کر دیں۔ کیا
آپ ہمارے اس پریوار سے ملنا پسند کریں گے؟"
"کیوں نہیں؟ میں بھی انسان ہوں، اور انسان کو انسان سے دوستی کرنی ہی ہوتی ہے۔"
"آپ مہان ہیں دیوی جی۔ چھوٹی سی عمر میں بھگوان نے آپ کو اتنا گیان دیا ہے۔ ان سے ملئے، یہ
میری دھرم پتنی ہیں۔"
"سرسوتی ہے میرا نام۔ اور میں ان کی پتنی ہوں۔" ادھیڑ عمر عورت نے کہا۔
"میں آپ کو پرنام کرتی ہوں ماتا جی۔" روپا ہاتھ جوڑ کر بولی۔
"جیتی رہو۔ بھگوان اس چاند سی موہنی صورت کو ہمیشہ قائم رکھے۔ پر بیٹی، تم نے اتنی چھوٹی سی عمر میں
ایسا گیان کہاں سے حاصل کر لیا؟"
"کوئی گیان دھیان نہیں ہے ماتا جی میرا۔ بس یوں سمجھ لیجئے اشیش بھگونت کے سائے ہیں۔"
اشیش بھگونت کو کوئی بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔ سرسوتی دیوی اپنی بچیوں کا تعارف کرانے لگیں اور کچھ لمحے
کے بعد روپا نے کہا۔
"میرا نام روپا کنول ہے۔ روپا کہتے ہیں مجھے۔ آپ کا کوئی بیٹا نہیں ہے ماتا جی؟"
"بیٹا......؟"
"ہاں۔"
"نہیں، ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔" رائے گرودت ایک دم بول پڑا۔ لیکن نجانے کیوں اُس کی آواز میں
ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ روپا نے محسوس کیا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ بہر حال اُسے اتنی زیادہ دلچسپی
بھی نہیں تھی۔ چند لمحات کے لئے خاموشی چھا گئی اور چند لمحوں کے بعد گرودت نے پھر کہا۔ "آپ کہاں جا

رہی ہیں دیوی جی؟"

"بس...... کوئی منزل نہیں ہے ہماری۔ جہاں بھاگ لے جائیں وہیں ٹھہریں گے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو کیوں نہ آپ ہمیں سیوا کا موقع دیں۔"

"ارے نہیں، ایسے اتفاقات کبھی کبھی نقصان دہ بھی ہو جاتے ہیں۔"

"آپ جیسی مہان دیوی اگر ساتھ ہو تو بھلا نقصان کیا ہو سکتا ہے؟ آپ کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

"دیکھیے......"

"نہیں دیوی جی۔ کچھ دن ہمارے ساتھ گزاریئے۔ آپ کا احسان ہوگا ہم پر۔"

روپا خاموش ہوگئی۔ البتہ دل ہی دل میں وہ یہ سوچ رہی تھی کہ احسان تو ایسا ہوگا میرا تم پر کہ تم لوگ زندگی بھر آئندہ کسی سفر میں کسی کو اپنے ساتھ نہیں لگاؤ گے۔ بہرحال وہ اُن کی بات مان گئی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ چلو دیکھ لیتے ہیں، گھر سے نکلتے ہی کچھ کرنے کا موقع مل رہا ہے تو پھر کرلیا جائے۔ بہرحال، ٹرین سفر کرتی رہی۔ شام ہوئی اور پھر دُور دُور کہیں نظر آنے والی بستیوں میں چراغ جل اُٹھے۔ پھر اس وقت جب چاند نے سر اُبھارا تو ایک بڑا اسٹیشن آ گیا۔ یہیں پر ان لوگوں کو اُترنا تھا۔ اندازہ یہ ہوا کہ واقعی گرودت جی بہت بڑے زمیندار ہیں۔

بہت سے لوگ اُنہیں لینے کے لئے اسٹیشن آئے ہوئے تھے اور اُن کا سواگت کر رہے تھے۔ روپا کو اُن کے ساتھ نیچے اُترنا پڑا۔ اور پھر وہ شاندار گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑے۔ یہاں جو شان و شوکت تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ عظیم الشان حویلی آ گئی جہاں اُن لوگوں کا قیام تھا۔ بے شمار ملازم تھے، لیکن رائے گرودت نے اپنی لڑکیوں سے یہی کہا تھا کہ وہ بذات خود اس مہان دیوی کی خدمت کریں۔ خود سرسوتی دیوی بھی اُس کے پیچھے پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹی لڑکی نے جس کا نام کامنی تھا کہا۔ "سچ دیوی...... آپ کے آنے سے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ آپ ہمارے دیدی کہنے کا بُرا تو نہیں مانیں گی؟"

"نہیں، بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟"

بہرحال، کھانا وغیرہ تیار کیا گیا اور اس کے بعد روپا کو ایک نرم اور آرام دہ بستر پر لٹا دیا گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اُس کے ذہن میں شیطانی خیالات آ رہے تھے۔ اُس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ ریاست کیسی ہے...... ذرا اس کے بارے میں معلوم تو ہونا چاہئے۔" اور پھر اُسے وہ لمحات یاد آنے لگے جب اُس نے کسی بیٹے کے بارے میں پوچھا تھا اور اُن لوگوں کا منہ بگڑ گیا تھا۔ خیر، جلدی کیا ہے...... دیکھیں گے اس نئی جگہ کی کہانی اور اپنا عمل کریں گے۔ وہ عمل جس کے لئے اشیش بھگونت نے گیان دھیان اور شکتی دی ہے۔ روپا اب بالکل بدل گئی تھی۔ حالانکہ باپ کی زندگی میں وہ سب باکردار لڑکیاں تھیں۔ لیکن شیطان کی شاگردی میں کردار کا کیا تصور رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اب روپا کے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔

ساحل کو رجنی نے صحیح معنوں میں اُس کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ اب اس قدر بے وقوف بھی نہیں تھا وہ کہ یہ نہ جانتا کہ اُسے آگے کیا کرنا ہے؟ البتہ اس کا احساس خود رجنی کو بھی ہو گیا تھا کہ ساحل کو دولت مل گئی لیکن دل کی دولت ہار چکا ہے وہ۔ خود رجنی اس سے پہلے اس مشکل کا شکار ہو چکی تھی اور اُس کے دل میں ساحل کے لئے محبت کا دریا موجزن ہو گیا تھا۔ چنانچہ ساحل کو اُس کی منزل دینے کے بعد وہ وہاں سے واپس چل پڑی اور ایمان علی کے گھر پہنچ گئی۔ انا زبیدہ جو درحقیقت ایک پراسرار عورت تھی، اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ہاں...... تمہیں وہ خوشی حاصل ہو گئی ستارہ جس کی تم خواہش مند تھیں۔ اب یہ بتاؤ کہ اب کیا چاہتی ہو؟" رجنی نے گردن جھکا لی، پھر اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپکے تو انا زبیدہ اُس کے سامنے آ گئی اور اُس نے اُس کی ٹھوڑی اُٹھا کر کہا۔ "خواہشیں شاید شعور کے پہلے دن سے موت کے وقت تک سب سے قریبی ساتھی ہوتی ہیں۔ دنیا چھوڑ دے لیکن خواہشیں ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ اور یہ خواہشیں ہی انسان کی زندگی میں رُوح بن کر دوڑتی رہتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری آنکھوں کے یہ آنسو کیا کہہ رہے ہیں، کیا چاہتی ہو؟ مجھے بتاؤ۔"

جواب میں رجنی بلک بلک کر رو پڑی اور کہنے لگی۔ "میں کیا بتاؤں کہ کیا چاہتی ہوں؟ انا ماں، میں تو اس دنیا سے اتنی ناواقف ہوں کہ شاید آپ مجھ پر یقین نہ کریں۔ ماتا پتا کی آغوش میں جیون بتایا، اس کے بعد مشکلیں آئیں تو اس طرح کہ خود ان کے آنے کا اندازہ بھی نہیں ہو سکا اور مشکلوں میں گھر گئی۔ انا ماں، میں نہیں جانتی کہ سنسار میں کون کون سی مشکلیں میرے لئے باقی ہیں؟ کیا بتاؤں میں آپ کو...... میں آپ کو کیا بتاؤں، کیسی کیسی مشکلوں کا شکار ہوئی ہوں، میں آپ کو کیا بتاؤں انا ماں؟" وہ بلک بلک کر رو پڑی۔ لیکن انا ماں کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

"تمہارے آنسوؤں کا راز میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں۔"

"میں کیا کروں انا ماں...... میں کیا کروں؟"

"نہیں...... ابھی کچھ نہیں کر سکتیں تم۔ جو کچھ تم نے کیا ہے اس کے بعد کچھ اور نہیں کر سکتیں تم۔ تمہیں جیون کا سکون اسی وقت ملے گا جب تم شیطان کے چنگل سے مکمل طور پر نکل آؤ گی۔" دیکھو، میں تمہیں ایک اچھے دوست اور ایک ہمدرد ساتھی کی حیثیت سے سب کچھ بتا رہی ہوں۔ میری بات کو غلط مت سمجھنا، اور کبھی یہ نہ سوچنا کہ تم نے جو کچھ کیا ہے وہ غلط کیا ہے۔ ناگ چندر کو جانتی ہو، ناگ چندر مر چکا ہے۔ لیکن شیطان نے اُس کے اندر دوسری رُوح پھونک دی ہے۔ وہ ایمان علی کا دشمن ہے، لیکن ایمان علی کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم شیطان کی شاگرد تھیں اور اب تم اُس کی شاگردی سے نکل آئی ہو۔ شیطان کے تمام فنون تمہارے پاس ہیں لیکن وہ تم سے یہ فنون چھین نہیں سکتا۔ اس وقت وہ بری طرح تلملا رہا ہے اور تمہارا بدترین دشمن بن گیا ہے۔ وہ خود تو تم تک نہیں پہنچے گا لیکن اُس نے ناگ چندر کو ایک شیطانی زندگی دی ہے اور ناگ چندر کو تمہارے مقابلے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ یہاں تو میں ایمان علی کے لئے موجود ہوں، لیکن

تمہیں تقدیر نے جو کچھ عطا کیا ہے تم اس سے شیطان کا مقابلہ کرو۔ تمہیں گیارہ ایسے کارنامے سرانجام دینا ہوں گے جن میں تمہیں شیطان کی شیطانیت کو نا کام بنانا ہوگا۔ اگر تم نے کامیابی کے ساتھ یہ عمل مکمل کرلیا تو پھر یہ سمجھ لو کہ زندگی تمہارے ساتھ انصاف کرے گی۔ لیکن سوچ لینا، شیطان کا شاگرد ناگ چندر جگہ جگہ تمہارا پیچھا کرے گا۔ اور تمہیں اُس سے نہ صرف بچنا ہے بلکہ اُس کے چنگل سے، اس شکار کو بھی نکالنا ہے جو اُس کا شکار بنا ہوا ہے۔ اور اس کے بعد میں تمہاری بزرگ ہونے کے باوجود تمہیں صاف دل سے بتا دُوں کہ یہ دنیا تمہیں ملے گی اور تمہارے من کا میت تمہارے پاس ہوگا یعنی ساحل۔ یوں سمجھ لو ایک طویل و عریض مصیبتوں کا سمندر عبور کرنے کے بعد تم ساحل تک پہنچ سکو گی۔"

رجنی کی گردن جھک گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ اللہ والے لوگ ہیں اور ان سے اپنے آپ کو کسی صورت نہیں چھپایا جا سکتا۔ بہرحال، یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن رجنی اب انا ماں کی ہر بات ماننے کے لئے تیار تھی۔ رات کو اُس نے عبادت کرتے ہوئے سوچا کہ شیطان نے دنیا بھر کی برائیاں مجھ سے اور میری بہنوں سے منسوب کر دی ہیں۔ اگر مجھے ان سے بچنے کا موقع مل رہا ہے اور انسانیت کی بھلائی کے لئے کچھ کرنے کی گنجائش مجھے دی گئی ہے تو پھر میں ضرور وہ کروں گی جس کی مجھے ہدایت کی گئی ہے۔ چاہے اس کے لئے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کر دینی پڑے۔ گیارہ ایسے عمل جو شیطان کے خلاف ہوں، خدا جانے وہ کیا ہو سکتے ہیں؟

دوسری صبح ایمان علی نے اُس سے ملاقات کی اور کہنے لگا۔ "بیٹی، اللہ تعالیٰ ہر ایک کی قسمت اس قدر روشن نہیں بناتا جتنی تمہاری تقدیر ہے۔ ارے بعض لوگ تو ساری زندگی کوششیں کرتے ہیں اور انہیں ایمان کی دولت نہیں ملتی۔ قدرت نے تمہیں شیطان کے چنگل سے نکال کر ایمان کے راستے پر ڈالا ہے، میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔ انا ماں نے مجھے ساری تفصیلات بتا دی ہیں بیٹی، یہ ایک چھوٹی سی نذر ہے۔ میں چھوٹا ہوں، یہ نذر چھوٹی نہیں ہے، تعویز ہے جو تم اپنے گلے میں ڈال لو۔ بہت سی مشکلات کا حل بنے گا یہ۔"

ایمان علی کا دیا ہوا تعویز رجنی نے اپنی گردن میں ڈال لیا اور اس کے بعد اُس نے ایمان علی سے پوچھا۔ "لیکن دنیا سے میری ناواقفیت تو ایک مسلم حقیقت ہے۔ میں سب کچھ کیسے کروں گی؟"

"تقدیر تمہاری رہنمائی کرے گی۔ اس کی طرف سے فکرمند نہ ہو۔" ایمان علی نے کہا۔

انا ماں نے اُسے بتایا کہ اُسے اپنا آغاز ایک مخصوص سفر کے بعد کرنا ہوگا اور ایک شخص روشن لال تک پہنچنا ہے جو ایک مخصوص جگہ رہتا ہے۔ ناگ چندر سے تمہاری پہلی ملاقات وہیں ہوگی۔ سارے پتے وغیرہ سمجھا دیئے گئے تھے۔ یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ جو کچھ بھی ہے، سارے معاملات ہوشیاری کے ساتھ کرنا ہوں گے۔ اس طرح رجنی جس نے بے شک شیطان کی شاگردی اختیار کر کے اپنی بہنوں کے ساتھ وقت گزارا تھا، لیکن بذاتِ خود کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا۔ پہلی بار اپنے اصل کام پر جا رہی تھی۔

بہرحال، یہ سفر جاری رہا اور آخر کار تقدیر اُس کی رہنمائی کرتی ہوئی اُسے روشن لال تک لے گئی۔ روشن لال ایک عجیب سا انسان تھا۔ وہ جوگی پنڈت تھا، لیکن اُس کے پاس لوگ اپنی مشکل لے کر آتے

تھے۔ روشن لال نے اُس کا استقبال بڑے احترام کے ساتھ کیا اور کہا۔

"بہن جی، جن لوگوں نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ میں تو بس ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ لیکن ایک بات میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ جس شخص کا آپ سے تذکرہ کیا گیا ہے یعنی ناگ چندر، وہ بڑا ہی سخت آدمی ہے اور اب تو وہ بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہے۔ اُس میں شیطان کی طاقت حلول کر گئی ہے۔ آپ کی ملاقات جب بھی اُس سے ہو جائے، اپنی تمام تر ہمت کے ساتھ کام کیجئے گا۔ مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کی مدد کروں۔ کہاں آپ اللہ والے اور کہاں ہم گندے سندے لوگ، گندے علوم جاننے والے۔ مگر چونکہ معاملہ شیطان اور ایک ناپاک وجود کا ہے یعنی وہ جو کالے علم کرتا ہے اس لئے مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کی پوری پوری مدد کروں۔"

"ایک بات بتاؤ روشن لال، کیا ناگ چندر زندہ ہے؟ جبکہ میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے۔"

"وہ زندہ نہیں ہے، بلکہ اُس کے وجود میں شیطان حلول کر چکا ہے اور ناگ چندر اور وہ ملا جلا رُوپ ہیں۔"

بہرحال، ناگ چندر سے رجنی کی پہلی ملاقات اس بھیانک دوپہر ہوئی جب اچانک ہی ایک عجیب و غریب شکل والا شخص جس کا سر بہت بڑا تھا اور ہاتھ پاؤں دُبلے پتلے تھے، رجنی کے سامنے پہنچ گیا۔ "اری او حرام کی پلی...... اپنا دین دھرم چھوڑ کر اشیش بھگونت سے غداری کر کے ہماری تلاش میں آئی ہے؟ کتنوں کو مارے گی تو؟ ہماری شکل میں اتنے ہیں کہ تیرا ہر سانس اگر ان میں سے ایک کو قتل کرے تو تیرا جیون کم پڑ جائے گا سسری۔ کیا نہیں دیا تھا تجھے اشیش بھگونت نے، کون سی چیز کی کمی چھوڑی تھی؟ ایک پریمی کی بات کرتی ہے، لاکھوں پریمی تیرے چرن چاٹتے پھرتے۔ پر سسری اپنی بہنوں کو بھی چھوڑ آئی، دین دھرم بھی کھو دیا اور مقابلہ کرنے چلی ہے اب اشیش بھگونت سے...... ارے ہم سے بچ کر سنسار کے کون سے کونے کھدرے میں بھاگے گی تو؟ تو جہاں جائے گی ہمیں پائے گی۔ تو نے ہمیں نہیں بلایا، مگر دیکھ ہم خود تیرے پاس آ گئے۔"

رجنی کے دل و دماغ پر پہلے تو خوف و دہشت کا حملہ ہوا لیکن دفعتہً ہی نجانے کیا ہوا کہ اُس کے وجود میں چنگاریاں سی بھر گئیں...... دہشت تو پہلے ہی دل و دماغ میں تھی، ہاتھ پاؤں البتہ چند لمحات کے لئے ساکت ہو گئے تھے۔ لیکن اچانک ہی اُسے ہوش آ گیا اور دوسرے لمحے اُس نے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے اور گھوڑے جیسی شکل اختیار کر گئی۔ پھر اُس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اس طرح دوڑنے لگی کہ اگر کوئی گھوڑا بھی اس وقت اُس کے پیچھے دوڑتا تو اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات خود بخود اُس کے ذہن میں آئی تھی اور اُس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اُس کے کانوں میں عجیب سی سرسراہٹیں گونج رہی تھیں۔ اور اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ناگ چندر بھی اُس کے ساتھ دوڑ رہا ہے...... رجنی اپنی اس رفتار کو اس قدر نا قابلِ یقین کہہ سکتی تھی کہ شاید ہی کبھی کسی ذی رُوح نے اتنی تیز دوڑ لگائی ہو۔ وہ ٹرین کے تیز رفتار انجن سے زیادہ تیز دوڑ رہی تھی۔ لیکن پھر کچھ ہی لمحے گزرے کہ اُس نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا...... گدھے جیسے ہاتھ پاؤں والا انسان جس کا سر ناگ چندر جیسا تھا دوڑتے ہوئے اُس سے آگے نکل گیا اور

کچھ دُور جانے کے بعد اُس نے دونوں ہاتھ پاؤں زمین پر پھیلائے اور رجنی نے دیکھا اُس کے سارے بدن میں پاؤں ہی پاؤں نکل آئے ہیں۔ اب وہ ایک عجیب الخلقت شے نظر آ رہا تھا۔ بدن گدھے کا، لیکن ہزاروں پاؤں والا۔ وہ خونخوار نگاہوں سے رجنی کو دیکھ رہا تھا اور اس طرح اُسے دیکھ رہا تھا جیسے اُس کا راستہ روکنا چاہتا ہو۔ رجنی نے ایک بار پھر رُخ تبدیل کر لیا۔ لیکن اب وہ رجنی سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ رجنی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟

کافی فاصلے پر اُسے کچھ کھنڈرات سے بنے ہوئے نظر آئے اور وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر اُن کھنڈرات کے نزدیک پہنچ گئی۔ کھنڈرات میں مدہم مدہم روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اور ابھی وہ کھنڈر کے دروازے پر ہی پہنچی تھی کہ وہاں اُس نے روشن لال کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ روشن لال پتھر کے بت کی مانند خاموش کھڑا تھا۔

رجنی، روشن لال کے قریب پہنچ کر رُک گئی اور اس کے بعد اُس نے اپنے اصل وجود کو اختیار کیا اور روشن لال اُسے دیکھ کر گردن ہلانے لگا۔ اچانک ہی ناگ چندر بھی اُس کے پاس پہنچا تھا، پھر وہ بھی بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اب وہ اپنی اصل شکل میں تھا۔ روشن لال خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔ ”اشیش بھگونت......“

”چپ رے حرام کے پلّے...... اپنی گندی زبان سے کس مہان آتما کا نام لے رہا ہے۔ جے بھگونتا...... اشیش بھگونت تو سنسار کا سب سے مہان روپ ہے اور تو دوغلے، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ دھوبی کا کتا۔ کالے دھرم کا کھاتا ہے اور دھرم ہی کی توہین کرتا ہے۔ تجھے اندازہ ہے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟“ ناگ چندر کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہونے لگیں اور پھر اُس کی آنکھوں سے خون جیسی کوئی سیال شے بہہ کر نیچے گرنے لگی...... اُس کے پاؤں بھیگتے جا رہے تھے۔ رجنی اور روشن لال ساکت کھڑے ہوئے تھے۔

”کتنی شکتی ہے رے تیرے اندر...... تو اس کا رکھوالا ہے۔ جانتا ہے اس نے اپنا دھرم بدل دیا ہے۔ یہ اپنا دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو گئی ہے، ملچھ ہو گئی ہے۔ تجھے پتہ نہیں ہے کہ ان لوگوں نے اشیش بھگونت کے خلاف ایک محاذ بنایا ہے۔ چل بلا اپنے مددگاروں کو...... دیکھتے ہیں ہم کون کیا کر سکتا ہے ہمارا۔“

روشن لال نے مدہم لہجے میں کہا۔ ”ناگ چندر، تجھے اس بات کا علم ہے کہ میرا تعلق براہِ راست اشیش بھگونت سے نہیں ہے۔ بلکہ میں بھوانی دیوی کا داس ہوں۔“

”ارے ایسی تیسی اوسری بھوانی کی...... ہمارے سامنے تو کالی بھی نہیں آتی، تو بھوانی کی بات کر رہا ہے؟“

”اب دیکھا جائے گا جو کچھ بھی ہوگا۔ میں مانتا ہوں کہ اشیش بھگونت کالوں میں سب سے بڑا ہے۔ لیکن کالے، کالے ہوتے ہیں۔ اس کے پاس دوسرے علم کی روشنی ہے تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”ارے اس کا تو میں بعد میں بگاڑ لوں گا جو کچھ بھی مجھے بگاڑنا ہوگا۔ تو اپنی خیر منا، تیرے مددگار کہاں ہیں؟“

”ٹھیک ہے، آؤ...... اے میرے مددگارو، آؤ۔ دیکھو یہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ دیکھو تم اس کے خلاف کیا کر سکتے ہو۔ مجھے تو ایک ذمہ داری دی گئی ہے جو مجھے پوری کرنی ہے۔ پر اسے دیکھو تم۔ آؤ...... آؤ......“ اس کی بھیانک آواز خوفناک سناٹے میں گونج رہی تھی۔ اور پھر رجنی نے جو کچھ دیکھا وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...... آسمان کی بلندیوں سے لمبے لمبے سیاہ رنگ کے پرندے نیچے اُتر رہے تھے۔ مگر یہ پرندے کہاں تھے؟...... یہ انسان بھی نہیں تھے۔ اُن کے قد دو دو فٹ سے زیادہ نہیں تھے۔ وہ پَر، جن سے وہ پرندے محسوس ہوتے تھے وہ پَر نہیں بلکہ اُن کے بازو تھے۔ اُن کے چہرے غیر انسانی ہی لگ رہے تھے۔ کالے سیاہ رنگ کے، کسی کے کان ہاتھیوں کے کان جیسے، کسی کی سونڈ لٹکی ہوئی، کسی کی زبان باہر نکلی ہوئی۔ وہ سب اُچھلتے کودتے زمین پر رقص کرنے لگے۔ اور پھر وہ روشن لال کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

”حکم اے مالک...... حکم دے۔“

”دیکھو...... اسے دیکھو۔ یہ میرا دشمن ہے، مجھے ختم کر دینا چاہتا ہے۔ تم اسے مار دو......“

وہ سب کے سب ناگ چندر کی طرف مُڑے۔ لیکن پھر اچانک ہی اُن کے حلق سے خوفزدہ آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ ایک دم ساکت ہو گئے اور پھر سارے کے سارے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے اور انہوں نے دونوں ہاتھ آگے رکھ لئے۔ رجنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کے دل کی دھڑکن بند ہونے کو ہے...... زبان خشک ہو گئی تھی اور ہر احساس دل سے فنا ہوتا جا رہا تھا۔ خوف کی انتہاء نے بدن پتھر کا بنا دیا تھا۔ کان سن سکتے تھے، دماغ بھی کام کر رہا تھا، کسی حد تک اُن کی آوازیں سمجھ میں آ رہی تھیں لیکن پورا وجود اس طرح ساکت ہو گیا تھا کہ اگر وہ کوشش بھی کرتی تو بدن کو جنبش نہ دے پاتی۔

”ہاں رے...... اب بول، اب کیا کہتا ہے تو روشن لال۔ کیا کریں تیرے ان بیروں کا، ختم کر دیں؟ بول، ختم کر دیں؟ چلو رے چلو...... سب ایک دوسرے کو ختم کر دو...... چلو ختم کر دو ایک دوسرے کو۔“ اور پھر ایک اور خوفناک منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ سب ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ کوئی کسی کی آنکھ پھوڑ رہا تھا، کوئی کسی کا ناک نوچ رہا تھا، کوئی کسی کے کان، کسی نے کسی کی گردن میں اپنے دانت گاڑ دیئے تھے۔ خون کے فوارے اُبلنے لگے تھے...... اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک عجیب و غریب جنگ شروع ہو گئی ہو۔ اس خوفناک جنگ کے جو کردار تھے وہ دیکھنے کے قابل نہیں تھے۔ بھیانک شکلیں ایک دوسرے کو ختم کرتی رہیں اور اُن کی لاشیں زمین پر گرتی رہیں...... ایک ایک کر کے سب مرتے جا رہے تھے اور اُن کی لاشیں زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ ادھر بے چارہ روشن لال خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر شدید دہشت کے آثار منجمد تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارے کے سارے ختم ہو گئے تو ناگ چندر نے کہا۔ ”ہاں اے کمینے...... اس بات پر اپنے دین دھرم سے راستہ بدلنے پر تیار ہو گیا تھا تو؟ بول، تجھے جو کچھ ملا ہے کیا وہ تیری اپنی کوششوں سے ملا ہے؟ اشیش بھگونت سے جھگڑا کرنے چلا تھا تو...... بول کتنی شکتی ہے تیرے اندر...... کتنی

شکتی ہے......؟"

"بڑھتے جارہے ہوتم لوگ.... بھگوان کوتم لوگوں نے تو جیسے بھلا ہی دیا ہے۔ کیا ہوگا تم لوگوں کا؟"

"کچھ نہیں...... سزا ملے گی تجھے...... سزا ملے گی تجھے۔" یہ کہہ کر ناگ چندر نے اپنے چھوٹے سے لباس میں ہاتھ ڈالا اور ایک گول سی بوتل نکالی۔ روشن لال جیسے بری طرح کپکپانے لگا تھا۔ اُس نے اچانک ہی پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن ناگ چندر نے اپنا ہاتھ بلند کر کے اچانک ہی اُس کے پیروں کی طرف رُخ کیا اور ایک لمبی سی زنجیر روشن لال کے پیروں میں آن پڑی...... اور اس کے بعد روشن لال کے ہاتھ بھی اس زنجیر سے بندھ گئے۔ وہ بری طرح چیخنے لگا تھا۔

"چھوڑ دے مجھے...... چھوڑ دے مجھے...... مجھے شما کر دے...... آئندہ کبھی بھول نہیں کروں گا...... کچھ نہیں کروں گا میں۔"

"بلا لے...... بلا لے اُنہیں...... بھوانی ماتا کو بلا لے۔ دیکھتے ہیں کیا بگاڑتی ہے وہ ہمارا...... بلا لے اُسے...... بلا لے......"

"نہیں...... چھوڑ دے مجھے...... چھوڑ دے۔"

"اب کیا چھوڑ دیں گے...... چل آ جا اس بوتل میں...... آ جا۔"

"معاف کر دے مجھے...... معاف کر دے۔" روشن لال بری طرح تڑپنے لگا لیکن اب وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں پا رہا تھا۔ اُس کے دونوں پاؤں جکڑے ہوئے تھے اور شاید وہ زمین پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ناگ چندر نے اُسے دیکھا، پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا اور پھر روشن لال کی طرف پھونک مار دی...... روشن لال کی کیفیت سے کچھ ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ شعلوں میں گھر گیا ہو۔ اُس نے بے اختیار چیخنا شروع کر دیا...... ایسی بھیانک چیخیں تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ اس کے بعد اُس کا بدن دُھواں اُگلنے لگا...... پہلے یہ دُھواں نارنجی رنگ کا تھا، اس کے بعد آہستہ آہستہ سفید رنگ کا ہو گیا...... بالکل یوں لگا کہ جیسے وہ جل کر راکھ ہو گیا ہو...... اُس کی آواز ہی بند ہو گئی تھی۔ پھر اچانک ہی ناگ چندر نے آگے بڑھ کر تھوڑی سی راکھ اُس شیشی میں ڈالی اور باقی راکھ کو نیچے منہ سے ہوا نکال کر اُڑا دیا...... ساری راکھ فضا میں بکھر گئی تھی۔ ادھر رجنی آنکھیں پھاڑے یہ تمام منظر دیکھ رہی تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا سارا وجود پتھر کا ہو گیا ہو۔ صرف آنکھیں کام کر رہی تھیں، باقی سب کچھ ایک انوکھا خواب سا تھا۔ ناگ چندر نے شیشی بند کی اور اپنے لباس میں ڈال لی۔ اب وہ خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا ہوا آنکھیں بند کئے ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہا تھا...... پھر اُس نے چاروں طرف پھونکیں ماریں اور رجنی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ہاں رجنی...... تیری تو شامت ہی آئی تھی جو بیچ میں آ گئی۔ ارے جھگڑا ہمارا اور ملا ایمان علی کا تھا۔ سسرے نے نہ جانے کیا سے کیا کر ڈالا ہے۔ ایک بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ چل تو ایک کام کر دے ہمارا، ہم تجھ سے سارے جھگڑے ختم کر دیں گے۔ اشیش بھگونت کو بھی منا لیں گے۔ اُس سے کہہ دیں گے کہ اشیش بھگونت، صرف ایک انسان کو ہماری وجہ سے معاف کر دے۔ کیا سمجھی؟ تو ہمیں یہ بتا دے پراسرار عورت کون ہے...... کون ہے وہ؟ کہاں رہتی ہے، کتنا گیان ہے اُس کا؟ تو، تو اب سب کچھ جانتی ہے۔ بتا دے ہمیں اُس کے بارے میں۔ تیری مہربانی ہوگی۔"

رجنی کے منہ سے تو آواز ہی نہیں نکل رہی تھی، وہ بھلا اشیش بھگونت کو پراسرار عورت کے بارے میں کیا بتاتی؟ اپنی جگہ پتھرائی کھڑی رہی۔ تب ناگ چندر نے کہا۔ "ایک بات کہیں تجھ سے...... دیکھ، ایمان علی نے اس پراسرار عورت کی مدد سے ہمیں تو اس سنسار سے دُور کر دیا۔ اب ہم اشیش بھگونت کے لئے کام کر رہے ہیں، ہمیں اشیش بھگونت کے لئے پراسرار عورت کی گردن چاہئے۔ سنسار میں تجھے ہر چیز دے دیں گے، پر تو یہ ہمارا کام کر دے۔ جو بھی تو مانگے گی تجھے دیا جائے گا۔ تو مسلمان ہو گئی نا؟ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم اشیش بھگونت سے کہہ دیں گے کہ سارے سنسار میں کروڑوں مسلمان بھرے ہوئے ہیں، ایک کا اضافہ ہو گیا تو اس کا کیا بگڑے گا؟ اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ اس دور میں ہر شخص صرف نام کا دھرم رکھتا ہے۔ کون دھرم سے کام رکھتا ہے؟ گنے چنے کچھ ہی لوگ ہوں گے جنہیں دھرم سے محبت ہے۔ ہندو ہو، مسلمان ہو، عیسائی ہو، کوئی بھی ہو، سب دھرم کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ ہر دھرم یہ کہتا ہے کہ منش کو، منش یعنی انسان کو انسان کی جان کا دشمن ہونا نہیں چاہئے۔ پر ہے...... ایسا ہے۔ لوگ دشمن ہیں ایک دوسرے کے۔ تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا یہ کام کر دے۔ اور اگر نہیں کرے گی تو تیرا ہی نقصان ہوگا۔"

رجنی نے کچھ بولنا چاہا، لیکن ہونٹ ہلتے رہ گئے۔ آواز حلق سے باہر نہیں آ سکی تھی۔ البتہ دل ہی دل میں اُس نے سوچا کہ کتے، اب جو کچھ بھی ہو گئی ہوں، تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں بھلا اب اپنے اس پیارے دین کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ میں ہزار بار مر جاؤں گی پر اپنے دین کو کسی طور نہیں چھوڑوں گی، چاہے کچھ بھی ہو جائے...... بہرحال، یہ ساری باتیں وہ سوچ رہی تھی لیکن منہ سے کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ البتہ اُسے افسوس تھا اس بات کا کہ بیچارے روشن لال کا صحیح معنوں میں کریا کرم ہو گیا۔ اُس کا عبرت ناک انجام بڑا ہی دُکھ دینے والا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، کالے جادو کا ماہر تھا یا ایک غلیظ انسان، لیکن رجنی کے ساتھ اُس نے بڑے ہی اچھے سلوک کا آغاز کیا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا؟ یہ رجنی نہیں جانتی تھی۔ لیکن بہرحال، اُس نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ رجنی کے لئے ہی کیا تھا۔ اسی وقت ناگ چندر آہستہ سے چلتا ہوا اُس کے قریب آیا اور بولا۔

"ہاں...... کیا سوچ رہی ہے تو؟ دیکھ، اس سے اچھی پیشکش اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی بھی وجہ یہ ہے کہ میں ہر قیمت پر ایمان علی کو اس سنسار سے دُور کرنا چاہتا ہوں۔ سارا سنسار تجھے مل جائے گا۔ مجھے اُس پراسرار عورت کے لئے تیرے ہی جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ تجھے ہمت بھی ملے گی، شکتی بھی ملے گی، اپنا کام بھی کر سکے گی۔ اب ایسا کر واپس جا۔ اور واپس جانے کے بعد ان لوگوں کو بتا کہ تیری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اور بس باقی کام تجھے کر ڈالنا ہے، سمجھ رہی ہے تو؟ بول، تیار ہے؟"

"لعنت ہے تجھ پر...... لعنت ہے۔" نجانے کس طرح رجنی کے منہ سے یہ آواز نکلی۔

"میں پھر پوچھ رہا ہوں کہ کیا کہنا چاہتی ہے؟ کیا تو یہ کام کرے گی؟"

"نہیں...... ہرگز نہیں۔" رجنی نے پختہ لہجے میں کہا۔

"پاگل کی بچی...... پاگل کی بچی، مان لے میری بات۔"

"دیکھو...... اب میں ٹھیک ہوں۔ یہ جو تماشہ ہو رہا ہے، مجھے اس سے ڈر نہیں ہے۔ تو جو کچھ بھی کر چاہتا ہے کر لے۔ میں تیری بات جھوٹ بول کر بھی نہیں مانوں گی۔ سمجھ رہا ہے نا تو؟ میں جھوٹے منہ بھی بات نہیں کہوں گی کہ تیرا یہ کام میں کر دُوں گی۔"

ناگ چندر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اُس نے خونی نگاہوں سے رجنی کو دیکھا اور پھر اچانک دونوں ہاتھ اُس نے زمین پر ٹکائے اور چوپایا بن گیا...... اور پھر اُس کی شکل بھیانک سے بھیانک تر ہو گئی۔ وہ ایک خونخوار بجو بن گیا...... بجو کی ناک کی جگہ لمبے لمبے دو سینگ نکلے ہوئے تھے۔ اُس نے یہ شکل اختیار کرنے کے بعد رجنی کو دیکھا اور دفعتہً ہی رجنی کے دماغ میں ایک آواز اُبھری۔ "ستارہ...... تو اس قدر خوفزدہ کیوں ہو گئی ہے؟ تجھے بھی تو شیطانی قوتیں حاصل ہیں، جہاں تک تیرے ایمان کا مسئلہ ہے اس کی پختگی تیرے الفاظ سے ظاہر ہو گئی ہے۔ لیکن میں نے تجھے یہ اجازت بھی تو دی تھی کہ شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر تو اپنا ایمان ختم کئے بغیر اپنی اس طاقت کو استعمال کر سکتی ہے تو ضرور کر جو تجھے حاصل ہوئی تھی۔" یہ آواز انا زبیدہ کی تھی جو رجنی کے دماغ میں گونجی تھی۔ اُسے ایک دم خیال آیا اور دوسرے لمحے اُس کا پورا بدن اس سحر سے آزاد ہو گیا۔ ناگ چندر اُس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ دفعتہً ہی رجنی نے بل کھایا اور ایک لمحے کے اندر اندر اُس نے بھی ایک خونخوار درندے کی شکل اختیار کر لی...... چنانچہ یہ شکل اختیار کرتے ہی اُس نے غرا کر ناگ چندر پر چھلانگ لگائی اور ناگ چندر جو اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُس پر جھپٹنے ہی والا تھا، اپنے ہاتھوں کو روک کر اُس کو دیکھنے لگا۔

رجنی نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور ناگ چندر کی ٹانگ اپنے دانتوں میں لے لی...... ناگ چندر نے قلابازی کھائی اور دوسرے لمحے وہ ایک دُھوئیں کی شکل اختیار کر گیا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو رجنی اُس کی ٹانگ چبا ڈالتی۔ ناگ چندر دُھوئیں کی شکل اختیار کرتے ہی فضا میں بلند ہوا اور پھر بلند ہی ہوتا چلا گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا...... وہ خوفزدہ ہو کر بھاگا تھا۔ رجنی چند لمحوں تک اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتی رہی اور اس کے بعد اُس نے اپنی اصلی شکل اختیار کر لی۔ اُس کے اندر ایک اعتماد پیدا ہو گیا تھا اور خود اعتمادی کے انداز میں وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ درحقیقت اُس نے ناگ چندر کو اُس کے عمل میں پوری کامیابی کے ساتھ ناکام بنا دیا تھا۔ بہر حال پھر اس کے بعد وہاں رُکنا بے مقصد سا تھا۔

روشن لال بے چارے کا البتہ جو حشر ہو گیا تھا اس کے لئے رجنی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے؟ وہ چلتی رہی۔ اور پھر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک آبادی نظر آئی۔ وہ اُس آبادی کی جانب چل پڑی۔ کافی وقت گزر چکا تھا، لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور رجنی اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اُسے کیا کرنا چاہئے؟ پتہ نہیں وہ کون سے عمل تھے جو اُسے پورے کرنے تھے اور اس کے بعد اُسے زندگی کا یہ لطف حاصل ہوتا؟ بہر حال، کافی دیر تک وہ ایک جگہ بیٹھی رہی، اور کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے بھی چل پڑی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے؟ روشن لال کے پاس جس کام سے بھیجا گیا تھا وہ تو نہیں

ہو سکا تھا، البتہ روشن لال، ناگ چندر کا شکار ہو گیا تھا اور رجنی سوچ رہی تھی کہ اب اُسے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ پر ہی بھروسہ کرنا پڑے گا۔ یا پھر کچھ اور ہو گا۔ بہر حال، ایک نوجوان اور حسین لڑکی کا یہ تنہا سفر بہت سے معاملات میں خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن رجنی کو کم از کم اس بات پر اعتماد تھا کہ اگر کوئی بری صورت نظر آئی تو پھر دیکھوں گی کہ کیا، کیا جا سکتا ہے؟ بہر حال، وہ چلتی رہی۔ اور پھر کافی فاصلے طے کر لیا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ دُور دُور تک جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ تھوڑے فاصلے پر آبادیاں نظر آ رہی ہوں۔ اور پھر اُس کا یہ اندازہ درست ہوا...... مدہم مدہم روشنیاں جل رہی تھیں، کوئی چھوٹی سی آبادی تھی۔ وہاں رہنے والے سو چکے تھے۔ دُور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کافی فاصلے پر کہیں گیدڑ بھی رو رہے تھے۔ یہ آوازیں بھی کبھی کبھی بالکل انسانی آوازیں لگنے لگتی تھیں۔ رجنی ایک بڑی سی جھاڑی کے قریب پہنچ گئی۔ اچانک ہی اُسے احساس ہوا کہ اُس کے قرب و جوار میں کوئی ہے...... وہ چونک کر سنبھل گئی۔ بہر حال اس بات کا اندازہ اُسے تھا کہ ناگ چندر خوفزدہ ہو کر بھاگ تو گیا ہے لیکن وہ آسانی سے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اچانک ہی اُس نے محسوس کیا کہ یہ آوازیں بالکل ہی قریب سے آ رہی ہیں۔ اور پھر ایک خونخوار کالے رنگ کا چیتا ایک جھاڑی کی آڑ سے نکل آیا...... اُس کی آنکھیں آگ کی طرح روشن تھیں، جسامت بہت بڑی تھیں...... سرخ آنکھیں خون میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اُس کا منہ کھلا ہوا تھا اور زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔

پھر اچانک ہی اُس نے دونوں پاؤں زمین پر ٹکائے اور رجنی کو لگا کہ جیسے وہ ایک لمحے کے اندر اُس پر چھلانگ لگانا چاہتا ہو...... یہ بڑی خوفناک صورت حال تھی۔ اگر کوئی چھوٹا جانور ہوتا تو رجنی اُس سے مقابلے کے لئے اس سے بڑی کیفیت اختیار کرتی۔ لیکن اس وقت اُس کی دماغی کیفیت ایک دم خراب ہو گئی۔ اُس کے آگے بڑھنے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ خوف کے مارے اُس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ اُس نے مڑ کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ اچانک ہی چیتے نے حلق سے ایک خوفناک دھاڑ نکالی اور اگلے دونوں پنجے دبا کر رجنی پر چھلانگ لگا دی...... رجنی کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور اُسے یقین ہو گیا کہ اب چند لمحوں کے بعد اُس کے بدن کے چیتھڑے زمین پر پڑے ہوں گے، اور اُس کی گردن چیتے کے جبڑوں میں نظر آئے گی...... اس کے بعد تو شاید وہ دوسری سانس بھی نہ لے سکے۔ اُسے اپنے اوپر چیتے کی سنسناہٹ محسوس ہوئی لیکن صرف ہوا کی مانند۔ وہ ایک لمبی چھلانگ لگا کر اُس کے اوپر سے گزر گیا تھا...... شاید چھلانگ لگانے میں غلطی ہو گئی تھی۔ لیکن اُس نے اس چیتے کے گرنے کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ وہ ایک دم خوف سے پلٹی، اسے بچاؤ کی کوشش بھی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن پیچھے کچھ بھی نہیں تھا...... رجنی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ دُور دُور تک نگاہیں دوڑانے لگی مگر کوئی شے متحرک نظر نہیں آئی۔ دُور دُور تک وہی خاموشی طاری تھی۔ اچانک ہی رجنی کو پھر یہ احساس ہوا کہ صورتحال بہت زیادہ سنگین نہیں ہے۔ ناگ چندر کتنا ہی طاقتور سہی، وہ اُس کا راستہ نہیں کاٹ سکتا۔ اُس کے دانت بھنچ گئے اور دماغ میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ پروں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں سنائی دیں...... ایک بڑی جھاڑی کے پیچھے سے بڑے بڑے لمبی گردن والے پرندے نکل آئے تھے۔ وہ

انتہائی خوفناک لگ رہے تھے...... اُن کی گردنیں ہل رہی تھیں اور اُنہوں نے اپنے پَر چادر کی طر پھیلائے ہوئے تھے...... آسمان پر کھلے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں وہ بے حد بھیانک لگ رہے تھے اُن کی تعداد بھی کافی تھی اور وہ اس طرح قطار میں پھیل گئے تھے کہ دُور دُور تک کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ گویا وہ اُسے آگے بڑھنے سے روکنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے رجنی کی جانب بڑھنا شروع کر دیا تھا......

ایسا لگ رہا تھا کہ بہت سے لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی کے گرد گھیرا ڈال رہے ہوں...... رجنی کچھ لمحے تک سوچتی رہی۔ پھر اُس کے حلق سے ایک وحشیانہ آواز نکلی اور وہ خود اُن کی طرف دوڑ پڑی۔ خوف اور جوش میں ڈوبی ہوئی اپنی آواز اُسے خود بے حد بھیانک لگی تھی۔ وہ خوفناک پرندے ایک دم آگے بڑھنے سے رُک گئے اور پھر اُن میں ابتری پھیل گئی۔ اور پھر وہ اپنے پیروں پر اُچھلنے لگے اس طرح اُچھلتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ جونہی رجنی ایک پرندے کے پاس پہنچی تو اُس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور پَر دبائے فضا میں پرواز کر گیا۔ یہ دوسروں کے لئے ہدایت تھی۔ کیونکہ اُس کے اُڑتے ہی دوسرے پرندوں نے بھی زمین چھوڑ دی تھی۔ اور اس کے بعد وہ پرواز کرتے ہوئے نجانے کس سمت چلے گئے؟ خوف سے رجنی کے بھی پورے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن بدن میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی فضا میں بلند ہو کر ان پرندوں کو پکڑے اور اُن کی ٹانگیں چیر کر پھینک دے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے؟

وہ آگے بڑھنے لگی۔ اب اُس کے چاروں طرف خوفناک جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ اور جونہی وہ ایک قدم آگے بڑھاتی، یہ جھاڑیاں اس طرح ہلتیں جیسے اُن کے درمیان بہت سے افراد چھپے ہوئے ہوں.... تب رجنی نے حلق سے دھاڑ نکالتے ہوئے کہا۔

"ناگ چندر...... اور کوشش کر۔ تو جتنی کوششیں کر رہا ہے، میرے حوصلے اتنے ہی بڑھ رہے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں تو مجھے کس طرح خوفزدہ کر سکتا ہے؟"

رجنی کی یہ آواز فضا میں گونجتی رہ گئی۔ کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ چنانچہ اب اُس کے حوصلے اور بڑھ گئے اور وہ ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگی۔ بستی کے چراغ اب بھی اتنی ہی دُور نظر آ رہے تھے جتنے پہلے۔ البتہ ایک عمارت اُس کی نگاہوں میں واضح ہوتی جا رہی تھی جو خاصی روشنیوں میں جگمگا رہی تھی۔ اُس نے ایک گزرتے ہوئے شخص سے پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"پتہ نہیں......" اُس نے بگڑتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"کیا معلوم کرنا چاہتی ہو بی بی؟" ایک دوسرے آدمی نے کہا۔

"میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ یہ کون سی جگہ ہے؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟"

"معلوم ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتی؟"

"اگر تمہیں معلوم نہ تھا تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ حیران ہو گئی۔ کس طرح کے لوگ ہیں یہ؟ اُس نے سوچا اور پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ عجیب پراسرار ماحول تھا۔

"کیا تلاش کر رہی ہو؟" کسی اور شخص نے پوچھا۔

"سکون۔" رجنی نے کہا۔

"وہاں بکتا ہے۔" اُس شخص نے ایک طرف اشارہ کیا اور رجنی نے اُس سمت دیکھا۔ وہاں بھی روشنی ہو رہی تھی۔

"میں وہاں جا سکتی ہوں؟" رجنی نے کہا۔

"مجھ سے پوچھ کر اس دنیا میں آئی تھی جواب پوچھ رہی ہو؟" اُس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

رجنی نے ایک گہری سانس لی اور سوچا، یہ کیا معاملہ ہے......؟

۞۞۞

تھوڑا سا وقت ذرا ہوشیاری سے گزارنا پڑا۔ رائے گرودت کی اس حویلی میں اس میں کوئی شک نہیں کہ اُسے ایک بڑا مقام حاصل ہو چکا تھا۔ اصل میں بات وہی ہوتی ہے، کسی پر پہلا اثر پڑ جائے، بس اس کے بعد سارے کام بن جاتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ وہ اس قدر دنیا ساز ہو چکی تھی اور اُسے ہر معاملے میں اتنی معلومات حاصل ہو چکی تھیں کہ اُس کے لئے کوئی مسئلہ، مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ایک خاص ملازم سے جو روپا کی سیوا کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا، روپا نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"رامو، مہارانی۔"

"پورا نام رامو مہارانی ہے؟"

"نہیں دیوی جی...... مہارانی تو ہم آپ کو کہہ رہے ہیں۔ ہمارا نام صرف رامو ہے۔"

"اچھا رامو، ایک بات بتاؤ۔"

"کیا مہاراج؟"

"رائے گرودت کا کوئی بیٹا نہیں ہے؟"

"بیٹا......؟ آپ کہہ سکتی ہیں دیوی۔"

"کیا مطلب؟"

"اُس کا نام ہیرا لال ہے۔"

"کس کا؟"

"بس ہم آپ کو اس کے بارے میں صحیح نہیں بتا سکتے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ بیٹا تو وہ رائے گرودت کا ہی ہے پر رائے صاحب اُس سے خوش نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ سرسوتی دیوی کا سوتیلا بیٹا ہے اور سرسوتی دیوی رائے صاحب کی دوسری بیوی ہیں۔"

"اوہو...... پہلی بیوی کہاں گئی؟"

"وہ مر گئی تھی۔"

"تو ہیرا لال اُس کا بیٹا تھا؟"

"ہاں دیوی، اکیلا۔"

"لیکن اُس کے خلاف ایسے خیالات کیوں ہیں؟"

"اس لئے کہ وہ بڑا سرکش ہے۔"

"سوتیلی ماں کا سلوک بھی اُس کے ساتھ اچھا نہیں ہوگا؟" روپا نے پوچھا۔

"سرسوتی دیوی بہت اچھی عورت ہیں۔"

"اور ہیرا لال؟"

"وہ من موجی ہے۔ اور مہاراج اس کی اجازت نہیں دیتے۔"

"باپ بیٹے کے درمیان خاصی گڑبڑ چل رہی ہوگی؟"

"بات گڑبڑ سے بھی آگے کی ہے دیوی۔" رامو نے جھجکتی ہوئی آواز میں کہا۔ روپا کو اس سارے معاملے سے بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ باتیں اُس کے لئے بڑی دلچسپ تھیں۔ اُس نے رامو سے کہا۔

"رامو، میں تمہیں بہت زیادہ انعام دُوں گی۔ مجھے ذرا اس بارے میں پوری تفصیل بتاؤ۔"

"دیوی جی، ہیرا لال مہاراج برائی کی حد میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ سنا ہے اب وہ کبھی کبھی ڈاکے بھی ڈال لیتے ہیں۔"

"اوہو...... کیا باقاعدہ؟"

"ہاں دیوی جی، باقاعدہ۔ کئی بار مہاراج گرودت کے پاس اُن کی شکایتیں آ چکی ہیں۔ وہ تو آپ بس سمجھ لیجئے کہ مہاراج کے تعلقات سرکاری حکام سے بڑے اچھے ہیں۔ ورنہ اب تک حویلی پر چھاپہ پڑ چکا ہوتا۔"

بہرحال، روپا کو یہ ساری معلومات بڑی پسند آئی تھیں۔ یہ گھر اُس کی ضرورت کے مطابق تھا۔ یہاں سب کے ساتھ برا عمل کر سکتی تھی۔ اور شیطان یہی تو چاہتا تھا کہ انسانوں کے سکون میں خلل اندازی کی جائے، انہیں بے سکون کر دیا جائے۔ اب اس حویلی میں اچھے لوگ آباد تھے، جو کسی کے ساتھ اچھا سلوک کر سکتے تھے۔ پھر بھلا اس کی کیا گنجائش تھی کہ وہ لوگ سکون سے زندگی بسر کر سکیں؟ انہیں نقصان سے دوچار ہونا چاہئے۔ لیکن کام آہستہ آہستہ ہی ہو سکتا ہے۔ پہلے ذرا یہاں کی صورت حال کا جائزہ لے لیا جائے، اس کے بعد دیکھنا تھا کہ آگے کیا، کیا جا سکتا ہے؟

دوسری صبح ایک خوبصورت سی لڑکی اُس کے پاس آئی اور اُسے جگا دیا۔

"کیا بات ہے؟"

"اشنان کر لیں دیوی جی۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کے اس کمرے کے پیچھے تالاب ہے۔ آپ وہاں نہا لیجئے۔"

"دوسرے بھی وہاں نہاتے ہیں؟" روپا نے پوچھا۔

"نہیں، وہ صرف آپ کے لئے ہے۔ اور یہ بتایئے صبح کا بھوجن کتنی دیر میں کریں گی؟"

"جب دوسرے کرتے ہیں۔" روپا نے کہا۔

"تو پھر آپ جلدی سے اشنان کر لیجئے، میں آپ کے کپڑے نکالے دیتی ہوں۔ یہ پیچھے کا دروازہ سیدھا تالاب کی طرف جاتا ہے۔ میں یہاں موجود ہوں، ناشتے پر آپ کا انتظار کیا جائے گا۔"

روپا نے گردن ہلا دی۔ تب داسی باہر نکل گئی اور روپا پچھلے دروازے سے تالاب پر پہنچی۔ لباس اُتار اور پانی میں گھس گئی۔ ٹھنڈا پانی بدن میں گدگدیاں کر رہا تھا۔ وہ دیر تک نہاتی رہی اور اس کے بعد باہر نکل آئی۔ داسی کپڑے لئے تیار موجود تھی۔ بہت ہی خوبصورت لباس تھا جسے پہننے کے بعد روپا بہت سندر لگنے لگی۔ پھر وہ اُسی داسی کے ساتھ ناشتے کے کمرے میں پہنچ گئی۔ کمرے میں سب نے اُس کا بڑے احترام سے استقبال کیا۔ رائے گرودت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سچ مچ یوں لگتا ہے جیسے دیوی ہمارے گھر میں اُتر آئی ہو۔"

سرسوتی نے بھی مسکراتی ہوئی نگاہوں سے روپا کو دیکھا اور اس کے بعد بیٹیوں نے بھی۔

کھانے سے فراغت حاصل ہو گئی تو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا۔ "روپا جی، پتا جی تو آپ کو دیوی بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری دوست بن جائیں۔"

"میں تمہاری دوست تو ہوں۔ اور بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"تھوڑی دیر کے لئے ہم آپ کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔"

لڑکیاں باہر نکل گئیں تو رائے گرودت نے کہا۔ "دیوی جی، بات صرف اتنی سی ہے کہ انسان اندر سے بڑا کمزور ہوتا ہے۔ اور یہی کمزوری اسے مطلبی بھی بنا دیتی ہے۔ بھگوان کی سوگند، ہم من سے تمہاری عزت کرتے ہیں۔ لیکن ہم تمہیں بلاوجہ ہی یہاں نہیں لائے۔ بلکہ ہم نے تمہارا گیان دھیان دیکھا تو من میں یہ آشا اُبھری کہ جس طرح بھی ہو سکے تمہیں اپنے کام کے لئے مجبور کیا جائے اور تم سے مدد مانگی جائے۔"

روپا نے نگاہیں اُٹھا کر گرودت کو دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ اور اس کے بعد ظاہر ہے جو معلومات اُسے حاصل ہو چکی تھیں وہی گرودت کا مسئلہ تھیں۔ اُس نے کہا۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں مہاراج؟"

"دیوی، تو خود سوچ لے کہ ہم تجھ سے کیا چاہتے ہیں...... تیرا یہی گیان تو ہمارا دھرم ہے۔"

روپا نے ہمت کی اور گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ہوں... تو تم اپنے بیٹے کے لئے پریشان ہو۔"

سرسوتی اور گرودت دونوں نے ہاتھ جوڑے اور گردن جھکا کر کہا۔ "ہے دیوی...... تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔"

"اور اُس کا نام ہیرالال ہے؟" روپا کی اس غیب دانی نے اُن دونوں کو شدید حیران کر دیا تھا۔

گرودت نے کہا۔ "حالانکہ ہم نے دیوی کو یہ بتایا تھا کہ ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔"

"سرسوتی دیوی جی، وہ تمہارا سوتیلا بیٹا ہے؟"

"ہاں دیوی، یہی میری بدنصیبی ہے۔"

"حالانکہ تم نے کبھی اُس کے ساتھ سوتیلا پن نہیں کیا۔ لیکن وہ تمہیں قبول نہیں کرتا۔"

"ہاں، یہی بات ہے دیوی جی۔" اس بار گرودت نے کہا۔ "وہ ہمارے لئے ہمارے من کا روگ بن

گیا ہے۔ دیوی، ہم کیا کہیں تم سے؟ یہ بھگوان کی دین ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں تم اتنی گیانی ہو، ہماری پریشانی دُور کر دو بیٹی۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے۔"

روپا نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پوری پوری اداکاری کرنا ضروری تھی۔ کچھ لمحے کے بعد اُس نے کہا۔ "مگر ہیرالال نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ اچھا نہیں ہے گرو جی۔"

"دیوی، تم سے کون سی بات چھپی ہے؟"

"پھر اب تم مجھے بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں دیوی کہ وہ سیدھے راستے پر آ جائے۔"

"اُس نے تم سے کوئی خواہش ظاہر کی ہے؟"

"ہاں......"

"کیا چاہتا ہے وہ؟"

"دیوی، میرے مرنے کے بعد میرا وارث وہی تھا۔ لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں، وہ اپنے گھر چلی جائیں گی۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اُسی کا تو ہے۔ لیکن اُس کا خیال ہے کہ سوتیلا ہونے کی وجہ سے میں اس سے اُس کا حق چھین لوں گا اور اپنی بیٹیوں کو دے دُوں گا۔ میں نے اُس پاگل کو بہت سمجھایا کہ بیٹا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن سو دوست سو دشمن، کسی نے اُس کے من میں یہ بات بٹھا دی کہ میں اُس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکوں گا اور اُس کی سوتیلی ماں کوئی چکر چلا کر ساری جائیداد خود ہڑپ کر لے گی۔"

سرسوتی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر اُس نے کہا۔ "میں کیا کروں گی اس جائیداد کا؟ بھاڑ میں جائے سب کچھ۔"

"ہمیں من کا چین مل جائے دیوی، تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں میں۔ تم میرے لئے کچھ کرو۔ وہ ایک ڈاکو کے نام سے مشہور ہو چکا ہے۔ میں بڑا پریشان ہوں۔ کہیں کسی مشکل میں پڑ گیا تو کیا ہو گا؟"

"وہ یہاں آتا ہے؟"

"ہاں...... کبھی کبھی آتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ میں دیکھوں گی کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔" روپا نے کہا اور ان دونوں میاں بیوی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

پورا دن ہی بڑا شاندار گزرا تھا۔ روپا کو یہاں رانیوں کا سا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور وہ یہ بات جانتی تھی کہ وہ لوگ وہی کریں گے جو اُس کے دل میں ہے۔ اور روپا اس جگہ اپنے بہت سے شکار پا رہی تھی......!

❁

رجنی آگے بڑھتی رہی۔ پھر اُس نے بہت سے انسانی سائے دیکھے۔ کسی بزرگ کا مزار تھا۔ اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ ایک شخص نظر آیا جو زمین پر بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا۔ بڑی سی سفید داڑھی تھی، عمر بھی بہت زیادہ تھی۔ رجنی اُس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ پھر جب اُس نے سلام پھیر کر جائے نماز اُٹھا دی تو رجنی نے کہا۔ "بابا صاحب، میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"کس حساب میں؟" بوڑھے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"جی...... وہ دو باتیں ہیں۔"

"مسلمان ہو تو پہلے سلام کرو۔ تم نے سلامتی بھیجی تو سامنے والے پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ورنہ وہی سوال کہ کس حساب میں؟"

"آئندہ خیال رکھوں گی۔"

"تو آئندہ بات کرنا۔"

"نہیں...... میرا مطلب ہے السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ کیا بات ہے؟"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"مزار شریف ہے اللہ کے ایک نیک بندے کا۔"

"میں وہاں جا سکتی ہوں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بی بی، محنت کرو۔ اس کے بعد پھل ملتا ہے، درخت اُگائے جاتے ہیں، خود بخود نہیں اُگ آتے۔"

"لیکن میں کیا کروں؟"

"پہلے اپنا حلیہ بدلو، مقابلہ حسن میں حصہ لینے نہیں جا رہی۔ عورت ہو، موٹے کپڑوں سے اپنا بدن چھپاؤ ورنہ لوگ بھٹک جائیں گے۔"

"میں ایسا کرلوں گی۔"

"اس کے بعد پانچ دن اور راتوں کا سفر کرو۔ پہلی منزل پر پہنچو گی، وہیں سے آغاز ہوگا۔"

"پہلی منزل؟"

"ہاں۔"

"وہ کیا ہوگی؟"

اس سوال پر بزرگ کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے۔ اُنہوں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "خرید سمجھ رکھا ہے کیا؟ یا موکل ہوں میں تیرا کہ تیرے ہر سوال کا جواب دیتا رہوں۔ چل جا، دفع ہو یہاں سے۔ یہ کیا ہے، وہ کیا ہے، ایسا کیوں ہے، ویسا کیوں ہے۔ ارے میں کوئی تیرے باپ کا نوکر ہوں۔ منزل کیا ہوگی، فلاں کیا ہوگا، جتنا بتا دیا اتنا کافی ہے۔ بے وقوف کہیں کی۔" بزرگ آگے بڑھ گئے۔ رجنی شرمندہ سی اپنی جگہ کھڑی اُنہیں دیکھتی رہی۔ کچھ فاصلے پر جا کر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو رجنی نے ایک گہری سانس لی اور پھر خود ہی ہنس پڑی۔

"ٹھیک تو کہہ رہے تھے وہ۔ اتنی رہنمائی کر دی گئی ہے، کافی نہیں ہے کیا؟ ساری باتیں کھول کھول کر کیسے بیان کر سکتے ہیں؟ خود غلطی میری ہی تھی۔ لیکن مشورہ اُنہوں نے بالکل ٹھیک دیا ہے۔" جس لباس

میں رجنی تھی، اس میں اُس کی مکمل شخصیت نظر آ رہی تھی اور بہر حال یہ غلط تھا۔ کیونکہ عیش کی زندگی گزارنے سے جسمانی نقوش بہت اچھے ہو گئے تھے اور لاکھ موٹے کپڑے سہی لیکن انہیں چھپانا مشکل تھا۔ اب پہلی بار اُسے احساس ہوا تھا کہ بزرگ نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل سچ کہا تھا۔ لیکن ایسے لباس میں کہاں سے لاؤں؟ یہ مشکل بھی دوسرے دن حل ہو گئی۔ یہاں کچھ ایسی جوگنیں پھر رہی تھیں جو لمبی لمبی عبائیں پہنے ہوئے تھیں۔ ان میں بیشتر عبائیں چیتھڑوں کی شکل میں تھیں۔ ایک عورت کو اُس نے روکا جو ایسی ہی ایک عبا پہنے ہوئے تھی۔

"میرے یہ کپڑے لو گی؟" اُس نے سوال کیا اور عورت بھوکی نگاہوں سے ان کپڑوں کو دیکھنے لگی۔

"اللہ تیرا بھلا کرے بی بی۔ دے دے اللہ کے نام پر۔"

"بھکارن تو میں بھی ہوں۔"

"پھر مجھ پر یہ احسان کیوں جتا رہی ہے؟"

"مال کے بدلے مال۔"

"کیا مطلب؟"

"تم اپنے کپڑے مجھے دے دو اور میرے لے لو۔"

"مذاق کر رہی ہے۔ یہ پھٹے پرانے کپڑے تیرے کس کام آئیں گے؟"

"بس کسی بھی کام آئیں، بولو، بدلو گی؟"

"اگر مذاق نہیں کر رہی ہے تو بدل لے۔"

اور پھر ایک سنسان جگہ دونوں کے لباس تبدیل ہو گئے۔ بھکارن عورت رجنی کے کپڑے لے کر اس طرح بھاگی کہ اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اور رجنی سوچ رہی تھی کہ یہ پاگل عورت کہیں ہوش میں نہ آ جائے۔

بہر حال، رجنی نے یہ موٹی عبا پہن لی۔ بڑا بوجھ لگی تھی یہ اُسے اپنے جسم پر۔ لیکن سر پر ایک کپڑا باندھ کر اور چہرے پر تھوڑی سی مٹی تھوپ کر، بال لٹکا کر وہ سچ مچ ایک جوگن بن گئی تھی۔ پانی کے ایک جوہڑ میں ہی اُس نے اپنی شکل دیکھی اور خوب ہنسی۔

"واہ ستارہ بی بی...... اب تم سچ مچ ایک چمکدار ستارہ بن چکی ہو۔" اُس نے دل میں سوچا۔ لیکن پھر اُسے اس خوف نے پریشان کر دیا کہ وہ کارنامے کیسے سرانجام دے گی جس کے بعد اُسے زندگی کی خوشیاں حاصل ہوں گی؟ آہ، بڑا مشکل امتحان تھا۔ لیکن میں اس امتحان سے گزروں گی۔ پتا جی کی موت کے بعد جو زندگی گزاری ہے وہ اتنی بدنما ہے کہ خود اس کے بارے میں سوچتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اور پھر ایک چہرہ، ایک نشان، ایک نام جو ساحل کی حیثیت رکھتا ہے، درحقیقت وہی اس کا کنارہ تھا۔ اور جب بھی وہ اُس کے بارے میں سوچتی اُس کے دل میں ایک ٹھیس سی اُٹھتی۔ کیا سچ مچ میرا کنارہ مجھے مل سکے گا؟ مزار شریف پر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی، لیکن بٹنے والا لنگر اُسے بھی ملا۔ اور اب تو وہ بالکل ایک جوگن، ایک فقیر بن چکی تھی۔ چنانچہ کئی جگہ اُسے بی بی صاحبہ یا مائی کہہ کر پکارا گیا اور اُس نے اس نام کو قبول کر لیا۔

پھر وہ وہاں سے چل پڑی اور انتہائی طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد اُس نے دیکھا تو وہ مناظر

نگاہوں سے گم ہو چکے تھے۔ وہ چل رہی تھی پہلی منزل کی تلاش میں۔ پاؤں جواب دیتے جا رہے تھے، جسمانی قوتیں ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ لیکن بزرگ کے کہنے کے مطابق وہاں جانا ضروری تھا۔ پانچ دن کے سفر کو پہلی منزل کہا گیا تھا۔ اور اُسے اس پہلی منزل کی تلاش تھی۔ لیکن منزل کا کہیں نام ونشان نہیں تھا...... نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ پھر اُس نے ایک جگہ رُک کر ہراساں نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ نجانے کہاں سے کہاں نکل آئی ہوں میں...... پتہ نہیں مجھے کوئی راستہ ملے گا یا نہیں؟...... اُس نے کسی ایسے بلند ٹیلے کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں جہاں چڑھ کر وہ دُور دُور تک کا جائزہ لے سکے۔ کافی فاصلے پر ایک پہاڑی ٹیلہ نظر آیا تو وہ اُس کی جانب بڑھ گئی۔ اس پہاڑی ٹیلے پر بھی چڑھنا مشکل ثابت ہوا۔ تھوڑا پتھر کا پہاڑ تھا، کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نظر آ جاتے تھے۔ اگر کٹاؤ نہ ہوتے تو پاؤں جمانا بھی مشکل ہو جاتا۔ ٹیلہ کافی بلند تھا، دُور سے اتنا احساس نہیں ہوتا تھا، لیکن آخر کار کسی نہ کسی طرح بلندی تک پہنچ گئی۔ توازن سنبھالا اور دُور دُور تک دیکھنے لگی۔ اور اس کے بعد اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ نگاہ کی حد تک اور آسمان کی بلندیوں تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ ہوتا ہے کہ اگر کہیں روشنیاں ہو رہی ہوتی ہیں تو وہاں آسمان پر ایک سفیدی سی آ جاتی ہے جو اُن روشنیوں کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن یہاں تو جدھر نظر اُٹھتی، آسمان سیاہ نظر آتا۔ کیا کالی تقدیر ہے، منزلیں تو قدموں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں میری منزل کہاں ہے؟...... وہ پہاڑی ٹیلے پر بیٹھ گئی۔ بہت دیر تک بیٹھی رہی، پھر نیچے اُترنے لگی اور نیچے اُتر کر ایک پہاڑی ٹیلے کے دامن میں بیٹھ گئی۔ اُس نے سوچا کہ اب دن کی روشنی میں پھر کوشش کرے گی۔ اب تو رات ہو چکی ہے۔

بہر حال، وہیں ساری رات گزاری۔ ایک نوجوان اور تنہا لڑکی اور اس طرح لق و دق جنگل میں آسان بات نہیں تھی۔ لیکن جو ماضی تھا وہ اس بات کا احساس دلاتا تھا کہ مشکلوں کو آسان کرنا کس طرح ممکن ہے۔

دن کی روشنی پھوٹنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگی۔ رات گزر گئی۔ پھر سورج نے پہاڑی سے جھانکا اور اس کے بعد فضا میں اُٹھتا چلا گیا۔ رجنی سوچ رہی تھی کہ اب اس ویرانے کا سفر زندگی کے لئے وبال بن جائے گا۔ پانی نہ خوراک۔ دل تھا کہ سینے کا خول توڑ کر باہر نکل آنا چاہتا تھا۔ لیکن اپنی کیفیتوں کو خود ہی سنبھالنا پڑتا تھا۔ چنانچہ وہ وہاں سے چل پڑی۔ سر چکرا رہا تھا، آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ جب تک ہمت ساتھ دیتی رہی، چلتی رہی۔ پھر زور کا چکر آیا اور سر پکڑ کر جہاں تھی وہیں بیٹھ گئی۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ تاریکی پورے وجود پر مسلط ہو گئی...... اسے شاید بے ہوشی کا نام دیا جاتا ہے۔

بے ہوشی بھی ہوش میں آنے کے لئے ہوتی ہے۔ اور جب ہوش آیا تو سینے پر کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سی چبھن بھی ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں کیا تھا؟...... پھر اچانک شانے میں جیسے کسی نے خنجر اُتار دیا۔ سینے پر دباؤ زیادہ ہوا۔ بازو کی تکلیف سے آنکھیں کھل گئیں تو اُس نے ایک انتہائی خوفناک چہرہ اپنی آنکھوں کے بالکل قریب دیکھا...... مُڑی ہوئی تیز چونچ، مکروہ اور بدنما گردن...... پھیپھڑوں کی پوری

...ن سے ایک چیخ نکلی اور اس کے بعد وہ چیخنے کی مشین بن گئی۔ لیکن یہ چیخیں اُس کی زندگی کی ضامن بن ...تھیں۔ پتہ نہیں منحوس پرندہ اس کے بعد جسم کے کون سے حصے پر حملہ کرنے والا تھا؟ وہ خوفزدہ ہو کر اُڑ گیا۔ ...سینے پر دباؤ پڑا اور پھر ختم ہو گیا۔ ایک انتہائی ہولناک صورت والا پرانی عمر کا گدھ تھا جو رجنی کے سینے پر بیٹھ ...کر غالباً سوچ رہا تھا کہ جسم کے کون سے حصے سے ابتداء کی جائے؟ اور اُس نے اپنی مُڑی ہوئی تیز چونچ رجنی کے بازو میں چبھوئی تھی اور بازو ادھیڑ دیا تھا۔ زخم سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا اور رجنی بری طرح ...نے لگی تھی۔ گدھ کافی اُونچا اُڑ گیا تھا اور پھر اُس نے اپنے چھتری جیسے پر پھیلائے اور صرف چند قدم کے فاصلے پر جا بیٹھا۔ اُس کی بھوکی نگاہیں رجنی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ادھر بازو کی تکلیف سے رجنی کی جان نکلی جا رہی تھی اور اُس کے حلق سے چیخیں اس انداز سے نکل رہی تھیں کہ جیسے کوئی دیکھنے لگا ہو۔ اور پھر ...یک دم ایک طرف دوڑ پڑی۔ خوفزدہ گدھ دوبارہ اُڑ گیا تھا۔ رجنی کو ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑی۔ پورے بدن ...میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں، لگ رہا تھا جیسے بدن کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ بازو سے خون بری طرح بہہ رہا تھا۔

شدت تکلیف سے دیوانی ہو کر اُس نے اپنے بازو کے زخم پر منہ رکھ دیا اور بہتا ہوا خون چوسنے لگی ...ازہ نمکین خون جو بدن سے بہہ جانے کے لئے بے چین تھا...... اُس کی آواز فضا میں گونجی۔

"آہ...... آہ میں مر رہی ہوں...... مجھے بچاؤ...... بچاؤ مجھے۔" رجنی جانوروں کی طرح اپنا بازو ...جھنجھوڑنے لگی۔ وہ زخم کی اس جلن کو ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی مگر یہ ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ پھر وہ اِدھر اُدھر بھاگنے ...لگی۔ پھر اُسے ایک جگہ مٹی نظر آئی۔ اُس نے مٹی ہاتھ میں بھری اور اُسے زخم سے لگا لیا۔ مٹی خون میں لتھڑ ...گئی تھی مگر اس سے رجنی کو فائدہ ہوا اور کچھ ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ آسمان کی بلندیوں پر منحوس گدھ لمبے لمبے ...چکر لگا کر واپس اُس کے سر پر بار بار آ جاتا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ اُس سے بھی بس غلطی ہو گئی تھی جس کا ...اسے احساس تھا۔ اگر وہ عالم بے ہوشی میں اپنا کام کر لیتا تو اب تک رجنی کی اُدھڑی ہوئی آنتیں اُس کی ...چونچ میں دبی ہوتیں۔ جگہ کے انتخاب میں غلطی ہو گئی۔ اس سے تو زیادہ بہتر تھا کہ آنکھوں پر چونچ مارنی ...چاہئے تھی یا پیٹ پر حملہ کرنا چاہئے تھا۔ اب وہ اپنی بے وقوفی پر بے چین تھا اور رجنی کے گر جانے کا انتظار ...کر رہا تھا۔

مٹی نے خون روک دیا اور گارا بن کر رجنی کے بازو سے چپک گئی۔ چیتھڑوں والی عبا خون سے سرخ ...ہو گئی تھی۔ رجنی کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں، سر بار بار چکرا رہا تھا اور زمین گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی ...تھی۔ آنکھوں میں دُھندلاہٹ آ جاتی تھی۔ لیکن سوچنے سمجھنے کی قوتیں باقی تھیں۔ اس منحوس گدھ سے بچنے ...کا طریقہ یہی تھا کہ متحرک رہے اور اُسے اپنی زندگی کا یقین دلاتی رہے۔

وہ کافی آگے بڑھ آئی۔ چاروں طرف پتھروں کے انبار تھے۔ نجانے پتھروں کا یہ دیس کتنا دُور تک ...پھیلا ہوا تھا؟ گدھ بہت دیر تک اُس کے سر پر منڈلاتا رہا، پھر مایوس ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ رجنی گدھ ...سے ہی خوفزدہ تھی۔ جب وہ کافی دُور نکل گیا اور اُس کا کوئی نام ونشان نہ رہا تو وہ چکراتے ہوئے ذہن ...کے ساتھ ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور بری طرح زار و قطار رونے لگی۔ سنی سنائی روایت نہیں ہے بلکہ سچائی ہے کہ

آنسو دل کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں۔ رجنی نجانے کتنی دیر تک روتی رہی، پھر اُسے ایک ہمدرد آواز سنائی دی۔
"بیٹا...... روتے نہیں ہیں۔ اللہ ہر مشکل حل کر دیتا ہے۔ اُس کی رسّی مضبوطی سے تھامو، سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔" رجنی نے چونک کر پیچھے دیکھا، بلند و بالا قامت کے ایک بزرگ کھڑے ہوئے تھے، چہرے پر چیچک کے گہرے داغ تھے لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ آگے بڑھ کر اُس کے سامنے آ گئے۔
"بڑی عجیب بات ہے، تنہا ہو، قرب و جوار میں کوئی نہیں ہے اور اس طرح بیٹھی بلک رہی ہو۔ آؤ اٹھو میرے ساتھ آؤ بیٹا۔ میں تمہارے بزرگ کی جگہ ہوں۔ آ جاؤ، مجھ سے ڈرو نہیں۔" رجنی اُٹھ کر چل پڑی۔ بزرگ اُسے لئے ہوئے ایک چھوٹی سی عمارت تک پہنچے جو پتھروں کو چن کر بنائی گئی تھی۔ بڑا سا احاطہ تھا، اس میں دو کمرے تھے۔ احاطے میں درخت لگے ہوئے تھے اور چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔
"بیٹھو......" بزرگ نے کہا اور پھر واپس جا کر سامنے رکھے ہوئے گھڑوں میں سے ایک گھڑے میں سے پانی نکالا اور اسے لے کر رجنی کے پاس پہنچ گئے۔ "لو، یہ پانی پیو۔ اوہو، تم تو زخمی ہو۔ ٹھہرو، مجھے اپنا زخم دکھاؤ۔ ڈرو نہیں۔ ایک بار پھر کہوں گا کہ تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔"
رجنی نے اپنے بازو کا زخم بزرگ کو دکھایا۔ اُنہوں نے بازو کا زخم صاف کر کے پٹی باندھ دی۔ پھر اُنہوں نے اُسے کھانے کے لئے کچھ پھل جو جنگلی تھے لیکن بے حد لذیذ تھے دیئے اور کہا۔ "اس کے علاوہ میں تمہیں کچھ نہیں پیش کروں گا۔"
"بابا، کیا نام ہے آپ کا؟" رجنی نے سوال کیا۔
"محمد خان۔"
"آپ یہاں تنہا رہتے ہیں؟"
"ہاں...... بس یہ گوشہ آباد کر لیا ہے۔ بڑی اچھی جگہ ہے۔ انسان بھٹک گیا ہے، مگر اللہ کی مخلوق محدود نہیں۔ بہت سے ننھے ننھے پرندے میرے دوست ہیں، میرے عزیز ہیں۔ دنیا سے ساری شکایتیں ختم ہو گئی ہیں میری۔"
"لیکن یہاں کھانے پینے کا بندوبست کہاں سے ہوتا ہے بابا صاحب؟"
"رازق سے اتنا فاصلہ ہے تمہارا؟ اُسے کیوں بھول گئی ہو بیٹی؟ یہ درخت، یہ پانی اللہ نے سب کچھ تو مہیا کر دیا ہے۔"
"صرف یہ پھل کھا کر جیتے ہیں آپ؟"
"ہاں...... بھٹک جانے والوں نے دنیا خود پر تنگ کر لی ہے۔ اللہ کی ہر نعمت اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔" محمد خان صاحب بولے۔ رجنی خاموش ہو گئی تو اُنہوں نے کہا۔ "اب کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔"
"میرا نام ستارہ ہے۔" رجنی نے کہا۔ اور پھر اوّل سے آخر تک اُس نے ساری کہانی سنا دی۔ محمد خان خاموشی سے یہ کہانی سنتے رہے، پھر کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے اور اس کے بعد اُنہوں نے کہا۔
"خوش بختی سے کتنی بڑی دولت سے نوازا ہے اللہ نے تمہیں۔ دیکھو، ذریعہ تو انسان ہی ہوتے ہیں

لیکن یہ ذرائع اگر مہیا ہو جائیں تو سمجھو اللہ کی نگاہ تم پر ہے۔ تمہیں یقینی طور پر کوئی کام کرنا ہے اور اس کام کے لئے تمہیں یہ سب کچھ دیا گیا ہے۔ چلو خیر ٹھیک ہے۔ یہاں وقت گزارو۔ بھوک لگے تو یہ پھل کھاؤ اور اللہ کی عبادت کرو۔ تم تو بہت عظیم ہو، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"
بہر حال، وقت گزرتا رہا اور رجنی یہاں بہت خوش نظر آنے لگی۔ ایک دن، دو دن، تین دن، کئی دن گزر گئے۔ اور پھر ایک شام جب رجنی ایک پتھر پر بیٹھی فضا میں دیکھ رہی تھی، اچانک ہی اُس نے دیکھا کہ آسمان پیلا ہو رہا ہے۔ گرد و غبار بلندیوں پر پہنچتا جا رہا ہے۔ غالباً آندھی چھڑ رہی تھی۔ محمد خان صاحب بھی باہر نکل آئے اور اُنہوں نے آسمان کی پیلاہٹوں کو دیکھا، پھر بولے۔ "آندھی خطرناک ہو سکتی ہے۔" اچانک ہی وہ کچھ چونکے چونکے سے نظر آنے لگے۔
رجنی کچھ نہیں سمجھ پائی تھی۔ لیکن اُنہوں نے اپنی جگہ سے پتھر کا ایک ٹکڑا اُٹھایا اور زمین پر ایک گہری لکیر بنا دی۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے کچھ پڑھتے گئے۔ اور پھر اس کے بعد لکیر سے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر رجنی سے بولے۔ "اس لکیر سے ذرا پیچھے ہی رہنا۔"
"کیوں......؟"
"دیکھو، آندھی آ گئی ہے۔" اُنہوں نے رجنی کی بات کا جواب دیئے بغیر کہا۔
گرد و غبار کا کالا طوفان نزدیک آتا جا رہا تھا۔ ہواؤں کی ایسی گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی جیسے پہاڑ آپس میں سر ٹکرا رہے ہوں۔ ایسی بھیانک آوازیں تھیں جیسے زمین آسمان ہل رہے ہوں۔ اور ایسا اندھیرا چھایا جا رہا تھا کہ دن کی روشنی چھپ گئی تھی۔ مگر پھر ایک اور احساس ہوا۔ رجنی، محمد خان صاحب کے ساتھ کٹیا سے باہر کھڑی تھی اور ہواؤں کو دیکھ رہی تھی۔ مگر یہ ہوائیں رجنی کے جسم کو نہیں چھو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی بند جگہ سے انہیں دیکھا جا رہا ہو۔ بڑے بڑے پتھر لڑھک رہے تھے اور نجانے کیا کیا ہو رہا تھا؟ لیکن وہ محفوظ تھی۔ پھر بادل گرجنے لگے اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ محمد خان صاحب نے کہا۔
"آؤ، اندر چلیں۔ آ جاؤ بیٹا۔"
رجنی اس خوفناک آندھی کے سحر میں گرفتار تھی، چونکی اور بابا صاحب کے ساتھ اندر آ گئی۔ کہنے لگی۔ "بڑی خوفناک آندھی تھی۔"
محمد خان صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بارش بہت زیادہ تیز نہیں ہوئی تھی مگر اندھیرا چھا گیا تھا۔ ابھی تھوڑی بہت روشنی ضرور تھی۔ پھر کچھ دیر گزری تھی کہ باہر سے عجیب سی گھنٹیوں کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ خاصی تیز آواز تھی۔ محمد خان صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے، رجنی نے بھی حیرت سے یہ آوازیں سنیں اور بولی۔ "یہ کیا ہے؟ یہ تو گھنٹیوں جیسی آواز ہے۔ یہاں گھنٹیاں کہاں سے آ گئیں؟"
"ستارہ، جو لکیر میں نے بنائی ہے اس سے قدم باہر نہ نکالنا۔ آؤ، شاید کوئی مہمان آیا ہے۔ مل لیتے ہیں اس سے۔"
بات سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن رجنی، محمد خان صاحب کے ساتھ باہر نکل آئی۔ باہر مدھم مدھم بوندیں پڑ رہی تھیں اور پتھروں سے چنی ہوئی چھوٹی سی اس کٹیا سے کچھ فاصلے پر کچھ نظر آ رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر کوئی

جانور سا محسوس ہوا۔ اور جب قریب سے دیکھا تو وہ کالے رنگ کی ایک بھینس تھی جس کی پشت پر ناگ چندر بیٹھا ہوا تھا...... اس وقت وہ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اُس کی گردن میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی جس میں رنگین دھاگے لٹک رہے تھے۔ سر پر اُس نے ایک بہت بڑی انسانی کھوپڑی باندھی ہوئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی لکڑی تھی جس پر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ پھر اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پیتل کی گھنٹی زور زور سے بجائی۔ محمد خان بابا اُسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ گھنٹی بجاتا رہا، اس کے بعد اُس نے کہا۔

''جے اشیش بھگونتا...... کیوں مُسلے، کیا خیال ہے تیرا؟''

''اشیش بھگونتا وہ ہے جسے معبودِ کائنات نے جنت سے نکال کر دنیا کی جہنم میں پھینک دیا ہے۔ اور وہ جہنم میں کروٹیں بدل رہا ہے۔''

''وہ سارے سنسار کو جہنم بنا رہا ہے۔ اور دیکھ لینا، ایک دم آکاش کا جہنم سنسار میں ہوگا۔ یہی ہمارا مقصد ہے۔''

''تو یہاں کیا جھک مارنے آیا ہے تو؟''

''یہ لڑکی چاہئے ہمیں۔''

''یہ آسان نہ ہوگا تیرے لئے۔''

''دیکھو میاں جی، ہم بتائے دے رہے ہیں۔ اشیش بھگونتا نے ہمیں ہدایت کی ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو، اسے ہم بھینس پر بٹھا کر لے جائیں گے۔''

''ناپاک، مردود، غلیظ...... جا یہاں سے بھاگ جا۔''

''ہم تمہیں جلا کر راکھ کر دیں گے۔ میاں جی، ہم سے نہ ٹکرانا۔''

''چلا جا یہاں سے غلاظت کے پتلے شیطان کے لئے تو ایک لاحول ہی کافی ہے۔ جا...... ہم تجھے نقصان نہیں پہنچانا چاہتے، ورنہ بتا دیتے تجھے۔''

''ارے ہم کہہ رہے ہیں لڑکی ہمارے حوالے کر دو اور آرام سے رہو۔''

''سمجھ میں نہیں آئی تیری بات؟ جا، یہاں سے چلا جا...... ورنہ اپنے جیسے بہت سوں کی زندگی کھو بیٹھے گا۔''

''ٹھیک ہے...... ایسے نہیں مانو گے تم۔'' ناگ چندر نے کہا اور بھینس کا رُخ بدل دیا۔ رجنی خاموش کھڑی ہوئی تھی۔ ناگ چندر کی خوفناک بھینس کچھ قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس کے بعد رُخ تبدیل کر لیا۔ اُس کا چہرہ ان دونوں کی طرف ہو گیا تھا اور وہ ہولناک آواز سے اپنے کھر سے زمین کریدنے لگی۔ ناگ چندر کی سرخ آنکھیں اُن پر جمی ہوئی تھیں۔ کالی بھینس سر جھکائے پھنکار رہی تھی۔ پھر اچانک زمین لرز اُٹھی...... ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈھول بج اُٹھے ہوں۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لئے بھینس چند چھلانگوں میں قریب پہنچ گئی۔ ایک لمحے کے لئے رجنی کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اُس کے دل میں تصور اُبھرا تھا کہ بھینس کی ایک ہی ٹکر سے اُس کے جسم کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔ پلک جھپکنے کا کھیل تھا اور پلک جھپکنے میں سب کچھ ہو گیا تھا۔ ایسی آواز اُبھری تھی جیسے دو چٹانیں آپس میں ٹکرائی ہوں...... بھینس تو رجنی تک نہیں

پہنچ سکی تھی۔ وہ درمیان میں آنے والی دیوار سے ٹکرا گئی تھی اور اُس کا بھیجا پاش پاش ہو گیا تھا۔ گردن ٹوٹ کر پیٹ میں گھس گئی تھی...... ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی نظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکرائی ہو۔ اس کے اوپر بیٹھا ہوا ناگ چندر اُچھل کر کوئی دس گز کے فاصلے پر جا کر گرا تھا۔ بھینس کی ٹوٹی ہوئی گردن لٹک گئی تھی اور اب بھینس اپنی لٹکتی ہوئی گردن کو لئے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھی۔ وہ بار بار گر رہی تھی، اُٹھ رہی تھی۔ سر کا بھیجا سفید ٹکڑوں کی شکل میں زمین پر پڑا ہوا تھا اور خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ ناگ چندر بھی جس جگہ گرا تھا، وہیں پڑا ہوا تھا اور اس طرح پڑا تھا جیسے مر گیا ہو۔ پھر بھینس تھوڑی دُور جا کر گری اور اُس کا لمبا چوڑا بدن کسی پھرکی کی طرح زناٹے سے زمین پر گھومنے لگا۔ وہ ایک عجیب آواز کے ساتھ گھومتی رہی۔ لیکن گھومتے گھومتے دوسرا منظر جو نظر آیا وہ یہ تھا کہ اُس کا جسم چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ ایک فٹ سے زیادہ کا نہ رہ گیا۔ اور تب وہ اُٹھی اور اس کی ہیئت بدل گئی۔ پھر اچانک ہی وہ فضا میں بلند ہوتی چلی گئی۔ دو تین بار اُس نے چیخیں ماریں اور تیسری چیخ مارنے کے بعد وہ فضا میں سیدھی ہو کر ایک طرف چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سیاہ نقطے کی شکل اختیار کر گئی اور پھر وہ سیاہ نقطہ بھی فضا میں معدوم ہو گیا...... رجنی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اِدھر ناگ چندر اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ رجنی نے خان محمد صاحب کی طرف دیکھا جن کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے وہ کچھ پڑھ رہے ہوں۔ آخر کار اُس نے کہا۔

''بابا صاحب...... شاید وہ مر گیا۔''

''مکار ہے سسرا...... مکاری کر رہا ہے۔ مرا نہیں ہے۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے، میں جانتا ہوں۔'' محمد خان صاحب کی آواز اُبھری۔ اُن کا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ ابھی اُن کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ناگ چندر اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ وہ بری طرح سے انہیں گھور رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اُس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور تیزی سے اس طرف دوڑا۔ لیکن جیسے ہی وہ اُس لکیر کے قریب پہنچا، ایسا لگا کہ جیسے کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا ہو۔ اور اس کے بعد وہ پھر گر پڑا۔ لیکن فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ حلق سے طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگا تھا...... ہر آواز کے ساتھ اُس کا قد بڑھتا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس میں ہوا بھری جا رہی ہو۔ اُس کی لمبائی کوئی دس فٹ ہو گئی۔ پھر وہ چوڑائی میں پھیلنے لگا...... خوفناک آوازیں مسلسل اُس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ ایک لمبا چوڑا انسان بن گیا جسے دیکھ کر دہشت سے بے ہوش ہو جانے کو دل چاہے۔ اُس کا مختصر لباس اُس کے جسم پر پھٹ گیا تھا۔ یہ جسامت حاصل کرنے کے بعد وہ مستی میں جھومتا ہوا ایک بار پھر اس طرف بڑھا اور دونوں ہاتھوں کی طاقت سے اُس نے دیوار پر گھونسے مارنے شروع کر دیئے جو نظر نہیں آ رہی تھی اور جو اُسے ان تک نہیں پہنچنے دے رہی تھی۔

دفعتہً ہی محمد خان صاحب کی ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''بے وقوف شیطان زادے، تو کوشش کر کر کے مر جائے گا لیکن اس رُکاوٹ کو نہیں توڑ سکتا۔ مر جائے گا تو...... جا، یہاں سے دفع ہو جا۔''

چندر اب بری طرح چیخیں مار مار کر دیوار پر ٹکریں مار رہا تھا۔ پھر وہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ اچانک اُسے درخت نظر آئے اور وہ اُن کے قریب پہنچ گیا۔ پھر ایک اور بھیانک منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اُس

نے درخت کے تنے سے ہاتھ لپیٹے اور اُسے جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر دوسرے اور تیسرے درخت کے ساتھ بھی اُس نے یہی کیا اور اس کے بعد اُن کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اب بولو...... کیا درخت کے یہ تنے تمہاری اس شیشے کی دیوار کو نہیں توڑ سکتے؟...... میں تم پر جینا حرام کر دُوں گا۔ سمجھے؟ اشیش بھگونتا ہر قیمت پر اس لڑکی کی موت چاہتا ہے۔ کیونکہ اس نے اشیش بھگونتا سے روگردانی کی ہے۔''

''تیرے بھگونتا کی ایسی تیسی...... تو کیا کر سکتا ہے؟''

''میں...... میں یہ سارے درخت اُکھاڑ کر پھینک دُوں گا۔ یہ سب جگہ بنجر اور ویران کر دُوں گا۔ پھر تم بھوکے مر جاؤ گے...... پیاسے مر جاؤ گے۔ دیکھو، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اُس چشمے کے پاس پہنچا اور پھر اُس کے قریب ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے منہ پانی میں ڈال دیا اور رجنی کی آنکھوں نے وہ دہشت ناک منظر دیکھا جسے دیکھ کر درحقیقت اُس کے دل کی دھڑکن انتہائی مدھم ہو گئی...... وہ دیکھ رہی تھی کہ چشمے کا پانی ختم ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس میں اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اُس نے کئی بار چشمہ خالی کیا لیکن چشمے میں پانی آ جاتا تھا اور چشمہ دوبارہ بھر جاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ اندازہ ہونے لگا کہ ناگ چندرا اپنے آپ کو اس کوشش میں ناکام محسوس کر رہا ہے۔ پھر وہ تھک کر کھڑا ہو گیا اور اچانک اس چشمے کے پانی میں تھوک دیا۔ تب محمد خان کے منہ سے نکلا۔

''لعنت ہو...... لعنت ہو تجھ پر ناپاک...... اب تو نے بلاشبہ کامیابی حاصل کر لی۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ ناگ چندر زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور رفتہ رفتہ اُس کی جسامت کم ہونے لگی۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنی اصلی حالت میں واپس آ گیا۔ لیکن اب وہ بے لباس تھا، کیونکہ لباس تو پہلے ہی لمبا ہونے کی وجہ سے اُس کے جسم سے پھٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا۔ پھر اُس نے زمین پر سے پتھر کا ایک ٹکڑا اُٹھایا، اُس پر تکون بنائی اور اس کے بیچ میں پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس لکیر سے اُس کا فاصلہ کوئی آٹھ فٹ کا تھا۔ پھر اُس نے رجنی اور محمد خان کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میاں جی...... ہماری تمہاری خوب چلی۔ مگر تم اس دیوار کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے ہو۔ ذرا باہر آؤ، پھر دو دو ہاتھ ہوں گے۔''

محمد خان ہنسنے لگے۔ پھر اُنہوں نے کہا۔ ''یہ شیطانی چال چلی ہے تم نے۔ مگر حکم نہیں ہے، ورنہ تجھ سے بات کرتے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے!'' اب نہ یہ پھل ملیں گے تمہیں اور نہ ہی پانی۔ بھوکے پیاسے بیٹھے رہو گے۔ دیکھوں گا میں بھی کب تک بیٹھے رہو گے۔ بھوک سے مرو گے تو خود ہی باہر نکلو گے۔''

''بات وہی ہے ناگ چندر کہ شریف اپنی شرافت سے مرتا ہے اور ذلیل یہ سمجھتا ہے کہ شریف اس سے ڈر گیا۔ ٹھیک ہے، یہ بھی دیکھ لیں گے۔ آؤ بیٹی، پاگل کتا تو دانت مار کر خاموش ہو گیا ہے، ہم اپنا وقت کیوں ضائع کریں؟ چلو، آرام کریں۔'' محمد خان صاحب نے رجنی کا ہاتھ پکڑا اور پھر اپنے جھونپڑا نما جھے میں داخل ہو گئے۔ رجنی کا پورا وجود اتنا ہلکا ہو گیا تھا کہ اُسے لگ رہا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا اُسے اُڑا کر کہیں سے کہیں پھینک دے گا۔ محمد خان نے اُس کی کیفیت محسوس کی تو وہ بولے۔ ''اطمینان سے آرام

کرو۔ ان ناپاک قوتوں کو ایسی طاقت مل جائے تو یہ دنیا کا سکون غارت کر دیں۔ یہ شیطان زادے شیطانی ذہنوں کا سہارا لے کر کوشش کرتے ہیں۔ اللہ نے شیطان کو چھوٹ دی ہے لیکن بس ایک محدود حد تک۔ تم بے فکر رہو۔ آؤ، اندر چلو۔''

رجنی اندر جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ کھانے پینے کا جو سامان تھا وہ رات کو کھانے کے طور پر استعمال کیا۔ دل پر خوف و دہشت طاری تھی۔ وہ باہر بیٹھا ہوا تھا اور اس بار ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھاگنے کے لئے نہیں آیا۔ اس نے اُن لوگوں کو بھوکا مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ سارے درخت تباہ کر دیئے تھے اُس نے، چشمہ غلیظ کر دیا تھا اور اب اس کا پانی کسی بھی طور پینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بہرحال، رجنی کو احساس ہو رہا تھا کہ برا وقت آ گیا ہے۔

ادھر جب صبح کی روشنی ہلکی ہلکی پھیلنے لگی تو محمد خان بابا نماز پڑھنے بیٹھ گئے اور کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد رجنی کو نیند آ گئی تھی۔ جاگی تو دن چڑھ چکا تھا اور خوب تیز دُھوپ پھیل گئی تھی۔ محمد خان صاحب ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رجنی نے کہا۔

''بابا صاحب، وہ موجود ہے؟''

''ہاں...... کتا تاک لگائے بیٹھا ہوا ہے۔'' محمد خان صاحب نے کہا۔

''مگر اب کیا ہو گا؟''

''کچھ نہیں...... وقت خود فیصلہ کرے گا۔''

''ہم اُسے باہر نکل کر دیکھ سکتے ہیں؟''

''وہ جو جگہ قائم کر دی گئی ہے وہ محفوظ ہے۔ مگر اس سے باہر قدم مت نکالنا۔ جب چاہو جا سکتی ہو۔'' محمد خان نے جواب دیا۔

رجنی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ وہ مخصوص جگہ بیٹھا ہوا تھا، آنکھیں مسلسل بند تھیں۔ اُس کا بھیانک، بدہیئت چہرہ بڑی عجیب و غریب کیفیتوں کا حامل نظر آ رہا تھا۔ رجنی نے آہستہ سے محمد خان سے پوچھا۔ ''اگر ہم اس جگہ سے باہر قدم نکالنا چاہیں تو کیا ہماری راہ میں بھی رُکاوٹ ہو گی؟''

''بالکل نہیں...... لیکن تم باہر مت نکلنا جب تک میں نہ کہوں۔''

پورا دن گزر گیا، پھر رات ہو گئی۔ رجنی کو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی، بھوک بھی لگ رہی تھی مگر زبان سے اُس نے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا، البتہ یہ محسوس کیا تھا کہ محمد خان صاحب نے اُسے کئی بار تشویش کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ پھر رات بھی گزر گئی۔ دوسرا دن ہوا اور اس کے بعد رجنی نے کہا۔ ''بابا صاحب...... میں یہاں سے چلتی ہوں۔''

''کیسے......؟''

''مجھے اس کا طریقہ آتا ہے۔ آپ براہ کرم یہاں انتظار کریں۔ وہ مجھے ہی لینے آیا ہے، جب میں اُسے یہاں نہیں ملوں گی تو وہ آپ کو کیسے پریشان کرے گا۔''

''مگر تم جاؤ گی کیسے؟''

"بتاتی ہوں......" رجنی نے کہا اور پھر اُس نے اپنی جون بدلنا شروع کر دی۔ اُس نے ایک چھوٹی سی، پتلی سی ناگن کی شکل اختیار کی اور اس کے بعد زمین میں نظر آنے والے ایک سوراخ میں گھس گئی۔ زمین سانپ کو راستہ دیتی ہے۔ رجنی تیز رفتاری سے سوراخ کے ذریعے اپنا بل بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ ناگ چندر کو کسی طرح یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ اُس کا شکار باہر نکل گیا ہے۔ وہ تو اپنی دھونی رمائے بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن رجنی برق رفتاری سے فاصلے طے کر رہی تھی۔ اور پھر وہ اُس جگہ سے میلوں دُور نکل آئی۔ وہ زمین کے نیچے نیچے سفر کر رہی تھی۔

دفعتہً ہی اُسے احساس ہوا کہ اُس کے سر کے اوپر ایک شدید گڑگڑاہٹ ہو رہی ہے...... رجنی رُک گئی، پھر ایک جگہ تلاش کر کے وہ اوپر کو اُبھری، تب اُس نے دیکھا کہ وہ ریلوے لائن تھی جو اُس کے سر پر سے گزر رہی تھی۔ اور تھوڑی دیر قبل اس پر سے ریل گزری تھی۔ رجنی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ایک سوراخ سے باہر نکل آئی۔ تھوڑے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن نظر آ رہا تھا۔ اُس نے ایک انسانی روپ اختیار کیا اور اس کے بعد ریلوے اسٹیشن کی جانب چل پڑی۔ اُس کی نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن پر بہت کم لوگ نظر آ رہے تھے۔ سامنے ہی ٹکٹ گھر تھا۔ رجنی یہاں سے دُور نکل جانا چاہتی تھی۔ ہمت کر کے وہ ٹکٹ گھر کے پاس پہنچ گئی۔

"ٹرین کب آئے گی بابو صاحب؟"

"کہاں جانا ہے، بہن؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا مطلب؟" کلرک چونک کر بولا۔

"میرا مطلب ہے کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ ریل کب آئے گی؟"

"گھر سے بھاگ رہی ہو؟" کلرک نے پوچھا۔

"جو کچھ میں نے تم سے پوچھا ہے وہ بتاؤ تم۔" رجنی کی غصیلی آواز اُبھری۔

"وہ آ گئی ٹرین۔" کلرک نے کہا۔ رجنی کو خود بھی ٹرین دُور سے نظر آ گئی تھی۔

"کہاں جائے گی یہ؟"

"راجن پور اس کا آخری اسٹیشن ہے۔"

"مجھے راجن پور کا ایک ٹکٹ بنا دو۔" رجنی نے اُسے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ اور ٹکٹ کلرک نے اُسے ٹکٹ بنا کر دے دیا۔

رجنی ایک کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر ایک سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ اُس کے ذہن میں بابا محمد خان کا خیال تھا، اُن بیچاروں نے بڑا ساتھ دیا تھا اس کا۔ لیکن ظرف کا تقاضہ تھا کہ اُن پر مصیبت نہ بن جائے، جبکہ اپنے اندر کم از کم اس قدر صلاحیت تھی کہ اپنا بچاؤ کیا جا سکے۔ دفعتہً برابر سے ایک آواز اُبھری۔ "تنہا سفر کر رہی ہو بیٹی؟"

رجنی نے چونک کر دیکھا، معصوم سی شکل کا ایک بھاری بدن کا آدمی تھا۔ رجنی نے گردن ہلاتے ہوئے

ہا۔ "جی چچا جی......"

"چاچا جی......" اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور رجنی اُسے غور سے دیکھنے لگی۔

"کیوں...... آپ کو میرا چاچا جی کہنا پسند نہیں آیا؟"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر آپ نے عجیب سے الفاظ میں میرے کہے ہوئے الفاظ کیوں دوہرائے؟"

"میری ایک بیٹی ہے نرویا۔ میرے بڑے بھائی کے بچے مجھے چاچا جی کہتے تھے جس کی وجہ سے وہ ی مجھے چاچا جی ہی کہنے لگی بالکل تمہارے انداز میں۔"

"اوہ...... یہ بات ہے۔"

"ہاں۔"

"کتنی بڑی ہے وہ؟"

"تمہارے برابر۔ لیکن......" اُس شخص کی سسکی سی نکلی اور رجنی چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"لیکن کیا چاچا جی......؟"

"پاگل ہو گئی ہے وہ۔" اُس نے کہا اور اُس کی آواز بھرا گئی۔

"اوہ......" رجنی کے منہ سے نکلا اور وہ اُداس ہو گئی۔ "حوصلہ کریں چاچا جی...... ایسا کب ہوا؟ کیسے ا؟"

"بھگوان جانے۔ میرا نام بانکے لعل ہے۔ راجن پور میں رہتا ہوں۔ بھگوان کا دیا سب کچھ ہے، ایک ا بیٹی تھی، پڑھتی تھی۔ بہت ذہین تھی۔ مگر......"

"آپ نے اُس کا علاج نہیں کرایا؟"

"کیا نہیں کرایا بیٹی......"

"کوئی فائدہ نہیں ہوا؟"

"بہت سے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ ہر طرح کے معائنے کرائے، سارے ٹیسٹ ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" رجنی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بھگوان ہی جانے۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟"

"ستارہ۔"

"مسلمان ہو؟"

"اللہ کے کرم سے۔"

"کہاں جا رہی ہو؟"

"راجن پور۔"

"وہیں رہتی ہو؟"

"نہیں......"
"اچھا، رشتے دار وغیرہ ہوں گے۔"
"کوئی بھی نہیں میرا چاچا جی...... ایک بات کہوں؟"
"ضرور بیٹی۔"
"میں نروپا کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ بے فکر رہیں، میرا کوئی لالچ نہیں ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اُسے دیکھوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"
"ارے بیٹا، مسلمان تو بھگوان کا روپ ہوتا ہے۔ تم اگر میرے ساتھ چلو گی تو مجھے خوشی ہو گی۔ اور چنتا مت کرنا، میرا مالی اور چوکیدار مسلمان ہے۔ تمہیں کھانے پینے کی بھی تکلیف نہیں ہو گی۔ ضرور چلو میرے ساتھ۔" اُس نے کہا اور رجنی نے گردن ہلا دی۔

❁❁❁

نسل شیطانی دن رات اپنے عمل میں کوشاں رہتی ہے۔ شیطانی قوتوں کے حصول کے بعد اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے شیطانی عمل کو دوہرا کر شیطان کی خوشنودی حاصل کرے۔ روپا اپنے عمل کے لئے نکل گئی تھی۔ رجنی کو اُس کی تقدیر نے نیک راستے دے دیئے تھے۔ اُس کے دل کی دنیا بھی آباد ہو گئی تھی اور اپنی تقدیر کے امتحان کے بعد شاید اُسے اُس کا محبوب بھی مل جائے۔ باقی تین لڑکیاں فارغ نہیں...... ہم کیا کریں......؟ تینوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا اور تینوں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگیں۔
"عیش......" راگنی نے کہا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رما بولی۔
"کیوں......؟"
"مفت کی ترکیبیں بھی نہیں ملتیں۔ اشیش بھگوات خوش تو عیش ورنہ......"
"ہاں، یہ تو ہے۔ پھر بتاؤ، کیا کریں؟"
"میں تو جا رہی ہوں بابا۔" رادھا نے کہا۔
"کہاں......؟"
"جہاں روپا گئی ہے۔"
"روپا کے بارے میں تو کچھ پتہ ہی نہیں چل سکا۔"
"عیش کر رہی ہو گی کہیں...... آئے گی تو پتہ چل جائے گا۔"
"یہ رجنی نے بڑی گڑبڑ کر ڈالی۔"
"ہاں۔ مسلمان ہو گئی۔"
"مگر کیوں......؟"
"یار ایک بات میں سوچ رہی ہوں۔" رادھا بولی۔
"کیا؟"
"اشیش بھگونت نے ہمیں بڑی شکتی دے دی ہے لیکن ایک کمی ہے ہمارے اندر۔"
"وہ کیا......؟"
"ہم کسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔ جبکہ دوسری شکتی والے ایسا کر سکتے ہیں جیسے کالی آتمائیں۔ ہم رجنی اور روپا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔"

"ایک بات بتاؤ رادھا...... یہ آتماؤں کی شکتی کیا ہوتی ہے اور کیا ان آتماؤں کی بھی کوئی کہانی ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں......ضرور ہوتی ہوگی۔ بلکہ تم نے تو مجھے ایک راستہ دکھا دیا۔"

"کیسا راستہ......؟"

"کسی کالی آتما کی تلاش۔ میں کسی کالی آتما کی تلاش کروں گی اور اُس کے بارے میں معلوم کروں گی کہ وہ مرنے سے پہلے کیا تھی اور آتما کیسے بنی اور اب کیا کرتی ہے؟"

"ہاں......کام تو اچھا ہے۔"

رادھا چل پڑی۔ اب اُسے کسی ایسے ویرانے کی تلاش تھی جہاں کسی رُوح سے اُس کی ملاقات ہو سکے۔ وہ کھوج میں لگی رہی، اور پھر ایک ایسی جگہ اُسے نظر آئی۔ ویران کھنڈر کی حالت بتا رہی تھی کہ وہاں رُوح کا بسیرا ہے۔ پھر ایک رُوح اُسے نظر آئی۔ یہ اُس کی شکتی تھی کہ اُسے پتہ چلا کہ یہ رُوح ہے۔ وہ اُس کے پاس پہنچ گئی۔

"میرا نام رادھا ہے اور میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

خوبصورت لڑکی مسکرا دی۔ اُس نے کہا۔ "مجھے دیکھ کر تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں......کیونکہ میں بھی شکتی مان ہوں۔ تم میری شکتی دیکھنا چاہتی ہو؟"

"ضرور" لڑکی نے کہا۔ اور اسی وقت رادھا نے روپ بدل لیا۔ وہ گائے کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کے بعد اُس نے کئی رُوپ بدلے، پھر اصل حالت میں آ گئی۔

"تم تو میری بہترین سہیلی ثابت ہو سکتی ہو۔ میرا نام شمی ہے۔"

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں تم سے تمہاری زندگی اور موت کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہر ذی رُوح کے ساتھ ایک کہانی ہوتی ہے۔ یہاں میں تنہا نہیں رہتی، میرا ایک ساتھی بھی یہاں رہتا ہے۔"

"یہاں تمہیں آرام ہے، کوئی پریشانی تو نہیں ہوتی؟"

"ہمیں بڑے دلچسپ واقعات پیش آتے ہیں۔"

"دلچسپ واقعات؟"

"ہاں......قسمت کے مارے یہاں آ پھنستے ہیں تو ہم اُن کی خوب درگت بناتے ہیں۔ مثلاً ابھی چند روز کی بات ہے کہ ایک بیچارہ آ پھنسا تھا۔ ساری شرارت نومی کی تھی۔ سدا کا شریر ہے۔ جب دیکھو کسی نہ کسی شرارت میں مصروف رہتا ہے۔ ایک شخص خوفناک سی شکل کا مالک، لمبی لمبی مونچھیں، ضرورت سے زیادہ کالا رنگ، کندھے سے بندوق لٹکائے اور بدن پر کارتوس کی پیٹی سجائے ہماری رہائش گاہ میں آ گھسا تھا اور پتھروں کے نیچے چھپ گیا تھا۔ کچھ اور لوگ اُس کے تعاقب میں آئے تھے لیکن اُن کی نگاہ پتھروں کے نیچے اُس جگہ نہیں پڑی تھی جہاں وہ شخص چھپا ہوا تھا۔ تعاقب کرنے والے واپس چلے گئے

اور اس بیچارے کی جان بچ گئی تھی۔ لیکن شیطان نومی کو بھلا کہاں چین؟ کئی بار پَر پھیلا کر اُس پر جھپٹے اور کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر طرح طرح کی آوازیں نکالتا رہا۔ اُس بیچارے کی خوف سے گھگھی بندھ گئی تھی۔ لیکن مصیبت کا مارا تھا، مجبوراً یہاں آ چھپا تھا، اس لئے نکل کر نہ بھاگا کیونکہ باہر اُن لوگوں نے ڈیرے ڈال دیئے جو اُس کا پیچھا کرتے ہوئے آئے تھے۔ اور پھر ساری رات نومی اُسے طرح طرح سے پریشان کرتا رہا۔ کبھی پتھروں کو اِدھر اُدھر دھکیلنے لگتا تھا اور کبھی دروازہ کھلنے بند کرنے لگتا تھا۔ چھپا ہوا آدمی کئی بار خوف سے چیخ پڑا تھا اور نومی قہقہے لگا لگا کر ہنس رہا تھا۔ اور پھر صبح کو تو اُس نے حد ہی کر دی۔ اُس بیچارے نے اپنی بھری ہوئی بندوق اپنے پیروں کے پاس رکھ لی تھی اور پتھروں سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے نجانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ نومی چپکے سے اُس کے پیروں کے پاس پہنچ گیا اور پھر اُس نے اپنے پنجوں سے بندوق کا گھوڑا دبایا اور بندوق چل گئی......بس غضب ہو گیا۔ اِدھر تو وہ مظلوم چیخ پڑا اور دوسری طرف باہر موجود لوگوں کو اُس کا پتہ چل گیا۔ خوب گولیاں چلیں اور پناہ گزین زخمی ہو گیا۔ پھر اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ نومی اس پیارے ڈرامے سے بہت خوش تھا اور بچوں کی طرح قلقاریاں مار رہا تھا۔ لیکن میں اس پر بہت ناراض ہوئی۔

"بھلا تمہیں کیا ملا اُس کے ساتھ یہ سلوک کر کے؟" میں نے تلخ لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"مجھے تو بہت مزہ آیا۔ اور تمہیں نہیں معلوم وہ ڈاکو تھا۔ بہت خطرناک ڈاکو۔ اُس نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا تھا اور کافی لوٹ مار کی تھی۔ اچھا ہوا کہ وہ گرفتار ہو گیا۔" نومی اب بھی بہت خوش تھا۔ لیکن میں نے اُس سے اتفاق نہیں کیا۔

"وہ ڈاکو تھا جو کچھ بھی تھا، ہمیں تو اُس نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا" دو تین دن تک میں نے نومی سے بات نہیں کی اور وہ طرح طرح سے میری خوشامدیں کرتا رہا، پھر میں ٹھیک ہو گئی۔ اس ویران کھنڈر میں وہی تو میرا دوست تھا۔ کہیں سے اُسے چمگادڑ کا بدن مل گیا تھا۔ بہت خوش تھا اس مُردہ بدن میں گھس کر اور پتہ نہیں کہاں کہاں پھڑپھڑاتا پھرتا تھا۔ دُور دُور تک نکل جاتا تھا اور کئی دن کے بعد واپس آ کر مجھے طرح طرح کے قصے کہانیاں سنایا کرتا تھا۔

اس سے قبل وہ سانپ کے بدن میں تھا، لیکن ایک بار شامت آ گئی تھی۔ چند دیہاتیوں نے کہیں گھیر کر لاٹھیوں سے اس کے بدن کو کچل دیا تھا۔ بہرحال وہ اس بدن کو چھوڑ کر بھاگا تھا اور اب چمگادڑ کے بدن میں تھا۔ اکثر وہ کہا کرتا تھا۔ "شمی، تم بس ان کھنڈروں میں گھسی رہتی ہو۔ دل نہیں گھبراتا تمہارا؟ کہیں چلا کرو میرے ساتھ۔"

"دل......" میں ہنس پڑی۔ "کون سا دل؟" اور نومی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بہرحال اُس کی رٹ جاری رہی۔ لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

اُس دن بارش ہو رہی تھی، موسم بے حد خوشگوار تھا۔ آسمان پر گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آ رہی تھیں اور بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ یہ موسم بڑا جانفزا ہوتا ہے۔ اور ایسے موسم میں نجانے کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔ شریر نومی نے جب بجلیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کی کوشش کی تو نجانے کیوں میں اُس کے ساتھ باہر نکل

آئی۔ بھوری چٹانیں پانی میں نہا کر نکھر رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے تمام گڑھے بھر گئے تھے، جل تھل ہو رہے تھے اور حشرات الارض زمین کے سوراخوں سے باہر نکل آئے تھے۔ تاحد نگاہ پانی کے دُھوئیں کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ میں نومی کے ساتھ ساتھ فضا میں چل رہی تھی کہ دفعتہً اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

''شمی، وہ دیکھو...... وہ کیا ہے؟''

میں نے اُس کے اشارے کی سمت دیکھا تو ایک بلند و بالا سیاہ پہاڑ کے دامن میں سوکھی ہوئی ہڈیوں کا ایک پنجر پڑا ہوا تھا۔ اس کے نیچے پانی جمع ہو چکا تھا اور وہ اِدھر اُدھر تیر رہا تھا۔ نومی پَر پھڑپھڑاتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ وہ اُس ڈھانچے سے کچھ فاصلے پر پتھر کی ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور اس میں بہتے ہوئے اس ڈھانچے کو بغور دیکھنے لگا۔ کمینہ اُسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ میں اُس کے نزدیک جا کھڑی ہوئی لیکن نجانے کیوں میرے ذہن پر ایک بوجھ سا طاری ہو گیا۔ میں خود کو مضطرب محسوس کر رہی تھی...... یہ ڈھانچہ...... یہ ڈھانچہ...... مجھے گزرے ہوئے کچھ واقعات یاد آنے لگے اور میری نگاہیں پہاڑ کی دیوار کے ساتھ ساتھ اُوپر اُٹھتی چلی گئیں۔ تب میں نے پہاڑ کی اُس چوٹی کو دیکھا جو بہت ہی بلند تھی اور اس چوٹی پر مجھے کچھ نظر آیا...... ہاں، وہ شاید میں ہی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی اس کی گہرائیوں میں پھیلی اس وادی کو دیکھ رہی تھی...... لیکن میرے نزدیک بھی کوئی تھا۔ کون ہے یہ؟ میں نے اُلجھے ہوئے انداز میں سوچا تھا۔ تب مجھے شاہد نظر آیا...... اوہ ہاں، وہ شاہد ہی تھا۔ شاہد، میرا شوہر...... میں نے خوفزدہ نگاہوں سے قرب و جوار کے ماحول کو دیکھا اور تب ہی ایک بھیانک چیخ میرے کانوں میں لہرا گئی......

ایک انسانی بدن اس پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر رہا تھا۔ فضا میں لڑھکنیاں کھاتا ہوا گہرائیوں کی جانب آ رہا تھا...... میں نے چاہا، میں لپک کر اس بدن کو پکڑ لوں۔ یہ میرا ہی جسم تو تھا۔ زندگی سے بھرپور، جوانی کی رعنائیوں سے سجا ہوا۔ لیکن میرے نادیدہ ہاتھ اس وجود کو نہ پکڑ سکے۔ میں نے دیکھا کہ وہ پہاڑ کے دامن میں بیٹھے ہوئے ایک برساتی نالے میں آ گرا۔ یہی نالہ تھا جس میں اب بارش کی وجہ سے پانی بھر گیا تھا۔ اُس وقت بھی شاید بارش ہو چکی تھی اور برساتی نالہ اپنے جوبن پر تھا۔ انسانی بدن اس نالے میں آ گرا...... میں اُس سے الگ کھڑی ہوئی تھی اور میری نگاہوں میں تاسف کے آثار تھے۔ تب ہی نومی کی کریہہ چیخ نے مجھے جگا دیا، میں خیالات سے باہر آ گئی۔

''شمی...... شمی، کیا سوچنے لگیں؟''

''کچھ نہیں نومی...... کوئی خاص بات نہیں۔''

''شمی، دیکھو یہ انسانی ڈھانچہ کس طرح پانی کی لہروں سے کھیل رہا ہے۔ شمی...... آؤ کیوں نہ ایک تجربہ کریں؟'' نومی نے حسب معمول پھر ایک تجویز پیش کر دی۔

''کیسا تجربہ؟'' میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''تم اس ڈھانچے میں داخل ہو جاؤ۔ دیکھیں تو سہی اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟''

''اونہوں...... میں ایسی غلط چیزوں کو پسند نہیں کرتی۔ اگر مجھے ایسے ہی کوئی بدن حاصل کرنا ہوتا تو تمہاری طرح کسی چمگادڑ کا بدن حاصل کر لیتی اور فضا میں تمہارے ساتھ پرواز کرنے لگتی۔ لیکن مجھے ایسے

منحوس بدن پسند نہیں ہیں۔ چھی چھی، کبھی اپنے آپ کو دیکھو تو فوراً اس خول سے نکل بھاگو۔'' میں نے کہا اور نومی پھر ہنسنے لگا۔

''شمی، تم تو بس انوکھی ہو۔ ارے یہ بدن کیا حیثیت رکھتے ہیں ہمارے لئے؟ جب چاہو چھوڑ دو اور ان سے نکل کر کسی دوسرے جسم میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن ہر جگہ ایک ہی کیفیت ملتی ہے۔ شمی، مان لو میری بات۔ ذرا تجربہ ہی سہی۔ دیکھیں تو سہی کہ اس جسم میں داخل ہو کر تمہاری کیا کیفیت ہوتی ہے؟'' نومی نے مجھے کچھ اس طرح مجبور کیا کہ میں تیار ہو گئی۔ آگے بڑھ کر میں نے اُس پانی پر کھیلتے ہوئے ڈھانچے کو پکڑ لیا، چاروں طرف سے اس کا جائزہ لیا اور پھر اسے پانی میں کھینچ لیا۔ اگر یہ برساتی نالہ پوری طرح بھر جاتا تو یہ پانی اس انسانی ڈھانچے کو لے کر نجانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا؟ بہرصورت، میں نے نومی کی ہدایت پر عمل کیا اور اس ڈھانچے میں داخل ہو گئی۔ عجیب سی گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ ڈھانچے میں داخل ہوتے ہی اس کے خلا پُر ہونے لگے۔ ہڈیوں کے درمیان کھال پیدا ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے میں اس حصار میں بند ہو گئی...... میں نے چیخ چیخ کر نومی کو آوازیں دیں، لیکن نومی کے قہقہے میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ تب میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''شریر آدمی، ہمیشہ ایسی ہی فضول حرکتیں کرتے رہتے ہو تم۔ میں باہر آ رہی ہوں۔''

''ارے نہیں نہیں...... شمی، سنو تو سہی۔ آخر ایسی کیا جلدی ہے؟ جب چاہو اس سے باہر آ سکتی ہو۔ تم قیدی تو نہیں بن گئیں۔ دیکھو، کیسی انوکھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اس میں۔ واہ، اس پر تو گوشت آتا جا رہا ہے۔ بڑا دلچسپ تجربہ ہے شمی۔'' میں نے ڈھانچے کو دیکھا، سوکھی ہوئی ہڈیاں پُرگوشت ہو گئی تھیں۔ ان کا رنگ ہی بدل گیا تھا، گورا گورا سفید اور گلابی...... آہ کتنا خوبصورت بدن تھا۔ لیکن لباس سے بے نیاز۔ مجھے شرم آنے لگی۔ انوکھے ہوتے ہیں یہ بدن۔ نجانے کیسے کیسے بوجھ لاد لیتے ہیں خود پر۔

''کمینے نومی، اپنا رُخ بدل لو...... ورنہ میں باہر آ جاؤں گی۔''

''میں سمجھ گیا تمہیں بے لباسی کا احساس ہو رہا ہے۔ انسانی بدن میں بس یہی خرابی ہے۔ وجود میں آتے ہی مصنوعی ضرورتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر ہم اس تجربے کو مکمل کریں گے۔ تم چند لمحے توقف کرو، میں ابھی تمہارے لئے لباس مہیا کرتا ہوں۔'' نومی نے اپنے بدن کو تولا اور فضا میں بلند ہو گیا۔ میں برساتی نالے سے ہٹ کر اُس چٹان پر آ بیٹھی جہاں تھوڑی دیر قبل نومی بیٹھا ہوا تھا۔ پانی کی بوندیں میرے بے لباس بدن کو بھگو رہی تھیں، لمبے لمبے بال ذرا سی دیر میں بھیگ کر میری گردن اور سینے پر آ پڑے تھے۔ میں ان لمبے بالوں سے اپنے بدن کو چھپانے لگی، حالانکہ یہاں کوئی نہیں تھا، لیکن بس ایک احساس، ایک فطری احساس مجھے شرم دلا رہا تھا۔

فضا میں نومی نظر آیا اور میں سمٹ گئی۔ اُس نے ایک لباس میرے اوپر ڈال دیا۔

''اب تم یہاں سے تھوڑی دُور چلے جاؤ۔ میں یہ لباس پہن لوں۔'' میں نے کہا اور نومی نے مجھ سے بااخلاقی تعاون کیا۔ تب میں نے لباس پہن لیا۔

''اب میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں؟'' نومی کی آواز اُبھری اور میری اجازت سے وہ میرے پاس آ

گیا۔ اُس نے شرارت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اپنے نوکیلے بھیانک دانت نمایاں کر دیئے۔
"تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو؟" میں غصیلے انداز میں بولی۔
"اوہ، نہیں شمی۔ یقین کرو ایسی بات نہیں ہے۔ تم بہت خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ کیا یہ تجربہ انوکھا نہیں ہے؟ سوکھی ہوئی ہڈیوں کا پنجر ایک دم سرسبز و شاداب ہو گیا......"
"ہونا ہی تھا۔ مٹی کے اس وجود میں رُوح کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟ ساری مٹی دابی رُوح کی ہوتی ہے۔ تم یہ لباس کہاں سے لے آئے؟"
"میری نہ پوچھو۔ میری دنیا ان کھنڈرات تک محدود نہیں ہے۔ میں تو نجانے کہاں کہاں گھومتا پھرتا رہتا ہوں۔ ان پہاڑوں سے کچھ دُور سرسبز جنگلوں سے پرے ایک خوبصورت شہر آباد ہے۔ حسین عمارتوں کا شہر...... جہاں بے شمار لوگ رہتے ہیں۔"
"آہ.... میں اس شہر کو جانتی ہوں۔ میں نے وہاں بیس سال گزارے ہیں۔ مجھے وہ شہر یاد ہے۔"
"وہ تمہارا شہر تھا......؟"
"ہاں، وہ میرا شہر ہے۔" مجھے اپنے دل میں حسرتیں تڑپتی محسوس ہو رہی تھیں۔ نجانے کیا کیا یاد آتا جا رہا تھا؟ ذہن کے دریچے کھل رہے تھے اور ان سے یادوں کی ہوا آ رہی تھی۔
"کیا تمہارے دل میں اس شہر کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو نہیں ہے شمی؟" نومی نے پوچھا اور پھر جلدی سے بولا۔ "اب تو تمہارے سینے میں دل ہوگا۔"
"آرزو......" میں نے حسرت بھری آواز میں کہا۔
"کیوں...... کیا تمہارے احساسات نہیں جاگے؟ کیا تمہارا دل اب بھی مُردہ ہے؟"
"نہیں نومی......"
"اس شہر میں تمہارے اپنے لوگ ہوں گے جن کے درمیان تم رہی ہو۔"
"میرے اپنے......" میں حسرت بھری آواز میں بولی۔ "تھے نومی، لیکن اب میرا اُن سے کیا تعلق؟ میرے اور ان کے رشتوں کے تو سارے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں۔ میں فطرت سے بغاوت کی جرأت کہاں کر سکتی ہوں؟"
"بغاوت تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن تفریحاً، تجرباتاً دیکھو تو سہی وہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ دیکھو تو سہی، اُن میں سے کوئی تمہیں یاد کرتا ہے یا سب بھول چکے ہیں؟ بس تفریحاً۔ پھر ہم وہاں سے چلے آئیں گے۔ بالآخر ہمیں انہی کھنڈرات میں آ جانا ہوگا۔"
یادوں کی ہوائیں تیز ہو گئیں اور ذہن کے دریچوں میں گزرا ہوا ماضی اُبھرنے لگا۔ پھر میری آواز اُبھری۔ "دل تو میرا بھی چاہتا ہے نومی، مگر کیا کروں ان لوگوں کے درمیان جا کر؟ کوئی نہیں ہے میرا۔ اور کوئی ہوتا بھی تو اب ان میں میرا داخلہ کس طور پر ممکن تھا؟ دنیا سے میرا ناطہ ٹوٹ چکا ہے، پھر اس دنیا سے جی لگانے سے کیا فائدہ؟ تم ہمیشہ ایسی ہی کوئی شرارت کرتے ہو۔ لیکن یقین کرو، تمہاری یہ شرارت میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں نومی، یہ بدن، یہ انسانی ڈھانچہ جو نجانے

کتنے عرصے کے بعد تم نے مجھے دکھایا ہے، میرا اپنا ہی ہے...... ہاں، میں اسے بھول چکی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ کہاں پڑا ہوا ہے؟ لیکن یہ شاید میرا انتظار کر رہا تھا۔ اور تمہاری شرارت نے مجھے ماضی کے تلخ غاروں میں دھکیل دیا۔ نومی، مجھے اجازت دو کہ میں یہ ناپاک بدن چھوڑ دوں جس کی کثافتیں مجھ پر مسلط ہو گئی ہیں۔ مجھے وہ آزادی پسند ہے نومی جو مجھے فطرت کی جانب سے ملی ہے۔ ہاں...... میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ میں یہ بدن چھوڑ رہی ہوں۔"
"ارے ارے...... سنو تو سہی شمی۔ دیکھو یہ تو ہمارے دائرہ اختیار میں ہے۔ بھلا ہمیں یہ بدن چھوڑنے سے کون روک سکتا ہے؟ جن چیزوں سے ہمارا ناطہ کٹ چکا ہے اب ہمیں کوئی بھی ان سے رابطہ رکھنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔ یہ تو بس ایک تجربہ ہے، ایک تفریح ہے جس کے بارے میں ہم عرصہ تک باتیں کرتے رہیں گے۔ آخر کوئی نہ کوئی موضوع تو تلاش کرنا ہی ہوگا۔ پرانی باتیں دہراتے دہراتے نجانے کتنا وقت بیت چکا ہے۔"
"ہاں...... نجانے کتنا؟ شاید پچاس سال...... ہاں نومی، پچاس سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔ چھوٹی سی تھی میں۔ ہاں، بڑا خوبصورت تھا میرا گھر، حسین ترین۔ اور وہ بوڑھا شخص جواب نجانے کہاں ہے؟ اور اب سے پہلے مجھے یاد بھی نہیں آیا، جسے میں نے کہیں تلاش نہیں کیا، زمین کے ناطے وہ میرا باپ تھا۔ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا، مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے محبت طوفان بن کر اُمنڈتی تھی اور میں اس طوفان میں ڈوب جایا کرتی تھی۔ بے پناہ چاہتا تھا مجھے، اور میں بھی اُسے اتنا ہی چاہتی تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی نومی کہ اُسے میری ماں سے پیار تھا۔ اتنا چاہتا تھا وہ کہ میری ماں نے اُس کا ساتھ چھوڑا تو کئی سال تک ہسپتال میں داخل رہا۔ نیم دیوانہ ہو گیا تھا وہ۔ اور اگر میں اپنی ماں کے خدوخال نہ اختیار کر لیتی تو شاید اُس کی دیوانگی اسے بہت پہلے موت کی وادیوں میں لے جاتی۔ لیکن ڈاکٹروں نے مجھے اُس کے سامنے پیش کیا۔ شاید یہ کوئی نفسیاتی علاج تھا، اور مجھے دیکھ کر وہ پھر سے جی اُٹھا۔ اُس نے اپنی تمام محبتیں میرے لئے وقف کر دیں۔ یہ دوسری محبت تھی۔ میرے خدوخال اُس کی محبوبہ سے ملتے تھے اور میں اُس کی بیٹی تھی۔ یہ دونوں محبتیں مجھے حاصل ہو گئیں اور وہ زندگی کی جانب لوٹ آیا...... دولت مند آدمی تھا، دولت کی کمی نہ تھی۔ اُس کے ہرکاروں نے اُس کا کاروبار اُس کی عدم موجودگی میں بھی بڑی وفاداری سے سنبھال رکھا تھا۔ اور بعد میں بھی یہی ہوا۔ اُس کی محبتیں میرے لئے وقف تھیں اور وہ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ زندگی میں کبھی اُس نے کسی دوسری عورت کی آرزو نہ کی۔ بس میری ذات کا ایک ایک لمحہ اُس کی زندگی تھا، اور میں بھی اُس محبت کرنے والے باپ کو بے پناہ چاہتی تھی۔ سو اُس نے سوچا کہ دستورِ زمانہ نبھانا تو ضروری ہے، مجھے بھی زندگی کے اس محور میں شامل کر دے جو ماہ و سال سے انسانوں کے گرد مسلط ہے۔ سو اُس نے تلاش کیا میرے لئے کسی ایسے نوجوان کو جو دولت مند نہ ہو اور میرے ساتھ اس کی کوٹھی میں زندگی گزارنا پسند کرے۔ حالانکہ میرا باپ اس قدر دولت مند تھا کہ اگر وہ چاہتا تو میرے لئے بہت سے اچھے گھرانے مل سکتے تھے۔ ایسے گھرانے جو بخوشی مجھے اپنا لیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شکل و صورت میں سینکڑوں لڑکیوں میں ایک تھی اور لڑکی ہونے کے

ساتھ ساتھ دولت بھی رکھتی تھی جس کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے۔

لیکن نجانے میرے باپ کی سوچ کیسی تھی؟ وہ صرف ایسا لڑکا چاہتا تھا جو اُس کی بیٹی کے ساتھ اُ کے گھر میں رہ سکے اور اُسے اپنی بیٹی سے جدا نہ ہونا پڑے۔ اور یہ نوجوان شاہد تھا۔ اُس کی ایک فرم مینجر، ایک خوبصورت اور اسمارٹ نوجوان۔ میرے باپ کی نگاہ اُس پر پڑی اور جب اُسے معلوم ہوا کہ شاہد اس دنیا میں تنہا ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور اُس نے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ شاہد کو شیشے میں اُتار لے گا۔ یہ شخص اُس کے تصورات کے عین مطابق تھا۔ پھر یوں ہونے لگا کہ شاہد ہمارے گھر آنے لگا۔ فرم کے کاموں سے ہی آتا تھا۔ سہما سہما سا، ڈرا ڈرا سا۔ میرے والد اپنے ملازمین کے ساتھ بہت سخ تھے اور اُن کے سارے ملازم اُن کی سخت مزاجی سے واقف تھے اس لئے ان سے خوفزدہ رہتے تھے۔ پ ایک شام میں نے اُس خوفزدہ نوجوان کو دیکھا۔ میں اس وقت اپنی کوٹھی کے لان میں چہل قدمی کر رہ تھی۔ میرے والد گھر میں موجود نہیں تھے۔ وہ نیلے رنگ کی ایک کار سے اُترا، شربتی رنگ کے خوبصورت لباس میں ملبوس، چھریرے بدن کا مالک، سیاہ بالوں کے مختلف گچھے اُس کے دودھ جیسے سفید چہرے خوب سج رہے تھے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جوانی کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ وہ میری طرف ہی گیا۔

''معاف کیجئے، سیٹھ ابراہیم صاحب گھر پر موجود ہیں؟''

''آپ کو نظر آ رہے ہیں؟'' میں نے سوال کیا اور میرے سوال پر وہ بوکھلا گیا۔

''مم...... میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو ڈسٹرب کیا۔'' اُس نے کہا۔

''کتنی بار معافی مانگیں گے آپ؟'' میں نے پوچھا اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ پھر بولا۔

''آپ کون ہیں؟''

''سیٹھ ابراہیم بہرطور نہیں ہوں۔'' میں اُس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''مِس ابراہیم ہیں؟'' وہ مسکرایا۔

''اس میں مسکرانے کی کیا بات ہے؟''

''دیکھئے خاتون، مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ سیٹھ صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔ اس سے قبل اگ آپ نے مجھے کسی قدر بدحواس محسوس کیا ہے تو وہ صرف سیٹھ صاحب کی وجہ سے۔ میں اُن کے علاوہ کس اور سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اور پھر آپ تو ڈرنے کی چیز نہیں ہیں۔''

''بے تکلف ہونا چاہتے ہیں؟'' میں نے اُسے گھور کر کہا۔

''حرج بھی کیا ہے؟ صرف اتنا بتا دیں کہ سیٹھ صاحب کتنی دیر میں آئیں گے؟ تاکہ میرے رُکنے جواز پیدا ہو جائے۔ یوں بھی بہت ضروری کام ہے اُن سے۔''

''مگر میں آپ سے بے تکلف نہیں ہو سکتی۔''

''میں مجبور نہیں کروں گا آپ کو۔''

''ڈیڈی ایک گھنٹے میں آجائیں گے۔ اُنہوں نے مجھے فون کیا تھا۔''

''گویا میرا اندازہ درست نکلا۔ آپ مِس ابراہیم ہیں۔ خادم کو شاہد پرویز کہتے ہیں۔''

''آپ ڈرائنگ رُوم میں اُن کا انتظار کریں۔ اندر چلے جائیں۔''

''اوہ...... وہاں گھٹن ہوگی۔ آپ اجازت دیں تو میں اس بنچ پر بیٹھ جاؤں؟'' اُس نے ایک طرف اشارہ کرکے کہا اور میں ناک سکوڑ کر خاموش ہوگئی۔ وہ مسکراتا ہوا بنچ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں چہل قدمی کرنے لگی۔ لیکن ذہن اُس کی طرف تھا۔ تب اُس کی آواز اُبھری۔ ''آپ میرا قرض نہیں ادا کریں گی مس ابراہیم؟''

''کیا......؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''میں نے آپ کو اپنا نام بتایا ہے۔ آپ پر بھی فرض ہو گیا کہ آپ اپنا نام مجھے بتائیں۔ یہ ایک طرح کا اخلاقی فرض ہے۔''

اسی وقت ایک ملازم ہمارے پاس آ گیا۔ ''شمی بی بی...... چائے لگا دُوں یا صاحب کا انتظار کریں گی؟''

''انتظار کروں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''شاہد بابو، آپ کے لئے چائے لے آؤں؟'' ملازم اُسے پہچانتا تھا۔

''ضرور فضل بھائی، میں انتظار نہیں کروں گا۔'' اُس نے جواب دیا اور ملازم چلا گیا۔

میں اُسے گھورتی رہی، پھر بولی۔ ''یہ فضل تمہیں کیسے جانتا ہے؟''

''میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں مس شمی۔ خادم ہوں آپ کا۔ سیٹھ صاحب کی فرم کا مینجر ہوں۔'' اُس نے جواب دیا۔ ملازم کی وجہ سے اُسے میرا نام معلوم ہو گیا تھا۔ کمینہ مجھے جلاتا رہا، چائے پیتا رہا۔ اس دوران میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

پھر ڈیڈی آ گئے۔ وہ وقت سے پہلے ہی آ گئے تھے۔ میں کسی قدر جزبز ہو گئی تھی۔ لیکن ڈیڈی کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ وہ اُس سے بات کرنے لگے۔ اُنہوں نے اور چائے منگوالی تھی۔ کافی دیر تک وہ بیٹھا رہا، کچھ دیر کاروباری گفتگو ہوئی اور پھر ڈیڈی سے اجازت لے کر چلا گیا۔ میرے ذہن پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا لیکن اُس کے جانے کے بعد ڈیڈی اُس کی تعریفیں کرتے رہے۔ وہ اُس سے بہت متاثر تھے۔ دوسرے دن مجھے اُس کا فون ملا۔ وہی شرارت بھری باتیں، وہی گفتگو۔ مجھے اُس کی گفتگو دلچسپ معلوم ہوئی تھی۔ پھر وہ اکثر ہمارے ہاں آتا رہا۔ ڈیڈی اُسے بہت زیادہ لفٹ دینے لگے تھے۔ شاید ڈیڈی نے اس سے کوئی بات بھی کرلی تھی اور اُسے اجازت دے دی تھی کہ وہ مجھ سے گھل مل جائے۔ ایک آدھ بار ڈیڈی نے خود بھی مجھ سے اُس کے ساتھ جانے کی سفارش کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اُس سے مانوس ہونے لگی۔ غالباً یہی میرے ڈیڈی کا مقصد تھا۔ اُنہوں نے اُس کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی، بس اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اُن کے خیال پر پورا اُترتا ہے۔ میں چونکہ زندگی کے اس رُخ سے واقف نہیں تھی اس لئے یہ پہلا شخص میری دلچسپی کا باعث بن گیا۔ اور جب ڈیڈی نے اُس کے بارے میں مجھ سے سوال کیا تو میرے چہرے پر شرم کے تاثرات پھیل گئے۔

"کیسا لگتا ہے وہ تمہیں......؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"عجیب سوال ہے ڈیڈی...... ایک شریف آدمی ہے۔ اچھا ہے اور بس۔" میں نے جواب دیا اور ڈیڈی سنجیدہ ہو گئے۔ پھر پُر خیال انداز میں بولے۔

"دراصل شمی بیٹی، تم میری دلی واردات سے اچھی طرح واقف ہو۔ ہم ان غم آلود قصوں کی جانب نہیں جائیں گے جن کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن اتنا میں تمہیں ضرور بتانا پسند کروں گا کہ تمہارے علاوہ میری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ شادی ایک اہم فریضہ ہے، اور میں جانتا ہوں کہ مجھے ایک نہ ایک دن یہ فریضہ پورا کرنا ہے۔ البتہ میری خواہش تھی مجھے کوئی ایسا نوجوان مل جائے جو تمہارے معیار پر بھی پورا اُترے اور میں اُسے اپنے ساتھ رکھ سکوں۔ شاہد اس سلسلے میں میرے لئے باعث دلچسپی ہے۔ وہ تنہا ہے اور کوئی بھی نہیں ہے اُس کا۔ اگر تم پسند کرو تو میں اُس سے تمہاری زندگی کے بارے میں بات چیت کروں؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن ڈیڈی نے خود ہی میری مرضی کا یقین کر لیا تھا۔ مجھے خاموش پا کر وہ بولے۔ "تو میں یہ سمجھوں کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

"میں نے آپ کی کسی بات پر کبھی اعتراض نہیں کیا ڈیڈی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

اور پھر نومی...... شاہد میری زندگی میں داخل ہو گیا۔ کھلنڈرا سا اور شوخ سا نوجوان۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ زندگی میں محرومیوں کا شکار رہا ہے، کوئی بھی نہیں ہے اُس کا۔ اور میرے مل جانے سے اُسے دلی مسرت ہے۔ چنانچہ میں خلوصِ دل سے اُس کی شریک زندگی بن گئی۔ میں نے اپنی تمام تر محبت اُس پر نچھاور کر دی اور شاہد ہم میں گھل مل گیا۔ ڈیڈی نے اُسے ہر سہولت فراہم کر دی تھی۔ اب وہ اس فرم کا منیجر نہیں بلکہ ایک طرح سے مالک تھا۔ البتہ ڈیڈی اصول پرست آدمی تھے۔ اخراجات کے معاملے میں وہ ہمیشہ ہی سنجیدہ رہتے تھے اور ایک حد پسند کرتے تھے۔ لیکن یہ حدود شاہد کو پسند نہیں تھیں۔

"کیسی تکلیف دہ بات ہے شمی، ہم لوگ اتنی بڑی دولت، اتنی وسیع جائیداد کے مالک ہیں لیکن شادی کے بعد ایک بار بھی اس کا موقع نہیں ملا کہ ملک سے باہر جاتے، دنیا دیکھتے۔ میرے دل میں بڑی آرزو ہے کہ میں ملک ملک کی سیر کروں۔"

"تو ڈیڈی سے بات کرو۔"

"میں بات کروں؟ میں تمہیں ایک بات بتا دوں شمی، لیکن شرط یہ ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گی۔"

"کیا بات ہے؟"

"پہلے تم اس بات کا وعدہ کرو کہ تم کبیدہ خاطر نہ ہو گی اور نہ ہی میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار۔"

"چلو وعدہ......"

"تمہارے ڈیڈی نے تمہارے ساتھ میری شادی کر کے ایک گھر داماد خریدا ہے اور وہی مثالی روایت قائم کی ہے جو گھر دامادوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ میں آج بھی اُن کی فرم کا منیجر ہوں اور مجھے وہ

حیثیت حاصل نہیں جو کہ ہونی چاہئے تھی۔"

"تمہیں کہاں اس کا احساس ہوتا ہے شاہد؟" میں نے سوال کیا۔

"ہر جگہ...... مجھے بتاؤ، تمہارا شوہر ہونے کے باوجود میرا کس چیز پر حق ہے؟ میں تو اپنی پسند کی ایک کار بھی نہیں خرید سکتا۔"

"تم اپنی پسند کی چار کاریں خرید لو شاہد...... میں تمہیں رقم دوں گی۔"

"تم دو گی نا...... یہ فرق ہے مجھ میں اور تم میں شمی۔" وہ تلخی سے مسکرایا۔

"تم ان باتوں کو محسوس مت کرو شاہد۔ میں ڈیڈی سے بات کروں گی۔"

"نہیں شمی...... میری سبکی ہو گی۔ تم اُن سے کوئی بات نہ کرنا۔" اُس نے کہا اور میں خاموش ہو گئی۔

لیکن میں نے بعد میں ڈیڈی سے اس موضوع پر بات کی اور ڈیڈی مسکرانے لگے۔

"شوہر کی حمایت میں لڑنے آئی ہو مجھ سے؟ پگلی یہ بتا کہ میں اس دولت کا کیا کروں گا؟ میرے کس کام آئے گی یہ؟ تم دونوں کے لئے ہی ہے۔ لیکن کچھ توقف کرو۔ شاہد بہت اچھا لڑکا ہے لیکن بہرحال اجنبی ہے۔ پہلے اسے پرکھ لوں۔ یہ کام جاری ہے، میرے چند خاص آدمی اُس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس کے بعد سب کچھ تم دونوں کو سونپ دوں گا۔"

"عجیب بات ہے ڈیڈی...... آپ اب اُسے پرکھ رہے ہیں جب وہ میری تقدیر کا مالک بن چکا ہے۔ میں کہتی ہوں وہ اچھا انسان ہے۔ کوئی خرابی نہیں ہے اُس میں۔ اُسے کسی محرومی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔"

"مگر وہ کیا چاہتا ہے......؟"

"اُسے کوئی حیثیت دی جائے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ ملک سے باہر جانا چاہتا ہے۔ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔"

"تم بھی اُس کے ساتھ جاؤ گی؟"

"ہاں ڈیڈی۔"

"اور میں......؟" ڈیڈی نے درد بھرے لہجے میں پوچھا اور میں ایک دم خاموش ہو گئی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں نے خود غرضی کی ہے۔

"آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے ڈیڈی۔"

"ارے نہیں بھئی۔ میں تو مذاق کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے، تم دونوں گھوم آؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"نہیں ڈیڈی...... میں آپ کے بغیر نہیں جاؤں گی، یہ میرا فیصلہ ہے۔" میں نے کہا اور ڈیڈی ہنسنے لگے۔ بہرحال ڈیڈی نے اُسے کچھ اختیارات دیئے اور وہ خوش ہو گیا۔

چند ہفتوں کے بعد اُس نے دوبارہ باہر جانے کی ضد شروع کر دی۔

"میں کب منع کرتی ہوں شاہد؟ لیکن ہم ڈیڈی کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔"

"کیا......؟" اُس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں...... میں ڈیڈی کو تنہا نہیں چھوڑوں گی۔"

"تو پھر کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں کیا برا ہے؟" اُس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تم ڈیڈی کو ناپسند کرتے ہو شاہد؟"

"یہ بات نہیں ہے شمی۔ بس ہمیں آزادی نہیں مل سکے گی۔ بات یہ ہے کہ میں ذہنی طور پر آج بھی خود کو اُن کا ملازم سمجھتا ہوں اور اُن سے بے تکلف نہیں ہو پاتا۔"

"بہر حال، جیسا تم پسند کرو۔"

ہم نے باہر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ خود ہی ڈیڈی ہمارے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوئے تھے۔ ہم دنیا دیکھنے نکل گئے۔ استنبول، روم، پیرس، لندن، سوئٹزرلینڈ اور نجانے کہاں کہاں...... ڈیڈی اس دوران مجھے بہت یاد آتے رہے تھے۔ مجھے اُن کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس کے علاوہ شاہد میں بھی کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ ایک رات اُس نے شراب بھی پی تھی جس پر پہلے تو مجھے حیرت ہوئی اور اس کے بعد شدید غصہ آیا۔ شاہد نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی، لیکن میں نے اچھی طرح محسوس کیا تھا کہ اب اُس کے وہ جذبات نہ رہے تھے جو چند روز پہلے تھے۔ وہ مجھ سے کترانے لگا تھا اور اکثر تنہا گھومنے نکل جاتا تھا۔ طرح طرح کے بہانے تراشتا تھا۔ ایک بار مجھے شبہ ہوا تو میں نے اُس کا تعاقب کیا اور پہلی بار میرا دل خون ہو گیا۔ میں نے شاہد کو ایک فرانسیسی عورت کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ دونوں بالآخر ایک ہوٹل کے کمرے میں بند ہو گئے تھے......

میں نے کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی اور خاموشی سے واپس آ گئی۔ اُس رات شاہد ہوٹل واپس نہیں آیا تھا۔ رات کو تیز بارش ہوئی تھی اور میں ساری رات ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھی خاموش سڑکوں کو گھور رہی تھی۔ اُس رات مجھے ڈیڈی کی باتیں یاد آئی تھیں۔ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے، پہلے شاہد کو پرکھ لیا جائے، اس کے بعد اُسے آزادی دی جائے۔ شاہد میں آوارگی کے جراثیم تھے۔ وہ چھوٹا انسان تھا۔ ذہنی طور پر چھوٹا تھا، اور ذہنی طور پر چھوٹے انسان کو جب دولت مل جاتی ہے تو وہ بہت پست ہو جاتا ہے۔ لیکن قصور ڈیڈی کا بھی تھا۔ یہ سب کچھ تو اُنہیں شادی سے قبل سوچنا چاہیے تھا۔ شاہد میری پسند تو نہیں تھا، میں نے اُس سے محبت تو نہیں کی تھی۔ بس ڈیڈی اُسے میرے سامنے لائے اور ایک خاص مقصد کے تحت لائے۔ میں نے اُن سے اعتراض نہیں کیا اور وہی کچھ کیا جو اُن کی اپنی خواہش تھی۔ اس خواہش کی تکمیل کے بعد شاہد کے بارے میں شک وشبہ کیا معنی رکھتا تھا؟ یہ تو ان کا فرض تھا کہ وہ اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرتے اس کے بعد فیصلہ کرتے۔ اور حقیقت وہی نکلی۔ شاہد اب دولت میں کھیلنے لگا تھا اور یہ دولت اب اُس کی آنکھوں پر پردے گراتی جا رہی تھی۔

وہ صبح کو واپس آیا۔ چہرے پر شرمندگی اور گزری ہوئی رات کی نحوست کے آثار منجمد تھے۔ مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ پشیمان سے لہجے میں بولا۔ "مجھے احساس ہے کہ تمہیں بڑی تکلیف سے یہ رات گزارنی پڑی ہوگی۔ لیکن میں کیا کروں؟ چند لوگوں سے شناسائی ہو گئی ہے۔ بس اُنہوں نے دعوت دے ڈالی تھی۔ پھر میں اس دعوت میں تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور کچھ ایسی تیز ہوئی کہ واپس نہ آ سکا۔"

بڑا گھٹیا سا بہانہ کیا تھا اُس نے۔ لیکن میں نے اُس پر حقیقت منکشف نہیں کی۔ یہ نہیں بتایا میں نے اُسے کہ میں اُس کی اصلیت سے واقف ہو چکی ہوں۔ بس میں نے ایک ہی بات کہی۔

"شاہد...... ہم واپس چلیں گے۔"

"ایں...... کیا کہہ رہی ہو؟ میرا مطلب ہے ابھی سے؟ ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے؟"

"شاہد...... ہم واپس چلیں گے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس وقت تو اُس نے کچھ نہیں کہا، لیکن بعد میں خاصی برہمی کا اظہار کیا تھا۔

"ابھی تو ہمارے پاس کافی وقت ہے شمی۔ اتنی جلدی کیا ہے؟ ابھی دل بھی نہیں بھرا اور تم واپس جانے کی بات کر رہی ہو؟"

"میں نے تم سے آخری بات کہہ دی ہے شاہد۔ اگر تم نہیں جانا چاہتے تو تم رُک جاؤ۔ میں واپس چلی جاتی ہوں۔" میں نے بدستور سختی سے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے بھلا؟ خیر اگر تم واپس ہی جانا چاہتی ہو تو میں تیار ہوں۔" اُس نے بے دلی سے کہا اور پھر نہایت بے دلی سے واپس چل پڑا۔

میرا ذہن سپاٹ تھا، کوئی بات نہیں سوچ رہی تھی میں۔ ہاں، یہ فیصلہ ضرور کر لیا تھا کہ ڈیڈی سے اس بارے میں بات کروں گی اور کہوں گی، شاہد کی طرف سے محتاط رہنا بے حد ضروری ہے۔ وہ اس مزاج کا انسان نہیں ہے جس کا ہم نے سمجھا تھا۔ وہ چھوٹا آدمی ہے اور یقیناً آئندہ بھی وہ چھوٹی حرکتیں کرے گا۔

گھر واپس پہنچی تو ایک عجیب سا ماحول پایا۔ ملازم سہمے سہمے تھے اور مجھے دیکھ کر بھونچکے سے ہو گئے تھے...... اور پھر ہمارے دو دیرینہ ملازم میرے پاس آ کر رونے لگے اور میں دھک سے رہ گئی۔

"کیا بات ہے......؟"

"آپ...... آپ کو نہیں معلوم ہو سکا بی بی؟" فضل بابا نے پوچھا۔

"کیا نہیں معلوم ہو سکا؟" میں متحیرانہ انداز میں بولی اور فضل کی بھیگی ہوئی آنکھیں مجھے بتانے لگیں۔ میں نے وحشت زدہ انداز میں فضل بابا کو جھنجھوڑ دیا۔

"کس بارے میں کہہ رہے ہو فضل بابا...... بتاتے کیوں نہیں؟"

"صاحب...... صاحب......" فضل بابا گھٹی ہوئی آواز میں بولے۔

"ہاں...... کیا ہو گیا صاحب کو؟"

"بی بی...... وہ آپ کے جانے کے پندرہ دن بعد ہی...... بس دل کا دورہ پڑا تھا آپ کو یاد کرتے رہتے۔" فضل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے حواس گم ہو گئے...... مجھے یاد نہیں رہا کہ میں نے کیا کچھ کیا اور کب تک کرتی رہی...... ہوش آیا تو بس تنہا تھی۔ ملازمین کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا میرے پاس۔ شاہد بھی نہیں تھا۔ میں نے نقاہت بھرے لہجے میں شاہد کے بارے میں پوچھا بشیرن نے بتایا کہ صاحب تو بہت کم گھر آتے ہیں۔ بس کبھی دن میں آ جاتے ہیں کبھی رات کو۔ دفتری کاموں میں اُلجھے رہتے ہیں۔

غم والم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے مجھ پر۔ ڈیڈی نے ساری زندگی مجھے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ دنیا ترک کر دی تھی اُنہوں نے میرے لئے۔ لیکن میں نے نئی زندگی پاتے ہی اُنہیں نظر انداز کر دیا تھا۔ میں اُنہیں چھوڑ کر چلی گئی اور میری جدائی وہ برداشت نہیں کر سکے۔ لیکن ڈیڈی کے انتقال کو کئی ماہ گزر گئے تھے۔ ہمیں خبر بھی نہ دی گئی، حالانکہ بے شمار لوگ موجود تھے۔ ملازم تھے ہمارے، مجھے اُن لوگوں پر شدید غصہ آیا۔ میں نے اسی وقت تنویر کو فون کیا۔ تنویر صاحب ہماری ایک فیکٹری کے نگران تھے۔ میں نے بچپن سے اُنہیں دیکھا تھا۔ ڈیڈی اُن پر بہت اعتماد کرتے تھے۔

''تنویر صاحب، میں شمی بول رہی ہوں۔''

''کیسی طبیعت ہے شمی بیٹی؟ ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے......''

''ڈاکٹر اور طبیعت کو جہنم میں جھونکیں۔ مجھے اس بات کا جواب دیں کہ آپ کو ہمارے بارے میں معلوم نہیں تھا؟''

''میں سمجھا نہیں بیٹی!؟''

''مجھے ڈیڈی کی موت کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟''

''اطلاع تو دے دی گئی تھی۔'' تنویر صاحب تعجب سے بولے۔

''کیسے دے دی گئی تھی؟''

''آپ سوئٹزر لینڈ میں تھیں۔ کیبل کا جواب بھی ملا تھا شاہد صاحب کی طرف سے۔''

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں تنویر صاحب......''

''جوابی تار میرے پاس موجود ہے شمی بیٹی۔''

''لے کر آئیں میرے پاس۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ غم و غصے سے میری کیفیت بہت خراب ہو رہی تھی۔ تنویر صاحب اتنا بڑا جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے۔ لیکن شاہد نے یہ بات کیوں چھپائی مجھ سے؟ اُس نے اتنے عرصے تک مجھے کچھ نہیں بتایا اور پھر خود ہی اس کا جواب بھی دے دیا۔ شاہد تو رنگ رلیاں منانے آیا تھا، وہ بھلا فوری واپسی کب پسند کرتا؟ اُسے خود بھی تو واپس آنا پڑتا۔

تنویر صاحب نے شاہد کا جواب میرے سامنے رکھ دیا۔ لکھا تھا۔ ''سخت غم ہوا۔ شمی نڈھال ہے۔ ابھی اُسے واپس لانا ٹھیک نہیں ہے۔ اسے بہلانے کے لئے رُکنا ضروری ہے۔ آپ تمام امور کی نگرانی کریں......شاہد۔''

''فریبی شاہد......کہاں ہے وہ......وہ کہاں ہے تنویر صاحب؟''

''معلوم نہیں بیٹی۔ وہ بہت کم نظر آتے ہیں۔ تمام کام ان دنوں اُن کا سیکرٹری محسن دیکھ رہا ہے۔ بڑی پریشانیاں ہوتی ہیں شاہد صاحب کے بغیر۔'' تنویر صاحب نے جواب دیا۔

''باقاعدہ نظر نہیں آتا......پر کہاں رہتا ہے؟''

''خدا جانے۔''

میں سوچ میں ڈوب گئی۔ شاہد کی فطرت سے واقف ہو گئی تھی ورنہ خوش فہمیوں کا شکار رہتی۔ تنویر

صاحب کے جانے کے بعد نجانے کب تک سوچتی رہی، پھر ملازموں کو بلا کر شاہد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ پتہ چلا کہ وہ گھر میں بہت کم نظر آتا ہے۔ بہرحال اس شام وہ واپس آ گیا۔ مجھے ہوش و حواس میں دیکھ کر اُس نے کسی خاص جذبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بس یونہی رسمی طور پر طبیعت پوچھ لی تھی۔ لیکن میں نے تار اُس کے سامنے رکھ دیا......

''تم نے مجھے ڈیڈی کی موت کی اطلاع کیوں نہیں دی شاہد؟''

''اوہ یہ...... یہ کہاں سے آیا تمہارے پاس؟''

''یہ جواب ہے تمہارا؟''

''نہیں......بس پوچھ رہا تھا۔ میری ہمت نہیں پڑھ رہی تھی شمی۔ یہ غمناک خبر میں تمہیں نہ سنا سکا۔ تمہیں صدمہ ہوتا۔''

''ڈیڈی مر چکے تھے اور ہم رنگ رلیاں مناتے پھر رہے تھے......''

''میں نے سوچا اب تو وہ مر ہی چکے ہیں۔ واپس آ کر تمہیں اطلاع ہو جائے گی۔''

''یہ کیوں نہیں کہتے شاہد کہ تمہاری تفریحات ترک ہو جاتیں؟ تمہیں واپس آنا پڑتا۔ اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟''

''تمہیں میری نیک نیتی پر شک نہیں کرنا چاہئے شمی۔''

''میں جانتی ہوں تم کتنے نیک نیت ہو۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''مجھے افسوس ہے شمی، لیکن میری طرف سے غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ مجھے اندازہ ہے کہ لوگ تمہیں بہکا رہے ہیں۔ تمہاری صحت پہلے ہی خراب ہے۔''

''کتنے دنوں بعد گھر آئے ہو؟'' میں نے طنز سے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونک کر بولا۔

''میری صحت کی طرف سے بہت فکرمند لگتے ہو۔'' میں بدستور طنزیہ انداز میں بولی۔

''شمی، میں سمجھ گیا ہوں...... میں جان گیا ہوں کہ کون تمہیں میرے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ لیکن شمی، ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ گھر کے ملازمین اور دفتروں میں کام کرنے والے طبعاً گھٹیا ہوتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں صرف ایک بات ہوتی ہے کہ مالکان کی ہمدردیاں حاصل کریں اور اپنا مالی مفاد پورا کریں۔ تنویر صاحب بھی اس قسم کے لوگوں میں سے ہیں۔ اب میرا تجربہ اتنا بھی محدود نہیں ہے کہ میں انسانوں کے بارے میں اندازہ نہ لگا سکوں۔ یہ تار اُنہوں نے محفوظ رکھا اور بالآخر تم تک پہنچا دیا۔ اس کی وجہ پر غور کیا تم نے؟ وہ صرف تمہاری توجہ چاہتے تھے کہ تم اُن کی ہمدردی پر غور کرو، اُن پر بھروسہ کرو، اس کے بعد وہ اپنے مسائل تمہارے سامنے لائیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد تم اپنے ہمدردوں کے بارے میں نہ سوچو گی تو کس کے بارے میں سوچو گی؟ یہ لوگ میری طرف سے تمہیں بہت زیادہ بہکا دیں گے۔ چونکہ اس میں ان کی جیت ہے۔''

''نہیں شاہد صاحب...ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا آپ نے تنویر صاحب کو یہ بھی لکھ دیا تھا کہ آپ

نے مجھے ڈیڈی کی موت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ اور شاہد لاجواب ہو گیا۔ ظاہر ہے بیچارے تنویر صاحب کو یہ بات کیا معلوم تھی کہ شاہد نے مجھے ڈیڈی کی موت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس لئے شاہد کا یہ اعتراض خود بخود ختم ہو گیا تھا۔

”بہر صورت......“ شاہد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں محسوس کر رہا ہوں شمی کہ میرے لئے حالات نہایت ساز گار ہوتے جا رہے ہیں۔ میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ شروع سے لے کر اب تک میں صرف ایک کھلونے کی حیثیت رکھتا ہوں۔ ڈیڈی مرحوم نے مجھے ایک تنہا آدمی پایا اور اپنی بیٹی کے لئے ایک گھر داماد حاصل کر لیا یہ سوچ کر کہ میں ان کا دست نگر رہوں گا اور ان کے احکامات پر عمل کرتا رہوں گا۔ انتقال ہوا اُن کا تو وہ ساری دولت اور ساری جائیداد تمہارے نام کر گئے۔ ظاہر ہے ان کے ذہن میں یہ بات ہو گی کہ میں ایک اجنبی شخص ہوں اور اسی طرح ان کی بیٹی کا غلام بن کر رہ سکتا ہوں کہ ان کا دست نگر رہوں۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں شمی، ایک حقیقت میں تمہارے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میں وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکا جو مجھے ملنی چاہئے تھی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں تمہارے گھر میں صرف ایک ڈمی ہوں اور شمی، ڈمی بن کر انسان خوش نہیں رہ سکتا۔ بس مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ تم اپنے ملازمین سے رابطہ رکھو، ان سے دوستیاں کرو، جو کچھ وہ کہیں اس پر غور کرتی رہو۔ مجھے ذلیل و رُسوا سمجھو، میں تمہیں اس سے نہیں روک سکتا۔“

شاہد یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور میں اُس کے بارے میں سوچتی رہی۔ میں اس مکار آدمی پر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ فرانس میں اگر میں اُسے اس انداز میں نہ دیکھ لیتی تو شاید یہی سمجھتی کہ شاہد کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ لیکن جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ غلط نہیں تھا اور اس کے بعد میں کسی حماقت کا شکار نہیں ہو سکتی تھی۔ شاہد پر قابو رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اُس کی لگامیں کھینچ رکھوں اور لگام کو کبھی ڈھیلا نہ ہونے دُوں...... یہ بات اس سے قبل مجھے نہیں معلوم تھی کہ ڈیڈی جائیداد کے بارے میں کوئی وصیت نامہ چھوڑ گئے ہیں، نہ ہی میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ میری تو حالت ہی درست نہیں تھی۔ لیکن شاہد یہ بات بھی مجھے بتا گیا تھا۔ یقیناً اُسے ان ساری چیزوں سے دلچسپی ہو گی۔ ڈیڈی کی بات نہ مان کر میں نے شدید نقصان اُٹھایا تھا۔ اگر شاہد کو باہر کی دنیا کی ہوا نہ لگتی تو شاید وہ انسان ہی رہتا۔ لیکن میں نے اُس کی اصلی تصویر دیکھ لی تھی اور اب میں شاید اُس پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ ڈیڈی کر گئے ہیں اب اس سے قطعاً انحراف نہ ہو گا۔

شاہد حسب معمول اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ میں اُسے کسی بات کا پابند نہیں کر سکی تھی۔ جب دل چاہتا وہ گھر آ جاتا، جب دل چاہتا چلا جاتا۔ ابتداء میں، میں نے اُس سے پوچھا لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ پا سکی۔ ہاں کئی بار اُس نے مجھ سے بڑی بڑی رقمیں وصول کی تھیں، اس کے علاوہ دفتر سے بھی وہ رقمیں حاصل کرتا رہتا تھا جس کی اطلاع مجھے مل جاتی تھی۔ لیکن میں چشم پوشی کرتی رہی۔ البتہ اُس دن میں خود پر قابو نہ رکھ سکی جب مجھے شاہد کی دوسری شادی کی خبر ملی......

شاہد نے ایک اور شادی کر لی تھی۔ نجانے کب؟ ممکن ہے مجھ سے شادی سے قبل ہی وہ شادی شدہ

ہو۔ اس جیسے شخص کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ خبر مجھے بالکل غیر متعلق آدمی سے ملی تھی۔ یہ ایک اسٹیٹ بروکر تھا جو شاہد سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔ شاہد نے اپنی بیوی کے لئے ایک بنگلہ خریدا تھا۔ اس کے کاغذات کی تکمیل کے لئے بروکر یہاں آ گیا تھا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ میں بھی شاہد کی بیوی ہوں۔ لیکن چند ایسی باتیں ہوئیں کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شاہد نے یہ بنگلہ اپنے بیٹے کے نام سے خریدا ہے...... فراز شاہد۔ یہ اُس کے بیٹے کا نام تھا۔ اسی بات سے میں نے سوچا تھا کہ ممکن ہے مجھ سے پہلے ہی وہ شادی شدہ ہو...... غم و غصے سے میں پاگل ہو گئی تھی۔ شاہد آیا تو میں طوفان بنی بیٹھی تھی جو اُسے دیکھتے ہی بپھر گیا۔

”تم پہلے سے شادی شدہ ہو شاہد، یا میری تقدیر پھوڑنے کے بعد تم نے یہ شادی کی تھی؟ جواب دو شاہد......“

اور شاہد کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ لیکن پھر سنبھل گیا۔ ”تمہیں یہ خبر کس نے دی ہے شمی؟“

”میری بات کا جواب دو شاہد...... مجھے صرف جواب درکار ہے۔“

”وقت آ گیا ہے شمی کہ میں تم پر اپنی حقیقت کھول دُوں۔ ہمارے دشمنوں نے ہمارے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔ اتنی وسیع کہ اگر میں تمہیں حقیقت حال سے روشناس نہ کروں تو نجانے کیا کیا ہو جائے۔ آؤ شمی، براہِ کرم اس وقت تک کے لئے برے خیال ذہن سے نکال دو جب تک کہ تم پر میری حقیقت واضح نہ ہو جائے۔ آؤ، میں اس سے قبل تم سے کچھ نہ کہوں گا۔“

کچھ ایسی اداکاری کی تھی اُس نے نومی، کہ میں بیوقوف بن گئی تھی۔ میں اس اسرار کو جاننے کی خواہاں ہو گئی جس کے بارے میں شاہد نے کہا تھا۔ اور شاہد مجھے اپنی کار میں لے آیا۔ وہ بہت سنجیدہ تھا اور میرے استفسار کے باوجود خاموش رہا تھا۔ بس اُس نے ایک جملہ کہا تھا۔

”چند لمحات توقف کرو شمی۔ تم پر تمام حقیقتیں عیاں ہو جائیں گی۔“

میں اُس کا فریب نہیں سمجھی تھی اور تجسس میں ڈوبی یہاں تک آ گئی تھی۔ آخری وقت تک میں اُس کی چال نہ سمجھ سکی۔ مجھے تو اس وقت احساس ہوا جب شاہد نے مجھے اس پہاڑ کی چوٹی سے نیچے دھکیل دیا تھا...... میں گہرائیوں میں جا رہی تھی۔ لیکن شاید میری رُوح نیچے پہنچنے سے قبل ہی بدن کی قید سے آزاد ہو گئی تھی۔ میں نیچے گرتے بدن کو دیکھ رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اسے اپنے ہاتھوں میں لپک لوں۔ لیکن ان نادیدہ ہاتھوں میں اتنی قوت نہیں تھی۔ میرا بدن پانی میں آ گرا اور یہاں لگی جھاڑیوں میں اٹک گیا۔ وہ جھاڑیاں اب یہاں نہیں ہیں، پہلے تھیں۔ میرا وجود بہت ہلکا ہو گیا تھا، میں ہر فکر سے بے نیاز ہو گئی تھی اور اس کے بعد سے آج تک میں نے کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا، کوئی خیال ہی نہیں آیا مجھے۔ لیکن نجانے کیوں نومی، اس وقت مجھے سب یاد آ رہا ہے...... سب کچھ۔“

ہمیشہ شرارتوں پر آمادہ رہنے والا نومی بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔ ”آؤ دیکھیں شمی، اب وہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ دیکھو تو سہی...... پتہ تو چلے کہ شاہد

"اب کس حال میں ہے؟"

دفعتہً میرے دل میں بھی شاہد کو دیکھنے کی خواہش جاگ اُٹھی اور اس بار میں تیار ہوگئی۔ نومی میرے ساتھ پرواز کر رہا تھا......

"ہم اُس تک کیسے پہنچیں گے نومی؟"

"ہمارے لئے کیا مشکل ہے؟ چلتی رہو میرے ساتھ۔ میں تمہیں شاہد کی رہائش گاہ کے سامنے لے جا کر کھڑا کردوں گا۔ آؤ، چلتی رہو...... آؤ۔"

یہ وہ گھر نہیں تھا جہاں میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہتی تھی، کوئی نئی جگہ تھی۔ لیکن بہت خوبصورت۔ پہلی کوٹھی سے ہزار درجے حسین اور کشادہ...... سامنے کی سمت پر بڑا سا لان تھا، ایک طرف چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے جو ملازمین کے لئے تھے۔ مالکان کے حصے کی رونق دیکھنے کے قابل تھی۔ ملازم اِدھر اُدھر دوڑے پھر رہے تھے۔ ہر طرف چہل پہل تھی...... نومی ایک گھنے درخت کی شاخ پر اُلٹا جا لٹکا۔

"اب تم جانو اور تمہارا کام۔ یہ دنیا تمہاری ہے۔" اُس نے کہا۔

"یہ شاہد کی کوٹھی ہے...... مگر شاہد کہاں ہے؟"

"تلاش کرو۔" منحوس نومی پھر ہنس پڑا۔ اُس کے ہنسنے کی عادت بھلا کہاں جا سکتی تھی؟ میں اس اجنبی ماحول میں حیران تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہاں جاؤں، کیا کروں۔ بہر حال وہاں سے آگے بڑھ گئی اور اصل رہائش گاہ کی عقبی سمت نکل آئی۔ اس سمت ایک اور عمارت بنی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی عمارت جو الگ تھلگ تھی...... اُس کا بڑا سا دروازہ بند تھا۔ مجھے شاہد کی تلاش تھی۔ شاہد کہاں ہے؟...... ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے کچھ لوگ اس طرف آتے نظر آئے۔ وہ اچانک گھوم کر سامنے آ گئے تھے اس لئے میں خود کو اُن سے چھپا بھی نہیں سکی۔ چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور اُنہی میں شاہد بھی تھا۔ خوبصورت، خوبرو شاہد جو پہلے سے زیادہ حسین، پہلے سے زیادہ جوان نظر آ رہا تھا۔ میں اُسے دیکھتی رہ گئی۔ آہ، کس قدر خوبصورت لگ رہا تھا وہ۔

اُن لوگوں نے مجھے دیکھا اور ٹھٹک گئے، پھر آگے بڑھ آئے۔

"آپ...... آپ شاید بھٹک کر ادھر آ گئی ہیں خاتون۔ ملازموں نے آپ کو گائیڈ نے کیا؟ کس سے ملنا ہے آپ کو؟" شاہد نے معصومیت سے پوچھا۔

میں بغور اُسے دیکھتی رہی تھی۔ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ کمبخت کو گمان بھی نہیں ہوگا کہ میں ہوں......

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" شاہد نے پوچھا۔

"کسی سے نہیں۔ بس یونہی آ گئی تھی۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"یونہی؟" شاہد حیرانی سے بولا۔

"تم...... تم شاہد ہو نا؟" میں نے تلخ مسکراہٹ سے پوچھا اور شاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل

گئی۔

"فراز شاہد...... شاہد میرے والد کا نام ہے۔" اُس نے جواب دیا اور میں چونک پڑی۔ مجھ سے بھی تو حماقت ہوئی تھی۔ بھول ہی گئی تھی کہ یہ کوئی آج کی بات تھی؟ سالہا سال بیت گئے تھے، طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ میں نہیں بدلی تھی، مگر شاہد تو بدل گیا ہوگا۔ بوڑھا ہوگیا ہوگا وہ...... پچیس سال کم تو نہیں ہوتے...... تو یہ شاہد کا بیٹا ہے۔ فراز شاہد......

وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پھر فراز نے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں...... میں آپ کے والد سے ملنا چاہتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ، خاتون شاید آپ کسی دوسرے شہر سے آئی ہیں اور شاید آپ کو میرے والد کے بارے میں معلوم نہیں۔" فراز نے کہا۔

"کیا مطلب......؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بیمار ہیں...... شدید بیمار۔ ٹی بی ہے اُنہیں۔ دونوں پھیپھڑے گل چکے ہیں۔ ہر وقت خون تھوکتے ہیں۔ دراصل اُنہوں نے اپنی صحت اپنے ہاتھوں سے تباہ کی ہے۔ شراب کی زیادتی...... اور اب بھی باز نہیں آتے۔" نوجوان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"تو وہ کسی ہسپتال میں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں...... گھر پر ہیں، موت کا انتظار کر رہے ہیں۔" نوجوان نے کہا۔

"میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"اپنی دشمن ہیں آپ؟"

"کیوں؟" میں نے کہا۔

"اُن کا مرض شدت اختیار کر چکا ہے۔ ڈاکٹروں نے ہدایت کر دی ہے کہ ان سے قطعاً دُور رہا جائے ورنہ کوئی بھی اس مرض کا شکار ہو سکتا ہے۔"

"ہسپتال میں کیوں نہیں رکھا آپ نے اُنہیں؟"

"ہسپتال...... وہ اُنہیں موت گھر کہتے ہیں۔ موت سے اُنہیں شدید خوف محسوس ہوتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ہسپتال میں اُنہیں قتل کر دیا جائے گا۔ کئی بار اُنہیں ہسپتال اور سینی ٹوریم بھیجا لیکن بھاگ آتے ہیں وہاں سے۔ بس یہ بوڑھے لوگ بعض اوقات اولاد کے لئے دردِ سر بن جاتے ہیں۔ لاپرواہ ہو جاؤ تو زمانہ اخلاقیات کے لاکھوں سبق دوہرا دے گا۔ لیکن......"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاہد کا بیٹا بول رہا تھا۔ شاہد کا گناہ بول رہا تھا۔ یہ شاہد کی حیثیت تھی اس گھر میں جو میری دولت کو غصب کر کے حاصل کیا گیا تھا۔ ان کے لئے شاہد نے مجھے قتل کیا تھا۔ اُسے اُس کے کیے کی سزا تو ملنی ہی چاہیے تھی۔ قدرت کسی ظالم کو اس طرح تو نہیں چھوڑ دیتی۔ مجھے انوکھا سکون محسوس ہوا۔

"تو شاہد کی تیمارداری کون کرتا ہے؟"

''بس ایک بڑے میاں ہیں...... ہمارے پرانے ملازم۔ بچپن سے یہ ملازم ہمارے کام کرتے ہیں۔ معمولی سی تنخواہ اُنہیں مل جاتی ہے۔''

''تو پھر......؟'' میں نے پوچھا۔

''بس یہ ہمارے ساتھ ہیں۔ دونوں بوڑھے موت کے منتظر ہیں۔'' فراز مسکرا کر بولا۔

''کہاں ہیں وہ؟'' میں نے پوچھا اور فراز نے اس الگ تھلگ عمارت کی طرف اشارہ کر دیا جو میرے عقب میں تھی۔

''وہاں...... شاید ڈیڈی نے یہ عمارت اپنے لئے تعمیر کرائی تھی۔ اور کوئی مصرف تو نہیں ہو سکتا اس کا۔ مگر خاتون، میں نے آپ کے سوالات کے جواب تو دے دیئے، اب میری باری ہے۔ اپنے بارے میں تو کچھ بتائیں آپ۔ آپ کا محل وقوع کیا ہے؟''

''میں......؟'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ جھوٹ ہی بولا جا سکتا تھا ان سب سے۔ حقیقتوں کو برداشت کرنے کی ہمت کہاں ہوگی ان میں؟ چنانچہ میں نے کہا۔ ''میں ایک ستم رسیدہ ہوں، بے حد بد نصیب۔ یورپ میں رہتی تھی۔ میرے والد صاحب شاہد صاحب کے دوست تھے۔ ان کے سوا میرا کوئی نہیں تھا اس جہاں میں۔ لاکھوں روپے کی دولت کی وارث ہوں لیکن اس جہاں میں یکہ و تنہا ہوں۔ اپنوں کے لئے ترستی ہوں۔ مرتے ہوئے والد صاحب نے کہا تھا کہ ان کے دوست شاہد کے پاس چلی جاؤں۔ نہ جانے کتنی دقتوں کے بعد یہاں تک آئی ہوں۔ لیکن اب...... اب کیا کروں؟''

فراز کے چہرے پر ہمدردی کے آثار پھیل گئے۔ وہ بڑی اپنائیت سے آگے بڑھ کر بولا۔ ''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ آپ صحیح جگہ پہنچ گئیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ آپ یہاں تک آ گئیں۔ ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔'' پھر فراز نے اپنی ساتھی لڑکیوں سے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ میری بہن عذرا شاہد ہے، یہ جبیں شاہد اور یہ خواتین ان دونوں لڑکیوں کی سہیلیاں ہیں۔ اور آپ......؟'' اُس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

میں اس جھرمٹ میں ایک نام بھی گھڑ چکی تھی۔ ''میرا نام ماریہ ہے۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ماریہ۔'' فراز نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''اور خاص طور سے اس لئے کہ اب آپ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ آیئے میں آپ کو ممی سے ملاؤں۔ بلکہ یوں کرو عذرا، تم گیسٹ رُوم کھلوا دو۔ مس ماریہ کو پہلے غسل وغیرہ سے فارغ ہونے دیں، اس کے بعد انہیں ممی سے ملائیں گے۔ جاؤ، کوئی تکلیف نہ ہو مس ماریہ کو۔''

''آیئے۔'' عذرا نامی لڑکی نے کہا جو فراز کی بہن تھی اور میں اُس کے ساتھ چل پڑی۔

نومی کا قہقہہ پھر میرے کانوں میں اُبھرا تھا۔ یہ شریر شخص تو میری اس حرکت سے بہت خوش ہوا ہو گا۔ میں اُس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ لیڈیز گیسٹ رُوم اس کوٹھی کے شایانِ شان تھا۔ عذرا مجھے ایک خوبصورت کمرے میں چھوڑ گئی۔ اُس نے میرے سامان کے بارے میں پوچھا۔

''بس، بے سروسامانی کی حالت میں ہوں۔ دوسرا کوئی لباس بھی ساتھ نہیں لا سکی۔''

''کیا ہرج ہے؟ میرے کپڑے آپ کے بالکل درست ہوں گے۔'' اُس نے کہا اور مجھے لباس مہیا کر دیئے گئے۔ میں باتھ رُوم میں داخل ہو گئی۔ بدن کی کثافت نے میرے ذہن میں بھی فوری تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں اور میرے اندر خواہشات بیدار ہو گئی تھیں۔ چنانچہ میں نے ایک عمدہ لباس پہنا، چہرہ اور بال درست کئے اور جب باہر آئی تو عذرا میری منتظر تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''بہت خوبصورت ہیں آپ مس ماریہ۔''

''شکریہ......''

''یورپ میں آپ کہاں مقیم تھیں؟''

''فرانس میں۔''

''اس کے باوجود آپ بے حد سادہ ہیں۔ آیئے، آپ کو ممی کے پاس لے چلوں۔ سب لوگ وہاں آپ کے منتظر ہیں۔''

''کیا آپ نے ممی کو میرے بارے میں بتا دیا؟''

''ہاں، فراز بھیا نے تو نہ جانے کیا کہا ہے ممی سے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ اُنہیں آپ کے آنے کی اطلاع تھی۔ ایک بات عرض کر دُوں آپ سے؟'' عذرا بولی۔

''جی۔''

''ممی دولت پسند ہیں۔ اُن سے اپنی امارت کے خوب تذکرے کریں۔ وہ آپ سے بہت خوش ہوں گی۔ دیکھئے ہر انسان کی کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ آپ محسوس نہ کریں۔''

''کوئی بات نہیں ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے جواب دیا۔ اور پھر میں نے اپنی سوکن کو دیکھا۔ اُس عورت کو جس کی خاطر شاہد نے مجھے قتل کر دیا تھا۔ کسی دور میں بے شک حسین ہو گی، اب تو کھنڈرات باقی تھے جن میں اُس نے چراغاں کر رکھا تھا......

اُس نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ میک اپ سے لتھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اُس کے سینے سے لگ کر سخت کراہت محسوس ہوئی۔ اُس نے دل جوئی کے بے شمار کلمات کہے اور مجھے تسلیاں دیتی رہی کہ میں فکر نہ کروں، یہ میرا خاندان ہے۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے میرے بارے میں بھی پوچھتی جا رہی تھی اور میں مسلسل جھوٹ بول رہی تھی۔ لیکن میرا ہر جھوٹ اُس کی آنکھوں کی چمک بڑھا دیتا تھا۔ یہاں میری بڑی خاطر مدارت ہوئی۔

کافی رات گزرے مجھے ان لوگوں سے چھٹکارا ملا تھا اور عذرا مجھے میری خواب گاہ میں پہنچا گئی تھی۔ اندر داخل ہو کر مجھے عجیب سا احساس ہونے لگا، میں کس چکر میں پڑ گئی تھی؟ میری رُوح پر جھوٹ کے انبار لگتے جا رہے تھے اور میں بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا یہاں سے بھاگ نکلوں۔ میری اپنی دنیا کس قدر پرسکون ہے۔ کوئی جھوٹ، کوئی فریب، کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ نومی ایک روشن دان سے اندر داخل ہو گیا اور میں غصیلی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''اب بولو...... کیا کروں؟''

"کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"بہت برا۔ میں خوش نہیں ہوں۔"

"ہر زندہ انسان ناخوش ہے، بے سکون ہے۔ سکون صرف ہماری دنیا میں ہے۔ زندگی اور سکون دو مختلف چیزیں ہیں۔"

"بدن کا بوجھ لاتعداد کثافتوں کا حامل ہوتا ہے۔ جب زندہ تھی تو اتنا غور نہیں کیا تھا۔ اب سوچتی ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔ حسد، جلن، فریب نہ جانے کون کون سے جذبے چھپے ہوئے ہیں ہڈیوں کے اس خول میں۔ وہ عورت میری سوکن ہے، دل چاہتا ہے اُس کا خون پی جاؤں۔ میری دولت پر عیش کر رہی ہے، ورنہ شاہد کے پاس کیا تھا۔"

"شاہد سے ملاقات ہوئی؟"

"نہیں...... لیکن سنا ہے اُس کی بری حالت ہے۔ میں تو اُس سے نفرت کرتی ہوں۔ بے پناہ نفرت...... ملوں گی اُس سے، ذرا بات کروں گی۔"

"تو پھر کچھ وقت گزارو، لطف لو اس ماحول کا، اس کے بعد واپس چلیں گے۔ ہڈیوں کے اس خول کو یہیں چھوڑ دینا۔ کیا رکھا ہے اس میں؟"

"ہاں...... مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن میں شاہد سے ضرور انتقام لینا چاہتی ہوں۔"

"میں اب چلتا ہوں۔ تمہارے اس بوجھل وجود کو آرام کی ضرورت ہوگی۔" نومی نے کہا اور پرواز کرتا ہوا روشن دان سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن بھی وہ لوگ میرے اِرد گرد رہے۔ بڑی چاہت کا اظہار ہو رہا تھا میرے لئے۔ مجھے ان ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دوپہر کو سب لوگوں کو آرام کرنے کی عادت تھی۔ اس وقت مجھے موقع مل گیا اور میں دبے قدموں شاہد کی آرام گاہ کی طرف بڑھ گئی۔

صاف ستھری جگہ تھی۔ فضل کو میں نے پہچان لیا۔ وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور شاید نابینا بھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اُس نے چونک کر پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ "کون ہے......؟"

لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ فضل پھر خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ میں اندر داخل ہو گئی۔ ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں ایک بستر اور چند کرسیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ایک کھڑکی کوٹھی کے پارک کی جانب کھلتی تھی جس کے پاس شاہد بیٹھا باہر خلا میں گھور رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر پلٹا۔ بالکل لاغر ہو چکا تھا...... آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، ہونٹ خشک تھے اور گال پچکے ہوئے۔ مجھے دیکھا اور دیر تک گھورتا رہا۔ پھر اتنی زور سے اُٹھا کہ کرسی اُلٹ گئی۔

"کک...... کون ہو تم؟" اُس کی آواز دہشت سے کپکپا رہی تھی۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "پہچاننے کی کوشش کرو شاہد۔" میں نے کہا۔

"کون ہو تم...... کون ہو......؟" اب وہ بری طرح کانپنے لگا تھا۔

"وہی ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔"

شمی؟...... ناممکن...... ناممکن...... تم...... تم شمی نہیں ہو سکتیں...... نہیں...... تم شمی نہیں ہو...... یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟"

میں نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا اور اُس کی طرف مڑی۔ "ہاں، یہ ناممکن ہے شاہد۔ کیونکہ شمی کو تم نے پچیس سال قبل ہلاک کر دیا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"پھر...... پھر تم کون ہو؟ کون ہو تم......؟"

"بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں ہے شاہد۔ میں جو کوئی بھی ہوں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گی۔ اس قدر خوفزدہ کیوں ہو؟" میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔ "لیکن تمہارا خوف بھی ٹھیک ہے۔ ہر مجرم بزدل ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے جرم کو فراموش نہیں کر سکتا۔ یقیناً تمہاری بھی یہی کیفیت ہوگی۔ اس طرح تم اپنے خوف میں حق بجانب ہو۔"

"تم...... تم...... تم میرا وہم نہیں ہو سکتیں...... تمہارے خدوخال، تمہاری شکل، تمہاری آواز سب کچھ وہی ہے...... سب کچھ وہی۔"

"اگر تمہیں اس قدر اعتماد ہے تو ٹھیک ہے۔ چلو میں مان لیتی ہوں کہ میں شمی ہوں۔"

"مم...... مگر...... مگر تم...... تم زندہ کیسے ہو گئیں؟ تمہاری یہ شکل و صورت...... تم بوڑھی بھی نہیں ہوئیں۔"

"مرنے والے اپنی جگہ پر رُک جاتے ہیں شاہد۔ پھر ان کی عمر نہیں بڑھتی۔ میری عمر وہی ہے جس عمر میں تم نے مجھے اس دنیا سے رخصت کر دیا تھا۔"

"تو تم...... تو تم...... تو تم رُوح ہو...... بدرُوح ہو......؟"

"بدرُوح......" میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہاں، تم مجھے ایک بری رُوح کہہ سکتے ہو۔ اور تمہارے اندر جو رُوح موجود ہے وہ یقیناً نیکیوں کی جانب راغب ہوگی۔ کیا خیال ہے شاہد، کیسی پائی یہ جرم کی زندگی تم نے؟ میں تمہارے اہل خاندان سے بھی مل چکی ہوں۔ میں نے ان سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں اور محسوس کیا ہے کہ سب تم سے نفرت کرتے ہیں، کوئی تمہارے پاس بھٹکنے کو تیار نہیں۔ اس لئے کہ تم ٹی بی کی آخری اسٹیج کے مریض ہو۔ تمہارے بیٹے، تمہاری بیٹیاں، کوئی بھی تمہارا نام محبت سے نہیں لیتا۔ یہ وہی لوگ ہیں نا شاہد جن کے لئے تم نے مجھے اس دنیا کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا؟ تم نے مجھے اُس عمر میں قتل کر دیا تھا شاہد، جس عمر کو اُمنگوں کی عمر کہا جاتا ہے...... کچھ ملا تمہیں اس قتل کے بعد؟ میری دولت سے تم نے ان لوگوں کو عیش کرا دیئے۔ کیا خیال ہے یہ دولت تمہارے بھی کسی کام آئی؟ کیسا پایا شاہد تم نے اس دنیا کو؟"

"تم...... تم...... آہ...... تم...... آہ یہ نہیں ہو سکتا...... یہ نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ آخر تم پچیس سال کے بعد میرے پاس کیوں آ گئیں؟"

"بس دل چاہ رہا تھا کہ جا کر تمہاری حالت، تمہاری کیفیت دیکھوں۔ شاہد، تم نے میرے باپ کی موت سے مجھے بے خبر رکھا، اس باپ کی موت سے جس نے مجھے ماں بن کر پالا تھا، جس نے میرے لئے زندگی کی ہر خوشی تج دی تھی۔ اپنا سکون اور آرام حرام کر لیا تھا۔ تم نے مجھے اس شفیق باپ کی موت

سے لاعلم رکھا اپنی خودغرضی کی بناء پر اور اس کے بعد تم نے ایک اور عورت کے لئے مجھے بھی ہلاک کر دیا۔ شاہد، میرا کیا قصور تھا؟ مجھے جواب دو۔ کیا میں تم سے انتقام لینے میں حق بجانب نہیں ہوں؟"

"انتقام......؟" شاہد اُچھل پڑا۔ "تو تم......تو تم مجھ سے انتقام لوگی؟ کیا تم مجھے ہلاک کر دوگی؟"

"ارے نہیں......" میں ہنس پڑی۔ "تم تو ویسے ہی نیم مُردہ ہو۔ تمہیں ہلاک کرنے سے کیا فائدہ؟ اور پھر کسی کو موت کے حوالے کر دینا تو اس کے ساتھ رحم اور ہمدردی ہے۔ یہ دنیا، یہ زندگی جس قدر ناپائیدار اور جس قدر تکلیف دہ ہے اس کا تمہیں پورا پورا احساس ہوگا۔ تمہیں اس زندگی سے نجات دلانے کا مقصد تو یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ہمدردی کی گئی...... ہاں، میں تمہارے کرب میں کچھ اور اضافہ کرنا چاہتی ہوں شاہد۔ اور یہی میرا انتقام ہوگا۔"

"اوہ......تم کیا کروگی؟ مجھے بتاؤ شمی، تم کیا کروگی؟" شاہد نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں...... شاید اب سے پہلے تو میرے ذہن میں کوئی ایسا خیال نہیں آیا تھا، لیکن اچانک ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں۔ اور بڑا ہی دلچسپ مشغلہ ہوگا یہ۔ کیا خیال ہے اس بارے میں؟" میں نے مسکراتے ہوئے شاہد سے پوچھا۔

"کیسی ترکیب...... کیسی ترکیب؟" شاہد بدستور خوف سے کانپ رہا تھا۔ اُس کے لئے یہ تصور ہی سوہانِ رُوح تھا کہ ایک مُردہ جسم اُس کے سامنے موجود ہے۔ میں اُس کی حالت سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ درحقیقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی تھی اور میں اس کے ہر پہلو پر غور کر رہی تھی۔

"بتاؤ...... کیا انتقام لوگی مجھ سے...... بولو، جواب دو۔" اُس نے کہا۔

"جب میں اس عمارت میں داخل ہوئی تھی تو میں نے تمہیں دیکھا، جوان، خوبصورت پہلے سے زیادہ دیدہ زیب، پہلے سے زیادہ دلکش اور میں نے تمہیں شاہد کہہ کر مخاطب کیا۔ لیکن شاہد، وہ تم نہیں تھے۔"

"پھر...... پھر کون تھا وہ......؟"

"تمہارا بیٹا فراز...... تمہارا ہم شکل۔ بالکل تمہاری مانند۔" میں نے مسکرا کر کہا، پھر بولی۔ "لیکن میں اُسے شاہد سمجھ لوں گی۔ میں اُسے شاہد بنالوں گی۔ میں اُسے اپنے پیار کے جال میں پھانس لوں گی۔ میں اُسے زندہ درگور کر دوں گی۔ اور شاہد، یہ سب تمہاری زندگی میں ہوگا...... یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا۔ کیسی ترکیب ہے یہ......؟"

"آہ، نہیں...... خدا کے لئے نہیں۔ ایسا مت کرنا...... میری زندگی چند روزہ ہے۔ میں تو یونہی لب گور ہوں۔ میرے ساتھ یہ سلوک مت کرو۔"

"کاش اس سے اچھی ترکیب میرے ذہن میں آسکتی...... کاش میں تمہیں اس سے زیادہ اذیت دے سکتی شاہد۔ میں تو پھر بھی تمہارے مقابلے میں رحم دل ہوں۔ تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ جواب دو، تم نے کیا، کیا تھا؟ پہلے مجھے ذہنی اذیتیں دیں، پھر اس وقت موت کے منہ میں دھکیل دیا جب میں نے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ میں نے کچھ بھی تو نہیں دیکھا تھا اس دنیا میں۔ بولو شاہد، تم نے یہ سب کچھ میرے ساتھ نہیں کیا تھا؟"

"مجھے معاف کردو شمی...... مجھے معاف کردو۔ میں مریض ہوں، زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا ہوں۔ میں چند دن کا مہمان ہوں، اس دنیا میں مجھے یہ اذیت نہ دو۔"

"مجھے تم سے نفرت ہے شاہد...... بے پناہ نفرت۔ تم مجھ سے معافی مانگ رہے ہو، شرم نہیں آتی تمہیں؟ یہ سب کچھ جس پر یہ لوگ عیش کر رہے ہیں، میرا ہے۔ یہ زندگی تو میری تھی، لیکن اب یہ سب......تم اس سے بھی کڑی سزا کے مستحق ہو شاہد۔ کاش، کوئی اس سے اچھی ترکیب میرے ذہن میں آجاتی۔ بس اتنا ہی بتانا تھا تمہیں۔ چلتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"معاف کردو شمی...... معاف کردو۔ مجھے معاف کردو شمی......" وہ چیختا رہا اور میں دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ میرا دل خوشی سے اُچھل رہا تھا، میں بے حد مسرور تھی۔ شاہد کی یہ کیفیت میرے لئے بہت مسرور کن تھی۔ اُس شخص نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے عوض یہ انتقام بہت ہلکا تھا۔ میں اُسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے میری دولت، میری زندگی چھین کر دوسروں کے قبضے میں دے دی تھی اور میں اُسے معاف کر دیتی؟ ناممکن تھا...... قطعی ناممکن تھا۔ ملازم فضل وفائیں نبھا رہا تھا۔ وہ بے چارہ بھی اب کسی قابل نہیں رہا تھا۔ میں اُس کے سامنے سے گزر کر چلی آئی لیکن اُسے پتہ بھی نہیں چل سکا۔

عمارت سے باہر نکلی تو فراز نظر آ گیا۔ اسی طرف آ رہا تھا، مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا اور پھر تیزی سے میرے پاس آ گیا۔ "آپ...... آپ ڈیڈی سے ملنے گئی تھیں؟ مل لیا آپ نے اُن سے۔"

"ہاں فراز۔"

"آپ کو ہماری باتوں سے خوف نہیں محسوس ہوا؟"

"خوف......؟"

"ڈیڈی کا مرض چھوت کا مرض ہے۔"

"میں ان باتوں پر بھروسہ نہیں کرتی۔"

"میں بھی نہیں کرتا، بس ممی کے احکامات ہیں کہ کوئی ان کے قریب نہ جائے، کوئی ان سے نہ ملے۔"

"اوہ فراز، کیا آپ کی ممی شاہد صاحب سے نفرت کرتی ہیں؟"

"یہ بات نہیں۔ بس ممی نفاست پسند ہیں اور حفظانِ صحت کے اصولوں کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ آیئے، اُس درخت کے نیچے بیٹھیں۔" فراز نے ایک طرف اشارہ کیا اور میں اُس کے ساتھ چل پڑی۔ قرب و جوار کا ماحول بے حد خوبصورت تھا۔ آسمان ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ فراز بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"اگر ممی حفظانِ صحت کے اصولوں کا خیال رکھتی ہیں تو شاہد صاحب کی یہ حالت کیسے ہوئی؟ ان پر توجہ کیوں نہیں دی گئی؟"

فراز کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ "چھوڑیئے مس ماریہ۔ آپ کہاں ان اُلجھنوں میں پڑ گئیں۔ میں آپ کو بہت جگہ تلاش کر کے اس طرف نکل آیا تھا۔ بس یوں ہی میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں آپ اس طرف نہ نکل آئی ہوں۔"

"شاہد صاحب میرے ڈیڈی کے دوست ہیں۔ مجھے اُن سے ہمدردی ہے۔"

"ڈیڈی اپنی فطرت کا شکار ہوئے ہیں۔ ممی کی اُن کی طرف سے بے توجہی بلاوجہ نہیں ہے۔"

"تم سب لوگ بہت اچھے ہو فراز۔ مجھے تم نے بڑی اپنائیت بخشی ہے۔ اس لئے میں اس گھر کے معاملات سے پوری پوری دلچسپی رکھتی ہوں۔ مجھے بتاؤ فراز، یہ سب کیا ہے؟"

"ڈیڈی کبھی اس گھر سے مخلص نہیں رہے۔ ضدی اور عیش پرست...... شراب اور عورت اُن کی زندگی رہی۔ یہ بیماری بھی اُن کی انہی عیش کوشیوں کا شاخسانہ ہے۔ ممی نے ہمیشہ انہیں ان تمام چیزوں سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کبھی کسی کی بات نہیں مانی۔"

"وہ اب بھی شراب نوشی کرتے ہیں؟"

"ہاں...... اب بھی۔"

"کوئی غم تو نہیں ہے اُنہیں؟"

"نہیں مس ماریہ...... وہ غم پالنے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔"

"تم لوگ بھی اُن سے ہمدردی نہیں رکھتے؟"

"حالات ہی ایسے رہے ہیں مس ماریہ۔ اُنہوں نے کبھی ہمیں خود سے قریب نہیں ہونے دیا۔ ہم ہمیشہ اُن کی محبت سے محروم رہے ہیں۔ اس لئے اب ہم بھی اس کے عادی نہیں ہیں۔"

"کیا نشے کے عالم میں اُن کی ذہنی کیفیت کچھ خراب ہو جاتی ہے؟"

"کبھی غور نہیں کیا۔"

"کیوں......؟ اس وقت بھی وہ حواس میں نہیں تھے۔" میں نے پیش بندی شروع کی۔

"اوہ...... آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟" فراز نے چونک کر پوچھا۔

"وہ مجھے نہیں پہچان سکے۔ کہنے لگے ان کا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں جھوٹ بول رہی ہوں، بے وقوف بنا رہی ہوں سب کو، میں بدرُوح ہوں، میں شمی ہوں۔ یہ شمی کون ہے فراز؟" میں نے غور سے فراز کو دیکھا اور اُس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے اُس نے سنبھل کر کہا۔

"اُن کے ذہن کی اختراع ہوگی۔ ویسے اُن کی یہ کیفیت نئی ہے۔ بہرحال مس ماریہ، براہِ کرم ان کے لئے پریشان نہ ہوں، یہ بتائیں آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"آپ جیسے مخلص لوگوں کی موجودگی میں مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟ بہت خوبصورت کوٹھی ہے آپ کی۔"

"اگر آپ کو پسند آ گئی ہے تو واقعی خوبصورت ہے۔" شاہد کا بیٹا بولا۔ شاہد کی آواز تھی، شاہد کا انداز تھا۔ پھر وہ سب لڑکیاں آ گئیں۔ شاہد کی بیٹیاں اور دوسری رشتے دار لڑکیاں۔

"ہوں...... یہ تنہائیاں کیا کہہ رہی ہیں؟"

"کیوں فراز بھائی......؟"

"ابھی تو چند ہی گھنٹے گزرے ہیں۔"

لڑکیاں، لڑکیوں جیسی باتیں کرنے لگیں۔ فراز بوکھلانے لگا۔ میں انجان بن گئی جیسے ان کا مذاق سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہوں۔ یورپ سے جو آئی تھی۔ لیکن ان تمام باتوں سے میں خوش تھی۔ وہ شروع ہو گیا تھا جو میں چاہتی تھی۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"یورپ کی زندگی کیسی ہے ماریہ؟"

"بس زندگی جیسی ہوتی ہے۔"

"سنا ہے وہاں بڑی آزادی ہے؟"

"ہاں...... جہاں سے آئی ہوں وہاں بڑی آزادی ہے، کوئی بوجھ نہیں ہوتا، ہلکا پھلکا خوشگوار سکوت فضاؤں میں ہوتا ہے۔"

"کسی سے محبت نہیں کی؟" ایک لڑکی نے سوال کیا اور میں مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

"جواب نہیں دیا تم نے ماریہ؟"

"اس بات کا جواب نہیں دے سکتی۔"

"خیر، اب کر لینا۔ ارادہ ہے؟" عذرا نے اپنی دانست میں مجھے گھستے ہوئے کہا۔

"ہاں، ارادہ ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور لڑکیاں فراز کو مبارکباد دینے لگیں۔ میں البتہ اسی طرح انجان بنی رہی جیسے ان کے مافی الضمیر سے ناواقف ہوں۔ فراز اُنہیں ڈانٹنے لگا۔ اور یوں یہ تفریحی شغل دیر تک جاری رہا۔

رات کے کھانے پر میں نے مسز شاہد کو مطمئن کرنے کے لئے کچھ فضول گفتگو کی۔ میں نے فراز سے کہا۔ "مسٹر فراز، اب تو میں یہاں آ گئی ہوں اور آپ لوگوں نے مجھے اپنے درمیان جگہ دے دی ہے۔ میں چاہتی ہوں اپنی دولت یہاں منتقل کر لوں۔ لیکن اس کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ آپ کسی اچھے سے وکیل سے مشورہ کر کے میرا سرمایہ منگوانے کی کوشش کریں۔"

"ہاں فراز، بہتر ہوگا تم نور الدین صاحب سے رابطہ قائم کرو اور بے چاری ماریہ کی یہ مشکل حل کر دو۔ ہرچند کہ یہاں رہ کر اسے دولت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن بہرصورت وہ اس کا سرمایہ ہے۔ جس قدر جلد منتقل ہو جائے بہتر ہے۔ اور ہاں ماریہ، مجھے تم سے کچھ اور گفتگو بھی کرنی ہے۔ تم ایک ایسی معزز ہستی ہو جس کی ہم سب بے حد عزت کرتے ہیں۔ اور ماریہ، اب تم میرے بچوں سے مختلف نہیں ہو۔ تمہارے بہتر مستقبل کے لئے میں نہیں سوچوں گی تو اور کون سوچے گا؟ میں چاہتی ہوں اب تم بقیہ زندگی ہمارے ساتھ ہی بسر کرو۔" مسز شاہد نے فراز کے کچھ بولنے سے پیشتر ہی یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں۔

"اس کے انتظامات ہو رہے ہیں ممی، آپ فکر نہ کریں۔" عذرا نے مسز شاہد کی باتوں کے جواب میں کہا۔

"کیا مطلب؟" مسز شاہد نے تعجب سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے...... میرا مطلب ہے آپ سب لوگ انتظامات کرتو رہے ہیں۔" عذرا نے مسکرا کر کہا اور دوسری لڑکیاں بھی زیرلب مسکرانے لگیں۔ عذرا کا مطلب کچھ اور تھا۔ فراز اُسے گھورنے لگا۔ لیکن عذرا ان سب باتوں سے انجان بن گئی تھی۔

یہ رات بھی خاموش گزر گئی، اور پھر دوسرا دن شروع ہوگیا...... وہی تفریحات، وہی معمولات۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ میں یہاں خوش ہوں یا ناخوش؟ بس جو جذبہ میرے دل میں پیدا ہو چکا تھا اس کی تکمیل چاہتی تھی اور اس کے بعد شاید میرے لئے یہاں رُکنا ممکن نہ ہوتا۔ البتہ ایک دن دوپہر کو ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ ہوا۔

فراز نے حسب معمول مجھے تلاش کرلیا تھا اور یہ وقت نہایت موزوں تھا کیونکہ دوسرے لوگ دوپہر کو سوجایا کرتے تھے۔ اُس نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور میں نے اُسے اندر بلالیا۔

"یہاں نہیں رُکیں گے، ورنہ صورت حال یکسر غیر مناسب ہو جائے گی۔ تم ابھی مقامی ماحول سے واقف نہیں ہو ماریہ۔ یوں کرو، لان میں آجاؤ، اُسی جگہ جہاں کل ہم لوگ بیٹھے تھے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" فراز نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ وہ چلا گیا اور میں نے بال وغیرہ درست کئے اور مسکراتی ہوئی اُس جگہ پہنچ گئی۔ ہم دونوں درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے اور فراز مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دفعتہً ہم نے شاہد کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ کھڑکی جس کے پاس میں نے شاہد کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا، اُسی جانب کھلتی تھی اور یقیناً شاہد نے ہمیں یہاں بیٹھے دیکھ لیا ہوگا۔ وہ ہانپتا کانپتا اسی طرف آرہا تھا۔ غصے کی شدت سے اُس کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔

"یہ نہیں ہوسکتا...... یہ نہیں ہوسکتا...... فراز، یہ بدرُوح ہے...... یہ بری رُوح ہے...... اس سے بچ۔ تم بھاگ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ...... یہ...... یہ تمہیں نقصان پہنچا دے گی۔ بھاگ جاؤ فراز...... یہاں سے بھاگ جاؤ...... اس کے فریب میں مت آؤ۔ یہ...... یہ بے حد خوفناک ہے۔" وہ پاگلوں کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ فراز کے ہونٹ بھنچ گئے، وہ ناخوشگواری کے انداز میں شاہد کو گھورنے لگا۔

"آپ باہر کیوں چلے آئے ڈیڈی؟ آپ کو علم ہے کہ ڈاکٹروں نے آپ کو چلنے پھرنے سے منع کیا ہوا ہے۔"

"میں...... میں تمہارا باپ ہوں فراز۔ اور میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔ خدا کے واسطے میری بات مان لو، اس بدرُوح کے پاس سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ یہ ہم سب کو تباہ و برباد کردے گی۔ بھاگ جاؤ فراز...... بھاگ جاؤ...... یہ ہم سب کو تباہ و برباد کردے گی۔ بھاگ جاؤ فراز...... بھاگ جاؤ۔ یہ ہم سے انتقام لینے آئی ہے۔ جلدی بھاگ جاؤ...... میں تمہیں انتباہ کرتا ہوں۔ ورنہ...... ورنہ شدید نقصان اُٹھاؤ گے۔" شاہد نے کہا اور فراز کا موڈ سخت خراب ہوگیا۔

"ڈیڈی آپ اندر جائیے، آرام کیجئے۔ ورنہ میں ممی کو آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔"

"آہ، میری بات مان لو فراز...... میری بات مان لو۔ خدا کے لئے میری بات مان لو...... یہ تمہیں

زندہ درگور کردے گی۔" شاہد نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "خدا کے لئے معاف کردے شمی...... ہمیں معاف کردے۔ جو کچھ ہو چکا ہے، اسے بھول جا۔ اپنی دنیا میں واپس چلی جا۔ خدا کے لئے ہمیں معاف کردے شمی...... خدا کے لئے......"

فراز آگے بڑھا اور اُس نے شاہد کا بازو پکڑلیا۔ "ڈیڈی، آپ اس کی توہین کر رہے ہیں۔ یہ ہماری مہمان ہے۔ براہ کرم آپ اندر چلئے...... جلدی چلئے۔" فراز نے سخت لہجے میں کہا۔ اُس نے شاہد کا بازو پکڑ لیا تھا۔ پھر وہ اُسے دھکیلتے ہوئے انداز میں لے کر آگے بڑھ گیا اور اس عمارت کے دروازے پر چھوڑ آیا جہاں سے شاہد باہر نکل آیا تھا۔ میرے ہونٹوں پر پُرسکون مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ میں اس ساری کارروائی سے بے حد مطمئن تھی۔

فراز تھوڑی ہی دیر میں واپس آگیا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ لیکن میں نے لاپروائی سے شانے ہلا دیئے تھے۔ "میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا فراز کہ اب شاید ان کی ذہنی حالت بھی خراب ہوتی جا رہی ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ڈاکٹر کو ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں بتا دیا جائے۔"

"ممی خود یہ کارروائی کریں گی۔ مجھے تو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ ہماری پُرسکون گفتگو میں انہوں نے خلل اندازی کی۔ آؤ، موڈ خراب ہوگیا ہے۔ چلیں یہاں سے۔" فراز نے کہا اور ہم دونوں کوٹھی کی جانب بڑھ گئے۔

دوسرا واقعہ رات کے کھانے کے بعد پیش آیا۔ ہم رات کے کھانے سے فارغ ہوئے تھے اور بیرونی برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے کہ مسز شاہد چونک پڑیں۔ اُنہوں نے سامنے دیکھا اور متحیر رہ گئیں۔

"یہ اپنی رہائش گاہ سے کیسے نکل آئے؟" اُن کے لہجے میں درشتی تھی۔ سب کی نگاہیں اُس طرف اُٹھ گئیں۔ وہ شاہد تھا۔ اُس کی حالت کچھ اور خراب نظر آرہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے، آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ خشک پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلتا یہاں پہنچ گیا۔

"آہ...... تو یہاں موجود ہے شمی...... تو یہاں موجود ہے۔ نہیں جائے گی تو یہاں سے...... نہیں جائے گی۔ اس خاندان کو تباہ کئے بغیر نہیں چھوڑے گی۔ بیگم، فراز کو بچاؤ۔ یہ شمی ہے، اُس کی رُوح ہے جو ہم سے انتقام لینے آئی ہے۔ اسے یہاں سے بھگا دو...... میں سچ بول رہا ہوں۔"

"کیا مصیبت ہے ممی...... اب تو پانی سر سے اُونچا ہوگیا ہے۔ ڈیڈی پاگل ہوگئے ہیں۔ انہوں نے خود کو تباہ کرلیا ہے تو ہمیں کیوں تباہ کرنا چاہتے ہیں؟ دوپہر کو بھی انہوں نے ماریہ کی انسلٹ کی تھی اور اب بھی وہی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ ممی، آپ انتظام کریں ان کا۔ ورنہ میں اس کوٹھی سے چلا جاؤں گا۔" فراز نے سخت لہجے میں کہا۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو شاہد؟ شمی پھر تمہارے ذہن میں زندہ ہوگئی ہے۔ وہ مر چکی ہے اور تم بھی اگر اُس کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے تو خودکشی کرلو۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ جاؤ، اپنی موت گاہ میں موت کا انتظار کرو۔"

"سنو تو سہی...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"دین خان...... صلاح دین...... انہیں گھسیٹ کر لے جاؤ یہاں سے۔ بند کر دو، تالا لگا دو۔ اور اس کے باوجود اگر یہ باہر نکلنے کی کوشش کریں تو انہیں پاگل خانے بھجوا دو۔"

دو قوی ہیکل ملازم شاہد کو زبردستی باہر لے گئے تھے۔ بیگم صاحبہ کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے معافی مانگی اور شمی کی کہانی سنائی۔ "یہ سب گناہوں کی سزا ہے ماریہ بیٹی۔ شاہد نے پوری زندگی جھوٹ اور فریب کے درمیان گزاری ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کی اور چند ماہ کے بعد ہی اُکتا گیا۔ گھر سے غائب رہنے لگا۔ میں فاقے کرتی رہی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ اس نے شمی نام کی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اور اس کے بعد وہ ملک سے باہر چلا گیا۔ طویل عرصے کے بعد وہ میرے پاس پناہ لینے آیا۔ کوئی اور اس کے فریب کا شکار ہو گیا تھا اور اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میں سب کچھ بھول کر اس کے لئے سینہ سپر ہو گئی۔ میں نے ہر خطرہ مول لیا اور اسے بچا لیا۔ اور پھر کچھ دن ٹھیک رہنے کے بعد وہ دوبارہ بھاگ گیا۔ میری اس جانفروشی کے صلے میں اس نے مجھے ایک چھوٹا سا بنگلہ خرید کر دے دیا تھا۔ پھر اس کمینہ صفت انسان نے اس لڑکی کو قتل کر دیا جس سے اس نے شادی کی تھی اور اپنے مجرم ضمیر کو دھوکہ دینے کے لئے شراب کا بے تحاشہ استعمال شروع کر دیا۔ میں پھر اس کا سہارا بنی لیکن اس سے وفا کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ اور وہی ہوا، شراب اور عورت۔ میری ساری زندگی دُکھوں میں گزری۔ اُس نے کہیں سے دولت حاصل کر لی، لیکن دولت سکون تو نہیں دیتی۔ اگر میرے بچے میرا سہارا نہ ہوتے تو میں کب کی خودکشی کر چکی ہوتی۔ اور اب میرا وقت ہے، میرا دور ہے اور میں اس سے انتقام لے رہی ہوں۔ میں نے اسے بے حیثیت کر دیا ہے۔ وہ اسی قابل ہے۔"

"ہاں...... وہ اسی قابل ہے۔" میں نے نفرت سے سوچا۔

کئی دن گزر گئے۔ اس کے بعد شاہد بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اُس کی رہائش گاہ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اُسے وہاں سے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ میری دولت کی منتقلی کے انتظامات ہو رہے تھے، لیکن میں بے سکون تھی۔ میں تو چاہتی تھی کہ شاہد بار بار میرے سامنے آئے، اذیت سے تڑپے، بلبلائے اور میں اس کے کرب سے لطف اندوز ہو سکوں۔"

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا؟ نومی دُور سے چیخا اور میں چونک پڑی۔ میں نے اُس دروازے کو آگ کی لپیٹ میں دیکھا جو اس کمرے میں داخل ہونے کا واحد راستہ تھا۔ کھڑکیاں، کمرے کا فرنیچر، قالین سب کچھ جل رہا تھا، چاروں طرف آگ لگ رہی تھی...... میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ نومی روشندان میں بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہوا نومی......؟"

"آگ لگی ہے۔" نومی نے کہا اور ہنس دیا۔

"میں مصیبت میں ہوں اور تم ہنس رہے ہو؟" میں جل کر بولی اور نومی روشندان سے اُڑ کر میرے ہاتھوں پر آ بیٹھا۔ وہ بدستور ہنس رہا تھا۔

"نومی...... نومی کمینے، اب کیا ہوگا؟"

"آگ اُس پاگل بوڑھے نے لگائی ہے۔ باہر بہت سے لوگ جمع ہیں اور وہ اُن سب کے درمیان چیخ رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ وہ شمی ہے، ایک رُوح ہے جو انہیں تباہ کرنے آئی ہے۔ وہ ان سے انتقام لے رہی ہے۔ اسے جل جانے دو، ورنہ سب اس کے انتقام کا شکار ہو جاؤ گے۔"

"اوہ......" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ تب نومی بولا۔

"آؤ شمی، یہاں گھٹن بڑھتی جا رہی ہے۔ آگ پھیل رہی ہے۔ آؤ باہر چلیں۔"

"ایں......؟" میں چونک پڑی۔ پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں بھی کتنی بیوقوف ہوں۔ میں ہڈیوں اور گوشت کے اس پنجر سے باہر نکل آئی اور بڑے سکون کا احساس ہوا۔ ایک دم کیفیت بدل گئی تھی میری۔ مجھے دُکھ ہونے لگا۔ افسوس، کس ناپاک کثافت میں داخل ہو گئی تھی میں۔ بلاوجہ میرے ذہن میں فاسد خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ بھلا مجھ کو اُس سے انتقام لینے کی کیا ضرورت تھی؟ انتقام لینے والا تو کوئی اور ہی ہے۔ توبہ توبہ، کیسا گناہ کیا ہے میں نے۔ بے چارہ شاہد تو خود ہی زندہ درگور ہے، اُسے دُکھ پہنچا کر مجھے کیا ملا؟ میں نے آگ میں لپٹے ہوئے اپنے بدن کو دیکھا۔ آگ میری ہڈیاں چاٹ چکی تھی۔ ناپاک خاکی کثافت۔ قصور میرا بھی نہیں تھا۔ بدن کی قید ایسے ہی گندے خیالات کی محرک ہوتی ہے۔ رُوح کتنی ہلکی پھلکی ہوتی ہے، اس میں کوئی برا جذبہ پیدا نہیں ہوتا، یہ صرف اس قید خانے کی غلاظت تھی۔ میرا ربّ مجھے معاف فرما دے۔ یہ سارے جذبے اس کثافت کی تخلیق تھے۔ چھی چھی...... میں کتنی احمق بن گئی تھی۔

"شریر نومی، آئندہ میرے ساتھ ایسا مذاق نہ کرنا۔ آؤ واپس چلیں۔ چلو یہاں سے۔"

میں باہر نکل آئی۔ اور اب ہمارا رُخ اپنی سکون گاہ کی طرف تھا جس میں گہری خاموشی پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں سکون ہی سکون ہے، گہرا بے کراں سکوت اور خاموشی...... تم ان کھنڈرات کو دیکھ رہی ہو؟"

"ہاں......"

"یہاں ابدی سکون ہے۔ اس سے اچھی جگہ کوئی نہیں ہے۔ اصل میں زندگی بہت چھوٹی چیز ہوتی ہے۔ بچپن ناسمجھی کی عمر ہوتی ہے۔ جوانی سمجھ کر نہ سمجھنے کی اور بڑھاپا بے بسی کی عمر ہوتا ہے۔ یہ سمجھ تو لیا جاتا ہے مگر کچھ کیا نہیں جاتا۔"

رادھا ہنسنے لگی تھی۔

"کیوں...... میں نے کچھ غلط کہا؟" شمی اُسے گھورتی ہوئی بولی۔

"نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔"

"پھر تم کیوں ہنسیں؟"

"اپنے آپ پر۔"

"وہ کیوں؟"

"میرا خیال اس سے مختلف ہے۔"

"وہ کیا......؟"
"رہنے دو...... کیا کرو گی پوچھ کر؟"
"یہ تو بری بات ہے۔"
"کیوں......؟" شمی نے کہا۔ "میں نے تو تمہیں اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔"
"شمی، بات ایسی نہیں ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی۔ اصل موڈ کچھ اور ہے۔" رادھا نے سوچتے ہوئے کہا۔
"میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔" شمی منہ پھیر کر بولی۔
"ارے نہیں، کیوں ناراض ہو جاؤ گی؟ تم تو میری بہت اچھی سہیلی بن چکی ہو۔" رادھا نے کہا۔
"اس لئے تم مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا رہیں؟" شمی نے شکایتی انداز میں کہا۔
"تم کیا جاننا چاہتی ہو میرے بارے میں؟"
"یہی کہ تم کیسے مریں؟" شمی نے کہا اور رادھا پھر ہنس پڑی۔
"تم ہنسنے کیوں لگیں؟" شمی نے حیران ہو کر پوچھا۔
"تمہارا سوال ہی تو ہنسی کی وجہ ہے۔"
"کیا مطلب؟" شمی حیرت سے بولی۔
"میں مری نہیں ہوں ابھی تک، زندہ ہوں۔"
"مجھے بے وقوف بنا رہی ہو؟"
"بالکل نہیں۔"
"پھر تم نے رُوپ کیسے بدلے تھے؟ یہ طاقت تو صرف رُوحوں کو حاصل ہوتی ہے۔"
"لیکن مجھے زندگی میں ہی طاقت حاصل ہے۔ بس مجھے اشیش بھگونت کا آشیرباد حاصل ہے۔"
"اشیش بھگونت کون ہے؟"
"ہم اُسے شیطان کہتے ہیں۔"
"کیا واقعی......؟"
"ہاں......"
"تب تو تم بدقسمت ہو۔" شمی نے کہا۔
"وہ کیوں؟" رادھا نے چونک کر پوچھا۔
"میری کہانی سے تم نے عبرت حاصل نہیں کی؟ تم کیا سمجھتی ہو، برائی کے جتنے پہلو نکلتے ہیں کیا وہ سب شیطانی عمل کا نتیجہ نہیں ہیں؟"
"اشیش بھگونت کو یہی شکایت ہے۔"
"وہ کیا؟"
"وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ انسان بڑی عجیب چیز ہے۔ یعنی فعل بد تو خود کرے، لعنت شیطان پر۔"

"غلط...... شیطان ہی انسان کے دل میں برائی پیدا کرتا ہے۔" شمی نے کہا۔
"تم نے میرے لئے ایک خوبصورت راستہ کھول دیا ہے شمی۔ اب میں اس سنسار میں گھوموں گی اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کروں گی کہ کالے اور سفید میں کالا کون کرتا ہے اور سفید کون؟ دنیا کا تجربہ کرنا ایک بہترین مشغلہ ہے اور اس طرف متوجہ کرانے کے لئے تمہارا شکریہ۔ اب میں چلتی ہوں۔ تم اسی سکون گاہ میں سکون کی زندگی بسر کرو اور خوب شرارتیں کرو......" اور رادھا وہاں سے آگے بڑھ گئی......!

۞۞۞

رجنی جانتی تھی کہ ریل کا یہ سفر بے معنی نہیں ہے۔ اب وہ تمام صورتحال سے واقف ہوگئی تھی۔ اُسے یہ اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ اُس کا جو بھی قدم اُٹھتا ہے وہ کسی نہ کسی مقصد سے اُٹھتا ہے اور قدرت اُس سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔ یہ بھی ایک درویشیت کی منزل تھی کہ اُسے اب بہت سی باتوں کا علم خود بخود ہونے لگا تھا اور وہ صورتحال سے واقف ہو جاتی تھی۔ بانکے لعل نے اپنی بیٹی نروپا کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا رجنی کو اس کا اندازہ تھا لیکن یہ اندازہ اُسے نہیں تھا کہ بانکے لعل اتنا دولت مند آدمی ہوگا۔

بانکے لعل کی حویلی بے حد عالیشان تھی۔ بہت سے ملازم، حسین و جمیل لان، خوبصورت عمارت۔ بہر حال سب کچھ تھا۔ رجنی کو اب ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ تو بس اب ایک نئی ہی منزل میں داخل ہو چکی تھی اور اُسے دنیا کی چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ شیطان نے جب اُن کے سروں پر ہاتھ رکھا تھا تو اُنہیں دنیا کی ہر آسائش حاصل ہوگئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ رجنی دل سے اس حیثیت کو قبول نہیں کرتی تھی، لیکن بہر حال بہنوں کے ساتھ اُسے شریک تو رہنا تھا۔ چنانچہ وہ بھی ان تمام چیزوں سے آشنا ہوگئی تھی۔ بانکے لعل اُسے عزت کے ساتھ ایک جگہ لے آیا اور اُس سے کہا۔

”بیٹا، اب جب تم یہاں آ ہی گئی ہو اور تم نے ہماری بننا قبول کرلیا ہے تو ہمارے ساتھ کچھ عرصہ قیام کرو۔ ہمیں خوشی ہوگی۔ میں تمہیں نروپا کو دکھائے دیتا ہوں۔“

کچھ گھنٹوں کے بعد بانکے لعل، رجنی کو لے کر چل پڑا۔ ایک بہت ہی خوبصورت سجے سجائے کمرے میں نروپا مسہری کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ چاندی کی طرح چمک رہا تھا، لمبے لمبے گھٹاؤں جیسے سیاہ بال جو شاید پنڈلیوں سے نیچے تک آتے تھے، بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کا چہرہ جھکا ہوا تھا، آنکھیں بستر میں گڑھی ہوئی تھیں۔ وہ عجیب سے انداز میں ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ رجنی اندر داخل ہوئی تو اچانک ہی اُس نے چہرہ اُٹھایا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شدید وحشت تھی۔ اُس نے گھور کر رجنی کو دیکھا اور پھر اچانک ہی اُس کے حلق سے دہشت بھری چیخیں نکلنے لگیں۔ وہ خوفزدہ ہوگئی تھی اور بانکے لعل اور اُس کی دھرم پتنی حیران نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ نروپا چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”بچاؤ بچاؤ...... مجھے اس سے بچاؤ...... بچاؤ مجھے اس سے۔ ارے تم اسے کہاں سے لے آئے؟ نکالو اسے یہاں سے...... مجھے بچاؤ اس سے..... میں...... میں..... میں......“

لیکن وہ اپنی جگہ پہ اس طرح سے بیٹھی ہوئی تھی جیسے اُس سے ہلا جلا بھی نہ جا رہا ہو۔ رجنی خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔ اُس کے ذہن پر نجانے کیسے کیسے خیالات گزر رہے تھے اور وہ خود اُس لڑکی پر نگاہیں جما کر ساکت ہوگئی تھی۔ دفعتہً اُسے اپنے کانوں میں ایک سرگوشی سنائی دی۔

”ہاں رجنی...... یہ تمہاری پہلی منزل ہے۔ منزل سمجھتی ہو نا؟ یہ لڑکی تمہاری توجہ کی طالب ہے اور یہ پہلا امتحان ہے تمہارا۔ میں کچھ نہ کہوں گی، تم خود اسے دیکھو گی۔ تمہاری آنکھوں کی بینائی بڑھی ہوئی ہے اور تمہیں پتہ چل سکتا ہے کہ یہ کس مشکل کا شکار ہے؟ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا، پتہ چل جائے گا تمہیں۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کرو۔ لڑکی تمہیں دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی ہے، لیکن فکر مت کرو۔ اب تمہیں وہ نظر آئے گا جو ہے، لیکن ابھی نہیں۔ اسے تنہا چھوڑ دو۔“

ادھر نروپا چیختی جا رہی تھی۔ ”ہٹا دو اسے یہاں سے...... ہٹا دو اسے یہاں سے...... یہ میری دشمن ہے۔ یہ مجھے کھا جائے گی...... یہ مجھے قتل کر دے گی۔ یہ قاتل ہے...... یہ خونی ہے...... خونی ہے یہ۔ ہٹا دو اسے یہاں سے...... ہٹا دو اسے یہاں سے۔“ نروپا چیختی جا رہی تھی۔

رجنی نے نگاہ اُٹھا کر بانکے لعل کو دیکھا اور پھر مدھم لہجے میں بولی۔ ”آیئے چا چا جی۔“

بانکے لعل نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور رجنی کے ساتھ واپس پلٹ پڑا۔ اُس نے چلتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ ”ذرا اسے دیکھو۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے اس کو۔“

”میں دیکھتی ہوں، آپ جایئے۔“ بانکے لعل کی دھرم پتنی نے کہا اور بانکے، رجنی کے ساتھ باہر نکل آیا۔

”معاف کرنا بیٹی...... بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات اس نے پہلے نہیں کی۔ یہ سب کچھ تو بڑا حیرت ناک ہے۔ مجھے تعجب ہے۔“ رجنی خاموش رہی۔

بانکے لعل نے پھر کہا۔ ”جاؤ بیٹا، تم اپنے کمرے میں آرام کرو۔ میں ذرا دیکھتا ہوں اُسے۔“

”نہیں چا چا جی...... آپ آیئے ذرا میرے ساتھ۔“ رجنی نے کہا اور بانکے لعل چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”بیٹا، کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں چا چا جی......“

بانکے لعل حیران سا اُس کے ساتھ آگے بڑھ آیا۔ رجنی اُس کے ساتھ اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اُس نے کہا۔ ”چا چا جی، ایک بات میں آپ کو بتاؤں، سب سے پہلے آپ مجھ سے یہ وعدہ کیجئے کہ میرے بارے میں کسی برے انداز میں نہیں سوچیں گے۔ انسان اگر اپنی بھلائی اور لالچ کے لئے کچھ کرتا ہے تو ایسی شکل میں کرتا ہے جب اُسے اس بات کا یقین ہو کہ کسی جگہ سے سب کچھ مل جائے گا۔ چا چا جی، نہ میں چور ہوں اور نہ میں کوئی ڈاکو، نہ ہی لالچی ہوں کسی بات کی۔ آپ کے گھر کچھ دن رہنا چاہتی ہوں۔ دو وقت کی روٹی تو انسان کسی فقیر کو بھی دے دیتا ہے۔ آپ یہی سمجھ لیں۔ مجھے روٹی دے دیجئے گا۔ جاتے ہوئے ایک پیسہ بھی آپ سے مانگوں یا کوئی لالچ کروں تو جوتے مار کر نکال دیجئے گا۔ میں یہ بات صرف اس لئے کہہ رہی ہوں کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو دولت مند دیکھ کر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ چلو کچھ سے یہاں گزارا کیا جائے۔ کچھ دن یہاں رہنا چاہتی ہوں چا چا جی اور ایک کوشش کرنا چاہتی ہوں۔“

بانکے لعل عجیب سی نگاہوں سے رجنی کو دیکھ رہا تھا، پھر اُس نے کہا۔

”بیٹا پیر سے جوتا نکالو اور دس مار لو اپنے چا چا جی کے سر پر۔ اتنے پیار سے تمہیں یہاں لایا ہوں، تم نے

چاچا جی کہا تو مجھے نروپا یاد آ گئی جو خود بھی مجھے چاچا جی کہتی ہے۔ لیکن اب تو برسوں سے ہوش میں نہیں ہے۔ بس جو حالت ہے اُس کی تم دیکھ چکی ہو۔ اس پر تم یہ کہہ رہی ہو کہ میں تم پر کوئی شک کروں گا اور یہ سمجھوں گا کہ تم کسی لالچ سے یہاں رُکنا چاہتی ہو۔ بیٹا جب تک تمہارا دل چاہے رُکو۔ ہاں تم نے ایک بات کہی ہے کہ میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"چاچا جی...... میری ساری باتیں ایسی ہیں کہ آپ کی جگہ کوئی بھی ہو، مجھ پر شک کرے گا۔ لیکن اب کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ اصل میں تھوڑی سی معلومات ہیں مجھے ایسی بیماریوں کے بارے میں۔ میں کوئی دس بارہ دن تک آپ کے یہاں رہ کر نروپا کو دیکھنا چاہتی ہوں کہ اس کی بیماری کا مقصد کیا ہے؟ بس اس کے بعد چلی جاؤں گی۔"

"بیٹا جو تمہارا دل چاہے کرو۔ ایسی بات نہیں ہے۔ جو تمہارا من چاہے کرو۔ جہاں تک نروپا کا معاملہ ہے میں تمہیں بتاؤں کہ وہ ذہنی توازن ضرور کھو چکی ہے اور اُس کے اندر کچھ عجیب سی باتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن اُس نے کبھی نقصان کسی کو نہیں پہنچایا۔ اور جو کام اس نے اس وقت کیا ہے وہ بھی اس نے پہلے کبھی نہیں کیا۔"

"بس چاچا جی، اتنا ہی کہنا ہے مجھے آپ سے۔"

"ہاں...... تم اطمینان سے یہاں رہو۔ جہاں دل چاہے آؤ جاؤ۔ اور تم خود کوئی تکلیف نہ کرنا، ہم سے کہنا تمہیں کیا چاہئے۔ ہم تمہیں سب کچھ دے دیں گے۔" بانکے لعل جی مسکرائے اور اس کے بعد وہ رجنی کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ بہت دیر تک رجنی سوچتی اور مسکراتی رہی۔ پھر اُس نے نروپا کی حالت پر غور کیا اور اُس کے چہرے پر غور و فکر کی لکیریں دوڑ گئیں۔ نروپا کی یہ حالت کس لئے ہے؟ ویسے یقینی طور پر کوئی مسئلہ ضرور تھا۔ کیونکہ انا زبیدہ کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی تھی اور کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہوا تھا۔

چنانچہ وہ سوچنے لگی کہ اب اُسے صحیح انداز میں کام شروع کر دینا چاہئے۔ بہر حال بہت دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئی۔ جو کام ہونا ہوتا ہے اس کے لئے حالات خود بخود سازگار ہو جاتے ہیں۔ بہر طور اب اس سلسلے میں اُسے معلومات حاصل کرنی تھیں۔ اپنے طور پر وہ بہت محتاط تھی۔ کسی کے گھر میں داخل ہو کر، وہ بھی ایسے عزت داروں اور اچھے لوگوں کے گھر میں کوئی ایسی حرکت نہیں کی جا سکتی تھی جس سے اپنی عزت پر بھی حرف آ جائے۔ اُس نے کافی دیر تک سوچا اور پھر اپنے طور پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔

رات کے کوئی بارہ بجے کے وقت اُس نے تیاریاں کیں اور اپنا حلیہ بدلنے لگی۔ کم از کم یہ بات اُس کے لئے باعث خوشی تھی کہ وہ اپنا حلیہ بدل سکتی تھی۔ لیکن نجانے کیوں ذہن میں سانپ بن جانے کا خیال ہی آتا تھا۔ چنانچہ وہ ناگن بن کر آہستہ سے باہر نکلی اور ایک سمت چل پڑی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ رات کو نروپا کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ ویسے نروپا شکل و صورت میں بے مثال تھی اور انتہائی خوبصورت تھی۔ وہ چلتی ہوئی ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں سے نروپا کے کمرے میں آسانی سے داخل ہوا جا سکتا تھا۔ پھر وہ اندر پہنچ گئی۔ اُس کا سوچنا بالکل درست تھا۔ رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی لیکن نروپا کے کمرے میں روشنی تھی اور اس روشنی میں رجنی نے جو کچھ دیکھا وہ اُس کے لئے ناقابل یقین تھا۔ نروپا ڈریسنگ ٹیبل کے

سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کا چہرہ اس قدر حسین نظر آ رہا تھا کہ دیکھنے والی آنکھ اُسے دیکھ کر دوبارہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ بے پناہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اُس نے بال بال موتی پروئے ہوئے تھے۔ میک اپ کے سامان سے اُس نے اپنے چہرے کو حسین تر بنایا ہوا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور اُس نے ایک خوبصورت ساڑھی نکالی اور لباس تبدیل کرنے لگی۔ اس حسین ساڑھی میں وہ قیامت نظر آ رہی تھی۔ رجنی باریک سے پتلے سانپ کی حیثیت سے ایک گوشے میں بیٹھی اپنی چمکدار آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ اُسے بے پناہ خوشی تھی کہ پہلے ہی مرحلے پر اُسے کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ وہ نروپا کو دیکھتی رہی۔ نروپا پوری طرح تیار ہوئی اور اس کے بعد خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

رجنی تیز رفتاری سے رینگتی ہوئی اُس کے پیچھے چل پڑی۔ نروپا حویلی کے پچھلے دروازے پر پہنچی تھی اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اُدھر تالا پڑا رہتا تھا لیکن اُس نے یہ تالا بڑی آسانی سے کھول لیا تھا۔ وہ پیدل سفر کرتی ایک طرف جا رہی تھی اور رجنی کو اُس کا تعاقب کرنے کے لئے چھپنے کے سہارے لینے پڑ رہے تھے۔ نروپا کا سفر کافی لمبا تھا۔ وہ شہر کے بائیں سمت ایک ویران علاقے میں چل پڑی۔ اور پھر فاصلہ طے کرتی ہوئی آخر کار ایک ایسی حویلی پر پہنچ گئی جو شہری آبادی سے الگ تھلگ تھی اور کافی پرانی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ نروپا جیسے ہی حویلی کے دروازے پر پہنچی، رجنی نے وہ دروازہ کھلتے ہوئے دیکھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ دروازہ کھولنے والا کون ہے؟ لیکن ایسی کوئی شخصیت اُسے نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اندر چلی گئی تو رجنی بھی اُس دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ وہ نروپا کو نگاہوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھی۔

حویلی قدیم طرز کی بنی ہوئی تھی اور بالکل سنسان اور ویران پڑی ہوئی تھی۔ رجنی حیرت بھری نگاہوں سے نروپا کو دیکھتی رہی۔ نروپا اس وقت بالکل ٹھیک معلوم ہو رہی تھی۔ رجنی نے دیکھا کہ حویلی کے ایک مشرقی گوشے میں روشنی ہو رہی ہے۔ نروپا اُس طرف جا رہی تھی۔ پھر وہ ایک بہت بڑے ہال نما کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کمرے میں پتھر کے چار مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ اُن کی شکل و صورت عجیب و غریب تھی۔ تیز روشنی ہو رہی تھی۔ رجنی ایک گوشے میں پہنچ کر کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ اس حیران کن منظر کو بڑی عجیب و غریب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس بڑے ہال کے دروازوں سے لوگ باہر نکلنے لگے۔ یہ سازندے تھے۔ اُن میں سے کسی کے ہاتھ میں پتلا تھا، کسی کے ہاتھوں میں سارنگی۔ اسی طرح کے دوسرے ساز بھی وہ لوگ لئے ہوئے تھے۔ وہ آرام سے نیچے بیٹھ گئے اور نروپا کمرے کے درمیان فرش پر بیٹھ گئی۔ خاموشی سے رجنی یہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے ایک شخص کو دیکھا، اچھی خاصی عمر کا عجیب و غریب لباس پہنے ہوئے ایک سادھو قسم کا آدمی تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، گلے میں قیمتی ہیروں کی مالائیں جن سے ماحول جگمگانے لگا تھا۔ وہ ایک جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ پھر دو لڑکیاں سونے کے برتن لئے ہوئے سامنے آ گئیں اور اُنہوں نے یہ برتن ایک طرف رکھ دیئے۔ اس میں سے کوئی سیال سا نکال کر اُنہوں نے اُس شخص کو پیش کیا اور اُس کی آواز اُبھری۔

"ہاں نروپا جی...... شروع ہو جاؤ۔"

نروپا نے مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھا، پھر اپنی جگہ سے اُٹھی، دونوں ہاتھ جوڑ کر جھکی اور اس کے

بعد اُس نے پیروں میں گھنگھرو باندھے اور سازندوں نے ہلکے ہلکے ساز چھیڑ دیئے۔ نروپا نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور اس کے بعد اُس کا بدن متحرک ہو گیا۔ حسین ترین لباس میں ملبوس وہ دیو داسیوں کا رقص کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ساز تیز ہوتے جا رہے تھے اور نروپا کا بدن تھرکنے لگا۔ وہ آرام سے رقص کر رہی تھی اور اُس کے بدن کی تھرکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سازوں کی دھن، نروپا کا رقص، یہ ساری چیزیں دیکھ دیکھ کر رجنی حیران ہو رہی تھی۔ ماحول پر ایک سحر سا طاری ہو گیا تھا۔ اُسے اندازہ تھا کہ نروپا کس قدر خوبصورت رقص کر رہی ہے۔ یہ رقص بہت دیر تک جاری رہا۔ اور آخر کار نروپا تھک کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ تب وہ شخص اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُس نے نروپا کا بازو پکڑ کے اُسے کمر میں ہاتھ ڈال کر اُٹھایا اور بولا۔

"بہت اچھا ناچتی ہو نروپا...... لو، یہ امرت جل پیو۔" اُس نے ایک گلاس میں شراب بھر کر نروپا کو دی اور نروپا نے خاموشی سے وہ شراب پی لی۔ وہ کہنے لگا۔ "بس، اب تم واپس جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد صبح ہو جائے گی۔ تمہارا گھر سے دُور رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں ابھی نہیں چاہتا کہ تمہارے بارے میں کچھ لوگوں کو پتہ چلے۔ تم ایسا کرو کہ آرام سے اپنے گھر جاؤ اور کسی کو خبر نہ ہونے دو۔ ابھی اس وقت تک میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا جب تک سارا کام پورا نہ ہو جائے۔"

نروپا اپنی جگہ سے اُٹھی، اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور اس کے بعد وہاں سے واپس چل پڑی۔ رجنی کو بھی ہوش آ گیا تھا اور وہ اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔ وقت کافی گزر گیا تھا۔ اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا۔ نروپا تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ اب رجنی کو اُس کا زیادہ تیزی سے تعاقب کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی ساری رات خراب ہو گئی تھی اسی لئے اُسے نیند کی جھونک بھی آ رہی تھی۔ اس وقت کہیں سے اذان کی آواز سنائی دی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد نمازی نماز پڑھنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ یہاں رجنی کو ایک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ اچانک ہی کسی نمازی نے اُسے دیکھ لیا اور زور سے چیخا۔

"سانپ...... سانپ......" اور پھر چار پانچ آدمی اُس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ اُن میں سے کچھ نے پتھر بھی اُٹھا لئے تھے اور رجنی پر برسانے شروع کر دیئے تھے۔ رجنی بری طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔ بس تقدیر ہی تھی کہ بچ گئی، ورنہ کوئی بھی پتھر اُس کے بدن کو کچل سکتا تھا۔ رجنی نہیں جانتی تھی کہ ایسے موقع پر بچنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ لیکن یہ بات اُس نے سوچ لی تھی کہ سانپ بن کر یہ زبردست خطرہ مول لینا مناسب نہیں ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ فضا میں پرواز کرتی ہوئی کوئی چیز بن جاتی۔ جب یہ سب کچھ دیکھنا ہی تھا تو کسی بھی شکل میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اور اُس نے آئندہ کے لئے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سانپ کا روپ اختیار نہیں کرے گی۔

بہر حال، تقدیر اچھی تھی کہ لوگ اُسے مارنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور آخر کار وہ بانکے لعل جی کی حویلی میں داخل ہو گئی۔ اور پھر اُس نے اپنے کمرے میں آ کر دم لیا۔ نروپا کے بارے میں اُسے ابھی صحیح اندازہ نہیں تھا، لیکن اُسے یقین تھا کہ نروپا گھر واپس آ گئی ہو گی۔ البتہ اُسے بہت سی باتیں پریشان کر رہی تھیں۔ نروپا کہاں جاتی ہے؟ کیا وہ اپنے ماں باپ کو بے وقوف بناتی ہے اور جان کر پاگل بنی ہوئی ہے؟

جبکہ بیچارہ بانکے لعل تو اپنی بیٹی کے لئے سخت پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ اُس کی بیٹی پاگل ہو چکی ہے۔ لیکن یہ کیسا پاگل پن تھا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

بہر حال اس کے بعد رجنی کو نیند آنے لگی اور وہ بستر پر لیٹ کر گہری نیند سو گئی۔ پھر ایک ملازمہ نے ہی اُسے جگایا تھا...... رجنی نے اُس کی صورت دیکھی اور جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"معافی چاہتی ہوں دیوی جی، اصل میں بانکے لعل مہاراج نے کہا ہے کہ پوچھوں تو سہی آپ کی طبیعت خراب تو نہیں ہے؟ ورنہ آپ اتنی دیر سے نہیں اُٹھتیں۔"

"ہاں...... رات کو نیند نہیں آئی۔ کہاں ہیں چاچا جی؟"

"ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں آپ کا۔"

"ارے......" رجنی نے کہا اور جلدی سے اُٹھ کر، منہ ہاتھ دھو کر، بال سنوار کر ناشتے کے کمرے میں پہنچ گئی۔ بانکے لعل، اُن کی دھرم پتنی اور کچھ اور لوگ ناشتے پر اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

"بیٹا، مجھے معاف کرنا۔ میں نے سوچا کہیں تم محسوس نہ کرو کہ ہم نے تمہارے بغیر ناشتہ کر لیا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"

"جی چاچا جی...... بس رات کو ذرا نیند نہیں آئی تھی۔"

"چلو آؤ، ناشتہ کرو۔ اور سنو اگر طبیعت ٹھیک نہ ہوا کرے تو ناشتہ اپنے کمرے ہی میں منگوا لیا کرو۔ آرام سے اٹھا کرو۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔"

"جی چاچا جی...... آپ بتایئے نروپا کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ اپنے کمرے میں ہے۔"

"ناشتہ کر لیا اُس نے؟"

"ہاں ناشتہ کر چکی ہے۔"

رجنی نے اطمینان کی سانس لی۔ اُسے کم از کم یہ پتہ چل گیا تھا کہ نروپا آرام کے ساتھ اپنے گھر واپس پہنچ چکی ہے۔ لیکن رات کے معاملات میں اُس کا ذہن شدید طریقے سے اُلجھا ہوا تھا۔

پھر دوسری رات رجنی یہ سوچ کر نروپا کے اُرد گرد منڈلاتی رہی کہ ہو سکتا ہے نروپا آج بھی وہاں جانے کی کوشش کرے۔ لیکن اُس دن نروپا نہیں گئی تھی۔ البتہ دوسرے دن رجنی نے پھر وہی منظر دیکھا۔ نروپا تیار ہو کر اسی طرف چل پڑی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ آج تک حویلی میں رہنے والے کسی بھی شخص کو یہ بات معلوم نہیں ہو سکی تھی کہ نروپا اس طرح راتوں کو گھر سے نکل جاتی ہے۔ یہ بات ذرا تعجب خیز تھی۔

بہر حال، آج رجنی نے دوسرا روپ اختیار کیا تھا اور ایک خوبصورت تتلی بن کر وہاں آ پہنچی تھی۔ وہاں کا منظر بالکل وہی کا وہی تھا۔ لیکن آج ایک اور خوفناک عمل ہوا تھا۔ رجنی تتلی کی حیثیت سے ایک ایسی جگہ بیٹھی ہوئی تھی جہاں ایک روشن دان بالکل قریب تھا۔ سازندے ساز بجا رہے تھے، نروپا رقص کر رہی تھی کہ اچانک ہی کمرے میں ایک کڑاکا ہوا جیسے بجلی چمکی ہو، اس کے بعد ایک دُھواں سا کمرے میں بھرنے لگا۔ سارے کے سارے کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن چمکیلا دُھواں آہستہ آہستہ انسانی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔

اور تھوڑی دیر کے بعد ایک بھیانک شکل اُس دُھوئیں میں نمودار ہوئی۔ اس شخص کو اُن میں سے کسی نے نہ پہچانا ہو لیکن رجنی نے ایک نگاہ میں اُسے پہچان لیا تھا...... یہ اشیش بھگونت تھا۔ رجنی سہمی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ ادھر وہ شخص جو راجا اندر بنا ہوا بیٹھا تھا، جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنی ساری مالائیں وغیرہ اُتار کر زمین پر ڈال دیں اور پھر آگے بڑھ کر شیطان کے قدموں میں جھک گیا۔

”جے بھگونتا......“

شیطان نے ایک زوردار ٹھوکر اُس کے منہ پر ماری اور وہ اُلٹ کر پیچھے گر پڑا۔ سازندے جو پہلے ہی خوف سے کھڑے ہو گئے تھے، ہاتھ جوڑے ہوئے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اور نروپا درمیان میں اس طرح ساکت ہو گئی تھی جیسے پتھر کا مجسمہ بن گئی ہو اور اُس میں جان ہی نہ ہو۔ وہ ایک خاص پوز میں تھی، اور اسی پوز میں ساکت و جامد ہو گئی تھی۔ رجنی اس خوفناک منظر کو دیکھتی رہی۔ اُلٹ کر گرنے والا شخص پھر کھڑا ہو گیا اور اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”معافی چاہتا ہوں...... شما چاہتا ہوں بھگونتا...... کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے؟“

”جنم کے اندھے، میں نے تجھے کیا نہیں دیا؟ اور تیری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہیں۔ تجھے پتہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں خرابی آ گئی ہے؟“

”کیا مہاراج...... میں نہیں سمجھا۔“

”تو میرے نام پر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ لیکن تجھے یہ بات نہیں معلوم کہ ہمارے دشمن ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ نروپا کا کھیل تو نے خود شروع کیا تھا اور اب خود ختم کر رہا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں مہاراج...... بالکل نہیں سمجھا میں۔ آپ جانتے ہیں گرو دھرم چند نے یہ کام کیا ہے اور میں اُنہی کے اشاروں پر یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔“

”سارے کے سارے ناکارہ ہوتے جا رہے ہو۔ کوئی کچھ نہیں کر رہا۔ جگہ جگہ یہ لوگ مجھے شکست دے رہے ہیں۔ تو نہیں جانتا اس وقت مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ مجھے صرف اس بات کی فکر ہے کہ میرے دشمن کامیابی کیوں حاصل کر رہے ہیں؟ کسی کام کو شروع کر دینا کوئی مشکل نہیں۔ لیکن جب ہم اس کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمارا کام ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ لوگ ہر اُس جگہ جا رہے ہیں جہاں ہمارا کام ہو رہا ہے۔“

”مگر مہاراج، میں سمجھا نہیں؟“

”دھرم چند کو کسی نے مجبور کیا تھا کہ وہ تجھ پر کام کرے اور نروپا کو تیرا قیدی بنا دے۔ پر یہ ساری باتیں اپنی جگہ مگر اس وقت تیرے پیچھے جو چیز لگی ہے وہ تیرا ناس بھی کر سکتی ہے۔“

”جے بھگونتا...... تمہاری موجودگی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟“

”ہاں...... وہ دیکھ، وہ تتلی بیٹھی ہے نا، وہ جاسوس تتلی ہے اور وہی تجھے نقصان پہنچائے گی۔ سمجھا؟ مار سکتا ہے اُسے تو مار دے۔“ اشیش بھگونت نے رجنی کی طرف اشارہ کیا۔ رجنی کے لئے یہ ضروری تھا کہ اب ایک لمحے کے اندر یہاں سے نکل جائے۔ چنانچہ وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے اُڑنے کے لئے پَر تولنے

لگی۔ ادھر وہ بڑی مونچھوں والا شخص اچانک ہی ایک پرندے کی شکل اختیار کر گیا، ایک ایسا مونچھ دار مکروہ پرندہ جو تتلیوں کا شکار کرتا ہے...... وہ تیزی سے رجنی کی جانب جھپٹا اور رجنی روشن دان سے باہر نکل گئی۔ یہاں اُس سے ذرا سی غلطی ہوئی تھی یعنی اُس پرندے نے اُس سے اپنا سائز بڑا رکھا تھا۔ روشن دان چھوٹا تھا۔ رجنی تو اپنی چھوٹی سی جسامت کے ساتھ برق رفتاری سے باہر نکل گئی لیکن وہ روشن دان سے باہر نہیں نکل سکا اور اُس سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ اس دوران رجنی چھت پر پہنچ چکی تھی۔ وہ ایک دم سے چھت پر تھی، اُس نے لوٹ لگائی اور اس کے بعد وہ ایک خوفناک عقاب کی شکل اختیار کر گئی اور آہستہ آہستہ پروں سے چلتی ہوئی تھوڑی سی آگے بڑھنے لگی۔ اُدھر وہ خوفناک شخص جو پرندے کی شکل اختیار کر چکا تھا تتلی کو پکڑنے کے لئے جھپٹا تھا، کسی طرح اپنے بدن کو سکوڑ کر روشن دان سے باہر نکلا اور اس کے بعد اُس نے تتلی کی تلاش میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن اس وقت ایک خوفناک عقاب سے اُسے سامنا کرنا پڑا۔ عقاب نے تیز چیخ کے ساتھ پرواز کر کے اُس پر پنجے مارے اور وہ پرندہ زخمی ہو کر چھت سے نیچے گر پڑا۔ رجنی نے ایک کامیاب داؤ استعمال کیا تھا۔ اُسے زخمی کر کے وہ پھرتی سے اُڑتی ہوئی بانکے لعل کی حویلی کی جانب چل پڑی۔ برق رفتاری سے اُس نے اپنا یہ سفر طے کیا اور اس کے بعد بانکے لعل کی حویلی میں داخل ہو گئی۔ حویلی میں پہنچ کر وہ رُکی، اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کے بعد اپنے کمرے کی جانب چل پڑی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنا روپ بدل لیا تھا۔ اُس کا سینہ بری طرح پھول چکا تھا۔ سانس سینے میں نہیں سمائی جا رہی تھی۔ جو حادثہ اور جو واقعہ پیش آیا تھا وہ اُس کے لئے بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔ اُس نے تھکے تھکے انداز میں مسہری پر بیٹھتے ہوئے سوچا کہ اشیش بھگونتا کو اُس کی یہاں موجودگی کا پتہ چل گیا ہے۔ شیطان کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یہاں موجود ہے تو جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ رجنی کے لئے اب پریشانی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ اُس نے اُس شخص کو تو نقصان پہنچا دیا تھا جس نے اُس کا پیچھا کیا تھا لیکن اگر شیطان نے ناگ چندر کو ادھر بھیج دیا تو رجنی کے لئے مشکل ہو جائے گی۔

بہرحال یہ ایک سنسنی خیز عمل تھا اور ایک نئی بات تھی جو رجنی کے ذہن میں پیدا ہوئی تھی۔ اُس کے دل میں نروپا کا خیال بھی آیا اور اُس نے سوچا نروپا بہرحال کچھ بھی ہے محفوظ ہے۔ ابھی اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ایک لمحے کے لئے اُس کا دل چاہا کہ خاموشی سے یہاں سے نکل جائے اور شیطان کو موقع نہ دے کہ وہ اُس کا راستہ روکے۔ لیکن پھر اُس نے دل میں سوچا کہ انا زبیدہ اُس سے یہ بات کہہ چکی ہے کہ اُسے اپنا فرض پورا کرنا ہے۔

”ٹھیک ہے...... جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ رجنی نے سوچا اور اپنے ذہن کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اُس نے خود کو یہ کہہ کر سکون دیا تھا کہ اب وہ نیکیوں کی راہ پر ہے اور اللہ کی قوت اس کائنات کی اُمید کی انتہا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں ہے...... پھر وہ دوسری باتوں پر غور کرنے لگی۔ وہ اس گفتگو کو یاد کر رہی تھی جو شیطان اور اس پُراسرار شخص کے درمیان ہوئی تھی جو لمبی مونچھوں والا تھا اور جو رجنی کے ہاتھوں زخمی ہو گیا تھا۔ بہت سے سوالات اُس کے ذہن میں آئے اور وہ ان پر غور کرنے لگی۔ مثلاً گرو دھرم چند...... یہ دھرم چند کیا چیز ہے؟ ان باتوں میں اپنا دماغ کھپانے کی بجائے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ براہِ راست

بانکے لعل سے اس بارے میں بات کرے گی۔

دوسرے دن اُس نے بانکے لعل سے کہا۔ "چاچا جی...... آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں بیٹا ضرور......"

"ایسے نہیں......"

"تو پھر......؟"

"آپ مجھے باقاعدہ وقت دیں گے۔"

"جب تو کہے بیٹا۔"

"آپ بتائیے۔"

"آج ہی شام۔"

"ہمیں بالکل تیار ہونا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے پھر دونوں چھت پر ملیں گے۔" بانکے لعل نے کہا، پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "پر بیٹا، بات کیا ہے؟"

"یہاں نہیں کی جائے گی...... بعد میں، چھت پر۔" رجنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر اُسی شام بانکے لعل نے رجنی کو چھت پر بلا بھیجا۔ "ارے بیٹی تو نے میرا پیٹ خراب کر دیا ہے۔ سارا دن اسی بارے میں سوچتا رہا ہوں۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے چاچا جی۔" رجنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر بات کیا ہے بیٹی؟"

"چاچا جی، نروپا کے سلسلے میں کچھ پوچھنا ہے۔"

"کیا؟"

"پہلے ایک سوال کا جواب دیں۔ کیا آپ نے اُسے کبھی آدھی رات کو تیار ہو کر کہیں جاتے ہوئے دیکھا ہے؟" رجنی نے کہا اور بانکے لعل کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

"تو کیوں پوچھ رہی ہے بیٹا؟"

"جواب دیں چاچا جی۔"

"مگر تو کیوں پوچھ رہی ہے؟"

"اس کی وجہ ہے چاچا جی......"

"بتا تو سہی۔"

"یہ غلط بات ہے۔ سوال میں کر رہی ہوں، جواب آپ کو دینا چاہئے۔ یا پھر آپ کھل کر یہ کہہ دیں کہ آپ جواب نہیں دینا چاہتے۔"

"یہ بات نہیں ہے بیٹا۔ مگر تو یہ سمجھ لے کہ یہ بات میں نے اپنی دھرم پتنی کو بھی نہیں بتائی۔ عورت ذات ہے، خوف سے ہی مر جائے گی۔"

"مجھے بتائیں چاچا جی......"

"ہاں...... میں نے دیکھا ہے۔"

"کہاں جاتی ہے؟"

"بھگوان کی سوگند وہ پوتر ہے۔ کوئی کھوٹ نہیں ہے اُس میں، یہ بات میں پورے دعوے سے کہتا ہوں۔ کیونکہ وہ میری اولاد ہے۔"

"یہ کس نے کہا چاچا جی کہ اُس کا کردار خراب ہے؟ آپ کو معلوم ہے وہ کہاں جاتی ہے؟"

"نہیں...... میں نے اُس کا پیچھا کیا تھا مگر وہ غائب ہو گئی تھی۔"

"دوسرا سوال...... یہ گرو دھرم چند کون ہے؟" رجنی نے سوال کیا اور بانکے لعل کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ یوں لگا تھا جیسے بانکے لعل کی جان نکل گئی ہو۔ رجنی دلچسپی سے اُسے دیکھ رہی تھی......!

روپا نے یہاں اچھی طرح اپنے پنجے گاڑ لئے تھے۔ معصوم لوگ پوری طرح اُس کے جال میں پھنس گئے تھے۔ رائے گرودت اور اُن کی دھرم پتنی سرسوتی تو دن رات روپا کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

"بھگوان کی دین ہے۔ جسے من چاہے، جو دے دے۔ اب دیکھو کیسی بالی سی عمریا ہے۔ مگر بھگوان نے گیان دیا ہے۔ جے بھگوان......"

"ہاں ہیرالعل کے بارے میں اُس نے جو کچھ کہا ہے، بھگوان کرے ویسا ہی ہو جائے۔"

"میں تو اب کچھ نہیں کہوں گی۔ میرے منہ سے کوئی بھی بات نکلتی ہے تو دل میں یہی خیال گزرتا ہے کہ سنسار کہے گا کہ سوتیلا بیٹا ہے۔"

"پاگل ہو تم سرسوتی۔ کون کہے گا اسے؟"

بہر حال یہ بیچارے اُس شیطان زادی کے بارے میں اس طرح سوچ رہے تھے۔ اور روپا سوچ رہی تھی کہ اشیش بھگونتا نے اُسے بلاوجہ یہاں نہیں بھیجا ہے۔ اس کا کام ہے یہاں پر۔ سارے کے سارے اُس کے شکار ہیں۔ اور اس نے اپنے شیطانی عمل سے یہاں موجود دوسرے افراد کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو یشودھا کا نام اُس کے ذہن میں آیا۔ یشودھا، گرودت رائے کی دوسرے نمبر کی بیٹی تھی۔ بہت ہی حسین، پھولوں کی طرح نازک۔ کئی بیٹیوں کے باپ تھے وہ۔ اور جس طرح بیٹیوں کے باپ مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں، اسی طرح بیچارے رائے گرودت بھی ایسی ہی مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ سب کچھ تھا اُن کے پاس مگر من کی شانتی نہیں تھی۔ ہیرالعل نے بری طرح پریشان کیا ہوا تھا۔ بیٹیوں کا خیال آتا تو دل مسوس کر رہ جاتے۔

بہر حال روپا اس وقت اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی آج کے واقعات کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ واقعات دلچسپ ہیں اور اس سلسلے میں اشیش بھگونت کی ہدایت پر بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے وہ سوچ رہی تھی کہ ہیرالعل یہاں اس حویلی میں تو رہتا نہیں ہے۔ اسے کہاں تلاش کیا جائے؟ وہ کہتے ہیں کہ وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔ بہر حال وہ اس سلسلے میں کوئی بہتر منصوبہ بندی کرنے لگی کہ باہر سے یشودھا کی آواز سنائی دی۔

''آپ سو گئیں دیوی جی؟''

''کون، یشودھا...... اس وقت کیسے آ گئیں؟''

''آپ بھی سوچتی ہوں گی روپا جی کہ کیسے برے لوگ ہیں۔ اپنی مرضی سے سونے بھی نہیں دیتے۔ پر بھگوان کی سوگند میرا من مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔''

''من میں کوئی خاص بات ہے؟''

''ضرور۔''

''چلو کوئی بات نہیں، بتاؤ۔ دروازہ بند کر دو۔ میں تمہارے من میں آنا چاہتی ہوں۔'' یشودھا ہنس پڑی اور دروازہ بند کر کے اُس کے سامنے آ بیٹھی۔

''روپا جی...... بھگوان کی سوگند من اس طرح آپ کی طرف کھنچتا ہے کہ آپ سے ہٹنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ آپ ہمیں اپنے بارے میں بتائیے۔ اور یہ بتائیے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں آپ کو اتنا گیان کہاں سے مل گیا؟''

''کیوں...... تم بھی کچھ گیان دھیان حاصل کرنا چاہتی ہو؟''

''ہاں......'' یشودھا نے کہا اور اُس کے چہرے پر شرم کے تاثرات اُبھر گئے۔ روپا نے مسکراتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور اُس کے دل میں اُتر گئی۔ پھر وہ کہنے لگی۔

''اچھا جی...... تو اب پریمی کے حصول کے لئے گیان دھیان کی نوبت آ گئی ہے۔''

یشودھا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ روپا کی شکل دیکھنے لگی، پھر بولی۔ ''ہائے روپا جی...... آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہو گئی؟''

''پگلی، خود ہی میرے گیان دھیان کی بات کر رہی ہے اور خود ہی یہ پوچھ رہی ہے کہ یہ مجھے کیسے پتہ چل گیا؟ تو کہے تو میں تیرے پریمی کا نام بھی بتا دوں؟''

''بتاؤ......''

''اچھا کان ادھر لا۔'' روپا نے کہا اور یشودھا کے کان میں اُس کے پریمی کا نام بتا دیا۔ یشودھا کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ وہ لرزتے بدن کے ساتھ روپا کو دیکھنے لگی، پھر بولی۔

''ہائے رام...... میں تو مر گئی۔''

''کیوں......؟''

''اب کیا ہو گا......؟''

''میرے اوپر بھروسہ نہیں ہے تجھے؟''

''دیدی، بھگوان کے لئے کسی کو بتانا نہیں۔''

''ہم سے سنسار کی کون سی بات چھپی ہوئی ہے؟ تو چنتا نہ کر۔''

یشودھا محبت بھرے انداز میں اُس سے لپٹ گئی تھی۔ پھر وہ بولی۔ ''روپا جی، میرا ایک کام کر دو۔''

''بتاؤ......''

''نہیں...... تم خود سمجھ لو۔''

''ہوں، چلو ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی ہوں۔ لیکن ابھی اس میں وقت لگے گا۔ تو جانتی ہے کہ ہیرالعل کی
ے حالات کتنے خراب ہیں اور بیچارے گرودت رائے کانٹوں پر لوٹ رہے ہیں۔''

''تم سے کوئی بات نہیں چھپی ہوئی ہے۔ میں کیا بات کہوں، کیا نہ کہوں تمہارے بارے میں؟''

یشودھا بہت دیر تک روپا سے باتیں کرتی رہی تھی۔ بہر حال روپا نے یہاں اچھی طرح اپنے پنجے گاڑ
ئے تھے۔ کوئی خاص نظریہ تو ہوتا نہیں تھا، بس شیطان کی ہدایت پر انسانوں کو بے کلی سے دوچار کرنا، انہیں
یشان کرنا، انہیں نقصان پہنچانا، سیدھے راستے سے ہٹانا، یہی روپا کا کام تھا۔ اپنے طور پر تفریح بھی ہو
تی تھی اور شیطان کی ہدایت پر عمل بھی۔ اب جو بھی بد قسمت پھنس جائے۔ اب اس وقت بیچارے
رودت رائے شیطان کے سائے میں پھنس رہے تھے۔ ہیرالعل، سوتیلی ماں کی جلن میں برائیوں کی
ب بڑھ گیا تھا۔ حالانکہ سرسوتی اتنی بری عورت نظر نہیں آتی تھی۔ ادھر یشودھا کسی کی محبت کے جال
گرفتار تھی۔ کہانیاں صرف ایک حد تک محدود نہیں ہوتی ہیں۔ بس کچھ کردار ایک دوسرے سے منسلک ہو
تے ہیں جیسے پوجا چکروتی اپنے محبوب پرکاش کے سینے پر سر رکھے سسک رہی تھی اور پرکاش خاصا اُلجھا
نظر آتا تھا۔

''لیکن ایسا کیسے چل سکتا ہے پوجا؟ تم خود سوچو، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ یہ ایک دوسرے گھر کا
بل تھا۔''

''میں کیا کروں پرکاش؟ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔''

''تم میرے ساتھ نکل چلو پوجا...... اب اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔''

''ہے بھگوان...... میں کیا کروں؟ ماتا پتا کی عزت کا سوال ہے۔''

''پر اُنہوں نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ وہ ٹھنڈے دل سے نہیں سوچتے۔ حالانکہ وہ
نتے ہیں کہ ہم دونوں محبت کی انتہا تک پہنچ چکے ہیں، ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔ اگر ہم نے
ئی غلط کام کر لیا تو پھر اپنی عزت کو روتے پھریں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا پوجا کہ آخر وہ ہم سے کیوں
ہوئے ہیں؟''

''بس...... کیا، کہا جائے؟''

''کہوں گا تو میں......'' درگا داس سنگھ کی آواز اُبھری اور دونوں چونک پڑے۔ درگا داس کا پورا بدن تھر تھر
پ رہا تھا۔ وہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اُس کے پیچھے اُس کا بیٹا اور اُس کے دوست کھڑے ہوئے
اُن کی آنکھوں میں بھی خون اُترا ہوا تھا۔ پرکاش نے بے خوفی سے اُنہیں دیکھا اور بولا۔

''چاچا جی...... میں پوجا سے پریم کرتا ہوں اور ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔''

''تو مر جاؤ...... کون کہتا ہے کہ تمہارا جینا ضروری ہے؟''

''چاچا جی، انسان سے محبت کرو۔ انسان کو جینے کا راستہ دکھاؤ۔ موت کی طرف کیوں دھکیلتے ہو؟''

”میں تمہیں بہت اچھا راستہ دکھاتا ہوں...... چلو مارو اسے۔ جان سے مار دو اس کتے کے پلے کو۔“

”پتا جی...... نہیں پتا جی......“ پوجا چیخی۔ لیکن درگا داس نے اُس کی چوٹی پکڑ کر کھینچ لی۔ درگا داس کا بیٹا اور اُس کے دونوں دوست لاٹھیاں لے کر آگے بڑھے۔ پرکاش تن کر کھڑا ہو گیا۔ پھر درگا داس کے بیٹے نے لاٹھی اُٹھائی ہی تھی کہ ایک دھماکہ ہوا اور گولی درگا داس کے بیٹے کے پیر میں لگی۔ وہ ہائے رام کہہ کر بہت زور سے چیخا۔ اسی وقت گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی اور کچھ منٹ کے بعد ایک شخص بندوق لئے اُن کے سامنے نظر آنے لگا...... سب لوگ منہ پھاڑے اُس کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کے ہونٹوں سے ہنسی نکلی اور وہ بولا۔

”واہ درگا داس جی...... مزہ آ گیا۔ کبھی کبھی کیسی مزے دار کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ تمہارے گھر ڈاکہ ڈالنے آیا تھا اور چھپ کر رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ تمہاری بیٹی کی پریم کہانی آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی۔ حالانکہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ جب رات گہری ہو جائے گی تو تمہارے گھر میں داخل ہو جاؤں گا، تمہارے اور تمہارے بیٹے کے پاؤں رسّی سے کسوں گا اور پھر تمہاری دھرم پتنی کو چوٹی سے پکڑ کر اُسے ساتھ لوں گا اور ساری قیمتیں چیزیں اُس سے پوچھ کر باندھ لوں گا۔ اگر تم گڑبڑ کرو گے تو تم سب کو گولی مار دُوں گا۔“ آنے والا بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنا پروگرام بتا رہا تھا۔

”تم کون ہو بھائی؟“ درگا داس کے منہ سے کپکپاتی آواز نکلی۔ دوسری طرف اُس کا بیٹا پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ گولی نے اُس کی ہڈی توڑ دی تھی اور وہ شدید کرب کے عالم میں تھا۔

”میں جو کوئی بھی ہوں، اپنے ان پلّوں سے کہو کہ بلاوجہ میرے ہاتھوں مرنے کی کوشش مت کریں۔“ اُس نے درگا داس کے دوستوں کی طرف رُخ کر کے کہا اور وہ ساکت ہو گئے۔ ”ہاں درگا جی...... تو کیا خیال ہے؟ چلو، آج کھیل بدل دیتے ہیں۔ ہمیں تو کھیل کھیلنے سے ہی دلچسپی ہے۔“

”بھائی تم ہو کون......؟“

”ہیرالعل ہے میرا نام...... ڈاکو ہیرالعل۔“

”ایں......؟“ درگا داس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ گرودت کے ہاں وہ کافی دن تک نوکری کر چکے تھے۔ ہیرالعل کو اُنہوں نے پہلے دیکھا تھا۔ اب بہت عرصے سے اُس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ خاصا بدل گیا تھا۔ پہچان نہیں پائے تھے۔ بہرحال آہستہ سے بولے۔ ”تیرے گھر کا نمک کھایا ہے بیٹا...... ہمارے پاس کیا رکھا ہے؟ تو، تو بڑے آدمی کا بیٹا ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے، نمک کھایا تھا اس لئے معاف کئے دیتے ہیں۔ پر ان دونوں کا کام تو کر دو۔ یہ ضروری ہے۔“

”ہیرالعل...... بھگوان کے لئے ہماری عزت سے نہ کھیل۔ اس سسرے کے پاس رکھا کیا ہے؟ کنگال ہے، فقیر ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے میری بیٹی سے۔ عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ برابری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”مگر اب یہ بہت مالدار ہو گیا ہے درگا داس جی۔“

”کیسے......؟“

”اس لئے کہ اب یہ میرا دوست بن گیا ہے۔ کیا سمجھے؟...... اے لڑکے، کھڑا ہو جا۔ ورنہ اس بار تیرے سر میں گولی مار دُوں گا۔“ ہیرالعل نے درگا داس کے بیٹے کی طرف رُخ کر کے کہا۔

”ارے نہ بیٹا نہ...... ارے نہ...... تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں میں۔“

”تو کھڑا نہیں ہو گا؟“ ہیرالعل نے بندوق سیدھی کر لی اور درگا داس کا بیٹا پاؤں کی تکلیف اور غشی بھول کر کھڑا ہو گیا۔ تب ہیرالعل نے گھوڑا آگے بڑھایا اور بندوق کی نال لڑکے کی گردن پر رکھ کر اُس کو گھوڑے پر چڑھ آنے کو کہا۔ درگا داس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن بہرحال اُس نے لڑکے کو گھوڑے پر بٹھا لیا۔ ”ہاں تو درگا داس جی...... کل تمہارا سب سے پہلا کام یہ ہو گا کہ پنڈت کو بلا کر ان دونوں کے پھیرے کرا دو۔ اگر کل سورج ڈھلے یہ کام نہ ہوا تو تمہارے بیٹے کی لاش اس گھوڑے پر لٹکی تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔“

”ہے بھگوان...... ہے بھگوان......“ درگا داس دوہائی دینے والے انداز میں بولے۔

”اور کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو سمجھ لینا جو کچھ ہو گا اس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“

”مگر بیٹا تو میری بات تو سن۔ اس سسرے کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔“

”تمہارے پاس تو بہت کچھ ہے پنڈت جی۔ تم اپنی آدھی دولت اسے دے دو گے۔“

”مگر......“

”نہیں پنڈت جی...... آدھی دولت پر بات ٹل رہی ہے۔ کتنا خوش نصیب ہے تمہارا داماد ورنہ اس وقت میں تمہاری ساری دولت لے جاتا اور صبح کو تم کنگال ہوتے۔“

”تیرا ستیاناس پاپی...... تیرا ستیاناس ہو......“

”اور ہاں سنو، یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد تم روتے پیٹتے گرودت رائے مہاراج کے پاس ضرور جاؤ گے۔ لیکن اُن کے پاس جانے سے پہلے یہ کام کر دینا۔ ورنہ جو کچھ ہو گا اس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“

”ارے میرے بیٹے کو تو چھوڑ جاؤ۔“

”چھوڑ دُوں گا۔ مگر اسی شکل میں جب کل تم یہ کام کرو گے۔“ یہ کہہ کر وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر چل پڑا۔ درگا داس جی دوہائیاں دیتے رہے۔ اور پھر پوجا کی طرف مُڑ کر بولے۔

”بھگوان تجھے ختم کر دے...... تیرا بیڑا غرق ہو...... تیری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔“

”تم میری دھرم پتنی کو کچھ نہیں کہہ سکتے درگا داس جی۔ اب صورتحال بدل گئی ہے۔“ پرکاش سخت لہجے میں بولا۔

”مر جائے تو پاپی کہیں کے...... تیرا ستیاناس۔ چل میرے ساتھ۔ ہائے اب وہی کرنا پڑے گا جو وہ کہہ گیا ہے۔“ درگا داس جی نے روتے ہوئے کہا اور پھر کاشی اور پوجا کو اپنے ساتھ لے کر اندر کی جانب چل پڑے۔ اُن کے بیٹے کے دونوں دوست اُن کے پیچھے آئے تو درگا داس جی بگڑ کر بولے۔ ”ارے تم

کیوں کتوں کی طرح پیچھے لگے ہوئے ہو؟ چلو بھاگ جاؤ۔ ویسے ہی عزت دو کوڑی کی ہوگئی۔ بھاگو، تمہارا ستیاناس۔''

دونوں دوست بری سی شکل بنا کر باہر نکل گئے تھے۔ درگا داس جی کی حالت بری تھی۔ رات بھر روتے پیٹتے رہے تھے اور پرکاش اور پوجا کو کوستے رہے تھے۔ لیکن دوسری صبح وہ منہ اندھیرے ہی پنڈت جی کو بلا لائے اور دوپہر تک پوجا کے پرکاش کے ساتھ پھیرے ہوگئے۔ بہرحال صبر تو کرنا ہی پڑا تھا۔ پرکاش تقدیر کا دھنی تھا کہ زبردستی اُن کے خاندان میں شامل ہوگیا تھا اور درگا داس کی کمائی ہوئی دولت میں سے نجانے کس طرح آدھی دولت کا مالک بن گیا تھا۔ لیکن درگا داس جی کا برا حال تھا۔ بہرحال، وہ بیٹے کا انتظار کر رہے تھے اور ہیرا لعل بہرحال بات کا پکا تھا۔

شام ڈھلی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور دو آدمی لڑکے کو سہارا دے کر اندر آگئے اور پھر اُس کی دیکھ بھال ہونے لگی۔ لڑکے نے بتایا کہ ہیرا لعل نے اپنے ہاتھوں سے اُس کی مرہم پٹی کی تھی اور اُسے بہت اچھی طرح رکھا تھا۔ وہ اُسے کسی غار میں لے گیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ میری واپسی کے بعد بھی اگر پوجا اور کاشی کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو وہ ہم سب کو گولی مار دے گا۔ ''پتاجی، بہت خطرناک ہے وہ۔''

''بھگوان نے چاہا تو کتے کی موت مرے گا پاپی۔ بس میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ جاتا ہوں ابھی گرودت رائے کے پاس اور اُس سے فریاد کروں گا۔ اُس سے صاف صاف کہہ دُوں گا کہ اگر وہ اپنے ڈاکو بیٹے کو گرفتار نہیں کرا سکتا یا مار نہیں سکتا تو ہم سے کہے، ہم یہ کام کر دیں گے۔''

''پھیرے ہوگئے پتاجی؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا......''

''مگر یہ اچھا تو نہیں ہوا۔''

''بھگوان کی یہی مرضی تھی۔''

''تو پھر اب کیا ہوگا؟''

''اب جو بھی ہوگا، پرکاش ہمارا داماد ہے۔ اب اُس پاپی سے کچھ نہیں کہنا، اُس کی عزت کرنی ہے۔ ہمارا اصل دشمن تو ہیرا لعل ہے۔''

''ہم اُس کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' لڑکے نے کہا۔

''تو دیکھتا جا... میں گرودت رائے سے بات کروں گا۔ میری آواز بہت اُونچی ہے۔ پھر اگر گرودت رائے نہ مانے تو میں... میں سارے پنڈتوں اور برہمنوں کو جمع کروں گا، اُن سے بات کروں گا۔''

''کوئی اور مصیبت آجائے گی پتاجی۔'' لڑکے نے کہا اور درگا داس جی گردن ہلا کر کچھ سوچنے لگے۔

ایسا لگتا ہے جیسے انسانی زندگی کے چند ہی مسائل ہوں، بھوک، محبت وغیرہ وغیرہ۔ انسان کا اگر پیٹ بھر جائے تو شاید دوسرا بڑا مسئلہ اُس کی اپنی طلب کی تکمیل ہے۔ اب یہ بحث تو بیکار ہے کہ ان میں سے کون سی چیز بنیاد ہے؟ جہاں تک میری اپنی رائے ہے، انسانی جسم کی ضرورت غذا ہے۔ اور پیٹ بھرنے کے بعد اُس کے دل دماغ میں محبت کا سودا ہی سماتا ہے۔ اب محبت کے مختلف روپ ہوتے ہیں۔ چاہے

سی کے لئے کسی نوعیت کی ہو۔ ماں باپ، بہن بھائی، اولاد اور محبوب۔ اور اگر زندگی میں دوسری سائشیں حاصل ہوں تو پھر بنیاد محبوب ہی رہ جاتا ہے۔

تو روپا اس گھر میں داخل ہونے کے بعد زندگی کے بڑے لطف لے رہی تھی۔ رائے گرودت تو ویسے ں اُس کا دیوانہ ہوچکا تھا اور اکثر اپنی دھرم پتنی سے کہتا تھا کہ سرسوتی، ایسا لگتا ہے کہ بھگوان نے ہمارے لئے اوتار بھیج دیئے ہوں۔ میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔ تو دیکھ لینا، ایک دن یہ ہمارا کلیان کر کے ہائے گی۔ میرا دل کہتا ہے۔

اب یہ الگ بات ہے کہ بیچارے گرودت کا کلیان ہی ہونے والا تھا۔ کیونکہ اوتار نہیں بلکہ شیطان اُتر آیا تھا اُن کے گھر میں اور اُس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ روپا کو کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ لیکن شیطان نے اُس کی زندگی بچائی تھی۔ ورنہ شیطان ہی کا ایک داس اُسے ان تہہ خانوں میں ختم کرنے پر تل گیا تھا اور اُس نے روپا کا گھر اُجاڑ دیا تھا۔ اگر شیطان اُس کی مدد نہ کرتا تو وہاں سے نہیں نکل سکتی تھی۔ بہرحال اب اس کے بعد تو روپا عیش و عشرت کی زندگی کی عادی ہوگئی تھی۔ اور یہ شیطان کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ کیا نہیں حاصل ہوگیا تھا اُنہیں؟ ساری بہنیں اگر چاہتیں تو رانیوں کی طرح راج کر سکتی تھیں اور زندگیاں گزار سکتی تھیں اور گزار بھی رہی تھیں۔ لیکن بات وہی تھی کہ شیطان کو خراج ادا کرنا ضروری تھا ورنہ شیطان اُن سے ناراض ہوجاتا۔

رجنی نے بغاوت کی تھی اور یقینی طور پر شیطان سے بغاوت آسان نہیں تھی۔ اُس نے اپنا مذہب بھی بدل لیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس کے بعد رجنی کا حشر کیا ہوتا ہے؟ مگر روپا اپنا وہ حشر نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے وہ شیطان کی ہدایت پر وہاں سے نکلی تھی اور آخرکار اُسے ایک ایسا پُرسکون گھرانہ مل گیا تھا جہاں تباہی پھیلا کر وہ شیطان کو خوش کر سکتی تھی اور اُس نے اپنے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔ رائے گرودت کی تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے چھوٹی کامنی تھی۔ معصوم اور کومل تھی۔ دوسری یشودھا اور تیسری کلاوتی۔ کلاوتی بھی ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی اور پتہ نہیں کس طرح کی لڑکی تھی وہ؟ ابھی تو روپا نے یشودھا کو دیکھا تھا۔ یشودھا کا دل اُس پر کھل گیا تھا۔ وہ سنگیت نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی۔ لیکن اتفاق کی بات یہ کہ یہاں بھی وہی مسئلہ درپیش تھا جو بیچاری پوجا اور پرکاش کا مسئلہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں ہیرا لعل نے کام درست کر دیا تھا۔ برا آدمی بھی کبھی کبھی اچھائیاں کر لیتا ہے۔

اب ویسا ہی مسئلہ یہاں بھی درپیش تھا۔ چونکہ سنگیت جو یشودھا کا محبوب تھا، یشودھا کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایک معمولی آدمی کا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ کپڑے کا کاروبار کرتا تھا جبکہ گرودت رائے بہت بڑے رئیس تھے۔ سنگیت تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس گھر میں اُس کی شادی ہوسکتی ہے اور یشودھا اُس کی زندگی میں آسکتی ہے۔

دوسرا مسئلہ کلاوتی کا تھا۔ کلاوتی بھی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی اور وہ نوجوان اس عمارت میں ملازمت کرتا تھا۔ بڑا دلچسپ چکر چل رہا تھا۔ کلاوتی کے محبوب کا نام امر تھا۔ امر سنگھ محل کی دیکھ بھال پر مقرر تھا۔ نوجوان اور خوبصورت لڑکا تھا۔ کلاوتی اُس سے متاثر ہوگئی اور دونوں کی زندگی میں ایک تبدیلی

رونما ہوگئی۔ بہرحال دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ لیکن دونوں ہی کو یہ احساس تھا
کہ ان کا ملاپ ممکن نہیں ہے۔ شروع شروع میں تو امر سنگھ، کلاوتی کے پاس آنے سے بھی خوفزدہ ہوتا تھا۔
لیکن ایک دن کلاوتی نے اُسے بڑے سخت لہجے میں کہا تھا کہ یہ بری بات ہے۔ وہ اُس سے ملتا کیوں نہیں
ہے؟ تو امر سنگھ نے کہا تھا۔

"آپ جانتی ہیں کلاوتی جی کہ میں آپ کے چرنوں کی دُھول ہوں اور بالکل اس قابل نہیں ہوں کہ
آپ مجھے عزت کے لئے جگہ دیں۔ کلاوتی جی، آپ جانتی ہیں کہ میں تو نمک کھانے والوں میں سے
ہوں۔ نمک حرامی نہیں کرنا چاہتا میں۔"

"محبت نمک حرامی تو نہیں ہوتی امر۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن آپ کا کیا خیال ہے، سنسار کی نگاہیں کیا ہوتی ہیں؟ یہ آپ نہیں سمجھتیں۔ آپ
کو پتہ ہے کلاوتی جی کل اگر کسی طرح میرا اور آپ کا پریم دنیا کی نگاہوں کے سامنے آجائے تو سنسار کیا
سوچے گا؟ صرف اور صرف یہ سوچے گا وہ کہ میں نے ایک دولت مند لڑکی کی طرف قدم صرف اس لئے
بڑھائے ہیں کہ اس کی دولت میں میرا حصہ لگ جائے۔ نہیں کلاوتی جی، بھگوان کے لئے مجھے اس برے
راستے پر نہ ڈالیں۔"

"مگر میں تم سے پریم کرتی ہوں۔ میں تمہاری بننا چاہتی ہوں۔ اس کے لئے چاہے مجھے کچھ بھی کرنا
پڑے۔ اگر اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکی تو جان دے دُوں گی۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ میرے لئے کیوں جان دے دیں؟ مجھے راستہ بتائیے، میں کیا
کروں؟"

"میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ تم مرد ہو، راستہ خود نکالو۔"

بہرحال، بیچارہ امر سنگھ خود بھی کیا کرسکتا تھا؟ وقت گزرتا رہا۔ پھر اتفاق کی بات یہ کہ ایک ایسی رات
بھی آئی جب روپا نے امر سنگھ اور کلاوتی کو ایک ساتھ دیکھ لیا۔ روپا ایک دم ہنس پڑی تھی اور دل ہی دل
میں اُس نے کہا تھا۔

"واہ میرے پیارے بچو...... تم تو بڑے ہونہار ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ رائے گرودت کے ہاں کھیل
ہی اُلٹا ہو رہا ہے اور آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ ادھر ہیرالعل اپنی رنگ رلیوں میں مست، ماں سے نفرت
کرنے والا۔ ادھر یشودھا جی محبت کی ماری ہوئی اور تیسرا کردار ان کلاوتی جی کا ہے...... کمال کے لوگ ہیں
یہ...... یہ تو پوری شکار گاہ ہے جس میں چاروں طرف خرگوش دوڑ رہے ہیں، جسے چاہے نشانہ بنالو۔"

بہرحال روپا یہاں ایک مہان گیانی کے طور پر مشہور تھی۔ ہیرالعل سے ابھی تک اُس کی ملاقات نہیں
ہوئی تھی اور وہ کئی بار دل ہی دل میں سوچ چکی تھی کہ پیارے ہیرالعل جی...... کسی دن اپنے درشن بھی تو
کراؤ۔ ذرا دیکھوں تو سہی کہ تم کتنے پانی میں ہو؟ ہم اس شکار گاہ میں سارے چرندوں اور پرندوں کو دیکھ
لینا چاہتے ہیں تا کہ ان کے مطابق کام شروع کریں۔

لیکن ہیرالعل اس دوران ابھی تک حویلی میں نہیں آیا تھا۔ پھر کلاوتی، روپا کے ہاتھ لگ گئی۔ ذرا

خاموش طبع لگی تھی۔ روپا نے خود اُسے آواز دی اور کلاوتی اُس کے پاس آگئی۔

"کیا بات ہے کلاوتی... تم کبھی ہمارے پاس نہیں آتیں؟ میرا خیال ہے تم ہمیں پسند نہیں کرتیں۔"

"کیسی بات کرتی ہیں روپا جی آپ؟...... آپ اتنی مہان اور قابل عزت ہیں ہمارے لئے کہ ہم تو کہہ
نہیں سکتے۔ میرے ماتا جی اور پتا جی کتنی آپ کی عزت کرتے ہیں، آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ بھگوان نے
آپ کو روپ رنگ بھی دیا اور اس کے ساتھ گیان بھی۔ بس اس لئے ڈرتی ہوں کہ کہیں مجھ سے آپ کی
شان میں کوئی گستاخی نہ ہوجائے۔"

"تم میری دوست ہو کلاوتی۔ اس گھر میں مجھے جو عزت دی گئی ہے اس کے بعد تو اس گھر کا ہر فرد میرا
پیارا اور میرا دوست ہے۔ تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ آؤ...... میرے پاس آؤ۔" کلاوتی خوش خوش روپا کے
کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ روپا اُسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھنے لگی، پھر اُس نے کہا۔ "کلاوتی، انسان
اپنے آپ سے چھپ سکتا ہے لیکن کسی گیانی سے نہیں چھپ سکتا۔ اب تم لوگ مجھے گیانی مانتے ہو تو پھر یہ
کیوں سوچتے ہو کہ میں تمہاری مشکلوں سے واقف نہیں ہوں گی؟"

کلاوتی نے چونک کر روپا کو دیکھا اور بولی۔

"مشکلوں سے......؟"

"ہاں......"

"مم...... مگر روپا جی، میں تو......"

"کسی مشکل کا شکار نہیں ہوں۔" روپا نے اُس کی بات پوری کی۔

"ہاں، بھگوان کا شکر ہے۔"

"مجھ سے جھوٹ......؟"

"نہیں...... میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ آپ دیکھ لیجئے، سنسار کی ہر چیز ہمیں حاصل ہے۔ بھگوان نے
پتا جی کو بہت کچھ دے رکھا ہے اور انہوں نے ہمارے لئے دنیا کی ہر آسائش مہیا کردی ہے۔ روپا جی،
انسان کو اور کیا چاہئے ہوتا ہے؟ عزت کی زندگی، گھربار اور سکون۔"

"اور دل کے سکون کے بارے میں کیا کہتی ہو؟" روپا نے مسکراتی نگاہوں سے کلاوتی کو دیکھتے ہوئے
کہا اور کلاوتی چونک کر اُسے دیکھنے لگی، پھر بولی۔

"جی......؟"

"ہاں...... میں دل کے سکون کی بات کر رہی ہوں۔"

"روپا جی، سکون تو دل ہی میں ہوتا ہے نا۔"

"ہاں، بالکل۔"

"اور مجھے ہے۔"

"نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" کلاوتی کے لہجے میں دہشت اُبھر آئی۔

’’کلاوتی، دوست ہو میری، تھوڑی ہی چھوٹی ہو، مجھ سے دل کی بات کیوں چھپاتی ہو؟ اگر مجھ سے ہی پوچھنا چاہتی ہو تو میں تمہیں بتاؤں، امر سنگھ برا لڑکا نہیں ہے۔‘‘

’’جی......؟‘‘ کلاوتی کی آواز دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔

’’ہاں...... میں جانتی ہوں کہ تم امر سنگھ سے پریم کرتی ہو۔‘‘

’’روپا دیدی، مر جاؤں گی میں...... روپا جی، میں مر جاؤں گی۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں یہ؟‘‘

’’یہ بتاؤ، کیا یہ جھوٹ ہے؟ بولو، بولو...... اگر سچی پریمی ہو تو میں نے تمہارے پریمی کا نام دے دیا ہے۔ بتاؤ، جھوٹ بول رہی ہوں میں؟‘‘

دفعتہً ہی کلاوتی کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے اور اُس نے آگے بڑھ کر روپا کے پاؤں پکڑ لئے۔

’’جان ہی گئی ہو تو اب مجھے میری اس مشکل کا حل بتاؤ۔ ورنہ میں تمہارے چرن نہیں چھوڑوں گی۔ گیانی ہو، اپنے گیان سے میرا کام کر دو۔‘‘

’’ارے ارے...... میرے پاؤں تو چھوڑو۔‘‘

’’نہیں چھوڑوں گی، جب تک مجھ سے یہ نہیں کہو گی کہ تم میری مدد کرو گی۔ میں نے تو تم سے نہیں کہا تھا کہ میں کسی سے پریم کرتی ہوں۔ جب تم نے یہ سب کچھ معلوم کر لیا ہے تو پھر میری مشکل حل کر دو۔‘‘

’’ہاں ہاں...... کروں گی بھئی، کروں گی۔ چھوڑو تو سہی۔ آرام سے بیٹھو۔‘‘ روپا نے کہا اور کلاوتی نے اُس کے پیر چھوڑ دیئے۔ وہ روتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

’’میں نے آج تک کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میری ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ بلکہ میں تو یہ سوچتی تھی کہ جب بھی کبھی میں امر سنگھ سے ملتی ہوں تو...... تو کہیں کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔‘‘

’’تمہیں یہ احتیاط تو کرنی چاہئے تھی۔ لیکن خیر، اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔‘‘

’’اب یہ بتاؤ روپا جی، تم میری مدد کرو گی؟‘‘

’’ہاں کروں گی بابا۔ تم دونوں شادی کرنا چاہتے ہو نا؟‘‘

’’ہاں روپا جی...... لیکن ایک بات میں جانتی ہوں۔‘‘

’’کیا......؟‘‘

’’گرودت، میرے پتا کبھی میری شادی امر سے نہیں کریں گے۔‘‘

’’کیوں......؟‘‘ذ

’’وہ ہمارے گھر کا ایک ملازم ہے۔‘‘

’’انسان تو ہے نا......‘‘

’’بس سمجھنے کا فرق ہے۔ لوگ کسی کو انسان کہاں سمجھتے ہیں؟ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کون کس حیثیت کا مالک ہے؟ یہ نہیں دیکھتے کہ کس کے دل میں کس کے لئے کیا حیثیت ہے؟‘‘

’’ہوں، ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرو۔ میں دیکھوں گی کہ میں کیا کر سکتی ہوں؟‘‘

روپا یہ سوچ رہی تھی کہ جو کچھ یہاں کر رہی ہے وہ کسی قابل ہے یا نہیں؟ کلاوتی تو چلی گئی تھی۔ روپا

اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے بیٹھی اسی سوچ میں گم تھی کہ اُسے کیا کرنا چاہئے، کہ اچانک ہی اُسے کچھ روشنیاں سی چمکتی محسوس ہوئیں۔ ایک مخصوص انداز تھا ان روشنیوں کے جلنے کا۔ اور پھر اشیش بھگونت کی آمد کی نشانی ہوا کرتی تھی۔ روپا ایک دم سنبھل گئی۔ بہت عرصے کے بعد اشیش بھگونت اُس کے پاس آیا تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد شیطان کا مجسمہ روپا کے سامنے آ گیا...... اُس کی آنکھوں میں کوئی خاص کیفیت نہیں تھی۔ وہ کہنے لگا۔

’’ہاں روپا...... کیا ہو رہا ہے؟‘‘

’’جے بھگونتا...... تم تو میرے سارے شریر میں اُترے ہوئے ہو۔ جب بھی کبھی میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں، تم فوراً ہی میرے سامنے آ جاتے ہو۔‘‘

’’میرے بارے میں تو یہ مشہور ہے کہ کوئی بھی سوچتا ہے تو میں اس کے پاس آ موجود ہوتا ہوں۔‘‘

’’میں نہیں جانتی تھی یہ بات۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... کیوں یاد کر رہی تھی مجھے؟‘‘

’’بھگونتا...... تمہارے کہنے پر میں گھر سے باہر نکلی ہوں اور اتفاقات مجھے رائے گرودت کی اس حویلی تک لے آئے ہیں۔ بھگونتا، میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ تمہیں اس جگہ کے بارے میں صحیح معلومات نہیں ہیں، لیکن میرا بھی فرض ہے کہ میں اپنے طور پر بتاؤں کہ میں کیا سوچتی ہوں۔‘‘

’’ہاں بولو بولو...... بتاؤ۔‘‘

’’بھگونتا...... یہ ایک پُرسکون گھر ہے۔ رائے گرودت ایک دولت مند آدمی ہے۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے۔ دوسری بیوی ہے، ایک بیٹا ہے جو اس گھر سے باغی ہے۔ اور یہ سوچتا ہے کہ اس گھر کی دولت کبھی اس کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ اس بغاوت میں وہ ڈاکو بن چکا ہے اور جنگلوں میں ڈاکے ڈالتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس گھر میں سرسوتی کی تین بیٹیاں ہیں۔ کامنی، یشودھا اور کلاوتی۔ یہ ان لوگوں کی جان ہیں۔ باقی گھر کے نوکر وغیرہ ہیں۔ میں اس پُرسکون گھر کو اس طرح برباد کر دینا چاہتی ہوں جیسے ہم نے منوہر لعل کے گھر کو برباد کیا ہے۔‘‘

’’ہاں، پھر......؟‘‘

’’نہیں بھگونتا، میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا میرا یہ سوچنا ٹھیک ہے؟‘‘

’’بالکل ٹھیک ہے۔ ہمیں وہ گھر ناپسند ہیں جہاں صرف عبادت ہوتی ہے اللہ کے نام پر، بھگوان کے نام پر، واہ گرو کے نام پر، کرائسٹ کے نام پر۔ مجھے بس اس سے اختلاف ہے۔ وہ لوگ جو برائیوں میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، وہ مجھے پسند ہیں۔ کیونکہ بہر حال ان کا خاتمہ تباہی پر ہی ہوتا ہے۔ تم نہیں سمجھتی ہو میرے دل کی آگ مجھے کیا راستے دکھاتی ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں کوئی سکون سے نہ رہے۔ یہی میری زندگی کا مقصد ہے اور اس کے لئے میں اپنے لاتعداد شاگردوں کو مصروف کئے رہتا ہوں۔ تم بالکل ٹھیک جا رہی ہو۔ مجھ سے کوئی مشورہ لینا چاہو تو مجھے بتانا۔‘‘

’’ہاں ضرور بھگونتا...... میں تو یہ معلوم کرنا چاہوں گی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟‘‘

''رائے گرودت یہ نہیں چاہتا یا یہ پسند نہیں کرے گا کہ اُس کی بیٹی کی شادی ایک ملازم سے ہو۔''

''ظاہر ہے۔''

''اور یہ بھی نہیں چاہے گا کہ ایک غریب لڑکے سے اُس کی دوسری بیٹی کی شادی ہو۔''

''جی مہاراج......''

''اور وہ اس سلسلے میں اپنی بیٹیوں کی قربانی دینے پر بھی تیار ہو جائے گا۔''

''شاید......''

''نہیں...... یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں اس کے لئے پوری ترکیب بتا رہا ہوں۔ ان دونوں کو تھوڑی دیر کے لئے ختم کر دو۔ یعنی اس طرح کہ وہ مر جائیں، مگر اصل میں وہ مریں گی نہیں۔ میں تمہیں یہ شیشی دے رہا ہوں، اس میں ایک بہت ہی عمدہ چیز ہے۔ اس کے دو قطرے ایک ایک گلاس میں ٹپکا کر انہیں پلا دو۔ ان کی مکمل موت واقع ہو جائے گی، لیکن تھوڑے وقت کے لئے۔ اور اس کے بعد تم اپنا کھیل کھیلو۔ جہاں تک ہیرالعل کا معاملہ ہے، اس کے لئے ابھی لمحوں کا انتظار کرو۔ وقت خود اپنی کہانی ترتیب دیتا ہے۔ بس تمہیں یہ خیال رکھنا ہے کہ ان میں سے ہر کردار کو بہت اچھے طریقے سے استعمال کرتی رہو۔''

''بھگونتا، آپ خوش ہیں اس بات سے؟''

''میں ہر اس بات سے خوش ہوتا ہوں جو میرے چیلے میرے لئے کرتے ہیں میرے نام کے ساتھ۔'' شیطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھگونتا...... رجنی کا کیا حال ہے؟''

''وہ......'' اشیش بھگونت کا منہ بگڑ گیا۔ ''وہ حد سے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس نے نیکیوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور اس بات پر لگی ہوئی ہے کہ جہاں بھی میرے اشارے پر کوئی کام ہو رہا ہو، وہاں مداخلت کرے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک اور شہر میں وہ موجود ہے اور تمہاری ہی طرح ایک گھر میں گھسی ہوئی ہے جہاں کچھ کام ہو رہا ہے۔ بہر حال ایک بات تم سن لو، رجنی کو میں ایسی موت ماروں گا کہ تم دیکھتی رہنا۔ اور تم اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر پاؤ گی۔''

روپا سرد نگاہوں سے اشیش بھگونتا کو دیکھتی رہی۔ اُس نے اپنے دل کا جائزہ بھی لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطانی صفات کی مالک ہونے کے بعد اُس کے دل میں کسی کے لئے بھی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ فطرت ہی بدل جاتی ہے انسان کی جب انسان شیطان کے جال میں پھنستا ہے تو ہر طرح کا احساس اُس سے دُور ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ ایک بری شخصیت کا مالک بن جاتا ہے۔ بہر حال شیطان اُسے سیال شیشی دے کر غائب ہو گیا اور روپا سوچنے لگی کہ ہر شخص اپنی زندگی جیتا ہے، اپنی زندگی مرتا ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ بلاوجہ رجنی کی فکر میں پڑوں؟ جیسا کر رہی ہے وہ، خود بھگتے گی۔ اور ویسے بھی اب وہ ہم میں سے تو نہیں رہی۔ ایک غیر مذہب کی لڑکی ہو کر رہ گئی ہے وہ۔ مجھے اپنا کام کرنا چاہئے۔ پھر وہ ان دلچسپ حالات کے بارے میں سوچنے لگی جو پیش آنے والے تھے۔ دونوں لڑکیاں یشودھا اور کلاوتی محبت میں گرفتار تھیں۔ ظاہر ہے ابھی تک ان کے پریمیوں کے بارے میں رائے گرودت کو معلومات نہیں تھیں۔ وہ تو اپنی

بیٹیوں کو لازمی طور پر معصوم اور بچہ سمجھ رہے ہوں گے۔ لیکن یہ کام بہر طور کرانا تھا۔ دونوں لڑکیوں نے روپا پر بھروسہ کیا تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اشیش بھگونتا کا اشیرواد اُنہیں مل گیا تھا۔ اس اشیرواد کے بعد کسی قسم کا تردّد بے معنی تھا۔ چنانچہ روپا اپنے دلچسپ کھیل کے لئے تیار ہو گئی۔

سرسوتی دیوی محبت کی ماری تھیں، حالانکہ حویلی میں لاتعداد ملازم تھے لیکن رات کو وہ اپنی بیٹیوں کو دودھ اپنے ہاتھ سے پلاتی تھیں۔ اس وقت بھی اُنہوں نے دُودھ تیار کیا۔ ابھی دُودھ کے گلاس ڈھکے نہیں تھے کہ ایک نامعلوم ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے دُودھ کے گلاسوں میں ایک شیشی سے ایک ایک قطرہ ٹپکا دیا...... تیسرا گلاس کامنی کے لئے تھا اور وہ الگ ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ سرسوتی دیوی دُودھ کے گلاس لے کر بیٹیوں کے کمرے میں پہنچ گئی۔ کامنی خود اُن کے کمرے میں سویا کرتی تھی۔ دونوں زہریلے دُودھ کے گلاس اُنہوں نے بیٹیوں کے سامنے رکھ دیئے اور بولیں۔

''بس، اب دُودھ پی کر سو جاؤ۔ رات بہت بیت گئی ہے۔'' پھر وہ دُودھ کا تیسرا گلاس لے کر کامنی کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ لیکن کامنی گہری نیند سو رہی تھی۔ ویسے بھی اس گلاس میں زہر نہیں تھا۔ سرسوتی دیوی اپنے کام مکمل کرنے کے بعد شوہر کے پاس پہنچ گئیں۔ گرودت رائے بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ سرسوتی دیوی نے کہا۔

''کیا سوچ رہے ہیں رائے صاحب؟''

''بس جیون کے بہت سے کھیل ہوتے ہیں۔ انسان سوچنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے؟''

''آپ پریشان نہ ہوا کریں...... بھگوان سب ٹھیک کر دے گا۔ آپ ہیرالعل کے لئے بھی پریشان رہتے ہیں نا؟''

رائے گرودت نے نگاہیں اُٹھا کر دھرم پتنی کو دیکھا اور بولے۔ ''بیٹا ہے نا میرا...... کبھی کبھی تو دل سینے سے باہر نکلنے لگتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسی کون سی ترکیب ہو جس سے اُس کے دل سے میرے لئے برائی نکلے؟ تمہیں وہ اپنی ماں سمجھے؟''

''بھگوان جو کرے گا ٹھیک کرے گا۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں، نجانے کیوں میرا دل یہ کہتا ہے کہ اس دیوی کی آمد ہمارے لئے نیک شگون ثابت ہو گی۔''

''ہاں، بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔ من تو میرا بھی یہی کہتا ہے۔ ایک اور بات، بیٹیوں کے لئے ابھی تک کوئی رشتہ بھی نہیں آیا۔ دونوں بچیاں جوان ہو گئی ہیں۔ انہیں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کب ان کے ہاتھ پیلے ہوں گے؟ عمر تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ گیا ہوا ایک دن بھی کبھی واپس نہیں آتا۔''

''اب ساری فکریں اپنے سرمت لگاؤ۔''

دوسرے دن صبح وہ ہو گیا جس کی کارروائی روپا نے کی تھی...... ایک داسی یشودھا اور کلاوتی کے کمرے میں پہنچی تھی۔ لیکن داسی نے جو کچھ دیکھا اس نے اُسے حواس باختہ کر دیا...... یشودھا اور کلاوتی مسہری سے زمین پر مُردہ پڑی تھیں...... اُن کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ہوش میں نہیں ہیں۔ داسی اُن کے قریب پہنچی اور اُس نے حیرت سے اُن کے جسموں کو دیکھا، پھر ماتھا چھو کر دیکھا اور دوسرے لمحے اُس کا

پورا بدن لرز کر رہ گیا...... دونوں لڑکیاں برف کی طرح سرد ہو رہی تھیں۔ داسی کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ چیختی ہوئی بھاگی۔

"ہے بھگوان...... ہے بھگوان...... یہ کیا ہو گیا...... مہاراج، سرسوتی جی...... دیکھیے تو سہی یہ کیا ہو گیا؟" اُس کی چیخ و پکار پر سارے لوگ اُس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اور پھر گرودت اور سرسوتی جی باہر نکل آئیں۔

"کیا ہو گیا...... موت آ گئی کیا تجھے؟ کیوں چیخ رہی ہے پاگلوں کی طرح؟"

"اندر چلیے دیوی جی... اندر چلیے۔ ہائے رام.... ہائے رام۔" داسی زار و قطار روتی ہوئی بولی۔

"کہاں اندر؟"

"وہاں، اُدھر؟"

"اُدھر کیا ہے؟"

"یشودھا جی کا کمرہ...... آئیے تو سہی۔"

"ہیں...... کیا ہو گیا؟" دونوں میاں بیوی تیزی سے اُس کمرے کی جانب بھاگے۔ اندر کا منظر دیکھا اور اُن کا خون خشک ہو گیا...... دونوں لڑکیاں جس انداز میں پڑی تھیں اس سے یہ احساس ہوتا تھا جیسے اُن کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ پھر اُن کے جسم چھو کر دیکھے گئے، دونوں کے جسم برف کی طرح ٹھنڈے پڑے ہوئے تھے۔ سرسوتی جی کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ گرودت رائے بھی بدحواس ہو گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں گھر کے سارے ملازم جمع ہو گئے اور اس کے بعد لے دے ہونے لگی...... ڈاکٹر صاحب آئے اور اُن کا جائزہ لینے لگے۔ گرودت کی حالت بری طرح خراب ہو رہی تھی۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہوا؟

ڈاکٹر صاحب نے اُن کا معائنہ کیا اور پھنسی پھنسی آواز میں بولے۔ "بھگوان آپ کو صبر دے۔ یہ دونوں اب اس سنسار میں نہیں ہیں۔"

سرسوتی دیوی کے حلق سے کرب ناک چیخیں نکلنے لگیں۔ رائے گرودت بھی بے اختیار ہو کر رونے لگے تھے اور پورا گھر غم و اندوہ کا شکار ہو گیا تھا...... پوری حویلی میں کہرام مچ گیا۔ اس گھر کی دو بیٹیوں کی موت کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا...... سرسوتی دیوی نے آخری چیخ ماری اور اس کے بعد اُن پر سکتہ طاری ہو گیا...... اُن کے دماغ پر گہرا اثر پڑا تھا۔ لیکن کسی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا؟ بہت سے ڈاکٹر جمع ہو گئے تھے۔ پھر کسی کی توجہ اُن گلاسوں کی جانب گئی۔ لیکن دودھ کے گلاس خالی رکھے ہوئے تھے اور ان سے کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا۔

بہر حال جس نے سنا، دنگ رہ گیا۔ دُور دُور تک سب کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ بدترین حادثہ ہو گیا ہے۔ ہر آنکھ سے آنسو رواں تھے۔ ہر شخص رو رہا تھا۔ گرودت جی دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے۔ سارے ڈاکٹروں نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ دونوں لڑکیاں موت کا شکار ہو چکی ہیں اور موت یقینی طور پر زہریلا دُودھ پینے سے ہوئی ہے۔ سرسوتی دیوی سے اب یہ بھی نہیں پوچھا جا سکتا تھا کہ یہ زہریلا دودھ

کہاں سے آیا؟ کیونکہ دودھ خود وہ اپنے ہاتھوں سے پلاتی تھیں۔

یہاں تک کہ خاصا وقت گزر گیا اور اس کے بعد حویلی کے لوگ لڑکیوں کی آخری رسومات کی تیاریاں کرنے لگے۔ دو جوان لڑکیاں زندگی سے موت کی جانب چلی گئی تھیں۔ اس دوران روپا اپنے کمرے میں ہی محدود رہی تھی۔ لیکن اس وقت کوئی یہ سوچنے والا نہیں تھا کہ وہ کمرے سے باہر کیوں نہیں نکلی؟ اور وہاں کیوں نہیں آئی؟

گرودت رائے نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔ بیوی کی حالت دیکھ کر وہ اور پریشان ہوا جا رہا تھا۔ بمشکل تمام اُسے لڑکیوں کے کمرے سے نکال کر اپنے کمرے میں لایا تھا کہ اسی وقت روپا اس کمرے میں داخل ہو گئی۔ گرودت نے روپا کو دیکھا اور بے اختیار رو پڑا۔

"دیکھا مس روپا جی...... دیکھا مس آپ نے ہماری بدنصیبی کو؟ یہ تو بدنصیبی کی بات ہوتی ہے۔ ارے کہاں سے ہم وہ نصیب لائیں جو ہماری مشکل دُور ہو؟ یہ کیا ہو گیا روپا دیوی...... یہ کیا ہو گیا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ روپا خاموش کھڑی اُنہیں دیکھتی رہی۔ پھر دو قدم آگے بڑھ کر بولی۔

"لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"کسی کو کچھ نہیں معلوم...... کوئی نہیں جانتا۔"

"ہوں......" روپا واپس مُڑی اور اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ دروازے سے پیٹھ لگائے خاموش کھڑی سامنے دیکھتی رہی، پھر اچانک ہی اُس کا چہرہ تبدیل ہونے لگا۔ اُس کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا تھا...... آنکھیں جیسے حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ رائے گرودت نے اُسے دیکھا اور ایک دم چونک پڑا۔ تبھی اُس کے اندر ایک سرد سا خوف دوڑنے لگا۔ روپا کا چہرہ بڑا عجیب ہو رہا تھا...... پھر اُس کی آواز اُبھری۔

"رائے گرودت...... اِدھر آؤ۔" یہ آواز بھی بالکل بدلی ہوئی تھی۔ گرودت نجانے کیوں دہشت زدہ سا ہو گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اُس کے پاس پہنچ گیا۔

"جی دیوی؟" اُس نے کہا۔

"جو کچھ میں کہوں گی وہ کرو گے؟"

"کیا دیوی؟ میں نہیں جانتا۔"

"اگر تمہاری بیٹیاں جیون پا جائیں تو؟"

"نہیں دیوی...... ہائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سنو میں جو کہہ رہی ہوں...... تم مجھے یہاں مذاق میں تو نہیں لائے یا میں یہاں بلاوجہ تو وقت ضائع نہیں کر رہی۔ اس گھر پر نحوست کے جو سائے منڈلا رہے ہیں، کیا میں نے وہ نہیں دیکھے؟"

"دیوی، میری بیٹیاں...... میری بیٹیاں مر گئیں۔"

"نہیں...... جب تک ان کی ارتھی نہ جل جائے، میں ان کو مُردہ نہیں مان سکتی۔"

"دیوی، آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

اچانک ہی سرسوتی کی چیخ سنائی دی۔ ان الفاظ نے اُس کے حواس واپس کر دیئے تھے۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اُٹھی اور روپا کے پاس پہنچ گئی۔ اُس نے جھک کر اُس کے پاؤں پکڑ لئے۔

''مجھے اپنی بیٹیوں کا جیون واپس چاہئے دیوی...... مجھے اپنی بیٹیوں کا جیون واپس چاہئے۔''

''اُن کا جیون اُنہیں مل سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ایک شرط ہوگی۔''

''ہمیں ہر شرط قبول ہے۔ مگر دیوی یہ مر چکی ہیں۔ مرے ہوئے کبھی واپس نہیں آتے۔''

''بے شک، تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اگر تم ان کا جیون کسی کو دان کر دو، کسی کے نام کر دو، کسی کے حوالے کر دو تو شاید یہ واپس آ جائیں۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ لیکن دیوی، آپ کا جو دل چاہے کریں۔ آپ جو کہیں گی، سمجھ لیں میں وہی کروں گا۔''

''ٹھیک ہے...... باہر ان کی ارتھی تیار کی جا رہی ہے۔ اُن کی آخری رسومات ادا کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔''

''ہاں......''

''تو پھر انہیں بند کرا دو اور مجھے اُن کے مُردہ جسموں کے پاس لے چلو۔''

ماں باپ غم کے مارے اُمید کا دامن پکڑے ہوئے روپا کے ساتھ چل پڑے۔ حالانکہ یہ ایک ناقابل یقین بات تھی۔ کم از کم رائے گرودت کو تو یہ پتہ تھا کہ دیوی کتنی ہی مہان کیوں نہ ہو لیکن جن بیٹیوں کی موت کی تصدیق اس طرح سے ہو چکی ہے، انہیں دوبارہ زندگی مل جانا تو ناممکن سی ہی بات ہے۔ مگر ماں اُمید کا دامن پکڑے ہوئے تھی۔ روپا ان دونوں کے ساتھ اُس کمرے میں آ گئی جہاں یشودھا اور کلاوتی کی لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ اُن کے بے جان جسموں میں زندگی کا نام ونشان نہیں تھا اور پھر ڈاکٹر اس بات کی تصدیق کر چکے تھے کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔ ایک بھی ڈاکٹر ایسا نہیں تھا جس نے اُمید ظاہر کی ہو کہ ان میں زندگی ہے۔ بہرحال وہ اس اُمید پر اندر آئے کہ شاید کوئی انوکھی ہی بات ہو جائے۔ اندر داخل ہونے کے بعد روپا نے کہا۔

''دیکھو، یہ بات اگر باہر نکل گئی تو نتیجے کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں، مجھے کرنے دو۔ جو کچھ میں بتاؤں، ویسا ہی کرنا۔''

''آپ کا جو حکم ہوگا، ہم وہی کریں گے۔''

''تم اُدھر کونے میں جا کر بیٹھ جاؤ سرسوتی دیوی...... اور تم دوسرے کمرے میں۔''

پھر روپا نے درمیان میں کھڑے ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سب کچھ وہ ایک ڈرامہ کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ درمیان میں کھڑی رہی پھر اُس کے حلق سے ایک بھاری آواز نکلی۔

گرودت کی نگاہیں اُس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ روپا کی آواز اُبھری تو وہ اس طرف متوجہ ہو گیا۔ روپا نے کہا۔ ''گرودت مہاراج، ان دونوں کا جیون ایک راکھشش کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ یہ قدرتی موت نہیں مریں بلکہ ان کی آتمائیں کسی نے اپنے قبضے میں کر لی ہیں۔ جب تم ان کے جسم جلا دو گے تو جو کوئی

بھی ہے وہ اُن کی راکھ لے جائے گا اور انہیں نئے جسموں میں تبدیل کر دے گا اور پھر یہ دونوں اُس کی داسیاں ہوں گی۔ تم سے ان کا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ یہ ہے ان کی کہانی۔''

''ہیں...... مگر وہ کون ہے؟''

''کچھ نہیں معلوم...... کوئی نہیں جانتا۔''

''تو اب کیا کریں ہم؟''

''ہاں...... ہم کچھ کر سکتے ہیں۔''

''بتایئے دیوی جی...... بتایئے۔''

''تم ان دونوں کی زندگی ان کے شوہروں کے حوالے کر دو۔''

''شوہر......؟'' رائے گرودت حیرت سے بولا۔

''ہاں......''

''مگر دیوی......''

''سنتے رہو۔ کیا تمہارے پاس دو ایسے نوجوان مل سکتے ہیں جو ان لاشوں سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائیں؟''

''دیوی، آپ خود سوچئے...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور پھر لاشوں کے ساتھ کسی کے پھیرے بھی تو نہیں ہو سکتے۔''

''ضروری نہیں ہے کہ پھیرے ابھی ہوں۔ وہ جو کوئی بھی ہوں ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سچے من سے ان کو اپنی دھرم پتنی مان لیں۔ اور تم دونوں بھی سچے من سے اُن کو ان کا پتی مان لو اور یہ سوچو کہ اگر ان دونوں کا جیون واپس آ گیا تو کسی بھی وقت ان کے پھیرے کرا دو گے۔''

رائے گرودت نے پاگلوں کی طرح بیوی کی صورت دیکھی اور پھر بولا۔ ''مگر دیوی جی......''

''کوئی مشکل ہے رائے گرودت؟''

''دیوی، تو سب کچھ جانتی ہے۔ اس سنسار میں صرف انسان رہتے ہیں۔ میں کسی سے یہ بات کہوں گا تو لوگ مجھے پاگل کہیں گے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہوں...... ٹھیک ہے۔ یہ کام بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔'' کچھ دیر کے لئے روپا نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کے بعد اُس نے کہا۔ ''پہلا آدمی وہ ہے جس کا من چاندی کی طرح ہے اور من شیشے کی طرح صاف ہوگا۔ تو اُسے امر سنگھ کہہ سکتا ہے۔ وہ یہ کام کر کے امر ہو جائے گا۔ کسی امر سنگھ کو جانتے ہو رائے گرودت؟''

''ایک امر سنگھ تو ہمارے محل میں ہی ہے۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔''

''دوسرا نام...... دوسرا نام سنگیت ہے۔ ہاں، یہ حسن اور گیت مل کر تیرے دوست بنتے ہیں۔ میں تجھے اس کا پتہ بتاتی ہوں۔ اُسے یہاں بلا لے گرودت۔ باقی کام ٹھیک ہو جائے گا۔ پتہ ذہن میں رکھ لے۔ ان دونوں کو یہاں میرے پاس پہنچا دے۔'' روپا نے بالکل ہی لہجہ بدل لیا تھا اور اس وقت ایک عجیب

انداز سے بول رہی تھی۔ یہ سب کچھ وہ اس لئے کر رہی تھی کہ رائے گرودت پر اس کا اثر قائم ہو جائے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر کہا۔

''اُنہیں جلدی بلا لے...... جا، دیر نہ کر۔ اگر وقت گزر گیا تو کوئی کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔''

رائے گرودت کی عقل اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ یہ تو بڑی بات تھی۔ پورے شہر میں تماشہ بن جائے گا اس کا۔ لوگ کہیں گے کہ گرودت پاگل ہو گیا ہے۔ اپنی بیٹیوں کی لاشوں کی شادی کسی سے کرا رہا ہے۔ عقل نہیں مان رہی تھی۔ لیکن دل کہہ رہا تھا کہ یہ کرنا چاہئے۔ ادھر سرسوتی اُس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ ''جاؤ...... جو روپا دیوی کہہ رہی ہے وہ کر لو۔ جلدی کرو۔''

بہرحال، اُن دونوں کو اکٹھا کر لیا گیا۔ دونوں ہی کے چہرے غم واندوہ کا شکار تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اُنہیں کیوں بلایا گیا ہے؟ لیکن جب وہ روپا کے پاس پہنچے تو روپا نے بھاری لہجے میں کہا۔ ''سنو...... تم دونوں اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں کہو گے۔ پہلے میری بات سن لو۔ جب میں اپنی بات پوری کر لوں تو پھر بتانا کہ تم میری بات کے جواب میں کیا کہہ سکتے ہو۔ یہ بتاؤ، کیا تمہارے اندر ہمدردی اور انسانیت ہے؟''

''دیوی جی...... ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''دو لڑکیاں موت کا شکار ہو گئی ہیں۔ ایک کا نام یشودھا اور دوسری کا نام کلاوتی ہے۔ وہ زندگی کھو بیٹھی ہیں۔ اُن کا جیون واپس لانے کے لئے میں ایک کام کر رہی ہوں۔ تم اس میں میرا ساتھ دو گے۔''

دونوں کو ان دونوں کی موت کی خبر مل چکی تھی۔ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھے۔ کیا کہتے؟ لیکن روپا کے کہنے پر اُنہوں نے کہا۔ ''ہاں دیوی جی، آپ ہمیں بتایئے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''تو سنو انسانیت کے وفادارو...... تم دونوں ان لڑکیوں کی رُوحوں کے لئے اہم کام سرانجام دے سکتے ہو۔ کلاوتی کی زندگی کے لئے امر سنگھ، تمہیں بلی دینی ہو گی۔ اور یشودھا کے لئے سنگیت، تمہیں۔ اب جواب دو، کیا تم یہ بلی دو گے؟''

''ہاں دیوی...... آپ حکم دو۔''

''تو سنو...... یہ لاشیں اُٹھ نہیں سکتیں۔ یہ تمہارے ساتھ قدم ملا کر لگن منڈپ کے پھیرے نہیں کر سکتیں۔ مگر تمہیں ان کا ہاتھ پکڑ کر قسم کھانی ہو گی کہ تم ان کے لئے ہو اور یہ تمہاری دھرم پتنیاں۔''

دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بیوقوفوں کی طرح روپا کی شکل دیکھنے لگے۔ ''آؤ...... جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔''

اُس کے حکم پر امر سنگھ، کلاوتی کے پاس پہنچا اور روپا کے اشارے پر اُس نے کلاوتی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''بھگوان کی سوگند، اس کی مُردہ آتما کی سوگند، میں اس سے پریم کرتا ہوں، میں اسے سچے من سے اپنی استری مانتا ہوں اور اس کے بعد میں جیون بھر شادی نہیں کروں گا اور اسے اپنے من میں بسائے جیون بتا دوں گا۔'' یہ کہہ کر امر سنگھ، کلاوتی کا ہاتھ پکڑ کر زار و قطار رو پڑا۔ سرسوتی اور رائے گرودت کی بھی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ عجیب سی بات تھی، نجانے کیوں اُنہیں امر سنگھ سے بڑی محبت محسوس ہو رہی تھی۔

پھر روپا کی نگاہیں سنگیت کی طرف اُٹھیں اور سنگیت آگے بڑھا اور اُس نے یشودھا کے دونوں ہاتھ

تھامے اور بولا۔ ''تیری آتما کی قسم یشودھا، جب تک جیتا رہوں گا، تیرا رہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ لیکن روپا دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ اس کے بعد اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اس وقت سارے کمرے میں عجیب وغریب آوازیں گونج اُٹھیں جب کمرے میں موجود لوگوں نے دونوں لڑکیوں کی کراہوں کی آواز سنی تھی...... اُنہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ کمرے میں موجود ایک ایک شخص کی نگاہیں کلاوتی اور یشودھا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ادھر سنگیت اور امر سنگھ بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دونوں لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے عمل میں مخلص تھے، اور اُنہیں اس بات کا بالکل پتہ نہیں تھا کہ یہ پراسرار عورت انتہائی پراسرار کھیل، کھیل رہی ہے اور اس کا عمل پوری حویلی کو بیوقوف بنائے ہوئے ہے۔ اس وقت رائے گرودت اور سرسوتی دیوی شدت حیرت سے پاگل ہو گئے جب اُنہوں نے دونوں لڑکیوں کو اُٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ بات کسی کے کہنے کی نہیں تھی۔ رائے گرودت نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لیتے ہوئے جس قدر شاندار ڈاکٹر اُنہیں حاصل ہو سکتے تھے حاصل کئے تھے اور تمام ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ سامنے صرف دو لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ لیکن اب ان لاشوں میں زندگی دوڑ گئی تھی...... بہرحال باپ کے دل میں بیٹیوں کے لئے جو محبت ہو سکتی تھی وہ پھٹ پڑی۔ رائے گرودت نے اپنی بچیوں کو اپنے کلیجے میں بھر لیا اور زار و قطار روتا ہوا بولا۔

''بڑا ظلم کیا ہے میں نے تم پر...... بڑا انیائے کیا ہے میں نے تم پر بیٹی۔ مجھے معاف کر دینا...... مجھے معاف کر دینا۔ میں تو تجھے کھوئے ہی بیٹھا تھا، مگر جے دیوی...... بڑا احسان کیا ہے بھگوان نے ہم پر کہ اس جیسی دیوی کو ہمارے درمیان بھیج دیا۔ ارے میں کس زبان سے اس کا شکریہ ادا کروں؟ جے دیوی...... جے دیوی......'' گرودت ہی نہیں، سرسوتی بھی لڑکیوں کی زندگی پا کر خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ بالکل مختلف قسم کی عورت تھی۔ بلاشبہ سوتیلی ماں میں اس کا بے مثال کردار تھا، ورنہ کون کسی کے لئے اس طرح دیوانہ ہوتا ہے؟ لیکن سرسوتی کسی بھی طور رائے گرودت سے کم محبت نہیں کرتی تھی ان لڑکیوں سے۔

ادھر سنگیت اور امر سنگھ پاگلوں کی طرح کھڑے اپنا مستقبل دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو جو کچھ ہوا تھا وہ اُن کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا اور اُنہوں نے آنکھیں بند کر کے ان دونوں لاشوں کو اپنے جیون میں سویکار کر لیا تھا۔ یہ بہت بڑا ابکار تھا، ورنہ کون اس طرح بیوقوفی کے کام کرتا ہے؟ لیکن اب اپنی پریمی کاؤں کو زندہ دیکھ کر اُن کے دلوں میں جو خوشی کا احساس تھا وہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ لیکن بہت بڑے لوگوں کا معاملہ تھا اور یہ معمولی لوگ تھے۔ اب پتہ نہیں آگے چل کر کیا ہو؟ پھر رائے گرودت نے آگے بڑھ کر روپا کے پاؤں پکڑ لئے۔

''دیوی...... اس حویلی میں تم نے پہلا قدم رکھا تھا تو نجانے کیا ہمارا من شانت ہو گیا تھا اور ہم نے سوچا تھا کہ بھگوان نے ضرور ہمارے لئے کوئی اچھا راستہ منتخب کیا ہے جو ایسی مہان دیوی کو ہمارے درمیان بھیج دیا۔ اور نتیجہ نکل آیا نا...... دیوی، ہمیں چھوڑ کر مت جانا۔ تیرا احسان ہو گا ہم پر۔ اب ہمیں حکم دے کہ ہم کیا کریں؟''

''رائے گرودت جی، آپ نے دیکھ لیا کہ وہ کون ہوتے ہیں جو دوسروں پر احسان کرتے ہیں۔ ان

دونوں نے ان لاشوں کو قبول کیا تھا۔ آپ یقین کریں اگر یہ اقرار نہ کرتے تو یہ دونوں لڑکیاں کبھی زندہ نہ ہونے پاتیں۔ بات یہی تھی کہ ان کا جیون اب انہی کا، بلکہ ان کے پتی کا ہے۔ فوراً انتظام کریں اور ان دونوں کے پھیرے کرائیں۔''

''جیسا آپ حکم دیں گی دیوی، ویسا ہی کروں گا میں۔''

''تو جائیے، اپنی یہ خوشخبری حویلی سے باہر نکال دیجئے۔'' روپا نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئی۔ اس کے بعد رائے گرودت نے دل کے دروازے کھول دیئے۔ اتنی خیرات بانٹی، اتنا کچھ دیا لوگوں کو کہ لوگ خوشی سے دُعائیں دینے لگے۔ لگن منڈپ تیار کئے گئے اور آخر کار امر سنگھ اور سنگیت کے پھیرے اُن کی پریمی کاؤں سے کرا دیئے گئے۔ تنہائی میں روپا نے سوال کیا۔

''اشیش بھگونتا...... تجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں میں۔''

جواب میں ایک سایہ سا وہاں نمودار ہو گیا۔ شیطان کے کروڑوں روپ ہوتے ہیں۔ اور کس وقت کس روپ میں وہ کہاں ہوتا ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ شیطان نے کہا۔ ''کیا پوچھنا چاہتی ہو روپا؟''

''پہلی بات مجھے یہ بتاؤ اشیش بھگونتا کہ جو کچھ میں نے کیا ہے تمہاری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے؟''

''بالکل...... ایک طرف ہیرالعل نے ایسا ہی کام کیا ہے جیسا تو نے کیا، دوسری طرف یہاں تو نے رائے گرودت کی نسلوں کو برباد کر دیا۔ بڑا نسلوں والا سمجھتا تھا خود کو۔ کہتا تھا کہ اس کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ اب دیکھ لو، دونوکر اُس کے داماد بن گئے ہیں۔ اصل میں تم نہیں سمجھتی، ہمارے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہم صرف انسانیت کی تذلیل چاہتے ہیں، ہماری خواہش ہوتی ہے کہ جو ہمارا پیروکار ہو وہ آسمان کی بلندیاں طے کرتا چلا جائے اور جو ہم سے منحرف ہو، ہمارا دشمن ہو۔ اُسے دنیا کی نگاہوں میں اتنا ذلیل ہونا چاہئے کہ وہ ذلت سے خودکشی کر لے۔ ابھی تو تمہیں اس گھرانے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔''

روپا پھر ہنس پڑی۔ پھر اُس نے کہا۔ ''لیکن بھگونتا...... اس نے بہتوں کو دولت بانٹی ہے۔ ان لوگوں کے تو عیش ہو گئے۔''

''یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ بڑے کام کے لئے چھوٹے کام برداشت کرنا ہی پڑتے ہیں۔'' اشیش بھگونتا نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ مطمئن ہیں؟''

''ہاں...... میرے چیلوں کی تعداد تو گنی ہی نہیں جاسکتی۔ لیکن تم دیکھ لو، میں ایک ایک پر نظر رکھتا ہوں۔ اپنے کام خوش اسلوبی سے جاری رکھو۔ اب تم میں سے کسی کو بھی یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم کیا کرو گی۔''

''بھگونتا، اگر برا نہ مانو تو مجھے رجنی کے بارے میں بتاؤ۔ آخر وہ میری بہن ہے۔''

''کھیل رہی ہے۔ ہم نے اُسے بھی کھلونے دے رکھے ہیں۔ کھیلتی رہے۔ ایک دن ایسی پھنسے گی موقع پر آن کر کہ تم دیکھنا کہ جس طرح چوہے کی گردن چوہے دان میں پھنس جاتی ہے اسی طرح وہ بھی چوہے دان میں پھنسی تڑپ رہی ہوگی۔ یہ اُس کا مقدر ہے، یہ اُس کا مستقبل ہے۔ اور میں جو کچھ کہتا ہوں وہ

کر دکھاتا ہوں۔'' شیطان نے کہا اور روپا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

روپا کچھ عجیب سے انداز میں رجنی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ پھر اُس نے سوچا، بھاڑ میں جائے۔ جب ہم سے الگ ہی ہو گئی تو پھر کیسی بہن؟ کہاں کی بہن؟ اشیش بھگونتا خوش تھا، سارے کام ٹھیک ٹھاک ہو رہے تھے، پھر ان تمام فضول باتوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ زندگی کے سارے عیش چرنوں میں تھے۔ اب یہاں رائے گرودت کی حویلی میں وہ ایک اوتار کی حیثیت اختیار کر گئی تھی، ایک طرح سے اُس کی پوجا ہو رہی تھی۔ گرودت رائے اور سرسوتی دیوی تو تھے ہی، لیکن پوری حویلی میں ایک ایک فرد روپا سے متاثر تھا اور اس کے لئے دل میں بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ جہاں تک سنگیت اور امر سنگھ کا تعلق تھا تو ان کے لئے روپا بھگوان کا درجہ رکھتی تھی۔ انہیں ان کی من پسند لڑکیاں مل گئی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہی رائے گرودت کی حویلی میں اُنہیں اعلیٰ ترین مقام حاصل ہو گیا تھا۔ شیطان خوش تھا اس بات پر کہ رائے گرودت کو دلی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ جو سر اُٹھا کر جیتا تھا اب اُس کی گردن جھک گئی تھی۔ بہر حال شیطان کے دل میں رائے گرودت کے لئے کیا بات تھی؟ یہ شیطان ہی جانتا تھا۔ روپا کو داد دینے کے بعد وہ چلا گیا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے کہ جس سے گرودت کی حویلی میں کچھ اور ہنگامہ ہو۔ لیکن ہنگامہ خود بخود ہی شروع ہو گیا۔

ہیرالعل ایک دن اچانک ہی آ گیا تھا۔ رائے گرودت بہت اچھے اور نیک فطرت انسان تھے۔ ہیرا لعل ان سے بالکل مختلف کیفیت کا مالک تھا اور اُس کا جو مزاج بن چکا تھا وہ تو بہت ہی خطرناک تھا۔ حویلی میں پہنچنے کے بعد اُس نے اپنے ایک خاص آدمی کو طلب کیا اور اُس سے کہا۔

''ہاں، شمبو، بتاؤ حویلی کے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟''

''جے ہو مہاراج کی...... ٹھیک ہے، بس کچھ تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا بات ہو گئی تھی۔''

''اب آیا ہوں تو بتاؤ۔ ان لوگوں کے بارے میں تو اچھی طرح جانتا ہوں کہ سارے کے سارے مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور کوئی بھی میرا اپنا نہیں ہے اس حویلی میں۔''

''ٹھیک کہتے ہیں مہاراج۔ کسی کو آپ کی چنتا نہیں ہے۔ کوئی سوچتا، پوچھتا نہیں ہے کسی سے کہ ہیرا لعل کہاں چلے گئے ہیں۔''

''ایک ایک کو جانتا ہوں اچھی طرح۔ مگر میں بھی اپنی ہٹ کا پکا ہوں۔ کبھی ان لوگوں سے تعاون نہیں کروں گا۔ تم کوئی خاص بات بتا رہے تھے۔''

''ہاں مہاراج، بہت بڑا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ آپ کی دونوں بہنیں مر گئی تھیں۔''

''کیا......؟'' ہیرالعل حیرت سے بولا۔

''جی مہاراج...... تمہاری بہنیں یشودھا اور کلاوتی دونوں ہی حادثے کا شکار ہو کر مر گئی تھیں مہاراج۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے تو؟ میری دونوں بہنیں؟''

''جی مہاراج، پر اب وہ ٹھیک ہیں۔''

"شمبو.....کون سا نشہ کرتا ہے تو؟"

"ارے کہاں مہاراج.....اب کہاں کرتے ہیں؟ کبھی کرتے تھے نشہ جوانی میں۔"

"اُلو کے پٹھے، میں پوچھ رہا ہوں کہ میری دونوں بہنوں کا کیا حال ہے اور تم اپنے نشے کی بات بتا رہا ہے؟ ابھی جوتے اُتار کر سر پر دس لگاؤں گا تو بچپن تک کا سارا نشہ اُتر جائے گا۔"

"آپ نے کہہ دیا، ہم نے مان لیا سرکار.....کیسا نشہ؟ کہاں کا نشہ؟"

"تو کہہ رہا ہے کہ میری دونوں بہنیں مر گئی تھیں؟"

"ہاں....."

"تو اب کہہ رہا ہے کہ دونوں زندہ ہیں۔"

"جی مہاراج۔"

"کون سی بات مانوں تیری؟"

"دونوں باتیں مان لیں مہاراج....."

"دیکھ شمبو، مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ مجھے تفصیل سے بتا۔"

"آپ بتانے کا موقع تو دیں مہاراج، تبھی تفصیل بتاؤں گا۔ آپ تو برا بھلا کہے جا رہے ہیں مجھے۔"

"کیا ہوا تھا.....کیا ہوا تھا؟ جلدی بول۔"

"اُن کا دیہانت ہو گیا تھا مہاراج، اور یہاں ایک دیوی آئی ہوئی ہیں مہاراج، ایسی دیوی ہیں کہ آپ دیکھو تو من مچل جائے۔ اور بڑی مہان ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ سارے ڈاکٹر حکیم آ گئے تھے، سب نے کہہ دیا تھا کہ یشودھا اور کلاوتی مر چکی ہیں۔ کریا کرم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لیکن دیوی جی آئیں اور اُنہوں نے کہا کہ ابھی رُک جائیں، کریا کرم نہ کریں۔ وہ کچھ کرنا چاہتی ہیں۔ پھر وہ اُنہیں کمرے میں لے گئیں۔ اور مہاراج، اُنہوں نے جو کچھ کیا وہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"کیا، کیا اُنہوں نے؟"

"مہاراج، آپ امر سنگھ اور سنگیت کو تو جانتے ہیں۔"

"امر سنگھ اور سنگیت؟"

"ہاں مہاراج.....وہی اپنے گھر کے نوکر۔"

"ہاں، جانتا ہوں۔ پھر؟"

"دونوں کی شادیاں اُن دونوں لڑکوں سے کر دی گئیں، یعنی آپ کی بہنوں یشودھا اور کلاوتی سے۔"

ہیرا لعل نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ دیر تک وہ سر پکڑے بیٹھا رہا، پھر اُس نے اپنے لباس سے خنجر نکالا اور شمبو کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تو نے ضرور نشہ کیا ہے شمبو..... میں تمہارا پیٹ پھاڑ دوں گا۔"

"مہاراج، سچ کہہ رہا ہوں..... آپ بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں۔" یہ کہہ کر شمبو نے وہ پوری داستان ہیرا لعل کو سنا دی جو یشودھا اور کلاوتی سے تعلق رکھتی تھی۔

"اس طرح ان دونوں نے اُن کی لاشوں کو سویکار کر لیا تھا۔ اور دیوی نے یہی کہا تھا۔ تب وہ دونوں

ٹھیک ہو گئیں۔"

اچانک ہی ہیرا لعل کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ خود بھی تو کچھ کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں پوجا کا پورا واقعہ اُس کے ذہن میں تھا کہ یہ اُسے بدلہ ملا ہے۔ لیکن وہ دوسروں کی بات تھی۔ اپنے گھر کا معاملہ ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ سنگیت اور امر سنگھ تو معمولی قسم کے ملازم تھے۔ یہ لوگ اس طرح کیسے اس گھر کے داماد بن گئے ہیں؟ وہ سوچتا رہا، پھر اُس نے کہا۔

"یہ دیوی کون ہے.....؟"

"روپا ہے اُن کا نام۔ بڑے مہاراج کے ساتھ کہیں سے آئی تھیں۔ کئی ایسے چمتکار دکھائے انہوں نے کہ بڑے مہاراج ان کے پجاری بن گئے۔ اور اب تو حویلی کا ہر شخص ان کی پوجا کرتا ہے۔"

"میں ذرا صحیح طریقے سے اُس کی آرتی اتاروں گا۔ مجھے تو لگتا ہے شمبو کہ یہ ساری کی ساری سازش ہے۔ ہو سکتا ہے سنگیت اور امر سنگھ نے یہ چکر چلایا ہو حویلی کا داماد بننے کے لئے۔ اور اب اِن کی کٹی ہوئی گردنیں ہی اس حویلی میں رہ سکتی ہیں۔ مگر نہیں..... پہلے ان دیوی جی کو تو دیکھ لوں۔ دیوی جی ہیں کہاں؟"

"مہاراج، اُن کو یہاں الگ جگہ دی گئی ہے رہنے کے لئے۔"

"مگر نہیں..... دیوی تو دیوی ہیں، ذرا پتا جی سے ملاقات کر لوں۔" ہیرا لعل نے کہا اور پھر وہ غصے میں ڈوبا ہوا اُس کمرے کی جانب بڑھا جہاں اس وقت بھی سرسوتی اور رائے گرودت موجود تھے۔ ہیرا لعل بغیر دستک دیئے اندر داخل ہو گیا۔ دونوں چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔ پھر گرودت کے چہرے پر غصے کے آثار اُبھر آئے۔

"میں تجھے جاہل بھی کہہ چکا ہوں، کمینہ اور ذلیل بھی کہہ چکا ہوں، گندا انسان بھی کہہ چکا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اب کون سے شبد تیرے لئے استعمال کروں؟ حرامزادے، دوسروں کے کمروں میں اس طرح گھس آتے ہیں؟"

ہیرا لعل نے مذاق اُڑانے والی نگاہوں سے باپ کو دیکھا اور بولا۔ "حرام زادے اسی طرح اندر آ جاتے ہیں پتا جی..... پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اصل حرام زادے کون ہیں؟"

"کیا مطلب.....کون ہیں اصل حرام زادے؟"

"نہیں پتا جی..... میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔" ہیرا لعل نے شدید گستاخی کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ "اس حویلی میں مسلسل من مانی ہو رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ میری دونوں بہنوں کی شادی دو گھٹیا ملازموں سے کیوں کی گئی؟"

"میرا خیال ہے کہ میں تجھے جواب دینے کے لئے مجبور نہیں ہوں۔ لیکن پھر بھی بتائے دے رہا ہوں، تیری دونوں بہنیں مر چکی ہیں۔ اب یشودھا اور کلاوتی ایسی آتمائیں ہیں جن میں کسی کے پریم نے دوبارہ جیون جگایا ہے۔ ایک ایسی مہان دیوی ہمیں مل گئی ہے جس نے ہماری مشکلوں کو سنبھال لیا ہے۔"

"وہ دیوی تو پتا جی، آپ کو پہلے ہی مل چکی تھی، آپ کی نئی دھرم پتنی کی شکل میں۔"

”دیکھ ہیرالعل، ایک بات میں تجھ سے کہے دیتا ہوں، تو اس بات کو غور سے سن لے۔ بہت عرصہ پہلے ایک نجومی نے تیرے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ تیری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔ اُس وقت میں نے اُس نجومی کا مذاق اُڑایا تھا اور کہا تھا کہ کون پتا اپنے بیٹے کو مار سکتا ہے؟ لیکن اب جو کچھ تو بن چکا ہے اس کے بعد مجھے نجانے کیوں بار بار اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ شاید اُس نجومی نے سچ ہی کہا تھا۔“

”پتا جی، پتا جی، پتا جی...... آپ کو اُس نجومی کی بات کو سچ سمجھنا چاہئے تھا۔ اور اس وقت سے پہلے ہی کام کر لینا چاہئے تھا، بہت عرصہ پہلے اُس وقت جب میں چھوٹا سا تھا۔ اب اگر آپ اس نجومی سے ملیں گے تو وہ آپ سے یہی شکایت کرے گا کہ ستارے کہتے ہیں کہ بازی اُلٹ گئی ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ بات بھی اُلٹ گئی ہو۔ چنانچہ آپ اب ایسا کوئی کھیل نہ کھیلیں جو آپ کو نقصان دے اور میری سوتیلی ماتا جی آپ کا سہاگ اُجاڑ دیں۔ ان دیوی کو نہ تو میں دیکھتا ہوں، میرا تو دعویٰ ہے پتا جی۔ مگر چھوڑیئے، آپ سے کیا کہنا؟ پہلے آپ کی آنکھوں کی چربی اُتر جائے، اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل آیا۔

اندر رائے گرودت سکتے کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیٹا جو کچھ کہہ گیا تھا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اُن کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ لیکن سرسوتی دیوی اُنہیں ڈھارس دینے لگیں۔ ”آپ اُس کے منہ نہ لگا کریں مہاراج...... ہزار بار ثابت ہو گیا ہے کہ وہ بہت گستاخ ہے۔ آپ اپنا دل بلاوجہ ہی خراب کرتے ہیں۔ نقصان پہنچ جائے گا آپ کو، آپ بیمار پڑ جائیں گے۔ مت کیا کریں اُس سے ایسی باتیں۔ وہ کبھی آپ کا مان نہیں رکھتا، اپمان کرتا رہتا ہے۔ بھگوان اُسے عقل دے۔“ رائے گرودت نے کچھ نہیں کہا، خاموشی سے بیٹھے دیوار کو گھورتے رہے۔

اُدھر ہیرالعل باہر آیا اور ملازموں سے پوچھنے لگا۔ ”وہ دیوی جی کہاں رہتی ہیں جنہوں نے یشودھا اور کلاوتی کو نیا جیون دیا ہے؟“

”وہ سامنے کے حصے میں مہاراج...... وہ اُن کا کمرہ ہے۔“ ملازموں نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور ہیرالعل تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اُس شیطان کی شاگرد کی طرف چل پڑا جس کے لئے وہ ایک ہوا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہاں بھی اُس نے اپنی فطری کمینگی سے کام لیا تھا اور دروازے پر دستک دیئے بغیر دروازے کو دبایا تو دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت روپا باریک سے لباس میں ملبوس مسہری پر دراز تھی۔ دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا تو اُس نے گردن گھما کر اُدھر دیکھا۔ اُسے اس بات کی پرواہ تو تھی نہیں کہ اُس کے بدن کی قیامت سامانیاں کسی کے ہوش و حواس چھین لینے کے لئے کافی ہیں۔ بس ایسے ہی نگاہیں اُٹھا دی تھیں اُس نے۔ لیکن اپنے سامنے جس لمبے چوڑے قوی ہیکل مرد کو پایا اُسے دیکھ کر روپا کی آنکھوں میں پسندیدگی کے جذبات اُبھر آئے۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں تھی کہ ہیرالعل قدم بڑھا کے آگے بڑھا اور اُس کے پاس پہنچ گیا۔

”ہیرالعل ہے میرا نام...... اور اس سنسار میں ایسا کوئی نہیں ہے جس سے میں اجازت لے کر آگے قدم رکھوں۔ بڑی بڑی حویلیوں میں گھس جاتا ہوں اور بڑے بڑے لوگوں کے سامنے سینہ تانے پہنچ جاتا

ں۔ مجھے روکنے والے اپنے سینے پر گھاؤ کھاتے ہیں اور یہ افسوس کرتے ہیں کہ کاش وہ مجھے روکنے کی وشش نہ کرتے۔“

روپا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے بڑی حسین اور دلآویز آواز میں کہا۔ ”ہم نے آپ کو وکنے کی کوشش تو نہیں کی مہاراج، پر گھاؤ کھا لیا ہے اپنے سینے پر۔ آپ کو یقین نہ آئے تو دیکھ لیجئے۔“ روپا نے اپنا لباس سینے پر سے ہٹا لیا...... اور ہیرالعل کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا...... ویسے ہی حسن و جمال بے ثال تھا۔ لیکن یہ حسین ادا دل پر صحیح معنوں میں چرکا لگا گئی اور ایک لمحے کے لئے اُسے احساس ہوا کہ ندگی میں ایک نیا اور انوکھا پن آیا ہے۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، پھر بولا۔ ”مگر ہم نے تو کوئی ھاؤ نہیں لگایا آپ کے سینے پر۔“

”کچھ گھاؤ ہاتھوں سے نہیں لگائے جاتے بلکہ خود بخود لگ جاتے ہیں۔ پریم کا گھاؤ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”کون ہیں آپ؟“

”روپا ہے ہمارا نام۔ آپ تو اپنا نام بتا ہی چکے ہیں۔“

”آپ ہی وہ دیوی ہیں جنہوں نے یشودھا اور کلاوتی کا جیون بچایا ہے؟“

”نہیں...... اُن کا جیون اشیش بھگونت نے بچایا ہے۔ ہم تو ایک ذریعہ بنے ہیں۔ بس نظر آ گیا تھا ہیں کہ لڑکیاں بالکل مری نہیں ہیں، گنجائش ہے اس بات کی کہ ان کی آتمائیں کسی کو دے دی جائیں، بھی واپنے شریر میں داخل ہو سکتی ہیں۔ اتنا سا کام ہمیں آتا تھا سو کر لیا۔ آپ آیئے نا، بیٹھئے۔ اگر آپ کہیں کہ م آپ کو نہیں جانتے تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ آپ اس حویلی کے مالک ہیں اور ہم آپ کو بتا دیں، ہم کوئی یوی نہیں ہیں، بس اشیش بھگونتا کی داس ہیں اور اشیش بھگونتا ہمارے کانوں میں وہ سب کچھ بتاتا رہتا ہے جو وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اُس نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کو حویلی کے سارے لوگ برا کہتے ہیں۔ آپ بگڑے ہوئے آدمی ہیں۔ پر آپ یقین کر لیں، حویلی آپ ہی کی ہے، سب کچھ آپ ہی کا ہے۔ کوئی آپ کے کتنے ہی راستے روکے آخر کار ایک دن دنیا آپ کو اس حویلی کا مالک تسلیم کر لے گی۔“

باتیں کچھ ایسی تھیں کہ ہیرالعل بالکل پگھل کر موم ہو گیا۔ کچھ لمحے کھڑا رہا، پھر آگے بڑھ کر کرسیٹ گھسیٹ کر بولا۔ ”اور ہم آپ سے یہ کہیں کہ جیون میں پہلی بار ہمارا من چاہتا ہے کہ ہم کسی سے معافی انگیں، اگر ہم کسی سے کچھ مانگیں تو کیا اس بات کی اُمید رکھیں کہ ہمیں وہ مل جائے گا؟“

”بات اگر معافی کی ہے اور مجھ سے مانگی جا رہی ہے تو پھر میں اپنا عمل کروں گی۔ آپ کا جو من چاہے کریں۔“

”کیا سزا دیں گی ہمیں ہماری اس گستاخی کی جو ہم نے آپ کے ساتھ کی ہے؟“

”اُٹھ کر آپ کے چرن چھو لوں گی اور آپ سے کہوں گی کہ من پر جو گھاؤ لگایا ہے مرہم بھی آپ ہی رکھ دیں۔“ روپا نے کچھ اس طرح ہیرالعل کو بیوقوف بنایا کہ وہ روپا کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اور پھر دونوں کے درمیان فاصلے کم ہونے لگے جو اجنبت کے فاصلے ہوتے ہیں...... حالانکہ یہ فاصلے نہ جانے کتنی

جدوجہد کے بعد کم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ان لوگوں کی بات ہے جو اندر سے مخلص ہوں۔ ہیرا لعل تو شاید روپا کے جال میں گرفتار ہو چکا تھا لیکن روپا شیطان کی شاگرد تھی اور شیطان زادی کے لئے یہ کھیل نہ تو اجنبی تھا نہ مشکل۔ وہ یہ کھیل منوہر کے ساتھ بھی کھیل چکی تھی۔ اور اب منوہر کا اس سنسار میں کوئی وجود نہیں تھا۔ ہیرا لعل نے بھاری لہجے میں کہا۔

''تم نے تو ہمیں دیوانہ بنا دیا ہے روپا۔ بھگوان کی سوگند، اس سے پہلے ہم نے کبھی کسی کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ اور اپنے آپ کو کبھی کسی کے اتنا قریب نہیں محسوس کیا تھا۔ ہم بہت برے بن چکے ہیں۔ لیکن ہمیں برا ہماری ماتا اور پتا جی نے بنا دیا ہے۔ ہماری یہ ماتا جی جو ہماری سوتیلی ہیں اور نہ جانے کیسے کیسے جال پھیلا کر پتا جی کو اپنے چکر میں پھنسا چکی ہیں، ہم اُن سے نفرت کرتے ہیں۔ پر اس کے بعد روپا جی، ہم نے سنسار میں کبھی کسی سے پریم نہیں کیا۔ مگر آج...... آج آپ نے ہمارے من میں جو پریم جوت جگا دی ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ہم کیا کریں......؟''

''آپ بہت اچھے انسان ہیں ہیرا لعل جی۔ جو لوگ آپ کو برا کہتے ہیں اصل میں وہ خود برے لوگ ہیں۔ وہ کسی کو نفرت کی نگاہ سے تو دیکھتے ہیں، اپنی حرکتوں پر غور نہیں کرتے۔ نفرت کا یہ ماحول انہوں نے خود پیدا کیا ہے۔''

''حقیقت یہی ہے۔ ایسی ہی بات ہے روپا۔ ورنہ ہم کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔'' ہیرا لعل نے کہا۔

روپا بڑی خوبصورتی کے ساتھ مکڑی کی طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور ہیرا لعل کو اپنے جال میں پھانستی جا رہی تھی۔ ہیرا لعل اُس کے سامنے موم کی طرح پگھل رہا تھا۔ روپا نے مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور بولی۔

''بڑا نام سنا تھا آپ کا ہیرا لعل جی۔ آج دیکھ بھی لیا۔''

''نام کیا سنا ہوگا دیوی...... برائیاں ہی کی ہوں گی اس حویلی کے رہنے والوں نے۔'' روپا کے چہرے پر ایک اُداسی کی لکیر پھیل گئی۔ ہیرا لعل غور سے دیکھ رہا تھا، یہ لڑکی اُسے زمین کی مخلوق تو معلوم ہو ہی نہیں رہی تھی۔ بلاشبہ یہ کوئی دیوی ہی تھی۔ ہیرا لعل نے دو قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ''آپ خاموش کیوں ہو گئیں دیوی جی؟''

''آپ نے بات ہی ایسی کی ہے ہیرا لعل جی۔ مجھے بتایئے، اس حویلی کے رہنے والے آپ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟''

ہیرا لعل بھی دُکھی ہو گیا۔ مدھم لہجے میں بولا۔ ''دیوی، بس تقدیر کی بات ہے...... کچھ لوگوں کی تقدیر میں نفرتیں ہی لکھی ہوتی ہیں۔ اور وہ اگر کسی کا پریم پانا بھی چاہیں تو انہیں پریم نہیں ملتا، نفرت ملتی ہے اور وہ اس نفرت کو محبت میں نہیں بدل سکتے۔''

روپا نے اپنی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا کر لی۔ کہنے لگی۔ ''ہیرا لعل...... میں اس سنسار میں تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کر سکتی ہوں جو کسی بھی طور ممکن نہ ہو۔ میں تمہارے لئے آکاش پر جا کر وہ

لے کر آ سکتی ہوں جو کوئی تمہیں نہ دے سکے۔ تمہارے من میں یہ خیال تو ہوگا کہ میں یہ سب کچھ کر سکتی ہوں یا نہیں؟ اور اگر کر سکتی ہوں تو تمہارے لئے یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہوں؟ اور میرا من بھی کسی کو چاہ سکتا ہے۔ تم اتنے دلکش ہو، اتنے پیارے ہو کہ سنسار تمہیں کسی بھی طرح ٹھکراتا رہے میں تم سے پریم ہی کرتی رہوں گی۔ تم رات کو میرے پاس آنا، میں تمہارے لئے شانتی تلاش کرنے جا رہی ہوں۔'' روپا نے کہا۔ اور اُس نے شعبدہ گری شروع کر دی۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا لئے۔ ہیرا لعل اُسے تعجب سے دیکھنے لگا۔ روپا کا یہ عمل اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن جب اُس نے روپا کا بدن چھوٹا ہوتے محسوس کیا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں...... روپا جھکی جھکی چھوٹی ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ ایک ننھی سی چڑیا کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ ایک انتہائی حسین چڑیا۔ اور پھر وہ چڑیا اپنی جگہ سے اُڑی، پہلے ایک کارنس پر بیٹھی، اس کے بعد ایک روشندان سے فضا میں پرواز کر گئی۔ ہیرا لعل حیرت سے بے ہوش ہوا جا رہا تھا۔ اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں کارنس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ روپا نے یہ عمل کیا ہی اس لئے تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر ہیرا لعل پر اتنا گہرا اثر ڈال دے کہ ہیرا لعل کچھ اور سوچ ہی نہ سکے۔ روپا اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اُسے کہاں جانا تھا؟ روشن دان سے نکل کر وہ ایک درخت پر جا بیٹھی تھی۔ لیکن ہیرا لعل پر جو اثرات وہ چھوڑ گئی تھی وہ ناقابل فراموش تھے۔ ہیرا لعل بالکل پتھرا کر رہ گیا تھا اور نہ جانے کب تک وہ اُسی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے آنکھیں میچ کر گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

''رام...... رام...... رام...... ہر انسان اپنے آپ کو سنسار کا سب سے طاقتور آدمی سمجھتا ہے۔ لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں ہے، کوئی اس سے بڑا طاقتور اس کے سامنے آتا ہے اور اسے حیرت میں ڈال کر چلا جاتا ہے۔ یہ دیوی تو سچ مچ مہان دیوی تھی۔ بڑی گیان والی...... اگر ایسی عورت سے کسی کی دوستی ہو جائے تو وہ سنسار کا سب سے بڑا آدمی بن جائے۔''

روپا اپنی تدبیر میں کامیاب ہو گئی تھی اور اُس نے ہیرا لعل کو پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ ہیرا لعل نے دل ہی دل میں یہ بھی طے کر لیا کہ امر سنگھ اور سنگیت کو اپنی بہنوں کا شوہر تسلیم کر لے گا۔ جب دیوی نے یہ کام کیا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا اور وہ دنیا کا ہر کام کر سکتی ہے۔ ہیرا لعل یہ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ بمشکل تمام وہ وہاں سے نکل کر آیا۔ روپا نے اُسے رات کو بلایا تھا۔ ہیرا لعل کے دل میں گدگدیاں سی ہو رہی تھیں۔

اُدھر روپا طے کر چکی تھی کہ سنسار کے سارے مزے چکھے گی۔ آخر اس سنسار میں آئی کس لئے ہے؟ اگر رسک لعل زندہ ہوتا تو ان لڑکیوں کے لئے بر تلاش کرتا، اُن کی شادیاں کرتا۔ اس وقت بھی انہیں زندگی کے ہر نازک دور میں سے گزرنا پڑتا اور نجانے کس کس کی غلامی کرنا پڑتی...... اشیش بھگونت نے اُسے آزادی دی تھی اور اب اس آزادی سے فائدہ نہ اُٹھانا حماقت تھی۔ وہ زندگی کے بہت سے رموز سے آشنا ہو چکی تھی اور اب اُس کے دل میں کچھ نئے چراغ جل اُٹھے تھے۔ بہرحال ہیرا لعل کے جانے کے بعد وہ اسی روشندان سے واپس آ گئی اور آرام سے بستر پر لیٹ گئی۔

رات کو جب حویلی میں مکمل خاموشی طاری ہوگئی تو ہیرالعل نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ روپا اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کی آواز پر ہیرالعل اندر داخل ہوگیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر روپا کے چرنوں میں جھک گیا۔ روپا نے اس وقت زبردست بناؤ سنگھار کیا تھا۔ بال بال موتی پروئے تھے اُس نے اور سچ مچ آسمان سے اُتری اپسرا لگ رہی تھی...... ہیرالعل اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اُس نے کہا۔ ''دیوی، میں پہلے سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ بات یہ ہے کہ میں ایک انسان ہوں۔ میں نے اس سنسار میں بہت کچھ نہیں دیکھا ہے۔ مجھے ایسے راستوں پر ڈال دیا گیا ہے جو بڑے کٹھن ہیں۔ لیکن میرے سینے میں دل ہے۔ آپ اگر میرے اندر کوئی گستاخی پائیں تو میں پہلے سے اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ بس مجھے ڈانٹ دیں، سمجھا دیں۔''

''ہیرالعل، میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ نہ میں اپسرا ہوں نہ کوئی دیوی ہوں۔ بس انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل ہے اور اس دل میں سیڑھیاں بھی ہیں۔ کوئی من موہنی صورت ان سیڑھیوں کو طے کر کے نیچے اُتر سکتی ہے۔ اور تم بھی اتنے ہی سندر ہو۔''

ہیرالعل کے چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے۔ ''تب تو دیوی، اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں آپ سے پریم کرنے لگا ہوں تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گی؟''

''پریم اس سنسار کا ایک حصہ ہے اور کوئی بھی اس سے خالی نہیں ہے۔''

''مگر اب کیا آپ میرا پریم سویکار کر لیں گی؟''

''میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ تم سندر ہو۔ اور سندرتا کسے پسند نہیں ہوتی؟''

ہیرالعل اس وقت سنبھلا جب وہ زندگی کے اُس نازک مرحلے سے گزر چکا تھا جو ذہنوں میں نجانے کہاں کی برائیاں لا کر ڈال دیتا ہے۔ ایک دیوی جو اُس کی آنکھوں کے سامنے چڑیا کا رُوپ دھار کر پرواز کر گئی تھی، اُس کی آغوش کی زینت بن چکی تھی...... روپا بھی بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اُس نے کہا۔ ''ہاں ہیرالعل...... تو تم نے تو اپنی تقدیر کا فیصلہ سن ہی لیا ہوگا۔''

''کہاں روپا جی...... میں نے تو اپنے من کے فیصلے پر عمل کیا ہے۔ تقدیر کا فیصلہ تو اب آپ مجھے بتائیں گی۔''

''تم وہ کر نہیں پاؤ گے ہیرالعل جو تمہاری تقدیر میں روشنی بکھیر دے گا۔''

''دیوی، آپ سمجھ لیجئے کہ آپ کے کہنے پر میں یہ خنجر نکال کر اپنی گردن کاٹ کر آپ کے چرنوں میں رکھ سکتا ہوں۔ کہہ کر دیکھئے ایک دفعہ۔''

''ارے نہیں نہیں...... پھر تمہارے دشمنوں کی گردنیں کون کاٹے گا؟''

''یہ آپ جانتی ہیں۔''

''مگر تمہیں بہت مشکل مرحلے سے گزرنا ہوگا۔''

''وہ کیا......؟''

''رائے گرودت تمہارے باپ ہیں۔''

''ہاں ہیں دیوی جی۔''

''اُنہیں ہلاک کرنا تمہارے لئے آسان کام تو نہیں ہوگا۔'' روپا نے کہا اور ہیرالعل ایک دم سکتے میں رہ گیا۔ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں، لیکن بہرحال رائے گرودت اُس کا باپ تھا۔ اُس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''دیوی، آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں، صاف صاف کہیں۔''

''تو پھر سنو...... تمہیں رائے گرودت کو ہلاک کرنا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟''

''ہلاکت کا مطلب نہیں سمجھتے؟ رائے گرودت کو مارنا ہوگا، اُس کی پتنی کو مارنا ہوگا۔ اور اس کے بعد تمہارا اس حویلی پر مکمل قبضہ ہوگا۔ یہ بات میں نے تم سے پہلے ہی وقت میں کہہ دی تھی۔''

''مگر پتا جی......''

''بس ٹھیک ہے۔ دیکھو، میں تمہاری کالی تقدیر کا جو اُوپائے تلاش کرنے گئی تھی اس میں اشیش بھگونت نے میری مدد کی اور اُنہوں نے مجھے بتایا کہ رائے گرودت اپنے بیٹے کے راستے کے سب سے بڑے کانٹے ہیں۔ جب تک کہ ہیرالعل یہ کانٹا اپنے راستے سے نہیں ہٹائے گا اس کا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر مجھے ایک پوری تفصیل بتائی گئی تھی اور کہا گیا کہ ہیرالعل سے کہو کہ وہ یہ کام کر ڈالے۔ اب تم خود سوچو، رائے گرودت سے میری کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''

''ہاں دیوی، یہ تو ہے...... اور ویسے بھی میں آپ کو بتاؤں کہ پتا جی نے دوسری شادی کرنے کے بعد ہم بہن بھائیوں کو بالکل کتے کی حیثیت دی ہے۔ وہ صرف اپنی دھرم پتنی کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔''

''یہی بات ہے...... اور وہ دھرم پتنی تمہیں پاتال میں پہنچا دے گی ہیرالعل۔ وہ تمہیں زندہ نہیں رہنے دے گی۔ ابھی تو اُس نے اپنی سازشوں کا آغاز کیا ہے۔ ابھی وہ اور کچھ نہیں کر سکتی۔ جانتے ہو اُس کا منصوبہ کیا ہے؟''

''کیا ہے دیوی......؟''

''یہ کہ تم ڈاکو بن کر ڈاکے ڈالتے رہو۔ اتنی برائی پیدا ہو جائے تمہارے دل میں حویلی کے لئے کہ تم خود حویلی کو اپنے ہاتھوں سے جلا ڈالو اور آخر کار قانون کے شکنجے میں پھنس کر زندگی کھو بیٹھو۔ اس کے بعد بھلا اس کے راستے کی رُکاوٹ اور کون ہو سکتا ہے؟''

ہیرالعل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے دیوی...... میں یہ کام کروں گا۔ میں اُن دونوں کو موت کی نیند سلا دوں گا۔ اس میں میری تقدیر کی روشنی ہے۔''

''جے اشیش بھگونتا......'' روپا نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

''یہ اشیش بھگونتا......''

''نہیں، احترام سے نام لو اُن کا۔ ہاتھ اُٹھاؤ۔''

ہیرالعل نے اُس کے کہنے پر ہاتھ اُٹھا دیئے۔ لیکن اسی وقت شیطان نے روپا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ کیا کر رہی ہے پاگل کی بچی...... یہ کیا کر رہی ہے؟ اسے میرا پجاری نہ بنا۔ اگر یہ میرا پجاری بن گیا

"تو یہ کھیل پورا نہیں ہو سکے گا۔"

روپا نے یہ الفاظ سنے اور ایک دم سمجھ گئی۔ ہیرالعل ہاتھ اُٹھائے کھڑا تھا لیکن اس کے بعد روپا خاموش ہو گئی اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہیرالعل یہی سمجھا کہ اس کے بعد اُسے یہی کرنا ہے۔ چنانچہ کمرے میں خاموشی کی فضا طاری ہو گئی۔

بہرحال، شیطان کا اپنا کام ایسا ہی عجیب تھا اور وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو شیطان چاہتا تھا۔ رائے گرودت اپنے ساتھ زندگی کا بہت بڑا عذاب لے کر آیا تھا۔ اس سے پہلے تو بیٹا گھر سے باہر رہ کر حویلی کی عزت اُچھال رہا تھا لیکن اب وہ گھر میں ہی آ گیا تھا اور اُس نے وہ شیطانی ہنگامے کئے تھے کہ رائے گرودت کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ بیٹا تھا اس لئے اُس کے خلاف کوئی ایسا عمل بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اور پھر اُس دن تو رائے گرودت کو غشی کے دورے پڑنے لگے جب سرسوتی کو زہر دے دیا گیا......

اُس کی ایک ملازمہ نے ہیرالعل کے کہنے پر سرسوتی کو زہر پلا دیا تھا۔ سرسوتی کا کلیجہ کٹ کٹ کر حلق سے باہر نکلنے لگا اور چاروں طرف ہاہاکار مچ گئی...... سرسوتی بہت اچھی عورت تھی۔ تین دن تک زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد آخر کار اُس نے دم توڑ دیا۔ رائے گرودت کے لئے اپنی پہلی بیوی کی موت کے بعد سرسوتی زندگی گزارنے کا ذریعہ ثابت ہوئی تھی۔ اس کی موت کے بعد گرودت کی زندگی تاریک ہو گئی۔ شبہ تو تھا کہ زہر بیٹے نے دیا ہے، یقین نہیں تھا۔ ہاں جب وہ ملازمہ ہی ضمیر کے ہاتھوں شکار ہو کر رائے گرودت کے سامنے پہنچی اور اُس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور اس کی وجہ ہیرالعل کو بتایا تو رائے گرودت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ بہت کچھ سوچتا رہا تھا، اور اس کے بعد اُس نے ہیرالعل کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا تھا۔ ہیرالعل خاموشی سے باپ کے پاس پہنچ گیا۔

"ہاں میرے بچے...... بہت سی شکایتیں ہیں تمہیں مجھ سے۔ نجانے کیوں میرا من چاہتا ہے کہ آج میں تم سے اپنے بارے میں ساری شکایتیں معلوم کر لوں۔"

"کوئی شکایت نہیں مجھے پتا جی آپ سے۔ بس آپ نے جو ساری دھن دولت پر قبضہ جما رکھا ہے مجھے اس پر اعتراض ہے، اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"ہاں...... تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے گھر کے سارے دھن دولت پر قبضہ جما رکھا ہے۔ مگر میرے بچے اس سنسار میں بڑی بڑی عجیب کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ دھن دولت کا کھیل ایسا ہی ہوتا ہے۔ منش صدیوں سے یہ کھیل کھیلتا چلا آیا ہے اور صدیوں کا تجربہ یہ ہے کہ اس کھیل میں سراسر نقصان ہی ہوتا ہے۔ جتنا اس کا لالچ کرو اتنا ہی سمجھ لو زندگی موت کے قریب ہوتی چلی جاتی ہے۔ سارے رشتے ناطے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں سوچتے بیٹا کہ ہر انسان کا اپنا ایک اشٹیش ہوتا ہے اور ہر انسان اپنی زندگی کے لئے کچھ چاہتا ہے۔ اب تو نے اس نوکرانی کے ذریعے ایک بے گناہ عورت کو مار دیا جو ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ ہیرالعل کو وہ سب کچھ دے دیں جو وہ چاہتا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ نہیں چاہئے۔ اس عورت کو مار دیا تو نے۔"

"کون کہتا ہے؟"

"بیٹا، پوری تحقیقات کے بعد یہ کہہ رہا ہوں۔ میرا سنسار بس اتنا ہی رہ گیا تھا کہ اپنی دھرم پتنی کے ساتھ ہنس بول کر وقت گزار لیتا تھا سو تم نے وہ بھی مجھ سے چھین لیا۔ بیٹا، میں نے پھیرے لئے تھے اُس کے ساتھ اور وعدہ کیا تھا اُس سے کہ اُس کے جیون کی رکھشا کروں گا۔ نہیں کر سکا، ایک مجرم بن گیا میں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس مجرم کو سزا دے دو۔"

"آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی پتا جی؟"

"تو پھر یہ سمجھ لو، اپنی وہ ذمہ داری پوری نہ کرنے پر میں اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ اور میرے لئے بیٹا، اس سے بڑی سزا کیا ہے کہ ایک باپ اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو زندگی سے دُور کر دے......" یہ کہہ کر رائے گرودت نے ریوالور نکال لیا اور اُس کا رُخ ہیرالعل کی طرف کر کے بولا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ مایا کا تو بڑی بری چیز ہوتی ہے۔ انسان اس کے چکر میں پھنس کر یوں سمجھ لو جیون ہی کھو بیٹھتا ہے۔ اور آج تم اس کا ہی شکار ہو رہے ہو۔"

رائے گرودت نے کہا اور اُس کے ریوالور سے تین شعلے نکلے اور دو گولیاں ہیرالعل کے دل میں اور ایک دماغ میں پیوست ہو گئی...... ہیرالعل کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر اُس کے منہ سے خون کی دھار نکلی اور اس کے بعد وہ اوندھے منہ زمین پر آ پڑا۔

"اپنے خون کے قطرے کو زندگی بھر کی محنت کے بعد پروان چڑھا کر اس طرح خون میں ڈبو دینا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ پر میں انصاف کر رہا ہوں۔ اپنے بیٹے کی موت کے بعد میرے لئے زندہ رہنا ناممکن ہے...... اب رہ بھی کیا گیا ہے اس سنسار میں میرے لئے؟ چنانچہ...... چنانچہ......" یہ کہہ کر رائے گرودت نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھی اور ٹرائیگر دبا دیا...... اس طرح دونوں باپ بیٹا ختم ہو گئے......!

سنگیت اور امر سنگھ حویلی اور جائیداد کے سلسلے میں جھگڑ پڑے اور دونوں نے ایک دوسرے کو ہلاک کر دیا۔ یشودھا اور کلاوتی بیواؤں کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگیں۔ حویلی بک گئی اور دونوں وہاں سے شہر منتقل ہو گئیں۔

اس کے بعد روپا کا یہاں کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ وہ واپس اپنے گھر چل پڑی جہاں اُس کی باقی بہنیں وقت گزار رہی تھیں......!!

❁❁❁

اس کے بعد کے واقعات جاننے کے لئے
جلد دوئم کا مطالعہ کیجئے

عجائب خانہ
2
ایم اے راحت

رجنی کی نگاہیں بانکے لعل کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ بانکے لعل گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر اُس نے افسردگی سے کہا۔
"بس...... ہونی ہو کر رہتی ہے۔ نروپا ایک بار ایک دوسری بستی میں اپنی ماسی سے ملنے گئی تھی۔ بستی کافی دُور دراز ہے۔ اور اُس کی ماسی کی حویلی ایک طرح سے آسیب زدہ کہلاتی ہے۔ نروپا کی ماسی نوجوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی اور اُس کا پتی اُس کے لئے بہت کچھ چھوڑ کر مرا تھا۔ وہ حویلی جو بڑے لمبے چوڑے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے لوگوں کی نگاہوں میں آسیب زدہ تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ نروپا کی ماسی کا پریوار اس حویلی میں حادثے کا شکار ہوا تھا اور وہیں ختم ہو گیا تھا۔ لیکن نروپا کی ماسی نے وہ حویلی نہیں چھوڑی وہ وہاں گئی اور اس کے بعد کی کہانی مجھے دوسرے لوگوں نے سنائی۔ وہ جودھنی چند کے نام سے مشہور تھا، حویلی میں آتا رہتا تھا۔ سادھو قسم کا آدمی تھا اور آوارہ گردی کرتا پھرتا تھا۔ جب نروپا وہاں پہنچی تو ایک بار وہ سادھو آیا اور اُس نے نروپا کو دیکھا اور اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر اُس نے کہا۔
"دیوی، تو کون ہے؟ ذرا میری آنکھوں میں دیکھ۔"
نروپا اچھی لڑکی تھی اور اپنے آپ کو لئے دیئے رکھتی تھی۔ سادھو کے اس طرح کہنے سے اُسے غصہ آ گیا اور اُس نے کہا۔ "بوڑھے بھکاری، تجھے جو چاہئے تو بتا۔ فضول باتیں کیوں کر رہا ہے؟ تیری ان منحوس آنکھوں میں دیکھنے سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟"
جواب میں سادھو ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "تو میری آنکھوں میں تو دیکھ۔ تجھے جو فائدہ ہو گا وہ پتہ چل جائے گا۔"
نروپا نے غصے سے اُس کے منہ پر تھوک دیا اور واپس پلٹی۔ لیکن پھر وہ وہیں پتھرا کر رہ گئی۔ اُس کے قدم آگے نہیں بڑھے تھے۔ سادھو نے پھر کہا۔ "اب میری آنکھوں میں دیکھ دیوی...... پلٹ۔"
نروپا پلٹ کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تو سادھو نے کہا۔ "میرا پتہ تو تجھے معلوم ہو گیا ہو گا۔ میں اپنے استھان پر تیرا انتظار کروں گا۔" اور اس کے بعد نروپا واپس پلٹ پڑی۔ سادھو اپنی جگہ چلا گیا تھا۔ یہ سارا منظر بالکل قریب سے ایک ملازمہ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے ساری باتیں بھی سن لی تھیں۔ وہ خوفزدہ سی نروپا کی ماسی کے پاس پہنچی اور اُسے ساری کہانی سنائی تو نروپا کی ماسی بھی پریشان ہو گئی اور اُس نے مجھے بلا بھیجا۔ جب میں پہنچا تو اُس نے یہ داستان مجھے سنائی اور بولی۔
"وہ گرو دھرم چند ہے اور اُس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ بہت بڑا عورت خور ہے اور خوبصورت لڑکیوں کو اپنے جال میں پھانسنا اُس کا مشغلہ ہے۔ تم جلدی سے نروپا کو گھر لے

جاؤ۔"

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور اُسے گھر لے آیا۔ نروپا ٹھیک ٹھاک تھی۔ بلکہ اس طرح چلنے آنے پر ذرا کچھ ناراض بھی تھی اور ہم نے اُسے کچھ بھی نہیں بتایا اور یوں تھوڑے دن بیت گئے۔ اس دوران نروپا کی ماسی نے کئی بار آدمی بھیج کر یہاں نروپا کی خیریت معلوم کرائی۔ لیکن پھر ایک رات جب آسمان پر چودھویں رات کا چاند کھلا ہوا تھا اور نروپا ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ کچھ مہمان آئے ہوئے تھے کہ اچانک ہی یوں لگا جیسے نروپا کو کوئی جھٹکا سا لگا ہو۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر بولی۔

"جے گرودھرم چند...... میں آ رہی ہوں۔ آپ نے مجھے بلایا ہے گرو جی، میں آپ کے چرنوں میں حاضر ہو جاتی ہوں۔" اور پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر چل پڑی۔

پہلے تو سبھی یہی سمجھے کہ وہ شرارت کر رہی ہے اور اس طرح کی اداکاری کر کے دوسروں کو بیوقوف بنانا چاہتی ہے۔ لیکن اپنے کمرے میں آ کر اُس نے سولہ سنگھار کئے اور اس کے بعد چل پڑی۔ اس وقت جو مہمان آئے ہوئے تھے اُس کا پیچھا کرنے لگے۔ میں بھی حیران تھا لیکن مجھے گرودھرم چند کا نام یاد تھا جو نروپا کی ماسی نے مجھے بتایا تھا۔ میرے ذہن میں پریشانی تھی جبکہ باقی سب لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ نروپا شرارت کر رہی ہے۔ اور ویسے بھی وہ ذرا شوخ فطرت کی مالک تھی۔ البتہ جب لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بستی سے باہر نکلی تو پیچھا کرنے والے کچھ پریشان سے ہو گئے۔ بستی سے باہر کھیتوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا، پورے چاند کی چاندنی میں وہ نروپا کو آگے بڑھتے دیکھ سکتے تھے۔ نروپا کافی فاصلے پر پہنچ گئی۔ پھر اچانک ہی اُس نے پلٹ کر دیکھا اور ایک دم یہ محسوس ہوا جیسے تیز بھونچال آ گیا ہو...... زمین لرزنے لگی تھی اور ماحول ایک دم سے عجیب سا ہو گیا تھا۔ وہ لوگ خوفزدہ ہو کر رُک گئے۔ لرزتی زمین پر بیٹھ کر انہوں نے اپنے آپ کو اس زلزلے سے بچایا۔ کوئی دس سیکنڈ تک یہ زلزلہ رہا اور اس کے بعد زمین ساکت ہو گئی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ نروپا اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ وہ بہت دیر تک اُسے تلاش کرتے رہے، اور اس کے بعد واپس آ گئے۔

لیکن اس واقعہ نے میرا دل دہلا دیا تھا۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے اور نروپا کی ماسی نے جو کچھ بتایا ہے وہی ہو رہا ہے۔ لیکن ہم کیا کر سکتے تھے؟

پھر اکثر نروپا کو یہ دورے پڑنے لگے۔ چاند کی چودھیں رات ہوتی یا نہ ہوتی، لیکن نروپا اسی طرح تیار ہو کر وہاں جاتی۔ اور اب بھی ایسا ہی ہے۔ وہ عام طور سے جس حالت میں رہتی ہے وہ تو تمہارے علم میں ہے دیوی۔ لیکن جب وہ اس طرح تیار ہو کر جاتی ہے تو ہم دُعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ وہ زندہ واپس آ جائے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں؟ جب تم آئی ہو تو ہمارے من میں یہ آشا پیدا ہو گئی ہے کہ بھگوان کرے بر تم ہماری مشکل کا حل بن جاؤ۔"

رجنی نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔"

"جیتی رہو بیٹا۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ اگر اس طرح اپنی عزت گنوا بیٹھے تو نہیں جانتے کہ سنسار میں ہمارا کیا مقام ہوگا؟ بھگوان کرے تم ہمارے کسی کام آ جاؤ۔" بانکے لعل رونے لگا۔ رجنی نے اُسے تسلی

دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں بانکے لعل جی...... آپ اس قدر پریشان نہ ہوں۔ بھگوان جو کچھ کرے گا ٹھیک ہی کرے گا۔"

رجنی کے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ وہ صحیح معنوں میں بانکے لعل کے لئے کچھ کام کرنا چاہتی تھی۔ اُسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ انا زبیدہ نے اُسے کس مقصد کے لئے مخصوص کیا ہے۔ ان لوگوں کو اس نے اپنا صحیح نام نہیں بتایا تھا، بس ہلکا پھلکا سا تعارف کرا دیا تھا۔ لیکن بہرحال نام سے کچھ نہیں ہوتا۔ رجنی اُن کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اُس نے بہت غور کیا، ساری تفصیل اُس کے علم میں آ چکی تھی۔ بانکے لعل اُسے بتا چکا تھا کہ گرودھرم چند کیا چیز ہے؟ خود رجنی کے دل میں بھی تجسّس پیدا ہو چکا تھا کہ اب ذرا تفصیل سے معلوم کیا جائے۔ جو کچھ اُس نے نروپا کا پیچھا کرنے کے بعد دیکھا تھا وہ اُس کے لئے بڑا سنسنی خیز تھا۔ اور رجنی بہرحال اپنی ہر صلاحیت سے فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی۔ بانکے لعل اُمید بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"دیوی، اب تو، تو یہ سمجھ لے کہ ہم مرنے کے قریب پہنچ گئے ہیں اپنی بیٹی کی اس حالت سے۔ ہمارا جو حال ہے ہم تجھے الفاظ میں نہیں بتا سکتے۔ بس ایک بات کہتا ہوں، میں نے جیون میں کوشش کی ہے کہ کسی کو میرے ہاتھوں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ دین دھرم ہر چیز کا خیال رکھا ہے، مصیبت کا مارا ہوا کوئی بھی شخص میرے سامنے پہنچا تو میں نے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ کون سے دھرم سے تعلق رکھتا ہے اُس کی مدد کی ہے دیوی۔ میں تھک گیا ہوں۔ بھگوان سے دعا ہے میری کہ اگر اپنی بیٹی کی یہی صورت دیکھنے کو ملتی رہے مجھے تو اس سے بہتر ہے کہ بھگوان مجھے اُٹھا لے۔"

"آپ چنتا نہ کریں۔ میں اسی بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اور جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ میں کچھ کروں گی۔ اور جو فیصلہ کر لوں گی اس کے بعد آپ کو بتاؤں گی۔"

رجنی نے دو دن تک سوچا اور اس کے بعد اُس نے بانکے لعل سے کہا۔

"بانکے لعل جی...... اب جو کچھ میں آپ کو بتا رہی ہوں آپ وہ کریں۔ چاند پورا ہونے میں ویسے تو تین دن باقی رہ گئے ہیں، لیکن جس دن نروپا وہاں گئی تھی اُس دن چاند پورا نہیں تھا۔"

"میں نے بتایا نا بیٹا کہ اب پورن ماشی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ کبھی بھی چلی جاتی ہے۔"

"آپ کو ایک کام کرنا ہوگا۔"

"ہاں بول۔" بانکے لعل نے کہا۔

"آپ کو کوئی ایسی نشے والی چیز لانی ہوگی جو آپ روزانہ شام کو نروپا کے کھانے میں ملا دیا کریں۔ تاکہ وہ بے ہوشی میں گہری نیند سو جایا کرے اور اس کے بعد اُس کے پاؤں باندھ دیا کریں اور ہاتھ بھی۔"

"تو پھر؟"

"بس، جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ کیا کریں۔ اور ایک بات سنئے، آپ نروپا کو دوسرے کمرے میں لے جائیں۔ اُس کے کمرے میں، میں سویا کروں گی۔"

"دیوی، جیسا تو پسند کرے۔"

چنانچہ دوسرے ہی دن رات کے کھانے میں نروپا کو بے ہوشی کی ایک دوا دی گئی اور اُس کے دونوں ہاتھ پاؤں باندھ کر بانکےلعل اور اُس کی دھرم پتنی نے اُسے اپنے کمرے میں سلایا جبکہ رجنی، نروپا کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے اُس کے بستر پر لیٹ گئی۔ لیکن اُس نے بیوقوفی سے کام نہیں لیا تھا۔ اُس نے اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے آپ کو نروپا کی شکل دے دی تھی اور اس وقت اس گھر میں دو نروپائیں موجود تھیں۔ ایک ہاتھ پاؤں بندھے ہو کر بیہوشی کے عالم میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ اور دوسری اُس کے بستر پر۔ رجنی انتظار کر رہی تھی کہ دیکھو اب اس سلسلے میں کیا ہوتا ہے اور کب ہوتا ہے؟

یہ شاید اُس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اُس کی پہلی ہی کوشش کارآمد ہوئی۔ اس وقت رات کے تقریباً بارہ بجے ہوں گے کہ اچانک ہی اُسے ایک سرگوشی سنائی دی۔

''نروپا...... جاگو نروپا...... کیا تم سو رہی ہو؟ یہ سونے کا سمے نہیں ہے۔ تمہارا پریمی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ سونے کا سمے نہیں ہے نروپا...... جاگ جاؤ......''

رجنی جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آؤ...... تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے۔ آج رات کی سبھا میں تمہارا رقص ہے۔ آؤ نروپا...... آ جاؤ۔ تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے۔''

اور اس کے بعد یہ آواز بند ہو گئی۔ رجنی اندازہ لگا رہی تھی کہ یہ آواز سرگوشی کی شکل میں اُس تک پہنچ رہی ہے اور حقیقتاً کوئی بھی اسے سن کر سحر کا شکار ہو سکتا تھا۔ یہ تھا نروپا کو بلانے کا طریقہ۔ رجنی اپنی جگہ سے اُٹھ گئی اور اس کے بعد اُس نے نروپا ہی کی طرح سنگھار کیا، خوبصورت لباس پہنا جو نروپا ہی کا تھا اور خاموشی سے اُس خفیہ راستے سے نکل کر چل پڑی جس راستے سے اُس نے نروپا کو باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ رجنی اپنی تمام تر صلاحیتوں سے کام لے کر اس راستے پر جا رہی تھی جو اُس نے اس دن دیکھا تھا۔ اس وقت اُس نے بڑے خطرات مول لئے تھے اور وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ نروپا کو کہاں بلایا جا رہا ہے۔

بہرحال وہ چلتی رہی اور خاصہ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس جگہ پہنچ گئی جہاں اُس نے نروپا کو جاتے ہوئے دیکھا تھا اور جہاں خود اُس کے ساتھ انتہائی پراسرار اور عجیب وغریب واقعات پیش آئے تھے۔ لیکن اب جو وہ وہاں پہنچی تو اُس نے ایک بدلا ہوا منظر دیکھا۔ یہ ایک حویلی نما جگہ تھی جس کی دیواریں کالی سیاہ ہو چکی تھیں۔ اس کی طرزِ تعمیر بھی عجیب سی تھی۔ چھت پر گنبد سے نظر آ رہے تھے۔ اس جگہ کا پہلے بھی یہاں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ لیکن طلسم خانۂ حیات میں اس قسم کے واقعات کا ظہور پذیر ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ باہر سے دروازہ جس میں پیتل کی کیل لگی ہوئی تھی بند تھا۔ رجنی اُس کے پاس پہنچ کر رُک گئی اور اُس نے سوچا کہ داخلے کے لئے کیا، کیا جائے؟ دروازے پر دستک دی جائے یا اسے ایسے ہی کھولنے کی کوشش کی جائے؟ اس عظیم الشان دروازے میں ایک ذیلی کھڑکی بھی لگی ہوئی تھی۔ رجنی نے اس کھڑکی پر دباؤ ڈال کر دیکھا تو اندر کو دبنے لگی۔ اس کا مطلب ہے وہ اسے کھول کر اندر داخل ہو سکتی ہے۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد اُس نے کھڑکی کھولی اور اندر داخل ہو گئی۔ پہلے وہ جس منظر کو دیکھ چکی تھی دروازے کے دوسری طرف کا منظر اس سے خاصا مختلف تھا۔ ادھر جلی ہوئی زمین نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا

جیسے کوئی آتش فشاں اُٹھا ہو اور اس کا لاوا اُچھل کر ٹھنڈا ہو گیا ہو۔ پوری زمین ناہموار تھی۔ جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے اور ان کے درمیان راستے دُشوار گزار تھے۔ رجنی نے پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا کہ یہ جگہ تو نہیں تھی جہاں وہ پہلے آ چکی تھی۔ لیکن اس کا سارا علم تو یہ بتاتا تھا کہ پہلے بھی یہ جگہ وہی تھی۔ یہ اب الگ بات ہے کہ اب اس کی شکل بدل دی گئی ہے۔ لیکن کیوں؟ اور پھر خود ہی اپنے اس سوال کا جواب مل گیا۔ بات کسی عام آدمی کی نہیں تھی۔ یہ پراسرار ماورائی قوتیں تھیں جو لمحہ لمحہ رنگ وروپ بدل سکتی تھیں۔ رجنی کو احساس ہوا کہ صورتحال سنگین ہے۔ وہ نروپا کا روپ دھار کر یہاں آ تو گئی ہے لیکن ان لوگوں کو دھوکا دینا بہت مشکل ہے۔

بہرحال وہ آگے بڑھنے لگی۔ نہ کوئی عمارت تھی نہ باب نہ ایسی کوئی جگہ جہاں سبزہ زار ہوں یا رقص کرنے کے لئے کوئی حسین جگہ بنائی گئی ہو۔ چاروں طرف ویران راستے پھیلے ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ آگے بڑھتی رہی۔ آخر کار تھک کر ایک جگہ رُک گئی اور پھر اُس نے بھاری آواز میں کہا۔

''دھرم چند...... میں تجھے گرو نہیں کہوں گی۔ تو جو کوئی بھی ہے سامنے تو آ۔ کم از کم تجھ سے تھوڑی سی باتیں ہی ہو جائیں۔''

اچانک ہی عجیب سی آوازیں فضا میں بلند ہونے لگیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد رجنی نے دیکھا کہ وہاں ان کالی چٹانوں میں ننھی ننھی کونپلیں اُگتی نظر آ رہی ہیں اور ان کے بڑھنے کی رفتار بہت تیز ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کونپلیں چھوٹے چھوٹے درختوں کی شکل اختیار کر گئیں اور پھر یہ درخت بھی اُونچے ہو کر پھیلتے چلے گئے۔ لمحوں کے اندر کالے کالے پہاڑوں کے بہتے ہوئے لاوے کے درمیان ایک حسین سبزہ زار اُبھرتا چلا آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماحول بالکل تبدیل ہو گیا۔

تبھی اُس نے کچھ لوگوں کو اِدھر آتے دیکھا۔ یہ خوبصورت لڑکیاں اور سازندے وغیرہ تھے جو آ کے درمیان میں بیٹھ گئے۔ اور پھر ایک شخص وہاں نمودار ہوا اور اُس نے رجنی کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''آؤ دیوی...... تم نے مجھے آواز دی ہے تو میں آ گیا۔ دیکھو میں نے کیسے تمہارے سواگت کا بندوبست کیا ہے۔''

رجنی اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ یہ گرو دھرم چند تھا۔

''تو تم دھرم چند ہو؟''

''گرو دھرم چند۔''

''گرو تو استاد کو کہتے ہیں۔''

''ہوں......''

''تو پھر میں تمہیں گرو کیسے کہوں؟''

''مگر مجھے گرو دھرم چند ہی کہتے ہیں۔''

''میں تو خالی دھرم چند ہی کہوں گی۔''

''دیوی، جو تمہارا من چاہے کہو۔ تمہیں بھلا کون روک سکتا ہے؟ تم تو بڑی مہان ہو۔''

"مجھے جانتے ہو؟"

"ہاں دیوی، جو روپ تم نے دھارن کیا ہے اس کے بارے میں تو ہمیں ایک لمحے میں پتہ چل گیا تھا کہ یہ تم ہو، وہ نہیں۔ اُس بیچاری کو تو تم وہاں بند ہوا کر ڈال آئی ہو ورنہ ہماری ایک آواز پہ وہ دوڑی چلی آتی، کوئی اُسے روکنے والا نہیں تھا۔"

"دھرم چند...... کیوں اُس بیچاری بچی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟ پورے خاندان کو تم نے پریشان کر دیا ہے۔"

"اس کی وجہ ہے دیوی۔"

"کیا وجہ ہے؟"

"بتاتا ہوں تمہیں...... آجاؤ مہاراج، آجاؤ۔" دھرم چند نے پیچھے رُخ کر کے آواز دی اور چند لمحات کے بعد ایک ننگ دھڑنگ آدمی وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے بدن پر بہت ہی مختصر سا لباس پہنا ہوا تھا۔ لیکن رجنی نے اُسے دیکھا تو اُس کے پورے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں...... یہ ناگ چندر کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا......

ناگ چندر خونی نگاہوں سے رجنی کو دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے رجنی کے دل میں خوف کے آثار پیدا ہوئے تھے لیکن پھر اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ کھیل بگڑ چکا تھا اور اب اس بگڑے ہوئے کھیل میں اُسے اپنا وجود برقرار رکھنا تھا۔ وہ ناگ چندر کو دیکھنے لگی۔ گرو دھرم چند بولا۔

"ہاں دیوی جی...... پہچان لیا تم نے ہمارے مہاراج کو؟"

"ہاں...... میں نے اس گندے روپ کو پہچان لیا ہے۔ یہ وہ لعنت کا مارا ہے جو مرنے کے بعد بھی در در بھٹک رہا ہے۔ اسے نہ چتا ملی نہ ارتھی۔ کتنا بدنصیب ہے یہ۔"

"بکواس بند کر...... میری چتا کبھی تیار ہوگی نہ ارتھی، سمجھی؟ میں تو امر ہوں۔ میرا جیون امر ہوتا جا رہا ہے۔ اشیش بھگونتا دیو کا ہاتھ میرے سر پر ہے۔ اور تو دیکھ لینا کیا سلوک کرتا ہوں میں تیرے اُس بوڑھے کھوسٹ کے ساتھ اور پراسرار عورت کے ساتھ جو نجانے کمبخت کون ہے کہ اشیش بھگونتا بھی اُس کی تلاش میں ناکام رہا ہے۔"

"ارے وہ تو ایمان علی کے گھر میں رہتی ہے۔ اُسے تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں رہتی وہ...... وہ اُس کی آتما ہے...... صرف آتما۔" ناگ چندر نے کہا اور رجنی سکتے میں رہ گئی۔ پہلی بار ناگ چندر کے منہ سے اُسے اس بات کا علم ہوا تھا کہ انا زبیدہ کوئی زندہ خاتون نہیں، کوئی رُوح ہے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت تھی؟ ہو سکتا ہے کہ یہ بکواس کر رہا ہو۔ اسے تو کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ انا زبیدہ زندہ نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں ناگ چندر کے ان الفاظ پر رجنی کے دل کو ایک دھچکا سا لگا تھا۔ بہرحال یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔ اس وقت دیکھنا تھا کہ اس بدترین دشمن سے نجات کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ گرو دھرم چند سے نمٹنا تو آسان تھا لیکن ناگ چندر کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ وہ بے حد خطرناک تھا۔

رجنی نے نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا اور چونک پڑی...... ناگ چندر ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ رجنی کچھ سمجھ سکتی اچانک ایک تیز سنسناہٹ سنائی دی اور باریک سنہری تار رجنی کے بدن سے لپٹ گئے...... یہ بے حد لطیف تار تھے۔ رجنی کو یوں لگا جیسے اُسے آکٹوپس نے جکڑ لیا ہو...... وہ کلبلا کر رہ گئی۔

"یہ کیا ہے ناگ چندر مہاراج؟" گرو دھرم چند نے پوچھا۔

"اشیش بھگونتا کا جال۔"

"کیا مطلب؟"

"لمبی کہانی ہے......"

"مجھے بتاؤ تو سہی۔"

"پرانی بات ہے، یہ ساری سسریاں ایک راکھشش کے جال میں پھنس گئی تھیں۔ اشیش بھگونتا نے انہیں مہان شکتی دی اور جیون بدل لینے کی طاقت دی۔ باقی بہنیں تو اس طاقت سے اشیش بھگونتا کے لئے کام کر رہی ہیں، یہ سسری اسے انہی کے خلاف استعمال کر رہی ہے۔"

"تو پھر؟"

"میں نے وہ شکتی قید کر دی ہے۔"

"اب یہ خود کو نہیں بدل سکتی؟"

"ہاں...... اب یہ ہماری قیدی ہے۔"

"اب کیا کرنا ہے مہاراج؟"

"اسے فوراً قید کر دو۔ بعد میں اس کا فیصلہ ہوگا یہ فیصلہ ہم نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" گرو دھرم چند نے عقیدت سے کہا اور دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ چار آدمی کہیں سے نکل آئے اور دھرم چند نے اُنہیں حکم دیا۔ "اسے نیومتی کنڈل میں قید کر دو۔"

وہ لوگ رجنی کو لے کر چل پڑے تھے۔ نیومتی کنڈل ایک انتہائی پراسرار جگہ تھی۔ عجیب سے غاروں کا لامتناہی سلسلہ...... اس ہولناک قید خانے میں رجنی کو ڈال دیا گیا اور وہ چاروں وہاں سے چلے گئے۔ رجنی بے حد خوفزدہ اور پریشان تھی۔

"اب میں کیا کروں......؟" اُس نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔

"آرام......" ایک آواز آئی۔

"کون ہے......؟" رجنی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وقت......"

"کیا مطلب......؟"

"میں وقت ہوں......"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"نہ رُکنے والا...... جہاں تو ہے اس جگہ کے بارے میں جانتی ہے؟"

"نہیں......"

"کوئی نام نہیں اس جگہ کا؟"

"شاید نیومتی کنڈل۔"

"یہ کیا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"جاننا چاہتی ہے......؟"

"ہاں......"

"میں تجھے ایک کہانی سناؤں؟"

"کہانی......؟"

"ہاں...صدیوں کی سب سے دلکش، سب سے حسین سوغات۔ جسے انسان ہمیشہ سنتا آیا ہے۔"

"مجھے کہانی سناؤ۔" رجنی نے کہا۔

"یہ علاقہ نیومتی کنڈل ان جادوگروں نے بنایا۔ پہلے یہ ہنومان کملی کہلاتا تھا۔ یہ چھوٹی سی آبادی ہنومان کھلی کپاس کی زبردست پیداوار کی وجہ سے حکومت کے لئے خاصی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ ایک ہزار مکانات پر مشتمل یہ بستی تقریباً دس ہزار نفوس کی آبادی رکھتی تھی۔ پہاڑوں کے درمیان یہ چھوٹی سی بستی بے حد قدیم تھی۔ یہاں کے لوگ کپاس کی فصل پیدا کرنے کے ماہر تھے۔ لیکن حکومت کی طرف سے انہیں بھی کوئی مدد نہیں ملی تھی۔ حکومت نے بھی اس علاقے پر کوئی توجہ نہیں دی تھی جن کی وجہ سے یہاں کے باشندے زندگی کی سہولتوں سے محروم تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ محنت کش لوگ اپنی مدد آپ کے اصول پر کاربند رہے۔ تقریباً تمام باشندے قرب و جوار کے علاقوں میں کپاس اُگاتے تھے اور اسے منڈی میں لے جا کر فروخت کر دیتے تھے۔ لیکن کب تک......؟ منڈی میں اندازہ لگایا گیا کہ سب سے زیادہ کپاس کہاں سے آتی ہے؟ اور تب اس بات کا انکشاف ہوا کہ ہنومان کھلی سونا اُگلتی ہے۔ بس حکومت اس طرف متوجہ ہوگئی۔ ہنومان کھلی کی طرف بہت سے لوگ چل پڑے۔ یہ سب لوگ حکومت کے کارندے تھے جو بستی کو سہولتیں فراہم کرنے اور کپاس کی پیداوار کے مشورے دینے آئے تھے۔ ابتدا میں تو بستی والوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ انہیں غیر لوگوں کی اپنی بستی میں مداخلت پسند نہیں تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ حکومت کے کارندوں سے مانوس ہونے لگے اور پھر اُن کے درمیان کافی اچھے تعلقات استوار ہو گئے۔ اب سب مل جل کر رہنے لگے تھے اور ایک دوسرے کی مدد سے بستی کافی ترقی کرنے لگی تھی۔

جہاں حکومت کے کارندوں نے کپاس کی فصل کو بہتر بنانے پر توجہ دی تھی وہیں وہ بستی کے رہنے والوں کو بہتر طریقہ زندگی کے اصول بھی سکھا رہے تھے۔ اس سے قبل وہ بہت سی پریشانیوں سے دوچار تھے۔ بارش ہوتی تو پانی کی نکاسی کا انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ بڑے نقصان ہوتے تھے۔ لیکن نئے آنے والوں نے سڑکیں اور پانی کی نکاسی کا انتظام کیا۔ اس کے علاوہ ایک سرکاری ڈسپنسری بھی کھول دی گئی اور

علاج کی سہولتیں بھی فراہم کی گئیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے منصوبے تھے اس بستی کے لئے۔ کیونکہ جائے وقوع کے لحاظ سے یہ بے حد خوبصورت بستی تھی، اس لئے ایک پلان یہ بھی پیش کیا گیا تھا کہ اس کے قرب و جوار کے خوبصورت علاقوں کو ایک عظیم تفریح گاہ بھی بنایا جائے۔ نجانے یہ بات بستی والوں کے حق میں جاتی تھی یا خلاف؟ بستی کے نوجوانوں کو اس بات سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن اب بھی یہاں پرانے خیالات کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایسی موجود تھی جو ان لوگوں کی مخالفت کرتی تھی۔ اُن کی پیش گوئی تھی کہ حکومت کے مداخلت کاروں کی آمد کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ وہ اپنے طور پر ان کی مخالفت کرتے رہتے تھے۔ لیکن نوجوان ان نئے لوگوں کی آمد اور ان کی ترقی کی کوششوں سے خوش رہتے تھے اور ان کے نو واردوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہاں بوڑھوں کی محفل لگتی تو وہ ان لوگوں کی آمد اور اپنے نوجوانوں کی حماقت پر تبصرہ کئے بغیر نہ رہتے......

اس وقت بھی بستی کے ایک مکان کے سامنے چوپال لگی ہوئی تھی جس میں بزرگ تمباکونوشی کر رہے تھے اور نوجوان ان کی دلچسپ باتوں کو سن رہے تھے۔

"ہمارے اپنے اصول ہیں، ہمارا اپنا طرزِ رہائش ہے۔ بھلا ہم ان لوگوں کے اصول کیسے اپنا سکتے ہیں؟ ہماری بستی سادہ لوح انسانوں کی بستی ہے۔ یہ لوگ ہمارے نوجوانوں کے ذہن بگاڑ دیں گے۔ تفریح گاہیں بنیں گی، یہاں لوگ عیش و عشرت کے لئے آئیں گے اور طرح طرح کی خرافات ہوں گی۔ کیوں...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" بستی کے ایک بزرگ نے کہا۔

"ہرگز نہیں...... اس میں ایک بات غلط نہیں ہے۔" دوسرے بزرگ نے تائید کی۔

"پھر ہوگا کیا...... کیا کر سکیں گے ہم لوگ، سوائے اس کے کہ آنکھیں بند کر لیں اور خود کو بگڑتے دیکھیں۔"

"ہم نہ دیکھ سکیں گے۔" دوسرے بزرگ نے لقمہ دیا۔

"پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ آخر کریں گے کیا؟"

"خودکشی۔" دوسرے بزرگ نے جواب دیا۔

"واہ...... ہاں، یہی سب سے آسان ترکیب ہے۔ اس کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں کر سکیں گے۔ کسی بھی ثقافت کے رکھوالے اس ملک کے، اس علاقے کے نوجوان ہوتے ہیں۔ لیکن اُن لوگوں نے کامیابی کی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ اُنہوں نے ہمارے نوجوانوں کو قابو کر لیا ہے۔ اور اب ان کا راستہ کون روکے گا؟" تیسرے بزرگ نے طنز کیا۔

"آخر پوچھو تو ان سے۔ انہوں نے یہ روش کیوں اختیار کی ہے؟ آخر انہوں نے کیا سوچا ہے اس بارے میں؟" ایک بزرگ نے یہاں بیٹھے نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا۔ "کیوں...... کیا تم میں سے کوئی جواب دے گا؟"

"اگر بزرگوں کی اجازت ہو۔" ایک نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور اگر ہماری گفتگو کو گستاخی نہ تصور کیا جائے۔" دوسرے نوجوان نے کہا۔

"ہاں، ہاں...... بولو۔ کم از کم تمہارے موقف کا تو پتہ چلے۔" ایک بزرگ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تو محترم بزرگ، آپ کو ان لوگوں کی آمد پر کیوں اعتراض ہے؟ وہ کسی غیر ملک کے باشندے تو ہیں نہیں، ہمارے اپنے وطن کے لوگ ہیں، ہمارے اپنے وطن کے ہیرو ہیں۔ کیا ہم صرف اس بات پر ان سے نفرت کریں کہ ان لوگوں کا تعلق ہماری بستی سے نہیں ہے؟ اور اس کے علاوہ ان کی آمد نے ہمارے بہت سے مسائل حل کیے ہیں۔ ہم مختلف تکالیف کا شکار تھے۔ انہوں نے ہماری تکالیف دُور کرنے کے لئے کتنی کاوشیں کی ہیں۔ کیا ہم احسان فراموش بن جائیں؟"

"تم نہیں سمجھتے...... یہ صرف ان کی بگلا بھگتی ہے۔" ایک بزرگ نے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم؟" ایک نوجوان نے پوچھا۔

"بس بس...... مجھے سب معلوم ہے۔"

"لیکن کیسے بزرگ؟ ہمیں بھی سمجھا دیں۔"

"ارے سمجھاؤں کیا؟ بس تم دیکھ لینا۔"

"ہاں، ہم اسی بات کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں کیا نقصان پہنچاتے ہیں۔"

"ہمارے علاقے میں تفریح گاہیں بنیں گی۔ ان تفریح گاہوں میں عیاشی ہوگی۔ سنا ہے کوئی سروے ٹیم بھی آئی ہے اور ڈسپنسری کی عمارت میں ٹھہری ہے۔"

"وہ تفریح گاہیں ہماری بستیوں سے دُور ہوں گی۔" نوجوان نے کہا۔

"اور وہاں سے یہاں تک سڑکیں بنیں گی۔ ارے تم آنے والوں کو روک لو گے کیا؟"

"ہاں بزرگ...... ہمارے خون اتنے سرد تو نہیں ہوئے۔ آخر ہماری رگوں میں بھی آپ ہی کا خون دوڑ رہا ہے۔ اگر کوئی بری نیت سے اس طرف بڑھا تو کیا ہمارے کلہاڑے اُن کے پاؤں بھی نہ کاٹ سکیں گے؟" نوجوان نے جوش سے کہا۔

"یہ بعد از وقت ہوگا۔"

"آخر کیوں...... کس طرح؟"

"اس وقت وہ لوگ اتنے طاقتور ہو چکے ہوں گے کہ تم ان کا زور نہ توڑ سکو گے۔"

"تو آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا ہم محض اس مفروضے پر انہیں اپنے علاقوں سے مار بھگائیں کہ آئندہ ہمیں نقصان پہنچائیں گے؟ یہ سلوک ہم ان لوگوں کے ساتھ کریں جو دن رات ہماری بہتری کے لئے کوشاں ہیں؟"

"اس بہتری کا اندازہ تو بعد میں ہوگا۔"

"تو براہِ کرم آپ اس وقت تو خاموش رہیں۔ اور ہم پر طنز نہ کریں جب تک ان کی جانب سے کوئی کارروائی ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہو جائے تو آپ ہمارے خون سرد نہ پائیں گے۔"

"یہی تو تم لوگوں کی حماقت ہے۔ تم وقت سے پہلے نہیں سوچ رہے۔ تمہیں ان لوگوں کے دلوں کا حال معلوم نہیں ہیں۔" بوڑھے نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"افسوس، ہم بلا جواز شریف انسانوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔"

"ہونہہ...... شریف لوگ......" بوڑھے نے برا سا منہ بنایا۔

"کیوں...... کیا آپ ڈاکٹر فراغی کی شرافت سے انکار کریں گے؟ کیا وہ برا انسان ہے؟ وہ انسان جو علاج بھی کرتا ہے اور اگر آپ کے کسی بچے کو خون کی ضرورت ہو تو اپنی رگوں کا خون بھی دے سکتا ہے۔ اور پھر ہفتوں بستر پر پڑا رہتا ہے۔" نوجوان نے کہا اور بوڑھوں کے چہرے اُتر گئے۔ ان میں سے کوئی بھی ڈاکٹر فراغی کی انسان دوستی اور ہمدردی سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ بستی کی سرکاری ڈسپنسری کے اس نوجوان ڈاکٹر نے بستی والوں پر بڑے بڑے احسانات کیے تھے۔ وہ دن رات اُن کے لئے تیار رہتا تھا۔ نہایت قابل ڈاکٹر تھا۔ تیر بہدف علاج کرتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہر وقت جان و مال سے ان کے لئے تیار رہتا تھا۔ پوری بستی اُس کی ممنون تھی۔ اب جب اُس کا ذکر آ گیا تو کوئی کیا بولتا؟ اور بوڑھوں کی مشکل ایک اور بوڑھے نے حل کر دی۔

بابا غلام فرید بہت کم لوگوں کی محفل میں شریک ہوتا تھا اور اُس کی آمد سب کے لئے حیران کن ہوتی تھی۔ وہ ایک سنکی بوڑھا تھا۔ کافی عمر تھی لیکن قوئی ابھی تک مضبوط تھے۔ بستی کے سب سے آخری سرے پر سب سے الگ تھلگ اپنی کٹیا بنا کر رہتا تھا اور عام طور سے لوگوں سے ملاقات نہیں کرتا تھا۔ اس طرح وہ بستی والوں کے درمیان ایک پراسرار حیثیت کا حامل تھا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ حیرت انگیز قوتوں کا حامل ہے اور پراسرار پیشین گوئیاں کرتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اُس کی پیشین گوئیوں کی تصدیق بھی کر لی تھی۔ اُس کی اچانک آمد پر وہ سب لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بوڑھا افراش محتاط قدموں سے چلتا ہوا اُن کے درمیان پہنچ گیا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ چوپال پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"کیا میں تمہارے درمیان بیٹھ جاؤں؟" اُس نے لوگوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹھو غلام فرید...... ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ کیا تمہیں تمبا کو پیش کیا جائے؟"

"اوہ، تم لوگ مجھ سے دشمنی کیوں کرتے ہو؟ میں تو تمہارا دوست ہوں۔ میں تمہیں خود سے دشمنی کرنے سے منع نہیں کرتا۔ لیکن تم مجھے اذیت ناک موت دینے کے لئے کیوں کوشاں رہتے ہو؟" بوڑھے غلام فرید نے کہا۔

"ہم میں سے تمہارا کوئی دشمن نہیں غلام فرید بابا۔"

"تب پھر مجھے زہر کیوں پیش کر رہے ہو جو پھیپھڑوں پر ناگ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور ان کی سانس لینے کی قوت کو سلب کرتا رہتا ہے، اور پھر بے شمار بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ نہیں نہیں میں ایسی اذیت ناک موت قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔" بوڑھے فرید بابا نے ہاتھ اُٹھائے ہوئے کہا اور دوسرے لوگ مسکرانے لگے۔ بوڑھا اُن کے نزدیک ہی بیٹھ گیا تھا۔

"سناؤ بزرگ فرید...... آج ہم لوگوں کی یاد کیسے آ گئی؟" کسی نے کہا۔

"بدتر انسان اپنی زندگی کے سارے دن مصروف گزارتے ہیں۔ اگر وہ دوسروں کے درمیان بیٹھ کر فضول باتیں کر کے وقت گنوانے لگیں تو بہت سے کاموں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو میں بلاوجہ

یہاں آیا ہوں؟''

''ہم تمہاری آمد سے خوش ہیں بابا فرید...... لیکن تمہارے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ تم ہمارے پاس کسی خاص وجہ سے آئے ہو۔''

''ہاں...... ایک انتہائی خاص وجہ ہے۔''

''تو کہو...... ہم منتظر ہیں۔''

''میں آج رات یہ بستی چھوڑ رہا ہوں۔''

''کیوں......؟'' سب چونک پڑے۔

''اس لئے کہ یہ بستی تباہ ہونے والی ہے۔ صدیوں پہلے کی ایک روایت ہے، ممکن ہے تم میں سے کسی کے علم میں نہ ہو، لیکن میں تنہائی میں علم کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں اور میرا علم مجھے نئے نئے راستے دکھاتا ہے، انوکھی باتیں بتاتا ہے۔''

''بستی تباہ ہونے والی ہے......؟'' بہت سے لوگ حیرت سے بولے۔

''ہاں...... اور وہ روایت یہ ہے کہ صدیوں پہلے بھی ایک مرتبہ یہ بستی تباہ ہوئی تھی۔ اور اچانک تباہ ہوئی تھی۔ اس وقت زمین نے آگ اُگلی تھی اور پانی کی طرح بہتے ہوئے سرخ پتھروں نے انسانوں کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کوئی جاندار باقی نہ بچا تھا یہاں۔ تم بتاؤ، میں نے پچھلی رات یہ خواب کیوں دیکھا؟''

''کیا تم نے پچھلی رات کوئی خواب دیکھا ہے؟''

''راہو کو سانپ نے کاٹا تھا؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''ہاں......''

''کیا ایک دن پہلے میں نے اُس سے نہ کہا تھا کہ وہ ترنتا کے علاقے کی طرف نہ جائے؟''

''تم نے کہا تھا بابا۔''

''قلیما پہاڑوں سے گر کر مر گیا تھا اور اس چوپال میں، میں نے اُسے آگاہ کیا تھا؟''

''ہمیں یاد ہے بابا۔''

''وہ سب میرے خواب تھے۔ اور یہ میرا خواب ہے۔ پتھر سرخ سرخ گاڑھی گاڑھی آگ میں اُبل رہے تھے۔ زمین قہقہے لگا رہی تھی اور انسان چیخ رہے تھے، بھاگو بھاگو......'' بوڑھا ایک دم کھڑا ہو کر چیخنے لگا اور پھر وہ سرپٹ دوڑ گیا۔ لوگ منہ پھاڑے اُسے دیکھتے رہ گئے۔ ایک عجیب خوف کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک ایک پُراسرار سناٹا طاری رہا۔ بوڑھے کی آواز کی بازگشت ابھی تک گونج رہی تھی۔ پھر ایک بزرگ نے گہری سانس لی اور بولا۔

''میں بابا فرید کے خواب کو غلط نہیں سمجھتا۔ بلاشبہ یہ تباہی مقدر بن گئی ہے۔ نئے آنے والے اسے برباد کئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ بابا فرید نے غلط نہیں کہا ہے۔''

نوجوانوں کے منہ بگڑ گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد محفل اُجڑ گئی۔ لوگوں کے دل اچاٹ ہو گئے تھے۔ اور پھر ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے اور چوپال پر سناٹا چھا گیا......!

ماہرین کی ٹیم دن رات پہاڑوں کا سروے کر رہی تھی۔ مختلف ٹولیاں تھیں جو مختلف جگہوں میں پھیل جاتی تھیں۔ زمین کے بے شمار نمونے جمع کئے گئے تھے اور ان کا تجزیہ کیا جا رہا تھا۔ فائنل رپورٹ تو دارالحکومت سے ملنے والی تھی۔ لیکن یہ لوگ اس میں بھی گفتگو کر کے اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتے رہتے تھے۔ اُن کا ہیڈ کوارٹر ڈسپنسری کی عمارت میں ہی تھا۔ کیونکہ اس پورے علاقے میں ابھی تک اس سے عمدہ عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی اور یہاں پر زندگی کی ساری سہولتیں مہیا کر دی گئی تھیں۔ رات کو اچھی خاصی نشست رہتی تھی۔

ڈاکٹر فراغی بھی اُن کی محفلوں میں شرکت کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ بے حد شریف الطبع نوجوان تھا۔ ہمدردی کے قدرتی جذبے سے مالا مال۔ اُس کی ان لوگوں سے خوب دوستی ہو گئی تھی۔ اس طرح سے وہ اُن کا میزبان بھی تھا۔ اس وقت بھی کافی کی پیالیاں سب کے سامنے تھیں اور موسم کی خنکی نے اس کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔ سب اپنی اپنی لائن کی دلچسپ گفتگو میں مصروف تھے۔ لیکن ڈاکٹر فراغی کی نگاہیں آج بھی بار بار خاموش اور کھوئے کھوئے نظر آنے والے سجاد پر لگی ہوئی تھیں جو عام دنوں کی طرح آج بھی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان لوگوں کو یہاں آئے ہوئے پورے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ ان دو ہفتوں میں ہر رات نشست ہوتی تھی اور یہ علاقہ موضوعِ گفتگو رہتا تھا۔ لیکن فراغی نے آج تک سجاد کو کچھ کہتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ سب گفتگو کرتے اور سجاد صرف سنتا تھا۔ لیکن آج رات یوں لگتا تھا جیسے سجاد کچھ بولنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اور یہ اتفاق ہی تھا کہ آج کرنل رتن چند نے بھی اُسے مخاطب کر لیا۔

''میں نے ایک خاص بات محسوس کی ہے مسٹر سجاد...... براہ کرم آپ مجھ سے مخاطب ہوں گے۔''

''کیوں نہیں کرنل...... فرمایئے۔'' سجاد نے نرم لہجے میں کہا۔

''میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ ہمیشہ مشرق کی طرف جاتے ہیں۔ جبکہ دوسرے تمام لوگ اپنے اپنے طور پر مختلف علاقوں میں چھان بین کرتے رہتے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں کرنل...... اتفاق سے آپ نے پوچھ لیا۔ اور آج ہی میں اپنے طور پر کچھ انکشافات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔''

''اوہ...... واقعی یہ دلچسپ بات ہے۔'' کرنل نے مسکرا کر دوسروں کی جانب دیکھا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ سجاد کا مذاق اُڑانے اور دوسروں کو اس میں شرکت کی دعوت دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

چند لوگ مسکرا دیئے اور رتن چند کا انداز ایسا نہیں تھا جسے سب نے محسوس نہ کر لیا ہو، یہاں تک کہ خود سجاد نے بھی۔ لیکن سجاد کے چہرے کی حلیمی رخصت نہ ہوئی۔

''آپ سب لوگوں کی باتوں سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ اس علاقے کے بارے میں بہت پُراُمید ہیں۔ یعنی جو کام حکومت نے آپ کے سپرد کیا ہے اس کے بارے میں آپ کہنا چاہتے ہیں کہ اس علاقے کی فضا بے حد موزوں ہے اور حکومت اپنے منصوبے یہاں پر شروع کر سکتی ہے۔''

''کیا آپ کو اس سے اختلاف ہے مسٹر سجاد؟''

"آپ کے خیال میں یہاں پانی آسانی سے مل جائے گا اور اس زمین میں سبزہ اُگانے کی بے انتہا صلاحیت موجود ہے، نیز یہاں پختہ عمارتیں بھی بخوبی بنائی جاسکتی ہیں۔" سجاد نے سوال کرنے والے کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہماری ناقص رائے تو یہی ہے۔"

"لیکن بدقسمتی سے میں کل حکومت کو ایک خوفناک رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔" سجاد نے جواب دیا۔

"انفرادی رپورٹ؟"

"ہاں...... کیونکہ یہ میری خالص تحقیق ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ مجھ سے اس بارے میں تعاون نہیں کریں گے۔"

"براہِ کرم اس رپورٹ کی نوعیت ضرور بتائیں مسٹر سجاد۔" جیوفر نے کہا۔ یہ کسی قدر سنجیدہ انسان تھا۔

"میری رائے ہے یہ علاقہ بارود کا ڈھیر ہے جس پر کسی قسم کی انسانی آبادی کا وجود نہیں رہ سکتا۔ کسی بھی لمحے زمین پھٹ سکتی ہے اور پکتے ہوئے پتھر پھوٹ کر باہر نکل سکتے ہیں۔ ایک وسیع وعریض علاقے میں زمین اندر ہی اندر پک رہی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے یہ لاوا سالہا سال سے، ممکن ہے کئی صدیوں سے پک رہا ہو اور اب اس میں نا قابل برداشت حدت پیدا ہوگئی ہے۔ زمین کی موٹی تہہ اب اسے زیادہ عرصہ تک قید نہیں رکھ سکتی۔ گیس راستہ تلاش کر رہی ہے۔"

"واہ...... آپ بے حد خوفناک گفتگو کر رہے ہیں مسٹر سجاد۔ آپ کی آواز میں بے حد ڈرامائی تاثر ہے۔ لیکن آپ اس سنجیدگی سے مذاق بھی کر سکتے ہیں ہمیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔"

"میں نے حقیقت عرض کی ہے۔" سجاد نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس بستی کی تاریخ معلوم ہے آپ کو؟ ضروری ہوتا ہے کہ ہم جس جگہ کام کر رہے ہیں وہاں صرف اپنے کام سے کام نہ رکھیں بلکہ ان لوگوں کے بارے میں بھی ضرور معلومات حاصل کریں جہاں کام کر رہے ہیں۔"

"ہاں...... اچھی بات ہے۔ لیکن اس سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"صرف یہ کہ ہماری معلومات کے مطابق یہ لوگ سالہا سال سے یہاں آباد ہیں۔ ان کی پشتیں یہاں زندگی گزارتی آئی ہیں اور یہاں کوئی ایسی روایت نہیں ہے جس سے کسی آتش فشاں کی نشاندہی ہوتی ہو۔ اس کے علاوہ یہاں کی زمین پر ایسے کوئی آثار نہیں نظر آتے جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ کبھی یہاں آتش فشانی ہوئی۔ شاید مسٹر سجاد کسی نامانوس زمین پر نکل گئے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھتا آپ لوگوں نے میرے بیان پر کہاں سبکی محسوس کی ہے۔ حالانکہ میں نے نہایت خلوص سے اپنی معلومات آپ تک پہنچائی ہیں اور میں پابند نہیں ہوں اس بات کا کہ اپنی رائے کا اظہار کر سکوں۔ میں نے ایک تحقیقی بات کہی ہے۔ آپ بھی میری لائنوں پر کام کریں اور میری رائے کے بارے میں اندازہ لگائیں۔"

"ہم اپنی معلومات کے مطابق مطمئن ہیں سجاد صاحب۔"

"ٹھیک ہے...... میں اس کے لئے بھی آپ کو منع نہیں کر سکتا۔" سجاد خاموش ہوگیا۔ پھر وہ زیادہ دیر تک اس نشست گاہ میں نہ بیٹھ سکا تھا اور ان سب سے معذرت کر کے اُٹھ گیا تھا۔

لیکن اس کے بعد ڈاکٹر فراغی بھی ان کے ساتھ نہ بیٹھ سکا تھا اور چند منٹ کے بعد وہ بھی اپنی جگہ سے اُٹھ گیا تھا۔ اُس کا رُخ سجاد کے کمرے کی طرف تھا۔ سجاد نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا لیکن اندر تیز روشنی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سجاد سونے کے لئے نہیں لیٹا ہے۔ وہ جاگ رہا تھا۔ تب فراغی نے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے...... اندر آجایئے۔" اندر سے سجاد کی آواز سنائی دی اور فراغی نے دروازے پر زور آزمائی کی۔ گویا اُس کا اندازہ غلط تھا، سجاد نے دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ فراغی اندر داخل ہوگیا۔ سجاد اُسے دیکھ کر خلوص سے مسکرا دیا تھا۔

"آیئے ڈاکٹر فراغی...... آپ کی آمد سے مجھے خوشی ہوئی ہے۔" اُس نے پُرتپاک لہجے میں کہا۔

"شکریہ...... چونکہ میرا تعلق آپ کے پیشے سے نہیں ہے اس لئے مجھے آپ سے کوئی رقابت بھی نہیں ہے، جیسا کہ میں نے اُن لوگوں کے انداز میں پائی تھی۔" فراغی مسکرا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"حالانکہ رقابت کی ضرورت اُنہیں بھی نہیں تھی۔ لیکن اُنہیں میری منفرد رپورٹ ناگوار گزری ہے۔"

"ویسے آپ کی رپورٹ بے حد خوفناک ہے۔" فراغی نے جھرجھری لے کر کہا۔

"درست...... لیکن میں اپنی تحقیق پر شک میں گرفتار بھی نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ عنقریب اس بستی میں تباہی پھیلے گی۔ میرے اندازے کے مطابق زمین کی حدت آخری مراحل سے بھی گزر چکی ہے اور اب لاوا باہر نکلنے کے لئے سخت جدوجہد کر رہا ہے۔"

"تمہارے خیال میں سجاد، اس عمل میں کتنا وقت لگ جائے گا؟"

"افسوس، میں وقت کی صحیح نشاندہی نہیں کر سکتا۔" سجاد نے جواب دیا اور فراغی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ نیک انسان تھا۔ گو اتنے عرصے بستی میں رہا تھا، اُن کے دُکھ سکھ میں شریک تھا۔ لیکن اُس نے کبھی آتش فشانی کی کہانی نہیں سنی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے وہ انسانی زندگی سے بے پناہ ہمدردی رکھتا تھا۔ اور پھر اس ہری بھری بستی کی کوئی مصیبت اُسے قبول نہ تھی۔ چنانچہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

"مسٹر سجاد......"

"کیا بات ہے جناب؟"

"اگر میں آپ سے کہوں کہ میں آپ سے متفق ہوں؟"

"تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اور آپ کو یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ میری تحقیق غلط نہیں ہے۔"

"لیکن اس طرح ہمارے اوپر کچھ فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

”آپ کے خیال میں اس بستی کی آبادی کتنی ہوگی؟“

”دس ہزار سے زیادہ نفوس آباد ہوں گے یہاں۔“

”کیا آتش فشانی سے ان کی زندگی کو خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا؟“

”یقینی امر ہے۔“

”ایسی صورت میں کیا ہم لوگ انہیں اس آفت سے ہوشیار نہیں کر سکتے؟“

”کر سکتے ہیں۔“

”اور ہمیں کرنا چاہئے۔ ہمارے اوپر فرض ہے۔“

”جناب، آپ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

”میری خواہش ہے کہ میں بستی والوں کو اس متوقع آفت سے ہوشیار کر دُوں۔ ان سے کہوں کہ وہ پوری طرح تیار اور ہوشیار رہیں اور ذرا سے نوٹس پر اپنی جان بچانے کے لئے دوڑ پڑیں۔“

”میرے خیال میں یہ ایک نیک کام ہوگا۔“ سجاد نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بشرطیکہ بستی والے ہماری بات پر کان دھریں۔“

”وہ ہماری بات سنیں یا نہ سنیں، لیکن ہمیں اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں برتنی چاہئے۔“

”ٹھیک ہے، میں کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک اچھا کام ہوگا۔“

”کیا اس اچھے کام میں آپ مجھ سے تعاون کریں گے؟“

”بتایئے، آپ کو میرا کس قسم کا تعاون درکار ہے؟“

”میں چاہتا ہوں کل میرے ساتھ آپ بھی شریک ہوں اور ان لوگوں کو اس بارے میں بتائیں۔“

”اگر آپ کی یہ خواہش ہے تو میں انکار نہیں کروں گا۔“ سجاد نے کہا۔ اور ڈاکٹر فراغی نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

دوسرے دن وہ یہ مہم سر کرنے نکل پڑے۔ لیکن بستی میں جا کر اُنہیں بے حد مایوسی ہوئی۔ بمشکل تمام اُنہوں نے چند لوگوں کو جمع کیا اور اپنا مافی الضمیر اُنہیں بتایا۔ ان میں چند بوڑھے مخالف بھی شامل تھے۔

”خوب...... کون سی تباہی کی نشاندہی کر رہے ہو تم لوگ؟ تباہی کا تعین تو ہم نے تمہارے یہاں قدم رکھنے پر ہی کر لیا تھا۔“ ایک بوڑھے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”میری خواہش ہے جناب کہ آپ اپنی بستی کو یہ پیغام دے دیں۔“ فراغی نے کہا۔

”افسوس، تمہاری سازش کامیاب نہیں ہوگی ڈاکٹر۔ تم اس طرح یہ بستی خالی کرانے کی کوشش میں ہو۔ لیکن ہم اپنے باپ دادا کی یہ زمین نہیں چھوڑیں گے۔“

”ہماری یہ خواہش نہیں ہے۔“

”کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ جاؤ اپنا راستہ ناپو...... ہم تمہاری باتوں میں نہیں آئیں گے۔“

بستی والوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں اُنہیں شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ سجاد نے نہایت خلوص سے آخری وقت تک ڈاکٹر فراغی کا ساتھ دیا تھا اور واپسی پر فراغی کافی افسردہ تھا۔ ”افسوس، وہ ہمارے ہم خیال نہ ہو سکے۔“

”یہ کام تھا بھی مشکل ڈاکٹر۔“ سجاد نے بھی متفکرانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن اس سے زیادہ ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟“

”ہاں...... بلاشبہ ہم اتنے افراد کی زندگی کسی طور نہیں بچا سکتے۔“

دونوں ڈسپنسری پہنچ گئے۔ یہاں سارے لوگ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس آ گئے تھے اور خوب ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے۔

”اوہ مسٹر سجاد، کیا آپ نے اپنی رپورٹ حکومت کو روانہ کر دی؟ اور ہاں، آج تو ڈاکٹر فراغی بھی آپ کے ساتھ تھے۔ کیا آپ نے مسٹر فراغی کو آتش فشاں کا دہانہ دکھایا تھا؟“ رتن چند نے پوچھا۔

”افسوس، آج ان دونوں کاموں میں سے کوئی کام نہیں کیا جا سکا۔“ سجاد نے خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھر غور کر لیں مسٹر سجاد۔ حکومت کو پریشان کرنے سے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔“

”لیکن اس کا افادی پہلو بھی ہے۔“ سجاد نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا......؟“

”ممکن ہے حکومت میری رپورٹ پر کوئی باقاعدہ مشن روانہ کر دے جو آ کر میری بات کی تصدیق کر دے۔“ سجاد نے جواب دیا۔

”اوہ...... لیکن کیا نقصانات پر بھی غور کیا ہے آپ نے؟“ رتن چند نے کہا۔

”نہیں...... براہِ کرم آپ میری رہنمائی کریں۔“

”اگر حکومت واقعی آپ کی رپورٹ پر سنجیدہ ہوگئی جو بظاہر ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ یقینی امر ہے کہ وہ ہم سے بھی رابطہ قائم کرے گی اور اب اسے بھی جواب دیں گے کہ یہ صرف مسٹر سجاد کی ذاتی رائے ہے جس سے ہم متفق نہیں ہیں۔ اس کے باوجود اگر حکومت نے اپنے اطمینان کے لئے کوئی ٹیم روانہ کر دی تو آپ کی کیا پوزیشن ہوگی؟“

”نہایت محفوظ...... ممکن ہے اس ٹیم میں کچھ سنجیدہ لوگ بھی شامل ہوں۔“ سجاد نے پہلی بار برا ماننے والے انداز میں کہا اور اس کے بعد وہ حسب معمول دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ڈاکٹر فراغی بھی چونکہ آج پورا دن مصروف رہا تھا اس لئے تھکن محسوس کر رہا تھا۔ کھانا وغیرہ کھا کر وہ بھی آرام کرنے چل دیا۔ آج وہ ان لوگوں کی محفل میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔

بستر پر لیٹنے کے بعد وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ سجاد کی بات کا کسی نے مذاق اُڑایا ہو، لیکن خود فراغی اس بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں خوف کا عنصر نہیں تھا، بس وہ سجاد کی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دوسروں کی طرح اسے سرسری طور پر نہیں لے رہا تھا۔ اگر سجاد کی بات درست نکلی تو...... یہ بستی یقینی طور پر تباہ ہو جائے گی...... اور اس کے لوگ...... افسوس میں ان لوگوں کی زندگی بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ ان لوگوں کی آنکھوں پر تعصب کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر کا ذہن

کافی دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا۔ اور پھر تھکن کی وجہ سے اُسے نیند آ گئی۔

❁

آسمان پر سرِ شام ہی بادل چھا گئے تھے۔ گہرے سیاہ بادل۔ اس علاقے میں اکثر بارشیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور بہر حال بارش کہیں بھی ہو خوشگوار محسوس ہوتی ہے۔ لیکن آج نجانے کیوں فضا میں گھٹن سی تھی۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستارے بھی بادلوں کے دبیز لحاف میں دبکے ہوئے تھے اور ان کی کوئی رمق نظر نہیں آ رہی تھی۔

بوڑھے کو کوشش کے باوجود نیند نہیں آتی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا اور عجیب عجیب خیالات تھے جو اُسے جگا رہے تھے۔ حالانکہ اُس کی زندگی کے سارے مقاصد پورے ہو گئے تھے۔ ہر مرحلے سے گزر چکا تھا وہ۔ اب اُس کے چار بیٹے تھے، دو بیٹیاں تھیں جو اسی بستی کے مختلف گھروں میں بیاہی گئی تھیں۔ چاروں بیٹے بھی شادی شدہ تھے اور اُن کے بچے بھی تھے اور خوب رونق تھی اُن کے بڑے گھر میں۔ بیٹے اُس کی خدمت کرتے تھے اور بقول شخصے وہ عیش کی زندگی گزار رہا تھا...... ایسے دنوں میں نیند نہ آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اُسے نیند نہیں آ رہی تھی...... نجانے کیوں اُسے ایک گھٹن کا سا احساس سونے نہیں دے رہا تھا۔ اس گھٹن میں خوف کی آمیزش بھی تھی اور اس سے قبل بوڑھے زخان کو کبھی خوف نہیں محسوس ہوا تھا۔

اُس نے گہری سرد سانس لی اور اپنے بستر پر کروٹ بدل کر سونے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ”اب تو مجھے نیند آ ہی جانی چاہئے......“ اُس نے کہا۔ اور اسی وقت یوں لگا جیسے آسمان زمین پر گر پڑا ہو...... دونوں پاش پاش ہو گئے ہوں...... اس کے بعد ایک مفلوج کر دینے والا دھماکہ ہوا...... اور اس دھماکے کے بعد ایک سنسناہٹ...... ایک ایسی خوفناک سنسناہٹ جو کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی چیز، کوئی رقیق چیز یا تیز ہوا کہیں سے خارج ہو رہی ہو...... لیکن اس بے پناہ قوت کے ساتھ...... جس کا اندازہ مشکل تھا۔

خوفناک دھماکے سے بہت کچھ ہوا تھا۔ بستی کے درجنوں مکانات گر گئے تھے، بے شمار انسانوں کی حرکت قلب رُک گئی تھی۔ بے شمار گرے ہوئے مکانات کے نیچے دب گئے تھے...... جن میں بچے، بوڑھے، عورتیں سبھی شامل تھے۔ اُن کی دل ہلا دینے والی چیخیں گونج رہی تھیں۔ لیکن خوفناک سنساہٹ کی آواز میں یہ ساری آوازیں دب کر رہ گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کروڑوں انجن ایک ساتھ اسٹیم چھوڑ رہے ہوں...... سیٹیاں بجا رہے ہوں...... اس آواز سے رہے سہے حواس بھی گم ہوئے جا رہے تھے۔ جو لوگ گھروں میں تھے وہ چیختے ہوئے باہر بھاگ رہے تھے۔ بے مقصد، کچھ سوچے سمجھے بغیر...... اور بوڑھا زخان سوچ رہا تھا کہ کیا ہوا...... آخر یہ کیا ہوا؟ لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

خود اُس کے گھر کے حواس باختہ لوگ بھی گھر سے باہر نکل بھاگے تھے۔ لیکن کس کی منزل کہاں تھی؟ کون کہاں بھاگ جانا چاہتا تھا؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا...... چاروناچار وہ بھی بے تکے انداز میں منہ اُٹھا کر بھاگنے والوں میں شامل ہو گیا......!!

❁ ❁ ❁

فراغی بھی سو گیا تھا۔ لیکن دھماکہ اتنا شدید تھا کہ چند سیکنڈ کے لئے اُس کے اعصاب بھی سو گئے۔ وہ اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکا۔ لیکن اس دھماکے جیسی تیز آواز نے حواس جگا بھی دیئے...... اور بمشکل تمام وہ اُٹھ سکا۔ اُس کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا تھا...... سجاد کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی... دوسرے لمحے اُس نے بدن پر گاؤن ڈالا اور یہاں سے نکل بھاگا۔ اُس کا رُخ سجاد کے کمرے کی طرف تھا۔ سجاد اُسے کمرے کے دروازے پر کھڑا نظر آیا۔ وہ بے چینی سے ہاتھ مل رہا تھا۔ ”میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے تو لوگوں کو آگاہ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی۔“

”تو یہ سب کچھ وہی ہے......؟“ فراغی نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں...... آؤ...... تم آ گئے، بہت اچھا ہوا۔ ہم چھت پر چل کر دیکھیں گے۔ کیا تم خود میں ہمت پاتے ہو؟“ سجاد نے پوچھا۔

”چلو...... لیکن وہ لوگ؟“

”فراغی...... براہِ کرم اس وقت صرف اپنے بارے میں سوچو۔ میں اُن سے اپنا مضحکہ اُڑانے کا انتقام نہیں لینا چاہتا۔ لیکن انہیں اپنے طور پر جدوجہد کرنے دو...... آؤ......“ سجاد نے کہا اور فراغی کے ساتھ چھت پر پہنچ گیا۔ ”وہ...... وہ دیکھو...... وہ سیاہ غبار جو آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہے۔“

”وہ...... آہ، وہ کیا ہے؟“ فراغی نے پوچھا۔

”پسے ہوئے پتھروں کا برادہ...... گیس نے زمین توڑ دی ہے۔ یہ تڑاخا اسی کا تھا۔ اور اب لاوا اوپر کی جانب اُبھر رہا ہے...... وہ ہر چیز خالی کرا رہا ہے اور اس دہانے سے پھوٹ پڑے گا۔“

”پھر اب...... اب کیا...... کیا جائے؟“

”جان بچانے کی خواہش ہے فراغی؟“ سجاد نے پوچھا۔

”کک...... کیوں نہیں...... لیکن دوسرے لوگ......؟“ فراغی اس وقت بھی ہمدردی کے جذبات سے عاری نہیں ہوا تھا۔

”افسوس...... ہم دوسرے لوگوں کے لئے اب کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ لوگ ہم سے تعاون کرتے تو ہم لوگ ان کے لئے بہت کچھ سکتے تھے۔ انہیں مفید مشورے دے سکتے تھے۔ لیکن اب ان کے لئے کچھ کرنے کا خیال خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ آؤ فراغی...... یہاں کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“ سجاد بولا۔

”چلو...“ فراغی مایوسی سے بولا۔ ہر چند کہ وہ لوگ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار تھے۔ انہوں نے فراغی

اور سجاد کی بات نہ مان کر ان پر آوازیں بھی کسی تھیں۔ لیکن فراغی اُن کے لئے افسردہ تھا۔ وہ برق رفتاری سے نیچے آ گئے۔ یہاں رتن چند اور دوسرے تمام لوگ سراسیمہ دوڑ رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر اُداسی تھی۔

''سجاد...... مسٹر سجاد...... ہم تمہیں ہی تلاش کر رہے تھے۔'' ہاشم خان بولا۔

''اوہ...... میں حاضر ہوں۔'' سجاد نے سکون سے کہا۔

''یہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''شاید کسی ملک نے ایٹمی دھماکہ کیا ہے۔'' سجاد مسکرا کر بولا۔

''اوہ...... مسٹر سجاد، پلیز۔''

''یہ زمین کا مذاق ہے...... میرا تو یقین ہے۔'' سجاد نے کہا۔

''تمہارا اندازہ درست نکلا سجاد......''

''ایک اور پیش گوئی کروں گا۔ اور اگر آپ لوگوں نے فوری طور پر یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تو پھر کوئی آپ لوگوں کو نہیں بچا سکے گا۔ آؤ فراغی......'' سجاد نے فراغی کا ہاتھ پکڑا اور ڈسپنسری کے بیرونی گیٹ کی طرف دوڑ پڑا۔ سب لوگ ہکا بکا رہ گئے تھے...... لیکن اُن لوگوں نے اس وقت مڑ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ دوسرے لوگوں کی کیا کیفیت ہے؟ ویسے کچھ لوگ اُن کے پیچھے ہی دوڑ پڑے تھے۔

ڈسپنسری کے گیٹ سے نکل کر سجاد چند ساعت کے لئے رُکا اور پھر اُس نے ایک طرف کا رُخ اختیار کر لیا۔ ''تیزی سے دوڑو فراغی...... کوئی بھی لمحہ آتش فشاں بن سکتا ہے۔'' اور اب فراغی کو دوڑنے میں کوئی عار نہیں تھا...... بات صرف اپنی زندگی کی تھی۔ دوسروں کی زندگی اب وہ نہیں بچا سکتا تھا اس لئے اب اُس کے انداز میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

وہ بے تحاشہ دوڑ رہے تھے...... یہ راستے فراغی کے دیکھے ہوئے تھے۔ وہ سجاد کی مدد بھی کر رہا تھا۔ سجاد کی نگاہ اُس سیاہ بادل کی جانب بھی تھی۔ وہ بار بار مڑ کر اُسے دیکھنے لگتا تھا۔ پھر وہ ایک بلند جگہ رُک گئے...... سجاد نے اُسے روکا تھا۔

''رُک کیوں گئے سجاد......؟'' فراغی نے پوچھا۔

''میں اب تک اندازے سے دوڑتا رہا تھا۔ ہم نے اپنی دانست میں ایک ایسا رُخ اختیار کیا ہے جو ہمارے لئے محفوظ ہے۔ لیکن اس کے باوجود لاوے کی سمت کا اندازہ ضرور لگانا ہے۔''

''اوہ، میں سمجھ گیا۔''

''لاوا بہہ نکلے تو ہم اس کی مخالف سمت میں بھاگیں گے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا اس کا رُخ کس طرف ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارا تعاقب کرے۔'' سجاد نے کہا۔

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔'' فراغی نے جواب دیا۔ اور پھر وہ تاریکی میں اُٹھتے ہوئے سیاہ غبار کو دیکھتے رہے جو تاریکی میں تحلیل ہو رہا تھا اور کان پھاڑ دینے والی آواز کے ساتھ فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ اُس کا حجم بے حد وسیع تھا اور وہ انتہائی خوفناک انداز میں پھیلتا جا رہا تھا...... پھر اس غبار میں سرخ زبانیں بھی لپکنے لگیں اور سجاد نے ایک گہری سانس لی۔

''دیکھا تم نے......؟'' اُس نے فراغی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہاں...... سیاہ غبار میں سرخ نشانات۔''

''یہ آگ کے نشان ہیں۔''

''اوہ، آگ......؟''

''ہاں...... لاوا دہانے تک پہنچ چکا ہے اور اب یہ سیاہ غبار ختم ہو جائے گا۔''

''گویا گیس خارج ہو چکی ہے؟''

''ہاں......'' سجاد نے جواب دیا۔ فراغی سہمی ہوئی نگاہوں سے اُس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہا تھا جس کے بارے میں اُس نے صرف سنا ہی تھا۔ اُس نے کسی آتش فشاں کو آگ اُگلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس آتش فشاں کا کوئی باقاعدہ دہانہ تھا۔ بس زمین پھوٹ کر سیاہ غبار نکل پڑا تھا۔ بہت خوفناک بات تھی۔ سجاد نے کس قدر درست اندازہ لگایا تھا اور جن لوگوں نے اُس کا مذاق اُڑایا تھا وہ سب لوگ اس وقت کتنے شرمندہ ہو رہے ہوں گے؟ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بستی والے کیا کریں گے؟ فراغی کا دل اب بھی اُن کے لئے دُکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بستی کے لوگ اتنی تیزی سے جان نہیں بچا سکیں گے۔ کیونکہ اُنہوں نے پہلے سے کوئی تیاریاں نہیں کی تھیں۔ اُنہیں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ نہ وہ اپنا سامان لے سکیں گے اور نہ ہی اپنے بچوں کو سنبھال سکیں گے۔ کتنی معصوم جانیں ضائع ہو جائیں گی...... لیکن اس میں غلطی اُن کی بھی تھی۔ انہوں نے تو انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

فراغی یہ خیالات دل میں رکھے ہوئے ان سرخ زبانوں کو دیکھ رہا تھا جو اب چنگاریاں چھوڑنے لگی تھیں۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے آتش بازی ہو رہی ہو...... سرخ اور خوفناک آتش بازی...... جس کا حجم زیادہ سے زیادہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوفناک منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا...... پگھلے ہوئے پتھر جن سے بھاپ اُٹھ رہی تھی، پانی کی شکل میں زمین پر اُبلنے لگے اور لاوا ایک سمت بہنا شروع ہو گیا۔

''بھاگو......'' سجاد نے کہا اور اُنہوں نے دوسری سمت اختیار کر کے بھاگنا شروع کر دیا...... لاوے کا پھیلاؤ انتہائی تیز تھا۔ لاوا چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا...... جس طرف وہ پھیل رہا تھا وہاں موجود ہر چیز خاکستر ہو رہی تھی۔ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اتنی تیزی سے پھیلتا ہوا لاوا کب اُن کے قدموں کے نزدیک پہنچ جائے...... وہ تیزی سے دوڑ رہے تھے اور پیچھے دوڑنے والوں کی آوازیں اور چیخیں بھی سن رہے تھے۔ بہت سے لوگ لاوے کی لپیٹ میں تھے اور سرخ لاوا اُن کے بدن کو آتشیں دھبے میں تبدیل کر چکا تھا......

سجاد اور فراغی بھاگے جا رہے تھے۔ اُنہوں نے کچھ اور لوگوں کو بھی دیکھا جو اُن سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ بستی والے چیختے چلاتے دوڑ رہے تھے۔ چاروں طرف سے اُن پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی...... فراغی نے اب آنکھیں بند کر لی تھیں اور اُس نے کچھ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ بس وہ بے تحاشہ دوڑ رہے تھے، ٹھوکریں کھاتے ہوئے، گرتے ہوئے، سنبھلتے ہوئے...... سجاد اُس کے ساتھ تھا۔ سجاد کی ذہانت نے اس وقت انتہائی اہم کارنامہ انجام دیا تھا...... ورنہ فراغی خود اپنی جان بھی بچا نہیں سکتا تھا۔ اس وقت وہ بستی والوں کا

غم بھول گیا تھا۔ ہر شخص فطری طور پر اپنے آپ کو بچانے کا خواہشمند ہوتا ہے۔

پھر وہ ایک درّے میں پہنچ گئے۔ دونوں طرف بلند و بالا پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں میں سیاہ دھبے نظر آ رہے تھے جو یقینی طور پر غاروں کے دہانے تھے۔ وہ درّے میں دوڑتے رہے۔ خاصا تنگ درّہ تھا، جس میں بہت کم لوگ دوڑ رہے تھے۔ ویسے اُنہوں نے محسوس کیا کہ کچھ دوڑنے والے اُن سے آگے نکل گئے ہیں۔ یہ بات اچھی بات تھی کہ ان لوگوں نے اپنی مدد آپ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب نجانے یہ بستی کے لوگ تھے یا اُس سروے ٹیم کے لوگ جو یہاں سروے کرنے آئے تھے؟

دفعتہً ایک خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی اور زمین ہلنے لگی...... وہ لوگ بری طرح لڑکھڑا کر نیچے گر رہے تھے۔ اور پھر اُنہوں نے اپنے سروں پر بلند آوازیں سنیں دیو پیکر پتھر اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ درّہ اتنا تنگ تھا کہ پتھر سیدھے اُن کے سروں پر آتے۔ یہ انتہائی خوفناک صورتحال تھی۔ سجاد نے دہشت زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر اُس نے فراغی کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں بادل نخواستہ ایک غار کے دہانے کی طرف دوڑے کہ ممکن ہے غار اندر سے صاف ستھرا ہو۔ ممکن ہے اس کے اوپر کا پہاڑ مضبوط ہو اور انہیں کہیں نکلنے کا موقع مل جائے۔ دونوں بے تحاشہ غار کی طرف دوڑنے لگے...... اور بہت سے پتھر اُن کے نزدیک آ کر گرے۔ بس زندگی تھی جو بچ گئے تھے۔ ویسے اُنہوں نے پیچھے آنے والوں کی پتھروں میں دبنے کی آوازیں بھی سنی تھیں...... گویا بے پناہ تباہی پھیلی تھی...... خوفناک تباہی......

وہ غار کے دہانے میں چھلانگ لگا کر اندر داخل ہو گئے اور پتھروں سے اُن کی جان بچ گئی۔ زمین ہل رہی تھی اور اس طرح ہل رہی تھی جیسے بچے کو پنگوڑے میں ڈال کر ہلایا جائے۔ وہ اُٹھنے کی کوشش میں لگے رہے تھے۔

"فراغی...... اُٹھنے کی کوشش مت کرو۔" سجاد نے کہا اور فراغی زمین پر لیٹ گیا۔ اُس نے چھپکلی کی طرح دونوں ہاتھ زمین پر پھیلا دیئے تھے اور سر کو پتھر پر رکھ دیا تھا۔ زمین کے جھٹکوں سے اُن کو ہلکی ہلکی چوٹ لگ رہی تھی۔ لیکن بہرحال یہ چوٹ کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ سجاد خود بھی رینگتا ہوا اُس کے نزدیک پہنچ گیا۔ پھر اُنہوں نے بہت سے قدموں کی آوازیں سنیں۔ گویا دوسرے لوگوں نے بھی اسی غار کا انتخاب کیا تھا۔ انہوں نے اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ دوڑتے ہوئے لوگ اُنہیں کچلتے ہوئے گزر جائیں گے۔ وہ اسی طرح زمین پر پڑے رہے اور ان کی پشت، ٹانگوں اور سر کی طرف سے لوگ گزرتے رہے۔ کافی لوگ اس درّے میں آئے تھے۔ سجاد اور فراغی دونوں کو اس بات کی خوشی تھی کہ آنے والے صرف ٹیم کے افراد ہی نہیں بلکہ اُن میں بستی کے لوگ بھی شامل تھے۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ پہاڑ اپنی جگہ قائم رہے اور زلزلہ ختم ہو جائے۔

گڑگڑاہٹیں جاری رہیں اور زلزلہ آتا رہا۔ ہلکی ہلکی بھاپ کی آنچ بھی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ گویا لاوا بہتا ہوا اس سمت میں آ نکلا ہے...... خوفناک تباہی پھیلی ہو گی۔ اور اس تباہی کے تصور سے اُن کے ذہن سن ہوئے جا رہے تھے۔ نجانے کب تک وہ زمین پر اسی طرح پڑے رہے۔ پھر اچانک ایسا سکوت چھا گیا جیسے ایک خوفناک طوفان اچانک تھم گیا ہو...... کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا

جیسے سینے سے اُچھل کر باہر آ جائے گا۔ اب غار میں کوئی آواز نہیں تھی۔ سب خاموش تھے......

فراغی اور سجاد خاموشی سے اپنی جگہ لیٹے ہوئے تھے اور انتظار کر رہے تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ لاوا کہیں غار کے اندر داخل نہ ہو جائے۔ اُن میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ غار کے دہانے تک جا کر باہر کا منظر دیکھتے۔ زلزلے کے خوفناک جھٹکے بند ہو چکے تھے...... اور کافی دیر سے نیا جھٹکا نہیں لگا تھا۔ تب فراغی نے بڑی مشکل سے زبان ہلائی۔ اُس نے سجاد کو پکارا تھا۔

"ہاں...... میں ہوش میں ہوں فراغی......" سجاد نے جواب دیا۔

"حواس قائم کرنا سجاد...... ورنہ ماحول حواس کھو دینے والا ہے۔"

"اوہ...... میں اتنے کچے دل کا نہیں ہوں۔" سجاد نے جواب دیا اور فراغی نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ دونوں اُٹھ کر بیٹھنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اور پھر جب کافی دیر ہو گئی تو فراغی نے آہستہ سے کہا۔

"سجاد، محسوس ہوتا ہے کہ زلزلہ رُک گیا ہے۔"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا فراغی......" سجاد نے جواب دیا۔

"اوہ...... جھٹکے پھر آ سکتے ہیں؟"

"ہاں...... ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ صدیوں سے رُکا ہوا لاوا نجانے کب تک بہے؟ اور وہ زمین توڑ کر جب باہر نکلے گا تو ظاہر ہے دھماکے ہوں گے اور زمین ہلے گی۔"

"آہ...... پھر تو اس پہاڑ کا بھی اپنی جگہ قائم رہنا مشکل ہے۔"

"اوہ...... فراغی، ان باتوں کو مت سوچو۔ زندگی بہرصورت ایک بار ختم ہونی ہے...... اور اسے ختم ہونا ہی ہے تو ہو جائے۔ ہم اسے نہیں روک سکتے۔ بہرصورت ہم نے اپنے طور پر زندگی بچانے کی کوشش کی ہے، باقی ہمارے ہاتھ سے باہر کی بات ہے۔"

"ٹھیک ہے میرے دوست...... لیکن یہ تپش...... آہ، یہ دُھواں کیسا ہے؟"

"دُھواں......" سجاد نے آہستہ سے کہا۔ "میرے دوست تم اس منظر کو برداشت نہیں کر سکو گے۔"

"کیا مطلب......؟"

"مجھے یقین ہے کہ بہتا ہوا لاوا اب اس درّے میں پہنچ چکا ہے جس میں اس غار کا دہانہ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تھوڑی دیر بعد اس غار کے دہانے تک پہنچ جائے۔"

"آہ...... جلتے ہوئے پتھر ہمارے جسموں کا کیا حال کریں گے؟" فراغی نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ہاں...... بالکل یہی کیفیت ہو گی، جیسے تنور میں روٹی لگا دی جاتی ہے۔" سجاد نے ہلکے سے تمسخرانہ انداز میں کہا اور فراغی حیران نگاہوں سے اس جانب دیکھنے لگا۔ حالانکہ تاریکی کی وجہ سے اُس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی لیکن پھر بھی وہ محسوس کر سکتا تھا کہ سجاد نے یہ جملے تمسخرانہ انداز میں کہے ہیں۔ گویا یہ چٹان دار آدمی اس وقت بھی مذاق کی حس رکھتا ہے...... فراغی کو خود پر شرم آنے لگی۔ وہ اس قدر خوفزدہ کیوں ہے؟ آخر سجاد بھی تو انسان ہے اور وہ بھی تو دوسروں کی مانند زندگی سے محبت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس بات نے فراغی کے ذہن میں کافی حد تک بیداری پیدا کی۔

''سجاد......'' تھوڑی دیر کے بعد اُس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا بات ہے فراغی؟''

''تپش بڑھتی جارہی ہے۔''

''ہاں......شاید لاوا غار کے دہانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

''پھر......ہمیں کوئی اور کوشش کرنی چاہیے۔''

''بے کار ہوگی فراغی......'' سجاد نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''کیوں......آخر کیوں؟''

''پگھلتے ہوئے پتھروں کے سیلاب میں کیا ہم اپنی جان بچاسکیں گے؟''

''اگر وہ ہمارے جسموں تک نہ پہنچے، تب بھی؟''

''ہاں......تب بھی۔ کیونکہ اس سے اُٹھنے والی گیس ہمارے دم گھونٹ دے گی۔''

''اور پھر......؟'' فراغی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں فراغی...... پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا خیال ہے میری بات تمہاری سمجھ میں آ جانی چاہیے۔''

''میں سمجھ گیا ہوں۔'' فراغی نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور پھر بولا۔ ''تب آؤ، ہم دیکھیں تو کہ لاوا کتنی دُور تک پہنچ چکا ہے اور غار کی طرف بڑھنے کی رفتار کیا ہے؟''

اب سجاد کی حیرانی کی باری تھی۔ لیکن بہرصورت اُس نے بھی اس دلچسپ منظر کو نگاہوں سے کھونا پسند نہ کیا۔ ''اُٹھو......'' اُس نے آہستہ سے فراغی سے کہا اور دونوں اُٹھ گئے۔ دونوں جیالے غار کے دہانے کی طرف بڑھ گئے۔ اور اچانک اُنہوں نے محسوس کیا کہ اُن کے چہرے روشن ہوگئے ہیں...... غار میں روشنی پھیل گئی ہے۔ اور یہ روشنی جلتے ہوئے سرخ پتھروں کی تھی...... وہ دونوں خوف سے سہم گئے۔ لیکن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے مضبوطی سے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ کسی بھی لمحے اُنہیں انتظار تھا کہ کھولتا ہوا لاوا اُن کے جسموں سے آ چپکے گا اور وہ جل کر بھسم ہو جائیں گے...... لیکن اُنہوں نے جب باہر کا منظر دیکھا تو اُن کے جسم لرز گئے......

لاوا کسی تیز رفتار نالے کی مانند بہہ رہا تھا۔ غار کا دہانہ کافی اُونچا تھا۔ گویا اس بات کا امکان تھا کہ فی الحال اس وقت تک وہ غار کے دہانے تک نہ پہنچے جب تک کہ اس سیلاب کا زور نہ بڑھ جائے۔ کھولتے ہوئے پتھر ہر چیز کو خاکستر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور روشنیوں نے پہاڑوں کو منور کر دیا تھا۔ عجیب بھیانک منظر تھا جس کو دیکھ کر ذہن پر قابو رکھنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ خاموش کھڑے لرزتے رہے۔ لاوا بہتا رہا اور اس کی تپش اُن کے جسموں تک پہنچتی رہی۔ اُن کے بدن پسینے سے تر ہو گئے تھے۔

تب سجاد نے گہری سانس لی اور فراغی بھی چونک پڑا۔

''کیا بات ہے سجاد......؟'' فراغی نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''فراغی، ممکن ہے لاوا اس غار کے دہانے تک نہ پہنچ سکے۔''

''ہاں......ابھی وہ کافی نیچے بہہ رہا ہے۔ اور اس کی مقدار بڑھتی نہیں محسوس ہو رہی۔'' فراغی نے کہا۔

''دراصل یہ لاوا باقاعدہ کسی چوٹی سے نہیں بہا۔ بلکہ زمین کے دہانے سے پھوٹ نکلا ہے، اسی لئے اس نے چاروں طرف پھیلاؤ اختیار کرلیا ہے۔ اگر یہ کسی چوٹی سے بہتا تو اس کا رُخ ایک طرف ہوتا اور وہ سمت جو بھی ہوتی وہاں پر اس کی مقدار بے پناہ ہوتی۔''

''گویا یہ تو اچھی بات ہے۔ خدا کرے اس کا رُخ بستی کی طرف نہ ہوا ہو......''

''بستی کی طرف......؟'' سجاد نے گہری سانس لی۔

''ہاں......کیوں؟''

''بس فراغی، تم ڈاکٹر ہو۔ تم نے محسوس نہیں کیا؟''

''کیا......؟'' فراغی نے پوچھا۔

''بستی کس قدر نشیب میں تھی، تمہیں اندازہ ہے؟''

''آہ......گویا تمہارا مطلب ہے لاوا بستی کی طرف ضرور بہا ہوگا؟''

''ہاں میرے دوست......میرا یہی مطلب ہے۔'' سجاد نے جواب دیا۔

فراغی کے چہرے پر تاسف کے آثار جھلک رہے تھے۔ اپنی زندگی بچنے کی اُمید پیدا ہوگئی تھی اس لئے ان لوگوں کا غم پھر سینے میں اُبھر آیا تھا اور وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ خوفناک لاوا بہتا رہا......اور وہ کھڑے اُس سرخ سیلاب کو دیکھتے رہے۔

دفعتہً گڑگڑاہٹ پھر پیدا ہوئی......اور یہ دونوں غار کے کنارے سے گرتے گرتے بچے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے اپنے جسموں میں توازن پیدا کیا تھا ورنہ ذرا سی لغزش سے وہ کھولتے ہوئے پتھروں پر جا پڑتے۔ بڑے بڑے پتھر پھر اپنی جگہ چھوڑنے لگے......وہ آگ کے پانی میں گرتے تو سرخ لاوا کافی اُونچا اُچھل جاتا......اس سے اس کی شدت کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ دونوں کافی پیچھے ہٹ گئے۔ قدموں پر کھڑے رہنے کی ہمت نہیں تھی۔ زمین اتنے زور سے ہل رہی تھی کہ قدم جمانا مشکل تھا۔ وہ پھر اوندھے لیٹ گئے۔ دل چاہ رہا تھا کہ زور زور سے چیخنے لگیں۔ لیکن دونوں ہی اپنی کمزوری پر قابو پانے میں کوشاں تھے...... سرخ روشنی اب بھی اُن تک پہنچ رہی تھی۔

لیکن اچانک روشنی ختم ہوگئی......اس کے ساتھ ہی بھاپ بھی ختم ہوگئی۔ ان دونوں نے یہ تبدیلی بخوبی محسوس کی تھی، اور اس پر وہ اپنی آوازیں بند نہیں رکھ سکے۔

''فراغی......''

''ہاں سجاد......بے فکر رہو، میں بے ہوش نہیں ہوں گا۔'' فراغی کی آواز سنائی دی۔

''میں تمہاری دلیری اور تمہارے اعصاب کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکوں گا۔''

''شکریہ سجاد......''

''کچھ محسوس کیا؟''

''ہاں......کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔''

''میرا خیال ہے غار کے دہانے پر کوئی وزنی چیز آ گری ہے۔''

''اوہ...... گویا ہماری حفاظت کا انتظام قدرت کی طرف سے ہوا ہے۔''

''ابھی کچھ نہ کہو فراغی......''

''کیا مطلب؟''

''تم کیا کہہ سکتے ہو...... کیا تمہیں یقین ہے کہ لاوے کی مقدار نہیں بڑھے گی؟ اور تم اس زلزلے کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہو؟ کیا اس کی شدت اس غار کو برباد نہیں کر سکتی؟''

''جو کام ابھی تک نہیں ہوا اس سے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' فراغی نے کہا۔ اور سجاد نے اس سے اتفاق کیا۔

''ہاں...... یہ بات تو ٹھیک ہے۔''

دونوں پھر خاموش ہو گئے اور قیامت کی رات آہستہ آہستہ گزرنے لگی...... کبھی کبھی یوں لگتا جیسے بڑھ رہا ہو۔ سنسناہٹ تیز ہوتی جا رہی تھی...... اُن کے سینے خوف سے پھٹنے لگے تھے۔ لیکن پھر خاموشی جاتی۔ پھر زمین ہلتی تو یوں لگتا جیسے غار کی چھت بیٹھ رہی ہو۔ ایک دو بار دراڑوں سے مٹی کی بارش بھی تھی اور انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کا آخری وقت قریب آ گیا ہے...... لیکن...... آخری وقت نہیں آیا...... مصیبت قائم رہی تھی...... غار میں کبھی کبھی وحشت زدہ چیخیں سنائی دے جاتی تھیں۔ دو تین بار کے رونے کی آوازیں سنائی دیں...... اور ان آوازوں کو سن کر فراغی کو ایک عجیب خوشی کا احساس ہوتا جو لوگ بچ گئے تھے، وہی کافی تھا۔

بالآخر زلزلہ تھم گیا...... تقریباً دو گھنٹے گزر گئے تھے اور اب کوئی جھٹکا نہیں لگا تھا۔ لاوے کے بہنے کی آواز بھی تھم گئی تھی۔ اور پھر یہ خاموشی طویل تر ہوتی گئی۔ باہر شاید سکوت چھا گیا تھا۔ پھر غار کی دراڑوں سے روشنیوں کی لکیریں اندر رینگنے لگیں۔ گویا اس خوفناک رات کی صبح ہو گئی تھی۔ سورج نکلنے لگا تھا...... پھر سورج نکل آیا...... پھر اُنہوں نے غار کا منظر دیکھا۔

انتہائی کشادہ غار تھا۔ اس کی چھت بے حد بلند تھی اور اس میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں جن سے روشنی رینگ رہی تھی۔ اب اتنی روشنی پھیل گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کی شکلیں بھی دیکھ سکتے تھے۔ فراغی کی بے تاب نگاہوں نے غار میں آنے والوں کو دیکھا۔ چھ عورتیں، آٹھ مرد اور پانچ بچے تھے جن کا تعلق بستی سے معلوم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ رتن چند، ہاشم خان اور ان کے ساتھی بھی بیٹھے ہوئے تھے...... ان کے ٹیم کا اور کوئی فرد غار میں موجود نہیں تھا۔ گویا سب...... یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے کسی اور غار میں پناہ لے لی ہو۔

سب کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اُن کی آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا جیسے سب کے سب حواس کھو بیٹھے ہیں اور ان کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہو...... فراغی ایک ایک کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اُس کے دل میں محبت اور ہمدردی کا جذبہ پھڑپھڑانے لگا۔ آخر وہ ڈاکٹر تھا۔ فطری طور پر انسانوں کا ہمدرد۔ چنانچہ وہ ہمت کر کے اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُن کے قریب پہنچ گیا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے...... ہماری زندگیاں محفوظ ہو گئی ہیں...... ہم بچ گئے ہیں۔''

سننے والوں نے کوئی جواب نہیں دیا...... کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی اُس کی طرف نہیں دیکھا جیسے اُن کے کان بہرے ہوں۔ تب فراغی نے پیار سے ایک بچی کو گود میں اُٹھا لیا اور اُسے پیار کرنے لگا۔ بچی کی ماں نے مضطربانہ انداز میں اُسے دیکھا اور پھر فراغی کو میزبان پا کر مطمئن ہو گئی۔ لیکن اُس کی گہری گہری وحشت خیز سانسیں گونجتی رہی تھیں۔ تب رتن چند اور دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ تینوں بھی اُن کے پاس پہنچ گئے تھے۔ لیکن اُنہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ سجاد بھی آہستہ آہستہ اُن کے قریب پہنچ گیا۔

''ہیلو سجاد......'' رتن چند پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''ہیلو رتن چند......'' سجاد کے لہجے میں نرمی تھی۔

''اب شرمندگی کے اظہار کی ضرورت رہ جاتی ہے...... کیا ہماری تباہ حالی، ہماری شرمندگی کا مظہر نہیں ہے؟''

''اوہ ڈیئر رتن چند...... براہِ کرم ایسی گفتگو نہ کرو۔ میرے ذہن میں اب ان باتوں کا کوئی خیال نہیں ہے۔''

''عظیم لوگ فطری طور پر نرم مزاج ہوتے ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔''

''ذہن سے سارے خیالات نکال دو رتن چند۔''

''شکریہ سجاد...... لیکن اب کیا حال ہے؟''

''کم از کم آج کا دن ہمیں خاموشی سے اس غار میں گزارنا پڑے گا۔''

''وہ کس لئے سجاد؟...... براہِ کرم میری بات کو محسوس مت کرنا...... میں صرف اپنی معلومات کے لئے یہ پوچھ رہا ہوں۔''

''لاوا ٹھنڈا ہونے میں وقت لگے گا اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آتش فشاں ساری آتش فشانی کر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے رات پھر خوفناک ہو۔''

''اوہ...... گویا اب بھی خطرہ ہے؟''

''ہاں...... نہیں کہا جا سکتا کہ صدیوں سے پکنے والا لاوا کتنی مقدار رکھتا ہے۔''

''لیکن مسٹر سجاد...... اگر یہ رات بھی گزشتہ رات کی طرح خوفناک ہوئی تو شاید یہ غار گڑگڑاہٹ برداشت نہ کر سکے اور ممکن ہے اس کی چھت نیچے آ رہے۔''

''ہر چیز ممکن ہے مسٹر رتن چند...... لیکن بہر صورت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ فی الوقت ہم اس غار میں رہیں۔''

''ٹھیک ہے...... اب ہم آپ کی باتوں سے انحراف نہیں کریں گے مسٹر سجاد......'' رتن چند نے کہا۔

''میں صرف آپ کو اپنی معلومات کی باتیں بتا رہا ہوں۔ باقی یہاں پر کوئی ایسا خیال میرے ذہن میں نہیں ہے کہ میں کسی کو کوئی ہدایت دُوں۔ آپ چاہیں تو باہر نکل کر حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ لیکن میرا اپنا اندازہ یہی ہے کہ گرم لاوا اتنی جلدی سرد نہیں ہو جائے گا۔ ابھی اگر گرم لاوا سرد ہو گیا ہو تو خوفناک

پتھروں کی دلدل ہماری منتظر ہوگی۔"

"اوہ......" رتن چند کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "خدا کی پناہ......کیا بھیانک رات گزری ہے۔"

"ہاں......" اس کے ساتھ ہاشم خان نے جواب دیا اور پھر بولا۔ "کاش، ہم مسٹر سجاد کی باتوں کو نہ سمجھتے۔"

"اب ان باتوں کا کیا وقت ہے مسٹر ہاشم خان؟ براہِ کرم، خاموش ہو جائیں اور اس موضوع پر گفتگو نہ کریں۔" سجاد نے کسی قدر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور پھر اُن کی نگاہیں ان لوگوں کی طرف اُٹھ گئیں جو بستی کے لوگ تھے اور ابھی تک وحشت زدہ بیٹھے ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

"افسوس......ان بیچاروں کا کیا، کیا جائے؟ نجانے ان میں سے کوئی اور زندہ بچ سکا یا نہیں؟" ہ... نے افسردہ انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے ہم ان لوگوں کو تسلی دیں۔" فراغی نے مداخلت کی۔

"کیا تسلی دے سکتے ہیں مسٹر فراغی؟ کیا کہیں گے ان سے؟ بہر صورت اب تو جو کچھ ہونا ہو چکا ہے ہو ہی چکا ہے......اب تو انہیں بھی اس پر صبر کرنا ہوگا۔ ہم نے ان کے ساتھ بھی برا سلوک نہیں کیا۔ ہم نے انہیں اطلاع دی تھی کہ بستی خوفناک تباہی کا شکار ہونے والی ہے۔ یہ لوگ اپنی زندگی بچانے کا بندوبست کر لیں۔ لیکن انہوں نے اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ سجاد نے کہا۔

"ہم سب ہی بدقسمت ہیں۔"

"میرا خیال ہے اب قسمت کو کوسنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں زندگی کی تدبیریں کرنی چاہئیں۔ را... کی خوفناک تباہی ہمیں اپنا نوالہ نہیں بنا سکی تو اب اس غار کے اندر ہم موت کا انتظار نہیں کریں گے یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کریں گے۔ پوری پوری کوشش......اور مجھے یقین ہے کہ اس میں ناکام نہیں رہیں گے۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ مسٹر فراغی۔" رتن چند نے کہا۔

اور پھر وہ وحشت زدہ لوگوں کے نزدیک پہنچ گئے......فراغی نے ایک شخص کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے دوستو۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ جو کچھ گزر گیا اسے بھول جانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ بہت جلد یہاں سے نکلنے کا بندوبست کریں گے۔"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لگتا تھا جیسے ان کی باتیں ان لوگوں کی سمجھ میں نہ آ رہی ہوں۔ تب ... نے فراغی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرا خیال ہے ان لوگوں کے اعصاب کافی کشیدہ ہیں......انہیں کچھ سمجھانا مشکل ہی ہوگا۔"

"پھر ان کے لئے کیا، کیا جائے؟"

"بس انہیں خاموش رہنے دیں......خود بخود جب ان کے اعصاب درست ہوں گے تو یہ حواس واپس آ جائیں گے۔" فراغی نے کہا۔ اُس کی نگاہیں غار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی اور نوجوان مرد بھی...... بوڑھا ایک بھی یہاں تک نہ پہنچ سکا تھا......عورتیں بچوں کو اُٹھا لائی تھیں ورنہ شاید بچے بھی اس غار تک سفر نہ کر سکتے۔ نجانے وہ کس طرح یہاں تک پہنچے تھے؟ لیکن شاید جان بچانے کی کوشش میں انہوں نے بے حد پھرتی سے کام لیا تھا۔ اور یہی بات شاید ان کی زندگی کا باعث بن گئی تھی۔

دن گزرتا رہا......سب خاموش بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی یہ لوگ آپس میں گفتگو کرنے لگتے تھے لیکن یہ گفتگو بے معنی ہوتی تھی۔ ان سب کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آئندہ اقدام کیا ہوگا؟ وہ باہر نکلنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ باہر کا ماحول بدستور خراب تھا......اُنہیں معلوم تھا کہ باہر بڑی تباہ کاری پھیلی ہوگی۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آتش فشاں کا زور ٹوٹ گیا ہے یا کچھ لاوا باقی ہے......؟

پورا دن بھوک اور پیاس میں گزر گیا، پھر رات ہو گئی۔ لیکن رات پُرسکون تھی اور غیر متوقع طور پر پُرسکون گزر گئی۔ گویا آتش فشاں اپنی آتش فشانی کر کے سرد ہو چکا تھا۔

دوسری صبح انہوں نے اطمینانی کی گہری گہری سانسیں لیں اور پھر باقاعدہ اس سلسلے میں ان لوگوں کی میٹنگ شروع ہو گئی۔

"اب کیا کرنا چاہئے......؟" فراغی نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے عورتوں اور بچوں کو ابھی اسی غار میں رہنے دیا جائے...... غار کے دہانے پر کوئی پتھر آ پڑا ہے۔ ہم سب مل کر اسے ہٹائیں اور باہر نکلیں۔ اور اگر لاوا ٹھنڈا ہو چکا ہے جس کا اندازہ بہر صورت ایک آدمی کو نیچے اُتر کر کرنا ہی ہوگا تو پھر ہم ان بدنصیب لوگوں کو تلاش کریں گے۔ ممکن ہے ان غاروں میں کچھ دوسرے لوگ بھی موجود ہوں۔ بستی کا حال دیکھیں کہ کیا ہوا......اور اگر خدانخواستہ ابھی تک کچھ برے اثرات موجود ہیں تو پھر ہم واپس اسی غار میں آ جائیں گے۔ عورتوں کو ساتھ لے کر تھکنا بہتر نہ ہوگا......اس لئے ان کا یہیں رہنا ٹھیک ہے۔" سجاد نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے......لیکن اس کے لئے کیا ہم ان مردوں کو تیار کر سکیں گے؟" رتن چند نے پوچھا۔

"تیار ہی کرنا پڑے گا اُنہیں......ورنہ اُن کی مرضی......ہم تنہا بھی جا سکتے ہیں۔ فراغی نے کہا۔

"ٹھیک ہے......آپ ان سے بات کریں مسٹر فراغی۔" ہاشم خان نے کہا اور فراغی مردوں کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے نہایت موثر انداز میں کہا۔

"دوستو...... جو تباہی ہوئی ہے اس میں آپ تنہا نہیں ہیں، ہم سب اس میں شریک ہیں اور آپ کو اندازہ ہے کہ ہم خود بھی اسی تباہی کا شکار ہیں۔ میری رائے ہے کہ اس مصیبت کا نہایت پامردی سے مقابلہ کریں۔ اس طرح بیٹھے رہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہمیں ہمت کرنا ہی ہوگی۔"

مرد جو اتنا وقت گزر جانے کے بعد خود پر قابو پا چکے تھے ہراساں نگاہوں سے فراغی کو دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک آدمی کی آواز اُبھری۔ "مگر ہم کیا کر سکتے ہیں مسٹر فراغی؟"

"زندگی کی جدوجہد......ہمیں بہر حال یہاں سے نکلنا ہے۔"

''کہاں جائیں گے یہاں سے نکل کر...... اب ہمارا کون سا ٹھکانہ ہے؟ ہماری بستی تباہ ہو چکی ہے۔ ہمارے گھر برباد ہو چکے ہوں گے۔ اور ہمارے لوگ......؟'' ایک نوجوان نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''وہ لوگ اپنی نفرت کا شکار ہو گئے۔ اگر وہ ہماری باتوں پر توجہ دیتے تو شاید ان کی زندگی بچ جاتی۔ بستی تباہ ہو جاتی، سامان تباہ ہو جاتا لیکن انسان بچ جاتے۔ تم خود بتاؤ ان لوگوں کے لئے کیا، کیا جا سکتا تھا؟''

''ہاں صاحب...... غلطی ہوئی تھی۔ لیکن اب...... اب کیا ہو سکتا ہے؟''

''جو بچ گئے ہیں انہیں اپنی زندگی کی جدوجہد کرنی ہے...... ہم ان غاروں میں بھوکے پیاسے جا نہیں دے سکتے۔ ہمیں یہاں سے نکل کر زندگی کی تلاش کرنی چاہئے۔ ہم لوگ بھی تمہارے ساتھ ہیں ظاہر ہے ہماری کیفیت مختلف نہیں ہے۔''

''ہم آپ کے احکامات کی تعمیل کریں گے۔'' نوجوان نے کہا۔

''تب ان عورتوں کو تسلی دو...... ان سے کہو کہ تم ان کی زندگیاں بچا لو گے۔''

''عورتیں سن رہی ہیں......'' ایک نوجوان نے کہا۔

''بچوں کی نگرانی آپ کا فرض ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ سب بچے بھوکے پیاسے ہیں۔ لیکن پوری کوشش کریں گے کہ باہر نکلنے کے بعد سب سے پہلے ان کی خوراک کا بندوبست کریں۔'' فراغی نے عورتوں سے کہا۔

''آؤ دوستو۔'' سجاد نے کہا اور پھر تیرہ طاقتور لوگ غار کے دہانے پر پہنچ گئے جس میں کوئی رخنہ با نہیں رہا تھا۔ جو چٹان غار کے اُوپر آئی تھی وہ اس طرح فٹ ہو گئی تھی کہ اس نے کوئی رخنہ بھی نہیں چھو تھا۔ اس کے علاوہ اندر کی جانب اُس کی نوکیں اُبھری ہوئی تھیں۔

تقریباً تمام لوگوں نے اسے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

''فراغی......'' سجاد نے آہستہ سے کہا۔ ''صورتحال ایک اور رُخ اختیار کرتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔''

''میں محسوس کر رہا ہوں۔'' فراغی نے کہا اور سجاد کے چہرے سے پہلی بار ایک عجیب سی کیفیت جھلکنے لگی۔ اُس نے سراسیمہ نگاہوں سے دوسروں کی جانب دیکھا۔ لیکن اس وقت ڈاکٹر فراغی آگے بڑھا اُس نے دونوں ہاتھ چٹان پر ٹکا دیئے۔ اُس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی چٹان کے پاس آ گئے تھے۔

''اپنا توازن قائم رکھنا...... زور لگاؤ......'' فراغی نے کہا اور وہ لوگ پوری قوت سے دھکیلنے لگے۔ لیکن چٹان کیا...... پہاڑ تھا پورا...... اسے جنبش بھی نہ ہوئی...... وہ دانت بھینچ کر زور لگا رہے تھے...... بہت جلد اُنہیں اندازہ ہو گیا کہ چٹان ان کی توقع سے کہیں زیادہ بڑی اور ٹھوس ہے...... سب پسینہ پسینہ گئے تھے۔ اور پھر وہ تھک کر رُک گئے۔ آنکھوں کی سراسیمگی اب ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی اور اب ایک دوسرے کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے......!

''یہ کیا ہوا مسٹر فراغی......؟'' رتن چند نے کہا۔

''ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بار پھر کوشش کی جائے۔'' فراغی بولا اور سب تیار ہو گئے۔ چٹان پر ایک بار پھر پہلے سے بھی زیادہ قوت صرف کی گئی۔ لیکن نتیجہ پہلے سے مختلف نہیں تھا۔ چٹان ا

جگہ سے نہیں ہلی تھی...... وہ لوگ پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔ سب کے دماغ چکرانے لگے تھے اور اس کے ساتھ ہی اُن کے دلوں میں ہراس اُبھرنے لگا تھا۔

''اگر چٹان اپنی جگہ سے نہ ہلی تو......؟'' ایک خوفناک سوال اُن کے سامنے منہ پھاڑ کر آ کھڑا ہوا تھا۔ یہ طویل اور کشادہ غار ان زندہ انسانوں کا مقبرہ بن جائے گا...... یہاں وہ کتنے روز زندہ رہ سکیں گے؟ کون اس چٹان کی طرف متوجہ ہو گا؟ اور یہاں سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟

سب ہی اس بات کو محسوس کر رہے تھے۔ خاص طور سے اس بستی کے لوگ۔ کچے ذہنوں کے مالک، سیدھے سادھے لوگ جو اپنی اس وحشت کو پوشیدہ نہ رکھ سکے تھے۔

''اب کیا ہو گا......؟'' ایک نوجوان کے منہ سے خوفزدہ آواز نکلی۔

''اب ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے......؟'' دوسرے نے رونی آواز میں کہا۔

''اوہ...... ہمت سے کام لو۔ کوئی نہ کوئی ترکیب نکالیں گے۔ کچھ نہ کچھ کوشش کریں گے۔ اگر ہم دل چھوڑ بیٹھے تو پھر کچھ نہ ہو گا۔ تمہارے ساتھ عورتیں بھی ہیں۔'' سجاد نے تسلی دینے والے لہجے میں کہا۔

''عورتیں......'' فراغی کے منہ سے نکلا اور پھر اُس نے آہستہ سے سجاد کو پکارا۔ ''سجاد......''

''کیا بات ہے فراغی......؟''

''دو عورتیں ایک مرد کے برابر تو قوت رکھتی ہی ہوں گی۔''

''کیا مطلب؟'' سجاد نے تعجب سے پوچھا۔

''پانچ عورتیں ہیں ہمارے ساتھ۔''

''ہاں، پھر......؟''

''کیوں نہ انہیں بھی اس بار اس کام میں شریک کر کے کوشش کی جائے؟ ممکن ہے چٹان کو تھوڑی سی مزید قوت درکار ہو۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' سجاد نے کہا۔

''ہم ایک اچھی خاصی قوت کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک۔ بات کرو۔'' سجاد نے کہا اور فراغی نے بستی کے نوجوانوں کی طرف دیکھا۔ نوجوانوں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ چنانچہ ایک نوجوان کے سپرد یہ کام کیا گیا اور وہ عورتوں کے پاس پہنچ گیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ عورتوں کو تیار کر کے لے آیا۔ عورتیں بھی مصیبت کی ماری اس کے لئے تیار ہو گئی تھیں۔

رتن چند اور اُس کے دوسرے ساتھی تھک گئے تھے۔ عام حالات میں اگر کوئی دوسرا کام ہوتا تو یقینی طور پر وہ صاف انکار کر دیتے۔ لیکن چٹان کا مسئلہ سب کی زندگی موت کا مسئلہ تھا...... وہ سب ہی بدحواس تھے اس لئے بلا چوں و چرا اس کام میں شامل ہو گئے اور کون تھا جس نے پوری قوت نہ صرف کر دی ہو...... یہاں تک کہ عورتیں بھی پوری قوت صرف کر رہی تھیں۔ اُن کے حسین چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ لیکن چٹان نے شکست نہ مانی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ غار کے دہانے کے چٹانی رخنوں سے جڑ گئی ہو اور اب اس کے سرکنے کا کوئی امکان نہ ہو...... انہوں نے اپنے بدن کی پوری قوت صرف کر دی تھی لیکن وہ ٹس سے مس

نہ ہوئی۔ بہت سے کھانسنے لگے، بہت سے زمین پر بیٹھ گئے۔ سب کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ان کی مایوسی بھی آخری حدود کو چھونے لگی تھی۔ اب اُنہیں یقین ہوگیا تھا کہ وہ سب مل کر بھی اس چٹان کو اپنی جگہ سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ مایوسی کے آثار اُن کے چہروں سے جھلک رہے تھے۔ یہاں تک کہ خود آہنی عزائم کا مالک ڈاکٹر فراغی بھی نا اُمید ہوگیا تھا۔

یہی غنیمت تھا کہ غار کے رخنوں سے تھوڑی سی ہوا اور روشنی اندر آ رہی تھی جس نے اُنہیں کچھ دیر زندگی برقرار رکھنے کی اُمید دلائی تھی ورنہ گھٹن اب تک ان میں سے کئی کو چٹ کرچکی ہوتی۔

آہستہ آہستہ وہ اپنی جگہوں پر واپس آ گئے۔ بستی کے نوجوان پریشان چہرے لئے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ رتن چند اور اس کے ساتھی سجاد اور فراغی کے قریب بیٹھ گئے تھے۔ سب کی آنکھوں میں لاتعداد سوال تھے۔ لیکن نجانے کیوں سب ہی ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے...... نجانے کیوں سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔ دوسرا بولے تو وہ خود بھی کچھ کہیں......

جب یہ خاموشی طویل ہونے لگی تو سب کو اس کی طوالت کا احساس ہوا...... اور پھر بولنے میں پہل کر کے اس جمود کو توڑنے والا رتن چند تھا۔

''مسٹر سجاد......'' اُس نے سجاد کو مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے مسٹر رتن چند......؟''

''ہم سب نے...... میرا مطلب ہے ٹیم کے لوگوں نے آپ سے اختلاف کیا تھا بلکہ مجرمانہ طور پر آپ کے خیالات کا مذاق بھی اُڑایا تھا۔ لیکن تقدیر نے ہماری حماقت کی سزا دینے میں کچھ مہلت بھی نہیں دی اور ہمیں فوراً ہی ہماری حماقت کی سزا مل گئی۔ لیکن......''

''پلیز مسٹر رتن چند...... براہ کرم ذہن سے یہ خیال نکال دیں۔ جو کچھ ہوا، وہ گزری ہوئی بات ہے۔ اب اس کا تذکرہ فضول ہے۔ ہمیں آئندہ حالات پر غور کرنا چاہئے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر ہم حالات پر سنجیدہ ہو جاتے تو شاید......''

''ہاں...... یہ درست ہے۔ لیکن بہر حال ہمیں تازہ حالات کا تجزیہ کرنا ہے۔''

''افسوس...... نجانے ہمارے دوسرے ساتھیوں کا کیا حشر ہوا؟'' رتن چند نے کہا۔

''میں بھی اُن کے لئے افسردہ ہوں...... لیکن آپ یہ دیکھیں مسٹر رتن چند کہ ہم پہلے سے ہی ان حالات سے واقف ہو کر بھی اپنے لئے کیا کر سکے؟ ہم بھی تو اس مصیبت کا شکار ہیں۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن......''

''سنئے مسٹر رتن چند...... پلیز...... اب صرف وہ باتیں کریں جو مفید اور کارآمد ہوں۔'' سجاد نے لجاجت سے کہا اور رتن چند ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

''ہاں...... صورت حال جس قدر خوفناک ہے اس کا اندازہ سب کو ہو چکا ہوگا۔ چٹان بہت بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اسے غار کے دہانے سے ہٹانا ایک ناممکن امر ہوگیا ہے۔'' فراغی نے کہا۔

''بستی کے سارے لوگ قابل رحم ہیں۔ خاص طور سے یہ بچے اور عورتیں۔ جو لوگ تباہ و برباد ہوگئے

ان کے لئے کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ لیکن جو یہاں موجود ہیں وہ پورے طور سے ہمدردی کے مستحق ہیں۔ آنے والے حالات جس قدر بھیانک ہوں گے ہمیں ان کے بارے میں اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔''

''ہم نہیں سمجھتے مسٹر فراغی...... آخر ہم ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ ہماری اپنی زندگیاں بھی اسی کشمکش کا شکار ہیں۔ ایسی صورت میں صرف ان کے بارے میں سوچنا کیا معنی رکھتا ہے؟'' رتن چند نے کہا۔

''آپ نے درست کہا مسٹر رتن چند...... لیکن ہماری نسبت ان کے ذہن چھوٹے اور محدود ہیں......'' فراغی نے جواب دیا۔

''لیکن آپ کی ذہانت ان کے کیا کام آسکتی ہے؟''

''غار کا ضابطہ...... اس بدامنی کو روکے گا جو پھیلنے والی ہے۔''

''خوب...... تو آپ یہاں طویل قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' رتن چند نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

''ہاں...... میں تو یہاں طویل قیام کروں گا۔ آپ کا جب دل چاہے باہر چلے جائیں۔'' فراغی نے بھی بھرپور طنز کیا اور رتن چند کے ساتھی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

''میں فراغی کی بات سے متفق ہوں۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنے طور پر سوچیں ہمیں اجتماعی طور پر کچھ سوچنا چاہئے۔'' سجاد نے کہا۔

''آخر کیا...... وہی بات میں جاننا چاہتا ہوں۔'' رتن چند نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''غار کا راستہ بند ہو چکا ہے۔ جتنا وقت ہم لوگ گزار چکے ہیں وہ خوف کا وقت تھا اور ہمارے جسموں نے اس کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن اب بھوک اور پیاس کا دور شروع ہوگا۔''

''یقیناً...... اور اس کے بعد پاگل پن کا۔ ہمیں اس پاگل پن کو روکنا ہے۔''

''گو ہم لوگ کچھ نہیں سمجھتے، لیکن اس کے باوجود ہم ہر تعاون کے لئے تیار ہیں۔'' رتن چند نے بیزار لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے...... یہ بھی کافی ہے۔ چنانچہ مسٹر سجاد...... سب سے پہلے ان نوجوانوں کے سامنے صورتحال کا اظہار ضروری ہے۔ اس کے بعد ہدایات دینا ہوں گی...... اس سے یہ ہوگا مسٹر رتن چند کہ ہم جو کچھ کرنا چاہیں گے، وہ سکون سے کریں گے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے......'' رتن چند ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''اور جو ضابطہ بنایا جائے گا اس کی پابندی سب کو کرنا ہوگی۔''

فراغی کے چہرے پر درشتگی کے آثار پھیل گئے۔ اُسے رتن چند کے انداز پر غصہ آ گیا تھا۔ ''ایسا ہی ہوگا مسٹر فراغی۔''

تب فراغی نے نوجوانوں کو پھر جمع کیا اور اُنہیں صورتحال سے آگاہ کرنے لگا۔ ''یہ عورتیں تمہاری بستی کی عورتیں ہیں۔ ممکن ہے ان سے تمہارا کوئی رشتہ نہ ہو۔ لیکن بستی کا رشتہ کسی بڑے سے بڑے رشتے سے کم نہیں ہوتا۔ ہمیں ان کا احترام کرنا ہوگا۔ عورتوں کو تم لوگوں کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہئے۔ تمہیں احساس ہوگا کہ ہم پر ایک کٹھن وقت آ پڑا ہے۔'' فراغی نے کہا۔

نوجوان عجیب نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔

”تمہیں ہماری بات سے اختلاف تو نہیں ہے؟“

”نہیں ڈاکٹر...... لیکن کیا ضمانت ہے کہ تم لوگ ان سے کوئی برا سلوک نہیں کرو گے؟“ بستی کے ایک نوجوان نے کہا۔

”اوہ، دوست تمہارا سوچنا ٹھیک ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ تم اتنے اچھے انداز میں سوچ رہے ہو۔ ہم ہماری تعداد پانچ ہے، تم آٹھ ہو۔ اگر ہم میں سے کوئی غار کے ضابطے کی خلاف ورزی کرے تو تمہیں اجازت ہے کہ تم اس کے ساتھ سب سے برا سلوک کرو۔ تم اسے زخمی کر سکتے ہو، قتل کر سکتے ہو۔ میں اور سجاد تمہاری مدد کریں گے۔ نہ بھی کریں تب بھی تم ہم پر بھاری رہو گے کیونکہ تمہاری تعداد زیادہ ہے۔“

”ہمیں تمہاری نیت پر بھروسہ ہے ڈاکٹر۔ یقین کرو ہم بھی عورتوں کی طرف سے فکرمند تھے۔“

”یہاں ہر فرد کو تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے اور ہم سب غلط انسان کے دشمن ہوں گے۔“

”شکریہ ڈاکٹر......“ نوجوان نے محبت سے کہا۔

”بہر حال ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔“ فراغی نے کہا۔

”ہم تمہارے اوپر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔“ نوجوان نے کہا اور یہ مسئلہ طے ہو گیا۔ تب فراغی نے دوسری تجویز پیش کی۔

”ابھی ہم نے اس غار کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا ہے۔ بہر حال جہاں ہم موجود ہیں یہ جگہ پوری طور سے محفوظ ہے اور یہاں ہوا اور روشنی بھی موجود ہے۔ چنانچہ غار کے اس کونے میں عورتوں کو یکجا کر دیا جائے تاکہ وہ ہماری نگاہوں کے سامنے رہیں۔ تم لوگ وہ سمت لے لو اور پھر ہم یہاں موجود ہیں۔ اس طرح ہم الگ الگ بھی رہیں گے اور ایک دوسرے پر نگاہ بھی رکھیں گے۔“

”مناسب ہے......“ نوجوان نے کہا اور پھر عورتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا۔ ان دونوں نے انہیں صبر سے کام لینے کی ہدایت کی تھی۔ نوجوانوں کو ان کی منتخب جگہ تعینات کر دیا تھا اور اس کام سے فارغ ہو کر دونوں واپس اپنی جگہ آ گئے۔ رتن چند، ہاشم خان اور ساتھی خاموشی سے غار کی ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ان کی کارروائی میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔

حالت کسی کی بہتر نہیں تھی۔ بھوک اور پیاس نے انہیں بھی نڈھال کر دیا تھا۔ لیکن کچھ لوگ ہمت سے کام لے رہے تھے اور ایسی صورت میں بھی عمل جاری رکھے ہوئے تھے۔ سجاد اور فراغی بھی بیٹھے رہے۔ وہ اپنی قوت کو مجتمع کر رہے تھے۔ اور جب کسی قدر قوت بحال ہو گئی تو فراغی نے سجاد کو پکارا۔ سجاد نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

”کیا سوچ رہے ہو مسٹر سجاد......؟“

”کوئی خاص بات نہیں فراغی۔“ سجاد پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

”پھر بھی۔“

”یقین کرو صرف ذہن کو مجتمع کر رہا ہوں۔“

”ہوں...... میرا خیال ہے سجاد، ہمیں بیٹھنا نہیں چاہئے۔“

”اوہ...... پھر؟“

”آؤ...... غار کا جائزہ لیں۔“

”چلو......“ سجاد اُٹھ گیا۔ بلاشبہ وہ ایک اچھا انسان تھا۔

وہ دونوں غار کے دوسرے حصوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

”کچھ وقفے کے بعد ہمارے جسموں میں جان نہیں رہے گی اور ہم عمل میں سست پڑ جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں ایسی نوبت آنے سے پہلے ہمیں جو کچھ کرنا ہے کر لیں۔“

”اچھا خیال ہے......“

”روشنی ہے۔ ہمیں غار میں ایسے حصوں کو تلاش کرنا چاہئے جو کسی قدر کمزور ہوں۔ ممکن ہے ہم انہیں توڑ کر کچھ راستہ بنا سکیں۔“

”اچھا خیال ہے۔“ سجاد نے کہا۔ اور پھر وہ دونوں غار میں چکر لگانے لگے۔

بلاشبہ غار بے حد کشادہ تھا۔ غار در غار تھا۔ اس طویل و عریض ہال کا اختتام ایک اور دہانے پر ہوا تھا۔ چھوٹے سے دہانے کے دوسری طرف بھی ایک کشادہ غار تھا۔ رخنے یہاں بھی تھے، لیکن بلندیوں پر۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا غار اور تھا۔

انہوں نے پتھر لے کر غاروں کا ایک ایک رخنہ ٹھونک بجا کر دیکھا اور کوئی دیوار کمزور نہیں پائی۔ کافی دیر تک وہ اس کام میں مصروف رہے۔ پھر گہری گہری سانسیں لے کر مایوسی کا اظہار کرنے لگے۔

”ایک مسئلہ ضرور حل ہو گیا۔“ سجاد نے کہا۔

”کیا......؟“

”یہ چھوٹا غار ضروریات فراغت کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔“

”اوہ......“

”خفیہ ضروریات کے لئے عورتیں اور مرد اس طرف جا سکتے ہیں۔ بدبو وہاں تک نہ پہنچ سکے گی۔“

”مناسب خیال ہے۔“

”اس کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

”ہاں......“

”آؤ...... چلیں۔“ وہ واپس چل پڑے۔ یہاں کا ماحول وہی تھا۔ سہمے ہوئے بچے بھی خاموش بیٹھے تھے۔ سب کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

پھر رات ہو گئی جس کا اندازہ روشنی ختم ہو جانے کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ سب فرش پر لیٹ گئے تھے۔ تھکے تھکے، بھوک اور پیاس سے نڈھال۔ غار میں اتنے انسان موجود تھے، لیکن موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات گزرتی رہی...... کوئی سو رہا تھا، کوئی جاگ رہا تھا۔ کسی کو کسی کا پتہ نہیں تھا۔ بس گہری گہری سانسیں سرد ہواؤں کی مانند اُبھر رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی کی کراہ اُبھر آتی...... اور پھر خاموشی...... پھر کسی بچے

کی چسر چسر کی آواز سنائی دی۔ غالباً ماں کی خشک چھاتی چوس رہا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ کوئی بچہ بھو
سے سسکنے لگا اور غار میں اُس کے رونے کی آواز گونجنے لگی۔ اُس کی ماں اُسے خاموش کرا رہی تھی لی
بھوک اُس کے لئے نا قابل برداشت تھی۔

اسی وقت رتن چند کی دہاڑ گونجی۔ ''اسے خاموش کرو...... رات کا وقت ہے، ذہن کو ویسے ہی سکون نہ
ہے۔''

''رتن چند......'' فراغی نے آہستہ سے پکارا۔ ''بچہ ہے رتن چند...... کیا تمہارا کوئی بچہ نہیں ہے؟''

''اوہ...... کوئی نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو...... اب کچھ نہیں ہے۔'' رتن چند نے وحشیانہ انداز میں کہا

فراغی چند ساعت خاموش رہا، پھر اُٹھ کر عورت کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے بچے کو عورت کی گود
لے لیا اور اُسے لے کر غار کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ وہ اُسے شانے سے لگا کر چپ کرانے کی کوش
کرتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد بچے کو صبر آ گیا۔ وہ فراغی کے شانے سے سر ٹکا کر خاموش ہو گیا...... ا
پھر سو گیا۔ فراغی نے خاموشی سے اُسے عورت کے حوالے کر دیا جو اس دوسرے غار کے دہانے پر کھڑ
ہوئی تھی۔ اور پھر واپس آ کر خاموشی سے فرش پر لیٹ گیا...... سجاد اُس کے نزدیک کھسک آیا تھا، لیکن اُ
نے فراغی سے کوئی بات نہیں کی۔

دوسرا دن پھر موت کی طرح ویران تھا۔ آج حالت اور زیادہ خراب تھی۔ کوئی اپنی جگہ سے اُٹھ ہی نہ
رہا تھا۔ وہ سب پھٹی پھٹی نگاہوں سے چھت کو گھور رہے تھے۔ پھر ایک عورت کی سسکیوں نے ماحول
سکوت توڑ دیا...... لوگوں کی نگاہیں اس طرف اُٹھ گئیں، لیکن کسی نے زبان نہیں ہلائی تھی۔ سب سے پ
اُٹھ کر بیٹھنے والا فراغی تھا۔ اس وقت سجاد بھی اُس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

عورت اپنی پانچ سالہ بچی کو سینے سے لپٹائے ہوئے تھی۔ فراغی دیکھتا رہا۔ پھر وہ اُٹھا اور عورت
قریب پہنچ گیا۔ عورت کی سسکیاں اور گہری ہو گئی تھیں اور اب اُس کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

''کیا بات ہے......؟'' فراغی اُس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

''یہ...... یہ......'' عورت نے بچی کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا ہوا......؟'' فراغی بے اختیار بچی پر جھک گیا۔ اور ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اُس نے
پہچان لیا کہ بچی بے جان ہے...... اُس کے ہونٹ خشک تھے اور یقیناً وہ بھوک اور پیاس سے مر چکی تھی۔

''اوہ......'' فراغی نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''صبر کرو۔''

''میں جب تک ہو سکا اسے اپنی زبان چسواتی رہی...... لیکن...... لیکن......'' عورت نے سسکیا
بھرتے ہوئے کہا۔

فراغی نے آہستہ سے اُس کا شانہ تھپتھپایا۔ ''لاؤ...... اسے مجھے دے دو۔''

''نہیں...... آہ، نہیں......'' عورت بلک بلک کر رونے لگی۔ دوسری عورتوں نے بچوں کو اپنے سینوں
بھینچ لیا تھا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اور پھر انہوں نے وہ آنسو بچوں کے ہونٹوں پر ٹپکا د

''اب تم اس کا کیا کرو گی...... لاؤ...... مجھے دے دو'' فراغی نے کہا۔

بالآخر اُس نے بچی کو عورت کی گود سے لے لیا۔ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن کسی نہ کسی طرح وہ
بچی کو لے کر غار کے دوسرے حصے میں پہنچ گیا۔ اور پھر اُس نے اُسے ایک کونے میں رکھ دیا...... ایک
ٹھنڈی سانس لے کر جب وہ پلٹا تو سجاد اُس کے نزدیک کھڑا ہوا تھا۔

''ابتدا ہو گئی......؟'' سجاد نڈھال لہجے میں بولا۔

''ہاں......'' فراغی نے ایک افسردہ سی سانس لی۔

''سب کا یہی انجام ہو گا۔''

''کیا، کیا جائے سجاد؟'' فراغی بولا۔

''کوئی صورت نہیں ہے۔'' سجاد مایوسی سے بولا، پھر کہنے لگا۔ ''ہم ناکام رہے ہیں فراغی...... کیا فائدہ
ان اخلاقیات سے؟ ہمیں صرف موت ہی کا تو انتظار کرنا ہے۔''

''سجاد...... سجاد میرے دوست...... موت تو مخمل کے بستر اور اجناس کے ڈھیر پر بھی آ جاتی ہے۔
اخلاقی قدریں روحانی سکون کا باعث بنتی ہیں۔ کیا موت کے بعد بھی تم مضطرب رہنا چاہتے ہو؟''

''نہیں......'' سجاد نے گردن ہلائی۔

''پھر جب تک زندہ ہو، حالات سے جنگ کرتے رہو اور رُوح کے سکون کے لئے اخلاقی قدروں کو
نبھاتے رہو......'' فراغی نے کہا اور پھر وہ سجاد کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔

باہر کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اُس عورت نے آنکھیں بند کر لی تھیں جس کی بچی نے
دم توڑ دیا تھا۔ شاید اُس نے اپنے غم کو بند آنکھوں میں چھپا لیا تھا۔

وہ پھر فرش پر لیٹ گئے۔ نہ کسی کو دن کی خوشی تھی اور نہ رات کی آمد کا انتظار...... بس ایک بے کراں
خاموشی، جس پر سانسیں بھی گراں گزرتی ہوں......

پھر اندھیرا چھا گیا...... غار میں کوئی آواز نہیں تھی، سوائے ایک ہلکی سی آواز کے...... یہ اُس ماں کی
آواز تھی جو اپنے بچے کو اپنی چھاتی چسا رہی تھی۔ اُسے زندہ رکھنے کی یا اپنا فرض پورا کرنے کی آخری کوشش
کر رہی تھی...... لیکن پھر اچانک اُس کی چیخ اُبھری...... ایک المناک چیخ اور سب چونک پڑے......

عورت گھٹی گھٹی آواز میں چیخی تھی۔ یوں لگا جیسے آواز کو بند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

''کیا بات ہے......؟'' سجاد نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑیں۔ لیکن بس عورت کی پے در پے چیخیں اُبھر
رہی تھیں۔ فراغی نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اُسے بڑے زور کا چکر آ گیا تھا۔ سجاد نے اُسے سہارا دیا اور وہ
ٹٹولتے ہوئے عورت کی طرف بڑھ گئے......!

۞۞۞

کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے کوئی کسی کو نوچ کھسوٹ رہا ہو اور کوئی عورت گھٹی
آواز میں چیخ رہی ہو، جیسے اُس کا منہ بند کرلیا گیا ہو۔

''کیا ہو رہا ہے...... یہ کون ہے؟'' فراغی دھاڑا۔ اُس نے محسوس کرلیا تھا کہ عورت سے دراز
کرنے والا کوئی مرد ہے اور سجاد اور فراغی نے مرد کو پکڑ لیا۔

''چھوڑ دو مجھے......سور کے بچو...... چھوڑ دو مجھے......'' مرد پکارا۔

''سارتھی......سارتھی، یہ کیا دیوانگی ہے؟'' سجاد نے اپنے ساتھی کی آواز پہچان لی۔

''میں کہتا ہوں مجھے چھوڑ دو......ورنہ...... میں تمہیں ہلاک کر دُوں گا۔'' سارتھی پھر چیخا۔

''بکو مت...... تم غار کے ضابطے کو نہیں توڑ سکتے۔ اس وقت جب سب موت کے نزدیک
تمہارے اوپر جنس کا بھوت سوار ہوا ہے۔ کیا تم انسانیت سے گری ہوئی حرکت نہیں کر رہے؟''

''چھوڑ دو مجھے...... براہ کرم چھوڑ دو......'' سارتھی ان دونوں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں نا
رہا تھا۔

''تم اس کی عزت نہیں لوٹ سکتے......'' سجاد نے گرج کر کہا۔

''عز......عزت کون لوٹ رہا ہے...... میں تو...... میں تو اس کی چھاتی سے دودھ پینا چاہتا ہوں......
چند قطرے......صرف چند قطرے...... میری زبان سوکھ کر مڑ چکی ہے۔ میں مر رہا ہوں......صرف
قطرے...... میں بھی زندگی کا حق رکھتا ہوں۔'' سارتھی نے کہا اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''آؤ سارتھی...... ہمت نہ ہارو...... خاموشی سے، عزت کے ساتھ موت کا استقبال کرو...... ہمت
کام لو سارتھی۔'' سجاد نے کہا اور وہ بمشکل سارتھی کو واپس لانے میں کامیاب ہو سکے۔ سب ہی جاگ ر
تھے۔ سارتھی بیٹھا روتا رہا۔ پھر رتن چند کسی طرح اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اندھیرے میں ان لوگوں کو گھور رہا تھا

''تم اخلاقیات کے ٹھیکیدار مت بنو...... جب ہمیں موت ہی کو گلے لگانا ہے تو کسی کے حکم کی
کیوں کریں؟''

''یہ ضروری ہے رتن چند......'' سجاد نے کہا۔

''تب پھر ہمارے لئے تمہاری موت بھی ضروری ہے۔'' رتن چند نے کہا۔

''ٹھیک ہے......کوشش کرو۔ لیکن تم کسی غیر اخلاقی حرکت میں اس وقت کامیاب ہو گے جب ہم
ہلاک کر دو۔'' سجاد نے کہا اور رتن چند خاموش ہو گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

پھر وہی لامتناہی خاموشی...... وہی طویل سناٹا...... سب نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کسی کو کسی

بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا...... پھر کوئی اُٹھا اور غار کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا...... غالباً رفع حاجت
کے لئے......اور پھر دیر تک کوئی آواز سنائی نہ دی۔

صبح ہونے میں کچھ دیر تھی جب بستی کے دو نوجوان قہقہے لگانے لگے۔ وہ دماغی توازن کھو بیٹھے تھے۔
لیکن اُن کے جسموں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ کوئی جنونی کارروائی کر سکتے۔ اُنہوں نے صرف اپنے بال
نوچنے پر اکتفا کی تھی۔

کوئی کچھ نہ بولا۔ کسی نے ہمدردی کے بول بھی نہ کہے۔ لیکن اُس صبح رتن چند بہت خوش تھا۔ اُس کا
ساتھی ہاشم خان بھی مسکرا رہا تھا۔ تب رتن چند نے کہا۔ ''کیا خیال ہے سجاد...... اُٹھ کر بیٹھ سکتے ہو؟''

''میں نہیں سمجھتا رتن چند......'' سجاد نے کہا۔ وہ تعجب سے رتن چند اور ہاشم خان کو دیکھ رہا تھا۔

''بس...... اگر تم نے غار کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش کی تو میں تمہاری گردن دبا دُوں گا۔''
رتن چند نے کہا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ اور ہاشم خان غار کے چکر لگانے لگے۔

''کچھ ہوا ہے سجاد......'' فراغی نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں...... لیکن کیا؟'' سجاد پُر خیال انداز میں بولا۔ اور پھر خاموش ہو گیا۔ دفعتہً فراغی چونک پڑا۔

''سجاد......'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ہوں......''

''لیکن ٹھہرو، میں ہی جاتا ہوں۔'' فراغی نے کہا اور وہ ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ غار
کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ اُس کے ذہن میں ایک مکروہ شبیہ جاگی تھی۔ وہ غار کے سب سے
چھوٹے حصے میں پہنچ گیا جہاں مرنے والے بچے کی لاش رکھی گئی تھی......اور اُس کے شبہ کی تصدیق ہو گئی۔
مردہ بچی کا جسم چاک تھا۔ آنتیں باہر نکلی پڑی تھیں اور اُس کے بدن کا گوشت جگہ جگہ سے غائب تھا......
یقیناً رتن چند اور ہاشم خان نے مردہ بچی کا گوشت کھایا تھا...... بھوک کی شدت نے اُن سے انسانی اقدار
چھین لئے تھے اور وہ جانوروں کی صف میں آ کھڑے ہوئے تھے۔

فراغی کا دل اُلٹنے لگا...... اُسے متلی آ رہی تھی۔ بہر حال وہ غار سے نکل آیا۔ رتن چند اور ہاشم خان کو نہیں
معلوم تھا کہ وہ کیا کارروائی کرنے گیا تھا ورنہ وہ مداخلت کرتے۔ فراغی طبیعت کو سنبھالے ہوئے واپس آ
کر بیٹھ گیا۔ سجاد غور سے اُس کی شکل دیکھ رہا تھا لیکن فراغی نے اُسے کچھ نہیں بتایا اور خاموشی سے اُن
دونوں کو دیکھ رہا تھا جو غار میں ٹہل رہے تھے۔ لوگ اُن کے جسموں میں آ جانے والی اچانک توانائی پر
حیران تھے لیکن وہ دونوں ان سے لاپرواہ نظر آ رہے تھے۔ اُن کے مزاج ٹھکانے نہیں تھے۔

پھر خاموشی...... طویل خاموشی...... ٹہلتے ٹہلتے دونوں تھک گئے تو زمین پر بیٹھ گئے اور پھر وہی گمبھیر
سناٹا...... لیکن دفعتہً اس سناٹے میں ایک گڑگڑاہٹ گونجی...... غار لرز گیا...... اُوپر سے کچھ مٹی سرک آئی
تھی، صرف ایک لمحے کے لئے......اور اس کے بعد چاروں طرف سائیں سائیں ہو گئی...... لوگوں کی چیخیں
نکل گئی تھیں...... لیکن جھٹکا لگا تھا۔ اس کے بعد کوئی جھٹکا نہیں لگا۔

''اس کا مطلب ہے ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔'' سجاد نے کہا۔

"اس کے بارے میں تم زیادہ بہتر جانتے ہو مسٹر سجاد۔" فراغی آہستہ سے بولا۔
"آتش فشاں بعض اوقات زمین کے نیچے نیچے بہت دُور تک پھیل جاتا ہے۔ لاوا نکلنے کے لئے ص
ایک راستے کا انتخاب کرتا ہے اور اسی سمت بہتا رہتا ہے۔ پھر زمین میں پوشیدہ گیس اسے اوپر لاتی
اس طرح زمین میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے۔"
"اوہ...... اس طرح تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ابھی کیا صورتحال ہے۔ افسوس...... موت کن حالات
آنا تھی۔" فراغی نے افسردگی سے کہا۔ سجاد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
پھر رات آ گئی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اُن لوگوں کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو
رونے اور آہیں بھرنے کی آوازیں آ رہی تھیں...... اندھیرا ابھی پورے طور سے نہیں پھیلا تھا کہ اچا
ایک بچی سہمے ہوئے انداز میں چیخی۔ یوں لگا جیسے کسی نے اُس کا منہ بند کر لیا ہو۔
فراغی نے گردن گھما کر دیکھا، ایک چھوٹی سی بچی رتن چند کے بازوؤں میں تھی اور رتن چند ا
دبوچے ہوئے دوسرے غار کی طرف جا رہا تھا۔
"رتن چند......" فراغی غرایا۔ مگر اُسے اپنی کمزور آواز کا خود احساس ہو گیا تھا۔ زور سے چیخنے سے
کی آنکھوں میں تاریکی اُبھر آئی تھی۔
"کیا بات ہے...... کیوں چیخ رہے ہو؟" قریب ہی کھڑے ہوئے ہاشم خان نے غراتے ہوئے کہا
"اُسے روکو ہاشم خان...... اُسے روکو۔"
"بکواس بند کرو...... ورنہ......" ہاشم خان نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔
"میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔"
"روک لو...... روک سکتے ہو تو۔" ہاشم خان نے کہا۔
"کیا بات ہے فراغی...... کیا بات ہے؟" سجاد نے پوچھا۔
"آہ...... سجاد، کسی طرح انہیں روکو۔" فراغی نے روہانسی آواز میں کہا۔
"اُٹھو سارتھی...... اُٹھو۔ انہیں بکواس کرنے دو۔" ہاشم خان نے اپنے تیسرے ساتھی کو سہارا د
اُٹھاتے ہوئے کہا اور سارتھی بھی ایک کراہ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس دوران رتن چند بچی کو اُٹھا کر اندر
جا چکا تھا۔ بچی کی ماں صرف اپنی جگہ پڑی سسک رہی تھی۔
"سجاد...... کیا تم اُٹھنے کی ہمت کر سکتے ہو؟" فراغی نے آہستہ سے کہا۔
"رتن چند اُس بچی کو کیوں لے گیا ہے فراغی؟"
"آہ...... وہ اُسے ہلاک کریں گے۔ اور...... اور پھر......"
"اور پھر......؟" سجاد نے لرزتے ہوئے پوچھا۔
"اور پھر...... اور پھر وہ اُسے...... وہ......" فراغی نے اتنا ہی کہا تھا کہ سارتھی کی چیخ اُبھری
بھیانک چیخ......
"نہیں...... نہیں......" اور پھر وہ بے تحاشہ دوڑتا ہوا غار سے باہر نکل آیا۔ "نہیں...... روکو......

روکو۔" اُس نے اتنا کہا اور اوندھے منہ گر پڑا۔ اُس کے سر سے خون بہہ نکلا تھا۔
سجاد نے کرب سے کروٹ بدلی۔ "یہ سب کیا ہے فراغی...... خدا کے واسطے مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟"
"سجاد...... وہ لوگ انسانیت کے نام پر داغ بن گئے ہیں سجاد۔ اُنہوں نے پچھلی رات اُس مردہ بچی کا
گوشت کھایا تھا جسے ہم نے آخری غار میں رکھ دیا تھا۔" فراغی نے بتایا اور سجاد کی حالت اور خراب ہو گئی۔
کئی منٹ تک وہ ساکت و جامد پڑا رہا جیسے اُس کی رُوح بدن سے نکل گئی ہو۔ اور پھر اُس نے ڈوبتے
ہوئے لہجے میں کہا۔
"اور...... اس وقت...... اس بچی کو......"
"ہاں سجاد... وہ کسی نیک ارادے سے نہیں لے گئے ہوں گے۔ وہ یقیناً اُس بچی کو ہلاک کر دیں گے۔"
"نہیں......" سجاد کے بدن میں وحشیانہ قوت آ گئی۔ "وہ ایسا نہیں کر سکتے...... وہ...... وہ......" سجاد
اُٹھ کر غار کی طرف دوڑا اور دوسرے لمحے وہ اندر داخل ہو گیا۔
فراغی دنگ رہ گیا تھا۔ گو اُس کے بدن میں جان نہیں تھی، لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اُٹھا اور سجاد کے پیچھے
چل پڑا...... اور اندر کا منظر اُس کی توقع کے خلاف نہیں تھا۔ دونوں توانا انسانوں نے سجاد کو زخمی کر دیا تھا
اور وہ غار کے فرش پر چت پڑا تھا۔ دونوں وحشی فراغی کو دیکھ کر ہنس پڑے۔
"آؤ ڈاکٹر...... کیا تم بھی اپنے دوست کی مدد کو آئے ہو؟"
"رتن چند...... کیا تم نے اسے ہلاک کر دیا...... کیا تم نے......" فراغی کراہا۔
"پاگل تھا...... اخلاقیات کا سبق دینے آیا تھا...... مر گیا ہو تو بہتر ہے۔ کسی روز چلا جائے گا۔ ورنہ کسی
دوسرے کی شامت آئے گی۔" رتن چند نے کہا۔
"تمہیں کیا ہو گیا ہے انسان ہو کر......؟"
"ڈاکٹر...... فضول باتوں سے پرہیز کرو...... بھوکے انسان کو گوشت مل جائے خواہ کچا ہی سہی اور خشک
زبان کو خون کی نمی مل جائے تو اسے اور کیا چاہئے؟" رتن چند ہاتھ اُٹھا کر بولا۔
"اس بچی کا کیا، کیا تم نے؟" فراغی نے پوچھا۔
"واہ...... دراصل مردہ بدن میں خون رواں نہیں ملتا۔ خون خشک ہو جائے تو نمی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ کمی
اس بچی کے خون نے پوری کر دی۔ ڈاکٹر...... زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ اسے برقرار رکھنے کی خواہش ہر
ذی رُوح میں ہوتی ہے۔ تم بھی اگر ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہو تو ہم تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔ ہم
فراخ دل ہیں۔" رتن چند بولا۔
فراغی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے بدن میں اتنی جان ہی نہیں تھی جو وہ اُن وحشیوں کے خلاف
کچھ کر سکتا۔ وہ سجاد کے پاس بیٹھ گیا۔ سجاد کے سر سے خون بہہ رہا تھا...... اور...... شاید وہ زندگی کے آخری
سانس پورے کر رہا تھا۔
"آہ...... سجاد میرے دوست...... تم بھی...... تم بھی ساتھ چھوڑ رہے ہو......"
"آؤ ہاشم خان...... ہم اپنا کام کریں۔ اسے اپنے دوست کی لاش پر نوحہ کرنے دو۔" رتن چند نے کہا

اور دونوں شیطان باہر نکل گئے۔ اس غار میں اُنہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

فراغی سجاد کو ٹٹول رہا تھا۔ سجاد کی نبضیں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ ایک تو اُس کی حالت ویسے ہی خراب دوسرے سر سے خون بہہ رہا تھا اور اس بہنے والے خون نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ لیکن فراغی دوست کی زندگی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اب کیا ہوگا......؟ خود فراغی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی کے چند تار باقی رہ گئے ہیں جو کہ بے بھی ٹوٹ جائیں گے۔ غار میں موجود دوسرے لوگوں کی کیفیت کا بھی اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ نجا کی کیا حالت تھی؟

''آہ...... میرے دوست...... میرے اچھے ساتھی...... میں بے بس ہوں۔ تمہارے لئے کچھ کر سکتا۔'' اُس نے ایک گہری سانس لے کر سجاد کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور اُس نے محسو کہ سجاد کا بدن سرد پڑ گیا ہے۔ پھر اُس نے بمشکل تمام زندگی کے بوجھ کو اُٹھایا اور باہر نکل آیا۔ لیکن ایک اور دلخراش منظر اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا......

شیطان آخری وحشت خیزی کر رہے تھے۔ دو عورتیں ہاشم خان اور رتن چند کے شکنجے میں کا تھیں۔ اُن درندوں نے اُن کے لباس تار تار کر دیئے تھے اور وہ اُن کی ہوس کا نشانہ بن رہی تھیں۔ کے ساتھی نوجوان خاموش نگاہوں سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا میں احتجاج کی ہمت ہی نہیں تھی...... فراغی نے اُنہیں دیکھا۔ اُس کے بدن میں چنگاریاں بھر گئیں ایک لمحے میں اُس نے سوچا کہ وہ بھی خودکشی کی کوشش کرے۔ لیکن کس طرح ان دونوں شیطانو کے آخری کارناموں کے لئے چھوڑ جائے؟...... کیا ان پر ٹوٹ پڑے؟...... لیکن اس سے فائدہ؟ وہ توانا ہیں، آسانی سے اسے ٹھکانے لگا دیں گے...... شیطان کے ساتھ شیطانی چال چلی جا ہاں...... اُنہیں تدبیر سے ہی مارا جائے۔ یہی عمدہ طریقہ ہے۔ اور اُس کے ذہن میں دُھواں سا بھر گ وہ خاموش اپنی جگہ جا بیٹھا اور وہ دونوں عورتوں کے بدن جھنجھوڑتے رہے۔ پھر وہ واپس اپنی جگہ آگئے

''ہیلو ڈاکٹر......'' رتن چند نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا بات ہے رتن چند؟'' فراغی کے لہجے میں تبدیلی تھی۔

''کیا حال ہے تمہارے وفادار دوست کا...... کیا اُس نے دنیا چھوڑ دی؟'' رتن چند نے مسکر ہوئے کہا۔

''ہاں...... وہ مر گیا......''

''اوہ...... افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ انجام تو ہم سب کا ہے۔'' رتن چ جواب دیا۔

''ہاں رتن چند...... تمہارا خیال درست ہے۔'' فراغی نے ٹھنڈی سانس لی۔

''کیا مطلب؟'' رتن چند چونک کر بولا۔

''میرا خیال ہے رتن چند، زندگی کے صحیح اختتام کا مصرف جو تم نے دریافت کیا ہے، وہی ٹھیک

ں اب تک غلطی پر تھا۔''

''اوہ...... یہ خیال سجاد کی موت کے بعد تمہارے ذہن میں آیا ہے؟''

''یہی سمجھ لو......''

''بہرحال کوئی فرق نہیں پڑتا فراغی۔ اگر ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہو تو ہم تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔ تم خود سوچو، ان غاروں میں جہاں زندگی کا کوئی تصور نہیں، مفلوج کتے کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رنے سے کیا فائدہ؟ موت تو ہم سب کے قریب کھڑی مسکرا رہی ہے...... چنانچہ زندگی نے جتنے لمحات یے ہیں ان سے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا جائے؟''

''ہاں...... ٹھیک ہے۔'' فراغی نے مضمحل لہجے میں کہا۔

''بہرحال ٹھیک ہے۔ ہم نے تمہیں اپنے ساتھ شریک کر لیا ہے۔ تھوڑی سی ہمت کرو میرے دوست ...... کیوں نہ ابتداء اپنے دوست ہی سے کرو ظاہر ہے اس سے زیادہ تمہارا مخلص اور کون ہوگا؟'' رتن چند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ فراغی چند لمحات کے لئے سناٹے میں رہ گیا۔ جو کچھ اُس نے سوچا تھا، اس پر عمل رنے کے لئے ان کتوں کی ہر بات برداشت کرنا ہوگی...... بہرحال وہ سوچتا تھا کہ پوری ہوشیاری کے اتھ وہ ان کو بے وقوف بنائے اور لوگوں کو ان سے نجات دلانے کی کوشش کرے اور اپنی ان کوششوں کو راکرنے کے لئے اُنہیں نہایت ہوشیاری کے ساتھ بے وقوف بنانا تھا......

''کیا خیال ہے...... کیا سوچا؟'' رتن چند نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے...... جب تمہارا ساتھی بن گیا ہوں تو پھر کون دوست، کون دشمن؟''

''بالکل ٹھیک سوچا تم نے...... جاؤ، غار کے اندر چلے جاؤ اور چاق و چوبند ہو کر واپس آؤ۔ ابھی من ں بہت سی لڑکیاں ہیں۔''

''لڑکیاں......؟'' فراغی کے بدن میں ایک بار پھر تھرتھری دوڑ گئی۔

''ہاں ہاں...... یہ بستی کی لڑکیاں۔ کیا تم زندگی کے اس رُخ سے محروم رہو گے؟''

''اوہ...... نہیں۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔'' فراغی نے کہا۔

''پہلے کی بات چھوڑ دو میرے دوست...... اب کی بات کرو۔''

''ہاں ٹھیک ہے...... کیا وہ دونوں لڑکیاں خوشی سے تیار ہو گئی تھیں؟'' فراغی نے پوچھا۔

''خوشی سے......؟'' رتن چند نے قہقہہ لگایا۔ ''ان کے نزدیک خوشی اور غم کی کوئی حقیقت نہیں رہی ہے۔ اور اب تو وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' فراغی نے پوچھا۔

''مر چکی ہیں وہ دونوں۔''

ایک بار پھر زوردار گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ لیکن یہ گڑگڑاہٹ صرف فراغی کے ذہن میں تھی۔ آہ...... تو ان دونوں نے ان معصوم عورتوں کو مار ڈالا تھا۔ ظاہر ہے وہ ان کی درندگی کہاں برداشت کر سکتی تھیں؟

فراغی چند لمحات سناٹے میں رہا...... پھر وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ اُس سے برداشت نہیں ہو

رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے ان دو کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ جسم کی قوتیں جمع کر کے اُٹھا اور غار کے اُس حصے میں چلا گیا جہاں اُس کے دوست سجاد کی لاش پڑی ہوئی تھی...... ایک بار پھر سجاد کی لاش کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اُس نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور خون کی چپچپاہٹ اُس کے ہاتھوں پر لگ گئی۔ تب اُس نے کہا۔

''سجاد...... میرے دوست...... تم مجھ سے انتہائی بہتر حالت میں ہو۔ تم زندگی کا خول چھوڑ کر جا چکے ہو۔ بے شک تم ایک اچھے انسان تھے۔ تم اس گندی زندگی کو چھوڑ چکے ہو۔ تم نے ایک اچھے مقصد کے لیے جان دی ہے۔ ہم سب یہاں موت کے قیدی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہر انسان زندگی سے چمٹے رہنے کا خواہش مند ضرور ہوتا ہے۔ زندگی کے جو لمحات تمہیں میسر آتے تم اس سے گریز نہ کرتے۔ لیکن تم نے بے غیرتی کی زندگی کو موت پر ترجیح دی۔ میرے لئے دُعا کرو میرے دوست کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ ان غریب لوگوں کو ان دو کتوں سے نجات دلاؤں...... تب میں بھی تمہارے پاس آ جاؤں گا اور ہم سکون سے باتیں کریں گے۔'' اُس نے سجاد کی پیشانی کا خون اپنے چہرے پر جگہ جگہ لگایا اور اس کے بعد وہ اُسے چوم کر غار کے اُس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ تب اُس نے ان میں سے ایک چھوٹے لیکن وزنی پتھر کا انتخاب کیا...... یہ پتھر نوکیلا تھا اور فراغی کے مقصد میں کارآمد۔ اُس نے پتھر کو احتیاط سے اپنے لباس میں چھپا لیا۔ تھوڑی دیر تک وہ غار میں چہل قدمی کرتا رہا اور پھر خود کو چاق و چوبند بنا کر غار کے دہانے کی طرف بڑھا جسم اور ذہن کی حالت وہ خود جانتا تھا۔ ٹانگیں لرز رہی تھیں، اعضاء جواب دے چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ کرنے کا خواہشمند تھا...... اور یہ کچھ کرنے کے لئے اُسے جسم کی آخری قوت کا سہارا لینا تھا...... آخری قوت...... اُس نے اپنی قوتوں کو آواز دی۔ بس آخری قوت...... آخری بار...... صرف آخری بار...... آخری بار مجھے میرے بدن کا ساتھ دے دو...... میں کچھ کرنا چاہتا ہوں...... اُس نے کسی سے کہا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے درحقیقت اُس کے بدن کی قوتیں واپس آ گئیں۔ اب اُس کے ہاتھ مضبوطی سے پتھر پر گرفت قائم کر سکتے تھے۔ اُس کی ٹانگوں میں جان آ گئی تھی۔

تب وہ غار سے باہر آ گیا۔ رتن چند اور ہاشم خان آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ وہ جاگ رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اُنہوں نے گردن گھما کر فراغی کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''آؤ ڈاکٹر...... واہ، دیکھا تمہاری چال میں کیا نمایاں تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے زندگی موت کے قریب ہو کر واپس آ گئی ہو۔''

''ہاں میرے دوست......'' فراغی اُن کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ''جسم کی ضرورت بہت اہم ہوتی ہے۔''

''تو تم نے ابتداء اپنے دوست سے ہی کی۔''

''ہاں......''

''لیکن اُس کے بدن میں خون تو رواں نہ ہوگا۔'' رتن چند نے پوچھا۔

''میرے لئے رواں ہو گیا تھا۔'' فراغی مسکرایا۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ میں نے اپنے دوست کے خون سے اپنی پیاس بجھائی۔''

''واہ...... بہت خوب۔'' رتن چند نے کہا۔

''ہاں...... تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ظاہر ہے وہ جوان انسان تھا۔ اور پھر میرا خیال ہے ابھی اُس کا جسم سرد نہ ہوا ہوگا۔'' ہاشم خان نے کہا۔ ''مجھے خوشی ہوئی کہ تم کچھ عرصے کے لئے زندوں میں شامل ہو گئے۔ کم از کم کچھ عرصے کے لئے تو ہمارا ساتھ دے سکو گے۔''

''یقیناً...... یقیناً......''

''تو پھر جاؤ...... ابھی ان میں کئی زندہ ہیں۔'' رتن چند نے عورتوں کی طرف اشارہ کیا جو سہمی ہوئی تھیں۔ ''ابھی کچھ اور ضرورتیں ہیں، انہیں پورا کرنا ہے۔'' رتن چند آنکھ مار کر مسکرایا۔

''ہاں...... لیکن میری طلب اور ہے رتن چند۔''

''اوہو...... کیا......؟'' رتن چند نے پوچھا۔

اس دوران فراغی خاموشی سے اپنے لباس میں چھپا ہوا پتھر نکال چکا تھا۔ اُس نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ بلند کیا اور پوری قوت سے پتھر رتن چند کی پیشانی پر دے مارا...... رتن چند کی طویل چیخ بھیانک غار میں گونج اُٹھی تھی...... ہاشم خان نے تڑپ کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن فراغی کے ہاتھ میں دبا ہوا پتھر پوری قوت سے اُس کی پشت پر پڑا اور ہاشم خان کی کریہہ چیخ بھی گونج اُٹھی...... وہ نیچے اُترا تو فراغی نے دوبارہ پتھر اُس کے سر پر کھینچ مارا اور وحشیانہ انداز میں اس وقت تک اُن کے سر کچلتا رہا جب تک اُن کے سروں کا وجود باقی رہا...... اُن کے جسم تڑپ رہے تھے اور فراغی کے جسم میں ایک ایسی قوت دوڑ رہی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ بے پناہ سرور اور مسرت آلود کیفیت اُس پر طاری تھی۔ بالآخر اُس نے دونوں شیطانوں کو جہنم رسید کر دیا تھا۔ دونوں تڑپ تڑپ کر سرد ہو گئے۔ غار میں موجود لوگ کچھ بھی نہیں بولے تھے۔ ہاں سب کی نگاہیں اسی طرف اُٹھی ہوئی تھیں...... بے نور نگاہیں...... فراغی نے پتھر پھینک دیا اور پھر وہ اپنی جگہ اوندھا لیٹ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں شرارے ناچ رہے تھے۔

بڑی بھیانک رات گزری تھی اور اس رات کی صبح بھی بھیانک تھی...... غار میں دو بچے مردہ پڑے تھے۔ دوسری طرف دو عورتیں مردہ پڑی تھیں جن کے ساتھ رتن چند اور ہاشم خان نے وحشیانہ سلوک کیا تھا۔ رتن چند اور ہاشم خان کے جسموں سے بہا ہوا خون غار میں کافی دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ لیکن فراغی نے اسی پر اکتفا نہیں کی۔ اُس نے نوجوانوں کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ پانچ نوجوان بیٹھے بیٹھے مر گئے ہیں۔ عورتوں میں سے دو تین مر چکی تھیں اور اب غار میں صرف دو لڑکیاں باقی تھیں۔

کیا، کیا جا سکتا ہے...... اب کیا، کیا جا سکتا ہے؟...... اُس نے ایک گہری سانس لی اور پھر ان عورتوں کے قریب پہنچ گیا جو زندہ تھیں۔ ایک خوبصورت عورت اپنی بچی کو سینے سے چمٹائے ہوئے بیٹھی تھی۔ اُس نے وحشت انگیز نگاہوں سے فراغی کو دیکھا۔ فراغی اُس کے نزدیک پہنچ گیا۔

''تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... اب تمہاری ذات کو کوئی خطرہ نہیں۔ جو سلوک ان دو

معصوم عورتوں کے ساتھ ہوا وہ تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ میں نے ان دو شیطانوں کو ختم کر دیا ہے۔" عورت کی آنکھوں میں کسی قدر سکون کے آثار نظر آئے۔ اُس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ لیکن پیاسے ہونٹ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی...... فراغی نے اُس کے ہاتھ رکھا اور واپس اپنی جگہ چلا آیا۔ اس کے علاوہ وہ سارتھی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ کرتا سوائے اس کے کہ اپنے ناتواں ہاتھوں سے اُس کا بدن تھپتھپائے۔ اور یہ کوشش کامیاب ثابت تھی۔ سارتھی نے تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول دیں۔ پھر وہ انتہائی منمنی آواز میں بولا۔

"کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟"

"اوہ.... سارتھی.... ہوش میں آؤ سارتھی.... میں نے ان دونوں شیطانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔"

"شیطان...... کون؟" سارتھی نے اُسے دیکھتے ہوئے کمزور آواز میں پوچھا۔

"رتن چند اور...... ہاشم خان۔" فراغی نے جواب دیا۔

"اوہ...... وہ درندے...... اُنہوں نے بچی کی گردن دبائی اور پھر اپنے دانتوں سے ادھیڑنے آہ...... وہ اُس بچی کا خون پی رہے تھے۔ اُنہوں نے مجھے بھی اس کی پیشکش کی اور میں ذہن پر قابو رہا تھا، سکا...... میرے خدا...... میرے خدا......"

"میں نے اُن دونوں کو بھرپور سزا دے دی ہے سارتھی...... اب وہ کسی کو پریشان نہیں کر سکیں گے۔"

"کہاں گئے وہ......؟" سارتھی نے غار میں نگاہیں دوڑائیں۔

"وہ پڑے ہوئے ہیں......" سارتھی نے اُن دونوں کی مسخ شدہ لاشوں کی طرف اشارہ کر کے نفرت سے کہا۔

"آہ...... یہ انسانی جسم؟"

"ہاں...... یہ رتن چند اور ہاشم خان کے بدن ہیں۔"

"مگر ان کے سر، ان کے چہرے کہاں گئے؟ یہ...... یہ......" سارتھی خوف سے لرز کر بولا۔

"میں نے انہیں پتھروں سے کچل دیا ہے۔" فراغی نے نفرت سے کہا۔

"بہت اچھا کیا...... یہ اسی قابل تھے۔" سارتھی نفرت سے بولا "بلاشبہ وہ اسی قابل تھے۔" اُس نے گہری سانس لی۔ فراغی نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"میرے دوست، میرے ساتھی...... ہم سب مرنے والے ہیں۔ ہم سب لوگ موت کے ہیں۔ اگر ہم نے کوئی وحشیانہ حرکت کر کے زندگی کے کچھ لمحات بچا بھی لیے تو یہ لمحات ہمیں کیا دے گے؟ مرنا ہے تو کم از کم اس سکون کے ساتھ مرو کہ تم کوئی ایسا کام کر کے نہیں مر رہے جس سے تمہارا ضمیر پر بوجھ ہو۔ رُوح کی زندگی بہرصورت زندگی ہوتی ہے۔"

سارتھی گردن ہلانے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔ "آخر موت کیوں نہیں آجاتی؟"

"آجائے گی سارتھی...... آچکی ہے۔ اور اسی غار میں فروکش ہے۔ ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا ہوا

سارتھی گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ اور پھر وہ دونوں غار کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

کے ذہنوں میں کوئی بات نہیں تھی، کوئی تاثر نہیں تھا۔ سامنے بیٹھی دو لڑکیاں اب بھی خاموش بیٹھی تھیں اور زندہ نوجوانوں میں سے شاید ایک آدھ اور چل بسا تھا...... وہ اتنی خاموشی سے مر رہے تھے کہ احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ کوئی موت کی ہچکی بھی نہ لیتا تھا اور آسانی سے جان دے دیتا تھا۔ کسی کو ان کی موت سے دلچسپی نہیں تھی۔ سب ایک دوسرے کے لئے خاموش تماشائی تھے۔

انتظار...... صرف موت کا انتظار...... آہ، کیسی گھٹن تھی رُوح میں؟ موت کا انتظار تو سب سے شدید ہوتا ہے۔ رُوح بدن میں پھڑپھڑاتی ہے، سانسیں ایکدوسرے کو دھکیلتی ہوئی باہر نکلتی ہیں جیسے ہر سانس کو خود گھٹ جانے کا خطرہ ہو...... باتیں بھی کی جاتیں تو کس سے...... بس خاموشی...... طویل خاموشی......

لیکن اچانک خاموشی ٹوٹ گئی...... زلزلہ پھر آ گیا تھا اور کافی شدید تھا۔ کئی سیکنڈ جھٹکے محسوس ہوتے رہے اور پھر ایک عجیب واقعہ رونما ہوا...... غار میں اچانک روشنی پھیل گئی تھی...... تیز روشنی جو کئی دنوں سے نہیں دیکھی گئی تھی۔ اور ان کی نگاہ روشنی کے منبع کی طرف اُٹھ گئی...... غار کا دہانہ کھل گیا تھا...... وہ چٹان لڑھک کر نیچے جا پڑی تھی جس نے اُنہیں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا...... کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا، یہ معجزہ کیسے رونما ہو گیا؟

"فراغی......" سارتھی آہستہ سے بولا۔

"ہوں......"

"یہ...... یہ کیا ہو گیا؟"

"موت سے آزادی مل گئی ہے سارتھی...... ہمارا صبر رنگ لے آیا ہے۔" فراغی نے خوشی میں لرزتی آواز میں کہا۔

"تو آؤ...... اس بھیانک غار کو چھوڑ دیں۔" سارتھی جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

فراغی بھی اُس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ دونوں غار کے دہانے کے پاس آ گئے۔ باہر کی فضا پُرسکون تھی۔ بہا لاوا سرد ہو چکا تھا۔ بہرحال باہر کچھ بھی ہو، سب سے بڑا مسئلہ غار چھوڑنے کا تھا۔ اب وہ کسی قیمت پر اس بھیانک غار میں زندگی نہیں گزار سکتے تھے...... بچنے والے اس قابل نہیں تھے کہ اپنے قدموں پر چل سکتے۔ زندگی کا یقین بھی اُن کے بدن میں توانائی نہ پیدا کر سکا۔ لیکن غار کی خوفناک فضا سے اُن کا نکلنا ضروری تھا۔ چنانچہ یہ فرض بھی اُن دونوں نے انجام دیا۔

غار کے باہر کی فضا نے اُن کے ذہنوں پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ یہ احساس اُن کے لئے توانائی بخش بن گیا تھا کہ اُنہیں نئی زندگی مل گئی۔ بچنے والوں میں صرف سات افراد تھے۔ فراغی، سارتھی، دو عورتیں، دو مرد، ایک بچہ...... باقی انسانوں کو وہ بھیانک شکلوں میں چھوڑ آئے تھے۔

زمین جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ لاوے نے اس علاقے کی شکل ہی بدل دی تھی۔ دُور دُور تک زندگی کا وجود نہیں نظر آ رہا تھا۔ ہر چیز سیاہ ہو گئی تھی اور ایک انوکھی سرزمین وجود میں آ رہی تھی۔ ہنومان کھلی اب نومتی کن بن رہی تھی۔ جادوگروں کی بستی۔ اور اس کے بعد یہ علاقہ کبھی آباد نہیں ہوا۔ آتش فشانی نے یہاں کوئلے کے گھر بنا دیئے۔ جنہیں بچنا تھا، وہ بچ گئے۔ جنہیں مرنا تھا اُن کی رُوحیں آج بھی ان کالی

پہاڑیوں میں بھٹکتی پھرتی ہیں اور کائنات کا سب سے بڑا دیدہ ور یعنی میں یہاں ہر منظر کو دیکھتا ہو
جنہیں زندگی ملنی تھی اُنہیں زندگی مل گئی اور جو موت کی جانب سفر کرنے والے تھے وہ چلے گئے۔ کیا
تم......؟''

''ہاں...... یہ سچ ہے۔ پہلے میں ایسی باتوں کو بالکل نہیں جانتی تھی۔ لیکن میری رہنمائی ہوئی اور
نے مجھے ان حالات کو سمجھنے کا موقع دیا تو مجھے بہت کچھ آ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھ پر کچھ ا
انکشافات بھی ہوئے ہیں۔''

''کیا......؟'' اُس پراسرار وجود نے پوچھا۔

''وقت...... تم تو سب سے بڑے جاننے والے ہو۔ تم سے زیادہ معلومات تو اس کائنات میں کسی
نہیں ہو سکتیں۔ مجھے بتاؤ کہ کیا سچ مچ انا زبیدہ ایک رُوح ہے؟''

وہ خاموش ہو گیا...... بہت دیر تک خاموش رہا، پھر اُس نے کہا۔ ''بہت سی باتیں حالات کے پ
میں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان سب کو جان لینے کی کوشش غلط ہوتی ہے۔ کیونکہ میں بھی ایک تخلیق ہوں
مالک کائنات کی جس نے کائنات کو وجود دیا اور پھر اسے مجھ سے منسلک کر دیا...... یعنی وقت سے۔ ا
لاتعداد واقعات ایسے ہیں جن کے بارے میں میری زبان بھی بند ہے اور میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ
معلومات محدود رکھیں۔''

رجنی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر اُس نے کہا۔ ''لیکن کیا تیری یہاں آمد میرے لئے کوئی
مقام رکھتی ہے؟ مجھے تیری ذات سے کچھ ملنا ہے؟''

''ہاں...... لمحوں میں تبدیلیاں اسی طرح ہوتی ہیں۔ کہانیاں اسی طرح بنتی ہیں۔ ناگ چندر شیطا
پیروکار ہے۔ اس کائنات میں تیرا سب سے بڑا دشمن ہے۔ چونکہ معاملہ رُوح سے منسلک ہو گیا ہ
شیطان نے گندی رُوحوں کو ہر طرح کا تحفظ دیا ہے۔ وہ عورت تو تجھے کائنات کی ایسی ایسی داستان
سکتی ہے جنہیں یقین کرنے میں تیری زندگی صرف ہو جائے اور تو یقین نہ کر پائے۔''

''لیکن میں یقین کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے لئے مجھے آزادی حاصل کرنا ہو گی۔ نہ میں ان لوگوں
ڈرتی ہوں جنہوں نے مجھے یہاں قید کیا ہے نہ میں خوفزدہ ہوں۔ میں تو بس کچھ جاننا چاہتی ہوں۔''

''حالانکہ تیری یہ قید تجھے بتاتی ہے کہ اپنے ماضی کو یاد کرو یہ سوچ کر کہ کیا ہوا تھا اور کہاں سے ک
تک ہوا تھا؟ لیکن تیرا ذہن کند ہے اور وہ کام نہیں کر رہا جو اسے کرنا چاہئے۔ جبکہ اسی کام سے تیرا آغا
تو تیرے لئے سب سے بہتر ہے۔''

رجنی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ درحقیقت اب پریشانیاں اُس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں
وہاں قید تھی لیکن انا زبیدہ نے اُسے جو کچھ سکھا دیا تھا وہ بہت ہی عظیم تھا اور جو قوت اُس پراسرار عورت
رجنی کو بخشی تھی وہ ایمان کی قوت تھی اور ایمان کا نظریہ یہ تھا کہ جو ہونا ہوتا ہے اسے روکنے والا اس کائن
میں کوئی نہیں ہے۔ یعنی ہونے والی ہر بات ہر قیمت پر ہو کر رہے گی اور اللہ کی ذات سے مایوسی کفر
رجنی نے خلوصِ دل سے کفر سے توبہ کی تھی۔ چنانچہ اب اُسے وہ خوف نہیں تھا جو ان حالات میں اُس ک

کا حصہ ہوتا۔ بس وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اب اُسے آگے کیا کرنا ہے؟ کیونکہ جن واقعات سے اُس کا سابقہ
پڑا تھا وہ بڑے مختلف تھے۔

رجنی بہت دیر تک خاموش رہی، پھر اُس نے کہا۔ ''آہ...... میں یاد کر رہی ہوں ان لمحات کو اور غور کر
رہی ہوں اس بات پر کہ تو نے جو نشاندہی کی ہے اس کا پس منظر کیا ہے۔''

اچانک وقت کی آواز اُبھری۔ ''بے وقوف لڑکی...... جب تم تمام بہنیں قید خانے میں تھیں اور موت لمحہ
لمحہ تمہاری جانب بڑھ رہی تھی تو ایک خوفناک قوت نے تمہیں سہارا دیا تھا۔ اُس نے تمہاری مدد کا وعدہ اس
شرط پر کیا تھا کہ تم اس کے خیالات کو عام کرو گی اور پھر اُس نے تمہیں وہ قوت دی تھی جو تمہاری جون بدل
دیا کرتی تھی اور تمہارے جسموں کو ہر اس شکل میں تبدیل کر دیا کرتی تھی جس کی تم خواہش مند ہوتی تھیں
اور اسی طرح تم مکڑیاں بن کر اس غار سے باہر نکلی تھیں۔''

''ہاں...... مجھے وہ تمام باتیں یاد ہیں۔''

''اس وقت تم کون تھیں؟''

''میں سمجھی نہیں؟''

''کیا نام تھا تمہارا اُس وقت؟''

''رجنی۔''

''اور اب......؟''

''اب؟''

''ہاں...... کیا تمہارا نام تبدیل نہیں ہوا؟''

''ہوا ہے......''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''ستارہ......''

''کیوں؟''

''میں سمجھی نہیں؟''

''مطلب یہ ہے کہ کیا تبدیلی رونما ہوئی ہے تمہارے اندر؟''

رجنی کا دماغ ایک دم سے پھٹ پڑا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اُسے جو سمجھا رہا تھا وہ رجنی لمحوں کے لئے بھول
گئی تھی اور اچانک ہی اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''لاحول ولاقوۃ...... پہلے میں شیطان کی پیروکار تھی۔ جو تبدیلی میرے اندر رونما ہوئی ہے وہ یہ ہے
کہ اب اللہ کے فضل سے میرا تعلق ایک ایسے دین سے ہے جو مثالی ہے اور شیطان کی نفی کرتا ہے۔ میں
بلاوجہ ہی افسردہ اور خوفزدہ تھی۔ میں یہ بھول گئی تھی کہ مجھے تین بار 'لاحول' پڑھنی چاہئے۔ میں نے اپنے
آپ کو بے بس سمجھ لیا تھا۔ میں بے بس کہاں ہوں؟ واقعی، میں بے بس نہیں ہوں۔'' رجنی اپنے آپ سے
کہہ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے جو شخصیت اُس کے سامنے تھی وہ اُس سے بے خبر ہو گئی تھی۔ لیکن کچھ لمحوں

کے بعد جب اُس نے اُس شخصیت کی جانب دیکھا تو حیران رہ گئی...... وہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔ رجنی کو
فیصد یقین ہو گیا کہ یہ اُس کی رہنمائی کی گئی ہے۔ اُسے بتایا گیا ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہئے؟ وہ باریک
باریک زنجیریں جنہوں نے اُسے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا اب بھی اُسے جکڑے ہوئے تھیں۔ اُس نے اُن
زنجیروں کو پکڑا اور بے اختیار اُس کے منہ سے ''بسم اللہ'' نکلا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ زنجیریں جو اُسے
بھی نہیں دے رہی تھیں، نازک دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئیں...... اُس کا سارا وجود آزاد ہو گیا......

رجنی مسرت سے کانپ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ خوفناک جگہ
جسے ہنومان یا ہنومتی کہا گیا تھا بے حد بھیانک تھی۔ اور یہ غار جس کے بارے میں وقت نے اُسے کہانی
سنائی تھی، کالے رنگ کے کوئلے سے بنا ہوا تھا۔ اس کی سیاہی کے کچھ نشانات رجنی کے لباس اور چہرے
بھی لگے ہوئے تھے۔ بہرحال رجنی نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ وقت نے اُسے جو بتایا تھا وہ یہی تھا کہ
شیطان سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اُس نے رجنی کے گرد وہ زنجیریں نہیں بنائی تھیں جو رجنی کی یادداشت
اُس سے چھین لیں۔ ابھی سب کچھ ٹھیک تھا۔

بہرحال وہ آگے بڑھی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ غار سے باہر نکل آئی۔ جو کہانی اُسے سنائی گئی تھی وہ
بے شک بہت ہی یقینی تھی اور رجنی اس کہانی سے پوری طرح واقف ہو گئی تھی۔ وہ تھوڑی سی آگے بڑھی اور
اسی وقت اُس نے اپنے بائیں سمت دیکھا تو اچانک ہی اُسے ایک ہیولا سا نظر آیا...... یہ ہیولا اُس کی
جانب بڑھ رہا تھا۔ رجنی کے قدم رُک گئے۔ ایک لمحے کے اندر اُس نے اُس ہیولے کو پہچان لیا۔ یہ
شیطان ہی تھا...... ایک لمحے کے لئے تو رجنی کا دل کانپ کر رہ گیا تھا۔ یہ نئی مصیبت تھی جو قریب آ رہی
تھی۔ بہرحال شیطان کی قوتیں اپنی جگہ تھیں۔

وہ اُسے دیکھنے لگی۔ آہستہ آہستہ شیطان اُس کے قریب آ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی
تھیں۔ رجنی نے ایک لمحے کے لئے اُس سے نگاہیں ملائیں لیکن اُس کی آنکھوں کی تپش سے گھبرا کر نگاہیں
پھیر لیں۔ وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈال سکتی تھی۔ اُس کی نظریں جھک گئیں۔ شیطان نے کہا۔

''ناگ چندر کے چنگل سے نکل آئی......؟''

رجنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شیطان چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''میں پوچھتا ہوں یہ تو نے
کیا، کیا؟ آخر یہ تو نے کیا، کیا؟ عیش کی زندگی گزار رہی تھی۔ کیا کچھ نہیں تھا تیرے پاس...... ذرا آنکھ کھول
کر دیکھ، اس سنسار میں دنیا کس طرح سڑکوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہی ہے۔ میں نے تمہیں وہ سب کچھ
دے دیا تھا جو تم چاہتی تھیں......

''تم نے مجھے ایک چیز نہیں دی تھی۔'' رجنی نے کہا۔

''نام بھی نہیں لے گی میرا...... اشیش بھگونت نہیں کہے گی مجھے......؟''

''نہیں...... اس نام میں احترام ہے، تقدس ہے۔ جبکہ یہ دونوں چیزیں تیرے لئے نہیں ہیں مردود۔''

''واہ...... پُراسرار عورت کی زبان بول رہی ہے۔ بول، بول۔'' شیطان کے ہونٹوں پر شیطانی
مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ایک چیز نہیں دی تو نے مجھے۔ اور جب مجھے وہ چیز ملی تو میں نے تیرا نام لینا چھوڑ دیا۔''
شیطان نے بھنوئیں سکوڑ کر رجنی کو دیکھا اور بولا۔ ''کیا چیز تھی وہ......؟''

''محبت......'' رجنی نے جواب دیا اور شیطان سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اُس نے پُرخیال انداز میں
گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ تو ہے... یہ تو ہے۔ یہ تو واقعی ہے... کیا نام ہے اُس کا، ساحل... ساحل ہی ہے نا اُس کا نام؟''

''جو کچھ بھی ہے، اُس کی شکل میں مجھے محبت ملی اور جب مجھے محبت ملی تو میں نے تجھے ٹھکرا دیا۔''

''مسلسل توہین کئے جا رہی ہے میری۔ میرے ماننے والے، میرے چاہنے والے مجھے اس طرح
نہیں پکارتے...... اس طرح نہیں پکارتے مجھے۔''

''اب میں نہ تیری ماننے والی ہوں نہ تیری چاہنے والی۔ دیکھ لے، تو نے میرے لئے ناگ چندر کا جو
جال بچھایا تھا میں اُس سے نکل آئی۔''

جواب میں شیطان نے ایک قہقہہ لگایا اور ہنستا ہوا بولا۔ ''نکل آئی...... ارے ابھی تو تیرے لئے اتنی
دلدلیں ہیں، اتنے گڑھے ہیں کہ ایک قدم اُٹھائے گی تو دس بار گرے گی۔ کیا سمجھتی ہے مجھے؟ اس دنیا کی
تین چوتھائی سے زیادہ آبادی اس وقت صرف میرا نام لے کر جی رہی ہے۔ تو کیا اور تیری اوقات کیا......''

''بے اوقات تو، تو ہو گیا ہے۔ تو نے دیکھ لیا، کچھ نہیں بگاڑ سکتا میرا اب تو...... میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ
سکتا۔ میں نے تیرا سارا کھیل ختم کر دیا ہے۔''

''گویا تو نے مجھ سے مکمل بغاوت کر دی ہے؟''

''بغاوت نہیں، میں نے تیری صورت پر تھوک دیا ہے۔''

''حالانکہ تجھے زندگی دینے والا میں ہوں۔''

''بکواس کرتا ہے...... میں جانتی ہوں میرے معبود کو میری زندگی عزیز تھی۔ بے شک ہم نے غلط
طریقے سے تیرا سہارا لیا، لیکن آخرکار میری آنکھیں کھل گئیں اور مجھے پتہ چل گیا کہ تو شیطان ہے۔ صرف
شیطان۔''

''اور یہ نہیں جانتی کہ شیطان کیا ہے......؟''

''ارے کچھ بھی ہے، مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں نے تو اُس کی ڈور پکڑی ہے جس
نے یہ دنیا تخلیق کی ہے، مجھے تخلیق کیا ہے۔ ایک بات بتا، کیا تو یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ تیرا تخلیق کنندہ بھی
اللہ ہے؟''

''ہاں ہے......''

''کیا تو یہ بتا سکے گا کہ اللہ کا تخلیق کنندہ کون ہے......؟''

''کوئی نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ صحیح معنوں میں برتر و اعلیٰ ہے۔ اور تو صرف ایک ایسا منحوس وجود ہے جو اُس
نے آزمائش کے لئے تخلیق کیا ہے۔''

''بہت زیادہ بکواس کر رہی ہے تو۔ میں جانتا ہوں انا زبیدہ نے تجھے یہ ساری باتیں بتائی ہیں۔''

''ہاں...... وہ میری استاد ہے۔ وہ میری محسن ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تو نے میرے رنگ نہیں دیکھے۔ میں تجھے بتاؤں گا کہ میں کیا ہوں۔ ایک چھوٹی کامیابی حاصل کر کے تو غار سے باہر نکل آئی ہے، ورنہ ہنومتی تیرا مقبرہ بن جاتا۔ ہنومتی کے بارے میں ابھی کچھ نہیں جانتی۔''

''مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرا ایمان مجھے تجھ سے بچا لے گا۔'' رجنی پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''دیکھ لوں گا میں بھی...... دیکھ لوں گا۔'' شیطان پلٹ کر واپس چل پڑا۔

رجنی کا دل مسرت سے کانپ رہا تھا۔ اُسے اس بات کی تو اُمید تھی کہ شیطان اُسے خاصی مشکلات میں مبتلا کرے گا۔ لیکن اس بات پر بھی اُسے یقین تھا کہ اب اُس کے دوسرے سہارے ہیں اور شیطان اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

اُس نے آنکھیں بند کیں اور قدم آگے بڑھا دیئے۔ دل ہی دل میں وہ کسی آیت کا ورد کر رہی تھی۔ سفر طے ہوتا رہا اور اس وقت اُس نے آنکھیں کھولیں جب اُس کے کانوں میں شور کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ہنومتی کن سے کس آبادی کا فاصلہ کتنا ہے؟ لیکن جو اُس نے سفر اختیار کیا تو وہ فاصلوں کو مختصر کر دینے والا تھا۔ اور جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو اُس نے اپنے آپ کو ایمان علی کے مکان کے قریب پایا...... اس علاقے کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور آگے بڑھ گئی۔ اُس کا دل خوشی سے کپکپا رہا تھا۔

گھر کے اندر داخل ہوئی تو وہاں جو شخصیت اُسے نظر آئی وہ انا زبیدہ ہی کی تھی۔ انا زبیدہ کو دیکھتے ہی اُس کے دل میں سینکڑوں خیالات پیدا ہو گئے۔

انا زبیدہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آؤ...... میں جانتی ہوں تم کہاں سے آ رہی ہو۔''

رجنی خاموشی سے انا زبیدہ کے ساتھ اُس کمرے میں پہنچ گئی جو ایمان علی نے انا زبیدہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ رجنی نے پوچھا۔

''میری گمشدگی سے یہاں پریشانیاں تو نہیں پیدا ہوئیں؟''

''نہیں...... تم جس سفر پر گئی تھیں اس کے بارے میں ایمان علی کو علم ہو گیا تھا۔''

''لیکن افسوس میں وہ سب کچھ نہیں کر سکی جو کرنا چاہتی تھی۔''

''کیوں......؟''

''میں اس لئے گئی تھی کہ وہاں کچھ کر سکوں۔ لیکن شیطان کا جال وہاں بہت مضبوط تھا۔''

''خیر، میں تجھے ایک خوشخبری سناؤں ستارہ، کہ جس کام کے لئے تو گئی تھی وہ تو ہو گیا۔''

''ہو گیا......؟''

''ہاں......''

''مگر کیسے......؟''

''جس مقصد کے لئے تو گئی تھی اور جسے تو بیوقوف بنانا چاہتی تھی وہ بیوقوف بن گیا۔''

''کون......؟''

''وہی جس نے شیطان کی مدد سے اُس بچی کو اپنے جال میں پھانس رکھا تھا۔ اب اُس کا سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ کیونکہ ناگ چندر اُس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ یہ گندے علم والے بہت سے معاملات میں بڑے بے بس ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کے سامنے اس کا گرو پہنچ جائے اور گرو کا مقصد وہ نہ ہو جو چیلے کا مقصد ہے تو چیلے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ناگ چندر اُس کا گرو تھا اور ناگ چندر کا گرو شیطان۔ یوں سارا کھیل تیری جانب منتقل ہو گیا اور اُن کا باقی کھیل بالکل ختم ہو گیا۔ نروپا اب بالکل ٹھیک ہے اور وہ کبھی اب کسی کے جال میں نہیں آئے گی۔ یہ تیرے لئے خوشخبری ہے۔ بانکے لعل اور اس کا پورا خاندان تیرا احسان مند ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تو نے اپنی قربانی دے کر ان کی بیٹی کو بچا لیا۔ بس اتنا ہی چاہئے تھا۔ اس سے زیادہ ہمارا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔''

''لیکن انا زبیدہ، اس دوران میں جن حالات سے گزری ہوں اور جو واقعات اور داستان سنی ہے؟''

''ہاں...... وہ سب ٹھیک ہے۔''

''تو کیا یہ بھی ٹھیک ہے کہ تم کوئی زندہ شخصیت نہیں بلکہ صرف ایک......''

انا زبیدہ ایک دم ہنس پڑی۔ ایک لمحے تک خاموشی اختیار کرنے کے بعد اُس نے کہا۔ ''یہ بھی ہماری کامیابی ہے ستارہ۔ شیطان تو ہر ایک کو دھوکہ دیتا ہے۔ اس کی تو حیات کا مقصد یہی ہے۔ لیکن اگر ہماری طرف سے وہ خود دھوکے میں رہے تو کیا یہ ہمارے لئے اعزاز کی بات نہیں ہے؟''

''دھوکے میں رہے؟''

''اس سے زیادہ کچھ مت پوچھ۔ میری زبان نہ کھلوا۔ اس وقت جو کچھ ہوا ہے تو نہیں سمجھتی کہ کتنا بڑا ہوا ہے۔ کیا اُن لوگوں نے یہ بات کی تھی کہ تجھ سے تیری وہ قوت چھین لی جائے یعنی تو جو اپنی جون بدل لیا کرتی تھی اور جو دل چاہے بن جاتی ہے اور یہ قوت تجھے شیطان نے دی تھی؟''

''ہاں...... وہ قوت مجھ سے چھین لی گئی ہے۔''

''تو اس سے خوش ہے یا رنجیدہ؟''

''میں اس کا کوئی تعین نہیں کر سکتی۔''

''بے وقوف، یہ تیرے لئے خوشی کی بات ہے۔ تقدیر نے تجھ پر سے ایک شیطانی بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ وہ شیطان کا عطیہ تھا جو تو اپنی حیثیت بدل لیا کرتی تھی۔ شیطان نے اس خیال سے تجھ سے وہ قوت چھینی کہ کہیں تو اس قید خانے سے نکل نہ جائے۔ لیکن اس قوت کے چھیننے کے بعد تیرے وجود میں شیطان کا کوئی تصور نہیں رہا۔ یعنی اُس کا کوئی احسان تجھ پر نہیں رہا جس کی وجہ سے تو اس کے چنگل سے آزاد ہو گئی۔ اور اگر تو سچ جان تو یہ حقیقت ہے کہ تیری آزادی کی وجہ شیطان کی وہی لی جانے والی قوت ہے جو اُس نے تجھ سے لے لی۔'' انا زبیدہ نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''دیکھو، شیطان بھی کبھی کبھی کس طرح

خود اپنے جال میں پھنس جاتا ہے۔ اگر وہ یہ سوچے کہ اُس نے کوئی بہت بڑا تیر مار لیا، کوئی بہت
کارنامہ سرانجام دے لیا کسی ایک کو بہکا کر تو اُس کی کتنی بڑی بے وقوفی ہے۔ اس کائنات میں نہ جا
اُس کی کتنی اولادیں بکھری ہوئی ہیں۔ اس کائنات میں بکھرے ہوئے مسائل کے بارے میں ستارہ
جانے انسان کیسی کیسی مشکلات میں مبتلا ہے۔ بظاہر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ مشکل کس طرح وجود
آئی ہے۔ خاص طور سے اس جدید دور میں تو یہ سمجھ لے کہ ہر شخص اپنے طور پر شیطان کی پیروی کر رہا ہے
کون سا کردار کیسا ہے، کوئی نہیں جانتا۔ بس سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ تجھے کس کس
بارے میں بتاؤں؟ بس یوں سمجھ لے کہ ایک لمبا چکر چلا ہوا ہے۔ آہ، انسان اتنا بے بس ہے کہ وہ
بھی نہیں سکتا۔'' انا زبیدہ کسی لمبے خیال میں کھو گئی...... پھر اُس کی آواز اُبھری۔

''رات کے گھور اندھیرے میں بجلیوں کی کوندوں کا سہارا لیتا ہوا ایک پراسرار سایہ کوہ الپس کی بلند
کی طرف رینگتا دکھائی دے رہا ہے...... ایسا لگتا ہے کہ بادلوں کی گھن گرج اور موسلا دھار بارش کا شور
کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ آخر وہ پہلی چوٹی پر قدرے دم لے کر اس ویران کلیسا کے کھنڈر کی طرف
پڑا جو زمانہ قدیم سے باب الابلیس کے نام سے موسوم تھا۔ جہاں رات تو رات دن کے سناٹے میں
انسان ادھر سے گزرتا ہوا دہشت سے کانپ جاتا تھا۔

اب وہ پراسرار سایہ بجلی کی مسلسل چمک میں اپنی پراسراریت کا لبادہ اُتار کر نمایاں شبیہ اختیار کر
تھا۔ دراز قد، کمزور و نحیف، ضعیف العمر انسان جس کے چہرے سے اب بھی جاہ و جلال ٹپک رہا تھا۔
کلیسا کی شکستہ دیواروں کے درمیان ایک بلند و بالا بت کے روبرو کھڑا بڑے پُرسکون انداز میں اُس کو گھور
رہا تھا۔ یہ ہیبت ناک بت صدیوں سے باب الابلیس میں اسی طرح اپنی جگہ نصب تھا۔ آٹھ فٹ کا
قامت مجسمہ پتھروں سے تراشا گیا تھا۔ مکروہ سا چہرہ، لانبے نکیلے دانت، شعلے برساتی آنکھیں، بڑے
بڑے ناخن، باہر نکلی ہوئی سرخ زبان...... مشہور تھا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے دن شیطان لعین کو اس
میں قید کر دیا گیا تھا۔ مگر اپنے مکر و فریب سے آزاد ہو کر اُس نے اسے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ
نامرادیوں اور محرومیوں کے شکار مایوس نوجوان اور اپنی عصمتوں کے موتی لٹانے والی دوشیزائیں خودکشی
سے پہلے اس بت کے آگے سربسجود ہو کر اپنی رُوحوں کی نجات کے لئے دُعائیں مانگا کرتی تھیں اور پھر اس
کی شعلہ بار آنکھوں سے نکلتی ہوئی شعاعوں سے مسحور ہو کر اس چوٹی سے چھلانگ لگا دیتی تھیں۔

اور پھر اس غیر انسانی پُرہول ماحول میں اُس پراسرار مردِ ضعیف کی آوازیں بلند ہوئیں۔

''اے رحیم و کریم آقا...... مجھے معلوم ہے کہ خودکشی حرام ہے۔ مگر کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں جس
اختیار کر کے میں اس دردناک عذاب سے نجات پا سکوں جس میں مبتلا ہوں۔ میں انکار نہیں کر سکتا کہ
میری پوری زندگی گناہوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بنی رہی ہے۔ میں اپنی ساری دولت عیاشیوں اور نفسانی
آسودگیوں کی بھینٹ چڑھا چکا ہوں۔ نہ تو میری کوئی شریکِ حیات ہے نہ اولاد، نہ عزیز و اقارب۔ میری
چلتی پھرتی لاش میرے لئے جہنم بن کر رہ گئی ہے اور آج میں یہ طے کر کے نکلا ہوں کہ اگر خود تو مجھے نہیں
بلاتا تو میں اپنی ناپاک رُوح شیطان کے حوالے کر کے مطمئن ہو جاؤں گا۔''

پھر وہ گھٹنے ٹیک کر اپنی ملتجیانہ نظریں آسمان پر دوڑاتا ہے۔ بجلی زور و شور سے کڑکتی ہے۔ بادل کی گرج
سے پہاڑیاں گونج اُٹھتی ہیں۔ پھر وہ حقارت بھری نظروں سے ابلیس کے بت کو دیکھتا ہے۔ اُس کے
ہونٹ لرزتے ہیں...... ''او، لعین مردود...... بارگاہِ خداوندی کی بجائے میں تیرے دامن میں پناہ لینا چاہتا
ہوں...... کیا تو میری بے قرار رُوح کی قربانی قبول کر سکتا ہے؟''

پھر وہ اُٹھا اور ڈگمگاتا ہوا پلٹا۔ اسی دم معبد کے شکستہ گنبد میں ایک مہیب آواز گونجی۔ ''رُک جاؤ او آدم
کی حقیر اولاد......'' اور اُس نے پلٹ کر اُس بت پر نگاہ ڈالی تو اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں
اور اُس کی تھوتھنی سے لٹکے ہونٹ ہل رہے تھے...... ''ہزاروں لاکھوں تیرے بھائی بہنوں نے اس چوٹی
سے خودکشی کر کے چھلانگ لگائی۔ لیکن تو پہلا ابنِ آدم ہے جس نے میرے حضور میں اپنے گناہوں کا اقرار
کر کے اپنی بے قرار رُوح کا تحفہ پیش کیا ہے۔ اس لئے میرے جود و کرم کا دریا تیرے لئے جوش میں آچکا
ہے اور میں تجھے ایک حرام موت کے بدلے ایک رنگین زندگی بخشنے کا ارادہ رکھتا ہوں...... ایک ایسی زندگی
جو غیر فانی ہو گی...... حیاتِ ابدی...... صرف یہی نہیں بلکہ حسنِ لازوال کے ساتھ تیرے شباب کی
واپسی...... دولتِ بے پایاں دولت...... عیش و عشرت...... طاقت...... جاہ و حشمت......''

بوڑھا حیرت سے اس متحرک مجسمہ کو دیکھتا رہا۔ ''کیا تم میری محرومیوں اور مجبوریوں کا مضحکہ تو نہیں اُڑا
رہے ہو؟''

''احمق انسان...... کیا تو نہیں جانتا کہ خدا کے بعد میں دوسری لامحدود طاقت کا مالک ہوں۔ میں اب
بھی معلم الملکوت ہوں۔ خدا خود مجھ سے عاجز ہے۔ فرشتے اب بھی مجھ سے خوف کھاتے ہیں۔''

اور پھر اُس مکروہ بت کے حلق سے ایک ایسا قہقہہ بلند ہوا کہ ایلپس کی چوٹیاں تھرا اُٹھیں اور بوڑھا
گھبرا کر سجدے میں گر گیا۔

''اُٹھ اے احمق...... آج سے تو میرے مریدوں کے خاص الخاص گروہ میں شامل ہو جائے گا۔''

بوڑھا اُٹھا۔ اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور آواز تھرا رہی تھی...... ''پھر بتا اے عظیم طاقت، مجھے کیا
کرنا ہے؟ مجھے وہ راستہ دکھا جس کا تو وعدہ کر رہا ہے۔''

''تو پھر غور سے سن اے حقیر انسانی کیڑے...... تجھے سات اچھوتی کنواریاں میری بھینٹ چڑھانا
ہیں۔ وہ پاک دامن دوشیزائیں جو تیرے دامِ محبت میں دل و جان سے گرفتار ہو کر اپنا تن، من، دھن سب
کچھ تیرے قدموں پر نثار کر سکیں۔ جس کی تاب لانا ان کنواریوں کے بس کی بات نہ ہو گی۔ مگر شرط یہ ہے
کہ تیرے قدم نہ ڈگمگائیں، تو اُنہیں دھوکا دیتا رہے، خود دھوکا نہ کھا جائے۔ ورنہ عہد شکنی تجھے میرے قہر و
غضب سے ہمکنار کر دے گی۔''

''منظور ہے...... منظور ہے اے عظیم طاقت۔'' بوڑھا کانپتا ہوا کراہا۔

''اس کے بعد تو امر ہو جائے گا۔'' شیطان کی آواز ایک بار پھر اُبھری۔ ''تیرا حسن، تیرا شباب، تیری
دولت سب لازوال بن جائے گی۔''

''مجھے یہ قربانیاں کہاں اور کس جگہ انجام دینی ہوں گی؟''

''اس جگہ، یہیں میرے قدموں پر۔'' شیطان لعین غرایا۔ ''کس طرح دینی ہوں گی؟ اس کے تجھے فکرمند نہیں ہونا چاہئے۔''

''اور کچھ اے عظیم طاقت؟''

''اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے اور وعدہ کر تو اپنے عہد پر قائم رہے گا۔'' مجسمہ کو ایک بار پھر حرکت ہوئی اور بوڑھے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں اے عظیم طاقت کہ مرتے دم تک اپنے عہد سے نہ پھروں گا۔''

اتفاقاً بوڑھے میں ایک انقلابِ عظیم نمودار ہوا۔ اب وہاں ایک نحیف و نزار بوڑھے کی بجائے طویل قامت نوجوان حسن و رعنائی کا مرقع کھڑا تھا۔ شہزادوں کی زریں پوشاک میں ملبوس...... معبد بقعہ نور بن گیا اور پراسرار شعاعیں چاروں طرف پھوٹ پڑیں۔ اب شیطان کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں نوجوان کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ خود بھی اپنی صورت اور ہیئت دیکھ کر آئینہ حیرت بن گیا۔

''تم ایک مشرقی شہزادے بن کر وینس کے جدید ترین علاقے میں مقیم ہو گے۔'' شیطان لعین کی آواز ایک بار پھر معبد کے گنبد سے ٹکرائی۔ ''قصر جمالی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ تمہارا نام شہزادہ فرخ جمال ہے۔ ایرانی طرز پر سجایا ہوا یہ محل ہر ضروری ساز و سامان سے مزین ہے۔ بس جاؤ، اپنا کام شروع کر دو۔ ٹھہرو...... ایک ضروری بات سن لو۔ چاند کی ہر چودھویں رات کو تم انسانی شکل و صورت سے محروم ہو کر بھیڑیا بن جایا کرو گے اور چاند نظر آتے ہی نمودِ صبح تک تمہارا کام نواحی بستیوں میں چیر پھاڑ، تباہی و بربادی ہو گا...... تمہارے جسم پر کوئی بھی ضرب کارگر نہیں ہو گی۔ تم جو خواہش کرو گے، وہ پوری ہو گی۔ اگر تم پرواز کرنا چاہو گے تو تم سیدھے اپنے محل کے عقبی حصے میں اُترو گے۔'' اور پھر شیطان لعین نے اپنا ہاتھ فرخ جمال کے سر پر رکھ دیا۔ پلک جھپکتے ہی وہ اوپر بلند ہو گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا......!

قصر جمالی میں شہزادہ فرخ جمال دوسرے دن انگڑائیاں لیتا ہوا بیدار ہوا اور سارا محل جاگ پڑا۔ ایک حسین و جمیل کنیز، صبوحی کا دور لے کر حاضر ہوئی اور پیش کر کے پہلے مودبانہ جھکی اور پھر اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔ شہزادے نے حوائج ضروری سے فراغت حاصل کی اور خواب گاہ سے برآمد ہوا۔ سب سے پہلے باڈی گارڈ کے افسر اعلیٰ نے سیلوٹ کیا پھر حفاظتی دستے کے سات مسلح جوانوں نے سلامی دی، سات وردی پوش ملازمین جھک کر تعظیم بجا لائے۔ قصر جمالی کا ایک سرسری معائنہ کرنے کے بعد فرخ جمال لائبریری میں داخل ہوا۔ میز پر اطالوی زبان میں تحریر کردہ ایک اشتہار کا بغور معائنہ کیا اور مسکرا دیا۔ اس وقت اُس کا تبسم کچھ اور نمایاں ہو گیا جب اُس نے میز سے ایک تازہ تصویر اُٹھائی۔ یہ ایک نوخیز چہرہ دوشیزہ کا فوٹو تھا۔ اور اسی لمحے ایک پراسرار آواز نے سرگوشی کی۔

''ہوشیار فرخ جمال...... یہ تیرا پہلا شکار ہے۔'' اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ پھر اُس نے کرسی پر بیٹھ کر اس حسین و جمیل معصوم سی کنواری کو، جس کے چہرے پر مریم کا تقدس بکھرا ہوا تھا، غور سے دیکھا اور میز کی دراز کے سپرد کر دیا۔ پھر اُس نے تالی بجائی اور افسر اعلیٰ نے داخل ہو کر سیلوٹ کیا۔

''مجھے ایک سیکرٹری کی ضرورت ہے جس کی مکمل تعریف اس اشتہار میں تحریر ہے۔ یہاں کے نامور معروف اخباروں میں میری اس ضرورت کا یہ اشتہار فوراً شائع ہونا چاہئے۔''

افسر اعلیٰ نے مودبانہ خم ہو کر یہ پرچہ لے لیا، سیلوٹ کیا اور چلا گیا...... اُسی شام کو وینس کے مشہور نائٹ کلب میں شہزادہ فرخ جمال کے آگے پیچھے پروانوں کی طرح شہر کی حسین ترین دوشیزائیں منڈلا رہی تھیں، مگر شہزادہ کسی کو لفٹ نہیں دے رہا تھا۔

دوسرے دن کے اخباروں میں ''سیکرٹری کی ضرورت'' کا اشتہار موجود تھا۔ انٹرویو کا وقت شام سے پہلے کا دیا گیا تھا۔ افسر اعلیٰ ساری اُمیدوار لڑکیوں کو استقبالیہ میں بٹھا چکا تھا۔ انٹرویو شروع ہوا۔ کل اُنیس لڑکیاں تھیں۔ صرف چار سوالات پوچھے گئے۔ نام، تعلیم، خاندانی پس منظر اور آخری سوال ایسا تھا جس کے جواب میں اٹھارہ لڑکیوں نے بے دھڑک جواب دیا کہ اُن کا آئیڈیل ابھی تک نہیں ملا۔

آخری دوشیزہ مصنوعی زیبائش سے پاک، سفید سلک میں مصر کی کوئی دیوی لگ رہی تھی۔ حسن و دلکشی کے ساتھ ساتھ معصومیت کا شاہکار نظر آ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی ہوئی وہ لائبریری میں داخل ہوئی۔ سینے پر اپنا ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا خم ہوئی اور پہلی بار فرخ جمال سے نظریں چار ہوتے ہی دوبارہ نظریں نہ اُٹھا سکی۔ انٹرویو سے پتہ چلا کہ اُس کا نام پرنسس روزینہ کارلوف ہے۔ تعلیم گریجویٹ، کسی تباہ شدہ شاہی خاندان کی آخری یادگار ہے۔ آخری سوال ''آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟'' پر اُس نے پہلے تو ایک نظر غلط انداز میں شہزادے پر ڈالی، نظریں ٹکراتے ہی بجلی کی لہریں اُس کے سارے جسم میں دوڑ گئیں اور اُس نے شرم سے عرق آلود ہو کر نظریں جھکا لیں۔ فرخ کا دل بے ساختہ سینہ میں مچلنے لگا۔ ایسے کئی معصوم حسن اپنی جوانی میں وہ اپنی درندگی کا شکار کر چکا تھا۔ مگر یہ سراپا، حسن و رعنائی اپنی ساری معصومیت کے ساتھ اُس کی دسترس سے باہر تھی۔ نہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ اُس کو پیار کر سکتا تھا نہ ہی اُسے چھوڑ سکتا تھا۔ وہ صرف اُس کو اپنے ساحرانہ حسن و جمال سے مغلوب کر کے فریب میں مبتلا کر سکتا تھا۔ کیونکہ اُس کی یہ پہلی محبوبہ مقدس قربانی کے لئے منتخب ہو چکی تھی......

''اچھا شہزادی روزینہ...... میں نے آپ کا انتخاب کر لیا ہے۔ کل صبح نو بجے آپ ڈیوٹی پر حاضر ہو جائیں۔ آپ کے فرائض بتا دیئے جائیں گے۔''

روزینہ کا کام ہی کیا تھا؟ آئے دن دعوتوں اور پارٹیوں کے انتظامات، مہمانوں کا استقبال جس میں شہر کے رؤسا، اعلیٰ حکام اور خصوصی طور پر شہر کی معزز ترین پری جمالیں بھی شامل تھیں۔ چند ہی دنوں میں مشرقی شہزادے کا شہرہ دُور دُور تک پہنچ چکا تھا۔ اخباری نمائندے طرح طرح کے سوالات کر کے اُس کی پراسراریت کو روشنی میں لانے کی کوشش کرتے لیکن وہ انہیں مبہم سا جواب دے کر ٹال دیا کرتا۔ آٹوگراف لینے والی حسیناؤں کے لئے اُس کا قرب حاصل کرنے کا یہی ایک بہانہ تھا اور وہ بڑی خوش مزاجی کے ساتھ اُنہیں ٹالتا رہتا تھا۔

آخر چاند کی چودہ تاریخ آ پہنچی...... اور اُس نے لائبریری میں روزینہ کو بلا کر ہدایت دی کہ وہ دن کے چار بجے ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہے اور رات اس کی واپسی نہ ہو سکے گی۔

روزینہ کو اس پر حیرت ضرور ہوئی کہ شہزادے نے سفر کے لئے اپنی کار استعمال کرنے کا ارادہ ظاہر نہیں

کیا بلکہ داروغہ اصطبل کو اپنا محبوب گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔
روانگی سے قبل اُس نے روزینہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر صبیح و ملیح حسن کا پیار بھری نظروں اور گال پر تھپکی دے کر کہا۔ ''گھبرانا نہیں میری ننھی شہزادی...... میں جلد ہی آجاؤں گا۔''
اور روزینہ نے محسوس کیا کہ وہ اس پراسرار مشرقی شہزادے کے دامِ محبت میں ایک بے بس طرح پھڑ پھڑا رہی ہے۔ اُس کے رخسار کان کی لو تک سرخ ہو گئے۔ جذبات کا ایک طوفان اُ سینے میں ڈوبنے لگا...... اُس نے حسرت بھری نگاہیں فرخ پر ڈالیں مگر وہ تو جا چکا تھا......
دوسرے دن اخباروں نے ایک ایسے پراسرار بھیڑیے کی خبر شائع کی جس نے رات نواح میں اپنی درندگی سے قیامت برپا کر دی تھی۔ کئی بچوں اور جوانوں کو ہلاک کر ڈالا۔ رپورٹ کے کے جسم سے خون کا ہر قطرہ چوس لیا گیا تھا......
آفتاب طلوع ہونے کے بعد فرخ جب قصرِ جمالی کے گیٹ پر گھوڑے سے اُترا تو اُس کے رہے تھے...... روزینہ نے پہلی بے چین رات کاٹی تھی۔ وہ ٹاپوں کی آواز کے ساتھ ہی گیٹ کی طر پڑی تھی۔ اُس نے فرخ کو سہارا دے کر گھوڑے سے اُتارا۔ اسی نازک لمحے میں فرخ نے روزینہ سے لگا کر پیار کر لیا اور روزینہ خوشی سے جھوم اُٹھی...... وہ فرخ کو سہارا دے کر خواب گاہ میں لائی بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گیا......!
دن ڈھلتا رہا اور وہ سوتا رہا۔ آج وہ ہر روز سے زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ روزینہ بار بار آتی جاتی۔ اور آخری بار فرخ کی پیشانی کو اُس کے ہونٹ چوم رہے تھے تو فرخ نے پلکیں جھکائیں آغوش اُس کے لئے پھیلا دی۔ روزینہ نے سر اُس کے فراخ سینے پر رکھ دیا اور وہ مسکرا اُٹھا۔
دن اور رات معمول کے مطابق گزر رہے تھے۔ فرخ نے اپنی توجہ زیادہ تر روزینہ کی طرف مبذ دی تھی۔ دعوتیں، پارٹیاں اور کلب کی رونقیں کم ہونے لگیں۔ ہر شام وہ کار میں روزینہ کو لے قدرت کی رنگین تنہائیوں میں وینس کی گل پوش وادیوں میں، لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں وہ ا وجمیل دوشیزہ کے زانو پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ اُس کے آگے عہد و پیمان شیطانی کی آہنی دیوا تھی، ورنہ روزینہ کے ساتھ اپنی پُرفریب وفاؤں کے ثبوت میں اُس نے شہر کی مشہور و معروف حسینہ سے بھی منہ موڑ رکھا تھا کہ محبت کا جال روزینہ کے گرد تنگ کر کے اسے مدہوش کر سکے۔
دوسرے چاند کی چودھویں رات بھی آ گئی...... اور معمول کے مطابق اُس نے انسان سے بھیڑیے گرد و نواح میں تباہیاں مچا دیں۔ احتیاطاً دوسری بار فرخ پیدل ہی محل سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ ا روزینہ، فرخ کو سہارا دے کر خوابگاہ میں لٹاتے ہوئے اُس کے حسین چہرے پر جھکی تو اُس کے ہو خون کی سرخی دیکھ کر چونک پڑی تھی جسے فرخ نے بعد میں اُس کے استفسار پر بڑی چالاکی سے بہانہ کر کے ٹال دیا تھا۔
آخر ایک رات فرخ کو شیطان کا پیغام مل ہی گیا۔ ''میں تمہاری کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں معبد اس مقدس حسینہ کا انتظار کر رہا ہے۔''

دوسرے دن فرخ روزینہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہہ رہا تھا۔ ''آؤ...... آج کی شام اس عظیم معبد سیر کراؤں جہاں ہم لوگ اپنی پاک محبت کا اقرار کر کے دائمی پیار کا عہد کریں گے۔'' اور روزینہ کا چہرہ رونی مسرت اور حیاء کی سرخیوں سے گلنار ہو گیا تھا......
یہ ایک بھیانک رات تھی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کے شور میں آج دو متحرک سائے ایک دوسرے لپٹے ہوئے ''باب الابلیس'' کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ بجلی کی مسلسل چمک میں ایک نازک اندام بخوبی پہچانی جا سکتی تھی۔ شہزادی روزینہ سہمی سہمی فرخ جمال کے بازوؤں کا سہارا لئے جذبات کے ان سے لبریز دل کی دھڑکنوں کے ساتھ اپنے ڈگمگاتے قدم آگے بڑھا رہی تھی۔ آخر کار وہ جونہی معبد اندر داخل ہوئے ابلیس کا ہیبت ناک مجسمہ معہ پورے گنبد کے بقعہ نور بن گیا...... روزینہ کی ایک سہمی ئی چیخ کے ساتھ ہی ایک پراسرار آواز گنبد میں گونجی۔
''مبارک ہو اے مقدس نازنین...... میں تم دونوں کی پاک محبت کا تحفہ قبول کرتا ہوں۔''
فرخ جمال گھٹنے ٹیک کر سربسجود ہو گیا اور لرزتی کانپتی روزینہ بھی جھک گئی۔
یکایک روشنی غائب ہو گئی اور اب چاروں طرف مہیب تاریکی اپنا بھیانک منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ پھر شیطانی مجسمے کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے...... جب تیز شعاعیں بجھ گئیں تو آواز گونجی۔
''اے محبوب بارگاہ شیطانی...... آگے بڑھ اور اس مقدس تحفے کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر میری ف بڑھا دے۔''
فرخ نے ایک معمول کی طرح حکم کی تعمیل کی۔ اس گھپ اندھیرے میں دو طویل غیر انسانی ہاتھ بڑھے روزینہ اس طرح غائب ہو گئی جیسے اُس کا کہیں وجود ہی نہیں تھا...... روشنی کے ایک جھماکے نے باب بلیس کو ایک بار پھر بقعہ نور بنا دیا اور گنبد ایک بار پھر مکروہ آواز سے گونج اُٹھا۔
''تیرا مقدس تحفہ قبول ہوا...... تیری طاقتوں میں دو چند اضافہ کر دیا گیا۔ تیرے ساتھ خصوصی رعایت لئے تیرے دوسرے تحفے کی تشبیہ دی جا رہی ہے۔ اسے غور سے دیکھ کر ذہن نشین کر لے۔'' پھر وہی ب تاریکی چھا گئی...... اور شیطانی مجسمے کی پشت سے مجسم نور بن کر جو ایک حسین پیکر اُبھرا وہ ایک معصوم چہرہ کا تھا۔ فرخ نے غور سے اُس کو دیکھا اور لرز گیا۔ اس لڑکی کو وہ اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا۔ یہ ادی بیٹرس تھی۔ ایک متمول رئیس کی اکلوتی بیٹی...... فرخ جمال نے دوسرے دن ہی اخباروں میں یہ خبر ئع کروا دی۔
''میری سیکرٹری روزینہ کارلوف رات سے لاپتہ ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہو مجھ سے فوراً آکر ملے۔''
اس خبر کے شائع ہوتے ہی ہلچل مچ گئی۔ پولیس اور اخباری رپورٹروں نے تین دن تک فرخ جمال کو یرے رکھا۔ اس کے علاوہ روزینہ کی بوڑھی دادی نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا...... فرخ جمال حقیقت اُداس تھا۔ اُس کا دل روزینہ کے غم سے خالی نہ تھا۔ اُس کا ضمیر اُس کو کچوکے لگا رہا تھا۔ وہ گھبرا گھبرا کر سر دیواروں سے ٹکراتا رہا۔ گھنٹوں تنہائی میں بیٹھ کر اس معصوم پیکر کے تصور میں کھویا رہا۔
آخر ایک ایسی ہی درد میں ڈوبی ہوئی رات میں ابلیس کا پیغام آیا۔ ''اپنے عہد و پیمان کو بھولنے کی

کوشش فضول ہے میرے دوست...... کل صبح دوسرے مقدس تحفہ کا امتحان ہے۔"

فرخ نے یہ پیغام سننے کے بعد ایک نادیدہ ہاتھ کا لمس اپنے سر پر محسوس کیا اور عالم
آنکھیں بند کرلیں۔ جب اُسے ہوش آیا تو روزینہ کی یاد خواب پریشاں کی طرح منتشر ہو چکی تھی
ہوتے ہی اُس نے پہلے ہی کی طرح چستی اور توانائی محسوس کی۔ پرسا دینے والوں کا تین دن
جاری تھا۔ افسر اعلیٰ نے کاؤنٹ لارنز اور شہزادی بیٹرس کی آمد کی اطلاع دی۔ فرخ نے اُنہیں ڈرا
میں بٹھانے کا حکم دیا اور خود ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

جب وہ مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو دونوں باپ بیٹی نے اُٹھ کر بڑے تپاک
استقبال کیا۔ فرخ جمال اپنے حسنِ مردانہ کی ساری سحر آفرینیوں کے ساتھ آگے بڑھا اور بیٹرس
ہاتھ ملا کر آنکھیں چار کرتے ہی اپنا معصوم دل اُس کی نذر کر چکی تھی۔

کاؤنٹ نے سیکرٹری کے حادثے پر اظہارِ افسوس کیا اور شہزادی نے بھی ازراہِ ہمدردی کہا۔

"آپ کو تو بڑی تکلیف ہوگی۔"

"جی ہاں...... سوچتا ہوں دوسری سیکرٹری کے لئے اخبار میں اشتہار دے دُوں۔"

"ضرور دیجئے۔" کاؤنٹ نے اصرار کیا۔ "کیا ہم لوگ کوئی خدمت انجام دے سکتے ہیں؟"

"شکریہ پیارے کاؤنٹ...... ایک پردیسی کے ساتھ ایسا پُرخلوص رویہ ہی ایک عظیم خدمت

اس کے بعد فرخ جمال نے باپ بیٹی کو اپنا محل دکھایا اور دوسرے دن طعام پر بلایا۔ جدا ہو
بیٹرس نے مصافحہ کیا تو اُس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ اس ہاتھ کو ہمیشہ کے لئے اپنانا چاہتی ہو۔

دوسری شام ایک رنگین شام تھی...... شہر کے مشہور و معروف رؤسا اور حسینائیں دعوتِ خصوصی
کی گئی تھیں۔ شہزادہ فرخ خود ہی میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ سرِ شام ہی گھنگھور گھٹائیں
آسمان پر چھائی ہوئی تھیں۔ دورانِ طعام ہی بارش شروع ہوگئی تھی اور دعوت کے اختتام پر
جھکڑوں نے شہر میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ مہمان جلدی جلدی رخصت ہونے لگے اور قصر
سناٹا چھا گیا۔

شہزادی بیٹرس اور کاؤنٹ حیران و پریشان اب تک رُکے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ڈرائیور
کار واپس کر دی تھی کہ شب کے گیارہ بجے تک اُنہیں لینے آ جائے۔ لیکن چونکہ طوفان قبل از
شروع ہو چکا تھا اس لئے کار آنے کی اُمید کم ہی تھی۔ شہزادی گھبرائی گھبرائی کہہ رہی تھی۔

"شہزادے...... اب کیا ہوگا؟ ہم کس طرح جائیں گے؟"

"ذرا طوفان کا زور تھم جائے تو میں خود آپ لوگوں کو پہنچا دُوں گا۔"

لیکن طوفان کا زور و شور بڑھتا ہی رہا۔ بجلیوں کی کڑک، بادلوں کی گرج، طوفانی جھکڑوں
دہشت ناک آوازیں...... ایسا لگتا تھا جیسے لاکھوں چڑیلیں اپنے جہنمی دریچوں سے نکل نکل کر ف
پھر رہی ہوں اور یہ شیطانی چکر شہزادی بیٹرس کو قصرِ جمالی میں رات بسر کرنے کے لئے مجبور کر
ہوا بھی یہی۔ جب رات کے دو بج گئے اور شہزادی نے نیند کے خمار سے چور ہو کر آنکھیں بند کر

جمال نے دونوں معزز مہمانوں کے لئے دو بیڈ رُوم تجویز کئے اور دونوں شب بخیر کہہ کر اپنی اپنی خواب
گاہوں میں چلے گئے۔

فرخ جمال ایک گھنٹہ تو کروٹیں بدلتا رہا، پھر اس خیال سے کہ دونوں مہمانوں کو کوئی تکلیف تو نہیں
چپکے سے اپنی خوابگاہ سے نکل کر کاؤنٹ کی خواب گاہ تک آیا۔ یہ دیکھ کر اُسے اطمینان ہوا کہ کاؤنٹ آرام
سے خراٹے لے رہا ہے۔ پہلو بہ پہلو شہزادی کی خوابگاہ تھی۔ دروازے کے کسی ہول سے جھانک کر دیکھا تو
اُسے اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ شہزادی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اُس نے ہلکے سے دستک دی اور
شہزادی چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ دوسری دستک پر شہزادی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

دروازہ کھلتے ہی فرخ جمال سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور ساتھ ہی شہزادی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی
مسرت سے لبریز آواز سنائی دی۔ "شہزادے...... آپ؟"

فرخ مسکرایا۔ "حیرت ہے کہ میری نیند بھی اُچاٹ ہوگئی اور آپ بھی...... ویسے میرے لائق کوئی
خدمت؟"

"آیئے شہزادے...... اندر آ جایئے۔" اور شہزادی نے فرخ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "ہم لوگوں
کی وجہ سے آپ کو کتنی زحمت ہوئی...... میں تو بڑی شرمندہ ہوں۔"

"میری معزز اور حسین مہمان...... زحمت کیسی؟ آپ کی میزبانی کا فخر تو میرے لئے باعث رحمت
ہے۔" اور فرخ اپنے دونوں ہاتھ شہزادی کے شانے پر رکھ کر بولا۔ "بیٹرس......"

"جی......؟" اور بیٹرس نے جب فرخ کی آنکھوں میں دیکھا تو سحرزدہ ہو کر رہ گئی۔ اسی لمحے ابلیس
لعین کا مکروہ چہرہ فرخ کی نظروں میں رقص کرنے لگا۔ اُس نے تلملا کر بیٹرس کی آغوش ایک جھٹکے کے
ساتھ چھوڑ دی۔

"بیٹرس، میری جان...... اب تم آرام کرو۔ صبح ملاقات ہوگی۔" بیٹرس حیرت زدہ دیکھتی رہ گئی اور
فرخ خواب گاہ سے نکلتا چلا گیا۔

"کیسا شریف اور پاکباز نوجوان ہے......" بیٹرس نے مسکرا کر دل میں سوچا اور تصور میں ایسے حسین
محبوب کے گلے میں بانہیں ڈال کر سوگئی۔

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر شہزادی جب رخصت ہو رہی تھی تو اُس کی آنکھوں میں ایک پوشیدہ پیغام تھا۔
شہزادی نے دعوت کی واپسی کا وعدہ پہلے ہی لے رکھا تھا اور آج کی شام قصر لارنس میں شہزادہ فرخ
جمال کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ چند خصوصی مہمان بھی مدعو کئے گئے تھے جن میں بیٹرس کی حسین
سہیلیاں بھی شامل تھیں۔ بیٹرس بڑے فخر کے ساتھ شہزادے سے اُن کا تعارف کرا رہی تھی۔ بات ہی کچھ
ایسی تھی۔ اس مجلس میں فرخ اگر آفتاب کی طرح چمک رہا تھا تو بیٹرس چاند بن کر جلوے دکھا رہی تھی۔

شام تو بڑی بہار آفرین گزری۔ پھر ذرا دیر بعد دورانِ طعام پچھلی شب کی طرح طوفان کے آثار
نمایاں ہونے لگے۔ ویسے میں قیامت خیز طوفان کی یادیں ابھی تازہ تھیں اس لئے مہمان خوف سے کانپنے
لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوہ ایپلس کی طرف سے بادلوں کی گڑگڑاہٹ بلند ہوئی اور طوفانی جھکڑ شروع ہو

گئے...... طعام سے فارغ ہو کر مہمان تو رخصت ہونے لگے لیکن شہزدی نے فرخ کے کان میں سرگوشی
''کل کی مہمان نوازی کا بدلہ چکانا ہے۔ بھاگنے کی کوشش نہ کریں حضور۔'' اور فرخ کے ہونٹوں
ایک شیطانی تبسم رقص کرنے لگا۔

اپنی خواب گاہ میں فرخ پہلو بدل رہا تھا اور دوسری خوابگاہ میں بیٹرس جاگ رہی تھی۔ کاؤنٹ
جانے کی وجہ سے اپنی خوابگاہ میں مدہوش پڑا تھا۔ بیٹرس سے آخر ضبط نہ ہو سکا۔ دبے پاؤں فرخ کی
تک آ کر دستک دی۔ فرخ تو اسی انتظار میں تھا۔ دروازہ کھلا اور دونوں ہم آغوش ہو گئے۔ بیٹرس
سے مغلوب ہو کر فرخ کی بانہوں میں جھول گئی۔ فرخ نے اپنی مضبوط بانہوں میں اُسے سنبھالا اور
سے مسہری پر اُسے لٹا دیا۔ بیٹرس بے حد مضطرب دکھائی دے رہی تھی مگر فرخ ہوش میں تھا۔ دو شعلہ
ہوئی شیطانی آنکھیں اُس کو گھور رہی تھیں۔ اُس نے شیطان پر پہلے تو لعنت بھیجی اور پھر شہزادی کے
میں بانہیں ڈال کر بولا۔

''جانِ آرزو...... ہمارے لئے سخت ترین امتحان کا لمحہ ہے۔ اگر ایسے نازک موقع پر ہم میں
ایک بھی اپنے نفس سے مغلوب ہوا تو محبت کی پاکیزگی ہمارا مضحکہ اُڑاتی پھرے گی۔ اس لئے
فیصلہ کیا ہے کہ کل کی شام ہمارے لئے ایک تاریخی شام ہوگی۔ ہم دونوں اپلیس کے عظیم معبد
محبت کا اقرار کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے نباہ کا عہد کریں گے اور پھر......'' جملہ دونوں کے تڑپتے ہوئے
کے تصادم پر ختم ہو گیا...... اور یوں شیطان لعین کا دوسرا مقدس تحفہ بھی قبول ہو گیا۔

جب رات زیادہ ہو گئی اور بیٹرس ''قصر لارنس'' میں نہیں لوٹی تو کاؤنٹ گھبرا کر فرخ کے پاس
تو فرخ بڑی چالاکی سے مکر گیا۔

''شہزادی یہاں؟ نہیں تو۔''

''مگر وہ تو یہ کہہ کر چلی تھی کہ تم سے ملنے جا رہی ہے۔''

''یقین کریں کاؤنٹ، شہزادی میرے پاس پہنچی ہی نہیں۔''

''اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟''

''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں محترم بزرگ۔ میری جان بھی اس سلسلے میں کام آئی تو میں دریغ
کروں گا۔''

''پھر بتاؤ وہ کہاں ہے؟''

''اس کا جواب تو آپ ہی دے سکتے ہیں۔ یا پھر اس کے عزیز و اقارب، دوست، سہیلیاں۔''

''میرے آدمی ہر جگہ سے بے نیل و مرام واپس آ چکے ہیں۔'' بوڑھا کاؤنٹ آنکھوں میں آنسو بھر

''پھر تو میں اپنے سارے آدمی اُس کی تلاش میں روانہ کر رہا ہوں۔'' اُس نے تالی بجائی اور افسر
داخل ہو کر تعظیماً جھک گیا۔

''دیکھو، تم لوگ شہزادی بیٹرس کو تو پہچانتے ہو۔ وہ سرِ شام مجھ سے ملنے اپنے محل سے روانہ ہو گئی
مگر یہاں نہیں پہنچیں۔ تم لوگ چاروں طرف پھیل جاؤ۔ کونہ کونہ، چپہ چپہ چھانو اور جہاں بھی ملیں عزت
کے ساتھ یہاں لے آؤ۔''

افسر اعلیٰ نے مودبانہ اپنے سر کو خم کیا۔

''اور ہاں دیکھو...... اگر وہ پراسرار بھیڑیا کہیں نظر آ جائے تو فوراً شوٹ کر دو۔ چلو، جلدی کرو۔''

دوسرے دن پولیس بھی حرکت میں آ گئی۔ اخباروں نے بھی لمبی چوڑی سرخی جمائی۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔
اتنا ضرور ہوا کہ ان دو حادثوں کے بعد اور پراسرار بھیڑیئے کی تلاش کے سلسلے میں ایک پراسرار گھوڑے
کے سموں کے نشانات نے قصر جمالی تک رہنمائی کی تھی۔ اس سے پولیس کی نظروں میں فرخ جمال کافی
مشکوک ہو چکا تھا۔ مگر سونے کی مہر پولیس کے سارے اعلیٰ حکام کے لبوں پر لگ چکی تھی۔ فرخ جمال کا کوئی
بال بیکا نہ کر سکا۔

اس طرح دن، ہفتے اور مہینے گزرتے رہے...... فرخ جمال پہلے سے کہیں زیادہ حسین، پُرکشش اور
طاقتور ہوتا گیا۔ تیسری اور چوتھی مہم اُس نے چٹکی بجاتے سر کر لی۔ اب وہ کافی محتاط ہو چکا تھا۔ اپنے محل
سے ان مقدس کنواریوں کو محل سے دُور ہی رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بالا ہی بالا اپنی محبت کے جال میں اُنہیں
اُلجھا کر عہد و پیماں کے بہانے دارالابلیس لے جاتا اور اسی طرح شیطانی تحفے قبول ہوتے رہے۔

اُس کے حسن و دلکشی میں جس شدت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا اسی شدت سے وہ سخت دل بنتا رہا۔
البتہ کبھی کبھی اُس کا ضمیر چند لمحوں کے لئے بیدار ہو جاتا اور وہ سوچتا۔ ایسی دولت، حسن و شباب کس کام کا
کہ وہ اپنی کسی پسندیدہ حسینہ کی دوشیزگی سے لطف اندوز بھی نہیں ہو سکتا؟ شیطان لعین سے بغاوت کا یہ
جذبہ اکثر اتنا شدید ہوتا کہ وہ اپنے رومانی دورے کے درمیان کبھی کبھی بہک کر درندہ بن جانے کی کوشش
کرتا مگر وہ مکروہ صورت اور شعلہ برساتی آنکھیں...... ان نظروں سے ٹکراتے ہی وہ ہوش میں آ جاتا۔

❁❁❁

اسی طرح تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی کنواری بھی شیطان کی بھینٹ چڑھ گئی...... ہر چا
چودھویں کو وہ انسان سے بھیڑیا بن کر تباہیاں مچاتا رہا مگر اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا...... انٹیلی جنس
مشہور و معروف افسر جیک مارلے کی دلچسپیاں اس حد تک بڑھیں کہ وہ چودھویں کے چاند کا شدت
انتظار کرنے لگا اور چھٹی مہم کے بعد تو اُس نے فوجی تعاون حاصل کر کے گرد و نواح کی ساری بستیوں
جنگلوں میں گھیرا ڈال دیا...... فرخ جمال کی یہ آخری چاند رات تھی۔ ساتویں اور آخری کنواری کی شہ
اپنے حافظے میں محفوظ کر چکا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ امر ہونے والا تھا۔ حیاتِ ابدی کا مالک......
چاند نکلتے ہی وہ معمول کے مطابق دامن کوہ کی ایک جھاڑی سے بھیڑیا بن کر نکلا۔ قبل اس کے کہ
اپنی درندگی کا آغاز کرے، مسلح فوجیوں نے اُس پر دھاوا بول دیا...... وہ جدھر جدھر بھاگتا، اُدھر اُ
گھیرے کا سامنا کرنا پڑتا۔ گولیاں چلیں، مشین گنیں بھی استعمال ہوئیں مگر وہ بے خوف و خطر بستی میں
چلا گیا...... جیک کو چونکہ تجربہ تھا کہ اس پراسرار بھیڑیئے پر گولیاں اثرانداز نہیں ہوتیں اس لئے اس نے
پر وہ اس درندے کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اُس پر جال پھینکے جائیں وہ
لاشوں کا خون پی کر فرار ہو چکا تھا۔ اس رات اُس پر جال پھینک کر گرفتار کرنے کے سلسلے میں سات
ہوئے۔ ساتواں حملہ اتنا خطرناک تھا کہ وہ چاروں طرف سے جالوں کے نرغے میں گھر گیا تھا۔

جب وہ بے بس ہو گیا تو اُس نے شیطانی قوت کا سہارا لیا۔ جالوں کی بندشیں آگ کے شعلوں کی
ہو گئیں اور خوفناک بھیڑیا واقعی خون آشام درندہ بن کر فوجیوں پر ٹوٹ پڑا...... چار فوجیوں کا خون پ
جب اُس نے انگڑائی لی تو جالوں کے ایک تازہ حملے نے اُس کا استقبال کیا تو وہ بھیڑیئے سے ایک دیو
عقاب بن کر فضا کی بلندیوں میں تیرتا ہوا پہاڑ کی چوٹیوں میں گم ہو گیا۔

دوسری صبح وہ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ قصر جمالی میں داخل ہو رہا تھا تو جیک مارلے اُس
استقبال کو کھڑا تھا۔ "صبح بخیر شہزادے صاحب......"

مگر فرخ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"شہزادے، آپ کے ہونٹ خون آلود ہیں۔ کیا میں آپ کو سہارا دے سکتا ہوں؟"

فرخ نے اُچھل کر جیک کے سینے پر ایسی شدید لات ماری کہ اگر وہ غیر معمولی طاقت کا انسان نہ
تو اُس کی پسلیاں یقینی ٹوٹ گئی ہوتیں۔

"اچھا پیارے شہزادے...... تمہارے تابوت میں آخری کیل کا وقت آ گیا ہے۔" وہ گردن جھاڑتا
بولا۔ مگر فرخ اپنی خواب گاہ میں داخل ہو گیا تھا۔

ایران کی پری جمال شہزادی قدسیہ ناز آفرین اپنے والد محترم اکرم کمال پاشا، ایرانی فوج کے معروف کرنیل کے ساتھ سیر و تفریح کی غرض سے یہاں آئی ہوئی تھی۔ جلد ہی شہزادی کے حسن و جمال کا چرچا دُور دُور تک پھیل گیا اور ایک شام نائٹ کلب میں اُس کا سامنا فرخ جمال سے ہو ہی گیا۔

اکرم کمال کی تیز اور تجربہ کار نظروں نے بھانپ لیا کہ اس شخص کی آنکھوں میں ایک مسحور کن کشش ہے جو بھولی بھالی لڑکیوں کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے گوشے گوشے سے شہزادی کے رُخِ تاباں سے ٹکرانے والی ہوس ناک نگاہوں سے دل برداشتہ ہو کر وہ بیزاری سی محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی پری جمال بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور کلب سے نکلنا ہی چاہ رہے تھے کہ فرخ جمال عقاب کی طرح جھپٹ کر اُن کے سامنے آ گیا۔

"السلام علیکم سیدی......" اور اکرم کمال کو بادل نخواستہ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھانا ہی پڑا۔

"کہئے آپ کو یہ شہر پسند آیا؟ اور شہزادی صاحبہ، آپ کو؟"

قدسیہ کی نظریں چار ہوئیں اور اُس نے ایک معمول کی طرح اپنا دایاں ہاتھ فرخ کی طرف بڑھا دیا۔ فرخ پہلے تو تعظیم کے لئے جھکا پھر اُس نے قدسیہ کا نرم و نازک ہاتھ، ہاتھ میں لے کر اُس کو لبوں سے لگا لیا۔ "اتنی جلدی کیا ہے سیدی...... ابھی تو کلب کی سرگرمیاں عروج پر بھی نہیں پہنچیں۔ آیئے ہم لاؤنج میں بیٹھ کر ایک ایک کپ کافی پی لیں۔" اور ساتھ ہی فرخ نے بے تکلفی کے ساتھ اکرم کمال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دونوں باپ بیٹی اُس کی درخواست مسترد نہ کر سکے۔

"میں نے آپ دونوں معزز ہستیوں کی آمد کی خبر اخبار میں پڑھی تھی اور اخباری فوٹو سے مشابہت کی بناء پر فوراً پہچان گیا۔ میں بھی پردیسی ہوں۔ میرا نام فرخ جمال ہے۔ وینس کی سکونت کے بعد یہاں ایک معزز شہری کی حیثیت سے "اے آمدنت باعث خوشنودی" کہتا ہوا دونوں کا خیر مقدم کرتا ہوں۔"

"میرا نام تو اخبار شائع کر چکا ہے۔ ویسے یہ کوئی سرکاری دورہ نہیں ہے اور شہزادی کا پورا نام قدسیہ ناز آفرین ہے۔" اکرم کمال نے کہا۔ اور ایک بار پھر اُس کے گرم جوش مصافحہ سے دونوں باپ بیٹی کو دوچار ہونا پڑا۔

اب اکرم کمال کے تیور ٹھیک ہو چکے تھے اور قدسیہ تو فرخ کے حسین خدوخال کے پیچ و خم میں اُلجھ کر گم ہو چکی تھی۔ جلد ہی فرخ نے اکرم کمال کو اپنی چکنی چپڑی باتوں میں ایسا اُلجھایا کہ وہ اُس پر فریفتہ ہو گئے۔

"تو آپ ایرانی ہیں شہزادہ فرخ جمال؟ ہم دونوں قصر جمالی میں حاضر ہو کر آپ کی رنگین محبتوں سے مستفیض ہونے کی یقینی کوشش کریں گے۔"

"ضرور ضرور محترم بزرگ...... یہ اس خاکسار کی بہت بڑی عزت افزائی ہو گی۔ اور آپ شہزادی صاحبہ، مجھے آپ یہ عزت ضرور بخشیں کہ اس حسین شہر کے مشہور و معروف مقامات کی سیر کرا سکوں۔"

"ضرور شہزادے۔ میری دلی خواہش بھی یہی ہے۔ آپ جیسا معزز گائیڈ مجھے کہاں ملے گا؟" وہ ہنس دی۔ اور جیسے ہی باپ بیٹی کلب سے نکلے ایک اجنبی نے اُن کا راستہ روک لیا۔

"بداخلاقی کے اس مظاہرے کے لئے معذرت چاہتا ہوں جناب۔ میرا نام جیک مارلے ہے۔" اور

اُس نے اپنا شناختی کارڈ جیب سے نکال کر پیش کر دیا۔ اکرم کمال نے تیوری پر بل ڈال کر کارڈ پر
نظر ڈالی اور متحیرانہ انداز میں جیک سے مخاطب ہوا۔

''مگر جناب ہم دونوں باپ بیٹی جائز پاسپورٹ اور ویزا کے ساتھ اس شہر میں داخل ہوئے ہیں۔''

''یہ بات نہیں ہے محترم۔'' جیک مسکرایا۔ ''میرے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ اُس شخص سے
خبر دار کر دوں جس سے ابھی آپ گفتگو کر رہے تھے۔''

''کیا یہ کوئی خطرناک مجرم ہے؟''

''ابھی تک تو اتنا ہی ہے کہ اس کی حیثیت پراسرار ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔''

''یعنی......؟''

''فی الحقیقت یہ کوئی ایرانی شہزادہ نہیں۔''

''تو پھر...... ذرا وضاحت کریں آفیسر۔''

''آپ نے سنا ہوگا کہ اس شہر میں ایک پراسرار بھیڑیئے کی درندگی نے نواحی بستیوں میں دہ
پھیلا رکھی ہے۔ یہ درندہ ہر چاند کی چودھویں کو انسانی خون سے سیراب ہو کر قبل از سحر غائب ہو جاتا ہے۔''

''میں نے سنا ہے۔'' اکرم کمال نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس واقعے کا شہزادے فرخ
تعلق ہے؟''

''یہی عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں محترم......''

''فرمایئے، میں گوش بر آواز ہوں۔''

''آپ نے سلسلہ وار چھ پری جمال دوشیزائیوں کی پراسرار گمشدگی کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔''

''سنا ہے۔ پھر؟''

''وہ دوشیزائیں اس شخص کے پُر فریب حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس کی محبت میں گرفتار ہوئیں
کا ثبوت مل چکا ہے۔ لیکن وہ کس طرح پراسرار طور پر غائب ہو گئیں؟ اس رازِ سربستہ کی کڑیاں بھی
کسی ٹھوس ثبوت کے ہاتھ لگ چکی ہیں کہ یہ خون آشام بھیڑیا اور فرخ جمال ایک ہی تصویر کے دو
روپ ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ فرخ جمال کو کوئی پلید رُوح ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''

''جناب کمال صاحب، یہ دنیا محیر العقول کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ کوئی شیطانی چکر سمجھ لی
ثبوت فراہم کرنے کی کوشش میں گزشتہ چار رات میں نے فوجی تعاون حاصل کر کے ایک زبردست
نواحی بستیوں اور دامن کوہ کے جنگلوں میں ڈالا۔ تجربہ بتا چکا تھا کہ اس درندے پر گولیاں اثر انداز
ہوتیں۔ اس لئے میں نے اُلجھا کر اُسے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب یہ چاروں طرف جالوں
پھنس کر بے بس ہو گیا تو آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ سارے جالوں میں آگ لگ گئی اور چار فوجیوں کا
پی کر وہ بھیڑیئے سے ایک دیو پیکر عقاب کا رُوپ دھار کر پرواز کرتا ہوا پہاڑ کی چوٹیوں میں روپوش ہو گیا۔''

''اگر فرخ کو ایک شیطانی بلا مان بھی لیا جائے تو میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''بہت کچھ اکرم صاحب...... فرخ حسن اور دوشیزگی کا شکاری معلوم ہوتا ہے۔ اور شہزادی صاحبہ میں
دلچسپی لیتے وقت میں نے اُس کی آنکھوں میں ہوسناکی کے ساتھ ساتھ درندگی دیکھ لی ہے جو اُس کی مسحور
کن آنکھوں کے گوشوں میں چھپی نہیں رہ سکی۔''

''آپ بے فکر رہیں مسٹر جیک۔ قدسیہ ایک بہادر قوم کی نڈر لڑکی ہے۔ اور پھر ہم مسلمان ہیں۔
ہمارے ایمان پر کوئی شیطانی طاقت غالب نہیں آ سکتی۔''

پہلی بار شہزادی قدسیہ ہم کلام ہوئی۔ ''مسٹر جیک، آپ مجھ پر مکمل بھروسہ کریں۔ اس سنگین معاملے
میں، میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کا وعدہ کرتی ہوں۔'' اور اُس نے جیک کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ جس کو
اُس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ چوم لیا اور بولا۔

''شکریہ عفت مآب شہزادی صاحبہ...... آپ نے شاید قصر جمالی جانے کا وعدہ کر لیا ہے اور اُس کی
گائیڈ کی خدمات کو بھی قبول کر لیا ہے۔''

''ٹھیک ہی تو ہے مسٹر جیک......'' قدسیہ نے تبسم زیر لب تسلیم کیا۔ ''اگر سانپ کو بل سے نکلنے پر مجبور
کر دیا جائے تو اس کا سر کچلتے کیا دیر لگتی ہے۔''

''کیا میں آپ کی خود اعتمادی پر مکمل بھروسہ کر لوں؟''

''یقیناً مسٹر جیک...... میں آپ کو ہر قدم پر باخبر رکھنے کی کوشش کروں گی۔''

''شکریہ...... اور ایک بار پھر شکریہ شہزادی صاحبہ۔ آپ ایک باہمت اور باحوصلہ خاتون ہیں۔ مجھے
اُمید ہے کہ آپ کا بچھایا ہوا جال اُس شیطان کے لئے جنجال بن جائے گا۔ میں بھی ہر لحہ رابطہ قائم رکھوں گا۔''

اس دوران فرخ جمال کلب کی حسیناؤں میں گھرا ہوا اُن سے جان چھڑانے کی ہی سوچ رہا تھا کہ
کلب کی ایک مشہور گلوکارہ جیکولین اُس کی طرف مسکراتی ہوئی بڑھی۔

''ہیلو پرنس چارمنگ...... آج تو آپ باغ و بہار دکھائی دے رہے ہیں۔''

''اور تم جانِ بہار'' فرخ نے ٹکڑا لگایا۔

''تو پھر آیئے ہم کیوں نہ گُل کھلائیں۔'' اور پھر جیکولین نے فرخ کا ہاتھ پکڑ کر رقص گاہ میں کھینچ لیا۔

''شہزادے...... تم کتنے حسین ہو۔'' جیکولین گنگنائی۔

''اور تم مہ جبینوں کی مہ جبیں۔'' فرخ نے ٹکڑا لگایا۔

''مگر تم کتنے سنگدل۔'' مہ جبیں نے دوسرا مصرعہ اُڑایا۔

''اتنا بھی نہیں کہ ایک حسینہ کا پیار ٹھکرانے کی ہمت کر سکوں۔'' فرخ نے مکھن لگایا۔

''سچ......؟''

''جھوٹ بھی نہیں۔''

اور جب راؤنڈ ختم ہوا تو جیکولین اُس کی بانہوں میں جھولتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ ساتھ ہی فرخ جمال
کی کار کے عقب میں ایک دوسری کار لگ گئی۔ اور جب فرخ کی کار قصر جمالی کے گیٹ سے اندر داخل
ہوئی تو تعاقب کرنے والی کار بہت دُور رُک چکی تھی۔

’’تمہارا محل تو بہت شاندار ہے شہزادے......‘‘ جیکولین اِٹھلائی۔

’’اور آج اس کی شان میں چار چاند لگ گئے ہیں۔‘‘

’’سچ......؟‘‘

’’جھوٹ بھی نہیں۔‘‘

اور جب جمال خواب گاہ میں داخل ہوا تو جیکولین بستر پر دراز تھی۔ اچانک فرخ پر جیسے درندگی کا دورہ پڑ گیا۔ پہلے تو اپنی ساری پوشاک سے بے نیاز ہو کر سر تا پا برہنہ ہو گیا، پھر بھیڑیئے جیسی غراہٹ کے ساتھ بستر کی طرف بڑھا...... جیکولین اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے دیکھ کر خوف سے کانپ گئی اور تڑپ کر بھاگنے ہی والی تھی کہ فرخ کے طویل اور تنومند بازوؤں نے اُس کو دبوچ لیا۔ اُس کے جسم کے ہر حصے پر درندوں جیسے بال اُگ آئے اور چہرہ بھیانک ہو گیا...... اب جیکولین ایک بے بس پرندے کی طرح اس کے دیو پیکر جسم کے نیچے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ فرخ کو آج سالہا سال کی بے بسی کے بعد اپنی آسودگی کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ ابلیس نے اپنی محبوباؤں کی بھینٹ کے چکر میں اُسے اس لذت سے محروم رکھا تھا۔ آج وہ نصف انسان تھا، نصف درندہ تھا...... کافی جدوجہد کے بعد بھی جب اُسے آسودگی نہ ہوئی تو اس نے جھلا کر جیکولین کا زیر جامہ ادھیڑ دیا اور اُس کے لباس کو تار تار کر دیا...... جیکولین خون میں نہا چکی تھی اور قریب قریب بے ہوش تھی کہ فرخ نے دو تیز نوکیلے دانت اُس کے نرخرے میں گاڑھ دیئے۔ جیکولین کی دردناک چیخوں سے قصر جمالی کے در و دیوار لرز گئے۔ یہاں تک کہ اُس کے جسم سے خون کا ہر قطرہ غائب ہو گیا اور اُس کی بے جان لاش اکڑ کر رہ گئی......

اس طرح جیکولین کو اپنی درندگی کی بھینٹ چڑھانے کے بعد فرخ نے اُس کا بے جان جسم بستر میں لپٹا کر پشتارہ بنایا اور اُٹھا کر محل کی چھت پر آ گیا۔ نیچے دریا زور و شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ چھاپ کی آواز کے ساتھ پشتارہ موجوں کے رحم و کرم پر بہتا ہوا آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

فرخ جمال ابھی سو کر اُٹھا بھی نہیں تھا کہ افسرِ اعلیٰ گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ ’’شہزادہ عالی وقار، پولیس کا ایک مسلح دستہ جیک مارلے کی سربراہی میں گیٹ پر کھڑا ہے۔ اُن کے پاس آپ کی تلاشی کا وارنٹ ہے۔‘‘

فرخ جمال نے بستر سے چھلانگ لگائی۔ ایک ہلکی سی شکن اُس کے ابرو پر نمودار ہوئی، پھر ایک لمحے کے ساتھ اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور بولا۔ ’’اُنہیں ڈرائنگ رُوم میں بٹھاؤ۔‘‘

افسرِ اعلیٰ سیلوٹ کر کے اُلٹے قدموں واپس ہو گیا۔ پھر اُس نے جلدی جلدی خواب گاہ اور گرد و نواح کا زینہ سے لے کر چھت تک بغور جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر باتھ رُوم میں داخل ہو گیا۔ جب وہ فل ڈریس میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو جیک مارلے استقبال کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

’’صبح بخیر مسٹر مارلے...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟‘‘

جیک نے مسکرا کر تلاشی کا وارنٹ پیش کیا۔

’’مگر کیوں؟ میری قیام گاہ کی تلاشی آپ کس بناء پر لینا چاہتے ہیں؟‘‘

جیک نے بڑے احترام کے ساتھ سر کو خم کیا اور بولا۔ ’’شہزادے صاحب کو گزشتہ رات جیکولین کے ساتھ کلب میں رقص کرتے دیکھا گیا۔ پھر شہزادے صاحب اُس کو اپنی کار میں بٹھا کر قصر جمالی لے آئے۔ لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں شہزادے صاحب کہ جیکولین کو محل سے باہر جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔‘‘

’’مگر جیکولین تو اپنے گھر کے قریب کار سے اُتر گئی تھی۔‘‘

’’تلاشی کے بعد ہی صحیح بات معلوم ہو سکتی ہے۔ ویسے شہزادے صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جیکولین اپنے گھر پر نہیں پہنچ سکی۔‘‘ جیک نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

’’دیکھو مسٹر مارلے...... میں چھوٹے چھوٹے افسروں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔ تم تلاشی لے سکتے ہو۔ لیکن اگر تم ناکام رہے تو تمہیں یہ تلاشی مہنگی پڑے گی۔‘‘

’’ہم چھوٹے لوگ کافی فرض شناس ہوتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے اپنی خواب گاہ تک میری رہنمائی کریں۔ آپ کی بڑی نوازش ہو گی جناب شہزادے صاحب۔‘‘ جیک مارلے ایک ذہین اور نڈر جاسوس تھا۔ اب تک وہ کافی چھان بین کر کے اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ فرخ جمال ایک فراڈ ہے۔ وہ انسانی روپ میں ایک مجسم شیطان ہے۔ اس کے پاس غیر انسانی طاقت ہے جس سے وہ مغلوب اور مسحور کر کے شہر کی حسین دوشیزاؤں کو اپنے دام میں گرفتار کر کے انہیں دارالابلیس لے جاتا اور انہیں اپنی درندگی کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ وہ شیطانی معاہدے سے قطعی ناواقف تھا۔ پر اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس کا ان کارناموں کے پس پشت دارالابلیس سے ضرور کوئی تعلق ہے۔ اس لئے وہ اس فکر میں تھا کہ فرخ کو رنگے ہاتھوں پکڑے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے پورے یقین کے ساتھ شہزادی قدسیہ کا تعاون حاصل کیا تھا۔ ورنہ فرخ جمال کی دولت سے حکام بالا کافی مرعوب ہو چکے تھے اور بغیر کسی تعاون کے اُس پر ہاتھ ڈالنا شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف سمجھتے تھے۔

خواب گاہ کا چپہ چپہ چھان مارا گیا اور ملازمین سے دیر تک پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ آخر ایک زنانہ ہیئر پن مسہری کے نیچے پڑی جیک کو مل ہی گئی جو کسی عورت کی نشاندہی کر رہی تھی اور یقیناً وہ جیکولین کے سوا اور کسی کی نہ ہو گی۔ جیک کو پن اُٹھاتے دیکھ کر فرخ کے چہرے پر پہلے تو گھبراہٹ کے سائے نمودار ہوئے، پھر وہ سنبھل گیا۔ جیک نے حفاظت سے اس ہیئر پن کو اپنی جیب میں رکھ لیا اور تھوڑی دیر بعد محل میں سناٹا چھا گیا۔

شام کو فرخ نے اپنے معزز مہمانوں کی ضیافت کا کافی اہتمام کر رکھا تھا اور بڑی بے چینی سے اکرم کمال اور پری جمال قدسیہ کا انتظار کر رہا تھا۔ شام ڈھلتے ہی باپ بیٹی بڑے کروفر کے ساتھ اپنی گاڑی سے اُترے۔ فرخ جمال نے اُن کا شایانِ شان استقبال کیا۔ پہلے تو فخر سے اُنہیں قصر جمالی کا گوشہ گوشہ دکھایا، پھر ڈرائنگ رُوم میں آ کر گٹار پر ایک دھن بجا کر مہمانوں کی پذیرائی کی۔ شہزادی نے اُس کی خوش گلوئی کی خوب داد دی اور خود پیانو پر ایک دھن چھیڑ کر فرخ کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیا۔ وہ بے چین ہو کر اکرم کمال کے پہلو سے اُٹھ بیٹھا اور بے تابی کے عالم میں قدسیہ کے آگے پیانو پر ہاتھ ٹھیک کر اپنی بے چین نگاہیں اُس کے حسین چہرے پر گاڑ دیں۔

چھ کنواریوں کے حسنِ معصوم میں سے صرف دو نے اُس کے جذبات کو چھیڑا تھا اور یہ ساتویں...... یہ تو

سرتاپا قیامت تھی۔ اس قیامت نے اُس کے دل میں طوفان مچا رکھا تھا۔ قدسیہ کی آنکھیں فرخ کی نظروں سے دوچار ہوئیں اور اُس کے دل میں محبت کی چنگاریاں پھوٹ پڑیں۔ وہ فرخ جمال کے حسن و جمال اور ساحرانہ طرزِ انداز سے کافی مرعوب تھی۔ وہ جیک کے شبہات اور دلائل پر یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔ مگر وہ کافی ذہین بھی تھی اُس نے سوچا کہ فرخ کی آنکھوں میں کون سا سحر ہے کہ نظریں چار ہوتے ہی پیار کا سوتا پھوٹ پڑتا ہے؟ وہ جب تک قریب رہتا ہے اُس کا دل سینے میں دھڑکتا رہتا ہے۔ یہ غلبہ شدت اختیار کرتا رہتا ہے۔ جب وہ دُور ہو جاتا ہے تو یہ مدھم پڑ جاتا ہے۔ آخر یہ کیا ہے؟ کیا ہے؟ اس کی آنکھوں سے پھوٹنے والی پُراسرار شعاعیں اس کے دل کی گہرائیوں میں اُترتی کیوں چلی جاتی ہیں؟ پھر ان سارے سوالوں کا جواب اُسے جلد ہی مل جاتا۔ مافوق الفطرت، غیر انسانی، ہپناٹزم...... وہ خود ہی سوچتی۔ خوف کی کوئی وجہ تو نہیں۔ اگر بقول جیک مارلے کے یہ کوئی شیطانی چکر ہے اور فرخ وہ درندہ ہے جس کا مقصد حسن و شباب کا شکار ہے تو تجربہ کرنے میں کیا نقصان ہے؟ میرے گلے میں پیرومرشد کا عطا کردہ ہیکل ہے وہ میری عصمت اور آبرو کا محافظ ہے۔ سانپ کو اس کے بل سے باہر نکال کر سر کچلنے میں مزہ آجائے گا۔ اور پھر وہ مطمئن ہوگئی کہ جیک مارلے کے ساتھ ضرور تعاون کرے گی۔

ضیافت کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ قصر جمالی کے پُرسکون ماحول میں پتہ بھی نہ چلا کہ بادل گھر آئے ہیں۔ رات تاریکی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہے اور بجلی کی مسلسل چمک طوفان کا پتہ دے رہی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی جھکڑ شروع ہوگئے...... چمک اور گرج سے محل گونجنے لگا۔ اکرم کمال قدسیہ نے رخصت طلب کی اور جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے تو کار نے اسٹارٹ ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ فرخ نے اپنی گاڑی کی پیشکش کرتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے اکرم صاحب کہ آپ لوگوں کو بڑی زحمت ہوئی۔ طوفان تیزی کے ساتھ شدت اختیار کر رہا ہے اور ایسے موسم میں کار کا سفر خطرے سے خالی نہیں ہے۔ پھر بھی آپ مصر ہیں تو میری گاڑی حاضر ہے۔"

بیٹی نے باپ کی طرف دیکھا اور باپ نے بیٹی کی طرف۔ اور پھر دونوں خاموش ہو کر فرخ کے ساتھ ڈرائنگ رُوم میں واپس آگئے۔

"طوفان ذرا تھم جائے تو میں خود آپ لوگوں کو قیام گاہ تک پہنچا دُوں گا۔ ورنہ چشم ماروشن دل ماشاد آپ شوق سے آرام کریں۔ قصرِ جمال کے لئے یہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔"

تھوڑی دیر تک یہ لوگ ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے رہے۔ مگر یہ طوفان تو شیطانی چکر تھا۔ یہ بلا آسانی سے کب ٹلنے والی تھی؟ جب گھڑی نے دو بجائے تو اکرم کمال بادل نخواستہ اُٹھے۔ ساتھ ہی قدسیہ بھی۔ فرخ جمال اُن کی رہنمائی کرتا ہوا اُنہیں خوابگاہوں تک پہنچا گیا۔ ایک بیڈ رُوم میں صرف ایک ہی بیڈ تھا اس لئے اکرم کمال کی یہ خواہش کہ باپ بیٹی ایک ہی خوابگاہ میں آرام کریں، پوری نہ ہوسکی۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ فرخ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ قدسیہ کا معصوم حسن و شباب اُس کی آنکھوں میں گردش کر رہا تھا۔ اُس کا دل اُس کے پہلو میں مچل رہا تھا۔ کاش...... یہ آخری

شیطان کے پنجہ ستم سے محفوظ ہو جاتا۔

وہ دبے پاؤں اپنی خوابگاہ سے نکلا۔ اکرم کمال تو بے خبر سو رہے تھے مگر پہلو کی خوابگاہ میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔

"تو شہزادی جاگ رہی ہے...... اور ہماری طرح وہ بھی بے چین ہے۔" اُس نے سوچا اور بے خوف و خطر دستک دے دی۔ دوسری ہی دستک پر دروازہ کھل گیا اور قدسیہ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ کھڑی پلکیں جھپکا رہی تھی۔

"آپ......؟" اور آگے وہ کچھ نہ بول سکی، اس لئے کہ فرخ نے اندر داخل ہو کر اُسے اپنی آغوش میں لے لیا اور گلاب کی نرم و نازک پنکھڑیوں پر مہرِ ہوس ثبت ہوگئی......

"اس گستاخی کے لئے معافی کا طلب گار ہوں۔ اس دلِ بے تاب کی ساری خطا تھی۔ میں نہ تھا۔" اس نے گھٹنے ٹیک کر قدسیہ کا دامن پکڑ لیا۔ شہزادی پُرسکون تھی۔

"کیا تمہیں معلوم ہے فرخ کہ میرے ہونٹوں کو آج تم نے پہلی بار گنہگار کیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے شہزادی صاحبہ......"

"جانتے ہو اس کی سزا کیا ہے؟"

"سب جان کر بھی کچھ نہیں جانتا۔ محبت اگر جرم ہے تو شہزادی کے ہاتھوں قتل ہو جانا بھی منظور ہے۔"

شہزادی نے فرخ کے ہاتھ کو پکڑ کر اُٹھایا اور بڑے وقار کے ساتھ اُس کو لئے ہوئے مسہری پر بیٹھ گئی۔ فرخ اُس کے قدموں میں ہی بیٹھا رہا۔

"اس کی سزا دائمی محبت کے عہد و پیماں کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔"

فرخ کا دل یہ سن کر باغ باغ ہوگیا۔ وہ کھڑا ہوا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور بولا۔ "دل و جان سے منظور ہے میری حسین شہزادی! مگر اس کے لئے آپ کو میرے ساتھ تن تنہا کوہ ایلپس کی پہلی چوٹی تک چلنے کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی جہاں ایک قدیم معبد میں ہم دونوں یہ مقدس رسم ادا کریں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر کیا؟"

"شام ڈھلے میں نیشنل پارک میں شہزادی کا انتظار کروں گا۔"

"اچھا پیارے شہزادے...... شب بخیر۔"

"شب بخیر......" اور فرخ مسرت سے جھومتا ہوا اپنی خوابگاہ میں آگیا۔

دن کے وقفے میں اکرم کمال، قدسیہ اور جیک مارلے میں رابطہ قائم ہوگیا تھا اور شام سے پہلے ہی جیک مارلے کی قیادت میں ایک مسلح دستے نے دارالابلیس کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔ اکرم کمال بھی جیک کے ہمراہ تھے۔

سرِشام قدسیہ اور فرخ کی نیشنل پارک میں ملاقات ہوئی اور دونوں فرخ کی کار میں روانہ ہوگئے۔ دامن کوہ کچھ زیادہ دُور نہ تھا۔ شام ڈھلے وہ کوہ کی بلندیوں پر پہنچ کر رُک چکے تھے۔ شہزادی کوہ پیمائی سے نا آشنائی کی وجہ سے تھکی جا رہی تھی لیکن عزم و استقلال کی یہ حسین دیوی سراپا جرأت ثابت ہو رہی تھی۔

آج شیطانی طوفان بھی خاموش تھا ورنہ اس نازک اندام حسینہ کے لئے چوٹی سر کرنا دوبھر ہو جاتا۔

آخر وہ منزل مقصود پر پہنچ کر معبد میں داخل ہو گئے۔ مگر فرخ جمال پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا
اُس نے دیکھا کہ شیطانی مجسمے نے گرم جوشی کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ وہ ایک بت کی طرح سا
خاموش رہا۔ نہ تو روشنیوں کا دھماکہ ہوا اور نہ ہی اُس بت کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل کر اس پر
کنواری کو بے ہوش کر سکیں۔ بس ایک پراسرار خاموشی کا راج تھا اور دونوں حیرت سے شیطانی مجسمے
رہے تھے۔ آخر فرخ جمال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اُس نے بت کے قدموں میں گھٹنے ٹیک دیے

"اے عظیم طاقت..... آج میں تیری بھینٹ کے لئے آخری تحفہ پیش کرنے آیا ہوں۔ اس کو قبول
پھر بھی بت میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ البتہ ایک بھیانک قہقہے سے معبد کا گنبد گونج اُٹھا۔ اور اس
گرجدار آواز سے فضا تھرا گئی۔

"احمق انسان..... تیرے کچھ تحفے تو عین شرائط کے مطابق تھے اور انہیں میں نے قبول کر لیا
طاقتوں میں چھ گنا اضافہ کر دیا۔ مگر آج تو کس کو لایا ہے؟ اس سے پوچھ کہ اس کے دل کے کس گو
تیری محبت جاگزیں ہے؟ اس سے پوچھ کہ یہ دل ہی دل میں کس کو یاد کر رہی ہے؟ اس سے پوچھ
نے اپنے داہنے بازو پر کیا باندھ رکھا ہے؟ اگر تو اس کے ملکوتی حسن و جمال میں گرفتار ہو کے یہ
جاتا کہ یہ تیری موت کا فرشتہ بھی بن سکتی ہے تو، تو اپنی اس آخری مہم میں چھلانگ لگاتے وقت اپنے
حواس نہ کھو بیٹھتا اور اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھتا۔ سب سے پہلے تو، تو نے اپنی نصف سے زیادہ
جیکولین کے ساتھ ضائع کر دی اور جیکولین ہی تیری تباہی کا باعث بنی۔ سرکاری سراغ رساں جو
بھی نہیں پا سکتا تھا، اسی سراغ رساں نے دونوں باپ بیٹی کا تعاون حاصل کیا۔ اور سن اے احمق آ
کہ یہ معبد اسی سراغ رساں اور اکرم کمال کی قیادت میں مسلح دستوں سے گھیرا جا چکا ہے۔ اور سن ا
کی احمق اولاد..... یہ حسینہ خدا اور اس کے دین کی سچی پرستار ہے۔ یہ تیرے حسن لازوال کی دلکشی
متاثر ضرور ہوئی۔ اور اگر تو آنکھیں بند نہ کر لیتا تو تیرا یہ تحفہ سب سے عظیم تحفہ ثابت ہوتا۔ سن اے
انسان..... آج تو اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں گرفتار ہو چکا ہے۔ مگر میں تجھے ایک آخری موقع
دوں گا۔ اگر ہمت ہے تو قبل اس کے کہ میں تیری نجس و ناپاک روح پر قبضہ کروں، اس معزز
عصمت کا دامن اسی معبد میں چاک کر دے....."

اور یکایک فرخ جمال کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ اُس نے پہلے تو مسکراتی قدسیہ کو قہر آلود
سے گھورا، پھر اُس پر چھلانگ لگا دی۔ لیکن قدسیہ بھی غافل نہ تھی۔ اُس نے اُس کے سینے پر ایک
لات ماری اور کترا کر دُور جا کھڑی ہوئی۔ فرخ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح غرایا اور دوسری
میں قدسیہ کو دھکیلتا ہوا شیطانی مجسمے کے قدموں تلے لے آیا۔ لیکن جونہی اُس نے قدسیہ کے بازو
اُس کو ایک جھٹکا لگا اور وہ چاروں شانے چت ڈھیر ہو گیا۔ اتنے میں جیک مارلے اور اکرم کمال
دستوں کے معبد کے اندر گھستے چلے آئے اور سب نے مل کر بڑی مشکل سے اُس ناپاک وجود پر قا
ابھی فرخ کو ہتھکڑی ڈالی ہی جا رہی تھی کہ روشنی کے ایک تیز دھماکے سے معبد بقعہ نور بن گیا۔

آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں اور شعلوں کی بوچھاڑ فرخ کو جلانے لگی۔ مسلح فوجی گھبرا کر الگ ہو گئے
پھر سب نے دیکھا کہ بجائے وہاں فرخ جمال کے حسین خوبصورت جسم کے ایک بوڑھے کا بھیانک ڈھانچہ
پڑا ہوا ہے جس کا چہرہ بھیڑیئے سے مشابہ تھا.....

شیطانی قہقہے کے ساتھ ایک گرجدار آواز سے معبد کا گنبد لرز گیا۔ "یہ لاش ستر سالہ جیمس ویگز کی ہے جو
خودکشی کے ارادے سے یہاں آیا تھا اور پھر اپنی رُوح کے تبادلے میں لازوال حسن و شباب، لافانی
طاقت اور بے پایاں دولت کا مالک بن بیٹھا..... اسے سات پری جمال کنواریوں کو اپنے دام محبت میں
گرفتار کر کے میری بھینٹ چڑھانا تھا مگر آخری مہم میں یہ حد سے زیادہ جذباتی ہو کر جیک مارلے کی
سازش کا شکار ہو گیا....."

پھر ایک طویل سناٹا چھا گیا..... ایک پراسرار خاموشی..... شہزادی قدسیہ ناز آفریں، ویگز کی لاش کے
سرہانے دوزانو بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سب آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔

"اے رحیم و کریم آقا..... اے قادر مطلق..... اس بدنصیب انسان کی رُوح کو شیطان لعین کے نحس
پنجے سے آزاد کر دے۔ یہ انسانی حرص و ہوس کا شکار ہو کر تجھے فراموش کر بیٹھا تھا۔ اے صاحب جلال و
جمال..... میں تجھے ان چھ معصوم بہنوں کا واسطہ دیتی ہوں جنہیں اس حریص انسان نے ابلیس ملعون کی
بھینٹ چڑھا دیا۔ ان مقدس رُوحوں کو بھی میرے مالک، آزاد کر کے اپنی پناہ میں لے لے....." اور پھر
قدسیہ کے لبوں سے سورۃ یٰسین کے پھول جھڑنے لگے۔ اکرم کمال اپنی محبوب بیٹی کے پہلو میں مودب بیٹھ
گئے اور جیک مارلے معہ مسلح دستے کے اپنی ٹوپیاں اُتار کر اس مجسم نور و سراپا حسن و جمال کو عقیدت بھری
نظروں سے دیکھنے لگے جس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر بوڑھے ویگز کے چہرے کو تر کر رہے تھے۔

پھر ایک حیرت انگیز نظارہ دیکھنے میں آیا..... شیطانی مجسمے نے ایک دلدوز چیخ ماری اور چشم زدن میں
وہ مہیب بت ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا..... اب ویگز کا بھیڑیا نما چہرہ انسانی رُوپ دھار چکا تھا اور گنبد کے
آخری سرے پر چھ حسین رُوحوں کا آسمانی نغمہ گونج رہا اُٹھا..... ایک قطار میں سفید حریری لباس میں ملبوس
یہ رُوحیں اپنی تشکر آمیز نگاہیں قدسیہ پر ڈالتی ہوئی فضا میں تحلیل ہو گئیں..... اور کوہ ایلپس کی حسین وادیاں
ان رُوحوں کے ملکوتی نغموں سے گونج اُٹھیں جنہیں شیطان لعین نے خودکشی کی ترغیب دی تھی۔ آخر کار
شیطان کو شکست ہوئی..... اُس کا بت پاش پاش ہو گیا۔ اُس کا گھمنڈ ٹوٹ گیا کہ وہ ناقابل شکست ہے۔
اسے منہ کی کھانی پڑی۔"

انا زبیدہ کی پراسرار آواز اُبھری اور رجنی چونک پڑی۔ وہ اس ہولناک داستان میں اس طرح کھو گئی
تھی کہ اُسے دنیا جہاں کی خبر نہ رہی تھی۔ اُس نے کھوئی کھوئی نظروں سے انا زبیدہ کو دیکھا تو پراسرار عورت
کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس وقت رجنی کو کسی کے الفاظ یاد آ گئے۔

"وہ تو خود ایک رُوح ہے۔ وہ زندہ کہاں ہے؟"

کیا واقعی انا ایک رُوح ہے.....؟ ایک پراسرار رُوح.....؟ اسی وقت انا زبیدہ کی آواز اُبھری۔

"ہم معمولی سے لوگ ہیں..... وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہ علم الملکوت، علم و آگہی کا

سمندر اور ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود معبود کریم نے ہمیں اس پر فوقیت دی ہے اور شکست دے سکتے ہیں۔ تو کیوں نہ ستارہ، ہم اُس کے خلاف ایک محاذ قائم کریں۔ ہم اوقات مدد کر سکتے ہیں کریں۔ کیا خیال ہے؟"

"بے شک...... ہمیں ایسا کرنا چاہئے۔"

"میں ایسے حالات میں تمہیں اپنا شریک رکھوں گی۔"

اُنہیں بہت جلد اس کا موقع مل گیا۔ اُس لڑکی کا نام عالیہ تھا اور اُسے ایمان علی ساتھ لایا تھا۔

"یہ بیچاری ایک مشکل کا شکار ہے اور آپ سے مدد چاہتی ہے انا زبیدہ۔"

"بیٹھ جاؤ بیٹی۔ کیا بات ہے؟"

"میں بہت پریشان ہوں بزرگ خاتون...... ایسے انوکھے حالات میں پھنس گئی ہوں کہ" گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

ایمان علی نے کہا۔ "واقعات کچھ جرم کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پس منظر میں ہاتھ ہے جسے شیطان کہا جاتا ہے۔ وہی برائی کا روح رواں ہے۔"

"کیا تم مجھے اپنے بارے میں تفصیل نہیں بتاؤ گی؟"

"مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔"

"ہاں، میں پوری کوشش کروں گی۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

لڑکی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میں اس وقت سے اپنے بارے میں بتاؤں گی جب کسی حادثے نے مجھ سے یادداشت تھی۔ میں نہ جانے کہاں تھی؟ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بس جس وقت آنکھ کھلی تو ذہن پر غنودگی تھی۔ گرمی کی شدت اور سر کے پچھلے حصے میں اُٹھنے والی درد کی لہروں کے سوا کوئی احساس نہیں بے حس و حرکت لیٹی بے مقصد سامنے گھورے جا رہی تھی۔ میری نظروں کا کوئی مرکز نہیں تھا۔ دُھندسی تھی جس نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ کوئی چیز واضح نہیں تھی۔ ملی جلی آوازیں بھنبھناہٹ میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ آوازیں کسی کنوئیں کی گہرائی ہوں۔ ایک مترنم آواز ان سب آوازوں پر غالب آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے بھی اپنی تما اُسی ایک آواز پر مرکوز کر دی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز واضح ہوتی چلی گئی۔

"اب تم ہوش میں آ رہی ہو۔ چند سیکنڈ اسی طرح بے حرکت لیٹی رہو۔ میرے تمہارے خون حاصل کرنا چاہتی ہوں۔" اسی لمحے مجھے اپنے دائیں بازو پر نازک سی اُنگلیوں کے لمس کا احساس ابھی اُنگلیوں کے اس لمس کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ میرے منہ سے بے اختیار سسکار گئی۔ بازو میں پیوست ہونے والی سوئی کی چبھن خاصی تکلیف دہ تھی۔

"بس چند سیکنڈ...... زیادہ تکلیف نہیں ہوگی مس عالیہ۔ ٹیسٹ کرنے کے لئے خون کے چند کافی ہوں گے۔" وہ ملائم سی آواز اس مرتبہ میرے کان کے بہت قریب سے اُبھری تھی۔

سوئی بازو سے نکل گئی۔ اب درد کا ہلکا سا احساس باقی رہ گیا تھا۔ لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ ن کے چند قطرے نکلنے سے میرے سر کا درد کچھ ہلکا ہو گیا تھا اور میں اپنے آپ کو بڑی حد تک بہتر محسوس رنے لگی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے سر کو دائیں طرف گھمایا۔ درمیانے قد کی ایک دُبلی پتلی عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔ آنکھوں پر نازک سے اسٹیل فریم کی عینک، کانوں میں ہلکے سے دے، ناک میں چھوٹی سی تھنی جس میں ننھا سا نگ جگمگا رہا تھا۔ بڑی بڑی شربتی آنکھیں اور کمر تک لتے ہوئے ریشمی سیاہ بال۔ اُس نے سفید رنگ کی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ اُس کے اس طرح مسکرانے سے چہرے پر باریک سی ریں نمودار ہو گئی تھیں جس سے وہ اپنی عمر سے کچھ بڑی نظر آنے لگی تھی۔ لیکن چہرے کی یہ باریک سی ریں بھی اُس کے حسن کو متاثر نہ کر سکیں۔ اس طرح گردن گھمانے سے میرے سر کے پچھلے حصے میں بار پھر درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ لیکن میں اس ملاحت آمیز چہرے کو دیکھتی رہی۔

"کیا تم ڈاکٹر ہو......؟" میں نے مرتعش لہجے میں پوچھا۔

"ہاں......" اُس کی غزالی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ "میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا لیکن اس ت تم پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ میں تمہاری طرف سے بہت فکرمند رہی ہوں۔ تم جب سے یہاں آئی تھوڑی دیر کو ہوش میں آنے کے بعد پھر بے ہوش ہو جاتی رہی ہو۔ بہرحال، اب میں تمہاری حالت ے قدرے مطمئن ہوں۔"

"کب سے یہاں آئی ہوں؟" میں بڑبڑائی۔ میری آنکھوں میں اُلجھن پیدا ہو گئی۔ میں سوچنے لگی کہ ون سی جگہ ہے؟ میں یہاں کب اور کیوں آئی تھی اور مجھے کیا ہوا ہے؟ ذہن پر زور دینے سے سر کا درد ت اختیار کر گیا۔ دماغ میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ میں نے بے بسی سے سر جھٹک دیا۔

"مم...... مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ فی الحال دماغ پر بوجھ نہ ڈالو۔ یہ کیفیت وقتی ہی ہے۔ ویسے تم ل قسمت ہو کہ جب تم پر حملہ کیا گیا تو ٹرین چندرات پہنچ رہی تھی۔ جلتے ہوئے اس صحرا میں بیسیوں میل کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کسی قسم کی طبی امداد مہیا ہو سکے۔ ہمارا یہ اسٹال اگرچہ بہت مختصر سا ہے لیکن میں شش کرتی ہوں کہ یہاں مریضوں کو ہر ممکن سہولتیں حاصل ہوں۔ میں یہاں کی واحد ڈاکٹر ہوں۔ گھبراؤ ، یہاں تمہاری مناسب دیکھ بھال ہو گی۔ سر میں درد کی تکلیف بھی جلد رفع ہو جائے گی۔"

"لل...... لیکن......" میں متوحش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ "لیکن...... مجھے کچھ معلوم نہیں ہ میں یہاں کیسے آئی تھی؟ یہ...... کون سی جگہ ہے؟"

"کیا...... کیا تمہیں وہ حادثہ یاد نہیں؟" ڈاکٹر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "تمہیں اتنا تو یاد گا کہ تم ٹرین میں سفر کر رہی تھیں اور کسی نے تم پر حملہ کر دیا تھا۔"

"ٹرین میں سفر...... حملہ......؟" مجھے اپنے پیٹ میں گرہ سی پڑتی محسوس ہوئی۔ "نہیں ڈاکٹر، مجھے یاد ..... کچھ بھی یاد نہیں۔ مم...... مجھے تو اپنا نام بھی یاد نہیں...... میں کون ہوں؟"

"تمہارا نام عالیہ ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "عالیہ خاتون۔" ڈاکٹر آگے بڑھ کر میرے سر اور بندھی ہوئی پٹیوں کا جائزہ لینے لگی۔ بڑی شدت کی گرمی تھی۔ ہر چیز دہک رہی تھی۔ یہ لمبا چوڑا کم طرح تپ رہا تھا۔ میرے سر میں ایک بار پھر درد کی شدید لہریں اُٹھنے لگی تھیں۔ میرے دانت گئے اور میں نے تکلیف سے نجات کے احساس سے آنکھیں بند کرلیں۔ میری گردن اور سر کا معا کے بعد ڈاکٹر نے پٹیاں دوبارہ باندھ دیں اور میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔

"اب تم آرام کرو...... ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ اس وقت کچھ دیر کی نیند تمہارے لئے ثابت ہوسکتی ہے۔"

"لیکن...... میں کہاں ہوں...... یہ کون سی جگہ ہے...... کیا میری یادداشت......؟" کسی نامعلو کے تحت میں جملہ پورا نہ کرسکی۔

"تم ہندوستان میں ہو۔ چندراٹ نامی یہ چھوٹا سا قصبہ، راجستھان کے صحرا کے کنارے وا تمہارا نام عالیہ خاتون ہے۔ اور اب تم آرام سے سو جاؤ۔" ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکر گئی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور نہ جانے ان نگاہوں میں کیا سحر تھا کہ میری خود بخود بند ہونے لگیں۔

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو ماحول نیم تاریک تھا۔ وارڈ کے آخری سرے پر چھت سے لٹکا روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس بلب کی بیمار روشنی اتنے بڑے کمرے کی تاریکی دُور کرنے کے ناکافی تھی۔ میں اُداس سی نظروں سے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے یہ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی کون ہوں اور راجستھان کے دُور دراز قصبے چندراٹ کے اس ہسپتال میں کس طرح پہنچی؟ ڈاکٹر تھا کہ ٹرین میں سفر کے دوران کسی نے مجھ پر حملہ کردیا تھا جس سے میرے سر اور گردن پر چوٹیں لیکن میں ٹرین پر کہاں جارہی تھی اور مجھ پر حملہ کس نے اور کیوں کیا تھا......؟ میرے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ تیز سنسناہٹ کے باعث سر میں ایک بار پھر درد ہونے لگا اور میں سر جھٹک کر رہ گئی۔ اسی لمحے کراہنے کی آواز سن کر میں چونک گئی۔

میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ کراہوں کی یہ آواز اُس سکرین کے عقب سے اُبھر رہی تھی جو میرے ساتھ والے بیڈ کے درمیان ایستادہ تھی۔

"اے...... کون ہے؟ کیا میں تمہاری کوئی مدد کرسکتی ہوں؟" میں نے آہستگی سے اپنے بیڈ ہوئے کہا۔ جواب میں کراہوں کے ساتھ اب سسکیوں کی آواز بھی سنائی دینے لگی جیسے میرے الفاظ اُس پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئے ہوں۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی سکرین کی دوسری جانب پہنچ گئی۔ بیڈ پر ایک بوڑھا حس وحرکت پڑا تھا اور ایک نوجوان لڑکی پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ بوڑھے جسم پر ایک بوسیدہ سا چغہ تھا۔ اُس چغے کا رنگ اگرچہ سفید ہی تھا مگر وہ اس قدر میلا چیکٹ ہو رنگت کی شناخت کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ بوڑھے کے سر کے بال چاندی کے تاروں کی طرح سفید

کا ایک ہاتھ سینے پر تھا اور دوسرا لڑکی کے ہاتھوں میں جسے وہ اپنی گرفت میں لئے زار وقطار رو رہی لڑکی کے سیاہ لمبے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ آہٹ پا کر اُس نے میری طرف دیکھا، ساروں پر آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

مجھے دیکھ کر اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کچھ اور بھی بھیگ گئیں۔ "بابا مرگیا......" وہ سسکی بھرتے ے بولی۔ "بابا مجھے چھوڑ گیا...... اب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ بابا مرگیا۔"

میں ہمدردانہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بالکل نوعمر تھی۔ ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا جسم پر جو لباس نظر آرہا تھا وہ کسی زمانے میں بہت اچھا رہا ہوگا مگر اب تو کثرت استعمال سے اُس کی اُڑ چکی تھی اور کہیں کہیں سے بخیے اُدھڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اُسے اس طرح بلک بلک کر تے دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ اس بوڑھے سے اس کا کیا رشتہ تھا؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ مگر یہ واقعی اذیت ات تھی کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس سے منہ موڑ چکا تھا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ وہ اس میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اس کے اور رشتے دار بھی تو ہوں گے۔ بہن، بھائی، ماں یا کوئی اور عزیز۔

"حوصلہ رکھو بہن......" میں نے ہمدردانہ لہجے میں اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ صدمہ واقعی بل برداشت ہے۔ مگر استقلال کا دامن نہ چھوڑو۔ مجھے اپنا سمجھو اور بتاؤ، میں تمہارے لئے کیا کرسکتی ؟ تمہارے عزیزوں کو اطلاع دی جائے؟"

"میرے عزیز......؟" لڑکی نے اشکبار نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "کوئی بھی نہیں بچا۔ جب را ہوا تو پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے اس قافلے کو تہہ تیغ کردیا گیا جس میں میرے عزیز تے دار بھی شامل تھے۔ ہم اس قافلے تک پہنچ سکے تھے۔ ہمیں گاؤں کے چند نیک اور ذمہ دار آدمیوں اپنی پناہ میں لے لیا۔ انہوں نے بہت عرصے تک ہمیں چھپائے رکھا لیکن...... اب میں کہاں اں...... اس دنیا میں میرا کون ہے؟"

اُس کا نام حسینہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک ہچکیاں بھرتی رہی، پھر میرے پوچھنے پر بتانے لگی کہ وہ اس گاؤں رہنے والی ہے۔ اس کا باپ مسلمان تھا جس نے ایک ہندو عورت سے شادی کرلی تھی۔ باپ کی گاؤں کریانے کی دُکان تھی اور نابینا دادا گاؤں کی چھوٹی سی مسجد کا پیش امام تھا۔ فسادات سے پہلے ہندو مسلم و شکر تھے۔ لیکن فساد کی آگ بھڑکتے ہی سارے رشتے ناتے ٹوٹ گئے...... جو دوستی اور بھائی چارے کا بھرتے تھے، جان کے درپے ہوگئے۔ ہر گاؤں اور دیہات میں مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا جارہا تھا، کی املاک کو نذر آتش کیا جارہا تھا۔ حسینہ کا باپ بھی اپنے چند جگری دوستوں کے ساتھ ہلاک ہوگیا۔ کی ماں نے مسلمانوں کے ایک مختصر سے قافلے کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش کی لیکن وہ بھی ہندوؤں انتقام سے نہ بچ سکی۔ اُسے اُس کے ماموں زاد نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ حسینہ اور اُس کے نابینا کو چند نیک دل آدمیوں نے بچا لیا۔ دلوں میں نفرت کی بھڑکتی ہوئی آگ ذرا سرد ہوئی تو صورت حال کسی حد تک بدل گئی۔ حسینہ اور اُس کے اندھے دادا کو اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ گاؤں کی مسجد ویران ہو تھی۔ کوئی نمازی ہی نہ رہا تھا تو مسجد کیسے آباد ہوتی؟ حسینہ اور اُس کا نابینا دادا مقامی ہندوؤں کے رحم و

کرم پر تھے۔ کبھی کوئی ترس کھا کر بچی کچھی روٹی دے دیتا اور کبھی یہ دونوں گلیوں میں بھیک مانگ
پرورش کسی حد تک گاؤں کے ملے جلے ماحول میں ہوئی تھی اور خیال تھا کہ عنقریب ان دونوں کو
کے ساتھ پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ لیکن اس دوران اس کا دادا بیمار پڑ گیا۔ گاؤں کے چھوٹے
میں اُس کا علاج ہوتا رہا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا اور بالآخر اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ اب حسینہ
تھی۔ پاکستان میں بھی اُس کا کوئی عزیز نہ تھا جہاں اُسے پناہ ملتی۔

"واقعی یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ ویسے میرے خیال میں تمہارا پاکستان چلے جانا ہی منا
وہاں کسی شریف نوجوان سے شادی کر کے گھر بسا لینا۔" میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"شادی......؟" اُس نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "کوئی پاکستانی نوجوان
لڑکی سے شادی نہیں کرے گا جو آدھی ہندو ہو۔ اور یہاں چندراٹ میں بھی کوئی ہندو ایسی لڑکی
کرنے کو تیار نہیں ہو گا جس کا باپ ایک مسلمان تھا۔"

"ارے...... مس عالیہ، اپنے بیڈ پر جایئے۔" ڈاکٹر کی آواز سن کر میں اُس کی طرف متوجہ ہوگئی
قریب پہنچ کر اُس نے حسینہ کی اشکبار آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی نظریں حسینہ کے
طرف اُٹھ گئیں جو دنیا کے تمام جھنجھٹوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ وہ جلدی سے بیڈ پر جھک گئی۔ نبض
بوڑھے جسم میں زندگی کی کوئی رمق تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن بوڑھی رگوں میں خون کی گردش
تھی۔ اُس نے سیدھے ہو کر دروازے پر کھڑے ہوئے اردلی کو کچھ ہدایات دیں اور ہندی زبان
حسینہ کو تسلی دلاسہ دینے لگی۔ ساتھ یہ وہ دھیرے دھیرے اُس کا کندھا بھی تھپتھپا رہی تھی۔ پھر
جھک کر بوڑھے کی لاش پر چادر ڈال دی اور میری طرف رُخ کر کے بولی۔

"مس عالیہ...... پلیز چند گھنٹوں تک اپنے بستر سے نہ ہلیں۔ آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے"

"میں اسے روتے ہوئے دیکھ کر یہاں آ گئی تھی۔" میں نے حسینہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب
"کس کس کی آہیں سنو گی؟" ڈاکٹر کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آ گئی۔ "اور تمہاری یادداشت
کیا حال ہے؟"

"ختم ہو چکی۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ "کبھی کبھی ذہنی طور پر مجھے دھچکا
ہے۔ لیکن کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو تاریکی چھا جاتی ہے۔ اب تم ہی مشورہ دو ڈاکٹر کہ
کرنا چاہیے؟ کیا پاکستانی قونصل خانے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں؟"

"چندراٹ ایک غیر معروف اور چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں کسی ملک کا کوئی سفارتی نمائندہ نہیں
اگر تم چاہو تو میں وہیں اطلاع بھجوا سکتی ہوں۔ لیکن اس وقت میرا مشورہ ہے کہ تم آرام کرو۔ اپنے
اور کاغذات کا جائزہ لو۔ ممکن ہے کوئی چیز نظر آ جائے جس سے تمہاری یادداشت عود کر آئے۔ میں
مسٹر بہادر سے ملواؤں گی۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کس لئے......؟" میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"مسٹر بہادر...... ان دنوں چندراٹ میں صرف وہی ایک مسلمان شخص ہے۔ اُس سے مل کر تمہیں

خوشی ہو گی۔" ڈاکٹر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ اسی وقت درمیانے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی ٹرے
اُٹھائے میرے بیڈ کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے تنگ سی پتلون پر ڈھیلا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر
دھاری دار کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے ٹرے میرے بستر پر رکھ دی جس میں ایک پیالے میں
گدلا شوربا اور تام چینی کی پلیٹ میں دو چپاتیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"یہ میرا اسسٹنٹ جگت سنگھ ہے۔ میری عدم موجودگی میں ہسپتال کی تمام ذمہ داریاں یہی پوری کرتا
ہے۔" ڈاکٹر نے کہا اور وارڈ کے آخری بیڈ کی طرف دیکھنے لگی جہاں ایک مریضہ کراہ رہی تھی۔ دوسرے ہی
لمحے ڈاکٹر تیز تیز قدم اُٹھائے ہوئے اُس طرف بڑھ گئی۔

میں نے بستر پر رکھی ہوئی کھانے کی ٹرے اُٹھا کر سٹول پر رکھ دی اور سامنے دیوار پر نظریں جماتے
ہوئے سوچنے لگی کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟ ڈاکٹر بملا کے مطابق ٹرین کے دوران مجھ پر حملہ کیا گیا
تھا۔ دماغ پر بوجھ ڈالنے سے ذہن میں تیز رفتار ٹرین کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کی سی آواز گونجنے لگی۔ لیکن
مجھ پر حملہ کیوں ہوا تھا؟ حملہ آور کون تھا اور کیا چاہتا تھا؟ اس کے بارے میں ذہن میں کوئی بات نہ آ سکی۔
دماغ کی نسوں میں تناؤ سا پیدا ہونے لگا۔ سیاہی کی چادر پھیلنے لگی۔

میں نے سوچنا چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے
ٹرے اُٹھا کر سامنے رکھ لی اور شوربے میں نوالے بھگو بھگو کر کھانے لگی۔ ماحول میں ایک عجیب سی
پراسراریت تھی۔ اجنبی لوگوں میں گھری ہوئی، میں خود اپنے آپ سے اجنبی تھی...... کھانا ختم کرنے کے
بعد میں ایک بار پھر اپنے بارے میں سوچنے لگی۔ ذہن میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی جو رفتہ رفتہ گڑگڑاہٹ
میں بدلتی چلی گئی۔ اچانک ایک جھٹکا سا لگا...... جیسے کچھ یاد آ رہا ہو۔ لیکن پھر ایک دم تاریکی چھا گئی۔ تیز
رفتار ٹرین کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ...... حملہ آور...... تاریکی...... کوئی بات ذہن کے تاریک گوشوں سے
اُبھر کر سامنے آنا چاہتی تھی لیکن ہر مرتبہ دماغ میں سوئیوں کی چبھن سی ہونے لگتی۔ میں نے پلنگ پر لیٹ کر
آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ میں کبھی بجلی کے کوندے سے لپکنے لگتے اور کبھی تاریکی چھا جاتی۔ پھر نہ جانے
کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح میں سوٹ کیس کھولے اپنے سامان کا جائزہ لے رہی تھی کہ حسینہ ناشتے کی ٹرے لئے پہنچ گئی۔ اُس
کے چہرے پر غم اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اُس نے ٹرے سٹول پر رکھ دی اور پلنگ کی پٹی پر
بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آج صبح سویرے میرے دادا کو پرانے قبرستان میں دفن کر دیا گیا ہے۔ اس کے مرنے
کے بعد اگرچہ ہسپتال میں میرے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن ڈاکٹر بملا نے مجھے مریضوں کی دیکھ بھال
اور اوپر کے کاموں کے لئے رکھ لیا ہے۔"

"چلو اچھا ہے۔ تمہارا دل لگا رہے گا۔" میں نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اس معصوم سی لڑکی کو
دیکھ کر میں نہ جانے کیوں افسردہ سی ہو رہی تھی۔

"میں ذرا دوسرے مریضوں کو ناشتہ وغیرہ دے دوں، پھر آپ کے پاس آ کر بیٹھوں گی۔ اگر میرے
لائق کوئی کام ہو تو بلا تکلف کہہ ڈالئے۔" حسینہ کہتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے ٹرے اپنے سامنے رکھی اور ناشتہ کرنے لگی جو دلیے اور
مشتمل تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے سامان کا جائزہ لینے لگی۔ نہ جانے مجھے
کیوں ہو رہا تھا کہ اس سامان میں سے کوئی چیز کم ہے۔ میں ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش
لگی کہ وہ کون سی چیز ہو سکتی تھی جس کی میں کمی محسوس کر رہی تھی؟ لیکن بڑی کوشش کے باوجود میں
مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے سوٹ کیس میں سے برآمد ہونے والا آئینہ اُٹھا کر اپنے سامنے
اور اس میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ چہرہ ستا ہوا سا تھا، آنکھوں میں سرخی کے ڈورے تھے، کمر تک پہنچے
سیاہ بال اُلجھے ہوئے تھے۔ دائیں کنپٹی پر بڑا سا سیاہ دھبہ تھا اور چہرے پر بھی ہلکی ہلکی خراشیں سی نظر
تھیں۔ اس وقت اگرچہ کسی تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیکن یہ سیاہ دھبہ اور خراشیں بڑی بدنما
رہی تھیں۔ میں نے آئینہ رکھ دیا۔ اسی وقت میری نظریں کپڑوں سے برآمد ہونے والی ایک تصویر
گئیں۔ ایک جوان عورت کی تصویر تھی۔ سلیقے سے بنے ہوئے بال، صبیح، بے داغ اور دلکش چہرہ،
کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں اور پرنٹ کی ساڑھی میں اُس کا حسن کچھ اور بھی نکھرا نکھرا سا لگ رہا
میری تصویر تھی۔ لیکن میں اس تصویر سے کتنی بدلی ہوئی تھی...... اٹیچی کیس کی جیب سے ایک پاسپورٹ
مل گیا۔ پاسپورٹ پر جس عورت کی تصویر تھی وہ دوسری تصویر سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ یہ بھی میری
تصویر تھی۔ میں پاسپورٹ کے اندراجات پڑھنے لگی۔

پاسپورٹ کے مطابق میرا نام عالیہ خاتون تھا۔ عمر چوبیس سال اور میں بیوہ تھی۔ بیوگی کے
سے میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ لیکن پھر تاریکی چھا گئی اور میں سوچنے لگی کہ میرا شوہر کون
پاسپورٹ میں اُس کا نام ندیم عارف تھا۔ لیکن میری شادی کب ہوئی تھی اور میرے شوہر کا انتقال کب
کس طرح ہوا تھا؟ لیکن کوئی بات یاد نہ آسکی۔ میرا قد پانچ فٹ چھ انچ، وزن ایک سو پونڈ، بال
آنکھیں بھی سیاہ تھیں۔ اس پاسپورٹ کے مطابق میں پاکستانی شہری تھی اور سیلون، نیپال، برما اور
ہوتی ہوئی بھارت میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن میں نہیں سمجھ سکی کہ میں اتنا طویل سفر کیوں کرتی رہی تھی
سفر کا مقصد کیا تھا؟ میں ہینڈ بیگ اُٹھا کر اس میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ ہینڈ بیگ میں
اپ کی تمام ضروری چیزوں کے علاوہ تقریباً دو ہزار روپے کی مالیت کے لگ بھگ ہندوستانی کرنسی نوٹ
موجود تھے۔ بیگ میں اتنی بڑی رقم کی موجودگی میرے لئے اُلجھن کا باعث بن گئی۔ ڈاکٹر بملا کے
کے مطابق مجھ پر ٹرین میں حملہ کیا گیا تھا۔ لیکن حملہ آور کا مقصد اگر مجھے لوٹنا تھا تو وہ رقم کیوں چھوڑ
میرے لئے مزید اُلجھن کی بات یہ تھی کہ میں ٹرین میں کہاں جا رہی تھی؟ میں جتنا سوچتی، اتنا ہی
بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر کنگھا اُٹھا لیا اور بال سلجھانے لگی۔

اسی دوران حسینہ آگئی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کنگھا میرے ہاتھ سے لے لیا اور میرے
سلجھانے لگی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دراز قامت آدمی وارڈ میں داخل ہوا۔ چند لمحے
اُدھر دیکھتا رہا، پھر نپے تلے قدم اُٹھاتا ہوا میرے بیڈ کے قریب آکر رُک گیا۔ اُس کا جسم صحت
آنکھوں میں تجسس کی چمک تھی۔ بڑی بڑی مونچھیں اُس کی شخصیت کو بڑا پُروقار بنا رہی تھیں۔

وہ چند لمحے متجسس نگاہوں سے میرے سراپے کا جائزہ لیتا رہا، پھر مدھم لہجے میں گویا ہوا۔
"کیا آپ ہی مس عالیہ ہیں؟"
"ہاں...... اور آپ کی تعریف؟" میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ حسینہ کنگھا میرے ہاتھ میں تھما کر وہاں سے کھسک گئی۔ شاید ہمیں بے تکلفی سے باتیں کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔
"میرا نام بہادر ہے۔ پاکستانی ہوں۔ گزشتہ دو سال سے یہاں مقیم ہوں تاکہ پاکستان جانے والے مہاجرین کی املاک کی تفصیلی فہرست مرتب کر سکوں۔ ڈاکٹر بملا نے بتایا تھا کہ آپ یادداشت کھو چکی ہیں۔" اُس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔
"ہاں...... کوئی ایسی ہی بات ہے۔" میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔
"کیا آپ کا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ہے...... میرا مطلب ہے، کوئی معمولی سی بات بھی یاد نہیں، آپ پر ہونے والا حملہ یا وہ حملہ آور جس نے آپ کا سامان چھیننے کی کوشش کی تھی؟" بہادر نے میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے پوچھا۔
"کچھ نہیں......" میں نے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "پاسپورٹ کے مطابق میں بیوہ ہوں۔ لیکن مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میرا شوہر کون تھا، کیسا تھا اور اُس کا انتقال کس طرح ہوا تھا؟"
"مجھے افسوس ہے۔" بہادر نے اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ یاد کرنے کی کوشش کیجئے۔ کوئی غیر معمولی بات، کوئی مخصوص چہرہ......؟"
"چہرہ......" میرے ذہن کو ایک خفیف سا جھٹکا لگا۔ "ہاں...... ایک بوڑھی عورت کے جھریوں پڑے چہرے کے مدھم سے نقوش میرے ذہن میں اُبھر رہے ہیں۔ لیکن......" میں ایک دم خاموش ہو گئی اور دماغ پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ جھریوں بھرے اس چہرے سے کون سی یاد وابستہ تھی؟ اگر اس سلسلے میں کچھ یاد آجائے تو ممکن ہے میں کچھ اور بھی سوچنے میں کامیاب ہو سکوں۔ لیکن میرے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ تاریکی ایک بار پھر مسلط ہونے لگی۔ روشنی کی جو ننھی سی کرن پھوٹی تھی وہ ذہن کے گھپ اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ بے بسی کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"نہیں...... مجھے کچھ بھی یاد نہیں آرہا۔" میں نے آنسو چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا۔
"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اُس نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن پھر فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی حادثے کے باعث یادداشت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا وقتی طور پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی اور معمولی سے حادثے سے آپ کی یادداشت عود کر آئے۔"
جواب میں، میں نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ اس دوران حسینہ واپس آگئی۔ بہادر نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔
"اس قصبے میں حسینہ میری سب سے اچھی دوست ہے۔ مجھے اس کے دادا کے انتقال کا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ بہت جلد اس واقعے کو بھول جائے گی۔"
میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا اور بیڈ سے اُتر کر بانس کی کھچیوں سے بنی ہوئی کھڑکی کے سامنے

کھڑی ہوگئی اور بہادر کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"مسٹر بہادر...... مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ میرے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ پلیز
میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"تمہارے ساتھ پیش آنے والے اس افسوس ناک حادثے کا مختصر سا حال مجھے ڈاکٹر بملا
معلوم ہوا ہے۔ اُس کے بیان کے مطابق ٹرین میں سفر کے دوران کوئی شخص جو تمہارا ہم سفر بھی ہو
تمہیں کسی بہانے کمپارٹمنٹ سے باہر لے گیا۔ اس دوران اُس کا دوسرا ساتھی تمہارے کمپارٹمنٹ
کر تمہارے سامان کی تلاشی لیتا رہا۔ وہ شخص تمہیں زیادہ دیر تک باہر نہ روک سکا اور جب تم کمپار
داخل ہوئیں تو وہ شخص بدحواس ہو گیا۔ اسی بدحواسی میں اُس نے تم پر حملہ کر دیا اور نہ صرف تمہارا ا
لے بھاگا بلکہ تمہیں یادداشت سے محروم کر گیا۔ میری دُعا ہے کہ تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔" بہا
کہا اور میرے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر پھر کسی وقت آنے کا کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

حسینہ ابھی تک بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر لے گئی اور مختلف باتوں
دل بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنے سامان کی تلاشی کے دوران ایک ڈائری میرے ہاتھ لگ گئی
میری ہی ڈائری تھی جس پر جگہ جگہ یادداشتیں تحریر تھیں۔ مگر یہ سب کچھ میرے لئے اجنبی تھا۔ یہ
ہاتھ کی لکھی ہوئی ان یادداشتوں سے بھی کچھ یاد نہ کر سکی۔ میں اپنے خیالات سے چونکی تو اس وقت
ایک آدمی میرے بیڈ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ ایک پستہ قامت، گول مٹول سا شخص تھا جس نے سفید دھوتی اور کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا۔
وہ ہندو تھا۔ مٹکے کی طرح پھولا ہوا پیٹ عجیب سا تاثر پیش کر رہا تھا۔

"میرا نام چاند ہے۔" اُس نے رومال سے پیشانی اور گردن پر بہنے والا پسینہ پونچھتے ہو
تعارف کرایا۔ "میں ریلوے آفیسر ہوں اور اس ٹرین میں سفر کر رہا تھا جس میں آپ کے ساتھ یہ حا
آیا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ اپنی یادداشت کھو چکی ہیں۔ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے آپ کو پو
لئے چلا آیا۔ مسافروں کی دیکھ بھال کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہئے، اب آپ کو کچھ یاد آ رہا ہے؟"

میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ ویسے وہ شخص مجھے ذرا بھی پسند نہیں آ
میری خواہش تھی کہ وہ اوٹ پٹانگ سوالات سے میرا دماغ خراب کرنے کی بجائے جلد سے
جائے۔ چند رسمی باتوں کے بعد اُس نے بتایا کہ ریل کی پٹڑی کے قریب ایک خالی سوٹ کیس پڑ
ہے جو اس وقت ریلوے اسٹیشن پر موجود ہے۔ وہ مجھ سے اس کی شناخت چاہتا تھا کہ وہ میرا ہے یا
یہ جاننے کے بعد کہ میں اپنی یادداشت کھو چکی ہوں، اُس کا یہ سوال ہی احمقانہ تھا۔ بھلا مجھے کیا
میرے پاس کیا کچھ تھا؟

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ ڈاکٹر نے مجھے آرام کا مشورہ دیا ہے۔"
جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں میرے ساتھ جا

ازت دیدے گی۔" وہ کہتا ہوا وارڈ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

حسینہ اُلجھی ہوئی نگاہوں سے چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر میرا سامان درست کرنے لگی۔
کچھ دیر بعد وہ شخص واپس آیا اور میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اُس نے یہ اطلاع دی کہ
اکٹر بملا نے کل مجھے اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی ہے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں کل بھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گی۔ اگر تم کوئی سوٹ کیس شناخت کرانا
ہتے ہو تو اُسے یہاں کیوں نہیں لے آتے؟" میں نے جواب دیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ اُس کی نظریں
جھے اپنے جسم پر سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"سوٹ کیس یہاں لانا درست نہیں ہوگا۔ میں پرسوں آ جاؤں گا یا پھر اس سے اگلے دن میں تمہارے
حت یاب ہونے کا انتظار کر سکتا ہوں۔ میں پھر آؤں گا۔" وہ کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

چاند چلا گیا، لیکن میرے لئے کچھ اور اُلجھنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ میں اُس کی
موجودگی میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرتی رہی تھی۔ حسینہ کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی، پھر کسی
کام کا عذر پیش کر کے وارڈ سے باہر نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر اپنی چیزوں اور
کاغذات کا جائزہ لینے لگی۔ لیکن ہر چیز اور ہر تحریر میرے لئے اجنبی تھی۔ یہ سب چیزیں میری ملکیت تھیں
لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز مجھے اپنا کھویا ہوا ماضی یاد دلانے میں میری مدد نہ کر سکی۔

کچھ دیر کے بعد میں وارڈ سے نکل کر ہسپتال کے صحن میں آ گئی۔ سورج اگرچہ مغرب کی طرف جھک
ا تھا مگر اُس کی حدت برقرار تھی۔ ہسپتال کی شکستہ دیوار کے دوسری طرف ایک جوہڑ نظر آ رہا تھا جس کے
گندے پانی میں مویشی اور ننگ دھڑنگ بچے نہا رہے تھے۔ کنارے پر ایک طرف چند عورتیں کپڑے دھو
رہی تھیں اور اُن کے قریب ہی تین چار خارش زدہ کتے پانی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے وہاں کھڑے زیادہ
دیر نہیں گزری تھی کہ ڈاکٹر بملا کا ماتحت تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اُس کے خون آلود ہاتھ دیکھ کر
میں بری طرح چونک گئی۔

"ارے کیا ہوا... تمہارے ہاتھوں سے یہ خون کیسے بہہ رہا ہے؟" میں نے اُس کے قریب پہنچنے پر پوچھا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ یہ خون میرا نہیں۔" وہ کہتا ہوا جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

اسی وقت دو آدمی ایک اسٹریچر اُٹھائے وہاں پہنچ گئے۔ اسٹریچر پر ایک موٹے آدمی کی لاش تھی۔ لاش
کے جسم پر کئی جگہ گہرے زخم نظر آ رہے تھے۔ اُسے بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔ وہ
لوگ لاش کو کہیں دُور سے اُٹھا کر لائے تھے۔ سانس لینے کے لئے اُنہوں نے اسٹریچر برآمدے میں رکھ
دیا۔ میں کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ لاش کا چہرہ دیکھتے ہی میں بری طرح بدحواس ہو گئی۔ وہ مسٹر چاند تھا جو
ریلوے آفیسر کی حیثیت سے مجھ سے ملا تھا۔ ابھی میں لاش کو اچھی طرح دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ ڈاکٹر بملا
بھی وہاں پہنچ گئی۔

"تم اپنے بیڈ پر جاؤ مس عالیہ...... میں کچھ دیر بعد تم سے بات کروں گی۔" ڈاکٹر بملا نے مجھے مخاطب
کرتے ہوئے کہا اور آدمیوں کو اسٹریچر اُٹھانے کا اشارہ کیا۔

میں اپنے بیڈ پر آ گئی۔ کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ برآمدے میں اب قصبے کے کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ حسینہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی میرے پاس آ کر گئی۔ وہ کچھ افسردہ سی نظر آ رہی تھی۔

''آپ کے لئے ایک بری خبر ہے۔ ڈاکٹر بملا کہہ رہی ہیں کہ اب آپ کو ہسپتال سے چھٹی دے دی جائے گی۔'' حسینہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''کیوں...... اُنہوں نے اچانک یہ فیصلہ کیوں کر لیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔ میرے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی تھی۔ یہ خیال ہی وحشت انگیز تھا کہ مجھے ہسپتال سے چھٹی دی جانے والی تھی۔ اجنبی جگہ، اجنبی لوگ، اپنے آپ سے اجنبی...... میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔

''چاند مر چکا ہے اور ان لوگوں کا خیال ہے کہ مرنے سے پہلے وہ جس آخری انسان سے ملا تھا وہ آپ ہیں۔'' حسینہ نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

''میری ملاقات کا اُس کی موت سے کیا تعلق؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے حسینہ کی طرف دیکھا۔

''میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ بس وہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ آخری شخصیت ہیں جس سے چاند ملا تھا۔ میں جا رہی ہوں۔'' حسینہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ مجھ سے ملنے کے بعد چاند مر گیا تھا یا اگر اُسے کسی نے ہلاک کر دیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟ میں اپنی اُلجھن پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ڈاکٹر بملا کا انتظار کرنے لگی۔ ڈاکٹر بملا تقریباً ایک گھنٹے بعد آئی تھی۔

''کیا یہ درست ہے کہ مجھے یہاں سے چھٹی دی جا رہی ہے؟'' میں نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''ہاں عالیہ...... ہمیں دوسرے مریضوں کے لئے بیڈ کی ضرورت ہے۔ اب تمہیں کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہے، صرف یادداشت کھوئی ہے اور اس کے علاج کے لئے ضروری نہیں کہ ہسپتال میں رہا جائے۔ ایسی صورتحال میں تمہیں ہسپتال چھوڑنے پر مجبور کرتے ہوئے مجھے افسوس ہو رہا ہے مگر میری بھی مجبوریاں ہیں۔ تم اگر چاہو تو قصبے کے گیسٹ ہاؤس میں تمہارا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ بہادر بھی وہیں رہائش پذیر ہے۔'' بملا نے کہا۔

''ایک اجنبی کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں......'' میں زیر لب بڑبڑائی، پھر ڈاکٹر بملا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے مجھے ہسپتال سے نکالنے کی وجہ وہ نہیں جو تم نے بتائی ہے۔ حسینہ سے معلوم ہوا تھا کہ کچھ لوگ مجھ پر کسی قسم کا شبہ کر رہے ہیں۔ ریلوے آفیسر چاند اپنی موت سے کچھ دیر پہلے مجھ سے مل کر گیا تھا اور اس کی موت کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے۔ گویا میں کسی شیطانی قوت کے زیر اثر ہوں''

''نہیں...... یہ بات نہیں عالیہ ہمیں واقعی دوسرے مریضوں کے لئے بیڈ کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر بملا نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''چاند کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟ اُسے قتل کیا گیا ہے یا کوئی حادثہ؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اس کی موت کی وجہ کوئی نہیں جانتا۔ اُس کی لاش تقریباً ایک میل دُور ریگستان میں کھڑی اُس کی جیپ کے قریب پڑی پائی گئی تھی۔ جسم پر زخموں کے لاتعداد نشان تھے اور زبان بھی کٹی ہوئی تھی۔ آس پاس صرف اُس کی جیپ کے پہیوں کے علاوہ اور کسی چیز کے نشان نہیں ملے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا کہ اسے کس نے قتل کیا ہوگا۔ اسی وجہ سے اس کی موت کو پراسرار قرار دیا جا رہا ہے......''

''اور اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے۔ کیونکہ آخری مرتبہ وہ مجھ سے مل کر گیا تھا۔'' میں نے اُس کا جملہ پورا کر دیا۔

ڈاکٹر بملا نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ چند لمحوں بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اپنا سامان تیار کر لو۔ میں کچھ دیر بعد کسی کو تمہارے پاس بھیج دوں گی جو تمہیں گیسٹ ہاؤس میں پہنچا دے گا۔''

یہ کہنے کے ساتھ ہی ڈاکٹر بملا رخصت ہو گئی۔ ڈاکٹر بملا کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر اُلجھ گئی۔ حسینہ مجھے ہندوؤں کی اوہام پرستی کے بارے میں تھوڑا بہت بتا چکی تھی۔ یہ لوگ مجھے کسی پراسرار شیطانی قوت کے زیر اثر سمجھ رہے تھے اور ظاہر ہے وہ یہاں میری موجودگی کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن میں یہ قصبہ اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتی تھی جب تک میری یادداشت عود کر نہ آئے۔ میرے لئے یادداشت کا بحال ہونا بہت ضروری تھا۔ آخر میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی ہوں اور یہاں کس طرح پہنچی؟ ذہن پر بوجھ ڈالنے سے میرا سر دُکھنے لگا اور میں کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

یہ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک لمبی سڑک اور اس سے ملحق چند گلیاں جن میں جا بجا کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ قصبے کے عین وسط میں ایک چھوٹا سا مندر، اس سے متصل ایک پرائمری سکول اور چند دُکانیں تھیں جہاں دیہاتیوں کی ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ بیشتر مکان کچے تھے، البتہ چند ایک سرخ اینٹوں کی پختہ عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ قصبے کے آخری سرے پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ کسمپرسی کی بناء پر مسجد کی حالت خاصی ابتر ہو گئی تھی۔ مینار ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ سرخ اینٹوں کی دیواریں بھی جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی تھیں۔ صحن میں خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ چار دیواری کی اینٹیں لوگ اپنے گھروں کی تعمیر میں استعمال کر چکے تھے۔ اینٹوں کی بجائے اب وہاں بانس کے بے ترتیب پودوں کی چار دیواری تھی۔ مسجد کے محرابی دروازے بھی ٹوٹ چکے تھے۔ برآمدے پر کھپریل کی چھت تھی۔ مسجد سے ملحق وہ چھوٹی سی عمارت تھی جسے گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مسجد ہی دراصل قصبے کا گیسٹ ہاؤس تھی۔ وہ حصہ جو اب بہادر کے تصرف میں تھا کسی زمانے میں مسجد کے پیش امام کا حجرہ رہا ہوگا۔ یہ حصہ صرف ایک ہی کمرے پر مشتمل تھا۔

جب میں حسینہ کے ساتھ وہاں پہنچی تو بہادر میرے استقبال کو موجود تھا۔ کمرے میں ایک پرانے طرز کی مسہری بچھی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی لائیٹنگ ٹیبل اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔ اندرونی حصے میں اسی سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ بھی تھا جسے شاید بیک وقت کچن اور غسل خانے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اتنا کشادہ تھا کہ اس میں ایک چار پائی بھی بچھائی جا سکتی تھی۔ بڑے کمرے کی ایک کھڑکی سے دُھوپ کی کرنیں کمرے کے وسط میں پہنچ رہی تھیں۔ لائیٹنگ ٹیبل پر ایک

پرانے سے ٹائپ رائٹر کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ میز کے اوپر دیوار پر اس کا
نقشہ آویزاں تھا جس پر مختلف جگہوں پر سرخ پنسل کے نشانات لگے ہوئے تھے۔
"تمہارے یہاں آنے سے مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ جب تک
یادداشت عود نہیں آتی، یہیں رہو۔ رہائش گاہ کے لئے تم یہ کمرہ استعمال کر سکتی ہو میں مسجد میں سو جایا کروں
گا۔ اب تم آرام کرو۔ میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ اگر منہ ہاتھ دھونا چاہو تو کچن میں پانی اور ضرورت کی
دوسری چیزیں موجود ہیں۔" بہادر خاموش ہو کر چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر باہر نکل گیا۔
میں عجیب سی تھکن محسوس کر رہی تھی۔ بہادر کے جاتے ہی بستر پر لیٹ گئی اور اپنے ذہن کو کھلا
چھوڑ دیا۔ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اس قصبے کی کل آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ بہادر
مسلمان تھا۔ وہ تقریباً پینتیس سال کا ایک وجیہہ اور توانا آدمی تھا۔ مسلمان ہونے کے ناطے اگر
اُس سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اُس کی آنکھوں کی چمک مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔
دفعتہً میرے ذہن کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا...... گہری تاریکی کی بجائے اب دُھند سی محسوس ہو رہی تھی۔
اس دھند میں ایک ہیولا سا اُبھر رہا تھا...... پگڑی کے نیچے بلی کی طرح چمکتی ہوئی دو آنکھیں، دو ہاتھ
سوٹ کیس کا تالا کھولنے کی کوشش کر رہے تھے...... چہرے کے نقوش واضح نہیں تھے۔ لیکن...... لیکن
وہ کون تھا؟ میرا ذہن اس ہیولے کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اپنے بازو پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس
کر کے میں اُچھل پڑی۔ وہ حسینہ تھی جو سامان رکھنے کے بعد چلی گئی تھی اور نجانے کس وقت واپس آئی تھی۔
"اوہ، حسینہ...... کیا بات ہے؟" میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔
"باہر ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اُس کا تعلق پولیس سے ہے۔" حسینہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔
"پولیس......؟" میں چونک سی گئی، پھر اُٹھ کر باہر آ گئی۔ حسینہ بھی میرے ساتھ تھی۔ لیکن دروازے
سے نکلتے ہی دوسری طرف مڑ گئی۔
مسجد کے سامنے ایک جیپ کھڑی تھی۔ ایک دراز قامت آدمی جیپ سے ٹیک لگائے کھڑا اِدھر
دیکھ رہا تھا۔ اُس کے جسم پر خاکی نیکر اور آدھے آستین کی ملیشیا رنگ کی قمیض تھی۔ سر پر بھارتی پولیس کی
مخصوص پگڑی تھی جس کے اوپر ایک طرف جھالر لگی ہوئی تھی۔
"میرا نام گوپال سنگھ ہے اور پولیس کپتان ہوں۔ میں آپ کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔
چند بہت ضروری باتیں پوچھنا تھیں جس کے لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ بہتر ہو گا کہ ہم کمرے میں
اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں۔" اُس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا اور جیپ کے اسٹیئرنگ پر
بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو وہیں رُکنے کا اشارہ کر کے میرے ساتھ چل پڑا۔
"میں نہیں سمجھتی کہ میں آپ کو کیا بتا سکوں گی؟ آپ مجھے جانتے ہوں گے کہ جب مجھ پر حملہ ہوا اس
کے بعد سے میں اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ حملہ آور کون تھا؟" میں نے کہا۔
"میں اس حادثے کے بارے میں نہیں، چاند نامی اس شخص کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں جو
آج صبح آپ سے ملا تھا۔ آپ سے ملاقات سے کچھ ہی دیر بعد اُسے ریگستان میں بیدردی سے

قتل کر دیا گیا تھا۔" گوپال سنگھ نے جواب دیا۔
"لل...... لیکن...... میں اُسے قطعی نہیں جانتی۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے ہسپتال آیا تھا اور کسی صندوق
کی شناخت کے سلسلے میں مجھے ریلوے اسٹیشن لے جانا چاہتا تھا۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ کسی
انجانے خوف کی لہر میرے پورے بدن میں سرایت کر گئی تھی۔
"ریلوے اسٹیشن پر کوئی ایسا صندوق نہیں جس کی شناخت کرانا مطلوب ہو۔ آپ کا ایک بیگ گم ہوا
ہے جو ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ کسی صندوق کے بارے میں اُس نے آپ سے جھوٹ کہا تھا۔ میں
صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ سے اُس کی کیا بات چیت ہوئی تھی؟" گوپال سنگھ بولا۔
میں دیوار کا سہارا لے کر میز کے کنارے بیٹھ گئی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں
چند لمحوں کے لئے اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اُسے بتانے لگی کہ میری، چاند
سے کیا گفتگو ہوئی تھی؟ میں نے اُسے یہ بتایا کہ چاند نے دوبارہ آنے کے لئے بھی کہا تھا۔ کیپٹن گوپال سنگھ
ڈائری پر نوٹ کرتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر اُس نے ڈائری جیب میں رکھ لی۔
"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟" میں نے مرتعش لہجے میں کہا اور میز پر پڑا ہوا دستی پنکھا
اُٹھا کر جھلنے لگی۔
"ضرور......" گوپال سنگھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اُس کا اصل نام بہاری لعل تھا۔ عام طور پر
اُسے چاند کہا جاتا تھا۔ اگرچہ اُس کے پاس جعلی کاغذات موجود تھے لیکن ریل کے محکمے سے اُس کا کوئی
تعلق نہیں تھا۔ اُس کی جیپ کا رجسٹریشن نمبر بھی جعلی تھا۔ دراصل وہ کلکتہ کا ایک جعلساز تھا۔ اُس کی مجرمانہ
سرگرمیاں خاصی وسیع تھیں۔ وہ ایک سنگین جرم کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب تھا، لیکن اچانک ہی غائب
ہو گیا۔ وہ آپ کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کی ہستی اُس کے لئے بہت
اہم تھی۔ وہ مر چکا ہے اور آپ کو کچھ یاد نہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ اُس کے لئے اتنی اہم کیوں
تھیں کہ وہ اپنا شہر چھوڑ کر آپ کے تعاقب میں یہاں تک چلا آیا؟"
"میں کچھ نہیں جانتی۔ میں کیا بتا سکتی ہوں؟" میں نے بے بسی کے انداز میں جواب دیا۔
"پلیز...... کچھ یاد کرنے کی کوشش کیجئے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمیں آپ کی لاش بھی چاند کی طرح
ریگستان میں پڑی ہوئی ملے۔" گوپال سنگھ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
میں تھرا اُٹھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتی، بہادر کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے کیپٹن گوپال
سنگھ سے جس انداز میں ہاتھ ملایا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے شناسا تھے۔
"ہیلو گوپال سنگھ...... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" بہادر نے اُسے گھورا۔
"میں ان خاتون سے چند ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بقول ان کے
انہیں کچھ بھی یاد نہیں۔" گوپال نے جواب دیا۔
"یہ درست ہے۔ مس عالیہ کی یادداشت کھو چکی ہے۔" بہادر نے جواب دیا۔
"بہرحال، میں پھر آؤں گا۔ خاتون، بہتر ہو گا کہ آپ جلد از جلد اپنی یادداشت واپس لانے کی کوشش

کریں۔" گوپال سنگھ نے کہتے ہوئے اس انداز میں میری طرف دیکھا جیسے اُسے شبہ ہو کہ میں یاد
کھو جانے کا محض ڈھونگ رچا رہی ہوں۔

"میں نے دہلی میں پاکستانی سفارت خانے کو تمہارے بارے میں ٹیلی گرام دیا تھا۔ آج
جواب مل گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ جلد ہی یہاں اپنا کوئی تحقیقاتی نمائندہ بھیجیں گے۔ اس
تمہاری دیکھ بھال کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔" بہادر نے کیپٹن گوپال کے جانے کے بعد کہا۔

میں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ حسینہ کھانے کی ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ باتوں میں ہمیں
احساس ہی نہیں رہا تھا کہ شام ہو چکی ہے۔ حسینہ نے ٹرے میز پر رکھ کر بتی جلا دی اور ہم دونوں کھانا کھا
لگے۔ بہادر کھانے کے بعد مجھے سیر کے لئے لے جانا چاہتا تھا۔ کھانا ختم کر کے اُس نے مجھے تیار ہو
کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُس کے جانے کے بعد میں کیپٹن گوپال سنگھ کی باتوں پر غور کرنے
اُس نے بتایا تھا کہ چاند جرائم پیشہ آدمی تھا۔ لیکن ایک جرائم پیشہ آدمی کو کسی غیر ملکی لڑکی سے کیا دلچسپی
تھی؟ وہ میرے پیچھے کیوں لگا تھا اور وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ٹرین میں مجھ پر حملہ کیا تھا؟ ڈاکٹر
گوپال سنگھ کے بقول حملہ آور میرا ایک بیگ لے گئے تھے۔ اُس بیگ میں کیا تھا؟ مجھے اس کا کوئی
تھا۔ البتہ تقریباً دو ہزار روپے کی رقم اور چند چھوٹے چھوٹے طلائی زیورات میرے اُس بیگ میں
تھے جو میرے پاس تھا۔ حملہ آوروں کو اگر رقم یا زیورات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو انہیں کس چیز کی
تھی؟ اور کیا بہاری لعل یا چاند بھی اسی چیز کے حصول کے لئے میرے تعاقب میں آیا تھا......؟

ب مجھے اپنے سوٹ کیس اور بیگ کی چیزوں کا جائزہ بھی لینا تھا۔ حسینہ میرے پاس ہی موجود تھی۔
دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کون سی چیز ہے جس کے حصول کے لئے یہ لوگ اس قدر بے چین ہو رہے ہیں
ایک آدمی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ لیکن میری نظروں میں کوئی ایسی چیز نہ آسکی۔ میں تمام
یں نکال نکال کر باہر رکھتی جا رہی تھی۔ حسینہ ایک چھوٹا سا گلدان اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ رنگین شیشوں کے
وں کو جوڑ کر بنایا گیا یہ گلدان چار انچ اُونچا تھا اور اس کا محیط دو انچ کے قریب تھا۔ اس طویل سفر کے
ان یہ گلدان میں نے کہاں سے لیا تھا؟ مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔

"اوہ، کتنا پیارا ہے شیشے کا یہ ننھا سا گلدان۔" حسینہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا لگا تمہیں؟ چلو، میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ حسینہ کا چہرہ دمک اُٹھا۔
نے اُسی وقت گلدان کو قمیض میں چھپا لیا اور برتن اُٹھا کر چلی گئی۔

پورے سامان کی تلاشی کے بعد بھی مجھے کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی جو اس مسئلے پر روشنی ڈال سکتی۔ میں
م چیزیں سنبھال کر باہر نکل آئی۔ بہادر مسجد کے برآمدے میں میرا منتظر تھا۔ ہم دونوں جیسے ہی بانسوں کی
ے باہر نکلے، باہر موجود ایک پولیس والے نے ہمیں روک لیا۔

"مس صاحبہ باہر نہیں جاسکتیں جناب۔" اُس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" بہادر کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔

"کپتان صاحب کا حکم ہے کہ مس صاحبہ کی حفاظت کی جائے۔ میری ڈیوٹی اسی مقصد کے لئے یہاں
ئی گئی ہے۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"انہیں ذرا قصبے کے بازار تک جانا ہے۔ اگر چاہو تو تم بھی ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔" بہادر نے
ں کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ کانسٹیبل چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے آمادگی کا اظہار کر دیا اور
ے دو قدم پیچھے چلنے لگا۔

ہماری واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی۔ کانسٹیبل تو باہر ہی رُک گیا اور بہادر مسجد والے کمرے میں چلا
جہاں اُس نے فرش پر ہی بستر لگا لیا تھا۔ میں تنگ سا برآمدہ طے کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ
ا۔ دروازہ کھولتے ہوئے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ دل میں ایک اضطراب اور بے چینی سی تھی۔
ا جیسے ہی اندر داخل ہوئی، دروازے کے قریب ہی کسی چیز سے ٹھوکر لگی...... میں نے دیوار پر ٹٹول کر بجلی
سوئچ آن کر دیا۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ کمرے میں عجیب ابتری کا
ل تھا۔ سوٹ کیس بستر پر کھلا پڑا تھا۔ کپڑے اور دوسری چیزیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ بیگ غائب

تھا جس میں میرا پاسپورٹ اور دیگر تمام ضروری کاغذات موجود تھے، نقد رقم اور زیورات بھی اُسی بیگ
تھے۔ یادداشت تو کھوئی ہی تھی، اب میں ان چیزوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تھی جو کسمپرسی میں میرے
معاون ثابت ہوسکتی تھیں۔

میں چند لمحے متوحش نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھتی رہی، پھر دروازے میں آ کر بہادر کو آواز
لگی۔ اُس نے وہاں پہنچنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگایا۔ کمرے کی حالت دیکھ کر وہ بھی چونک
صورتِ حال سمجھنے میں اُسے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ وہ اُلجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا
وجہ جاننا چاہتا ہو۔ لیکن ظاہر ہے میں کیا بتا سکتی تھی؟ اس کے برعکس میں اپنے آپ کو مکمل طور پر
سمجھنے لگی تھی، ایک ایسی عورت جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا، جو اپنے آپ تک کو شناخت نہیں کر

چند لمحوں تک ہم خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر بہادر آگے بڑھ کر چیز
لگا۔ باہر اگرچہ کانسٹیبل موجود تھا لیکن اُس سے کسی قسم کی کوئی مدد لینا بیکار تھا۔ تھانہ بھی ریلوے
تھا۔ اگر کسی قسم کی رپورٹ کی جاتی تو کوئی حوصلہ افزا نتیجہ برآمد ہونے کی کوئی توقع نہیں تھی اس لیے
نے مجھے آرام سے سو جانے کا مشورہ دیا۔ وہ جیسے ہی دروازے کی طرف بڑھا، میں جلدی سے بول

''تت...... تم کہاں جا رہے ہو؟''

''مسجد میں سونے کے لئے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''یہیں سو جاؤ...... اسی کمرے میں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' میں نے مرتعش لہجے میں کہا۔

بہادر چند لمحے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر اُس نے دروازے کی کنڈی
اور بستر کی چادر اُٹھا کر دری پر بچھاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے...... تم بیڈ پر سو جاؤ۔ میں نیچے
ہوں۔'' بہادر چادر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ میں پلنگ پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ عجیب اضطرابی کیفیت
کمرے میں ایک مرد کی موجودگی سے میں کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کر رہی تھی۔ بس ایک عجیب
چینی تھی جس کا اظہار بھی الفاظ میں ممکن نہیں تھا۔ پھر نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح مجھے ڈاکٹر بملا نے جھنجوڑ کر اُٹھایا تھا۔ میں نے خمار آلود نگاہوں سے اطراف میں دیکھا
کھڑکی سے آنے والی دُھوپ کی کرنیں فرش پر مچل رہی تھیں۔ بہادر کمرے میں موجود نہیں تھا
بہت صبح اُٹھ جانے کا عادی تھا۔

''خیریت ڈاکٹر...... کیا بہادر نے تمہیں رات کے واقعے کے بارے میں بتا دیا ہے؟'' میں
آلود نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... لیکن اس وقت حسینہ کے بارے میں پوچھنے آئی ہوں۔ تم نے اُسے کہیں دیکھا
ڈاکٹر بملا کے لہجے میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔

''گزشتہ رات ہمیں کھانا اُسی نے لا کر دیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں آج کی بات کر رہی ہوں۔ وہ گزشتہ رات سے غائب ہے۔''

''غائب ہے...... کیا مطلب؟'' میں بری طرح چونک گئی۔ ڈاکٹر بملا کے لہجے نے مجھے کچھ

مجبور کر دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آخری مرتبہ وہ مجھ سے ملی اور پھر غائب ہوگئی۔

''پیپل کے نیچے بیٹھے ہوئے سادھو نے گزشتہ رات اُسے کسی آدمی کے ساتھ کیکر کے درختوں کے
جھنڈ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لباس سے وہ آدمی کوئی ہندو ہی لگتا تھا لیکن تاریکی کے باعث سادھو
کو اُس کا چہرہ نظر نہیں آ سکا۔ اُس کے بعد سے حسینہ کو نہیں دیکھا گیا۔'' ڈاکٹر بملا نے متردد لہجے میں کہا۔

''کیا وہ پہلے بھی بغیر اطلاع کے اس طرح غائب ہو جایا کرتی تھی؟'' میں نے لرزتے ہوئے لہجے
میں دریافت کیا۔

''نہیں...... اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' ڈاکٹر بملا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے
جواب دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے چاند کی موت کا منظر گھومنے لگا۔ وہ بھی مجھ سے ملاقات کے چند گھنٹے بعد ہی
موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ کہیں حسینہ بھی تو......؟ نہیں نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا۔ حسینہ کے بارے
میں یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ جرائم پیشہ افراد کی آلۂ کار ہوگی۔ اُسے تو شاید جرم کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا۔
میں جب سے یہاں آئی تھی وہ مجھ سے مانوس ہوگئی تھی۔ اُسے یقیناً ان لوگوں نے اغوا کیا ہوگا جو مجھ سے
کچھ چاہتے تھے۔ وہ حسینہ کے ذریعے دباؤ ڈال کر مجھ سے اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے ہوں گے۔

''کیا اُسے ریگستان کی طرف تلاش کیا گیا ہے؟ میرا مطلب ہے......'' کسی انجانے خوف کے تحت
میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔

''میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں۔'' ڈاکٹر بملا نے خشک لہجے میں کہا۔ ''یہاں دو تین روز سے کچھ
پراسرار واقعات رونما ہونے لگے ہیں۔''

''کیا میرا ان پراسرار واقعات سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی
طرف دیکھا۔

''صورتحال خاصی پیچیدہ ہے۔'' بہادر کی آواز سن کر میں دروازے کی طرف گھوم گئی۔ وہ نجانے کب
سے وہاں کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہاں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان پراسرار واقعات کی
ذمہ دار تم ہو۔''

میں ایک بار پھر سوچ میں کھوگئی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف دو روز ہوئے تھے اور اس عرصے میں
ایک آدمی پراسرار طریقے سے ہلاک ہو چکا تھا اور ایک نوجوان لڑکی لاپتہ ہوگئی تھی۔ بدقسمتی سے وہ دونوں
آخری مرتبہ مجھ سے ملے تھے۔ لوگوں کے خیال میں، میں کسی پراسرار شیطانی قوت کے زیر اثر تھی۔ اور
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ ان پراسرار واقعات کا تعلق مجھ سے ہے۔
وہ مجھے ہی قصوروار سمجھ رہے تھے۔

''ہسپتال میں ایک آدمی آیا ہے جو تم سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ اگرچہ ہندو ہے لیکن اُس کی باتوں سے
ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہارے شوہر اور تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ رام داس ملہوترہ کا شمار بمبئی
کے امیر ترین آدمیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ہسپتال کے سامنے والے میدان میں خیمہ زن ہے۔ اگر تم چاہو تو

اُس سے مل سکتی ہو۔'' ڈاکٹر بملا نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... اگر وہ میرے بارے میں جانتا ہے تو یقیناً میری مدد کر سکتا ہے۔ میں اُس سے
گی۔'' میں جلدی سے بولی۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں کیپٹن کو پال سنگھ کی واپسی کا انتظار کر لینا چاہئے۔ وہ حسینہ کی
ریگستان کی طرف گیا ہوا ہے۔'' بہادر نے کہا۔

''میں اُس کی موجودگی ضروری نہیں سمجھتی۔'' میں نے بہادر کو گھورا۔

''تو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' اُس نے کہا۔ بہادر نے اپنے طور پر میری حفاظت کی ذ
کا بوجھ اُٹھالیا تھا اور مجھے بھی اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ایک اطمینان تو تھا کہ ان حالات میں
ہمدرد بھی موجود ہے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں گیسٹ ہاؤس سے نکلے اور اُس کی جیپ میں سوار ہو کر
کی طرف چل دیئے جہاں ڈاکٹر بملا کے کہنے کے مطابق رام داس ملہوترہ خیمہ زن تھا۔

ہسپتال کے سامنے ایک وسیع میدان میں شاندار خیمے نصب تھے۔ ان خیموں کو دیکھ کر یہ خیال
جیسے کوئی مہاراجہ یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہو۔ تین چھوٹے خیمے تھے اور ایک بڑا، جو باہر
خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ بڑے خیمے کے قریب ہی ایک شامیانہ لگا ہوا تھا جس کے نیچے تین چار
کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شامیانے کے بانس پر نصب ایک چھوٹی سی چرخی سے کپڑے کا ایک
پنکھا لٹکا ہوا تھا۔ چرخی میں سے گزرنے والی رسّی کا دوسرا سرا ایک آدمی کے ہاتھ میں تھا جسے وہ
سے آگے پیچھے کھینچ رہا تھا۔ اُس کے عمل سے پنکھا متحرک تھا۔ شامیانے کے قریب ہی ایک بہت
اور ایک لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ ٹرک میں ایک چھوٹا سا جنریٹر بھی نصب تھا جس سے ضرورت کے
پیدا کی جاسکتی تھی۔ لینڈ کروزر میں بھی ایئر کنڈیشنر تھا۔ کرسیوں کے قریب ہی ایک میز تھی جس
ہی ایک آئس بکس بھی موجود تھا جس میں کوکا کولا کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ وسطی کرسی پر ایک ادھ
پُر تمکنت انداز میں براجمان تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں ایک موٹا سا سگار تھا۔ قیمتی لباس کے ساتھ
بارُعب چہرہ اور آنکھوں کی چمک اُس کی شخصیت میں بڑا پُراسرار سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ اُس کے
ہی دو آدمی مودبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ وہ دونوں بھی ہندو ہی تھے۔

ہماری جیپ شامیانے سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گئی۔ میں، ڈاکٹر بملا اور بہادر کے ساتھ
آئی۔ ڈاکٹر بملا نے اُس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتا دیا تھا کہ وہی رام داس ملہوترہ
سے ملنے کا خواہشمند تھا۔ اگرچہ اُس نے اپنے آپ کو میرا شناسا بتایا تھا لیکن وہ میرے لئے قطعی
اُس نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔

''مجھے افسوس ہے عالیہ خاتون، تم جن حالات سے دوچار ہو وہ میرے لئے بھی پریشانی
ہیں۔ میں اس وقت بمبئی میں تھا جب تمہارے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر اخبار میں
یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ چور گزشتہ رات تمہارا سب کچھ لے اُڑے۔'' ملہوترہ نے تاسف کا اظ

''یہ حالات میرے لئے خاصے پریشان کن ہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ پا رہی کہ کیا کروں؟'' میں

ملا اور مسٹر بہادر کا مجھے بہت سہارا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر تمہاری یادداشت برقرار رہتی تو تم مجھے فوراً پہچان لیتیں۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ کراچی میں گزرا
تمہارا شوہر ندیم عارف میرے بہترین دوستوں میں تھا۔ اس وقت تمہاری مدد کرنا میں اپنا اخلاقی
فرض سمجھتا ہوں اور یہاں میری آمد کا مقصد بھی یہی ہے۔ ویسے کیا تمہیں یاد ہے کہ ہم تقریباً ایک ماہ پہلے
راچی میں ہی ملے تھے؟'' ملہوترہ نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''کراچی میں؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے یاد نہیں... کچھ بھی یاد نہیں۔''

''میرا خیال ہے اگر تم کوشش کرو تو تمہیں سب کچھ یاد آسکتا ہے۔'' ملہوترہ کی نظروں میں عجیب سی
اُلجھن تھی۔

''نہیں...... نہیں مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔''

''تو گویا تم مکمل طور پر اپنی یادداشت کھو چکی ہو؟'' ملہوترہ کی نگاہوں میں تشکیک کی جھلک نمایاں تھی۔

''ڈاکٹر بملا کا خیال ہے کہ عالیہ کو آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ دماغ پر غیر ضروری بوجھ ان کے
لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔'' بہادر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اس اطلاع کا شکریہ۔'' ملہوترہ نے بہادر کو گھورا۔ وہ شروع ہی سے میرے ساتھ اُس کی موجودگی کو
پسند نہیں کر رہا تھا۔

''تیز دھوپ بھی اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔'' اس مرتبہ ڈاکٹر بملا نے کہا۔

''میں آپ لوگوں کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ اگر آپ دونوں چاہیں تو واپس جا سکتے ہیں۔ عالیہ
خاتون دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں گی۔ میرا خیمہ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ انہیں گرمی کا احساس تک نہیں ہو
گا۔'' ملہوترہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''عالیہ میرے زیرِ علاج ہے۔ میں اسے ایسا مشورہ نہیں دوں گی۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ کیوں
عالیہ؟'' ڈاکٹر بملا نے میری طرف دیکھا۔

''ہاں، چلو۔'' میں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

رام داس ملہوترہ اگرچہ اپنے آپ کو میرا پرانا شناسا ظاہر کر رہا تھا اور کسی ایسے شخص کی موجودگی میرے
لئے اطمینان کا باعث ہو سکتی تھی۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ وہ مجھے قطعی پسند نہیں آیا تھا اور یہاں کھڑے
کھڑے میرا دل گھبرانے لگا تھا۔

''تو ٹھیک ہے...... شام کو میں گیسٹ ہاؤس آؤں گا۔ مجھے کچھ ایسی باتیں معلوم ہیں جو ہو سکتا ہے
تمہاری یادداشت لوٹانے میں مددگار ثابت ہوں۔'' رام داس ملہوترہ نے ایک بار پھر مسکراتے ہوئے کہا
ہمیں جیپ تک چھوڑنے کے لئے آیا۔

ڈاکٹر بملا کو ہسپتال اُتارنے کے بعد میں اور بہادر گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ بہادر نے اس موضوع پر
سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا اور میں دن بھر بستر پر لیٹی موجودہ صورتِ حال
کے بارے میں سوچتی رہی۔ بہاری لعل چاند کا قتل اور پھر حسینہ کی گمشدگی نے ایک عجیب سی فضا پیدا کر دی

تھی۔ رام داس ملہوترہ کی آمد نے مجھے ایک اور اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو میر
دوست بتاتا تھا اور ایک ماہ پہلے برما میں مجھ سے ملاقات کا مدعی بھی تھا۔ مجھے یہ سب کچھ معلو
لیکن رام داس ملہوترہ کا رہن سہن اور ٹھاٹھ باٹھ بتا رہا تھا کہ وہ کروڑ پتی نہیں تو لکھ پتی ضرور ہے
شان و شوکت کسی مہاراجہ سے کم نہیں تھی اُس کا کیمپ تو یہی ظاہر کر رہا تھا۔ اور میں یہ سوچے بغیر
کہ اُس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہوگی؟ اور اُس کی آمدنی کا ذریعہ کیا تھا؟
شام کے سائے ڈھل چکے تھے جب گیسٹ ہاؤس کے سامنے ملہوترہ کی لینڈ کروزر آ کر رکی۔
وقت بہادر کے ساتھ گیسٹ ہاؤس کے صحن میں بیٹھی تھی۔ ملہوترہ کا ڈرائیور سٹیئرنگ پر ہی بیٹھا تھا
ملازم نے نیچے اُتر کر دروازہ کھولا اور ملہوترہ گاڑی سے برآمد ہو کر پُروقار انداز میں چلتا ہوا ہمار
بڑھنے لگا۔ ہم دونوں نے اُٹھ کر اُس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے تیسری کرسی کی طرف اشار
باقی دونوں کرسیوں کی طرح خاصی شکستہ حالت میں تھی۔
"مسٹر بہادر، اگر آپ اجازت دیں تو میں تنہائی میں عالیہ خاتون سے کچھ باتیں کرنا چاہتا
ملہوترہ نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد بہادر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
بہادر نے میری طرف دیکھا اور پھر میری رضامندی پا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ اُس کے جانے
ملہوترہ کئی لمحوں تک گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا، پھر قدرے آگے کو جھک کر
"مس عالیہ...... اب تمہیں یاد آ جانا چاہئے کہ تقریباً ایک ماہ پہلے برما میں ہماری ملاقات ہوئی
"مجھے بالکل یاد نہیں۔ ماضی کی کوئی بات بھی میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہی۔" میں نے جوا
"میرا خیال ہے کہ تمہیں اتنا تو ضرور یاد ہوگا کہ برما کی ملاقات کے دوران ہم میں ایک
معاملہ طے ہوا تھا اور میں نے تم پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا تھا۔" اُس نے میری آنکھوں میں جھانک
کہا۔ گویا اُسے شبہ تھا کہ میں یادداشت کے کھو جانے کا ڈھونگ رچا رہی ہوں۔
"اعتماد...... معاملہ...... میں بالکل نہیں سمجھ سکی؟" میں اُس کی باتوں سے اُلجھن محسوس کر رہی
"اب مجھے کھل کر بات کرنا پڑے گی۔" اُس نے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور
کو جھکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "یہ درست ہے کہ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے تمہار
سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اُس سے آخری ملاقات تمہاری شادی کی پہلی سالگرہ کے مو
تھی۔ میں ان دنوں اپنے کاروباری سلسلے میں کراچی گیا ہوا تھا۔ پھر آج سے تقریباً ایک ماہ پہلے تم
میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں تم نے بتایا تھا کہ تمہارے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور تم
مختلف ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے سکم اور ہندوستان سے ہوتے ہوئے پاکستان واپس جا
میں برما سے کچھ ہیرے ہندوستان میں سمگل کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ لوگوں کی نظروں میں آ جا
باعث خود یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ تمہیں دیکھ کر میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال اُبھرا کہ کیوں
یہ کام لیا جائے۔ تم نے ایک کروڑ روپے مالیت کے ہیروں کی اسمگلنگ کو ایک دلچسپ ایڈونچر سمجھ
قبول کیا تھا۔ ہم میں یہ طے پایا تھا کہ جس روز تم برما سے روانہ ہوگی، میرا ایک آدمی تمہیں ہیر

دے گا۔ پروگرام کے مطابق آج سے تین دن پہلے تمہیں بمبئی کے اشوکا ہوٹل میں ہیرے میرے حوالے
کرنے تھے۔ لیکن تم وہاں نہیں پہنچیں تو میں پریشان ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید تمہاری نیت بدل گئی ہو
اور تم ہیرے ہضم کرنا چاہتی ہو۔"
"میں نہیں سمجھ سکی تم کیا کہہ رہے ہو...... آج سے پہلے نہ میں نے تمہیں کبھی دیکھا ہے اور نہ مجھے کوئی
ایسی بات یاد ہے۔" میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی
چلنے لگیں۔ ملہوترہ کے کہنے کے مطابق میرے پاس ایک کروڑ روپے کے ہیرے تھے لیکن مجھے کوئی ایسی
بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔
"تم کہتے ہو کہ میرے پاس گراں قدر ہیرے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹرین میں مجھ پر وہ حملہ محض
اسی وجہ سے کیا گیا ہو؟" میں نے کہا۔
"یقیناً۔ اور میں اخبار میں یہ خبر پڑھ کر ہی یہاں کے لئے روانہ ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا راز
فاش ہو گیا۔ ٹرین میں تمہارا جو بیگ چوری ہوا تھا اُس میں کیا سامان تھا؟" ملہوترہ نے پوچھا۔
"مجھے کچھ علم نہیں۔"
"کل رات تمہارا جو بیگ چوری ہوا تھا اُس میں کیا تھا؟" اُس نے دوبارہ پوچھا۔
"پاسپورٹ، ڈائری اور دیگر ضروری کاغذات۔ اس میں ہیرے قسم کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ ہی سوٹ
کیس میں کوئی ایسی چیز موجود تھی۔" میں نے جواب دیا۔
"یاد کرنے کی کوشش کرو عالیہ۔ میں اپنی ساری پونجی اس داؤ پر لگا چکا ہوں۔ اگر مجھے ہیرے واپس نہ
ملے تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔" ملہوترہ نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
"مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔" میں نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔
"ویسے تمہاری ذہنی کیفیت کب تک درست ہو جائے گی؟" اُس نے مشتبہ نگاہوں سے میری طرف
دیکھا۔
"کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ڈاکٹر بملا کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے دو چار روز میں میری یادداشت لوٹ آئے یا
اس میں غیر معینہ عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"اوہ......" ملہوترہ نے گہرا سانس بھرا۔ "خیر یہ باتیں کسی سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں پھر کسی
وقت تم سے ملاقات کروں گا۔ اپنے ذہن پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے تمہیں کچھ یاد آ ہی
جائے۔" وہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔
ملہوترہ جیسے ہی صحن سے باہر نکلا، بہادر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ
کسی جگہ چھپ کر ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ میں اس وقت شدید اُلجھن میں مبتلا تھی۔ دماغ میں چیونٹیاں سی
رینگ رہی تھیں۔ بہادر میرے چہرے کے تاثرات سے میری کیفیت بھانپ گیا اور مجھے سہارا دے کر
کمرے میں لے آیا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میری زبان گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی۔
بالآخر کئی منٹ کی خاموشی کے بعد میں نے اُسے رام داس ملہوترہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے

میں بتا دیا جسے سن کر وہ بری طرح چونک گیا۔

''صورت حال خاصی پیچیدہ ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں فوراً کیپٹن گوپال سنگھ کو اطلاع دینی چاہئے۔'' میرے خاموش ہونے پر اُس نے کہا۔ میں کوئی جواب نہ دے سکی۔

بہادر مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اُس نے مجھے جیپ میں بٹھایا اور اسے تیز رفتاری سے ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑا دیا۔ لیکن ہماری یہ بھاگ دوڑ بے کار ثابت ہوئی۔ کیپٹن گوپال سنگھ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ کسی کیس کی تفتیش کے سلسلے میں قصبے سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپس آنے کے بعد بہادر تقریباً ایک گھنٹے تک میرے کمرے میں بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر مسجد والے کمرے میں چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹ گئی۔ میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ دفعتہً میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ صورت حال نہ صرف خاصی پیچیدہ بلکہ میرے لئے انتہائی سنگین تھی۔ اگر پولیس کو پتہ چل گیا کہ میں ہیروں کی اسمگلنگ میں ملوث ہوں تو میرا ٹھکانہ جیل کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا۔ اس تصور ہی سے میں سرتا پا لرز اُٹھی۔ میرے لئے بچاؤ کا صرف ایک ہی واستہ تھا۔ فرار!

میں نے اُٹھ کر ایک چھوٹے سے شولڈر بیگ میں اپنی چند ضروری چیزیں بھر لیں اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگی۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ سب لوگ سو گئے ہوں گے تو میں نے بیگ اُٹھایا اور کھڑکی کے راستے کمرے سے باہر آ گئی۔ میں سامنے والے رُخ سے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی کیونکہ مسجد کے برآمدے سے ہو کر گزرنا پڑتا۔ اس طرح میں بہادر کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ مزید برآں گیسٹ ہاؤس کے گیٹ نما راستے پر کیپٹن گوپال سنگھ کا متعین کردہ کانسٹیبل بھی موجود تھا۔ وہ دونوں اگرچہ سو رہے تھے لیکن قدموں کی آہٹ سے اُن میں سے کسی کی آنکھ کھل سکتی تھی۔

گیسٹ ہاؤس کی عقبی دیوار تقریباً آٹھ فٹ اُونچی تھی لیکن جگہ جگہ سے اینٹیں ٹوٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے اس دیوار پر چڑھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں نے بیگ دانتوں میں پکڑ لیا اور دیوار کی ٹوٹی ہوئی جگہ میں پیر پھنسا کر آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگی۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ انجانے سے خوف کے تحت جسم کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ دیوار کے اوپر پہنچ کر میں نے بیگ دوسری طرف پھینکا اور چند لمحوں بعد خود بھی چھلانگ لگا دی۔ نیچے گرتے ہوئے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی جس کی وجہ سے میرے ایک ٹخنے میں ہلکا سا جھٹکا آ گیا۔ درد کی شدت سے میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں چند لمحوں تک ٹخنہ سہلاتی رہی، اور جب درد کسی حد تک کم ہوا تو بیگ اُٹھا کر لنگڑاتی ہوئی ایک طرف کو چل پڑی۔ گلی سے نکل کر میں قصبے کے مین روڈ پر پہنچ گئی۔ جہاں کتوں نے بھونک کر میرا استقبال کیا۔ میں جلدی سے ایک اور گلی میں گھس گئی اور دوبارہ مین روڈ پر آنے کی بجائے گلیوں ہی گلیوں میں چلتی رہی۔ میرے سامنے کسی منزل کا نشان نہیں تھا۔ انجان راستوں پر تیز تیز قدم اُٹھاتی زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ جلد سے جلد قصبے سے دُور نکل جاؤں۔ ایک گلی کے آخر پر پہنچی تو سامنے ہسپتال کی عمارت دیکھ کر ٹھٹک گئی جس کے سامنے ہی رام داس ملہوترہ کا کیمپ تھا۔ میں چند لمحے گلی کے موڑ پر کھڑی رہی اور پھر واپس مڑنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک میری آنکھوں

سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچ اُٹھیں...... سر پر لگنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں لہراتی ہوئی نیچے گرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا......!

جہاں میری آنکھ کھلی، اُسے باقاعدہ کمرہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ تقریباً بارہ فٹ لمبا اور سات فٹ چوڑا ایک پہاڑی غار تھا۔ غیر ہموار دیواریں اور جھکی ہوئی چھت میرے اس خیال کی تصدیق کر رہی تھیں۔ چھت اس قدر نیچی تھی کہ قدرے لمبے قد کے آدمی کا سر چھت کو چھو سکتا تھا۔ کمرے میں فرنیچر نام کی صرف ایک بوسیدہ سی کرسی پڑی ہوئی تھی اس کے علاوہ لکڑی کی چند ٹوٹی ہوئی چیزیں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے قریب پتھر کا ایک چبوترہ تھا جس پر ٹین کا بنا ہوا ایک چراغ جل رہا تھا۔ چراغ میں تیل کی بجائے شاید کسی قسم کی چربی استعمال کی جا رہی تھی کیونکہ گاڑھے دُھوئیں کے ساتھ کمرے میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے قریب ہی گدلے سے پانی کا بھرا ہوا ایک جگ رکھا ہوا تھا۔ میری ایک کلائی ایک آہنی کڑے میں جکڑی ہوئی تھی جس سے منسلک زنجیر کا دوسرا سرا دیوار میں لگے ہوئے ایک چک میں پھنسا ہوا تھا۔

چند لمحوں تک تو میں کچھ نہ سمجھ سکی، لیکن پھر رفتہ رفتہ صورت حال واضح ہونے لگی۔ رات کو ہسپتال کے قریب میرے سر کی پشت پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کیا گیا تھا اور اب میں ایک قیدی تھی...... لیکن مجھے قید کرنے والے کون تھے؟ اس کا بھی کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ میں چند لمحے اسی حالت میں بیٹھی رہی، پھر اُٹھ کر اُس قید خانے کا جائزہ لینے لگی۔ زنجیر خاصی لمبی تھی، میں اس حد تک آگے بڑھتی رہی جہاں تک زنجیر اجازت دے رہی تھی۔ یہ کمرہ شاید اس سے پہلے بھی قید خانے ہی کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا تھا کیونکہ ایک طرف کپڑوں کے چند چیتھڑے اور غلاظت کا ڈھیر نظر آ رہا تھا جس سے شدید تعفن اُٹھ رہا تھا۔

میں دوسری طرف گھومنا ہی چاہتی تھی کہ اس کونے میں کوئی چیز چمکتی ہوئی دیکھ کر رُک گئی۔ میں نے چبوترے پر رکھا ہوا چراغ اُٹھا لیا اور آگے بڑھ گئی۔ دوسرے ہی لمحے میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا......

روشنی میں چمکنے والی وہ چیز میرا دُھوپ کا وہ چشمہ تھا جو پہلے ہی روز میں نے ہسپتال میں حسینہ کو دیا تھا۔ اُس کا ایک شیشہ چکنا چور اور فریم درمیان سے ٹوٹا ہوا تھا۔ میرے لئے خوفزدہ ہونے کی بات یہ تھی کہ میرا یہ ٹوٹا ہوا چشمہ ایک انسانی ہاتھ کی گرفت میں تھا جس کا باقی جسم دیوار کی آڑ میں تھا......

میں کچھ اور آگے بڑھی تو سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا...... وہ حسینہ تھی۔ دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن چند لمحوں بعد جب آنکھیں کھولیں تو وہ حقیقت جوں کی توں میرے سامنے موجود تھی...... حسینہ کا مردہ جسم آڑھی ترچھی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اُس کا لباس تار تار اور جسم پر چھوٹے بڑے زخموں کے لاتعداد نشان نظر آ رہے تھے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ مرنے سے پہلے اس پر خاصا تشدد کیا گیا تھا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ حسینہ کی اذیت ناک موت کی ذمہ دار میں اور صرف میں تھی۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ رخساروں پر آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور دماغ میں تیز سنسناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ سر پر جس جگہ ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کیا گیا تھا وہاں درد کی بڑی شدید

ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں...... یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سر پر بھاری ضربیں لگائی جا رہی ہوں۔ پھر اچانک میرے دماغ میں روشنی کا کوندا سا لپکا اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے ماضی کی طرف لوٹنے لگی......!

میری کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ رہی تھی۔ بیتے ہوئے واقعات تاریکی سے اُبھر کر سامنے آنے … خیالات اور یادوں کے اس ہجوم سے میرا دماغ دُکھنے لگا۔ میں بار بار سر کو جھٹکنے لگی تاکہ ذہن کا … طرح کم ہو سکے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میرے ماضی کی ایک ایک تصویر ذہن میں واضح ہو … گئی۔ میں اٹھارہ سال کی تھی جب میرے والدین کا ٹریفک کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ … مالی حالت اتنی بہتر نہیں تھی اور نہ ہی ہمارا کوئی رشتے دار اس قابل تھا کہ میرا بوجھ اُٹھا سکتا۔ اس … والد کے ایک دوست عارف ندیم نے مجھے سہارا دیا۔ ندیم کا کاروبار کیا تھا؟ اس کے بارے میں، میں نہ جان سکی۔ لیکن گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ چھ ماہ بعد جب اُس نے مجھے شادی کی پیشکش کی تو … انکار نہ کر سکی۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے تقریباً بیس سال بڑا تھا لیکن اپنی عمر کے اس مرحلے میں، میں شدت سے ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس کر رہی تھی جو صحیح معنوں میں میرا محافظ بن سکے اور عارف نے اس ذمہ داری کا بوجھ اُٹھا لیا تھا۔

ہماری شادی کو پانچ سال گزر چکے تھے۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ دولت، اپنی پسند کے ملبوسات اور زیورات، ہر چیز کی فراوانی تھی۔ لیکن میں اولاد کی نعمت سے محروم رہی۔ اور پھر ایک … عارف ندیم کو دل کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ ندیم کے انتقال کے بعد اُس کی ساری جا… اور دولت میرے نام منتقل ہو گئی۔ میرے وہ رشتے دار جو میرے ماں باپ کے انتقال کے بعد مجھ… کترانے لگے تھے، شہد کی مکھیوں کی طرح میرے گرد جمع ہونے لگے۔ ہر کوئی مجھے نوچنے کھسوٹنے کی… کر رہا تھا۔ چند ایک نے مجھے دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا۔ میرے رشتے داروں میں ایک دو آدمی بھی تھے جنہوں نے مجھے سہارا دینے کی پیشکش بھی کی۔ لیکن میں خوب جانتی تھی کہ اُنہیں مجھ سے … میری دولت سے ہمدردی تھی۔ میں تقریباً ایک سال تک اُن لوگوں کو برداشت کرتی رہی، پھر سیا… نیت سے نکل کھڑی ہوئی۔ خیال تھا کہ کچھ عرصہ آوارہ گردی سے دل بہل جائے گا۔ میری پہلی منزل … تھی۔ پھر نیپال سے ہوتی ہوئی برما پہنچی تو عارف کے ایک پرانے دوست رام داس ملہوترہ سے ملاقا… گئی۔ قیامِ پاکستان سے قبل ملہوترہ کراچی میں ہی مقیم تھا، پھر بھارت چلا گیا۔ عارف سے میری ش… ایک سال ہوا تھا کہ انہی دنوں ملہوترہ بھی کسی کاروباری سلسلے میں کراچی آیا۔ دونوں بچھڑے ہوئے … بڑی گرمجوشی سے ملے۔ ملہوترہ نے بتایا کہ اُس کا شمار ہندوستان کے امراء میں ہوتا ہے اور اُس کا … پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اُس نے یہ وضاحت نہیں کی کہ وہ کاروبار کیا تھا۔

برما میں ملاقات کے دوران جب میں نے اُسے اپنے شوہر کے انتقال کا بتایا تو اُس نے گہرے … اظہار کیا اور پھر باتوں ہی باتوں میں مجھے اُس کے کاروبار کا بھی پتہ چل گیا۔ وہ جواہرات کا بہت بڑ… تھا اور اُس کا گروہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اعتماد میں لینے کے لئے اُس نے بتایا کہ وہ تقر… کروڑ روپے کی مالیت کے ہیرے برما سے ہندوستان سمگل کرنا چاہتا ہے لیکن بعض لوگوں کی نظروں …

جانے کی وجہ سے اب وہ یہ کام خود نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی اور آدمی پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ اُس نے پیشکش کی کہ اگر میں اُس کے ہیرے بمبئی پہنچا دوں تو مجھے ایک معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پھر ہر پہلو پر سوچنے کے بعد ہامی بھر لی۔ یہ کام اگرچہ خطرناک تھا لیکن میں اس کام کو کسی معاوضے کے لالچ میں نہیں بلکہ ایک دلچسپ ایڈونچر سمجھ کر انجام دینا چاہتی تھی۔ یہ طے پایا تھا کہ برما کی سرحد چھوڑنے سے پہلے اس کا ایک آدمی مجھے ہیرے پہنچا دے گا اور میں ایک مقررہ تاریخ پر وہ ہیرے بمبئی میں رام داس ملہوترہ کے حوالے کر دوں گی۔

میں برما سے روانہ ہو کر سکم سے ہوتی ہوئی انڈیا پہنچ گئی۔ لیکن ملہوترہ کے کسی آدمی نے مجھے ہیرے نہیں دیئے۔ میں بمبئی میں دو دن رہی اور اپنے طور پر مختلف تفریحات سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ میں نے ملہوترہ کے بتائے ہوئے پتے پر بمبئی میں اُس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں اسے مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ اُس نے برما میں میرے ساتھ جو پروگرام بنایا تھا اسے شاید عین وقت پر منسوخ کر دیا تھا اور ہیرے میرے بجائے کسی اور کے ذریعے بھیج دیئے تھے۔ اب اُس سے رابطہ قائم کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں مختلف علاقوں کی سیاحت کرتی ہوئی جے پور پہنچ گئی۔ خیال تھا کہ کھوکھراپار کے راستے پاکستان پہنچ کر کچھ عرصہ آرام کروں گی اور پھر یورپ کی سیاحت کو نکل جاؤں گی۔ لیکن ٹرین میں وہ حادثہ پیش آ گیا جس نے مجھے یادداشت سے محروم کر دیا۔ اب ملہوترہ کا کہنا تھا کہ ہیرے مجھے دیئے گئے تھے اور راز فاش ہو جانے کی وجہ سے مجھ پر حملے بھی اسی وجہ سے ہوئے تھے کہ کوئی دوسری پارٹی مجھ سے وہ ہیرے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے حیرت تھی کہ میرے پاس ہیرے کہاں سے آ گئے جبکہ برما سے روانہ ہوتے وقت ملہوترہ کے کسی آدمی نے مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔

میں برما میں قیام کے دوران اپنی نقل و حرکت کا جائزہ لینے لگی، ایک ایک تفصیل میرے ذہن میں واضح ہو رہی تھی۔ پھر دفعتاً میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکہ ہوا؟ برما کے سرحدی قصبے سے سکم کے لئے روانہ ہونے کے لئے مجھے بس تبدیل کرنا تھی۔ بس میں مجھے کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ ملی تھی۔ مختلف خوانچے والے، مسافروں کے ہاتھ اپنی چیزیں فروخت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک خوانچے والا میری کھڑکی کے پاس کھڑا مجھے مختلف چیزیں دکھا رہا تھا جن میں ہاتھی دانت کے زیورات اور اسی قسم کی چیزیں شامل تھیں۔ میں نے ہاتھی دانت کا ایک ہار پسند کر لیا۔ وہ شیشے کے ٹکڑوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا گلدان بھی میرے سر تھوپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تقریباً چار انچ لمبا اور دو انچ قطر کا گلدان میرے ہاتھ میں تھا اور خوانچے والا اس کی صناعی میں قصیدہ گو تھا۔ اس دوران بس چل پڑی۔ میں نے گلدان خوانچے والے کو دینے کی کوشش کی لیکن وہ خوانچہ سنبھالتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور گلدان میرے ہاتھ میں پکڑا رہ گیا۔ بس اڈے سے نکل کر تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ میں نے گلدان پھینکنا چاہا مگر یہ سوچ کر اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکی کہ سڑک پر گر کر یہ چکنا چور ہو جائے گا اور کسی کام کا نہ رہے گا۔ میں چند لمحے شیشے کے مختلف ٹکڑوں سے بنے ہوئے اس خوبصورت گلدان کو دیکھتی رہی، پھر اسے بیگ میں رکھ لیا۔ اور وہی گلدان گزشتہ روز میں نے حسینہ کو دے دیا تھا اور حسینہ کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔

اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ننھا سا وہ گلدان ہی دراصل وہ جواہرات تھے جنہیں ملہوترہ برما سے
سمگل کرنا چاہتا تھا۔ ہیروں کو اس خوبصورتی سے گلدان کی شکل دی گئی تھی کہ کوئی شبہ تک نہیں کر سکتا
جس کے قبضے میں گلدان تھا، وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی
لگیں۔ کیا وہ گلدان حاصل کر چکے ہیں یا انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا؟ مجھے ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں
تھا کہ حسینہ کی موت کے ذمہ دار کون تھے؟ اور میں کن لوگوں کی قید میں تھی، ملہوترہ کے آدمی یا کسی
گروہ کے......؟

بہت دیر کی سوچ بچار کے بعد بھی میرا ذہن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور میں نے سر جھٹک کر دیوار
ٹیک لگا لی۔ چراغ میں جلنے والا سیال ختم ہو رہا تھا کیونکہ روشنی کم ہو گئی تھی۔ میری کلائی میں پڑی
ہتھکڑی خاصی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ میں اس ہاتھ کو کم سے کم حرکت دینے کی کوشش کر رہی
زیادہ تکلیف نہ ہو۔ سناٹا میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہا تھا۔ لیکن پھر دفعتہً باہر کسی جگہ
سنائی دینے لگی...... وہ قدموں کی آواز تھی جو لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی۔ بالآخر دروازے کے سامنے
کر یہ آواز رُک گئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میری آنکھیں
چندھیا گئیں اور میں نے جلدی سے رُخ بدل لیا۔

''بہت بہادر بننے کی کوشش کر رہی تھی...... مسجد کے گیسٹ ہاؤس کو بھول جاؤ اور اب ذرا میرے
گیسٹ ہاؤس میں بھی رہ کر دیکھ لو۔'' دروازے کی طرف سے اُبھرنے والی یہ غراہٹ آمیز آواز ملہوترہ
علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے جلدی سے اُس طرف دیکھا، دروازے میں تین آدمی کھڑے
تھے۔ ایک ملہوترہ، دوسرا دیو قامت اُس کا ملازم جس نے تیسرے آدمی کو جکڑ رکھا تھا۔ اسی لمبے دیو
آدمی نے تیسرے آدمی کو زوردار دھکا دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے وسط میں آ گرا...... وہ بہادر تھا
کے ہاتھ باندھے ہوئے تھے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ بہادر کی اس حالت کو دیکھ کر میں
اُٹھی۔ اُس کی پیشانی سے بہتا ہوا خون اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اُس کے ساتھ مار پیٹ کی گئی
میں چند لمحے متوحش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی، پھر ملہوترہ کی طرف گھوم گئی۔ ''تو مجھے
کرنے والے تم ہو...... لیکن بہادر کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

''تمہارا سب سے بڑا ہمدرد ہے یہ۔ اور میرا خیال ہے کہ اسے تم سے کچھ دلی لگاؤ بھی پیدا ہو گیا
اسے یہاں لانا میرے لئے یوں بھی سودمند ثابت ہو گا کہ قصبے میں اب تمہیں تلاش کرنے والا کوئی
رہا۔ تم دونوں کی عدم موجودگی سے یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ تم کسی طے شدہ پروگرام کے تحت کہیں
فرار ہو گئے ہو۔'' ملہوترہ کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''لیکن حسینہ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ اس معصوم کو اس بے دردی سے کیوں ہلاک کیا گیا ہے؟''
نے پوچھا۔

''میرا خیال تھا کہ اسے ہمدرد پا کر تم نے اسے اپنے راز سے آگاہ کر دیا ہو گا اور یہی راز ہم اس
اُگلوانا چاہتے تھے۔ مگر وہ بڑی ٹھس ثابت ہوئی۔ ٹنگو کے چند ہاتھ بھی برداشت نہ کر سکی۔'' ملہوترہ

وہ اپنے قریب کھڑے ہوئے لمبے تڑنگے آدمی کی طرف دیکھا جس نے بہادر کو دھکا دے کر گرایا تھا۔
''نہیں...... وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔
''تو گویا تم جانتی ہو؟'' ملہوترہ نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔
''مم...... میں کیسے جانتی ہوں؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنی یادداشت سے محروم ہو چکی
ہوں۔'' میں نے چہرہ جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ میں اُسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میری یادداشت لوٹ
آئی ہے۔
''ہوں......'' اُس نے مجھے گھورا۔ ''میں تم سے علیحدگی میں بات کروں گا۔ کھانا تیار ہو چکا ہے اور
تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہو گی۔ ہماری باقی گفتگو کھانے پر ہو گی۔'' ملہوترہ نے کہتے ہوئے ٹنگو کو اشارہ
کیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر بہادر کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا، لیکن ہاتھ بندھے رہنے دیئے۔ پھر وہ
میری طرف آیا اور میرے ہاتھ کا آہنی کڑا کھول دیا۔ میں دوسرے ہاتھ سے کلائی مسلنے لگی۔
''تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی رام داس۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ عالیہ کے بارے میں پاکستانی
سفارت خانے کو اطلاع دی جا چکی ہے۔ میری حیثیت بھی حکومت پاکستان کے ایک نمائندے کی ہے۔
اس معاملے کو سفارتی سطح پر اُٹھایا جائے گا اور تم کسی طرح نہ بچ سکو گے۔'' بہادر نے کہا۔
''میرے بچنے یا نہ بچنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہو گا جب مجھ پر بات آئے گی۔ جبکہ کسی کو علم ہی نہ
ہونے پائے گا کہ تم لوگوں کو اغواء کرنے والا میں ہوں۔'' ملہوترہ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''کیا مطلب...... کیا تم زندگی بھر کے لئے ہمیں اپنا قیدی بنا کر رکھنا چاہتے ہو؟'' میں نے اُسے گھورا۔
''میں یہ روگ نہیں پالوں گا۔ لیکن تم لوگوں کو اس طرح غائب کر دیا جائے گا کہ دنیا میں تمہارا نام تک
نہ رہے گا۔''
''کیا مطلب...... کیا تم ہمیں قتل کر دو گے؟'' میں سہم گئی۔
''ہاں...... اور تم لوگوں کی ہڈیاں بھی اس غار میں گل سڑ جائیں گی۔'' ملہوترہ نے باری باری ہم دونوں
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اُس نے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ایک نظر بدقسمت حسینہ کی لاش اور
زمین پر بندھے ہوئے بہادر کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ملہوترہ آگے تھا۔ اُس
کے پیچھے میں اور میرے ساتھ ٹنگو، جس نے میرے بازو پر گرفت جما رکھی تھی۔
ہم مختلف سرنگوں میں چکراتے ہوئے جیسے ہی دہانے سے باہر نکلے، میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ
گئیں۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا...... چاروں طرف سے چٹانوں میں گھرے ہوئے ایک چھوٹے سے
میدان میں عالی شان خیمے اور شامیانے نصب تھے۔ دو مختلف جگہوں پر پیٹرومکس جل رہے تھے۔ ایک
طرف ملہوترہ کا ایک ملازم کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا۔ ملہوترہ مجھے لے کر اس میز کے قریب پہنچ گیا
جس کے گرد کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہمارے بیٹھنے کے چند منٹ بعد ہی ملازم نے میز پر کھانا چن دیا۔
ملہوترہ نے کھانے کی طرف اشارہ کیا مگر میں نے انکار کر دیا۔
''میرے ساتھ تعاون کر کے فائدے میں رہو گی۔'' ملہوترہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''بصورتِ دیگر

تمہاری اور بہادر کی موت اذیت ناک ثابت ہوگی۔ میرا یہ ملازم ٹنگو تشدد و اذیت کے بیسیوں طریقے جانتا ہے۔"

"تو...... تو کیا تم واقعی ہمیں قتل کر دو گے؟" میں نے متوحش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"اپنے آپ کو احمق ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو عالیہ۔ تم حسینہ کے قتل کی عینی شاہد ہو۔ تمہیں چھوڑ کر میں اپنے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" رام داس ملہوترہ نے مجھے گھورا۔

"للل...... لیکن کیوں؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" میں ہکلا کر رہ گئی۔

"تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ مجھ سے تعاون کرو اور یہ بات ذہن نشین کر لو کہ یہاں نہ تمہاری مدد کو آئے گا اور نہ ہی تم یہاں سے فرار ہو سکتی ہو۔ اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو سچ اُگلوانا بھی جانتا ہوں۔"

"لیکن...... مجھے کچھ یاد نہیں...... میں کچھ نہیں جانتی۔"

"تمہیں سب کچھ یاد آ جائے گا۔" ملہوترہ نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

عین اسی لمحے خیمے کے دوسری طرف کوئی پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی...... ہم دونوں چونک کر اس طرف دیکھنے لگے۔ ملہوترہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے اُلجھن کے آثار پیدا ہوئے، پھر تاثرات بدل گئے۔ وہ ٹارچ اُٹھا کر اس کی روشنی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت مجھے بھی پہلی مرتبہ غور سے اس جگہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ چٹانوں میں کسی مندر کے کھنڈرات تھے۔ ہمارے کیمپ کے چاروں طرف اُونچی شکستہ دیواریں تھیں۔ کہیں کہیں کوئی ستون بھی نظر آ رہا تھا۔

"شاید کوئی جانور تھا۔" ملہوترہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "میں تم سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں اور یقین ہے کہ تم ٹھیک ٹھیک جواب دو گی۔"

"تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ میں کچھ نہیں جانتی۔" میں نے جواب دیا۔ میری نگاہیں اندھیرے میں اسی سمت مرتکز تھیں جہاں سے پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اور پھر صرف ایک لمحے کے لئے میں نے دو چٹانوں کے درمیان ایک ہیولے کو معلق دیکھا، مگر دوسرے ہی لمحے ملہوترہ کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"تو پھر مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔" ملہوترہ نے کہتے ہوئے جیب سے ٹین کی ایک سی ڈبیہ نکال لی جس میں ایک سرنج اور ایک چھوٹی سی شیشی میں سیال بھرا ہوا تھا۔

"یہ ٹروتھ سپریم ہے...... اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ہر ایک کو سچ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے پہلے میں ویسے ہی تم سے سوالات کروں گا۔ اس کے بعد یہ انجکشن لگا کر سوالات دُہرائے جائیں گے۔ اگر کسی بات میں تضاد پایا گیا تو پھر تمہیں ٹنگو کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور وہ ٹنگو تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دے گا۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں؟" میں تقریباً چیخ اُٹھی۔ "جب میں کچھ جانتی ہی نہیں تو دواؤں کے تشدد کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں خاموش ہو کر اس کے چہرے کو تکنے لگی جہاں درندگی اور

کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے حسینہ کی لاش گھوم گئی جو اُن کی بربریت کا واضح ثبوت تھی۔ لیکن میں نے طے کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گی۔

"تمہیں شاید علم نہیں۔" میں نے اُس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے دوبارہ کہا۔ "بہادر، کیپٹن گوپال سے مل کر تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ وہ یقیناً مجھے تلاش کرتا ہوا اس طرف آئے گا۔"

"یہ بات بھی میرے ذہن میں ہے۔" ملہوترہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کیپٹن گوپال سنگھ کو اطلاع دینے کے بعد بہادر کی نیت بدل گئی ہو اور وہ تمہیں لے کر فرار ہو گیا ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہادر نے یہ پروگرام بڑی عجلت میں بنایا تھا۔ کیونکہ اُس کی جیپ میں پانی کی ایک بوتل کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ جیپ میں پٹرول بھی زیادہ نہیں تھا۔ کسی خاطر خواہ انتظام کے بغیر ریگستان میں نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ تم لوگ بھی ریگستان میں راستہ بھٹک گئے، جیپ کا پٹرول ختم ہو گیا۔ تم لوگ تپتے ہوئے ریگزار میں گرمی اور پیاس سے ختم ہو گئے۔ دونوں کی لاشیں جیپ میں ملیں گی اور تمہاری محبت کی کہانی پر ہر کوئی یقین کر لے گا۔"

میں سرتاپا لرز اُٹھی۔ اُس کے شیطانی ذہن نے بڑے بھیانک منصوبے بنا رکھے تھے۔

"اگر...... اگر میں یہ کہوں کہ...... میں کچھ جانتی ہوں تو؟" میں نے رُک رُک کر مرتعش لہجے میں کہا۔

"تم مجھے ہر وہ بات بتاؤ گی جو میں پوچھنا چاہوں گا۔" ملہوترہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ "اور میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ٹنگو کو بھی مایوس نہیں کرنا چاہتا۔" اُس نے خاموش ہو کر دیو قامت ٹنگو کو اشارہ کیا۔ اُس کے اس جملے سے میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مجھے کسی حالت میں بھی بخشنا نہیں چاہتا تھا۔ اس اعتراف کے بعد کہ میں کچھ جانتی ہوں، میں نے اپنے مقدر پر خود ہی بدقسمتی کی مہر لگا دی تھی۔ وہ سچ اُگلوانے کے لئے میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دے گا۔

دیو قامت ٹنگو نے چمڑے کے ایک فیتے سے میری دونوں کلائیاں اس قدر مضبوطی سے باندھ دیں کہ چمڑے کا فیتہ مجھے گوشت میں اُترتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔ پھر اُس نے میرا سر پکڑ کر گردن کو ایک طرف موڑا۔ گردن مڑنے کے ساتھ ساتھ مجھے گردن کی ہڈی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ پھر اُس نے زوردار جھٹکا دے کر گردن چھوڑ دی۔ میرے منہ سے بے اختیار کربناک چیخ نکل گئی اور میں زور زور سے سر جھٹکنے لگی۔

"میں تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں۔" ملہوترہ کی آواز سنائی دی۔ "ہیرے کہاں ہیں؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں...... میں کچھ نہیں جانتی۔" میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

ملہوترہ نے ٹنگو کو اشارہ کر دیا۔ عین اسی لمحے کسی طرف سے دھپ کی آواز سنائی دی۔ ملہوترہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا اس کے ساتھ ہی اُس نے جیب سے بائیس بور کا ریوالور نکال لیا۔ اُس نے ٹارچ اُٹھا کر دوسرے ملازم ارجن اور اشارہ کیا اور دونوں آواز کی سمت دوڑ گئے۔ میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ وہ آواز کس قسم کی تھی؟ میں تو خوفزدہ نظروں سے ٹنگو کو دیکھ رہی تھی جو میرے اوپر جھک رہا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ کی آہنی گرفت میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے زمین پر پڑا ہوا زنبور اُٹھا لیا۔ میں دہشت سے کانپ اُٹھی...... مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ میرے ناخن کھینچنا چاہتا تھا۔

عین اسی لمحے دھپ کی ایک اور آواز سنائی دی اور کسی نے جلتا ہوا پیٹرومیکس اُٹھا کر خیمے
اُچھال دیا۔ ٹنکو مجھے چھوڑ کر اُس طرف بھاگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا
ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا کہ پشت کی سمت سے ایک سرگوشی سنائی دی۔
"عالیہ...... عالیہ، کیا تم میری آواز سن رہی ہو؟" آواز بلاشبہ بہادر کی تھی۔
میں اُٹھ کر آواز کی سمت دوڑی۔ اگرچہ خیمے کو آگ لگ چکی تھی لیکن اس طرف تاریکی تھی۔
ہی ایک ستون کے قریب پہنچی، کسی نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے کھینچتا ہوا چٹان کے ایک اور غار میں
گیا۔ وہ بہادر تھا۔ ہم اندھوں کی طرح غار میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے بالآخر ایک کھلی جگہ نکل آ
شکستہ مندر کا ایک حصہ ہی تھا۔ ہمارے سامنے پتھروں کی کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ آسمان پر چمکنے وا
کی روشنی میں ایک جگہ جیپ کھڑی نظر آ رہی تھی۔ میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ اپنی کیفی
پانے کے لئے میں ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔
"ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ وہ نیچے میری جیپ کھڑی ہے۔ اگر ملہوترہ ہم سے
تک پہنچ گیا تو ہمارے فرار کی تمام راہیں مسدود ہوں گی۔" بہادر یہ کہتا ہوا مجھے اُٹھا کر سیڑھیوں
اُترنے لگا۔ ایک جگہ ہم ایک دیوار کی آڑ میں رُک گئے اور وہ شیشے کے ایک ٹکڑے سے میری کا
بندھا ہوا چمڑے کا فیتہ کاٹنے لگا۔ یہ حسینہ کی ٹوٹی ہوئی عینک کا شیشہ تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ
کے اندر بہادر نے اپنے آپ کو کس طرح کھولا ہو گا۔
چند لمحوں بعد ہم دیوار کی آڑ سے نکل کر پھر نیچے اُترنے لگے۔ سیڑھیاں ختم ہو گئیں۔ آخری
زمین کا فاصلہ تقریباً آٹھ فٹ تھا اور وہاں سے پندرہ سولہ فٹ کے فاصلے پر جیپ کھڑی تھی۔ بہ
سے نیچے کود گیا اور سرگوشی میں مجھے نیچے کودنے کو کہا۔ میں چھلانگ لگانے کی بجائے سیڑھی کا کن
لٹک گئی اور اس سے پہلے کہ میں ہاتھ چھوڑتی، فضا دھماکے کی آواز سے گونج اُٹھی...... دائیں طر
سے آنے والی گولی میرے بالکل قریب پتھر پر لگی۔ پتھر کا ایک ٹکڑا میرے رخسار پر لگا اور اسی
نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ بہادر مجھے گھسیٹتا ہوا دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ دائیں طرف بلندی پر کھ
داس ملہوترہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس کے ساتھی مختلف سمتوں پر کھڑے فائرنگ کر رہے تھے۔
چند لمحے صورت حال کا جائزہ لیا اور میرا ہاتھ پکڑے دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اب
جیپ پر فائرنگ کر رہے تھے۔ گولی لگنے سے جیپ کی ونڈ شیلڈ میں ایک جگہ سوراخ ہو گیا تھا اور
جالے کی طرح پورے شیشے میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ بہادر چند لمحے دیوار کے ساتھ کھڑا رہا، پھ
تھام کر تیزی سے جیپ کی طرف دوڑا۔ مجھے اُس نے اُٹھا کر پچھلے حصے میں فرش پر پھینکا اور خود
کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو مرتبہ غرانے کے بعد تیسری
اسٹارٹ ہو گیا۔ اسی لمحے ایک گولی ہڈ کو چیرتی ہوئی میرے گھٹنے کے قریب فرش میں پیوست ہ
جیپ کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ پوری رفتاری سے دوڑنے لگی...... میرے جسم کا ہر حصہ بری
رہا تھا، سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت جیپ کے فرش پر لیٹی رہی۔ فائرنگ کی

ہت پیچھے رہ گئی تھیں اور جیپ تیز رفتاری سے ریگزار میں اُچھلتی ہوئی جا رہی تھی۔
"اُٹھ جاؤ عالیہ اب ہم خطرے سے باہر ہیں۔" بہادر نے پیچھے مڑے بغیر کہا۔
"ہم کس طرف جا رہے ہیں بہادر؟" میں نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔
"کچھ پتہ نہیں۔ اس وقت تو میں ان لوگوں سے زیادہ سے زیادہ دُور نکل جانا چاہتا ہوں۔ رات کے
ت سمت کا تعین مشکل ہے۔ ویسے چندراٹ یہاں سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ میرا خیال
ہے کہ ہم صبح ہونے پر ہی راستے کا تعین کر سکیں گے۔ اس وقت ہم کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں گے۔" بہادر
نے جواب دیا۔
تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ کا انجن خرخرانے لگا...... اس کے ساتھ ہی رفتار کم
ہوتی چلی گئی۔ بہادر گیئر بدل کر انجن کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا اور بالآخر جیپ رُک
گئی۔ بہادر انجن چیک کرنے کے لئے نیچے اُترا تو لڑکھڑا کر ریت پر گر گیا۔ میں جلدی سے نیچے کود گئی۔
بہادر کو اُٹھانے کے لئے جیسے ہی اُس کا ہاتھ پکڑا، بری طرح چونک گئی۔ اُس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا
تھا۔ میں نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو میرا ہاتھ چپچپانے لگا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ جب بہادر کو
لایا گیا تھا تو اس کی پیشانی زخمی تھی اور شاید اسی وجہ سے اسے بخار آ گیا تھا۔ اور بخار بھی اس قدر شدید کہ
فوری طور پر کسی قسم کی طبی امداد نہ پہنچائی جاتی تو اس کی حالت بگڑنے کا خدشہ تھا۔ مجھے تو حیرت تھی کہ وہ
اب تک اپنے آپ پر قابو کیسے پائے ہوئے تھا؟ میں نے اُسے بمشکل اُٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈال
دیا۔ وہ اُٹھ کر جیپ کا انجن چیک کرنا چاہتا تھا، لیکن اب شاید اُس کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔
جیپ میں پانی کی ایک بوتل مل گئی۔ میں نے اپنی قمیص کا دامن پھاڑا اور کپڑا بھگو بھگو کر اُس کی پیشانی پر
رکھنے لگی۔ اس وقت اس کے علاوہ میں کچھ اور کر بھی نہیں سکتی تھی۔ رات بیتی جا رہی تھی۔ بہادر پر غنودگی
طاری تھی اور میں اس خیال سے ہی سہمی جا رہی تھی کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو آبادی سے میلوں دُور اس صحرا
میں میری زندگی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر رام داس ملہوترہ اور اس کے وحشی ساتھیوں کے ہاتھ آنے
سے بچ بھی گئی تو دن میں انگاروں کی طرح تپتی ہوئی ریت مجھے موت کی نیند سلا دے گی۔
رات کے آخری پہر بہادر کو کچھ ہوش آیا لیکن وہ اپنی جگہ سے اُٹھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے
اسے لیٹے رہنے کا مشورہ دیا اور اُس کا دھیان بٹانے کے لئے اُس سے باتیں کرنے لگی۔
"میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں عالیہ......" اُس نے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ملہوترہ تم
سے کیا چاہتا ہے؟ اُس نے تمہیں اغواء کیوں کیا تھا؟ جہاں تک میرا خیال ہے، حسینہ کی موت اور میرا اغواء
تمہاری ہی وجہ سے ہوا تھا۔ آخر کیوں؟"
بہادر کی اس کیوں کے پیچھے بہت سے سوالات پوشیدہ تھے۔ میں فوری طور پر جواب دینے کی بجائے
سوچنے لگی کہ میری وجہ سے دو قتل ہو چکے تھے۔ بہادر بھی میری ہی وجہ سے اس مصیبت میں پھنسا تھا۔ اگر
وہ مجھے لے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب نہ ہو پاتا تو یقیناً اُسے بھی قتل کر دیا جاتا۔ موجودہ حالات میں اُس
کی اور میری زندگی کی اب بھی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگر ملہوترہ ہمیں تلاش کرتا ہوا اس طرف آ

نکلا تو ہم چوہوں کی طرح مارے جائیں گے۔ وہ مسلح تھے اور ہم نہتے۔ ہماری طرف سے کسی
ممکن نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ زندگی کے اس نازک موڑ پر بہادر کو تمام واقعات سے
جائے۔ بالآخر چند لمحوں بعد میں مدہم لہجے میں اُسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگی۔ اُسے اس
پس منظر سمجھانے لگی۔

''اوہ...... اب وہ ہیرے کہاں ہیں؟'' میرے خاموش ہونے پر بہادر نے چونک کر پوچھا۔

''وہ گلدان میں نے ایک بے کار سی چیز سمجھ کر حسینہ کو دے دیا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ حسینہ
کے بعد اب وہ ایک کروڑ روپے کی مالیت کا گلدان کہاں ہوگا؟'' میں نے مدھم لہجے میں جواب

''وہ گلدان یقیناً حسینہ کے سامان میں موجود ہوگا۔ اُس کا سامان ہسپتال ہی کے سٹور روم میں
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی تک کسی نے اُس پر توجہ نہیں دی ہوگی۔ ہمیں جلد سے جلد چندراٹ
کوشش کرنی چاہیے۔'' بہادر کہتا ہوا ایک بار پھر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا اور اس مرتبہ وہ اپنی
میں کامیاب ہوگیا۔ دن کا ہلکا سا اُجالا پھیل رہا تھا۔ اُس نے جیپ کا بونٹ اُٹھا دیا اور انجن چیک
لگا۔ بیٹری کا تار لوز ہوگیا تھا۔ اسے درست کرتے ہی انجن سٹارٹ ہوگیا۔ بہادر کی حالت اگرچہ
نہیں تھی لیکن اُس نے جیپ کو تیز رفتاری سے دوڑا دیا۔ بخار کے باعث اسٹیئرنگ پر اُس کے
رہے تھے۔

مشرقی اُفق پر سرخی پھیل گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سورج طلوع ہوگیا...... سورج کا گولا منظر عام
آگ برسانے لگا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی ریت تپنے لگی۔ رات کے وقت ہوا کے جھونکے بڑ
محسوس ہورہے تھے، اب لُو کے تھپیڑے بن کر جسم کو جھلسائے دے رہے تھے۔ ہم صحیح سمت
تھے۔ بہادر کے خیال کے مطابق چندراٹ یہاں سے زیادہ سے زیادہ ساٹھ میل دُور تھا۔ جیپ کی
اتنا تیل موجود تھا کہ اگر ہم بھٹکے بغیر چلتے رہتے تو آسانی سے وہاں پہنچ سکتے تھے۔ کسی ریگستان
خیال ہی رُوح فرسا تھا۔ گرمی کی شدت سے دماغ پگھلا جارہا تھا۔ پیاس کی وجہ سے حلق میں
رہے تھے۔ بوتل میں صرف چند گھونٹ پانی موجود تھا۔ پانی کے یہ چند گھونٹ ہم نے کسی انتہا
موقع کے لئے محفوظ کررکھے تھے۔ بہادر کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ میں نے اُسے ایک گھونٹ
مشورہ دیا لیکن اُس نے انکار کردیا۔ اسٹیئرنگ اُس کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ ہاتھوں کا معمولی
جس سے جیپ سیدھے رُخ دوڑی جارہی تھی۔

''اوہ...... وہ دیکھو عالیہ...... وہ کیا ہے؟'' بہادر نے سامنے قدرے دائیں طرف اشارہ کیا۔
چونک کر اُس طرف دیکھا، ایک سیاہ نقطہ تھا جو لحہ بہ لحہ واضح ہوتا جارہا تھا...... وہ کوئی جیپ تھی جو
سے فاصلہ سمیٹ رہی تھی۔ اُس جیپ کو دیکھ کر میرا دل لرز اُٹھا...... مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی
ملہوترہ ہم سے پہلے ہی اس طرف پہنچ گیا تھا اور اب بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا
آنکھوں میں ویرانی چھاگئی۔ ہم ایک بار پھر وہیں پہنچ گئے تھے جہاں سے چلے تھے......
بہادر نے جیپ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھنے کے باوجود جیپ کی رفتار کم نہیں کی تھی۔

''اوہ...... بہادر، اُدھر دیکھو، بائیں طرف......'' میں نے دوسری سمت اشارہ کیا۔ اُس طرف سے بھی
جیپ تیز رفتاری سے ہماری طرف آرہی تھی۔ ''شاید ہمیں دو طرف سے گھیرنے کی کوشش کی جارہی
''میں خوفزدہ لہجے میں بڑبڑائی۔

''اوہ...... وہ ملہوترہ کے ساتھی نہیں، پولیس کی جیپ ہے۔ جیپ پر لگا ہوا جھنڈا اس بات کی نشاندہی
تا ہے۔ شاید کیپٹن گوپال سنگھ ہماری تلاش میں اس طرف آنکلا ہے۔'' بہادر نے جواب دیا۔

غور سے دیکھنے پر مجھے بھی اُس دوسری جیپ پر ایک چھوٹا سا جھنڈا لہراتا ہوا نظر آگیا۔ اب مجھے
ے اطمینان ہوگیا کہ ملہوترہ کے شکنجے میں آنے سے بچ جائیں گے۔

بہادر نے جیپ کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ ہماری جیپ ان دونوں جیپوں کے درمیانی رُخ پر بڑھ رہی
۔ ان دونوں جیپوں کی رفتار میں بھی فرق نہیں آیا تھا...... فاصلے لحہ بہ لحہ سمٹنے لگے...... اب دونوں
ف کی جیپیں اتنی نزدیک پہنچ چکی تھیں کہ ان میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔ دائیں طرف کی
میں ملہوترہ اور اُس کے دونوں ساتھی تھے اور بائیں طرف والی جیپ میں کیپٹن گوپال سنگھ اور چند مسلح
ہی بھی نظر آرہے تھے۔ بہادر شاید ان دونوں جیپوں کے درمیان سے اپنی جیپ نکال لے جانا چاہتا تھا۔
کی نظریں دائیں طرف کی جیپ پر تھیں۔ شاید وہ فاصلے کا تعین کرکے فائرنگ کی پہنچ سے دُور رہنا چاہتا
میری نظریں اچانک ہی سامنے ایک بہت بڑے کھڈ کی طرف اُٹھ گئیں...... جیپ تیزی سے اُس کھڈ
طرف بڑھ رہی تھی۔

میں نے چیخ کر بہادر کو اُس طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن اب دیر ہوچکی تھی...... جیپ کے پہیوں نے
ن چھوڑ دی...... جیپ چند لمحے ہوا میں تیرتی رہی پھر قلابازی کھاتی ہوئی ایک زوردار دھماکے کی آواز
کھڈ کی تہہ میں جاگری...... میں جیپ کے گرنے سے پہلے ہی باہر جاگری تھی۔ میرے دماغ میں
کے سے ہورہے تھے...... تاریکی میں ڈوبے ہوئے ذہن کے ساتھ فائرنگ کی آواز بھی سماعت سے ٹکرا
تھی۔ پھر مجھے کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ میرا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا تھا......!

میری آنکھ ایک بار پھر چندراٹ کے اُس چھوٹے سے ہسپتال کے بیڈ پر کھلی۔ ہوش میں آتے ہی سب
پہلے ڈاکٹر بملا کا چہرہ نظر آیا جو میرے اوپر جھکی بازو میں انجکشن لگارہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب
اثر تھا جس سے میں کوئی نتیجہ اخذ نہ کرسکی۔

مکمل طور پر ہوش میں آنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ جیپ کے کھڈ میں گرتے وقت بہادر اس میں
ارہ گیا تھا جس سے اُس کی گردن اور ریڑھ کی ہڈی کئی جگہوں سے ٹوٹ گئی اور اُس نے وہیں دم توڑ
۔ میں معجزانہ طور پر باہر گرنے کی وجہ سے زندہ بچ گئی تھی۔ چند معمولی سی چوٹوں کے سوا مجھے زیادہ
ن نہیں پہنچا تھا۔''

زندگی میں ایسے انوکھے واقعات کی کہانی کبھی کبھی علم میں آتی ہے۔ ایک طرف شیطان اپنی کوششوں
لگا رہتا ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو بھی طاقت دی ہے کہ وہ شیطان کی
شوں کو ناکام بنادیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں میٹنگ ہوئی اور اس میٹنگ میں انا زبیدہ، ایمان علی اور

رجنی یا ستارہ شریک ہوئے۔ انا زبیدہ نے کہا۔

''جس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیطان آج سے مصروفِ عمل نہیں ہے بلکہ دنیا کی ابتداء
اور اس سے پہلے وہ حضرت آدم کو بہکا چکا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس کی پُراسرار اور شیطانی قوتیں نجا
کس شکل میں عمل میں آتی رہی ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیطان اپنا عمل کرتا رہا ہے اور اللہ
کرنے والے ہر جگہ اس کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ جو اس کا اپنا عمل ہے وہ اپنی جگہ، ہم
ہے کہ ہم اس کے عمل کے خلاف کام کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری قوتیں اور ہمارا علم شیطا
مقابلے میں محدود ہے اور ہمیں اللہ نے جو قوت دی ہے ہم اسی سے شیطان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ا
پہلی بات یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو شیطانی خیالات سے دُور رکھیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم
پر اچھا عمل کریں اور ہمارے علم میں جو بھی شیطان کا مارا ہوا نظر آئے ہم اس کے ساتھ بھرپو
کریں۔ میری بات تم دونوں کی سمجھ میں آ رہی ہے؟'' انا زبیدہ نے ایمان علی اور رجنی سے پوچھا۔

''ہاں انا زبیدہ...... آپ کی باتوں کا ایک ایک لفظ ہماری سمجھ میں آ رہا ہے۔''

''میں بندۂ ناچیز یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ لیکن ہمیں اللہ نے جو کچھ
ہے اس کے تحت ہم ان لوگوں کی مدد کریں جو شیطان کے جال میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ایمان عل
سلسلے میں ایک طریقہ کار اختیار کرو۔ جہاں سے بھی کوئی ایسا شخص نظر آئے جو سحر زدہ ہو، جس پر جا
ہو یا وہ شیطان کی وجہ سے مشکلات میں گرفتار ہو، ہمیں اُس کی مدد کے لئے کھڑے ہو جانا چاہئے
طرح بھی بن پڑے ہمیں اُس کی مدد کرنی چاہئے۔ کوئی ایسا شخص ہے تمہارے ذہن میں؟''

''انا زبیدہ...... ایسے کسی شخص کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ ہم مختلف ذرائع س
کرتے ہیں اور اس سے ہمیں فائدہ ہی ہوگا۔''

''دیکھ لو...... اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح سے کوئی کام ہو سکتا ہے تو پھر ہمیں یہ کام بڑی خوشی
کرنا چاہئے۔''

''میں اس سلسلے میں اپنی تمام تر کوششیں کرتا ہوں۔ ہمیں ایسے کسی واقعے کی طرف پوری
دینی چاہئے۔''

بہر حال، گھر میں ایک ایسا کمرہ بنا لیا گیا جسے اُنہوں نے اپنے دفتر کا درجہ دیا تھا اور شیطان
کارروائیوں کے لئے یہ ساری کوششیں کی جا رہی تھیں۔

پھر ایک ایسے شخص سے واسطہ پڑا جو ذہنی بیماری کا شکار تھا اور اُس کی بیماری سمجھ میں نہیں آ رہ
ایک اچھے گھرانے کا فرد تھا۔ پچاس پچپن سال کی عمر تھی۔ اُس کا بیٹا فوج میں کرنل تھا اور اس
کرنل ایاز تھا۔ ایمان علی سے کسی ذریعے سے رابطہ ہوا تو کرنل ایاز نے بڑی دل سوزی سے کہا۔

''میں ایک باعزت اور معزز آدمی ہوں۔ میرے والد ایک ایسے ذہنی مرض کا شکار ہیں ج
میں نہیں آتا۔ بہت سی جگہ میری بے عزتی ہو چکی ہے۔ تمام علاج کرا چکا ہوں لیکن ان سے کوئی ف
تک نہیں ہوا۔ اگر آپ میری کچھ مدد کر سکیں تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔''

ایمان علی نے انا زبیدہ کو اس بارے میں بتایا تو انا زبیدہ نے اُنہیں طلب کر لیا۔ کرنل صاحب کے
د کا نام غیاث احمد شیخ تھا۔ انا زبیدہ نے غیاث احمد کو دیکھا اور اُن سے سوالات کرتی رہیں۔ غیاث احمد
تعلیم یافتہ اور مہذب آدمی تھے۔ جب کبھی اُنہیں دماغی دورے پڑتے ہوں گے تو وہ نجانے کیا کیا عمل
تے ہوں گے۔ لیکن عام حالات میں بالکل اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ اس وقت بھی وہ سفید شلوار
پہنے، ٹوپی پہنے، کندھے پر رومال ڈالے ہوئے اُن کے پاس آئے تھے۔

انا زبیدہ کافی دیر تک کچھ پڑھتی رہیں۔ پھر اُنہوں نے دم کر کے غیاث احمد کو یہ پانی پلایا اور غیاث احمد
ب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ اصل میں دیوانہ نہیں ہوں، بعض اوقات کچھ چیزیں جب دماغ
پھنس جاتی ہیں اور انسان ان کا اصل تلاش نہیں کر پاتا تو دماغ میں ایک دُکھن ہوتی ہے اور بس کچھ ایسا
ہو جاتا ہے کہ لوگ پاگل سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اصل میں مجھے نوادرات کا بے حد شوق ہے۔
ن تو غیر اینٹیکس اور ایسی دوسری اشیاء میں بھی بے ایمانی کی جاتی ہے اور لوگوں کو لوٹا جاتا ہے اور وہ نو
یے، جنہیں کوئی تمیز نہیں ہوتی، اپنے آپ کو معتبر اور معزز ظاہر کرنے کے لئے ایسے نوادرات کی دُکانوں
گھس جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ان لوگوں کا کام بھی چلنا ہوتا ہے۔ میں ایک ایسے نوادر خانے میں جا گھسا
ی عام جگہ نہیں تھا۔ ایک پتلی سی گلی کے آخری سرے پر کسی سرپھرے نے یہ نوادر خانہ بنا رکھا تھا۔ بس
بار میں وہاں موجود اُس نوادر خانے میں گیا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ
ں۔ اپنے دیس، اپنے وطن میں ایسے کسی نوادر خانے کو دیکھ کر انسان کو جتنی حیرت ہو سکتی تھی وہ یہاں آ
مجھے ہوئی تھی اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ سچ ہی ہے۔ مجھے یوں
لہ دنیا کے ہر گوشے سے آرٹ اور نوادرات کے نمونے یہاں لا کر رکھے گئے ہوں۔ جب میں اُس
ر خانے میں داخل ہوا تو میری نظر سب سے پہلے ایک عجیب و غریب لیمپ پر پڑی جو ایک اُونچی سی
ی پر آویزاں تھا۔ لکڑی بڑی عمدگی سے تراشی گئی تھی۔ اس کے نزدیک ہی شاید برسوں پرانی میز پر ایک
ن رقاصہ کی مورتی موجود تھی جو رقص کے انداز میں میز پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس الماریوں
ایک لمبی قطار تھی جن میں ہر طرح کے ملبوسات، انتہائی قدیم زمانے کے مجسمے اور فن پارے قرینے سے
ہوئے تھے۔ میری نگاہیں اس دُکان کے مالک کی تلاش میں بھٹکنے لگیں اور میں اِدھر اُدھر نظریں گھما کر
انسان کو تلاش کرنے لگا۔ تب میں نے کاؤنٹر پر ایک بوڑھے سے شخص کو دیکھا جو لمبا سا چوغہ پہنے خود
زمانہ قدیم کا کوئی نوادر نظر آ رہا تھا۔ اُس کے کان بڑے بڑے اور نوکیلے تھے۔ چھوٹی سی داڑھی ٹھوڑی
آخری سرے پر لٹکی ہوئی تھی۔ چپٹی سٹائل کی مونچھیں۔ لیکن اُس کے نقوش نہایت نفیس تھے اور وہ مقامی
علوم ہوتا تھا۔ ٹوپی بھی اُس نے ایک خاص انداز کی پہنی ہوئی تھی۔

مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے باہر نکل آیا۔ اُس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور شانوں
درمیان کو بڑا نکلا ہوا تھا۔ اس نوادر خانے کی موجودگی ہی کیا کم تھی کہ اس میں موجود اس شخص کو دیکھ کر
ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس پتلی سی گلی میں آخری سرے پر اس نوادر خانے کی موجودگی اس بات کا

اظہار کرتی تھی کہ اس دُکان کے مالک کو گاہکوں کی تلاش نہیں ہوتی۔ بلکہ یقینی طور پر گاہکوں کو ایک
سے معلومات حاصل ہوتی ہوں گی اور وہ احتیاط کے ساتھ ادھر آتے ہوں گے۔

وہ شخص میرے قریب پہنچا تو میں نے اُسے سلام کیا۔ لیکن اُس نے مجھے میرے سلام کا جواب
تھا بلکہ عجیب سی منمناتی ہوئی آواز میں اُس نے مجھے کچھ کہا تھا۔ میں نے کان پر ہاتھ رکھ کر اُس سے

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں...... بتایئے آپ کو کیا چاہئے؟"

"پہلے مجھے ایک سوال کرنا ہے تم سے۔"

"کیجئے۔"

"کیا تم اس نوادر خانے کے مالک ہو؟"

"نہیں، ملازم۔"

"اس کا مالک کون ہے؟"

"وہ ملک سے باہر ہے۔"

"مقامی ہے؟"

"نہیں......"

"تو پھر......؟"

"اُس کا تعلق اسپین سے ہے۔"

"یہ نوادر خانہ گلی کے اس قدر اندر کیوں کھولا گیا ہے؟"

"تاکہ یہاں گاہک نہ آسکیں۔" اُس نے جواب دیا اور میں حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

"وہ کیوں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا مطلب... تم کہہ رہے ہو کہ یہ نوادر خانہ یہاں اس لئے کھولا گیا ہے کہ یہاں گاہک نہ آ

"ہاں...... میرا مالک نہیں چاہتا کہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز فروخت ہو۔"

"تو پھر یہ دُکان کیوں کھول رکھی ہے تم نے؟"

"کوئی مجبوری ہو سکتی ہے۔"

"تمہاری؟"

"نہیں، میرے مالک کی۔"

"نام کیا ہے اُس کا؟"

"نام سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ اگر تمہیں اس دُکان میں کوئی چیز پسند ہے تو ا
اور مجھ سے اس کی قیمت معلوم کرو۔ پھر اگر اس کی قیمت تمہاری جیب میں ہو تو اسے ادا کرو اور
لے جاؤ۔"

"لیکن......" میں نے کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ کیا کہتا میں اُس شخص سے؟
وہ مڑا اور واپس جا کر کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں جن میں سانپ جیسی
چمک لہرا رہی تھی، میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں وہاں سے آگے بڑھا اور ایک الماری کے پیچھے پہنچ گیا۔
مجھے یوں لگا جیسے وہ آنکھیں الماری کو چیر کر مجھ تک آ رہی ہوں۔ بہرحال وہاں موجود ایک ایک چیز کو میں
بڑی دلچسپی اور بے چینی کی نگاہوں سے گھورتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ جگہ جگہ چیزیں میزوں پر لگی ہوئی تھیں
اور ایک دوسرے کے اوپر چنی ہوئی تھیں۔ انداز ایسا تھا کہ ذرا بھی ٹھیس لگ جائے تو کوئی بھی چیز گر
جائے۔ اس لئے مجھے احتیاط سے آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس نوادر خانے میں اس
سے بھی زیادہ پراسرار چیز وہ کاؤنٹر مین یا اس دُکان کا منیجر ہے۔ وہ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔

میں نے ایک کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر غور سے اس کا جائزہ لیا۔ اُس کے سر پر سفید بال اور چہرے
پر بے شمار جھریاں تھیں، بدن بھی کافی دُبلا پتلا تھا۔ چہرے کا رنگ ضرورت سے زیادہ سفید تھا۔ اور بات پھر
وہیں آنکھوں تک آ جاتی ہے جن کا پیلا پیلا رنگ اور تیزی سی ویرانے میں جلتے ہوئے چراغ کی مانند تھی۔
اُس کی ناک بھی آگے کو جھکی ہوئی تھی اور اُس کا چہرہ کچھ زیادہ ہی عجیب لگ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ کسی
مُردے کے ہاتھوں کی طرح سخت اور خشک تھے اور انتہائی کمزور لگتے تھے۔ لیکن گہری نگاہ سے دیکھنے سے
یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس قدر کمزور نہیں ہے۔

بہرحال اس کے بارے میں، میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ خود بھی اس نوادر خانے کا ایک نوادر ہے۔
اس نوادر خانے کے مالک نے بڑی زندہ دلی کا ثبوت دیا ہے کہ نوادرات کی فروخت کے لئے ایک نادر
شخص کو ملازم رکھا ہے۔ اُس نے بدستور اپنی منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور آپ دیکھیں گے کہ دنیا کے بڑے بڑے نوادر خانوں میں یہاں جیسی چیزیں آپ کو دستیاب نہیں
ہوں گی۔ ویسے آپ کیا خریدنا چاہتے ہیں؟ ہتھیاروں کے سیکشن میں آیئے۔ یہ دیکھئے، دونوں طرف دھار
والی تلوار۔ اور اگر آپ اس کی تاریخ پر جائیں تو یہ تلوار ایک ایسے جانباز سپاہی کی ہے جس نے اپنی تلوار سے
ایک جنگ میں تینتیس افراد کو ہلاک کیا تھا۔ تلوار کی دھار دیکھیں، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس سے کتنی
زندگیاں چپکی ہوئی ہیں...... کہا جاتا ہے کہ رات کی تاریکیوں میں اس تلوار سے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں
اور یہ قطرے چھوٹے چھوٹے انسانی سروں کی شکل کے ہوتے ہیں۔ یہ سر اپنی موت کی داستان سناتے
ہیں۔ آپ یقینی طور پر مجھ سے یہ سوال کریں گے کہ کیا میں نے کبھی اس پراسرار بات کا تجزیہ کیا ہے۔ تو
میں آپ کو بتاؤں، نوادر خانے میں سجی ہوئی تمام چیزوں کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ یہ تاریخ ہم تک
کہانیوں کی شکل میں پہنچتی ہے اور ہم یہ کہانیاں اپنے معزز مہمانوں کو سنا دیتے ہیں۔ تجزیہ اور تجربہ کرنا انہی
کا کام ہوتا ہے۔ ذرا اس تلوار کا حسن دیکھئے، میرا خیال ہے اگر آپ کو نوادرات کا شوق ہے تو یہ آپ کے
نوادر خانے کی ایک عظیم چیز ہو گی۔"

میں نے ہنس کر اُس سے کہا۔ "میرے عزیز دوست، میں ایک ریٹائرڈ فوجی ہوں اور میرے پاس اتنا
اسلحہ ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس طرح کی چیزوں سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو اپنی پسند

کی اشیاء تلاش کر رہا ہوں۔ اگر کوئی اچھی چیز مجھے نظر آ گئی تو میں اُسے خرید لوں گا۔“
”ضرور...... ضرور...... آپ آیئے اور دیکھئے۔ کیا میں آپ کی رہنمائی کروں؟“
”نہیں...... بہتر ہوگا کہ تم مجھے خود ہی ان چیزوں کو دیکھنے دو۔“ میں آگے بڑھا اور کاؤنٹرز کو
اپنے دل میں ان کی تعریفیں کرتا ہوا خاصی دُور نکل آیا۔ چھوٹی بڑی ہر طرح کی اشیاء موجود تھیں۔
تانبے اور پیتل کے گول بات مجسمے جن میں بدھ کا مجسمہ بھی شامل تھا۔ میں ان چیزوں کو دیکھ ر
اچانک میری نگاہ ایک خوبصورت انسانی پاؤں پر پڑی جو یقیناً کسی مجسمے کے جسم سے ٹوٹ کر الگ
تھا۔ میں آگے بڑھا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ پاؤں انتہائی متناسب اور انتہائی خوبصورتی
تھا۔ میں جھک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اور پھر میں نے اسے بڑی احتیاط سے اُٹھا لیا۔ یقیناً وہ بہت قد
اس کی قدامت کے سارے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ایک خوبصورت پیپر و
لئے یہ پاؤں ایک خوبصورت حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے دل میں یہ فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔
”مجھے اس پاؤں کی قیمت بتاؤ۔ اور ذرا اس کی تفصیل بھی بتاؤ۔ دیکھنے میں تو یہ خاصا ہلکا لگتا
شاید یہ کسی قسم کی دھات کا بنا ہوا نہیں ہے ڈیئر۔ یہ تو یوں لگتا ہے جیسے بالکل گوشت پوست کا بنا
بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کسی ممی کا کٹا ہوا پاؤں ہو۔“ میں نے اسے مزید غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
پیر کے انگوٹھوں پر پورے ناخن موجود تھے اور اس کی بناوٹ اور اس کے انداز کی نرمی سے صا
ہوتا تھا کہ یہ کسی انسانی جسم سے ہی الگ کیا گیا ہے۔ لیکن اتنا خوبصورت، اتنا خوبصورت کہ اُ
کے بعد رکھنے کو جی نہ چاہے اور یہ احساس ہو کہ زندگی کے کسی دور میں یہ پاؤں کسی نازک اندام
جسم سے منسلک ہوگا اور اس سے اُس نے نجانے کتنے فاصلے طے کئے ہوں گے۔
تاریخ...... ایک قدیم تاریخ جس میں انسان کھو جائے تو نجانے کیسے کیسے قصے اُس کے ذ
مربوط ہو جائیں۔ میں جس انداز میں سوچ رہا تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ میری سوچ الفاظ کی ش
میرے منہ سے نکل رہی تھی یا پھر یہ پراسرار شخص میرے دماغ کو پڑھ رہا تھا اور نوادر خانے کا
پراسرار نوادر تو یہ شخص ہی تھا۔ اچانک ہی اُس نے لمبی گردن جھکاتے ہوئے کہا۔
”گویا آپ پرنس آرا صفیہ کا یہ پاؤں خریدنا چاہتے ہیں...... اور وہ بھی پیپر ویٹ کے طور پ
کرنے کے لئے۔“
میں نے چونک کر اُسے دیکھا اور پھر تعجب سے کہا۔ ”تمہیں یہ بات کیسے معلوم؟“
میرے اس سوال پر اُس کے چہرے پر حیرت کے نقوش پیدا ہو گئے۔ پھر اُس نے کہا۔ ”آ
تو یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا کر رہے ہیں۔“
”ایں...... ہاں ہاں، تو ذرا مجھے اس پاؤں کی قیمت تو بتاؤ۔“
”قیمت......؟“ اُس نے اپنی گول گول آنکھوں سے مجھے گھورا اور پھر بولا۔ ”آپ کو میرے
یقین آ گیا ہے کہ یہ پاؤں پرنس آرا صفیہ کا ہی ہے؟“
”میں نے اس کی قیمت پوچھی ہے تم سے۔“

”اور میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے الفاظ میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اور میں آپ کو بتا
دوں گا......“
”دیکھو، میں نے اس سلسلے میں زیادہ بحث کرنے کی بات نہیں کی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس کی قیمت کیا
ہے؟ ویسے اس وقت میری جیب میں بہت کم رقم ہے۔“
”اور یہ کم رقم کا نہیں ہے، سمجھے؟ کم سے کم چالیس ہزار روپے اس کی قیمت ہے۔“
”تمہارا دماغ خراب ہوا ہے کیا...... چالیس ہزار کبھی دیکھے ہیں تم نے؟“
”نہیں جناب...... دُکاندار اور گاہک کے درمیان بھی تہذیب کا ایک رشتہ ہوتا ہے۔ میں آپ کی
عزت کروں گا۔ لیکن اس شرط پر کہ آپ بھی میری عزت کریں۔ بار بار آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ یہ پاؤں
پرنس آرا صفیہ کا ہے جس کی ایک تاریخ ہے۔ را آفتوخ کی بیٹی پرنس آرا صفیہ۔ اور اس کو مصر کے ایک
قدیم زرین احرام سے حاصل کیا گیا ہے۔ چالیس ہزار روپے سے اس کی قیمت ایک روپیہ کم نہیں ہوگی۔
ویسے میں آپ کو ایک بڑی عجیب بات بتاتا ہوں۔ مگر چھوڑیئے، آپ یہ بتائیے کہ آپ اس پاؤں کی قیمت
کیا لگاتے ہیں؟“
”صرف دس ہزار۔“
”آہ...... آپ نے میرے سر پر ہتھوڑا مار دیا ہے۔ آپ شاید اس بات پر یقین نہ کریں کہ یہ ایک پیش
گوئی ہے۔ آپ یہ سمجھئے کہ دس ہزار روپے میں یہ پاؤں آپ کا ہوا۔ اس پاؤں کے بارے میں آج سے
سینکڑوں سال پہلے مصر کے ایک عظیم پیشوا نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن شہزادی آرا صفیہ کا یہ پاؤں
پیپر ویٹ کے طور پر استعمال کرنے کے لئے خریدا جائے گا۔ آج وہ پیش گوئی سچی ثابت ہو رہی ہے۔ آپ
نے چونکہ وضاحت کر دی ہے، میں اس پیش گوئی سے منحرف کیسے ہو سکتا ہوں؟ آپ کو یہ بات معلوم ہے
کہ پراسرار چیزوں کو ان کی مرضی کے بغیر خریدنا اپنے لئے عذاب مول لینے کے مترادف ہے۔ بات کسی
ایک چیز کی نہیں ہے، اس نوادر خانے میں سینکڑوں ایسی اشیاء ہیں جن کی اپنی تاریخ ہے۔ اور یہ تاریخ کی
کہانیاں بھی ہیں۔ میں نے اپنے مالک سے اجازت لے لی تھی کہ اگر کوئی ایسی صورتحال ہو تو مجھے کیا کرنا
چاہئے۔ بہرحال میں اسے آپ کے لئے پیک کر دیتا ہوں۔“
اُس نے پاؤں میرے ہاتھ سے لیا اور ایک خوبصورت کیس میں اُس کی پیکنگ کرنے لگا۔ میں
آنکھیں بند کر کے گردن جھٹک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بس کسر اتنی سی ہے کہ اس نوادر خانے کو اس پتلی سی
گلی کے آخری سرے پر کھولا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت ہے کہ یہ سیلز مین منیجر یا جو کوئی بھی ہے ان تمام اشیاء کو
اس طرح فروخت کرے گا کہ شاید اس کی یہ کہانیاں اور اس نوادر خانے کا یہ انداز گینز بک کا ورلڈ ریکارڈ
بن جائے۔ وہ بہت ہی دلچسپ آدمی تھا اور اپنا کام کرنا بخوبی جانتا تھا۔ اُس نے کاغذ میں لپٹا ہوا پاؤں
میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”ویسے مجھے یقین ہے کہ را آفتوخ کو اس واقعے سے سخت صدمہ ہوگا۔ چونکہ پرنس آرا صفیہ اُس کی
چہیتی اور اکلوتی بیٹی تھی اور را آفتوخ اس سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔“

آخر کار مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ”محترم بزرگ...... کہیں آپ خود ہی تو را آفتوخ نہیں ہیں
طرح آپ یہ ساری کہانی سنا رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا تعلق براہِ راست شہزادی آر
سے ہے۔ آپ را آفتوخ ہیں یا پھر اور کچھ نہیں تو اُس کے قریبی مشیر ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے آپ
اس دور سے تو نہیں ہے۔“

بوڑھا آدمی کچھ لمحے عجیب انداز سے میری صورت دیکھتا رہا، پھر دس ہزار کے نوٹ گنتے ہو
نے اپنی جیب میں رکھ لئے اور اس طرح کاؤنٹر پر جا بیٹھا جیسے رُوٹھ گیا ہو۔ میں ہنستا ہوا وہاں
آیا۔ مجھے ایک عجیب سی مسرت ہو رہی تھی۔ خیر بوڑھے سیلز مین کی سنائی ہوئی کہانی تو اس طرح قا
نہیں تھی کہ اس پر بہت زیادہ غور کیا جائے۔ لیکن بہرحال پاؤں اس قدر خوبصورت تھا کہ میری کی
حس کو تسکین پہنچتی تھی۔

اصل میں ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات کسی کی کہی ہوئی بات جو کسی بہت مؤثر پیرائے میں کی جا
جائے، بڑی حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔ میں نے اپنے نوادر خانے میں اپنی چھوٹی سی خوبصورت
کاغذات کے اوپر اس پاؤں کو رکھ کر اس کا جائزہ لیا اور عش عش کرنے لگا۔ مجھے نجانے کیوں یہ یقین
تھا کہ واقعی مصر کی کسی شہزادی کا ہی پاؤں ہے اور میں نے ایک طرح سے اس سلطنت کی سب
شے حاصل کر لی ہے۔

بہرحال کافی دیر تک میں اس پاؤں کا جائزہ لیتا رہا۔ ویسے تو نوادرات کا مجھے بے پناہ شوق تھا
دائرے میں رہ کر انہیں ایسی حالت میں جسے میں مالی طور پر برداشت کر سکوں میں نے نوادرات خر
اور جمع کئے تھے۔ لیکن یہ پاؤں حاصل کر کے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے بہت بڑا خزانہ حاصل
ہے۔ بہرحال اس کے بعد میں اپنے معاملات میں مصروف ہو گیا۔

میری بہت سی ذمہ داریاں تھیں جنہیں میں پورا کرتا رہا اور پھر بے پناہ تھک گیا۔ اس وقت م
تھکن محسوس کر رہا تھا اور نیند نے میرے دماغ کو بوجھل کر رکھا تھا۔ بہرحال میں اپنے کمرے م
ہوا۔ یہ بات میں شاید بتانا بھول گیا کہ کمرے ہی کا ایک گوشہ یعنی میرے بیڈ رُوم کا ایک حصہ م
خانہ تھا اور وہیں میں نے ایک بڑے حصے کو اپنے ذوق کی تسکین کا مرکز بنا لیا تھا۔

اُس دن میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، خوشبو کا ایک ہلکا سا جھونکا میری ناک سے ٹکرایا۔
بڑی ہی عجیب سی خوشبو تھی اور انتہائی خوشگوار تھی۔ ایسی خوشبو جو اس دور میں رائج نہیں تھی۔ میں اسے
صندل اور نجانے کیسی کیسی چیزوں کا آمیزہ کہہ سکتا ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ ہزاروں سال پرانی
ہے۔ لیکن اس کا مرکز میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ایک لمحے کے اندر اندر اپنے آپ کو سنبھالا او
تبدیل کرنے کے بعد اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ چونکہ تھکن مجھ پر غالب تھی اس لئے لیٹ کر بڑا سا
تھا۔ لیکن یہ صرف اتفاق تھا کہ وہ میز جس کے اوپر میں نے شہزادی آرا صفیہ کا یہ پاؤں رکھا تھا
آنکھوں کے عین سامنے تھا۔ کاغذات اور پرانی کتابوں کے اس ڈھیر پر وہ پاؤں نظر آ رہا تھا اور کچھ
سا محسوس ہو رہا تھا...... ایسا لگتا تھا جیسے لیمپ کی روشنی نے اس پاؤں کو اپنا فوکس بنا رکھا ہو۔ بہرحال

لمحے میں اپنی اس نئی خرید کو دیکھتا رہا اور اس کے بعد میں نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ لیمپ بجھا دیا اور تھکن کی وجہ
سے نیند میری آنکھوں میں تیرنے لگی۔ نجانے کتنی دیر ہو گئی۔ اور پھر مجھے ایک دم یوں لگا جیسے میرے اندر
کوئی اور وجود جاگ اُٹھا ہو یا میری رُوح کی آنکھ کھل گئی ہو...... اور پھر میری رُوح نے خوابوں کی وادیوں
کی جانب سفر کرنا شروع کر دیا۔ میں نے خواب میں اپنے اس کمرے کو دیکھا جس میں، میں سویا ہوا تھا۔
منظر اتنا واضح اور مکمل تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے میں سو نہیں بلکہ جاگ رہا ہوں۔ میں بند آنکھوں سے لیکن
جاگتے ذہن سے کمرے کے ماحول کو دیکھ رہا تھا...... یہ منظر میرے سامنے چند لمحوں کے بعد اچانک ہی
گڈمڈ ہونے لگا۔

مجھے یوں لگا جیسے اب ہر چیز اُلٹ پلٹ ہو رہی ہو۔ کھٹ کھٹ گرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔
الماریاں اور کرسیاں زور زور سے گر رہی تھیں اور ان میں سے گہرا کالا دُھواں نکل رہا تھا...... پھر میں نے
اُس میز کی جانب دیکھا جس پر آرا صفیہ کا پاؤں رکھا ہوا تھا۔ اور دوسرے لمحے میرے ہونٹ حیرت سے
سکڑ گئے...... میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کٹے ہوئے پاؤں میں حرکت ہوئی اور وہ میز پر رکھے ہوئے
کاغذات اور کتابوں پر کسی مینڈک کی طرح اُچھلنے اور کودنے لگا۔ میرا دماغ حیرت سے سن ہو گیا تھا......
میں ابھی اس منظر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یکایک یوں لگا جیسے کمرے کے اندر کوئی موجود ہو۔ ایک ایسی
شخصیت جو ایک ٹانگ سے محروم ہو۔ کیونکہ میں نے جو آواز پہلی بار سنی تھی وہ کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی ایک
ٹانگ کا شخص اُچھل اُچھل کر آگے بڑھ رہا ہو۔ پھر میں نے دروازے سے پردہ ہٹتے ہوئے دیکھا اور میری
نگاہیں ایک ایسے چہرے پر پڑیں جسے دیکھ کر انسانی ذہن کا توازن بگڑ جائے۔

اتنا ہی حسین اور خوبصورت چہرہ تھا جو ایک نوجوان لڑکی کا تھا۔ اُس کا رنگ سرخ و سفید تھا اور وہ مصری
حسن و جمال کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور بھنوئیں ترچھی تھیں۔ ستواں ناک یونانی
دیویوں کی ناکوں کو بھی شرمائے ہوئے تھا۔ اس خوبصورت ناک کے قریب اُس کے بھرے بھرے رخسار
اور نازک ہونٹ عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ چہرے سے ہٹ کر میری نگاہیں اُس کے سراپا سے اُلجھ گئیں۔
حسن و جمال کی اس دیوی کا جسم انتہائی گداز اور پُر شباب تھا۔ اُس کے سڈول بازو پر کالے رنگ کی مٹی کا
بنایا ہوا ایک عجیب بازو بند بنا ہوا تھا جس کی شکل سانپ سے مشابہ تھی۔ اُس کے سینے پر بالوں کی کئی چھوٹی
چھوٹی چوٹیاں سانپوں کی مانند لہرا رہی تھیں...... جسم پر ایک انتہائی بیش قیمت اور بھاری لباس پہنا ہوا تھا۔
میرے لئے یہ سب کچھ اجنبی اور ایک عجیب سا احساس رکھنے والی چیز تھی۔

میں ایک طرح سے ماحول کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا۔ نجانے کیونکر میرے کانوں میں نوادرات کے
بوڑھے مالک کے الفاظ گونجنے لگے جو اُس نے کہے تھے، یہی کہ بوڑھا فرعون یقیناً اس واقعہ پر رنجیدہ ہو
گا۔ کیونکہ اُسے اپنی بیٹی سے بے حد پیار تھا۔ یہ سب کچھ میں نجانے نیند کے عالم میں دیکھ رہا تھا یا سوچ رہا
تھا یا میں جاگ رہا تھا؟ اپنی اس کیفیت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

بہرحال اس وقت میری آنکھوں کے سامنے جو حسینہ نظر آ رہی تھی وہ لازمی طور پر پرنس آرا صفیہ ہی
تھی۔ میں اُسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں اُس خوبصورت لڑکی کے نچلے دھڑ پر آ کر ٹکیں

اور میں دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اُس کا داہنا پیر ٹخنوں کے پاس سے کٹا ہوا ہے...... وہ صرف ایک کے سہارے چل رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں اس میز پر جمی ہوئی ہیں جس پر اُس کا پیر رکھا ہوا تھا۔ میرا دل دہل کر رہ گیا جب میں نے اُس کی غزالی آنکھوں میں آنسو چھلکتے ہوئے میز پر اُس کا کٹا ہوا پاؤں اب بھی اسی طرح اُچھل کود کر رہا تھا۔

پھر ایک اور حیرتناک بات ہوئی۔ اُس کے ہونٹوں سے کوئی آواز نکلی تھی اور مجھے یوں لگا جیسے ترنگ بج اُٹھا ہو...... اُس نے قدیم مصری زبان میں اپنے کٹے ہوئے پیر کو مخاطب کر کے کچھ کہا تھا وقت مجھے بے حد تعجب ہوا جب میں نے اس جملے کو یوں سمجھ لیا جیسے یہ زبان میرے لئے اجنبی شہزادی نے کہا تھا۔

''میرے رفیق...... میرے ہمدم...... میں نے ہمیشہ تجھے اپنے ساتھ رکھا...... کتنا خیال رکھتی تیرا...... میں تجھے عطر اور گلاب سے دھوتی تھی...... میں تجھے ایسے ایسے زیورات سے آراستہ کر جنہیں مصر کی عورتوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ میں تجھے کتنا یاد کرتی ہوں، تو نہیں جانتا۔''

جواب میں، میں نے ایک اور آواز سنی اور یہ آواز پاؤں سے نکلی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔'' صفیہ...... تیرے حسین جسم سے جدا ہو کر میں نجانے کیسے کیسے عذاب بھگت رہا ہوں۔ اور اب بازاری چیز کی طرح بک چکا ہوں۔ تیرے تاجر عاشق نے جسے تو نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تجھ سے بدلہ لے لیا ہے۔ اُس نے مجھے بہت معمولی قیمت پر فروخت کر کے تجھے ذلیل کرنے کی سا ہے۔ وہ بدنصیب جس نے مجھے تیرے جسم سے جدا کیا تھا اور جس نے تیرے مقبرے میں نقب لگ اسی بدمعاش تاجر کا آدمی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تو اپنے پیر سے محروم ہو کر اس قابل نہ رہ جائے کہ اُ میں جا سکے جو عالم ارواح میں منعقد ہوتی ہے۔ اور آخر کار وہ کامیاب ہو گیا۔ میری ملکہ...... میں جدا ہو کر یہاں ان لوگوں کے درمیان پڑا ہوا خود کو، کوس رہا ہوں۔ لیکن...... میں تجھے اب بھی مل اگر تو میرے موجودہ مالک کو وہ قیمت ادا کر دے جو اس نے مجھے حاصل کرنے میں خرچ کی ہے۔ تو وہ قیمت مجھے ادا کر سکتی ہے؟''

''آہ...... میں اس دنیا کی انسان نہیں ہوں۔ عالم ارواح میں میرا مقام بے شک ہے، لیکن وہ نہیں دے سکتی۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں...... کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس......'' وہ سسکیاں بھر اور میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ سب کچھ بھی عالم تصور اور عالم خواب میں ہی تھا۔ میری آواز

''زمانۂ قدیم کی مصری شہزادی...... میں اتنا بے رحم نہیں ہوں کہ تیرے جسم کے کسی حصے کو اپنے قبضے میں رکھوں۔ یہ میری جانب سے تحفہ قبول کر۔ میں تجھے اس طرح لنگڑا کر چلتے ہوئے نہ سکتا۔ ایک مکمل حسن، لیکن پاؤں سے محروم رہے، یہ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور دونوں ہاتھوں میں رکھ کر اُس کی جانب بڑھا دیا۔

اچانک اُس کے چہرے پر خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اُس کا چہرہ پھول کی مانند کھل اُٹھا اور اُس کی سے ممنونیت ٹپکی۔ وہ بے اختیار آگے بڑھی۔ حالانکہ آگے بڑھتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھی۔ اُس نے

ہاتھوں سے پیر کو لیا اور پھر اس طرح اپنے کٹے ہوئے جسم کے ساتھ جوڑ لیا جیسے ہم لوگ جوتا پہنتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ اطمینان سے کمرے میں چل رہی ہے۔ اُس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اُس نے کہا۔

''آہ...... تم نہیں جانتے محترم شخص۔ تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے سرزمین مصر پر احسان کیا ہے۔ را آنتوخ کتنا خوش ہوگا...... وہ جو مجھے لنگڑاتا دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا، وہ جس نے میرے لئے ایسا انتہائی مضبوط مقبرہ بنوایا تھا جس میں کوئی نہ پہنچ سکے، اور میرا مُردہ جسم اُس مقبرے میں آج بھی موجود ہے۔ آؤ...... میں تمہیں اپنے عظیم باپ سے ملاتی ہوں۔ تم نے مجھے ایک ایسی چیز دی ہے جو کوئی بھی کسی کو نہیں دے سکتا تھا۔ آؤ...... میرے ساتھ آؤ۔''

میں تیار ہو گیا۔ پھر اُس نے اپنے بازو پر بندھا ہوا چھوٹا سا زیور نکالا اور اُسے ٹھیک اس جگہ میز پر رکھ دیا جہاں اُس نے کٹے ہوئے پیر کو رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس بازو بند کی شکل ایک ایسے چھوٹے سے سانپ کی تھی جس نے اپنا چھوٹا سا پھن اُٹھا رکھا ہے۔ وہ کہنے لگی۔

''یہ بازو بند بھی وہی کام دے گا جو میرا پاؤں دے رہا تھا۔'' پھر اُس نے اپنا خوبصورت ہاتھ آگے بڑھایا اور میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور میرے جسم میں سردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کمرے سے نکل کر کھلی فضا میں آ گیا ہوں اور خلاؤں میں تیر رہا ہوں۔ کچھ لمحوں تک مجھے صرف نیلا آسمان اور نیچے نیلے سمندر کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر کچھ لمحات اور گزرے، پھر میں نے دیکھا کہ ہم ایک عظیم الشان اہرام کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ قرب و جوار میں تاحد نظر ریگستان پھیلا ہوا تھا اور اس میں یہ اہرام سر اُٹھائے کھڑا ہوا تھا......

پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ہم آگے بڑھتے رہے۔ اور پھر آرا صفیہ مجھے ایک ایسی سرنگ کے دہانے پر لے آئی جو اندر سے بے حد تاریک نظر آ رہی تھی۔ اُس نے ایک مشعل روشن کی اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ پھر ہم بڑی بڑی بارہ دریوں اور سجے سجائے کمرے سے گزرتے ہوئے ان سیڑھیوں تک جا پہنچے جو زمین کے اندر تک بہت نیچے جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جگہ ہزاروں سال پہلے کی دریافت ہو۔ کمروں کی بناوٹ اس بات کی گواہ تھی کہ لاکھوں انسانوں نے اس کو مل کر بنایا ہوگا اور اس پر کروڑوں روپوں کی لاگت آئی ہوگی۔

سیڑھیاں اُتر کر ہم ایک لمبی راہداری میں پہنچ گئے۔ دیواروں پر دونوں جانب پرندوں اور حشرات الارض کی تصویریں مجسم حالت میں آویزاں تھیں۔ ہم ایک ایسے ہال میں پہنچے جس کی خوبصورتی کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تمام در و دیوار منقش تھے اور ان پر سونے اور چاندی کی پتریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ ایک بہت وسیع اور بڑا ہال تھا۔ اندر کی تاریکی میں جا بجا مشعلیں روشن تھیں اور یہ عظیم ہال اس ملگجی روشنی میں بے حد پراسرار اور پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ پھر میری نگاہ ہال کے آخری سرے پر رکھی ہوئی اس کرسی پر جا ٹھہری جس میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تھے اور جس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کرسی پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے سر پر رکھے ہوئے سنہرے تاج کے ہیرے آنکھوں کو بند کئے دے رہے تھے۔ اور ایک لمحے میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ قدیم مصر کا فرعون

ہے۔ اُس کے سارے جسم پر سونے اور چاندی کے بے شمار زیورات آراستہ تھے۔ اُس کا چہرہ
طرح سفید تھا اور اس پر لمبی سی داڑھی لٹک رہی تھی۔ اُس کے پیچھے غلاموں کا ایک گروہ مؤدب کھ
اُس کے دائیں اور بائیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہال کی وسعتوں میں کرسیوں پر وہ سارے فرعون بیٹھے
تھے جنہوں نے صدیوں مصر پر راج کیا تھا۔

ہال میں پہنچتے ہی بوڑھے فرعون کی طرف دیکھ کر شہزادی نے مجھ سے کہا۔

''تم اس وقت میرے باپ کے روبرو ہو...... ان سے ملاقات کرو۔''

میں نے ادب سے جھک کر سلام کیا تو فرعون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آرا صفیہ
باپ سے کہا۔ ''مقدس باپ...... مجھے میرا پیرو واپس مل گیا ہے اور اس شخص نے، میرے محسن نے
دونوں پیروں پر کھڑا کر دیا ہے۔''

چاروں طرف سے مدھم مدھم آوازیں اُبھرنے لگیں جن میں مجھے خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا
نے دیکھا کہ عظیم فرعون کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا ہے۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی بوجھل آنکھیں کھول
دیکھا اور کہنے لگا۔

''جہنم کی سزاؤں کی قسم...... میں اپنے محسن کا شکر گزار ہوں۔ میرے محسن مانگو...... تم کیا مانگتے

''میں...... میں تجھ سے شہزادی آرا صفیہ مانگتا ہوں۔ اور کچھ نہیں چاہئے مجھے۔'' میں نے
اور بوڑھے فرعون کی بھنوئیں سکڑ گئیں۔ اُس نے کہا۔

''تم کون ہو...... اور تمہاری عمر کیا ہے؟''

''میں جو کچھ بھی ہوں، تم نے مجھ سے کچھ مانگنے کی بات کی ہے اور میں نے تم سے کچھ مانگ لیا۔''

''لیکن میں تمہیں وہ نہیں دے سکتا...... کیونکہ تم ایک زندہ انسان ہو اور ہم روحیں۔''

''بہر حال، میں نے جو مانگنا تھا تم سے مانگ لیا۔''

''ٹھیک ہے...... انتظار کرو...... تمہارے پاس شہزادی کا دیا ہوا تحفہ موجود ہے۔
تمہارے اس سوال کا جواب دیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد دیا جائے۔ انہیں احترام کے ساتھ
کی رہائش گاہ پر چھوڑ دو......''

اور پھر وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لا کر یہاں چھوڑ گئے۔ یہ ہے میری کہانی۔ لیکن...... لیکن اس کے
کہانی جو ہے وہ تمہارے لئے زیادہ سنسنی خیز ہوگی۔ میرے دوست، کیا تم وہ بعد کی کہانی سننا پسند کرو
ایمان علی، انا زبیدہ اور رجنی حیرانی سے اُس شخص کی صورت دیکھ رہی تھیں۔ کچھ لمحے کے بعد
نے کرنل ایاز سے کہا۔ ''یہ تمام سنائے ہوئے واقعات بہت ہی پراسرار اور انوکھے ہیں۔ لیکن اب
دوسری نشست کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں تاکہ ان واقعات کی روشنی میں آگے کے واقعات
کوئی مناسب فیصلہ کرلیں۔'' کرنل ایاز نے مغموم انداز میں گردن ہلا دی تھی......!

شیطان پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔ بہت دیر تک وہ اپنی سوچوں
ڈوبا رہا اور اس کے بعد اُس نے سوچا کہ کہیں چلا جائے۔ لاتعداد گھرانے تھے اُس کے لئے جہاں
کے پیروکار، اُس کے چیلے موجود ہوا کرتے تھے۔ اب یہ اتفاق تھا کہ راستہ چلتے چلتے اُسے وہ حویلی
آ گئی جس میں راگنی، رادھا، روپا وغیرہ رہا کرتی تھیں۔ شیطان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی صحیح راستے پر
نکل گئی تھی۔ باقی سب جوں کی توں تھیں اور رنگ رلیوں میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ ان کے کردار بے
خراب ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے شیطان کی سرکردگی میں وہ شیطان بن چکی تھیں۔ بہر حال جب وہ ان
یوں کے پاس پہنچا تو چاروں لڑکیاں اُسے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

''اشیش بھگونت...... تم ہمارے آئیڈیل ہو۔ جب تم ہمارے پاس آ جاتے ہو تو ہمیں یوں لگتا ہے جیسے
محبوب ہمارے پاس آ گیا۔''

''مگر تم سب مل کر بھی میرے مشن کو اس طرح نہیں چلا رہے جس طرح میں چلانا چاہتا ہوں۔ تم نہیں
تیں کہ میرے اوپر کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔ ایک طرف ساری دنیا ہے تو دوسری طرف میں اکیلا۔
ں گا تم لوگوں نے اپنے اپنے شیطان گھر الگ الگ بنا لئے ہیں، اپنی مرضی سے سارے کام کرتے
اب میں کس کس سے لڑتا پھروں؟ عیش و عشرت کی زندگی کو تو تم لوگ آسانی سے گزار لیتے ہو۔ لیکن
ب تمہاری حفاظت کی بات آتی ہے تو مجھے ہی سینہ نکال کر سامنے آنا پڑتا ہے۔ تم لوگوں میں اتنی ہمت بھی
ں ہے کہ اپنے طور پر میرے ان دشمنوں سے مقابلہ کرو جو دن رات مجھے تباہ کرنے اور مجھے برباد کرنے
فکر میں رہتے ہیں۔ مجھ پر اتنے دُرّے پڑتے ہیں روزانہ کہ میرا سارا وجود لہولہان ہو جاتا ہے۔ لاحول
ۃ کے دُرّے میرے سارے وجود کو ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں اور پھر میں کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنے
وں کو مرہم لگاتا ہوں نئے زخموں کے لئے تیار ہونے کے لئے۔ ارے بیوقوفو، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم
ری دنیا کو میرا پیروکار بنا دو۔ میرے خلاف بات کرنے والا کوئی شخص روئے زمین پر نہ رہے۔ لیکن تم
ں میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ تم یہ کام نہیں کر سکتے۔ آہ، کاش میرے وہ پرانے چیلے زندہ ہوتے جو
مشن کو بڑی آمادگی کے ساتھ آگے بڑھاتے تھے۔ مگر انہیں بھی موت نے دبوچ لیا۔ کاش میں تم
وں پر سے موت ہٹا سکتا۔''

''آپ کے وہ پرانے چیلے کون تھے اشیش بھگونت؟'' رادھا نے پوچھا۔

''ارے ہزاروں لاکھوں نام ہیں...... چنگیز خان، ہلاکو خان، ہٹلر، نہرو، فرعون، نمرود، شداد...... یہ
رے کے سارے میرے پیروکار تھے اور میری ہدایت پر عمل کرتے تھے۔ لیکن اس طرح کہ کبھی کبھی تو

میں بھی ان سے خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے جیسے انسانوں پر اتنا ظلم کرتے تھے کہ بیان سے باہر
وہ لوگ موت کا شکار ہو گئے۔ ان کے بعد بھی بہت سے لوگ آئے۔''

''ایک بات بتایئے اشیش بھگونت......'' راگنی نے سوال کیا۔

''ہاں بولو......'' شیطان نے کہا۔

''زمانہ قدیم کے شداد، نمرود وغیرہ تو جو ظلم انسانوں پر کرتے تھے وہ آج کے انسان ...
معمولی سا ظلم ہوتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کسی ملک پر حملہ کر کے وہاں قتل عام کر دیا کرتے ...
طریقہ کار بالکل مختلف تھا۔ لیکن اب تو ایسے ایسے ہتھیار بنائے گئے ہیں کہ انسانوں کے شہر ...
جائیں، ملک تباہ ہو جائیں۔ جراثیمی ہتھیاروں سے انسان پگھل کر ربڑ کا بن جاتا ہے، سانس ...
جاتا ہے۔ ایٹم بم پھینک دیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ صدیوں اس علاقے میں زندگی نہیں پیدا ہوتی۔
انسان زیادہ ظالم تھا یا اس دور کے یہ ہتھیار بنانے والے؟ یہ تو ان سے کہیں زیادہ ظالم ہیں۔''

''ہاں ہیں...... مگر جنگیں ہوتی کہاں ہیں؟ ساری دنیا جنگوں کے خوف سے ایک جگہ جمع ہو
جاتی ہے۔ پہلے کی بات دوسری تھی۔ واہ، واہ...... لشکر کشی ہوتی تھی، گردنیں اُچھلتی تھیں، خو...
تلواریں چلتی تھیں...... کیا حسین منظر ہوتا تھا انسان کی تباہی کا۔ بہر حال ہم لوگ غلط بحث ...
ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔''

''کیوں اشیش بھگونت......؟''

''ارے بتا تو رہا ہوں...... بس میری کوئی کوشش کارگر ہی نہیں ہو رہی۔ یہ اللہ والے ہر ...
ہوئے ہیں اور مجھ پر دُرّے برساتے ہیں۔ اب ان صاحب کو لے لو۔ اُنہوں نے ٹھیکہ لے ...
کی بہتری کا۔ یہ ٹھیکیدار کچھ زیادہ ہی پیدا ہو گئے ہیں۔''

''آپ کن صاحب کی بات کر رہے ہیں؟''

''بابا عالم ہیں...... حکیم ارشاد علی نام ہے اُن کا۔ بابا عالم کہلاتے ہیں۔ بس میں اگر کسی کو گر...
گرفتار کر دوں اور وہ حکیم ارشاد علی کے پاس پہنچ جائے تو سمجھ لو حکیم صاحب میری جان کے پیچھے ...
ہیں۔ میرے بہت سے چیلوں کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اور اب اس لڑکی کو دیکھ لو جسے میں ...
خوشی دی۔ جانتی ہو اس نے اپنی وہ قوت واپس کر دی ہے۔ بلکہ اسے آگ میں جلا دیا ہے جو میں ...
دی تھی۔''

''کون سی قوت......؟''

''جون بدل لینے والی۔ اب وہ کچھ نہیں بن سکتی۔ صرف انسان ہے۔ بڑی اللہ والی بن ر...
کل اُن لوگوں نے میرے خلاف ایک محاذ کھول رکھا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ انسانوں سے پوچھتے ...
کیا تکلیف ہے، ان انسانوں سے جو میرے ستائے ہوئے ہیں۔ اور پھر ان کا علاج کرنے ...
ہو جاتے ہیں۔ پہلا عمل شروع کیا ہے اُنہوں نے۔ میں بھی ایسے ناکوں چنے چبواؤں گا کہ د...
گے۔''

''رجنی بھی شامل ہے ان میں؟'' رادھا نے سوال کیا۔

''وہی کمینی تو سارا کھیل کھیل رہی ہے۔ آہ...... میں نے کیا نہیں دیا تم لوگوں کو۔''

''ہماری بات نہ کریں اشیش بھگونت...... ہم تمہارے ساتھ ہیں۔''

''خاک میرے ساتھ ہو؟ کون سے ایسے کارنامے انجام دے رہی ہو تم؟ اپنی جگہ پڑی ہوئی عیش کرتی
ہو۔ ارے میں تو کہتا ہوں کہ میرا نام لے کر سنسار میں پھیل جاؤ۔ ہر گھر میں گھسو اور جہاں سکون اور
...ن نظر آئے وہاں تباہی و بربادی پھیلا دو۔ سنو راگنی، ایک کام میں تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حکیم
ارشاد علی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پھیل رہے ہیں۔ ایسا کرو ان کے گھر جاؤ، وہاں جا کر دیکھو کیا صورتحال
ہے؟ اصل میں آج کل حکیم ارشاد علی حج پر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی چند ہی روز پہلے نکلے ہیں وہ۔ اس
دوران تمہیں گھر خالی ملے گا۔ خاص طور پر میں ایک کردار کی جانب اشارہ کروں، اس گھر میں حکیم ارشاد علی
کا ایک ہی پوتا ہے۔ گلزیب ہے اُس کا نام۔ لڑکیاں تو وہاں بہت ہیں لیکن سات بہنوں کا اکلوتا بھائی
گلزیب ہے۔ اور اس طرح سے یہ سمجھ لو کہ حکیم ارشاد علی کے گھر میں وہ سب کی آنکھوں کا تارا ہے۔ تمہیں
یہ دیکھنا ہے۔''

''ٹھیک ہے اشیش بھگونت...... اس کے لئے مجھے کہاں جانا ہوگا؟'' راگنی نے سوال کیا۔

''رانا نگر۔ رانا نگر کے بارے میں تمہیں مکمل معلومات آسانی سے حاصل ہو جائیں گی۔ رانا نگر کی وہ
حویلی ہے جہاں حکیم ارشاد علی رہتے ہیں۔ تمہیں ریل کے ذریعے وہاں پہنچنا چاہئے تاکہ اس گھر میں
آسانی کے ساتھ داخل ہو سکو۔ بس یہی کہنا ہے تمہیں کہ حکیم ارشاد علی نے تمہیں طلب کیا تھا اور اُن کی
ہدایت پر تم وہاں پہنچی ہو۔''

''ٹھیک ہے...... یہ کام میں با آسانی کر لوں گی اشیش بھگونت۔''

''بہت ہوشیاری کا کام ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ حکیم ارشد علی بہت زیادہ صاحب علم ہے، ایک
...قسم کا انسان۔ اور اُس نے اپنے علم سے نجانے کیا کیا چکر چلائے ہوئے ہیں۔ اُس کی جان اپنے
پوتے میں ہے۔ گلزیب کو مکمل طور پر ہمارے قبضے میں ہونا چاہئے۔ اگر گلزیب ہمارے قبضے میں آجائے تو
سمجھ لو ہر طرح کا کام آسان ہو جائے گا۔''

''وہ ہمارے قبضے میں ضرور آئے گا اشیش بھگونت۔'' راگنی نے مسکراتے ہوئے کہا اور شیطان اُن کی
نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

چاروں بہنیں سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ روپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''رجنی دیوانی تھی جو اتنے اچھے
...ول کو چھوڑ کر نجانے کہاں سے کہاں چلی گئی۔ اُس نے تو ہماری ناک کٹوا دی۔ اشیش بھگونت نے کیا
...ں کیا ہمارے لئے۔ اُنہوں نے ہمیں سنسار کی ساری آسائشیں دے دیں۔ سب کچھ ٹھیک کر دیا انہوں
نے ہمارے لئے۔ ہمارے جیون بچائے۔ پر رجنی بیوقوف نجانے کس پھیر میں پڑ گئی؟''

''ہاں...... یہ تو ہے۔'' شیطان فوراً ہی نمودار ہو گیا۔ بھلا اُس کے کانوں سے کوئی بات کیسے اوجھل رہ
...گئی؟ کہنے لگا۔ ''عشق کا چکر چلا ہے اُس پر...... پاگل ہو گئی ہے ایک لڑکے کے لئے۔ اُس کا نام ساحل

ہے۔ لیکن میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اُسی کے ہاتھوں رجنی کو مراؤں گا...... اُسی کے ہاتھوں
فرصت مل جائے تو پھر اس طرف بھی جا کر دیکھوں گا۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ غائب ہو گیا۔

رادھا نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ "ماری جائے گی سسری...... بے موت ماری جائے
اشیش بھگونت سے جھگڑا مول لینا کوئی معمولی بات ہے؟"

بہر حال راگنی جانے کے لئے تیاریاں کرنے لگی۔ بڑا خوبصورت لباس اُس نے اپنے جسم
ایک ماڈرن لڑکی کے رُوپ میں اپنے چھوٹے سے اٹیچی کے ساتھ باہر نکل آئی۔ باقی سارے
لوگوں کے لئے مشکل نہیں تھے۔ ساری آسانیاں اُنہیں حاصل تھیں۔ وہ رانا نگر کے بارے میں
حاصل کر کے ریل میں بیٹھ گئی۔ ایک اکیلی ماڈرن لڑکی ریل میں سب کی توجہ کا باعث تھی۔ کچھ
لڑکے للچائی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے اور راگنی دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ حالانکہ
اتنی زیادہ نہیں تھی، لیکن شیطان کی قربت میں اُن کے کردار اس قدر بگڑ چکے تھے کہ اب وہ خود
شیطان بن گئی تھیں۔ اور اس کے علاوہ شیطان نے اُنہیں جو قوتیں دی تھیں ان قوتوں نے اُنہیں
مغرور کر دیا تھا۔

راگنی کا یہ سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ اور اس وقت رات کے تین بجے تھے جب
نگر کے اسٹیشن پر پہنچی۔ ٹرین رُکی اور اُس نے جھانک کر باہر دیکھا تو اُسے رانا نگر کا سائن بورڈ نظر
اپنا اٹیچی لے کر نیچے اُتر گئی۔ کچھ اور مسافر بھی اُترے تھے۔ سارا ماحول بھائیں بھائیں کر رہا
سوچنے لگی کہ اس وقت اُسے کیا کرنا چاہئے؟ خوف و دہشت کا نام و نشان نہیں تھا اُس کے دل
وقت ایک ضعیف سا آدمی اُس کے قریب پہنچ گیا۔

"بیٹی...... اکیلی ہو؟"

راگنی نے بے خوفی سے اُسے دیکھا اور بولی۔ "جی بابا جی۔"

"رات کے تین بجے ہیں۔ کہاں جاؤ گی؟"

"بابا جی، مجھے حکیم ارشاد علی کی حویلی جانا ہے۔"

"ارے تم حکیم ارشاد علی کی مہمان ہو؟"

"ہاں بابا جی...... اُنہوں نے مجھے بلایا ہے۔"

"کیا تم نے اُنہیں خبر کی تھی کہ تم آ رہی ہو؟"

"بس یہی تو غلطی ہو گئی بابا جی...... مجھے نہیں معلوم تھا کہ ریل اتنی دیر میں رانا نگر پہنچے گی۔"

"پہلی بار آئی ہو یہاں؟"

"ہاں بابا جی......"

"بیٹا، اس وقت تو اگر تم حویلی جاؤ گی بھی تو وہاں تمہیں سب سوئے ہوئے ملیں گے۔"

"جی، ایسا تو ہے بابا جی۔"

"میں تم سے فوراً یہ بات کہتا کہ بیٹا، تم میرے ساتھ چلو۔ صبح کو تم حکیم ارشاد علی کی حویلی چلی

نہیں وہاں پہنچا کر آؤں گا۔ نوجوان بچی ہو، کوئی بھی غلط بات ہو سکتی ہے تمہارے ساتھ۔ میرا مطلب
اگر ایسا کوئی تمہیں کہے بھی تو تم اس بات کو قبول مت کرنا۔ میں یہ کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ یہیں بنچ پر
جاتا ہوں۔ صبح کو تانگہ کر کے تمہیں لے جاؤں گا۔ یہاں کم از کم اتنی رونق ضرور رہتی ہے، رات بھر کہ
ں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔"

"نہیں بابا جی۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ آپ بہت اچھے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنے
لے چلیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"میرا گھر یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے بیٹا...... مگر ہے کچی سی جھونپڑی۔"

"کوئی بات نہیں ہے بابا جی۔"

بوڑھا آدمی راگنی کو اپنے گھر لے گیا۔ بیوی اور دو بچے تھے اُس کے۔ بہر حال سب جاگ گئے۔ وہ
ی کہیں سے آیا تھا۔ راگنی کو آرام کے لئے جگہ دے دی گئی۔ راگنی کو بھلا کسی ایک انسان سے کیا خوف
ں ہو سکتا تھا؟ بہر حال وہ آرام سے سو گئی اور صبح کو بوڑھے بابا کی بیوی نے اُسے جگایا۔ خوب دن
چکا تھا۔

راگنی نے مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور بولی۔ "ماں جی، آپ؟"

"ہاں...... میں رحیم الدین کی بیوی ہوں۔ اُنہوں نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔
بیٹا تمہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ حکیم ارشاد علی تو ان دنوں حج پر گئے ہوئے ہیں۔"

"اوہ...... یہ تو بڑی پریشانی ہو گئی۔ اصل میں اُنہوں نے مجھے بلایا تھا اپنے پاس۔ میں اُن کے دوست
کی بیٹی ہوں۔ اُن کے دوست کا انتقال ہو چکا ہے اور انہوں نے کہا تھا کہ مجھے حویلی ہی میں رہنا ہے۔"

"بیٹا...... وہاں تمہیں اور کوئی نہیں جانتا؟"

"نہیں...... کوئی بھی نہیں جانتا۔ حکیم صاحب جب شہر آیا کرتے تھے تو میرے گھر رہا کرتے تھے۔"

"وہ تو بہت بڑے آدمی ہیں بیٹا۔ بہت بڑے زمیندار ہیں یہاں کے۔"

بوڑھے رحیم بابا نے ناشتے وغیرہ کا انتظام کر لیا تھا۔ اس سے فراغت حاصل کرنے کے بعد راگنی ایک
تانگے میں بیٹھ کر حکیم ارشاد علی کی حویلی چلی گئی۔ ویسے تو خیر اُس کے پاس بہت سے ذرائع تھے، کسی بھی
طرح حکیم ارشاد کی حویلی میں جا سکتی تھی۔ لیکن وہ ایک انسان ہی کی حیثیت سے وہاں فروکش ہونا چاہتی
تھی۔ اُسے گلزیب کو اپنے حسن کا شکار بنانا تھا اور یہ کام راگنی کے لئے مشکل نہیں تھا۔ بہر حال وہ حکیم
ارشاد علی کی حویلی پہنچ گئی۔ حکیم ارشاد علی کے سیکرٹری فاروق علی نے دفتر میں اُس سے ملاقات کی تو راگنی
نے کہا۔

"مجھے حکیم صاحب نے اپنے پاس بلایا تھا۔ میں اُن کے دوست شہزاد علی کی بیٹی ہوں۔ یہ کافی دن
پہلے کی بات ہے۔ کوئی تین مہینے سے زیادہ پہلے کی، اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا، یہاں اکیلی رہتی ہو،
تم میرے پاس حویلی آ جاؤ۔ بہت بڑا گھر ہے۔ تمہارے لئے وہاں کافی جگہ ہے۔ مگر مجھے نہیں معلوم
تھا کہ وہ حج پر چلے گئے ہیں۔"

"تو کوئی بات نہیں بیٹا۔ وہ حج پر گئے ہیں تو واپس آ جائیں گے۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو؟ کافی ہے کہ تم حکیم صاحب کے دوست کی بیٹی ہو۔ آؤ، میں تمہیں اندر پہنچائے دیتا ہوں۔"

راگنی سات بہنوں کے درمیان پہنچ گئی۔ بڑا خوبصورت ماحول تھا گھر کا۔ ہنستے بولتے لوگ، پچھلے حصے میں بڑے بڑے درختوں پر جھولے پڑے ہوئے تھے۔ یہ ساون کا مہینہ تھا اور اوپر آسمان پر چھائی رہتی تھیں۔ راگنی یہاں ایک خاص منصوبے کے تحت آئی تھی۔ لیکن یہاں آ کئی بار اُس کا دل عجیب انداز میں ڈول ڈول گیا تھا۔ یہ ماحول تو انتہائی خوبصورت تھا۔ اُسے باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اُس وقت جب اُس کا باپ زندہ تھا اور اپنی بیٹیوں سے بہت زیادہ محبت اُس نے اُن کے لئے بھی ایسے جھولے ڈلوا رکھے تھے۔ حکیم ارشاد علی کی ساتوں بیٹیوں نے اُس بہت اچھا سلوک کیا۔ اُسے مزید تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں اور وہ یہ سوچ رہی تھی کہ چلو یہاں تک ہے۔ اب وہ اپنے کام کا آغاز اشیش بھگونت کے کہنے کے مطابق کر دے گی۔ لیکن حکیم ارشاد اُس سے کیا کہے گی؟ ظاہر ہے اُس کا کوئی ایسا دوست نہیں تھا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا، جو ہو گا گا۔ اس وقت اگر روپوش ہونا پڑا تو روپوش بھی ہو جائے گی۔

بہرحال وہ ان لوگوں کے درمیان ہنسی خوشی رہنے لگی۔ اُسے گھر کے ایک فرد کی حیثیت دے اور اس بات نے بھی اُسے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ پھر اُس نے پہلی بار گلزیب کو دیکھا۔ نرم حسین سا لڑکا جس کے چہرے سے شرافت ٹپکتی تھی۔ اس وقت وہ گلزیب کے سامنے نہیں آئی۔

لیکن اُس دن جب گھٹائیں رِم جھم کر کے برس رہی تھیں، اُس نے گلزیب کو سامنے وا ایک گوشے میں دیکھا جہاں وہ بیٹھا بارش کے موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ راگنی نے ایک وہاں ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ بارش کی وجہ سے تمام لوگ کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے تھے آس پاس نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ چوری چھپے اُس جگہ پہنچ گئی جہاں گلزیب موجود تھا۔ اور پھر وہ آواز کے ساتھ گلزیب کی اُس جھونپڑی نما جگہ میں پہنچ گئی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی دلکش گلزیب چونک کر اُسے دیکھنے لگا تھا۔ راگنی کا پورا بدن پانی میں بھیگا ہوا تھا اور اس وقت جس ایک ایسا مجسمہ گلزیب کی آنکھوں کے سامنے تھا جسے دیکھ کر اگر کوئی انسان اپنے حواس قابو میں وہ انسان نہیں کچھ اور ہی کہلا سکتا تھا۔

بہرحال، گلزیب اُسے دیکھتا رہ گیا۔ راگنی اپنے چہرے پر بہنے والا پانی پونچھنے لگی تھی۔ دلکش آواز میں حسین آنکھوں سے گلزیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسی بارش...... اللہ توبہ۔"

گلزیب کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ راگنی نے پھر کہا۔ "معافی چاہتی ہوں آپ کو تنگ کیا۔ آ بیٹھے ہوئے تھے۔"

"آپ کون ہیں؟" گلزیب نے سوال کیا۔

"اوہو...... ٹھیک تو ہے۔ آپ بھلا مجھے کیسے جانتے ہوں گے؟ آپ کی مہمان ہوں۔ نام۔" راگنی نے یہی نام ان لوگوں کو بتایا تھا۔"

"ارے ہاں...... مجھے آپ کی آمد کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ بلکہ مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا کہ میں آپ پردہ نشینی کا خیال رکھوں۔"

"اسی لئے تو میں آپ تک پہنچی ہی نہیں۔"

"تو آپ ہیں جمیلہ۔"

"خوب پردہ نشینی کا خیال رکھا آپ نے۔ اب آپ مجھے اس حال میں دیکھ رہے ہیں۔ میں اب بھاگ کر اندر بھی نہیں جا سکتی۔ پورا بدن بھیگا ہوا ہے۔"

گلزیب کے سارے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ کنپٹیوں سے آگ نکلنے لگی تھی اس مجسمہ کو دیکھ کر۔ اور وہ بھی اس عالم میں کہ سارا لباس بدن سے چپکا ہوا، بدن کے ہر نقش کو نمایاں کرتا اور نقش بھی ایسے کہ انسان دیکھ کر پتھر ہو جائے۔ راگنی نے شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"کیسے دیکھ رہے ہو مجھے؟"

"م...... معافی چاہتا ہوں...... بس......"

"لیجئے، عجیب سے انسان ہیں آپ۔ بات بات پر معافی مانگنے لگتے ہیں۔ اس میں معافی کی کیا بات میں خود ہی تو آئی ہوں آپ کے پاس۔"

"جمیلہ، آپ...... آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"ہے۔" راگنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے بتا دیجئے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کی یہ تکلیف دُور کی جا سکے۔"

"بس آپ سے ملتے رہنا چاہتی ہوں۔ نہیں ملوں گی تو مجھے تکلیف ہو گی۔"

گلزیب اُس کے لب و لہجے میں کھو گیا۔ اب اس سے بڑی دعوت اور کیا ہو سکتی تھی؟ وہ بے اختیار ہو اور اُس نے ایک قدم آگے بڑھا کر کہا۔ "کیا واقعی؟ حالانکہ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن دیکھنے کے بعد مجھے دُکھ ہو رہا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے کیوں نہیں دیکھا؟ اور پھر جمیلہ آپ......"

"معافی چاہتی ہوں۔ بہت زیادہ بولنے کی عادت ہے مجھے۔ اب میری معافی مانگنے کا وقت آیا ہے۔"

"نہیں...... اس میں معافی کی کیا بات ہے؟ آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ اگر آپ دل میں بھی میرے لئے کوئی جگہ پیدا ہو سکتی ہے تو جمیلہ، میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے دل میں کوئی دے دیجئے۔ آپ یقین کریں کہ میں کوئی برا انسان نہیں ہوں۔ لیکن بس کبھی کبھی کوئی اس طرح بے ار ہو جاتا ہے مجھے اس کے بارے میں پہلے معلوم نہیں تھا، اب پتہ چلا ہے۔"

"چلئے آپ کو پتہ تو چل گیا...... اب کب مل رہے ہیں آپ؟ یہ تو بتایئے۔"

"جب آپ کہیں۔"

"رات کو جب سب لوگ سو جائیں۔ ایک بجے پچھلے باغ میں۔"

"میں آپ کو جگہ بتاؤں، وہ جو سامنے آپ ایک کیبن دیکھ رہی ہیں ناں؟ وہ خالی رہتا ہے۔ ہماری ات وہاں ہو گی۔"

"ٹھیک ایک بجے۔" راگنی نے کہا اور پھر بولی۔ "اب یہاں بھی مجھے اس طرح نہیں رہنا چاہ دن کا وقت ہے۔ اگر کوئی نکل آیا تو مجھے اور آپ کو ساتھ دیکھ کر اُسے شک ہوگا۔ جاؤں؟"

"یہ الفاظ آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟"

"اچھا جاتی ہوں۔" راگنی نے کہا اور مسکراتی ہوئی وہاں سے واپس چل پڑی۔ کچھ دیر کے بعد کمرے میں آ گئی جو اُسے رہنے کے لئے دیا گیا تھا۔ یہ بھی حویلی کے پچھلے حصے میں ہی تھا اور وہاں سے باہر نکلنے کے لئے ایک عمدہ راستہ بھی تلاش کر لیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اُسے سونپا گیا تھا اُس کا آغاز اس نے کر دیا تھا۔ لیکن اُس کی نگاہوں میں گلزیب کا چہرہ تھا۔ انتہا معصوم انسان مصیبت میں گرفتار ہونے والا تھے۔ اشیش بھگونت اس گھر کو تباہ و برباد کرنا چاہتا دُکھ کی بات۔ کتنے ہنستے بولتے لوگ ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کی زندگی میں کوئی دُکھ آیا ہی نہ ہو بولتے لوگوں کو اُجاڑنا، تباہ کرنا، برباد کرنا ایک تکلیف دہ کام ہے۔ لیکن بہرحال اشیش بھگونت کا سے آگے....." اُس نے سوچا اور اپنے آپ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

حویلی قدیم و جدید طرزِ تعمیر کا ایک عظیم شاہکار تھی۔ یہ حویلی ڈاکٹر ارشاد علی کی پشتوں کی پ تھی۔ باپ، دادا، پڑدادا کے دور سے یہ حویلی قائم چلی آ رہی تھی۔ اس کے پرانے حصے بوسیدہ ہو لیکن حویلی کی شان اور بزرگوں کا نام برقرار رکھنے کے لئے ان حصوں کو مرمت کرایا جاتا رہا تھا بھی خاصی مضبوط حالت میں نظر آتے تھے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو پریشانی کا باعث ہ کے گرنے کا کوئی خطرہ ہوتا۔ حویلی کا ایک حصہ بالکل ویران پڑا رہتا تھا۔ یہ ایک عظیم الشان جگہ اس میں تین در بنے ہوئے تھے۔ ان دروں کے اُوپر وسیع و عریض گنبد تھا اور یہاں ایک عجیب خاموشی اور سناٹا طاری رہتا تھا۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہاں بھی آبادی ہے اور اس وقت بھی میں تین بزرگ قسم کے لوگ بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر گہ طاری تھی۔ کچھ لمحے خاموشی کے بعد ایک نے کہا۔

"اور ہمیں اپنا فرض ادا کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ شیطان حویلی کے درواز داخل ہو چکا ہے۔ اصل میں قبلہ محترم کی غیر موجودگی سے وہ فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ مگر ہمیں ذ داریاں پوری کرنی ہیں۔ میرا خیال ہے اُس شیطان زادی کا مقابلہ مختلف انداز میں ہی کرنا چ شیطان کی شاگرد ہے اور شیطان نے اُسے بہت سی قوتیں دینے کے بعد یہاں بھیجا ہے۔ اب د کہ وہ کس طرح اپنے کام کا آغاز کرتی ہے۔ ہم اسے اسی کے داؤ پر ماریں گے۔"

"وہ اپنے کام کا آغاز کرتی نہیں ہے بلکہ کر چکی ہے۔ آج جب جل تھل بارش ہو رہی تھی گلزیب کو دُور سے دیکھا اور اُس کے بعد بارش میں بھیگتی ہوئی اُس کے پاس پہنچ گئی۔ اُس نے اپنے بدن کا جادو چلایا اور گلزیب جو ایک نوجوان اور معصوم سا لڑکا ہے، اُس سے متاثر ہو گیا۔ د عمل۔ اگر وہ محبت کا پیغام کسی اور انداز میں گلزیب تک پہنچاتی تو شاید ہمیں مشکلات کا سامنا لیکن اس شیطانی عمل نے اور اس کے بدن کی لطافتوں نے جس کام کا آغاز کیا ہے اس کا خا

ے لئے آسان ہو جائے گا۔"

"تو پھر کوئی منصوبے بنائیے...... تاکہ ہم اس کا صحیح انداز میں مقابلہ کر سکیں۔"

"ایک بات دماغ میں رکھنا...... شیطان اپنی ساری قوتوں کے ساتھ مصروفِ عمل ہوا ہے۔ اور اُسے اس بات کا علم ہوگا کہ حکیم صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں، ان کی غیر موجودگی میں ان کے گھر پر تباہی بادل برسا دیئے جائیں۔ چنانچہ وہ خود پوری قوت سے کام کرے گا۔"

"تو ہم کس لئے ہیں؟ حکیم صاحب نے ہماری ڈیوٹیاں لگائی ہیں کہ ان کی غیر موجودگی میں ہم ان گھر کا تحفظ کریں۔ کیونکہ قبلہ محترم نے جن لوگوں کو فیض پہنچایا ہے وہ اُن کے ہمدرد ہیں اور جنہیں ان سلسلے میں ناکام ہونا پڑا ہے وہ الگ ہیں۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے نا۔ میں خاص طور سے شیطان کی بات کرتا ہوں جو اب یہاں سے مردود ہو چکا ہے لیکن حکیم صاحب پر وار کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ خیر، اس کی بات چھوڑو۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے کام کا آغاز کس طرح کرنا ہے؟ مشورہ کر لیتے ہیں آپس میں۔" اُن تینوں نے سر جوڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور اس کے بعد وہ دیر آپس میں صلاح و مشورے کرتے رہے۔ اُن کی آوازیں سرگوشیوں میں اُبھر رہی تھیں اور اس پُرہول ل میں ان تینوں کے سفید لباس چمک رہے تھے۔ آخر کار وہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے، اُنہوں نے فضا اتھ بلند کئے اور دُھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔

راگنی ان تمام باتوں سے بے خبر اپنی آرام گاہ میں آرام کر رہی تھی۔ گلزیب کا سراپا اُس کے ذہن میں ش کر رہا تھا اور وہ اُس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ گلزیب ایک انتہائی حسین نوجوان تھا اور راگنی دل میں اُس کے لئے ایک عجیب سا احساس اُبھر رہا تھا۔ لیکن پھر اُس نے اپنے اس احساس کو ذہن جھٹک دیا...... کیا بیوقوفی کی بات ہے...... میں تو اشیش بھگونت کی پجارن ہوں...... مجھے ان تمام ں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ نہیں...... بالکل نہیں...... مجھے یہ کام بالکل نہیں کرنا چاہئے۔ میرا دل تو اپنا ہے ہی نہیں۔ میرے دل کے کسی گوشے میں ایسی کوئی بات آنی ہی نہیں چاہئے۔ غلط ہے...... یہ ب کچھ غلط ہے۔ میں ان تمام باتوں پر توجہ نہیں دُوں گی۔ رات کو اُس سے ملنا ہے۔ میں اپنی رہائش گاہ باہر جاؤں گی اور اُس سے ملوں گی......

بہرحال راگنی ان تمام باتوں کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ جس جگہ اُس کا قیام تھا وہاں سے تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ اُس عالیشان حویلی کے عقبی حصے سے نکل سکتی تھی اور اس کے بعد لمبا فاصلہ طے کر اُس جگہ تک پہنچ سکتی تھی جہاں اُسے جانا تھا۔ لیکن جب رات گہری ہو گئی اور یہ اندازہ ہو گیا کہ حویلی سارے مکین گہری نیند سو چکے ہیں، تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اُس نے اپنے وجود کو سنوارا، تھوڑا سا سنگھار کیا۔ وہ انتہائی دلکش نظر آنے لگی تھی۔ پھر وہ دبے پاؤں حویلی کے اندرونی حصے سے باہر نکل آئی۔ لیکن ایک ہی اُسے ٹھٹک کر رُک جانا پڑا۔ تھوڑے فاصلے پر دو پہریدار موجود تھے۔ دروازے سے اُن کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا، وہ پوری طرح مسلح تھے اور اسی انداز میں ٹہل رہے تھے جیسے پہرہ دے رہے ہوں۔

راگنی کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ اُسے پہلے سے علم نہیں تھا کہ یہاں رات کو چوکیداری

بھی ہوتی ہے۔ وہ بڑی پریشانی کے عالم میں ان پہریداروں کو دیکھتی رہی۔ کمبخت ٹس سے مس
رہے تھے۔ یہ تو پریشانی کی بات ہے...... اب کیا، کیا جائے؟ اُس نے دل میں سوچا اور پھر وہ واپ
ایک گوشے میں پہنچنے کے بعد اُس نے اپنی جون بدلی اور ناگن کا رُوپ دھار لیا...... خوبصورت سفی
کا جسم اختیار کرنے کے بعد وہ رینگتی ہوئی دروازے سے باہر نکل آئی اور اُس نے دیکھا کہ اس
دونوں پہریدار موجود نہیں ہیں۔ وہ غالباً اس جگہ پہرہ دینے کے بعد کہیں فاصلے پر نکل گئے تھے
حویلی کے دوسرے حصے میں گئے ہوں۔ چنانچہ وہ آگے بڑھنے لگی۔

اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ ابھی جون تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب اُس جگہ پہنچ
جہاں گلزیب سے ملنے کا وعدہ کیا ہے اُس نے تو اپنا حلیہ اور جسم بدل لے گی۔ چنانچہ وہ ایک مخصوص
اختیار کر کے بل کھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور فضا میں تیز روشنی پھ
تھی۔ بارش کے بعد آسمان اور زمین کے درمیان جمی ہوئی گرد کی چادر چھٹ گئی تھی اور چاندنی صاف
پر پڑ رہی تھی۔ اس شفاف چاندنی میں ایک حسین ناگن کا رینگتا ہوا جسم بے حد خوبصورت لگ رہا تھا

اچانک ہی راگنی کو کچھ آہٹیں محسوس ہوئیں اور اُس نے ایک دم پھن اُٹھا دیا۔ اور اس کے بعد
جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر اُس کی جان ہی نکل گئی...... وہ انتہائی خونخوار نیولا تھا جو اپنی سرخ چمکدار
سے اُسے گھور رہا تھا۔ راگنی کا تو جیسے دم ہی نکل گیا تھا۔ اس وقت نیولے سے بچاؤ اس کے لئے
تھا۔ ٹھیک ہے وہ ناگن کا روپ دھارے ہوئے تھی، لیکن مکمل ناگن ہی تھی اس وقت وہ۔ اور اگر
پر حملہ کر دیتا تو اس کے لئے بچنا بے حد مشکل ہو جاتا۔ نیولا اپنی خونی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا
راگنی کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ جان کی بازی لگا کر واپس پلٹے اور
حویلی میں پناہ لے۔ لیکن نیولے نے اُس کا پیچھا کیا تو راگنی کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ د
اس وقت اُسے جتنا خوف محسوس ہو رہا تھا اس سے پہلے زندگی میں وہ کبھی کسی چیز سے اتنی نہیں ڈ
نیولا اُس کے لئے ایک انتہائی بھیانک شکل اختیار کر چکا تھا اور بدنصیبی کی بات یہ تھی کہ اُس نے
لیا تھا اور اب حملہ کرنے کے لئے پینترے بدل رہا تھا۔

اچانک ہی وہ راگنی کی طرف جھپٹا اور راگنی پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی...... لیکن پھر بھی
ایک پھنکار ماری اور خود نیولے پر حملہ کیا۔ نیولا چھلانگ لگا کر پیچھے ہٹ گیا تھا اور راگنی نے ایک
کر پیچھے کی جانب دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کی سب سے زیادہ تیز رفتاری
کر رہی تھی۔ نیولے نے ایک لمبی چھلانگ لگائی لیکن خوش قسمتی یہ تھی کہ جہاں اُس نے یہ چھلا
وہاں ایک گڑھا تھا۔ خود راگنی کو بھی اُس گڑھے کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ لیکن نیولا اُس گڑھ
پڑا۔ اور پھر جو راگنی دُم دبا کر وہاں سے بھاگی تو اُس نے حویلی کے اندرونی حصے میں آ کر ہی دم لیا
برا حال ہو چکا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ دہشت زدہ نگاہوں سے کھلے دروازے کو
تھی اور اُسے خوف تھا کہ نیولا کہیں اندر نہ گھس آئے۔ وہ تو خوش قسمتی تھی اُس کی کہ نیولا گڑھے
تھا۔ ورنہ اگر یہ چھلانگ کامیاب ہو جاتی تو نیولا اس ناگن کا پھن چبا کر پھینک دیتا اور اس وقت

جو کچھ بن جاتا وہ دیکھنے کے قابل نہ ہوتا۔ یہ تو بعد کی بات تھی کہ وہ انسانی جون میں آ جاتی۔ لیکن
ی جون میں آنے کے بعد بھی چہرہ اسی طرح کچلا ہوا رہتا۔
"ارے دیا رے دیا...... یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا میں نے۔ اشیش بھگونت، اس کے لئے کبھی تو نے
بندوبست نہیں کیا۔ میں ناگن بنی ہوئی تھی۔ اور اگر نیولا سچ مچ مجھ پر قابو پا لیتا تو میرا کیا ہوتا؟" اُس
نورا ہی انسانی روپ اختیار کر لیا اور اس کے بعد چکراتے سر کے ساتھ بیٹھی سوچ میں ڈوبی رہی۔ جان
تھی ورنہ اُمید تو کوئی نہیں رہی تھی۔ اب کیا کروں...... اب کیا کرنا چاہئے مجھے؟ اُس نے دل ہی دل
سوچا اور پریشانی سے گردن ہلانے لگی۔ پھر اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا، اب تو چند ہی منٹ رہ گئے
لزیب کے وہاں پہنچنے میں۔ جو وعدہ اُس نے کیا تھا اسے پورا کرنے میں ہو سکتا ہے گلزیب کی بے تابی
وقت سے پہلے وہاں لے آئی ہو اور وہ انتظار کر رہا ہو۔ بہر حال، اس کے بعد سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا،
جائے؟ بہت دیر تک وہ اسی طرح سوچتی رہی اور اس کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ اب باغ سے باہر
کر دیکھا جائے۔ چنانچہ ایک بار پھر ہمت کر کے دبے قدموں آگے بڑھی اور دروازے تک پہنچی۔ لیکن
دونوں پہریدار جو پوری طرح مسلح تھے دروازے سے کچھ فاصلے پر چوکس نظر آئے اور راگنی نے آنکھیں
کے گردن جھٹکی، پھر وہ مایوس سی اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ لیکن اس کے بعد وہ کئی گھنٹے تک جاگتی
۔ جب بھی وہ باہر نکلی اُس نے چوکیداروں کو مستعد دیکھا اور دل ہی دل میں اُنہیں کوسنے لگی۔
"کمبخت مارے...... پہلے تو پہرے پر نکل گئے تھے، اب تو ہل بھی نہیں رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
گئے ہوں۔ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔ بیچارہ گلزیب کیا سوچ رہا ہوگا؟" بستر پر لیٹے لیٹے وہ یہ تمام
سوچ رہی تھی اور اُس کے دل میں ایک عجیب سے دُکھ کا احساس ہو رہا تھا۔ کئی بار اُس نے اپنے آپ
کیا تو اُسے احساس ہو گیا کہ وہ خود بھی گلزیب سے ملنے کے لئے اتنی ہی بے چین ہے جتنا شاید
یب اُس سے ملنے کے لئے بے چین ہوگا۔ لیکن یہ بے چینی اشیش بھگونت کے حکم کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ وہ
کے اندر کی ایک طلب کو محسوس کر رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ اپنے آپ کو کوستی رہی اور پھر نیند نے اُس کی
ں میں بسیرا کر لیا اور وہ گہری نیند سو گئی......!

کرنل ایاز کے جانے کے بعد رجنی، انا زبیدہ اور ایمان علی بہت دیر تک غیاث احمد کی کہانی پر غور کرتے
ہے۔ بڑی عجیب اور بڑی ہی پراسرار کہانی تھی۔ مصر کی ایک قدیم شہزادی نے غیاث احمد صاحب کو اپنی
فت میں جکڑ لیا تھا۔
"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب تو غیاث احمد بوڑھے ہو گئے۔ کرنل ایاز کو اس سلسلے میں کیا پریشانی ہے؟
وہ کیوں اُلجھے ہوئے ہیں؟"
"ہاں...... یہ سوال تو واقعی قابل غور ہے۔"
"خیر، مگر کرنل سے پوری بات بھی تو نہیں پوچھی ہم نے۔ پتہ تو چلے؟ اب کرنل کو کیا پریشانی ہے؟
رحال اب یہ جو کچھ بھی ہے، پوری تفصیل سننے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔" اور پھر یہ لوگ اس گفتگو کے بعد

منتشر ہو گئے۔

پھر دوسری نشست ہوئی اور کرنل ایاز نے اس کے بعد کی تفصیلات بتائیں۔ اُس سے باقاعدہ ہوا
گیا تھا۔ آج غیاث احمد اُس کے ساتھ نہیں تھے اور کرنل ایاز ان لوگوں کی ہدایت کے مطابق تنہا ہی آیا
ایمان علی نے اُس سے سوال کیا۔

''ایک بات بتائیے کرنل صاحب...... یہ بات جیسا کہ غیاث احمد صاحب یعنی آپ کے والد ما
نے بتایا کہ خاصی قدیم ہے۔ اور اب اس ساری کہانی کا کوئی وجود نہیں ہے، ایسی صورت میں آ
پریشانی کیا ہے؟''

''کون کہتا ہے کہ اس کہانی کا وجود نہیں ہے؟'' کرنل ایاز کے الفاظ نے ان سب کو چونکا دیا تھا
سوالیہ نگاہوں سے کرنل ایاز کو دیکھنے لگے تو کرنل ایاز نے کہا۔

''میں ایک باعزت آدمی ہوں، معاشرے میں ایک مقام ہے میرا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے
تک پہنچانے میں میرے والد صاحب کی کاوشوں کا دخل ہے۔ وہ ایک بہت ہی مشفق ہیں۔ لیک
میرے باپ کا مذاق اُڑایا جائے اور انہیں عجیب سی نگاہوں سے دیکھا جائے تو آپ مجھے خود بتائیے
میرے دل کو خوشی ہوگی؟''

''میں سمجھا نہیں؟'' ایمان علی نے حیرانی سے کہا۔

''جناب عالی...... وہ آج بھی آرا صفیہ سے عشق کرتے ہیں۔ اور ان پر عجیب سے دورے
ہیں۔ اس وقت وہ آرا صفیہ کو اس طرح محسوس کرتے ہیں جیسے وہ ان کے سامنے ہو۔ اور یہی آرزو
ہیں کہ آرا صفیہ ان کی زندگی میں شامل ہو جائے، بلکہ اس کے لئے وہ ایک مخصوص جگہ جاتے ہیں اور
جا کر وہ عجیب و غریب کیفیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔''

''وہ مخصوص جگہ کہاں ہے؟''

''یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک علاقہ ہے دیپال پور۔ دیپال پور میں ایک حویلی ہے جو قدیم ہے۔
حویلی کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ آسیب زدہ ہے اور عجیب و غریب کہانیاں سنائی جاتی
آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اُس حویلی سے ان واقعات کا کوئی گہرا تعلق ہے اور میرے والد وہاں جانے
بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ محفلوں میں بھی جاتے ہیں اور ان پر دورہ پڑ جاتا ہے تو
صفیہ...... آرا صفیہ چیخنے لگتے ہیں اور ایک ایسے عاشق کا انداز اختیار کر لیتے ہیں جو اپنی محبوبہ کے لئے
رہا ہو۔ آپ خود غور کیجئے کہ اس وقت میری کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔ ویسے عام حالات میں آپ نے
دیکھ لیا کہ وہ بالکل ہوش میں ہیں اور کوئی کیفیت یا علامت ان پر ظاہر نہیں ہوتی جس کے بارے
سوچا جائے کہ وہ کسی طرح سے ذہنی مریض ہیں۔ بس یہ دورہ اچانک ہی پڑتا ہے ان پر اور اس
سب شرمندگی سے منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ وہ ایسی ہی بے تکی حرکتیں کرتے ہیں۔''

''جس حویلی کے بارے میں آپ نے بتایا کہ وہ دیپال پور میں ہے، اس حویلی کی تاریخ کیا ہے؟''

''بہت ہی عجیب و غریب۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ حویلی کچھ ایسے لوگوں نے بنوائی تھی جو

ے آئے ہوئے تھے اور اس حویلی میں باقاعدہ ایک انصاف گھر بنا ہوا ہے۔ یعنی بالکل ایسا جیسا کسی
عدالت میں ہوتا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ باقاعدہ ایک عدالت جیسی جگہ بنی ہوئی ہے۔ ہمیں خود تعجب
ہے کہ اس حویلی کا ہمارے والد صاحب سے کیا تعلق ہے؟''

''اب آپ یہ بتائیے کہ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں کرنل صاحب؟''

''جیسا کہ آپ نے، یا یوں کہنا چاہئے کہ مجھے آپ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں کہ آپ
مشکلات میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور انہیں ہر طرح کی آسانیاں پہنچاتے ہیں، تو ہماری بھی ہمت اور
جرأت ہوئی کہ ہم، میرا مطلب ہے کہ میں آپ کے پاس آ کر اپنی مشکل کا حل تلاش کروں۔''

''ٹھیک ہے...... انشاء اللہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ ہم سب سے پہلے اس بارے میں یہ معلومات
حاصل کریں گے کہ قصہ کیا ہے۔''

''ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اس عمل میں جتنے اخراجات ہوں گے وہ میں ادا کروں
گا۔ آپ نے چونکہ مجھ سے کچھ طلب نہیں کیا ہے اس لئے میں خود یہ پیشکش کر رہا ہوں۔''

''نہیں بھائی...... اللہ تعالیٰ آپ کو بہت زیادہ دے، ہم اپنے کام کا معاوضہ ایک چنے کے دانے کی
شکل میں بھی وصول نہیں کرتے۔ آپ براہِ کرم ہم سے اس سلسلے میں دوبارہ نہ کہیں، ورنہ ہمیں دُکھ ہوگا۔
ہم نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، آپ بھی ہمیں کوئی ذہنی تکلیف نہ پہنچائیں۔''

''اللہ تعالیٰ آپ کو میری مشکل کا حل دریافت کرنے کا حوصلہ عطا کرے۔''

کرنل ایاز کے چلے جانے کے بعد ایک بار پھر انا زبیدہ نے گردن ہلائی اور بولیں۔ ''تو مسئلہ یہ ہے۔
گویا کرنل پر وہ آسیب اب تک سوار ہے۔ حیرت کی بات ہے۔ اب ایک کام کرو ایمان علی، ذرا وہاں جا
کر دیکھو، کیا واقعی وہاں کوئی نوادرات کی دُکان موجود ہے یا وہ سب طلسم ہی تھا؟''

''میں معلومات کئے لیتا ہوں۔''

''اور میں چلّہ کشی کرتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ اس سلسلے میں کیا، کیا جا سکتا ہے؟''

''ٹھیک ہے، اب یہ کرتے ہیں کہ میں تو جاتا ہوں وہاں۔ اور آپ چلّہ کشی کیجئے۔ اور ستارہ بیٹی تم......''

''یہ میری مدد کرے گی۔ ظاہر ہے یہ میری ساتھی ہے۔'' انا زبیدہ نے کہا۔

پھر ایمان علی اُس دُکان کی تلاش میں چلا گیا اور پتہ لگاتا ہوا بالآخر اُس جگہ پہنچ گیا۔ لیکن اُس کا اندازہ
بھی درست تھا اور کرنل کا کہنا بھی، وہاں کوئی دُکان نہیں تھی اور ایک مکان تھا۔ پڑوس کے لوگوں نے بتایا
کہ یہ مکان تو ہمیشہ سے غیر آباد پڑا ہوا ہے اور اس میں کوئی دُکان کبھی نہیں کھلی۔ مکان کا اندر سے جائزہ
لینے کے لئے ایمان علی نے کچھ لوگوں سے رابطہ کیا۔ مکان کا مالک ایک کاروباری آدمی تھا۔ اُس نے کہا۔

''اگر آپ یہ مکان خریدنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایسے گنجان اور اچھے علاقے میں ایک ایسا مکان بہت
مہنگا ملے گا۔ لیکن میں اسے کوڑیوں کے مول بیچنے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ طویل عرصے سے میں اسے
بیچنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن میرا ہر گاہک بھاگ جاتا ہے۔ وجہ کچھ نہیں ہوتی، وہ خود اپنے کسی مسئلے میں
گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور اگر آپ اسے کرائے پر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو تین سال کے لئے میں

بلا معاوضہ اسے آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔“

”نہیں بھائی...... نہ مجھے یہ مکان خریدنا ہے اور نہ کرائے پر حاصل کرنا ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ اس جگہ کبھی کوئی دُکان کھلی ہوئی تھی یا نہیں“

”ارے آپ کیا بات کرتے ہیں؟ مکان ہے کہ دُکان؟“

ایمان علی ٹھنڈی سانس لے کر واپس چلا آیا تھا۔

اُدھر انا زبیدہ چلّے میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس سلسلے میں تمام تر معلومات حاصل کر رہی تھی۔ یہ چلّہ تین دن کا تھا۔ تین دن کے بعد یہ طے کیا گیا تھا کہ آرا صفیہ کی رُوح کو طلب کیا جائے گا انا زبیدہ اچھی طرح جانتی تھی۔

ایمان علی نے ساری تفصیل انا زبیدہ کو بتائی تو انا زبیدہ گردن ہلا کر خاموش ہو گئی تھی۔ دوسرے دن کا چلّہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے باقاعدہ ایک ایسی جگہ بنا لی تھی جہاں وہ اپنے یہ تمام کام تھے۔ اب بہر حال یہ ایک نیک مشن تھا۔ وہ شیطان کے خلاف صف آراء ہوئے تھے۔ تیسرے دن ختم ہو گیا تو انا زبیدہ نے آرا صفیہ کی تلاش کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ ایک بڑا سا حصار اس حصار کو مضبوطی سے محفوظ کیا گیا اور انا زبیدہ نے حاضرات پڑھنا شروع کر دیئے۔ کوئی ایک مسلسل کوشش کے بعد اچانک ہی وہ حصار روشن ہو گیا اور اُس میں سے ننھے ننھے شعلے بلند ہونے اُن کی اُونچائی چھ انچ سے زیادہ نہیں تھی۔

حصار کے ایک سرے پر انا زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی اور باقی دو طرف ایمان علی اور ستارہ یا رجنی بیٹھ تھے۔ انا زبیدہ بہت ہی پہنچی ہوئی بزرگ تھی اور اس طرح کے کاموں کو بہت اچھی طرح جانتی تھی میں شعلے بلند ہوتے رہے۔ تاریک اور سنسان ماحول میں چمکتے ہوئے یہ شعلے بڑے عجیب لگ رہے اور رجنی کا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ خود ایمان علی کے بدن پر بھی ہلکا ہلکا پسینہ طاری تھا۔

انا زبیدہ کے ہاتھ آگے بڑھے اور شعلوں سے گزر کر اُس سامنے والے حصے میں پہنچ گئے جو موجود نہیں تھا یعنی انا زبیدہ حصار کے ایک سرے پر تھی، دائیں طرف ایمان علی اور بائیں طرف تھی، سامنے کا حصہ خالی تھا۔ انا زبیدہ نے حصار کی لائن توڑی اور اس کے دونوں سرے ایک دروازے کی شکل میں ترتیب دے دیئے۔ اور پھر اُس کی خوفناک آواز اُبھری۔

”آرا صفیہ...... مصر کی شہزادی...... را آفتوخ کی بیٹی...... اس حصار سے اندر آ کہ تیرا احسان ہے۔ اندر آ اور بتا کہ یہ سارا سلسلہ تو نے کیوں شروع کیا؟ اور اب کیوں اس شخص کو پریشان کر رہی ہے جو عمر کی اس منزل سے گزر چکا ہے جہاں عشق و محبت کے راستے ہموار کئے جاتے ہیں؟ بول کی بیٹی...... جواب دے...... جواب دے را آفتوخ کی بیٹی...... اندر آ......“

دفعتہً ہی یوں لگا جیسے ایک ننھا سا ہیولا حصار کے اندر اس دروازے سے داخل ہو رہا ہو اچانک ہی حصار میں آگ کے شعلے بھڑکے اور وہ ہیولا گم ہو گیا۔ یہ شعلے کچھ دیر بھڑکتے رہے کے بعد سرد ہو گئے تو انا زبیدہ کی آواز پھر اُبھری۔

”تو اپنے آپ کو انصاف کی عدالت میں آنے سے نہیں بچا سکتی...... صرف تو ہی نہیں بلکہ اس کے بعد میں تیرے باپ کو بھی طلب کروں گی۔ کیونکہ قصور غیاث احمد کا نہیں ہے، قصور تو تیرا ہے۔ تیرا پاؤں کس نے کاٹا تھا یہ بات نہ میں جانتی ہوں اور نہ غیاث احمد جانتا ہے۔ اندر آ، ورنہ تیرے ساتھ بڑے سلوک کا آغاز ہو جائے گا۔“

ایک بار پھر شعلے بیٹھ گئے تھے اور حصار کے دروازے پر ایک ہیولا سا اندر آتا ہوا نظر آ رہا تھا...... ایمان علی اور ستارہ پھٹی پھٹی وحشت زدہ نگاہوں سے اس عمل کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن دروازے سے چند ہی قدم آگے چلنے کے بعد ایک بار پھر شعلے بھڑک اُٹھے اور وہ ہیولا اس میں گم ہو گیا۔ انا زبیدہ کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے تھے۔ پھر اُس نے کہا۔

”اور اب میں تجھ پر لاحول پڑھتی ہوں...... شیطان، تو اپنی تمام کوششیں کر لے۔ میرا تجھ سے باقاعدہ مقابلہ ہو رہا ہے اور تو دیکھنا کہ تو کس طرح شکست کھاتا ہے......“ انا زبیدہ نے تین بار لاحول پڑھا اور اس کے بعد حصار پر ہاتھ پھیر دیا۔ وہ حصار بالکل ٹھنڈا ہو گیا اور اب وہاں شعلوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ تب انا زبیدہ نے ایمان علی سے کہا۔

”یہ سارا شیطانی چکر ہے...... مکمل طور پر شیطانی چکر۔ یقیناً بے چارے غیاث احمد کو شیطان نے اپنا شکار بنایا۔ ہو سکتا ہے غیاث احمد کے نوادرات کے حصول کے شوق نے اُنہیں اس حال کو پہنچایا ہو اور شیطان نے اُنہیں دھوکہ دے کر وادیٔ مصر کی کسی کہانی میں اُلجھا دیا ہو۔“

”تو اب کیا ہو گا...... کیا غیاث احمد اس جال سے نہیں نکل سکے گا؟“

”نکل سکے گا۔ کیوں نہیں نکل سکے گا؟ لیکن اس کے لئے ہمیں دیپال پور چلنا ہو گا، دیپال پور کے اُس پُراسرار مکان میں جس کا تعلق یقیناً ان تمام واقعات سے ہے۔“

”تو آپ نے کیا طے کیا انا زبیدہ؟“

”جب شیطان کے خلاف ہم لوگوں نے ایک محاذ شروع کیا ہے تو اس کے لئے بھاگ دوڑ تو کرنی ہی پڑے گی۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ہم شیطان سے باقاعدہ جنگ کریں گے اور ہمیں یقین ہے کہ آخر کار ہم اُسے شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اب تم لوگ دیپال پور چلنے کی تیاریاں کرو۔“

دوسری صبح رانگنی کافی دیر سے جاگی تھی اور بستر پر لیٹی لیٹی رات کے واقعات کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر غسل خانے میں داخل ہوئی۔ نجانے کیوں اُس کے دل میں بار بار گلزیب کا خیال آ رہا تھا۔

رانگنی نے کپڑے تبدیل کئے ہی تھے کہ گلزیب کی دو بہنیں اُسے بلانے کے لئے آ گئیں۔

”ہیلو جمیلہ...... کیا بات ہے، رات کو دیر تک جاگتی رہیں کیا؟“

”ہاں...... بہت دیر سے نیند آئی تھی۔“

”اچھا جی...... کوئی نیند چرانے والا مل گیا ہے کیا؟“ گلزیب کی ایک بہن نے شرارت کی اور رانگنی

مسکرادی، پھر بولی۔
''نیند کیا اسی لئے نہیں آتی؟''
''خیر نیند نہ آنے کی تو بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ لیکن اس عمر میں یہ ایک وجہ بھی ہوتی ہ
''بھئی ایسی باتیں مت کرو۔ ہماری جمیلہ ایسی نہیں ہے۔'' دوسری بہن نے کہا۔
''لو...... تمہیں کیا معلوم؟ جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے جمیلہ سے ملاقات کئے اور کہا
جیسے جمیلہ سے برسوں سے واقف ہو۔''
''سچی بات تو یہی ہے کہ جمیلہ برسوں کی واقف کار لگتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو دل میں یہ خیال
اگر یہ ہماری آٹھویں بہن وہوتی تو کتنا اچھا ہوتا؟''
''ہم انہیں آٹھویں بہن بنا بھی تو سکتے ہیں۔ اتنی خوبصورت، اتنی پیاری اگر بہن نہ سہی تو
سکتی ہے۔''
''اے زبان سنبھال کر بات کرو۔ جمیلہ بڑا بھی مان سکتی ہے۔'' دوسری بہن نے پہلی کو ڈا
''برا مانے کی تو ہم معافی مانگ لیں گے۔ آخر ہماری سہیلی ہے۔''
راگنی ایک لمحے کے لئے کھو سی گئی۔ سات بہنوں کا یہ کنبہ، آٹھواں بھائی، ماں، باپ کو نہ
اتنے اچھے تھے یہ لوگ کہ ایک لمحے کے لئے راگنی کا دل ڈول ڈول جاتا تھا۔ اُسے احساس ہو
نے غلط اندازِ فکر اختیار کیا ہے۔ اشیش بھگونت کا تو مقصد ہی کچھ اور ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ا
ناراض ہو جائیں۔ کام تو دوسرا ہی سپرد کیا گیا ہے۔ یہ باتیں کیا معنی رکھتی ہیں۔
پھر باقی دن بھی ایسے ہی ہنستے بولتے گزرا۔ ان لوگوں کے ساتھ تو وقت کا پتہ بھی نہیں چلا
عورتوں کے درمیان بہت کم آتا تھا۔ مرد کھانا بھی الگ ہی کھاتے تھے۔ حکیم ارشاد علی اسی طر
تھے۔ گھر میں ذرا تھوڑی سی پابندیاں تھیں اس لئے مرد زنان خانے میں کم ہی آیا کرتے ت
نگاہوں نے کتنی ہی بار گلزیب کو تلاش کیا تھا کہ کم از کم یہ اندازہ لگایا جائے کہ گلزیب کی کیا کیف
شام کو پانچ بجے کے قریب اچانک ہی راگنی کو اپنے دروازے پر کچھ ہلکا سا کھٹکا محسوس ہ
سے دستک دی گئی تو وہ بولی۔ ''آ جاؤ...... کون ہے؟''
لیکن جو اندر داخل ہوا تھا اُسے دیکھ کر راگنی ایک دم چونک کر رُک گئی۔ ''آپ......؟'' اس
کو دیکھ کر کہا۔
گلزیب آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ''اس طرح آنے کی
ہوں۔ مگر کیا کرتا؟ دل کمبخت بس اب پھٹنے کے لئے تیار تھا۔''
''کیوں؟''
''کتنے بھولے پن سے آپ یہ سوال کر رہی ہیں جمیلہ۔ رات کو آپ کیوں نہیں آئیں؟ آ
کہ میں صبح چار بجے تک وہاں کھڑا رہا ہوں۔''
''چار بجے تک؟''

آپ نے منع تو نہیں کیا تھا نا مجھے؟''
''جی...... آپ نے منع تو نہیں کیا تھا نا مجھے؟''
''مگر آپ کو پتہ نہیں ہے پچھلے دروازے پر چوکیدار کھڑے ہوئے تھے۔''
''چوکیدار؟''
''جی......''
''کون چوکیدار؟''
''آپ کے گھر کے چوکیدار۔''
''کہاں کھڑے ہوئے تھے؟''
''پچھلے دروازے پر ہتھیار لئے کھڑے ہوئے تھے۔ کیسے آتی؟''
''مس جمیلہ، آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔''
''کیا غلط فہمی ہو رہی ہے؟''
''ہمارے ہاں صرف گیٹ پر چوکیدار ہوتا ہے۔ پوری حویلی میں چوکیدار نہیں گھومتے پھرتے۔''
''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ یقین کریں میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ ایک بار نہیں، کئی بار میں
نے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن چوکیداروں نے راستہ روک لیا۔ اُن کی موجودگی میں کیسے آتی؟''
''بابا، یہاں چوکیدار نہیں ہوتے۔''
''میں کہہ رہی ہوں، تھے۔''
''تعجب کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔''
''کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ میں نے پوری ہوش مندی سے اُنہیں دیکھا ہے۔ آپ کیا بات کر رہے ہیں؟''
''آپ کو میں کیسے جھٹلا سکتا ہوں؟ لیکن میں آپ کو صرف ایک بات بتا دوں، یہاں صرف گیٹ پر
ایک ہی چوکیدار ہوتا ہے۔''
''وہ دو تھے۔''
''اچھا آپ اُنہیں دوبارہ دیکھیں گی تو پہچان سکتی ہیں؟ ہو سکتا ہے حویلی کے دوسرے ملازم ہوں اور
وہاں کھڑے ہوئے ہوں۔''
''وہ مسلح تھے۔ میں نے اُن کے چہرے نہیں دیکھے، لیکن اُنہیں اچھی طرح دیکھا۔''
''مسلح تھے؟ تعجب کی بات ہے۔ اچھا چھوڑیئے، آج آئیں گی؟''
''آپ دیکھئے، چوکیدار تو نہیں ہوں گے وہاں؟''
''میں دیکھ لوں گا۔ ایک چکر لگا لوں گا۔''
''ٹھیک ہے۔''
''اُسی جگہ؟''
''جی۔'' جمیلہ نے جواب دیا۔
''میں چلتا ہوں۔ بڑا خطرہ مول لے کر یہاں تک پہنچا تھا۔ لیکن کیا کرتا؟ آپ سے ملاقات کے لئے

دل مچل رہا تھا۔ اس کے لئے میں سخت پریشان تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اطمینان رکھیں، آج میں ضرور پہنچ جاؤں گی۔" راگنی نے جواب دیا۔

"چلتا ہوں...... دل تو چاہ رہا ہے کہ آپ کے پاس بہت دیر تک بیٹھ کر آپ سے باتیں کرتا کیا جائے؟ مجبوری ہے۔" یہ کہہ کر گلزیب تیزی سے باہر نکل گیا۔ راگنی اُس دروازے کو دیکھتی رہی جس سے گلزیب نکل کر گیا تھا۔ اس وقت اُس کا دل صرف ایک عورت کا دل تھا جو گلزیب کی محبت میں رہا تھا۔ آہ...... کتنا خوبصورت نوجوان ہے یہ...... آہ، کیا میں...... کیا میں واقعی اس کی زندگی میں سکتی ہوں؟ آہ، کیا...... کیا مجھے زندگی کی یہ خوشی مل سکتی ہے؟...... بہت سے سوالات، بہت سے اُس کے دل میں تھے اور وہ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اُس کے سارے بدن میں اینٹھن تھی۔ اور اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ، وہ نہ ہوتی جو ہے۔ ان کا چھوٹا سا گھر ہوتا، جو والی ایک حسین لڑکی تھی وہ جو اپنے ماں باپ سے پیار کرتی تھی، جو اپنی بہنوں سے پیار کرتی تھی زندگی کا سارا سکھ حاصل تھا۔ قصور میرا تو نہیں تھا۔ بابا سے جھگڑا ہوا تھا بس پاپی کا اور اُس نے مشکل میں ڈال دیا تھا۔

واقعی قصور ان میں سے کسی کا نہیں تھا۔ وہ تو بس وحشت اور درندگی کا شکار ہوئی تھیں۔ ایک درندگی کا شکار۔ لیکن پھر تقدیر نے اُنہیں نجانے کیسے کیسے راستوں پر لا ڈالا تھا۔ رسک لعل بیچارہ کا شکار ہوا تھا۔ حالانکہ یہ سچ ہے کہ راوت رائے اور لاکھن سنگھ کو وہ مزہ ملا تھا کہ اب اُن کا نام دنیا سے مٹ گیا تھا۔ لیکن ظالم اپنا کام کر کے چلا جاتا ہے اور اس کے اثرات نجانے کس کس کو ہیں۔ ہے بھگوان...... میں کیا کروں؟ بہت دیر بعد اُس نے سوچا اور اچانک اُس کے سارے گڑگڑاہٹ ہونے لگی۔ اُس نے بھگوان کا نام لیا تھا۔ بہت عرصے کے بعد لیا تھا۔ جبکہ شیطان سے کہا تھا کہ ایک ہی کام ہے اُس کا یہ کہ انسانوں کو بھگوان سے دُور کرے، اللہ سے دُور کرے کے نام کی پوجا کریں، اُسی کے کہے پر عمل کریں۔ اُس کا ایک ہی موقف تھا کہ انسانوں کو سکو رہنے دو۔ اتنا بہکاؤ انہیں کہ وہ انسانیت سے بہت پیچھے ہٹ جائیں۔ اور ان بہنوں نے شیطان قبول کئے تھے، پوری طرح سوچنے سمجھنے کے بعد، جاننے کے بعد۔ لیکن اس وقت اُس کے منہ کا نام نکل گیا تھا۔ یہ محبت کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اُسے احساس ہوا کہ محبت ایک بڑی طاقت ہے وہ انسان کو بری طرح بے بس کر دیتی ہے۔

آج رات میں اُس کے پاس ضرور جاؤں گی، جو کچھ بھی ہو، میں اُس کے پاس ضرور جاؤں اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ اشیش بھگونت نے مجھے اس گھر کو تباہ کرنے کے ہے۔ لیکن کیا میں اس گھر کو تباہ کر سکوں گی؟ اس گھر کو جس میں گلزیب رہتا ہے؟ اور وہ گلزیب صورت پر غور کرنے لگی۔ کتنا سندر، کتنا اچھا...... ہائے جلدی سے رات ہو جائے......!

کرنل ایاز نے مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا اور وہ ایمان علی اور انا زبیدہ کے پاس آتا رہتا تھا۔ اُس

کہ اُسے یقین ہے کہ یہی لوگ اُس کی مشکل کا حل بن سکیں گے۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ ویسے تو میں نے بہت سے لوگوں کو اپنی یہ مشکل سنائی اور اُن سے امداد چاہی۔ لیکن دل کسی جگہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوا تھا کہ یہ لوگ سچی معنوں میں میرے کام آ سکتے ہیں۔ لیکن جب سے میں نے یہاں آپ لوگوں سے رابطہ قائم کیا ہے نجانے کیوں مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ آپ لوگ ہی میری مشکل کا حل بن سکتے ہیں۔ آپ نے ابھی تک مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے آپ کا اپنا کوئی لالچ نمایاں ہو سکے۔ ایسی صورت میں سیدھی سیدھی سی بات ہے کہ اللہ نے آپ لوگوں کو میری مشکل کا حل بنایا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہر تعاون کے لئے تیار ہوں۔"

ایمان علی کہنے لگا۔ "ہم لوگ دپال پور جا رہے ہیں اور ہم نے یہ طے کیا ہے کہ دپال پور کی اس حویلی میں پہنچنے کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ ہم نے وہاں کیا کرنا ہے۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" کرنل ایاز نے کہا۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن آپ دیکھ لیجئے کہ آپ کے پاس وقت نکل سکے گا یا نہیں۔"

"وقت نکالنا پڑتا ہے جناب۔ اس کا کیا سوال ہے کہ وقت نکلے گا یا نہیں؟ میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا۔ اور ویسے بھی اگر آپ پہلی بار دپال پور جا رہے ہیں تو آپ کو وہاں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چونکہ یہ دن وہاں برف باری کے دن ہیں اور وہاں شدید برف باری ہوتی ہے۔ میں اس چھوٹی سی بلکہ ایک ایسی سرائے سے واقف ہوں جہاں ہمارے قیام کے لئے بہتر جگہ نکل سکے گی۔"

"ٹھیک ہے...... آپ چلنا چاہیں تو ضرور چلئے۔ ہمیں اس سلسلے میں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ بلکہ چاہے آپ کی رہنمائی بھی رہے گی۔"

ایمان علی نے انا زبیدہ اور رجنی کو تیار کیا۔ چوتھا آدمی اُن کے ساتھ کرنل ایاز تھا۔ کرنل ایاز نے اپنے ایک چھوٹے سے شکاری کتے کو ساتھ لے لیا تھا۔ یہ خاص نسل کا کتا تھا جس کا قد و قامت چھوٹا تھا لیکن شکار کے لئے وہ بہت ہوشیار رہتا تھا۔

"جانور بہت سی بلاؤں کو ٹالتے ہیں۔ اور یہ میرا وفادار کتا اس سے پہلے بھی دپال پور جا چکا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں غیاث احمد صاحب کو دو تین بار دپال پور سے لے کر آیا ہوں۔"

ان لوگوں نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

دپال پور جانے کے لئے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ ٹرین کے ذریعے دپال پور تک کا سفر کیا گیا تھا۔ جب یہ لوگ دپال پور کے اسٹیشن پر اُترے تو یہ ہل اسٹیشن کہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ پچھلے روز ہی برف باری ہوئی تھی اور ہر طرف سفیدی ہی سفیدی نظر آ رہی تھی۔ دیکھنے میں یہ جگہ بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔

کرنل ایاز کی رہنمائی اس وقت واقعی بہت اچھی ثابت ہوئی تھی۔ اسٹیشن کے باہر کسی سواری کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ برف کی سفیدی ایک عجیب ویران کن انداز میں چمک رہی تھی کہ عام لوگوں کے دل ہول سے دھڑک اُٹھتے۔ کرنل ایاز حالانکہ ایک بہادر آدمی تھا لیکن وہ اس ماحول سے بے حد متاثر نظر آ رہا تھا۔ البتہ اُس کے علاوہ جو تین افراد تھے وہ ذرا مختلف قسم کے لوگ تھے۔ سبھی کا واسطہ کہیں نہ

کہیں بھیانک ترین واقعات اور حالات سے پڑ چکا تھا۔ چنانچہ ان کا کسی ایسے ماحول سے خو
غیر فطری امر تھا۔ البتہ باہر کسی سواری کی ناموجودگی نے ایک لمحے کے لئے انہیں پریشان کر
اس وقت کرنل ایاز نے کہا۔

''وہ جو ایک روشنی نظر آ رہی ہے نا آپ کو، وہی وہ سرائے ہے جہاں ہمیں قیام کرنا ہے۔''

''آہا...... یہ تو زیادہ دُور نہیں ہے۔''

''بالکل......''

''وہاں تو ہم پیدل بھی جا سکتے ہیں۔''

''جی، پیدل ہی جانا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں کسی سواری کا کوئی وجود نہیں ہے۔
حالات کے تحت اُس سرائے کا انتخاب کیا ہے۔ دپال پور میں عام طور سے برف باری ہوتی ر

وہ لوگ سرائے کی جانب چل پڑے۔ رات کے اس پہر سرائے بھی ویران پڑی تھی۔
جگہ ایک چراغ روشن کر دیا گیا تھا جو نجانے کس کو راستے دکھانے کے لئے تھا۔

سرائے کا دروازہ بجایا تو کچھ لمحوں کے بعد سرائے کے بوڑھے مالک نے دروازہ کھول
ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اُس نے لالٹین اُونچی کر کے ان لوگوں کو باری باری دیکھا اور پھر درواز
ہٹ گیا۔ اُنہیں حیرت نہیں ہوئی تھی کہ سرائے کے مالک نے اُن کی اس وقت کی آمد کو بر
نہیں دیکھا تھا۔ کرنل ایاز نے کہا۔

''یہ سرائے کے مالک بابا رفیق ہیں۔ بابا رفیق جانتے ہیں کہ موت اور گاہک کا کوئی
ہوتا، کسی وقت بھی آ سکتا یا آ سکتی ہے۔ چنانچہ یہ ہر لمحہ اس لئے تیار رہتے ہیں۔'' کرنل ایاز
قہقہہ لگایا۔ باقی کوئی اس قہقہے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ البتہ بابا رفیق نے پوچھا۔

''کتنے کمرے چاہئیں۔؟''

''دو عورتوں کے لئے اور دو مردوں کے لئے۔ سمجھے آپ؟'' کرنل ایاز نے کہا۔

''آؤ......'' بابا رفیق نے کہا۔ پھر اُس نے جو کمرے دکھائے وہ واقعی بہت اچھے کمر
کشادہ اور پُر آسائش۔ موسم میں بہت زیادہ سردی نہیں تھی۔ کیونکہ ہوا نہیں چل رہی تھی۔ بر
چلنے والی ہوائیں ہی اصل سردی کا سبب ہوتی ہیں اور ابھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ غالباً اس کی وجہ
جو اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ برف باری کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔

بابا رفیق نے اُنہیں بہترین کافی مہیا کی۔ یہاں ہر آرام کا بندوبست تھا۔

''حقیقت یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی سرائے ایسے موسم میں کسی فائیو اسٹار سے کم نہیں ہے۔
ذہین آدمی ہیں۔ انہوں نے شہریوں کی ضروریات کے لئے ہر وہ چیز رکھی ہوئی ہے جس کی
ہیں۔ اور سب سے بڑی بات ان کا باورچی ہے جو بہترین اور ہر طرز کے کھانے بنانا جانتا
''واقعی۔ بڑی اچھی جگہ ہے۔'' پھر اس کے بعد انا زبیدہ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس
میں سفر کرنے کے بعد خاصی ذہنی تھکن بھی ہو گئی ہے اور جسمانی بھی۔ کیوں نہ ہم لوگ صبح

نے ذہن کو ہر مشکل سے آزاد کر دیں؟ ویسے تمہارا یہ کتا کہاں رہے گا؟''
''میرے پاس۔ یہ کہیں اور نہیں رہ سکتا۔'' کرنل ایاز نے کہا اور وہ لوگ اپنے اپنے کمروں میں منتقل
ے۔

دوسرے دن گیارہ بجے وہ ایک بار پھر اکٹھے ہوئے تھے۔ ماحول میں اب بھی وہی گاڑھی کہر نظر آ رہی
اور اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ دن کے گیارہ بج رہے ہیں یا رات کے؟ البتہ بابا رفیق نے تھوڑی دیر کے
پوچھا۔ ''ناشتے میں کیا لیں گے آپ لوگ؟ مجھے بتا دیں تا کہ میں تیار کرا دوں۔ باورچی بہت دیر سے
لوگوں کے لئے مستعد کھڑا ہے۔''

''بابا صاحب...... ناشتہ آپ کی مرضی کا۔'' کرنل ایاز نے کہا۔ بوڑھا یہ سن کر وہاں سے واپس چلا گیا
کرنل ایاز نے پھر کہا۔ ''اور اب آپ ایک عمدہ ناشتہ کریں گے۔''

''یہ آپ سے خاصا واقف معلوم ہوتا ہے کرنل۔'' ایمان علی نے کہا۔

''میں نے کہا نا، کئی بار میں اپنے والد صاحب کے سلسلے میں یہاں آ چکا ہوں۔ اور میرا قیام اسی
ئے میں ہوتا ہے۔ ویسے یہاں چھوٹے چھوٹے تین چار ہوٹل بھی ہیں جہاں اچھی آسائشوں کا
بست ہے۔ لیکن وہاں رش ہوتا ہے۔ عام طور سے لوگ اس چھوٹی سی سرائے میں رہنا پسند نہیں
تے۔ کیونکہ یہاں وہی آتے ہیں جن کی جیبیں بھری ہوئی ہوتی ہیں اور بھری جیبوں والوں کے نخرے
کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔''

ناشتہ واقعی بہت عمدہ تھا۔ کتے کے لئے بھی تیاریاں کی گئی تھیں اور وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ناشتے
کے بعد سب لوگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''تو پھر اب کیا خیال ہے...... اُس حویلی میں چلا جائے؟''

''ہاں...... میں ذرا بابا رفیق سے اس حویلی کے بارے میں تھوڑی سی معلومات حاصل کر لوں۔ اُنہیں
صورت حال معلوم ہے۔''

بوڑھا سرائے کا مالک آیا تو کرنل ایاز کے ذکر چھیڑنے سے پہلے ہی اُس نے کہا۔ ''سناؤ، تمہارے
کیا حال ہے؟ بہت عرصے سے اُنہوں نے آرا صفیہ کے جلوے نہیں دیکھے اور اپنے عشق کا اظہار
کیا۔ کیا حال ہے اُن کا؟''

''وہ ٹھیک ہے۔''

''میرا مطلب ہے کہ ان دنوں کہیں وہ آرا صفیہ سے ملنے تو نہیں آئے؟'' بوڑھے کے الفاظ میں ہلکا
مزاح کا عنصر تھا لیکن کرنل نے اُس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور بولا۔
''نہیں...... وہ یہاں نہیں آئے۔ لیکن یہ بتاؤ حویلی کا کیا حال ہے؟''

''معمول کے مطابق۔ کیا تم وہاں جانا چاہتے ہو؟''

''ہاں......''

''ان لوگوں کے ساتھ؟''

''ہاں......''

''نہ جاؤ۔''

''کیوں......؟''

''تم نہیں جانتے، ابھی پچھلے دنوں ایک نیا واقعہ اور ہو چکا ہے وہاں۔''

''کیا؟''

''ایک شوقین آیا تھا۔''

''تو پھر؟''

''قیام کیا تھا اُس نے وہاں۔''

''کیا وہ اب بھی وہاں موجود ہے؟''

''کیسے موجود ہوتا؟ جانتے ہو اُس نے کیا، کیا؟ نجانے کس چکر میں آیا تھا۔ یہ صدیوں سے خالی پڑی ہوئی حویلی عام طور سے انسانوں کی زندگیوں کی بھینٹ لیتی رہتی ہے۔ یہاں ب پراسرار حالت میں مردہ پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو کوئی کسی تیز دھار آلے کی مدد سے قتل کرد پھر لاشوں کو اس طرح نوچتا ہے جیسے بلی، چوہے کو نوچتی اور بھنبھوڑتی ہے۔ اگر آپ لوگوں کو اور سے آپ کو اس بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ اس پراسرار حویلی کی خاندانوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک واقعہ ہوا ہے، وہ یہ تھا کہ ای کہیں باہر سے آیا ہوا تھا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر کے اس حویلی میں منتقل ہو گیا تھا۔ اُس اُس کے کئی ملازم بھی تھے، بیوی اور چار بچے بھی تھے۔ بہر حال ایک صبح کو اس حویلی میں ا چیخوں کی آوازیں سنائی دیں اور دن کی روشنی میں جب اندر دیکھا گیا تو عورت، چار بچے او وہاں گردنیں کٹے ہوئے پڑے تھے۔ البتہ وہ شخص وہاں موجود نہیں تھا جو اُن کا سربراہ تھا۔ ی واقعہ وہاں پیش آیا ہے۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ اُس حویلی میں داخل ہونے والے جنونیوں کو عقل آتی؟ زندگی اس طرح کھونے کی چیز تو نہیں ہے۔ بہر حال میں جانتا ہوں کہ تم جاؤ گے اور ضرو تمہاری مرضی ہے، میں کب کہتا ہوں کہ وہاں نہ جاؤ۔ میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ خالی ا مالک۔ کیا سمجھے؟''

بوڑھے بابا رفیق کی بات پر کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے یہاں تک کا سفر ا گیا تھا۔ انا زبیدہ نے کہا۔ ''بہر حال ہمیں وہاں جانا ہے۔ اس کے علاوہ اگر تم ایک بات پر غو دوبارہ تمہاری توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیا انا زبیدہ؟'' کرنل ایاز جواب ان سب سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا بولا۔

''یہ شخص جو اس سرائے کا مالک اور اس کا نام بابا رفیق ہے، کیا یہ ہمیں اس عمارت سے کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے؟''

کرنل ایاز نے حیران نگاہوں سے انا زبیدہ کو دیکھا اور کہا۔ ''آپ کے خیال میں کیا ی

کہ وہاں کوئی نہ جائے؟''

''نہیں...... میں نے صرف سطحی انداز میں یہ بات کہی ہے۔ تم لوگوں نے محسوس نہیں کیا؟''

''نہیں انا زبیدہ...... ایسی بات نہیں ہے۔ میں بھی کتنی ہی بار یہاں آیا ہوں اور اس شخص نے مجھے جانے سے روکا ہے۔ جب بھی میرے والد غیاث احمد صاحب اُس حویلی میں چلے جاتے ہیں اُن کے تعاقب میں وہاں جانا چاہتا ہوں تو یہ شخص یہی کہتا ہے کہ میں وہاں نہ جاؤں اور ان کی کا انتظار کروں۔ میں سمجھتا ہوں اس سلسلے میں یہ ہمیں مس گائیڈ کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ اصل میں حویلی کے متعلق بے شمار روایات ہیں۔ جیسا کہ ابھی اس نے بتایا کہ ایک اور خاندان یہاں اس طرح کا شکار ہوا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی اس کے بارے میں عجیب و غریب یاں مشہور ہوئیں جن میں ایک کہانی یہ بھی ہے کہ ایک شخص جس کا نام مکھی لعل تھا اور جو گندے علوم کرتا اس حویلی میں مقیم ہوا۔ پتہ نہیں اُس نے یہ حویلی خریدی تھی یا اسے کرائے پر حاصل کیا تھا یا ویسے ہی اس جا بیٹھا تھا؟ وہ اُس کے اندر ہی مر گیا۔ لیکن اُس کی رُوح آج تک وہاں موجود ہے۔ بے شمار ایسے ت ہیں۔''

''کیا آپ نے یہ حویلی اندر سے دیکھی ہے کرنل ایاز؟''

''تین بار۔ آپ اسے دیکھیں تو آپ کو ایک عجیب و غریب احساس ہوگا۔ یہ صدیوں پرانا طرزِ تعمیر کا ہے اور اس کا وسیع و عریض باغ بالکل اُجڑا ہوا ہے۔ بڑے بڑے کمروں کی دیواریں گرد و غبار سے ائی ہیں۔ جگہ جگہ مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تنے ہوئے ہیں۔ بے شمار چمگادڑیں اس کے رے برآمدوں میں اور لمبی راہداریوں میں لٹکی رہتی ہیں۔ لوہے اور لکڑی کے بنے ہوئے بلند زے اور کھڑکیاں، ان پر لٹکے ہوئے بھاری پردے سب کے سب بری طرح بوسیدہ ہیں۔ چپے چپے پر گھاس اور خاردار جھاڑیاں ہیں۔ اور آہستہ آہستہ یہ عمارت اس ویران اور ہولناک سناٹے کے اندر ہو گئی ہے اور صدیوں سے اس کی یہی کیفیت ہے۔''

''واقعی...... تب تو یہ دیکھنے کی جگہ ہے۔'' ایمان علی نے کہا۔

بہر حال یہ لوگ تیاریاں کرنے لگے اور آخر کار انہوں نے اس عمارت میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ہی عجیب و غریب خوف اور وسوسے کا حامل تھا۔ چنانچہ اب وہ تمام تیاریاں کرتے ہوئے اُس ت کی جانب چل پڑے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اُس اُجڑے ہوئے عظیم الشان حویلی نما محل میں ہو گئے۔

جب وہ اس عمارت میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے انہیں اُس وسیع و عریض باغ کا سامنا کرنا پڑا حدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا اور یہاں سے اس عمارت کا عظیم الشان دروازہ دکھائی دیتا تھا۔ دیکھنے کے قابل ی۔ پرانے طرز کی برجیاں، کھڑکیاں، دیواریں۔ سب کے سب عجیب و غریب نگاہوں سے اس ا دیکھ رہے تھے اور ان کا خون سرد ہوا جا رہا تھا۔

اُن کی نگاہ ایک عظیم الشان مجسمے پر پڑی۔ یہ کسی نامعلوم دھات کا سیاہ رنگ کا ایک جانور تھا جس کی

شکل ڈائنو سار جیسی تھی، لیکن باقی جسم ذرا مختلف تھا۔ اُس کا منہ بڑے بھیانک انداز میں کھلا ہوا تھا
نوکیلے دانت جو خدا جانے کس چیز سے بنائے گئے تھے، صاف نظر آتے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں
رنگ کے چمکدار پتھر جڑے ہوئے تھے۔ رجنی اُسے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ باقی لوگ
نگاہیں بھی اُس کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ کرنل ایاز نے کہا۔

''یہ خوفناک مجسمہ ہی سب سے پہلے آنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ غالباً یہ خوف کا
ہے اور خوف کا یہ مجسمہ یہاں قدم رکھنے والے کو پہلے ہی مرحلے پر دہشت زدہ کر دیتا ہے اور وہ یہاں
واپس بھاگ جاتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ کرے تو پھر دوسرے واقعات شروع ہو جاتے ہیں۔''

رجنی کو نجانے کیا سوجھی وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی، اُس نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے گرد جھاڑ
اتے ہوئے اس مجسمے کے جسم کو صاف کیا اور بہت دیر تک اُس میں کھوئی رہی۔ یہ ہولناک مجسمہ
شیطان کا مجسمہ لگ رہا تھا۔ اُس کا واسطہ تو براہِ راست شیطان سے رہ چکا تھا۔ نجانے کیا کچھ اُس کے
میں آ رہا تھا اور وہ ایک عجیب سی بے خودی کا شکار ہو گئی تھی۔ ایمان علی اور کرنل ایاز دوسرے معاملات کا
جائزہ لے رہے تھے لیکن انا زبیدہ کی پُراسرار نگاہیں خاص طور سے رجنی میں کھوئی ہوئی تھیں۔ وہ
اندرونی کیفیات کو پڑھ رہی تھیں۔

تب یہ لوگ یہاں سے آگے بڑھے اور پرانی بوسیدہ اور پلستر اُکھڑی ہوئی دیواروں کے ساتھ
چلنے لگے۔ رجنی کی کیفیت بدستور سحر زدہ سی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی انتہائی خاص بات محسوس
ہو اور ان لوگوں سے ذہنی طور پر الگ ہو گئی ہو۔ بلاشبہ یہاں کا ماحول انتہائی خوفناک تھا۔ بڑی بڑی
چمگادڑیں لٹکی ہوئی نظر آ رہی تھیں جو تاریک زینوں اور اُونچی چھتوں کے اندر اُلٹی لٹکی ہوئی تھیں۔
کے ان مہیب اور بڑے بڑے جالوں کو دیکھ کر انسانی دل سخت خوف کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ
کبوتروں اور چڑیوں کے وہ بے شمار گھونسلے جو جا بجا بنے ہوئے تھے اُن کی نگاہوں کے سامنے تھے

وہ سب بہت سی ضروریات سے لیس ہو کر آئے تھے اس لئے جب وہ عمارت کے تاریک حصے
داخل ہونے تو انہوں نے خاص قسم کے الیکٹرک لیمپ روشن کر لئے جو کئی دن مسلسل جلنے کے
اپنی آب و تاب نہ کھونے والے تھے۔ اور یہ تمام انتظامات کرنل ایاز نے اپنے تجربے کی بنیاد پر
وہ اس جگہ سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ یہاں اُسے کیا کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں......!

❁❁❁

یہ ایک عجیب و غریب مہم تھی، اور اس مہم میں شریک افراد یعنی انا زبیدہ، کرنل ایاز، ایمان علی اور رجنی
سب الگ الگ کیفیتوں کا شکار تھے۔ اصل میں اس مکان کے بھیانک ماحول نے اُن لوگوں کو ذہنی طور پر
سحر زدہ کر دیا تھا۔ حالانکہ سب کے سب ذہنی طور پر بہت طاقتور لوگ تھے۔ انا زبیدہ تو تھی ہی ایک پُراسرار
عورت جس کے بارے میں کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا ہے؟ اس کے بعد رجنی آ جاتی تھی جو نجانے
کیسے کیسے خوفناک واقعات سے گزر چکی تھی۔ پھر ایمان علی جو ایک عالم تھا۔ ان لوگوں میں سب سے زیادہ
کمزور حیثیت کرنل ایاز کی ہی تھی، جو صرف یہ چاہتا تھا کہ اُس کا باپ اس سحر سے آزاد ہو جائے جس نے
اُسے ذہنی طور پر سخت پریشان کر دیا ہے اور ان کا سوشل اسٹیٹس بری طرح مجروح ہو چکا ہے۔

بہر حال یہ تمام باتیں تھیں جو لوگوں کے ذہن میں تھیں، لیکن رجنی خاص طور سے یہاں آنے کے بعد
اپنی کیفیت کو کچھ عجیب محسوس کر رہی تھی۔ کرنل ایاز نے کہا۔

''آپ لوگوں نے اس ماحول کو دیکھ لیا۔ اب آپ یہ بتایئے کہ آپ کو کیا کرنا ہے؟''

انا زبیدہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کرنل ایاز، کہ یہاں کسی تنہا گوشے میں رہ کر کچھ
پڑھوں۔ ایمان علی، تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''ظاہر ہے ہم شیطان کے خلاف وظیفہ کر کے ہی جیت سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں یہاں سے کچھ
معلومات حاصل ہو جائیں۔''

''اور رجنی تم؟''

رجنی نے چونک کر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔ ''میں بھی تنہائی چاہتی ہوں۔'' رجنی کو یوں
لگا جیسے یہ آواز اُس کی اپنی نہ ہو، کسی اور نے یہ الفاظ کہے ہوں۔ لیکن وہ اپنے جذبات کی ترجمانی بھی نہیں
کر سکتی تھی۔

کرنل ایاز نے کہا۔ ''بھئی میں بہت زیادہ دلیر آدمی نہیں ہوں۔ سرحد پر مقابلے کی فوجوں سے لڑنا اور
دشمن کو ہلاک کرنا میرے لئے بہت آسان ہے لیکن وہ دشمن جو نگاہوں کے سامنے ہی نہ ہو اُس سے لڑا جا
سکتا ہے اور نہ ہی......''

''تم اگر چاہو تو میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔'' ایمان علی نے کہا۔

''ہاں...... میں بھی آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ ظاہر ہے، میرا مسئلہ ہے۔''

''تو میں جاؤں؟'' رجنی نے سوال کیا۔ اُس کے دل و دماغ میں ایک عجیب سی ہلچل ہو رہی تھی۔ کسی
نے کوئی جواب نہیں دیا اور رجنی جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا

ہو رہا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے طور پر اپنے دل کو سمجھا بھی رہی تھی کہ جس مقصد کے لئے وہ یہاں آ
اسے پورا کرے۔ لیکن دوسری طرف نجانے اُس پر کیا کیفیتیں طاری ہوتی جا رہی تھیں۔
جس بڑے کمرے میں وہ پہنچی تھی وہ کافی وسیع و عریض تھا۔ لیکن اس میں ایک بستر بھی پڑا ہوا
ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں بھی۔ چنانچہ وہ وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ پھر اچانک ہی اُس نے کچھ
سنیں۔ نیم تاریک ماحول میں اُسے دو عجیب و غریب روشنیاں چمکتی نظر آئیں...... وہ اُن روشنیوں کو
لگی کہ یہ کیا ہیں؟ تب اُسے احساس ہوا کہ وہ روشنیاں نہیں بلکہ کسی بلی کی دو آنکھیں ہیں۔ بلی کا ر
سیاہ تھا اور وہ اپنی خوفناک آنکھوں سے رجنی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تو اسی طرح دیکھتی رہی، پھ
کے ساتھ ساتھ دُور تک چلی گئی۔
رجنی اُس کی حرکتوں کو دیکھ رہی تھی۔ بلی اپنے پنجوں سے جگہ جگہ سے دیوار کو کھرچ رہی تھی۔
وہ رُک کر دیوار کو گھورنے لگتی اور اُس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے کیا ہ
بلی کافی دیر تک اسی طرح دیوار کو کھرچتی اور بھاگتی دوڑتی رہی۔ اور اس کے بعد گردن جھکا کر ایک
کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ رجنی اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ک
ماحول روشن ہوتا جا رہا ہو۔ لیکن یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی؟ اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔
ایک بار پھر اُس کی نگاہ بلی کی جانب اُٹھ گئی جو چونک کر سیدھی ہو گئی تھی اور سامنے والی دیوار کو گ
تھی۔ پھر وہ کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس انداز میں آگے بڑھی جیسے اپنے شکار پ
ارادہ کر رہی ہو۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دیوار کے قریب پہنچ کر وہ اُسے سونگھنے اور پھر پنج
کھرچنے لگی۔ رجنی کی متجسس نگاہیں اُس پر جمی رہیں۔ بہرحال بہت دیر تک وہ اسی طرح کرتی ر
کے بعد پھر مطمئن سی ہو گئی۔
بہرحال رجنی کی اپنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ اُس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ب
نے نظر انداز کر دیا تھا۔
یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟...... اُس نے سوچا اور اُس کے ذہن میں ماضی کا ایک ایک خیال آنے
بہت عرصے کے بعد اُسے اپنی بہنیں یاد آئی تھیں۔ وہ اُن کے بارے میں سوچتی رہی لیکن اُس کے
اُن کے لئے محبت کے گداز کے علاوہ یہ احساس بھی اُبھرنے لگا کہ وہ غلط حرکات کا شکار ہو گئی ہیں
شک شیطان نے اُن پر غلبہ قائم کر لیا ہے، لیکن اُنہیں بالکل ہی دیوانہ نہیں ہو جانا چاہئے تھا۔ آہ
کوئی ایسا موقع مجھے مل جائے جس کے تحت میں ان لوگوں کو یہ سمجھا سکوں کہ شیطان کے اثر سے
سکتا ہے۔ ہم تو بڑے اچھے گھر کے بڑے اچھے لوگ تھے۔ زندگی کو بڑے پُرسکون انداز میں دیکھ
اسے آسانیوں کے ساتھ گزارتے تھے۔ لیکن پھر ایک شیطان نے ہماری دنیا اتھل پتھل کر دی اور
بعد ہم برائیوں کے ان راستوں پر نکل گئے جو انتہائی برے تھے۔ آہ، کیا کیا نہیں کیا ہم نے۔ غرض
تمام باتوں کے بارے میں سوچتی رہی، پھر اُس کی نگاہیں اُس طرف اُٹھ گئیں جہاں بلی موجود
اس وقت بلی وہاں نہیں تھی۔ رجنی کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ تب اُس نے ایک جھ

در روشندان میں بلی کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ پتہ نہیں یہ بلی کیا مصیبت ہے۔ اُس نے منہ سے چمکارنے
آوازیں نکالیں لیکن بلی اُس کی جانب متوجہ تک نہیں ہوئی۔
بہرحال نجانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔ بلی وہیں روشندان میں بیٹھ گئی تھی۔ اُس نے اپنی عادت
مطابق آنکھیں بند کر لی تھیں۔ رجنی بستر پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی جیسے بدن بے جان ہو گیا ہو۔ وہ
نا چاہتی تھی لیکن دل نہیں چاہ رہا تھا۔ نجانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر اچانک ہی اُس نے بلی کو
جو ایک دم سے چھلانگ مار کر دیوار کے پاس پہنچ گئی تھی اور اب اُس کے کھلے منہ سے غرغر کی آوازیں
برآمد ہونے لگی تھیں۔ بہرحال کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی تھی۔ رجنی کے بدن میں ایک لمحہ کے لئے
جھری چھوٹ گئی۔ مگر پھر اُس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ بلی پر نجانے کیا دیوانگی طاری ہو رہی تھی۔
سورج غروب ہو جانے کے بعد وہ پُرسکون ہو گئی اور پھر ایک طرف بیٹھ گئی۔ رجنی کا دل ان لوگوں کے
ں جانے کے لئے نہیں چاہ رہا تھا۔ نجانے کیوں اُسے اپنے اندر ایک عجیب سی ہلچل کا احساس ہو رہا تھا۔
اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ آگے بڑھی اور اُس نے لکڑی کا بھاری لیکن بے حد مضبوط دروازہ اندر سے بند
ر لیا۔ پھر کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے اور خود آرام دہ بستر پر لیٹ گئی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی
۔ یہاں تک کہ کسی جانور کے بولنے کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ عمارت کے قرب و جوار میں پھیلا ہوا
ویران اور پرندوں سے خالی پڑا تھا۔ البتہ آسمان پر بڑی بڑی چمگادڑیں ضرور اُڑ رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ
نیچے آ جاتیں، لیکن اُن کے پھیلے ہوئے مکروہ پروں سے کبھی کوئی آواز نہیں نکلتی تھی۔
رجنی کی نگاہوں کے عین سامنے شمال میں کھڑکی تھی جس کا پردہ اُس نے دانستہ نہیں کھینچا تھا تاکہ باہر
سے تازہ ہوا آتی رہے۔ سورج غروب ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی اور چاند غالباً رات کے پچھلے پہر صرف
تھوڑی دیر کے لئے نکلنے والا تھا۔ لیکن مغرب کی طرف آسمان پر چند رنگ برنگی قوسیں اور زاویے چمکتے
دکھائی دے رہے تھے۔ ان زاویوں کی شکلیں بدلتی رہیں۔ رجنی دیر تک یہ تماشہ دیکھتی رہی، پھر نجانے کب
نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔ لیکن پھر انوکھے اور انتہائی بھیانک خواب نے اُسے گھیر لیا۔ وہ خواب میں عجیب
و غریب دنیا دیکھ رہی تھی۔ نجانے کیا کیا چیزیں تھیں اُس کے قدموں تلے اور وہ فضا میں بلند ہوتی چلی جا
رہی تھی۔
اچانک ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کے سرہانے جلتے ہوئے تیل کے لیمپ کی روشنی مزید مدھم پڑ
گئی تھی اور باہر گھپ اندھیرا تھا۔ اُس نے اپنے دھڑکتے دل کی آواز خود سنی اور بدن کو پسینے میں تر بہ تر پایا۔
خدا کی پناہ...... کیسا عجیب و غریب اور ڈراؤنا خواب تھا...... رجنی نے ہاتھ بڑھا کر قریب ہی میز پر
سے پانی کا گلاس اُٹھانا چاہا، اسی اثناء میں اُس کی نگاہیں بلی کی جانب گئیں۔ اُس نے دیکھا کہ وہی کالی
بلی اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھی سامنے دیوار پر ٹکٹکی باندھے تک رہی ہے۔ اُس کے کان کھڑے تھے اور
آنکھیں دہکتے ہوئے سرخ کوئلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ بلی کی یہ کیفیت پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔
نجانے کیوں رجنی کے دل میں خوف کا احساس پیدا ہونے لگا۔ بلی رجنی کو بستر میں کت کرتے دیکھ چکی
تھی لیکن اُس نے ذرا بھی جنبش نہیں کی تھی اور یونہی بیٹھی دیوار پر گھورتی رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی چمک

دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ رجنی ایک لمحے تک سوچتی رہی۔ اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری
اچانک ہی اُس کے منہ سے آواز نکلی۔ ”میاؤں...... میاؤں......“

لیکن اس آواز پر بھی بلی نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی اور چھلانگ لگا کر بستر سے نیچے کود گئی
انتہائی احتیاط اور چالاکی کے ساتھ ایک ایک انچ دیوار کی جانب بڑھ رہی تھی۔ رجنی نے بھی دیوار کی
دیکھا لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن بلی کی حرکات اور اُس کا پُراسرار انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ
شے کو دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے عین نیچے پہنچ کر بلی نے منہ آگے کیا اور دیوار سونگھنے لگی۔ پھر وہ بار
اپنے دونوں پنجے دیوار پر رگڑنے لگی۔ دیوار پر اُس کے لمبے تیز ناخن رگڑنے کی آواز اس وقت یوں
دے رہی تھی جیسے کوئی بڑھئی لکڑی پر آرا چلا رہا ہو۔

دفعتہً ہی رجنی کا دل زور سے دھڑکا، جیسے سینے سے اُچھل کر باہر آ جائے گا۔ ہاتھ پیر سنسنانے
اُس پر غشی سی طاری ہونے لگی...... اُس نے وقت تک کچھ نہیں دیکھا تھا، البتہ ایک آواز ضرور سُنی
نے اُسے اس حالت کو پہنچا دیا۔ یا اللہ رحم...... یا اللہ رحم...... واقعی یہ آواز کیسی انوکھی آواز ہے۔ آواز
جیسے کوئی انتہائی بھیانک انداز میں باجا بجا رہا ہو۔ ایسا باجا جس کے سُر بے سُرے ہوں۔ ایک لمحے
آواز سنائی دیتی رہی۔ رجنی نے عجیب سی نگاہوں سے قریب رکھی ہوئی میز کی طرف دیکھا جہاں
ہوا تھا۔ اُس نے ایک گھونٹ میں پانی کا گلاس ختم کر کے میز پر رکھ دیا۔ اوسان کچھ بحال ہوئے
نے دوبارہ اس آواز کی طرف کان لگا دیئے۔ اور اب یہ آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔
بھیانک آواز تھی کہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

بلی خوفناک انداز میں دیوار کے پاس کھڑی ہوئی اس آواز کو سن رہی تھی۔ بہرحال نجانے کتنی
یہ کیفیت طاری رہی، اس کے بعد آواز بند ہو گئی۔ جیسے ہی آواز بند ہو گئی بلی کے اندر بھی سکون
گیا۔ اور پھر رجنی نے اُسے دیوار کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ بلی نے اُس کھڑکی پر چھلانگ لگا
پر وہ بیٹھی ہوئی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد غائب ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

بہرحال رات جس طرح گزری، دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کرنل
دروازے پر دستک دی۔ دروازہ چونکہ رجنی نے اندر سے بند کر لیا تھا اس لئے اُسے کھولنے کے لئے
جانا پڑا۔ کرنل ایاز نے اُسے دیکھا اور کہا۔

”آپ خیریت سے تو ہیں مس ستارہ......؟“

”جی سر۔“ رجنی نے جواب دیا۔

”میں آپ کی طرف سے بے حد خوفزدہ اور پریشان رہا۔“

”کیوں......؟“

”بس نجانے کیوں جب میں نے رات کو یہاں کا چکر لگایا تو آپ کے کمرے کا دروازہ بند
اندر سے کچھ عجیب و غریب آوازیں سنیں۔ یہ آوازیں میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھیں۔ آپ یوں سمجھ
میں بہت دیر تک آپ کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا رہا۔“

”کیا واقعی؟“

”ہاں......“

”کچھ عجیب و غریب واقعات پیش آئے ہیں یہاں۔“

”اوہو، کیا؟“ کرنل ایاز نے کہا اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”یہاں ایک کالے رنگ کی بلی نظر آئی تھی۔“

”تت...... تو پھر؟“ کرنل ایاز نے سوال کیا اور رجنی اُسے بلی کے بارے میں ساری تفصیلات بتانے
لگی۔ کرنل ایاز کے خوبصورت چہرے پر ایک لمحے کے لئے دہشت کی سفیدی طاری ہو گئی تھی۔ اُس کی
آنکھوں کا رنگ بدل گیا تھا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ اُس نے کہا۔

”لیکن یہ تو بالکل نئی بات ہے۔“

”ظاہر ہے، آپ اس بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔“

”آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں...... میں سخت حیران ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پُراسرار کہانی کا
انجام کیا ہو گا؟“

”آپ یہ بتایئے، اچھا نہیں، ٹھہریئے ذرا سارے کھڑکیاں اور دروازے کھول دیجئے۔ میں بلی کے
ناخنوں کے نشانات دیوار پر دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”آپ دیکھ لیجئے، جیسا آپ کہیں۔“ کرنل ایاز نے رجنی کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے بعد کمرے
میں اچھی خاصی روشنی ہو گئی۔ رجنی خود بھی اُٹھ کر دیوار کے پاس پہنچ گئی تھی اور دیوار پر بلی کے ناخنوں کے
نشانات صاف اور نمایاں نظر آنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ بلی مسلسل اس دیوار کو کھرچتی رہتی ہو۔

”اس دیوار کے دوسری طرف کیا ہے؟“

”کمرہ۔ آپ دیکھ سکتی ہیں۔“

”لیکن پھر بلی خالی اس دیوار کو کیوں کھرچتی ہے؟“

کرنل ایاز کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اُس نے کہا۔ ”آیئے...... ہمت کر کے دیکھتے ہیں۔“ وہ دونوں دیوار کو
ٹھونک بجا کر دیکھتے رہے، فرش پر زور زور سے پاؤں مارے، پھر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اُس نے
کہا۔ ”اچھا...... اب آپ ایک بات بتایئے، کہ کیا آپ یہاں خوف محسوس کر رہی ہیں؟“

”میں نہیں جانتی۔ اصل میں اس سلسلے میں زیادہ مناسب بات ایمان علی یا انا زبیدہ ہی بتا سکتی ہیں۔“

”وہ دونوں اپنا عمل کر رہے ہیں اور اُنہوں نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ اُنہیں بالکل پریشان نہ کیا
جائے۔ اگر ان کے ساتھ ایسا کیا گیا تو ان کا عمل اُلٹا بھی ہو سکتا ہے۔“

”ہاں...... اس قسم کے عملیات میں مداخلت غیر مناسب ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ صرف میں
اور آپ رہ گئے کرنل ایاز۔“

”ہاں......“

”کیا آپ خوف محسوس کر رہے ہیں؟“

''دیکھیے، خوف انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ میں پہلے بھی آپ سے کہہ چکا ہوں کہ سرحد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے رہنا یا دشمن پر وار کرنا ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن کچھ ہو رہا ہے اس سے ہماری واقفیت نہیں ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ سرحد کے دشمن سے لڑنا ہمارا کام اس طرح ایک پراسرار دشمن سے لڑنا آپ کا کام۔'' کرنل ایاز نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی
''ہوں...تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ ایسا کیجئے کہ آج میرے پاس آ جایئے۔ ہو سکتا ہے آپ کچھ سمجھ سکیں
''اگر آپ مجھے اجازت دیں۔''
''ہاں......میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔''

بہر حال، یہ دن گزر گیا۔ رجنی اور دوسرے لوگ طے کر چکے تھے کہ جب تک ساری صورت وضاحت نہیں ہو جاتی وہ لوگ یہاں قیام کریں گے۔ کرنل ایاز کھانے پینے کی چیزیں اپنے ہمراہ رجنی اور ایاز دونوں مل کر انا زبیدہ اور ایمان علی کے پاس پہنچے لیکن وہ اپنے عمل میں مست تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کھانے پینے کے لئے منع کر دیا۔ البتہ رجنی نے اُس کے ساتھ کھانا کھایا تو ایاز نے کہا۔

''رات کو آپ آرام کرنے کے لئے لیٹ جایئے، دروازہ کھلا چھوڑ دیجئے گا، میں آ جاؤں گا۔''

رجنی نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ لیکن رات کا ابتدائی پہر تھا اور کرنل ایاز ابھی تک نہیں رجنی اپنے بستر پر بیٹھی آرام کر رہی تھی کہ دفعتہً اُس کی نگاہ سامنے کی جانب اُٹھ گئی۔ وہ دیوار کھرچتی رہی تھی، اچانک ہی ایک عجیب سا رُخ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس کے بالکل درمیانی ایک چھوٹا سا دروازہ نمودار ہوتا جا رہا تھا...... آہستہ آہستہ اُس دروازے سے ایک سایہ برآمد ہوا۔ غریب ڈراؤنی اور بھیانک شکل تھی...... وہ ایک مرد تھا جس کے دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور ناخن لمبے لمبے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ اس انداز میں رجنی کی طرف دیکھ رہا کہہ رہا ہو کہ تو میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتی۔ پھر رجنی نے اُس کی پشت کی طرف دیکھا اور پورے وجود میں خوفناک لہریں اُٹھنے لگیں...... اُس کے عقب میں سرخ سرخ آنکھیں نظر آ رہی عجیب و غریب جانور تھے۔ نہ پرندے نہ چرندے۔ بس اُس کا قد و قامت بلی سے تھوڑا سا چھوٹا خوفناک انداز میں منہ کھولے آگے بڑھ رہے تھے...... اُن کے منہ گہرے سرخ تھے اور ان سے بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

دفعتہً ہی رجنی کی گھٹی گھٹی چیخ فضا میں اُبھری اور اسی وقت وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگی کیونکہ سے کرنل ایاز داخل ہوا تھا جس کے ہاتھ میں بڑی سی ٹارچ تھی اور وہ ٹارچ کی روشنی میں ادھر آیا۔ کی نگاہ ایک لمحے کے لئے اُدھر اُٹھی تھی۔ اور پھر دوسری طرف، لیکن اب دیوار سپاٹ اور ہموار تھی لگ رہا تھا جیسے وہ صرف ایک وہم، ایک خیال ہو جو اُس کے دل میں آیا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے اپنے سرہانے رکھا پانی کا گلاس اُٹھایا اور اپنے ہونٹوں تک لے آئی۔ کرنل ایاز آگے بڑھ آیا تھا۔
''کہئے......آپ نے کچھ دیکھا تو نہیں؟''

ابھی اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہی اُسی چوکور روشندان سے کالے رنگ کی بلی نیچے کودی اور کرنل ایاز کے گھٹنوں کو چھوتی ہوئی نیچے آ گئی...... کرنل ایاز کے منہ سے ایک دھاڑ سی نکلی تھی۔ بلی کے پنجے اُس کے گھٹنوں میں لگ گئے تھے۔ وہ درد کی شدت سے بلبلا رہا تھا۔ لیکن بلی اُس سے بے پرواہ نیچے اُتری اور سامنے والی دیوار کو گھورنے لگی۔ کرنل ایاز نے بڑی مشکل سے ٹارچ کی روشنی میں لیمپ کی بتی اُونچی کی اور کمرے میں اچھی خاصی روشنی پھیل گئی۔ لیکن آہ......اب اس کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔
بلی نے ایک چھلانگ لگائی اور دیوانہ وار تسماں دیوار کو سونگھتی ہوئی، میاؤں میاؤں کی آوازوں سے کمرے کو لرزاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اُس کے جنون میں ہر لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر وہ بند دروازے کی طرف گئی اور اُسے پنجوں سے کھرچنے لگی۔ لکڑی پر تیز پنجوں کے رگڑنے کی آوازیں اعصاب شکن ماحول میں عجیب لگ رہی تھیں۔ کرنل ایاز کا سانس بھی بند تھا۔ وہ واقعی انتہائی خوفزدہ ہو گیا تھا۔
تھوڑی دیر تک تو یہ کیفیت طاری رہی، اس کے بعد وہ اپنے بستر سے اُٹھا، اُس نے لیمپ ہاتھ میں لیا اور اُس دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دیوار کو ایک ہاتھ سے ٹٹول رہا تھا۔ اچانک ہی کھٹکے کی ایک آواز ہوئی اور دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھل گیا۔ لیکن دروازہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ آسانی سے اندر داخل ہو جاتے۔ البتہ وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کرنل ایاز کچھ کرے، بلی جھپٹی اور برق رفتاری کے ساتھ اُس دروازے سے غڑاپ سے اندر داخل ہو گئی۔ ستارہ بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر کرنل ایاز کے پاس پہنچ گئی تھی۔ کرنل ایاز لیمپ کی روشنی میں اُس دروازے کو دیکھ رہا تھا جو ابھی نمودار ہوا تھا۔ اُسے دوسری جانب سیڑھیاں نظر آئی تھیں۔ یہ سیڑھیاں نا قابل فہم تھیں۔ نجانے اُدھر کیا تھا۔ رجنی نے بلی کی کوششوں کو یاد کیا۔ بلی غالباً اس دروازے کے دوسری طرف جانا چاہتی تھی۔ لیکن کیوں؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔
بہت دیر تک رجنی اور کرنل ایاز ان سیڑھیوں کو دیکھتے رہے، پھر کرنل ایاز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''کیا کہتی ہیں مس ستارہ......کیا ہمیں نیچے اُترنا چاہیے؟''
''آپ دیکھ لیجئے۔ جیسا آپ پسند کریں۔''
''آیئے پھر چلتے ہیں۔ اللہ مالک ہے، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''
بلی ان سیڑھیوں کے دوسری جانب غائب ہو چکی تھی۔ اُنہیں نہیں معلوم تھا کہ اس طرف کیا ہے؟ کرنل ایاز نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا اور خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ''حالانکہ میں اس عمارت میں درجنوں بار آ چکا ہوں۔ آپ سمجھتی ہیں کہ اس کی صورت حال کیا ہے۔ لیکن یہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ میرے لئے نا قابل فہم ہے۔ یہ دروازہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''
وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ رجنی بھی اُس کے ساتھ جا رہی تھی۔ حالانکہ کرنل ایاز کا کہنا تھا کہ دیوار کے دوسری جانب بھی ایک کمرہ ہے۔ لیکن گہرائیوں میں اُنہیں جو کچھ نظر آ رہا تھا وہ انتہائی ہولناک تھا۔ یہ ایک مرگھٹ تھا جہاں جگہ جگہ جلی ہوئی چتاؤں کے کالے ڈھیر نظر آ رہے تھے...... بعض جگہ ان چتاؤں سے دُھواں بھی اُٹھ رہا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو خوفناک چیز تھی وہ انسانی آوازیں تھیں جو فضا سے آ رہی تھیں۔ قرب و جوار میں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن یہاں آس پاس ایک انتہائی ڈراؤنا

شور بلند ہو رہا تھا جیسے ہزاروں بدرُوحیں آپس میں سرگوشیاں کر رہی ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا
ایاز کے دل و دماغ پر خوف طاری تھا۔ ستارہ بھی اس کیفیت سے الگ نہیں تھی۔

کافی دیر تک وہ اپنی جگہ کھڑے ان آوازوں کو سنتے رہے اور آہستہ آہستہ ان آوازوں کا راز
میں آنے لگا۔ یہ شور ان بے جان شاخوں اور مُردہ ٹہنیوں کا تھا جو ہوا کے زور سے ہل کر آپس می
رہی تھیں۔ کچھ دیر یہاں کھڑے رہنے کے بعد اُن کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں اور وہ آہستہ
قدم آگے بڑھے۔ سامنے ہی ایک دیوار نظر آ رہی تھی۔ یہ مرگھٹ اور اس میں جلتے ہوئے مردے
کس کیفیت کا مظہر تھے؟ لیکن یہ جگہ بڑی اجنبی اجنبی سی نظر آ رہی تھی۔ دُور دُور تک اُس بلی کا کو
تھا۔ ایک لمحے تک وہ سوچتے رہے، پھر رجنی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کرنل ایاز، واپس چلیں۔ اس جگہ کا مقصد ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے
یا ایمان علی صاحب اس سلسلے میں کچھ بتا دیں۔"

کرنل ایاز بھی غالباً دلیری کی انتہا کو پہنچنے کے بعد پسپا ہو گیا تھا۔ چنانچہ رجنی کے انہی الفاظ
اُس نے واپس آنے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شدید خوفزدہ ہے۔ اُ
دُھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑا ہوا تھا۔ رجنی اور وہ کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں پہنچ کے
نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے منہ سے مدھم مدھم آوازیں نکل رہی تھ

"میرے خدا...... میرے خدا......"

رجنی بھی خاموشی سے بستر پر بیٹھی سامنے والی دیوار کو گھور رہی تھی جس کا دروازہ اب بند ہو چکا
بہر حال اُنہیں یہ علم ہو چکا تھا کہ اس کے دوسری طرف دروازہ ہے اور نیچے جانے کا راستہ جو ایک
گھاٹ میں کھلتا ہے۔

بہت دیر تک دونوں پر یہی کیفیت طاری رہی۔ پھر رجنی نے کہا۔ "آپ کو تو اس علاقے
میں معلومات ہوں گی کرنل صاحب۔"

"کس علاقے کے بارے میں؟"

"میرا مطلب ہے اُسی مرگھٹ کے بارے میں۔"

"بالکل نہیں...... یہ میرے لئے نئی اور اجنبی جگہ تھی۔ ویسے آپ ایک بات بتا سکتی ہیں مس

"کیا......؟"

"یہ سب کیا ہے؟"

"شیطانی عمل۔"

"کیا ایسا ہوتا ہے؟"

"جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔"

"آپ یقین کیجئے، بہت عرصے تک تو میرے ذہن میں یہ خیال رہا کہ یہ صرف وہم ہے
اوقات تو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے والد صاحب قبلہ کوئی کھیل، کھیل ر

ری کہانی میرے لئے بے مقصد اور بے عمل تھی۔ لیکن آج میرے دل نے اس بات کا پوری طرح یقین
لیا کہ یہ ایک پراسرار دنیا کی پراسرار کہانیاں ہیں اور ان کہانیوں میں سچائی ہوتی ہے۔ یقیناً ان کہانیوں
سچائی ہوتی ہے۔"

"اگر آپ کو میں اپنے بارے میں بتاؤں کرنل صاحب، تو آپ حیران رہ جائیں۔"

"وقت کاٹنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا مس ستارہ۔"

"چھوڑیئے، آرام کیجئے۔ بلاوجہ ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"کیا آپ مجھے یہیں قیام کرنے کی اجازت نہیں دیں گی؟ آپ میرے لئے انتہائی قابل احترام ہیں۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔ مجھے اپنے آپ پر بھی اعتماد ہے اور آپ پر بھی کرنل صاحب۔ آپ ایک
ف آدمی ہیں۔"

"پتہ نہیں، میں سو سکوں گا یا نہیں؟ وہ دونوں عالم اپنی اپنی عبادت میں مصروف ہیں اور میں نے محسوس
ہے کہ یہاں وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بالکل الگ ہے۔ وہ ہم لوگوں کو اپنے قریب نہیں دیکھنا چاہتے۔"

"آپ ایسا کریں، بستر پر آ جایئے۔ میں نیچے سو جاتی ہوں۔"

"کسی بھی طور پر یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ آرام کریں۔" کرنل نے اپنے لئے ایک جگہ بنائی اور اس کے
آرام کرنے لیٹ گیا۔ اجنبی آنکھیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ بلی نجانے کہاں غائب ہو گئی تھی؟
نیچے گہرائیوں میں پتہ نہیں کیا کیا کچھ تھا؟

کرنل تو گہری نیند سو گیا لیکن رجنی جاگتی رہی۔ اور پھر رات کا نجانے کون سا حصہ تھا کہ کچھ عجیب و
ب آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ اور اسی وقت رجنی نے اُس بلی کو دیکھا جو جنون و اضطراب کے عالم
میں دیوار سے سر پھوڑ رہی تھی۔ مدھم آوازیں بلند ہوتی رہیں اور بہت دیر تک جاری رہیں۔ پھر اس
بعد آوازوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ بہت ہی پراسرار صورت حال تھی۔

صبح کرنل جاگا اور ناشتے وغیرہ کا بندوبست کرنے لگا۔ رجنی بھی ایمان علی اور اناز بیدہ کے پاس پہنچ گئی
ا۔ اُنہوں نے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور دائرے کی طرف اشارہ کیا جو اُنہوں نے بنا رکھا تھا۔ کرنل تو کچھ
ہ سکا لیکن رجنی سمجھ گئی کہ وہ اُنہیں دائرے میں آنے سے منع کر رہے ہیں۔ رجنی نے اشارے سے
نے وغیرہ کے بارے میں پوچھا تو اُنہوں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ گویا کھانا پینا بھی ترک
ہوا تھا اُنہوں نے۔ رجنی اُن دونوں کے بارے میں جانتی تھی کہ وہ جو عمل کر رہے ہیں وہ یقینی طور پر
اُمد ہو گا۔ لیکن بہر حال کرنل نے کہا۔

"کیا خیال ہے میڈم، اب ذرا دن کی روشنی میں ہم اُس مرگھٹ کا جائزہ لیں، آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔ یہ دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔" رجنی
کہا اور وہ اُس دروازے کے قریب پہنچ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔

دروازہ کھل گیا۔ دن کی روشنی میں بھی نیچے گہرائیاں تاریک اور سرد تھیں اور وہ راستے جن سے گزر کر
رگھٹ تک پہنچے تھے انتہائی خوف دلانے کا باعث بن رہے تھے۔ مرگھٹ جیسی جگہ کا اب وہاں کوئی

وجود نہیں تھا...... یہ دیکھ کر وہ شدید حیران رہ گئے۔ پہلے تو یہ جگہ بالکل کھلی ہوئی تھی۔ رجنی نے کہا
''ہم کسی غلط جگہ تو نہیں آ گئے کرنل؟''

کرنل کے حلق سے تو آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ رات کو اُنہوں نے جو چٹانیں اور جلی ہوئی ہڈیاں ڈھیر دیکھے تھے، اب ان کا وہاں نام و نشان نہیں تھا بلکہ ایک عجیب و غریب سی جگہ تھی جس کا ایک بڑے سے سلاخوں والے دروازے پر ہوتا تھا۔ زنگ آلود سلاخوں کا بنا ہوا دروازہ نجانے رات کس طرح نمودار ہو گیا تھا؟ لیکن بہرحال رجنی اور کرنل ایاز وہاں پہنچ گئے۔

کرنل نے بڑا زور لگا کر دروازہ کھولا اور پتھر کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے نیچے اُترتا چلا گیا۔ رجنی نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ جس جگہ وہ پہنچے وہ ایک بڑا سا ہال کمرہ تھا جس کے ایک گوشے میں صدیوں پرانا فرنیچر اور کپڑے ابھی تک بھرے ہوئے تھے۔ یہاں انتہائی ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ جونہی وہ داخل ہوئے چند چمگادڑیں پھڑ پھڑاتی ہوئی کسی گوشے سے نکلیں اور دروازے سے باہر نکل گئیں۔ پختہ زمین پر گرد وغبار کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس تہہ خانے کے شمالی حصے میں ایک اونچا چبوترہ دکھائی دے رہا تھا جس پر ایک بڑا پتھر کتبے کی طرح رکھا ہوا تھا۔

وہ لوگ اس عجیب و غریب علاقے کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ بڑا پتھر گرد آلود تھا۔ قریب گئے تو نجانے اس پر کیسی عجیب شکلیں اور حروف نظر آئے۔ کرنل نے دبی آواز میں کہا۔ ''آہ...... یہ شاید قربان گاہ ہے۔ دیکھئے خون کے بڑے بڑے دھبے ابھی تک موجود ہیں۔'' رجنی نے بھی جھک کر دیکھا۔ قربان گاہ کے سنگین چبوترے پر خون کے کالے کالے دھبے نظر آ رہے تھے۔

اچانک ہی کرنل نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے اس کے نیچے ایک چھوٹا تہہ خانہ اور بھی ہے۔ دیکھئے اس پر چلنے سے کیسی آواز نکلتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے نیچے بھی کچھ ہے۔''
''کیا ہو سکتا ہے......؟''

''یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔ غالباً لوگ اس جگہ کے بارے میں کہانیاں سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں ایک قبیلہ آباد تھا اور اس تہہ خانے میں وہ اپنے دیوتا پر انسانوں کی بھینٹ چڑھاتا تھا۔ اور پھر اس نچلے تہہ خانے میں لاشیں پھینک دیا کرتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ نیچے ابھی وہ لاشیں ہوں گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے لاکھوں کیڑے مکوڑے ان لاشوں کو چٹ کر گئے ہوں۔''

بڑی سنگین صورتحال تھی۔ اچانک ہی دونوں نے اپنے عقب میں بلی کی میاؤں، میاؤں سنی۔ پلٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''یہ کالی بلی یقینی طور پر اس عمارت کی والی رُوح ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟ میں نے تو یہی سنا ہے کہ سیاہ رنگ کی بلیوں کے بھیس میں ہوتی ہیں۔''
''اللہ جانے......''
''آیئے آگے بڑھیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں وہ دوسرا راستہ بھی نظر آ جائے۔''
تھوڑی دیر تک وہ لوگ سوچتے رہے۔ لیکن اچانک ہی کرنل کی نگاہ ایک طرف پڑی اور اس نے

وہ ''یہ کیا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اُس نے ایک کونے میں پڑی ہوئی وزنی سی سلاخ اُٹھالی۔ ''یہ سلاخ یقینی طور پر ہمارے لئے کارآمد ثابت ہو گی۔ میں اسے دیکھتا ہوں۔'' وہ اچانک ہی آگے بڑھا اور اُس نے لوہے کی یہ سلاخ قربان گاہ کے عظیم پتھر میں لگے ہوئے لوہے کے کڑے میں پھنسائی اور پوری قوت صرف کر دی۔ اور اس وقت دونوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُنہوں نے مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ پتھر کو اپنی جگہ سے سرکتے ہوئے دیکھا...... وہاں ایک تنگ سا راستہ نمودار ہو گیا۔

رجنی آگے بڑھی تو کرنل نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ایک منٹ...... ایک منٹ رُک جایئے۔ نجانے کتنی صدیوں کے بعد یہ تہہ خانہ کھلا ہے۔ ذرا گندی ہوا نکل جانے دیجئے، پھر اندر اُتریں گے۔'' کرنل نے اپنی ٹارچ کی روشنی اُس تنگ سرنگ نما راستے میں پھینکی اور پھر اچانک ہی کالی بلی نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اُس سرنگ میں غائب ہو گئی۔ کرنل اُس کے پیچھے پیچھے بڑھ گیا تھا اور رجنی سب سے پیچھے اُس تہہ خانے میں اُتری تھی۔ لیکن خدا کی پناہ، یہاں تو سرنگوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ کوئی نو دس فٹ گہری سرنگ تھی جس میں پہنچ کر وہ رُک گئے۔ اور پھر آگے بڑھنے لگے۔ آگے کا راستہ پتھروں سے بنا ہوا تھا اور دونوں طرف پختہ دیواریں تھیں۔

ابتداء میں تو بدبو کا شدید احساس رہا، لیکن کچھ لمحوں کے بعد ہوا کا ایک تازہ جھونکا اُن کے قریب سے گزر گیا۔ کرنل کی آواز اُبھری۔ ''ایسا لگتا ہے سرنگیں بنانے والوں نے تازہ ہوا کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔''

بہرحال کرنل کی ٹارچ کی روشنی میں دونوں آگے بڑھتے رہے۔ بلی ایک بار پھر غائب ہو گئی تھی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اُنہوں نے ایک ایسی چیز دیکھی جسے دیکھنے کے بعد اُن کے قدم آگے بڑھنے سے رُک گئے۔ یہ انسانی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا ایک عظیم الشان ڈھیر تھا اور کالی بلی اس عظیم الشان ڈھیر میں نجانے کیا کیا ڈھونڈ رہی تھی؟ اس طرح کے کئی ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ ان ہڈیوں کا فاسفورس اندھیرے میں خوب چمک رہا تھا اور یہ منظر ایسا لرزہ خیز اور دلدوز تھا کہ بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ ہڈیوں کی اِن کھوپڑیوں میں بعض کھوپڑیاں ایسی نظر آ رہی تھیں جن کی ساخت بن مانسوں کی کھوپڑیوں سے ملتی جلتی تھی۔ دوسرے جانوروں کی ہڈیاں بھی کثیر مقدار میں جمع تھیں۔ یہاں جو صورتحال تھی اس سے انتہائی خوف کا احساس ہوتا تھا۔

پھر اچانک ہی وہی بدنما جانور جن کی خوفناک آنکھیں دیکھی جا چکی تھیں ان ہڈیوں کے ڈھیر سے نمودار ہوئے...... اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ ان لوگوں پر حملہ کئے بغیر نہیں رہیں گے...... اُن کی آوازیں بے پناہ بھیانک تھیں...... دونوں کے حلق سے چیخیں نکلیں اور وہ اندھا دھند بھاگنے لگے۔ بلی بھی تیزی سے اُن دونوں کے پیچھے آ رہی تھی۔

ٹارچ چونکہ کرنل کے ہاتھ میں تھی اس لئے اُس کے چلے جانے سے سرنگ میں گھپ اندھیرا ہو گیا اور رجنی تنہا رہ گئی...... کرنل اتنی تیزی سے بھاگا تھا کہ اُس کا نام و نشان نہیں رہا تھا اور تنہائی میں رجنی چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھی۔ یہاں وہ اپنے آپ کو تنہا پا رہی تھی...... انسانی ہڈیوں کا ڈھیر، صدیوں پرانی سرنگیں، آدم خور جانور...... اور پھر اچانک ہی خون اُس کی رگوں میں جم گیا...... ہڈیوں کے اس ڈھیر کے

اردگرد، اُوپر نیچے اور دائیں بائیں وہی خوفناک جانور نظر آ رہے تھے۔ اُن کے سانس لینے کی آوا
رجنی کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔ وہ شاید وہی آدم خور جانور تھے جنہوں نے ہڈیوں کے ڈ
تھے۔ رجنی خوفزدہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پُراسرار جانور اُس کے چاروں طرف
تھے۔ اُن کی مکروہ کھالیں، رجنی کے بدن سے مس ہو رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اب چند لمحوں
اُسے چبا کر پھینک دیں گے۔

لیکن اچانک ہی اُس کے گرد دھوئیں کا ایک حصار سا قائم ہونے لگا...... ایک انوکھا حصار
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اُس دھوئیں میں لپٹ گئی تھی۔ اور پھر وہ پُراسرار جانور اُس دھوئیں
لگے۔ غالباً اُنہیں اپنا شکار چھن جانے پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ لیکن رجنی دھوئیں کے اس حصار
تھی۔ اچانک ہی اُسے کچھ عجیب وغریب آوازیں سنائی دیں...... اُسے یوں لگا جیسے کوئی ہنس رہا
ہنسنے والے کی آواز کافی دُور تھی...... آہستہ آہستہ اُس نے ایک روشن ہیولے کو اپنی طرف آتے ہ
اور پھر اُس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی گئی...... اُس کے منہ سے کچھ الفاظ نکلنے والے تھ
الفاظ رُک گئے...... وہ یہ نہیں کہنا چاہتی تھی جو کہہ کر شیطان کی عبادت کا احساس ہوتا تھا......!!

❁

راگنی پر بہت برا وقت گزر رہا تھا۔ اشیش بھگونت نے اُسے حکیم ارشاد کے گھر بھیجا اور حکی
کے گھر اُسے وہی ساری غلاظتیں پھیلانی تھیں جو یہ سب پھیلاتے چلے آئے تھے۔ صرف ر
کے جال سے نکل گئی تھی۔ باقی بہنیں ابھی تک بری طرح شیطان کے جال میں جکڑی ہوئی تھ
کی آسائشیں اُنہیں حاصل ہو گئی تھیں۔ لیکن اس طرح تو خود اُن کا دل کبھی سکون محسوس نہیں کرتا
راگنی کو یہاں جس کام کے لئے بھیجا گیا تھا وہ کام تو پس پشت رہ گیا تھا اور وہ گلزیب
گرفتار ہو گئی تھی۔ جب بھی اُس کی نگاہ گلزیب پر پڑتی وہ شدید پریشانی کا شکار ہو جاتی۔ کیا کر
نہ کروں...... ایک طرف اشیش بھگونت کے احکامات ہیں اور دوسری طرف گلزیب۔ ویسے اس
تک وہ اپنے لئے کوئی کام نہیں کر سکی تھی۔ کیونکہ وہ دیکھتی تھی کہ عجیب وغریب پہرے دار اُ
بکھرے ہوئے ہیں اور اُسے کچھ نہیں کرنے دیتے۔ مگر راگنی وہ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی جس کے
یہاں بھیجا گیا تھا۔ گلزیب سے اظہارِ عشق کرنے کی خواہش مند تھی وہ۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہی
اس سلسلے میں کیا کرے؟ اشیش بھگونت کی ناراضگی کا خوف بھی اُس کے دل میں رہتا تھا۔

ایک دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ گلزیب اُس طرف سے گزرا۔ راگنی نے اُ
جھلک دیکھ لی تھی۔ اُس کا دل چاہا کہ دوڑ کر گلزیب کے پاس پہنچ جائے۔ اُس سے اپنا حالِ دل کہ
لیکن اچانک ہی ایک عجیب بات ہوئی، بدبو کی ایک تیز لہر اُسے محسوس ہوئی اور وہ چونک کر چار
دیکھنے لگی۔ بڑی اذیت ناک اور مکروہ بدبو تھی...... مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں سے آ رہی
اُسے یوں لگا جیسے بدبو اُس کے ہاتھ سے اُٹھ رہی ہو...... اُس نے اپنا ہاتھ سونگھ کر دیکھا اور اُس
گیا۔ بدبو اُس کے ہاتھ سے ہی نہیں، اُس کے پورے بدن سے اُٹھ رہی تھی۔ وہ حیرانی سے

بو کہاں سے آ گئی؟
ہی وہ غسل خانے کی جانب بھاگی اور اُس نے اپنا لباس اُتار کر نہانا شروع کر دیا۔ بدن کو
اچانک طرح ملا لیکن کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ بدبو اُس کے بدن سے جیسے بہہ رہی تھی۔ ہے بھگوان...... کیا ہو
کیا ہو گیا...... بھگون...... بھگون...... بھگون......'' اُس نے تو بھگونت کہا تھا اور وہ بھی اشیش بھگونت۔
اشیش بھگونت کا سہارا لیا تھا بھگوان کا نام بھول گئی تھی۔ اس وقت پر بھگوان کیسے یاد آ گیا؟
وہ اپنے بدن کو ملتی رہی، لیکن بدبو تھی کہ دُور نہیں ہو رہی تھی۔ کیا کروں، کیا نہ کروں؟ اُس نے دل
سوچا اور ایک دم اُس کے کانوں میں ایک مدھم سی سرگوشی اُبھری۔
''یہاں سے سیدھی چلی جا...... آگے جو پرانی عمارت نظر آ رہی ہے، اُس پرانی عمارت کے دروازے
اندر داخل ہو جا۔ وہاں تجھے ایک حوض نظر آئے گا۔ اُس حوض میں جو پانی بھرا ہوا ہے اس سے نہانے
بدبو تیرے بدن کی یہ بدبو ہلکی ہو سکتی ہے۔''
راگنی نے اس طرح یہ الفاظ سنے جیسے کوئی اُس کی رہنمائی کر رہا ہو۔ لیکن پھر وہ ایک دم چونک پڑی۔
آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ اُس نے دل میں سوچا۔ بہرحال نجانے کیوں اُس کے دل نے یہ بات کہی
کچھ اُس سے کہا گیا ہے وہ اگر ہو جائے تو شاید بدبو سے اس کا جسم پاک ہو سکے۔ گلزیب کے سامنے
کا تصور بھی ذہن سے ہٹ گیا تھا۔ اس شکل میں اگر گلزیب کے سامنے جائے گی تو گلزیب اُسے کیا
ئی دے گا؟ وہ تو نفرت سے ناک سکوڑ کر رہ جائے گا۔ راگنی پریشان ہو گئی۔
آخر کار اُس نے لباس پہنا اور پھر پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ سیدھا راستہ طے کرتی ہوئی پرانی
ت میں داخل ہوئی۔ عمارت ویران پڑی ہوئی تھی اور یہاں ایک عجیب سی بدنما کیفیت نظر آ رہی تھی۔
اُسے عمارت میں حوض ضرور نظر آ گیا تھا۔ وہ جیسے ہی حوض کے کنارے پہنچی سامنے والا دروازہ ایک
آواز کے ساتھ بند ہو گیا اور رجنی چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس نے بند دروازے کو دیکھا۔ اُس
میں نہیں آ رہا تھا کہ دروازہ کس نے بند کیا ہے؟
پھر وہ کچھ لمحے اپنی جگہ خاموش کھڑی رہی اور اس کے بعد اُس نے پلٹ کر حوض کی طرف دیکھا۔
کے کناروں پر تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ سفید لباس میں ملبوس، لمبی لمبی سفید داڑھیاں، سر پر
باندھی ہوئی تھیں۔ اُن کے چہرے انتہائی پُر وقار تھے اور آنکھیں راگنی کی جانب۔ راگنی کا اوپر کا
اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا۔ وہ جیسے پتھرا گئی تھی اور اُس کی پھٹی پھٹی نگاہیں ان تینوں کے
پر جمی ہوئی تھیں۔ تب وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور اُن میں سے ایک نے کہا۔
''اُس حوض میں نہانا چاہتی ہے؟''
راگنی کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ ''ہاں......''
''کیوں......؟''
''میرے بدن سے سخت بدبو اُٹھ رہی ہے۔ اور یہ بدبو اچانک پیدا ہوئی ہے۔''
''نہیں...... یہ بدبو اچانک نہیں پیدا ہوئی۔''

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

”تو جھوٹ کہہ رہی ہے۔اور تو نہیں جانتی کہ یہ بدبو کیسی ہے؟“

”ہاں...... میں نہیں جانتی۔“

”یہ بدبو اچانک پیدا نہیں ہوئی ہے۔اتنا سارا پانی تو نے اپنے جسم پر بہالیا، کیا یہ بدبو دُور ہوا

”نہیں ہوئی۔“

”تو پھر، جانتی ہے کیسی بدبو ہے؟“

”نہیں“

”یہ تیری غلاظت ہے...... وہ شیطانی غلاظت جو تیرے سارے وجود پر چڑھی ہوئی ہے۔“

”اشیش بھگونتا کا نام ایسے نہ لو۔“

”یہی تجھے بتانا ہے اور فیصلہ کر دینے کے لئے تجھے چھوڑ دینا ہے۔سن...... شیطان نے تم پر

پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔صرف ایک ہے جو ایک مردِ مومن کی نگاہوں میں آئی تو اُس کی گندگی دُور ہو

”رجنی کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاں......“

”اشیش بھگونتا اُسے چھوڑے گا نہیں۔“

”تو کیا کہتی ہے، کیا تجھے یہ بات معلوم ہے کہ ہم تیری آمد کی وجہ جانتے ہیں؟“

راگنی ایک دم چونک پڑی۔وہ جو الفاظ کہہ گئی تھی اس سے اُس کی شخصیت کا پردہ چاک،

لیکن یہ پُراسرار لوگ...... اُس نے کہا۔”تم کون ہو......؟“

”ہم جو کوئی بھی ہیں تو یہ سمجھ لے کہ جس دن سے تو یہاں آئی ہے ہم تیری ہر کوشش ناکا

ہیں۔ایک بات بتا، اپنے جسم کی بدبو تو کیوں دُور کرنا چاہتی ہے؟“

”تمہیں کیوں بتاؤں میں؟“

”تجھے بتانا چاہئے...... کیونکہ یہیں سے تیری اصلاح کا آغاز ہو جاتا ہے۔“

راگنی کو یوں لگا جیسے اُس کی زبان اُس کے خلاف ہوتی جا رہی ہو۔اُس نے کہا۔”میں

محبت کرنے لگی ہوں۔“

”پاگل عورت...... جانتی ہے اسی محبت نے تیرے لئے زندگی کی ایک لچک پیدا کی ہے

محبت اللہ کا حق ہے...... محبت کے ذریعے اور محبت کی وجہ سے یہ کائنات قائم ہوئی ہے۔چنانچ

دل میں اُبھرتی ہیں وہاں نیک جذبے بھی اُبھرنے لگتے ہیں اور انسان پر برکتوں کا نزول ہو

چاہے وہ کسی بھی مذہب، کسی بھی ملت سے تعلق رکھتا ہو۔تو بے شک غلاظت کی پوٹ ہے،

لعنتیں پڑ چکی ہیں اور یہی لعنتیں بدبو بن کر تیرے بدن سے خارج ہو رہی ہیں۔جس محبت

لئے تو دوڑنا چاہتی تھی اس سے تجھے روکنے کے لئے تجھے احساس دلایا گیا کہ تو غلیظ ہے اور

سے اُٹھنے والی بدبو کسی کو بھی تجھ سے متنفر کر سکتی ہے۔اب بدبو کے ذریعے تجھے گلزیب تک

لیکن بدنصیب عورت، محبت کی جو کونپل تیرے سینے میں اُگی ہے اس نے آہستہ آہستہ تیرے وجود پر

ں ڈالنا شروع کر دی ہے اور شیطان مردود یقینی طور پر جب تیرے بارے میں یہ علم حاصل کرے گا تو

ن ہو جائے گا۔سمجھ رہی ہے نا؟ محبت کے راستے پر چل پڑنے کی وجہ سے تیرے گناہوں میں تھوڑی

آ گئی ہے۔اب غور سے سن، تو اپنے ماضی پر نگاہ دوڑا...... کیوں شیطان کے زیر اثر آئی تھی؟“

چانک ہی راگنی کے اندر ایک عجیب سی لہر پیدا ہوئی۔اُس نے سرد لہجے میں کہا۔”اگر تم یہ سوال کر

ہو تو کیا یہ نہیں جانتے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے؟ ہمارا باپ رسک لعل ایک شریف آدمی تھا۔کوئی

ہیں تھی اُس کے اندر۔صرف کچھ زمینوں پر قبضہ کرنے کے لئے ایک شیطان صفت نے ہمارے

ہلاک کر دیا اور ہمیں قید خانے میں قید کر دیا۔اس وقت کوئی نیک رُوح ہمارے پاس نہیں آئی اور

نے ہماری مدد نہیں کی۔یہ اشیش بھگونت ہی تھا جس نے ہمیں نیا جیون دیا۔اور اب تم اگر عقل رکھتے

ہو سوچو، کیا نیا جیون دینے والا ہمارے لئے باعث عزت نہیں ہو سکتا تھا؟ ہماری جگہ کوئی بھی ہوتا، تم

ؤ کیا وہ ایسا نہ کرتا؟ وہ ایسا ہی کرتا۔تم یقین کرو ہماری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ ایسا ہی کرتا۔“

”اور شاید صرف اتنی ہی وجہ ہے کہ تمہارے اوپر رعایت کے دروازے کھلے رکھے گئے ہیں۔ورنہ

مردود نے تو تمہیں کہیں کا نہیں رہنے دیا۔تمہارے ساتھ یہ رعایت اسی لئے برتی گئی ہے کہ تم ایک

کا شکار ہو کر گناہ کے راستوں پر نکلی ہو۔یعنی تمہاری زندگی وہاں مشکل ہو گئی تھی اور تم نے معصومیت

ھوں مجبور ہو کر شیطان کی قربت حاصل کی تھی۔دیکھو، تمہیں ایک بات بتائی جائے۔زندگی اور موت

ہوتی ہے اور جب موت آنی ہوتی ہے تو کوئی مرنے والے کو نہیں روک سکتا۔اور نہیں آنی ہوتی تو کوئی

سبب بن جاتا ہے۔تمہیں وہاں سے نکلنا تھا، زندہ سلامت نکلنا تھا۔لیکن تمہاری تقدیر میں خرابی تھی

یں شیطان کے ذریعے نکلنے کا راستہ ملا اور اس کے بعد شیطان نے تم سب بہنوں کو اپنے شکنجے میں

لیا اور ان راستوں پر چلا دیا جو شیطانیت کے راستے ہوتے ہیں۔بہرحال، ساری باتیں اپنی جگہ یہ

کچھ ہوتا رہا اور تم شیطان کے ہاتھوں کھیلتی رہیں۔پھر تقدیر نے تمہاری ایک بہن کو ایک ایسے گھر میں

یا جو اُس کی زندگی کے لئے نیکیوں کا گھر بن گیا۔اور تم بھی اسی طرح یہاں چلی آئیں۔یہ تمہاری

تی بھی تھی۔بہرصورت یہاں تم جو کچھ کر رہی تھیں وہ نہیں کر پائیں۔اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تم بہت ذہین

لاک ہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ تم بہت بیوقوف ہو۔حکیم ارشاد علی کہیں نہیں گئے۔وہ یہاں عبادتِ الٰہی

مروف ہیں اور ہم ان کے دست و بازو ہیں جو اس جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔تمہارے بدن کی یہ

یطانی عمل کی بدبو ہے۔اور اس سے تمہیں یہ بتایا گیا ہے کہ تم برائیوں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہو۔

ل اب تمہیں ایک راستہ دیا جاتا ہے۔اگر خود تمہارے دل میں یہ تحریک پیدا ہو کہ تم اپنی محبت کو آگے

ؤ اور اپنی منزل پا لو تو اس کا ایک ہی راستہ ہے۔نیکیوں اور سچائیوں کی راہ پر آ جاؤ اور اسلام قبول کر لو

طرح تمہاری بہن رجنی نے جواب ستارہ ہے، قبول کیا ہے۔بات سمجھ میں آ جائے تو ٹھیک ہے۔ورنہ

ی صورت میں تمہیں یہاں سے جانے کی بخوشی اجازت دے دی جائے گی۔اور تم جس مقصد کے

ئی ہو اس میں کامیابی کا تو یوں سمجھ لو تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔جاؤ، اب واپس جاؤ اور اپنی آرام گاہ

میں جا کر سوچو۔ شیطان مردود کو اس گھر میں ہمیشہ ناکامی ہوگی۔ جاؤ۔"

اور پھر راگنی کے قدم واپسی کے لئے اُٹھ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی آرام گاہ میں آ گئی۔ لیکن دل و دماغ کی جو کیفیت ہو رہی تھی وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ اُس کی حالت خراب تھی اور وہ ایک عجیب و غریب کیفیت کا شکار تھی۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ دوسرا دن پھر شام کو اُس کے دل میں ایک عجیب سی شمع روشن ہو گئی...... اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس شیطانی چھوڑ دے گی۔

پرانی حویلی کے راستے کھلے ہوئے تھے۔ اور اب وہ اندر داخل ہوئی تو وہاں کا حلیہ ہی بدلا ہوا ایک دم سے چند گھنٹوں کے اندر یہ تبدیلی رونما ہو جانا بڑا عجیب مسئلہ تھا۔ چاروں طرف پھول کھلے تھے اور خوشبوئیں چکراتی پھر رہی تھیں۔ ہر طرف مدھم مدھم روشنیوں کا راج تھا۔ اور پھر ایک انتہا قسم کے بزرگ نے راگنی کا استقبال کیا۔

"میرا نام حکیم ارشاد علی ہے...... جس ارادے سے تم آئی ہو وہ اتنا ہی خوشنما ہے، جتنے خوشنما آؤ...... اپنے اوپر سے صدیوں کی گندگی اُتار دو۔ آؤ، یہاں بیٹھ جاؤ۔"

نورانی صورت والے بزرگ نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا اور راگنی دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

"اب مجھے بتاؤ...... کیا فیصلہ کر کے آئی ہو؟"

"میں سچے دل سے مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ آپ کے اور اس عظیم مذہب کے زیرِ سایہ ہوں اور میرے دل میں خلوص اور سچائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی لالچ، کوئی فریب نہیں ہے گلزیب کی محبت مجھے اس راستے پر لائی ہے۔ لیکن اگر مجھ پر یہ شرط عائد کی جائے کہ مذہب کے لئے گلزیب کی محبت کو ترک کر دوں تو میں اس کے لئے خوشی سے تیار ہوں۔"

"جزاک اللہ......" حکیم ارشاد علی نے کہا اور پھر اُنہوں نے راگنی کو کلمہ پڑھایا اور اُس کا نام کیا۔ اس طرح راگنی مذہب کے نور سے ماہ نور ہو گئی اور اُس نے بھی رجنی کی طرح اپنے سہارے حاصل کر لئے......

حکیم ارشاد علی نے کہا۔ "اور اب وقت آ رہا ہے کہ شیطان کو ایک اور بدترین شکست سے پڑے جیسا کہ وہ ہوتا رہتا ہے۔ تم دو بہنیں مذہب کی تحویب میں آ گئی ہو۔ باقی رہ گئیں تین۔ تو کے لئے ایک عمل کرتا ہوں تا کہ ان تینوں کے دلوں میں بھی گداز پیدا ہو۔ ورنہ دوسری صورت اس بات کا اندازہ ہے کہ شیطان جب تک ان کے جسم کوڑھ سے داغدار نہیں کر دے گا، باز نہیں جاؤ، عیش و آرام سے رہو۔ گلزیب تمہارا مقدر ہے، یہ بات میں تم سے کہتا ہوں۔ تمہاری محبت جائے گی۔ تمہیں باقاعدہ مذہب کی تربیت دی جائے گی۔ جاؤ، اپنی آرام گاہ میں جاؤ۔"

اور راگنی نجانے کیسے کیسے خوبصورت بوجھ اُٹھائے ہوئے اپنی خواب گاہ کی جانب چل پڑی۔

۞ ۞ ۞

پرکاش آٹھ دس سیاحوں کے ہمراہ عظیم الشان مندر کے صدر دروازے میں داخل ہو گیا اور وہ لڑکی در سے باہر کچھ فاصلے پر اپنا چہرہ چھپائے، چپ چاپ کھڑی اُسے مندر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے بھی قدم آگے بڑھانے کا ارادہ کیا۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے اُس نے چوکنا نگاہوں سے آس پاس کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ ایک بار پھر اُس نے بار بار اپنے ماتھے پر سے رتی ہوئی ساڑھی کا پلو درست کیا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے سنہری بالوں کی کوئی ایک لٹ بھی باہر نکل آئے۔

سردی بہت زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنے کندھے سے لپٹی ہوئی گرم اُونی شال کے اندر اپنے دونوں ہاتھوں کو چھپا لیا۔ سورج اپنے دن بھر کی گرمی کو کھو کر اب آہستہ آہستہ اُونچی اُونچی پہاڑیوں کی جانب جھک رہا تھا۔ مگر پھر بھی لڑکی نے اپنی آنکھوں پر سے سیاہ سن گلاس ہٹانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ مندر کے اندر جانے کے لئے بے چین تھی۔ لیکن جلدی جلدی آگے بڑھنے کی بجائے وہ سنبھل سنبھل کر اور پھونک پھونک کر قدم اُٹھا رہی تھی۔

جب مندر کا پھاٹک صرف چار پانچ قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو اچانک وہ سہم کر رُک گئی۔ دراصل وہ اپنے سینڈل اُتارنا بھول گئی تھی۔ اُس کی نظر ایک کونے میں بیٹھے ہوئے جوتے سنبھالنے والے لڑکے پر پڑی جو اُس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ شرمندہ سی ہو کر نیچے دیکھنے لگی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ بار بار سینڈل اُتارنے کی بات کو یاد کرنے کے باوجود عین وقت پر وہ سینڈل اُتارنا بھول ہی گئی۔ اگر وہ بے خیالی میں دروازے کے اندر قدم رکھ دیتی تو پھر لڑکے نے اُس کی چوری پکڑ لی ہوتی۔ اُس نے لڑکے کی جانب سے منہ پھیر لیا اور جھک کر جلدی جلدی سے اپنے سینڈل اُتارنے لگی۔ اُس نے پیروں میں لمبے لمبے موزے پہن رکھے تھے اس لئے اُس کی گوری چمڑی نظر آ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کچھ اور لوگ بھی مندر کی جانب آتے دکھائی دے رہے تھے۔ اُس نے اپنے سینڈل لڑکے کے سامنے رکھے ہی تھے کہ دروازے کے اوپر لٹکا ہوا پیتل کا بڑا گھنٹا زور سے بج اُٹھا اور شام کے دُھندلے دُھندلے ماحول کے ساتھ ہی لیزا کا دل بھی کانپ گیا...... وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک جانب کھڑی ہو گئی۔

"بھگوان شنکر کی اس مورتی کا پہاڑ جیسا قد دیکھ کر بہت سارے لوگ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔" پرکاش اپنے ساتھ آئے ہوئے سیاحوں کو سمجھا رہا تھا۔ "آٹھ فٹ اُونچی اور سونے کی پتریوں میں لپٹی ہوئی اس مورتی پر نظر پڑتے ہی آپ لوگوں کی طرح ہر نیا آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ پشپتی ناتھ کے اس مندر میں سوائے ہندو کے کسی اور مذہب کے آدمی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی پشپتی ناتھ کے بھگوان کی مورتی

پر کسی غیر مذہب کے آدمی کی نگاہیں نہیں پڑ سکتیں۔ پہلے بہت سے غیر ملکی یہاں آتے تھے
دروازے کے باہر کھڑے رہ کر شنکر بھگوان کی مورتی کو دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن اصل مورتی
کی نظر نہ پڑنے پاتی۔ اس لئے اس قد آور مجسمے کو دروازے میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔'' بولتے بولتے
ایک پل کے لئے رُکا اور پھر مسکرا کر آگے بولا۔ ''اب تو دروازے پر کھڑے رہ کر اندر نظر ڈالنے
اس مجسمے کی پیٹھ ہی نظر آتی ہے۔'' یہ سن کر دو چار سیاح ہنس پڑے۔ لیکن چھپ کر کھڑی ہوئی لیزا
''فرض کر لیں کہ کوئی غیر مذہب کا آدمی اس حکم کی خلاف ورزی کر کے اس مندر میں داخل ہو
تو؟'' ایک سیاح نے پوچھا۔ ''کیا واقعی اس کی کوئی سزا ہوگی؟''

نوجوان ٹورسٹ کے اس سوال نے لیزا کو کپکپا دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ پرکاش کوئی جواب دیتا
دل چاہا کہ وہ بھاگ کر مندر سے باہر نکل جائے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے پرکاش اس سوال کے
میں یہی کہے گا کہ ''حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کو دھکے مار کر نہ صرف مندر سے بلکہ اس
باہر نکال دیا جائے گا اور ممکن ہے اُسے چند روز جیل کی سزا بھی کاٹنی پڑے۔''

لیکن پرکاش کو ایسا کوئی جواب دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ سنہری رنگ کے اس قد آور
پیٹھ پر بیٹھے ہوئے ایک شریر بندر نے اچانک ہی ایک ٹورسٹ پر چھلانگ لگائی تھی اور پلک جھپکتے
کے ہاتھ سے وہ تھیلا لے اُڑا تھا جس میں بھگوان شنکر کی پوجا کے لئے لائی ہوئی چیزیں تھیں۔ تھیلا
بندر چھلانگیں لگاتا ہوا برابر والے پیپل کے درخت کی ایک شاخ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ جس سیاح کے
بندر اُس کا تھیلا لے گیا تھا اُس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ حیرت سے بندر کو دیکھنے لگا
جبکہ آس پاس کھڑے ہوئے دوسرے سیاح بندر کی اس شرارت پر ہنسنے لگے۔ دُور کھڑی ہوئی لیزا
یہ منظر دیکھا تھا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک پائی تھی۔

''اے بندر......'' گردن اُونچی کر کے پرکاش نے درخت کی شاخ پر بیٹھے ہوئے بندر کو ڈانٹا۔
''یار یہ ہمارے مہمان ہیں، ہمارا ملک دیکھنے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ تمہیں ایسا سلوک نہیں کرنا چا
بندر نے بڑی توجہ سے پرکاش کی بات سنی، پھر اچانک کسی شریر بچے کی طرح اُن کی جانب
پھیر کر بیٹھ گیا اور تھیلے کو کھول کر اُس میں سے کھانے کی چیزیں نکالنے لگا۔

''مسٹر گائیڈ......'' سیاحوں میں سے ایک نے کہا۔ ''ہمیں اس مندر کے بارے میں کچھ بتائیں۔''
یہ سوال سن کر پرکاش کی آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی اور اُس کی آنکھوں کی یہ چمک کافی دُور
کے باوجود بھی لیزا کو صاف نظر آ رہی تھی۔ اپنے دھرم، اپنے دیش اور اپنے دیوی، دیوتاؤں کے
میں باتیں کرتے وقت پرکاش کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آنے لگی تھی۔

''یہ تو آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ مہادیو شنکر کا یہ مندر ہندوؤں کی ایک پاک عبادت گاہ ہے۔
اس شہر میں بدھ مذہب کے پیروکار بھی بہت بڑی تعداد میں رہتے ہیں اور یہ واحد جگہ ہے جہاں ان دو
دھرموں کے لوگ کسی بھید بھاؤ اور عداوت کے بغیر سکھ چین سے رہتے ہیں۔ آج سے تقریباً پچاس
قبل اس کے دروازے باہر کی دنیا کے لوگوں کے لئے بند تھے۔ لیکن ہندوستان کے ہندوؤں

ہاں ایک ہفتہ رہنے کی اجازت تھی۔'' بولتے بولتے پرکاش کی آواز کچھ دھیمی ہوگئی اور لیزا آگے کی بات
ن سکی۔ لیکن وہ پرکاش کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ سکتی تھی۔ پرکاش کا چھ فٹ لمبا قد اُس کی آنکھوں
ے سامنے تھا۔ پرکاش کچھ کہتے کہتے ہنس پڑا تھا اور لیزا کو اُس کے چمکتے ہوئے دانت صاف دکھائی دینے
لگے تھے۔ اچانک لیزا کو دو سال پہلے کی باتیں یاد آ گئیں۔

جب دو سال قبل پہلی بار یہاں آئی تھی تو اُس کے لئے گائیڈ کے فرائض پرکاش نے ہی انجام دیئے
ھے اور تب اُسے پرکاش کی ہر ہنسی بہت اچھی لگی تھی۔ لیزا کو اس شہر کا لباس بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ تنگ
کپڑے کا پاجامہ اور بٹن کی جگہ ڈوریوں سے بندھا ہوا کرتہ اور اس پر ہاف آستین کا کوٹ۔ لیکن اگر سردی
زیادہ ہو تو کرتے پر سوئٹر اور سر پر ٹوپی۔ اس پہلے سفر میں پرکاش پورے آٹھ روز تک اُن کے ساتھ رہا تھا
اسی دوران ایک دن لیزا نے اُس سے پوچھا تھا۔

''ایک گائیڈ کی حیثیت سے آپ کو روزانہ ہی طرح طرح کے غیر ملکیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن ان
کے ساتھ گھومنے پھرنے کے باوجود بھی آپ نے اپنا یہ لباس کیوں نہیں چھوڑا؟ کیا آپ کا جی انگریزی
لباس پہننے کو نہیں چاہا؟''

اُس کی بات سن کر پرکاش ہنس پڑا تھا۔ اُس کی یہ ہنسی اس وقت لیزا کو ایسی لگی تھی جیسے پہاڑ کے پیچھے
سے سورج نکل رہا ہو۔ لیزا کا خیال تھا کہ اُس کے سوال کے جواب میں پرکاش یہی کہے گا کہ ہمارا لباس
تو ہماری شان اور پہچان ہے۔ لیکن ایسے کسی جواب کے بغیر اُس نے تو مسکرا کر خود اُسی سے پوچھا تھا۔

''کیوں...... کیا اس لباس میں، میں بہت ہی برا لگتا ہوں؟''

''مسٹر پرکاش، آپ کی صورت شکل کس سے ملتی جلتی ہے، کیا آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں؟'' ایک دن
لیزا نے ہنستے ہوئے پرکاش سے پوچھا تھا جسے سن کر پرکاش نے چونک کر پوچھا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آپ کے ہندو دھرم میں دیوی دیوتاؤں کی تعداد کروڑوں تک ہے۔'' لیزا نے کہا۔
اس لئے میں جاننا چاہتی تھی کہ آپ کی شکل اُن میں سے کس کی طرح ہے؟''

''یہ درست ہے کہ ہندو دھرم میں دیوی دیوتاؤں کی تعداد تقریباً تینتیس کروڑ ہے۔'' پرکاش نے
جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''بہت سے غیر ملکی تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان کی دھرتی پر انسانوں سے دیوی
دیوتاؤں کی آبادی زیادہ ہے اور مکانوں کے مقابلے میں یہاں مندروں کی تعداد زیادہ ہے۔''

لیزا دو سال پہلے کی ان باتوں کو یاد کر کے دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ اور ٹھیک اسی وقت اُس کی
سماعت سے پرکاش کی آواز ٹکرائی جو اپنے ساتھ آئے ہوئے سیاحوں سے کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں ذرا جلدی
کرنی ہوگی۔ کیونکہ ''سندھیا آرتی'' کا وقت ہو گیا ہے۔ اور آرتی کے درشن کرنے سے پہلے ہمیں مندر کا
پچھلا حصہ دیکھ لینا چاہئے۔ پچھلی جانب ایک ندی بہتی ہے جس کا نام ''باغ متی'' ندی ہے۔ اُس کے
گھاٹ پر اگر ''اگنی سنسکار'' کو دیکھ لیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ دیکھنے والے کی عاقبت سنور جاتی ہے۔''
پرکاش اتنا کہہ کر آگے بڑھا۔ لیکن چار قدم آگے جا کر وہ اچانک ہی رُک گیا۔ اُس نے گردن موڑ کر پیچھے

کی جانب دیکھا تو لیزا یکایک سہم گئی۔ اُسے لگا کہ کہیں پرکاش کو اُس کی موجودگی کا علم نہ ہو گیا ہو
نہیں، پرکاش کی توجہ کہیں اور تھی۔ چند لمحوں تک اِدھر اُدھر نظر دوڑانے کے بعد پرکاش پھر اپنے
کے ساتھ چل پڑا۔ اونچائی پر جانے اور پھر نیچے جانے کے لئے زینے بنے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر
ان زینوں پر چڑھنے کے بعد لیزا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن پچھلے دو سال کا ایک منظر
آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

اُن دنوں مقابلہ حسن میں لیزا نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس مقابلے میں وہ دوسرے نمبر پر آئی تو
مقابلے کے بعد وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہندوستان کی سیر کو آئی تھی اور ایک ہوٹل کے منیجر نے ان
مختلف مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اُنہیں چاول سے کشید کی ہوئی خاص شراب پیش کی تھی اور
نوجوان کا تعارف کرواتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔ ''ان سے ملئے، یہ مسٹر پرکاش ہیں۔ اور یہ یہاں
لوگوں کے لئے گائیڈ کے فرائض انجام دیں گے۔''

اپنے مخصوص لباس میں ملبوس نوجوان پرکاش کو دیکھ کر تینوں سہیلیاں ایک دوسرے کی جانب دیکھ
تھیں۔ اور تب شوخ و چنچل اور بہت زیادہ باتونی ماریہ نے اُسے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے پوچھا
''مسٹر گائیڈ...... ابھی تو آپ خود ایک طالب علم جیسے لگتے ہیں۔ کیا آپ اس کام کی ابتداء ہم سے
چاہتے ہیں؟''

یہ سن کر ہوٹل کے منیجر نے پرکاش کی تعریف میں کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ پرکاش نے ہاتھ اُٹھا کر
روک دیا اور خود ہی ماریہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''مس ماریہ، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی
آدمی چاہے جتنا بھی پڑھ لکھ جائے لیکن اس کے باوجود زندگی بھر ایک طالب علم ہی رہتا ہے۔ کالج
لڑکوں کو پڑھاتے وقت میں پہلے یہی کہا کرتا ہوں کہ تم لوگوں کو پڑھاتے وقت میں خود بھی پڑھتا ہوں
لیزا اُس کے جواب سے متاثر ہوئی تھی۔ لیکن شریر ماریہ نے اپنی شرارت جاری رکھتے ہوئے کہا
''تو مسٹر گائیڈ، باتوں باتوں میں آپ نے ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ آپ کالج میں پروفیسر بھی ہیں۔''
''پروفیسر نہیں، میں تاریخ کا لیکچرار ہوں۔'' پرکاش نے مسکرا کر کہا تھا۔ ''اور دوپہر کے بعد سیاحوں
لئے گائیڈ کی خدمات انجام دیتا ہوں۔ تاکہ اپنے ملک کی ایک ایک جگہ کو خود بھی نزدیک سے دیکھ سکوں
''اس کام میں ملک کی ایک ایک جگہ کے علاوہ ہم جیسی خوبصورت اور دیکھنے کے لائق غیر ملکی لڑکیاں
بھی آپ نزدیک سے دیکھ سکتے ہیں۔'' ماریہ نے مسکراتے ہوئے پُرمذاق لہجے میں کہا۔ لیکن لیزا کو
یہ مذاق اچھا نہیں لگا تھا۔ اُس نے ماریہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔
''پلیز ماریہ...... دِس اِز ٹو مچ۔''
بس اُس روز سے ماریہ، پرکاش کے پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔ گھومتے پھرتے وقت وہ پرکاش کو چھیڑنے
کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ اکثر وہ اپنے لونگ بوٹ کے اندر سے ایک لمبا سا چاقو نکال
جوتوں کی ایڑی پر اس دھار کو رگڑ کر لیزا اور ٹینا کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح کہتی تھی کہ پرکاش
اُس کی بات سن لے۔ ''جب ہم اپنے ملک سے چلے تھے تو کئی لوگوں نے تاکید کرتے ہوئے

تنہا جا رہی ہو۔ لیکن ہر قدم پر سنبھل کر رہنا۔ کیونکہ گرم علاقوں کے لوگ گوری لڑکیوں کو دیکھ کر بھوکے
وں کی طرح غراتے ہیں۔ اسی لئے یہ چاقو میں اپنے ساتھ لیتی آئی ہوں۔ دوسرے ممالک میں تو ہمیں
ز عمر کے ہی گائیڈ ملے تھے، بے چارے وہ تو ہم سے دُور دُور ہی رہتے تھے اس لئے اس چاقو کو
تعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اب دیکھتے ہیں کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔'' لیکن پرکاش کو غصہ دلانے
اس کھیل میں ماریہ خود ہی دل ہی دل میں کھسیا کر رہ جاتی تھی۔
اور تب ہی ''ٹائیگر اسپاٹ'' کے دو دنوں کے ٹور میں اچانک ہی وہ حادثہ ہو گیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ربڑ کی
کشتی میں بیٹھ کر وہ چاروں ندی پار کر رہے تھے کہ اچانک ندی کے بیچوں بیچ ماریہ یکایک ہی کشتی سے
چھل پڑی۔ پہلے تو ان تینوں کو یہی لگا کہ اپنی عادت کے مطابق وہ کوئی شرارت کر رہی ہے۔ لیکن تیرنا
اننے کے باوجود جب وہ پانی میں غوطے کھا کر اُن کی کشتی سے دُور بہنے لگی تو پرکاش پانی میں کود پڑا۔ ماریہ
حالت اُس شیخی خور جیسی ہو گئی تھی جو اپنی موت کو سامنے دیکھ کر ہی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہو۔
کاش نے آگے بڑھ کر جب اُسے تھام لیا تو اُس نے گھبرا کر اپنے جسم کا سارا بوجھ اُس پر ڈال دیا۔
کاش تیرتے تیرتے بڑی ہوشیاری سے اُسے کھینچتا ہوا کشتی کے قریب لے آیا اور ٹینا اور لیزا کی مدد سے
سے کشتی پر سوار کر دیا۔ ماریہ کشتی پر پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ جبکہ پرکاش ایک جانب بیٹھا
ندی کے بہتے ہوئے پانی کو گھور رہا تھا۔ ماریہ چور نگاہوں سے اُس کے گیلے کپڑوں میں پھنسے ہوئے
ان جسم کو دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی دیر تک اُس کے مضبوط سے چپکی رہی
ی۔ لیکن پرکاش اُس کی جذباتی سوچ سے بالکل بے پرواہ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے اُس کی جانب دیکھے
یر صرف ایک بار ہی یہ کہا تھا۔
''اگر آدمی کو تیرنا آتا بھی ہو تو بھی اسے ہر اجنبی ندی اور دریا میں کودنے کی حماقت نہیں کرنی چاہئے۔''
پھر خیمے میں واپس آ جانے اور جسم کو گرمی پہنچانے کے لئے آگ کے الاؤ کے سامنے بیٹھ جانے کے
د بھی ماریہ کی نگاہیں پرکاش کے مضبوط جسم سے ہٹتی نہیں تھیں۔ ایک طرف حسن کے دریا میں طغیانی آئی
وئی تھی اور دوسری جانب سمندر کا سکوت تھا۔ اور پھر رات کو سونے سے پہلے ماریہ نے اپنی دونوں
ہیلیوں کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کہہ دیا۔
''آج میں اس مرد کے غرور کا بت توڑ کر رہوں گی۔''
اس کے بعد آدھی رات کے وقت سنسان جنگل میں چاند کی پہلی چاندنی میں ماریہ، پرکاش کے خیمے
یں داخل ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں اُس کی جوانی کے خمار سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اُس نے گہری نیند
وئے ہوئے پرکاش کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرا۔ پرکاش کا نیند میں بھی مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ
ر ماریہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ اُس کے چہرے پر جھکی، ویسے ہی پرکاش نے
چونک کر آنکھیں کھول دیں اور اپنے آپ پر ماریہ کو یوں جھکا ہوا دیکھ کر وہ بوکھلا کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور تب
ی ماریہ نے اُس کا ایک ہاتھ اس طرح پکڑ لیا جیسے اس میں اب صبر کی طاقت ہی نہ رہی ہو۔
''شام کو تم نے میری جان بچائی تھی اور میں اس کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئی تھی۔'' ماریہ نے بڑے

جذباتی لہجے میں کہا اور اپنے نائٹ گاؤن کے بٹن کھولنے لگی۔

یہ دیکھ کر پرکاش نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بستر سے اُٹھ کر سیدھا خیمے کی جانب بڑھا
لیکن ماریہ نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر تیزی سے اُس کا راستہ روک لیا۔ پرکاش حیرت سے اُس کی
دیکھتا ہوا وہیں کھڑا ہو گیا۔ ماریہ کو جب اُس کے چہرے پر کسی قسم کے کوئی تاثرات نظر نہیں آئے
نے الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"پرکاش......عورت کا جسم بڑے بڑے پہاڑ جیسے مرد کا راستہ بھی روک سکتا ہے۔"

مگر جواب میں پرکاش نے کچھ نہیں کہا۔ چند لمحوں تک وہ بھی خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتی
پھر آگے بولی۔ "شاید آج سے پہلے تم نے کبھی بھی کسی عورت کو بے لباس نہیں دیکھا ہوگا۔"

اب پرکاش کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ لیکن بولنے سے پہلے اُسے تھوک گلے میں اُتارنا پڑا
ہی روپ میں نے ایک عورت کا دیکھا ہے ماریہ......" اُس کی آواز بالکل سپاٹ تھی اور آنکھوں میں
اُداسی تھی۔

ماریہ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا اور وہ ذرا طنزیہ لہجے میں بولی۔ "شاید وہ عورت میری
حسین نہیں ہوگی۔"

"نہیں ماریہ......" پرکاش اُسی لہجے میں بولا۔ "وہ دنیا کی ساری حسین عورتوں سے زیادہ حسین تھی
یہ سن کر ماریہ کے انگ انگ میں غصے اور حسد کی لہر سی دوڑنے لگی اور وہ چنگھاڑتی ہوئی آواز
بولی۔ "کون تھی وہ حسین عورت؟"

"میری ماں......" پرکاش کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں نمی دکھائی دینے لگی۔ "میں صرف چار سال
اور میری ماں بستر مرگ پر تھی۔"

بس اسی ایک جملے نے ماریہ کے جسم کی ساری گرمی چوس لی۔ ایک لمحے کے لئے اُس کا جی چاہا
نفرت سے پرکاش کے منہ پر تھوک دے۔ لیکن پرکاش کے معصوم چہرے نے اُس کی نفرت کو بھی
دیا۔ اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو چمکنے لگے تھے۔ لیکن ان آنسوؤں پر پرکاش کی نظر نہ پڑنے پائے
لئے اُس نے فوراً ہی اپنا منہ پھیر لیا اور پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی خیمے سے باہر نکل گئی۔ پھر کافی
تک لیزا اپنے خیمے میں اُس کی سسکیوں کی آوازیں سنتی رہی تھی۔ اور اسی رات لیزا نے اپنے من مندر
پرکاش کی مورتی سجا لی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ دو سال بعد وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک
پالن پور کھنچی چلی آئی تھی۔

مندر کے دروازے پر لٹکے ہوئے گھنٹے کی آواز نے لیزا کو خیالوں سے چونکا دیا۔ مندر میں غیر
کے لوگوں کی آمد پر پابندی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنا چہرہ چھپا کر مندر کے اندر گھس آئی تھی۔
احساس ہوتے ہی وہ سنبھل گئی۔ آرتی کے درشن کے لئے آنے والے بہت سے لوگ اُس کے قریب
ہو کر گزر گئے تھے لیکن پھر بھی وہ کسی کی نظر میں نہیں آئی تھی۔ اس بات پر اُسے ذرا سی حیرت ہوئی
پھر اُس کی نگاہیں پرکاش کو تلاش کرنے لگیں۔

پرکاش یاتریوں کے ساتھ مندر کے پچھواڑے سے واپس آ رہا تھا۔ وہ سب سے آگے تھا اور اُن سے
کہہ رہا تھا۔ "دوستو......ذرا جلدی کرو۔ ورنہ اتنی بھیڑ ہو جائے گی کہ مہا دیوی کے درشن ٹھیک سے نہیں ہو
سکیں گے۔"

مہا دیوی کی مورتی کے چاروں طرف سات فٹ اُونچی دیواریں تھیں جن میں تین جانب سات فٹ
اونچے دروازے تھے اور ان کی تعداد تین تھی۔ اور چوتھی دیوار کے قریب دیوی جی کی مورتی تھی۔ لیزا نے
تھوڑی دیر بعد پرکاش کو آنکھیں بند کر کے ایک دروازے کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکتے ہوئے دیکھا۔ تینوں
دروازوں پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سنکھ بجنے لگے تھے، گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں اور اسی کے
ساتھ پجاری نے دیوی کی مورتی کے سامنے آرتی کی پوجا شروع کر دی تھی۔

لیزا اپنی جگہ کھڑی کھڑی یہ محسوس کر رہی تھی کہ کسی اور کی نظر اُس پر جمی ہوئی نہیں ہے تو وہ آہستہ آہستہ
بھی ایک دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔ تا کہ پوجا کا منظر قریب سے دیکھ سکے۔ لیکن اُس کے آگے
لوگوں کی بھیڑ اس قدر زیادہ تھی کہ اُسکی ہمت نہ ہوئی۔ اس لئے وہ ایک ستون کے پاس کھڑی ہو کر پرکاش
کو دیکھنے لگی جو دونوں ہاتھ جوڑے اپنی آنکھیں بند کئے دیوی کی بندگی میں کھویا ہوا تھا۔ لیکن اچانک وہ
اُس کی جانب دیکھتے ہوئے چونک پڑی۔

"یہ کیا...... پرکاش کی آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ رہے ہیں؟ کیا وہ اتنی گہرائی سے اپنے بھگوان کی
یاد میں ڈوبا ہوا ہے؟ یا یہ اس کے اندر کا کوئی درد ہے جو اس کی آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر لیزا آبدیدہ ہو گئی۔ اُس کا دل ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا۔
پل بھر کے لئے وہ اپنے آس پاس کے ماحول کو بھول گئی۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے اپنا سیاہ چشمہ اُتارا
اور اُسے ہاتھ میں لے کر بے اختیار آگے بڑھنے لگی۔ وہ پرکاش کے قریب جا کر اپنی ریشمی ساڑھی کے
دامن سے اُس کے آنسو پونچھ دینا چاہتی تھی۔ لیکن ابھی وہ دو قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ یکایک اُس کے منہ
سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ ایک بندر نے اُس کے ہاتھ میں دبے ہوئے چشمے پر چھلانگ لگائی تھی اور پلک
جھپکتے ہی اُس کا چشمہ لے اُڑا تھا۔ لیزا بندر کے اس اچانک حملے سے گھبرا گئی تھی اور اُس کے منہ سے چیخ
نکل گئی تھی۔

یکایک لیزا کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبا لیا تا کہ پھر ایسی
غلطی نہ ہو جائے۔ لوگ بڑے دھیان سے آرتی کی پوجا کر رہے تھے اس لئے کسی نے بھی اُس کی چیخ پر
کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اُسے یہ ضرور محسوس ہو گیا تھا کہ پرکاش نے اُس کی چیخ پر اپنی آنکھیں کھول کر
اُسے دیکھ لیا ہے۔ اس بات کا خیال آتے ہی وہ تیزی سے مڑی اور دروازے کی جانب دوڑ گئی۔

بے تحاشہ بھاگتی ہوئی لیزا نے اگر عین وقت پر اپنی ریشمی ساڑھی کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو وہ منہ کے بل
زمین پر گر پڑی ہوتی۔ مندر کے صدر دروازے تک آ جانے کے بعد بھی اُس نے اپنے سینڈل لینے کی
ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ اس گہرے ہوتے
ہوئے اندھیرے میں نجانے کب تک دوڑتی رہتی، لیکن دُور کھڑی ہوئی ہوٹل کی ایک مائیکرو بس ویگن پر

نظر پڑتے ہی اُس کے پیروں میں جیسے بریک سے لگ گئے اور وہ دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ
کر ایک دیوار کے سہارے کھڑی ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک وہ کھڑی ہانپتی رہی، پھر وہ یہ جاننے کے لئے بے
چین ہوگئی کہ اُس کے اس طرح دوڑنے بھاگنے کو کسی نے دیکھا تو نہیں ہے؟ لیکن اُس میں پلٹ
کر پیچھے کی جانب دیکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

چند لمحوں بعد اُسے پیچھے سے آتے ہوئے کسی کے قدموں کی آہٹ نے چونکا دیا۔ قدموں کی آہٹ لمحہ
بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھی اور اُس کے دل کی دھڑکنیں خوف سے بند ہونے لگیں۔ اُسے یوں لگا جیسے
آنے والا شخص ابھی پیچھے سے اُس کی گردن پکڑ لے گا اور جھٹکے دے کر اُسے مندر کے دروازے پر
لے جا کر بہت سارے لوگوں کے سامنے اُس کے جرم اور جرم کی سزا کا اعلان کرے گا۔ وہ لوگوں سے مخاطب
کرتے ہوئے کہے گا۔

"لوگو..... اس لڑکی نے ہمارے مندر کو ناپاک کیا ہے۔ اس لئے اسے کڑی سے کڑی سزا دی جائے۔"

لیکن قدموں کی آواز اُس کے بالکل نزدیک آکر تھم گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی لیزا کو یوں لگا جیسے اُس
کے دل کی تیز ہوتی ہوئی دھڑکن بھی ایک دم تھم جائے گی۔ سہمی ہوئی خاموشی کے چند لمحے اُس کے لئے
بھیانک سزا سے کم نہ تھے۔ یکایک اُس کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔ "لیزا....."

قدموں کی آہٹ سے تو وہ سمجھ گئی تھی، لیکن آواز سننے کے بعد تو اُسے پورا یقین ہوگیا تھا۔ اُس
نے دھیرے دھیرے اپنی گردن گھمائی اور پیچھے کھڑے ہوئے پرکاش پر نظر پڑتے ہی اُس کی نگاہیں
مجرم کی طرح جھک گئیں۔

"تم نے یہ کیا، کیا مس لیزا.....؟" پرکاش کے پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے دھیمی آواز نکلی۔ لیزا میں
تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ جواب میں آئی ایم سوری بھی کہہ سکتی۔

"جان بوجھ کر تم نے ایسا کیوں کیا لیزا؟" پرکاش کی آواز میں درد کی جھلک محسوس ہوئی تو لیزا کو
پلکیں اُٹھانی پڑیں۔ اُس نے تھوڑی دیر قبل جن آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے ان آنکھوں میں
اُسے ایک عجیب سا دردناک سناٹا نظر آرہا تھا۔ وہ اس درد کو سمجھ بھی نہ سکی۔ اُس کا تو خیال تھا کہ پرکاش
غصے سے کھول اُٹھے گا لیکن اُس کی خاموشی دیکھ کر اُس کا دل چاہا کہ وہ اُس سے پوچھے، کیا میرے مندر
کے داخل ہونے کی وجہ سے اُس کے بھگوان کی بے حرمتی ہوگئی ہے؟ مگر لیزا کو یہ سوال پوچھنا بیکار
لگا۔ کیونکہ اُس سے بھول تو ہو ہی گئی تھی۔ مندر کی بے حرمتی نہ بھی ہو تو بھی اُس نے پرکاش کا دل
ہی توڑا تھا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

"پرکاش، میں اپنے دل کو قابو میں نہیں رکھ سکی تھی۔ نجانے کون سی غیبی قوت تھی جو مجھے کھینچ رہی
تھی۔"

"میں جانتا ہوں....." پرکاش نے جلدی سے کہا۔ "آدمی کو جہاں جانے کے لئے منع کیا جائے
وہیں جانے کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ آخر وہاں ایسی کیا بات ہوگی؟"

"لیکن میرے وہاں جانے کی وجہ اس تجسس کے علاوہ بھی کچھ اور تھی۔" لیزا کا جی چاہا کہ

اپنی کیفیت سے بھی پرکاش کو آگاہ کردے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہتی، اُس کی نظر مندر سے باہر
نکلتے ہوئے سیاحوں پر پڑ گئی۔ اس لئے اُس نے فوراً ہی پرکاش کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو، وہ لوگ مندر سے باہر آرہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے....." پرکاش نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اسی جگہ میرا انتظار کرنا۔" اتنا کہہ کر
تیزی سے آگے بڑھا اور ان سیاحوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اُس نے جاتے ہی ان لوگوں کو اس طرح
باتوں میں اُلجھا لیا کہ وہ لیزا کی جانب توجہ ہی نہ دے سکے۔ پرکاش نے اُنہیں باتوں میں لگا کر بڑی
ہوشیاری سے ہوٹل کی ویگن میں بٹھا لیا۔ سارے سیاح ویگن میں سوار ہو چکے تھے اور اب صرف گوپال
ہی پرکاش کے ساتھ باہر کھڑا تھا۔ گوپال سنگھ، پرکاش کا دوست تھا اور آج کل وہ پرکاش کے ساتھ رہ کر
گائیڈ بننے کی ٹریننگ حاصل کررہا تھا۔

گوپال سنگھ کی تیز نظروں نے لیزا کو دیکھ لیا تھا۔ وہ موٹر سائیکل کی چابی، پرکاش کے ہاتھوں میں
تھماتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "میں سمجھ گیا پرکاش....." اتنا کہہ کر وہ تیزی سے مڑا اور ویگن میں سوار ہوگیا۔
اُس کے اندر آتے ہی ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کردیا۔ ویگن کی تیز لائٹیں روشن ہوگئیں اور وہ
اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ پرکاش نے پلٹ کر دیکھا، لیزا اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔

"ارے..... یہ کہاں غائب ہوگئی؟" وہ بڑبڑایا اور اپنی نگاہیں اِدھر اُدھر دوڑانے لگا۔ مندر کے صدر
دروازے پر اُس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ لیزا جوتے سنبھالنے والے لڑکے سے اپنے سینڈل لے کر وہیں
کھڑی ہوئی اُنہیں پہن رہی تھی۔ یہ دیکھ کر پرکاش نے سوچا، مندر میں داخل ہوتے وقت اس لڑکی نے
سینڈل اُتارنے والی بات تو یاد رکھی تھی۔ مگر یہ کیا، اس نے تو ساڑھی پہن رکھی ہے۔ اس کا مطلب تو یہی
تھا کہ لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر وہ مندر میں داخل ہونے کی پوری پوری تیاری کرکے یہاں آئی تھی۔

پرکاش کچھ دیر تک کھڑا چپ چاپ سوچتا رہا، پھر تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لیزا اُس کے
قریب آگئی۔ جب وہ اُس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی تو پرکاش کا دل چاہا کہ اُس سے پوچھ لے کہ مندر
میں داخل ہونے کی کیا وجہ تھی؟ لیکن کچھ سوچ کر اُس نے یہ پوچھنے کا ارادہ ترک کردیا اور بولا۔

"لیزا، یہاں آس پاس تو کوئی سواری نظر نہیں آتی۔ مگر تم اتنی دُور کیسے آگئیں؟"

"ہوٹل سے تو ٹیکسی میں آئی تھی۔" لیزا نے کہا۔ "لیکن مندر سے تھوڑے فاصلے پر ٹیکسی کا ٹائر پنکچر ہو
گیا اس لئے پیدل ہی چل کر آگئی۔"

"پیدل آکر اچھا کیا تھا۔ لیکن اب واپسی کیسے ہوگی؟" پرکاش نے پوچھا۔

"واپسی تو اب تمہارے ساتھ ہی ہوگی۔" لیزا نے کہنا چاہا تھا کہ اچانک ہی اُس کی نظر پرکاش کے
ہاتھ میں دبی ہوئی موٹر سائیکل کی چابی پر پڑی۔ اس لئے جواب اُسے سوجھ گیا۔

"کیوں..... موٹر سائیکل کی چابی تو ہے تمہارے پاس۔ میں بھی تمہارے پیچھے بیٹھ جاؤں گی۔"

پرکاش اُس کا جواب سن کر گھور گھور کر اُسے دیکھنے لگا۔ سنہرے بال، آسمانی آنکھیں اور گورے گالوں
میں مسکراتے وقت پڑنے والے چھوٹے چھوٹے گڑھے اور سرخ ہونٹوں پر کھیلنے والی مستقل مسکراہٹ.....

"کیوں...... میری اس تجویز سے اُلجھ گئے؟" لیزا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ساتھ سائیکل پر بیٹھے دیکھ کر کہیں کوئی یہ نہ سوچنے لگے کہ......" لیزا اتنا کہہ کر چپ ہوگئی اور پرکاش کو اس کسی کی کہی ہوئی چند سال پرانی ایک بات یاد آگئی۔ کسی نے اُس سے کہا تھا۔

"مجھے اگر اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے جاؤ گے تو کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ میں تمہاری کوئی ہوں۔"

ماضی کی اس بات نے جیسے اُسے اُس کی جگہ سے دھکا دے دیا ہو۔ اس طرح وہ اچانک موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ لیزا بھی اُس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ لیکن اُس نے پرکاش کے کاندھے پر اپنا ہاتھ نہیں رکھا۔ ہوٹل کے سفر کے دوران میں دونوں اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔ اور پھر ہوٹل کے صدر دروازے پر جا کر موٹر سائیکل رُک گئی۔ ہوٹل کے دروازے پر پرکاش کا دوست گوپال سنگھ کھڑا اُنہی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن کے قریب آگیا۔

"یہ میرا دوست ہے، گوپال سنگھ۔" پرکاش نے اُس کا تعارف کراتے ہوئے لیزا سے کہا۔

لیزا، گوپال سنگھ کو دیکھتی رہی۔ وہ تقریباً پرکاش کا ہم عمر ہی تھا۔ لیکن قد میں پرکاش سے ذرا چھوٹا اور جسم بھی بھرا ہوا تھا۔

"لیزا...... یہ گوپال سنگھ پچھلے سات سال سے باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو جوا کھلانے کی خدمت انجام دے رہا ہے۔" پرکاش نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر آج کل اس پر گائیڈ بننے کی دُھن سوار ہے۔ اس لئے دوپہر سے شام تک میرے ساتھ رہتا ہے۔"

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" لیزا نے گوپال سنگھ کو نیچے سے اُوپر تک دیکھا اور مسکرا کر آگے بڑھی۔ "رات کے وقت سیاحوں کو جوا کھلانا اور دن کے وقت انہیں مندروں میں لے جا کر دیوی دیوتاؤں کی زیارت کرانا؟"

یہ سن کر گوپال سنگھ کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر وہ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ کر پرکاش سے بولا۔ "آٹھ بج چکے ہیں اور میری نائٹ ڈیوٹی ہونے والی ہے۔ تم اپنا کام کر کے موٹر سائیکل اپنے گھر لے جاؤ۔" اتنا کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ اچانک رُک گیا اور لیزا سے بولا۔ "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ جب بھی آپ یہاں آئیں تو مجھ سے ضرور ملیں۔"

گوپال کے جانے کے بعد ان دونوں کے درمیان پھر خاموشی چھا گئی۔ یکایک لیزا کو کچھ یاد آگیا۔ وہ اس خاموشی کو توڑتے ہوئے بولی۔ "اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔" پرکاش نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔

"آرتی کے وقت میں نے دیکھا تھا کہ تم ایک ستون کے پاس آنکھیں بند کئے کھڑے تھے اور تمہاری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم کیوں رو رہے تھے؟"

لیزا کا سوال سن کر پرکاش چونک پڑا۔ اُس نے لیزا کے چہرے پر سے نظریں ہٹالیں۔ پھر موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا جیسے وہ اس سوال کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا ہو۔ لیکن لیزا نے موٹر سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"سچ بتاؤ نا...... تمہارے وہ آنسو کسی کی یاد کے آنسو تھے نا؟"

پرکاش نے چونک کر خود کو سنبھالتے ہوئے لیزا کی طرف دیکھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ غیر ملکی اُس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا چکی ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس سوال کا کیا جواب دے کہ لیزا نے ایک بار پھر وہی سوال دہرایا۔

"اگر کوئی حرج نہ ہو تو بتا دو پرکاش، کہ تم کسے یاد کر رہے تھے؟"

"آرتی کو۔" پرکاش اپنے ہی آپ بولا۔

"آرتی...... کون آرتی؟" لیزا چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"آرتی میری چھوٹی بہن ہے۔ آج سے چند سال قبل وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔" پرکاش خلاء میں دیکھتے ہوئے رُک رُک کر بولا۔

"چلی گئی ہے؟ مگر کہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" پرکاش دردناک لہجے میں بولا۔ "اور سب لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ مر چکی ہے۔ لیکن برس گزرنے کے باوجود اُس کی موت کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔"

"چھ سال ہوگئے؟" لیزا نے حیرت سے کہا۔ "اس وقت وہ کتنی بڑی ہوگی؟"

"اس وقت وہ آ کر تمہارے برابر کھڑی ہو جائے تو تم جتنی ہی لگے گی۔" پرکاش نے کہا۔

"تو وہ زندہ ہی ہے۔ اس بات کا تمہیں......"

"نہیں نہیں......" پرکاش نے فوراً ہی اُس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ "اس کی زندگی کا مجھے تو یقین ہے۔ لیکن دل یہ ماننے کے لئے تیار بھی نہیں ہے کہ وہ مر چکی ہے۔" پرکاش کی آواز کانپ رہی تھی۔ "جب آرتی غائب ہوئی تھی تو میرے فائنل امتحانات ہو رہے تھے اور میں دوسرے شہر میں تھا۔ اس لئے ایک ہفتے تک کسی نے اطلاع ہی نہیں دی۔ اور جب مجھے پتہ چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔"

لیزا نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر کہا۔ "لیکن یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ ابھی تک زندہ ہی ہوگی؟"

"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں لیزا جو سمجھائی نہیں جاسکتیں۔" پرکاش درد بھرے لہجے میں بولا۔ "اُن دنوں ہمارے پالن پور میں سے اکثر اس طرح لڑکیاں غائب ہو جاتی تھیں۔"

"او مائی گاڈ......" لیزا تھرا گئی۔ "تو تمہارے اس دیوتاؤں کے دیش میں درندے بھی بستے ہیں؟"

پرکاش اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ اُس نے موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے اسٹارٹ کر دی۔ اُس کا چہرہ یکایک ہی سرخ ہو گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ لیزا اُسے گڈ نائٹ کہتی، پرکاش نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی اور پھر چند ہی لمحوں میں موٹر سائیکل لیزا کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

ایک دو منزلہ مکان کے سامنے پرکاش نے موٹر سائیکل روک دی اور اُتر کر دروازے پر دستک دینے لگا۔ اُس کی پہلی ہی دستک پر اس طرح دروازہ کھل گیا جیسے اندر اُسی کا انتظار کیا جا رہا ہو۔ دروازہ کھلتے ہی ایک نرم آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"آگئے بڑے بھائی......" چھہتر سالہ رتن سنگھ نے اُس کی موٹر سائیکل کو تھامتے ہوئے کہا۔ "یہ تو

گوپال سنگھ کی پھٹ پھٹی لے آئے ہو تم۔"

پرکاش پچھلے ایک گھنٹے سے بے حد سنجیدہ تھا۔ لیکن رتن سنگھ کی بات سن کر وہ ہنس پڑا اور بولا
چاچا...... آپ ہٹ جائیں۔ میں موٹر سائیکل کو اندر لے جاتا ہوں۔"

لیکن رتن سنگھ نے اُس کا ہاتھ ہٹا دیا اور کہا۔ "مجھ سے اس طرح کی ہمدردی نہ کرو بڑے بھائی
ہو گیا ہوں تو کیا ہوا؟ ابھی میں اتنا کمزور اور بے کار بھی نہیں ہو گیا ہوں۔ تم کہو تو اس بائیک کو پیٹھ
ابھی بھی پہاڑوں پر چڑھ سکتا ہوں۔"

بوڑھے رتن سنگھ کی یہ بات سن کر اچانک پرکاش کو تین سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ تب
پرکاش چند سیاحوں کو لے کر سندر نگر گیا تھا اور اُنہوں نے وہاں اُس پہاڑی پر رتن سنگھ کو مزدوری
سے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ پہلے رتن سنگھ بے شمار سیاحوں کے قافلے کے ساتھ ان اونچے ٹیلوں پر جاتا
لیکن ایک بار ایک پہاڑی پر اُس کا اپنا پاؤں برف کی چٹانوں میں دب گیا تھا جس کی وجہ سے
داہنے پاؤں میں ذرا سی لنگڑاہٹ آ گئی تھی۔ اس لئے اب اُس نے اونچائی پر مزدوری کے لئے
دیا تھا اور نیچے ہی کام کاج کرنے لگا تھا۔ پرکاش سے اُس کی ملاقات سندر نگر کے نشیبی علاقوں میں
اور وہیں پرکاش نے اُس کی طاقت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ رتن سنگھ بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اُس کا
تندرست و توانا تھا۔ اپنے پاؤں کی مجبوری کی وجہ سے ہی اب اس بوڑھے پہاڑی کو زمین پر
خواہش ہونے لگی تھی۔ اور تب ہی پرکاش نے اُس سے کہا تھا۔

"تم میرے ساتھ پالن پور چلو رتن سنگھ۔ وہاں تم ہمارے گھر کو سنبھالنا اور اطمینان سے کھانا
رتن سنگھ کا دنیا میں شاید کوئی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی پرکاش کے ساتھ جانے کی اُس نے فوراً ہامی
بھری تھی۔ اُس نے پرکاش سے کہا تھا۔ "نہیں صاحب، مجھے اطمینان سے بیٹھ کر روٹیاں کھانے
مت کہنا۔" اُس کا لہجہ پتھر کی چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ "آپ مجھے ویسے ساتھ لے جانا چاہیں
ضرور لے جائیں، مگر کبھی بھی میرے بڑھاپے پر رحم کھانے کی کوشش نہیں کیجئے گا۔" اور پھر ان
میں رتن سنگھ پرکاش کے گھر کا ہی فرد بن کر رہ گیا تھا۔

ہاتھ منہ دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد پرکاش جب برآمدے میں آیا تو اس
بوڑھے رتن سنگھ نے اُس کا کھانا دسترخوان پر لگا دیا تھا۔ وہ چونکہ نچلی ذات کا تھا اس لئے اُسے
کے باورچی خانے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن رات کو پرکاش اکثر دیر سے گھر آتا تھا
اُس کی سوتیلی ماں اُس کا کھانا باہر برآمدے میں ڈھانک کر رکھ دیتی تھی اور رتن سنگھ ہی کھانا
پرکاش کو کھلاتا تھا۔

"رتن چاچا...... تم ہمیشہ مجھے کھلانے کے بعد خود کھاتے ہو؟" پرکاش نے روٹی توڑتے ہوئے
"تمہارا دستور میری سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن اب اگر تم یہ عادت چھوڑ دو تو بہت ہی اچھا ہو گا۔"

"تھوڑے دنوں بعد چھوڑ دوں گا۔" بوڑھے رتن سنگھ نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور پرکاش
چونک پڑا کہ اُس کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید رتن سنگھ کو اُس کی

گئی ہے۔ لیکن رتن سنگھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اُسے اور زیادہ حیرت ہوئی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں رتن چاچا۔" پرکاش نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ لیکن پھر بھی بوڑھے کی
مسکراہٹ جوں کی توں اُس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔

"تو میں کب مذاق کر رہا ہوں پرکاش؟" بوڑھا رتن سنگھ سالن کا پیالہ اُٹھاتے ہوئے بولا۔ "تم کھانا
کھا کر اوپر جاؤ گے تو تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔"

"اوپر......؟" پرکاش نے چونک کر پوچھا۔ "بھلا اوپر ایسی کیا بات ہے؟"

"پروہت جی تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔" رتن سنگھ نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔
"تمہارے ماما جی کا خط آیا ہے۔ جس میں ماما جی نے تمہاری شادی کے بارے میں لکھا ہے۔"

"ماما جی نے؟" پرکاش نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ پروہت جی خط پڑھ کر ماں جی کو سنا رہے تھے اور تب ہی یہ بات مجھے معلوم ہو گئی۔" بوڑھا
اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "اب تھوڑے ہی دنوں بعد اس گھر میں ایک بہو آ جائے گی
تمہیں کھلانے پلانے کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لے گی۔ اس طرح میری یہ عادت خود بخود چھوٹ
جائے گی۔" بوڑھا رتن سنگھ بول رہا تھا۔ لیکن پرکاش کا دھیان اُس کی باتوں میں نہیں تھا۔ وہ تو کھانا
کھاتے کہیں اور ہی کھو گیا تھا۔ پچھلے دو سال سے وہ اپنی شادی کی بات کو ٹالتا رہا تھا۔ ہمیشہ اپنے باپ سے
کوئی بہانہ بنا کر خود کو بچا لیتا تھا۔ مگر اب تو سارے بہانے بھی ختم ہو گئے تھے۔ اب تو شادی کو ٹالنے
کی زوردار وجہ بھی اُس کے پاس نہیں تھی۔

"پرکاش" اچانک اوپر کے برآمدے سے پتا جی کی آواز سنائی دی تو وہ کانپ کر رہ گیا۔ "اگر تم نے
کھا لیا ہے تو ذرا اوپر آ جاؤ۔"

"آتا ہوں پتا جی۔" پرکاش دسترخوان سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ پھر ہاتھ دھو کر جب وہ مڑا تو رتن سنگھ
لئے اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔

"اس بار تم برے پھنس گئے ہو بڑے بھائی۔" رتن سنگھ مسکراتے ہوئے دبی آواز میں بولا۔ "سنا ہے کہ
ماما نے تمہارے لئے بڑی خوبصورت لڑکی ڈھونڈی ہے۔"

پرکاش نے تولیہ اُس کے منہ پر اُچھال دیا اور آہستہ آہستہ اوپر کے تنگ زینے چڑھنے لگا۔ اوپر چڑھتے
ہوئے وہ کوئی نیا بہانہ بھی سوچ رہا تھا۔ لیکن دروازے پر پہنچنے کے بعد اچانک ہی وہ سر جھکانا بھول گیا۔
کمرے کا یہ دروازہ اُس کے قد سے چھوٹا تھا اس لئے اُسے ہمیشہ ہی جھک کر اندر آنا پڑتا تھا۔ مگر اس کے
باوجود بھی آج اُس کے ماتھے پر چوٹ لگ ہی گئی۔ ٹھک سے ایک آواز ہوئی اور پھر اُسے اپنا سر سہلاتے
ہوئے اندر داخل ہونا پڑا۔

"لگی نا چوٹ......" پروہت جی نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہارے ماما جی نے بھی اپنے
خط میں یہی لکھا ہے کہ لڑکے لڑکی اگر شادی کی عمر کے لائق ہو جائیں تو اپنے بزرگوں کی خواہش پوری
کرنے کے لئے اُنہیں اپنا سر ان کے آگے جھکا دینا چاہئے۔"

پرکاش اپنا سر سہلاتا ہوا اپنے پتا جی کے سامنے بیٹھ گیا۔ پروہت راجیش سنگھ کی عمر تقریباً سا
تھی۔ وہ جس گول تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اس کے نیچے سے اُنہوں نے ایک لفافہ نکالا اور
پرکاش کے سامنے بڑھاتے ہوئے بولے۔

''لو...... خود ہی پڑھ لو۔''

خط میں جو لکھا تھا اس کا پتہ تو پرکاش کو چل ہی چکا تھا، پھر بھی اُس نے لفافہ کھول کر جلدی جلدی پڑھنا شروع کر دیا۔ اُس کے ماما جی نے لکھا تھا۔ ''اپنے بھانجے پرکاش کے لئے ہم نے یہاں ایک حد خوبصورت لڑکی ڈھونڈ رکھی ہے۔ خاندان بھی اچھا ہے۔ کھنہ صاحب سی بی آئی اے میں ایک بڑ ہیں۔ پچھلے سال جب پرکاش یہاں چند دنوں کے لئے آیا تھا تو شانو بھی یہاں تھی۔ میری بیٹی کی ہے اس لئے اس کی شادی پر وہ خاص طور سے آئی تھی۔ پرکاش کو اُس نے بھی دیکھا ہے۔ شادی کے پر اُس نے چند خوبصورت گیت سنائے تھے، اس لئے پرکاش کو بھی وہ لڑکی یاد ہوگی۔ ہمیں تو وہ لڑکی پسند ہے......'' اتنا پڑھنے کے بعد پرکاش رُک گیا اور نظریں اُٹھا کر پتا جی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اپنی ہی جانب گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ پھر سے خط پڑھنے لگا۔ اس کے ماما جی نے آگے لکھا تھا۔ ایک بات پر اعتراض ہو سکتا ہے، کھنہ صاحب اپنی بیٹی کی شادی کر کے اسے پالن پور بھیجنے سے ہچ ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ پرکاش ان کے شہر میں رہنے کا فیصلہ کر لے تو اس کے لئے ترقی کی را کھل سکتی ہیں۔ وہ اپنے داماد کو اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے، لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ان کی سے بہت دُور چلی جائے۔ اس سلسلے میں پرکاش کی مامی کا مشورہ یہ ہے کہ پرکاش نے چونکہ تعلیم حاصل کی ہے، اس لئے اسے یہاں بہتر ملازمت مل سکتی ہے۔ وہ چاہے تو شادی کے بعد سال دو سال ہمارے پاس رہے یا کہیں الگ مکان لے کر رہے۔ اور بعد میں اگر دونوں میاں بیوی چاہیں تو چلے جائیں۔ رشتہ بہت اچھا ہے اور ایسے رشتے چھوڑ دینا بیوقوفی ہوگی۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی جواب سوچ سمجھ کر دیں۔ فقط ہری لعل۔''

خط پڑھنے کے بعد پرکاش نے اسے تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں ڈال دیا اور اطمینان کا سانس لے کر اپنے پتا جی کی جانب دیکھنے لگا۔ اس شادی سے انکار کی وجہ اُسے مل گئی تھی اس لئے پتا جی کے پوچھنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

''پتا جی، ایک اچھی بیوی کے لئے میں آپ کو اور اس گھر کو چھوڑ دینے کے بارے میں تو کبھی نہیں سکتا۔ اس لئے ماما جی کو میں خود ہی لکھ دوں گا کہ یہ رشتہ مجھے منظور نہیں ہے۔''

''لیکن پرکاش...... اگر یہ فرض کر لو کہ تمہارے یہاں سے جانے میں مجھے کسی قسم کا اعتراض نہ پروہت جی نے پوچھا ہی تھا کہ پرکاش نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا اور حیرت زدہ آواز میں بولا

''پتا جی...... یہ...... آپ......''

''ہاں پرکاش...... یہ میں کہہ رہا ہوں۔'' پروہت جی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''حقیقت ہے دانشمندی نہیں ہے۔'' اتنا کہنے کے بعد وہ ایک پل کے لئے رُکے، پھر اس قدر دھیمی آواز میں

ساتھ والے کمرے میں سوئی ہوئی اُن کی بیوی اُن کی آواز نہ سن سکے۔

''میں یہ تو نہیں جانتا بیٹے کہ تم شادی سے ہمیشہ انکار کیوں کرتے آ رہے ہو؟ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ شادی کے بعد تم اپنی بیوی کے ساتھ اس گھر میں سکھ سے نہیں رہ سکو گے۔''

دونوں باپ بیٹے کے درمیان ایسی نجی باتیں بہت کم ہوا کرتی تھیں اس لئے پرکاش کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اُس کی خاموشی کو دیکھ کر پروہت جی نے پھر کہا۔ ''میں جانتا ہوں بیٹے کہ اپنی ماں کے روکھے پھیکے سلوک سے بچنے کے لئے ہی تم سارا دن گھر سے باہر رہتے ہو۔ اور شادی کے بعد شاید اس کے دل کی تلخی اور بڑھ جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو تم شاید یہاں رہ کر بھی سکون نہ پا سکو گے۔''

''لیکن پتا جی...... کیا میں نے کبھی آپ سے گھر کی کوئی شکایت کی ہے؟'' پرکاش بولا۔

''شکایت نہ کرنے والے لوگ ہی اندر سے بہت دُکھی ہوتے ہیں بیٹے۔'' پروہت جی نے نرم اور جذباتی لہجے میں کہا۔ ''تمہاری نئی ماں بار بار مجھے یہ طعنے دیتی ہے کہ پرکاش سے آپ بہت زیادہ پیار کرتے ہیں اور میرے بیٹے روہن کو آپ پرایا ہی سمجھتے ہیں۔ آپ کی نظر میں تو روہن کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔''

''لیکن پتا جی، اس وقت یہ باتیں......''

''مجھے اپنی بات کہہ لینے دو بیٹے۔'' پروہت جی نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر لینے دو۔'' پروہت جی کی آواز بھاری ہو گئی۔ اور اُن کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ ''جب تمہاری ماں کا انتقال ہوا تھا تو اس وقت تم صرف چار برس کے تھے اور تمہاری بہن آرتی دو برس کی تھی۔ تمہاری فکر نہیں تھی، لیکن آرتی کی پرورش کے لئے ماں کی ضرورت محسوس ہوئی اس لئے میں تم دونوں کے لئے ایک نئی ماں لانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن اس وقت یہ کہاں معلوم تھا کہ وہ اٹھارہ سال کی بھرپور عمر میں ہی اپنی ماں کی طرح ہمیں چھوڑ کر دنیا سے رخصت......''

''پتا جی......'' پرکاش پُر جوش لہجے میں پتا جی کی بات کاٹ کر بولا۔ ''آرتی ہمارے پاس موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ آپ کو ایسی بات منہ سے نہیں نکالنی چاہئے۔''

اور پھر باپ بیٹے کے درمیان تھوڑی دیر تک گہری خاموشی چھا گئی۔ دل کا درد چھپانے کے لئے پروہت جی کو اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لینا پڑا۔ اور پرکاش اپنی بے قراری کو چھپانے کی کوشش میں اپنی مٹھیاں کبھی بند کرتا اور کبھی کھولتا تھا۔ پچھلے دو سال میں اُن دونوں کے درمیان کئی بار اس بارے میں گفتگو ہو چکی تھی۔ لیکن ہر بار یہ گفتگو ادھوری ہی رہتی۔ دونوں کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ہی رہ جاتے تھے۔ پروہت جی اس بات کا ثبوت ہی نہیں پیش کر سکتے تھے کہ اُن کی بیٹی مر چکی ہے۔ اور پرکاش کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ثبوت نہیں دے سکتا تھا کہ اُس کی بہن آرتی زندہ ہے۔ پروہت جی یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ آرتی کی تلاش میں ہم نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے...... مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ جبکہ پرکاش کا یہ کہنا تھا کہ آرتی کی طرح کئی اور لڑکیاں بھی غائب ہوئی تھیں جن کا پتہ پانچ چھ سال بعد بھی چلا ہے۔ اس بات سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ آرتی زندہ ہے اور دیر سویر اُس کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔

''بیٹے، تم ایک بار ماما جی کے پاس تو ہو آؤ۔'' پروہت جی نے آخر کار اس طویل خاموشی کو توڑتے

ہوئے اور اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکی کو جا کر دیکھ لو۔ اگر تم دونوں
ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں تو شادی کے بعد یہاں رہنا ہے یا وہاں، یہ فیصلہ ہم بعد
سکتے ہیں۔"

پرکاش اُن کی یہ بات ماننے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ وہ کسی نئے بہانے کے لئے الفاظ ڈ
تھا کہ پروہت جی پھر بول پڑے۔ "اس وقت جواب دینے کی جلدی نہیں۔ جاؤ، جا کر سوچ
پاٹ سے فارغ ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر جواب دینا۔"

پرکاش چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ لیکن تب ہی اُس کی نظر دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر پر پڑی
آنکھیں وہیں جم گئیں۔ اسکول کے یونیفارم میں اُس کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر آرتی نے تص
تھی۔ پرکاش کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس وقت بھی فوٹو فریم کے شیشے کے پیچھے سے اُس کی چھوٹی
رہی ہو۔ "مجھے اپنے پیچھے سائیکل پر بٹھا کر لے جاؤ گے تو کوئی یہ نہیں کہے گا کہ میں تمہاری....."
کے یاد آتے ہی پرکاش کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے اپنا پاؤں اُٹھایا اور جا
زینے اُترتا ہوا نیچے کے برآمدے میں آ گیا اور رتن سنگھ کی جانب دیکھے بغیر تیزی سے اپنے
گھس گیا۔

کمرے میں ایک سناٹا طاری تھا۔ سلاخوں والی کھڑکی میں سے دکھائی دینے والے پہاڑ
دکھائی دے رہے تھے۔ پرکاش نے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے سوچا...... آج کا یہ دن تو بڑے
ڈھنگ سے گزرا ہے۔ اچانک اُسے لیزا کی یاد آ گئی اور وہ اُس کے خیالوں میں کھو گیا۔ آخر
ناتھ کے مندر میں کیوں گھس آئی تھی؟ اُس کی یہ چوری پکڑنے کے بعد میں نے کیوں اُسے
سوالات اُس کے ذہن میں اُٹھتے رہے اور وہ ان سوالوں سے لڑتا ہوا جانے کب سو گیا۔

✿

کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کا الارم بجتے ہی لیزا کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ گھڑی کا ایک بٹن
دیکھنے لگی۔ ٹھیک پونے چھ بجے تھے۔ اُس نے انگڑائی لے کر اپنے جسم کی ٹھنڈک دُور کرنے
اور بستر سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ساتھ والے دوسرے کمرے میں اُس کے ڈیڈی سو رہے تھے
تھی کہ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ بھی اپنے بستر سے اُٹھ بیٹھیں گے۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھ
منہ ہاتھ دھویا، لیکن اتنی دیر میں ڈیڈی کے کمرے کے باتھ رُوم میں آہٹ ہوئی تو وہ سمجھ گئی
جاگ چکے ہیں۔ رات کو ہی دونوں باپ بیٹی نے یہ طے کر لیا تھا کہ صبح سویرے سب کو سوتا ہوا
دونوں ہوٹل سے نکل جائیں گے۔

انسان کی زندگی میں بہت سے رشتے بڑے ہی عجیب ڈھنگ کے ہوتے ہیں۔ مثلاً لیز
والے کمرے میں اُس کے ڈیڈی جس کے ساتھ تھے وہ اُس کی ممی نہیں تھیں اور سامنے والے
اُس کی ممی جس مرد کے پہلو میں سوئی ہوئی تھیں وہ اُس کا باپ نہیں تھا۔ اس وقت اُس کے
کمرے میں جو عورت تھی وہ اُس کی دوسری بیوی تھی جسے وہ آنٹی کہتی تھی اور ممی کے دوسرے شو

تھی۔ دس سال قبل اُس کے ڈیڈی اور ممی ایک دوسرے سے طلاق لے کر علیحدہ ہو گئے تھے اور تب
ا کی ممی کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ بعد میں اُس کی ممی نے جوزف نامی ایک شخص سے شادی کر لی اور اُس
ڈیڈی نے ایک دوسری عورت سے شادی کر لی۔

شروع شروع میں تو دو ایک سال تک لیزا کو یہ اُمید تھی کہ اُس کے بچھڑے ہوئے ماں باپ پھر ایک
ے مل جائیں گے۔ اور اس طرح اُس کی زندگی کے دو الگ ہو جانے والے حصے پھر سے ایک ہو
گے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور لیزا کے دل میں ہمیشہ کے لئے ایک کسک رہ گئی۔ وہ ماں
کی ایک دوسرے سے علیحدگی کے بارے میں اکثر یہ سوچنے لگی تھی کہ ایسی شادی اور ایسی زندگی کا آخر
مقصد؟ دو انسان ساتھ مل کر تیسرے انسان کو پیدا کرتے ہیں اور پھر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو
ہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے؟ شاید یہی وجہ تھی کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے باوجود لیزا شادی
کے ایسے انجام سے خوفزدہ ہو کر دُور دُور رہنے لگی تھی۔ لیکن دو سال قبل جب وہ سیر و تفریح کے
یہاں آئی تھی تب بھی اُس کے دل میں محبت کرنے اور کسی کو اپنانے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس
میں آ کر اُس نے شادی کر کے جھگڑتے ہوئے میاں بیوی کو جھگڑے کے بعد بھی ایک ساتھ رہتے
دیکھا تھا۔ اُس نے یہاں ایسی لڑکیوں کو بھی دیکھا تھا جو شادی سے پہلے کسی غیر مرد کی طرف آنکھ
بھی نہیں دیکھتیں۔ اور یہ بات اُسے بہت اچھی لگی کہ مشرقی لڑکیوں کے دل میں جس مرد کا تصور ہوتا
مرد صرف ان کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں دیکھ کر وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکی اور دل ہی
ا پرکاش کی شخصیت سے متاثر ہو کر اُس نے اُسے اپنے من مندر کا دیوتا بنا لیا۔

دو سال قبل جب وہ یہاں کی سیر سے واپس اپنے وطن جا رہی تھی تو اس وقت اُس نے اپنے دل میں
باندھ لی تھی کہ ایک دن وہ اپنے ممی اور ڈیڈی کو ساتھ لے کر یہاں واپس آئے گی اور اس وقت تک
ا کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھے گی۔ ممی اور ڈیڈی کو پالن پور لانے کے بعد وہ اُن سے
ا۔ "دیکھئے، میں نے اس شخص کو اپنے ہم سفر کے طور پر پسند کیا ہے۔"

ی کو انکل کے ساتھ اور ڈیڈی کو آنٹی کے ساتھ پالن پور لانے کے لئے لیزا کو چھ مہینے تک محنت کرنا
ی۔ اُس نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "آپ لوگ چل کر ایک بار پالن پور کا علاقہ دیکھ لیں تو
آئے تو کہئے گا۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس بہانے ہم پانچ آدمی مہینہ بھر ایک ساتھ تو رہیں
لیزا کے اندر یہ خاص خوبی تھی کہ اُس کی گفتگو کی مٹھاس ہر شخص کے دل میں اُتر جاتی تھی۔

یک اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور وہ چونک پڑی۔ وہ کپڑے پہن کر تیار
تھی اس لئے اُس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پیٹر نے اپنی بیٹی لیزا کو پالن پوری
لباس میں دیکھا تو اُن کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔

رے...... یہ لباس تم نے کب سلوایا بے بی؟" اتنا کہہ کر وہ پیار سے کرتے کی ڈوری ٹھیک سے
تے ہوئے بولے۔ "ایسا لگتا ہے بیٹی کہ ان تینوں کو گہری نیند میں سوتا چھوڑ کر ہم مارننگ واک کی
کی اور ہی پراسرار کام پر جا رہے ہیں۔"

"پراسرار تو نہیں ڈیڈی، البتہ یہ ذرا رومانٹک ضرور لگتا ہے۔" یہ کہہ کر لیزا نے اپنے ڈیڈی کا ہاتھ
لیا اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "چلیئے......"

لفٹ کے ذریعے نیچے اُترنے اور پھر ہوٹل کی لابی سے گزرنے کے بعد دونوں باپ بیٹی صبح کی
بھری ٹھنڈ میں پہلے تو دھیرے دھیرے اور پھر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ آسمان پر سورج
کی تیاری کر رہا تھا۔ راستہ بالکل سنسان تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ البتہ
والے اپنے کندھوں پر بالٹیاں اُٹھائے آتے جاتے ضرور نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی دو چار مزدوروں
قافلہ بھی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پیٹھ پر باندھے ہوئے گزرتا دکھائی دے جاتا تھا۔

چلتے چلتے یکایک لیزا نے راستے میں اُتر کر ایک پگڈنڈی پر قدم رکھے تو پیٹر اپنی جگہ پر
کھڑے ہو گئے اور اونچی پہاڑی پر جاتی ہوئی پگڈنڈی کے آخری سرے پر واقع بدھ مندر کو
دیکھتے ہوئے بولے۔

"لیزا بیٹی، اس منکی ٹیمپل تک چڑھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ اوپر بندر بھی بہت ہیں۔"

لیزا نے پلٹ کر اپنے ڈیڈی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ "مجھے معلوم ہے...... ویسے آپ
اونچائی پر نہیں لے جاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے آپ دل کے مریض ہیں۔ بس دو چار قدم اُوپر آ
جائیں۔" یہ کہہ کر اُس نے سہارا دینے کی خاطر پیٹر کی جانب اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور بولی۔

"ڈیڈی، بھگوان بدھ کے اس مندر کو منکی ٹیمپل کہنا اچھا نہیں لگتا۔ امریکن ٹورسٹوں نے
بندروں کو دیکھ کر اس کا یہ آسان نام تو رکھ دیا ہے۔ لیکن یہ نام بڑا ہی بیہودہ ہے۔ کم از کم غیر ملکیوں
کچھ تو لحاظ کرنا ہی چاہیئے۔"

"تو اس کا مطلب ہے لیزا کہ تم مجھے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ سکھانے کے لئے صبح ہی صبح
لائی ہو۔" مسٹر پیٹر ہانپتے ہوئے بولے۔ "ہم یہاں اتنی دُور سیر و تفریح کے لئے آئے ہیں،
ہندی سیکھنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے ڈیڈی۔ آپ کو اور ممی کو یہاں لانے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔" لیزا نے اپنے
کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا۔ "اور وہی وجہ بتانے کے لئے میں آپ کو یہاں لائی ہوں"

یہ سن کر پیٹر نے پُرتجسس نظروں سے لیزا کو دیکھا پھر سورج کی کرنوں سے چمکتے ہوئے مندر
اُونچے مینار پر نظر ڈال کر اُنہوں نے پوچھا۔

"بدھ مذہب سے متاثر ہو کر کہیں تو سادھو تو نہیں بننا چاہتی؟"

"بالکل نہیں ڈیڈی......" لیزا ہنس کر بولی۔ "میں تو اپنا گھر بسانے کی بات کرنے کے لئے
یہاں لائی ہوں۔"

"سچ......؟" اپنی شرماتی ہوئی بیٹی کے سرخ گال پر ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے انہوں
پوچھا۔ "یہ فیصلہ تم نے کب کر لیا بیٹی؟ ابھی تین ماہ قبل جب کرسمس کے موقع پر تم میرے پاس آئی تھیں
تو تم نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے ہنس کر پوچھا بھی تھا کہ کتنے بوائے فرینڈ ہیں تمہارے، لیکن

انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا یہ جواب سن کر میں فکرمند ہو گیا
تھا۔ مگر آج یہ اچانک......"

"اُس وقت تو آپ فکرمند ہو گئے تھے۔" لیزا نے اپنے ہانپتے ہوئے ڈیڈی کی بات درمیان ہی میں
کاٹ دی اور کہا۔ "لیکن میرا یہ فیصلہ سن کر آپ کو کیا لگ رہا ہے؟"

"اب تو ایسا لگ رہا ہے کہ تمہیں ایک تھپڑ دے ماروں۔" مسٹر پیٹر نے جواب دیا۔

"وہ کیوں......؟" لیزا نے چونک کر پوچھا۔

"یہ خوشخبری سنانے کے لئے تم نے ہمارا اتنا پیسہ خرچ کرا دیا۔" پیٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہاں
لانے کی بجائے اگر یہ بات تم وہیں بتا دیتیں تو کیا حرج تھا؟"

"ڈیڈی۔" لیزا نے لاڈ سے اپنے ڈیڈی کے سینے پر سر رکھ دیا۔ "آپ لوگوں کو پالن پور تک لانے کی
وجہ یہی تھی کہ میں اپنی پسند کا شخص آپ کو یہیں دکھا سکتی تھی۔"

"کیا مطلب......؟" مسٹر پیٹر چلتے چلتے رُک گئے۔

"مطلب یہ کہ وہ شخص یہیں کا باشندہ ہے۔"

"ہوں......" پیٹر کا چہرہ ایک دم بدل گیا۔ پھر بڑی مشکل سے انہوں نے اپنی سانسوں کو قابو میں
کرتے ہوئے کہا۔ "تو کیا تم کسی غیر مذہب سے......"

"ہاں ڈیڈی۔" لیزا نے جلدی سے کہا۔ "دو سال قبل جب میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہاں آئی تھی تو
میرے دل میں اُس کے لئے جگہ پیدا ہو گئی تھی۔ پھر دو سال تک محبت کا یہ جذبہ میرے دل میں پروان
چڑھتا گیا۔ لیکن آخری فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کی رائے جاننا بھی مجھے ضروری لگا۔"

لیزا نے آپ کی اجازت کی بجائے آپ کی رائے جیسے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اور یہ بات مسٹر پیٹر
نے خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ شاید اسی لئے وہ لیزا کی پسند کو دیکھنے کے لئے بے چین ہو گئے۔ لیکن انہوں
نے بڑی ہوشیاری سے اپنے اس تجسس کو اپنے سینے میں ہی دبا لیا اور کہا۔

"تو اب سمجھا کہ کل شام تم ہم لوگوں سے الگ ہو کر کہاں گئی تھیں۔ اور یکایک تمہیں ساڑھی پہننے کا
جنون کیوں ہو گیا تھا۔"

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے ہوٹل کی جانب واپس آنے لگے تھے۔ اس بات کا اُنہیں خیال ہی نہیں
رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر پیٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بیٹی، اب یہ بتاؤ کہ تم
نے یہاں کے پرنس کو تو اپنا دیوانہ نہیں بنا لیا؟"

اپنے ڈیڈی کے اس انداز پر لیزا کو ہنسی آنی چاہیئے تھی۔ لیکن اُسے سنجیدہ رہ کر کہنا پڑا۔ "کیا آپ نے
پالن پور کے پرنس کو دیکھا ہے ڈیڈی؟"

"ارے مجھے تو اُس کے نام کا بھی علم نہیں ہے۔" پیٹر نے کہا۔ "میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کنوارا ہے
یا شادی شدہ؟ اور نہ ہی میں نے اسے کبھی دیکھا ہے۔"

"لیکن میں نے جسے پسند کیا ہے اسے تو آپ نے دیکھا ہے ڈیڈی۔" لیزا نے کہا۔

"کون......؟" پیٹر نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"پچھلے تین دنوں سے جو ہمارے ساتھ گھومتا ہے۔" لیزا نے کہا۔ اور چند لمحے رُک کر بولی۔ "گائیڈ ہے وہ۔ پرکاش۔"

"پرکاش......؟" پیٹر کے قدم ایک جھٹکے سے رُک گئے اور وہ ترچھی نظروں سے لیزا کی طرف دیکھنے لگے۔ سورج کی کرنوں میں اب لیزا کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُنہوں نے پوچھا۔ "کیا تم پرکاش گائیڈ کے بارے میں ہی کہہ رہی ہو؟"

لیزا سانس روکے کھڑی تھی۔ اُس نے خود اعتمادی سے گردن ہلا دی۔ "ہاں ڈیڈی۔"

مسٹر پیٹر نے اپنی نظریں اُس کے چہرے پر سے ہٹا دیں اور اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔ لیزا چپ چاپ چلنے لگی۔ اُسے اس بات کا اندازہ تو تھا کہ اُسے اپنی پہلی کوشش میں ہی کامیابی نہیں مل جائے گی اور نہ ہی اُس کے ڈیڈی اس معاملے میں جلد ہی اپنی کوئی رائے دیں گے۔ لیکن اُسے اُمید تھی کہ اُس کے ڈیڈی اُس کے جذبات کو سمجھنے کی پوری کوشش کریں گے اور اُسے خود بھی ڈیڈی کو سمجھانے اور اُنہیں قائل کرنے کی کوشش کرنا پڑے گی۔

ہوٹل جانے والے راستے پر وہ دونوں آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور لیزا اپنے ڈیڈی کو پرکاش کے بارے میں بتاتی رہی۔ "وہ ایک گائیڈ ہے تو کیا ہوا؟ لیکن وہ راجیش پروہت کا بیٹا ہے۔ اُس کے گھر میں غربت اور فاقے نہیں ہیں۔ اُس نے اپنے مذہب کو اپنے من کی گہرائیوں میں اتار رکھا ہے۔ اُس کے مذہب میں عورت کا مقام بہت اُونچا ہے۔ ایسے آدمی کو پسند کر کے میں کیا بھول کر رہی ہوں ڈیڈی؟ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اُس کی چمڑی گوری نہیں ہے، اُس کا لباس ہم جیسا نہیں ہے اور اُس کا رہن سہن بھی مختلف ہے۔ اس کے علاوہ اس کا مذہب اور اس کی زبان بھی ہم سے مختلف ہے۔ لیکن کیا اس کے باوجود بھی وہ ہماری طرح آدمی نہیں ہے؟"

لیزا کی یہ ساری باتیں خاموشی سے سننے کے بعد پیٹر نے ایک گہرا سانس لیا اور آخر کار پوچھ ہی لیا۔

"تب تو پھر تم نے اُس سے پوچھ ہی لیا ہوگا کہ وہ اپنا یہ ملک چھوڑ کر ہمارے ساتھ......"

"نہیں ڈیڈی......نہیں۔" لیزا نے پھر اُنہیں درمیان میں روک دیا۔ "اُسے اپنا ملک چھوڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں خود اپنا ملک اور مذہب چھوڑ کر اُس کی طرح ہو جانا چاہتی ہوں۔"

لیزا کی یہ بات سن کر پیٹر پھر ایک بار چونک پڑا۔ اُس نے لیزا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب ہوٹل بالکل نزدیک آ گیا تو پھر اُنہیں کہنا پڑا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر تم دونوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو"

"نہیں ڈیڈی...... یہ فیصلہ تو میں نے اکیلے ہی دل میں کیا ہے۔" لیزا نے پھر اپنے ڈیڈی کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو پرکاش کو بھی میرے اس فیصلے کی خبر نہیں ہے۔"

پیٹر بوکھلائی ہوئی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھتے رہے۔ اور لیزا نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "میرا خیال ہے ڈیڈی، یہ باتیں آپ کو بڑی عجیب سی لگ رہی ہوں گی۔ لیکن پرکاش سے یہ ساری باتیں کہنے کے لئے مجھے آپ کی اور ممی کی ضرورت تو پڑے گی ہی۔"

"اور فرض کرو وہ اس بات کو نامنظور کر دے تو؟" پیٹر نے پوچھا۔

"تو......؟" لیزا کے ہونٹ ایک لمحے کے لئے ایک دوسرے سے جڑ گئے۔ شاید اُس نے یہ بات سوچی ہی نہیں تھی کہ اگر پرکاش نے انکار کر دیا تو وہ کیا کرے گی؟ آخر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بڑے مدھم لہجے میں بولی۔ "ڈیڈی، اگر ایسا ہو گیا تو مجھے نہیں معلوم میں کیا کروں گی۔"

بیٹی کی آواز میں وہ پہلے جیسا جوش و خروش نہ پا کر مسٹر پیٹر کا دل ایک پل کے لئے کانپ گیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس عمر کی تمام لڑکیوں میں اُن کی بیٹی لیزا بہت زیادہ حساس ہے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر بیٹھے کیوں نہ اسے اپنے نصیب پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ ساری باتیں دل ہی دل میں سوچنے کے بعد اُنہوں نے کہا۔

"آؤ بیٹی......ہم نیچے ریستوران میں ہی گرم گرم چائے پی لیں۔"

لیزا نے یکایک رُک کر اپنے ڈیڈی کی طرف دیکھا اور پھر چپ چاپ اُن کے ساتھ چل پڑی۔

پرکاش کے لئے چائے لے کر اُس کی سوتیلی ماں اُس کے کمرے میں داخل ہوئی تو پرکاش بھگوان کی پوجا پاٹ سے فارغ ہو رہا تھا۔

"ماں جی، آپ......؟" وہ یکایک چونک پڑا۔ "آج چائے دینے خود ہی آ گئیں؟" پرکاش نے کہا۔

"روزانہ تو رتن سنگھ ہی آتا تھا۔ لیکن میں نے آج اُسے کسی کام سے بھیج دیا ہے۔ کیونکہ اگر سوتیلے بیٹے کو زہر دینا ہو تو سوتیلی ماں کو خود ہی آنا پڑتا ہے نا۔"

پرکاش نے چونک کر پہلے چائے کی پیالی کی طرف اور پھر اپنی سوتیلی ماں کی جانب دیکھا۔ لیکن اُسے اپنی نئی ماں کے چہرے پر مذاق کے تاثرات دکھائی نہیں دیئے۔

"خوبصورت چہرے والے لوگ جب کڑوی کسیلی باتیں کرتے ہیں تو سننے والوں کو بہت خراب لگتا ہے۔" پرکاش نے سوتیلی ماں کے طنز کو نظر انداز کر کے اسے مذاق میں بدلنے کی کوشش کی اور چائے کی پیالی اُٹھا کر دو چار گھونٹ چائے پی گیا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ "واقعی اگر چائے میں زہر ملایا گیا ہے تو بھی اس وقت یہ زہر بہت میٹھا لگ رہا ہے۔"

لیکن اس کے باوجود ماں کے چہرے کی تنی ہوئی شکنیں ڈھیلی نہیں ہوئیں۔ وہ اپنی تیز اور دھار دار آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "میں نے زہر چائے میں نہیں ملایا تھا۔ زہر تو میں تمہیں چائے کے اوپر جمی ہوئی بالائی کی طرح دُوں گی۔"

پرکاش اُس کی سنجیدگی دیکھ کر سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گمبھیر دکھائی دے رہا ہے۔ اور آج اس کی یہ سوتیلی ماں کسی انجام کی پرواہ کیے بغیر فوراً ہی کچھ نہ کچھ کرنے آئی ہے اس خیال کے ذہن میں آتے ہی اُس نے پیالی میں بچی ہوئی ساری کی ساری چائے ایک ساتھ حلق میں انڈیل لی اور بولا۔

"کہئے......مگر پہلے آپ بیٹھ جائیں۔"

"نہیں۔ اگر کسی کو چوٹ مارنی ہو تو کھڑے کھڑے وار کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔"

ماں کا یہ انداز دیکھ کر پرکاش سوچنے لگا کہ یہ کتنی بے رحم عورت ہے؟ اُس کا دل کانپ اُٹھا، کیا
اُس کی ماں کا رُوپ دھار کر اُس کے پچھلے جنم کا کوئی بدلہ لینے آئی ہے؟ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ
اسی لئے وہ سر جھکا کر بولا۔

''وار کرنا ہے تو جلدی سے کر ڈالئے ماں جی۔ میں نے اپنی گردن جھکا دی ہے۔''

''یہ کہہ کر گویا تم میرا حکم ماننے کا وعدہ کر رہے ہو۔'' سوتیلی ماں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

''میں تو اپنا سر بھی پیش کر رہا ہوں۔'' پرکاش نے بدستور گردن جھکائے ہوئے کہا۔ ''اب آپ
اپنا رحم نہ کریں۔''

سوتیلی ماں نے یہ سن کر ایک گہرا سانس چھوڑا اور پھر تھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تمہارا با
راجا شرتھ ہوتا تو اُس کی بیوی کی طرح میں بھی اُس سے وہی مانگتی جو اُس نے اپنے بیٹے کے لئے ما

یہ سن کر پرکاش نے سر اُٹھایا اور اپنی سوتیلی ماں کے اُداس چہرے پر نظر ڈالی اور پھر بولا۔ ''میر
ماں، رانی کی طرح تم بھی یہی مانگ رہی ہو، یعنی اپنے بیٹے روہن کے لئے گدی اور میرے لئے بن

''بہت جلدی سمجھ گئے میرے بیٹے۔'' ماں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن روہن کے لـ
پروہت بننے کا راستہ تم صاف کر کے بن باس چلے جاؤ اور راجا دسرتھ کی طرح تمہارے بابا بھی تر
جانے کے بعد دنیا کو چھوڑ دیں، ایسا انجام مجھے نہیں چاہئے۔''

''ایسا انجام تو میں خود بھی نہیں چاہتا ماں۔'' پرکاش نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایسی کو
نہ ہونے پائے اس لئے تمہیں ہی کوئی ترکیب ڈھونڈنی پڑے گی۔''

''یہ ترکیب تو تمہارے باپ نے کل ہی تمہیں بتا دی ہے۔'' ماں اپنے ہونٹوں پر ایک
مسکراہٹ لا کر بولی۔ ''یعنی اگر تم اس لڑکی کا رشتہ قبول کر لو تو تمہارا باپ تمہارے سکھ کی خاطر تمہارا
برداشت کر لے گا۔''

''تو کیا آپ......؟'' پرکاش کے ہونٹ کچھ اور کہنے کے لئے کانپتے رہے۔

''ہاں پرکاش، کل رات تم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نے دروازے کے پیچھے
سن لی تھی۔'' سوتیلی ماں کی آواز میں اس غیر اخلاقی حرکت کے لئے شرمندگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔
کر پرکاش کو ہنسی آگئی۔ وہ بولا۔

''تو کیا ماں، واقعی آپ کو ایسا لگتا ہے کہ پتاجی کے بعد راج پروہت کی گدی پر اگر روہن
میں اُس کے آڑے آؤں گا؟''

''شاید تم ایسا نہ بھی کرو۔'' سوتیلی ماں نے کہا۔ ''مگر تمہارا پتا اُس کے آڑے ضرور آئے گا۔''
یہ بات کچھ اس طرح کہی جیسے اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہو۔ ''اگر تمہیں ماں کی بھلائی عز
تمہیں میرے لئے کچھ کرنا ہوگا۔''

''کیا مطلب......؟''

''یہی کہ تمہیں پندرہ روز کے اندر اس کا فیصلہ کر لینا ہوگا۔''

''پندرہ روز......؟'' پرکاش کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سب کچھ چھوڑ کر چلے جانا اور وہ بھی کس کے
ب کے لئے؟ سوتیلی ماں کے لئے؟ یا سوتیلے بھائی کے لئے؟ پرکاش کی آنکھیں آنسوؤں سے نم
ئیں۔ لیکن ماں اپنا فیصلہ سنا کر واپسی کے لئے مڑ چکی تھی۔ اُس نے پرکاش کے آنسوؤں کی جانب کوئی
نہیں دی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ ماں کمرے سے باہر نکل جاتی، ماں کی پیٹھ سے پرکاش کی بھرائی ہوئی
از ٹکرائی۔

''ماں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔''

''بس۔'' ماں نے گردن گھما کر صرف ایک لمحے کے لئے ہی اُس کی طرف دیکھا اور پھر فخریہ سینہ
ن کر اس طرح کمرے سے نکل گئی جیسے کوئی بڑا مقابلہ جیت کر آ رہی ہو۔

❁

''یہ ہے تلجا بھوانی دیوی کا مندر۔ ہمارے شاہی خاندان کا یہ مندر 1549ء میں ملاونس خاندان کے
راجہ نہندر نے تعمیر کرایا تھا۔'' پالن پور کے دربار چوک میں واقع لکڑی کی بنی ہوئی ایک اونچی عمارت کی
ف اشارہ کرتے ہوئے پرکاش اپنے ساتھ آئے ہوئے سیاحوں کو اس کے بارے میں بتاتے ہوئے
رہا تھا۔ ''آدمی کی پہلی نظر پڑے اور وہ دیکھتا رہ جائے۔ پہلے زمانے کے لوگ ایسا ہی سوچتے تھے، یہی
ہے کہ یہاں کے پرانے محلے میں بنے ہوئے مکانات اور مندر وغیرہ لکڑی یعنی کاٹ سے تعمیر کئے گئے
۔ جابجا کاٹ کے ان مکانوں اور مندروں کی وجہ سے ہی اس شہر کا نام مشہور ہے۔''

پرکاش کے ساتھ آئے ہوئے سیاح اپنی گردن اُٹھا کر تلجا بھوانی دیوی کے مندر کی تانبے کی چھت اور
لص سونے کے اونچے مینار کو دیکھ رہے تھے اور لیزا، پرکاش کے چہرے پر نگاہیں جمائے چپ کھڑی
تھی۔ آج صبح چائے پیتے وقت لیزا اور اُس کے ڈیڈی مسٹر پیٹر نے اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ آج رات
ہی لیزا کو اپنے دل کی بات پرکاش سے کہہ دینی چاہئے۔ انہوں نے پرکاش کو رات کے کھانے پر بلا کر
ے ٹولنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور پھر اسی درمیان لیزا کو تنہائی میں اُس کو شادی کے لئے رضامند کرنا تھا۔

''اب چلئے، میں آپ کو ایک اور عجیب جگہ دکھاتا ہوں۔'' پرکاش نے بھوانی مندر کے سامنے ایک
ھوٹے سے مکان کی جانب اشارہ کر کے کہا اور پھر لیزا بھی اُن کے پیچھے چل پڑی۔

''دنیا بھر کے سیاح اس چھوٹے سے مکان میں داخل ہونے کے بعد جانے کیا کیا محسوس کرنے لگتے
ہیں۔'' پرکاش کے ساتھ رہ کر گائیڈ کی تعلیم حاصل کرنے والے اُس کے دوست نے سیاحوں سے کہا۔
''دیکھنے میں تو یہ ایک معمولی سا مکان ہے۔ لیکن اس کا درجہ ایک مندر کا سا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک دیوی
تی ہے۔ زندہ دیوی۔''

زندہ دیوی کا نام سنتے ہی سب لوگوں کی نگاہیں لکڑی کے اس مکان پر جم گئیں اور اُن کے قدم تیزی
ے اُٹھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب کھڑکی نما ایک چھوٹے سے دروازے میں سر جھکا کر داخل ہو گئے۔

لیزا اس سے قبل بھی دُور سے اس گھر کو دو بار دیکھ چکی تھی۔ لیکن وہ ایک بار پھر پرکاش کی زبان سے
اس زندہ دیوی کے بارے میں کچھ سننے کے لئے بے تاب ہو گئی تھی۔ اُسے افسوس صرف اس بات کا تھا کہ

وہ دیگر ہندو مسافروں کی طرح اوپر جا کر اس دیوی کے درشن نہیں کر سکتی تھی۔ لکڑی کے اس دو
کے آنگن میں سب لوگ داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر کے دس بارہ جاپانی سیاح
عورتیں بھی تھیں، گردنیں اُٹھائے اوپر کی جانب ایک کھلی ہوئی کھڑکی پر نظریں جمائے کھڑے تھے
گائیڈ ٹوٹی پھوٹی جاپانی زبان میں اُنہیں معلومات فراہم کر رہا تھا۔ جاپانی سیاحوں نے اپنے اپنے
اور فلیش گن تیار کر رکھے تھے، کیونکہ اُنہیں یہ بتایا گیا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں زندہ دیوی اس کھڑ
کر لوگوں کو درشن دے گی۔

''اس مکان میں رہنے والی ایک سات سالہ بچی ہم سب کی کنواری دیوی ہے۔'' پرکاش
مخصوص لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''برس ہا برس سے یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ اُونچی ذات کی ایک بچ
بنا کر اس مکان میں رکھا جاتا ہے۔ اسے دیوی منتخب ہونے کے لئے بڑے بڑے امتحانات سے گ
ہے۔ جس کا ظاہر اور باطن خوبصورت ہو، جس کے چہرے پر فرشتوں جیسی پاکیزگی اور معصوم
جس کے جسم پر کسی قسم کا کوئی داغ یا کوئی نشان نہ ہو اور جس کا دل کمزور نہ ہو......'' ابھی پرکاش
شروع ہی کیا تھا کہ جاپانی سیاحوں نے بھی اُس کی بات سننے کے لئے آہستہ آہستہ قریب آنا شرو
پرکاش کی باتوں کا اتنا اچھا اثر دیکھ کر لیزا دل ہی دل میں خوش ہو گئی۔

''اس رسم کے پیچھے کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ کئی پشت پہلے کے ایک راجہ پر ہمار
دیوی کی بڑی مہربانی تھی۔ ہر مشکل وقت میں دیوی کی جانب سے راجہ کو اشارہ ملتا اور اُس کی
آسان ہو جاتی۔ لیکن ایک بار ایک مسئلے نے راجہ کو بڑی اُلجھن میں مبتلا کر دیا جس کو سلجھانے کے
بھوانی دیوی کو روپ بدل کر راجہ کی آرام گاہ میں آنا پڑا۔ راجہ کی آرام گاہ کے باہر سخت پہرہ تھا
پہرے داروں کی موجودگی میں اگر کوئی اس آرام گاہ میں داخل ہو جائے تو یقیناً یہ بڑی حیرت کی
تھی۔ راجہ کو یقین ہو گیا کہ وہ بھوانی دیوی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اس کا خیال آتے ہی وہ بھوا
کے پیروں میں گر گیا۔ اور تب اُس کی سماعت سے بھوانی دیوی کی آواز ٹکرائی۔

''راجہ...... آئندہ کبھی تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے تو میں اسی طرح روپ بدل کر تمہار
آؤں گی۔ لیکن اس کے لئے تمہیں میری دو شرطوں پر عمل کرنا ہوگا۔ پہلی تو یہ کہ میں تمہارے سا
ہوتی ہوں، یہ بات تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ تم شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھو گے اور میں کھیل کھیل
تمہارے مسئلے کا حل تمہیں بتا دیا کروں گی۔ لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل رہے گا۔
کبھی میرا چہرہ نہ دیکھو گے۔''

اس طرح یہ سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا۔ لیکن ایک بار راجہ، دیوی کو دیکھنے کے لئے بے تا
اور اُس نے درمیان کا پردہ ہٹا دیا۔ اور تب بھوانی دیوی کے بدصورت چہرے پر نظر پڑتے ہی راجہ
میں ایک پل میں عقیدت کی بجائے نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے دیوی اُس کی
کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے بعد راجہ نے روٹھی ہوئی دیوی کو منانے کی بہت کوشش کی
دل سے اپنے گناہ کی معافی مانگی۔ تب دیوی نے اُسے معاف کر دیا اور کہا۔ ''تمہارے بعد بھی تخ

ہوئے راجاؤں کی یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ دیوی کو دیکھنے کی ہمت کر کے اس کی پاکیزگی کو میلا کریں۔
اس لئے اب میں جوانی کی بجائے ایک بچی کے روپ میں تمہارے اور تمہارے بعد آنے والے راجاؤں
کے سامنے آؤں گی۔ اور مجھے زندہ اپنے سامنے دیکھنے کے لئے تمہیں کوئی معصوم کنواری بچی کو تلاش کرنا ہو
اور اسے دیوی سمجھ کر پوجنا ہوگا۔''

بھوانی دیوی کے اس فیصلے کے بعد سے ہی ہمارے مذہب میں یہ سلسلہ چل پڑا ہے اور ہر سال پالن پور
راجہ ایک بار خود یہاں چل کر آتا ہے اور کنوری دیوی کی پوجا کرنے کے بعد اس کا آشیرواد لے جاتا ہے۔''
تا کہ پرکاش سانس لینے کے لئے رُکا ہی تھا کہ سیاحوں میں سے ایک بوڑھے جاپانی سیاح نے پوچھا۔
''تمہاری یہ کنوری دیوی کیا کوئی معجزہ بھی دکھا سکتی ہے؟''
''کنواری دیوی کی طاقت بھوانی دیوی جتنی نہیں ہے۔ ہم اسے بھوانی دیوی کے بچپن کا روپ سمجھ کر
تے ہیں۔ اور اس کا یہ معجزہ ہی کیا کم ہے کہ کسی آدمی کے آگے نہ جھکنے والے پالن پور کے راجہ اس کنواری
بچی کی پوجا کرتے ہیں اور اس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔''
''پھر تو آپ ہمیں یہ بھی بتائیں کہ اس زندہ دیوی کا انتخاب کیسے کیا جاتا ہے؟'' ایک دوسرے سیاح
نے پوچھا تو پرکاش نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے بولا۔
''وہ بھی بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اُس نے گردن اُٹھا کر کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ لیکن جب وہاں
کا چہرہ نظر نہیں آیا تو آگے کہنا شروع کر دیا۔ ''ابھی جو کنواری دیوی کہلاتی ہے اس کا بچپن جب
زرنے لگے گا اور جب اُس کے جسم میں جوانی کے آثار نمایاں ہونے شروع ہونے لگیں گے تو اس سے
لے نئی دیوی کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ اونچی ذات کے بہت سے والدین کی جانب سے پیشکشیں
شروع ہو جائیں گی۔ اور تب دیوی کی امیدوار بچیوں کو اچھی طرح جانچا اور پرکھا جائے گا۔ اس کی جنم
کنڈلی دیکھی جائے گی اور پھر سینکڑوں میں سے چار بچیوں کو آخری انتخاب کے لئے رکھ لیا جائے گا۔ اور یہ
آخری امتحان بھی کبھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔'' پرکاش نے ایک بار پھر رُک کر اوپر کی کھلی ہوئی کھڑکی کی
طرف دیکھا اور بولا۔ ''ہمارے یہاں سال میں ایک بار دیوی دیوتاؤں کے سامنے جانوروں کا خون بہایا
جاتا ہے۔ اور اس دن ان بچیوں کو مندر میں موجود رکھ کر ان کے سامنے بھینسوں کو گرا کر ان کی گردن کاٹی
جاتی ہے۔ ایک کے بعد دوسرے بھینسے کو گرایا جاتا ہے اور ان کی گردنوں سے خون کے فوارے اُڑتے
رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھینسوں کی گردنیں دھڑ سے الگ ہو جاتی ہیں اور ان کے دھڑ تڑپنے لگتے ہیں۔
بچیوں کو جان بوجھ کر یہ خوفناک منظر دکھایا جاتا ہے تا کہ ان کے دل کی مضبوطی کا اندازہ لگایا جا سکے۔''
''بس بس، اس خون خرابے کی بات چھوڑو۔'' ایک سیاح نے کہا۔ ''آگے بتاؤ۔''
''بتاتا ہوں جناب۔'' پرکاش نے مسکرا کر کہا۔ ''بچیاں اس کڑے امتحان سے گزرتی ہیں کہ اس کے
بعد دوسرے امتحان سے انہیں گزرنا پڑتا ہے۔ یعنی اسی رات ان تمام بچیوں کو مندر کے الگ الگ
کمروں میں تنہا بند کر دیا جاتا ہے۔ پھر جب رات گہری ہو جاتی ہے تو بہت سے لوگ ان کے کمروں کے
باہر طرح طرح کی بھیانک آوازیں منہ سے نکالتے ہیں۔ یہ آوازیں اس قدر ڈراؤنی ہوتی ہیں

کہ سخت سے سخت دل رکھنے والا شخص بھی دہل جائے۔ لیکن ان خوفناک چیخوں سے بھی جو بچی خوفز
جس کے منہ سے آواز تک نہ نکلے اور جسے مارے ڈر کے بخار نہ چڑھے اس بچی کو دیوی کے لئے
جاتا ہے......"

پرکاش نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ہر شخص کی آنکھیں کھڑکی کی طرف اُٹھ گئیں۔ پھر اس سے
میں سے کوئی پرکاش سے سوال کرتا، یکایک ہی کھڑکی میں ایک چہرہ نمودار ہوا۔ تمام سیاحوں کی گر
جھٹکے سے اوپر کی طرف اُٹھی رہ گئیں۔ مگر ان سب کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں۔ کھ
میں جو چہرہ نظر آرہا تھا وہ ایک بوڑھی عورت کا چہرہ تھا۔ جس کی عمر اسی سال سے کم نہیں ہوگی۔ ا
نے پرکاش کو اُس کا نام لے کر پکارا اور پھر اپنی قومی زبان میں اُس سے کچھ کہا۔ بڑھیا کی با
پرکاش نے سیاحوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ماں جی یہ کہہ رہی ہیں کہ تھوڑی دیر میں ہی کنواری دیوی کھڑکی میں آکر درشن دے گی۔"

"یہ بڑھیا دیوی کی دادی لگتی ہے؟" ایک سیاح نے پوچھا تو پرکاش نے اُس کی طرف دیکھ
جواب دیا۔

"نہیں...... یہ تو دیوی کو پالنے والی عورت ہے۔ کوئی بچی اگر ایک بار کنواری دیوی کے لئے
جاتی ہے تو پھر وہ اپنے خاندان کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اُس کے ماں باپ کو راجہ کی طرف سے
کوئی مکان رہنے کے لئے دے دیا جاتا ہے اور ان کے کھانے پینے کا سارا خرچ بھی مہاراجہ کی طر
ملتا ہے۔ دیوی کے ماں باپ یا کوئی اور بزرگ اُس سے ملنے کے لئے آتے ہیں تو انہیں بھی
آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔"

ابھی پرکاش نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کھڑکی میں بچی کا چہرہ دیکھ کر تمام سیاح پھر اُس کی
متوجہ ہوگئے اور دیوی کو دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

ایک جاپانی سیاح نے کہا۔ "کتنی کمسن بچی ہے۔ اگر یہ راستے میں جارہی ہو تو کوئی اسے ایک
نہیں دیکھے گا۔"

دیوی کو دیکھنے کے بعد بہت سے سیاحوں کا خیال تھا کہ دیوی کی شکل وصورت سے زیادہ خو
اس کی کہانی تھی جو پرکاش نے انہیں سنائی تھی۔ کسی کو دیوی کے چہرے کی معصومیت نے متاثر کی
اُس کی معصومیت دیکھ کر یہ کہنے لگا۔ "اتنی چھوٹی عمر میں بے چاری کو دیوی بنا کر لوگوں نے اس
چھین لیا ہے۔"

"چلئے، اب میں آپ سب کو اوپر لے جاؤں۔" یکایک پرکاش نے اپنے ساتھ آئے ہوئے
سے کہا۔ "آپ لوگ نذرانے کے طور پر جتنی رقم چاہیں دے سکتے ہیں۔ اور اگر آپ چاہیں تو د
چرن بھی چھو سکتے ہیں۔ اور اگر دیوی سے آپ کو کوئی سوال پوچھنا ہو تو وہ سوال آپ بوڑھی ما
معرفت پوچھ سکتے ہیں۔ چلئے، نزدیک سے دیوی جی کے درشن کر لیں۔"

"لیزا......" اوپر چڑھنے سے قبل پرکاش اُس کے قریب جا کر دھیرے سے بولا۔ "تم ہی

مہارے ساتھ ہے۔"
نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اُن جاپانی سیاحوں کو دیکھ رہی تھی جو اپنے اپنے کیمروں سے کنواری
تصویریں اُتارنے میں مصروف تھے۔ لیکن کنواری دیوی زیادہ دیر کھڑکی پر نہیں ٹھہری۔ جب وہ
ہٹ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی تو کئی مقامی لڑکے دوڑتے ہوئے آگئے اور جاپانی سیاحوں کے
کنواری دیوی کی تصویریں فروخت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ سب سیاحوں کو سمجھاتے ہوئے
ہے تھے۔

صاحب، آپ نے دیوی کی جو تصویریں اُتاری ہیں وہ روزمرہ کے چالو لباس میں ہیں۔ جبکہ ہماری
یں اس موقع کی ہیں جب سال میں ایک بار دیوی سچ مچ دیوی کا روپ اختیار کرتی ہے۔"
لڑکے سے دیوی کی ایک تصویر خرید کر ایک جاپانی سیاح سرک کر لیزا کے پاس کھڑے ہوئے
کے پاس آگیا اور بولا۔

سٹر، کیا آپ مجھے یہ بتائیں گے کہ یہ کنواری دیوی کیا زندگی بھر کنواری ہی رہتی ہے؟"
جی نہیں......" گوپال نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اپنے دیوی کا زمانہ گزار لینے کے بعد وہ
تمام لڑکیوں کی طرح سکول میں پڑھنے بھی جایا کرتی ہے۔ اور ہمارے راجہ اس کا تمام خرچ
ت کرتے ہیں اور پڑھ لکھ لینے کے بعد وہ کسی سے بھی شادی کر سکتی ہے۔"
ب تو ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر وہ جاپانی سیاح سر ہلاتا ہوا اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔
یزا کے دل میں ایک سوال مچلنے لگا۔ یہی سوال وہ پہلے پرکاش سے پوچھنا بھول گئی تھی۔ لیکن اب
نے گوپال سے پوچھ لیا۔

گوپال، ماضی میں دیوی کی حیثیت سے عزت اور شہرت حاصل کرنے والی لڑکی سے شادی کرنے
ے تمہارے یہ مقامی لوگ تو ٹوٹ پڑتے ہوں گے نا؟"
لا کا یہ سوال سن کر گوپال نے کہا۔ "نہیں مس لیزا، ایسی بات نہیں ہے۔ اچھے گھرانوں کے لڑکے
ے شادی کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"
اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟" لیزا نے حیرت سے پوچھا۔
نہیں اپنی موت کا ڈر ہوتا ہے۔" گوپال نے لیزا کو چونکاتے ہوئے کہا۔ "پہلے ہمارے مذہب میں
جاتا تھا کہ جو لڑکی ایک بار بچپن میں کنواری دیوی رہ چکی ہو اس کے ساتھ اگر کوئی مرد صحبت کرے تو
موت واقع ہو جاتی ہے۔"
یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" لیزا نے پوچھا۔ "کیا ایسا کوئی واقعہ ہوا ہے؟"
نہیں...... بار بار ایسا تو نہیں ہوا۔" گوپال بولا۔ "لیکن ایک دو بار ایسا ہو چکا ہے۔ میری چچی کی عمر
ت پینتیس سال ہے لیکن وہ صرف پانچ چھ سال کی تھی تو یہاں کی کنواری دیوی رہ چکی تھی۔ میرے چچا
ب اُس کی شادی ہوئی تو دوسری صبح کو ہی میرے چچا کی موت واقع ہو گئی تھی۔"
گ......؟" لیزا کو یقین نہیں آرہا تھا۔ "تمہارے سگے چچا؟"

"ہاں......"

لیزا نے آگے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ گردن اُٹھا کر اس مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پرکاش کا چہرہ اُسے نظر آ رہا تھا۔ یکایک وہ اُس طرف دیکھتی ہوئی ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائی۔

"یہ آج پرکاش اس قدر اُداس کیوں ہے؟"

"اُداس......؟" گوپال چونک پڑا۔ وہ لیزا کی طرف دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ یہ غیر ملکی لڑکی دوست پرکاش میں ضرورت سے زیادہ ہی دلچسپی لینے لگی ہے۔ وہ اُس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا اُس کی سماعت سے پرکاش کی آواز ٹکرا گئی۔

"کیوں گوپال، کیا ہو رہا ہے؟ لگتا ہے تم نے ابھی سے اپنے جوئے خانے کا پرچار شروع کر دیا"

لیزا نے پلٹ کر دیکھا۔ پرکاش اُن کے قریب آ گیا تھا۔ اُس کی پیشانی پر سرخ رنگ کا ایک تھا جو شاید کنواری دیوی نے اُس کے ماتھے پر لگا دیا تھا۔ پرکاش کا چہرہ اس ٹیکے میں بڑا دلکش لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ گوپال کوئی جواب دیتا لیزا خود ہی بول پڑی۔

"ہاں۔ ہم دونوں جوئے خانے کی ہی بات کر رہے تھے۔ اور ہم دونوں نے یہ فیصلہ بھی کیا رات کے کھانے کے بعد تمہیں بھی کھینچ کر جوئے خانے میں لے جائیں گے۔"

یہ سن کر پرکاش مسکرایا اور بولا۔ "شاید تمہیں نہیں معلوم لیزا کہ یہاں کے جوئے خانوں میں لوگوں کو جوا کھیلنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کھیلنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن جوئے خانے کے اندر جانے کی اجازت تو ہے نا۔" گوپال کی وکالت کرتے ہوئے کہا تو اُس کی بات سن کر پرکاش کو یقین ہو گیا کہ واقعی ان دونوں نے اس کے خلاف سازش کی ہے۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے تمام سیاحوں کو باہر کھڑی ہوئی ہوٹل کی ویگن میں بٹھا دیا اور پھر گوپال سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ "موٹر سائیکل کی چابی مجھے دے دو۔ میں آج بھی تمہاری موٹر سائیکل لے جاؤں گا۔"

لیکن گوپال کے کچھ کہنے سے پہلے ہی لیزا بول اُٹھی۔ "کیا بھول گئے ہو پرکاش، آج تو دونوں کے ساتھ ڈنر کرنا ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔" یہ کہہ کر پرکاش نے گوپال کے ہاتھ سے موٹر سائیکل کی چابی لے لی اور بولا۔ "پشپتی ناتھ کے مندر سے ہو کر میں کھانے کے لئے سیدھا ہوٹل آ جاؤں گا۔"

لیزا کہنا چاہتی تھی کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں، لیکن پرکاش کی آنکھوں میں اچانک ... والی اُداسی کو دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

پالن پور کے بازار سے گزرتے وقت ویگن میں گوپال کے ساتھ بیٹھی ہوئی لیزا تھوڑی دیر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ پرکاش آج کسی اچھے موڈ میں نہیں ہے اس لئے شادی کی بات نہیں چھیڑنی چاہئے۔ لیکن یکایک ہی ایک خیال تیزی سے اُس کے ذہن میں اُبھرا

گوپال سے پوچھا۔

"گوپال، کیا تمہارے ملک میں جوان اور شادی کے لائق لڑکیوں کی کمی ہے؟"

عجیب سا سوال سن کر گوپال نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا، لیکن لیزا بدستور سنجیدہ تھی۔

"نہیں تو میں بھی ابھی تک کنوارا ہوں مس لیزا۔" گوپال نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "لیکن میرے اور ...کے خیالات مختلف ہیں۔ پرکاش نے ابھی تک کسی لڑکی کو پسند نہیں کیا ہے، جبکہ میں کسی سے محبت ...نے کے باوجود کنوارا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" لیزا نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر اُس کی طرف دیکھا۔ "کیا اپنی پسند کی لڑکی سے ...کے لئے تمہیں روکا گیا ہے؟"

لیکن گوپال کی جانب سے اس سوال کا فوری جواب نہیں ملا۔ اُس کی خاموشی لیزا کو کھٹک رہی تھی۔ مگر ...ش رہ کر اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ اور ٹھیک اسی وقت سٹیشن ویگن ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں آ ...ل گئی۔ تمام سیاح اترنے کے لئے اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے پیچھے وہ دونوں بھی ...ے باہر آ گئے۔ جب بھیڑ کم ہو گئی تو لیزا نے دھیرے سے پوچھا۔ "گوپال، جسے تم نے پسند کیا وہ ...ن ہے؟"

"وہ ہے نہیں...... تھی۔" گوپال کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "مس لیزا، تم اُس کے بارے میں بہت جانتی ہو۔ کیونکہ کل ہی پرکاش نے تم سے آرتی کی بات کہی تھی۔"

"تو کیا تم آرتی سے..."

"ہاں، ہم دل ہی دل میں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔" گوپال نے ایک سرد سی آہ بھری اور آگے "پرکاش بھی ہماری اس محبت سے واقف تھا کہ اچانک ایک دن وہ کہیں غائب ہو گئی۔"

...ایک لیزا کو پرکاش کا اُداس چہرہ نظر آ گیا۔ کل اُس نے اپنی بہن آرتی کا ذکر اُس سے کیا تھا۔ لیکن ...یک بھائی کا اُداس چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ اور آج جو اُداس چہرہ اُس کے سامنے تھا وہ آرتی کے ...کا تھا۔ لیزا تھوڑی دیر تک ہمدردانہ نظروں سے اُسے دیکھتی رہی، پھر پوچھ بیٹھی۔ "تو کیا تم ساری ...آرتی کی یاد میں بیٹھے رہو گے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" گوپال نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ "لیکن جب تک میں یہ نہیں جان ...کہ آرتی کس کا شکار ہوئی ہے اور جب تک میں اُس درندے سے اس کا انتقام نہیں لوں گا اس وقت ...تک اور نہیں سوچوں گا۔" اتنا کہہ کر گوپال مڑا اور جواء خانے کی طرف چل پڑا۔ لیزا اُس وقت تک ...اُسے دیکھتی رہی جب تک وہ جوئے خانے کے دروازے میں داخل ہو کر اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس کے کانوں میں اب بھی گوپال کی آواز گونج رہی تھی...... "جب تک اُس درندے سے انتقام نہیں لوں گا اس وقت تک اور کچھ نہیں سوچوں گا۔"

...ایک ٹھنڈی ہوا کے ایک تیز جھونکے نے لیزا کو چونکا دیا اور اُس نے اپنے جسم میں ایک کپکپاہٹ سی ...اُسے لگا کہ اُس نے پرکاش کو شادی کی پیشکش کی تو وہ بھی اُسے کوئی ایسا ہی جواب نہ دے

دے۔ اور اگر اُس نے بھی ایسا ہی جواب دے دیا تو وہ کیا کرے گی......؟

❁

لیزا کے خاندان کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد پرکاش اُن سے رخصت ہونے کی رہا تھا لیکن ان لوگوں نے اُسے زبردستی یہ کہہ کر روک لیا کہ آج اُسے ان لوگوں کے ساتھ جوئے میں جانا ہوگا۔ پرکاش اُن کی ضد کے آگے مجبور ہوگیا۔ خاص کر لیزا کے ڈیڈی مسٹر پیٹر نے اُس سے
''مسٹر پرکاش، میں پچھلی تین راتوں سے مسلسل ہار رہا ہوں۔ اس عرصے میں میری جیب کافی چکی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ میں تم جیسے خوش نصیب شخص کے ساتھ مل کر کھیلوں گا تو کم سے کم ہوئی رقم ضرور واپس لاسکتا ہوں۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ تم میرا خیال کرو گے۔''

پرکاش سوچنے لگا کہ آج کے دن کی ابتداء کچھ اور ہی ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ صبح اُس کی ...نے اُس کے پاس آکر اُس سے ''بن باس'' پر چلے جانے کا عہد لیا تھا اور شام کے وقت کنواری... درشن کرتے وقت اُسے چھ سالہ کنواری دیوی کے چہرے میں اپنی گمشدہ بہن کا چہرہ نظر آیا تھا... وقت وہ لیزا اور اُس کے خاندان والوں کے ساتھ ڈنر کرتے وقت یہ محسوس کر رہا تھا جیسے بہت اجنبی لوگ اُس کے اوپر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اب کیا خبر باقی یہ رات کس طرح ختم ہوگی۔

پرکاش رات کے وقت موٹر سائیکل پر ہی گھر واپس جانا چاہتا تھا اور اسی لئے وہ گرم شال اوڑھ کر دعوت پر آیا تھا تاکہ واپسی میں ٹھنڈی ہوا نہ لگ جائے۔ اس لئے جب وہ لیزا اور اُس کے ڈیڈی کے ساتھ جوئے خانے میں داخل ہوا تو بھی گرم شال اُس کے جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ دروازے داخل ہونے کے بعد جب وہ زیرِ زمین بنے ہوئے جوئے خانے میں جانے کے لئے زینے اُتر... لیزا اُس کے برابر آگئی اور طنزیہ لہجے میں پرکاش سے بولی۔

''تمہارے مذہب میں تو پاتال کی دنیا کا بھی ذکر ہے۔ تو کیا وہ پاتال کی دنیا کہیں اس جو... جیسی تو نہیں ہوگی؟''

لیزا کی یہ بات سن کر پرکاش ہنس پڑا اور بولا۔ ''لگتا ہے ہمارے مذہب کا تم نے بڑا گہرا مطا... ہے۔''

''ہاں......'' لیزا نے کہا۔ دراصل وہ یہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ اس کی وجہ بھی تم آج رات لو... گے۔ لیکن نجانے کیوں یہ بات اُس سے کہہ نہ سکی۔

وہ زینے اُتر کر ایک روشن ہال میں آچکے تھے جہاں ایک جانب بڑے سے کاؤنٹر کے پیچھے کیشئر بیٹھے ہوئے لوگوں کو رقمیں دے رہے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک چھوٹا سا نوٹس بورڈ لگا ہوا تھا... لکھا ہوا تھا۔ ''یہاں صرف ہندوستانی کرنسی میں ہی جواء کھیلا جاسکتا ہے۔''

پرکاش کو اس بات پر حیرت بھی ہوئی کہ سیاحوں کو جوئے کی لالچ دے کر انہیں لوٹنے کا یہ ... تھا۔ لیکن ان جوئے خانے والوں اور حکومت نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کوئی بھی مقامی باشندہ ... کی لت میں گرفتار ہو کر اپنی زندگی تباہ نہ کرنے پائے۔

اچانک ہال کی داہنی جانب سے پیتل کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں جیسی آواز سن کر سب لوگ چونک ... پرکاش نے بھی گردن گھما کر اُس طرف دیکھا، وہ ایک وزن بتانے والی مشین جیسی ہی ایک مشین ... جس کے نزدیک ایک بارہ تیرہ سال کی بچی کھڑی تھی جو مشین کے اندر سے کھنکتے ہوئے سکوں کی بارش ... کر اپنی خوش قسمتی پر مسکرا رہی تھی۔ گھنٹیوں جیسی آواز انہی کھنکتے سکوں کی تھی۔ یکایک کہیں سے ایک آواز ... ''لگتا ہے بے بی کا جیک پاٹ لگ گیا ہے۔''

''چلو پرکاش، ہم بھی اس مشین سے ابتداء کرتے ہیں۔'' لیزا کاؤنٹر پر سے پلاسٹک کے ٹوکن خرید کر ... کٹورے میں رکھتی ہوئی بولی۔ ''اپنی قسمت آزمانے کے لئے سب سے آسان مشین یہی ہے۔''

''آسان اور مشکل تو نہیں، کھیلنے والوں کے لئے ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔'' پرکاش کو اس ماحول میں ... محسوس ہو رہی تھی۔ ''میں تو ان سب کھیلوں سے ناآشنا ہوں۔''

اتنی دیر میں لیزا کے ڈیڈی پیٹر اور انکل جوزف بھی نوٹوں کے بدلے پلاسٹک کے ٹوکن خرید کر رولٹ ... کے پاس آگئے۔ لیزا کے ڈیڈی پیٹر ''رولٹ'' کے شوقین تھے۔ لیکن انکل جوزف کو تاش کے تین ... سے دلچسپی تھی۔ اس لئے وہ اپنی بیوی اور مسٹر پیٹر اپنی بیوی کے ساتھ جوئے خانے کے اندرونی حصے ... طرف چلے گئے۔ شاید ان لوگوں نے پہلے ہی یہ پروگرام بنا رکھا تھا کہ لیزا اور پرکاش کو تھوڑی دیر کے ... اکیلا چھوڑ دیا جائے۔

لیزا پلاسٹک ٹوکن کے بھرے ہوئے کٹورے کے ساتھ اب ایک مشین کے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔ پرکاش کو بھی اُس کے پیچھے وہاں آنا پڑا شاید اُس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر منا لیا تھا کہ اگر ساتھ دینے ... لئے یہاں تک آہی گیا ہے تو اب دُور دُور رہنا مناسب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی جوئے ... کے تماشوں کو اپنی آنکھوں سے ایک بار دیکھ لینا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اُسے یہاں اب زیادہ دنوں ... ٹھہرنا نہیں تھا۔

مشین کے اندر ایک سکہ ڈالنے کے بعد لیزا نے پرکاش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اس شیشے کے ... مختلف رنگوں کی چرخیاں گھومتی ہیں۔'' اتنا کہہ کر اُس نے دوسرا سکہ ڈال دیا اور آگے بولی۔ ''اگر ان ... ایک ہی لائن میں ایک ساتھ تین مختلف نشانوں والی چرخیاں آگئیں تو یہ مشین سکوں کی بارش ... کر دے گی۔''

پرکاش اس مشین کی کارکردگی سے اچھی طرح واقف تھا۔ لیکن اس کے باوجود انجان بن کر لیزا کی ... سن رہا تھا۔ لیزا کے آس پاس دوسری مشینوں پر بھی لوگ اپنی اپنی قسمت آزما رہے تھے۔ کسی کی ... تھوڑے بہت سکے اُگل دیتی اور کسی کی مشین کسی دیو کی طرح اُس کے سکے ہضم کر جاتی تھی۔ جواء ... والے یہ لوگ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مشین بدلتے رہتے تھے۔ پرکاش باری باری اُن لوگوں کی حرکات ... دیکھ رہا تھا۔

پھر مشین نے سکے اُگلنے بند کر دیئے اور لیزا مٹھی بھر کر سکے سمیٹتی ہوئی خوشی سے بول اُٹھی۔ ''پرکاش، یہ تمہاری کمپنی کا پھل ہے۔ واقعی تم ایک لکی آدمی ہو۔''

پرکاش مسکرا دیا اور بولا۔ ”یہ بات مت کہو مس لیزا...... دراصل یہ مشین کسی کی طرفداری نہیں
بہت کچھ لے لینے کے بعد تھوڑا بہت واپس کرنا ہی تو اس کی چالاکی ہوتی ہے۔“

”ارے مسٹر......“ پیچھے سے اُس کی بات سن کر کسی نے کہا۔ ”تم ہمارے جوئے خانے کی ایما
الزام لگا رہے ہو۔“

دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گوپال کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”مسٹر پیٹر نے کہا ہے کہ
ہمارے جوئے خانے کو لوٹنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس لئے میں تم دونوں کو خود آمدید اور گڈلک
لئے آیا ہوں۔ لیکن مجھ سے پہلے ہماری اس مشین نے یہ فرض ادا کر دیا ہے۔ تم لوگوں کی بہترین ا
کر یہ لگتا ہے کہ صبح تک تم لوگ جیتتے رہو گے۔“

”اگر ایسا ہو گیا تو شاید تم لوگ آئندہ مجھے جوئے خانے میں آنے نہیں دو گے۔“ لیزا نے ہنس
کہا تو گوپال بھی ہنس پڑا۔ پھر بولا۔ ”نہیں مس لیزا...... ہم دوبارہ بھی آپ کو آنے دیں گے
آدمی کو ساتھ لانے کی اجازت نہیں ہوگی۔“

”تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے اس دوست کی وجہ سے جیت رہی ہوں؟“

”میں ہی نہیں، آپ خود بھی یہی سمجھ رہی ہیں۔“ گوپال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تھ
قبل آپ پرکاش سے یہی کہہ رہی تھیں۔“

لیزا یہ سن کر شرما گئی۔ اور تب گوپال، پرکاش کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”چلو، میں تمہیں اندر لے جا
تم چونکہ پہلی بار میرے اڈے پر آئے ہو اس لئے میں نے مینجر سے آدھے گھنٹے کی چھٹی لے
یہاں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یقیناً تمہیں بڑا مزہ آئے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ انہیں مجھ سے جدا کر رہے ہیں؟“ لیزا نے دوسری مشین
آزماتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، آپ انہیں لے جائیں۔ مگر میں ان کے بغیر بھی جیتنا جاری رکھ
میرا خیال ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آپ بھی دیکھئے گا۔“ بناوٹی غصے کا اظہار کرتی ہوئی لیزا پ
ڈالنے کے بعد پرکاش، گوپال کے ساتھ جوئے خانے کے اندرونی حصے میں چلا گیا اور وہاں کا منظ
کے بعد اُسے گوپال کی بات بالکل سچ محسوس ہوئی۔ یہ بڑا سا ہال جواریوں سے بھرا ہوا تھا۔ زیادہ
اپنے اپنے کھیل میں پوری طرح مصروف تھے اور جوئے خانے کے لوگ ان کے آس پاس ان کی
کے لئے موجود تھے۔ جوئے خانے کے ویٹرز بیئر، وسکی اور کولڈ ڈرنک کے گلاس ٹرے میں اُٹھا
سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ دُھندلی دُھندلی روشنی میں سگریٹ کی دھونی نے اندر کے ماحول کو ا
دُھندلا دُھندلا بنا رکھا تھا۔

”بڑا عجیب ہے انسانوں کا یہ میلہ۔“ پرکاش نے تھوڑی دیر تک چاروں طرف دیکھنے کے بعد کہ

”تمہیں کیسا لگ رہا ہے یہ میلہ؟“ گوپال نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”ہر چہرہ دُھندلاہٹ کی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔“ پرکاش نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”گوپال، یہاں
والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہاں سے کوئی آدمی ہی جیت کر جاتا ہے۔ اس کے باوجود گھوم پھر کر یہ لوگ

ں کیوں آتے ہیں؟“

”یہ ایک نشہ ہے پرکاش۔ ہر آدمی یہی سوچ کر آتا ہے کہ جیتنے والا شخص وہی ہو سکتا ہے۔ اس طرح
ی ہار جیت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور پھر یہ نشہ گہرا ہو جاتا ہے۔“ گوپال نے اُس کی بات کا
ب دیتے ہوئے کہا۔

اتنے میں جوئے خانے کے ایک آدمی نے آ کر گوپال کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر گوپال کی آنکھیں
گئیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ اُس سے بولا۔ ”ٹھیک ہے...... تھوڑی دیر تک تو چلنے دو، پھر میں آ کر
پال لوں گا۔“

”کیا بات ہے گوپال؟“ اُس کارندے کے جانے کے بعد پرکاش نے پوچھا۔ ”اگر میری وجہ سے
ری ڈیوٹی میں خلل پڑ رہا ہو تو......“

”نہیں نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اپنے دائیں بائیں نگاہ ڈالنے کے بعد گوپال نے دھیرے
کہا۔ ”وہ مجھے یہ بتانے آیا تھا کہ دو ایک مقامی آدمی یعنی یہیں کے باشندے جواء کھیلنے کے لئے بیٹھ
ہیں۔“

”تو اب......؟“ پرکاش نے پوچھا۔

”اب کیا...... تھوڑی دیر بعد میں اُنہیں پہچان لوں گا، پھر دھیرے سے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر
ں باہر چلے جانے کا اشارہ کروں گا اور وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے چپ چاپ چلے جائیں گے۔“
یہ کہہ کر گوپال ایک لمحے کے لئے رُکا، پھر بولا۔ ”یہاں مقامی لوگوں کو کھیلنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن
افسروں اور سفارت خانے کے صاحب لوگوں کو اجازت ہے۔ اس لئے صرف مقامی چہروں کو دیکھ
اُنہیں نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ میری ڈیوٹی میں یہ بھی شامل ہے کہ میں ایسے لوگوں کو پہچانوں، پھر کوئی
روائی کروں۔ تاکہ جوئے خانے میں ہنگامہ نہ پھیل جائے۔“

یہ سن کر پرکاش بے اختیار جوئے خانے میں نگاہیں دوڑانے لگا کہ شاید کوئی ایسا مقامی شخص نظر آ
ئے۔ لیکن اس کی بجائے اُسے رولٹ مشین پر لیزا کے ڈیڈی، ممی اور آنٹی نظر آ گئے اور فلش کی میز پر انکل
ف تین پتوں پر چال چلتے دکھائی دیتے۔ رمی کی میز پر مارواڑی سیٹھ بھی نظر آیا جسے شام کے وقت
رے سیاحوں کے ساتھ وہ کنواری دیوی کا درشن کرانے لے گیا تھا۔ لیکن وہ ایک بھی مقامی چہرہ نہ
ونڈ سکا۔ اور تب اُس کی ناکام کوشش پر گوپال کو ہنسی آ گئی اور اُس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

”پرکاش، ایسے لوگوں کو تمہاری نگاہیں آسانی سے نہیں ڈھونڈ سکتیں۔ کیونکہ چھپ کر کھیلنے والے تو حلیہ
ل کر آتے ہیں۔ آؤ، اب ہم ذرا آگے چلیں۔“

ہال کی دُھندلی دُھندلی روشنی میں پرکاش، گوپال کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا آگے سرکنے لگا۔ پھر اچانک
اُس نے گوپال کا کندھا دبا دیا اور رولٹ مشین پر داؤ کھیلنے والے ایک ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کر
دھیرے سے بولا۔ ”دیکھو گوپال، مجھے تو یہ شخص مقامی لگتا ہے۔ اس نے اپنا چہرہ مفلر میں چھپا رکھا ہے۔“
گوپال نے اُس شخص کی جانب دیکھا تو اُسے ہنسی آ گئی اور بولا۔ ”تمہارا اندازہ غلط ہے پرکاش۔ یہ

مقامی نہیں ہے۔ اس کا چہرہ اور اس کا حلیہ دیکھ کر تم یقین نہیں کرو گے کہ یہ ہمارے اڈے کا بہت
کھلاڑی ہے۔ سوتی کپڑے کی قمیض جس کے کالر بھی پھٹے ہوئے ہوتے ہیں، پرانی دھوتی اور پھٹے
چپل دیکھ کر اُس پر کسی غریب مزدور کا گمان ہوتا ہے۔ اگر یہ جوئے خانے کے گیٹ پر کھڑا دکھائی
لوگ اسے بھکاری ہی سمجھیں گے۔ لیکن یہ کنجوس نظر آنے والا شخص ایک جھٹکے میں بیس پچیس ہزار
ہیرا پھیری کر دیتا ہے۔"

"یہ آدمی......؟" پرکاش کو یقین نہیں آرہا تھا۔ "دیکھنے میں تو واقعی یہ کوئی مزدور لگتا ہے۔"

"اب اُس کے ساتھ کھڑے ہوئے اُس کشمیری کو دیکھو۔" گوپال نے ایک دوسرا کھلاڑی دکھا
ہوئے کہا جو عمر میں کافی بڑا تھا۔ لباس معمولی تھا لیکن اُس کے سامنے پلاسٹک کے ٹوکنوں کے دو تین
دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ بہت مالدار آدمی ہے۔

"اس بوڑھے کی نوجوان اور خوبصورت بیوی یہاں کے ایک ہوٹل میں صفائی وغیرہ کرتی ہے۔
کی تنخواہ میں تو شاید گھر کا خرچہ چل جاتا ہے۔ لیکن ہوٹل کے مسافر جاتے وقت اُسے بڑی بڑی بخشش
جاتے ہیں اور وہ ساری بخشش اس کا یہ شوہر جوئے کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔"

پرکاش نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ ہماری دیوتاؤں کی اس زمین پر جوئے خانے کھ
کر گناہ کا کاروبار کیوں شروع کیا گیا ہے؟ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا فلش کی میز پر تین پتوں کا
کھیلنے والا ایک داڑھی والا ادھیڑ عمر شخص گوپال کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور اشارے سے اُسے اپنے
بلانے لگا۔ گوپال کے ساتھ پرکاش کو بھی اُس کے قریب جانا پڑا۔ اس میز پر فلش کے چھ کھلاڑی بیٹھے
جن میں دو نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں سگریٹ تھا اور دوسری کے ہاتھ میں وہسکی کا گلا
تھا۔ پرکاش جانتا تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں جوئے خانے کی تنخواہ دار ملازم تھیں جو دوسرے کھلاڑیوں کا سا
دینے کے لئے کھیلا کرتی تھیں۔ لیزا کے انکل جوزف بھی اس میز پر کھیل رہے تھے۔ لیکن وہ تین پتوں
دنیا میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ اُنہوں نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے پرکاش کی طرف دھیان
نہیں دیا تھا۔

"بھائی گوپال، میں اس وقت چار پانچ ہزار کی جیت میں ہوں۔" اُس داڑھی والے ادھیڑ عمر شخص
گوپال کے کان میں دھیرے سے کہا۔ "میں جانتا ہوں آئندہ دو گھنٹے میں اور چار پانچ ہزار جیت لوں
پھر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ بس تم سے یہی کہنا ہے کہ دو گھنٹے بعد تم کسی طرح مجھے یہاں سے اُٹھا دینا"

اُس کی یہ بات سن کر گوپال نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا، پھر مسکرا کر بولا۔
وقت سوا گیارہ بجے ہیں۔ میں ایک بج کر پندرہ منٹ پر آپ کو یاد دلانے آجاؤں گا۔ اس وقت یہاں
اُٹھنا یا نہ اُٹھنا آپ کی مرضی پر ہوگا۔"

"دس ہزار ہوگئے تو میں بالکل اُٹھ جاؤں گا۔" داڑھی والے شخص نے کہا اور پھر سے پتے بانٹنے
مصروف ہوگیا۔

"یہ شخص بھی ایک نمونہ ہے۔" گوپال نے مسکراتے ہوئے پرکاش کو اُس کے بارے میں بتایا۔

شخص کی ایک بڑی دُکان ہے اور ہفتے میں دو تین راتیں وہ یہاں ضرور کھیلنے آتا ہے۔ چند روز
ہزار میں اس اسی طرح جیت رہا تھا۔ نو بجے سے اُس نے کھیلنا شروع کیا تھا۔ پھر دو تین گھنٹے کے اندر اُس نے کئی
بدل لیں اور اُس کی جیت ایک لاکھ تیس ہزار تک پہنچ گئی۔"

"اور پھر وہ ہارنے لگا۔ یہی نا؟" پرکاش نے کہا۔

"تم پوری بات تو سنو۔" گوپال نے اُسے ٹوک دیا۔ "میں نے اس سے کہا بہت جیت چکے ہو۔ اب
اور ساری رقم کو تجوری میں رکھ دو۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ آج تو میں تمہارا یہ جوا خانہ ہی خرید
گا۔ پھر میرے بہت سمجھانے پر وہ چلا گیا۔ لیکن یہ کہتا گیا کہ میری جیت سے تم لوگ خوش نہیں ہو۔
ن میں کل پھر آؤں گا۔"

"پھر......؟"

"وہ جیت کر گھر چلا گیا تو میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔" گوپال نے کہا۔ "کیونکہ کافی عرصہ بعد اُس
مت نے یاوری کی تھی۔ لیکن ابھی رات کے ساڑھے تین ہی بجے تھے کہ وہ واپس آگیا۔ آتے ہی وہ
نے لگا کہ مجھے گھر میں نیند نہیں آئی اس لئے میں صبح تک کھیلوں گا اور جیت کر گھر واپس جاؤں گا۔"

"پھر......؟"

"پھر صبح تک وہ ایک لاکھ تیس ہزار ہار گیا اور جاتے وقت دس ہزار کا قرض بھی چڑھا گیا۔" اتنا کہہ کر
وپال نے آگے کہا۔ "اور آج پھر کہہ رہا ہے کہ دس ہزار جیت لوں تو مجھے یہاں سے اُٹھا دینا۔"

پرکاش نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
"کہاں ہو تم......؟"

پرکاش نے گردن گھما کر دیکھا تو لیزا کے ڈیڈی مسٹر پیٹر کٹورے میں پلاسٹک کے تھوڑے سے سکے
کھڑے تھے۔ اُنہوں نے وہ کٹورا پرکاش کے سامنے بڑھا دیا اور ہنستے ہوئے بولے۔ "اب یہ پچیس
پے ہیں۔ لیکن اگر تم تھوڑی دیر میرے پاس کھڑے رہو گے تو دو چار داؤ لگ ہی جائیں گے۔"

گوپال نے بھی ان کی تائید کی اور کہا۔ "پرکاش، مسٹر پیٹر ٹھیک کہتے ہیں۔ تم ذرا انہیں کمپنی دو۔ تب
میں اُس مقامی جواری کو ڈھونڈ لوں۔" یہ کہہ کر گوپال اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد پیٹر نے پرکاش کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے رولٹ مشین کی جانب لے گیا۔ سب
ے زیادہ رش اس کھیل پر لگا ہوا تھا۔ کرسیاں کم تھیں اور کھلاڑی زیادہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بعض کھلاڑی
رسیوں کے پیچھے کھڑے کھڑے ہی داؤ لگا رہے تھے۔ مخملی میز پر ایک نمبر سے لے کر چھتیس نمبر کا حصہ نظر
رہا تھا اس کے علاوہ زیرو کے بھی دو خانے بنے ہوئے تھے۔ اس طرح کل اڑتیس خانوں پر پلاسٹک کے
رکھ کر داؤ لگایا جا سکتا تھا۔ میز پر رکھی ہوئی مشین کی چرخی جب گھومنے لگتی تو کھلاڑی اپنی پسند کے نمبر
پلاسٹک چپس رکھ دیتے تھے۔ پھر جب چرخی کسی نمبر پر رُک جاتی تو اس نمبر پر رقم لگانے والے کو ایک
کے بدلے پینتیس گنا رقم مل جاتی تھی اور باقی خانوں پر لگائی ہوئی ساری رقم جوئے خانے والے سمیٹ
لیتے تھے۔ پرکاش نے دیکھا بہت سے کھلاڑی پہلے کاغذ پر نمبر نوٹ کر لیتے تھے، پھر حساب لگاتے تھے کہ

انہیں اب کس نمبر پر رقم لگانی ہے۔

اچانک بھیڑ میں کھڑے ہوئے پرکاش کو پیچھے سے کسی نے دھکا دیا تو اُسے ذرا ہٹ جانا پڑا۔ لیکن ایسا کرتے وقت بے خیالی میں اُس کا پاؤں کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک ایسے شخص کے پاؤں سے ٹکرا گیا جس نے سر پر اُونی ٹوپی پہن رکھی تھی جس کی وجہ سے اُس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جب اُس کے پاؤں پر پرکاش کا پاؤں پڑا تو اُس نے چونک کر اوپر دیکھا۔

''مسٹر ذرا دیکھو تو سہی۔''

مگر جب پرکاش نے اُس کی جانب دیکھا تو وہ دونوں ہی سکتے میں رہ گئے۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کی آنکھیں ملیں، پھر اُس اُونی ٹوپی والے کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور پرکاش کی آنکھوں میں درد کی جھلک سی نظر آنے لگی اور وہ دھیرے سے بولا۔

''روہن......تم......؟''

''بڑے بھائی......'' روہن نے پرکاش کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی کرسی پر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پلیز، کسی کو معلوم نہ ہونے پائے۔ نہیں تو بے عزتی بھی ہو گی اور مجھے گھر سے بھی نکال دیا جائے گا۔''

''لیکن تم یہاں......؟''

''کبھی کبھی آتا ہوں۔'' روہن نے اپنی اُونی ٹوپی کو کھینچ کر اپنی آنکھیں بھی چھپا لیں اور سر جھکا کر بولا۔ ''اور ابھی چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''تم نے اتنا بھی نہ سوچا کہ تم شاہی پجاری کے بیٹے ہو۔'' پرکاش دھیمی مگر کرخت آواز میں بولا۔ ''تم نے یہ خیال بھی نہیں کیا کہ مستقبل میں تمہیں اُن کی جگہ سنبھالنی ہے؟''

''اس کے لئے تو آپ ہیں بڑے بھائی۔'' روہن کی آواز میں خوف کی کپکپاہٹ تھی۔ گرم ٹوپی کی وجہ سے اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔ ''مجھ میں تو راج پروہت بننے کی لیاقت بھی نہیں ہے۔''

''لیاقت پیدا کرنی پڑتی ہے روہن......'' پرکاش اپنے چھوٹے بھائی کو نصیحت کرنا چاہتا تھا لیکن نہ تو اس کا موقع تھا اور نہ ہی ماحول اس قسم کی گفتگو کے لئے سازگار تھا۔

روہن نے پلاسٹک کے بچے ہوئے چپس اپنے ہاتھوں سے مختلف نمبروں پر رکھ دیئے اور تب پرکاش نے اُس سے کہا۔ ''تمہاری قسمت میں راج گدی لکھی جا چکی ہے۔ جوئے کی اس چرخی سے زیادہ اہم تمہارے لئے زندگی کی چرخی ہے۔''

لیکن روہن کی آنکھیں تو رولٹ مشین کی گھومتی ہوئی چرخی پر جمی ہوئی تھیں۔ اپنی چوری پکڑی جانے کے باوجود وہ آخری بازی جیت لینے کی خواہش میں بیٹھا تھا۔

''جواء کھیلنے کے لئے تم پیسے کہاں سے لاتے ہو روہن؟'' یکایک پرکاش نے پوچھا۔ لیکن جب روہن نے اُس کے سوال کا جواب نہیں دیا تو پرکاش نے پھر کہا۔ ''جواء خانے والوں کو علم ہو چکا ہے کہ تمہاری طرح ایک دو مقامی جواء کھیلنے بیٹھ گئے ہیں۔ وہ سپروائزر بھی تمہیں مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔''

یہ سن کر روہن کے تن بدن میں کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔ رولٹ مشین نمبر تین کے ہندسے پر رُک گئی تھی اور تب بازی ہار جانے والے روہن نے رحم طلب نظروں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا اور پھر پسینہ پونچھنے کے بہانے منہ پر رومال رکھ کر وہ بھیڑ میں سے راستہ بناتا ہوا تیزی سے جوئے خانے سے باہر نکل گیا۔ پرکاش اُسے باہر جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر ایک گہرا سانس لے کر دل ہی دل میں بولا۔ ''یقیناً اس نے گھر سے ہی پیسے چرائے ہوں گے۔''

''اے مسٹر......آپ کہاں کھو گئے تھے؟'' یکایک پیچھے سے لیزا نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''وہ ساری مشینیں تو بڑی مطلبی ہیں۔ میرے سارے پیسے ہضم کر گئی ہیں۔''

پرکاش نے اُس کے بیٹھنے کی جگہ کر دی۔ لیکن لیزا تو کھڑے کھڑے ہی رولٹ دیکھنے کے موڈ میں تھی۔ ''اب دیکھنا ہے کہ تمہارا ساتھ میرے لئے کتنا فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر اُس نے سو روپے کے نوٹ کے پلاسٹک چپس لے لئے، پھر اپنے ڈیڈی کے چپس کی جانب دیکھ کر بولی۔ ''ڈیڈی، لگتا ہے آپ بھی میری طرح ہارتے رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں بیٹی۔'' پیٹر نے ہنس کر کہا۔ ''جوئے میں ہارنے والا شخص محبت کی بازی جیت لیتا ہے۔'' یہ سن کر لیزا مسکرا کر پرکاش کی جانب دیکھنے لگی۔ لیکن پرکاش کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے۔

''تم نصیب کو تو مانتے ہو نا پرکاش؟'' لیزا نے اُس کی خاموشی توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ پرکاش نے صرف گردن ہلا کر اثبات میں جواب دے دیا تھا۔ اور تب لیزا نے کہا۔

''تو جوا بھی نصیب کا ہی کھیل ہے۔ اب بتاؤ میں کس نمبر پر کھیلوں؟''

''جس نمبر پر تمہارا دل کہے، اس پر کھیل جاؤ۔''

پرکاش کا یہ جواب سن کر لیزا نے بغیر سوچے سمجھے کئی نمبروں پر پلاسٹک چپس رکھ دیئے۔ رولٹ مشین کا چکر گھومتا رہا۔ لوگ داؤ لگاتے رہے اور پرکاش چپ چاپ ہار جیت کا یہ کھیل دیکھتا رہا۔

''شاید تم بور ہو رہے ہو۔'' لیزا نے پھر کہا۔ ''مگر صرف دس روپے کا یہ آخری چپس ہی باقی رہ گیا ہے۔ اب بتاؤ تمہارا فیورٹ نمبر کون سا ہے؟''

''گنتی میں تو ہر ہندسے کی اہمیت ہوتی ہے۔'' پرکاش نے ہنس کر جواب دیا۔ ''جس پر دل چاہے کھیل جاؤ۔''

لیکن لیزا آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اچانک اُس کے ذہن نے قلابازی کھائی اور گلابی گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ اُس نے دھیرے سے اپنا چہرہ پرکاش کے کان کے پاس کیا اور دھیرے سے بولی۔ ''بائی دی وے......تمہاری عمر کتنی ہو گی؟''

''چھبیس......'' بے اختیار پرکاش بول گیا۔

''بس......بس......'' لیزا ہنس پڑی اور پھر اُس نے دس روپے کا آخری چپس چھبیس نمبر کے ہندسے پر رکھ دیا۔ لیزا کی اس چالاکی پر پرکاش کو ہنسی آ گئی اور وہ سوچنے لگا کہ جوا کھیلنے والے لوگ کس قدر توہم

پرست ہوتے ہیں۔ لیکن رولٹ مشین کی گھومتی ہوئی چرخی نے اُس کا اندازہ غلط ثابت کر دیا۔
نمبر ٹو ونٹی سکس، سن کر لیزا نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے اور خوشی سے چلاتی ہوئی بولی۔ ''میں
گئی...... پرکاش، تمہارا دیا ہوا نمبر لکی ثابت ہوا ہے۔''

اُس کی آواز سن کر سب لوگوں کی توجہ اُس کی طرف کھنچ گئی اور پرکاش سوچنے لگا کہ ایک بازی جی
یہ لڑکی اس قدر خوش کیوں ہو رہی ہے؟ صرف ساڑھے تین سو کی رقم جیت کر اتنی بڑی خوشی تو نہیں ہو
لیکن لیزا نے ایک بار پھر اُسے حیران کر دیا۔ کیونکہ لیزا نے جیتے ہوئے ساڑھے تین سو روپے
سنگھ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''میری طرف سے جوئے خانے کے سٹاف کو مٹھائی کھلا دینا
جیت تو گئی ہوں لیکن پھر بھی میں جیت کر جانا نہیں چاہتی۔''

آس پاس کھڑے ہوئے تمام لوگ اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ساڑھے تین سو کی رقم بہت
نہیں تھی، لیکن جیت کر نہ جانے والی بات جو لیزا نے کہی تھی وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مگر اس
پہلے کہ کوئی اس بارے میں اُس سے پوچھتا، اُس نے اس طرح پرکاش کی کلائی پکڑ لی جیسے جلد
وہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔ ''چلو، ہم یہاں سے کھلی ہوا میں چلے جائیں۔''

پرکاش نہ تو اُس کے ہاتھ سے اپنی کلائی چھڑوا سکا اور نہ ہی اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر
کے ڈیڈی پیٹر اُن دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرانے لگے۔ ''گڈ لک مائی ڈی
ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائے اور لیزا کے لئے خوشحالی کی دُعائیں کرنے لگے......!

❁❁❁

کہانی ادھوری رہ گئی تھی، اچانک ہی رادھا اندر آ گئی تھی۔ ''کیا پڑھ رہی ہو رما؟'' رادھا نے پوچھا۔
''کچھ نہیں دیدی۔''
''پھر بھی......''
''یہ ایک کہانی ہے۔'' رما نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''کیا بات ہے...... طبیعت ٹھیک ہے؟''
''ہاں ٹھیک ہے......''
''پھر روز کیسی ہو رہی ہے؟'' رادھا، رما کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔
''بس دیدی......'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔
''مجھے نہیں بتاؤ گی؟''
''دیدی...... ایک عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔''
''کیا......؟''
''دیدی، سنسار میں کیا سب ہمارے جیسے ہوتے ہیں؟''
''مطلب؟''
''اشیش بھگونت نے ہمیں سب کچھ دے دیا ہے، لیکن ہم ایک چیز سے محروم ہیں۔''
''وہ کیا......؟''
''پریم، محبت، پیار۔ ہم سنسار کے دشمن ہیں۔ ہم کسی کے دوست نہیں ہیں۔ ہر ایک کو نقصان پہنچانا
ری زندگی کا مقصد ہے۔ اس کے سوا ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔ جبکہ سنسار کے باسی کہتے ہیں کہ جوت سے
ت جگا کے چلو۔ پریم کی گنگا بہا کے چلو۔''
رادھا کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی، پھر اُس نے کہا۔ ''ایک بات کہوں رما؟''
''ہاں دیدی...... کہو۔''
''پچھلے چھ دنوں سے میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔''
''کیا......؟''
''میں نے...... میں نے سپنے میں پتا جی کو دیکھا۔'' رادھا کی آواز میں ایک سسکی سی اُبھری۔
''پتا جی کو......؟''
''ہاں...... میں نے دیکھا کہ ہمارے بیچ ایک گہری کھائی ہے۔ پتا جی کھائی کے اُس پار کھڑے ہیں اور

میں دوسری طرف۔ میں رو رو کر پتا جی کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہوں تو وہ بھی روتے ہیں اور کہتے ہیں
بڑی کھائی تم سب نے میرے اور اپنے بیچ حائل کر دی ہے۔ اس کے بعد بھی تم میرے پاس آنا چاہتی
''میں اُن سے پوچھتی ہوں کہ کیسی کھائی؟ تو وہ کہتے ہیں کہ سنسار میں لوگ اپنے جیسے انسانوں کی
اور بھلائی کے لئے کام کرتے ہیں۔ اور تم سب نے شیطان سے دوستی کر رکھی ہے اور اُس کے ہاتھ
ہو۔ میں نے کہا کہ پتا جی، اشیش بھگونت نے ہمیں سنسار کے وہ سارے عیش دے رکھے ہیں جو
اور سے نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ اُنہوں نے کہا، اشیش بھگونت سے ایک اور چیز مانگو۔ اگر وہ تمہیں
تو ٹھیک ہے۔ ورنہ تم کچھ سمجھو۔ موت کے بعد تمہارا کیا حال ہوگا؟ میں نے پوچھا کہ میں اشیش
سے کیا مانگوں؟ تو پتا جی نے کہا کہ اُس سے امر شکتی مانگو...... اُس سے کہو تمہیں سدا کا جیون دیدے
کیا فائدہ اس چند روز کی زندگی کے عیش کا جس کی وجہ سے تم انسان نہیں رہیں...... میرا من چاہتا تھا
کر پتا جی سے لپٹ جاؤں، مگر ہمارے بیچ کھائی تھی۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔''
رادھا نے دیکھا کہ رما کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اُس نے چونک کر کہا۔ ''ارے، ر
رہی ہو؟''
''میں......'' رما چونک پڑی۔ پھر بولی۔ ''تم بھی تو رو رہی ہو دیدی۔''
دونوں کا دل بھر آیا اور وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگیں۔ اسی وقت اُنہیں ایک پراسرا
سنائی دی اور وہ دونوں اُچھل پڑیں...... پلٹ کر دیکھا تو اشیش بھگونت تھا...... وہ ڈر گئیں کہ شیطا
کے خیالات سن نہ لے۔ لیکن شیطان پُرسکون تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔
''تم پانچوں بہنوں میں سے کون سندر ہے؟'' وہ سب اس سوال پر حیران رہ گئیں۔ شیطان
''روپا سب سے سندر ہے۔ کیوں روپا...... کیا تو بھی پاگل سونیا کی طرح اپنی سندرتا پر غرور کرتی
''نہیں بھگونتا......'' روپا نے جواب دیا۔
''کیا تو ایک دیسی سودناری کا روپ دھارن کرے گی؟ اگر تیرا پریمی ایک خوبصورت ناگ
کے ساتھ گزارا کرے گی تو؟''
''نہیں مہاراج......''
''پھر بھی، اس کا کیا جیون، تو شادی کرے گی؟''
''کس سے مہاراج......؟''
''ہے ایک دُکھوں کی ماری۔ موت سے لڑ رہی ہے۔ اور میں دوت کو دھوکہ دینا چاہتا ہوں
شیطان کچھ دیر سوچتا رہا، پھر مسکرایا، پھر مزے لیتا ہوا بولا۔
''ساون کا مہینہ، پھول نگر کی بہار کا مہینہ...... یوں تو پھول نگر پھول محل تھا۔ لیکن پھول نگر
تب آتی تھی جب سونیا اپنی سکھیوں کے ساتھ موتیوں سے سجے رتھ میں بیٹھ کر ساون رت منانے
تھی۔ پھلوں سے بھرے درخت جھوم اُٹھتے، ان کی سخت ٹہنیوں میں رنگین رسیاں لٹک جاتیں جن
بیلیں چڑھا دی جاتیں۔ ان رسیوں میں پیڑیاں اٹکائی جاتیں اور پھر مدھ بھری جوانیاں فضا

کی طرح اُڑتی نظر آتیں، اُمنگوں بھرے گیت گائے جاتے، قہقہے بلند ہوتے، ہر طرف سندر مہک
جاتی جوان کنواریوں کے بدن سے اُٹھتی تھی۔ کوئی منچلا اس خوشبو کو پالے تو پاگل ہو جائے۔ یا جینے کی
چھوڑ دے۔
ساون کے پہلے دن سونیا پھول نگر پہنچ گئی تھی۔ ہر سال آتی تھی۔ راجہ مہابت رائے کی اکلوتی بیٹی کے
پہاڑوں سے گھری اس عمارت کو تین مہینے پہلے سے سجانا شروع کر دیا جاتا تھا اور یہ ساون کے پہلے
تیار ہو جاتی تھی۔ لیکن بادل کسی کے بس میں نہیں تھے، ان کی مملکت ہی الگ تھی۔ پانی کے بوجھ
جھکے جھکے وہ آسمان کی وسعتوں میں سفر کرتے رہتے تھے۔ جی چاہا تو برسے، نہ جی چاہا تو کون انہیں
۔ ساون کی پیاس سے تپتے کنوارے پنڈے، دُھوپ جلی دھرتی کی مانند جو پانی پائے تو آگ
ٹھنڈی ہو تو کونپلیں جو پھول بنیں، درخت بنیں، رنگ بکھیر دیں۔
''بھگوان کرے یہ بادل سوکھ جائیں۔ انہیں کہیں پانی نہ ملے۔ دیکھو تو، آسمان پر ڈگر ڈگر پھر رہے
برستے ہی نہیں۔'' سونیا نے ان بادلوں کو کوستے ہوئے کہا۔
پاس بیٹھی سروجہ ہنس پڑی۔ ''جوانی ایسی ہی جھلی ہوتی ہے راجکماری جی۔ کسی کے بس میں نہیں آتی۔
کی جوانی تو بس بھگوان ہی بس میں کریں۔''
''تو بھگوان کو کون دھرتی پر بلائے کہ وہ آ کر ان بھاگتے بادلوں کو دبوچ لیں، ان کا سارا پانی نچوڑ
؟'' سونیا نے کہا۔
''بھگوان نہ سہی، بھگوان داس سہی۔ کوئی تو آئے جوان بادلوں کو نچوڑے۔'' سروجہ نے تیکھی نگاہوں
سونیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''تو نے پھر اُس کالے بینگن کا نام لیا۔'' سونیا نے چڑ کر کہا۔
''ارے رام رام...... یہ تو گھڑے میں پانی بھرنے والی بات ہے۔ میں نے اس بھگوان داس کے
تھوڑی کہا تھا؟ بھگوان نہ کرے کہ وہ کالا کلوٹا پھول نگریا میں نظر آئے۔ ساری بہار چلی جائے گی۔''
جہ نے جلدی سے کہا۔
سروانی کے کمار بھگوان داس کا رشتہ آیا تھا کماری سونیا کے لئے۔ بر دکھانے میں سونیا نے پیتل کا
اُس کے منہ پر دے مارا تھا۔ کیونکہ بھگوان داس کالا تھا۔ اُس کی اس حرکت سے دونوں ریاستوں
ٹھنی کھڑی ہو گئی تھی۔ حالانکہ مہاراجہ مہابت رائے نے اپنی لاڈلی کی اس حرکت کی معافی بھی مانگی تھی
معافی مانگنے سے بھگوان داس کی ناک تو ٹھیک نہیں ہو سکتی تھی جو پیتل کے کنارے والی تھالی سے کٹ
گئی۔ اب وہ کالا ہونے کے علاوہ نکٹا بھی ہو گیا تھا۔
''پھر کون سے بھگوان داس کے بارے میں کہا تھا؟'' سونیا نے سروجہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔
''بھگوان کا کوئی بھی داس۔ کوئی رشی، کوئی منی جو لمبے ہاتھ کر کے بادلوں کو پکڑ لے، انہیں دبائے اور
پڑے۔'' سروجہ نے شوخی سے کہا۔
''بولوں گی تو پکڑی جاؤں گی۔ پر کیا کروں؟ بولے بغیر رہا بھی تو نہیں جاتا۔'' چمپا نے آنکھیں

مٹکاتے ہوئے کہا۔
''بول، تجھے کس نے منع کیا ہے؟'' سروجہ نے کہا۔
''اول تو رشی نمی ادھر آ ہی نہیں سکتا۔ چوکی والے ادھر آنے ہی کیوں دیں گے؟ اور اگر آ
ہوش میں کہاں رہے گا کہ بادلوں کو دبائے، پانی برسائے۔ اُس کے لمبے ہاتھ آکاش کی طرف
گے ہی نہیں۔''
''کیوں......؟'' رضی نے پوچھا۔
''کون بتائے، اِی بولے تو مارا جائے۔ اپسراؤں کے دیس میں کوئی عقل کی بات کرے تو زا
چمپا نے کہا اور ہنس پڑی۔
''بھگوان نشٹ کرے ان چوکی والوں کو۔ مہاراج نے ذرا سا خیال رکھنے کا کہہ دیا کہ اُنہ
رشیوں اور نمیوں کو بھی ادھر جھانکنے پر پابندی لگا دی۔ کوئی آئے تو پانی برسے۔'' رجنی نے مسرت
بادل برسے تو سب اُچھل پڑیں۔
''کوئی آ گیا......'' چمپا اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔
پانی کی پہلی بوند نے سونیا کو چھوا تو امر ہو گئی۔ اس کے بعد برکھا شروع ہو گئی۔ دُھوپ جلی
جلے پنڈے چھن چھن بجنے لگے۔ فضاؤں میں بھاپ بلند ہونے لگی۔ پھول نگریا اگن کنڈ بن گیا۔
بھی ایسے برسے کہ ساری اگنی بجھا کر ہی دم لیا۔ دھرتی ٹھنڈی ہو گئی اور ساون کے گیت ہوا
لہرانے لگے۔
راجکماری سونیا، مہابت رائے کی اکلوتی بیٹی تھی۔ کماری اور وہ بھی اکیلی۔ جو نہ ہوتا کم تھا۔
ایک اشارے پر انہونی ہو جاتی تھی۔ مہابت رائے نے کبھی اُس کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی۔ یہی
راجکماری بہت مغرور ہو گئی تھی۔ آئینے کے سامنے اُس نے کہا۔
''کیا دھرتی کے سینے پر کوئی مجھ سا ہوگا؟''
''دھرتی پر رہنے والے سب تجھ سے ہیں کماری۔'' آئینے سے آواز اُبھری۔
سونیا نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''یہ تو بولا تھا......؟'' راجکماری نے تعجب سے کہا۔
''تو نے مجھ سے ہی تو پوچھا تھا۔''
''دھرتی پر کون مجھ سا ہے؟ میں جب تیرے سامنے آتی ہوں تو، تو روشن ہو جاتا ہے۔''
''تجھے کیسے معلوم؟'' آئینے نے پوچھا۔
''میری آنکھیں دیکھتی ہیں۔''
''یہی تو جھوٹ ہے سونیا...... میں جیسا ہوں، ویسا ہی رہتا ہوں۔ تیری جھوٹی آنکھیں تجھ
کہ میں جل اُٹھا۔ منش کے من میں ہی تو جھوٹ سچ چھپا ہوتا ہے۔ سچ کی آنکھ سے دیکھے تو سنار
ہے۔ ماٹی اور پانی کے گندے ہوئے سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تو نے شمشان گھاٹ میں جلتا
ہے، سب کی سب ایک سی۔ سچ ہے وہ کماری۔ باقی سب آنکھ کا پھیر ہے۔''

''یہ تو کیا درپن ہے اے...... بولتا ہے۔'' سونیا نے کہا۔
''سارے درپن بولتے ہیں، کوئی سنے تو۔ پر کان بھی جھوٹے ہوتے ہیں۔ سنتے سب کچھ ہیں لیکن
مانتے وہ ہیں جو جھوٹ ہو۔''
راجکماری سونیا بجھ گئی۔ یہ انوکھی بات ہے۔ اُس نے سوچا۔
ساون بیت گیا۔ بھادوں بھائی سے گلے مل روتی چلی گئی۔ کوئی رشی، کوئی نمی پھول نگریا نہیں آیا۔ آیا
ہوگا تو چوکی والے اُسے اندر کہاں آنے دیتے؟ مہاراج کی طرف سے بلاوا آ گیا تھا۔ موتی جڑے
بھیج دیئے گئے تھے۔ پھول نگر خالی ہو گیا۔ ہر پائے راستوں پر رتھ میں جڑے بیلوں کی گھنٹیاں بجتے
ہیں۔ بہن بھائی آتے چلے گئے پر دھرتی پر اپنی نشانی چھوڑ گئے تھے۔
چر کلا محل پھول نگریا سے بیس کوس کے فاصلے پر تھا۔ بیل دن میں دس کوس سے زیادہ سفر نہیں کر سکتے
تھے۔ چنانچہ ان کے سفر کی پہلی رات بستی اتناسری کے قریب ہوئی۔ اتناسری کا جاگیردار گوند پال سواگت
کے لئے کھڑا تھا۔ پتہ چل گیا تھا کہ راجکماری گزرنے والی ہے۔ مگر سونیا نے کہا۔
''ایک رات ہی کی تو بات ہے گوند چاچا۔ ہم یہیں بیل گاڑیوں میں گزار لیں گے اور صبح کو چلے جائیں
گے۔''
''رام رام...... اگر ایسا ہوا تو گوند، اتناسری چھوڑ دے گا۔''
''تو چھوڑ دیں چاچا۔ یہ آپ کی خوشی ہے۔'' راجکماری نے شوخی سے کہا۔
''داس کا جھونپڑا راج محل جیسا تو نہیں، ہاں راج کماری ایک رات اُس میں رُک جائیں تو وہ راج محل
بن جائے گا۔''
''جھونپڑے ہمیں بہت برے لگتے ہیں۔ ہم ان میں کبھی نہیں جائیں گے۔'' سونیا نے کہا۔
''راجکماری، چل کر تو دیکھیں۔''
''ہم جھونپڑے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ کیوں سروجہ؟'' اُس نے ساتھ بیٹھی سروجہ سے پوچھا۔
''ٹھیک ہے گوند چاچا، آج ہمیں یہیں بھگوان محل میں رہنے دو۔'' سروجہ بولی۔
''بھگوان محل؟'' گوند جاگیردار نے تعجب سے پوچھا اور لڑکیاں ہنس پڑیں۔
''ہاں گوند چاچا۔ یہ بھگوان محل ہی تو ہے جس کی نہ چھت، نہ دیواریں۔ چاروں طرف سے کھلا کھلا۔''
سروجہ نے کہا۔
''راج کماری مذاق کر رہی ہیں۔'' گوندا نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔
سونیا نے وہیں کھلے میدان میں ڈیرے ڈال دیئے۔ سماں حسین تھا۔ ڈھلے ڈھلے آسمان پر چاند نکل آیا
تھا اور دھرتی پر دیئے جل اُٹھے تھے۔ کچھ دُور ایک ندی روانی سے بہہ رہی تھی۔
رات گہری ہوئی تو راجکماری نے سوتی ہوئی چمپا، سروجہ اور دوسری لڑکیوں کو جگا دیا۔
''نیند سے مری جا رہی ہو۔ آؤ ندی پر چلیں۔ مزہ آ جائے گا۔'' راجکماری نے کہا اور آن کی آن میں
کماری لڑکیاں تیار ہو گئیں۔ جنگل میں منگل ہو گیا تھا۔ وہ سب کھلے آسمان تلے اپسرائیں لگ رہی تھیں جو

ابھی ابھی اندر سبھا سے اُٹھ کر آئی تھیں۔

"سچ کماری، دھرتی کتنی سندر ہے۔ پر اس سندرتا میں ایک بڑی کمی لگے ہے۔" سروجہ نے

"کیسی کمی؟"

"کسی من موہن کی۔ کسی کے موٹے موٹے مسکراتے ہونٹ، چوڑی چھاتی، مضبوط بازو،
تو جیون ادھورا ہو جائے ہے۔" سروجہ نے سسکی سی لے کر کہا۔

راجکماری مسکرا دی۔ اُس نے کستوری کو پاس بلایا اور اُس کے کان میں کچھ کہہ کر اُ
طرف بھیج دیا، پھر سروجہ سے بولی۔ "کوئی من موہن ہے تیرے من میں؟"

"ہائے، اس کا سمے ہی کہاں ہمارے پاس؟" سروجہ نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"کتنا سمے چاہئے تجھے؟" سونیا نے پوچھا۔

"سارا جیون...... بلکہ وہ بھی کم ہوتا ہے۔" سروجہ نے کہا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کستوری ایک موٹے تازے رتھ بان کو لے کر آ گئی جس کا بدن
آنکھوں میں لگا کاجل گالوں پر پھیلا ہوا تھا۔ سر کے عین درمیان موٹی سی چٹیا جھول رہی تھی۔

"جے راجکماری کی۔" اُس نے قریب آ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"من موہن راجکماری جی۔" رتھ بان نے جواب دیا۔

"سروجہ تمہیں یاد کر رہی تھی۔ جیسا یہ کہے، ویسا کرو۔" سونیا نے کہا اور سروجہ کا منہ حیر
گیا۔ لیکن سونیا اتنی دیر میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

سروجہ جو شریر اور آفت کی پرکالا تھی سمجھ گئی، راجکماری نے بھگوان داس کے نام کا بدلہ لیا ہے۔
من موہن بے چارہ پریشان کھڑا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"من...... موہن۔" من موہن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کس نے رکھا ہے؟"

"میرے ماتا پتا نے کماری جی۔"

"تب تمہارے ماتا اور پتا کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"کماری جی کی سکھی۔"

"راجکماری نے خود کہا ہے جو میں کہوں وہ کرو۔"

"کہا ہے کماری جی۔"

"تب اُلٹے کھڑے ہو جاؤ اور زور زور سے کہو کہ تمہارا نام من موہن نہیں بلکہ گوبردھن گو
جلدی کرو۔ ورنہ چابک مار مار کر تمہاری کھال اُتار لی جائے گی۔"

"ارے دیا رے دیا...... اُلٹا ناسی کھڑا ہو جائے گا ہم سے۔ کماری جی، شما کر دیں۔"

"جلدی کرو۔ ورنہ جان سے جاؤ گے۔" سروجہ کڑک کر بولی اور بے چارہ من موہن اُلٹا کھڑا ہونے
میں دھپ دھپ گرنے لگا۔ لیکن اُس کی زبان تیزی سے چل رہی تھی۔

"میرا نام گوبردھن گولو ہے...... میں گوبردھن گولو ہوں......"

"کہتے رہو۔ اور جو کر رہے ہو، کرتے رہو۔ ایک پل کے لئے رُکے تو......"

من موہن کو جان پیاری تھی۔ اُلٹا تو اُس سے ایک بار بھی نہ کھڑا ہوا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے
گولو بن گیا تھا۔

سونیا دُور سے سکھیوں کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ہنس کر بولی۔ "یہ سروجہ بڑی نٹ کھٹ
اُلٹا چکر چلا دیا ہے اُس نے بے چارے پر۔"

سے قبل کہ وہ آگے بڑھ کر اُس کا حال دیکھتیں، سروجہ خود ہی اُن کے پاس پہنچ گئی تھی۔

"کیوں...... اپنے من موہن کے پاس نہیں رُکی؟" سونیا نے پوچھا۔

"میں کیا کروں...... خود چل کر دیکھ لو، وہ اب من موہن نہیں، گوبردھن گولو ہے۔"

"بڑا ستیاناس۔" سونیا ہنس پڑی۔ "یہ کیا کر رہا ہے؟"

"اپنا نیا نام یاد کر رہا ہے۔ ایسا یاد رکھے گا کہ جیون بھر بھولے گا نہیں۔" سروجہ نے جواب دیا۔

نیا نے خود ہی بے چارے من موہن کو اس مصیبت سے نجات دلائی تھی۔

لے آسمان کے نیچے سونیا کو بہت مزہ آ رہا تھا۔ جب تک جاگتی رہی، سکھیوں سے ہنسی مذاق کرتی
سکھیاں سو گئیں۔ اُس نے اُنہیں سوتے ہوئے دیکھا۔ خود اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنی آرام
باہر نکل آئی۔ دُور دُور تک حسین چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔ اور دفعتہً وہ رُک گئی۔
کے کنارے اُسے دو ننھی منھی روشنیاں جلتی نظر آئی تھیں۔ اُس نے چوڑے پھن والے اُس ناگ
جو کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ سونیا کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ لیکن اُس کی آواز سنتے ہی سانپ
پانی کی طرف رینگ گیا۔

ماری جلدی سے واپس پلٹ پڑی۔ اُس کی چیخ کی آواز سن کر سکھیاں دوڑ پڑیں۔

"کیا ہوا کماری جی...... کیا ہوا؟ کہاں چلی گئی تھیں......؟"

"ہائے رام...... ایسے ہی نکل آئی تھی ندی کے کنارے۔ بہت بڑا سانپ دیکھا ہے میں نے۔"

"ناگ......؟" سروجہ نے کہا۔

"ہاں...... یہ لمبا کالا۔"

"بھگوان کی سوگند کماری، یہ سانپ پھول نگریا سے ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔" سروجہ نے کہا۔

"کیا بک رہی ہے ری...... مجھے ڈرا رہی ہے؟"

"آپ کی سوگند کماری جی۔ میں نے بھی اُسے دیکھا ہے۔" چمپا نے کہا۔

"ارے وہ کوئی دوسرا ہوگا۔ بھلا کوئی ناگ ہمارا پیچھا کیوں کرے گا؟" سونیا نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کماری جی سے پریم کرنے لگا ہو۔"

"اب ناگ بھی مجھ سے پریم کریں گے؟ چلو، تمہیں تو بس بات بنانے کو چاہئے۔" کماری نے
اپنی آرام گاہ میں آ گئی۔

دوسری صبح یہ قافلہ دوبارہ چترکلا چل پڑا۔ گوند نے صبح کا ناشتہ ان لوگوں کو دیا تھا۔ پھول نگری کی
ختم ہو گئیں، لیکن راج محل بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اکلوتی راج کماری کے لئے ہر موسم ساون کا
راجہ مہابت رائے کو ان دنوں فکر پڑی ہوئی تھی کہ کسی اچھے بر کو دیکھ کر راجکماری کو بیاہ دیا جائے۔
سونیا کے خیالات جانتے تھے کہ وہ کسی معمولی راجکمار کو پسند نہیں کرے گی۔ کئی بر آئے تھے لیکن وہ
کیڑے نکال دیتی تھی۔ جب وہ پھول نگر یا گئی ہوئی تھی تو راجہ مہابت رائے نے اپنے اچھے دوستو
بات کی تھی۔ کنور پرتاب چکروتی نے کہا۔

"کماری جی تو اس طرح کبھی نہ مانیں گی مہاراج۔ کوئی ایسا کام کریں کہ بات بنے۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں چکروتی جی۔ ایسا کیا کام ہو؟" مہابت رائے نے فکر مندی سے کہا۔

"ایک بات کہوں مہاراج؟" سنت رام سہائے نے کہا۔

"چپ کیوں ہو سنت جی؟"

"آپ سوئمبر رچا دیں۔ سارے راجاؤں کو سوئمبر میں بلالیں اور کماری جی سے آخری بات کہ
انہی میں سے انہیں کوئی بر چننا ہے۔"

"اوہ سنت جی، یہ دور سوئمبر کا کہاں ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟"

"کوئی کچھ نہیں کہے گا مہاراج۔ ریاست چترکلا کوئی معمولی ریاست نہیں ہے۔ اس کی اکلوتی
نجانے کتنوں کی آرزو ہوگی۔ آپ بھگوان کا نام لے کر سوئمبر کا اعلان کر ہی دیں۔" سنت رام نے
کہا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی اور مہابت رائے تیار ہو گئے۔ طے یہ کیا گیا کہ را
پھول نگر سے واپسی کے بعد فوراً سوئمبر رچا لیا جائے۔ اس سے پہلے سارے کام مکمل کر لئے جائیں
راج کماری کو اس بارے میں پتہ نہیں تھا، لیکن کستوری کو یہ بات معلوم ہو گئی اور وہ پیٹ پکڑ
کے پاس پہنچ گئی۔

"کچھ سنا کماری جی...... اور سنا تو سکھیوں کو خبر تک نہ دی۔"

"کیا ہوا اری...... کیا سنانے آئی ہے؟" سونیا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہنجو گتا سچ رہی ہے۔ پرتھو چوہان کی راہ تکی جا رہی ہے۔ کماری جی کا سوئمبر ہو رہا ہے۔"

"کیا الٹی سیدھی بک رہی ہے......؟"

"بھگوان کی سوگند، سچ کہہ رہی ہوں۔ سارے انتظام ہو گئے ہیں۔ پرانے محل کے آ
انتظامات ہو رہے ہیں۔ آس پاس کی ریاستوں کے راجکمار آنے والے ہیں۔ اب تو ور مالا کسی
میں ڈالنی ہی ہو گی۔"

راج کماری کی آنکھوں میں رنگین خواب جاگ اٹھے۔ کون ہوگا وہ جس کی گردن کی طرف
ہاتھ بڑھیں گے؟ ہائے رام، کیسا لگے گا مجھے......؟

نے کو اس نے آئینے سے پوچھا۔ "ہوگا کوئی مجھ جیسا......؟"

ب تجھ جیسے ہیں کماری۔ سب ماٹی ڈھلے ہیں۔ سندرتا تو من میں چھپی ہوتی ہے۔"

تو پاگل ہے۔ تجھ سے بات کون کرے؟" راج کماری نے منہ بنا کر کہا۔

ہیں ہمیشہ سچ بولتا ہے کماری جی۔ جیون مرن کا کھیل سب پر ایک ہے۔ ماٹی ڈھلے، ماٹی سے اُٹھتے
ور ماٹی ہی بن جاتے ہیں۔ تم کسی سے الگ نہیں ہو۔" آئینے نے کہا اور وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

پرانے محل کے آس پاس راجکماروں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ دُور دُور سے کمار سوئمبر میں حصہ لینے
آئے۔ چترکلا محل میں بھی دیوالی اتر آئی تھی۔ مہاراج مہابت رائے سوئمبر سے پہلے راجکماروں کی
کر رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے۔ راجکماری پر سامنے کے حصے میں جانے کی پابندی لگا دی گئی تھی۔
اس کی سکھیاں پھر بھی چھپ چھپا کر اُسے راجکماروں کی صورتیں دکھا رہی تھیں۔ پھر ان پر تبصرے
ہوئے کیڑے نکالے جاتے۔

راج کمار بھی خوب من چلے تھے۔ اُس رات رجکماری سونیا کھانے کے بعد سکھیوں کے ساتھ پچھلے باغ
رہی تھی کہ یکا یک ایک اونچے پیڑ کی چوٹی سے کوئی نیچے کود آیا اور سب اُسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔
آنے والا ایک خوبصورت بانکا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تاروں کے بیچ چاند کی پرکھ میں کوئی
نہیں ہوتی۔ تو میں نے چاند دیکھ لیا ہے۔ تم ہی راجکماری سونیا ہو۔"

"تم کون ہو؟" راجکماری نے غصے سے پوچھا۔

"سورج سنگھ...... ریاست دھیرا کا راجکمار۔"

"یہاں کیوں آئے ہو؟"

"دیکھنے کے لئے کہ جو ہاتھ میرے گلے میں ور مالا ڈالیں گے، وہ خود کیسے ہیں؟" اُس نے بے باکی

"تمہارے گلے میں؟" سرسوتی نے پوچھا۔

"ارے اور کون سا گلا ایسا ہے جس میں سونیا، ور مالا ڈالے گی۔ جب راجکماری کے ہاتھ میری طرف
اٹھے تو میں خوشی سے گردن جھکا دوں گا۔" سورج سنگھ بولا۔

"جانے کا کیا لوگے؟ یا پھر چوکیداروں کو بلایا جائے؟" سونیا نے کہا۔

"جانے کا جو لوں گا وہ ملے گا نہیں۔ اس لئے جا رہا ہوں۔ جس کام کے لئے آیا تھا وہ ہو گیا۔" اُس
اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔

"ارے سنو تو مہاراج۔" سروجہ نے کہا۔

"ہاں کہو......" وہ رک گیا۔

"ہمیں کب سے نہیں دیکھا؟"

"یہاں آنے سے پہلے دیکھا تھا۔"

"کچھ بتایا نہیں اس نے؟"

''کہتا تھا سورج بھان، وہ آنکھ ہی نہیں بنی جو تجھے دیکھے اور بھول جائے۔ اور مجھے درپن پر
ہے۔''
''پر مہاراج، آپ کا ایک پاؤں چھوٹا، دوسرا بڑا ہے۔ ایسے کسی اور پیڑ سے کودے ہوں گے
نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
وہ چلا گیا تو سب اُس کے بارے میں باتیں کرتی اور قہقہے لگاتی رہیں۔ یہ ایک واقعہ نہیں تھا۔
کماروں نے راج کماری کے ساتھ طرح طرح کی حرکتیں کی تھیں۔ لیکن وہ دونوں تو سب سے
لے گئے۔
راجکماری کی خوابگاہ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن وہ کھلے دروازے سے اندر آئے تھے۔
سادھوؤں کا سا بھیس بنائے ہوئے تھے۔ سونیا پہلے تو ڈر گئی، لیکن پھر اُس نے سمجھ لیا کہ یہ کون ہو سکتے
''تم نے یہاں گھسنے کی ہمت کیسے کی؟'' وہ بپھر کر بولی۔
''ہمیں کوئی کہیں نہیں روک سکتا کماری۔ کیوں چیلے؟'' ایک نے دوسرے سے کہا۔
''ہاں گرو...... ہمیں کون روک سکتا ہے؟'' چیلے نے کہا۔
''ابھی پہرے والے آجائیں تو ساری بہادری نکل جائے گی۔ تم ہو کون؟ کیا سوئمبر میں آئے
''یہی سمجھ لو کماری۔ لیکن ہمارا کام دوسرا ہے۔''
''کیا......؟''
''ہم تمہاری گردن میں موت کی مالا ڈالنے آئے ہیں۔ اونچے سنسار سے یہی آگیا ملی ہے
تمہیں لے آئیں۔ میں یم دوت ہوں اور یہ میرا چیلا۔''
''کون ہو......؟''
''یم دوت...... موت کا فرشتہ۔'' اُس نے جواب دیا اور راجکماری کا چہرہ زرد پڑ گیا۔
''ہائے رام، یہاں کیوں آئے ہو؟'' اُس نے خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔
''تمہاری پران نکالنے۔ تمہارا سمے پورا ہو گیا ہے۔ اونچے سنسار کی باتیں کون جان سکتا ہے؟ ادھر تم
لئے سوئمبر کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ تمہارے بھاگ میں نہیں ہے کماری۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''
''شما کرو یم راج مہاراج...... شما کرو۔ ابھی تو میں نے سنسار میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ میری
ہو جانے دو۔'' راجکماری کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس کا بدن بری طرح کانپنے لگا تھا۔
''انسان کی آرزوئیں تو کبھی ختم نہیں ہوتیں کماری۔ شادی ہو جائے گی تو کہو گی چار چھ بچے
جائیں۔ پھر تم سوچو گی کہ دادی نانی بنوں...... یہ سنسار لالچ کا گھر ہے۔ پر منش کا سوچا کب پورا ہوتا
''یم راج مہاراج...... شما کرو۔ کوئی اپائے کرو...... ہائے رام، میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے
راج، بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔'' سونیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
''ارے رے رے...... اتنا رونے کی کیا ضرورت ہے کماری؟ سنسار سے ہر کسی نے جانا ہے
آج نہ سہی کل سہی۔ دھرتی کے رہنے والے جانے کیوں اس بات کو بھول جاتے ہیں۔''

''پر مہاراج یم راج، اتنی جلدی...... ہائے رام میری سکھیاں جیتی رہیں گی اور میں مر جاؤں گی۔ نہیں
راج جی، کوئی اپائے کرو۔ میرا جیون بچاؤ۔''
''اپائے......؟'' یم دوت سوچ میں ڈوب گیا، پھر اُس نے دوسرے سے پوچھا۔ ''چیلے، کوئی اپائے
کچھ کر سکتے ہیں ہم اس ناری کے لئے؟''
''اپائے ہے مہاراج...... پر کیا فائدہ؟ تین برس ہوتے ہی کتنے ہیں۔''
''تین برس؟'' یم راج نے چیلے کو گھورتے ہوئے کہا۔
''ہاں مہاراج۔ اس کی عمر والی اسی دن اور اسی سمے پیدا ہونے والی ایک ابلا ہے۔ نام اُس کا کومل ہے
یہاں سے بہت دُور ایک شہر میں رہتی ہے۔ پر وہ ناچن کاری ہے اور ناچ گا کر جیون بتا رہی ہے۔
روہ بھگوان پر اتفا کرتی ہے کہ ہے بھگوان، مجھے موت دیدے۔ پر اُس کے جیون کے تین سال ابھی
ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو مہاراج اس کے جیون کے تین برس اسے دے دیں۔''
''ہوں......'' یم راج کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''ہو تو سکتا ہے...... اُسے جیون کی آرزو ہے اور اُسے
نی کی۔ ہیر پھیر اچھی بات تو نہیں ہے۔ لیکن راج کماری کی آرزو پوری ہو جائے تو اچھا ہے۔ کیوں
کماری، تو جیون کے تین سال نہیں پسند کرے گی؟''
''بس تین سال مہاراج......؟''
''ناچن ہاری کا جیون اتنا ہی ہے۔''
''تو میں ناچن ہاری بن جاؤں گی؟''
''جینا چاہتی ہے تو بس یہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔'' یم راج نے کہا۔
''ایسا نہ کروں گی تو مر جاؤں گی۔''
''ابھی، اسی سمے؟''
''نہ نہ مہاراج...... میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے جیون دے دو۔ ناچن ہاری کا جیون ہی سہی۔'' سونیا
آنسو بہاتے ہوئے کہا۔
''چیلے......'' یم راج نے آواز دی۔
''جی گرو مہاراج......''
''اس کے پران نکال کر کمنڈل میں ڈال لو اور ناچن ہاری کے۔''
''جو آگیا گرو جی۔'' چیلے نے کہا اور دونوں ہاتھ بلند کر لئے۔ اُس کے ہاتھوں کے ساتھ سونیا کے
ناپر پڑتے جا رہے تھے اور سونیا کے بدن کی جان نکلتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کا منکا ڈھلک
یا۔ سونیا اپنے من کی آنکھوں سے اپنے بے جان شریر کو گھور رہی تھی۔ اب شریر اس کا نہیں تھا۔ گورے
بھرے سڈول ہاتھ پاؤں، پتلی سی کمر، تیکھے نقوش...... یہ سب کچھ اب سے کچھ دیر پہلے اس کا تھا، پر اب
ٹی تھا۔ سچ ہی تو کہا تھا درپن نے، ماٹی کا کھیل ہے۔ سب ماٹی کا کھیل۔
پھر یہ سب کچھ اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب اُس کے چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔

وہ اب یم دوت کے کنڈل میں تھی اور اُس کا ہلکا پھلکا وجود ہواؤں کے دوش پر تیر رہا تھا۔ پھر ا
کانوں میں ڈھولک کی تھاپ اور سارنگی کے سُر اُبھرے۔ اس کے ساتھ ہی اُسے گھنگھروؤں کی جھ
سنائی دی تھی۔ پھر اُس کے پران کھنڈلی سے نکال لئے گئے۔ اُس نے دیکھا ایک ریلی رس بھری
ساڑھی باندھے سر سے پاؤں تک سنہرے زیوروں میں ڈوبی زمین پر بچھے قالین پر تھرک رہی تھی
طرف سازندے ڈھولک، ہارمونیم اور سارنگی بجا رہے تھے۔ اُن کے آگے دو لڑکیاں ستار سنبھا
تھیں۔ دو لڑکیاں ''نئی چونری رنگ ڈاری...... کیسو بیداری بنواری'' گا رہی تھیں۔ اُن کے کچھ
بوڑھی نائکہ دُلہن بنی پان کھا رہی تھی۔ چاروں طرف سے آہ، واہ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔
دھوتی، کھدر کے کرتے، زربفت کی شیروانی، لٹھے کے پاجامے، گالوں میں پان دبائے، آنکھوں م
لگائے، ترچھی ٹوپیوں میں سجے گھنی مونچھوں میں پھندے چمکیلی آنکھوں سے تھرکنے والی کے وجود
بخرے کر رہے تھے۔

''یہی ہے کومل کماری۔'' چیلے کی آواز اُبھری۔

''آہ...... یہی ہے سسری۔ سندر تو ہے۔'' کماری کی آواز اُبھری۔

''بڑی سندر۔ پورے شہر میں اس کے دیوانے بھرے پڑے ہیں۔'' چیلے نے جواب دیا۔

''تو تیار ہے سونیا......؟''

''ہاں مہاراج......'' سونیا نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''چیلے، کام شروع کرو۔'' یم دوت کی آواز اُبھری۔

''جو آ گیا مہاراج۔'' چیلے نے کہا اور دونوں ہاتھ بلند کر لئے۔ دفعتہً ناچن ہاری کے قدم لڑ
اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑ لیا...... اُس کے منہ سے ہائے رام، ہائے رام کی آوازیں
رہی تھیں۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

یم راج کی آواز اُبھری۔ ''کماری سونیا......''

''مہاراج......''

''ابھی تک تم سونیا ہو۔ لیکن اب سے کچھ دیر کے بعد صرف کومل کماری ہو گی۔ سوچ لو۔ کبھی
نہیں کہو گی کہ تم سونیا تھیں۔ جس سمے تم نے یہ شبد منہ سے نکالے، وہ تمہارا آخری سمے ہو گا۔ کسی
خود کو کومل کماری سمجھو اور کہو۔''

''جی مہاراج......'' سونیا نے کہا۔

دوسری طرف کہرام مچ گیا تھا۔ کومل کماری کا سارا بدن پسینے میں بھیگ گیا۔ وہ زمین پر پڑی
ہائے کر رہی تھی اور اُس کی آنکھیں پتھراتی جا رہی تھیں۔ ہال کمرے میں بیٹھے سارے لوگ اُس کے
ہو گئے تھے۔ نائکہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ سازندے شور مچا رہے تھے۔

''سب لوگ ہٹ جاؤ...... ارے ہوا تو آنے دو۔ کیا جان لو گے کومل کی؟ ہٹو، سب ہٹو۔''

''ارے وید جی کو بلاؤ...... کوئی جلدی وید جی کو لاؤ...... اندر لے چلو۔ میری کومل کو اندر لے

نچ رہی تھی۔ اور پھر سونیا کو لگا جیسے اُسے شریر مل گیا ہو۔ اُس کا ہلکا پھلکا وجود پھر بوجھل ہو گیا تھا۔
بوجھل جیسے پہلے تھا۔ کومل کماری کا جیون اُسے مل گیا تھا۔ تین سال کے لئے...... صرف تین سال
لئے۔

اُسے اندر لایا گیا۔ مسہری پر لٹایا گیا۔ وید جی آئے، مشک سنگھایا گیا۔ ماتھے پر صندل لگایا گیا اور وید
نے کہا۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔ اب یہ ٹھیک ہے۔ بس گرمی سے گھبرا گئی تھی، اور کوئی بات نہیں ہے۔''

''بھگوان تیرا شکر ہے...... بھگوان تیرا شکر ہے۔'' نائکہ کی آواز اُبھری۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہی
راج کماری سونیا ساری باتیں سن رہی تھی، لیکن اُس کی زبان بند تھی۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔
سے بیسوا بن گئی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ اس زندگی کو کیسے گزارے گی؟ ایک دن وہ تھا جب سورج
تو سکھیاں ساز بجا بجا کر اُسے جگاتیں، پیروں کے نیچے برتن لا کر رکھے جاتے، چہرہ دُھلایا جاتا،
بوئیں مل جاتیں۔ ہر آنکھ میں احترام ہوتا۔ ہر دل میں پیار۔ مگر آج وہ صرف ناچنے والی تھی جس کی
شام ڈھلے شروع ہوتی تھی اور آدھی رات گزرے ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد یہ سب چلتی پھرتی
جان لاشیں تھیں جو کبھی کسی کے رحم و کرم پر ہوتیں اور کبھی بستر کی تنہائیوں میں۔

کماری سونیا کو اس زندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ جب راج محل میں کوئی جشن ہوتا تو
ہندستان کے کونے کونے سے ناچنے والیوں کو بلایا جاتا اور دن رات مجرے ہوا کرتے تھے۔ لوگوں کی
ہیں ان کے کومل جسم پر پڑتیں۔ آہ اور واہ کی آوازیں بلند ہوتیں۔ ہر شخص انہیں حاصل کرنے کا خواہاں
ا۔ اور جس کے پاس زیادہ دولت ہوتی وہ اُن کا مالک بن جاتا۔

راجکماری سونیا کی سہیلیوں نے اُسے بتایا تھا کہ یہ لڑکیاں عورت کے نام پر کلنک ہوتی ہیں اور اچھے
روں میں انہیں نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ راج کماری سونیا نے بھی آج تک ان لڑکیوں کو
ائی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اُن کے تھرکتے بدن، کھنکتی مسکراہٹیں ہر شخص کے لئے ہوتی تھیں اور کماری
یا نے خود سوچا تھا کہ وہ، جو سب کے لئے ہوتی ہیں، کبھی قابل احترام نہیں ہو سکتیں۔ وہ عورتوں سے
لگ کوئی چیز ہوتی ہیں۔ جن کی شکل و صورت عورتوں جیسی ہوتی ہے۔ لیکن آج کیا تھا؟ آج وہ خود انہی
سے ایک تھی۔

وید جی چلے گئے تھے۔ اُسے آرام کی ہدایت کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ بوڑھی چندرا بھی باہر نکل گئی جو
کومل کماری کی ماں تھی۔ ان سب کے جانے کے بعد کماری سونیا نے آنکھیں کھولیں، اپنی اس عیش گاہ کو
دیکھا اور اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کہاں راج محل، موتیوں سے سجا ہوا حسین پلنگ،
دیواروں پر آویزاں ہیرے جواہرات سے بنے سجاوٹ کے فانوس اور نجانے کیا کیا۔ اس کمرے کو بھی
آرائش دی گئی تھی۔ لیکن راج محل اور طوائف کے کوٹھے میں فرق ہوتا ہے۔

اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے اپنے پیروں کی طرف دیکھا، اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ یہ سب کچھ
خوبصورت تھا۔ ٹخنوں کے قریب کالا سا نشان بنا ہوا تھا۔ یہ گھنگھروؤں کا نشان تھا جو اُس کے پیروں کی

زینت ہوتے تھے۔کومل کماری کو اُس نے رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔اور جب یم راج نے بتایا کہ وہی بینوا ہے۔جس کا روپ اس نے لینا ہے تو کماری نے سوچا تھا کہ چلو کومل سندر تو ہے۔لیکن اب جو اُس نے کومل پر غور کیا تو اُسے یہ سب کچھ بہت عجیب لگا۔اب ہر نگاہ اس کی طرف اُٹھے گی اور اسے کبھی بھی ایک باعزت مقام حاصل نہیں ہو سکے گا۔ہائے رام،تھوڑے دن پہلے ہی کی تو بات ہے کہ لوگ اس کے راستے میں آنکھیں بچھاتے تھے۔کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ آنکھیں اُٹھا کر اس کے پورے شریر کو دیکھ لے۔لیکن کل جب وہ رقص کرے گی تو چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کی نگاہیں اُس کے بدن کے ایک ایک زاویئے کو تولیں گی۔زمین میں شرم سے گڑ نہ جائے گی وہ؟ لیکن اب یہ سب کچھ اس کی زندگی میں شامل تھا۔نجانے کب تک آنسو بہاتی رہی۔

دن کو گیارہ بجے دو لڑکیاں ہاتھوں میں کسی شربت کا جگ لئے ہوئے اندر داخل ہوئیں اور کماری نے انہیں پہچان لیا۔میں میں سے ایک چھایا تھی اور دوسری کانی۔سونیا کو حیرت ہوئی کہ اُسے ان کے نام کیسے معلوم ہو گئے؟ اس نے تو انہیں صرف اس وقت دیکھا تھا جب کومل ناچ رہی تھی اور وہ دونوں گا رہی تھیں۔بھلا نام معلوم کرنے کا کیا سوال تھا؟ لیکن جب اُس کی آنکھوں نے انہیں دیکھا تو اس کے ذہن میں ان کے نام گونج اُٹھے۔اُس نے دل ہی دل میں سوچا، سچ ہی تو ہے۔میرے پورے شریر میں اس وقت کومل ہی تو گردش کر رہی ہے۔میرا دماغ کومل کا دماغ ہے۔میرے ہاتھ پاؤں، میری ہر شے کومل کی ہے،بس آتما کا معاملہ ہے۔آتما تبدیل نہیں ہو سکتی اور یہ آتما ہمیشہ ایک راج کماری کے طوائف بن جانے پر روتی رہے گی۔سونیا سوچ رہی تھی۔پھر چھایا نے کہا۔

”کیا ہو گیا ری تجھے......کیا رنجیت یاد آ رہا ہے؟ کیوں بے ہوش ہو گئی تھی؟ درد ہوا تھا سینے میں؟“

کماری سونیا نے آنکھیں اُٹھا کر چھایا کو دیکھا اور چھایا کانی سے کہنے لگی۔”اری، اس کی تو آنکھیں بھی رو رو کر سوجھ رہی ہیں۔ہو کیا گیا اسے؟ رات کا وقت ہوتا تو ہم لوگ یہ سوچتے کہ اس نے کوئی سپنا دیکھا ہے اور سپنے میں کسی راجکمار کو دیکھ لیا ہے۔یہ تو ناچتے ناچتے بے ہوش ہو گئی تھی۔کیا ہو گیا کومل تجھے تو،تو دیوانی سی ہو رہی ہے۔“

”کچھ نہیں ری......سب ٹھیک ہے۔“

”لے، یہ شربت پی لے۔وید نے دوا ڈال کر بھجوایا ہے۔پر ذائقہ نہیں بدلا۔“ کانی نے شربت کا ایک گلاس بھر کر کماری سونیا کو دیا اور اُس نے گلاس ہاتھ سے لے لیا۔ہونٹوں کی پیاس تو بجھ گئی لیکن من کی آگ ہمیشہ کے لئے جل اُٹھی تھی۔دل تسلیم ہی نہیں کر سکتا تھا کہ آن کی آن میں یہ کایا پلٹ ہو گئی۔کل تک دلوں پر راج کرنے والی راجکماری آج دلوں کی رانی بن گئی ہے۔لیکن اب یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا۔دل کی بات کسی سے کہوں تو کون مانے گا؟ سب مذاق اُڑائیں گے اور کہیں گے کہ سپنے میں کوئی راجکمار دیکھ لیا ہو گا اور اب دماغ خراب ہو گیا ہے۔چنانچہ اُس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

دونوں لڑکیاں کافی شوخ و شریر تھیں۔اُن کی باتوں سے دل کچھ بہل رہا تھا۔کماری سونیا تو سہیلیوں میں وقت گزارنے کی عادی تھی اور سہیلیاں وہی باتیں کرتی تھیں جو اُسے پسند ہوتی تھیں۔یہ دونوں

لڑکیاں کسی حد تک غنیمت تھیں کہ اُس کا دل بہلاتیں۔

اُن کے جانے کے بعد راج کماری سونیا خیالات میں ڈوب گئی۔وہاں چتر کلا میں سوئمبر کے انتظامات ہو گئے ہوں گے۔لوگوں کو یہ اطلاع مل گئی ہو گی کہ راج کماری سونیا اچانک مر گئی ہے۔اس کے شریر کو بھسم کر دیا گیا ہو گا۔اور راجہ مہابت رائے اور اُس کی ماتا بروتی کا نجانے کیا حال ہو گا؟ ایک بار پھر کماری سونیا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔لیکن اب رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔جان دے دیتی تو اس مصیبت سے چھٹکارا پا لیتی۔لیکن جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔اُس نے جینا پسند کیا تھا اور زندگی کے تین سال مانگ لئے تھے۔

رات گزر گئی۔صبح ہوئی،کوئی پرسان حال نہیں تھا۔وقت ہی بدل گیا تھا۔وہ خود ہی اُٹھی۔غسل خانے میں جا کر غسل کیا اور باہر آ گئی۔دل دنیا سے اچاٹ تھا۔لیکن سانس کتنے پیارے ہوتے ہیں،اس کا اندازہ اُسے ہو رہا تھا۔اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اپنے آپ کو اسی رنگ میں ڈھالے گی۔گزری ہوئی باتیں یاد کرنے سے کچھ نہیں ملے گا۔

دن آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔کانی اور چھایا اُس کے پاس آ گئیں۔طرح طرح کی باتیں کرنے لگیں جو شرمناک بھی تھیں اور ہنسی دلانے والی بھی۔یہاں آنے والے لوگوں کے بارے میں طرح طرح کے تبصرے کئے جانے لگے۔نائکہ چندرا بھی اُس کے پاس آئی۔اُس کی طبیعت پوچھی اور پریشانی کا اظہار کرنے لگی۔

راجکماری سونیا نے اس پورے ماحول کے بارے میں سوچا تو اُس کے ذہن میں ایک ایک چیز آ گئی۔وہ چندرا کی بیٹی نہیں تھی، بلکہ اُس کی ماں روپ وتی تھی جو چندرا کی بہن تھی۔روپ وتی کو اُس کے ایک عاشق نے قتل کر دیا تھا۔اس وقت کومل صرف چھ سال کی تھی۔چندرا نے اسے اپنی بیٹی کی طرح پالا تھا۔چھایا اور کانی خود چندرا کی بیٹیاں تھیں۔یہاں مردوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔مرد تو خوبصورت سجے سجائے کھلونے ہوا کرتے تھے جو شام کو سونے کی سیج سجائے اس دروازے پر آتے تھے،جیبیں خالی کرتے تھے اور چلے جاتے تھے۔مرد اس دنیا میں دوسرے ہی سیارے کی مخلوق تھی جن کے بارے میں بات چیت کی جا سکتی تھی،اُن کا مذاق اُڑایا جا سکتا تھا،اُن کی جیبیں خالی کرائی جا سکتی تھیں،انہیں بے وقوف بنایا جا سکتا تھا اور بس۔اُس کے بعد نہ کوئی باپ تھا،نہ بھائی،نہ بیٹا۔

کماری سونیا کو یہ سب کچھ بہت عجیب لگا تھا۔اُس کی رُوح اس ماحول کو انسانی ماحول تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھی۔لیکن دنیا میں آنے کے بعد رُوح کے لئے زخموں کے علاوہ اور کیا رہ جاتا ہے؟ یہ زخم طرح طرح سے لگتے ہیں۔

شام ہوئی تو کوٹھے آباد ہونا شروع ہو گئے۔پھولوں کی خوشبوئیں مہکنے لگیں۔گلابوں کے انبار لگ گئے۔شرابوں کی بوتلیں کھل گئیں اور سازوں کے منہ۔سازندے ہونٹوں میں پان دبائے اپنے اپنے ساز سنبھال کر بیٹھ گئے۔گھنگھرو چھنکائے جانے لگے کہ یہ سب کاروباری باتیں تھیں۔

پھر رات ذرا اور ڈھلی تو شریف زادوں نے دروازے بجانے شروع کر دیئے۔بھلا سورج ڈھلے ایسے

وقت جب لوگ ایک دوسرے کی شکلیں نہ دیکھ سکیں، کون شریف زادہ ان سیڑھیوں پر چڑھنا پسند کر
ویسے چندرا کے کوٹھے کا ایک مقام تھا۔ وہاں چھچھوالے لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی اور اس
چندرا نے معقول بندوبست کر رکھا تھا۔ نئے آنے والوں سے معذرت کر لی جاتی تھی۔ ہاں، اگر کوئی
قابل ہو کہ اسے مہمانوں میں جگہ دی جائے تو دوسری بات تھی۔۔ اور اس قابلیت کا اندازہ چندرا ایک
لگا لیتی تھی۔

آج آنے والوں میں کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے پندرہ بیس آدمی آ کر بیٹھ گئے تھے
اور کانی تیار ہو کر آ گئی تھیں۔ سب کی منتظر نگاہیں اندرونی دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اند
عورت سونیا کو تیار کرا رہی تھی۔ سونیا کا آج پہلا امتحان تھا۔ وہ کومل کے روپ میں آج اپنے آپ کو
کرنے جا رہی تھی۔ زخمی دل تڑپ تڑپ کر چیخ رہا تھا، رو رہا تھا۔ راجہ مہابیت نے تو کبھی اُسے غیر
نگاہوں میں نہیں آنے دیا تھا۔ یا پھر اگر وہ کبھی مجمع میں جاتی تو نگاہوں کو ہدایت کی جاتی کہ وہ پاؤں
انگوٹھے کو چھوئیں۔ کماری سونیا کے حسن و جمال کی تاب لانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس شان
دھج سے کے بعد وہ باہر نکلتی اور لوگوں کے چہروں پر احترام دیکھ کر اُس کا خون سیروں بڑھ جاتا۔ لیکن
جب وہ محفل میں پہنچی تو پُرشوق نگاہیں اُس کے وجود کا طواف کر رہی تھیں۔ ہر نگاہ میں لالچ اور ہوس
اُس کا پنڈا پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ چندرا نے اُٹھ کر بہت سے نوٹ اُس پر سے وارے اور انہیں
سازندے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"گنت رام جی...... غریبوں میں تقسیم کر دیجئے۔ کل تو میں ڈر ہی گئی تھی۔"

"ہم تو ساری رات نہ سو سکے چندراوتی جی۔ ساری رات کومل کا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھو
اس کی درد بھری آوازیں ہمیں بے چین کرتی رہیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ دن کی روشنی ہوتے ہی آ
دروازے پر آ جائیں اور معلوم کریں ہماری کومل کا کیا حال ہے۔ مگر کیا کریں، آپ کے بنائے
قانون نے روک دیا۔" ایک گوشے سے ایک موٹے تازے نواب کی آواز اُبھری، جن کے پور
سے عطر کی خوشبوئیں اُڑ رہی تھیں۔ ترچھی سیاہ ٹوپی، گھنی مونچھیں، بڑے بانکے نظر آ رہے تھے۔

دوسری طرف سے ایک اور بھرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "ارے نواب صاحب، صرف منہ
باتیں کرتے ہو۔ ہم سے پوچھو، رات بھر مشورے کرتے رہے لوگوں سے کہ ہماری کومل کماری کو کیا
صبح ہوتے ہی اپنے کارندوں کو دوڑا دیا کہ کسی ایسے ویسی کو تلاش کر کے لاؤ جو کماری کومل کو ایک
ٹھیک کر دے۔"

"ارے واہ لالہ جی۔ کارندے تو آئے نہیں، حالانکہ رات ہو گئی۔"

"آتے ہی ہوں گے بس۔ تلاش بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" لالہ جی نے جواب دیا۔

چندراوتی نے فوراً ہی صورتحال سنبھال لی اور نرم لہجے میں بولی۔ "آپ ہی لوگوں کی دعائیں تو
بس ذرا گرمی کا شکار ہو گئی تھی۔ آپ کو تو پتہ ہے وہ نازک سی ہے اور موسم کتنا شدید۔ تھوڑی ہی دیر
ٹھیک ہو گئی تھی۔"

"یہ سب ہماری دُعاؤں کا طفیل ہے۔" ایک اور گوشے سے ایک صوفی صاحب کی آواز سنائی دی۔ جن
کے گیسو دراز تھے۔ سادہ سا کھدر کا لباس پہنے ہوئے ہاتھ میں تسبیح لئے وہ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیوں نہیں صوفی صاحب...... کیوں نہیں؟ آپ ہی لوگوں کی دُعائیں تو ہیں جن سے یہ کوٹھے آباد
ہیں۔" چندراوتی نے کٹیلے لہجے میں کہا اور چاروں طرف سے قہقہہ اُبھرا۔ صوفی صاحب نے تسبیح کے دانے
جلدی جلدی گھمانے شروع کر دیئے تھے۔

نواب صاحب نے فرمائش کی۔ "تو پھر ہو جائے کوئی پھڑکتی ہوئی سی چیز۔ لڑکیو، آج تم اپنی آواز کا
جادو جگاؤ۔ ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ کومل کماری طبیعت کی ناسازی کے باوجود رقص کریں۔ اگر وہ نہ کرنا
چاہیں تو ہم نغمے ہی سے کام چلا لیں گے۔"

"نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔" کماری سونیا کے منہ سے بے اختیار آواز نکلی۔ اُس کے وجود میں زبان
رہ گئی تھی جس کا تعلق دل و دماغ سے تھا۔ روح کا اس بدن سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن روح خاموش تھی
آہستہ آہستہ سسک رہی تھی۔ راج کماری سونیا ان پُرہوس نگاہوں کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔

لڑکیوں نے نغمہ چھیڑا۔ کومل کا دل نہ چاہا کہ وہ اس نغمے پر رقص کرے۔ اُس نے کانی سے کہا۔

"کانی، یہ نہ گاؤ۔"

ساز رُک گئے۔ کانی اور چھایا بہت خاموش نگاہوں سے کومل کماری کو دیکھنے لگی۔ تب اُس نے ایک
غمگین نغمے کی فرمائش کی اور ستاروں کی دھنیں بدل گئیں، سازوں کی آوازوں میں درد اُبل پڑا اور فضا پر
ایک عجیب سا کیف مسلط ہو گیا۔ کومل کماری کے قدم تھرکنے لگے۔ اُس کا پورا بدن اُس کے وجود کی ترجمانی
کر رہا تھا۔ غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا زندگی سے بیزار یاس کی کہانیاں سناتا ہوا۔

نواب صاحب قبلہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ صوفی صاحب پر وجد طاری ہو گیا اور لالہ جی بار بار
دھوتی کی گرہ ڈھیلی کرنے اور تنگ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ نغمہ اُنہیں پسند نہیں تھا۔ لیکن صوفی
صاحب اور نواب صاحب غالباً اس المیہ طرز کو پوری طرح سمجھ رہے تھے۔

نغمہ جاری رہا۔ لالہ جی بے چین رہے۔ دوسرے چند افراد بھی جو یہاں کے مخصوص آنے والوں میں
سے تھے، پہنچ گئے تھے۔ لیکن اس وقت اچانک نغمہ رُک گیا جب رادھے شام جی اندر داخل ہوئے۔

چندراوتی فوراً کھڑی ہو گئی تھی۔ سازندوں نے ساز بند کر دیئے تھے۔ رادھے شام ململ کی دھوتی اور
نہایت باریک دھاگے کے ململ کے کرتے میں ملبوس گلے میں سونے کے بٹن لگائے اندر داخل ہوئے۔
انہوں نے ماحول کا رنگ بگڑتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔

"ارے نہیں نہیں بھئی...... دوسروں کو کیوں پریشان کیا جائے؟ ہم تو ہیں ہی ناوقت آنے والوں
میں۔ کماری شروع کرو۔ جاری رکھو۔"

چندراوتی نے اُنہیں گاؤ تکیہ پیش کیا اور رادھے شام گاؤ تکیہ سے ٹک کر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب کی
آنکھوں میں غصے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اُنہوں نے بڑبڑاتے ہوئے صوفی صاحب سے کہا۔ "یوں
محسوس ہوتا ہے جیسے چندراوتی جی اب کوٹھے کی روایات بھولتی جا رہی ہیں۔ ایسا حسین نغمہ اگر درمیان میں

رُک جائے صوفی صاحب، تو کیا ہوتا ہے؟"

"قیامت آجاتی ہے۔ عزرائیل صور پھونک دیتے ہیں۔ زمین و آسمان تہہ و بالا ہو جاتے ہیں۔"
اُن کی آواز سازوں کی آواز میں دب گئی۔

رادھے شام جی نے مسکراتی نگاہوں سے کومل کماری کی طرف دیکھا اور اُس کے پاؤں پڑ لگے۔ غم واندوہ اُس کے ایک ایک عضو سے ٹپک رہا تھا۔ رادھے شام جی کے ہونٹ مسکرا گئے۔ دراز قامت کے آدمی تھے۔ دیکھنے میں اچھے خاصے لگتے تھے۔ گو عمر چالیس سے اوپر تھی لیکن شاید خوشحالی تھی اور زندگی میں کبھی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک بھی جھری موجود تھی۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جو کماری سونیا کے وجود پر نثار ہو رہی تھی۔

سونیا پھر ناچنے لگی تھی۔ کومل کے شہر میں آکر اُسے کومل کی تمام خصوصیتیں مل گئی تھیں۔ گو ہر چیز اُس کے لئے اجنبی تھی لیکن اُسے خود بخود احساس ہو جاتا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا ہے۔ اس طرح وہ شخصیت کی مالک ہو گئی تھی۔ آتما اندر سے تڑپ رہی تھی اور اپنی اس حالت پر دل رو رہا تھا۔ ایک دن تھا کہ دوسرے اُس کے لئے ناچتے تھے اور آج وہ دوسروں کے لئے ناچ رہی تھی۔ ایک دن وہ تھا کہ اس کے ابرو کی ایک جنبش پر لوگوں کے پتے پانی ہو جاتے تھے۔ اور آج لچتی بھنوئیں اُس کے سراپے کا لے رہی تھیں اور اُن کے نیچے چمکتی آنکھوں میں ہوس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ بہت بڑی تبدیلی کرنا پڑ رہی تھی اُسے صرف تین سال کی زندگی کے لئے۔

رقص جاری ہوا تو نغمہ بھی شروع ہو گیا۔ صوفی صاحب کی تسبیح کے دانے بدستور چل رہے جھوم رہے تھے۔ لالہ جی پہلو بدل رہے تھے۔ رادھے شام کی آمد کے بعد ماحول کچھ بدل گیا تھا۔ توجہ رادھے شام جی پر مرکوز ہو گئی تھی۔ گو کومل نے اس پر غور نہیں کیا تھا کہ رادھے شام جی کیا چیز ہیں۔ نواب صاحب کی ترچھی ٹوپی سیدھی ہو گئی تھی۔ لالہ جی نے اب توند کے گرد کسی ہوئی دھوتی کو تنگ کرنا بند کر دیا تھا۔ صوفی صاحب کی تسبیح کے دانے رُک گئے تھے۔ دوسرے تمام لوگ بھی کسا دل نظر آرہے تھے۔

نغمہ ختم ہو گیا اور رادھے شام جی جھومنے لگے۔ "واہ کومل کماری...... ناچنے کا فن تم پر ختم ہے۔ ایسے انداز دے دیتی ہو کہ اگر گیت نہ بھی گایا جا رہا ہو تب بھی اس کا ایک ایک بول سنائی دے۔"

کومل کماری نے فرشی سلام کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے کماری سونیا نے کبھی اس انداز کا کوئی سلام نہ کیا تھا۔ لیکن اب وہ سونیا نہیں کومل تھی۔ نواب صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا چندراوتی جی، ہم چلتے ہیں۔ یہاں تو ہمارے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا چلا آرہا ہے۔"

"ارے نہیں نہیں نواب صاحب، کوئی غلطی ہو تو معاف کر دیں۔ اب آپ بتایئے کہ کیا کیا؟ دراصل آپ ہی کی فرمائش پر......"

"نہیں چندراوتی جی۔ محفل کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ یہاں ایک بات آپ کو سمجھا دیں، پرانی کار خاتون ہیں آپ۔ کوٹھے پر آنے والے ہر انسان کی عزت یکساں ہوتی ہے۔ اگر ان عزتوں کا

پایا جائے تو کوٹھے ویران ہو جاتے ہیں۔"

چندراوتی نے پریشان نگاہوں سے نواب صاحب کو دیکھا اور وہ باہر نکل گئے۔

"حق اللہ...... میاں صاحب نے جو کچھ کہا وہ سچ کہا۔ کوٹھوں پر رقص کرنے والوں کی تو ایک ایک ادا کے مہمانوں کی امانت ہوتی ہے۔ امانت میں خیانت کو خداوند قدوس کبھی معاف نہیں کرتا۔ ہم بھی اس ن تک دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے جب تک کہ اس رقص گاہ کی حرمت بحال نہیں ہو جاتی۔"

لالہ جی نے دھوتی کی گرہ سے نوٹوں کا ایک بنڈل کھول کر اُس پر ہاتھ پھیرا اور اسے کرتے کے نیچے شلوکے کی جیب میں رکھ لیا اور پھر خود بھی اُٹھ گئے۔

چندراوتی ایک ایک کو پریشان نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ چند مہمان باقی رہ گئے تھے۔ رادھے شام جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان سب کو کیا ہو گیا چندرا جی؟"

"بھگوان جانے۔ بس جلتے ہیں سسرے۔ پر آپ کیوں چنتا کرتے ہیں رادھے شام جی، آپ آگئے، مکمل ہو گئی۔ ہمیں آپ کے ہوتے کسی کی چنتا نہیں۔" چندراوتی نے اس موٹی مرغی کو سنبھالتے ہوئے کہا اور رادھے شام جی ہنسنے لگے۔ اُن کے ہاتھوں میں موٹے سے بنڈل میں جو چیز موجود تھی اس کا جائزہ چندراوتی نے اچھی طرح سے لے لیا تھا۔ رادھے شام جی آن بان والے تھے۔ لاکھ منع کرو مگر کچھ لے کر ہی آتے تھے۔ اور جب بھی آتے تھے اتنا دیتے تھے کہ دوسروں کے چلے جانے کا کوئی افسوس نہیں ہوتا تھا۔

چندراوتی نے لڑکیوں کو اشارہ کیا اور ایک نغمے کا آغاز ہو گیا۔ کومل رقص کر رہی تھی اور رادھے شام کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اور جو سوچ اُس کے ذہن میں موجود تھی وہ کومل ہی کی ملکیت تھی۔ رادھے شام جی، کومل کے عاشق تھے اور اُس کے لئے اپنی کائنات لٹائے ہوئے تھے۔

رقص جاری رہا۔ نوٹوں کے بنڈل سامنے لگ گئے۔ دوسرے لوگوں کی اب دال نہیں گل رہی تھی۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد رادھے شام جی ہی رہ گئے۔ اُنہوں نے کومل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس کرو کومل...... اتنا رقص کرو گی تو تھک جاؤ گی۔"

"کل تو اس کی بری حالت ہو گئی تھی رادھے شام جی۔ لاکھ پوچھو کہ کیا ہوا تھا تجھے، پر من کی بات کون کھولے؟ چندراوتی کی آنکھیں بھی اندھی نہیں۔ کتنے دن کے بعد آئے ہیں آپ۔ ایسی حالت نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟"

"اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنی کومل کماری کو خود ہی سمجھا دیں؟" رادھے شام نے چندراوتی سے کہا۔

"لو، اور لو...... آپ اور اجازت مانگیں؟ کومل تو آپ کی لونڈی ہے مہاراج۔ کومل، جو کہنا ہے رادھے شام جی سے کہہ دو۔ ہم یہ بات تو جانتے ہیں کہ کسی اور کے سامنے تمہاری زبان کا ہے کو کھلے۔ رادھے شام جی کی خاطر مدارت کرو۔"

کماری سونیا نے ایک نگاہ اُس ادھیڑ عمر کے شخص کو دیکھا جو دیکھنے میں ادھیڑ عمر نہیں لگتا تھا۔ لیکن اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ رادھے شام جی اُٹھ گئے اور کومل آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی خوابگاہ میں تھی۔ چھت پر لگا ہوا فانوس روشنی بکھیر رہا تھا اور اس کے رنگین شیشے کمرے میں مختلف رنگ سجائے ہوئے تھے

جن کے بیچ آ کر کومل اتنی حسین لگی کہ دیکھنے والوں کی نگاہ اُس پر سے نہ ہٹے۔ سامنے ہی درپن لگا
کومل کا ازلی دشمن۔ اُس پر نگاہ گئی تو بدن لرز کر رہ گیا۔ ایک دن اس درپن ہی سے تو پوچھا تھا کہ
مجھ جیسا؟ سو اُس نے کہا کہ سنسار میں سب تجھ جیسے ہیں۔ اس وقت یہ بات دل سے نہیں اتری تھی
آج جب وہ دو پیسے کی عورت تھی تو اُسے درپن کی بات سچ ہی لگی تھی۔ شریر کب کسی کا ہوا ہے؟ مائی کا
مائی ہی جانے۔

رادھے شام جی نے آگے بڑھ کر دونوں شانوں پر ہاتھ رکھے تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی، جو
راجکماری تھی۔ رادھے شام جی کچھ بھی ہوتے، اُس کے ایک اشارے پر خرید ے جاسکتے تھے۔ لیکن
کی بات تھی۔ آج کا کام یہ ہی تھا کہ ان کے چرنوں میں جھک جائے۔ اور چندراوتی نے یہ
خاطر مدارت کا مقصد اور کیا تھا؟

''ارے کیا ہوا کومل کماری...... اتنی خفا ہو ہم سے؟'' رادھے شام جی نے محبت بھرے لہجے میں
''کتنے دن کے بعد آئے ہیں آپ۔''

''سارا جیون ہی تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ تمہارے ہی لئے دیر لگ گئی تھی۔ پتہ ہے کہاں گئے تھے
''کہاں گئے تھے تم؟'' کومل نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ لیکن رادھے شام جی مسہری کی
بڑھے تو وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''اتنی ناراض ہو تم؟ پاس بھی نہیں بیٹھو گی؟''

''آپ بیٹھئے، میں ادھر بیٹھ جاتی ہوں۔'' اُس نے کہا اور رادھے شام جی بیٹھ گئے۔

''ہم ڈیڑھ دو دن کے لئے گئے تھے۔ وہاں کچھ زمینیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں
قبضہ نہ ہو جائے۔ کون لڑتا بھڑتا پھرے۔ حالانکہ ایک زمانہ وہ تھا کہ گھوڑی پر بیٹھ کر جدھر نکل جاتے
بند ہو جاتے تھے کہ رادھے شام آیا ہے، نجانے کس کی شامت آئے۔ پر جب سے من میں پریم دیا
جی ہی نہیں چاہتا کہ کسی سے ٹیڑھے میں بات بھی کر لی جائے۔ دل میں تو کومل رہتی ہے۔''

''کون سے دل میں؟''

''ایک ہی تو دل ہے ہمارے پاس۔''

''باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔''

''کچھ بھی کہو کومل، اب تو تمہارے قیدی ہیں۔''

''تو ڈیڑھ دو دن میں زمینیں بک گئیں؟''

''ہاں بھئی۔ کیوں رکھتے انہیں؟ بے کار چیزوں سے اپنا کیا کام؟ سوچا ہے کہ جمنا محل میں
کمروں میں شیشے ہی شیشے لگوا دیں۔ اب معمولی سا خرچ تو ہوتا نہیں۔ ہرادآباد جانا پڑے گا ٹھیکہ دینے کے
لئے۔ اور تم دیکھنا کومل، کہ آج یہ شیش محل بن گیا تو کیا نظر آئے گا۔''

کومل کو اس شیش محل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن جب اُس نے ذہن میں دہرایا تو
پتہ چلا کہ رادھے شام جی اُس کے لئے جمنا کنارے ایک محل نما عمارت بنوا رہے ہیں جس میں

جا کر رہیں گے۔
باتیں سمجھ میں آ گئیں۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے رادھے شام جی کو دیکھنے لگی۔ میرے لئے یہ
ساری باتیں کیا کر رہا ہے؟ ایک ناچنے والی کے لئے جو وہ بھی نہیں ہے جو وہ سمجھتا ہے۔ کیا کروں میں...... کیا
کروں میں؟ اس کا دل تو نہیں بہلا سکتی۔ جیون جائے پر بدن تک کسی کو نہیں پہنچنے دُوں گی چاہے کچھ بھی ہو
جائے۔ رادھے شام ہو یا مرلی دھر، مجھے کسی کی چنتا نہیں ہے۔ اُس نے سوچا۔ پر رادھے شام پُر شوق
نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''اب بھی ہمارے پاس نہیں آؤ گی کومل؟''

''نہیں مجھے آپ کے پریم پر شک ہو گیا ہے۔'' کماری سونیا بولی۔ یہ کومل کی آواز نہیں تھی۔ رادھے
شام جی کا چہرہ اتر گیا۔

''ارے ارے...... کیوں؟''

''بس شک کی کوئی بنا نہیں ہوتی۔ ہمارے من میں شک ہے سو ہے۔''

''اور یہ شک ہم کیسے دُور کر سکیں گے؟''

''اُس سمے جب آپ ہمیں شیش محل میں لے جائیں گے۔''

''اوہ...... بہت بڑی شرط لگا دی تم نے۔ اتنے دن ہم تم سے دُور رہیں گے؟''

''پریم کی بات کرتے ہیں تو پریمیکا کی بات ماننا ہی پڑے گی۔'' کومل نے کہا اور رادھے شام بھی
گردن ہلانے لگے۔ پھر اسی طرح محبت پاش نگاہوں سے کومل کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''اس سے بڑا بھی کوئی امتحان لے لو کومل، رادھے شام اپنی سوچ میں اٹل ہے۔''

''میں سوگند کھا رہی ہوں رادھے شام جی...... کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اگر آپ نے اس سے الگ کیا
تو بس یوں سمجھ لیجئے کہ میرے من میں میل آ جائے گا۔''

''اور تمہارے من کے میل کو دُور کرنے کے لئے ہم جیون بھی تم پر وار سکتے ہیں۔''

''مگر یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔''

''کیسے؟''

''خاص طور سے چندراوتی جی کو۔ اگر اُنہیں پتہ چل گیا کہ ہم نے آپ پر کوئی ایسی شرط لگا دی ہے تو
ہمارا جیون حرام کر دیں گی۔''

''بھلا دو پریمیوں کے بیچ میں کسی تیسرے کا کیا دخل؟'' رادھے شام جی نے کہا اور کومل مسکرانے لگی۔
کومل کے روپ میں کماری سونیا مسکرا رہی تھی۔ وہ مصیبت اُس نے عارضی طور پر ٹال دی تھی جو اُس پر مسلط
ہونے جا رہی تھی۔ رادھے شام بھی کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ پریم کی باتیں کرتے رہے۔ اور اس کے بعد
کومل نے گردن ہلا کر کہا۔

''ٹھیک ہے...... پھر آج رات ہمیں یہاں رُکنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو شرط تم نے لگا دی ہے اس
کے لئے تو اب ہمیں اپنا کام تیز کرنا ہی پڑے گا۔ پر یہ بات سوچ لو کہ اگر ہمارے علاوہ کوئی اور تمہارے

شریر تک پہنچا تو نہ تمہارا جیون رکھیں گے نہ اُس کا۔"

"آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟"

"اس سے تک نہیں جب تک تم شیش محل میں نہ پہنچ جاؤ۔" رادھے شام جی نے کہا اور ہنس پڑ[ے]

"تو یہ بدلہ لیا ہے آپ نے۔"

"کیوں نہ لیں گے۔ تم خود سوچو، ڈیرا دون میں تھے تو یہاں بھاگنے کی فکر کرتے رہے کہ [...]
پاس پہنچیں۔ اور یہاں آئے تو تم نے ہاتھ پاؤں ہی کاٹ کر رکھ دیئے۔"

"اب ہاتھ پاؤں کٹ ہی گئے مہاراج، انہیں کٹا ہی رہنے دیجئے۔" کومل نے کہا اور رادھ[ے]
اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کومل اُنہیں باہر تک چھوڑنے آئی تھی۔ چھایا اور کانی اپنے اپنے کمروں میں
تھیں۔ کوٹھے کا کاروبار ختم ہو گیا تھا۔ سازندے بیٹھے چندراوتی سے حساب کتاب کر رہے تھے۔ [...]
نے رادھے شام کو باہر نکلتے دیکھا تو حیران ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے ارے شام جی مہاراج...... خیریت تو ہے؟ کہاں چلے؟"

"بس، ہمیں کچھ کام تھا۔ اپنی کومل سے تھوڑی دیر باتیں کیں۔ اور اس کے بعد اب جا رہے ہ[یں]"

"اوہو...... میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ کہیں رادھے شام کسی بات پر ناراض تو نہیں ہو گئے۔ الہڑ [...]
پاگل پن کی باتیں کرتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کر جاتی ہے جو دوسروں کو بری لگیں۔ پر آپ
کریں مہاراج۔"

"ارے نہیں نہیں چندراوتی جی۔ کومل کی بات کا برا ماننے والا نرکھ میں جائے گا۔" رادھے شا[م]
اور چندراوتی ہنسنے لگی۔ رادھے شام جی دونوں ہاتھ جوڑ کر باہر نکل گئے۔ چندراوتی نے اطمینان
سانس لی اور پھر نیچے آ بیٹھی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اُٹھی اور کومل کے کمرے میں پہنچ گئی۔ کومل نے
تبدیل کر لیا تھا اور مسہری پر جا بیٹھی تھی۔ چندراوتی کو دیکھ کر تکیے کے سہارے اُٹھ بیٹھی۔

"اب تو تیری طبیعت ٹھیک ہے نا کومل؟"

"ہاں ماتا جی۔ اب تو ٹھیک ہے۔"

"رادھے شام جی کیوں چلے گئے؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"کیا کہہ رہے تھے جاتے ہوئے؟"

"کچھ نہیں۔ کہتے تھے کچھ کام ہے۔"

"ہاں، مجھ سے بھی یہی کہہ رہے تھے۔ اچھا ٹھیک ہے، تو آرام کر۔ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں [...]

"بات بھلا کیا ہوگی ماتا جی...... آپ بیٹھ جائیں۔ جا کیوں رہی ہیں؟"

"نہیں، تو آرام کر رہی ہے تو آرام کر۔"

"میں یہ پوچھ رہی تھی کہ اگر رادھے شام جی کسی بات پر ناراض ہو گئے تو کیا ہوگا؟"

"لے، کہہ رہی ہے کیا ہوگا۔ ارے لاکھوں روپے کی آسامی ہے۔ پانچ لاکھ ملیں گے ہمیں [...]

[...] اور تیرے لئے جمنا محل الگ بنوا رہے ہیں۔ جمنا محل میں جا کر رہنا۔ عمر ہی کتنی ہے رادھے شام
[...] کتنے عرصے جئیں گے؟ اس کے بعد سب کچھ تیرا ہوگا۔ جب تک من چاہے اُن کے ساتھ رہنا۔ یہ
[...] لوگ عیاش طبع ہوتے ہیں۔ جی بہلانے کے لئے نجانے کیا کیا خرچ کر دیتے ہیں۔ اور جب جی بھر
[...] تو بھول جاتے ہیں۔ تو رادھے شام جی کے ساتھ جمنا محل میں چلی جانا۔ سب کچھ تجھے مل جائے گا
[...] کے لئے کوشش کرنا کہ اس کا جی تجھ سے بھر جائے۔ بھئی ہم لوگوں کی یہی زندگی ہے۔ اور یہی گر
بڑھاپے تک سہارا دینے کے لئے کام آتے ہیں۔"

"میں سمجھ رہی ہوں ماتا جی۔" کومل نے کہا۔ اور پھر چندراوتی مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ کومل کا دل
[...] تھا۔ اپنی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے اُسے یقین نہیں آتا تھا۔ کل کا دن تھا کہ وہ اس جیسے
[...] محل نوا سکتی تھی۔ لیکن آج ایک دولت مند ایک محل اور پانچ لکھ روپے دینے کا وعدہ کر کے اس کا
[...] خریدنا چاہتا تھا۔ اس سمے جب یہ سارے کام اس نے کر ڈالے تو کیا ہوگا؟ اس کے بعد بھی کیا وہ
[رادھ]ے شام جی کے ہاتھ روک سکے گی؟ نہیں نہیں...... کچھ کرنا چاہئے۔ بے شک زندگی بچانے کے لئے،
[...] کی زندگی حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنے آپ کو اس برے روپ میں تو ڈال لیا ہے۔ لیکن
[...] کچھ نہیں کروں گی جو یہاں ہوتا آیا ہے۔ جیسے بھی بن پڑا اپنی عزت بچاؤں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو
[...] یہ بات تو خیر یقینی ہو گئی ہے کہ میں دوبارہ چتر کلا نہیں پہنچ سکتی اور وہاں جا کر راجکماری کی حیثیت
حاصل کر سکتی۔ لیکن ایک ناچنے والی کی حیثیت سے بھی میں جیون نہیں بتاؤں گی۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں۔ دل ٹوٹ ٹوٹ کر رو رہا تھا۔ نجانے چتر کلا میں
[...] رہا ہوگا...... نجانے اُس کے ماتا پتا کی کیا حالت ہوگی؟ نجانے اُس کی موت کے بعد ان لوگوں نے
[...] کیا ہوگا......

❁

[سوئ]مبر کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مہایت رائے بہت خوش تھے۔ بیٹی کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں
[ہوئی] تھی۔ بلکہ کوشش کر کے اُس کی سہیلیوں سے اُس کے خیالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ لڑکیوں نے جو
[...] بتائی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ سوئمبر کی بات کماری سونیا کو بری نہیں لگی۔

[بہ]ت سے راجکمار آ چکے تھے۔ بڑے بڑے لوگ تھے ان میں۔ سوئمبر رچانے پر مہایت رائے کو
[...] بھی دی گئی تھیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ رات مہایت رائے کی زندگی کی سب سے
[...] رات تھی...... وہ لمحہ اُن کے لئے موت سے برا تھا جب دفعتہً کچھ لڑکیاں زار و قطار روتی ہوئی
[...] ہوئی اُن کے پاس پہنچیں اور اُنہوں نے دھاڑیں مار مار کر مہایت رائے کے قدموں میں گر کر رونا
[شروع] کر دیا۔ مہایت رائے ششدر رہ گئے تھے۔

"ارے کیا ہوا بیوقوفو...... کچھ تو بتاؤ۔ ہوا کیا، کچھ تو بتاؤ...... کیا ہو گیا تم سب کو......؟"

"ہائے رام، ہائے رام...... کس منہ سے کہیں، کس منہ سے بتائیں مہاراج...... کیا کریں، ہائے رام۔"
[...] نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں...... لگتا ہے جیسے تم سب کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ارے کوئی ہے، ان بیوقوفوں کو ذرا کوئی
سے پوچھو کہ بات کیا ہوئی؟ یہاں خوشیاں منائی جارہی ہیں اور ان لوگوں نے رونا دھونا لگا رکھا ہے۔"
بہت سے لوگ دوڑ پڑے۔ لڑکیوں کو سنبھالا گیا تو انہوں نے انکشاف کیا کہ کمرے میں کماری
ایسے پڑی ہوئی ہے جیسے اس میں جان ہی نہ ہو۔

مہابت رائے کے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑے۔ اور اس کے بعد صورت حال
بدل گئی۔ سوئمبر کے لئے جو ہنگامے ہو رہے تھے وہ بھی دوسرا رُخ اختیار کر گئے...... ویدوں اور حکیموں
لائن کی لائن لگ گئی۔ سب نے ایک ہی بات کہی تھی...... کماری سونیا اب اس سنسار میں نہیں ہے۔
چکی ہے......

جو ہنگامے ہو سکتے تھے، وہ ہوئے۔ سوئمبر میں شریک ہونے کے لئے آنے والے راجکمار، کماری
کی ارتھی میں شریک ہوئے۔ چاروں طرف کہرام مچ گیا تھا۔ چترکلا کی تقدیر کالی ہوگئی تھی۔ مہا
مہابت رائے پاگل ہوگئے تھے اور مہارانی جی پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ جتنا سوگ اور غم
جاتا، کم تھا۔ چترکلا کے درودیوار رو رہے تھے۔ وہ سب ہی دُکھی تھے جو سوئمبر کے لئے آئے تھے۔
ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر ایسا کیا ہوا؟ کیا کماری سونیا نہیں چاہتی تھی کہ اس کا سوئمبر
جائے؟ کیا اس نے آتما ہتیا کرلی؟ کیا اس نے خود کو مار لیا یا پھر کوئی اور بات ہے؟ لیکن ویدوں
کہ کماری کی موت بالکل ایسی ہی ہے جیسے لوگ مرتے ہیں۔ اس میں کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں ہے
طبعی موت مری ہے۔

بہر طور ارتھی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کئی دن لگا لئے گئے تھے۔ بہت سے لوگوں کو شریک ہو
مہاراجہ کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اب ان کی بیٹی اس سنسار میں نہیں ہے۔ یہی کیفیت سکھیوں کی
نجانے کہاں کہاں سے نجومیوں اور جوتشیوں کو بلایا گیا تھا اور معلومات کی جارہی تھیں کہ آخر ایسا
کیوں ہوا؟ لیکن سب کی زبانیں بند تھیں۔ کوئی کچھ کہتا تو کیا؟ موت بالکل طبعی تھی۔ بس سمے آگیا
کماری مرگئی تھی۔

مہابت رائے، بیٹی کی ارتھی جلانے کے لئے ہی تیار نہیں تھے۔ کس دل سے اس کومل بدن کو شعلوں
کے حوالے کرتے؟ وہ سوچتے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ لیکن بڑے بوڑھوں نے سمجھایا کہ ایسا تو ہوتا ہی
یہی ہوتا ہے۔ یہی سنسار کی ریت ہے۔ مائی کا کھیل مائی ہی جانے۔ جو آتا ہے وہ جاتا ضرور ہے۔ کوئی
کو روک نہیں سکتا۔

سمجھانے بجھانے پر مہاراجہ بمشکل تمام تیار ہوئے۔ اب تک مصالحوں سے کماری کی لاش کو محفوظ
گیا تھا۔ بہر طور اُسے دُلہن بنایا گیا۔ اُس کی ارتھی تیار کی گئی۔ اُس کی سب سے پسندیدہ جگہ پھول نگر
تھی اور سال کے سال کماری وہاں جانے کی بڑی کوششیں کیا کرتی تھی۔ بڑی خوشیاں منایا کرتی
مہاراج نے اعلان کیا۔

"راجکماری کی لاش پھول نگریا میں جلائی جائے گی اور اس کے بعد پھول نگریا کے دروازے بند

کر دیئے جائیں گے۔ وہاں صرف راجکماری رہے گی۔ صرف اس کی آتما رہے گی۔"
اعلان بڑا ہی دل گداز تھا۔ جس نے سنا، رو دیا۔ مہاراج اپنی بیٹی کو اور کچھ تو نہ دے سکے۔ وہ سوئمبر
کی گردن میں اُس کی مالا تو نہ پڑوا سکے۔ لیکن پھول نگریا انہوں نے راج کماری کو دے دی تھی۔
راج کماری کی ارتھی پھول نگریا میں لائی گئی۔ طویل فاصلہ طے کر کے جب وہ اتنا سری پہنچے تو
کے ساتھ شامل ہوگیا۔ گوندا نے روتے ہوئے مہاراج کو بتایا کہ کس طرح پھول نگریا سے
کماری سونیا یہاں رُکی تھی اور اُس نے کہا تھا کہ گوندا محل سے اچھا بھگوان محل ہے۔
راجہ مہابت رائے اُس کی باتیں سن کر زار و قطار رو دیئے۔ بہر طور کماری کی لاش پھول نگریا میں
پھول نگریا کے کھلے دروازے دیکھتے ہی مہاراجہ مہابت رائے پر غشی طاری ہوگئی۔ وہ بہت زور
گرے اور بے ہوش ہوگئے۔ یہ ایک الگ مرحلہ ہوگیا تھا۔ مہاراجہ کی جان سب کو عزیز تھی۔ چنانچہ
گیا کہ ارتھی میں مہاراجہ کو شریک کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ انہیں فوراً واپس چترکلا لے جایا
یہاں ان کا علاج ہو۔ مشیروں نے بھی یہی رائے دی تھی۔ اور سب نے متفقہ طور پر فیصلہ کرلیا تھا
راجہ کو تکلیف دینا اچھی بات نہیں ہے۔ چنانچہ مہاراجہ مہابت رائے کو واپس لے جایا گیا۔
نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے کماری سونیا کی ارتھی جلا دی جائے تاکہ اس کے
راجہ کو سکون ملے۔ جب شریر راکھ ہو جائے گا تو پھر خود بخود صبر آ جائے گا۔ ارتھی کی تیاریاں زور وشور
گئیں۔ لکڑیوں کی ٹالیں لگا لی گئیں اور ان پر گھی چھڑکا جانے لگا۔ کماری سونیا دُلہن بنی ایسی لگتی تھی
ابھی سو گئی ہو۔ اتنے دن گزر چکے تھے اُس کی لاش میں ذرا بھی تعفن پیدا نہیں ہوا تھا۔ بڑی ہی
لگ رہی تھی وہ دُلہن بنی ہوئی۔ جو آنکھ دیکھتی وہ اپنے آنسو نہ روک پاتی۔
اب اُسے آگ دکھانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ شام کا سمے ہو چکا تھا، سورج ڈوب رہا تھا۔
بادل چھائے ہوئے تھے۔ ارتھی میں آگ لگانے والے آگ لگانے کو تیار تھے کہ دفعتہً انہوں نے
کالا سانپ دیکھا جس کی لمبائی اتنی تھی کہ آنکھوں کو یقین نہیں آتا تھا۔ اُس کا چوڑا پھن ایک
طرح تھا اور اُس کی سرخ زبان بار بار باہر نکل رہی تھی اور آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں۔
تیزی سے ارتھی جلانے والوں کے پاس آیا کہ ارتھی جلانے والوں کے اوسان خطا ہوگئے اور وہاں
تھا، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اور کسی نے جلتی ہوئی لکڑی ارتھی میں ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
پھول نگریا کے دروازے سے باہر آنے کے بعد وہ ایک دوسرے سے سانپ کے بارے میں باتیں
لگے۔ طرح طرح کی باتیں تھیں۔ کوئی کہتا تھا ناگ دیوتا ارتھی کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی
کہتا تھا اور کوئی کچھ۔ کسی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ دراصل کماری سونیا مری نہیں بلکہ ناگ دیوتا
میں چلی گئی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اس کے شریر کو بھسم کیا جائے۔ اور اسے بچانے کے لئے وہ
تھے۔

"مگر اب کیا، کیا جائے؟ کیا کسی کی ہمت ہے کہ وہ ارتھی کو آگ دکھائے؟"
"نہیں بابا...... ناگ دیوتا سے کون ٹکرائے۔ آگے بڑھے اور کسی کو چاٹ لیا تو پانی ہو جائے گا۔"

”مگر مہاراج کا بھی خیال کرو۔ جب ہم لوگ اس طرح بھاگ جائیں گے تو وہ کیا کہیں گے؟“ کسی
”ہاں...... یہ تو ہے۔ ارتھی کو آگ لگانا ضروری ہے۔“
”تو پنڈت جی، آپ ہی کوشش کیوں نہ کریں۔ آپ برہمن ہیں اور برہمنوں کو ناگ دیوتا کبھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“ لوگوں نے ساتھ آنے والے برہمن سے کہا۔
پنڈت جی کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے لرزتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن دیوتا کے غصے کے آگے کون ٹک سکے گا؟“
”پنڈت جی، یہ کام تو آپ ہی کا ہے۔ اگر مہاراج یہاں ہوتے تو وہ یہ کام کسی بھی طرح دیتے۔ لیکن آپ کا کیا خیال ہے آپ ارتھی کو آگ لگائے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے؟“
”مم...... میں...... میں......“
”پنڈت جی، یہ کام آپ ہی کیجئے۔“ لوگوں نے پنڈت کو مجبور کر دیا۔ وہ آگ کی مشعل ہاتھ میں ڈرتے، لرزتے، کانپتے ایک بار پھر پھول نگریا کے بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوئے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ لیکن جونہی لکڑیوں کے پاس پہنچے تو دفعتہً اُنہیں سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ سانپ ان کے پیچھے ہی تھا...... پنڈت جی کے ہاتھ سے مشعل گر گئی۔ بدن لرزنے لگا۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ سانپ کو پھلانگ جاتے۔
دفعتہً سانپ نے اُن کے پیروں پر منہ مارا اور پنڈت جی کے منہ سے ہائے رام کی چیخ نکلی۔ جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سانپ آ گیا ہے اور پنڈت جی کو اُس لیا ہے۔ دوسرے لمحے اُنہوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ سانپ نے پنڈت جی کی پنڈلی پر اور پنڈت جی کا بدن اس طرح پگھلنے لگا جیسے وہ صابن کا جھاگ ہو...... وہ آہستہ آہستہ زمین پر رہے تھے اور نیچے بدبودار پانی جمع ہوتا جا رہا تھا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس پانی اور پنڈت جی کی کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔
ساتھ آنے والے اس بری طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے کہ اُنہوں نے پلٹ کر پھول نگریا کی نہیں دیکھا۔ پنڈت جی کا یہ حشر دیکھنے کے بعد اب کس کی مجال تھی کہ وہاں ایک لمحے کے لئے بھی بھاگنے والے اس طرح بھاگے تھے کہ اُنہوں نے اتنا سری میں آ کر ہی دم لیا تھا۔
گونڈا کو پوری کہانی سنائی اور گونڈا بھی حیران رہ گیا۔ پھر بہت سے لوگوں کی ایک پلٹن پھول نگر طرف چل پڑی تھی۔ مہاراج کی بیماری کی اطلاع تو سب کو مل گئی تھی اور اب یہ گونڈا کا فرض ہو گیا راج کماری کی ارتھی کو جلانے کے لئے اپنے آدمیوں کا سہارا حاصل کرے۔
اس طرف یہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف ایک اور ہی کھیل جاری تھا۔ بھاگنے والے جب پھول سے بھاگ گئے، یہاں تک کہ وہ بھی جو برسوں سے پھول نگریا میں رہتے تھے، پہرہ دیتے تھے تو پھول کے آس پاس سناٹا چھا گیا۔ گہرا گمبھیر سناٹا...... کوڑیالا سانپ چتا کے گرد پورا گھیرا باندھ کر بیٹھ گیا بڑا گھیرا تھا اُس کا کہ دیکھنے والوں کو یقین نہ آئے۔ بہت ہی خوفناک قسم کا شیش ناگ تھا...... تھوڑی

کماری سونیا کی لاش کو گھورتا رہا۔ اور پھر دفعتہً وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور زمین پر لمبا لمبا طرح بیٹھا کماری سونیا کی لاش کو گھورتا رہا۔ اُس کا شریر انسانی وجود اختیار کرتا جا رہا تھا...... تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ شیش ناگ تھا۔ اُس نے لکڑیوں کے ٹال میں گھس کر کماری سونیا کے شریر کو دیکھا، اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تب اُس نے ہاتھ آگے بڑھائے اور کماری سونیا کو اُس کی ارتھی سے اُٹھا لیا۔
...ہن بنی ہوئی سونیا سانپ کے بازوؤں میں دبی ہوئی تھی اور وہ آہستہ آہستہ پھول نگریا سے باہر جا رہا تھا۔ اُس کا رُخ ویرانوں کی جانب تھا۔ بہت دُور کالے جلے ہوئے پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا تھا۔ ان پہاڑوں کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں کسی زمانے میں آتش فشاں تھا۔ جو آتش فشانی کرتے کرتے سرد ہو گیا تھا۔ صدیوں پہلے اس نے یہ آتش فشانی کی تھی، لیکن اس کے یہ اثرات آج تک موجود تھے۔ جلے ہوئے پہاڑوں سے کوئلہ نکلتا تھا اور وہاں پتھروں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جدھر دیکھو کوئلہ ہی کوئلہ۔ کوئلوں کی راکھ اُڑتی رہتی تھی۔ اس لئے اس طرف کوئی نہیں جاتا تھا۔
نوجوان، کماری سونیا کی لاش کو لئے ہوئے انہی پہاڑوں کی سمت سفر کرتا رہا اور بہت دُور چلنے کے بعد ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کوئلے کے پہاڑ نہیں تھے، بلکہ چوڑی چٹی کے پہاڑ نظر آ رہے تھے جو کافی اونچے تھے۔ ایک پہاڑ کے دامن میں سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ بے ترتیب اور ناہموار سیڑھیاں جن پر شاید صدیوں سے کسی انسان کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ نجانے کس نے یہ سیڑھیاں بنائی تھیں؟ ممکن ہے وہ قدرت کی تخلیق ہو۔ کیونکہ اتنی پرانی محسوس ہوتی تھیں کہ اگر ماہرین آثار قدیمہ ان کا جائزہ لیتے تو ان کی تاریخ نہ بتا سکتے۔
سیڑھیاں بلندی پر جانے کے بعد ایک سمت گھوم گئی تھیں اور یہاں چٹانوں نے انہیں چھپا لیا تھا۔ لیکن چٹانوں کے آخری سرے پر جہاں سیڑھیوں کا اختتام ہوتا تھا ایک چھوٹا سا غار نما سوراخ بنا ہوا تھا۔ یہ سوراخ انسانی ہاتھوں کی تراش محسوس نہیں ہوتا تھا، کیونکہ بالکل چوکور تھا۔ اس سوراخ میں پہنچنے کے بعد ایک بار پھر سیڑھیاں نیچے تہہ خانے کو اُترتی تھیں اور اس تہہ خانے میں ایک عجیب و غریب قسم کا پتھر کا بت بنا ہوا تھا۔ یہ بت قد آدم سے بھی کچھ زیادہ تھا جس کے آس پاس مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ غاروں میں طرح طرح کے جانور چکراتے پھر رہے تھے۔ ان کی ہیئت انتہائی خوفناک تھی۔ ان کے بت کے پاس ٹھنڈی کی جگہ ایک ہیرا جڑا ہوا تھا جو چمک رہا تھا اور ان کی روشنی پورے غار کو منور کر رہی تھی۔
نوجوان نے کماری سونیا کی لاش بت کے چرنوں میں رکھ دی اور اس کے بعد خاموشی سے کھڑا بت کو دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔ اُس کے ہونٹ عجیب انداز میں سکڑے ہوئے تھے۔ گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ اس حالت میں وہ بے حد خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ کماری سونیا کی لاش بت کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ تب اُس کی گمبھیر آواز اُبھری۔
”اے دھرم ادھنی...... تو جانتا ہے میں نے سارا جیون تپسیا کر کے بتایا ہے تب تو نے مجھے وہ شکتی دی کہ انسانی روپ دھار لوں۔ تو نے مجھے آ گیا دی دھرم ادھنی کہ میں اب جیون جس طرح چاہوں بتاؤں۔ مہاتما، میں نے سارے جیون کی تپسیا کا کیا پھل پایا؟ کیا یہی جو تیرے سامنے لاش کی شکل میں موجود

ہے؟ مجھے بتا دھرمادھنی کہ جسے میں نے جیون سے زیادہ پیار کیا اسے بھگوان نے کیوں چھین لیا مجھ
نے تو ہمیشہ مجھ سے کہا تھا کہ بھگوان دیالو ہے۔ وہ رحم کرتا ہے۔ وہ پریم کرنے والوں کو چاہتا
دھرمادھنی، میں نے تو کبھی اسے نہ مانگا تھا۔ میں تو من ہی من میں اسے پوجتا تھا۔ میں چاہتا تو راجکمار
کر سوئمبر میں چلا جاتا اور اسے جیت لیتا۔ پر میں نے اسے جیتنے کی بات تو نہیں کی۔ میں جانتا تھا کہ
سانپ ہوں۔ پر من میں تو میں اسے چاہتا تھا۔ چھپکتی رہتی تو میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتا رہتا۔ تو نے ا
کر دیا؟ دھرمادھنی...... مجھے اس کا جیون چاہئے۔ ورنہ میری تپسیا مجھے واپس دے دے۔ میں اس ک
جینا نہیں چاہتا۔ مجھے جواب دے دھرمادھنی...... مجھے جواب دے۔"

پھر غاروں میں ایک آواز اُبھری۔ "اس کا جیون ختم ہو گیا تھا پرشوتم...... تو کیا چاہتا تھا؟ تو کہتا ہے
تجھے اس کے شریر سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ تو اس کی آتما کو چاہتا تھا، کیوں پرشوتم، تو نے یہی کہا تھا نا؟"

"ہاں دھرمادھنی...... میں نے کب چاہا تھا کہ اس کا شریر میرے قابو میں آ جائے۔"

"اگر شریر سے پریم نہیں کیا جاتا تو پھر آتما پیاری ہوتی ہے۔ کیوں، کیا ایسا نہیں ہے؟"

"ایسا ہی ہے...... مگر اب اس مٹی کے بے جان ٹکڑے کو دیکھ کر میں کیا کروں؟ کل لوگ اس کا
بھسم کر دیں گے تو مجھے کیا ملے گا؟"

"شریر سے تو تجھے کچھ لینا ہی نہیں تھا پگلے۔ تو آتما کا پجاری ہے نا؟ جا، اس کی آتما کو تلاش کر
تجھے بتاتے ہیں کہ اس کی آتما سنسار ہی میں موجود ہے۔ وہ آکاش پر نہیں پہنچی۔ وہ کسی اور کے شریر
تجھے مل جائے گی۔ تیرے پاس دیکھنے والی آنکھ ہے، چلنے والا بدن ہے۔ جا اور سنسار میں اسے تلاش
تیرا پریم سچا ہے تو یہ تجھے ضرور مل جائے گی۔ جا...... دھرمادھنی جھوٹ نہیں کہتا۔ جو کچھ میں نے کہا
ہے۔ یہ کسی اور کے شریر میں جا پہنچی ہے۔ جا، اس شریر کو تلاش کر۔ ہم تجھے اس کا پتہ نہیں بتائیں
صرف تیری سچی لگن ہو گی جو اُسے تلاش کرے گی۔"

آواز بند ہو گئی۔ نوجوان کے آنسو خشک ہو گئے۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور بت کے قد
میں گر پڑا۔ اُس کا بدن آہستہ آہستہ سانپ بنتا جا رہا تھا...... تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنے وجود ک
سے انسانی بدن میں تبدیل کیا اور راج کماری سونیا کی لاش کو اُٹھائے ہوئے واپس پھول نگریا میں آ گیا

گوندا اور دوسرے لوگ یہاں ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ اُس نے لاش کو ارتھی پر رکھا اور پھر سانپ
کر آہستہ آہستہ پھول نگریا سے باہر نکل گیا۔

گوندا اور دوسرے لوگ جب پھول نگریا پہنچے تو ارتھی اسی طرح لکڑی پر رکھی ہوئی تھی۔ گوندا نے ا
ہاتھ سے ارتھی کو مشعل دکھائی اور تھوڑی دیر کے بعد لکڑیاں جل اُٹھیں...... مائی کا کھیل مائی ہی جانے
راج کماری سونیا کا حسین وجود راکھ میں تبدیل ہو گیا تھا...... آئینے نے سچ ہی کہا تھا، سب اُس جیسے
راکھ کا کھیل مٹی کا کھیل یکساں ہی تو تھا۔ کوئی کسی رنگ میں ہے، کوئی کسی رنگ میں۔ لیکن سب ایک
رنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔

❁❁❁

دن خاموشی سے گزر گیا۔ یہاں دن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ زندگی راتوں کو جاگتی تھی۔ شام
کوٹھے سجنے لگتے تھے۔ کماری سونیا ان کوٹھوں سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔ چھایا اور کانی اُسے سب
سمجھا رہی تھیں۔ گو اُن کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی گمان نہیں تھا کہ ان کی ساتھی بدل گئی ہے۔ شریر
آتما سہی۔ کومل نے اپنے آپ کو بدلا محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

شام ہو گئی۔ سازندوں نے ساز سجائے اور کومل کو رقص کے لئے سجایا جانے لگا۔ آج کے رقص میں نہ
صاحب آئے تھے نہ لالہ جی اور نہ صوفی صاحب۔ یہ تینوں ناراض ہو گئے تھے۔ چندراوتی نے ہنستے
کہا۔

"زیادہ دن کی بات نہیں ہو گی۔ بھلا نواب صاحب کہاں رُک سکیں گے؟ بھلا صوفی صاحب کو اس
ٹھے پر آئے بغیر نیند آ سکتی ہے؟ اور لالہ جی، وہ تو پیدا ہی یہاں کے لئے ہوئے تھے۔ بس یہ اس سے
کی بات ہے جب تک ان کے دماغ صحیح نہیں ہو جاتے۔ حالانکہ رادھے شام جی کسی کے آنے کا برا
مانتے۔ اتنے بڑے آدمی ہو کر وہ بڑے نیک مزاج کے انسان ہیں۔"

رادھے شام جی آ گئے۔ آنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ کوٹھوں پر بھلا کسی کو کون روک سکتا ہے؟ ہاں منہ
لگایا جاتا تھا جن کی مالی حیثیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا تھا۔ چندراوتی نے اس سلسلے میں اپنے کوٹھے کا
بار رکھا ہوا تھا اور یہاں معیاری لوگ ہی آتے تھے۔

رادھے شام جی آ گئے اور رقص شروع ہو گیا۔ آج کوئی برا ماننے والا نہیں تھا۔ سب کے سب ہال میں
ملار ہے تھے۔ رقص جاری رہا۔ اور جب وقت زیادہ ہو گیا تو چندراوتی نے مہمانوں کو الوداع کیا۔ ہاں
دھے شام کی بات دوسری تھی۔ اور بیچاری کومل کو ان کی چند لمحات کی تنہائی بہر طور برداشت کرنی ہی پڑتی
آج دن میں اُس نے رادھے شام جی کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔

رادھے شام جی تنہائی میں پہنچے تو اُنہوں نے کومل سے وہی لگاوٹ کی باتیں شروع کر دیں۔ گھسا پٹا
پرانی دہرائی ہوئی باتیں۔ لیکن کومل کو ایسا ہی اظہار کرنا ہوتا تھا جیسے رادھے شام جی کی ہر بات نئی ہو۔

"جب تم جمنا محل پہنچ جاؤ گی کومل، تو کیا تمہیں یہ کوٹھا یاد نہیں آئے گا؟"

"نہیں...... محل کے صحن میں بیٹھ کر جمنا کو دیکھا کروں گی، اُس میں پھول ڈالا کروں گی۔"

"اور ہم کیا کریں گے؟"

"آپ بھی تو میرے ساتھ ہی ہوا کریں گے۔" کومل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ مسکراہٹ دل کی
گہرائی سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔

راد ھے شام مسرت سے بے قابو ہو گئے۔ ''اور پھر ہم ساون کے مہینے میں جمنا کے کنارے ریت پر
پانی سے نہایا کریں گے۔ کیوں، تمہیں ساون پسند ہے؟'' راد ھے شام جی نے پوچھا اور کومل کے دل میں
ایک ہوک سی اُٹھی۔ اُسے ساون ہی نہیں پھول نگریا بھی تو پسند تھا...... اُس کی پسندیدہ جگہ تو اُس کے پتا
نے اُسی کے لئے بنوائی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آ گئی تو راد ھے شام جی تڑپ اُٹھے۔

''ارے ارے کومل...... کیا بات ہے؟ کیا سوچ کر تمہیں دُکھ ہوا ہے۔''

''کچھ نہیں...... بس کچھ نہیں۔''

''ہمیں نہیں بتاؤ گی؟ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کومل جیسے تم ہم سے وہ پریم نہیں کرتیں جو ہم تم سے کرتے ہیں۔''

''راد ھے شام جی، آپ کو پتہ ہے کہ میں ایک ناچنے والی عورت ہوں۔''

''ہاں، کیوں نہیں۔ کیا ہوا؟''

''بہت سی آنکھیں میرے شریر کو چھوتی ہیں۔''

''آنکھوں کی پہنچ کو کون روک سکتا ہے؟ اگر تم کسی ریاست کی راجکماری بھی ہوتیں، تب بھی دیکھنے والوں کی آنکھوں کو تو بند نہیں کر سکتی تھیں۔''

''میرا مطلب ہے مجھے ان آنکھوں کی چبھن پسند نہیں آتی۔''

''اُس سمے تک کی بات ہے کومل، جب تک شیش محل مکمل نہیں ہو جاتا اور ہم چندراوتی کو پانچ لاکھ روپے ادا نہیں کر دیتے۔''

''ایسا کب ہوگا راد ھے شام جی؟''

''بہت جلد میری راجکماری...... بہت جلد۔ میں پوری پوری کوشش کر رہا ہوں۔ کل میں جھانسی جا رہا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ میرے جتنے وسائل ہیں، سب اکٹھے کر کے میں تمہارے لئے لگا رہا ہوں۔''

''جھانسی جا رہے ہیں آپ؟''

''ہاں......''

''جھانسہ تو نہیں دے رہے ہیں مجھے؟'' کومل نے کہا اور راد ھے شام جی ہنس پڑے۔

''واہ...... اب تمہارا موڈ ٹھیک ہوا۔''

''راد ھے شام جی، اب جلدی سے یہ سب کچھ کریں۔ میں اب یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔''

''بس رانی...... تھوڑا سا سمے اور دے دو۔'' راد ھے شام جی نے کہا۔ وہ کافی دیر تک کومل سے باتیں کرتے رہے اور اُسے تسلیاں دیتے رہے۔ اور اس کے بعد رخصت ہو گئے۔

کومل اُن کے جانے کے بعد عجیب سے خیالات میں ڈوب گئی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر راد ھے شام جی اپنے اس کوٹھے سے اُتار کر جمنا محل لے جاتے ہیں تو کم از کم اتنا تو ہو گا کہ وہ دوسروں سے محفوظ ہو جائے گی۔ پھر اُس کے سامنے ایک ہی شخص ہو گا جسے بیوقوف بنا کر اپنے آپ کو بچائے رکھنا ہو گا۔ چنانچہ اس فیصلے کے تحت اُس نے راد ھے شام جی کو اس بات کے لئے مجبور کیا تھا۔

محل جلد بن جائے تاکہ وہ وہاں منتقل ہو جائے۔ وہ جانتی تھی کہ چندراوتی نے اُسے راد ھے شام کے حوالے کرنے کے لئے پانچ لاکھ روپے طلب کئے ہیں جو اُس کی قیمت ہو گی۔ کاش یہ مرحلہ کچھ پہلے آ گیا ہوتا تو وہ اپنے جوتوں کی جھاڑن سے پانچ لاکھ روپے ادا کر سکتی تھی۔ لیکن اب وہ راج کماری نہیں بلکہ کومل تھی۔ ایک ناچنے والی......

رات کو نجانے کب تک اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ مرنے والے مر جاتے ہیں، سنسار سے ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن وہ جو جیتے جی اپنا سنسار کھو بیٹھے ہیں، کس طرح جیون گزارتے ہوں گے؟ ان کا احساس کماری سونیا کو بخوبی ہو رہا تھا۔

دوسرے دن ناشتے پر چندراوتی نے اُسے بتایا۔ ''راد ھے شام جی جھانسی چلے گئے ہیں۔ رات کو جاتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ کئی دن وہاں لگ جائیں گے۔ چنانچہ اب خاص طور سے ان لوگوں کا خیال رکھنا جو روٹھ کر چلے گئے ہیں۔ میں نواب صاحب کو سندیس بھجواتی ہوں کہ کومل نے انہیں یاد کیا ہے۔ ایسے ہی سندیس صوفی صاحب اور لالہ جی کو بھیجے جائیں گے اور ان سب کو جنہوں نے ان دنوں یہاں آنا چھوڑ دیا ہے۔ اصلی بات تو یہ ہے کومل کہ تمہارے میرے دم سے اس کوٹھے کی رونق ہے۔ میں تو اس کے لئے بھی پریشان ہوں کہ پانچ لاکھ روپے لے کر کہیں راد ھے شام جی تم پر قبضہ ہی نہ جما بیٹھیں۔ یہ سب کچھ تم پر ہے کومل بیٹی کہ تم جتنی جلد ہو سکے راد ھے شام جی سے پیچھا چھڑا لینا۔ تم جانتی ہو کہ ہم لوگوں کو یہ کام کتنی محنت سے کرنے ہوتے ہیں۔''

کومل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ تو آنے والے وقت کی بات تھی۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ ایک لمحہ بھی اس کوٹھے پر نہ رہے۔ بہرطور آج کی شام دوسروں کے نام تھی۔ بھلا کومل کماری کا پیغام ملتا اور لالہ جی دوڑے نہ آتے؟ بھلا خدا کی ایک حسین مخلوق صوفی صاحب کو بلاتی اور صوفی صاحب تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے نہ آ جاتے؟ اور نواب صاحب تو تھے ہی کومل کے تیر نظر کا شکار۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی نوابی راد ھے شام سے بہت کم تھی اور راد ھے شام کے آگے کسی کی دال نہیں گلتی تھی۔

شکوے شکایت ہوئیں، محفل سج گئی۔ فرمائشیں ہوئیں اور رقص جاری ہو گیا۔ آنے والوں میں کچھ نئے بھی تھے جن میں نمایاں شخصیت ایک خوبصورت جوان کی تھی۔ کمسن اور بھولا بھالا، نگاہیں جھکائے بیٹھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس سے پہلے کبھی کسی کوٹھے پر آنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ کومل نے اچٹتی سی نگاہ اُس پر ڈالی، طوائف کے کوٹھے پر رہتے ہوئے اب اُسے کچھ تجربہ بھی ہو چلا تھا۔ چنانچہ اُسے نوجوان کا بھولا بھالا انداز پسند آیا۔ پتہ نہیں بے وقوف یہاں کیوں آ مرا ہے......؟

وہ رقص کرتی رہی۔ اور پھر وہ وقت نکل گیا جو رقص کرنے کا ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد یہاں کسی کو رُکنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک ایک کر کے سب رُخصت ہونے لگے۔ لیکن نوجوان اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اُس کی آنکھیں ایک بار بھی اُن میں سے کسی کی جانب نہیں اُٹھی تھیں۔

چھایا نے مسکراتے ہوئے کانی سے کہا۔ ''کانی، یہ نصیب جلا کیوں بیٹھا ہوا ہے؟''

''مر گیا ہے شاید۔'' کانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ کومل بھی اُسے دیکھ کر مسکرا دی۔ چندراوتی نے نوجوان

کے قریب پہنچ کر کہا۔

''میاں جی، وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب کوٹھا بند ہو رہا ہے۔ دروازے بند ہو گئے تو کہاں جاؤ گے؟''

''جی...... وہ...... وہ......''

''ہاں ہاں میاں، بولو۔ گھر سے بھاگے ہوئے ہو؟ ناراض ہو کر آئے ہو؟ عشق میں ناکام ہوئے ہو؟ کیا بات ہے؟ کہو کہو، یہاں دل کی باتیں راز رکھی جاتی ہیں۔''

''میں...... میں ان سے...... ان سے......''

''کس سے......؟'' چندراوتی نے اُس کے اشارے کی سمت دیکھا۔ سامنے ہی کومل بیٹھی تھی۔

''ارے ارے میاں، بڑی غلط جگہ نگاہ ڈالی ہے۔ کہاں دیکھ لیا تھا کومل کو پہلے؟''

''جی دیکھیں...... میں بس تھوڑی دیر...... تھوڑی دیر ان کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''پہلی بار آئے ہو کسی کوٹھے پر؟ آداب سیکھ کر آئے ہوتے۔ جانتے ہو ان الفاظ کی کیا قیمت ہے۔ ایک لمحے میں یہاں سے نکل جاؤ اور آئندہ کبھی اس طرف کا رُخ مت کرنا، ورنہ جان سے جاؤ گے۔''

''آپ...... آپ سمجھیں نہیں...... میں...... میں......''

''ہاں صاحب، جمن، مادھو لعل، ذرا اس عاشق کے ساتھ وہی سلوک کرو جو اس قسم کے عاشقوں کے ساتھ ہوتا ہے۔''

تین مشٹنڈے تیزی سے لپکے اور نوجوان کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔

''بدتمیزی مت کرو...... میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا۔ میں کومل سے کچھ دیر بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اے چل......'' مادھو نے اُسے زور سے دھکیلتے ہوئے کہا۔

نوجوان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے خون اُتر آیا تھا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ سرد ہو گیا اور لوگوں سے بازو چھڑا کر واپس چل پڑا۔ کومل خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں نجانے کیا خیالات آ رہے تھے۔

بھگوان داس آیا تھا اُس کا رشتہ لے کر۔ اُس نے بھگوان داس کا کالا چہرہ دیکھ کر اُسے برا بھلا کہا اور پھر پیتل کا تھال اُس کے منہ پر دے مارا تھا۔ سوئمبر کے لئے کئی راج کمار آئے تھے لیکن اُن کا مذاق کر اُنہیں واپس بھیج دیا گیا تھا۔ کسی سے دل ہی نہیں ملتا تھا اُس کا۔ سوچتی تھی کہ بر مالا کسی ایسے کے میں ڈالے گی جو زمانے میں یکتا ہو۔ لیکن آج اُس کی ایک قیمت مخصوص کر دی گئی تھی۔ آج یہ سب اُس کے بس میں نہیں رہا تھا۔

بہت دیر تک وہ اُس نوجوان کے بارے میں سوچتی رہی۔ دل میں ایک عجیب سی بے چینی اُبھر آئی تھی۔ رات گزرتی رہی، کانی اور چھایا اپنے کمرے میں سونے کے لئے جا چکی تھیں۔ چندراوتی کے خراٹے اُس کے کمرے میں گونج رہے تھے۔ باہر کے دروازے بند تھے۔ مدھم روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی سی کھلی کھڑکی سے تاروں بھری رات جھانک رہی تھی۔ مسہری پر لیٹے لیٹے کومل کی نگاہ آسمان کی جانب اُٹھ گئی۔ یہی آسمان چترکلا پر بھی ہوگا...... اُس نے کئی بار محل کی چھت سے تاروں بھرے آسمان کو

دیکھا تھا اور اُسے آسمان ہمیشہ خوبصورت لگتا تھا۔

اُس کے اپنے اُس سے تھوڑے فاصلے پر تھے۔ ہمت کرتی تو چترکلا جا پہنچتی۔ لیکن کسی کو اونچا نہیں سکتی تھی۔ اور اگر کہتی بھی تو کون مانتا؟ لوگ یہ سوچ کر بھگا دیتے کہ ایک ناچنے والی محل پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہی ہے۔

نجانے کیا کیا خیالات اُس کے ذہن میں آتے رہے۔ اور جب بھی ایسے خیالات آتے، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ اس وقت بھی وہ رو رہی تھی کہ دفعتہً کچھ شور مچلنے لگا...... وہ حیران ہو کر اُس سننے لگی۔

نیچے کچھ لوگ چیخ چلا رہے تھے۔ وہ چونک کر کھڑکی کے پاس آئی۔ تب اُس نے دیکھا کہ چند افراد کسی کو پکڑے ہوئے کھڑے ہیں اور اُسے مار پیٹ رہے ہیں۔ کومل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کچھ دیر تک وہ کھڑکی میں کھڑی جھانکتی رہی۔ لوگ اُس آدمی کو پکڑے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ پھر باہر کے دروازے پر دھڑ دھڑ سنائی دینے لگی اور تھوڑی دیر بعد چندراوتی نے تیز روشنی کر کے دروازہ کھول دیا۔

چند آدمی ایک نوجوان کو پکڑے ہوئے اندر لائے تھے۔ کومل خود بھی باہر نکل آئی۔ کانی اور چھایا بھی آ گئیں اور جو لوگ یہاں رہتے تھے سب کے سب اُس بڑے ہال میں جمع ہو گئے تھے جہاں رقص ہوتا تھا۔ آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"چندرا بائی، یہ تمہارے گھر کے پچھلے حصے کی کھڑکی سے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم نے دیکھ لیا اور پکڑ لیا۔"

"ارے یہ تو وہی ہے۔" چندراوتی کے منہ سے نکلا۔ تب کومل نے بھی اُس نوجوان کو غور سے دیکھا۔ یہ وہی بھولا بھالا سیدھا سادھا سا نوجوان تھا جو کومل سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔

"ہوں...... تو یہ اس طرح کھڑکی سے چڑھ کر آ رہا تھا۔ ارے لے جاؤ۔ پتھروں سے مار دو اس کمبخت کو۔ آخر سمجھا کیا ہے اس نے اپنے آپ کو۔ کیا سمجھا ہے اس نے چندراوتی کے کمرے کو؟ چل بے...... کیا کرنے آ رہا تھا؟''

''میں چور نہیں ہوں چندراوتی۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں کومل سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' نوجوان بولا۔

"اب تو تیرا منہ ہی توڑنا پڑے گا۔ ابھی بلواتی ہوں کوتوال صاحب کو حوالے کرتی ہوں تجھے اُن کے۔ دیکھتی ہوں کہ کتنا بانکا ہے تو۔'' چندراوتی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ لیکن نجانے کومل کے دل میں کیا سمائی، وہ آگے بڑھی اور اُس نے اُن لوگوں سے کہا۔

''چھوڑ دو اسے...... میں نے خود ہی اس سے کہا تھا کہ کھڑکی سے آ کر مجھ سے بات کرے۔ کیوں مار رہے ہو تم لوگ اسے؟''

چندراوتی، چھایا اور دوسرے لوگ حیران رہ گئے۔ پھر آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ ''چندراوتی، طوائف ہے نا...... بلاوجہ ہمارے ہاتھوں اس بے چارے کی پٹائی کرا دی۔ جب تمہاری بیٹی نے اسے

بلایا تھا تو اتنا زیادہ بننے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ لوگ برا سا منہ بنا کر چلے گئے۔ چندراوتی تعجب سے کول کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے حیرت سے کہا۔

''کول......''

''کیا کرتی ماتا جی...... مروا ہی دیتیں آپ اس بیچارے کو۔''

''مگر یہ تو نے......''

''اس کی جان بچانا ضروری تھا۔ ذرا سی بات پر آپ اس کی جان کے پیچھے پڑ گئیں۔'' کول نے لہجے میں کہا۔

''تو، تو اسے اپنے کمرے میں لے جائے گی؟''

''کیا حرج ہے؟ اگر یہ مجھ سے صرف باتیں کرنا چاہتا ہے تو کمرے ہی میں کیا اس ہال میں بڑی باتیں کر سکتا ہے۔''

''نن...... نہیں کول...... میں آپ سے...... آپ سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھو، اگر تمہارے دماغ میں کوئی پاگل پن سوار ہے تو اسے دل سے نکال پھینکو۔ یہاں لوگ اس طرح ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ جاؤ، واپس چلے جاؤ۔ بیہودہ جذبات کو قابو میں رکھو۔ تم ویسے بھی مجھ سے نہیں مل سکتے۔ کسی قیمت پر نہیں۔ جاؤ، میں نہیں چاہتی کہ تمہاری جوانی خاک میں مل جائے۔''

نوجوان نے آتش بھری نگاہوں سے کول کو دیکھا اور پھر غصے سے پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ چندراوتی نے کہا۔ ''دیکھ لیا اس کا غصہ؟ ایسے رحم کرو گی کول تو کوئی نہ کوئی کسی دن تمہاری ہتیا کر دے گا۔ جان لے گا تمہاری۔ کیا سمجھی؟''

''نہیں ماتا جی...... اب ایسا بھی نہیں ہے۔ بس مجھے اُس پر رحم آ گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے...... رحم کھانا کوئی بری بات نہیں۔ مگر کوئی جان ہی کے پیچھے پڑ جائے تو کھڑکی بند کر لو۔ اب تم جاؤ۔''

کول اپنے کمرے میں آ گئی۔ لیکن نجانے کتنی دیر وہ نوجوان کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اگرچہ دل میں نوجوان کی محبت کا تصور بھی تو نہیں اُبھرا تھا۔ لیکن بہر طور وہ اُس کے لئے افسردہ ضرور تھی۔ کہیں گے، ایسی جگہوں پر دل لگا لیتے ہیں جہاں دلوں کا سودا ہی نہیں ہوتا۔

وہ مسہری پر لیٹ گئی۔ بہت دیر تک نوجوان اُس کے ذہن میں چکراتا رہا۔ اور پھر اُسے نیند آ گئی۔

دوسری صبح حسب معمول تھی۔ رات بھی آئی اور گزر گئی۔ اس کے بعد وہ نوجوان نظر نہیں آیا تھا۔

تیسرے دن دوپہر کے وقت کچھ لوگ چندراوتی کے پاس آئے۔ انہوں نے کسی تقریب میں مجرے کے لئے کہا تھا۔

چندراوتی بہت کم مجروں میں جایا کرتی تھی۔ لیکن ہزاروں کے نوٹ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ بہت بڑی رقم تھی۔ چنانچہ اُس نے وعدہ کر لیا کہ رات کو وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ مجرے میں شریک ہو گی۔ جگہ بتا دی گئی۔ آنے والوں نے کہا کہ وہ اُنہیں خود لے جائیں گے۔ اُنہوں نے

بڑے رئیس کا حوالہ دیا تھا جنہیں چندراوتی بھی جانتی تھی۔ لیکن اس حیثیت سے نہیں جس حیثیت سے وہ کوٹھے پر آنے والوں کو جانتی تھی۔

تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مجرا، کول کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ لیکن کماری سونیا کے لئے اجنبی تھا۔ اکثر جشن کے موقع پر دیس کی ناچنے والیوں کو اپنے محل کے بیرونی حصے میں رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن ایسے موقع پر گھر کی عورتوں کو اُن کے سامنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اُنہیں نیچ سمجھا جاتا تھا، کمینہ سمجھا جاتا تھا اور اتنی حیثیت نہیں دی جاتی تھی کہ وہ گھر کی عورتوں کے سامنے آئیں۔ انہیں مُردوں سے بدتر سمجھا جاتا تھا۔ اور آج وہ ایک ناچنے والی کی حیثیت سے کسی رئیس کے یہاں مجرے میں جا رہی تھی۔ کماری سونیا، کول کی حیثیت سے زمانے کی ستم ظریفی پر اب روتی نہیں تھی، بلکہ مسکرا دیتی تھی۔ جب تقدیر میں ہی کچھ لکھا ہے تو روتے رہنے سے کیا حاصل؟

رات کو اُسے موتیوں میں پرو دیا گیا۔ پھولوں سے لاد دیا گیا۔ کانی اور چھایا نے بھی حسین ترین لباس زیب تن کئے تھے، خوبصورت میک اپ کیا تھا اور اس کے بعد ایک بڑی سی موٹر اُنہیں لینے کے لئے آ گئی۔ جسے ایک مونچھوں والا جوان چلا رہا تھا۔

موٹر آگے بڑھتی رہی، لڑکیاں اُس میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جبکہ چندراوتی اپنے سازندوں کے ساتھ ایک دوسری موٹر میں پیچھے آ رہی تھی۔ پھر دونوں موٹریں اُس کوٹھی کے سامنے جا کر رک گئیں جس کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اگلی موٹر سے لڑکیاں نیچے اُتریں، دوسری موٹر سے سازندے اور چندرا بھی اُتر آئیں۔ لیکن دفعتہً ہی جانے کیا ہوا، اگلی موٹر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے جس کی مونچھیں گھنی اور نوکیلی تھیں، دفعتہً ہی کول کا ہاتھ پکڑ کر واپس موٹر میں گھسیٹ لیا اور اس کے بعد موٹر اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی......

کانی اور چھایا کی چیخوں سے چندراوتی حیران رہ گئی تھی۔ اُس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دوسری موٹر بھی برق رفتاری سے اسٹارٹ ہوئی اور نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔ چندراوتی کو ایک لمحے کے لئے صورتحال کا اندازہ نہیں ہو سکا، لیکن دوسرے لمحے اُس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ کوٹھی کے دروازے پر کھڑے ہوئے دربان اُن کی جانب دوڑ پڑے تھے۔ چندراوتی واویلا کر رہی تھی۔ کوتوال کی دھمکی دے رہی تھی اور نجانے کیا الا بلا بک رہی تھی۔ دربانوں نے اُس سے شور مچانے کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا۔

''ہمیں بلایا تھا قمر صاحب نے۔ مجرے کے لئے پچیس ہزار روپے بھجوائے تھے۔ لیکن میری بیٹی کو اغوا کر لیا گیا...... ہائے، وہ میری کول کو لے گئے...... میں تو حشر برپا کر دوں گی۔ میں تو...... میں تو......''

چندراوتی چیخ رہی تھی۔ اندر سے کچھ اور لوگ بھی برآمد ہوئے جن میں وہ بڑے رئیس بھی شامل تھے جن کی یہ کوٹھی تھی۔ چندراوتی اور سازندوں کو ڈانٹا گیا اور اُن سے صورتحال پوچھی گئی۔ لیکن چندراوتی اول فول بکتی رہی۔ جس پر رئیس نے غصے میں آ کر کہا۔

''ان سب کو اندر لے جاؤ اور ان کے بدن سے ان کی کھال اُتار دو۔ مجھے بدنام کرنے کے لئے کسی کے ساتھ سازش کی ہے۔''

"ہائے رام...... اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ہمیں بلایا مجرے کے لئے اور اس کے بعد ہماری بچی کو اغوا کرلیا اور ہمیں ہی مارنے کی دھمکی دیتے ہیں؟"

"تو پاگل ہوگئی ہے عورت...... ہمیں نہیں جانتی۔ ہمارے ہاں کوئی مجرا وجرا نہیں تھا۔ ہم نے کسی کو نہیں بلایا۔ یہ سب ڈھونگ ہے۔ اور اس ڈھونگ کی تجھے خاطر خواہ سزا دی جائے گی۔" رئیس نے غصے سے دہاڑتے ہوئے کہا۔

اب تو چندراوتی کے ہوش بھی ٹھکانے آ گئے تھے۔ ہوسکتا ہے یہ کومل کو اغواء کرنے کی سازش ہو...... واویلا کرتی رہ گئی۔ ان لوگوں کو کوٹھی سے دُور بھگا دیا گیا تھا۔

دوسری طرف وہ نوجوان جو کومل کو اغواء کر کے لایا تھا بہت تیز رفتاری سے موٹر چلا رہا تھا۔ اُس کا رُخ کسی نامعلوم سمت کی طرف تھا۔ کومل جو ایک لمحے کے لئے کچھ بھی نہیں سمجھ سکی تھی اور خاموشی سے پچھلی سیٹ پر دبکی پڑی تھی، آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہوا ہے؟ لیکن پھر وہ صورتحال کو سمجھنے لگی۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے دل میں خوف کے آثار اُبھرے لیکن دوسرے لمحے نجانے وہ کیوں خوش ہوگئی۔ اگر اس طرح اُسے کوٹھے سے نجات مل جائے تو کیا حرج ہے؟ اُس نے سر اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ نوجوان بار بار پلٹ کر اُس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ کومل نے آہستہ سے کہا۔

"تم سڑک پر نگاہیں جما کر گاڑی چلاؤ۔ میں کچھ نہیں کروں گی۔"

نوجوان کے چہرے پر حیرت کے آثار اُبھر آئے تھے۔ لیکن بہرطور اُس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی مختلف سڑکوں سے گھومتی ہوئی ایک خوبصورت عمارت کے سامنے رُک گئی۔ حویلی نما عمارت خاصی بڑی اور کشادہ تھی۔ لیکن اُس پر سوگواری برس رہی تھی۔ ایک عجیب سا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ رات کا وقت تھا، لیکن وہاں روشنی بھی بہت کم نظر آ رہی تھی۔

"یہ تمہاری رہائش گاہ ہے؟" کومل نے پوچھا۔

"ہاں......"

"مگر تم کون ہو؟ اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

نوجوان نے اپنے چہرے پر سے لمبی اور گھنی مونچھیں اُتار دیں۔ اور کومل اُس کی صورت دیکھ کر ششدر رہ گئی...... یہ تو وہی تھا جس نے پہلے چندراوتی کے کوٹھے پر آ کر کومل سے ملاقات کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ پھر رات کو کھڑکی سے چڑھ کر آیا تھا، لیکن پکڑا گیا تھا۔ تو اس نے یہ سازش کی تھی۔ نجانے کیوں کومل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں تمہیں پہچان گئی۔ اور اب تم یقیناً اس توہین کا بدلہ لو گے مجھ سے۔"

"نہیں کومل جی...... میں نے اُس وقت بھی یہی کہا تھا کہ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ لیکن چندراوتی کمینی نے مجھے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں اس وقت بھی آپ سے کچھ باتیں ہی کرنا چاہتا ہوں۔ ان باتوں کے بعد میں آپ کو جہاں آپ کہیں گی، وہیں پہنچا دوں گا۔ میرا جو بھی حشر ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"مگر تم نے...... تم نے چال تو بڑی اچھی چلی۔ ان لوگوں کو وہیں چھوڑ آئے اور پچیس ہزار روپے

ہارے۔"

"ہاں کومل جی، بڑے نقصان کو پورا کرنے کے لئے چھوٹا نقصان کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ پچیس ہزار میں نے کہاں سے جمع کیے؟ آپ نہیں جانتیں۔"

"کیا تم...... تم...... میرا مطلب ہے یہ حویلی تو اچھی خاصی ہے۔"

"آپ اسے طوائف کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں کومل جی۔ انسان کی نگاہ سے دیکھیں تو اس حویلی کے در و دیوار سے آپ کو آہوں کی آواز سنائی دے گی۔"

"میں سمجھی نہیں؟"

"آیئے، میں آپ کو سمجھاؤں۔ ممکن ہے مجھے اس کے بعد اس کا موقع نہ ملے۔ میں نے اپنے گھر کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگائی ہے۔ ممکن ہے اس قربانی کے صلے میں مجھے بہت کچھ دینا پڑے۔" نوجوان نے کومل کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی جانب چل پڑا۔ کومل اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ عجیب سا احساس اُس کے دل میں پیدا ہو رہا تھا۔

کوٹھی کا برآمدہ طے کر کے وہ اندر داخل ہوگئے۔ سب سے پہلے اُن کی ملاقات اُن لڑکیوں سے ہوئی جو سادہ ساڑھیوں میں ملبوس سادہ سے چہرے میں اُن کے سامنے آئی تھیں۔ لڑکیوں نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے نوجوان کو دیکھا اور پھر کومل کو۔ پھر اُن میں سے ایک نے کہا۔

"گوپال بھیا...... یہ کون ہے؟ کیا...... کیا......"

"فضول باتیں مت کرو۔ ایک بھی فضول بات مت کرنا۔ ماتا جی کہاں ہیں؟"

"کمرے میں ہیں اپنے۔ آئیں بھیا۔"

"آ جاؤ......" نوجوان بولا اور دونوں لڑکیاں اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ کومل حیران سی آگے بڑھ گئی۔ اُس نے ایک بار لڑکیوں کو دیکھا اور مسکرا دی۔ دونوں لڑکیاں بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔ آگے دو لڑکیاں اور ملیں جو عمر میں اُن سے کچھ چھوٹی تھیں۔ اُنہوں نے بھی حیرت سے کومل کو دیکھا تھا اور اپنے بھیا کو جس کا نام وہ گوپال لے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اندر داخل ہوگئے۔ ایک بڑے سے کمرے میں ایک کشادہ مسہری پر ایک لاغر عورت پڑی ہوئی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ہوئی تھی۔ ہونٹ خشک تھے، گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اور وہ ہراساں نگاہوں سے چھت کو دیکھ رہی تھی۔ قدموں کی آواز پر اُس نے پلٹ کر اُن لوگوں کو دیکھا، پہلے نوجوان کو اور پھر اُس کے پیچھے کومل کو اور پھر چاروں لڑکیوں کو۔ اس کے بعد وہ اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن اُن میں سے ایک لڑکی جلدی سے اُس کے پاس پہنچ گئی۔

"نہیں ماتا جی...... لیٹی رہیے۔ آپ لیٹی رہیے۔" اُس نے بیمار عورت کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور عورت کھانسنے لگی۔

"یہ...... یہ کون ہیں؟ یہ کون ہیں گوپال؟" عورت نے کھانسنے کے بعد کہا۔

"ماتا جی، یہ کومل کماری ہیں۔ وہی کومل کماری جنہوں نے ہمارا سب کچھ چھین لیا، جنہوں نے ہمیں

برباد کر دیا۔ یہ وہی کومل کماری ہیں۔ میرا گھر ہے ماتا جی، میں انہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں ان کے
سے بات کرنے کے لئے گیا تھا لیکن ان سے بات کرنے کی قیمت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے
جی ان کی قیمت ادا کی اور انہیں یہاں لے آیا۔ پہلے انہیں انسانوں کی طرح سمجھانا اچھا رہے گا۔
یہی وہ کومل کماری جی ہیں۔"

"تو نے کیا بیوقوفی کی گوپال..... تو نے ایسا کیوں کیا؟ بیوقوف پاگل لڑکے، ایسا کیوں کیا تو نے
کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ سوچا تھا؟"

"میں نے جو کچھ کیا ہے ماتا جی، سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ہم سب کو خود کشی ہی کرنا تھی، اس سے پہلے
نے سوچا کہ کم از کم انہیں اپنے گھر کی صورت تو دکھا دوں۔ انہیں بتا دوں کہ جو زہر انہوں نے میرے
میں اتارا ہے اس نے کیا صورت اختیار کر لی ہے۔ بتاؤ ماتا جی، کیا ہم اس طرح زندہ رہ سکیں گے
کومل کماری نے ہم سے ہماری زندگی کی ہر خواہش نہیں چھین لی ہے؟ ایسے ہم کیسے جئیں گے ماتا جی
کچھ مجھ سے بن پڑا تھا، میں نے کیا۔ مجھے اس پر نہ ٹوکو۔ ایک بار ان کے سینے کو ٹٹول لینے دو مجھے
ہوں کہ ایک انسان کے اندر سے ضمیر کس طرح گم ہو جاتا ہے۔ دیکھتا ہوں ماتا جی، ایک تجربہ
جائے گا جیون میں۔"

اب کومل کی آنکھوں میں حیرانی اُبھر آئی تھی۔ اُس نے پریشان نگاہوں سے چاروں لڑکیوں کو، گوپال
اور پھر اُس بیمار عورت کو دیکھا۔ اور اس کے بعد ہمدردانہ انداز میں اپنے لباس کی پرواہ کئے بغیر بیمار
کی مسہری پر جا بیٹھی۔

"آپ کون ہیں گوپال..... مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟ میں کچھ نہیں سمجھی ماتا جی؟ بھگوان کے لئے
مجھے بھی تو کچھ بتا دیں۔"

"میں بتا رہا ہوں کومل کماری جی۔ وہ سب کچھ میں آپ کو یہاں لا کر بتا رہا ہوں جو میں نے
آپ کو آپ کے کوٹھے پر بتا دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آپ نے مجھے اس کا موقع نہیں دیا تھا۔"

"وہ میں کہاں تھی؟ اگر میری بات ہوتی تو میں تو سن لیتی۔ تم نے دیکھا نہیں میں نے کس طرح
ہو کر اُن لوگوں کے ہاتھوں......"

"اپنی مجبوری کا تذکرہ کر کے ہمارے خاندان کا مذاق نہیں اُڑایئے کومل کماری جی۔ آپ کو اس کا
حق نہیں پہنچتا ہے۔"

"ٹھیک ہے..... پر مجھے بتاؤ تو سہی، میں نے کیا، کیا ہے؟"

"یہ رادھے شام جی کا گھرانہ ہے۔ رادھے شام جی میرے پتا ہیں، اور یہ میری ماتا جی۔ سمجھیں!
تھوڑے دنوں پہلے کی بات ہے کہ اس حویلی کی آن بان ہی دوسری تھی۔ نوکروں کی پوری فوج رہتی
یہاں۔ مانگنے والے کو اس حویلی میں اتنا کچھ ملتا تھا کہ وہ نہال ہو جاتا تھا۔ لیکن آج وہ دن آ گیا ہے
کا دن ہم سڑکوں پر بھیک مانگتے پھریں گے۔ سمجھیں کومل کماری جی؟ اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ
ہے، صرف تمہاری وجہ سے......"

"کیا کہہ رہے ہو تم گوپال؟ بھگوان کے لئے صاف لہجے میں بات کرو۔ رادھے شام جی..... یہ
رادھے شام جی کا گھر ہے؟"

"ہاں..... یہ میری چار بہنیں ہیں۔ چار کنواری بہنیں، جن کا اب وہ سمے تھا کہ پتا جی انہیں سنبھالتے،
ان کے لئے بر تلاش کرتے، ان کے ہاتھ پیلے کرتے۔ یہ کام میرا بھی تھا۔ میں ان چاروں بہنوں کا اکلوتا
بھائی ہوں۔ لیکن اس سے پہلے ہمارے جیون میں کوئی ایسی پریشانی نہیں تھی۔ ہماری زندگی پر کسی کومل کا
سایہ نہیں پڑا تھا۔ ہمیں کوئی چنتا نہیں تھی۔ لیکن اب صورتحال بدل چکی ہے۔ اب آپ نے ہمارے
گھر ڈاکہ ڈالا ہے۔"

"مگر کس طرح..... بھگوان کے لئے مجھے بتا تو دو، کس طرح؟"

"آپ کے لئے جمنا کنارے محل بنایا جا رہا ہے نا..... پتا جی نے سارا کاروبار بیچ دیا ہے۔ اُن کے سر
پر بھوت سوار ہے۔ اُن کے دماغ میں اب ہم لوگ نہیں رہے ہیں۔ آپ اُن کے اوپر اپنا قبضہ جما
چکی ہیں کومل جی۔ آپ نے ان چار لڑکیوں سے ان کا باپ چھین لیا ہے۔ ایک عورت سے اس کا شوہر
چھین لیا ہے۔ آپ کتنے عرصے جیتی رہیں گی؟ بتایئے، کتنا جیون ہے آپ کا؟ ایک نہ ایک دن آپ یہ سب
چھوڑ کر پرلوک سدھار جائیں گی۔ لیکن ہم سب کا جیون ناس کر دیا ہے آپ نے۔"

"اوہ..... رادھے شام جی یہ سب کچھ کر رہے ہیں؟"

"کیوں نہیں کریں گے؟ پانچ لاکھ روپے کی رقم جو ادا کرنی ہے انہیں چندرا بائی کو۔ آپ کی قیمت۔
اس کے بعد وہ آپ کو جمنا محل لے جائیں گے۔ اُس شیش محل میں جسے تیار کرنے کے لئے انہوں نے اپنے
بزرگوں کی زمینیں بیچ دیں۔ پُرکھوں کی جائیدادیں بیچ دیں۔ سارا کاروبار ختم کر دیا۔ اور اب جھانسی گئے
ہیں کہ وہاں کی زمینیں بیچ کر دولت لے آئیں جو آپ کے چرنوں میں ڈال دی جائے۔ کومل، ایک بات
کان کھول کر سن لو۔ میں تمہیں اُس شیش محل میں نہیں رہنے دوں گا۔ میں شیش ناگ بن کر تمہیں ڈس لوں
گا چاہے اس کے لئے مجھے اپنا جیون ہی کیوں نہ کھونا پڑے۔ میں رادھے شام کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"کیا بک رہا ہے گوپال..... کیا بک رہا ہے؟ کیوں میری جان کا لاگو ہو گیا ہے پاپی؟" بیمار عورت
نے بلبلے لہجے میں کہا۔

"ماتا جی، تمہیں دق ہو گئی ہے۔ کیوں؟ کیا تم اب سے چند سال پہلے بھی دق کی مریض تھیں؟.....
کومل کماری، میری ماں کو یہ بیماری تم نے دی ہے۔ تم نے اور صرف تم نے......"

کومل کماری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے مسکراتی نگاہوں سے لڑکیوں کو دیکھا، گوپال کو
اور بیمار عورت کو دیکھا۔ اور پھر بیمار عورت کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"بھگوان کی سوگند، اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے۔ بھگوان کی سوگند، میں نے رادھے شام جی سے
کچھ نہیں کہا۔ وہ تو چندراوتی ہے جس نے اپنی لالچ کی آگ میں جل کر ایک گھر کو بھسم کر دیا ہے۔ مگر ایسا
نہیں ہوگا جی۔ گوپال، ایسا بالکل نہیں ہوگا۔ تم چنتا کیوں کرتے ہو؟ اچھا کیا تم مجھ سے مل لئے۔ اچھا
کیا میری آنکھیں کھول دیں۔ بھگوان کی سوگند میں لعنت بھیجتی ہوں جمنا محل پر۔ میں لعنت بھیجتی

ہوں اس دولت پر جو انسانوں کا خون کر کے مجھ تک پہنچائی جائے۔ مجھے دولت کا کوئی لالچ نہیں۔
بلاوجہ مجھے اتنا ذلیل کر رہے ہو۔ ہاں، چندراوتی سے میں ڈرتی ضرور ہوں۔ میں اُس کا کچھ نہیں کر
سکتی۔ مگر ایسی بات بھی نہیں ہے۔ اپنا جیون دے کر میں تمہارا جیون بچاسکی تو وچن دیتی ہوں کہ ایسا
کروں گی۔ سمجھے؟ میں وہ نہیں ہوں...... میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتے ہو۔"

گوپال کی آنکھوں میں حیرت نظر آنے لگی۔ لڑکیاں تعجب سے کومل کو دیکھنے لگیں۔ بیمار عورت نے
کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے اور دُکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "میں جانتی تھی، عورت کچھ بھی بن جائے
بھی بنا دیا جائے اسے، پر رہتی عورت ہے۔ اس کا نرم دل کبھی دوسرے کو دُکھی نہیں دیکھ سکتا۔ بھگوان
بھلا کرے۔ بھگوان کی سوگند، مجھے اپنی چنتا نہیں ہے، اپنی کوئی فکر نہیں ہے مجھے۔ یہ لڑکیاں...... یہ لڑ
جب سڑکوں پر آجائیں تو ان کا کیا بنے گا؟"

"نہیں بہن جی...... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ آنے دیں ایک بار رادھے شام جی کو۔ آنکھیں کھول
گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ چندراوتی مجھ سے ناراض ہوگی، نکال دے گی مجھے۔ یہ تو اور بھی
بات ہے۔ میں کب اُس نرکھ میں رہنا چاہتی ہوں؟" کماری سونیا نے کہا۔ اس وقت کومل نہیں، کماری
بول رہی تھی۔ سچ ہی تو کہا تھا اُس نے کہ وہ، وہ نہیں ہے جو بنا دی گئی ہے۔

کافی دیر تک گوپال، کماری سونیا سے اپنے گھر کی باتیں کرتا رہا۔ سب لوگ اُس کے الفاظ پر
گئے تھے۔ گویا اُنہیں نئی زندگی مل گئی تھی۔ کماری سونیا کو پہلی بار اتنے عرصے میں ایک خوشی کا احساس
بلاشبہ اگر چند دُکھی انسانوں کے لئے کچھ کر دیا جائے تو کم از کم جیون کی وہ آگ تو بجھ سکتی ہے جو ا
وجود کو جلائے دے رہی تھی۔ اُس نے گوپال سے کہا۔

"گوپال جی، تم مجھے کسی ایسی جگہ پہنچادو جہاں سے میں اپنے گھر چلی جاؤں۔ بعد کے حالات
خود دیکھ لوں گی۔ بالکل چنتا مت کرنا، کوئی بھی نہیں جان سکے گا کہ مجھے تم کہاں لے گئے تھے اور
کر کے لانے والا کون تھا؟"

گوپال کی آنکھوں سے ممنونیت کے آنسو نکل پڑے۔ اُس نے کومل کے نزدیک پہنچ کر سر
جھکاتے ہوئے کہا۔ "میرا فیصلہ صحیح تھا کومل کماری جی...... میرا فیصلہ صحیح تھا۔ سچ مچ ضمیر کبھی نہیں مرتا۔
زندہ رہتا ہے کومل کماری جی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کچھ گھنٹوں کے لئے سو جائے۔ بھگوان آپ کو
صلہ دے گا۔ آیئے میں آپ کو آپ کے گھر کے آس پاس چھوڑ دوں۔ میرا نام لینا چاہیں تو لے لیں
آپ کو اس سے منع نہیں کرتا کیونکہ بہرطور میں نے آج وہ کام کیا ہے جسے کرنے کے بعد مجھے اپنے
کی ذرا بھی فکر نہیں رہ گئی ہے۔"

"بھگوان کرے تم جیتے رہو، خوش رہو۔ تمہارے پتا تمہیں مل جائیں۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"
کماری نے کہا۔ اور پھر وہ سب سے رُخصت ہو کر باہر نکل آئی۔

گوپال نے بہت خاموشی سے اُسے ایک تانگے میں بٹھا کر اُسے گھر کے آس پاس چھوڑ دیا۔
چندراوتی اپنی بیٹیوں کے ساتھ واپس آگئی تھی۔ گھر میں پولیس، کوتوال اور سپاہی موجود تھے۔

ی کے لئے بڑا واویلا ہو رہا تھا۔ کوتوال جی بیانات لکھ رہے تھے۔ گاڑیوں کے نمبر پوچھے جا رہے
کوئی بھی گاڑیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔ کومل جب اندر پہنچی تو وہ شدت حیرت سے اُچھل
پڑے۔ چندراوتی دوڑی دوڑی کومل کے قریب پہنچی اور اُس سے مل کر دھاڑیں مارنے لگی۔

"ہائے ہائے، میری بچی...... تو ٹھیک تو ہے؟ کون تھے وہ پاپی جو تجھے لے گئے تھے؟ کون تھے وہ؟"

"ڈاکو تھے ماتا جی...... ڈاکو تھے۔ کم بختوں نے مجھے دھوکے سے اغواء کر لیا تھا۔ مگر میں نے بھی ایسی
سنائیں کہ میا یاد آ گئی۔ میں نے اُنہیں بھگوان کا خوف دلایا۔ باقی تو سارے برے لوگ تھے، لیکن اُن
میں ایک اچھا آدمی تھا۔ جمنا کنارے پہنچ کر اُنہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ وہ ڈر گیا تھا میری بددُعاؤں سے۔
اس کے بعد میں تانگہ کر کے واپس آگئی۔"

کوتوال جی، کومل سے بیان لینے لگے۔ اُنہوں نے بہت سے سوال کئے۔ اُن کی بڑی بڑی آنکھوں
میں ہوس ناچ رہی تھی۔ اور اُنہیں شاید افسوس ہو رہا تھا کہ اس سے پہلے کومل اغواء کیوں نہ ہوئی؟ اس سے
پہلے اُنہیں اس کا بیان لکھنے کا موقع کیوں نہیں ملا؟ اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کومل سے کہا۔

"دیوی جی، اُنہیں آپ کو چھوڑنا ہی تھا۔ بھلا وہ آپ کے حسن کی تاب کہاں لا سکتے تھے؟ ویسے ان
کی گرفتاری میں آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔"

"میں کیا مدد کر سکوں گی کوتوال جی؟ کیا بندوق لے کر آپ کے ساتھ چلنا ہوگا؟ ڈاکوؤں پر گولیاں
چلاؤں گی؟" کومل نے مسکراتے ہوئے کہا اور کوتوال جی ہنس پڑے۔

"نہیں دیوی جی۔ آپ کو بھلا بندوق لے کر چلنے کی کیا ضرورت ہے؟ ڈاکو آپ کے سامنے آ کر
کھڑے بھی ہو گئے تو کم بختوں پر جادو ہو جائے گا۔ پھر بھلا ان میں سے کون بھاگ سکتا ہے؟" کوتوال
جی نے بھی مذاق کیا۔

کومل کے دل میں شدید نفرت اُبھر رہی تھی۔ یہاں اس کوٹھے پر آنے والے ہر شخص کی آنکھوں میں
ہوس ناچ رہی تھی۔ اُنہوں نے چلتے ہوئے چندراوتی سے کہا۔ "چندراوتی جی، اس سے پہلے آپ کے
درشن نہیں ہو سکے۔ افسوس ہے کہ آپ نے ہمیں ایک ایسے وقت میں بلایا جب ہم سرکاری ڈیوٹی پر ہیں۔
کبھی ویسے بلایئے۔"

"ارے کوتوال جی، آپ کا گھر ہے۔ جب دل چاہے آجایئے۔" چندراوتی نے کہا اور کوتوال جی کا
منہ بن گیا۔ غالباً اُنہیں احساس ہوا کہ کم از کم یہ ان کا گھر نہیں ہو سکتا۔ ان کے گھر میں تو شریف زادیاں
ہیں۔ چندراوتی نے یہ کیا کہا؟ بہرحال، وہ سلام دعا کر کے چلے گئے۔ چندراوتی، کومل سے ڈاکوؤں کے
بارے میں تفصیلات پوچھنے لگی۔ اُس نے کومل کے زیورات گنے اور سنبھال دیئے۔ پھر بولی۔

"بھگوان کی آرتی اتاروں گی۔ تیری نذر بھی اتاروں گی۔ بچ گئی آج تو۔ کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اگر
سارے زیورات ہی اتار لیتے تو کیا ہوتا؟"

"ہاں ہاں جی، زیورات واقعی قیمتی چیز ہیں۔" کومل نے تلخ لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ
مشکل سے بیٹھی ہی تھی کہ چھایا اور کامنی بھی پیچھے پیچھے پہنچ گئیں۔

"ہائے ڈیڈی، ڈاکو کیسے تھے؟ اُنہوں نے اور تو کچھ نہیں کہا تمہیں؟"
"پاگل ہوگئی ہو تم...... تم بچ گئی ہو تو کتنی خوش نظر آرہی ہو۔"
"کاش، ہم نہ بچتے۔ دیکھتے تو سہی ڈاکو کیسے ہوتے ہیں؟ مجھے تو ڈاکوؤں کو دیکھنے کا بڑا ہی شوق ہے۔" چھایا نے کہا۔
"ٹھیک ہے...... اب کے کہیں ڈاکو ملے تو کہہ دوں گی کہ چھایا کو اغواء کر کے لے جائیں۔"
"ہائے رام...... اغواء ہونے میں کتنا مزہ آتا ہوگا؟"
"اب تم لوگ بکواس ہی کئے جاؤ گی یا مجھے تنہا چھوڑو گی؟" کومل نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں
"کیوں، وہ ڈاکو جس نے تمہاری جان بچائی تھی کیا بہت خوبصورت تھا؟ رنجیت سے بھی زیا
کانی نے پوچھا۔

کومل کے سامنے رنجیت کا نام دوسری بار آیا تھا۔ وہ رنجیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی جب کومل کی حیثیت سے اُس نے سوچا تو اُسے رنجیت یاد آ گیا۔ کانی اور چھایا نے اُسے زیادہ سو موقع نہیں دیا تھا۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک ہنسی مذاق کرتی رہیں، اور اس کے بعد چلی گئیں۔

باہر چندراوتی، آرتی کا بندوبست کر رہی تھی۔ آج سازندوں کو بھی مصروف کر دیا گیا تھا۔ بہ مصیبت سے نجات ملی تھی۔ لیکن رات کی تاریکیوں میں کومل کے ذہن میں گوپال کی آواز اُبھر رہی تھی۔ بیمار عورت، معصوم لڑکیاں، اُداس نوجوان، یاس بھرا گھرانہ...... یہ سب رادھے شام کی وجہ سے تھے۔ اور رادھے شام، کومل کے لئے پریشان ہو رہا تھا۔

نہیں...... یہ نہیں ہونا چاہئے۔ کسی قیمت پر نہیں ہونا چاہئے...... دھن دولت کا مجھے کیا کرنا ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے کہ میں کیا چیز ہوں؟ کوئی بھی دولت، کوئی بھی دھن مجھے کسی سے متاثر نہیں کر بڑے بڑے راج کمار میرے لئے آئے تھے، بڑے بڑے راج کمار۔ اور میں نے غرور سے اُنہیں تھا۔ جس نے انہیں اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ وہ میرے جیون میں شامل ہوں۔ آج مجھے اس غرور کی رہی ہے۔ ہے بھگوان...... ہے بھگوان...... انسان کا تصور کتنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے تو مجھے لمبا جیون بھی دے سکتا تھا۔ تو چاہتا تو میں اس مصیبت میں نہ پڑتی۔ لیکن غرور کی سزا تو ملنی ہی ہے اور اس کی کوئی نہ کوئی شکل بھی سامنے آتی ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے، یم دوت کس لئے آیا تھا؟ کیا سکتا ہے؟ شاید...... شاید میرا دوش قابل معافی نہ ہو...... اُس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں اور وہ نجانے کب تک روتی رہی۔ پھر اُس نے آنسو خشک کر لئے۔ اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن کم از کم رادھے شام جی کی وہ خبر لے گی کہ وہ یاد رکھیں گے۔

دن گزرتے رہے۔ غالباً رادھے شام جی چوتھی شام آئے تھے۔ کوٹھے آباد تھے اور رادھے شام غیر موجودگی میں نواب صاحب، صوفی صاحب، لالہ جی اور وہ تمام لوگ مستقل آتے رہے تھے کوٹھے کے رسیا تھے۔ آنا تو ہمیشہ ہی چاہتے تھے، لیکن رادھے شام جی کی موجودگی میں اُنہیں اپنی احساس ہوتا تھا اور بعض دنوں میں وہ غائب ہو جاتے تھے۔ رادھے شام جی اُس شام آئے تو دیکھا

ہوا تھا۔ اُن کا پُرتپاک استقبال کیا گیا۔ چندراوتی کی آنکھوں میں پانچ لاکھ روپے کی رقم اور جمنا رہا تھا۔ اس کے لئے اُس نے کومل سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ رادھے شام جی میں کتنے دن کی ہے؟ ایک دن ختم ہو جائے گی، تو اس کے بعد یہ تمام دولت ہتھیا کر پھر یہ کوٹھا آباد ہو جائے گا۔ یہی رہیں کہ کس طرح ہم لوگوں کی جیبیں خالی کرائیں۔

بھی مشکل نہیں تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے رادھے شام جی، کومل سے عشق کا اظہار کرتے تھے اور اُن کا ات کہ وہ کومل کو چاہتے ہیں اور وہ اسی کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں۔ اگر کومل ان سے نفرت کا اظہار تو رادھے شام جی کے پاس کیا رہ جاتا ہے کہ وہ کومل کو اپنے قابو میں رکھیں؟ یہ کام چندراوتی کا تھا ومل کو ان لائنوں پر تربیت دیتی۔ لیکن ابھی نہیں، ابھی اس کی ضرورت کیا تھی؟ ابھی تو چڑیا آہستہ جال کی جانب آ رہی تھی۔

ختم ہوا اور مہمان چلے گئے۔ رادھے شام جی حسب معمول کومل کی خوابگاہ میں آ گئے۔ اُنہیں تھی کہ تنہائی میں کومل سے بیٹھ کر باتیں کریں۔ لیکن آج کومل کا انداز بدلا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے ے تاثرات تھے۔ آج وہ اپنے کام کے آغاز کا فیصلہ کر چکی تھی۔

دھے شام جی اندر داخل ہوئے اور اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کومل کو دیکھا۔ لیکن کومل کے ہونٹوں مسکراہٹ نہیں اُبھری تھی۔

کیا بات ہے...... ہماری کومل ہم سے ناراض ہے؟ جھانسی میں اتنے دن نہیں ہوئے کہ کومل کو بہت انتظار کرنا پڑا ہو۔"

ماری سونیا نے عجیب سی نگاہوں سے رادھے شام جی کو دیکھا، اور پھر آہستہ سے بولی۔ "رادھے ی، کبھی سنسار کی حقیقتوں پر بھی غور کیا ہے آپ نے؟ کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے آپ نے کہ کس طرح ایک دوسرے انسان کے سامنے بیوقوف بن جاتا ہے۔"
"کیا بات ہے...... آج فلسفہ کی زبان کیوں بولی جا رہی ہے؟"
"اس لئے کہ آج آپ پر رحم آ رہا ہے۔" کماری سونیا یا کومل نے کہا۔
"مجھ پر رحم؟ خیریت ہے...... ہم پر ترس کیوں آنے لگا آج؟ اور اس کے نتیجے میں کیا ہوگا؟"
"اس کے نتیجے میں، میں آپ کو چند حقیقتوں سے روشناس کروں گی رادھے شام جی۔" کومل نے کہا۔
"اچھا...... آج تو ہماری کومل کماری بڑی عجیب زبان بول رہی ہے۔ ایسی عجیب زبان جو پہلے ہم نے کومل کے منہ سے نہیں سنی۔"
"ہاں رادھے شام جی...... آج واقعی مجھے آپ پر دیا آ گئی ہے۔"
"اس کی وجہ......؟"
"بس، آپ کی معصومیت پر افسوس ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں رادھے شام جی کہ میری عمر کیا ہے؟"
"مطلب......؟" رادھے شام جی نے چونک کر پوچھا۔
"آپ کو یاد ہے کہ آپ کی عمر کیا ہے؟ کیا آپ اس بات کو نہیں جانتے رادھے شام جی کہ آپ کے

بیٹے بیٹیاں مجھ سے بڑی عمر کے ہوں گے؟"
"تم کہنا کیا چاہتی ہو کومل؟" رادھے شام جی کھسیانے سے ہو گئے۔
"رادھے شام جی...... ایک طوائف کے بارے میں آپ نے کبھی کچھ نہیں سنا، کبھی کچھ نہیں دیکھ
کوئی ایسا آدمی آپ کو نظر نہیں آیا جو طوائف کے کوٹھے پر شکار ہوا ہو اور اس کے بعد سارا جیون اُس
ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزارا ہو؟"
"کومل، یہ کیسا مذاق ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟ تم ڈرا رہی ہو مجھے؟"
"ڈرا نہیں رہی ہوں رادھے شام جی، ایک سچ کہہ رہی ہوں۔ جو ایک کڑوا سچ ہے۔"
"کیا ہے وہ سچ......؟"
"رادھے شام جی، اگر آپ کے دل میں یہ بات ہے کہ میں ایک کومل کنیا ہو کر آپ کے لئے پریم
گرفتار ہوں تو اس بات کو ہمیشہ کے لئے اپنے من سے نکال دیجئے۔ رادھے شام جی، یہاں جو بھی آتا
اور جسے تنہائی میں میرے پاس اس کمرے میں پہنچنے کا موقع ملتا ہے میں اُس سے اسی انداز میں باتیں کر
ہوں جس طرح آپ سے۔ میرے من میں صرف ایک بات ہوتی ہے، وہ یہ کہ کس طرح میں آپ
دولت پر قبضہ کر سکتی ہوں؟ کس طرح آپ کو اپنی اداؤں سے لبھا لبھا کر زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کر
ہوں؟ یہ تربیت مجھے بچپن سے دی گئی ہے۔ اور اسی تربیت کی بنیاد پر میں کام کرتی ہوں۔ میری ماتا یا
چندراوتی نے مجھے بتا دیا تھا کہ رادھے شام جی ایک بڑے کاروباری ہیں۔ ان پر اس طرح جال ڈالو
وہ پھنس کر رہ جائیں۔ رادھے شام جی، میں نے اسی طرح آپ پر جال ڈالا ہے۔ آپ میری اداؤں
دیوانے ہو گئے، آپ نے بڑی دولت لٹائی ہے یہاں اس کوٹھے پر۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن
کہ آپ میرے لئے جمنا محل بنوائیں یا آکاش محل، آپ میری قیمت پانچ لاکھ ادا کریں یا پچاس لاکھ
آپ دل میں یہ سوچتے ہیں کہ میرے من میں ایک پریتم کی حیثیت سے آپ کی جگہ ہوگی تو یہ آپ کی بھ
ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے رادھے شام جی، میں صرف چندراوتی کے اشاروں پر چل رہی ہوں۔ وہ
رہی ہوں جو مجھ سے میری ماتا نے کہا ہے رادھے شام جی، ہماری تربیت ہی ایسی ہوتی ہے، ہم کیا کر
پر کبھی کبھی من میں سچائی اُبھر آتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان لٹنے والوں کو بتا دیں کہ کیوں لٹ رہے
کیوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہو؟ مجھے بتایئے رادھے شام جی، کیا آپ کا کوئی گھر ہے؟"
"گھر......؟" رادھے شام جی کے منہ سے سسکی کی سی آواز نکلی۔
"ہاں...... بال بچے تو ہوں گے آپ کے؟ پتنی بھی ہوگی۔ کیوں، ہے؟"
"ہاں ہاں...... ہے۔"
"کیا وہ سب بہت خوش ہیں؟ کیا وہ جانتے ہیں کہ آپ ایک کوٹھے پر ناچنے والی کے لئے اس
میں جنت بنا رہے ہیں؟ جمنا کنارے کے محل میں لاکھوں روپیہ تو لگا ہوگا۔ کیا یہ محل آپ کے بچوں کے
نہیں ہو سکتا؟ رادھے شام جی، آپ اپنی خوشی کے لئے، اپنے من کی تسکین کے لئے لاکھوں روپے لٹا
ایک کوٹھے والی کو اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں جو کبھی آپ کو من سے نہیں چاہتی۔ چندراوتی کا منصوبہ

جانتے ہیں آپ؟"
"منصوبہ......؟" رادھے شام کے منہ سے پھر اسی انداز میں نکلا۔
"ہاں رادھے شام جی...... چندراوتی نے مجھ سے کہا ہے کہ پانچ لاکھ روپے اُنہیں مل جائیں، رادھے
جی جمنا محل میرے حوالے کر دیں، اس کے بعد کچھ عرصہ میں ان کے ساتھ رہوں اور آہستہ آہستہ ان
نفرت کا اظہار کروں۔ اس کے بعد ان سے علیحدگی اختیار کر لوں۔ کیونکہ وہ دولت تو ہماری ہو ہی
گی۔ اس کے بعد آپ کیا رہ جائیں گے؟ صرف ایک چچوڑی ہوئی ہڈی۔ رادھے شام جی...... پتہ
کیوں میرے من میں بھگوان جاگ اُٹھا ہے۔ آپ قلاش ہو جائیں گے...... اور آپ کے بچے بھوکے
گے۔ یہی سب کچھ ہوگا نا؟ مجھے آپ سے پریم نہیں ہے رادھے شام جی...... آپ بوڑھے آدمی ہیں
میں جوان۔ یہ سب ایک کھیل ہے۔ مجھے آپ پر ہنسی آتی ہے رادھے شام جی...... سب ہی آپ پر ہنستے
مگر ہم کیا کریں؟ ہم طوائفوں کا کھیل ہی یہی ہے۔"
رادھے شام جی پاگلوں کی طرح کومل کی صورت دیکھ رہے تھے۔ پھر اُنہوں نے کہا۔ "کومل، تم میرا
ن کر رہی ہو۔"
"نہیں رادھے شام جی...... جیون میں پہلی بار آپ سے سچ بول رہی ہوں۔ جمنا محل مجھے دے دیجئے،
کیا جاتا ہے؟ پانچ لاکھ روپے بھی دے دیں چندراوتی کو۔ پہلے میں آپ کا من لبھاؤں گی۔ اور پھر
محل میں دوسرے بھی آئیں گے۔ آپ کس طرح مجھے اُن سے ملنے سے روکیں گے؟ کون سا قانونی حق
آپ کے پاس اس سے؟ آپ اپنے بچوں کے پاس واپس چلے جائیں گے، لیکن سب کچھ لٹا کر۔"
رادھے شام جی کے ذہن میں بھونچال آ رہا تھا۔ کومل کا ایک ایک لفظ سچ تھا۔ وہ بالکل سچ بول رہی
۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر اُنہوں نے کہا۔
"تم سچ کہہ رہی ہو کومل...... بالکل سچ کہہ رہی ہو تم۔ تم نے میرا اپمان نہیں کیا، بلکہ آنکھیں کھول دی
۔ میں اب یہاں نہیں آؤں گا۔" وہ اُٹھے اور باہر نکل گئے۔ کومل کا دل خوشی سے ناچ اُٹھا۔ اُس نے چھ
والوں کی زندگی بچا لی تھی۔
رادھے شام نہ دوسرے دن آئے نہ تیسرے دن۔ اور جب چوتھے دن بھی وہ نہ آئے تو چندراوتی
پریشان ہو گئی۔ اُس نے کومل سے پوچھا تو اُس نے معصومیت سے کہا کہ اُسے کچھ نہیں معلوم۔
"ہائے رام، وہ موا اپنے وعدے سے پھر تو نہیں گیا؟ ایسا ہوا تو میں تو مر ہی جاؤں گی۔"
کومل دل میں ہنس پڑی تھی۔
چندراوتی نے سارنگی نواز کو بھیجا کہ وہ رادھے شام جی کو بلا لائے۔ لیکن رات کو اُس کا جواب آ گیا۔
سارنگی نواز نے بتایا کہ رادھے شام جی شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ کب آئیں گے، اس کے بارے میں
کچھ معلوم نہیں۔
چندراوتی پر سوگ طاری ہو گیا تھا۔ رادھے شام جیسی آسامی کا ہاتھ سے نکل جانا بہت بڑی بات تھی۔
دوسرے دن تک پلنگ پر پڑی رہی۔ بار بار یہی کہتی تھی کہ ہائے رام، کیا ہو گیا؟ رادھے شام جی کو کیا ہو

گیا؟

بہر حال کومل دل میں خوش تھی کہ رادھے شام جی نے صحیح فیصلہ کیا اور بے وقوفی کرنے کی کوشش نہیں
کی۔ اُس کے اپنے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی رہتی تھی۔ سوچتی تھی کہ اس کوٹھے سے نکلنے کا ایک موقع ملا
تھا۔ بلا سے رادھے شام جیسی بلا اُس کے گلے پڑ جاتی، لیکن کم از کم ان تمام بری نگاہوں سے تو پیچھا
چھوٹ جاتا جو دن رات اُس کے بدن کو کریدتی رہتی تھیں۔ پُر ہوس نگاہیں۔ کوتوال صاحب، نواب
صاحب، صوفی صاحب اور نجانے کون کون صاحب...... اُسے تو اپنے عورت ہونے پر ہی شبہ ہونے لگا
تھا۔ بہت بڑی سزا ملی تھی اُسے اپنے غرور کی۔

آئینے سے پوچھا اُس نے۔ ”درپن، کیا اب میں کسی قابل رہ گئی ہوں؟“

اور آئینہ مسکرا دیا۔ ”میں نے تو تجھ سے پہلے ہی کہا تھا کماری سونیا، کہ سنسار میں سب تجھ جیسے ہیں،
صورت مورت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سب کچھ تقدیر ہوتی ہے۔ کسی کا من بھلا تن صید تو کسی کا تن بھلا من
میلا۔ یہ سب مائی کے کھیل ہیں۔ جاری ہیں، جاری رہیں گے۔“

کومل کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح رونے لگیں۔ اُسے اب چتر کلا بہت یاد آ رہا تھا۔ جمنا محل
جاتی تو شاید من کو کچھ شانتی مل جاتی، تھوڑا سا سکھ تو ہوتا۔ لیکن چھ انسانوں کی زندگی کے لئے اُس نے
سکھ چین تیاگ دیا تھا۔

یہ اس واقعے سے تقریباً پندرہ دن بعد کی بات ہے۔ گوپال اُسے ایک بازار میں ملا۔ چھایا اور کانی کے
ساتھ وہ شریف زادیوں کی طرح بازار میں گئی تھیں۔ چندراوتی سے اجازت مل گئی تھی۔ چھایا اور کانی
خریداری میں مصروف تھیں اور وہ بس اُس بڑی سی دُکان میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ گوپال اُس کے
سامنے آ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اُسے پرنام کیا۔ کومل اُسے پہچان گئی۔

”گوپال......؟“

”دیوی جی، وہاں آتا تو آپ بھی بدنام ہو جاتیں اور پتہ نہیں ہمیشہ کی طرح میرے ساتھ کیا سلوک کیا
جاتا۔ من آپ سے ملنے کو بڑا بے چین تھا۔“

”ہوں......“ کومل نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور گوپال باہر نکل گیا تھا۔ کومل، چھایا اور کانی کو چھوڑ کر دکان
سے باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں تانگے پر بیٹھے جمنا گھاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ گوپال گردن
جھکائے تانگے کے اگلے حصے میں بیٹھا تھا اور کومل پچھلے حصے میں۔ کومل نے یہ ہمت کر ڈالی تھی۔ چندراوتی
کا کیا تھا؟ زیادہ سے زیادہ بک جھک کر رہ جائے گی۔ بہر طور وہ گوپال کے ساتھ جمنا کنارے پہنچ گئی۔

”ہاں گوپال جی...... اب بتایئے، کیا حال ہیں رادھے شام جی کے؟“

”کومل کماری، میں نہیں سمجھتا کہ بھگوان نے انسانوں کے درجے کیوں مقرر کر دیئے ہیں؟ دیوتا کہاں
کہاں پائے جاتے ہیں؟ ایسی بری جگہ آپ کیسے جیون بتا رہی ہیں؟ کومل کماری جی، آپ کے من میں
بھگوان بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”رادھے شام جی کا کیا حال ہے گوپال...... صرف یہ بتاؤ۔ باقی باتوں کو جانے دو۔“

”پتا جی کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ماتا جی کو لے کر علاج کرانے بمبئی گئے ہوئے ہیں۔ ہم سب گھر میں
بہت خوش ہیں۔ پتا جی نے نئے سرے سے کاروبار کی طرف توجہ دی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ سب کچھ
آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔“

”بھگوان کا شکر ہے کہ تمہاری پریشانیاں دُور ہوئیں۔“

”کومل جی، میں آپ کے لئے کیا کروں؟ آپ مجھے بتایئے، میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“

”کوئی میرے لئے کچھ نہیں کر سکتا گوپال، کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“

”میں آپ کو آپ کے اس احسان کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔“

”بچوں جیسی باتیں مت کرو...... مجھے بھلا کوئی کیا مدد دے سکے گا؟ میری حیثیت ہی کیا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں کومل جی؟“

”ارے سمجھو گے تو برا بھلا کہتے ہوئے یہاں سے چلے جاؤ گے۔“ کومل نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا اور
گوپال تعجب سے کومل کی صورت دیکھنے لگا۔

”نہیں دیوی جی...... بھلا آپ جیسی دیوی کو میں کس منہ سے برا بھلا کہوں گا؟“

”تو پھر گوپال، مجھے اپنے گھر میں جگہ دے دو...... مجھے اپنی پتنی بنا لو۔ مجھے اپنے جیون میں شامل کر
لو۔ بولو، کر سکتے ہو یہ؟ تم کہتے ہو نا کہ دیوتاؤں کی طوائف کے کوٹھے پر کیا گنجائش ہوتی ہے۔ کیا تم اتنا
نہیں کر سکتے کہ کسی دیوتا کو طوائف کے کوٹھے سے اُٹھا لاؤ اور اپنے گھر کے مندر میں سجا دو؟“

گوپال کا چہرہ ست گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی خوفزدہ آنکھوں سے کومل کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے پھنسی پھنسی
آواز میں کہا۔ ”یہ...... یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کومل جی؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ میرے پتا جی، مم...... میرا
مطلب ہے، ارے میں کیا کہوں اس بارے میں؟ آپ نے ایک ایسی عجیب بات کہہ دی ہے جسے میرا من
سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

”ہے نا عجیب بات؟ ٹھیک ہے، تم دیوتاؤں سے کچھ مانگتے ہو اور اگر دیوتا تم سے کچھ مانگ لیں تو تم
اس طرح باتیں بنا کر خاموش ہو جاتے ہو۔ کیسے عجیب لوگ ہو تم...... کیسے عجیب لوگ ہو...... بس یہی کہنا
چاہتے تھے نا مجھ سے...... میں جاؤں؟“ کومل نے تلخ لہجے میں کہا۔ گوپال کے منہ سے کوئی جواب نہیں نکل
سکا تھا۔ کومل نے ایک تانگے کو اشارہ کیا اور تانگے والا قریب پہنچ گیا۔ تب کومل تانگے پر چڑھ گئی۔ اُس نے
ایک بار پھر تلخ نگاہوں سے گوپال کو دیکھا، گوپال گردن جھکائے خاموش کھڑا ہوا تھا۔ تانگہ آگے بڑھ گیا۔

سمے کی دھارا بہتی رہی۔ واقعات تبدیل ہوتے رہے۔ رادھے شام جی نے پھر اُس کوٹھے کا رُخ
نہیں کیا تھا۔ چندراوتی نے بار بار کوشش کی۔ اور ایک بار تو سارنگی نواز کو مار پیٹ کر بھگا دیا گیا۔ اس کے
بعد خاموشی اختیار کر لی گئی تھی۔ کومل سے اس بارے میں بہت سے سوالات کئے گئے تھے۔ لیکن وہ ایک ہی
جواب دیتی کہ رادھے شام کی گمشدگی کا اُسے کوئی علم نہیں ہے کہ کیوں ہوئی؟

بہر طور، طوائف کا کوٹھا تھا۔ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ کومل کو سب کے لئے ناچنا ہوتا تھا۔ لیکن
بہت دن سے کوئی ایسی آسامی نہیں آئی تھی جو چندراوتی کے لئے باعث کشش ہوتی۔ اُس کے کارندے

بڑے بڑے لوگوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔

پھر ایک دن دھرم پال نے اطلاع دی اور چندراوتی خوش ہوگئی۔ کسی ریاست کے راجکمار آ رہے ہوئے تھے۔ رقص وموسیقی کے رسیا تھے اور دھرم پال نے اُنہیں چندراوتی کے کوٹھے پر آنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔

''ہونا یہ چاہئے چندراوتی، کہ آج رات کوئی نہ آئے۔ بس مہاراج کا آجانا ہی کافی ہوگا۔ ایکی محفل رچائیں گے کہ مہاراج ہمارے جال سے نکل نہ سکیں۔''

''اس کی تو تم چنتا ہی نہ کرو دھرم پال...... بس اُنہیں لے آؤ۔''

اُس رات یہاں آنے والوں سے معذرت کرلی گئی تھی۔ سج دھج ہی دوسری تھی۔ چندراوتی نے کہا تھا کہ اُس کے کچھ رشتے دار آرہے ہیں جس کی وجہ سے آج عام مجرا نہیں ہوگا۔ کوٹھے پر آنے والوں کا کوئی زور تو تھا نہیں۔ سب لوگ چلے گئے۔ پھر رات کے تقریباً آٹھ یا نو بجے تو ریاست کے راجکمار بھگوان داس جی اندر داخل ہوئے۔ چندراوتی نے بڑے اہتمام سے اُن کا استقبال کیا۔ بھگوان داس کے ساتھ اُن کے چھ ہرکارے تھے جو راج کمار بھگوان داس کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ راج کمار کے بدن پر بیش قیمت لباس تھا۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالائیں، ہاتھوں کی اُنگلیوں میں انگشتریاں۔ دیکھنے ہی میں راجکمار لگتے تھے۔ پر صورت راجکماروں جیسی نہیں تھی۔ رنگ کالا اور ناک پر کٹے ہوئے کا نشان۔

چندراوتی نے بڑے اہتمام سے گاؤ تکیے کے ساتھ بٹھایا۔ جل پانی سے اُن کی خاطر مدارت شروع ہوئی۔ سازندوں نے ساز چھیڑ دیئے اور مدھم آوازوں میں سواگت کا گیت گایا جانے لگا۔ راجکمار چھایا اور کانی کو دیکھ رہے تھے۔ بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ لیکن راجکمار جی کے دل میں اُن کے لئے کوئی بہت بڑی بات نہیں پیدا ہوئی تھی۔ چندراوتی اچھی طرح راجکمار کا جائزہ لے رہی تھی۔ شوقین مزاج آدمی تھے۔ پھر جب لال رنگ اُن کے گلے سے نیچے اُترا تو اُنہوں نے اپنے پسند کے گیت کی فرمائش دی اور پوچھا کہ کیا کوئی رقص نہیں کرے گا؟

''مہاراج...... کومل آنے والی ہے۔ تیار ہو رہی ہے۔''

''کون ہے یہ کومل......؟''

''کومل ہی تو وہ ہے جس کے دم سے یہ بازار آباد ہے۔ ابھی آتی ہی ہوگی۔''

آج کومل کو موتیوں کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ وہ جب کمرے کے دروازے سے باہر نکلی تو جیسے زرق برق ہال میں ایک نئی روشنی پھیل گئی۔ اُس کے چہرے پر نگاہیں نہیں جمتی تھیں۔ اتنا حسین میک اپ کیا تھا اُس کا کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جائے۔ وہ ویسے بھی خوبصورت تھی۔ لیکن آج تو قیامت ڈھا رہی تھی۔ راجکمار بھگوان داس نے اُسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

کومل کماری چند قدم آگے بڑھی اور اُس کی نگاہ دفعتہً بھگوان داس پر پڑی اور اُس پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ یہ وہی بھگوان داس تو تھا جس نے اپنا رشتہ کومل کماری کے لئے یعنی کماری سونیا کے لئے دیا تھا۔ وہ دکھاوے کے لئے آیا تھا اور کماری سونیا نے پیتل کا تھال اُس کے منہ پر کھینچ مارا تھا اور اُسے کالا بھجنگ

پکارا تھا۔ اُس کی ناک پر پڑا ہوا نشان بھی پیتل کی تھالی ہی کا تھا جو کماری سونیا کے ہاتھوں لگا تھا۔ وہ اُسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی۔ اُس کے دل میں عجیب سے احساسات اُمنڈ رہے تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں بھگوان سے کہا۔ ''ہے بھگوان...... کتنے امتحان لو گے۔ کتنے امتحان لو گے میرے؟ میں نے ایسے کون سے پاپ کیئے ہیں جن کی سزا مجھے دی جارہی ہے؟ ذرا سا غرور کیا تھا میں نے۔ اور اس کے بدلے میں اتنی بھیانک سزا...... بھگوان، میں نے...... میں نے اتنا کون سا بڑا پاپ کیا ہے؟ کل جس آدمی کو میں نے زخمی کر کے اپنے گھر سے بھگا دیا تھا، آج مجھے اُس کے سامنے ایک ناچنے والی کی حیثیت سے ناچنا پڑے گا...... شما کرو بھگوان، شما کر دو......''

بھگوان داس حیران نگاہوں سے کومل کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں پسندیدگی کے جذبات تھے۔ اُس نے اپنے ساتھی کی طرف رُخ کر کے کہا۔ ''چندراوتی نے اس ہیرے کو کہاں چھپا رکھا تھا اب تک؟ واہ، لطف آگیا۔ کیا یہ رقص کرے گی؟''

''ہاں مہاراج...... پیروں میں بندھے گھنگھرو اسی بات کی خبر دیتے ہیں۔''

''تو اس قیامت سے کہو کہ رقصاں ہوجائے۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔''

کارندے نے چندراوتی کو بھگوان داس کی فرمائش بتائی اور چندراوتی نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔

''یہ داسی ہے آپ کی مہاراج...... کیوں نہ رقص کرے گی آپ کے اشاروں پر؟'' چندراوتی نے کہا۔ بھگوان داس نے پھر اپنے کارندے کی طرف منہ جھکایا اور آہستہ سے بولے۔

''اُسے دیکھو، کیسے ٹکر ٹکر ہمیں دیکھ رہی ہے۔ آخر کیوں؟''

''اس سے پہلے کبھی اس نے راج کمار نہیں دیکھے ہوں گے۔ آپ سے بری طرح متاثر ہوگئی ہے۔''

''ہم بھی تو اس سے بری طرح متاثر ہوگئے ہیں۔ کتنی سندر ہے یہ۔ کتنی پیاری ہے۔''

دفعتہً کومل کو جیسے ہوش آگیا۔ اُسے رقص کرنا تھا، اُس شخص کے سامنے جسے اُس نے اپنی ڈیوڑھی سے بھگا دیا تھا۔ سازندوں کے سازوں کی دُھنیں تیز ہوگئیں اور گھنگھروؤں کی جھنکار فضا میں بلند ہونے لگی۔ کومل رقص کر رہی تھی۔ اپنے غرور کو پارہ پارہ کر رہی تھی۔ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہی تھی۔ وہ ایسا جی بھر کر ناچی، ایسا رنگ لچکایا اُس نے کہ بھگوان داس بھی پاگل ہو کر رہ گیا۔ اُس نے اپنے کارندوں سے کہا۔

''ہم تو لٹ گئے دوستو...... ہم تو لٹ گئے۔ اب بھلا کون اس کوٹھے سے جانے کی ہمت کر سکتا ہے؟''

''وہ اپسرا ہے مہاراج...... بھگوان کی سوگند وہ اپسرا ہے۔ ضرور راجہ اندر کے اکھاڑے سے اڑ کر نیچے آگئی ہے۔''

''رقص ختم ہوجائے تو چندراوتی سے اس کے لئے بات کرو۔''

چندراوتی خود اپنی تجربہ کار نگاہوں سے بھگوان داس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جب رقص کا دور ختم ہوا تو بھگوان داس نے اپنے گلے سے موتیوں کی مالائیں توڑ دیں اور لاکھوں روپے کی قیمت کے موتی کومل کماری کے قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی سونے کے بے شمار سکے کومل کماری کے چرنوں میں لگا دیئے گئے تھے۔

"مہاراج کی جے...... آپ کو کومل کا رقص پسند آیا۔ ہمارے بھاگ کھل گئے۔" چندراوتی نے کہا۔
"یہ لڑکی تمہاری ہے چندرا؟" بھگوان داس نے پوچھا۔
"ہاں مہاراج...... میں ہی اس کی ماں ہوں۔"
"ہوں...... ہم تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں چندراوتی۔"
"جو حکم مہاراج...... آپ کہیں تو دوسرا گانا سنواؤں؟"
"نہیں...... گانا ہم سنتے ہی رہیں گے۔ ہمیں تنہائی درکار ہے۔"
چندراوتی نے مہاراج کو ساتھ لیا اور اندرونی کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں دولت کے جو انبار بھگوان داس نے اُس کے سامنے لگا دیئے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ راج کمار کیا چیز ہوتی ہے۔
چندراوتی ادب سے راج کمار کو اندر لے گئی اور اُس سے بیٹھنے کے لئے کہا۔
"چندراوتی...... ہم یہاں آئے تو دس بارہ دن کے لئے تھے۔ لیکن اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم دو مہینے تک یہاں سے نہیں جاسکیں گے۔"
"جی مہاراج......" چندراوتی نے کہا۔
"ہم زیادہ شوقین مزاج آدمی نہیں ہیں۔ اپنی ریاست کے ایک کام سے آئے تھے۔ سوچا کہ تھوڑی دل لگی ہی کرلی جائے۔ لیکن یہاں آکر ہمارے دل کو جو لگ گئی ہے، وہ ہمارے لئے بڑی تکلیف دہ ہے۔"
"میں سمجھی نہیں مہاراج...... جو کہنا چاہتے ہیں کھل کر کہیں۔"
"کومل ہمیں بہت پسند آئی ہے۔"
"آپ کی داسی ہے مہاراج......"
"نہیں، ہم اُسے داسی نہیں، رانی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے تو ہم تم سے یہ بھی کہہ سکتے تھے چندراوتی کہ اُسے ہمارے حوالے کردو۔ ہم تمہیں اس کی منہ مانگی قیمت ادا کریں گے۔ لیکن ظاہر ہے یہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ ہمارے پتا جی زندہ ہیں اور ریاست کا کام وہی سنبھالتے ہیں۔ ہمیں اتنا حق نہیں کہ کسی ایسی لڑکی کو مستقل اپنے گھر لے جا کر رکھ لیں۔ لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ کومل کماری صرف ہمارے لئے رہے۔ وہ ہمارے لئے رقص کرے، ہمارے لئے جئے۔ ہم تمہیں اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بولو چندراوتی، کیا طلب کرتی ہو؟"
"مہاراج کے چرنوں کی آمد ہی یہاں بہت کچھ ہے۔ مہاراج کا دیا سب کچھ ہے اپنے پاس۔ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار کومل کماری کے لئے آئے۔ کوئی پانچ لاکھ دے رہا تھا اور کوئی پندرہ لاکھ۔ مگر میں جانتی ہوں اس ہیرے کی اصل قیمت کیا ہے۔ سچ مہاراج، مجھے آپ ہی جیسے کسی دیکھنے والے جوہری کا انتظار تھا۔"
"ہم تمہیں پچیس لاکھ دے سکتے ہیں چندراوتی جی...... پورے پچیس لاکھ۔ یہ رقم تمہیں کل تک دی جائے گی۔ ہم کومل کے لئے یہاں ایک خوبصورت عمارت خریدیں گے اور اسے وہاں رکھیں گے۔

...کی طرح ہماری دی ہوئی عمارت میں رہے گی اور ہم اس سے ملنے کے لئے آتے جاتے رہیں گے۔ کل سارے بندوبست ہو جائیں گے۔ پرسوں تمہیں پچیس لاکھ روپے ادا کردیئے جائیں گے۔ لیکن ...ہے کہ آج کے بعد کومل تمہارے کوٹھے پر رقص نہیں کرے گی۔"
"پیسوں کی کیا بات ہے مہاراج، آپ کا حکم ہی کافی تھا۔" چندراوتی پر نیم بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔ ...لاکھ روپے کی رقم کا تصور بھی اُس کے لئے مشکل تھا۔ دور دور کی بات ہوتی ہے۔ پانچ لاکھ روپے ...کومل کو رادھے شام جی کے حوالے کرنے جارہی تھی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ٹھنڈا کر کے کھانا ...گرم گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے۔ چندراوتی نے مہاراج بھگوان داس کو یقین دلا دیا کہ کومل ...اس کی ملکیت ہے اور بھگوان داس خوش خوش باہر نکل آئے۔
کومل باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پریشان تھی۔ جانتی تھی کہ بھگوان داس، چندراوتی سے کیا باتیں کرنے اندر ...ہے؟ لیکن اُس کا زخمی دل تڑپ رہا تھا۔ بھگوان داس کالا کلوٹا بینگن تو اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ ...چمپا اور دوسری سکھیاں یاد آرہی تھیں جنہوں نے بھگوان داس کا کیسا مذاق اڑایا تھا۔ اور آج یہ ...ن داس اُسے خریدنے آیا تھا۔ آہ...... مجھے اس کے سامنے ناچنا پڑا ہے۔ کتنی بڑی توہین ہوئی ہے ...کیسا میرے غرور کا سر نیچا ہوا ہے۔
چندراوتی باہر آگئی۔ اُس نے سازندوں سے ہٹ جانے کو کہا اور پھر کومل سے بولی۔ "کومل، دیکھو ...ن داس جی تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ جاؤ، انہیں احترام سے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اور سنو، ...رکھنا، اب یہ تمہارے مالک ہیں۔"
کومل کے پاؤں جم گئے۔ کتنا زہریلا لفظ تھا یہ...... جیسے اُس کے کانوں میں جلتا ہوا سیسہ انڈیل دیا ...ہو۔ وہ مدہوشی کے سے انداز میں اُٹھی۔ بھگوان داس نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا تھا۔ اور پھر وہ ...کومل کے کمرے میں لے گیا۔
"آسمان سے اتری ہوئی اپسرا ہو یا کوہ قاف کی پری...... کون ہو تم کومل؟"
کومل نے اُداس نگاہوں سے بھگوان داس کو دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔
"ارے ارے...... یہ اُداسی کیوں؟ اور یہ تو بتاؤ، تم ہمیں دیکھتی کیوں رہ گئی تھیں؟"
"کچھ نہیں مہاراج...... بیتی ہوئی ایک بات یاد آگئی تھی۔" کومل کماری نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔
"کیا بات تھی وہ...... ہمیں نہیں بتاؤ گی؟"
"نہ پوچھیں تو اچھا ہے۔ آپ کو پسند نہیں آئے گی۔"
"چلو ٹھیک ہے۔ جانے دو۔ ہم تمہیں کسی بات کے لئے مجبور نہیں کرسکتے۔ تمہارے لئے ہم پاگل ہو ...ہیں کومل۔ ہم نے...... ہم نے چندراوتی کو پچیس لاکھ روپے ادا کر کے تمہیں ہمیشہ کے لئے اس قید ...آزاد کرلیا ہے۔ اور اب تم ہماری قید میں ہو۔ بولو، ہماری قید میں خوش رہو گی یا نہیں؟"
کومل کماری سسکتی رہی۔ اُس کے چہرے پر ایک بار بھی مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔ بھگوان داس نے ...نرمی سے کہا۔ "اگر تمہاری کوئی اور مانگ ہو تو ہمیں بتاؤ۔"

"نہیں مہاراج...... بھگوان کی دیا ہے۔ آپ کی دیا ہے۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر اطمینان رکھو۔ ہم بہت جلد تمہیں یہاں سے لے جائیں گے۔ ہم تمہارے لئے تمہاری م
پسند کوئی جگہ خریدنے کی کوشش کریں گے۔ کل ہی ہمارے آدمی یہ کام شروع کر دیں گے۔ تم یوں سمجھو
اب تم ایک ریاست کی راجکماری ہو، کیا سمجھیں؟ ہم تمہیں راجکماریوں کی سی حیثیت دیں گے۔"

ایک بار پھر کول کے دل پر چوٹ سی لگی۔ یہ کیا کہہ دیا تھا اس پاپی نے...... کس طرح آسانی سے کہا
تھا کہ تم ایک ریاست کی راجکماری ہو۔ آہ، میں ریاست کی راجکماری ہی تو تھی......!

کافی دیر بیٹھنے کے بعد بھگوان داس چلا گیا۔ لیکن یہ رات کول کماری پر بڑی بھاری پڑی تھی۔ رات
وہ روتی رہی۔ صبح کو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ چندراوتی نے اُسے دیکھا تو حیرت سے بولی۔

"اری...... یہ تو نے اپنے چہرے پر کیا کرلیا...... کیا ہوا؟ کیا رات بھر سوئی نہیں؟"

"ہاں...... نیند نہیں آئی۔"

"پر کیوں؟ تو نے دیکھا نہیں، کیسے بھاگ کھلے۔ میں تو کہتی تھی کول کماری، کہ بھگوان ایک دن تیر
صحیح قیمت ہمیں دلوا دے گا۔ ہے بھگوان...... میں بہت بڑا چڑھاوا چڑھاؤں گی تم پر۔"

چندراوتی خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ پچیس لاکھ روپے کی رقم کا تصور اُسے بار بار بے ہوش
دے رہا تھا۔ چھایا اور کانسی بھی خوش تھیں۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کول سے کہا۔

"آخر ایسی کون سی بات ہے تم میں؟ ساری چیزیں تو ہم جیسی ہی ہیں، بس ذرا چہرے کا رنگ بھلا
بدن کی بناوٹ اچھی ہے۔ اور اس کے بدلے تمہیں پچیس لاکھ اور ہمیں کچھ بھی نہیں۔ باقی تم میں کیا رکھا
ہے؟"

کول نہ ہنسی۔ وہ اداس نگاہوں سے چھایا اور کانسی کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے کہا۔ "کیا میں تم سے
ہو جاؤں گی؟"

"ارے کتنے دن کے لئے...... بڑے بڑے راجہ، مہاراجہ طوائفوں کے کوٹھوں پر ناک رگڑتے ہ
اور طوائفیں اُنہیں اُنگلیوں پہ نچا کر ان کی جیبیں خالی کرواتی ہیں۔ اتنا تو ہے کہ یہ راج کمار جی کنگال نہ
ہوں گے۔ اور جو بھی تم مانگو گی تمہیں دیتے رہیں گے۔ اور ایک نہ ایک دن ان کا دل بھی تم سے بھر جا
اور اس کے بعد وہ خود ہی تمہیں آزاد کر دیں گے۔ جو تم ہمیں مل گئی، وہ ہماری۔"

کول نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں ہر شخص کی سوچ کے بارے میں وہ جانتی تھی۔ سب ہی یکسا
انداز میں سوچتے تھے، کسی میں سوچ کی کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ چنانچہ یہ لڑکیاں جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ بھی
نہیں تھا۔

آج رات کو پھر یہاں مجرا نہیں ہوا۔ پچیس لاکھ روپے اگر مل جائیں تو سچی بات تو یہ ہے کہ چندراوتی
پھر رقص و موسیقی کی ضرورت نہیں تھی۔ باقی دو لڑکیاں ہیں، ان سے کچھ اور کام لے گی۔ فی الحال تو مہ
مہاراج کی تیاریاں تھیں۔ رات کو مہاراج بھگوان داس پھر آ گئے۔ اور ان کے لئے سازندوں نے ا
ساز کھول لئے۔ آج بھی مہاراج نے دل کھول کر لٹایا تھا۔

تیسرے دن انہوں نے اطلاع دی کہ اُنہوں نے کول کے لئے ایک بہت ہی حسین کوٹھی خریدی ہے۔

"ہم اپنی کول کو یہ کوٹھی دکھانے لے جاسکتے ہیں چندراوتی جی؟"

"ہاں...... کیوں نہیں مہاراج؟"

"ارے ہاں، وہ تمہاری رقم ہم نے منگوائی ہے۔ دس لاکھ روپے تو ہمارے پاس موجود ہیں۔ یہ تو تم
رکھو، پندرہ لاکھ روپے کی رقم دو چار دن میں آ جائے گی۔ اور سبھی ہم تمہیں ادا کر دیں گے۔"

دس لاکھ روپے کے نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر چندراوتی کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔
رقم اس نے ساری زندگی یکجا نہیں دیکھی تھی جسے سنبھالتے ہوئے بھی اُس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے

مہاراج بھگوان داس کول کو اپنے ساتھ لے گئے۔ جو کوٹھی اُنہوں نے خریدی تھی، اسے دیکھ کر کول
دنگ رہ گئی۔ اس سے پہلے بھی یہ کوٹھی دیکھنے آئی تھی۔ یہ وہی جمنا محل تھا جو رادھے شام نے اُس کے لئے
بنوایا تھا۔ یقیناً یہ جمنا محل رادھے شام جی نے اب بھگوان داس کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔

کول کو تقدیر پر ہنسی آ گئی۔ کیسی انوکھی باتیں ہوتی ہیں۔ کیسا عجیب فیصلہ ہوتا ہے بھگوان کا...... یہ کوٹھی
رادھے شام کے ذریعے اُسے ملنے والی تھی، لیکن اب یہ شیش محل بھگوان داس نے اُسے دیا تھا۔ لعنت ہے
بھگوان داس پر۔ کمبخت کے چہرے پر تیل کا تھال مارا تھا۔ ناک کٹ گئی تھی، مگر اچھا ہی تو کیا تھا میں
نے۔ پر اب کیا ہوگا؟ اب یہ میرا مالک بن جائے گا۔ اس محل میں مجھے قید کر دیا جائے گا۔ بے شک میں
کوٹھے سے اُترنا چاہتی تھی، لیکن وہاں سے اُتر کر بھگوان داس جیسے آدمی کے ہاتھ لگ جانا، آہ بھگوان،
میں اسے برداشت کرسکوں گی......؟ وہ یہی سوچتی رہی۔ بھگوان داس کافی دیر تک اُسے شیش محل دکھاتا
رہا اور اس کے بعد واپس اُسے کوٹھے پر چھوڑ آیا۔ اُس نے واپس ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"ہم تمہیں لے جائیں گے کول کماری۔ لیکن دُلہن بنا کر۔ تم ہماری دُلہن بن کر یہاں سے جاؤ گی۔ اور
اس کے بعد ہم تمہیں شیش محل میں رکھیں گے۔"

وہ بہت بڑے کردار کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ لیکن کول کی آنکھوں میں جو درد سمٹ آیا تھا، اس میں کوئی کمی
نہ ہوئی۔ اور وہ اذیت کا ایک ایک لمحہ گزار رہی تھی۔

دوسرے دن شام کے تقریباً ساڑھے چار بجے ہوں گے کہ دفعتاً باہر کچھ آوازیں سنائی دیں۔ کول
کمرے سے نکل آئی۔ ان آوازوں میں تلخی اور تیزی نمایاں تھی۔ اُس نے ایک قد آور نوجوان کو
دیکھا۔ چہرے پر کنپٹی کے پاس سے ٹھوڑی تک گہرے زخم کا نشان تھا۔ بدن پر لباس بھی کچھ ایسا ہی تھا۔
مونچھیں لمبی لمبی اور نوکدار، شکل وصورت اچھی خاصی تھی۔ لیکن اپنے حلیے سے وہ اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا
تھا۔ کول کے ذہن میں فوراً ہی ایک نام گونجا "رنجیت......!"

نجانے کیوں یہ نام اُس کے ذہن میں اُبھرا تھا؟ یقیناً رنجیت اُس کی جانی پہچانی صورت تھی۔ رنجیت
اور چندراوتی آپس میں تلخ کلامی کر رہے تھے۔ چندراوتی کہہ رہی تھی۔

"تو تم جیل سے چھوٹ کر آ گئے۔ لیکن رنجیت، میں نے تم کو پہلے بھی منع کیا تھا کہ یہاں نہ آیا کرو۔

ہماری بھی کوئی عزت ہے، ہمارا بھی کوئی مقام ہے۔ میں تم سے ایک بار پھر کہتی ہوں کہ ضد نہ کرو
سے نہیں مل سکتی۔" چندراوتی خاموش ہوگئی۔ کیونکہ کومل باہر نکل آئی تھی۔ رنجیت نے چندراوتی کو ہاتھ
ایک طرف ہٹایا اور آہستہ سے کومل کے قریب پہنچ گیا۔

"کومل...... میں آگیا ہوں کومل۔"

کومل خاموش کھڑی رہی۔ رنجیت نے آگے بڑھ کر دونوں بازو پکڑ لئے۔ "میں آگیا ہوں کومل۔
دیکھ لو، یہ عورت آج بھی باز نہیں آرہی۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ تمہاری ماں کے برابر ہے۔ م
ہمیشہ اس کا احترام کیا کومل، لیکن اب یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کب تک چھوڑے رکھوں؟ تمہیں کوئی فیصلہ
گا کومل...... تمہیں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"دیکھو رنجیت، میں تم سے لڑنا بھڑنا نہیں چاہتی۔ لیکن اتنا تم سوچ لو کہ اگر تم یہاں آتے رہے
تمہارے لئے کچھ نہ کچھ کر کے رہوں گی۔" چندراوتی نے کہا۔

"ارے چندراوتی جی، کیا کریں گی آپ میرے لئے؟ کومل کی ماں سمان نہ ہوتیں تو میں آپ
کہ میں کیا ہوں۔"

"ارے جا جا...... بڑے دیکھے ہیں تجھ جیسے۔ خبردار جو آئندہ اس کوٹھے کا رُخ کیا۔ کومل، جاؤ
اندر جاؤ۔" چندراوتی نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا اور کومل بے بسی سے رنجیت کی طرف دیکھتی ہو
کی طرف مڑ گئی۔ رنجیت چند قدم آگے بڑھا تو چندراوتی جلدی سے اُس کے آگے پہنچ گئی۔

"تو غنڈہ ہے نا...... چاقو اتار دے میرے سینے میں...... مار ڈال مجھے اور اس کے بعد پھانسی پا
اور ایک بات سوچ لے، کومل تک تجھے نہیں جانے دوں گی۔"

"چندراوتی جی، کومل تک جانے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں جا رہا ہوں، لیکن پھر آؤں
کومل کو لینے کے لئے۔ سمجھ لیجئے آپ، کومل میری ہے اور صرف میری۔"

"ارے جا جا، منہ دھو رکھ۔ سڑک چھاپ غنڈے، لفنگے، لچے، تو اور کومل؟ وہ مہارانی اور تو بھ
دونوں کیسے ساتھ رہ سکتے ہو؟"

"تو تیرا بندوبست کرنا ہی پڑے گا مجھے۔"

"دیکھو رنجیت، میں آخری بار تجھ سے کہہ رہی ہوں...... آئندہ اس طرف کا رُخ مت کرنا۔ نہیں
میں کوتوال صاحب سے کہہ کر تیرا حساب کتاب کر دوں گی۔"

"کوتوال جی...... ارے کوتوال جی سے کہنا تو سہی رنجیت کے بارے میں۔ تین دن تک ب
چڑھا رہے تو رنجیت نام نہیں میرا۔" رنجیت نے ہنستے ہوئے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ درواز
رُک کر اُس نے پھر کہا۔ "کومل کو تو ہم کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ تم جانتی ہو چندرا رانی جی، وہ ہمارا پریم
تم اپنے لئے کانٹے بو رہی ہو چندراوتی جی۔"

"جا جا...... بہت دیکھے ہیں تجھ جیسے۔ یہ کوٹھا ایسے ہی نہیں چلا رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے...... ہمیں بھی دیکھ لینا چندراوتی جی۔ ہمیں بھی دیکھ لینا۔" رنجیت نے کہا اور باہر نکل

کومل کی اپنی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ رنجیت اُسے شکل وصورت سے کوئی اچھا آدمی معلوم نہیں ہوا تھا۔
نجانے کیوں اُس کے دل میں رنجیت کے لئے جگہ موجود تھی۔ وہ رنجیت کو بہت عرصے سے جانتی تھی۔
کی حیثیت سے حالانکہ کماری سونیا کے لئے یہ صورت اجنبی تھی۔ لیکن اب وہ سونیا تو نہیں تھی۔
چندراوتی پریشان سی اندر آگئی۔ اُس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو
اور پھر بولی۔ "اس رنجیت کے لئے تو سنا تھا کہ لمبی قید ہوگئی ہے۔ پر یہ رہا کیسے ہوگیا؟"
"پتہ نہیں چندراوتی جی......"
"کوتوال جی سے بات تو کی جائے۔ تم ایسا کرو ذرا کوتوال جی سے مل آؤ۔"
"ٹھیک ہے......" استاد جی نے کہا اور باہر نکل گئے۔
کومل اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ چندراوتی گہرے غور وفکر میں ڈوبی رہی۔ پھر وہ کومل کے پاس پہنچ
"کومل، اگر رنجیت کبھی یہاں آئے تو اس سے کوئی بات نہیں کرنا۔ تو خود ہی اُسے اتنی گھاس ڈالتی ہے
کی دوبارہ ہمت بڑھ جاتی ہے۔"
"میں کیا کروں ماتا جی...... میں اُسے بلانے تو نہیں گئی تھی۔" کومل نے کہا۔
"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے۔ بھگوان داس جی اب کے آئیں گے تو ان
ں گی کہ جلدی سے تجھے یہاں سے لے جائیں۔ دیکھ کومل، تجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت تو نہیں۔ تو
ہے کہ ہم جیسوں کو کیا کرنا ہوتا ہے۔ بھگوان داس جی بے شک بہت بڑے راجکمار ہیں۔ لیکن بالآخر
ایک دن وہ بھاگ جائیں گے۔ اور اس دوران اُن سے جو کچھ لے لے وہ تیرا ہوگا۔ دس لاکھ
میرے پاس آگئے۔ اور پندرہ لاکھ اور آجائیں گے۔ مگر یہ رنجیت، بھگوان اس کا ناس کرے۔"
ما کے ذہن میں بار بار رنجیت کھٹک رہا تھا۔ کومل نے اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے
میں جا کر لیٹ گئی۔
ت خوب گہری ہوگئی تھی۔ لیکن کومل کو اب نیند کم ہی آتی تھی۔ زیادہ تر راتیں سوچتے ہوئے گزرتی
ن کو کوئی کام نہ ہوتا، وہ خاصے دن چڑھے تک سو لیتی تھی۔
رات بھی وہ جاگ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ ایک
بغاوت اُس کے ذہن میں سر اُبھار رہی تھی۔ اُس نے سوچا، بھگوان داس کو میں نے کتے کی طرح
گھر سے نکال دیا تھا۔ لیکن اب وہ میرا مالک بننے جا رہا ہے۔ بے شک میرا چہرہ وہ نہیں ہے، لیکن
ہے۔ کیا یہ آتما بھگوان داس کا تسلط قبول کرے گی؟ کیا اس کے بعد ان سانسوں پر قابو رکھ سکوں
ایک ایک سانس مجھے آری کی طرح کاٹ کر نہ رکھ دے گا؟ وہ سوچتی رہی۔ اور پھر اُس کے ذہن
اور خیال اُبھرا...... یہ خیال رنجیت کا تھا۔ ہاں، عام حالات میں وہ رنجیت جیسے لفنگے کو اپنے گھر
رے پر بھی کھڑے دیکھنا پسند نہ کرتی۔ لیکن بھگوان داس سے بچنے کے لئے کیا رنجیت کا سہارا نہیں
......؟
ما کے من میں جوار بھاٹے اُٹھ رہے تھے۔ نجانے کیوں اُس کی آنکھیں کھڑکی کی طرف اُٹھ گئیں

اور وہ چونک پڑی...... اُسے کھڑکی پر ایک سایہ نظر آیا تھا۔ کومل جلدی سے کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ وہ
رنجیت ہی تھا۔

"جلدی سے کھڑکی کھولو، ورنہ میں گر پڑوں گا۔" اُس نے کہا اور کومل نے کھڑکی کھول دی۔

رنجیت نے اندر آکر اُس کا سر سینے سے لگالیا تھا۔ "میرا انتظار کر رہی تھیں کومل؟" اُس نے کہا اور کومل
کا سر ہل گیا۔ رنجیت مسرت سے سرشار ہوگیا تھا۔ "اگر مجھے یہ سہارا نہ ہوتا تو بھگوان کی سوگند، کبھی یہاں نہ
آتا۔ پر یہ چندراوتی اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ میرے اس انمول ہیرے کو اپنے قبضے میں رکھ کر بھلا وہ
سکتی ہے؟ مجھے قید ہوگئی تھی کومل، ورنہ اب سے بہت پہلے تم میری بن چکی ہوتیں۔"

کومل کے ذہن میں تھوڑی دیر پہلے ہی یہ منصوبہ ترتیب پا رہا تھا کہ کسی طرح وہ رنجیت کو اس بات
آمادہ کرے کہ وہ بھگوان داس سے اس کا پیچھا چھڑا دے۔ اور اب یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا تھا۔ ایک
اُس کا دل دھڑک اُٹھا۔ کیا میں یہاں سے نکل سکتی ہوں؟ کیا چندراوتی کا کوٹھا مجھ سے چھوٹ سکتا
اس کوٹھے پر تو ہر رات مرنا پڑتا ہے۔ ہر دن اس خوف اور وسوسے کا ہوتا ہے کہ آج کوئی آئے گا اور قیمت
دے کر مجھے حاصل کرے گا۔ کومل اپنے آپ کو بیچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ راج کماری سونیا سے ناچن
کومل کماری ضرور بن گئی تھی، لیکن اُس کی آتما کماری سونیا کی ہی آتما تھی۔ اور یہ آتما بھی اپنے سودے
قبول نہیں کر سکتی تھی، خواہ محبت کے عوض اُسے خریدے۔ اور رنجیت اس وقت وہی نظر آ رہا تھا۔

اُس نے رنجیت کی طرف دیکھا اور مسکرادی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

"میں بھی تو تجھے جیون سے زیادہ چاہتا ہوں۔ اگر تیرے من میں میرا پریم نہ ہوتا تو بھگوان کی سوگند
جینے میں مزہ بھی نہ آتا۔ تیرے لئے ہی تو جیون اپنا رکھا ہے، ورنہ کب کا موت کو گلے لگالیا ہوتا۔" رنجیت
نے کہا۔

"رنجیت...... چندراوتی نے میرا سودا کر دیا ہے۔ دس لاکھ روپے اُس نے لے لئے ہیں۔ پندرہ لاکھ
روپے اور لینے والی ہے۔ مجھے ایک راج کمار کے ہاتھ بیچ دیا گیا ہے۔ اگر تم نے جلدی نہ کی تو...... تو......"

"کومل، تم ایسا کرو جلدی سے اپنا سامان باندھ لو...... جو بھی ہاتھ لگے، وہ لے لو۔ وہ دس لاکھ روپے
کہاں رکھے ہیں؟"

"مجھے اُن کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

"چلو چھوڑو، وہ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا۔ میں انتظام کر کے آیا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"مگر ہم کہاں جائیں گے رنجیت؟"

"کہیں بھی...... کیا تمہیں اپنے رنجیت پر اعتبار نہیں ہے؟"

"نہیں...... یہ بات نہیں۔" کومل کسی سوچ میں ڈوب گئی......!

❀❀❀

کیا رنجیت پر مکمل بھروسہ کیا جاسکتا ہے......؟ ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ رنجیت کی آواز اُبھری۔

"کیا سوچ رہی ہو کومل؟ ہم نئے جیون کا آغاز کریں گے۔ اس جیون میں تم ایک سچی اور پیار کرنے
والی ہوگی اور میں تمہارا پتی۔ جیون کے یہ لمحات جتنے بھی طویل ہوں گے، ہمارے لئے بڑے قیمتی ہوں
گے۔ کیا تم یہ سب کچھ کھونا چاہتی ہو؟ کیا تمہیں کوٹھے پر ہوس بھری نگاہوں کے سامنے ناچنا پسند ہے کومل؟"

"نہیں رنجیت...... نہیں۔"

"کوئی راجکمار تمہیں دولت کے بل پر خرید لے اور اپنی لونڈی بنالے، یہ تمہیں پسند ہوگا؟"

"نہیں رنجیت...... نہیں۔"

"تو پھر ہمت کرو۔ میرے پاس دولت نہیں ہے۔ من ہے، سچائی ہے، پریم ہے۔ تم جو کچھ اپنے ساتھ
لے جاسکتی ہو، لے لو۔ ہم اس سے کام چلائیں گے۔"

کومل کے سارے زیورات اُس کے پاس الماری میں بند تھے۔ اُس نے اُن کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی
بنائی اور پھر بولی۔ "لیکن ہم باہر نکلیں گے کیسے؟"

"اسی رسی کے ذریعے۔ کیا رنجیت کے مضبوط بازوؤں پر بھروسہ نہیں ہے تمہیں؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ مم...... مگر......"

"آؤ...... میں تمہیں نیچے اتارتا ہوں۔" رنجیت نے کہا۔ وہ ایسے کاموں کا ماہر تھا۔ چنانچہ وہ کومل کو
لے کر نیچے اُترنے لگا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُس کے پیروں نے زمین چھو لی۔ پھر رات کی تاریکی
میں وہ ایک سمت بڑھتے چلے گئے۔

کومل نے یہ سارے فیصلے اچانک ہی کئے تھے۔ بہت سے خیالات اُس کے ذہن میں آرہے تھے۔ یم
نے اُسے تین سال کی زندگی دی تھی اور کہا تھا کہ یہ زندگی ایک ناچنے والی کے حساب میں ہے۔ مگر
یہ نہیں کہا تھا کہ اگر وہ ناچنے والی کی حیثیت ختم کر دے تو اس کی موت ہو جائے گی۔ ہاں، یہ ہدایت کی
تھی اُسے کہ وہ دوبارہ کبھی چتر کلا جا کر اپنی حیثیت ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے علاوہ اُس پر
اور پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔ چنانچہ رنجیت کے ساتھ چلتے ہوئے اُسے خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا۔
طوائف کی زندگی اُسے سخت ناپسند تھی۔ ہر چند کہ اس نئی زندگی میں بھی نجانے کون کون سی مصیبتیں منہ
کھولے کومل کا انتظار کر رہی تھیں۔ اب کم از کم دل پر لگنے والے وہ کچوکے تو برداشت نہیں کرنے پڑیں
گے جو یہاں آنے والوں کی نگاہوں سے اُس کے سینے پر لگتے تھے۔ اُس اپنی حیثیت مٹی میں ملتی محسوس
کرتی۔

رنجیت اُسے لئے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ اس وقت سڑکوں پر مکمل سناٹا تھا۔ وہ بہت سا فاصلہ طے کر کے لاریوں کے اُس اڈے پر پہنچ گیا جہاں سے لاریاں دوسری جگہوں کے لئے چلتی تھیں۔ لیکن اس وقت اڈہ بھی سنسان پڑا ہوا تھا۔ بہت سی لاریاں کھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس وقت جانے والی کوئی لاری نہ تھی۔ رنجیت نے کومل کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود لاریوں کی روانگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ پھر اُس نے کومل کے پاس واپس آ کر کہا۔

"صبح پانچ بجے ایک لاری بلند شہر کی جانب چلے گی۔ ہمیں وہاں جانا ہے۔ بلند شہر پہنچنے کے بعد کہیں اور جانے کے بارے میں سوچیں گے۔"

کومل نے گردن ہلائی اور آہستہ سے بولی۔ "لیکن اس سمے تک ہم کہاں رہیں گے؟"

"آؤ، کہیں نہ کہیں پڑ رہتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پریشانی کی کیا بات ہے؟" رنجیت نے کہا۔ اُنہوں نے لاریوں کے اڈے سے تھوڑے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے بسیرا کر لیا۔ کومل درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر رنجیت کہنے لگا۔

"کومل، تمہیں میرے پریم کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ کہاں تمہارا وہ راج محل جہاں تم کماریوں کی طرح راج کرتی تھیں اور کہاں اب رنجیت کا ساتھ۔ کیا تم میرا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو کومل؟"

"ہاں رنجیت۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے تو اب جو بھی ہو۔" کومل نے جواب دیا۔ پھر بولی۔ "لیکن ہم جائیں گے کہاں؟"

"پہلے تو بلند شہر چلتے ہیں۔ وہاں کہیں تھوڑے دن اپنا ٹھکانہ بنائیں گے۔ چندراوتی ایسی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ ہمارے بارے میں ہندوستان بھر میں معلوم کرے گی۔ لیکن تم چنتا نہ کرو۔ میں تمہیں اپنے ایک دوست کے پاس کانپور لے جاؤں گا۔ وہاں ہم آرام سے اپنے قیام کے لئے جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے رنجیت۔ اب تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جو من چاہے سلوک کرو میرے ساتھ۔ میں بھلا کیا کر سکوں گی؟"

"تم چنتا ہی مت کرو رانی...... میں اپنے پریم کو پا کر رہوں گا۔" رنجیت نے کہا اور نجانے کیوں کومل کو احساس ہوا کہ رنجیت کا سہارا اُس کے لئے بہت کافی ہے۔

رات سوتے جاگتے گزری۔ ہر لمحے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی آ نہ جائے۔ پولیس کے سپاہیوں کو ایک دو بار دیکھا تو کومل کی آنکھوں میں خوف اُبھر آیا۔ وہ جانتی تھی کہ کوتوال جی سے چندراوتی کے اچھے خاصے تعلقات ہو گئے ہیں۔ اور جب کوتوال جی کو یہ معلوم ہو گا کہ ایک غنڈا چندراوتی جی کے کوٹھے سے ایک انمول ہیرے کو لے بھاگا ہے تو کوتوال جی اپنی پوری قوت اُسے ڈھونڈنے میں صرف کر دیں گے۔ کیونکہ اُن کی آنکھوں کا حال بھی اچھا نہیں تھا۔

صبح پانچ بجے سے پہلے رنجیت تیار ہو گیا۔ لاری اڈے پر لوگ آنے شروع ہو گئے تھے۔ احتیاطاً رنجیت

نے ایک اوڑھنی کومل کو اوڑھا دی۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر کوئی بھی اُس کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ رنجیت نے اپنا حلیہ بھی تھوڑا سا تبدیل کر لیا تھا۔ سر پر ایک دیہاتی قسم کی پگڑی باندھ کر وہ کوئی دیہاتی لگنے لگا تھا۔ کومل بھی سادہ کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس لئے کوئی خاص طور سے اُس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چھوٹی سی گٹھڑی جس میں زیورات بندھے ہوئے تھے، رنجیت نے سنبھال کر رکھ لی۔ اور اس کے بعد وہ لاری اڈے پر پہنچ گئے اور اُس لاری میں بیٹھ گئے جو بلند شہر کی طرف جاتی تھی۔

لاری میں سفر کرتے ہوئے صبح کا سورج نمودار ہوا۔ کومل کھڑکی سے باہر کے منظر دیکھ رہی تھی۔ بھاگتے کھیت اور عمارتیں اُسے عجیب سی لگ رہی تھیں۔ اس سے پہلے جب کہیں سفر کرتی تو حسین رتھ اُس کی سواری ہوتے۔ گھوڑے سوار آگے پیچھے چلتے۔ ان رتھوں میں آرام دہ گدے بچھے ہوتے تھے اور ان کی حفاظت کے لئے بہت سے گھوڑسوار چل رہے ہوتے تھے۔ لیکن آج یہ کسمپرسی کا سفر اُسے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اُس کے جیون کی کہانی انوکھی ہی تھی۔ پتہ نہیں اب حالات اُسے کس رُخ پر لے جا رہے تھے۔ رنجیت کے ساتھ جیون کیسا بیتے گا؟ اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بظاہر رنجیت ایک محبت کرنے والا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کے چند سال اسی محبت کے سہارے گزر جائیں تو ٹھیک ہے۔ جب بھی اُس کو یہ خیال آتا کہ اُس کا جیون صرف تین سال کے لئے ہے، اُس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ بلاشبہ وہ دنیا کی سب سے انوکھی عورت تھی۔ اُسے اپنی موت کا سمے پتہ تھا۔

سفر جاری رہا۔ اب کھیتوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی باغات نظر آ جاتے، کبھی کوئی چھوٹی سی بستی۔ یہاں تک کہ بلند شہر کا سفر دن کو ساڑھے دس بجے کے قریب ختم ہوا اور گاڑی، لاری اڈے پر جا رُک گئی۔

رنجیت اُسے ساتھ لئے ہوئے اطمینان سے باہر آیا، ایک تانگے میں سوار ہوا اور کسی جگہ کا پتہ بتا دیا۔ راستے میں کومل نے پوچھا۔ "کون سی جگہ ہے یہ؟"

"ایک جاننے والے کا گھر ہے۔ ایک بڑھیا رہتی ہے اس گھر میں۔ کبھی کبھی اس بڑھیا کو کچھ پیسے دے دیا کرتا تھا۔ ہمارے عارضی قیام کے لئے اچھی جگہ ہو گی۔ حالانکہ ہم وہاں رُکیں گے نہیں، بلکہ یہاں سے آگے کانپور ہی چل کر رہیں گے۔ وہاں ہمیں آسانی سے لوگوں کے درمیان گھسنے کا موقع مل جائے گا۔"

تانگے نے اپنا سفر طے کیا اور پھر کچے پکے مکانوں کی ایک بستی کے پاس جا کر رُک گیا جہاں مکانوں اور جھونپڑوں پر پھوس کے چھپر پڑے ہوئے تھے۔ ایک بوسیدہ مکان کے دروازے پر رنجیت نے دستک دی تو تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ میلی کچیلی ساڑھی میں ملبوس ایک بوڑھی عورت نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھا اور آنکھیں ملنے لگی۔

"میں رنجیت ہوں ماسی...... تمہارا رنجیت۔"

"ارے رنجیتے...... تو آ گیا بیٹا...... اندر آ جا...... یہ کون ہے تیرے ساتھ؟ میری آنکھوں کی روشنی تو اور کم ہو گئی ہے۔"

"میری پتنی ہے ماسی جی...... تمہارے چرن چھونے کے لئے لایا ہوں۔"

''ارے آجا، آجا...... بھگوان سکھی رکھے۔تو نے شادی کب کر لی؟'' بوڑھی عورت نے کہا اور رنجیت
اُس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا صحن، چھوٹا سا برآمدہ اور ایک گھٹی ہوئی سی کوٹھڑی۔ یہ ایک مکان
کی پوری کائنات تھی۔ کوٹھڑی، چھپر سے ڈھکی ہوئی تھی، لیکن ٹھنڈی تھی۔ برآمدے پر بھی چھپر پڑا ہوا تھا
برآمدے میں پڑے ہوئے لکڑی کے ایک تختے پر بوڑھی عورت نے ایک چارپائی بچھائی اور کومل کو اس
بٹھا دیا۔

''کاش بیٹی، میں تیری صورت دیکھ سکتی۔ میری آنکھوں کی روشنی ختم ہو چکی ہے۔ بس دُھندلا دُھند
نظر آوے ہے۔ بس تیری پرچھائیاں دیکھ سکتی ہوں۔''

''جی ماتا جی......'' کومل نے آہستہ سے کہا۔

''بڑی خوشی ہوئی رنجیتے۔تو کافی دنوں کے بعد آیا ہے...... کہاں چلا گیا تھا؟''

''ارے بس ماسی، کاروبار میں تو ایسی ہی مصروفیت رہتی ہے۔ اُلجھا ہوا تھا۔ اور پھر شادی بھی تو کر
ہے میں نے۔''

''اب تو آ گیا ہے۔ یہاں رہ میرے پاس۔ میری آنکھوں کا علاج کرا دینا۔ زیادہ پیسے خرچ ہو
گے، ورنہ میں خود ہی کرا لیتی۔ وید جی نے کہا تھا پورے پانچ سو روپے لگیں گے۔''

''چنتا مت کر ماسی۔ میں تیری آنکھوں کا علاج ضرور کراؤں گا۔ اب تو جلدی سے ہمارے۔
بھوجن تیار کر۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔''

''ابھی لے رے...... ابھی لائی۔'' ماسی نے کہا اور رسوئی کی جانب چل پڑی جو ایک چھوٹی سی جگہ
بنی ہوئی تھی۔ کومل نے پریشان نگاہوں سے اس ماحول کو دیکھا اور رنجیت ہنس پڑا۔

''میں تمہاری آنکھوں کا مقصد سمجھ رہا ہوں کومل۔ لیکن یہ ہماری عارضی قیام گاہ ہے۔ یہ تکلیفیں تو تم
برداشت کرنی ہی ہوں گی۔''

''نہیں نہیں...... کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس نرکھ سے نکل آئی، بس یہی میرے لئے کافی ہے
کومل نے سچے دل سے کہا۔ حقیقت یہی تھی کہ اس راج محل میں جو چندراوتی کا گھر تھا اُس کے دل کو ایک
ایک لمحے قتل ہونا پڑتا تھا۔ وہ اس ماحول کو برداشت نہیں کر پاتی تھی جہاں فحاشی، عیاشی اور بے حیائی
علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ پُرہوس لوگوں کی ننگی نگاہیں اُس کے بدن کو چھوتی رہتی تھیں تو اُسے یوں محسوس
تھا جیسے پورے بدن میں برچھیاں سی چبھ رہی ہوں۔ یہاں کم از کم سکون تو تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھی عورت نے گندا سا غلیظ سا کھانا جو ساگ بھاجی اور پوریوں پر مشتمل تھا، ا
کے سامنے رکھ دیا۔ اور رنجیت ہاتھ دھو کر تخت پر آ بیٹھا۔

''کھاؤ کومل دیوی۔ یہ تمہارا نیا بھوجن ہے۔''

کومل کھانے میں مصروف ہو گئی۔ واقعی اُسے یہ کھانا بہت اچھا لگا تھا۔ پھیکا اور بدمزہ۔ لیکن ان لذ
کھانوں سے بدرجہ بہتر جو غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بوڑھی عورت نے کہا۔

''آرام کر لے اندر۔ میں تیرے لئے چارپائی بچھائے دیتی ہوں۔''

وہ اندر چلی گئی۔ رنجیت، کومل کے ساتھ اندر آ گیا تھا۔ اُس نے کومل کو ایک چارپائی پر لیٹنے کے لئے کہا
پھر بولا۔ ''میں چلتا ہوں کومل۔ ممکن ہے رات کو یہیں رہنا پڑے۔ کوشش کروں گا کہ آج ہی کانپور کے
لئے چل پڑوں۔ مگر رات یہاں گزارنی پڑے تو چنتا مت کرنا۔''

رنجیت چلا گیا۔ کومل بانوں سے بنی ہوئی اس چارپائی پر آ پڑی جو اُس نے اس سے پہلے کبھی نہیں
دیکھی تھی۔ صرف اس کے بارے میں سنا تھا۔ وہ تو آرام دہ مسہریوں پر سونے کی عادی تھی۔ لیکن تقدیر نے
اسے کیا کیا دکھا دیا تھا...... آئینے کی بات اُسے سچ ہی لگتی تھی۔ سنسار میں سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔
کوئی راج محل میں پیدا ہوتا ہے اور کوئی اس جیسی کٹیا میں۔ لیکن ان سب کا جیون ایک ہی ہوتا ہے۔ اور
یہ بات کومل کی سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی۔ اُسے اپنے غرور کا بھگتان بھگتنا پڑا تھا۔

بوڑھی عورت تھوڑی دیر کے بعد اُس کے پاس آ گئی اور اُس سے باتیں کرنے لگی۔ کومل کا جی نہیں چاہتا
تھا کہ کسی سے ایک لفظ بھی بولے۔ رنجیت کے ذریعے وہ چندراوتی کے کوٹھے سے نکل بھاگی تھی جہاں ہر
لمحے اُسے اپنی عزت خطرے میں محسوس ہوتی تھی۔ کبھی بھگوان داس اور کبھی رادھے شام، کبھی نواب
صاحب اور کبھی صوفی صاحب۔ ان میں سے یقیناً کوئی نہ کوئی اُسے داغدار کر دیتا۔ اور ایسے ہی داغ سے
بچنے کے لئے وہ یہاں آئی تھی۔ لیکن رنجیت...... رنجیت اُس سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیا وہ اسے کوئی
دیوی بنا کر پوجے گا؟ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے یہ نہیں ہو گا۔ تو پھر میں کیا کروں؟ کیا رنجیت کے ہاتھوں
اپنی عزت گنوا دوں؟ لیکن اس سنسار کے بارے میں، میں تو کچھ نہیں جانتی۔ پورے سنسار میں جہاں
لاکھوں لوگ رہتے ہیں، وہاں کوئی ایک بھی تو ایسا نہیں ہے جو میرا اپنا ہو۔ ہائے، کسی طرح ریاست چترکلا
پہنچ جاؤں...... کسی طرح اپنے پتاجی کے چرنوں میں جا کر کہوں کہ پتاجی، میں کومل نہیں ہوں۔ ناچنے والی
نہیں ہوں، بلکہ تمہاری بیٹی سونیا ہوں۔ کماری سونیا۔ وہ سونیا جسے تم اپنی آنکھوں کی روشنی کہتے تھے لیکن جو
اب ایک عجیب جیون گزار رہی ہے۔ ایک ایسا جیون جس میں اس کا اپنا کوئی نہیں ہے۔ لیکن اُس کی اتنی
ہمت نہیں تھی کہ وہ چترکلا پہنچ جاتی۔ موت کا خوف اُس کے سینے میں جاگزیں تھا۔ وہ اسی طرح پڑی
آنسو بہاتی رہی۔ رونے کے علاوہ اب اُس کے جیون میں اور رہ ہی کیا گیا تھا؟ اس سے تو اچھا تھا کہ
وہ مر ہی جاتی۔''

اتنا کہہ کر آشیش بھگونت خاموش ہو گیا۔ لڑکیاں اس دلچسپ کہانی کو سن رہی تھیں۔ شیطان کے خاموش
ہونے سے وہ بے چینی محسوس کرنے لگیں۔ روپا نے کہا۔

''پھر کیا ہوا مہاراج......؟''

''ماری گئی سسری اپنے ہی ہاتھوں۔ اُس نے یم دوت سے موت مانگ لی تھی۔ یہی روک تھی جو اُس
نے بچا دی تھی۔''

''تو پھر......؟'' دوسری لڑکیوں نے پوچھا۔

''اب وہ مر جائے گی۔ کیونکہ ہر بار وہ نیا جیون مانگتی رہتی تھی اور اُسے کوئی نہ کوئی شریر مل جاتا تھا۔ اس
بار اُس نے موت مانگی ہے۔ اب وہ جی نہ سکے گی۔''

"میرے لئے کیا آگیا ہے مہاراج؟" روپا نے پوچھا۔

"اب کچھ نہیں۔" شیطان نے مایوسی سے کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ "مگر کوئی بات نہیں، سنسار میں میری پوجا کرنے والے بہت ہیں۔"

"اوش مہاراج......"

"تم ابھی انتظار کرو۔ میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر شیطان وہاں سے چل پڑا۔ وہ پریشان تھا۔ ان دنوں نہ جانے کیا ہو رہا تھا؟ اُس کے بہت سے چیلے اپنی کوششوں میں ناکام ہو گئے تھے۔ کچھ اُس سے باغی ہوئے جا رہے تھے۔ جیسے رجنی جو اب پکی مسلمان ہو چکی تھی۔ اور اب تو اُسے اُس کا محبوب بھی مل گیا تھا جسے اُس کی تمام حقیقت پتہ چل گئی تھی۔

❁

شیطان ایک درویش کا روپ دھار کر ایک جگہ بیٹھ گیا تھا۔ وہ سادہ لوح لوگوں کو دھوکے دے کر گمراہ کرنے لگا تھا۔ اُسے ایک شخص ملا۔

"میرا نام خاور ہے۔" اُس نے کہا۔

"میں تیرے لئے کیا کر سکتا ہوں بچے؟" شیطان نے کہا۔

"میں ایک طلسمی جال میں پھنس گیا ہوں۔"

شیطان نے دلچسپی سے اُسے دیکھا، پھر بولا۔ "میرے علاوہ تجھے اس جال سے کون نکال سکتا ہے۔"

"تو میری مدد کرو......"

"میں تیار ہوں۔"

"کیا میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں؟"

"ظاہر ہے......اس کے بغیر میں تیری کیا مدد کر سکوں گا؟"

"بڑی عجیب کہانی ہے میری۔ اس دنیا میں کون میرا ہے، کون نہیں ہے، اس بات کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ میرا ایک بہت پیارا دوست تھا انور۔ اور میں اُس سے ملنے پریم نگر پہنچا تھا۔ یہاں آ کر مجھے ایک عجیب احساس کا سامنا کرنا پڑا۔

اسٹیشن سے پریم نگر تک کا فاصلہ مجھے ٹیکسی سے طے کرنا پڑا۔ پلیٹ فارم پر ہی مجھے ایک طویل جھلاہٹ اور کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ انور اسٹیشن پر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اپنی آمد کی اطلاع اُسے میں نے بذریعہ تار دے دی تھی۔ میں نے سامان قلی کے سر پر رکھوایا اور اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ باہر بھی مجھے انور نہ مل سکا۔ چاروناچار مجھے ٹیکسی کرنا پڑی۔ اور اب میری ٹیکسی پریم نگر کی طرف جا رہی تھی۔

ٹیکسی ایک دھچکے کے ساتھ "انور لاج" کے سامنے رُک گئی۔ میں ٹیکسی سے نیچے اُتر آیا۔ ڈرائیور کی مدد سے اپنا ہولڈال اٹیچی کیس باہر نکلوایا۔ ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت کرنے کے بعد میں انور لاج کی طرف مڑا۔ میری نظریں رینگتی ہوئی انور لاج پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

میں چونک پڑا۔ گھبرا کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کہیں غلطی سے کسی دوسری جگہ تو نہیں آ گیا؟ یہ خیال

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں کوند گیا۔

مگر عمارت کی پیشانی پر کندہ عبارت "انور لاج" جیسے میرے خیال کی تردید کر رہی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ "انور لاج" کو دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں ایک حماقت آمیز تشبیہ اُبھری۔ "بھوت لاج"...... میرے ذہن کے نجانے کون سے تاریک پردوں کو عبور کر کے ایک نام میری زبان کی نوک سے پھسل پڑا...... میرے ہونٹوں کی قوسیں ایک دائرہ کو تشکیل دے چکی تھیں اور میں مبہوت سا پھر اس عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن کا شور مجھے ماضی کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔

آج سے تقریباً پانچ سال پہلے میں یہاں آیا تھا۔ اسی طرح میں نے باہر کھڑے ہو کر ایک طائرانہ نظر "انور لاج" پر ڈالی تھی۔ انور لاج، جس کے ایک ایک عضو سے حسن پھوٹ رہا تھا۔ میں نے انور لاج کی کھڑکیاں دیکھی تھیں جو باہر کی طرف کھلتی تھیں اور گیٹ پر کھڑے ہو کر صاف نظر آتی تھیں۔ ان کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ کے پردے سرسرا رہے تھے، کسی دوشیزہ کے رنگین پیراہن کی طرح ہواؤں کے شوخ و چنچل تھپیڑوں سے سرشار ہو کر۔

میں نے انور لاج کا کمپاؤنڈ دیکھا تھا۔ روش کے دونوں طرف کروٹا کی باڑ دیکھی تھی جسے نہایت خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ میں نے چوبی صدر دروازے کو دیکھا تھا جو صندل کی لکڑی سے بنا تھا، جس پر پریوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں، حسین نقوش تھے جو سائیکی کے حسن کو بھی شرما سکتے تھے۔

مگر اب جیسے "انور لاج" کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ جیسے پانچ سال اپنے ساتھ انور لاج کا حسن چھین کر لے گئے ہوں...... وہ روشن کھڑکیاں جن پر آج سے پانچ سال پہلے ہلکے نیلے رنگ کے شوخ پردے سرسرایا کرتے تھے، جن سے ٹھنڈی ٹھنڈی، نیلی نیلی فرحت بخش روشنی پھوٹا کرتی تھی، وہ روشن کھڑکیاں...... اُف بالکل ہی تو اُجاڑ نظر آ رہی تھیں۔ پہلے وہاں زندگی رقصاں تھی، بہار کی اپسرا کی طرح تھرکتی تھی۔ مگر اب...... ایسا لگ رہا تھا جیسے چند ڈائنوں نے مل کر ان کھڑکیوں کا حسن چھین لیا ہو۔ اب...... اُف ایسا لگ رہا تھا جیسے چند چڑیلیں اپنے لمبے لمبے دانت نکالے ان کھڑکیوں سے باہر کی طرف جھانک رہی ہوں، پھر وحشیانہ انداز میں پیچھے کی طرف پلٹ کر رقص دیوانگی میں مصروف ہو گئی ہوں۔ اپنے لمبے لمبے دانت نکالے، کالی شکلوں کو اور بھیانک بنا کر، اپنے بالوں کو بکھرا کر جیسے وہ بھوتوں کے دربار میں حاضری دے رہی ہوں۔ اب ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے ان روشندانوں، کھڑکیوں کے پیچھے کوئی...... کوئی بھی بہت بھیانک اور خوفناک راگ چھیڑ رہا ہے۔ اور عجیب الہیئت بھوت، خوفناک چڑیلیں، بھیانک شکلوں والی ڈائنیں اس بھیانک راگ کی دھن پر تھرک رہی ہیں، لال روشنیوں کے مابین...... لال روشنیاں جو خون کی آئینہ دار تھیں......

اور پھر...... انور لاج کی داہنی طرف والا تالاب...... جس میں، میں اور انور تیرا کرتے تھے، جس کا پانی صاف شفاف ہوا کرتا تھا، نیلا آسمانی جلد کی طرح۔ وہ تالاب، اُس کا پانی کتنا گندا تھا، جیسے کسی پھوڑے سے نکلا ہوا رقیق مادہ...... اس پر طرہ یہ کہ اس پانی میں انور لاج کا عکس بھیانک، عجیب وغریب نظر آ رہا تھا جیسے وہ بھی ڈائنوں، چڑیلوں اور بھوتوں کے ساتھ مل کر اس بھیانک راگ کی دھن پر تھرک رہا

ہے۔

میں نے ایک جھرجھری لے کر اپنی آنکھوں کو مسلا۔ میری نگاہیں ایک مرتبہ پھر مفلوک الحال "انور لاج" پر مرکوز ہوگئیں۔ کراتا کی بار کسی مفلس اور بوڑھے آدمی کے چہرے پر اُگی ہوئی بے ہنگم سی داڑھی کے مترادف تھی۔ ایسی داڑھی جو شرمندہ حجامت نہ ہوسکی ہو۔ اس تشبیہ کے متعلق سوچ کر میرے ہونٹوں پر ایک پھیکی اور بے جان سی مسکراہٹ رینگ کر رہ گئی۔

پھر میں دروازے کو دیکھنے لگا۔ اس دروازے کے آبنوسی پٹ جن پر منقوش تصویریں کبھی میں اپسراؤں کی تصویریں گرداناتا تھا۔ وہ منقوش تصویریں، وہ نقش و نگار اب مجھے تھرکتی ہوئی روحیں نظر آرہی تھیں جیسے اس آبنوسی پٹ پر روح کے گوناگوں فرائض کی تصویر کشی کی گئی ہو۔ دیوتا کے سامنے روح کی حاضری کو پیش کیا گیا ہو۔ وہ انسانی شکلیں جنہیں میں سائیکی اور کیوپڈ تصور کرتا تھا، اس وقت ایسے جبڑے کھولے چہروں پر بھیانک پن کی لکیریں کھینچے جیسے روحوں کو ڈس رہی تھی۔ حالانکہ یہ سب ایک واہمہ تھا، فریب نظر تھا۔ مگر نہ جانے کیوں میرا ذہن اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ میرے ذہن میں بھیانک تشبیہات کا جتنا انبار تھا، اس نے شاید آج میری نوک زبان سے پھسلنے کی قسم کھالی تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ تو تھا جس کی وجہ سے میں اتنا سب کچھ سوچ رہا تھا۔ میرے اتنا سب کچھ سوچنے کی محرک انور لاج کی ویرانی بھی ہوسکتی تھی۔

"بھاگ جاؤ......" ایک لمحے کے لئے میرا دل ایک بھیانک سی آواز کے ساتھ چیخ اُٹھا۔ اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ رات گہری اور تاریک تھی اور میرے بدن پر لرزہ تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹک دیا، تیزی سے جیب میں ہاتھ گھسیڑا اور سگریٹ تلاش کرنے لگا۔ پھر میں نے سگریٹ سلگالی۔ کاش میں دہلی نہ آتا۔ بمبئی سے دہلی کا فاصلہ بہت ہوتا ہے۔ ایک ہزار لمبے لمبے اُکتا دینے والے میل درمیان میں حائل ہوتے ہیں۔ انہیں طے کر کے آنا پڑتا ہے۔ مگر...... میرا دل...... اور اس دل میں میرے بدنصیب دوست انور کی محبت۔

آج سے چار روز پہلے مجھے اپنے ایک دوسرے دوست کا خط موصول ہوا تھا جس میں چند دوسری باتوں کے علاوہ انور کے متعلق صرف اتنا لکھا تھا...... "انور کی حالت نہایت قابل رحم ہے۔ تم شاید اُسے پہچان بھی نہ سکو۔ وہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ دراصل بہت پریشان ہے۔ کیا بتاؤں؟ یہی بہتر ہوگا کہ تم اُس سے مل لو۔"

اس خط کو دیکھتے ہی میں نے اپنی انتہائی اہم مصروفیات کو چھوڑ کر دہلی آنے کی تیاری شروع کردی۔ اور اب میں دہلی میں انور لاج کے سامنے کھڑا تھا۔ مبہوت سا...... پھٹی پھٹی آنکھوں سے انور لاج کو تکتا ہوا...... انور مجھے اسٹیشن پر بھی لینے نہیں آیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اب میں اندر جا کر اُس کی گُدی ناپوں گا۔ ہنہ میں اپنی شریک حیات، اپنی پیاری نورین، صحت مند جسم اور نیلی آنکھوں والی نورین کو اکیلا چھوڑ کر صرف اس کے لئے اتنی دُور چلا آیا تھا۔ اور وہ مجھے اسٹیشن پر بھی لینے نہیں آیا تھا۔ ہنہ...... میری پیاری نورین...... میری پیاری سی نورین...... میری زندگی...... میری جان میرے بمبئی والے فلیٹ میں میرے لئے تڑپ رہی ہوگی۔ اُس کی نیلی نیلی آنکھوں میں سفید سیپ کے ایسے موتی جھلمل کر رہے ہوں گے

بے قرار ہوگی میرے ساتھ جوہو کے کنارے، میرے ہاتھ میں ہاتھ ال کر ٹہلنے کے لئے۔ اور میں یہاں آیا اپنے اس خبطی دوست سے ملنے جو مجھے اسٹیشن پر ریسیو کرنے بھی نہیں آیا، ہنہ......

ہوں...... نورین کو یاد کر کے مجھے انور کی زارا یاد آگئی۔ میرے پیارے دوست انور کی بیوی...... شریک حیات...... جسے آج سے پانچ سال پہلے وہ بیاہ کر لایا تھا۔ جسے منہ دکھائی کے میں نے پورے پانچ سو روپے دیئے تھے۔ وہ زارا، میری بھابھی...... وہ بھی اسٹیشن پر نہیں آئی۔ مجھے ان دونوں سے نمٹنا ہے......

آگے بڑھ کر میں نے کال بیل کے پش بٹن پر اُنگلی رکھ دی تھی۔ میں اندر گھس سکتا تھا۔ میرے اندر جانے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ میری انور کی بے تکلفی، گہری دوستی کسی اجازت کی مرہون منت نہیں تھی۔ مگر میرا سامان...... میں نے بہتر یہی سمجھا کہ کال بیل کا بٹن دبا کر کسی کو بلاؤں۔ ابھی کون ہوسکتا ہے، انور، زارا یا پھر بوڑھا شامو...... جس کی زندگی انور کی خدمت کرتے کرتے گزر گئی۔ بہرحال ان میں سے کوئی بھی آئے گا اور میرا سامان اُٹھائے گا۔ اس لئے میں نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

عمارت کے دُور افتادہ حصہ میں "ٹرن ٹرن" گونج اُٹھی۔ پھر وہی سکوت...... جیسے انور لاج، انور لاج نہ ہو بلکہ شہر خموشاں ہو......

میں نے ایک مرتبہ پھر جھنجھلا کر گھنٹی بجائی اور کسی کے قدموں کی چاپ گونجنے لگی۔ کوئی باہر آرہا تھا۔ میں نے سگریٹ کو پیروں تلے مسلا، سگریٹ کا چھوٹا سا ٹکڑا میرے بوٹ کے تلوے تلے دب کر بجھ گیا۔ دروازہ کھلا، سامنے شامو کھڑا تھا۔

"ہیلو شامو کاکا......" میں شامو کاکا کی طرف جھپٹا اور اُن سے بغل گیر ہوگیا۔ وہ تھے تو نوکر، مگر میں بچپن سے اُن کا ادب کرتا تھا۔ اُن سے محبت کرتا تھا۔

"خاور بیٹے، میرے چھوٹے سرکار......" شامو کاکا میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اُن کا لہجہ کپکپایا ہوا سا ہے۔

"کیسے ہو شامو کاکا؟"

"اچھا ہوں بیٹے" شامو کاکا کے لہجے میں ارتعاش تھا۔

میں شامو کاکا سے الگ ہوگیا۔ میں نے دیکھا، شامو کاکا اپنے کندھے پر پڑے ہوئے انگوچھے سے اپنی دُھندلی دُھندلی سی آنکھیں صاف کر رہے تھے جو نم ہوگئی تھیں۔ شامو کاکا نے میرا ہولڈال اُٹھایا اور میں نے اٹیچی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے صدر دروازے کو عبور کر کے عمارت کے اندر داخل ہوگئے۔ شامو کاکا میرے آگے آگے تھے۔

"انور کیسا ہے؟" میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

"انور......" شامو کاکا ایک لمحے کے لئے ٹھہرے۔ اُن کا لہجہ پُرخیال تھا۔ کپکپایا ہوا سا تھا۔ "چھوٹے سرکار، کیا بتاؤں بیٹے؟"

"کیا مطلب......؟"

"تم خود ہی دیکھ لینا۔" شامو کاکا، کا لہجہ ڈوبا ڈوبا سا تھا۔

"اور بھابھی......؟"

"کیا......؟"

"اے بھئی بھابھی......زارا......اور کون؟"

"خاور بابو......" شامو کاکا، کا لہجہ گلوگیر تھا۔

"شامو کاکا......" میں چونک پڑا۔ میرے لہجے میں ہزار ہا سوالات پوشیدہ تھے۔ میری آنکھیں
سی گئی تھیں۔ گویا شامو کاکا کے جواب کی منتظر ہوں۔

شامو کاکا خاموشی سے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ۔ میں نے چا
آگے بڑھ کر شامو کاکا کے کندھے پکڑ کر اُنہیں جھنجھوڑوں اور اُن سے پوچھوں کہ وہ پہیلیوں میں با
کیوں کر رہے ہیں؟ مگر میں اپنے اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کیونکہ وہ اوپر، دوسری منزل سے اُ
رہا تھا۔

مگر...... میرے ہاتھ سے اٹیچی چھوٹ کر نیچے گر پڑی...... انور کے چہرے پر پیرانہ سالی کے ن
تھے۔ اس انور کے چہرے پر جس کی عمر اور میری عمر میں کوئی خاص تضاد نہیں تھا، جو میرا ہم عمر تھا، ج
سے پانچ سال پہلے بائیس سال کا خوبصورت نوجوان تھا، اُس انور، اُس بدنصیب کے چہرے پر پیرانہ
کے نقوش تھے۔ وہ نہایت آہستگی کے ساتھ سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ اور میں مبہوت سا، پھٹی پھٹی آنکھوں
اُسے دیکھ رہا تھا۔

اُس نے سیڑھیاں طے کر لیں...... اب وہ میرے نزدیک آ رہا تھا...... اور نزدیک آ رہا تھا...
نزدیک آ رہا تھا...... مگر...... وہ ایک غیر اضطراری سی حرکت تھی جو میں تیزی سے پیچھے کی طرف ہٹ
مجھے انور سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ اُس کے چہرے پر بڑھاپے کے نقوش اپنی تمام تر تلخیوں ا
گویا ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنے اُسی دوست، جس کے خط کو پڑھنے ک
میں دہلی آیا تھا، کی تحریر ناچ رہی۔ "شاید تم اسے پہچان نہ سکو۔"

میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ وحشیانہ انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے ایک جملہ...... صرف
جملہ میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔ "تم شاید اُسے پہچان نہ سکو۔"

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بھوتوں کے دیش میں آ گیا ہوں۔ پانچ سال...... نہیں نہیں، پانچ
کسی شخص سے اس کی جوانی چھین کر بڑھاپے کے نقوش ثبت نہیں کر سکتے۔ نہیں نہیں...... یہ ایک واہ
اور مضحکہ خیز سا خیال ہے۔ لیکن...... جیسے حقیقت مجھے منہ چڑا رہی تھی۔ انور کے گھٹنے نقاہت سے
رہے تھے۔ کندھے ضعف سے جھکے ہوئے تھے۔ اُس کی گردن اور چہرے پر جھریاں تھیں، وہ بھی سل
کی شکل میں جو تیز ہوا کے چلنے کی وجہ سے کھڑکھڑا رہی تھیں...... سر پر سفید بال تھے، روئی کے گالو
طرح...... آنکھوں میں ویرانی تھی۔ کرب، تکلیف، سوزش اور نہ جانے کیا کیا بھرا ہوا تھا۔ ناک کی
نمایاں طریقے سے نظر آ رہی تھی۔ ہونٹوں کی قوسیں جیسے شکستہ ہو گئی تھیں...... پیشانی اگرچہ جھریوں
صاف تھی، مگر اُس پر نمایاں لکیریں امتدادِ زمانہ کے گہرے نقوش کے مترادف تھیں۔ آنکھیں بے

پُر درد...... ویران، جن میں نہ جانے کتنی ویران کہانیاں تڑپ رہی تھیں۔ ایسے لگ رہی تھیں جیسے وہ
بھی شرمندۂ تعبیر ہوئی ہوں اور نہ کبھی ہوں گی۔ اُس کا پورا جسم ہڈیوں کا پنجر نظر آ رہا تھا۔ بھنوؤں پر سفید
بال کافی حد تک بھیانک لگ رہے تھے۔ اور چہرے پر نمایاں ہڈیاں...... اُف...... میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"مجھے معلوم تھا......" انور کہہ رہا تھا۔ مگر اُس کی آواز مدھم تھی، کانپتی ہوئی...... ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ
کہیں دُور سے آ رہی ہو۔ حالانکہ وہ میرے بالکل قریب آ کر مجھ سے بول رہا تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں
سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ "مجھے معلوم تھا......" انور اسی مدھم اور کپکپاتے لہجے میں کہتا رہا۔ "تم مجھے پہچان بھی
نہ سکو گے۔ تم مجھے دیکھ کر وحشیانہ انداز میں پیچھے ہٹو گے، جیسے میں کوئی خبیث رُوح ہوں جو موقع ملتے ہی تم
سے چمٹ جائے گی۔"

آخری جملہ...... اُف...... میں اُسے زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ زمانے بھر کا کرب تو بھرا ہوا تھا اس
میں...... مایوسیوں کے انبار تھے، تلخیوں کی چاشنی...... ایک لمحے کو میں جھنجھلا گیا۔ میں کتنا کم ہمت تھا؟ اپنے
دوست کو اس بری حالت میں دیکھ کر میں وحشیانہ انداز میں پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔

"انور......" میں اُس کی طرف لپکا۔ میرا لہجہ گلوگیر تھا۔ میرے بازو اُس کے جسم کے گرد پھیل گئے۔
میں نے اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

"خاور......" وہ تقریباً رو پڑا۔

"انور......" میں کپکپاتے لہجے میں بولا۔ "میرے دوست، تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟ تم اتنے اجنبی کیوں
ہو گئے ہو؟ تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے اور تم نے مجھے لکھا بھی نہیں...... میں اب اتنا غیر بھی نہیں تھا انور......"
وہ مجھ سے لپٹا سسکتا رہا...... شامو کاکا اپنے انگوچھے کے کناروں سے پلکوں کے نم کنارے خشک
کرتے رہے۔

"آؤ......" تھوڑی دیر بعد اُس نے میرے گلے میں اپنا بایاں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ میں اُس کے
ساتھ آگے کی طرف چل دیا۔ اب ہم لوگ دوسری منزل تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں طے کر رہے تھے۔
انور کا ہاتھ میرے شانے پر کپکپا رہا تھا۔ ہم نے سیڑھیاں طے کر لیں۔

"انور......" میں نے سیڑھیاں طے کرنے کے بعد اُسے ہولے سے پکارا۔

"ہوں......"

"زارا کہاں ہے؟"

"خاور......" اچانک انور چیخ پڑا اور اُس نے ایک جھٹکے کے ساتھ میرے شانے پر سے اپنا ہاتھ گھسیٹ
لیا۔ وہ مجھے اپنی دُھندلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی ویران سی آنکھوں میں آنسو جھلمل کر رہے
تھے۔ اُس کا پورا بدن کپکپا رہا تھا۔ "نام مت لو اُس کا میرے سامنے......" وہ مدھم لہجے میں بڑبڑایا۔

"کیوں......؟"

"خاور......" اُس کے لہجے میں التجا تھی۔

"مگر کیوں؟" میں جھنجھلا گیا۔

''وہ میرے کندھے سے سر ٹیک کر پھوٹ پڑا۔
''انور...... انور......'' میں نے اُس کا شانہ تھپتھپایا۔
''ہوں......''
''کیا مسئلہ ہے...... بتاؤ نا...... یہ تم لوگ پہیلیوں میں باتیں کیوں کر رہے ہو؟ مجھے اُلجھن ہوتی ہے
وحشت سی ہوتی ہے۔ بتاؤ نا۔''
''اُس کا تذکرہ چھوڑ دو خاور۔''
''مگر کیوں؟ وہ میری بھابھی ہے اور تمہاری شریکِ حیات۔''
''شریکِ موت کہو خاور...... میری موت کی متمنی کہو۔''
''انور......'' میرا لہجہ غصیلا تھا: ''تم ہوش میں تو ہو نا؟''
''میں نے شراب پینا چھوڑ دی ہے۔'' اُس کا لہجہ اسی طرح مدھم تھا۔
''مگر......''
''اگر مگر کچھ نہیں...... اس تکلیف دہ قصے کو چھوڑ دو۔''
''نہیں انور...... یہ سب نہیں ہو سکتا۔ تمہیں بتانا پڑے گا، آخر یہ سب کیا ہے؟''
''خاور......'' اُس کے لہجے میں التجا تھی۔
''کیا ہے؟''
''میری ایک عرض مانو گے؟''
''کیا......؟''
''پہلے وعدہ کرو، مانو گے؟''
''تم کہو تو سہی۔''
''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''
''کیوں......؟''
''میں سکون چاہتا ہوں۔ تم نے میرے زخموں کو کرید ڈالا ہے۔ م...... میں......'' وہ سسک پڑا۔
''انور، میرے دوست......'' میں نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ ''درد بانٹنے سے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ ا
درد میرے ساتھ بانٹ لو۔''
''مگر......''
''پلیز انور...... فار گاڈ سیک۔''
''اچھا......'' اُس کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ ''تم نہا لو، پھر میں تمہیں بتاؤں گا۔''
''بہتر۔'' میں بڑبڑایا۔
تھوڑی دیر بعد میں اپنے اٹیچی کیس سے ٹوتھ برش، پیسٹ، صابن، تولیہ وغیرہ نکال کر غسل خانے
طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں اپنے دانتوں کو برش کرنے لگا۔ بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ

ہا پڑا...... وہ چیخ بہت بھیانک تھی۔ اور وہ چیخ انور ہی کی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ غسل خانے
دروازہ کھولا۔ دوسرے لمحے میں تیر کی سی تیزی کے ساتھ انور کے کمرے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ ایک جھٹکے
ساتھ میں انور کے کمرے کے دروازے کے سامنے رُک گیا...... اور...... میں نے دیکھا...... اُف......
انور کر...... میں نے دیکھا ایک دراز قد عورت سفید کفن میں لپٹی ہوئی میرے دوست...... بدنصیب
پر جھکی ہوئی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کا ہالہ اُس کی گردن کے گرد بنائے ہوئے...... اُس کے شانے
ں کی سنہری زلفیں لہرا رہی تھیں۔ نچلا بدن سفید کفن میں لپٹا ہوا تھا...... انور کے چہرے پر کرب کے
ات تھے۔ اُس نے میری طرف دیکھا، بے بس نگاہوں کے ساتھ جو مدد کی ملتجی تھیں۔
جیسے ہی اُس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں، وہ دراز قد عورت بھی پلٹی۔ اُف...... اُس دراز قد عورت
سینے سے خون کا فوارہ اُبل رہا تھا...... مگر زمین خون سے پاک تھی۔ اُس کا چہرہ خوبصورت تھا۔ نچلا
ب جیسے سفید دانتوں کے درمیان سختی سے بھنچا ہوا تھا۔ وہ بہت خوبصورت عورت تھی۔ اپسراؤں کی
ح...... مگر اُسے غور سے دیکھ کر...... اُف، آپ سمجھ سکتے ہیں وہ کون تھی؟ آہ...... میرے خدا...... رحم کر
وہ دراز قد عورت...... جس کی زلفیں اُس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں، جس کے سینے سے خون کا
اُبل رہا تھا...... وہ...... وہ زارا تھی......!
میرے پورے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ میری آنکھوں کے گوشے بھاری ہو گئے تھے۔ شاید ان
آنسو اٹکے ہوئے تھے۔ میری نگاہیں کفن میں ملبوس اُس دراز قد عورت، جو زارا تھی پر سے ہٹ کر
نے والی دیوار پر لگے ہوئے بڑے سے شیشے پر مرکوز ہو گئیں...... شیشے میں تین شخصیتوں کے عکس تھے۔
عکس انور کا تھا، جس کی آنکھوں میں وحشت تھی، سفید بال پریشان تھے، بھنوئیں سکڑ گئی تھیں، ہونٹوں
لکتہ قوسیں پھڑک رہی تھیں، چہرے کی ہڈیاں کسی ویران میدان میں اُبھرے ہوئے ٹیلوں کا سماں پیش
رہی تھیں...... ایک عکس زارا کا تھا...... جس کا خوبصورت چہرہ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔
طور پر سپاٹ...... اور ایک عکس تھا میرا...... میں، جس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے تاثرات جیسے
ہو کر رہ گئے تھے۔ میری آنکھوں کے گوشوں میں دو آنسو جیسے اٹک کر رہ گئے تھے اور بس...... نہیں
ا...... وہاں ایک اور عکس تھا...... اُف...... کنپٹیاں پھٹ نہ جائیں...... میرے جسم کی رگوں کا سلسلہ
ت خوف سے منقطع نہ ہو جائے، میری رُوح میرے جسم کا ساتھ نہ چھوڑ دے...... وہ...... وہ عکس......
اُس کے پورے بدن پر یہاں تک کے چہرے پر بھی بھورے رنگ کے بال تھے، کھڑے کھڑے
...... اور تمام جسم خون سے تر تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں، خون میں ڈوبی ہوئی۔ پیشانی تنگ تھی۔ صرف
بالوں سے بے نیاز تھی...... وگرنہ ایک ایک عضو، ایک ایک نقش، باریک سے باریک خطوط بالوں سے
تھے...... اور وہ کہیں دُور بھی نہیں تھا، بالکل میرے نزدیک ہی کھڑا تھا......
میں نے تیزی سے اپنی داہنی طرف پلٹ کر دیکھا، وہ اپنے چہرے پر تمام تر شیطانیت لئے اپنی سرخ
آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا...... مجھے ایسا لگا جیسے میں اُڑتا جا رہا ہوں آسمانوں میں...... جیسے میرے
میرے دماغ اور میرے سر کا کوئی وجود ہی نہیں...... پھر وہ انور کو گھورنے لگا...... میں نے دیکھا انور

کپکپا رہا تھا...... وہ انور کی طرف بڑھا۔ انور کے قریب پہنچ کر اُس نے اپنا ایک ہاتھ اُٹھایا۔ وہ انو
میں تر تھا...... فضا میں ایک بوجھل سا سناٹا مسلط تھا......

''انور......'' اُس کی بھیانک آواز نے اس بھیانک جمود کو توڑا۔ انور کے بدن پر وہی لرزہ طاری

''انور......'' اُس کی وہی آواز جو کسی سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی گونجی۔ اُس نے اپنا داہنا ہاتھ ا
طرف بڑھا رکھا تھا۔ ''میں نے اپنے اس ہاتھ کو......'' اُس نے اپنے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے کہا
کرات'' میں بہت دھویا...... بہت دھویا انور...... مگر اس پر جمی ہوئی خون کی سرخی ختم نہ ہو سکی۔ آ
بحر کرات کی بے چین موجیں تیری منتظر ہیں...... آ کہ بحر کرات کا مشرقی کنارہ چیخ رہا ہے...... آ کہ
سے انتقام کے لئے بے چین ہوں...... آ کہ زارا کی بے قرار رُوح اپنا مسکن چھوڑ کر بحر کرات کے
کنارے پر بھٹک رہی ہے، صرف تیرے انتظار میں۔ آ...... غمزدہ، پُر درد گیت وہاں بھی اُبھرتے ہیں
کرات کی لہریں ان گیتوں میں اُداس سی موسیقی کا اضافہ کرتی ہیں۔ مگر تیرا خون...... ان گیتوں
موسیقی کو جلا بخش سکتا ہے۔ آ......''

''بب...... بچاؤ......'' انور پوری قوت کے ساتھ چیخا۔

''آ...... ہا...... ہا......'' اُس بھیانک وجود کا قہقہہ...... بھیانک قہقہہ انور کی چیخ پر بھاری تھا۔
ایک لمحے کے لئے پلٹ کر اپنی بوجھل سی مگر خوفناک آنکھوں سے مجھے دیکھا، دوسرے ہی لمحے وہ زار
تھا۔ اُس نے زارا کا سفید کفن کھینچ لیا...... آہ...... میں کس جنجال میں پھنس گیا ہوں...... زارا عریا
تھی...... میرے دوست کی بیوی...... مگر نہیں نہیں...... اُس کا جسم تو کہیں بھی نہیں...... وہاں تو م
ہے۔ مگر...... اُس بھیانک وجود نے اپنا کالا لبادہ اُتار دیا۔ اور پھر اُس جگہ، جہاں وہ بھیانک وجو
اس جگہ کچھ بھی تو نہیں تھا...... کمرے میں نہ زارا تھی، نہ بھیانک وجود...... کچھ بھی تو نہیں تھا۔ م
مبہوت سا کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا...... انور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔
کے سفید کفن اور اُس بھیانک وجود کے کالے لبادے کی طرف جھپٹا۔ زارا کا سفید کفن خون میں تر
خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرا تھا۔ اور وہ کالا لبادہ...... میں نے تیزی سے اُسے نیچے پھینک د
ایسا لگا جیسے وہ کالا لبادہ نہ ہو بلکہ سانپ کی کینچلی ہو۔

''انور......'' میں تیزی سے انور کی طرف لپکا۔

''خا...... و...... ر......'' انور سسک پڑا۔

''یہ سب کیا ہے انور......؟'' میری آواز بوجھل سی تھی۔ بالکل اس سناٹے کی طرح جو اس کم
مسلط تھا۔

''کک...... کچھ نہیں......'' انور کی آواز میں کرب تھا۔

''انور......'' میں نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ کہا۔ ''مجھے کچھ بتاؤ تو میرے دوست، یہ سب کیا
کو کیا ہو گیا ہے؟''

''وہ مر چکی ہے خاور......'' انور کراہا۔ ''مگر نہیں...... وہ مری نہیں۔ بلکہ میں نے اُس کا قتل کیا

کیا مطلب......؟''
میں صحیح کہہ رہا ہوں۔'' انور بڑبڑایا۔ ''میں اُس کا قاتل ہوں...... میرے ہی بدنصیب
اں خاور......
نے اُسے موت سے ہمکنار کر دیا۔''
مگر کیوں......؟''
ایک لمبی کہانی ہے خاور۔''
اور یہ دوسرا آدمی کون تھا؟''
وہ آدمی نہیں تھا۔ اور وہ لڑکی...... میری زارا نہیں تھی۔''
پھر وہ...... پھر وہ کون تھے؟'' میں جھنجلا گیا۔ ''آخر تم پہیلیوں میں کیوں باتیں کر رہے ہو؟ مجھے
رہی ہے انور۔ مجھے بتاؤ نا۔''
زارا کی رُوح تھی...... اور اُس کے ساتھ شارکر کی رُوح۔''
یا......؟''
خاور...... شارکر۔''
...... مگر یہ کون ہے؟''
زارا کا باپ۔''
کیا مطلب؟ آخر زارا کون تھی؟''
وہ میری بیوی ہے خاور......'' انور کراہا۔ ''میں نے تمہیں ہی کیا، کسی کو بھی آج تک زارا کی اصلیت
نہیں کیا۔ کیونکہ مجھ سے قسم لی گئی تھی۔ مم...... میں...... مجبور تھا۔''
زارا کہاں کی رہنے والی ہے؟''
جزیرہ ہلونا کی۔ جزیرہ ہلونا، جو بحر کرات کے بالکل بیچ میں واقع ہے۔''
تم نے زارا کے بارے میں کہا تھا کہ وہ......''
میں نے جھوٹ کہا تھا۔'' انور نے میری بات کاٹی۔
یہ ہے کیا چکر......؟''
کچھ بھی تو نہیں ہے خاور، صرف میری بدقسمتی ہے، جو میری موت کے ساتھ مل کر اپنے بھیانک
لے میری طرف آ رہی ہے...... مگر یہ مجھے موت بھی تو نہیں دیتی تا کہ ان دُکھوں کا خاتمہ ہو......
میری رُوح کو تو سکون حاصل ہو۔''
زے پر کھڑکھڑاہٹ کی آواز سن کر میں چونک پڑا...... میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے پر شامو
ے تھے۔ اپنی آنکھوں میں دو لٹکے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اُن کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ چہرے کے
لکیریں کرب اور تکلیف سے متاثر نظر آ رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔
بات ہے......؟'' میں نے اُن سے پوچھا۔
ما......؟''

"ہاں...... ہاں...... میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔" میں بڑبڑایا۔ "صرف کافی لوں گا۔ اگر آپ کو تکلیف
ہو تو کافی تیار کر دیجئے۔"

"بہتر ہے چھوٹے سرکار......" شاموکاکا مجھے چھوٹے سرکار ہی کہا کرتے تھے۔ وہ اپنے کندھے پر
انگوچھا رکھتے ہوئے پلٹ پڑے۔

میں انور کی طرف مڑا۔ انور گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

"انور......" میں نے انور کو مخاطب کیا۔

"ہوں......"

"لو...... یہ سگریٹ پیو۔"

انور نے لرزتے ہاتھوں سے میرے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکالا۔ اپنے لئے ایک سگ
منتخب کر کے میں نے لائٹر کی مدد سے انور کا سگریٹ سلگایا اور پھر اپنا...... سگریٹ کا ایک گہرا کش کھینچنے
بعد میں انور کی طرف دیکھنے لگا جو نہایت آہستگی کے ساتھ سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر اب
کرب کے تاثرات تھے اور اُس کی ایسی حالت دیکھ کر میرا دل رو رہا تھا۔

میں...... حالانکہ بیسویں صدی کی فضا میں سانس لے رہا ہوں جہاں رُوح...... بھوت پریت
ڈائنیں وغیرہ ایک مضحکہ خیز جھوٹ تصور کی جاتی ہیں۔ موجودہ تہذیب نے ہمیں ان تمام فرسودہ روایا
جھٹلانے کی تلقین کی ہے۔ مگر میں...... میرا شروع سے یہ نظریہ ہے کہ دنیا میں رُوح کا ایک وجود ہے
ایک شخص اپنا مقصدِ حیات مکمل نہ کر سکا ہو تو اس کی رُوح بھلے ہی اُس کا جسم چھوڑ دے، مگر اس وقت
اس دنیا میں بھٹکتی رہے گی جب تک اس مقصد کی تکمیل نہ ہو جائے۔ اس لئے رُوحوں کا وجود ہے۔ اور
تو میں نے اپنی آنکھوں سے زارا اور اُس کے باپ کی رُوحیں دیکھی تھیں جو عارضی طور پر انسانی ج
میں مقید ہو کر آئی تھیں، لہٰذا یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ پھر میرے سامنے میرے دو
زندگی تھی، اُس کی موجودہ حالت تھی۔ اور میرے ذہن کے تاریک گوشوں میں اُس کے ماضی کے عکس
تھے۔ ماضی کے وہ عکس اور حال کا یہ چہرہ...... دونوں میں گہرا تضاد تھا۔ وہ کوئی تو طاقت تھی جو
میرے دوست سے اُس کی جوانی چھین کر بڑھاپے کے نقوش ثبت کر دیئے تھے۔ اُس کے جسم کی
لے کر لرزہ اور کپکپاہٹ بخش دی تھی۔ اُس کے گھنگھریالے سیاہ چمکیلے بالوں کو سفید رُوئی کے گالوں
بدل دیا تھا، اُس کے چوڑے چکلے سینے کو ہڈیوں کا پنجر بنا کر رکھ دیا تھا۔ پھر بھی وہ زندگی کی ڈور کو
رہا تھا جو کھینچنے سے بڑھتی جا رہی تھی، ٹوٹ نہیں رہی تھی۔ حالانکہ وہ دل سے اس بات کا متمنی تھا کہ
ٹوٹ ہی جائے۔

میرے دل کے نرم گوشے اُس کی اس حالت سے متاثر تھے۔ کاش میں اپنی جان کی بازی لگا
اُس کے رخساروں کی سرخی واپس لا سکتا۔ مگر حالات...... حالات بھی انسان کو کتنا پیس کر رکھ دیتے
حالات اور حادثات...... گویا وقت کی چکی کے دو پاٹ ہیں جن کے درمیان انسان گیہوں کی طرح
رہ جاتا ہے۔ وقت اپنا چکر چلاتا رہتا ہے اور وہ پستا رہتا ہے۔

میرے ہونٹوں سے ایک سرد سی آہ خارج ہوگئی۔ میں اپنے دوست کو دیکھتا رہا جو سگریٹ کے ہلکے ہلکے
لیتا ہوا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا؟ وقت ہلکی سی چاپ کے ساتھ گزرتا گیا۔ میں انور کا مطالعہ کرتا رہا......
پھر چونکا اُس وقت جب شاموکاکا، کافی لے آئے تھے۔ شاموکاکا نے کافی کے پیالے ہم دونوں
ہاتھوں میں تھما دیئے اور چلے گئے۔ میں ایزی چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر تلخ کافی کی چسکیاں لینے
ماحول پر سناٹے کی ایک دبیز تہہ چھا کر رہ گئی تھی۔ ہاں، یہ سناٹا کبھی کبھی چسکیوں کی آواز سے متزلزل
ہو جاتا تھا۔

"خاور......" تھوڑی دیر بعد انور نے سکوت توڑا۔ اُس کی آواز ویسی ہی مدھم تھی جیسی رہا کرتی تھی۔
مجھے لگا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آواز سینکڑوں میل دور سے آ رہی ہو۔

"ہوں......" میں بڑبڑایا۔

"زندگی اتنی کٹھن کیوں ہوتی ہے؟" اُس کے لہجے میں یاسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ "اس لئے
زندگی ہے...... مگر......"

"ہاں انور......" میں نے اُس کی بات کاٹی۔ "زندگی شاعروں اور ادیبوں کے لئے موسمِ بہار کے
رہی ہو۔ وہ لوگ الفاظ کے حسین پیراہن سے زندگی کو حسین ثابت کرتے رہے ہوں۔ مگر زندگی
خود ہزار ہا اموات کا نام ہے۔ موت صرف ایک مرتبہ انسان کو دُکھ دیتی ہے۔ مگر زندگی لاتعداد
پھر بھی یہ حقیر سا کیڑا...... یہ انسان...... زندگی کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ یہ اشرف المخلوقات جو
میں اس زمین پر رینگنے والے کسی حقیر کیڑے سے کم نہیں۔ کم از کم میرا تجربہ یہی ثابت کرتا ہے۔"
ور کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک عود کر آئی۔ پھر وہی ویرانی۔ "میں نے زندگی کو اچھی طرح
ہے۔ میں نے اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر حسن تلاش کرنا چاہا ہے، بہاروں کو کھوجا ہے۔ مگر ہر بار
کامی ہوئی ہے۔ زندگی ہر بہار کے پیچھے ایک خزاں بھیجتی ہے۔ ہر حسن کے پیچھے ایک کریہہ منظر اور
پیچھے ایک موت...... اس کے دامن میں خواہشات کا ایک انبار سسکتا ہے اور یہ بظاہر ایک بہار کی
گرائی رہتی ہے۔ مگر بہ باطن...... ایک ناگ کی طرح ان خواہشات کو ڈستی رہتی ہے۔ یہ بسا اوقات
ایسے گناہوں کا مرتکب بناتی ہے جو اُس کی رُوح تک کو لرزا کر رکھ دیتے ہیں۔ جو اسے موت کو
پر مجبور کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ گناہ انسان وقتی جذبے کے تحت کرتا ہے۔ مگر اس کا خمیازہ اُسے
آغوش تک بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ انسان کو جانتے بوجھتے گناہ کی دلدل میں دھکیلتی ہے۔ اور پھر چیختی
چھاڑتی ہے۔ جبکہ انسان، انسانیت کی سرحد سے گزر جاتا ہے۔ گناہ کے عمیق ترین غار اسے اپنی
میں لے لیتے ہیں اور وہ حالات کی چکی میں اتنا پس جاتا ہے کہ زیست اُس کی نظروں میں موت
یادہ بھیانک ہو جاتی ہے اور وہ بے ساختہ موت کو پکار اُٹھتا ہے۔ یہ موت جو درحقیقت سکون و آرام کی
ہے، جس کی آغوش میں جا کر انسان ہر قسم کی تکلیفوں سے نجات پاتا ہے۔ اُلجھنوں، مصائب اور
وں سے چھٹکارا پاتا ہے۔ مگر یہ ذی ہوش انسان...... عقل کے بندے...... خدائی کے دعویدار،
اُڑنے والے، اس حسین سی دیوی کو...... موت کو...... برے الفاظ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ یہ

جانتے ہوئے کہ اس دلدل سے جس میں کہ وہ پھنسے ہوئے ہیں موت بدرجہا بہتر ہے۔ مگر انسان، انسا
ہی کیوں کہلائے اگر وہ باطن کو پرکھ سکتا ہو؟ اگر وہ گہرائیوں میں ڈوبنا جانتا ہو؟ اگر وہ یہ جانتا ہو
خوبصورتی اندر ہوا کرتی ہے، باہر نہیں......"

میں خاموش بیٹھا انور کو دیکھ رہا تھا۔

"تو......" انور ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "جب زندگی انسان کو گناہوں کی دلدل میں دھکیلتی ہے، وہ موت
پکار اُٹھتا ہے۔ جیسا کہ میرے ساتھ ہے۔ اتنی لمبی تقریر میں نے اسی مقصد کے تحت کی ہے کہ آج
تمہیں اپنی زندگی اور اس میں رونما ہونے والے حادثات کی بھی کارگزاری سناؤں۔ اتنی لمبی تمہید جو
نے باندھی ہے، یہ میری زندگی کا نچوڑ ہے، تجربہ..... جو جوانی کو داؤ پر لگا کر میں نے حاصل کیا
لیکن....." میں انور کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا لہجہ پُرخیال سا ہو گیا تھا۔ "نہیں...... اس وقت نہایت آرام
ساتھ تم سے باتیں کر رہا ہوں۔" وہ کہتا رہا۔ اسی مدھم سے لہجے میں۔ "زندگی ایک بھیانک راگ کی د
پر ناچ رہی ہے۔ اس ناچ اور اس ساز کی ہلکی سی دھمک میرے سانس کی آواز کی شکل میں تمہاری سماعت
سے ٹکرا رہی ہے۔ یہ بھیانک راگ چھیڑا جاتا رہے گا۔ میں موت موت پکارتا رہوں گا...... اور نجانے ک
موت کی مہربان دیوی مجھے اپنی آغوش میں لے لے گی۔ میں اس زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ ہاں،
ایک سگریٹ تو دینا یار......"

میں سر جھکائے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ دو عدد سگریٹ۔ ایک اُس کے لئے اور ایک اپنے لئے۔

"ہاں......" وہ سگریٹ کا کش لے کر بڑبڑایا۔ "تو میرے ایک گناہ نے جو نادانستگی میں مجھ سے
ہو گیا، آج میری یہ حالت بنا دی۔ وقت کے دھارے نے اس زندگی کے ساتھ سازباز کر کے مجھے گنا
ایک دلدل میں پھنسا دیا۔ ٹھہرو...... میں تمہیں شروع سے سناتا ہوں۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ یہ اس دن
سے شروع ہوئی جب میں نے شمالی ایشیا کا سفر شروع کیا تھا۔ بحری سفر...... تمہیں معلوم ہے کہ نہ میری
ہے نہ باپ، نہ کوئی قریبی رشتہ دار۔ بہرحال والد صاحب کے انتقال کے بعد اُن کی بے اندازہ دولت
میں تنہا مالک ہوں۔ چنانچہ میری اس دولت یا میری فطری عیاش طبیعت نے مجھے شمالی ایشیا کی سیاحت
اکسایا۔ یہ ساڑھے پانچ سال پہلے کا تذکرہ ہے۔ تمہیں یاد ہو گا، اُن دنوں تم بمبئی پہلی مرتبہ گئے تھے۔
نے تمہیں اپنے ساتھ سیاحت کے لئے چلنے کو کہا تھا۔ مگر تم اپنی نورین کو چھوڑ کر ایک روز کے لئے بھی کہ
باہر نہیں جا سکتے تھے۔ لہٰذا میں اکیلا ہی چلا گیا۔ یاد ہے نا تمہیں؟"

"ہاں......" میں اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔

"تو......" وہ اپنا نحیف ہاتھ ہلا کر بولا۔ "بس، میری موجودہ بدنصیبی کی داستان وہیں سے شروع
ہے۔ بب...... بچاؤ......" اچانک انور دروازے کی طرف دیکھ کر چیخ پڑا۔ میں نے جھپٹ کر درواز
طرف دیکھا۔ اُف...... کیا آپ یقین کر سکیں گے؟ دروازے پر زارا کھڑی تھی...... کافی کی ٹرے لئے
اس وقت اُس کا منہ خون کی آمیزش سے لال نہیں ہو رہا تھا۔ نہ ہی وہ سفید کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ بلکہ
وقت اُس کے جسم پر خوبصورت ہلکے نیلے رنگ کا ایک سلیپنگ گاؤن تھا۔ کانوں میں آویزے لٹک ر

گلے میں خوبصورت ہار، بالوں کی چند شوخ لٹیں سنہری رنگ کی اس کشادہ پیشانی پر جھول رہی تھیں۔
مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں...... آنکھوں میں دو آنسو۔

خاور بھیا......" وہ آگے بڑھی۔ اُس کی آواز...... ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اس کمرے میں موسیقی بکھر
"سفر میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟ اور ہاں...... یہ آپ اتنے سال بعد آئے ہیں......"

ں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یاد آیا، یہ وہی لباس تھا جو زارا اُس رات پہنے ہوئے تھی جس کی صبح کو
ی جانا تھا۔ جب میں ان دونوں کی شادی میں شرکت کی غرض سے آیا تھا، ایک ہفتہ تک ان کے
ہا تھا۔ زارا نے ٹرے میز پر رکھ دی۔

نکل جاؤ......" انور حلق پھاڑ کر چیخا۔ میں نے دیکھا زارا، میری پیاری خوبصورت اور بہت اچھی سی
ی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے...... گویا باہر نکلنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہوں۔ ہونٹوں کی
کپکپا رہی تھیں۔

انور......" زارا دھیرے سے بڑبڑائی۔

نکل جاؤ......" انور پھر چلایا۔

ر...... زارا ہماری نظروں کے سامنے سے غائب ہو چکی تھی۔ ہاں، کمرے میں اب تک سسکیوں کی
ونج رہی تھی۔ اور وہ آواز...... میں اسے لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز زارا کی تھی۔ پھر وہ آواز
ندوم ہوتی چلی گئی...... انور کے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

یہ مجھے نت نئے بھیس بدل کر تنگ کرتی ہے خاور......" انور روہانسا سا ہو گیا۔ "اس نے میری زندگی
کے رکھ دی ہے......"

ں مبہوت سا انور کی کمر تھپتھپا رہا تھا۔ میز پر کافی کی ٹرے اسی طرح رکھی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد انور
ے اپنی کہانی سنانی شروع کر دی۔

وہ سفر......" انور ہاتھ اُٹھا کر بڑبڑایا۔ "اُف...... ہمارا جہاز سمندر کی سطح پر پھسل رہا تھا۔ پھر ایک دن
سا آ گیا۔" انور اپنا ماضی سنا رہا تھا......

ہاز سمندر کی ساکن سطح پر پھسل رہا تھا...... انور جہاز کے عرشے پر کھڑا ریک کا سہارا لے کر گرد و پیش
زہ لے رہا تھا۔ آسمان پر چودھویں کا چاند جگمگا رہا تھا اور اس کی روشنی کی مہربان کرنیں سمندر کی ساکن
پھیل رہی تھیں۔ دُور دُور تک خاموشی تھی۔ ہاں جہاز کے چاروں طرف ٹکرانے والی موجیں، کچھ شریر
ایک کیف انگیز موسیقی کو جنم دے رہی تھیں جو رات کے سناٹے سے ہم آہنگ ہو کر روحانی کیفیات کو
ے رہی تھی۔

چانک انور نے اپنے شانے پر کسی مضبوط ہاتھ کا بوجھ محسوس کیا۔ انور پلٹ پڑا۔ اُس کے سامنے ایلس
تھا۔ ایک سیاح، جس کا کیبن انور کے کیبن کے بالکل نزدیک تھا۔ ایلس پرتگالی تھا۔ اُس کے چہرے
عجیب سے نقوش تھے۔ کسی پہلو سے وہ پرتگالی نظر آتا تھا، کسی پہلو سے ہندوستانی۔ اور چہرے کے
دوخال اطالوی جھلکیاں پیش کرتے تھے۔ وجہ شاید یہ رہی ہو کہ وہ صرف نام کا پرتگالی تھا۔ اُس کی

زندگی کا بیشتر حصہ سیاحت کی نذر ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے ملکوں کا سفر کیا تھا وہ فخریہ کہا کرتا تھا کہ اس کی پاؤ زندگی سمندر کی سطح پر گزری ہے۔ وہ ہر بات کہنے کے بعد ایک قہقہہ لگاتا جاندار قہقہہ، جس میں زندگی کی تمام تر کھنک موجود ہوتی۔ انور کے لئے وہ ایک اچھا ساتھی ثابت ہوا تھا کے دوران ہی انور کی اور اُس کی دوستی ہوئی تھی۔ پھر وہ لوگ وقت کا بیشتر حصہ ایک ساتھ گزارنے لگے۔ ایلس شراب نوشی کا دیوانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی آنکھیں ہمیشہ سرخ رہتیں۔ سرخی تو اُس کی آنکھوں میں رچ بس گئی تھی۔ اُس کی اوپر کی طرف اُٹھی ہوئی مونچھیں اُس کے چہرے پر شاندار اضافہ تھیں۔ چہرہ بھرا بھرا تھا، ناک ہونٹوں کی طرف خفیف سی جھکی ہوئی تھی۔ قد لمبا تھا اور جسم کے اعضاء مضبوط۔

”کہو ماسٹر.....“ ایلس گنگنایا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”دیکھ رہا ہوں ایلس.....“ انور کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ”اس وقت سمندر کی لہریں کتنی شانت ہیں۔ کتنی مہربان..... چاند کی روشنی کتنے خوبصورت طریقے سے ان لہروں پر پھسل رہی ہے اٹک رہی ہے..... پھر پھسل رہی ہے۔“

”ماسٹر.....“ ایلس نے ایک قہقہہ کے دوران کہا۔ وہ انور کو ماسٹر ہی کہا کرتا تھا۔ ”یہ لہریں، یہ چاند رات..... یہ سفر اس وقت اور بھی زیادہ حسین ہو جائے گا جب تم میری جیب میں رکھی ہوئی ایک شیشی اپنے ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دو گے۔“ ایلس نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک شیشی نکالی۔ وہ ہر وقت اپنی پتلون اور کوٹ وغیرہ کی جیبوں میں شراب کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھا کرتا تھا۔ جہاں اُس کا دم اکھڑتا تھا، وہ ان شیشیوں کی مدد سے اس کو پھر دوامی حیثیت دے دیتا۔

”نہ.....“ انور بڑبڑایا۔ ”ابھی تو میں نے پی ہے۔“

”چھوڑو ماسٹر.....“ ایلس نے قہقہہ لگایا۔ ”شراب ہر وقت جائز ہے۔ اور جتنی پی جائے کم ہے لو..... زندگی بہت مختصر ہے ماسٹر۔ اور خوشی اس سے بھی زیادہ مختصر..... کیا خبر ہم اگلی صبح نہ دیکھ سکیں۔“

”ایسا نہ کہو ایلس.....“ انور جلدی سے بولا۔ ”مجھے ان باتوں سے ڈر لگتا ہے۔“

”بہت ڈرپوک ہو ماسٹر تم۔“ ایلس نے قہقہہ لگایا۔ ”لو..... تمہارا یہ ڈر فوراً ہی ختم ہو جائے گا جب میرے وطن، میرے عزیز وطن پرتگال کی شراب کی شیشی کو خالی کر دو گے۔ لو..... اور ہاں ماسٹر، آج فرانسیسی لڑکی، ارے وہی کیتھرائن تمہیں بہت دیکھ رہی تھی۔“

”اوہ، نہیں ایلس.....“ انور کے لہجے میں شرم کی آمیزش تھی۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”ایلس کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتا ماسٹر۔“ ایلس مسکرایا۔ ”ایلس کی آنکھیں حال کو پھلانگ کر مستقبل پر مرکوز ہو جایا کرتی ہیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں وہ لڑکی تم میں بہت دلچسپی لے رہی ہے۔ پھر ماسٹر مشرقی ہو۔ میں سمجھتا ہوں مشرق کی ہر چیز حسین ہے۔ مشرق خوابوں کی سرزمین ہے ماسٹر، وہاں کی ہر پراسرار ہے۔ حتیٰ کہ تم بھی ماسٹر... یہ مغربی لڑکیاں مغرب میں رہ کر بھی مشرق کے خواب دیکھتی ہیں۔ میری آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے ماسٹر۔ میں..... میں خود مشرق کا دیوانہ ہوں ماسٹر۔ مشرق، اُف.....“

انور نے دیکھا، ہلکی سی روشنی میں ایلس اپنے ہاتھ مسل رہا تھا۔ انور نے شیشی کا، کاک کھولا اور پھر

شراب غٹاغٹ پی گیا۔ شیشی خالی کرنے کے بعد اُس نے شیشی سمندر میں اُچھال دی۔ ہلکے ہلکے اُچھلنے والی لہروں نے شیشی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ انور نے رومال سے اپنے ہونٹ صاف کئے اور سگریٹ سلگانے لگا۔ ایلس نے اس دوران میں ایک خالی شیشی سمندر میں پھینک دینے کے بعد اپنے ہونٹوں میں سگار کا ایک گوشہ دبا لیا تھا۔ انور نے اپنی سگریٹ اور ایلس کا سگار جلایا۔ دُھوئیں کی لہریں ان کے چہروں کے گرد بل کھانے لگیں۔

”چلو ماسٹر.....“ ایلس نے کہا۔ ”سونے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“

”آج نہ جانے کیوں نیند نہیں آ رہی ایلس۔“

ایلس نے قہقہہ لگایا۔ ”کہیں کیتھرائن کی یاد تو نہیں ستا رہی؟“

”اوہ نہیں ایلس..... آج نجانے کیوں میرا دل اُداس اُداس سا ہے۔“

”دوسری شیشی دُوں؟“ ایلس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ اپنی تمام جائیداد انور کو بخش رہا ہے۔ انور کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

اچانک انور اُچھل پڑا..... لائٹ ہاؤس کی روشنی کے پیچھے اُس نے دیکھا۔ اُس جگہ متعدد چراغ روشن تھے۔ ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے وہ چراغ سمندر کی سطح پر تیر رہے ہیں.....

”وہ کیا ہے.....؟“ انور کی اُنگلی اُن چراغوں کی طرف اُٹھ گئی۔

”وہ.....“ اچانک ایلس کی بھنوئیں تن گئیں۔ ”وہ ایک آزاد جزیرہ ہے ماسٹر، جو کسی بھی ملک سے وابستہ نہیں ہونا چاہتا۔“

”مگر.....“

”اوہ نو..... اس کا تذکرہ چھوڑو ماسٹر۔ وہاں نو وارد کے لئے موت ہے۔ موت وہاں چیختی چنگھاڑتی پھرتی ہے۔ وہ لوگ اپنی زمین پر کسی غیر شخص کا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔“

”اس جزیرے کا نام کیا ہے؟“

”جزیرہ ہلونا.....“ ایلس بڑبڑایا۔ ”وہاں کی روایات عجیب ہیں۔ وہ لوگ ہندوستانی بولتے ہیں مگر اپنے آپ کو ہندوستانی نہیں کہتے۔ وہ کسی غیر شخص کو اپنے جزیرے میں نہیں آنے دیتے۔“

”کمال ہے.....“

”کمال نہیں ماسٹر، حیرت انگیز۔“ ایلس بڑبڑایا۔ اُس کے لہجے میں اضطراب کی جھلکیاں تھیں، بے زاری کے متعدد نقوش اُس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ تیزی سے اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ اُس نے ایک شیشی نکالی اور غٹاغٹ پی گیا۔ شیشی سمندر میں پھینکنے کے بعد وہ بڑبڑایا۔ ”میری دیرینہ خواہش ہے ماسٹر کہ میں اس جزیرے کی سیر کروں۔ مگر وہاں کا قانون..... اُف..... کمبخت موت وہاں ہر وقت منڈلاتی رہتی ہے۔ وہ روحوں کا جزیرہ ہے ماسٹر..... وہاں کی ہر چیز پراسرار ہے۔ وہاں زندگی اتنی سستی ہے ماسٹر کہ مت پوچھو۔ وہاں میں نے سنا ہے کہ دشمنی نسل در نسل چلتی ہے..... خاندان کے خاندان ذرا سی بات پر تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔ بس یوں سمجھو کہ وہاں طاقت کا راج ہے۔ جس کے گھونسہ میں جان

ہے، جس کی چھاتی چکنی ہے، جس کی چھاتی پر بال ہیں وہ وہاں راج کر سکتا ہے، وگرنہ موت...... چنگھاڑتی موت انسان کو بہت جلد اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ وہ لوگ روحوں کے دیوتا کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کا دیوتا لافانی قوتوں کا مالک ہے۔ اس کی مہربانی ایک اٹل حقیقت ہے۔ اور اس شراب خود اپنی جگہ ایک مضبوط ستون۔'' ایلس بڑبڑائے جا رہا تھا۔ شاید پرتگالی شراب غیر معمولی طور اُس کے اعصاب پر اثر انداز ہو چکی تھی۔

انور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان جلتے ہوئے چراغوں کو دیکھ رہا تھا جو بادی النظر میں سسک رہے تھے لرز رہے تھے۔ ایلس نے ریلنگ کا سہارا لے لیا تھا۔ شاید وہ نشہ کی زیادتی کی وجہ سے نڈھال سا ہو گیا تھا

''آؤ ماسٹر......'' ایلس تھوڑی دیر بعد بڑبڑایا۔ ''اب چل کر سوئیں۔''

''چلو......'' انور اپنے کیبن کی طرف بڑھا۔ ایلس کو اُس کے کیبن کے دروازے پر چھوڑ کر انور اپنے کیبن میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر وہ لیٹا نیند کو لانے کی ناکام سعی کرتا رہا۔ کافی دیر گزر گئی اور وہ سو نہ سکا آخر کار تھک ہار کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کیبن سے باہر نکل آنے کے بعد وہ اپنے کیبن کے سامنے ہی ٹہلنے لگا اُس نے سگریٹ سلگایا اور اُس کی نگاہیں رینگتی ہوئی اُس کیبن پر مرکوز ہو گئیں جس میں کیتھرائن تھی۔

''ہیلو......'' کیتھرائن اُس کی طرف بڑھتی ہوئی سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ''آپ سوئے نہیں ابھی تک؟''

''نیند نہیں آ رہی۔'' انور مسکرایا۔

''کیوں......؟'' کیتھرائن کی آنکھوں میں چمک تھی، چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس کے فرانسیسی خدوخال اُبھرے نقوش بہت اچھے لگ رہے تھے۔

''رات حسین ہے۔'' انور سرگوشیانہ انداز میں بولتا ہوا مسکرایا۔ ''اور میں سو کر اس رات کو اکارت نہیں کرنا چاہتا۔''

''اوہ، یونانی بوائے......'' کیتھرائن مسکرائی۔

''آیئے......'' انور مسکرایا۔ ''عرشے پر چلتے ہیں۔''

''نہیں......'' کیتھرائن کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔ ''وہاں نہیں۔ آیئے، میرے کیبن میں آ جایئے وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''جیسا آپ کا حکم۔'' انور مسکرایا۔ اُس نے کیتھرائن کا ہاتھ تھام لیا اور وہ دونوں کیبن کی طرف بڑھے۔ انور بیسویں صدی کا نوجوان تھا۔ وہ کسی روایتی فلم یا کسی سستے سے ناول کا ہیرو نہیں تھا۔ کسی بھی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر اُس کے دل کے نرم گوشے کپکپانے لگتے تھے اور وہ اس لڑکی کے حصول کے لئے آخری حد تک کوشش کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ پُرکشش تھا اور اعضاء مضبوط تھے۔ نہ صرف باہر بلکہ ہندوستان ہی میں بیشتر لڑکیاں اُس کی دوستی کی متمنی رہتیں۔ وہ اُن سے دوستی کرتا مگر ایک محدود مدت تک کے لئے۔ اُس نے زندگی کی ان گنت راتیں لاتعداد لڑکیوں کے ساتھ گزاری تھیں، پھر بھی وہ کنوارہ تھا۔ کیتھرائن کو دیکھ کر بھی اُس کے دل کے نرم گوشے کپکپائے تھے۔ اور اس وقت کیتھرائن کا ہاتھ پکڑنے کے بعد جیسے اُس کے جسم میں کوئی برقی رو کوند کر رہ گئی تھی۔

''لو......'' کیتھرائن نے ایک پیگ لبریز کر کے اُسے دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے پیو اور سو جاؤ۔''

''اور تم......؟''

''نہیں...... میں نہیں لوں گی۔''

''پھر میں بھی نہیں پیتا۔''

''اچھا بابا، تم بہت ضدی ہو۔'' کیتھرائن ہولے سے مسکرائی۔ ''لو، میں بھی تھوڑی سی لے لیتی ہوں۔'' کیتھرائن نے اپنے لئے دوسرا پیگ لبریز کیا۔ انور اس اثناء میں لیٹ چکا تھا۔ اُس کی سنہری زلفیں اُس کے شانوں پر لہرا رہی تھیں اور وہ اُس کی زلفوں سے کھیل رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ اُس پر جھک کر بڑبڑائی۔

''زلفِ پریشاں کو۔''

''شاعری بھی کر لیتے ہو؟''

''ہوں...... کبھی کبھی۔''

''کب......؟''

''جب کوئی حسینہ دل کے بہت قریب ہو۔''

''ایسا بار بار ہوتا ہے کیا؟''

''اُوں ہوں......''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔''

انور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''میں سمجھتا تھا کہ صرف مشرقی لڑکیاں شکی ہوتی ہیں۔ مگر معلوم ہوا کہ......''

''باتیں بہت بنانا آتی ہیں۔'' کیتھرائن نے اُس کی بات کاٹی۔

''تم سے ہی سیکھی ہیں۔'' انور نے کیتھرائن کی ایک پریشان زلف کو اپنی اُنگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

''اور ہم پر ہی آزما رہے ہو۔''

''دل مجبور کر رہا ہے۔''

''دل سے کہو وہ مجبور نہ کرے۔''

''بہت کہا، مگر کمبخت مانے جبھی نا۔''

''باتوں میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔''

''اور اگر میں یہ کہوں کہ دل چرانے میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا تو غلط نہ ہو گا۔''

''اوفوہ...... اب خاموش۔'' کیتھرائن نے بھولپن کے ساتھ اُنگلی اپنے پتلے خوبصورت ہونٹوں پر رکھ کر کہا۔ ''وہ ایلس شاید جاگتا ہے۔''

''تو کیا ہے...... وہ ادھر نہیں آئے گا۔''

''مگر......''

"ششش......اب کچھ مت بولو۔" انور نے تیزی سے اُسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اُس کا دماغ نشے کی زیادتی کی وجہ سے سن سا ہو گیا تھا......

مگر تھوڑی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ نیند اور نشہ سے بوجھل سی آنکھیں، سن دماغ ایک لمحے کے لئے بیکار سا ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ جہاز ڈول رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک شور سا مچ گیا تھا۔ انور بوکھلا کر باہر نکلا۔ جہاز کے عملے کا ایک آدمی کیبنوں کے باہر کھڑا تھا اور اسے چاروں طرف سے مسافروں نے گھیر رکھا تھا۔

"یہ طوفان بالکل غیر متوقع ہے......" وہ ہاتھ اُٹھا کر کہہ رہا تھا۔ "ہم خواب میں بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ طوفان آئے گا۔"

انور بھونچکا سا کھڑا اُس آدمی کو گھور رہا تھا۔

"کچھ کریے......" متعدد آوازیں اُبھریں۔

"ہم لوگ پوری کوشش کر رہے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

انور کی نگاہیں عرشہ پر سے رینگتی ہوئی سمندر کی لہروں پر مرکوز ہو گئیں۔ سمندر میں گویا بھونچال سا آ گیا تھا۔ بڑی بڑی لہریں اُچھل کر جہاز کے عرشہ کی دیوار سے ٹکرا رہی تھیں اور جہاز ڈول رہا تھا۔

"ہم میں ضرور کوئی گنہگار ہے۔" ایک وہی آدمی بڑبڑایا۔ "تبھی تو اس غیر متوقع طوفان کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔"

انور جھپٹ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ "مَے بی......" ایلس انور کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔

انور لرز کر رہ گیا۔

طوفان اب تیزی اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کتنا ہی پانی جہاز میں بھر گیا...... بے چین لہریں اُچھل اُچھل کر جہاز میں پناہ لے رہی تھیں۔ پھر جہاز نیچے ڈوبنے لگا...... عملے کے آدمی تیزی کے ساتھ مسافروں کو کشتیاں سپلائی کر رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت اپنے بوڑھے خاوند کے ساتھ لگی سسک رہی تھی۔ انور اتنا بوکھلا گیا کہ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اچانک اُس نے اپنے شانے پر ایک ہاتھ محسوس کیا...... بھاری ہاتھ......

"ماسٹر......" ایلس اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "چلو، میں ایک سپاٹ کشتی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ گہری کشتیوں میں ڈوبنے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔"

"مم...... مگر......"

"چلو ماسٹر۔" ایلس نے اُسے گھسیٹا۔ "کشتی سپاٹ تو مل گئی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے وہ بھی ڈوب جائے۔"

ایلس کشتی کو سمندر میں دھکیل رہا تھا۔ "تم نے سنا تھا؟" ایلس بڑبڑایا۔ "ایک آدمی کہہ رہا تھا، ضرور ہم میں کوئی گنہگار ہے۔"

"آں...... ہاں......"

"چلو ماسٹر۔" ایلس بڑبڑایا۔ "پھر بھی میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"کیا مطلب......؟"

"بے کار کی باتوں میں وقت ضائع نہ کرو ماسٹر۔" ایلس جلدی سے بولا۔ "آؤ، سمندر کی یہ بے چین
تمہارے چہرے پر لگے لپ اسٹک کے ہلکے دھبوں کو دھو سکتی ہیں۔"

انور بالکل گم صم تھا...... ایلس نے اُسے کشتی میں گھسیٹ لیا۔ ایلس کے ہاتھ میں پتوار تھے اور چہرے پر ایک پن۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ ہونٹوں کے درمیان سگار سختی سے بھنچا ہوا تھا۔ جسم پر ایک قمیض تھی اور پتلون جس کے پائنچے اُوپر کی طرف مُڑے ہوئے تھے۔ انور کے جسم پر صرف سلیپنگ سوٹ تھا اور ے پر گھبراہٹ۔ ایلس وحشیانہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا۔ کشتی لہروں کے ساتھ کبھی اوپر جا رہی تھی اور کبھی

"آہا...... ہا...... ہا......" ایلس قہقہوں کے درمیان بولا۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا ماسٹر، زندگی بہت ہوتی ہے۔ اور خوشی اس سے بھی زیادہ مختصر۔ کہو، کیتھرائن کیسی ہے؟"

"ایلس......" انور کا لہجہ لرزیدہ تھا۔

"لو، پرتگالی شراب پیو۔" ایلس نے ایک پتوار اپنی بغل میں دبا کر اپنی جیب سے ایک شیشی نکالی، انور کی طرف پھینک کر اُس نے دوسری شیشی نکالی۔ پھر اپنے منہ میں لگا ہوا سگار پانی میں پھینک دیا لئے کے سے انداز میں۔ ایک ہاتھ سے اُس نے شیشی اپنے ہونٹوں کو لگا لی اور پھر اُسے بھی پھینک دیا دار تھام لی۔

"آہا...... ہا......" وہ قہقہوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔ "ماسٹر...... آہا...... ہا...... زندگی بہت مختصر ہے۔ ٹی مختصر ترین۔ آہا...... ہا...... ہا...... ماسٹر، لپ اسٹک کے دھبے دھو ڈالو۔ دیکھو، یہ بے چین لہریں ے رخساروں سے کھیل رہی ہیں ماسٹر۔ آہا...... ہا...... ہا......"

انور اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ پرتگالی شراب کی شیشی اُس کی مٹھی کے اندر سختی سے بھنچی ہوئی تھی ل کی سماعت سے ایلس کے قہقہے ٹکرا رہے تھے۔ پھر...... اُس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا......!

❁❁❁

کشتی ہچکولے کھا رہی تھی...... انور ریت کے ایک تودے میں دھنسا ہوا تھا۔ اُس کا نچلا دھڑ ریت م
مدفون تھا۔ چہرے پر نقاہت تھی، ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سمندر کی لہریں بار بار اس تودے سے ٹکرا کر ر
کو گیلا کر جاتیں اور صرف ایک لمحے کے لئے انور کو ٹھنڈک نصیب ہو جاتی......

اپنے سر پر ایک بھیانک آواز سن کر اُس نے اپنا سر اوپر اُٹھانے کی کوشش کی۔ سر تو کجا آنکھوں کو گر
دینے میں اُسے تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اوپر دیکھنے میں صدیاں بیت جائیں گ
اُس نے اپنا نقاہت زدہ چہرہ بمشکل تمام اوپر کی طرف اُٹھایا۔ ایک گدھ اُس کے سر پر چکرا رہا تھا۔ ا
نے اپنے نقاہت زدہ ہاتھ سے گدھ کو جھٹک دیا۔ گدھ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ اُڑ گیا۔

وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا...... بہ دقت تمام وہ اپنے اس فعل میں کامیاب ہو سکا۔ اُس سے کھڑا نہ
ہوا جا رہا تھا۔ مگر وہ برابر کوشش کئے جا رہا تھا۔ اُس کا پورا بدن کانپ رہا تھا اور وہ اپنے جسم کو آگے کی طر
دھکیل رہا تھا۔ گدھ اب تک پرواز کر رہا تھا مگر اُس سے ذرا دُور ہٹ کر۔

اُس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور آگے کی طرف گھسٹنے لگا۔ گدھ اب تک چنگھاڑ رہا تھا...... وہاں مو
چیختی چنگھاڑتی پھرتی ہے...... ایلس کا یہ جملہ تیزی سے اُس کے ذہن میں گونج کر رہ گیا اور وہ متو
نگاہوں کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نو وارد کے لئے موت ہے...... ایلس کا ایک اور جملہ غیر شعوری ط
پر اُس کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سورج کی کرنیں اُس پر ترچھی پڑ رہی تھیں
اُس کے چہرے پر وحشت تھی۔ زبان سوکھ کر چمڑا ہو گئی تھی۔ پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ گھٹنے نقا
کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔ اُس کی حالت بالکل وحشیوں کی سی ہو گئی تھی۔ وہ سمندر کے کنارے
طرف جھپٹا۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھکا پانی پی رہا تھا...... پانی کی لکیر گویا اُس کے معدے کو چیرتی ہوئی
گئی۔ وہ کھڑا ہو گیا...... اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ بے شمار زرد گنجان دائرے اُس کی آنکھوں کے سا
تیزی سے رقص کرنے لگے اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

پھر اُس نے اپنے گیلے ہاتھ سلیپنگ سوٹ کی شرٹ سے پونچھ لئے اور آگے کی طرف بڑھا۔ اُس
قدم بار بار ریتلے فرش میں دھنسے جا رہے تھے۔ وہ بڑھتا، آگے کی طرف...... اور آگے کی طرف......
اپنے سامنے کھجور کے درختوں کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ وحشیا
انداز میں کھجور کے درختوں کی طرف جھپٹا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ کسی ایسے بھوکے آدمی کی طرح کھجوریں نگ
رہا تھا جیسے شاید زندگی میں کبھی کھانا نصیب نہ ہوا ہو۔

کھجوروں سے اچھی طرح سیر ہو کر اُس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کی زبان تیزی کے ساتھ
کے ہونٹوں پر پھسلنے لگی۔ اُس کا دماغ سن ہوتا جا رہا تھا۔ اتنی تھکن اور بھوک کے بعد کھجوروں نے
اتنا مخمور بنا دیا تھا کہ شاید پرتگالی شراب کے کئی ڈرم بھی اسے اتنا مخمور نہ بنا سکتے۔ مگر اس خمار کے
ساتھ اُس کے سر میں درد کی ہلکی سی دھمک بھی تھی۔ اور اُس کا معدہ اور جسم نکوٹین کی متوقع مقدار کی
ئش کر رہا تھا، نکوٹین جو سگریٹ کا لازمی جزو ہوتی ہے، جو معدے اور جسم کو اپنا عادی بنا ڈالتی ہے۔
سگریٹ کی طلب بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک غیر اضطراری حرکت تھی جس کے تحت وہ
کے ساتھ اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ پھر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں...... اُس کی ایک جیب سے
یٹ کیس کا ایک ہک اٹکا رہ گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سگریٹ کیس سمندر کی لہروں کی نذر نہ ہو سکا،
اُس کے پاکٹ میں اُلجھا رہ گیا۔

اُس نے تیزی سے سگریٹ کیس باہر نکالا۔ چار سگریٹیں اس میں تھیں جو ہلکی ہلکی نم ہو چکی تھیں۔
یٹ کیس سے اٹیچ لائٹر بالکل ناکارہ ہو چکا تھا۔ پٹرول کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ لائٹر کا پتھر پگھل چکا
سگریٹ سلگانا ناممکن تھا۔ اُس کی بے چین نگاہیں گرد و پیش کا طواف کرنے لگیں۔ پھر ایک کھجور کے
ت کے تنے کے پاس پڑے کچھ پتھروں کو دیکھ کر وہ اُچھل پڑا۔ اُس نے جھپٹ کر وحشیانہ انداز میں وہ
اُٹھا لئے۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح ان پتھروں کو رگڑ رہا تھا
نتیجہ خاطر خواہ ثابت ہوا۔ کافی دیر کی کوشش کے بعد وہ سگریٹ سلگانے میں کامیاب ہو گیا۔ سگریٹ
ں کو ریت میں دبا کر وہ کھجور کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا اور سگریٹ کے گہرے
ے کش کھینچنے لگا۔ سگریٹ کا ہر کش اُس کے دماغ کو نہ صرف سن کر رہا تھا بلکہ بوجھل بھی بنا رہا تھا۔ اُس
سم کا ہر عضو سن ہو رہا تھا۔ وہ آرام کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔
پھر سگریٹ کا آخری کش لے کر اُس نے سگریٹ اُچھال دی اور اُس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ
کا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ پر بندھی ہوئی رِسٹ واچ دن کے گیارہ بجا رہی تھی۔
پھر جب اُس کی آنکھ کھلی تو سورج دُور مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ اُفق پر لالی تھی۔ قوسِ قزح کے
ن رنگ لہریئے بن رہے تھے۔ درخت کے تنے سے پشت لگائے انور اُفق میں قوس قزح کے بکھرتے
ے رنگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اُنہی پتھروں کی مدد سے
یٹ سلگا رہا تھا۔
سگریٹ کا ایک گہرا کش کھینچ کر وہ خلاء میں تکنے لگا۔ پھر وہ اپنے بائیں ہاتھ پر بندھی ہوئی رِسٹ واچ
طرف دیکھنے لگا۔ چھ بج چکے تھے۔ اُس کی واٹر پروف اور شاک پروٹ رِسٹ واچ جس میں ہندسوں
جگہ نگینے جڑے تھے، بالکل محفوظ تھی۔ اور پابندی کے ساتھ وقت دے رہی تھی۔
اچانک وہ چیخ پڑا۔ وہ ایک چیخ ہی کی آواز تھی۔
"بچاؤ......" کوئی نسوانی چیخ پھر اُبھری۔ وہ اُچھل پڑا۔ پھر اُس نے دیکھا سمندر کی سطح پر دو نازک
اُبھرے ہوئے مچل رہے تھے جیسے مدد کے لئے کسی کو بلا رہے ہوں۔ انور تیر کی سی تیزی کے ساتھ

کنارے کی طرف لپکا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر اُس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ڈوبتی ہوئی لڑکی کے
دونوں ہاتھ اور سنہری زلفیں سمندر کی سطح پر اُبھری ہوئی تھیں۔ لڑکی اب تک متواتر چیخے جا رہی تھی۔

انور تیرتا ہوا لڑکی کے نزدیک پہنچ رہا تھا۔ لڑکی کے نزدیک پہنچ کر انور نے اُس کے بال اپنی مٹھی میں
جکڑ لئے۔ اب وہ کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ لڑکی پوری اُس کے جسم پر آ رہی۔ انور ایک مرتبہ
ڈوبتے ڈوبتے بچا، لیکن اس پانی میں بھی انور کے جسم میں گویا برقی رو دوڑ گئی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اُس
نے لڑکی کو علیحدہ کیا۔ لڑکی نے اُس کی شرٹ کا کالر پکڑ لیا۔ بہ دقت تمام وہ کنارے تک پہنچ سکا۔

لڑکی کو کنارے پر ڈال دینے کے بعد وہ مبہوت سا اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے اپنی زندگی میں لاتعداد
لڑکیوں کو دیکھا تھا مگر یہ حسن...... وہ مبہوت سا کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ لڑکی گہری گہری سانسیں لے رہی
تھی۔ اُس کا جسم صحت مند تھا۔

انور محوِ حیرت بنا اُسے تک رہا تھا۔ وہ اب تک اُس لڑکی پر جھکا ہوا تھا۔ لڑکی کا رنگ گورا تھا، بال
سنہری، ناک ستواں، دہانہ مختصر۔ اور پھر اس پر رُخساروں کا اُبھار۔ وہ حیرت انگیز حد تک دلکش تھی۔ لبوں
کے نیچے ٹھوڑی پر ایک تل تھا ہلکے کالے رنگ کا۔ جیسے چاند کے چہرے پر ہلکا سا انمٹ داغ۔ گردن صراحی
کی مانند جو شراب سے لبریز ہو۔ گردن کی جلد سے خون جھلک رہا تھا۔ انور ہانپتا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر
اُس نے اُسے ٹھیک کیا۔ اُس کے عریاں سینے کو ڈھکا۔

اچانک وہ اُچھل پڑا۔ اپنی پشت پر اُسے چبھن سی محسوس ہوئی۔

"جمال تمہارا مشکور ہے......" اُس نے سنا۔ وہ جھپٹ کر پلٹا۔ کئی آدمی اُس کی طرف بھالے تانے
کھڑے تھے۔ اُن لوگوں کے چہروں پر کھریا اور گیرو سے بنے ہوئے نقش تھے۔ سر پر پتوں کی ٹوپیاں
تھیں۔ جسم پر کھالیں تھیں۔

"تم نے جزیرے کی شہزادی زارا کی جان بچائی۔" ایک قدرے خوبصورت اور صحت مند آدمی انور
سے مخاطب ہوا۔ "اس کے لئے جمال تمہارا مشکور ہے۔" انور نے دیکھا، دوسرے آدمیوں کے برخلاف
جمال کا رنگ گورا تھا، اعضاء مضبوط تھے، چہرہ کافی حد تک دلکش تھا، آنکھیں سرخ تھیں۔ لہجے میں شائستگی
لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ غراہٹ آمیز تھا۔

انور صورت حال سے بے پرواہ زارا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ زارا جو اُس کے قدموں میں پڑی تھی۔
جس کی جان اُس نے بچائی تھی۔ جو جزیرے کی شہزادی تھی۔

زارا...... اُس نے سوچا۔ کتنا حسین نام ہے۔ اس کے وجود کی طرح...... شاید وہ زارا ہی تھی جس نے
اُس کو اتنا متاثر کیا تھا جتنا آج تک کوئی لڑکی اُسے نہ کر سکی تھی۔ زارا کو دیکھ دیکھ کر بے ساختہ اُس کا دل پکار
رہا تھا کہ ساری زندگی زارا کی آغوش میں گزار دے۔ لیکن جمال کہہ رہا تھا۔

"تم فی الحال ہمارے قیدی ہو۔"

"لل...... لیکن......" انور ہکلایا۔

"بے فکر رہو دوست۔" جمال نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں اس جزیرے کے قوانین

ہوں۔ ہم اور ہمارا قانون کسی غیر شخص کو برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر پھر بھی میں تمہارے لئے کوشش
ں گا صرف اس لئے کہ جزیرہ تمہارا احسان مند ہے۔ تم نے جزیرہ پر احسان کیا ہے۔"

انور خاموش کھڑا رہا۔

"شہزادی کو اُٹھاؤ۔" جمال نے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ دو آدمی آگے بڑھ کر زارا کو اُٹھانے لگے۔ زارا کو
ش آ چکا تھا۔ دونوں آدمیوں نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی، مگر وہ جھپٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"شہزادی صاحبہ......" جمال خفیف سا جھکا۔ "اب آپ کیسی ہیں؟"

"م...... میں ٹھیک ہوں۔" زارا کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

"اس نوجوان نے آپ کی جان بچائی۔" جمال، انور کی طرف اشارہ کر کے زارا سے مخاطب ہوا۔ زارا
ں لمحے کے لئے انور پر نظر ڈالی، پھر انور کو دیکھتی ہی رہ گئی۔

"شکریہ......" زارا ہولے سے بڑبڑائی۔ انور کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

"کوئی بات نہیں۔" انور مسکرایا۔ "یہ میرا فرض تھا۔"

"آپ کا نام؟" زارا کے لہجے میں شہزادیوں کی سی شان تھی۔

"انور۔"

"آپ نو وارد ہیں؟"

"جی ہاں...... میرا جہاز طوفان کی نذر ہو گیا۔ زندگی تھی جو لہروں نے مجھے لا پھینکا۔ میں خود سے یہاں
یا۔"

"لیکن......" زارا کے لہجے میں اُلجھن تھی۔ "لیکن ہمارا قانون......"

"آپ کے قانون کا احترام کرنا میرا فرض ہے۔" انور مسکرایا۔ "اگر آپ کا قانون میرے لئے موت
رتا ہے تو میں تیار ہوں۔"

"نہیں......" زارا کے لہجے میں وہی شان تھی۔ "ہم احسان فراموش بھی نہیں۔ ہم تمہارے لئے کچھ
گے۔"

"میں اسے اپنی عین خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

"شہزادی صاحبہ......" جمال نے زارا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ یہاں خلاف معمول آئیں کیسے؟"

"میں ایسے ہی ٹہلتی ہوئی یہاں آ نکلی تھی۔" زارا بولی۔ "سمندر کے کنارے بیٹھ کر میں اپنے پاؤں
کی کہ میرا پاؤں پھسل گیا۔"

"اوہ......" جمال کے ہونٹ ایک دائرے کو تشکیل دے چکے تھے۔ "بہر حال چلئے۔ آئیے جناب،
ا آپ کا نام......"

"انور......"

"آئیے، تشریف لائیے۔ ہمارا راجہ شار کر آپ کے لئے فیصلہ کرے گا۔"

"بہتر ہے۔"

"آیئے، تشریف لایئے۔" جمال کے لہجے میں وہی غراہٹ تھی۔

انور کے گرد بھالے والوں نے محاصرہ کر رکھا تھا۔ آگے آگے زارا تھی اور پیچھے پیچھے جمال اور اس کے پیچھے انور۔

جزیرے کی آبادی والا حصہ شروع ہوگیا۔ انور نے دیکھا جزیرے کے مرد اور عورتیں زارا کے آگے جھک رہے تھے اور جمال کو ادب سے سلام کر رہے تھے۔ وہ لوگ بستی کی چھوٹی چھوٹی گلیاں پار کر رہے۔ اور پھر قافلہ ایک بڑے مکان کے سامنے رُک گیا۔ وہ مکان پورے جزیرے میں سب سے زیادہ بہتر تھا۔ پتھروں سے بنی ہوئی وہ عمارت عہدِ قدیم کی داستان سنا رہی تھی۔ صدر دروازہ لکڑی کا تھا۔ صدر دروازے سے لے کر عمارت کے دروازے تک کا کمپاؤنڈ کافی پتلا تھا۔ دونوں طرف گھاس اُگی ہوئی تھی۔ وہ عمارت، ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اُس عمارت پر روحوں کا سایہ ہو۔ حالانکہ کئی محافظ بھالے اور نیزے ... دروازے پر مسلط تھے، لیکن پھر بھی ایک طویل خاموشی، ایک پراسرار سناٹا تھا، جسے بھیانک بھی کہا جا... تھا۔ محافظ خاموشی کے ساتھ بھالے تھامے اِدھر اُدھر سے گزر رہے تھے۔ محافظوں کے چہروں پر بھی کو... اور گیرو کے نقش تھے۔ اب تک صرف جمال اور زارا ہی ایسے تھے جن کے چہروں پر انور نے دیے... نہیں دیکھے تھے۔

صدر دروازے پر وہ لوگ ایک لمحہ کے لئے ٹھہرے۔ انور نے صدر دروازے کا جائزہ لیا اور پھر اُ... پڑا۔ صدر دروازے کے عین اوپر لکڑی کے بانس میں لگی ہوئی ایک ہیبت ناک کھوپڑی نے اُسے لرزا... رکھ دیا تھا۔

"یہ......؟" انور بڑبڑایا۔

"یہ جوزف کی کھوپڑی ہے......" جمال غرایا۔ "جسے شارکر نے توڑا تھا۔ شارکر سے پہلے یہاں کا را... جوزف تھا۔ وہ جزیرے کا سب سے بہادر آدمی تھا۔ اس لئے وہ یہاں راج کرتا تھا۔ پھر مقدس دیوتا... شارکر کے بازوؤں میں وہ طاقت بھری کہ جوزف کا سر اُس نے بازوؤں میں دبا کر توڑ دیا۔"

زارا کا چہرہ چمک اُٹھا تھا۔ شاید وہ اپنے باپ کی تعریف سن کر پھولے نہیں سما رہی تھی۔

"اور وہ دن دُور نہیں جمال......" ایک بھیانک غراہٹ آمیز آواز گونجی۔ "جب شارکر کی کھوپڑی ا... بانس پر سکھائی جائے گی۔"

انور نے جھپٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا، اُس کے پیچھے ایک خوفناک سی شکل کا آدمی کھڑا تھا۔ اُس... چہرے پر گیرو اور کھریا کے نقوش نہیں تھے۔ اُس کا جسم بادی النظر میں کسی گینڈے کا جسم نظر آتا... سڈول مضبوط۔ اُس کا رنگ کالا تھا، آنکھیں گدھ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں، چھوٹی چھوٹی چمکدار... نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھی، سر بالوں سے بے نیاز تھا۔ اُبھرے ہوئے رُخسار حدت سے چمک رہے... گردن موٹی اور مختصر سی تھی۔

"اوہ جیکی......" جمال غرایا۔ "اور اگر قانون میری راہ میں حائل نہ ہوتا تو تیری کھوپڑی میں اپنی... میں دبا کر چٹخاتا اور پھر تیری کھوپڑی تیرے باپ جوزف کی کھوپڑی کے ساتھ اُس بانس پر جھولتی۔"

جواب میں جیکی نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا تھا۔

"جیکی......" جمال غرایا۔ "مقدس دیوتا کی قسم میرا خون کھول رہا ہے۔ جا، اپنی ماں سے اپنا دُودھ بخشوا آ۔"

"جمال......" جیکی غرایا۔ "اتنا مت اُڑ۔ یاد رکھ، جیکی، جوزف کا لڑکا ہے۔ اس کی رگوں میں ایک ... خون دوڑ رہا ہے۔"

"جیکی......" جمال غرایا۔ اُس نے تلوار کھینچ لی۔ "آ...... آج میں دیکھتا ہوں تیری ماں نے تجھے کتنا پالا ہے۔ مقدس دیوتا کی قسم میں تیری کھوپڑی کو بستی کے کتوں کی خوراک بناؤں گا۔ پھر تیری ... اس بانس پر تیرے کمینے باپ کی کھوپڑی کے ساتھ بھیک مانگے گی۔ اور جزیرہ ہلونا کے کتے بھی ... کی طرف حقارت سے دیکھیں گے۔"

"جمال......" جیکی نے جھپٹ کر اپنی تلوار سونت لی تھی۔

"جیکی...... جمال......" زارا اُچھل کر اُن دونوں کے درمیان آگئی تھی۔ پھر وہ جیکی کی طرف پلٹ کر ... "جاؤ جیکی، مجھے مجبور نہ کرو۔ ورنہ تیری ماں تیرے جسم کی بوٹیاں ڈھونڈتی پھرے گی۔ یاد رکھ، تو ... زارا کی موجودگی میں راجہ کے ایک وفادار کو للکارا ہے۔ اگر ہمت ہے تو پورن ماشی کی رات کو ... کو فتح کر کے دیکھنا۔"

"یہ ہی ہوگا زارا......" جیکی غرایا۔ "آج سے چار دن بعد پورن ماشی کی رات کو شارکر اور جمال کی ... اسی دروازے پر لٹکی ہوں گی۔ جزیرے کا ایک ایک بچہ جیکی کے آگے جھک رہا ہوگا۔ اور میں ... دوران تیرے گلے میں وجے مالا ڈالوں گا۔ کیونکہ بستی کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی میں ہوں۔ اور ... ہوتا ہے، شہزادی اس کی ہوتی ہے۔ یہ دیوتا کا حکم ہے۔"

"... جا، لیکن آنے سے پہلے اپنی ماں سے دودھ بخشوا آیئو۔"

"..." جیکی نے پیر پٹخا اور اندھیرے میں ایک طرف کو نکل گیا۔

"... دیوتا کی قسم شہزادی، میرا خون کھول رہا ہے۔" انور کی حیران نگاہیں جمال پر مرکوز ہو گئیں جو ... کے ساتھ ہاتھ ملتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"جمال......" زارا تمکنت کے ساتھ بولی۔ "اپنے غصہ کو تھوک دے۔ پورن ماشی کی رات کو مجھے تیری ... ضرورت ہے۔"

"... کے خون کا آخری قطرہ بھی شارکر اور زارا کے لئے وقف ہے۔"

"... تجھ سے ایسی ہی اُمید ہے جمال۔"

"... شہزادی کا اقبال بلند ہو۔" جمال کے چہرے پر سچی خوشی تھی۔ "جمال، جیکی کی کھال کا لباس ... دیکھنے کے لئے بے چین ہے۔"

"... دیوتا تیری آرزو پوری کرے۔ اب چل۔"

... انور کو لے کر اندر آگئے۔ زارا بار بار انور کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی

محبت پاش نگاہیں انور کو مجبور بنائے دے رہی تھیں۔ حالانکہ جمال اور جیکی کے درمیان ہونے والے
سے انور متاثر ہوا تھا۔ مرد اور بہادر ہوتے ہوئے بھی وہ ایک لمحہ کے لئے کپکپا سا گیا تھا۔ مگر زارا کے
پر کوئی نقش نہیں اُبھرا تھا جس کی بنا پر انور یہ سمجھتا کہ وہ تھوڑی بہت ڈری ہوئی ہے۔ وہ بالکل مطمئن تھی

پھر وہ لوگ ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے۔ وہ ہال ضروریاتِ زندگی کی ہر شے سے پُر تھا۔ ہال
کے دونوں طرف ستون تھے جن پر نقش نگاری کی گئی تھی۔ ان ستونوں پر رُوحوں کی تصاویر منقوش تھیں جو
دیوتا کے آگے سر جھکائے کھڑی تھیں۔ اور ہال کے مشرقی کنارے پر ایک تخت بچھا ہوا تھا جس پر ایک
بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے جسم کے ہر حصے پر بال تھے۔ چہرہ کافی حد تک خوفناک تھا۔ گو سر کے بال
سفید ہو چلے تھے، مگر قویٰ ابھی تک مضبوط نظر آ رہے تھے۔ اُس کا سینہ کسی شیر کے سینے سے بھی زیادہ چوڑا
تھا۔ اُس کا قد لمبا تھا۔ وہ شیر کی کھال کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے سامنے مختلف لوازمات رکھے
ہوئے تھے۔ بھنے ہوئے پرندے، تازہ پھل اور شراب کی صراحیاں جو کسی دھات کی بنی ہوئی تھیں، جن پر
نقش نگاری کی گئی تھی۔ اور ساتھ ہی رکھے تھے شیشے کے پیمانے......

اُس کے چاروں طرف لڑکیاں تھیں۔ حسین و خوبرو، جن کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اُس کی کنیزیں
ہیں۔ اُن کے جسموں پر اس قسم کا لباس تھا کہ اُن کے جسم کے مخصوص حصے نمایاں طریقے پر نظر آ رہے تھے
جسم بھرے بھرے، گدرائے ہوئے، آنکھیں چھلکتے ہوئے پیمانوں کے مترادف تھیں۔ رنگ صاف
ستھرے، سرخی مائل...... وہ سب کی سب شوخ تھیں۔ آزادانہ قہقہے لگا رہی تھیں۔ ایک صراحی میں شراب
نکال کر اُس بوڑھے کے منہ تک لے جا رہی تھی، دوسری نے ایک بھنا ہوا پرندہ اُٹھا رکھا تھا اور تیسری
انگوروں کا گچھا اُس بوڑھے آدمی کے منہ تک لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بقیہ کھلکھلا کر ہنس رہی
تھیں۔ وہ سب بوڑھے آدمی کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

"جمال، عظیم شارکر کو سلام پیش کرتا ہے۔" جمال نے جھکتے ہوئے کہا۔ اُس کے دوسرے ساتھی
جھک گئے تھے۔

"اُٹھ جمال...... ہم نے تیرا سلام قبول کیا۔" وہ بوڑھا جو شارکر تھا، غرایا۔

"جمال آپ کی خدمت میں ایک پردیسی کو لایا ہے۔"

"پردیسی......؟" بوڑھا اُچھل پڑا۔ اُس کی نگاہیں انور پر مرکوز ہو گئیں۔ چند لمحوں تک انور کو دیکھتے
رہنے کے بعد وہ جمال کی طرف مڑا۔ "مگر تم اسے یہاں کیوں لائے ہو؟ جبکہ تم جانتے ہو کہ پردیسیوں
کے لئے یہاں موت ہے۔"

"لیکن......"

"کچھ نہیں جمال......" شارکر غرایا۔

"بابا، انہوں نے میری جان بچائی ہے۔" زارا آگے بڑھی۔

"کون، میری بچی؟" بوڑھا شارکر، زارا کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں بابا...... میں بحر کرات میں ڈوب رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بچایا۔"

"اس لئے میں اسے یہاں لایا ہوں۔" جمال بولا۔ "کیونکہ جزیرے والے احسان فراموش بھی نہیں۔"

انور خاموش کھڑا شارکر کو دیکھ رہا تھا۔ شارکر، انور کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا کچھ بڑبڑایا۔ "پردیسی،
را نام؟"

"انور......"

"آہم......" شارکر غرایا۔ ہم احسان فراموش بھی نہیں۔ ہم تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دیتے ہیں۔
ے تم جمال کے ساتھ رہو گے اور ہمارے مہمان۔ لیکن اتنا یاد رکھو، یہاں سے نکلنے کی کوشش کا نتیجہ
ی موت ثابت ہو گا۔ کہو، تم یہاں خوش رہو گے نا؟ اور یہاں سے کبھی جانے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

انور نے زارا کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں پیار کا سمندر موجزن تھا۔ جو محبت پاش نظروں سے
ی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں......" انور ہولے سے بڑبڑایا۔ "کہ زندگی بھر یہاں رہوں گا۔ اور راجہ کا وفادار
گا۔"

"جاؤ نوجوان......" شارکر ہاتھ اُٹھا کر غرایا۔ "تمہیں فیصلہ پر کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا۔ جزیرہ ہلونا
ل تمہارے لئے بہترین دوست ثابت ہوں گے۔ آج سے تم جمال کے ساتھ رہو گے۔"

"شکریہ......"

"جا سکتے ہو۔"

جمال نے انور کا ہاتھ پکڑا۔ انور، جمال کے ساتھ مڑا۔ مڑتے مڑتے اُس نے دیکھا، زارا اُسے محبت
نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نظریں اُس کے حسین چہرے پر تھیں۔ پھر وہ سر جھکائے ہوئے
کے ساتھ باہر نکل آیا۔

جمال کا مکان مضبوط مگر شکستہ پتھروں کی چہار دیواری کے اندر بنے ہوئے چار کمروں پر مشتمل تھا۔
کے محل سے اس مکان کا فاصلہ بمشکل دو گز رہا ہو گا۔ ان چاروں کمروں کے گرد باغات تھے اور ان
کے گرد وہی مضبوط مگر شکستہ پتھر کی چار دیواری۔ اس کی مشرقی دیوار کے بالکل بیچ میں ایک لکڑی
ازہ تھا جو آمد و رفت کے لئے تھا۔

"دوست......" جمال اپنے مکان کے دروازے پر کھڑا ہو کر انور کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
تمہیں تمہارے شہروں جیسا آرام تو نہ ملے گا۔ پھر بھی جمال تمہیں خوش رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش
گا۔"

"شکریہ......" انور مسکرایا۔

"آؤ، اندر چلو۔" جمال کے لہجے میں وہی غراہٹ تھی۔ جمال اندر کی طرف بڑھا۔ انور اُس کی تقلید کر
"یہ کمرہ کھانا پکانے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔" جمال نے غراہٹ آمیز لہجے میں پہلے
کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ دوسرا کمرہ میری ماں کا ہے۔ ماں مر چکی ہے مگر......" انور نے
کیا اُس کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔ اُس کی آواز پر ہر وقت مسلط رہنے والی غراہٹ نہ جانے کہاں جا سوئی

تھی۔

"میری بھی کوئی ماں نہیں ہے جمال۔" انور نے اُس کا ہاتھ دبایا۔

"مگر......" جمال کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔ "تمہاری صرف ماں نہیں ہے۔ میرا اس دنیا میں نہ باپ، نہ ما
نہ بھائی، نہ بہن۔"

"یقین کرو دوست...... میں بھی اس دنیا میں اکیلا ہوں۔"

"نہیں......" جمال کے لہجے میں حیرت تھی۔

انور نے مسکراتے ہوئے گردن اثبات میں ہلا دی۔ جمال کی آنکھوں میں دو روشن ستارے چ
رہے تھے۔ "آؤ میرے دوست۔" جمال نے انور کو تیزی سے لپٹا لیا۔ "پھر تو خوب گزرے گی جو
بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

انور نے ایک بوجھل سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور یہ کمرہ......" جمال نے تیسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "میرے لئے ہے۔ تم بھی
کمرے میں میرے ساتھ رہو گے۔ اور یہ چوتھا کمرہ، یہ میری پشپا کے لئے ہے۔ اسے میں اس کم
دُلہن بنا کر لاؤں گا۔"

"یہ پشپا کون ہے جمال؟"

"جیکی کی بہن......" جمال نے پُر خیال مگر غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا......؟" انور چونک پڑا۔

"ہاں انور، میرے دوست......" جمال بڑبڑایا۔ "جزیرہ ہلونا کی سابقہ شہزادی، جوزف کی بیٹی، جیک
بہن۔"

"لل...... لیکن...... پھر؟"

"آں، ہاں...... چھوڑو۔" جمال ہاتھ اُٹھا کر بڑبڑایا۔ "تم یہی کہو گے کہ میں اپنی محبوبہ کا ساتھ نہ د
کر شار کر اور زارا کا ساتھ کیوں دے رہا ہوں؟ تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جزیرے کے قانون
مطابق یہاں طاقتور ترین آدمی حکومت کر سکتا ہے۔ سو شار کر، کر رہا ہے۔ جوزف کا سر جب اُس نے
تھا اس وقت میں اُنیس سال کا نوجوان تھا۔ میں نے دیکھا تھا۔ میری پشپا کی ملتجی نگاہوں میں بے بسی تھ
وہ لرزتے ہوئے آنسوؤں والی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مگر میں کیا کرتا؟ شار کر ہم سب پر بھا
تھا۔ پھر جزیرہ کا قانون۔ بعد میں مجھے شار کر کا وفادار بننا پڑا۔ کیونکہ دیوتا کا حکم ہے کہ اگر راجہ سے کمز
تو اس کے وفادار رہو۔ سو میں اب تک ہوں۔ شاید تم سمجھ رہے ہو گے کہ اب میرے جسم میں اتنی طا
ہے کہ میں شار کر کا خاتمہ کر سکوں۔ نہیں میرے دوست، تم غلطی پر ہو۔ بوڑھا شار کر اب بھی جزیرہ کے
آدمیوں پر بیک وقت بھاری ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ ایک اٹل حقیقت......"

"مگر...... مگر جیکی......؟"

"آں، جیکی کا سر توڑ سکتا ہے۔ مگر کاش میری پشپا اُس کی بہن نہ ہوتی۔ پھر بھی...... اگر

ے شار کر کو للکارا تو پہلے اُسے جمال کی لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔ اور جمال کو فتح کر لینا جیکی کی
ں سے باہر ہے۔"

"پشپا تم سے اس بات پر ناراض تو نہیں کہ تم اُس کے بھائی کے دشمن ہو؟"

"نہیں انور میرے دوست......" جمال کے لہجے میں سچی خوشی تھی۔ "وہ انصاف پسند ہے۔ وہ شار کر
وفادار ہے۔ کیونکہ ہمارا قانون ہمیں یہی سکھاتا ہے۔ وہ جیکی سے متنفر ہے۔ وہ ملعون، خنزیر کا بچہ میری
پشپا کو مارتا ہے۔"

"اور تم یہ برداشت کر لیتے ہو؟"

"کر لیتا تھا۔ مگر اب نہیں کروں گا۔" جمال بڑبڑایا۔ "آج سے ٹھیک چار دن بعد پشپا اُنیس سال کی
ہو جائے گی۔ اُنیس سال کی عمر میں جزیرہ کی لڑکی کو اختیار ہے کہ وہ پورن ماشی کی رات کو کسی مرد کے گلے
مالا ڈال دے اور اسے اپنا ور مان لے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا اُس کے ور کو للکارے تو اسے جنگ کرنی
ہوگی۔ جس کی جیت ہوگی وہی اُس لڑکی سے شادی کرے گا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جمال سے مقابلہ
کرنے کی ہمت بستی میں کوئی نہیں کر سکتا۔"

"تمہارے ہاں ہر کام قوت بازی سے کیوں کیا جاتا ہے؟"

"قانون میرے دوست۔ یہاں کا قانون...... ہم اس پر عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ ورنہ دیوتا ہمیں
پ دے گا۔"

"تم لوگ ضعیف الاعتقاد ہو۔"

"انور......" جمال کے غراہٹ آمیز لہجے میں وحشت تھی۔ "تم میرے مہمان ہو۔ یہاں کے قانون
بارے میں اور مقدس دیوتا کے بارے میں، میں ایک لفظ بھی برائی کا سننا پسند نہیں کروں گا۔ تم جانتے
زف نے دیوتا کو گالی دی تھی۔ دیوتا کا شراپ شار کر کی صورت میں اس پر نازل ہوا۔ اور آج تک اُس
لوڑی بھیک مانگتی ہے۔ جزیرہ کا کتا بھی اس کی طرف حقارت سے دیکھتا ہے۔" جمال کی آنکھوں میں
ت رقص کرنے لگی۔

"میں معافی چاہتا ہوں......" انور جلدی سے بولا۔

"آؤ......" جمال نے اُسے اپنے کمرے کی طرف گھسیٹا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں بیٹھے مٹی کے پیالوں میں شراب پی رہے تھے...... شراب بہت تیز تھی۔
ئے ہی بھنے ہوئے پرندوں کی قابیں رکھی تھیں۔ ملازم کمرے کے دروازے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"جمال......"

"ہوں......؟"

"یہاں تمباکو مل سکے گا؟"

"تمباکو...... اوہ، تم سگریٹ پینا چاہتے ہو گے۔"

"ہاں"

"ہمارے ہاں سگریٹ نہیں بلکہ پائپ وافر مقدار میں تیار کیے جاتے ہیں۔ میں ابھی تمہارے پائپ اور بہترین قسم کا تمباکو منگواتا ہوں۔ چلے گا ناں؟"

"ہاں، آں......"

تھوڑی دیر بعد ملازم نے انور کو پائپ اور تمباکو لا کر دے دیا۔ پائپ میں تمباکو بھر کر اسے سلگا لینے کے بعد انور ٹہلنے کے لیے باہر نکل پڑا۔ جمال اندر ہی لیٹ گیا تھا۔ وہ کھانا کھا کر سو جانے کا عادی تھا۔

چہار دیواری سے باہر نکل کر انور ٹہلنے لگا۔ غیر ارادی طور پر وہ شار کر کے محل تک چلا گیا۔ پھر وہ ہی رہا تھا کہ چونک پڑا۔ کسی نے اُسے پکارا تھا...... اُس نے پلٹ کر آواز دینے والی کو دیکھا، مگر وہاں بھی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پھر کسی نے اُسے آواز دی۔ آواز نسوانی تھی۔ اس مرتبہ وہ آواز دینے والے کو میں کامیاب ہو گیا۔

وہ زارا تھی، جو محل کی ایک کھڑکی میں کھڑی اُسے آوازیں دے رہی تھی۔ اُس نے انور کو رُکنے کا کیا اور خود کھڑکی پر سے ہٹ گئی۔ انور کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد زارا اُسے دروازے پر نظر آئی۔ انور نے دیکھا، محافظ اُسے جھک جھک کر تعظیم دے رہے تھے۔ زارا خراماں خ چلتی ہوئی اُس کی طرف آ رہی تھی۔ پھر وہ اُس کے بالکل نزدیک آ گئی۔

"زارا کی طرف سے سلام قبول ہو پردیسی......"

"مجھے انور کہتے ہیں۔" انور مسکرایا۔

"مجھے انور سے زیادہ پردیسی کہنا اچھا لگتا ہے۔"

"آپ کی پسند میری پسند ہے شہزادی۔"

"میں استدعا کروں گی کہ آپ مجھے شہزادی نہیں بلکہ صرف زارا کہیں۔"

"اور میں استدعا کروں گا کہ آپ مجھے آپ نہیں بلکہ تم کہہ کر مخاطب کریں۔" انور مسکرایا۔

انور نے دیکھا زارا کی پلکوں کی جھالریں نیچے کی طرف جھک گئی تھیں، چہرے پر سرخی دوڑ گئی تھی۔

دسویں رات کا چاند ایک لمحہ کے لیے رُکا اور اُنہیں پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ ستارے ٹم ٹم سی موسیقی بکھیر رہے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ دُور بستی میں چراغ لرز رہے تھے قطار میں روشنی کو روشنی سے جوڑ کر تاریکیوں سے جدوجہد کرتے ہوئے......

"آپ کو جمال کے ہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟" زارا نگاہیں نیچی کیے ہوئے بڑبڑائی۔

"جی نہیں......" انور مسکرایا۔ "شکریہ......"

"کس بات کا؟"

"میرا خیال رکھنے کا۔"

"کیا مطلب......؟"

"میں خوش قسمت ہوں، ایک شہزادی میرا اتنا خیال رکھتی ہے۔"

"پھر آپ نے مجھے شہزادی کہا؟" زارا کے لہجے میں سخت شکایت تھی۔

"معافی چاہتا ہوں......"

"اور اگر میں معاف نہ کروں؟"

"سر تسلیم خم ہے۔"

"صرف اتنا خیال ہے، کہ آپ نے میری جان بچائی۔" زارا مسکرائی۔

"آپ کی نہیں، بلکہ اپنی۔"

"کیا......؟"

"جی...... جی۔"

"پردیسی......" انور نے محسوس کیا زارا کی آواز کانپ رہی تھی۔

"زارا......" انور کا لہجہ پیار میں ڈوبا ہوا تھا۔ زارا نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"آیئے کہیں گھومنے چلیں۔" انور نے تجویز پیش کی۔

"آیئے......" زارا کی حسین آنکھیں چمک رہی تھیں۔

انور نے زارا کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ دونوں آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ ستاروں کی ملی سی روشنی میدان میں اُن کی پرچھائیاں بکھیر رہی تھی۔ پرچھائیاں، جو ایک ساتھ چل رہی تھیں سے قدم ملا کر...... کپکپاتی ہوئی خوشی کی شدت سے۔

ایک مناسب جگہ کا انتخاب کر کے وہ دونوں بیٹھ گئے۔

"پردیسی......"

"ہوں......"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"ادھر...... مشرق میں ایک ملک ہے۔" انور بڑبڑایا۔ "لوگ اُسے سونے کی چڑیا بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ ری بات ہے کہ وہاں فاقے ہیں، محرومیاں، بدنصیبی، تنگ حالی نے وہاں پڑاؤ کر رکھا ہے۔ سونے کی بھوکی ہے۔ وہاں مائیں بچوں کو تھپک تھپک کر سلا دیتی ہیں اور پھر سسک پڑتی ہیں، بچوں کے اروں پر آنسوؤں کی لکیریں دیکھ دیکھ کر جنہیں بھوک کے نشانات بھی کہا جا سکتا ہے۔ جہاں ایک ف آنسو ہیں تو دوسری طرف قہقہے۔ جہاں اگر پرتھوی راج پیدا ہوتا ہے تو ساتھ میں وجے چند بھی پیدا تے ہیں۔ جعفر بھی اور رام کے ساتھ راون بھی۔ جہاں سب کچھ جمنا کی لہروں جیسا پھسلتا ہے۔ مُرلی کی ھُن کے ساتھ اور کوئی رادھا اپنا تن من دھن ارپن کر کے عالم بے خودی میں رقص کرنے لگتی ہے۔ وہاں کے بھجن بھی گونجتے ہیں کسی مرلی منوہر کے لیے، وہاں ایک خلوص، ایمانداری، سچائی کا اگر کوئی مینارہ گی کے روپ میں پیدا ہوتا ہے تو نور کے اس مینار پر تاریکی کا ایک غلاف رام ناتھ گوڑسے بن جاتا ہے۔ دیش، جو سپنوں کا دیش ہے...... دیش، جو قہقہوں کا دیش ہے اور موسیقی کا دیش ہے...... دیش، جو وؤں، کراہوں اور تلخیوں کا دیش ہے، جسے میرا ملک کہتے ہیں۔"

"پردیسی......" زارا گنگنائی۔ "تم کیا کوئی لکھک ہو کہانی لکھنے والے یا پھر شاعر؟"

"اوں ہوں......" انور نے گردن ہلا دی۔ "میں صرف ایک آدمی ہوں۔ گناہوں کی پوٹ، میں بدنصیب بھی نہیں ہوں۔ مجھے ہمیشہ قہقہے ملے ہیں۔ زندگی حسین سی موسیقی کے ساتھ مجھے خوشیوں کے نغمے سناتی رہی ہے۔ مگر کبھی کبھی میرے اندر سویا ہوا ایک ہندوستانی بھی جاگ اُٹھتا ہے اور میں......"

"ایک بات تو بتاؤ پردیسی؟"

"ہوں......"

"کیا ہندوستانی چور ہوتے ہیں؟"

"کیا مطلب......؟"

"بہت دن ہوئے......" زارا کسی داستان گو کی طرح بولی۔ "تمہاری ہی طرح ہمارے جزیرے میں ایک ہندوستانی آیا تھا۔ حالات اُسے بے گناہ ثابت کررہے تھے۔ یعنی یہاں آنے میں اُس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اس لئے اُسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ پھر جانتے ہو اُس نے کیا، کیا؟ اُس نے یہاں کی شہزادی نیلی کا دل چرالیا۔"

"لیکن میں نے......"

"آں، ہاں......" زارا ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "تم کچھ مت بولو۔ نیلی اُسے دیوانہ وار چاہنے لگی۔ وہ دونوں روز اسی میدان میں جسے پالی کا میدان کہا جاتا ہے آکر ملنے لگے۔ روز جب دن ختم ہوجاتا اور چاند آسمان سے جھانکنے لگتا، وہ دونوں یہاں آجاتے۔"

"لڑکے کا نام کیا تھا؟"

"عمر......"

"ہوں...... پھر کیا ہوا؟"

"وہ دونوں رات کو یہاں ملتے۔ آہستہ آہستہ اُن کی محبت پروان چڑھتی گئی اور پھر ایک دن آیا کہ دونوں کی شادی ہوگئی۔ پھر شادی کے بعد عمر ایک سال تک یہاں رہا، ایک سال بعد وہ نیلی سے چھپ کر یہاں سے بھاگ گیا۔ اُس کا دل اب نیلی سے بھر چکا تھا۔ اور وہ واپس ہندوستان لوٹ جانا چاہتا تھا۔ اُس نے بے وفائی کی اور نیلی کو بتائے بغیر ایک رات یہاں سے بھاگ گیا۔ جانتے ہو پھر کیا ہوا؟" زارا کے لہجے میں معصومیت تھی۔

"کیا ہوا......؟"

"جب اُس نے اپنی موٹر بوٹ بحر کرات میں ڈالی تو ایک زبردست طوفان آیا۔ اور پھر...... اُس کی کشتی سمندر میں ڈوب گئی۔ وہ مرگیا پردیسی۔" زارا کا لہجہ گلوگیر ہوگیا تھا۔ "جب نیلی کو معلوم ہوا تو وہ بھی سمندر میں کود گئی۔ اُس نے اپنی جان دے دی۔ آج تک اُس کی رُوح بھٹکتی پھرتی ہے، یہیں پالی کے میدان میں۔ وہ بس یہاں سے گزرتی رہتی ہے یہی کہتے ہوئے، نہ جاؤ عمر...... نہ جاؤ عمر...... اور پھر بھٹکنے لگتی ہے۔"

"یہاں...... اس میدان میں؟" انور چاروں طرف دیکھتا ہوا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں...... مگر تم ڈرو نہیں پردیسی۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔" زارا بولی۔

انور اب بھی متوحش نگاہوں کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"پردیسی......"

"ہوں......؟"

"تم عمر تو نہیں بنو گے نا؟"

"کک...... کیا......؟"

"پردیسی......"

"نہیں زارا...... میں عمر نہیں بنوں گا۔ اور نہ ہی تمہیں نیلی بننے دوں گا۔ مجھ پر بھروسہ کرو زارا...... مجھ پر بھروسہ رکھو۔"

"کھاؤ میری قسم۔"

"اپنی قسم......"

"اوں ہوں، میری۔"

"تم اور میں الگ الگ تو نہیں۔"

"سچ پردیسی......؟"

"ہاں......"

"اوہ، میں کتنی خوش قسمت ہوں۔"

"مگر زارا، اگر کوئی یہاں سے واپس جانا چاہے، فرض کرو کہ میں۔ اور میں تم سے شادی بھی کرچکا ہوں تو ایسی کوئی صورت نہیں ہوگی کہ ہم تم واپس چلے جائیں؟"

"مگر جائیں کیوں......؟"

"فرض کرو میرا دل چاہے کہ میں اپنا وطن دیکھوں، پھر؟"

"راجہ کی اجازت سے ہم لوگ جاسکتے ہیں۔"

"راجہ اجازت دیدے گا؟"

"بشرطیکہ ہم دونوں چاہیں۔"

"ہوں......" انور مسکرایا۔ "تو پھر میں تمہارے ساتھ شادی کر کے تمہیں ہندوستان لے جاؤں گا۔ کیوں؟"

"مگر بابا اجازت نہیں دیں گے۔"

"کیوں......؟"

"وہ اسے پسند نہیں کریں گے کہ میں ان کی آنکھوں سے دُور ہوجاؤں۔"

"ارے بھئی ہم یہاں آتے رہیں گے۔"

"مگر یہاں رہنے میں کیا قباحت ہے؟"

''زارا، وطن کی محبت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔''
''لیکن پردیسی......''
''آں ہاں، زارا، تم کچھ نہیں بولو گی۔'' انور نے اُس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''ہم دونوں ہندوستان جائیں گے۔ پھر ہر سال یہاں آتے رہیں گے۔''
''ہوں......''
''ارے وہ کون ہے......؟''
''وہ...... نیلی کی رُوح۔'' زارا بڑبڑائی۔
''آں......'' انور چونک پڑا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا، دُور پالی کے اُس سرے پر سے ایک لڑکی گویا ہوا میں تیرتی آ رہی تھی...... اُس کے پورے جسم پر سفید لباس تھا۔ ساتھ ہی ساتھ پالی کے میدان میں سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی اور ایک جملہ نہ جاؤ عمر...... نہ جاؤ عمر...... پھر سسکیاں......
انور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے زارا کا ہاتھ سختی سے تھام لیا۔ نیلی کی رُوح اُن دونوں کے قریب آ کر رُک گئی۔ ایک لمحہ کے لئے اُداس سی نگاہوں کے ساتھ اُنہیں دیکھتی رہی، پھر ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگا کر معدوم ہو گئی۔
چار دن گزر گئے......
آج کی رات پورن ناشی کی رات تھی۔ انور صبح سے متفکر تھا۔ بار بار اُس کے ذہن میں جیکی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اپنے قول کے مطابق آج جیکی، شارکر کو چیلنج کرنے جا رہا تھا۔
ابھی رات نہیں ہوئی تھی۔ سانجھ ہولے ہولے الوداع ہو رہی تھی۔ دُور اُفق پر قوس قزح کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ پرندے سفر کر رہے تھے۔ اُن کی پرواز چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ وہ گھونسلوں میں جا رہے تھے۔
انور، جمال کے گھر کے سامنے کھڑا خلا میں تک رہا تھا۔ اُس کے جسم پر جمال کا لباس تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے خلاء یا پھر قوس قزح کے رنگ نہیں تھے، بلکہ اُس کی آنکھوں کے سامنے متعدد تصاویر رقص کر رہی تھیں۔ پہلی تصویر زارا کی تھی، جوان چار دنوں میں اُس سے کافی زیادہ گھل مل گئی تھی۔ جس کے ساتھ رات گئے تک وہ پالی کے میدان میں ٹہلتا رہتا تھا۔ اُسی پالی کے میدان میں جہاں ایک خوفناک چیلنج عمل میں آنے والا تھا۔ انور کے سامنے زارا کی تصویریں گھوم رہی تھیں جو نجانے کیوں دو روز سے متفکر تھی۔ جس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں تھرک رہی تھیں۔ جس کی آنکھوں میں اُداسیاں تیر رہی تھیں۔ شاید ان اُداسیوں کا سبب جیکی کا چیلنج رہا ہو۔ بہر حال وہ متفکر تھی۔
اُس کے سامنے رقص کرتی ہوئی دوسری تصویر تھی جمال کی۔ جمال آج صبح سے ہی متفکر تھا۔ انور کے استفسار پر وہ ہاتھ ملتا ہوا صرف اتنا بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ ''انور، میرے دوست...... میں جیکی سے نہیں ڈرتا۔ مگر اُس کی شاطرانہ چالیں، تم سمجھتے ہو وہ چین سے بیٹھا ہو گا؟ نہیں نہیں انور، میرے دوست...... ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور کوئی چال چلے گا۔ اور تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ بہادر سے بہادر آدمی بھی اس وقت مر سکتا ہے

...اس پر پیچھے سے حملہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے شارکر مر جائے اور اُسے مرتے وقت یہ بھی پتہ نہ چلے کہ ...کی موت کا تیر کدھر سے آیا۔ وہ جیکی کتا بہت شاطر ہے انور، میرے دوست......''
...تیسری تصویر جیکی کی تھی۔ جیکی...... ایک خوفناک چہرے کا مالک جس کی آنکھیں کسی گدھ کی آنکھوں ...مشابہ تھیں۔ جن میں ہر وقت کینہ توزی کی جھلکیاں تھرکتی تھیں، جس کا رنگ کالا تھا، اعضاء مضبوط ...ناک خفیف سی اُٹھی ہوئی تھی۔ نتھنے جو ہمیشہ پھڑکتے رہتے تھے، جس کے منہ سے شراب کی بو کے ...آتے رہتے تھے، جس نے شارکر کو چیلنج کیا تھا......
پھر اُس کے سامنے شارکر کی تصویر کی شبیہہ تھرکنے لگی۔ شارکر...... جو بوڑھا ہو چکا تھا۔ مگر جس کے قویٰ ...مضبوط تھے، سینہ کسی شیر کے سینے سے بھی زیادہ چوڑا تھا۔ جس کے جسم کے ہر حصے پر بال تھے۔ جس کی ...بھنوئیں مل کر ایک سو پینتیس ڈگری کا زاویہ بناتی تھیں۔ جس کے لئے جمال نے اُس سے کہا تھا۔
...انور...... وہ آج بھی بستی کے دس افراد پر بیک وقت بھاری ہے۔''
شارکر بستی کے دس آدمیوں پر بیک وقت بھاری ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ تو آج پالی کا میدان ہی ...کرے گا...... انور نے سوچا۔ مگر خدانخواستہ اگر شارکر کو کچھ ہو گیا تو...... اُس کی زارا...... زارا کی کیا کیفیت ...ہو گی؟ کیا زارا کی چیخیں سننے کی سکت اُس میں ہو گی؟ کیا وہ زارا کو بلکتا ہوا دیکھ سکے گا؟ کیا وہ ایک غیور ...انسان ہونے کے باوجود اپنے جسم کی رگوں میں دوڑتے وہوئے خون کی حدت کے باوجود یہ سب کچھ ...برداشت کر سکے گا؟ کیا وہ برداشت کر سکے گا کہ اُس کی محبوبہ، وہ دوشیزہ جسے دیکھ کر اُس کے دل کے نرم ...گوشے پھڑک اُٹھتے تھے، ایک عجیب اور بالکل انوکھے انداز اُس کی آنکھ میں آنسو تیریں؟ کیا وہ یہ سب ...برداشت کر سکے گا؟ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔
''نہیں......'' وہ چیخ پڑا۔ اُس کی مٹھیاں سختی سے بھنچتی چلی گئیں...... مگر وہ کیا کرے؟ اُس کا ضمیر اُسے ...آوازیں دے رہا تھا...... وہ بڑبڑایا۔ ''اگر شارکر کو کچھ ہو گیا تو پھر جیکی کو میں چیلنج کروں گا۔ خواہ مجھے جان کیوں نہ دینی پڑے۔ شارکر کے بعد پیش آنے والی رُسوائی سے بدرجہا بہتر موت ہے۔''
اُس کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ اُس کے جبڑے مسلسل تیزی سے اُبھرنے اور پچکنے لگے۔ چہرہ ...خون کی حدت سے سرخ ہو گیا۔ اور پھر نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں کے درمیان بھنچ گیا......
شام کا خون ہو چکا تھا۔ دُور مغرب میں چاند جھانک رہا تھا، زرد سے چہرے کے ساتھ۔ جیسے اُس کے ...چہرے پر بھی فکر کی لکیریں پھیل گئی ہوں۔ قوس قزح کا خون آسمان کی پیشانی پر چپک کر رہ گیا تھا۔
وہ جمال کے گھر کے دروازے پر کھڑا پائپ پیتا رہا...... اُس نے ایک نظر پالی کے میدان پر ڈالی ...لکڑیوں کا ایک ڈھیر میدان کے بالکل وسط میں لگا کر اُسے آگ لگا دی گئی تھی۔ لکڑیوں نے آگ پکڑ ...لی اور پھر شعلے لپکنے لگے۔
''ٹھیک اس آگ کی طرح......'' ایک ہاتھ اُس کے رُخساروں کے قریب آیا، جس کی کلمہ کی اُنگلی پالی کے میدان میں روشن ہوتی ہوئی آگ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ''میرے دل میں ایک آگ لگ رہی ...انور، میرے دوست...... اور ماں قسم، یہ آگ اُس وقت سرد ہو گی جب میں جیکی کی کھال کے جوتے

بنواؤں گا۔اسے یاد رکھنا میرے دوست...... جمال نے زندگی میں پہلی بار اپنی ماں کی قسم کھائی ہے۔"

انور نے مڑ کر دیکھا، اُس کے شانے پر ہاتھ رکھے جمال کھڑا تھا۔اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں
غصے کی شدت کی وجہ سے اُس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔انور اُس کا شانہ تھپتھپانے لگا۔اس دوران میں پالی کے
میدان میں ڈھول اور تاشے پیٹے جانے لگے۔

"اوہ......" جمال اپنے ہاتھ مسل رہا تھا۔"اُس خبیث نے اعلان کر دیا ہے۔"

"کیا......؟"

"اوہ، انور میرے دوست......" جمال بڑبڑایا۔"یہاں جب کوئی راجہ کو چیلنج کرتا ہے تو اسی طرح اُ
پالی کے میدان میں ڈھول اور تاشے پٹوانے پڑتے ہیں۔یہ ایک طرح سے اعلانِ جنگ ہوتا ہے۔
دیکھو، تم نہیں دیکھ رہے؟ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر جوق در جوق پالی کے میدان کی طرف بڑ
رہے ہیں۔"

انور خاموش کھڑا پالی کے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"شارکر کو اس چیلنج کے متعلق علم ہے؟" تھوڑی دیر بعد انور نے پوچھا۔

"نہیں......اب تک تو نہیں تھا۔مگر اب شارکر بہرہ بھی نہیں۔اُس کے کانوں میں ضرور ڈھول پیٹے
آوازیں پہنچ رہی ہوں گی اور وہ کسی شیر کی طرح دھاڑ رہا ہوگا۔انور، وہ...... وہ ضرور آج جیکی کی گر
اپنی بغل میں دبا کر توڑ دے گا۔آج جیکی کی زندگی کو کوئی نہیں بچا سکتا۔آج کا چاند اس کے لئے مو
پیغام لے کر آیا ہے۔لیکن شارکر سے پہلے جیکی کو میں چیلنج کروں گا انور، میرے دوست......وہ میری لا
پر سے گزر کر شارکر تک پہنچ سکتا ہے۔میں......"

"مگر......"

"آں، ہاں...... جمال بزدل نہیں۔جمال نمک حرام بھی نہیں۔جمال کے لہو کا آخری قطرہ بھی شا
کے لئے وقف ہے۔میں آج جیکی اور اُس کے ساتھیوں کو دیکھوں گا۔میں دیکھوں گا جیکی کی ماں
اُسے کتنا دودھ پلایا ہے۔"

"اُس کے ساتھی......؟"

"بستی میں جب کوئی راجہ کو چیلنج کرتا ہے تو چند شر پسند لوگ اُس کا ساتھ دیتے ہیں۔بستی کے سار
غنڈے جیکی کے ساتھ ہیں۔" انور نے دیکھا، جمال کا پورا جسم غصہ کی زیادتی کی وجہ سے کپکپا رہا تھا۔

"آؤ انور......" تھوڑی دیر بعد جمال اُس سے مخاطب ہوا۔"ہم پالی کے میدان میں چلتے ہیں
شارکر بھی وہاں پہنچنے والا ہوگا۔"

"چلو......" انور بڑبڑایا۔

جمال نے ایک مرتبہ پلٹ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا، خصوصیت کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف
پھر اُس کی آنکھوں کے گوشوں میں دو آنسو کپکپانے لگے۔ایک جھٹکے کے ساتھ وہ مڑا۔اُس کی آنکھوں
آنسو نکل کر زمین پر گر پڑے اور وہ اُنہیں روندتا ہوا پالی کے میدان کی طرف بڑھا۔انور اُس کی تقلید کر

پالی کے میدان میں جب وہ دونوں پہنچے تو میدان میں بستی کے تقریباً تمام لوگ آ چکے تھے۔بچے اپنی
ؤں کی گودوں میں ہمک رہے تھے۔جوان لڑکیاں ایک طرف تھیں اور جوان لڑکے دوسری طرف۔بستی
بوڑھے مرد ایک طرف اور بوڑھی عورتیں دوسری طرف۔ان سب لوگوں نے مل کر ایک دائرہ تشکیل
ے دیا تھا۔یعنی پالی کے میدان میں روشن ہوتی ہوئی آگ کے چاروں طرف ایک دائرہ بنا کر وہ لوگ
ڑے تھے۔

انور نے دیکھا، جمال کے وہاں پہنچتے ہی سب لوگ اُسے تعظیم دے رہے تھے۔مگر جوان لڑکوں کی ٹولی
چند لوگوں کی آنکھوں میں کینہ توزی کی جھلکیاں بھی تھیں۔انور صاف سمجھ گیا کہ وہ جیکی کے آدمی ہیں۔
جوان لڑکیوں کا گروہ ان دونوں کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔وہ دائرہ جو اُن سب لوگوں نے مل
مکمل کیا تھا، اُس دائرے کا کچھ حصہ خالی تھا۔وہاں چند مونڈھے پڑے تھے اور ان مونڈھوں کے
میان ایک تخت۔

"آؤ انور......" جمال نے انور کا ہاتھ پکڑا۔دوسرے ہی لمحے وہ دونوں اُن مونڈھوں پر بیٹھ چکے تھے
ت کے داہنی طرف رکھے تھے۔تخت کے بائیں طرف والے مونڈھوں پر جیکی اور اُس کا ایک آدمی بیٹھا
۔انور، جیکی کو دیکھ رہا تھا جس کے ہر انداز سے غرور ٹپک رہا تھا۔اُس نے ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ
ان دونوں کو دیکھا جس میں تمسخر کی جھلکیاں تھیں۔جمال اُسے غضبیلی نظروں سے گھور رہا تھا۔

ڈھول اب تک پیٹے جا رہے تھے۔

"تم نے جیکی کو دیکھا؟" جمال، انور سے مخاطب ہوا۔

"آں، ہاں......"

"اور اُس کے ساتھی کو؟"

"اُس کا ساتھی کون؟"

"ٹانی......وہی جو اُس کے ساتھ بیٹھا ہے۔"

"ہوں......"

"ٹانی کا انداز بتا رہا ہے انور میرے دوست کہ وہ مجھے چیلنج کرے گا۔آ...... ہا...... ہا...... ہا......" جمال
نتوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔"چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں انور۔ٹانی میری جگہ حاصل کرنے کا
اب دیکھ رہا ہے۔آ...... ہا...... ہا...... انور، میرے دوست، میں دونوں کا سر توڑ دوں گا۔داہنے پیر
جیکی کی کھال کی جوتی اور بائیں پیر میں ٹانی کی کھال کی جوتی۔آ...... ہا...... ہا......"

انور، ٹانی کو دلچسپ نگاہوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ٹانی کے چہرے کی نمایاں خصوصیت اُس کی چھوٹی
ٹی چمکدار آنکھیں تھیں۔کوئی بھی ان آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ ٹانی شیطانیت سے پُر ہے۔
الباز ہے، شاطر ہے، دھوکہ باز ہے۔اُس کا سر بالوں سے بے نیاز تھا۔یہاں تک کہ بھنوئیں بھی
اڑ گئیں۔گردن بہت مختصر مگر مضبوط تھی۔دہانہ کافی چوڑا تھا اور کان کھڑے ہوئے سے، رنگت کالی تھی،

جسم مضبوط تھا۔ اُس نے ہرن کی کھال پہن رکھی تھی۔

''اور وہ......'' جمال نے آنکھ کے اشارے سے انور کو بتایا۔ ''وہ پشپا ہے۔''

''کون سی......؟''

''وہی جوان سب لڑکیوں کے بیچ میں بیٹھی ہے۔ وہ گورے رنگ کی، جس کی پیشانی پر بال جھول رہے ہیں۔''

''اوہ، اچھا......'' انور پشپا کو دیکھ رہا تھا۔ الاؤ کی روشنی میں انور نے صاف دیکھ لیا، پشپا کی آنکھوں میں آنسو اٹکے ہوئے تھے۔ اُس کا چہرہ گول تھا، آنکھوں کو چشم آہو کہا جا سکتا تھا۔ بھنوئیں نفاست کے ساتھ تراشی کی گئی تھیں، ناک ستواں تھی، دہانہ مختصر، رخسار بھرے بھرے تھے جن پر گلاب کی سی سرخی رچی ہوئی تھی۔ اُس کے بال کافی لمبے تھے جو اُس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ کافی دلکش تھی۔ اُس کے چہرے پر غموں کی پرچھائیاں تھیں جنہوں نے مل کر حسن کو اُداس بنا دیا تھا۔ مگر یہ اُداس حسن...... انور نے اندازہ لگایا کہ بستی کی کوئی لڑکی اس سے زیادہ حسین نہ رہی ہوگی۔

دفعتہً شارکر کے محل کی طرف سے موسیقی کی آواز آنی شروع ہوئی۔ سب لوگ مڑ کر محل کی طرف دیکھنے لگے۔

''شارکر آ رہا ہے۔'' جمال کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ انور بھی کھڑا ہو گیا۔ جیکی اور ٹانی عجیب سے انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ موسیقی کی آواز بتدریج نزدیک آتی گئی۔ انور نے دیکھا، چند لوگ اپنے سروں پر ایک تخت اُٹھائے ہوئے لا رہے ہیں۔ تخت پر ایک کرسی بچھی ہوئی ہے جس پر شارکر بیٹھا ہے۔ اُس کے پیچھے اسی قسم کا ایک دوسرا تخت تھا جس پر رکھی ہوئی کرسی پر زارا بیٹھی ہوئی تھی۔

جیکی، ٹانی سے کہہ رہا تھا۔ ''اس تخت پر واپسی میری ہوگی۔ نیزہ کی نوک پر شارکر کا سر ہوگا۔ پوری بستی میرے نام کی جے جے کرتی ہوئی اس تخت کے پیچھے محل تک آئے گی۔''

''ایسا ہی ہوگا عظیم جیکی......'' ٹانی کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تیزی کے ساتھ گردش کر رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد شارکر ان مونڈھوں کے درمیان رکھے ہوئے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی داہنی طرف زارا تھی اور پیچھے کنیزوں کی قطار۔

''اب رقص ہوگا۔'' جمال، انور کی طرف جھک کر بڑبڑایا۔ ''رقص، جس کے دوران ہر شخص کی آنکھوں میں بے چینی کی جھلکیاں ہوں گی۔ ہر شخص مضطرب نظر آئے گا انجام دیکھنے کے لئے، جو دیوتا نے سوچ لیا ہوگا۔ جواب تک کسی کو بھی نہیں معلوم، جو صرف دیوتا کو معلوم ہے اور جو کچھ دیر بعد پورے جزیرے کو معلوم ہو جائے گا۔ وہ دیکھو، وہ سب لوگ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے ہیں۔ بس اب رقص شروع ہونے والا ہے۔ چوبیس کنواری لڑکیاں اس آگ کے گرد رقص کریں گی۔ وہ دیکھو، اُن چوبیس لڑکیوں میں پشپا بھی شامل ہے۔ وہ دیکھو، وہ اُٹھ گئیں۔ اور اب رقص کے سے انداز میں آگ کے الاؤ کے گرد دائرہ بنا رہی ہیں۔''

انور نے دیکھا، لڑکیوں کے جھنڈ میں سے چوبیس لڑکیاں باہر نکل کر اب آگ کے الاؤ کے گرد ایک

[دائرہ] بنا چکی تھیں۔ اُن میں پشپا بھی تھی۔ انور نے ایک نظر زارا پر ڈالی، زارا انور ہی کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی [آنکھ]وں میں پیار کا بیکراں سمندر موجزن تھا۔ لیکن پس منظر میں اُداسی تھی۔ غموں کی پرچھائیاں، جیسے وہ [م]ل کر ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہوں، اب کیا ہوگا؟

شارکر، خونخوار نظروں کے ساتھ جیکی کو گھور رہا تھا۔ جیکی مسکرا رہا تھا۔ وہی مسکراہٹ جو تمسخر سے پُر تھی۔

پھر انور رقص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ الاؤ کے گرد وہ چوبیس لڑکیاں دائرہ بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ ڈھول [ا]یک پیٹے جا رہے تھے۔ پھر رقص شروع ہو گیا...... وہ عجیب ہی قسم کا رقص تھا۔ انور نے کبھی زندگی میں [ایسا ر]قص نہیں دیکھا تھا۔ اس رقص میں اضطراب تھا، بے چینی تھی، بے خودی تھی، بے نیازی تھی۔ تمام [لڑکی]وں کے لانبے لانبے بال اُن کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ جسم پر ہرن کی کھالیں تھیں جو جسم کے چند [حصو]ں کو چھپائے تھیں۔ کھال کا ایک ٹکڑا سینے پر کس کر باندھا گیا تھا جس کی گرفت پیچھے کمر تک لیجا کر [باندھ د]ی گئی تھی۔ کھال کا دوسرا ٹکڑا پیٹ پر باندھا ہوا تھا جو رانوں کو نصف چھپا رہا تھا۔ باقی تمام جسم عریاں [تھا]۔ پاؤں ننگے تھے، لیکن ٹخنوں پر پازیبیں بندھی ہوئی تھیں۔

ڈھول اب نہیں پیٹے جا رہے تھے۔ بلکہ اب تھرکتے ہوئے جسموں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے [پاؤ]ں میں پازیب کی جھنکار سناٹے کو متزلزل کر رہی تھی۔ زمین پر چاروں طرف گویا روشنی تیر رہی تھی اور [سن]ہری روشنی پر تیرتے کچھ گورے پاؤں، کچھ سانولے پاؤں...... اب پشپا سب سے آگے تھی اور دوسری [تما]م لڑکیاں پیچھے۔ رقص اپنے شباب پر تھا۔ سب خاموش تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ پس منظر میں [پازیب] کی جھنکار اور تھرکتے ہوئے پیروں کی تھاپ......

پھر وہ تھاپ اور پازیب کی جھنکار بتدریج کم ہوتی چلی گئی...... اور پھر رقص ختم ہو گیا...... ایک بار پھر [تما]م لڑکیاں آگ کے الاؤ کے گرد ایک دائرہ بنا رہی تھیں۔ دائرہ بنانے کے بعد اُن کے ہاتھ اُن کے [پیرو]ں کو چھونے لگے۔ وہ ایک مرتبہ پھر جھک کر آگ کی لپٹوں کو تعظیم دے رہی تھیں۔ اور پھر وہ کھڑی ہو [گئیں]۔ ایک قطار میں وہ اپنی جگہوں پر چلی گئیں۔

انور نے دیکھا جیکی اور ٹانی کے چہروں پر اضطراب کی جھلکیاں تھیں۔ اضطراب کی جھلکیاں جمال [کے چ]ہرے پر بھی تھیں، زارا کے چہرے پر بھی۔ مگر شارکر...... اُس کے چہرے پر کرختگی کے آثار تھے۔ نچلا [ہونٹ] دانتوں کے درمیان سختی سے بھنچا ہوا تھا...... چاروں طرف خاموشی تھی۔

پھر اُس طرف سے جہاں بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، ایک بوڑھا آدمی باہر نکلا۔ اُس کے کندھے [عمر] کی وجہ سے جھکے ہوئے تھے۔ نقاہت کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔ پورے بدن پر لرزہ تھا۔ آنکھیں [ب]الکل مرجھائی سی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں امتدادِ زمانہ کی کہانیاں دوہرا رہی تھیں اور پیشانی پر کھنچی ہوئی [لکیریں] ماضی کی داستان۔

وہ آگے بڑھ کر شارکر کی طرف رُخ کر کے خفیف سا جھکا، پھر لرزتی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔ ''تمارہ، [عظیم] شارکر کو سلام کرتا ہے۔''

''شارکر نے تمہارا اسلام قبول کیا بوڑھے تمارہ......''

انور، جمال سے کہہ رہا تھا۔ "یہ بوڑھا، راجہ کو اسی روز سلام کرتا ہے جب راجہ کو کسی نے چیلنج کیا ہو
ہے۔ اس کے سلام کا مطلب ہے "جنگ طاقت کی۔"

"بوڑھا تمارہ، راجہ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔" تمارہ مسکرا رہا تھا۔

"نہیں......" جمال کھڑا ہو گیا۔ "عظیم شارکر کو چیلنج کرنے والے کو پہلے مجھ سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔"
پورے میدان میں سناٹا چھا گیا۔ انور نے دیکھا، پشپا کی آنکھوں میں آنسو شدتِ جذبات سے لرز رہے تھے۔ ہونٹوں کی قوسیں تھرتھرا رہی تھیں، چہرے پر تذبذب تھا۔ انور اندازہ نہ لگا سکا کہ یہ کیفیات خوشی کی غماز ہیں یا غم کی آئینہ داری کر رہی ہیں؟ مگر پھر بھی لرزتے ہوئے آنسو، حسین دانتوں کی چمکتی ہوئی قطار، ہونٹوں کی لرزش اندرونی خوشی کی غمازی کر رہی تھی۔ یہ انور کا خیال تھا۔

"نہیں......" ثانی اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "تمہیں میں چیلنج کرتا ہوں۔"

"ثانی......" جمال کی آواز کسی شیر کی دھاڑ سے ہی مشابہ تھی۔ "گیدڑ کے بچے، کیا تو اپنی ماں سے دودھ بخشوا آیا ہے؟"

"میں اپنا دودھ بخشوا چکا ہوں جمال۔" ثانی مسکرایا۔ "تو اپنی بتا...... دُودھ معاف کرانے کے لئے تجھے دوسرے جہاں میں جانا پڑے گا جہاں تیری ماں ہے۔"

"ثانی......" جمال غرایا۔ "جزیرہ ہلونا کی مائیں اپنے بہادر بیٹے کا دودھ اسی وقت معاف کر دیتی ہیں جب وہ پہلی مرتبہ ہاتھ میں تلوار تھامتا ہے اور پورا جزیرہ جانتا ہے جمال بہادر ہے۔ اس کا فیصلہ یہ تلوار کرے گی۔"

ثانی نے اپنی تلوار کو اُچھالا۔ "تو پھر اب یہ فیصلہ ہو گا کہ جمال زیادہ بہادر ہے یا ثانی؟"

"مقدس دیوتا کی قسم...... اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔" جمال غرایا۔ اُس نے اپنی تلوار کھینچ لی اور آگے کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو......" شارکر غرایا۔ "جمال، ابھی شارکر کے بازوؤں میں بہت طاقت ہے۔ میری تلوار دشمن کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لئے بے قرار ہے۔"

"عظیم شارکر......" جمال خفیف سا جھکا۔ "کسی گیدڑ سے مقابلہ کرنا شیر کی توہین ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ آپ جیکی جیسے گیدڑ کا مقابلہ کریں۔ یہ آپ کی توہین ہے جسے جمال کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا۔"

"جمال......" جیکی غرایا۔ "آ، تو ہی پہلے آ۔ میں تیرے دل میں کوئی حسرت نہیں رہنے دینا چاہتا۔"
شارکر اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ زارا، انور کو دیکھ رہی تھی۔ پشپا کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

"جمال کو بوڑھے تمارہ کی اجازت درکار ہے۔"

"اجازت ہے......" تمارہ کی لرزتی ہوئی آواز فضا میں بازگشت کر کے معدوم ہو گئی۔
دوسرے ہی لمحے جمال الاؤ کی طرف جھپٹا۔ اُس کی تلوار اُس کے ہاتھ میں چمک رہی تھی۔ جیکی ایک زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا اپنی تلوار کو تولتا ہوا...... پھر جیکی، جمال پر تقریباً جھپٹا

...ن کا حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ متعدد چیخیں نکل پڑیں۔ انور غصہ کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اُس نے ...کیا کہ حلق سے آزاد ہونے والی چیخوں میں سب سے زیادہ تیز چیخ پشپا کی تھی۔
...ین جمال نے نہایت صفائی کے ساتھ نہ صرف وار خالی دیا تھا بلکہ جیکی کی تلوار اپنی تلوار سے روک لی ...لاؤ کی روشنی میں تلواروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ انور مضطربانہ انداز میں پہلو ...تھا۔ جمال اور جیکی ایک دوسرے پر زور صرف کر رہے تھے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کی تلواریں ...لی تھیں اور دونوں ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ آگ کی روشنی میں جمال ...تمار رہا تھا۔
...تلواریں ایک جھنکار کے ساتھ الگ ہونے لگیں۔ دونوں تلواروں کی نوکیں ایک دوسرے سے ملیں ...جھپٹ کر پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔ جیکی نے ایک مرتبہ پھر ایک بھرپور وار کیا۔ اس مرتبہ پھر جمال ...کی تلوار اپنی تلوار پر روک لی۔ دونوں ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر جیکی ...فوری قوت لگا کر جمال کو جھٹکا دیا۔ جمال پیچھے کی طرف گرتا چلا گیا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ جمال ...جا کر گرا تھا جہاں جوان لڑکیوں کی ٹولی بیٹھی تھی۔ پشپا اُس کی طرف جھپٹی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ...اُٹھا رہی تھی۔ جیکی تلوار تولتا ہوا اُس کی طرف آ رہا تھا۔
...مال......" پشپا، جمال کو اُٹھاتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "ثانی اور جیکی کی تلواروں کی ...ہر میں بجھی ہوئی ہیں۔ ثانی کا خنجر بھی۔"
...لیا......؟" جمال چونک پڑا۔ اتنی دیر میں جیکی اُس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔
...نے چاہا کہ اپنی تلوار کی نوک جمال کے سینہ کے پار کر دے، مگر جمال حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ ...ف کھسکا اور پھر جھپٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جمال تلوار کو تولتا ہوا جیکی پر جھپٹا۔ دونوں تلواریں ایک ...سے ٹکرائیں۔ جمال کے چہرے پر جوش اور غصے کے آثار تھے۔ وہ جھپٹ جھپٹ کر جیکی پر حملے کر ...یکی کسی مشاق جنگ باز کی طرح اُس کے وار خالی دے رہا تھا۔
...اور انور اپنی اپنی جگہوں پر بے چینی کے ساتھ پہلو بدل رہے تھے۔ تمام لوگ خاموش بیٹھے تھے۔ ...کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔
...اور جمال کی لڑائی اب اپنے عروج پر تھی۔ دونوں کی تلواریں بجلی کی سرعت کے ساتھ ایک ...سے ٹکرا رہی تھیں۔ جھنکار لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی...... پھر جمال نے ایک مرتبہ اپنی تلوار پر جیکی کی ...لی، اپنی تلوار کو نہایت صفائی کے ساتھ گردش دی، پھر اُس نے اپنی تلوار تیزی کے ساتھ جیکی کی تلوار ...کے نزدیک والی جگہ پر ماری۔ جیکی کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر دُور جا گری...... جیکی کے چہرے ...لکیریں نمایاں ہو گئیں۔
...مال بہادر ہے یا جیکی......؟" جمال غرایا۔ "میں نہتے پر وار نہیں کرتا۔ لو......" جمال نے مسکراتے ...ار اُس کی طرف اُچھال دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ جیکی کی تلوار پر جھپٹا تھا جس کی نوک زہرآلود ...کے تمام لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ پشپا بھی اُن میں شامل تھی۔ اُس کے ہاتھ تالیاں بجا رہے

تھے اور آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں۔ شارکر کا قہقہہ تالیوں پر بھاری تھا۔ انور اور زارا کے چہروں
مسکراہٹ تھی۔ انور کا ہاتھ اُس تلوار کے قبضہ پر تھا جو آج ہی اُسے جمال نے دی تھی۔ تلوار چلانے کی مش
وہ پچھلے دو دن سے کر رہا تھا۔

''جیکی...... او گیدڑ......'' جمال غرا رہا تھا۔ ''تو نے جزیرہ ہلونا کی طاقت پر ایک بدنما دھبہ لگایا
دھوکے باز، جو دوسروں کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود اس میں گرتا ہے۔ دیکھ، تیری وہ تلوار جس کی نو
تو نے زہر میں بجھائی تھی اس وقت میر ہاتھوں میں ہے۔'' جیکی کے چہرے پر خوف سے زیادہ گھبراہ
کے آثار تھے۔

اچانک سب چونک پڑے...... شارکر کی کراہ کافی طویل تھی...... وہ ایک چیخ کے ساتھ تخت پر آ
اُس کے پیٹ میں ایک خنجر دستہ تک پیوست ہو چکا تھا......

زارا چیخ مار کر گر پڑی۔

''ثانی......'' شارکر غرایا۔ مگر اُس کی غراہٹ میں نقاہت تھی۔ ''بزدل، چھپ کر وار کرتا ہے۔ آہ
آئیں......'' شارکر کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

''او گیدڑو......'' جمال کے لہجہ میں غراہٹ کے ساتھ لرزش بھی تھی۔ ''بزدلو، پیچھے سے وار کرتے
اوہ انور، میرے دوست، اس خنجر کی نوک زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ آہ...... عظیم شارکر...... آہ......''

جیکی دُور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ایک طنز بھری مسکراہٹ......

''جزیرہ ہلونا کے بہادرو......'' جمال کی نگاہیں جیکی پر تھیں، مخاطب جزیرہ ہلونا کے لوگ تھے۔ ''ہے
تم میں سے بہادر جو ناپاک ثانی کا سر اپنی تلوار سے کاٹے؟''

سب لوگ خاموش تھے۔ جیکی اور ثانی کے قہقہے بلند ہو رہے تھے...... زارا سسک رہی تھی...... پشپا
آنسو ٹپک رہے تھے۔

''میں ہوں جمال......'' انور اپنی تلوار تولتا ہوا میدان کی طرف بڑھا۔ ''ثانی کا سر میں توڑوں گا۔''

''اوہ انور، میرے دوست......'' جمال کا لہجہ لرزا ہوا تھا۔ ''تجھے ضرور کسی شیرنی نے جنم دیا ہوگا۔
جیکی کا سر اُڑا کر تیری مدد کو آ رہا ہوں میرے دوست...... آج میں شارکر کے ایک ایک مخالف کے خون
اپنی تلوار کو رنگوں گا۔'' جمال تھوڑی دیر کے لئے ہی غافل ہوا تھا۔ جیکی اس دوران میں اُس پر جھپٹ
تھا۔ لیکن اُس کا وار اوچھا پڑا۔ جیکی کی تلوار جمال کے بائیں شانے کے گوشت کو تراشتی ہوئی نکل گئی
جمال کے بائیں شانے سے خون بہنے لگا...... پشپا کے ہونٹوں سے ایک طویل کراہ خارج ہوئی تھی۔
انور، ثانی سے بھڑ گیا تھا

الاؤ کے گرد ارتلواریں چمک رہی تھیں اور فضا میں جھنکار بازگشت کر رہی تھی...... شارکر دم تو
تھا...... زارا اُس سے لپٹی سسک رہی تھی...... جمال کسی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ اُس کے حملے اتنے
اور سرعت کے ساتھ ہو رہے تھے کہ جیکی بدحواس ہو گیا تھا...... وہ پے در پے جیکی پر وار کئے جا رہا تھا۔
پیچھے کی طرف ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ انور اور ثانی ایک دوسرے پر زور صرف کر رہے تھے۔

چانک جمال کی تلوار کسی بجلی کی طرح کوندی اور جیکی کے پیٹ میں گھستی چلی گئی...... جیکی کے حلق سے
لی چیخ بہت بھیانک تھی۔

''آ...... ہا...... ہا...... ہا......'' جمال قہقہے لگاتا ہوا غرایا۔ ''جزیرہ ہلونا کے رہنے والو دیکھ لو، جمال سے
نے کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے...... او جیکی، گیدڑ کے بچے، اب میں تیری کھال کے جوتے بنواؤں گا۔ تیری
ی تیرے باپ کی کھوپڑی کے ساتھ شارکر کے محل کے دروازے پر رکھی جائے گی۔ غدار، بزدل۔''
لی نے ایک آخری ہچکی لی اور ڈھیر ہو گیا...... پشپا چیختی ہوئی جیکی کی طرف بڑھی تھی۔ دوسرے ہی
جیکی کی لاش سے لپٹی رو رہی تھی۔ جمال اُس کی سنہری زلفوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پھر جمال، انور اور
طرف پلٹا۔ اُس نے اپنی تلوار تولی اور ثانی کی طرف جھپٹنے ہی والا تھا کہ رُک گیا۔

ہیں جمال......'' انور نے اُس سے کہا تھا۔ ''یہ میرا شکار ہے۔''

نرور انور، میرے دوست......'' جمال کا لہجہ خوشی کی شدت کی وجہ سے کپکپا رہا تھا۔ ''مگر اتنا یاد رکھنا
ذلیل کی تلوار کی نوک زہر میں بجھی ہوئی ہے۔''

پرواہ نہیں جمال۔'' انور نے ایک زبردست وار کرتے ہوئے کہا۔

نرور تو کسی شیر کا بچہ ہے انور میرے دوست...... میرے بھائی......'' جمال کے لہجے میں لرزش تھی۔
م لوگ دلچسپی کے ساتھ انور اور ثانی کا مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ ثانی اب بوکھلا گیا تھا۔ اُس کے
ے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ راہِ فرار کا متلاشی ہو۔

ہے کوئی مائی کا لال......'' جمال للکار رہا تھا۔ ''پوری بستی میں ہے کوئی ایسا جو جمال کے مقابلے پر
ظیم دیوتا کی قسم مجھے خوشی ہوگی۔ آئے کوئی جیالا...... جس نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہو...... جو غدار
م خیال ہو۔ میری نظر میں جیکی کے تمام ساتھی ہیں۔ وہ آنا چاہیں تو آ جائیں۔ میں انہیں نہیں
گا۔ عظیم دیوتا کی قسم...... اس سرزمین پر ایک بھی غدار کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔''
ا کے تمام لوگوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور صرف تلواروں کی جھنکار......
ثانی کو پیچھے کی طرف رگید رہا تھا۔ ثانی بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ پھر انور کا چہرہ سرخ ہو گیا جس کی
حرکت سے اُس کے جوش کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک زبردست وار کیا۔ دوسرے ہی لمحے
پڑی اُس کے تن سے جدا ہو کر جمال کے قدموں میں گر پڑی تھی...... لوگ اتنے خوفزدہ ہو گئے
ال بھی نہ بجا سکے۔

ا تمارہ کانپ رہا تھا...... زارا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ...... پشپا
میں کھڑی سسک رہی تھی۔

...... ہا...... ہا......'' جمال، ثانی کی کھوپڑی پر اپنا بایاں پاؤں رکھ چکا تھا۔ ''جزیرہ ہلونا کے
آؤ، تم میں سے کون ہے جو اپنا انجام اس قسم کا چاہتا ہے...... آؤ۔ کوئی نہیں آئے گا۔ انور......
ست...... میرے گلے لگ جا...... تیرا باپ بھی میرے باپ کی طرح شیر تھا۔ تیری ماں بھی میری
ح شیرنی تھی۔ آ جا انور...... میرے بھیا...... کاش تو میرا سگا بھائی ہوتا۔''

انور، جمال سے لپٹ گیا۔ جمال نے پشپا اور زارا کو تسلی دی۔

تھوڑی دیر بعد لوگوں نے بوڑھے تمارہ کے ساتھ مل کر جمال کو راجہ کے تخت پر بٹھا دیا۔ یعنی اُسے راجہ تسلیم کرلیا گیا۔ جمال نے بہت ضد کی کہ اُس کی جگہ انور کو بٹھایا جائے مگر انور نے ایک نہ مانی۔ دوسری وجہ جزیرہ ہلونا کے تخت پر باہر کا کوئی آدمی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

پھر رقص کا پروگرام شروع ہوا۔

تھوڑی دیر بعد پشپا، جمال کے گلے میں مالا ڈال رہی تھی، جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ...... اور زارا انور کے گلے میں...... پورا میدان تالیوں کے شور سے گونج رہا تھا۔

اور کئی ماہ بیت گئے...... جمال اب راجہ کی حیثیت سے شار کر کے محل میں رہ رہا تھا۔ محل کے دروازے پر ایک طرف جوزف کی کھوپڑی تھی دوسری طرف جیکی اور ٹانی کی کھوپڑیاں۔ پشپا، جزیرہ ہلونا کی رانی تسلیم کرلی گئی تھی۔ انور اور زارا کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ جمال نے اُنہیں اپنے ہی محل میں رکھ لیا تھا۔

انور، زارا سے شادی کر کے بہت خوش تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ جزیرہ ہلونا سے اُس کا دل بھر گیا تھا۔ وہ جلد سے جلد جزیرہ ہلونا چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ زارا کو بھی لے جانا چاہتا تھا۔ زارا اُس کے ساتھ ہندوستان جانے پر راضی تھی۔

اس بات کا تذکرہ کئی مرتبہ انور نے دبی زبان میں جمال سے بھی کر دیا تھا۔ شروع میں تو جمال نے بہت مخالفت کی، لیکن انور اور پھر زارا کی ضد نے اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے سوچ کر فیصلہ کرنے کا وعدہ کیا۔ انور انتظار کرتا رہا...... آج جمال کے وعدے کے مطابق آخری دن تھا۔ یعنی اُسے فیصلہ کر دینا تھا۔

انور، جمال کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ایک کنیز دونوں کے لئے صراحی میں سے شراب نکال کر پیالوں کو لبریز کر رہی تھی۔

''جمال......'' انور بڑبڑایا۔ ''آج وعدے کے مطابق آخری دن ہے۔ آج تمہیں جواب دینا ہے۔''

''مگر...... انور میرے دوست......'' جمال کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ ''تمہیں یہاں کس چیز کی تکلیف ہے؟ تمہارے لئے ہر قسم کی آسائش مہیا ہے۔ ہر چیز......''

''مگر جمال......'' انور نے اُس کی بات کاٹی۔ ''تم خود سوچو میرے دوست، انسان کے دل میں اُس کے وطن کے لئے کتنی محبت ہوتی ہے۔ پھر میں ہمیشہ کے لئے تو نہیں جا رہا۔ میں یہاں بھی آتا ہی رہوں گا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہیں بھلا سکوں گا؟''

''اوہ انور...... کاش تو یہاں نہ آیا ہوتا۔'' جمال بڑبڑایا۔ ''نجانے کیوں تیرے قریب رہنے سے مجھے سکون ملتا ہے۔ پھر میں تیری بھلائی کے لئے کہہ رہا ہوں انور۔ دیوتا یہاں سے جانے والے سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ ناراض رہتا ہے۔ اگر دیوتا ناراض ہو گیا تو...... نہیں انور، تم باز آجاؤ۔''

دیوتا کا خیال یا اُس کی ناراضگی کا ڈر انور کے لئے مضحکہ خیز سا خیال تھا۔ وہ ترقی پسند قسم کا آدمی تھا۔ اس طرح کی اوہام پرستی سے اُس کا دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ دیوتا کا مضحکہ بھی اُڑا سکتا تھا۔ مگر اس میں

ے مصلحت نہیں سمجھی۔ کیونکہ اس طرح جمال کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ اور انور، جمال کو تکلیف نہیں اہتا تھا۔

''تم مطمئن رہو جمال......'' انور بڑبڑایا۔ ''دیوتا ناراض نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے۔ پھر میں یہاں پ کر نہیں جا رہا، بلکہ تمہاری اجازت لے کر جا رہا ہوں۔ پھر دیوتا کی ناراضگی کا کیا سوال؟ دوسری یہ کہ زارا بھی تو میرے ساتھ جانے پر راضی ہے۔''

''اچھا انور...... میرے دوست......'' جمال کا لہجہ ڈوبا ڈوبا سا تھا۔ ''دو روز بعد تم چلے جانا۔ میں اپنے میں اتنی طاقت تو پیدا کرلوں میرے دوست کہ تمہیں رخصت کر سکوں۔''

''مطمئن رہو جمال...... میں جلد ہی واپس آؤں گا۔''

''مجھے اُمید ہے انور...... میرے دوست......'' جمال کا لہجہ کپکپایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لرز رہے اُس نے تیزی سے شراب کا پیالہ اُٹھایا اور پھر غٹاغٹ پی گیا۔

اُسی شام کو انور محل کے باغ میں بیلچے کی مدد سے کھدائی کر رہا تھا۔ وہ ایک نیا پودا اپنے ہاتھوں سے لگانا تھا، جمال کے لئے بطور ایک نشانی کے...... وہ ہمہ تن اپنے کام میں مصروف تھا۔ اُس کا سارا بدن میں شرابور تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ زمین کھود رہا تھا۔ ابھی ابھی زارا...... اُس کی پیاری زارا اُسے پلا کر گئی تھی۔ وہ کھدائی کرتا رہا۔ زمین کا سینہ پھٹتا رہا۔ پھر بیلچے کی ایک ضرب کے زمین پر لگتے ہی کی آواز پیدا ہوئی...... وہ چونک پڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے مٹی ہٹا رہا تھا۔

پھر اُس کے جسم نے ٹھنڈا پسینہ چھوڑ دیا۔ مٹی کے نیچے ایک کھوپڑی تھی۔ وہ اُس کھوپڑی کو دیکھ کر پڑا۔ ایک مرتبہ اُس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر سب کو بلا لے۔ مگر اُس نے ایسا نہ کیا۔ وجہ جمال کی سے زیادہ اوہام پرستی تھی...... اگر جمال کو کھوپڑی کے بارے میں علم ہو گیا تو ہو سکتا ہے اُس کے میں اڑچن پڑ جائے۔

اُس نے پائپ سلگایا اور گہری گہری سانسیں لیتا ہوا وہیں مٹی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہیں اُس ہیبت کھوپڑی پر مرکوز تھیں جس میں نجانے کتنے خلاء تھے۔ دانت بھیانک انداز میں کھلے ہوئے تھے۔ ں کی جگہ دو سوراخ تھے، تاریک گہرے...... کسی غار کی طرح...... کالے کالے دانت وحشیانہ انداز ٹے ہوئے...... ناک کی جگہ مدھم سے نقش۔ اُس نے پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھا، پھر ر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے تیزی کے ساتھ دوسری جگہ کی مٹی کھودی اور اُس کھوپڑی کو وہاں دبا دیا...... پودا لگانے میں مصروف ہو گیا۔

پودا لگانے کے بعد اب وہ پائپ کے گہرے گہرے کش لیتا ہوا پالی کے میدان کی طرف چل پڑا۔ اندھیروں میں ڈوب چکی تھی...... اُس کا ہر انداز بجھا بجھا سا تھا۔ وہ سر جھکائے پالی کے میدان کی بڑھ رہا تھا۔ پالی کے میدان کی طرف اُس کی روانگی بڑی اندوہناک تھی۔ وہ باغ کی وحشت سے را پانے کے لئے پالی کے میدان کی طرف جا رہا تھا......!

❁❁❁

پراسرار قوتوں کا مالک شیطان اپنے جال پھیلائے انسان کو بھٹکانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ یہ انسان کا اپنا عمل ہے کہ وہ اللہ کے احکامات اور اُس کی یقینی مدد کے سہارے شیطان کی شیطنت کو ناکام بنائے۔ وحدہٗ لاشریک نے اس نافرمان لعین کو اجازت دی کہ جا میرے بندوں کو بہکا سکتا ہے تو بہکا۔ لیکن اس بات پر بھی یقین رکھ کہ جو میرے فرمانبردار ہیں، وہ کبھی تیرے جال میں نہیں آئیں گے۔ اور وہ، جو جان بوجھ کر میرے احکامات سے روگردانی کریں گے، دنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہوں گے۔ تمہارے ہر عمل کے لئے ہدایت موجود ہے بشرطیکہ ہدایت پر عمل کرنے والوں میں سے ہو......

انور ایک عمل سے چھٹکارا پانے کے لئے پالی کے میدان کی طرف جا رہا تھا...... مگر وہ بدنصیب...... انور...... کیا جانتا تھا کہ آنے والے لمحات اُس کے لئے کیا لائیں گے؟ اُسے کیا معلوم تھا کہ دُور پہاڑیوں کے پاس سے دو سرخ سرخ آنکھیں...... خوفناک سی...... خون میں ڈوبی ہوئی...... اُسے دیکھ رہی تھیں...... وحشیانہ انداز میں...... اُس بدنصیب کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ان دو سرخ سرخ آنکھوں کے پس منظر میں اُفق کی لالی تھی...... یعنی ان آنکھوں کا کوئی جسم نہیں تھا...... کوئی عضو نہیں تھا...... بلکہ وہ آنکھیں جزیرہ ہلو کے دیوتا کی آنکھیں تھیں......

وہ انور...... بدنصیب انور...... جو محل کے پائیں باغ سے اس لئے نکلا تھا کہ پالی کے میدان میں اُفق کی لالی دیکھ کر اپنی طبیعت میں کچھ رومانیت پیدا کرے گا۔ اس کھوپڑی کو بھولنے کی کوشش کرے گا۔ اُس بدنصیب کو کیا معلوم تھا کہ اس کھوپڑی سے بھی زیادہ حیران اور پریشان کر دینے والا واقعہ پالی کے میدان میں اُس کا منتظر ہے......!

وہ سر جھکائے پالی کے میدان کی طرف بڑھتا رہا۔ بڑھتا کیا رہا بلکہ گھسٹتا رہا...... کھوپڑی والے واقعہ نے اُس کے دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

پالی کے میدان میں پہنچ کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر وہ اُفق میں دیکھنے لگا۔

اب وہ سرخ آنکھیں معدوم ہو چکی تھیں...... وہ کھڑا رہا...... پھر وہ اُچھل پڑا......

اُس کی داہنی طرف میدان میں ایک شخص کھڑا تھا۔ ایک بڈھا...... سرتاپا سفید...... اُس بوڑھے آدمی کے جسم پر سفید لباس تھا۔ دُودھ سے زیادہ سفید۔ اُس کے سر کے بال رُوئی کے گالوں کی طرح سفید تھے...... داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی سفید تھے...... یہاں تک کہ اُس کی بھنوئیں بھی سفید تھیں...... اُس کے ہاتھوں پر، بانہوں پر بھی بال تھے...... سفید سفید...... وہ سرتاپا سفید تھا...... پھر وہ چل پڑا انور کی طرف۔ اُس کی چال خوابیدہ سی تھی...... ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چل نہیں رہا بلکہ تیر رہا ہے۔

انور وحشت زدہ نگاہوں کے ساتھ اُسے دیکھ رہا تھا......

پھر وہ انور کے نزدیک آ گیا۔ انور نے دیکھا...... آہ...... اُس بوڑھے کا تمام جسم...... ہر عضو سفید تھا۔ آنکھیں...... اُف، وہ اتنی ہی سرخ تھیں جیسے خون میں ڈوبی رہی ہوں...... وہ ان سرخ آنکھوں کے ساتھ چند لمحوں تک انور کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر بڑبڑایا۔

"لڑکے......" اُس کی آواز مدھم تھی۔ لرزتی ہوئی۔ "دیوتا نے تمہیں شراپ دیا ہے۔"

"آں......؟" انور چونک پڑا۔ مگر وہ بوڑھا...... وہ سفید ریش بزرگ غائب ہو چکا تھا۔

انور چند لمحوں تک گھبرایا ہوا سا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر گردن جھٹک کر محل کی طرف چل پڑا۔

دو روز بھی گزر گئے...... آج شام کو انور کو زارا کے ساتھ جزیرہ ہلونا چھوڑ دینا تھا...... جمال صبح سے ہی غمگین تھا۔ پشپا بھی رنجیدہ تھی...... افسوس زارا کو بھی تھا...... جزیرہ ہلونا چھوڑنے کا۔

جمال نے انور اور زارا کے لئے ایک سپاٹ کشتی اور ایک ملاح کا انتظام کیا تھا جسے اُن دونوں کو لائٹ ہاؤس تک پہنچا کر واپس آنا تھا۔ لائٹ ہاؤس تک پہنچنے کے بعد انور اور زارا کو کسی بھی بحری جہاز کا انتظار کرنا تھا جو اُنہیں ہندوستان کی بندرگاہ تک پہنچا سکے۔

جمال، انور سے کہہ رہا تھا۔ "تم جا تو رہے ہو میرے دوست...... مگر یہ یاد رکھنا کہ میری ہر سانس تمہارا انتظار کرے گی۔ میں ہر وقت تمہارا منتظر رہوں گا۔"

"مطمئن رہو جمال......" انور نے کہا۔ "میں بھی جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا۔"

"اس کے علاوہ......" جمال پُرخیال انداز میں بڑبڑایا۔ "زارا کی صحیح پوزیشن تم کسی پر واضح نہیں کرو گے۔"

"کیا مطلب......؟"

"یہی کہ زارا کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں کی رہنے والی ہے......؟" جمال بڑبڑایا۔ "ہر جگہ اور ہر فرد سے اس کی اصل پوزیشن چھپاؤ گے۔"

"مگر کیوں......؟"

"دیوتا کا حکم ہے۔" جمال بڑبڑایا۔ "اگر کوئی شخص یہاں سے باہر چلا جاتا ہے تو یہ اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ جزیرہ ہلونا...... یہاں کے باشندوں کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتائے اور نہ ہی اپنی اصلیت سے کسی کو آگاہ کرے۔"

"مگر......"

"نہیں میرے دوست...... تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا۔"

"اچھا......"

"تمہیں جمال کی بہادری کی قسم ہے۔ تم زارا کا راز کسی پر ظاہر نہیں کرو گے۔" جمال کہتا رہا۔ "خواہ پوچھنے والا تمہارا کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو۔"

"مطمئن رہو دوست...... ایسا ہی ہو گا۔"

"مجھے تم پر بھروسہ ہے...... اعتماد ہے۔"

"انور تمہارا مشکور ہے۔"

"اس کے علاوہ......" جمال بڑبڑایا۔ "وعدہ کر انور میرے دوست...... کہ تو جلد آئے گا۔ میں تیرا ہر وقت انتظار کروں گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" انور مسکرایا۔

پھر اُس رات...... جمال نے بلکتے ہوئے انور کو وداع کیا تھا۔

بہرکرات کے مشرقی کنارے پر جزیرہ ہلونا کی پوری آبادی کھڑی تھی۔

بیشتر آنکھیں نم تھیں...... جمال اور پشپا سسک رہے تھے......

انور نے زارا کو سہارا دے کر کشتی میں اُتارا۔ پھر کشتی لائٹ ہاؤس کی طرف پھسلنے لگی۔ جمال بھیگی پلکوں کے ساتھ ہاتھ ہلا رہا تھا......!

بہ دقت تمام انور اور زارا ہندوستان پہنچ گئے......

انور لاج کسی شفیق ماں کی طرح اپنی آغوش کھولے اُن کا منتظر تھا۔ بوڑھے شامو کی آواز اس روز مسرت کی شدت سے کپکپاتی ہوئی سی تھی۔

انور کے تمام دوست احباب وغیرہ اور شامو یہ سمجھ چکے تھے کہ انور مر چکا ہے۔ ظاہر تھا اُس اچانک آمد کی خوشیوں کا انبار ہی سمیٹ کر لا سکتی تھی۔

اُس روز انور لاج کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا...... ہوائیں انور لاج کی دیواروں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گنگنا رہی تھیں۔ کھڑکیوں پر لگے خوبصورت پردے سرسرا رہے تھے۔

انور لاج کا بوڑھا پھاٹک خوشی کی شدت سے جھوم رہا تھا۔ پائیں باغ کے پھول کھل اُٹھے تھے...... مسرت سے سرشار ہو کر جھومنے لگے تھے۔

بوڑھے شامو کی آنکھوں میں دو آنسو اور ہونٹوں پر ایک شفیق مسکراہٹ چپک کر رہ گئی تھی...... آنسو، جو خوشی کی آئینہ داری کر رہے تھے۔ جنہیں بوڑھے شامو نے جھاڑن کے کنارے سے کئی مرتبہ خشک کیا تھا۔

پھر وقت گزرتا چلا گیا۔

انور نے اپنے دوستوں کی موجودگی میں خاور کو بلا کر ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق، اپنے عقیدے کے مطابق زارا سے شادی کر لی۔

پھر شادی کے ہنگامے بھی سو گئے...... مہمان ایک ایک کر کے جانے لگے۔ انور نے اپنے سب سے زیادہ محبوب دوست خاور کو بھی اُس کے مسلسل اصرار پر رخصت کر دیا...... خاور بمبئی چلا گیا...... اپنی نورین کے پاس...... اُس رات...... جس کی صبح کو خاور نے بمبئی کے لئے روانہ ہونا تھا، تمام رات انور، خاور اور زارا ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہے...... زارا کافی تیار کرتی رہی۔

پھر دوسرے روز خاور بھی چلا گیا۔ ایک مرتبہ پھر بوڑھے شامو کی دُھندلائی ہوئی سی آنکھیں نم ہو گئیں...... اور یہ نمی کئی روز تک قائم رہی...... اور پھر دل میں خاور کی یاد رہ گئی۔

زندگی ساز بجاتی رہی...... انور، زارا کی آغوش میں جنت ڈھونڈتا رہا...... زارا ایک بہترین شریک حیات ثابت ہوئی۔

مگر...... انور جیسے لاابالی، بے فکرے، ایڈوانس اور رئیس نوجوان کو زارا کی صرف ایک بات کھٹکنے لگی۔

وہ یہ کہ زارا حد سے زیادہ شریف لڑکی ثابت ہوئی۔ یعنی زارا نے اُس کے ساتھ کلب اور ہوٹلوں وغیرہ میں جانے سے انکار کر دیا...... زارا کسی ایڈوانس لڑکی کی طرح شراب بھی نہیں پی سکتی تھی۔ شراب...... جو انور کی زندگی کا جزو لازم تھی۔ زارا کسی بھی کلب میں اُس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ایکریشن ہال کے چوبی فرش پر بے تکلف نہیں ہو سکتی تھی۔ زارا، انور کے دوستوں سے بے تکلف نہیں ہو سکی تھی سوائے خاور کے۔

اور یہی باتیں انور کو ناگوار محسوس ہوئی تھیں...... اُس نے اپنی شریک حیات کو چشم تصور سے ایک الٹرا ماڈرن لڑکی کے رُوپ میں دیکھا تھا۔ کلبوں میں ڈانس کرتے دیکھا تھا۔ مگر تصور کے بظاہر حسین جھروکے زارا کی پاکیزگی سے مسمار ہو کر رہ گئے تھے۔

زارا کی پاکیزگی...... حیا...... انور کے لئے اُس کا سب سے بڑا گناہ بن گئی۔

انور، زارا سے اُکتا سا گیا......

زارا کی آنکھیں بھرا گئیں۔

بوڑھا شامو، انگوچھے کے کناروں سے اپنی دُھندلائی ہوئی نم آنکھوں کو خشک کرتا رہا۔

پھر...... حد اُس وقت ہو گئی جب انور دوسری فلرٹ قسم کی لڑکیوں کو انور لاج میں لانے لگا۔

زارا سب کچھ برداشت کر سکتی تھی...... مگر یہ نا قابل برداشت تھا۔

انور لاج پر دُکھوں کے بادل چھا گئے...... تلخیوں کا ایک نہ مٹنے والا سلسلہ انور لاج پر مسلط ہو گیا۔ انور لاج میں ہر وقت چھوٹے چھوٹے جھگڑے جنم لیتے رہے...... روز ایک مرتبہ زارا اور انور میں نوک جھونک ہو جاتی۔

لیکن انور...... وہ روز ایک نئی لڑکی لانے لگا۔

کھڑکیوں پر آویزاں حسین پردوں نے سرسرانا بند کر دیا۔ ہواؤں نے نغمے بکھیرنے بند کر دیئے۔ اب ایسا ہی لگتا تھا کہ ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں...... ماتم کر رہی ہیں......

انور لاج کا بوڑھا دروازہ...... اب بالکل خاموش کھڑا رہتا...... اُس کے ہونٹوں سے چرچراہٹ کی کوئی آواز بلند نہ ہوتی...... انور لاج میں غم کی پرچھائیاں تھرکتی رہتیں...... زندگی ساز بجانے کی بجائے سسکنے لگی ایک کراہ کے ساتھ...... بوڑھے شامو کا کا دل رو لیا۔ اُس کا کپکپاتا ہوا ہاتھ زارا کے سر پر رہتا اور وہ زارا کو تسلیاں دیتا رہتا۔

اور ایک دن...... وہ ایک سانولی سی صبح تھی۔ کچھ کچھ ٹھٹھری ہوئی۔ ڈرائنگ رُوم کے آتش دان میں شعلے چیخ رہے تھے۔ بوڑھا شامو ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ لگا رہا تھا کپکپاتے ہاتھوں سے...... سردی کافی شدید تھی۔ زارا کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ انور باتھ رُوم میں تھا۔

"شامو کا کا......" زارا جس کی آنکھیں نم تھیں...... جس کے چہرے پر غم واندوہ کے بادل تھے، جس

کے جسم پر کالا لباس تھا، ماتمی...... بڑبڑائی۔

"کیا ہے بھئی......؟"

"وہ کل رات پھر ایک لڑکی کو لے کر آئے تھے۔"

"کیا......؟" شامو چونک پڑا۔

"ہاں بابا...... میں سچ کہہ رہی ہوں۔" زارا سسک پڑی۔

"آنے دے اُسے...... میں نے بہت برداشت کر لیا۔" بوڑھے شامو کی آواز کپکپا رہی تھی۔ "آج میں پوچھ لوں گا اُس سے بھی۔"

زارا سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ شامو کچن میں چلا گیا۔

انور تولیہ سے بال پونچھتا ہوا ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوا۔

"تم نے ابھی شامو کاکا سے کیا کہا تھا؟" انور کا لہجہ درشت تھا۔

"وہی...... جو مجھے کہنا چاہئے تھا۔"

"زارا...... اپنی کھال میں رہو...... میں زیادہ خودسری برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ سمجھی؟"

"انور......" زارا سسک پڑی۔ "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے...... تم ایسے تو نہیں تھے...... مم...... میں نے تمہارے لئے اپنا وطن چھوڑا، اپنا سب کچھ ہی تو چھوڑ کر تمہارے پاس آ گئی ہوں۔"

"مجھ پر کون سا احسان کیا ہے؟" انور غرایا۔ "میں روتا ہوں اُس گھڑی کو جب تم میرے پلے بندھ گئیں۔"

"انور......" زارا چیخی۔

"زارا......" انور غرایا۔ "میں اُونچی آواز سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

"آج آپ کو فیصلہ کرنا پڑے گا۔" زارا کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "اب مجھ میں زیادہ برداشت کی سکت نہیں ہے۔"

"تو تشریف لے جائیے یہاں سے......" انور کا لہجہ طنزیہ تھا۔ "صاف صاف بات ہے۔ یہاں رہنا ہے تو خاموش رہو...... روٹی کھاؤ، پانی پیو، کپڑا پہنو...... بس یہ بھی میرا احسان ہے۔ اگر یہ برداشت نہیں تو دفع ہو جاؤ یہاں سے......"

"انور......" زارا چیخی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو...... تم جس کے لئے میں نے ان گنت قربانیاں تھیں...... یہ تم کہہ رہے ہو انور؟ جس نے میرے سامنے ثانی کا سر توڑا تھا، صرف اس لئے کہ وہ کمینہ تھا، ذلیل تھا، غدار تھا، دھوکے باز تھا...... کیا میں تم سے پوچھ سکتی ہوں کہ تم میں اور ثانی میں کیا فرق رہ گیا ہے؟"

"زارا......" انور غرایا۔ "اپنی زبان قابو میں رکھو۔"

"آج میں چپ نہیں رہوں گی۔"

"زارا......" انور چیخا۔

"ہاں...... آج میں فیصلہ کر کے رہوں گی۔" زارا کھڑی ہو گئی۔ "اور زیادہ بربادی میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"خاموش زارا......"

"آج میں خاموش نہیں رہوں گی۔" زارا بھی خونخوار ہو رہی تھی۔ اور یقیناً کوئی خوفناک حادثہ جنم لینے
تھا...... ماحول یہی کہہ رہا تھا......

"میں تیری زبان کھینچ لوں گا......" انور زارا کی طرف جھپٹا۔

دوسرے ہی لمحے وہ زارا کا گلا اپنے طاقتور ہاتھوں سے دبا رہا تھا۔ یہ سب کچھ غصے کی شدت کی وجہ ہو رہا تھا۔ زارا کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخیں نکل رہی تھیں۔ انور کے ہاتھوں کی گرفت تیز سے تیز تر
تی جا رہی تھی......

پھر......

زارا کا جسم...... دراز قد زارا کا جسم کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح انور کی بانہوں میں آ رہا تھا......
ی سانس کی رفتار بند ہو چکی تھی......

انور چونک پڑا...... وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ زارا کو دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ تھا، مگر زارا کو مارنے
اُس کے ارادے کو دخل نہ تھا......

یہ سب کچھ جذبات کی شدت کی وجہ سے ہوا تھا۔ اُس کا جرم اُس کی بانہوں میں جھول رہا تھا...... اُس
شریک حیات، اُس کے جرم کا رُوپ دھار کر اُس کی بانہوں میں جھول رہی تھی۔

دروازے پر کھڑے شامو کی آنکھیں پھٹ گئیں...... وہ چیخ بھی تو نہ سکا......

پھر...... شامو کو کسی طرح سمجھا بجھا کر انور نے جرم کی پردہ پوشی شروع کی۔ زارا کے کفن کا انتظام کیا
۔ پھر اُسے کفن وغیرہ پہنا کر انور نے اُسے اپنے ہاتھوں پر اُٹھایا۔ شامو کاکا کے ہاتھوں میں مشعل تھی۔
کاکا انور لاج کے تہہ خانے کی طرف بڑھ رہے تھے ہاتھ میں مشعل تھامے۔ انور اُن کی تقلید کر رہا تھا۔

تہہ خانے میں ایک صندوق پہلے ہی رکھ دیا گیا تھا۔ انور کا خیال تھا کہ تہہ خانے میں ہی قبر کھود لی
ے۔ مگر دن میں یہ کام ناممکن تھا۔ کھدائی سے پیدا ہونے والا شور چیخ چیخ کر اُس کے جرم کو عیاں کر سکتا
لہٰذا طے یہ ہوا کہ فی الحال تو دراز قد زارا کی لاش کو تہہ خانے میں ایک صندوق میں بند کر کے رکھ دیا
ے۔ پھر رات کو بارہ بجے کے بعد قبر کھود لی جائے۔

وہ ماحول کتنا بھیانک تھا۔

تہہ خانہ...... تاریک ترین تہہ خانہ...... اُس میں مشعل کی زرد سی روشنی لرز رہی تھی۔ تہہ خانے کی
ریں کالی ہو گئی تھیں...... بدبو، سیلن...... وہاں رُکنا ناقابل برداشت تھا۔ پھر ایک کونے میں ایک
ے پر رکھا ہوا ایک صندوق...... شکستہ...... بوسیدہ سا...... جس کی لکڑی متعدد جگہ سے دیمک کی نذر ہو
ی۔ اور اُس صندوق کی طرف بڑھتے ہوئے دو آدمی...... ایک بوڑھا جس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔
اجوان...... جس کی بانہوں پر ایک دراز قد لاش کفن میں ملبوس جھول رہی تھی۔

ر...... چٹاخ...... ایک چمگادڑ اُن کے سر پر سے گزر گئی۔

پھر اُنہوں نے آگے بڑھ کر اس صندوق کو کھولا...... صندوق میں زارا کی لاش رکھی...... اور صندوا
ڈھک دیا۔ پھر وہ مڑ پڑے۔ اُنہوں نے تہہ خانہ طے کیا۔ لوہے کا وہ پھاٹک جس کے پٹ آبنوسی تھے
جن پر لوہے کی کیلیں جا بجا اُٹھی ہوئی تھیں، اُس پھاٹک کو بند کیا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئے۔ فرش
ڈھکا...... اور پھر فرش پر قالین بچھا دیا گیا......

بوڑھا شامو بھیگی آنکھوں کے ساتھ قالین صحیح کر رہا تھا۔ انور ایک کونے میں ٹکا ہوا ہانپ رہا تھا۔

پھر وہ دن گزر گیا...... وہ شام گزر گئی......!

انور کا دل تیزی کے ساتھ دھڑکتا رہا۔ اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا رہا۔ اُس کی پیشانی پر سخت سر
کے باوجود پسینے کے قطرات چمکتے رہے۔ جرم طرح طرح کی بھیانک شکلوں میں اُس کے سامنے ناچنے لگ

پھر شام، رات میں ڈوب گئی......

اُس نے کدال تھامی، تہہ خانے کی طرف چل پڑا۔ شامو گھریلو کاموں میں مصروف تھا۔

اُس کمرے میں پہنچ کر قالین اُٹھایا، فرش کا ڈھکن کھولا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ نیچے اُتر رہا تھا۔ سیڑھیا
طے کرنے کے بعد وہ اُس پھاٹک کو کھولنے لگا جس سے گزر کر اُسے تہہ خانے میں پہنچنا تھا...... پھاٹک
لوہے کا بنا ہوا تھا مگر جس کے پٹ آبنوسی تھے۔ جس کے اندرونی پٹ پر جا بجا کیلیں اُبھری ہوئی تھیں۔
لمبی لمبی، دو اِنچ قطر کی نوکیلی کیلیں......

اُس نے پھاٹک کھول دیا۔

مگر......

اوہ رحم کر خدایا...... تو رحم کر......!!

اُس کے ہاتھ خون میں لت پت ہو گئے...... اُس کے ہاتھوں پر ایک دراز قد کفن پوش مُردہ جھول
تھا...... پھاٹک کے آبنوسی پٹ چرچرا رہے تھے۔ اُس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ کوشش کرنے کے باوجود نہ
سکا۔

اُس نے ایک نظر لاش پر ڈالی...... آہ...... وہ لاش زارا کی تھی...... مگر اُس کے پیٹ سے خون نکل
کر جم گیا تھا...... اُس کے شانوں پر اُس کی سنہری زلفیں جھول رہی تھیں۔ وہ انور کے ہاتھوں پر تھی۔ ا
پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ اُسے دیکھ رہا تھا۔

پھر اُس کی نگاہیں رینگتی ہوئی اُس چبوترے پر مرکوز ہو گئیں جس پر وہ صندوق رکھا ہوا تھا...... مگر ا
صندوق وہاں نہیں تھا...... بلکہ نیچے گرا ہوا تھا...... ٹوٹا ہوا......

حقیقت اب اُس پر عیاں ہو چکی تھی......

زارا اُس وقت مری نہیں تھی...... بلکہ چند منٹوں کے لئے اُس کا سانس رُک گیا تھا...... یا وہ بے ہ
ہو گئی تھی۔ گھبراہٹ میں انور نے یہ سب کچھ کر ڈالا۔ پھر جب زارا کو ہوش آیا اور اُس نے جنبش کی
صندوق چبوترے پر سے گر پڑا...... گر کر ٹوٹ گیا......!

زارا سفید کفن میں ملبوس اُٹھی، گھسٹتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر شاید چیخ چیخ کر آوازیں د

رہی۔ پھر دروازے کو...... اُس آبنوسی پٹ والے دروازے کو جس پر کیلیں لگی ہوئی تھیں جھنجھوڑنے لگی۔ اسی
دوران میں بے ہوش ہو گئی۔ گرتے گرتے وہ کیل سے اٹک گئی...... کیل جس کی نوک اُس کے پیٹ میں
گھس گئی۔ پھر لٹکے ہی لٹکے وہ مر گئی...... خون جم گیا......!

حقیقت اپنا بھیانک منہ کھولے انور کو چڑا رہی تھی۔ انور کی آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔ پھٹی پھٹی
آنکھیں تہہ خانے میں رینگ رہی تھیں...... تہہ خانہ، جس کی دیواریں کالی تھیں، جہاں سیلن اور بدبو کا راج
تھا...... جہاں ایک آبنوسی پٹوں والا قاتل دروازہ تھا...... ایک شکستہ صندوق تھا...... ایک چبوترہ تھا...... ایک
لاش تھی...... دراز قد لاش...... کفن میں ملبوس...... جس کے نچلے دھڑ پر خون ہی خون جما ہوا تھا...... جس کی
آنکھیں نیم وا تھیں...... جس کی زلفیں شانوں پر لہرا رہی تھیں...... جس کے چہرے پر کرب کی تمام تر
علامتیں تھیں...... جس کے حسین دانتوں کی قطار اب بھی چمک رہی تھی۔

اور......

جیسے ہزار ہا خبیث رُوحیں اس چھوٹے سے تہہ خانے میں چنگھاڑ رہی ہوں...... چڑیلیں اپنا بھیانک
منہ کھولے، دانت باہر نکالے انور کی طرف بڑھ رہی تھیں...... بھوت رقص کر رہے تھے......

''آہ......'' انور کٹے ہوئے پیڑ کی طرح فرش پر گر پڑا۔

وہ رات انور کے لئے بہت بھاری تھی......!

زارا کی لاش کو دفنانے کے بعد انور کو ایک ایک لمحہ علیحدہ گزارنا دوبھر معلوم ہو رہا تھا......

اور اُس رات...... اُس نے شاید اپنی زندگی میں بیک وقت اتنی شراب کبھی نہ پی ہو گی جتنی اُس رات
پی تھی...... لیکن پھر بھی...... زارا کی رُوح...... اُس سفید کفن میں ملبوس، دامن پر خون کے دھبے لئے،
خوبصورت آنکھوں میں بھیانک پن کے ڈورے ڈالے اُس کے سامنے گھومتی رہی...... اور نہ جانے کتنی
مرتبہ انور کے حلق سے طویل چیخیں خارج ہوئیں...... بار بار اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں اُس کمرے میں مرکوز
ہو جاتیں جہاں سے تہہ خانے کو جانے والا راستہ تھا...... تہہ خانہ...... جہاں زارا دفن تھی......!

پھر دن گھسٹتے گئے......!

آہستہ آہستہ خبیث رُوحوں نے انور لاج کو اپنا مسکن بنا ڈالا...... چڑیلیں کھڑکیوں کے پرے اپنے
بھیانک دانتوں کی نمائش کرتی ہوئی کسی بھیانک راگ کی دھن پر ناچنے لگیں وحشیانہ انداز میں...... بھوت
اپنی مہیب شکلوں کے ساتھ رقص دیوانگی میں مصروف ہو گئے۔

وہ کمرہ، جس میں زارا رہتی تھی، وہاں جانے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ انور ایک مرتبہ گھسا، مگر کسی نے
اُس کے جبڑے پر ایک گھونسہ رسید کر دیا...... اُس کمرے میں اب بھی زارا کی گنگنانے کی آواز کی بجائے
رُوحوں کا دربار لگتا تھا۔ رُوحوں کا دیوتا وہاں آ کر رُوحوں کی حاضری سے خوش ہوتا تھا۔

انور کی زندگی ایک مجسم تلخی بن کر رہ گئی......

پھر انور نے شراب بکثرت استعمال کرنا شروع کر دی۔ روز رات کو اُس کے بستر پر نئی نئی لڑکیاں آنا
شروع ہو گئیں۔

لیکن ایک رات......

شارکر کی رُوح آئی...... زارا کی رُوح کے ساتھ۔

اُف...... یہ شارکر کی رُوح کتنی خوفناک تھی...... پھر روز رات کو شارکر اور زارا کی رُوحیں انور کو تنگ کرنے لگیں...... انور کی زندگی اجیرن ہوتی چلی گئی۔ ڈر اور خوف ہر وقت اُس کی زندگی پر غالب آتا چلا گیا...... جوانی، بڑھاپے کی آغوش میں جا چھپی۔ خوف اور ڈر اُس کی جوانی کو بڑھاپے میں بدلنے لگا...... اُس کے چہرے پر جھریاں پڑتی چلی گئیں...... بال سفید ہوتے چلے گئے...... ہر وقت کا خوف، ہر وقت کی فکر زندگی کو ایک دیمک کی طرح چاٹتی چلی گئی......!

صرف پانچ سال انور کو بوڑھا بنا گئے۔

شارکر کی رُوح کا صرف ایک مطالبہ تھا۔ ''انور...... تمہاری زندگی...... بقیہ زندگی جو کچھ بھی باقی ہے، صحیح طریقے سے اُسی وقت گزرے گی جب تم بحرکرات کے مشرقی کنارے آ جاؤ گے...... اور بس......''

''تو یہ ہے وہ زندگی......'' انور نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''ہوں......'' میں پُرخیال انداز میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''خاور......'' اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''کیا کوئی مہذب آدمی اس تمام کہانی پر یقین کر سکتا ہے؟ اُف...... بعض اوقات تو مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک بہت ہی لمبا اور بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں...... مگر...... حقیقت کسی بھیانک خواب سے بھی زیادہ بھیانک اور ٹھوس ہوتی ہے جس سے میں آج کل دوچار ہوں۔''

''ہوں......'' میں سگریٹ کا گہرا کش لے کر بڑبڑایا۔ ''ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جزیرہ ہلونا چلے جاؤ...... جیسا کہ شارکر کی رُوح کا مطالبہ ہے۔''

''مجھ میں اتنی سکت نہیں خاور...... پھر اگر میں وہاں چلا گیا تو نہ جانے وہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں؟ اُدھر اُس جزیرہ میں موت چنگھاڑتی پھرتی ہے خاور...... وہاں طاقت کا راج ہے۔ اور میں دس قدم چلنے سے بھی معذور ہوں۔''

''ہوں...... بہرحال میں سوچوں گا۔'' میں نے ایک لمبی جمائی لی۔ میری آنکھیں نیند کے دباؤ کی وجہ سے بوجھل سی ہو گئی تھیں۔ مگر تفکر میں ڈوبی ہوئی۔ فکر...... جو میرے دوست کے لئے میری آنکھوں میں تیرنے لگی تھی۔

''اوہ......'' انور بولا۔ ''تم جا کر سو جاؤ خاور...... دیکھو، میں کتنا بیوقوف ہوں کہ اب تک تمہیں بور کرتا رہا۔ اب تک یہی سمجھتا رہا کہ میری طرح تمہاری آنکھیں بھی نیند سے کبھی بوجھل نہیں ہوتیں۔''

''انور...... فکر مت کرو۔'' میں نے اُس کا شانہ تھپتھپایا۔ ''مجھ سے جو کچھ ہو گا میں کروں گا۔''

''ہاں، ہاں...... اب تم جا کر سو رہو۔'' انور بڑبڑایا۔ ''یہ نہیں دیکھتے کہ رات کے تین بج گئے ہیں۔''

''بہتر ہے......'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''شب بخیر......''

''شب بخیر......'' انور اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔

یں باہر نکل آیا۔ راہداری کو پار کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اور پھر پلنگ پر گر پڑا۔ آنکھیں بوجھل سی ہو رہی تھیں...... مگر پھر بھی میں سو نہیں پا رہا تھا۔ نیند مجھ سے کوسوں دُور تھی۔ میری وں میں پریشانیاں تھرک رہی تھیں۔ میں سگریٹ پھونکتا رہا......

ساڑھے تین بج گئے...... کلاک نے ساڑھے تین بجے کا گجر بجایا اور میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر ی طاری ہو رہی ہے۔ میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں ٹھونس دیا اور لیٹ گیا۔

وہ چیخ ایک طویل اور کربناک چیخ تھی...... میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ میرے کمرے کی کھڑکیوں پر آسیب سائے منڈلا رہے تھے۔ سکوت کے منظر میں ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت ہی بھیانک راگ چھڑا پھر میں نے بیک وقت ہزارہا خبیث رُوحوں کے چلانے کی آوازیں سنیں...... بھوتوں کے قہقہے ں کی غراہٹیں......

میں پورے بدن سے کانپ کر رہ گیا۔

ایک اور چیخ فضا میں بازگشت کر کے معدوم ہو گئی...... میں ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھا۔ میرا رُخ انور کے ے کی طرف تھا۔ انور کے کمرے سے ہی چیخوں کی آواز آ رہی تھی۔ انور کے کمرے کے دروازے پر یک جھٹکے کے ساتھ رُک گیا......

اُف...... میں اپنا سر بھی تو نہیں پکڑ سکتا تھا...... کمرے میں شارکر اور زارا کی رُوحیں موجود تھیں۔ ر کے چہرے پر وہی شیطنت کے آثار تھے...... اور...... ایک اضافہ تھا...... خوفناک اضافہ...... اُس نے ہاتھ کی ہتھیلی سے ایک کیل چپکی ہوئی تھی۔ پھول والا سرا جس کا قطر دو انچ رہا ہو گا، اُس کی ہتھیلی ا ہوا تھا...... اور آگے کی نوک...... آہ، وہ میرے بدنصیب دوست انور کے سینے میں پیوست ہو چکی ...... میرے ہاتھ پیر کپکپا رہے تھے...... میں مزاحمت بھی تو نہیں کر پا رہا تھا۔

شارکر پے در پے میرے دوست پر وار کر رہا تھا...... پھر...... اُف زارا میری طرف بڑھی۔ اُس کے ے خون کا فوارہ اُبل رہا تھا......

''خاور بھیا...... ہم انور کو لے جا رہے ہیں۔'' زارا میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی خوابناک سے لہجے بڑائی۔

''زارا......'' میں چیخ پڑا۔

''خاور......'' زارا کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''شاموکا کا......'' وہ میرے پیچھے دیکھنے لگی۔ میں نے ڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے شاموکا کا کھڑے تھے۔ اُن کا چہرہ کسی بھی قسم کی کیفیات سے یکسر عاری تھا۔ سپاٹ......!

''میں انہیں لے جا رہی ہوں......'' زارا ہم دونوں سے کہہ رہی تھی۔ ''یہاں انہیں آرام نہیں مل سکتا۔ خاور بھائی، آپ کا انتظار کر رہی تھی۔''

''چپ رہ ڈائن......'' میں چیخ پڑا۔ ''اپنی گندی زبان سے میرا نام بھی مت لے۔ تو کسی چڑیل کی میرے دوست کی زندگی پر چھا گئی...... اور اب...... مجھے بھیا کہہ رہی ہے؟''

"وہ دیوتا کا حکم تھا۔" زارا سسکی۔ "مجبور تھی میں خاور بھیا......"

"خاموش رہو......" میں اپنی پوری شدت کے ساتھ چیخا تھا...... اور...... اُسی لمحہ انور زمین پر گر
تھا...... اُس کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل رہا تھا...... وہ...... وہ ختم ہو چکا تھا......!

"آ...... ہا...... ہا...... ہا......" شار کر قہقہے لگا رہا تھا۔ "اس بدنصیب نے میری بیٹی کی جان لی تھی اور اب...... آ...... ہا...... ہا...... دیوتا کا حکم...... آؤ انور...... اب چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

زارا مڑی...... پھر...... میں ہل بھی تو نہیں پا رہا تھا۔

آہ...... میں نے دیکھا...... شار کرنے انور کی لاش کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھا لیا تھا......

پھر...... وہ اور زارا...... تقریباً تیرتے ہوئے کھڑکی سے باہر نکل کر دُور خلاؤں میں گم ہو گئے......

شاموکا کا قہقہے لگا رہے تھے...... وحشیانہ انداز میں...... میں غصے کے عالم میں تیزی کے ساتھ آنسوؤں کو روندتا ہوا اُس کمرے کی طرف بڑھا جہاں سے تہہ خانے کا راستہ تھا...... تھوڑی دیر بعد قالین ہٹا کر نیچے تہہ خانے میں اُتر رہا تھا۔

سیڑھیاں پار کرنے کے بعد میں نے دروازہ کھولا...... آہنی دروازہ...... آہ...... اُس کے آہنی میں لگی ہوئی کیلوں میں سے ایک کیل غائب تھی...... اور...... جہاں زارا دفن تھی...... وہ جگہ کھدی تھی...... وہاں سے زارا کی لاش غائب تھی...... زمین پر ایک بیلچہ اور کھوپڑی پڑی تھی......!

شاموکا کے وحشیانہ قہقہوں کی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی......

اس واقعہ کو دو روز گزر چکے ہیں۔ میں اب انور لاج نہیں، بھوت لاج میں مقیم ہوں۔ میرا ذہن کر رہ گیا ہے۔ میرا دماغ پراگندہ ہو کر رہ گیا ہے۔ دن میں بار ہا میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں انور کو یاد کر کے۔ اپنے دوست کو جس کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا......

انور لاج اب بھوتوں، چڑیلوں اور رُوحوں کی مملکت ہو گئی ہے...... اب انور لاج کے کمروں بھوتوں اور چڑیلوں کا رقص ایک بھیانک راگ کی دھن پر ہوتا ہے...... اور...... آپ یقین کریں گے؟ کبھی شاموکا بھی وحشیانہ انداز میں ناچنے لگتا ہے...... جب وہ ناچتے ناچتے تھک جاتا ہے تو قہقہے لگ لگتا ہے...... پھر چیخ چیخ کر کہتا ہے۔

"لے گئے...... میرے چھوٹے بابو کو لے گئے...... آ...... ہا...... ہا...... ہا...... بھوتوں کے دیس لے گئے اُدھر......" اُس کا انداز پُرخیال سا ہو جاتا ہے۔ "جہاں کھوپڑیوں میں پانی پیا جاتا ہے...... قدم قدم پر موت رقص کرتی ہے...... رُوحوں کے دربار لگتے ہیں...... چڑیلیں ناچتی ہیں...... آہ، وہاں گئے۔"

میں خاموش بیٹھا یہ سب کچھ سنتا رہتا ہوں...... اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں...... آپ ہی بتائیے جناب......

انسان کو شیطان سے بچنے کا مکمل تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ عام طور سے اُسے لاحول کے ورد سے جاتا ہے۔

ناگ چندر نے شیطان سے پوچھا۔ "جے اشیش بھگونتا...... تمہارے پنچھی اُڑتے کیوں جا رہے؟"

ٹری میں آتما نہیں ہے۔ میں تو صرف تمہارا چیلا ہوں جو تمہارے حکم کی پابندی کرتا ہوں۔ لیکن
......"

نچھ میں ایک خوبی ہے۔"

کیا......؟"

تیرے پاس مجھے مارنے کے ہتھیار نہیں ہیں...... جبکہ مسلمانوں کے پاس......"

جے بھگونتا...... تیرے پاس کوئی اپائے نہیں ہے؟ دوسری بات، رادھا، رما، راگنی اور روپا تو مسلمان ہیں، وہ تیری مٹھی سے کیوں نکلتی جا رہی ہیں؟"

آہ...... اس کا کارن وہ پراسرار عورت ہے جس کی وجہ سے مجھے بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔" شیطان درگی سے کہا۔ پھر بولا۔ "ناگ چندر...... تو ایک کام کر۔"

حکم دے بھگونتا......"

دوسرے ابھی تک وہ کرنے میں ناکام رہے ہیں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔"

کیا کرو گے بھگونتا......؟"

ایسے نیک اور ایماندار گھرانوں کا شکار جن کی بلی دی جا سکے......" پھر شیطان، ناگ چندر کو آہستہ کچھ بتانے لگا۔ پھر بولا۔ "یہ ان لڑکیوں کو قابو میں لانے کی آخری کوشش ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

لیکن لڑکیوں کو قابو میں لانے کے لئے یہ ایک الگ عمل ہے۔"

ہاں...... میرے کام تو نہیں جانتا۔"

شیطان اپنی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے؟ اُس کے منصوبے کے تحت جس کو شیطان نے اپنا شکار بنایا اُس کا رابطہ کسی طرح ایمان علی سے ہو گیا۔ اُس نے ایمان علی اور کو اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا۔

میں ایک شیطانی رُوح کے جال میں پھنس گیا ہوں جناب...... وہ ایک حسین عورت کی شکل میں ساتھ رہ رہی ہے۔" نوجوان ماضی کے واقعات سناتے ہوئے بولا۔ "کچھ بزرگوں نے رہنمائی کی اور مجھے چار کیلیں پڑھ کر دیں، جنہیں میں نے اپنے گھر کے چاروں کونوں میں گاڑھ دیا۔ اسے فارغ ہو کر جب میں اندر پہنچا تو میں نے اُس کے کمرے میں روشنی جلتی ہوئی دیکھی۔ پتہ کہ نے میرے بارے میں چھان بین کی یا نہیں؟ لیکن بہرطور میں خاموشی سے جا کر اپنے بستر پر لیٹا۔ پورا بدن پسینے سے تر ہو رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اب نجانے کیا ہوگا؟

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں نے اُٹھ کر دُور سے اُس کے کمرے کو دیکھا، روشنی بجھ چکی تھی۔ اس کا ہے یا تو وہ آرام کرنے لیٹ گئی ہے یا اپنے کسی شیطانی عمل کا شکار ہے...... میری آنکھوں میں البتہ گی اور میں بہت سی باتیں سوچ رہا تھا۔

سوچ رہا تھا کہ تقدیر نے کیا انوکھا گل کھلایا ہے۔ کیسے برے چکر میں پھنسا ہوں...... واقعی عقل لینا چاہئے تھا...... یہ سارا کھیل ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کوئی خاص معلومات بھی نہیں تھیں۔

فقیروں نے جو مرمت کی تھی وہ بھی میرے ہوش وحواس پر برق بن کر گری تھی۔ جو الفاظ اُنہوں نے کہے
تھے وہ ملامت آمیز تھے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ حرام وحلال کی تمیز چھوڑ دی میں نے۔ واقعی سچ بات تو تھی
لیکن اب کیا کروں؟ اب تو مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں...... کیسے جان بچاؤں گا اس سے؟
رات انہی سوچوں میں گزر گئی۔ صبح کے وقت نیند آ گئی۔ پتہ نہیں کیا ہوا؟ کوئی ساڑھے دس بجے آ
کھلی۔ میں نے چونک کر گھڑی دیکھی اور پھر منہ ہاتھ دھوئے بغیر باہر نکل آیا۔ راہداری میں دوڑتا ہوا ا
کمرے تک پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی ہے۔ اُس کے چہرے
مسکراہٹ تھی اور اُس کا سارا وجود بہت حسین نظر آ رہا تھا۔ وہ پُرسکون تھی۔
دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ ابھی تک اس بات سے واقف نہیں ہو سکی کہ اُس کے خلاف کیا ساز
کی گئی ہے؟ یا پھر وہ اس سازش پر حاوی ہو گئی ہے۔ میں اُلٹے قدموں واپس پلٹا۔ نہایا دھویا اور اس
بعد لباس وغیرہ تبدیل کر کے میں اُس کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ اتنی دیر میں وہ تیار ہو چکی تھی۔
نے دروازے پر دستک دی تو وہ بولی۔
''آ جاؤ...... اب تم کچھ زیادہ تکلف نہیں برتنے لگے؟''
میں نے دیکھا کہ وہ ایک خوبصورت لباس میں ہے۔ لیکن لباس گھریلو ہی تھا۔ یعنی وہ کہیں جا
ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ چہرہ اتنا حسین نظر آ رہا تھا جس طرح کہ پہلے دن نظر آ رہا تھا۔ خاموشی سے می
صورت دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔
''کیا بات ہے...... کیا آج کل راتوں کو نیند نہیں آ رہی؟''
''نہیں...... پچھلی رات میں ذرا دیر سے سویا تھا۔''
''کیوں اپنے وجود کو گھن لگا رہے ہو......؟''
''ہاں...... کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔''
''مگر کیوں......؟''
''بس...... ایک بیزاری سی ذہن پر سوار ہے۔''
''اس کے لئے تمہیں کوئی طریقہ کار دریافت کرنا پڑے گا۔''
''کیا طریقہ...... یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔''
''یہ تو میں بھی تمہیں نہیں بتا سکتی۔''
''تم......؟''
''ہاں......''
''تم مجھے کوئی مشورہ تو دو مجھے۔''
''میں مشورہ دیتی ہوں...... تم مانتے نہیں ہو۔''
''اب بتاؤ۔''
''بھئی اپنی دوستیاں بڑھاؤ۔ جن لوگوں سے رابطے قائم کرنا چاہتے ہو کرو۔ ضروری ہے، اس

ں فائدہ بھی ہوگا، طبیعت بھی بہل جائے گی۔ مال و دولت کی کوئی کمی نہیں ہے تمہارے پاس۔ نوکری
نے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں، اگر اپنے لئے کوئی مشغلہ اختیار کرنا چاہو تو کر لو۔ مجھے کوئی اعتراض
ہے۔''
''میں اس بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔''
''غور ہی کرتے رہو گے یا عمل بھی کرو گے؟''
''نہیں...... عمل بھی کروں گا۔''
''ناشتہ تو نہیں کیا ہوگا......؟''
''تم نے کر لیا......؟''
''ہاں......''
''میرے لئے کسی سے مناسب ناشتہ منگوا دو۔'' میں نے کہا اور اُس نے گردن ہلا دی۔ میں سوچتا رہا
اب کیا کروں؟ نجانے وہ گھر میں کیوں ہے؟ ہو سکتا ہے اُسے میری کارروائی کا علم ہو گیا ہو۔ لیکن
کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔
شتہ کیا۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ شام ہو گئی۔ اُس کے ساتھ باہر لان پر آ گیا۔ رات کے نو بج گئے۔
کا کھانا کھایا۔ آج وہ پورا دن گھر پر ہی گزار رہی تھی۔ ایک بار بھی اُس کے چہرے سے اس بات کا
ہیں ہوا تھا کہ کوئی اہم بات ہے۔
ات کو گیارہ بجے اُس نے مجھے مسکراتے ہوئے انداز میں دیکھا اور بولی۔
''کیا خیال ہے...... سونے جا رہے ہو......؟''
''جیسا تم کہو۔''
''جاؤ، سو جاؤ۔''
''ٹھیک ہے......'' میں نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔ وہ مجھے میرے کمرے کے
ے تک چھوڑنے آئی تھی۔
ں اندر داخل ہو گیا۔ پھر میں نے روشنی بھی گل کر دی۔ لیکن جاگتا ہی رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔
مجھے کیوں یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی سنسنی خیز بات ضرور ہونے والی ہے۔ اور میرا اندازہ درست
دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تھی...... لمبے گھنے بال اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور
دنے کے باوجود اُس کا آتشیں چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ بڑے پُروقار انداز میں ایک ایک قدم آگے
ہوئی دروازے کی جانب جا رہی تھی۔ میں نے اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ عمارت کے صدر
ے سے باہر نکل گئی اور میرا دل دھڑکنے لگا۔ جو کچھ ہو جانے والی کیفیت تھی، اب وہ اور شدید ہوتی
لی۔
را اندازہ درست نکلا۔ وہ دروازے پر پہنچی۔ گیٹ کا چوکیدار غالباً سو رہا تھا اور گیٹ پر موجود نہیں
انے گیٹ پر پہنچنے کی کوشش کی۔ لیکن اچانک ہی ایک زبردست سفید رنگ کا شعلہ بھڑکا اور وہ گھبرا

کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ شعلہ اتنا روشن تھا کہ سارا ماحول ایک لمحے کے لئے روشن ہو گیا تھا...... بالکل اسی طرح جیسے بجلی کڑکتی ہے۔ ایک دم سے مجھے کاجل کی وہ لکیر یاد آ گئی تھی۔ وہ ششدر کھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحے تک وہ کھڑی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اور پھر اُس نے دوبارہ قدم آگے بڑھائے۔ لکیر تک پہنچی تو ایک دم سے شعلہ پھر روشن ہو گیا۔ اور اس بار آگ دیر تک رہی تھی۔ اُس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی جو وہاں تک سنی جا رہی تھی جہاں میں موجود تھا۔ اُس نے کہا۔

''چوکیدار...... چوکیدار کہاں مر گیا تو......؟''

چوکیدار جو تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا گھبرا کر اُس کے قریب آ گیا۔ ''جی بی بی صاحب......؟''

''یہ...... یہ سب کیا ہے؟''

''کہاں بی بی صاحب......؟''

''بھئی دیکھو، یہ سب کیا ہے؟'' اُس نے کہا اور ایک قدم پھر آگے بڑھایا۔ جیسے ہی اُس کے پاؤں نے لکیر کو چھوا، شعلے اُبل پڑے...... چوکیدار کی تو گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ چیخ مار کر دوڑا اور اوندھے منہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

وہ آگے بڑھی۔ اُس نے چوکیدار کو گریبان سے پکڑ کر اُٹھایا اور اُسے بے ہوش پا کر زور سے دھکا دے دیا۔ ''بزدل...... کمینہ کہیں کا...... مگر...... مگر کیا ہے یہ سب کچھ...... کیا ہے؟''

اور پھر وہ دوڑتی ہوئی گھر کی ایک دیوار تک پہنچی۔ اُس نے دیوار پر ہاتھ جمائے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عورت ہو کر، اتنی خوش لباس اور خوبصورت ہو کر کوئی ایسا قدم اُٹھائے گی...... لیکن اُس کے انداز سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ شاید دیوار کود کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن جیسے ہی اُس نے دیوار چھوئی، پوری دیوار سے سرخ شعلے اُبل پڑے اور وہ چیخیں مارتی ہوئی وہاں سے پیچھے ہٹ گئی۔

اور اس کے بعد اُس کی دیوانگی دیکھنے کے قابل تھی۔ گھر کے ہر گوشے کو وہ دیکھ رہی تھی۔ اور ہر جگہ سے آگ اُبل رہی تھی۔ میں ساکت و جامد کھڑا ہوا تھا...... ملازم بھی جاگ گئے تھے اور یہ سب دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا تھا۔ کوئی کچھ نہیں بولا تھا۔

پھر اچانک ہی میں نے ایک اور بھیانک منظر دیکھا...... وہ زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ کالے لباس میں وہ اپنا سر گھٹنوں میں دے کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ اور چند لمحوں کے بعد اس منظر نے میرے ہوش و حواس ہلا دیئے...... سو فیصدی کالی بلی تھی وہ...... اُس کی آنکھیں بلبوں کی مانند چمک رہی تھیں، لیکن اُس کی جسامت کسی کتے کے برابر تھی۔ اتنی بڑی جسامت کی بلی شاید کبھی کسی انسان کی نظروں سے نہ گزری ہو۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹی اور اس کے بعد اُس نے چھلانگ لگا کر دیوار پر چڑھنا چاہا۔ لیکن جیسے ہی اُس کے کندھے دیوار سے ٹکرائے، دیوار سے شعلے اُبلنے لگے اور وہ کئی قلابازیاں کھا کر پیچھے گری۔ اور اس کے بعد اس رہائش گاہ میں ایک خوفناک ہنگامہ شروع ہو گیا......!

پتہ نہیں اس ہنگامے کی آواز باہر تک جا رہی تھی یا نہیں؟ ملازم ایک بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ بلکہ سب کے سب ڈرے سہمے ہوئے اپنی جگہ دبکے ہوئے تھے یا پھر خوف سے بے ہوش ہو چکے تھے۔ کسی کی کوئی

نہیں آ رہی تھی۔ البتہ ایک بلی کے چیخنے اور غرانے کی آواز نے پوری عمارت میں شور برپا کیا ہوا تھا۔ ا رہی تھی، پنجے زمین پر مار رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھی۔ چاروں طرف ایک خوفناک بلی کی ر دوڑتی پھر رہی تھی۔ دیوار پر جہاں بھی اُس نے چڑھنے کی کوشش کی، ہر جگہ آگ کے شعلوں نے اُسے شکار بنانے کی کوشش کی اور وہ وہاں سے پیچھے پلٹ پڑی۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک یہ ہولناک کھیل جاری رہا۔ اور اگر اس کھیل کو دیکھنے والا کوئی انسان ہوتا تو طور پر اُس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی ہوتی۔ ایسا ہی خوفناک منظر تھا......

میری جو کیفیت تھی میں وہ بھی محسوس کر رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ بابا کریم بخش مجھے وقت پر اس مزار لے جاتے اور مجھے سہارا نہ مل جاتا تو میں یقینی طور پر اس بدروح کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا جو انتہائی ر تھی۔

جب وہ تھک گئی تو اسی طرح زمین پر بیٹھ گئی۔ اور چند لمحات کے بعد جب اُس نے سر اُٹھایا تو وہ بلی عورت تھی۔ اور تھکی تھکی نظر آ رہی تھی...... پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چل پڑی میں نے پھرتی سے اپنے کمرے کی جانب دوڑ لگا دی۔ میرے سینے میں سانس نہیں سما رہی تھی۔ اس اگر وہ میرے پاس آ جاتی تو میری کیفیت دیکھ کر یقینی طور پر اس بات سے ہوشیار ہو جاتی کہ اُس کے جو کچھ بھی کیا گیا ہے، اس کا کرتا دھرتا میں ہوں۔ کاش وہ اِدھر نہ آئے۔ اور اُس کو روکنے کے لئے نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ لیکن کسی بدروح کا بند کمرے کا دروازہ کھول لینا مشکل نہیں لیکن وہ اس طرف آئی ہی نہیں تھی۔ کیونکہ آدھا گھنٹہ، پونا گھنٹہ، پھر ایک گھنٹہ گزر گیا اور کمرے کے ے پر کوئی آہٹ نہیں اُبھری۔

آہ...... میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس نے میرے ہوش و حواس اس بری طرح خراب کئے تھے کہ میں طرح چکرا رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین گھوم رہی ہو...... اپنے آپ کو سنبھالنا ایک مشکل کام رہا تھا۔

اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ ایک مکمل بدروح ہے۔ لیکن اس خوبصورت کہانی اس کا کیا تعلق ہے......؟ یہ خاص طور سے اس آبادی تک کیوں پہنچی تھی؟ کیا چاہتی ہے وہ مجھ سے؟ بلی بن کر جس طرح اُس نے اُچھل کود مچائی تھی، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کمبخت کافی طاقتور ہے۔ کیا میں اس کو روک سکوں گا؟ کیا کوئی ایسا لمحہ نہیں آ جائے گا کہ یہ خود میری جان لے لے؟ اس اپنے آپ کو بچانا مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔

بہرحال آنکھوں آنکھوں میں صبح ہو گئی۔ مجھے یہ خوف تھا کہ نجانے دن کی روشنی میں اُس کا کون سا سامنے آئے؟ یہ ایک پریشان کن بات تھی۔ سوچنا تھا کہ کیا، کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے؟ کافی وقت طرح گزر گیا تھا۔ پھر صبح کی روشنی نمودار ہو گئی تھی۔ اور میں اُٹھ کر غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ غسل میں داخل ہونے سے پہلے دروازہ کھول دیا تھا۔ بہرحال اُس کا سامنا تو کرنا تھا۔ اگر وہ اندر آ جاتی دیکھنا ہو گا کہ اُس کا رویہ کیا ہوتا ہے؟ حقیقتاً میرے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے اُس

کے آنے کی آہٹ ذرّہ برابر بھی نہیں سنائی دی تھی۔

غسل خانے سے باہر نکلا تو اُسے اپنی مسہری پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ شاید غسل کر کے آئی تھی۔ اُس کے لمبے بال لہرا رہے تھے۔ چہرہ پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھی۔

ایک لمحے کے لئے تو دل کانپنے لگا۔ جی چاہا کہ دروازے سے نکل کر باہر بھاگ جاؤں۔ لیکن بالکل مناسب نہ ہوتا۔ میں باہر آ گیا اور اُس نے میری آہٹ پا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں آپ کو بتا نہیں سک کہ ان آنکھوں میں کس بلا کی نشہ آلود کیفیت تھی...... ہونٹوں پر ایک سبک سی مسکراہٹ تھی۔ اتنی دلکش لگ رہی تھی وہ اُس وقت کہ انسان اگر واقعی انسان ہو تو دنیا کو بھول کر حواس کھو بیٹھے اور اُس کے قدموں میں گر ہو جائے۔ لیکن انسان اگر رات کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو اور اس کے بعد ایسا کر کے د دے تو اسے واقعی ہم سپر مین کہیں گے۔ اُس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ پھر ن آلود لہجے میں بولی۔

''چائے منگواؤ...... میں بہت تھک گئی ہوں۔''

میں نے موقع غنیمت جانا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ لیکن پھر میرے قدم رُک گئے۔ گھر سے باہر نکل کر بھاگ بھی تو نہیں سکتا تھا۔ جاتا بھی تو کہاں جاتا؟ اپنے آپ کو بالکل مفلوج کر کے رکھ لیا تھا۔ اور کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ پھر میں نے خود کو سنبھالا، ملازم سے چائے کے لئے کہا، پوری طرح آنے وا واقعات کے لئے اپنے آپ کو تیار کر کے اندر آ گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا......

وہ پھر بستر پر دراز ہو گئی تھی اور مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اُس کی جانب دیکھا۔ اس وقت اُس جو انداز تھا بلاشبہ وہ اس سے زیادہ حسین پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔ پھر اُس نے مدھم لہجے میں مجھے پکارا اور میں چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

''جی......''

''ایک بات بتاؤ گے......؟''

''ہاں...... کیوں نہیں؟''

''کیا میرا وجود اب تمہارے لئے کشش کھو بیٹھا ہے......؟''

''بالکل نہیں...... تمہیں یہ احساس کیوں ہوا؟''

''سچ بولنا اچھی بات ہے۔ اور سچ سے بہت سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ سچ بولو...... فریب نہ کرو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرے اندر یہ خیال پیدا ہی ہوا ہے جس کی وجہ سے میں نے تم سے یہ سوال کر لیا۔''

''وجہ......؟''

''تم مجھ سے بہت دُور رہتے ہو۔ تمہیں میری قربت کی خواہش بھی نہیں ہے۔''

''نہیں...... تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ اگر یہ خیال تمہارے دل میں پیدا ہوا ہے تو کیا تم نے اس کی وجوہات پر غور نہیں کیا؟''

''نہیں...... نہیں کیا۔''

''خود غور کرو۔''

''پلیز، مجھے بتاؤ۔''

''تم اس دوران کتنے وقت میرے ساتھ رہی ہو؟''

''ہر وقت۔''

''نہیں، ایسا نہ کہو...... تم جانتی ہو کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، وہ غلط ہے۔''

''تمہیں شکایت ہے مجھ سے؟''

''نہیں...... تم خود دیکھو، مجھے نہیں معلوم کہ تم کہاں جاتی ہو...... کیا کرتی ہو...... کچھ بھی نہیں معلوم ہے...... اور معلوم کر بھی نہیں سکتا۔ میرے پاس اس کے ذرائع بھی نہیں ہیں۔''

''ہاں، کہہ سکتے ہو۔ واقعی کہہ سکتے ہو...... لیکن ایسی بات ہے نہیں۔''

''شاید تمہارا کہنا درست ہو۔''

''اچھا یہ بتاؤ، ناراض ہو مجھ سے؟''

''ناراض نہیں ہوں...... بس مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے اور بہت کچھ کر رہی ہو...... میرا خیال ہے کہ مجھے اس کے صلے میں خاموش ہی رہنا چاہئے۔''

''اوہ...... مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری طرف سے تم اتنے بددل ہو چکے ہو...... اچھا یہ بتاؤ، اس کے علاوہ اور کوئی شکایت؟''

''تمہارے خیال میں کیا ہو سکتی ہے......؟''

''مجھ سے ہی سوال کئے جا رہے ہو۔ میں کہہ رہی ہوں، تم مجھے بتاؤ۔''

''نہیں...... میں اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں نے اس دوران تمہارے لئے کچھ نہیں کیا ہے۔''

''تو کچھ کرو نا میرے لئے۔''

''بتاؤ، کیا کروں؟''

''محبت کرو مجھ سے۔ اپنے دل میں میرے پیار کو قائم رکھو...... کچھ کرنے سے اگر تمہاری مراد دولت کا حصول ہے تو یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت کچھ ہے ہم دونوں کے پاس۔ ہم اس کے خواہشمند نہیں ہے۔ ہاں، اس سے ہٹ کر جو تمہاری ذمہ داریاں ہیں وہ تم پوری کرو۔''

''کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''آؤ، آج کوئی اچھا سا پروگرام بناتے ہیں...... یہ کیا کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہ گئے ہیں۔''

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُسے دیکھا۔ نجانے کیسا پروگرام بنانا چاہتی ہے؟ اتنی دیر میں ملازم چائے لے آیا۔ جب وہ چلا گیا تو اُس نے مجھے بڑی لاڈ بھری نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"بناؤ چائے...... آج میرے اوپر بڑی کہولت سوار ہے۔"

میں جانتا تھا کہ یہ کہولت کیسی ہے...... میں نے اُسے چائے بنا کر دی۔ اپنے لئے بھی چائے بنائی اور وہ کہنیوں کے بل اُٹھ کر گرم چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ جبکہ میں اتنی گرم چائے کو ہونٹوں سے نہیں لگا سکتا تھا۔ عام حالات میں، میں نے اُسے کبھی اتنی گرم چائے پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر کسی قسم کی تکلیف کے آثار بھی نہیں تھے۔ بڑے مزے سے وہ چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔

"اگر زندگی سے اُکتاہٹ ہو رہی ہے تو یہاں سے کہیں اور چلیں...... کسی اور ملک، کسی اور جگہ...... تمہارے پسند کے کسی شہر۔"

"نہیں...... اُکتاہٹ نہیں ہو رہی...... بس تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔"

"میں چلی جاتی ہوں اس لئے؟"

"ہاں...... ظاہر ہے، تمہارے بعد تو یہاں صرف ملازم رہ جاتے ہیں نا۔"

"تم ایسا کرو کہ ایک سیکرٹری رکھ لو...... لیڈی سیکرٹری۔" اُس نے تجویز پیش کی۔

"پھر......؟"

"اُس سے بات چیت کر لیا کرو۔"

"اور تم یہ نہیں بتاؤ گی کہ تم کہاں جاتی ہو؟"

"دیکھو، میں صرف تمہیں ایک بات بتاؤں...... جہاں میں جاتی ہوں وہاں جانا میری مجبوری ہے۔"

"اسی لئے میں نے تمہیں نہیں ٹوکا۔"

"تمہیں میرے جانے پر اعتراض ہے؟"

"کہا نا نہیں ہے...... بس ایک اتنی سی بات تھی کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ تم کہاں جاتی ہو۔"

"ہوں......" اس بار اُس نے آنکھیں جھکا لیں۔ ہتھیلی سے ماتھے کو پکڑ کر کچھ سوچتی رہی۔ اس کے بعد بولی۔ "چلو...... آج کا دن باہر گزاریں گے۔"

اُس کی اس فرمائش پر میں نے اُس کو بغور دیکھا تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اس فرمائش نے میرے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ وہ مکان سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ کیا اب وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا کر اس مکان سے باہر نکلنا چاہتی ہے؟...... اگر ایسا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہئے...... اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اُس کی فرمائش پوری کروں۔ اور اس کے لئے اُس نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔

ساڑھے گیارہ، پونے بارہ بجے کے قریب ہم باہر نکلے...... کار میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور کار باہر نکل گئی تھی۔ اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ باہر نکل کر میں نے اُس سے پوچھا۔

"اب بتاؤ...... کہاں چلیں؟"

"جہاں دل چاہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"ساحل پر......؟"

"میں نے کہا نا جہاں دل چاہے۔"

چنانچہ میں نے کار کا رُخ ساحل کی جانب کر دیا۔ اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا...... ان احکامات کی خلاف ورزی ہوئی تھی۔ اسے بابا حماد علی نے گھر میں روکا تھا، لیکن میں اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کرتا بھی تو کیا کرتا......؟

کچھ دیر کے بعد ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ اُس نے ایک حسین لباس پہنا ہوا تھا۔ ساحل پر ہم دونوں چہل قدمی کرتے ہوئے بہت دُور نکل گئے۔ عام طور سے اس جگہ پر لوگ کم آتے تھے...... آگے جا کر کالی اور بدنما چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جب وہ اُس طرف بڑھنے لگی تو میں نے کہا۔

"اس سے آگے نہیں۔"

"تھک گئے؟"

"ہاں......"

"مرد ہو کر......؟" اُس نے میری ہمت کو اُبھارنے کی کوشش کی۔

"اس میں مرد عورت کا کیا سوال ہے؟"

"میں تو نہیں تھکی۔"

"تم بہت بہادر ہو۔"

"اور طاقتور بھی۔"

"ہاں......"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ، کہاں چلیں؟"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"پھر آؤ، کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔"

اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے چل پڑے۔ اور میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اصل میں اُس کے بارے میں معلومات حاصل ہونے کے بعد مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ ایک انسان اگر جسمانی طور پر طاقتور ہو تو اس سے زندگی کی بازی لگا کر جنگ کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر ایک انسان، انسان ہی نہ ہو تو کیا، کیا جا سکتا ہے؟ اور یہ بات مجھے معلوم ہو چکی تھی کہ میں اُس سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی اُس نے رعایت کی تھی میرے ساتھ۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟

کار ڈرائیو کرتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا تھا کہ اصل میں وہ مجھ سے مکمل تعاون کر کے اپنا کوئی اہم مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ بہرحال جب تک میرا فریب چل سکتا ہے، میں بھی اس سے تعاون کروں گا۔ اور جب میرے فریب کا پردہ چاک ہو گیا اور حقیقت اس کے علم میں آ گئی تو پھر میں وہ کروں گا جو حماد علی صاحب کہیں گے۔

ہم ایک عالیشان ہوٹل میں آ بیٹھے۔ میں نے ساحل پر بھی محسوس کیا تھا کہ وہاں جتنے افراد تھے اُن کی

نگاہوں میں اُس کے لئے پسندیدگی کے تاثرات تھے۔ اُس جیسی حسین عورت کو دیکھ کر ہر شخص اُسے گھورتا ضرور تھا۔ یہاں ہوٹل میں جتنے بھی افراد تھے اُن سب کی نگاہیں ہمارا تعاقب کر رہی تھیں۔

ہم ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ویٹر سے مینو منگوایا اور اس کے بعد کھانے کا انتخاب کرنے لگے۔ میں دل ہی دل میں ملال سے سوچ رہا تھا کہ کاش اتنی حسین عورت حقیقت میں میری ساتھی ہوتی، میری دوست ہوتی اور جیسا کہ حماد علی صاحب نے کہا تھا کہ وہ بغیر نکاح کے میرے ساتھ رہ رہی ہے، میں بڑی خوشی کے ساتھ اُس سے نکاح کرتا۔ صرف اُسے ہی کچھ نہ کرنے دیتا، خود بھی ہاتھ پاؤں ہلاتا۔ وہ تو ماں کی موت کے بعد طبیعت کچھ بیزاری سی ہو گئی تھی اس دنیا سے۔ چنانچہ قلیٰ گیری کر لی تھی۔ ورنہ میں اتنا نکما اور ناکارہ نہیں تھا کہ دنیا میں اپنے لئے کوئی مقام نہ حاصل کر سکتا۔ یقینی طور پر میں اپنا ایک مقام بنا سکتا تھا۔ لیکن اب ذرا مشکل ہی کام تھا۔

ویٹر نے ہمارے سامنے کھانا سجا دیا۔ وہ کہنے لگی۔ ''جو انداز پہلے تمہارے اندر تھا، جو پذیرائی پہلے تم میری کرتے تھے، یقین کرو اب اس کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔''

''بس چھوٹی چھوٹی سی وجوہات تھیں...... میں تمہیں بتا چکا ہوں۔''

''کھانا شروع کرو...... '' اُس نے کہا اور ہم لوگ کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ ایک دم چونکی اور بولی۔ ''وہ کون سا طریقہ ہو سکتا ہے جس سے ہمارے درمیان محبت کے وہ لمحے پھر سے تازہ ہو سکیں جن سے ہم نے آغاز کیا تھا؟''

''تم کر پاؤ گی؟''

''کیا کر پاؤں گی؟''

''تم مجھ سے نکاح کر لو۔''

''کیا......؟'' وہ کھاتے کھاتے رُک گئی۔ اُس کی حسین آنکھوں میں ایک بار پھر حیرت کے نقوش اُجاگر ہوئے تھے۔ کچھ لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک محبت بھری مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھوں سے محبت کے آثار جھلکنے لگے۔ اُس نے کہا۔

''تم مجھے آزمانا چاہتے ہو؟''

''نہیں......''

''تو پھر......؟''

''بس اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔''

''تمہارے دل کے اطمینان کے لئے میں دنیا کا ہر وہ کام کر سکتی ہوں جو تم چاہو۔'' اُس نے کہا۔ اور اب میرے خاموش ہونے کی باری تھی۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں اُس سے یہ الفاظ کہوں گا تو صحیح ردِعمل کا پتہ چل جائے گا۔ ردِعمل تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خلوصِ دل کے ساتھ مجھ سے منسلک ہونے کے لئے تیار ہے۔ اب اس سے آگے میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔

وہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی اور بڑے دلکش انداز میں مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ میں نے بھی

کھانا خاموشی سے ہی کھایا تھا۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اُس نے کہا۔

''تم سے نکاح کرنے کے لئے مجھے مسلمان ہونا پڑے گا۔''

''ہاں ظاہر ہے......''

''ویسے کیا تم مسلمان نہیں ہو؟''

''پتہ نہیں، تم تو ایسے کہہ رہے ہو مجھ سے جیسے میں مسلمان ہوں ہی نہیں۔''

میں نے ایک لمحے کے اندر محسوس کیا جیسے اُس نے پہلے جملے ادا کرنے کے بعد اپنی غلطی کا احساس کیا اور پھر ایک دم اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی ہو۔ لیکن یہ میرا خیال بھی ہو سکتا تھا۔ جو بات انسان کے ذہن میں ہوتی ہے اس سے منسلک بہت سی باتیں ذہن تک آتی رہتی ہیں۔ جبکہ ان کی اصلیت کچھ بھی ہوتی۔ لیکن بہرحال میں اپنے آپ کو پوری طرح محتاط رکھنا چاہتا تھا...... کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

''تو جناب، آپ کہاں اور کس جگہ ہمیں اپنی زوجیت میں قبول کر رہے ہیں؟ چلئے یہ بھی سہی، ہمیں بھلا کیا انکار ہو سکتا ہے؟''

''واقعی...... اگر تم تیار ہو تو میں چاہتا ہوں کہ ایسا کر لوں۔''

''اور تیاری کا اظہار کس طرح کیا جا سکتا ہے...... آپ حکم دیجئے، ہم مانیں گے۔'' اُس نے بڑی محبت سے کہا اور میں تھوڑا سا نروس ہو گیا۔ بہرحال، ساری باتیں اپنی جگہ، غور کرنے کا مقام تو تھا۔ پھر بولی۔ ''خیر، آپ فیصلہ کر لیجئے۔ لیکن آیئے ہم بھی آپ کو اپنا ٹھور ٹھکانہ دکھائیں۔ آپ کو لطف آئے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''نہیں...... ہم نے آپ سے کوئی مطلب پوچھا؟'' وہ بولی اور میں خاموش ہو گیا۔

کھانے سے فراغت حاصل کر لی گئی۔ ویٹر کو بل وغیرہ بھی ادا کر دیا گیا اور اس کے بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ اب ظاہر ہے اُس نے میری خواہش پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا اور میرے پاس اُس سے کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے اتنا طویل سفر طے کیا تھا۔ یہاں تک آیا تھا اور یہاں زندگی کے بہترین لمحات گزارے تھے...... ایک لمحے میں مجھ پر شکوک و شبہات کے پہاڑ تو ٹوٹ سکتے تھے...... لیکن میں نے اُس پر اعتبار کرنا تھا۔

ہم چلتے رہے...... شہر سے باہر نکل آئے۔ اور پھر میرے سامنے کھنڈرات کا ایک عظیم الشان سلسلہ آ گیا...... یہ کھنڈرات نجانے کون سے دور کے بنے ہوئے تھے؟ بہت سی ٹوٹی ہوئی دیواریں، ٹوٹے ہوئے ستون اور اینٹوں کے ڈھیر۔ یہاں اُس نے کار روک دی۔ میں نے حیران نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ وہ نیچے اتر گئی تھی۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا۔

''ڈر رہے ہو......؟''

''نہیں...... کیوں؟''

''تو پھر آؤ۔''

"آ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور نیچے اُتر گیا۔

"آ جاؤ میرے ساتھ۔"

"مگر سنو تو......"

"ہاں بولو......" وہ رُک کر بولی۔

"کون سی جگہ ہے یہ؟"

"پوچھنا ضروری ہے؟"

"میں اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا۔"

"اب تو آئے ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن...... پھر بھی......"

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" وہ تعجب سے کھڑی ہوگئی۔

"مجھے بتاؤ تو سہی تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟"

جواب میں وہ ہنس پڑی اور پھر اُس نے ہنستے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی نوخیز کنواری کسی شیطان نما مرد کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہو۔ آؤ، بننے کی کوشش کرو۔"

یہ میری غیرت کے لئے للکار تھی...... میں آگے بڑھ گیا۔ واقعی میرے ان الفاظ نے یہ ماحول پیدا تھا جیسے میں اُس سے خوفزدہ ہوں...... پھر یہ بھیانک کھنڈرات میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ خاص سے اس لئے کہ اس کی شخصیت میری نگاہوں میں مشکوک ہو چکی تھی۔ کھنڈرات کی اینٹوں کے ڈھیر درمیان راستے بنے ہوئے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے ان راستوں پر لوگ آتے جاتے رہتے ہوں۔ لیکن ان کھنڈرات کے بارے میں مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔ میں نے اُسے آ دی۔ وہ رُک گئی۔ پھر بولی۔

"ہاں......"

"میری بات تو سنو۔ کم از کم کسی مسئلے کے بارے میں بتانا تو ضروری ہے۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ......؟"

"ہاں، پوچھو۔" "تم نے مجھ سے نکاح کے لئے کہا تھا......"

"کہا تھا۔"

"میں نے تم سے اس بارے میں کوئی ایک لفظ بھی پوچھا......؟"

"نہیں......"

"تو پھر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو......؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ایسی بھیانک جگہ......"

"تم مرد ہو اور میں عورت ہوں؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"مجھے خوفزدہ ہونا چاہئے یا تمہیں؟"

"خیر یہ ضروری نہیں ہے کہ تم مجھے خوفزدہ ہی سمجھو۔"

"تو پھر آ جاؤ نا میرے ساتھ۔ کیوں ضد کر رہے ہو؟" اُس نے کہا اور ایک بار پھر میں نے قدم آگے ھا دیئے۔ لیکن میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ آگے بڑھنے والا ہر قدم خطرات کی جانب جا رہا ہے۔ رحال ہمارا اختتام ایک ٹوٹے ہوئے در پر ہوا...... اندر کے ماحول پر ایسی بھیانک نحوست طاری تھی کہ ر انسان کا دل بیٹھنے لگے۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ جگہ شیطان کا گھر ہو...... اُس کی چھت نہیں ی۔ بس دیواریں تھیں اور ان دیواروں پر عجیب و غریب نقوش بنے ہوئے تھے...... ٹوٹی اینٹوں نے کچھ ی بھیانک شکل اختیار کر لی تھی کہ دیواروں میں جگہ جگہ ہیولے سے بن گئے تھے۔ کہیں کوئی ہنستا ہوا ھے سے منہ والا مرد، کہیں کوئی چڑیل نما عورت...... ایک عجیب و غریب ماحول تھا یہاں۔

پھر اچانک ہی ایک عجیب واقعہ ہوا...... میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی تھی......!

❁❁❁

ایک لمحے کے لئے میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو بیلنس کر کے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن بہت سی اینٹوں کے ساتھ کہیں نیچے جا گرا...... میرے پیروں میں چوٹ بھی لگی تھی۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بھی میرے ساتھ تھی اور اس طرح سیدھی زمین پر آ کھڑی ہوئی تھی جیسے پرواز کرتے ہوئے آئی ہو۔ جبکہ میں زمین پر گر پڑا تھا اور کئی اینٹیں میرے دائیں بائیں گری تھیں۔ وہ تو شکر ہے کہ کوئی سریا میرے جسم پر نہ لگا، ورنہ لطف ہی آ جاتا......

ایک لمحے کے لئے تو میرے حواس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا اور جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا...... میں نے چاروں طرف دیکھا۔ بہت ہی صاف ستھری جگہ تھی۔ ایک وسیع و عریض تہہ خانہ بنا ہوا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ کئی سوراخ دیواروں میں بھی تھے لیکن اتنے چھوٹے کہ روشنی کے سوا اور کوئی چیز وہاں سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا...... پھر اُسے دیکھا...... وہ پر اسرار انداز میں مسکرا رہی تھی۔

میں نے اُس سے کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"تم اسے بدتمیزی کہو گے......؟"

"تو اور کیا کہوں گا......؟"

"چھت میں نے گرائی ہے؟"

"تم مجھے اس کھنڈر میں کیوں لائی ہو......؟"

"ایک بہت ضروری کام کے لئے۔"

"کیا ضروری کام ہے؟"

"تم مجھ سے نکاح کرنا چاہتے ہو نا......؟"

"کیا تم اس بات کو میری چڑ بنا رہی ہو؟"

"نہیں...... پوچھ رہی ہوں۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا...... یہاں سے نکلو۔"

"کیسے نکلوں...... دیکھو چھت کا سوراخ بھی بند ہو چکا ہے۔" اُس نے کہا اور یہ بات میں نے پہلی بار محسوس کی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو جہاں سے میں اینٹوں سمیت نیچے گرا تھا وہ جگہ تو بالکل مضبوط اور پائیدار تھی۔ وہ سوراخ خود بخود بند ہو گیا تھا...... میرے اوسان خطا ہونے لگے...... یہ تو بڑا خوفناک چکر ہے...... دل

رے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ پھنس گئے بیٹے کسی برے جال میں...... اب بچو اس مصیبت سے......

میں وحشت زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ "دیکھو، مذاق بند کرو...... چلو یہاں سے نکلو...... کیسی وحشت ناک جگہ ہے یہ......؟"

"آؤ ذرا، میں تمہیں کچھ دکھاؤں۔" اُس نے کہا اور ایک طرف بڑھ گئی۔

اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ میں اُس کے ساتھ آگے بڑھوں۔ وہ مجھے لئے ہوئے کافی ے آ گئی۔ حیرت انگیز جگہ تھی۔ حالانکہ سامنے والی دیوار نظر آ رہی تھی۔ لیکن جیسے جیسے میں آگے بڑھتا جا تا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دیوار پیچھے ہٹتی جا رہی ہو اور یہ تہہ خانہ کشادہ سے کشادہ تر ہوتا جا رہا ہو۔ اچانک ہی وہ بائیں جانب مڑی اور ایک طرف اشارہ کر کے بولی۔

"اُدھر دیکھو......"

میں نے اُدھر دیکھا۔ پتھر کا ایک ہیبت ناک مجسمہ ایک سنگی چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ اتنا ہیبت ناک مجسمہ کہ اُسے دیکھ کر دہشت طاری ہونے لگے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، لیکن اسی وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پیروں سے کوئی چیز لپٹ گئی ہو...... پھٹی پھٹی حیران نگاہوں سے میں نے اُس چیز کو دیکھا تو ک ہی دو رسیاں میرے ہاتھوں اور دو پاؤں میں آ پڑیں اور میں دہشت سے چیخ پڑا...... رسیاں ک کھنچ گئی تھیں اور میں انگریزی کے حرف "ایکس" کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

میں نے اُسے دیکھا...... اب اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اُس نے کہا۔

"دیکھو، تمہیں اب وہ کرنا ہے جو میں کہوں...... جو بھول چکے ہو اُسے یاد دلانا ضروری ہے...... یہ مجسمہ رہے ہو نا، یہ تمہاری رہنمائی کرے گا...... یہ تمہیں بتائے گا کہ تمہیں آگے کیا کرنا ہے...... بہت بڑا مان ل کرنے والے ہو تم...... وہ ملنے والا ہے تمہیں جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے...... سمجھ ہے نا میری بات...... بہت کچھ ملنے والا ہے تمہیں۔"

"یہ کیا طلسم خانہ بنا رکھا ہے تم نے......؟"

"نہیں...... میں نے کوئی طلسم خانہ نہیں بنا رکھا ہے...... یہ صرف تم ہو جو سب کچھ بھول چکے ہو...... نہیں ایک لفظ بھی یاد نہیں دلاؤں گی۔ پر یہاں سب کچھ تمہیں خود ہی یاد آ جائے گا...... دیکھو اُدھر، اس کے سینے پر ایک شبد جگمگا رہا ہے۔ اسے پڑھو...... یہ مجسمہ تمہیں اس کا مطلب سمجھائے گا۔ ہر گھڑی ل ایک شبد نظر آئے گا...... اسے اپنے من میں بٹھاتے رہو۔ اور جب یہ سب کچھ پورا ہو جائے گا تو ے من میں ایک روشنی اُترے گی۔ اور وہ روشنی تمہیں بتائے گی کہ تمہاری اصلیت کیا ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا......؟"

"دماغ تو تمہارا خراب ہو گیا تھا...... مگر اب ٹھیک ہو جائے گا...... اچھا میں چلتی ہوں...... تمہارے سارے انتظامات موجود ہیں۔"

اچانک ہی میں نے اُسے دُھوئیں میں تبدیل ہوتے دیکھا...... اُس کے اِرد گرد دُھواں پھیل گیا تھا اور کا وجود خود بھی دُھواں بنتا جا رہا تھا...... پھر یہ دُھواں فضا میں بلند ہوا اور میں نے اُسے ایک سوراخ

سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ یہ صرف پلک جھپکتے ہوا تھا...... کچھ لمحوں کے بعد کچھ بھی نہ تھا...... وہ فضا میں تحلیل ہو گئی تھی اور میں اس تہہ خانے کا قیدی بن گیا تھا...... اوہ میرے خدا، کھا گیا تھا میں اس سے مات...... ظاہر ہے وہ ایک آوارہ رُوح تھی...... جیسا کہ حماد علی صاحب نے بتایا تھا۔ اور میں تو کچھ بھی نہیں تھا...... آہ، واقعی میں تو کچھ بھی نہیں تھا......

پھر اس کے بعد ایک بدترین دور کا آغاز ہو گیا۔ نجانے کتنے گھنٹے گزر گئے...... میرے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں دُکھنے لگے...... مجسّمے کے سینے پر روشن الفاظ کی لکیر چلتی رہی۔ مگر میں نے ایک بار بھی اُن کی طرف نہیں دیکھا۔ مجسمہ بار بار منہ کھولتا تھا اور اُس کے منہ سے مختلف الفاظ نکلا کرتے تھے۔ میں نے اُس کے منہ سے بھیانک آوازیں بھی نکلتے ہوئے دیکھی تھیں...... لیکن اپنے اندر اتنی طاقت پیدا کر لی تھی میں نے کہ ان بھیانک آوازوں کو میں اپنے کانوں تک نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔ حالانکہ میرا چہرہ اُس مجسّمے کی جانب ہی تھا لیکن میں ان الفاظ کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا......

پہلے کچھ گھنٹے شدید کرب اور بے چینی کے عالم میں گزرے۔ اور اس کے بعد لمحہ لمحہ میں نے اپنے آپ کو سکون دینے کی کوشش کی...... آہ، بہت برا ہو گیا تھا...... بہت ہی برا ہو گیا تھا...... اب نجانے کیا ہو گا......

شاید یہاں میری پہلی رات گزر گئی۔ بڑے سکھ اُٹھائے تھے میں نے زندگی میں...... حالانکہ اس سے پہلے بہت تکلیف میں تھا...... لیکن یہ تکلیف ہزار راحتوں سے زیادہ اچھی تھی...... اسٹیشن کی بنچ پر ایسی نیند آتی تھی کہ اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا...... قدرتی ایئر کنڈیشن چلتے رہتے تھے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے، بے فکری، دوستوں کا ساتھ، نہ کوئی مشکل نہ کوئی اور خیال۔ نجانے اس جنجال میں کیسے پھنس گیا تھا...... نجانے یہ سب کیا ہو گیا تھا...... بہرحال جو تقدیر میں تھا وہ ہوا۔ اب کیا کروں......

صبح ہو گئی...... چھت کے سوراخوں سے روشنیاں جھلکتی رہیں اور آہستہ آہستہ وقت گزرتا رہا...... بھوک پیاس نے الگ نڈھال کر رکھا تھا اور مجسمہ اپنے عمل میں بدستور مصروف تھا۔ شاید رات بھر مصروف رہا تھا یا ممکن ہے رات کو اُس کی آواز بند ہو گئی ہو، میں بھی نیند کی آغوش میں جا پہنچا تھا اس لئے مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

البتہ صبح سب سے پہلی آواز اسی منحوس مجسّمے کی تھی...... میں نے ایک نگاہ اُس پر ڈالی تھی...... لفظ روشن ہو رہے تھے اور ماحول عجیب و غریب کیفیت اختیار کرتا جا رہا تھا...... بھوک پیاس نے نڈھال کر رکھا تھا۔ زبان پر کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں...... ایک درد، ایک کرب کا شکار تھا لیکن کیا کرتا...... گزارنی تھی، اسی درد و کرب میں گزارنی تھی۔

پھر روشنی دُھندلا گئی...... ہوش اور بے ہوشی کے درمیان جیتا رہا تھا اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا...... پھر آہستہ آہستہ اُس تہہ خانے میں اندھیرا پھیلتا چلا گیا...... اب تک میں نے کوئی آواز سنی تھی نہ کوئی سرسراہٹ۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اچانک ہی بلندی پر کوئی سرسراہٹ سی محسوس ہوئی...... میں نے چھت کی طرف دیکھا، چھوٹے سے سوراخ سے کوئی عجیب سی شے جھانک رہی تھی۔ میں نے اپنی بصارت پر زور دیا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ چھوٹی سی شے کیا ہو سکتی ہے......؟ پھر میں نے ایک چوہے کو اند

ل ہوتے ہوئے دیکھا۔ لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چوہا دیوار پر چڑھ کر چھت پر جا پہنچا اور پھر اُلٹا ہوا اُس جگہ تک آنے لگا جہاں اُس رسّی کے کنڈے لگے ہوئے تھے جو میرے ہاتھ میں بندھی ہوئی تھی...... چوہا اُن میں سے ایک کنڈے میں لٹک گیا...... اُلٹا لٹک کر وہ رسّی کو اپنے منہ سے آہستہ آہستہ کاٹنے لگا۔ میری آنکھیں شدتِ حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد رسّی کٹ گئی اور میرا ہاتھ نیچے لٹک گیا...... اتنی دیر تک ایک طریقے سے بندھے رہنے سے خون کی روانی رُک گئی تھی اور بے جان ہاتھ ایسے جھول رہا تھا جیسے اس میں زندگی نہ ہو۔

چوہا دوسرے ہاتھ کی جانب بڑھ گیا...... دوسرے ہاتھ کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔ اب میرے حواس کام کر رہے تھے۔ ہاتھوں میں دورانِ خون بحال کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ جس طرح وہ بے جان انداز میں رسّی سمیت لٹکے ہوئے ہیں، میں انہیں جنبش دینے کی کوشش کروں۔ اور اپنی تمام تر قوتِ ارادی کو استعمال کرتے ہوئے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو تیز تیز جنبش دینا شروع کر دی۔ میرے ہاتھ پنکھوں کی طرح فضا میں گردش کر رہے تھے اور میرا دوران خون بحال ہوتا جا رہا تھا...... اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے دل میں ایک شدید خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے میں یہاں سے نکل جاؤں۔

پھر میں نے اپنے پیروں کی رسیاں کھولیں۔ اُس مہربان چوہے کی یہ عنایت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے خصوصی طور پر وہ صرف ان رسیوں کو کاٹنے کے لئے آیا ہو...... بہرحال جب انسان ایک بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوتا ہے تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرنے کی بجائے وہ یہ سوچتا ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے یہاں سے نکل جایا جائے...... آخر کار وہیں اُسی تہہ خانے میں میں نے اپنے بدن کو بھی جنبش دے کر اپنا دورانِ خون مکمل طور پر بحال کر لیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دو اینٹیں اُٹھا لی تھیں کہ اگر راستے میں کسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے تو میں اس کا مقابلہ کر سکوں......

اس وقت میرے اندر بڑی جرأت پیدا ہو گئی تھی اور میں ہر خطرے سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ میں تیز رفتاری سے تہہ خانے سے باہر جانے والے راستے کی طرف لپکا۔ کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی، لیکن آخر میں میں نے یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ دریافت کر ہی لیا۔ اور جب میں نے اُس منحوس کھنڈر کے اوپر کے حصے میں قدم رکھا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے میرا استقبال کیا تو میں خوشی سے کانپنے لگا...... مجھے تو اُمید نہیں تھی کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن بہرحال خدا نے میری مدد کی تھی...... میں کامیاب ہو گیا تھا۔

باہر تاریکیاں پھیلی ہوئی تھیں...... نجانے رات کا کیا وقت تھا...... اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ اچھی خاصی رات گزر گئی ہے...... تاروں کی مدھم چھاؤں میں، میں نے آگے قدم بڑھائے...... یہ سن گن لیتا جا رہا تھا کہ کوئی آس پاس موجود تو نہیں ہے...... اینٹوں کے ڈھیر چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اور ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا تھا...... کئی جگہ اینٹیں میرے پیروں سے نکل گئی تھیں اور مجھے اپنا توازن رکھنے میں دقت پیش آئی تھی۔

تھوڑا سا آگے بڑھا ہوں گا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے علاوہ کوئی اور بھی ان کھنڈرات میں

موجود ہے۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن میں خوفزدہ ہو گیا تھا...... ان کھنڈرات میں اس بدرُوح کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا؟ کوئی اس طرف آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا...... اب کیا کروں، کس طرح بچوں یہاں سے؟ میں نے دل میں سوچا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا آئندہ قدم کیا ہو؟ آہ...... ان کھنڈرات سے نکلنا میرے لئے کتنا مشکل ہو رہا تھا؟...... لیکن میں اب بھی اس کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکا۔"

ایمان علی نے رجنی کو دیکھا، پھر مسکرا کر بولے۔ "ستارہ...... اس کے لئے کیا تجویز کرتی ہو......؟"

"آعوذ باللہ کا ورد......"

"اسے بتاؤ۔"

"کیا تم چالیس دن آعوذ باللہ کا ورد کر سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں، لیکن وہ بدرُوح......"

"تمہارے گرد ایک حصار قائم کر دیا جائے گا۔ وہ اس حصار کے اندر نہیں آ سکے گی۔"

"میں تیار ہوں، لیکن......"

"ہاں بولو۔"

"مجھے آپ کا تحفظ درکار ہے۔"

"ہم بھلا کیا کر سکیں گے...... جو کچھ تم پڑھو گے، اس میں تمہیں اللہ کا تحفظ حاصل ہو گا۔"

"ہاں، ٹھیک ہے......"

❁

"شیطان کو ایک اور شکست کا سامنا کرنا پڑا...... اُس نے اپنی ذرّیات سے کہا۔

"اب کیا کریں؟"

"اپنی بقاء کا انتظام......"

اور اس کے لئے ضروری تھا، کسی نیک اور ایماندار گھرانے کو مشکل کا شکار کرنا...... ورنہ سارا کھیل خراب ہو جاتا۔ ناگ چندر، رجنی اور پھر راگنی سب باغی ہو گئے تھے اور شیطان کے چنگل سے نکل گئے تھے۔ اور یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ وہ پراسرار عورت اُسے نقصان پر نقصان پہنچا رہی تھی اور شیطان اُس کے خلاف کچھ کرنا چاہتا تھا......

تب اُس نے ایک ہنستے بستے گھرانے کو تاکا اور اپنے مخصوص عمل کے لئے تیار ہو گیا۔ پہلے اسے حیرت کا شکار کیا جائے، پھر اس پر ڈورے ڈالے جائیں۔ اور وہ اس کی تیاریاں کرنے لگا۔

دونوں باپ بیٹے باتیں کر رہے تھے۔

"جوانی بھی کیا شے ہوتی ہے کمبخت۔"

"کیوں ابو......؟"

"بس، بلا سوچے سمجھے ہر ایک پر آ جاتی ہے۔" توقیر صاحب نے افسردگی سے اپنے بچوں کو دیکھتے

ئے کہا۔ کچھ چھوٹے کچھ بڑے۔ سب کے سب اُمنگوں سے بھرے ہوئے۔

اکثر اسی کا اظہار ہوتا تھا۔

"ابو...... یہ بھی کوئی زندگی ہے......؟"

"کیوں...... کیا خرابی ہے اس میں؟"

"خوبی بھی کیا ہے؟"

"بلندیوں کی طرف دیکھنے کے عادی ہو۔ پستیوں میں جھانکا کرو، سکون ملتا ہے۔"

"بلندیوں کو دیکھنے سے کیا تصور اُبھرتا ہے ابو؟"

"مطلب......؟"

"کیا انسان کو بہتر مستقبل نہیں تلاش کرنا چاہئے؟"

"ضرور کرنا چاہئے۔"

"تو پھر ہم پستیوں میں کیوں جھانکیں؟"

"اس لئے کہ بلندیوں اور پستیوں کا فرق پتہ چلتا رہے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"حقیقتوں پر نگاہ رہے گی۔"

"حقیقتیں تو سامنے آتی رہتی ہیں۔"

"انہیں سمجھنا بھی تو ضروری ہے۔"

"یہ تو فلسفہ ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے، ہے تو سہی۔" توقیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ابو...... مجھے عملی زندگی میں آ جانے دیں، پھر دیکھیں۔"

"کیا کرو گے؟"

"تقدیر بدل دُوں گا اس گھر کی۔"

"خدا کرے تم ایسا کر سکو۔" توقیر صاحب محبت سے بولے۔

"میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کر دکھاؤ گے۔" توقیر صاحب نے اُس کی ہمت کو توڑنا پسند نہیں کیا۔ وہ اُن اُمیدوں کے چراغ تھے۔ ان چراغوں کو وہ خود کیسے بجھا سکتے تھے؟ لیکن وقت...... وقت سارے چراغ دیتا ہے۔

کمال کے جانے کے بعد وہ دیر تک خاموش رہے۔ پھر جیب میں سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرنے لگے۔ یٹ ہونٹوں میں دبا کر اُنہوں نے لائٹر سے سلگایا اور اس کے دُھوئیں سے بننے والے مرغولوں میں تلاش کرنے لگے۔

بہت پہلے...... بہت پہلے ان پر بھی جوانی آئی تھی۔ لوگ کہتے تھے وہ اب بھی جوان ہیں۔ عمر ہی کیا

ہے، چوالیس سال کوئی بڑھاپے کے سال ہوتے ہیں؟ چوالیس سال میں تو جوانی مکمل ہوتی ہے۔ لیکن اُن کی جوانی پچیس سال میں مکمل نہیں ہوئی تھی، چوالیس سال میں کیا ہوتی؟ ہاں، جوانی کو محسوس اُنہوں نے ضرور کیا تھا، بالکل کمال کے سے انداز میں۔

اُن کا خاندان بہت اعلیٰ نہیں تھا، درمیانے درجے کے لوگ تھے۔ لیکن باقر صاحب، توقیر صاحب کے والد ایک دولت مند شخص کے ہاں ملازم تھے۔ اور وہ گھرانہ ضرورت سے زیادہ اچھا تھا۔ فصیح الدین کے اہلِ خاندان باقر صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُس زمانے میں جب چاروں طرف ناخواندگی اور فرسودگی پھیلی ہوئی تھی، فصیح الدین خاں صاحب کا خاندان بے حد ماڈرن تھا اور وہ لوگ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ تھے۔ اُس وقت توقیر صاحب نے بھی اسی انداز میں سوچا تھا جس کا تذکرہ آج کمال نے کیا تھا۔ بیگم فصیح الدین نے کہا۔

''توقیر میاں، کیا پڑھ رہے ہو؟''

''ایف ایس سی کر رہا ہوں۔''

''کیا کرو گے؟''

''خدا جانے۔''

''کوئی نظریہ......؟''

''ہاں...... دنیا میں سربلند ہو کر جینا چاہتا ہوں۔''

''بڑا اچھا خیال ہے۔ لیکن بہرحال مستقبل کا کوئی فیصلہ ضرور کرنا چاہیئے۔''

''جی......'' توقیر صاحب نے جواب دیا۔ نظریات تو بہت سے تھے لیکن خاندانی فرسودگی، وسائل کی کمی نے ان نظریات کو فروغ نہ پانے دیا۔ اس وقت کچا ذہن تھا۔ زمانے سے ہارنا نہیں جانتا تھا۔ فصیح الدین کے گھرانے میں اس کا ایک مقام بن گیا تھا اور یہ صرف ان لوگوں کی اچھائی تھی کہ اُنہوں نے ایک بے وقعت لڑکے کو یہ مقام دے دیا تھا۔ اور اس مقام نے توقیر صاحب کو زندگی کے ان راستوں سے ہٹا دیا تھا جو درحقیقت ان کے لئے متعین تھے۔

فصیح الدین صاحب اسنوکر کے کھلاڑی تھے۔ اور اُنہوں نے اپنی عالیشان کوٹھی میں اسنوکر کی ٹیبل لگائی ہوئی تھی۔ پہلی بار توقیر صاحب نے اُنہیں اسنوکر کھیلتے ہوئے دیکھا، بڑے لوگوں کا کھیل...... اور اپنے آپ کو بڑوں میں شامل کرنے کے لئے اُنہوں نے اس کی مشق شروع کر دی۔ جوانی کی ذہانت اور پھرتی نے اُنہیں اسنوکر کے کھیل سے پوری طرح روشناس کرا دیا۔ وہ فصیح الدین کے خاندان میں ویسے ہی مقبول تھے اور گھر کے لڑکوں میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک دن جب توقیر صاحب نے فصیح الدین کے مقابلے پر اس کھیل کا مظاہرہ کیا تو فصیح الدین ششدر رہ گئے۔

''میاں، کب سے کھیل رہے ہو اسنوکر؟''

''زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔''

''بہرطور جتنا بھی عرصہ ہوا ہے، تم نے اس کھیل میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی ہے۔'' فصیح

الدین کہنے لگے۔ اور اس کے بعد توقیر صاحب، فصیح الدین صاحب کی آنکھوں کا تارا بھی بن گئے۔ بہرطور زندگی میں بلندیوں کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ اور اب اُنہیں وہ گھر برا لگنے لگا تھا جس میں وہ خود رہتے تھے۔ اپنے اہلِ خاندان اُنہیں ضرورت سے زیادہ پسماندہ نظر آتے تھے اور وہ سوچتے تھے کہ مستقبل میں جب وہ بہت بڑے انسان بن جائیں گے تو اس خاندان کے ساتھ گزارا کیسے کریں گے؟ جبکہ وقار صاحب کا نظریہ کچھ اور ہی تھا۔ پتہ نہیں وقار صاحب کی اپنی زندگی کس طرح گزری ہو؟ جوانی کمبخت تو اُن پر بھی آئی ہو گی اور اس نے انہیں بھی بھٹکایا ہی ہو گا۔ بھٹکنے کے بعد وہ کس طرح سنبھلے؟ یہ کہانی توقیر صاحب کے علم میں نہیں تھی اور نہ ہی وہ کہانیوں پر غور کرنا چاہتے تھے۔

بیگم فصیح الدین گرمیوں کے موسم میں پہاڑی مقام پر جانے کے لئے تیاریاں کرنے لگیں تو اُنہوں نے توقیر میاں کو بھی دعوت دے دی۔ وقار صاحب اس راستے میں نہ آ سکے اور توقیر صاحب اس خاندان کے ہمراہ پہاڑ پر چلے گئے۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے، جن میں ایک راشدہ بھی تھی۔

راشدہ، فصیح الدین کی ماڈرن بیٹی تھی جو اُس زمانے میں بھی جدید ترین لڑکیوں کا سا انداز رکھتی تھی اور یہ انداز اُس کے لئے مناسب بھی تھا۔ دولت سے بھرپور گھرانہ تھا۔

لیکن دولت سے بھرپور اس گھرانے کی لڑکی نے جب ایک شام دُور سے آتے ہوئے توقیر کو دیکھا تو چشمہ آنکھوں سے کھسکا کر ناک پر رکھ لیا۔ وہ بڑی دلچسپ نگاہوں سے اس نوجوان کو دیکھ رہی تھی جو سفید باس میں ملبوس ایک لاابالی شان سے آتا ہوا بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ راشدہ کی مسکراہٹ میں تبدیلی ی پیدا ہو گئی۔

''ہیلو مسٹر توقیر......'' اُس نے بدلے ہوئے انداز میں کہا۔ اس سے پہلے لفظ مسٹر نہیں استعمال کیا گیا غا، اس لئے توقیر صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جی فرمائیے...... کوئی کام ہے؟''

''جی ہاں......''

''کیا......؟'' توقیر نے حسب عادت مؤدب لہجے میں کہا۔ اپنی اس حیثیت کو اُس نے کبھی نظر انداز ہیں کیا تھا۔

''ہنڈرڈ میٹر کی ریس میں حصہ لیں گے؟'' راشدہ نے ایک عجیب سا سوال کیا اور توقیر حیرت سے منہ کھول کر اُسے دیکھنے لگا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''افسوس، آپ ہنڈرڈ میٹر کی دوڑ نہیں سمجھتے؟'' راشدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دوڑ تو سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ دوڑ کہاں ہو رہی ہے؟ اور مجھے کس سے مقابلہ کرنا پڑے گا یہ بات مجھے ہیں معلوم۔''

''مجھ سے......'' راشدہ نے جواب دیا اور وہ حیرت سے راشدہ کی صورت دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''آپ مذاق کر رہی ہیں شاید۔''

’’شکست کے خوف کو الفاظ کا پیراہن پہنانا بہت پرانی بات ہوگئی ہے۔ آپ اگر مجھ سے مقابلہ کر سکتے ہیں تو آیئے۔‘‘

’’جیت گیا تب بھی خوشی نہیں ہوگی کہ ایک خاتون سے جیتا۔ اور ہار گیا تو ضرورت سے زیادہ شرمندگی ہوگی۔ اس لئے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس مقابلے کا فیصلہ یہیں کھڑے کھڑے ہو جائے؟‘‘

’’ہرگز نہیں...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔‘‘ راشدہ نے کہا۔ اور اس کے بعد توقیر کو اُس کا ساتھ دینا پڑا۔ راشدہ واقعی تیز دوڑتی تھی۔ لیکن یہ ہنڈرڈ میٹر کی دوڑ نہیں تھی، بلکہ ان لوگوں سے دُور نکل جانے کا مسئلہ تھا جو آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ اور راشدہ کے ذہن میں توقیر کے لئے کوئی تصور جاگ اُٹھا تھا۔ اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

’’توقیر...... میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔‘‘

’’ہنڈرڈ میٹر کی دوڑ کے سلسلے میں؟‘‘

’’نہیں...... زندگی بھر کی دوڑ کے سلسلے میں۔‘‘ راشدہ نے بے باکی سے کہا اور توقیر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

’’راشدہ صاحبہ......؟‘‘

’’نہیں...... اب اس سلسلے میں تم مجھے فرسودہ قسم کی فلمی کہانیاں نہیں سناؤ گے۔ میں آزاد زندگی کی مالک ہوں۔ میرے اوپر کوئی بھی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ اور پھر یہ زبردستی بھی نہیں ہے۔ اگر تمہارا دل قبول کرے تو ٹھیک، ورنہ نہیں۔‘‘

اور توقیر صاحب کے دل نے راشدہ کو قبول کر لیا۔ لیکن اب زمانے کے بے شمار مسائل سامنے آ گئے تھے۔ راشدہ توقیر صاحب سے خوب گھل مل گئی تھی۔ وہ زیادہ تر انہی کے ساتھ دیکھی جاتی تھی۔ اُس نے توقیر صاحب کو تحفے تحائف بھی دینے شروع کر دیئے تھے، عمدہ قسم کے لباس، جرسیاں، پرفیومز۔ اُس نے کئی تصاویر بھی توقیر کے ساتھ اپنے پسندیدہ لباسوں میں بنوائی تھیں۔ بہرطور دونوں ہی زندگی کے اندھے راستوں کی طرف دوڑ رہے تھے مستقبل کے خدشوں سے بے نیاز ہو کر۔ توقیر صاحب بھول گئے تھے کہ وہ ایک فرسودہ گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ اور اس گھرانے کی تمام تر عنایتیں صرف ان کی اچھائیوں پر مشتمل ہیں۔

جب فصیح الدین صاحب کو احساس ہوا کہ توقیر اور راشدہ ضرورت سے زیادہ ہی بے تکلف ہو گئے ہیں تو انہوں نے اس بے تکلفی کے راستے میں بند باندھ دیا۔ بہت ہی مہذب انداز میں توقیر صاحب سے یہاں نہ آنے کی فرمائش کی گئی اور توقیر صاحب حیران رہ گئے۔ فصیح الدین صاحب نے نہایت سنجیدگی سے اُنہیں سمجھایا کہ جو حماقتیں وہ کر رہے ہیں ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔

اور اس کے بعد سارا مسئلہ تلپٹ ہو گیا۔ کچھ بھی تو نہ ہو سکا تھا۔ توقیر صاحب اپنی سی کوشش کرتے رہے۔ اور اس کے بعد اُنہوں نے حقیقتوں کو تسلیم کر لیا۔ ایک ملازم گھرانہ، ملازم تو رہ سکتا تھا، مالک نہیں بن سکتا تھا۔ یہ بات اس وقت اُن کی مکمل طور پر سمجھ میں آ گئی جب بڑے پُرسکون انداز میں راشدہ مسکراتی

ئی پیا کے گھر چلی گئی۔ اُس کی شادی اُس کے شایانِ شان گھرانے میں ہو گئی تھی......!

توقیر صاحب کافی دن تک اپنے وقت کے رائج شدہ المیہ گانے گاتے رہے، پھر نارمل ہو گئے۔ نوکر ے تو خاندان ہی کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ غم غلط کرنے کے لئے اُنہوں نے بچوں سے گھر بھر ۔ اور یہ فلسفہ اُن کی زندگی کا نچوڑ تھا۔ وقت بدل گیا، خیالات بدل گئے۔ کچھ یاد نہ رہا اور ماحول میں کھو ئے۔

وہی خاندان، وہی لوگ، وہی زندگی...... ہاں بچوں کی خوشی کے لئے وہ کچھ کرنا بھی چاہتے تھے۔ رگی میں کچھ تبدیلی تو ہو۔ اور اس تبدیلی کے لئے اُنہوں نے ایک مائیکرو فوکسی ویگن خریدی تھی۔

گاڑی کیا آئی بچوں کی خوشیاں انتہا کو پہنچ گئیں۔ ہر فرد خوش تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں خاندان میں ب شادی نکل آئی اور فیصلہ کیا گیا کہ گاڑی کے ذریعے سفر کیا جائے۔

اس گاڑی کو ڈیڑھ سو میل لمبے سفر پر لے جانا خطرے کا باعث ہی تھا۔ اُنیس سو چونسٹھ کا ماڈل تھا۔ یلر وفوکسی ویگن تھی۔ زندگی کے چوبیس گرم و سرد دیکھ چکی تھی اور زمانے کا خوب تجربہ تھا اُسے۔ اس میں ئی شک نہیں کہ توقیر صاحب نے اس پر کافی محنت کی تھی۔ باڈی کئی جگہ سے گل گئی تھی لیکن ڈینٹر پینٹر نے اُس میں پیچ لگا کر سب ٹھیک کر دیا تھا۔ نئے پلگ پوائنٹ، نیا رنگ۔ ٹائر زیادہ پرانے نہیں تھے، چل تے تھے۔ اس لئے توقیر صاحب اسے لے کر چل پڑے تھے۔ ساتھ میں دادی اماں یعنی توقیر صاحب کی دہ تھیں، بیگم توقیر تھیں، اُن کی جوان بیٹی ہما تھی، نوجوان بیٹے ناصر اور کمال تھے، بھتیجی ثریا تھی جس کی منگنی ال سے ہو چکی تھی اور دو چھوٹے بچے محمود اور سیما تھے۔ گویا توقیر صاحب سمیت کل نو افراد تھے۔

یہ سفر سب کے لئے دلچسپ تھا۔ اوّل تو اپنی گاڑی میں لمبا سفر۔ جہاں دل چاہے روک لو، کھاؤ پیو، ے کرو۔ ہما وغیرہ نے راستے کے لئے سارا سامان بھی لے لیا تھا۔ کیروسین آئل کا چولہا، چائے بنانے تمام سامان اور ایسی ہی دوسری چیزیں۔

راستہ خوب ہنستے بولتے کٹا تھا۔ پھر کمال کے لئے ثریا تھی جس سے منگنی کے بعد پردہ ہو گیا تھا۔ لیکن یا کے والد بیمار تھے اور اس شادی میں شریک نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ثریا کی ضد پر اُسے توقیر صاحب ے ساتھ بھیج دیا گیا تھا۔ گاڑی نے مایوس نہیں کیا اور بڑی عمدگی سے اُنہیں منزل پر پہنچا دیا۔ توقیر صاحب راہیں تو محتاط رہے، لیکن بعد میں اس کامیابی پر پھولے نہ سمائے۔ اُن کے سارے خواب پورے ہو گئے ے۔ اُن کی یہ شاندار گاڑی سب کی نگاہوں کا مرکز رہی تھی۔ درمیانے درجے کا خاندان تھا، سائیکلوں کے ر سے نکل کر زیادہ سے زیادہ موٹر سائیکلوں تک آ گیا تھا۔ لیکن موٹر سائیکلیں بھی گنی چنی تھیں اور چند ہی جوانوں کے پاس تھیں۔ اس لئے توقیر صاحب نے پالا مار لیا تھا اور اس شادی کی سب سے معزز شخصیت ار پائے تھے۔

یہ معزز خاندان تین دن تک شادی اور اس کے بعد کی رسومات میں شریک رہا۔ اور پھر چوتھے دن ت سفر باندھ لیا گیا۔ توقیر صاحب واپس چل پڑے۔ وہ صبح ہی اس سفر کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یزوں نے قسمیں کھلا کر روک لیا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد جانے دیں گے۔ دوپہر کا کھانا دو بجے

کھایا۔ ملاقاتیوں کی پوری فوج پونے تین بجے تک گلے ملتی رہی۔ تب کہیں جا کر چھٹکارا ملا۔ شیر غرغرایا اور فوکسی ویگن پانی کی طرح بہنے لگی۔

شہر سے باہر نکلے تو سر پر ابرِ رحمت چھا گیا۔ اور مزید کچھ دُور نکلے تو آسمان نے شبنم افشانی شروع کر دی۔ اہلِ خاندان کی تو عید ہوگئی۔ بارش کی رِم جھم اور سنسان پہاڑیاں، کوکتی کوئلیں، چہچہاتے پرندے اور ان حسین مناظر کے درمیان "جوانی کی ریل چلی جائے رے" ہما نے تالیاں بجائیں۔ محمود نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال لیا۔ لیکن توقیر صاحب کا چہرہ ستا گیا تھا۔ ونڈ اسکرین پر وائپر نہیں تھا، ایک گھنڈی ضرور لگی ہوئی تھی لیکن بس۔ اُنہیں افسوس ہونے لگا کہ وائپر ذہن میں ہی نہیں آیا۔ فوکسی ویگن خریدتے چوٹ ہوگئی تھی۔ کمبخت نے گاڑی بیچتے ہوئے وائپر نکال لیا تھا۔ کچھ اور دُور نکلے تو بارش تیز ہوگئی۔

"اللہ کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اے ننھے، ہاتھ اندر کر لے، سردی لگ جائے گی۔" دادی اماں نے محمود سے کہا۔

"اماں، سردی کا موسم کہاں؟ کیسی عمدہ ہوا چل رہی ہے۔ سنتے ہیں جی...... میں آگے آجاؤں؟" بیگم توقیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خاموش بیٹھو، بکواس کر کے میرا دھیان مت ہٹاؤ۔" توقیر صاحب نے جھلاہٹ میں جواب دیا۔ ونڈ اسکرین پر بارش کا پانی بہہ رہا تھا اور چند گز دُور کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ شکر تھا سڑک صاف تھی اس لئے ابھی تک کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ تاہم توقیر صاحب کا دل اب لرزنے لگا تھا۔ چوبیس سال پرانی گاڑی صاف سڑک پر ہی مرضی کے بغیر یہ سفر طے کر لیتی تو اس کا احسان تھا۔ بارش میں تو اچھی اچھی گاڑیاں بند ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اس سڑک کا اُنہیں زیادہ تجربہ بھی نہیں تھا۔ کرائے کی گاڑیوں میں چند بار آئے تھے اور بس۔ خود کبھی اس سڑک پر ڈرائیونگ نہیں کی تھی۔ کرائے کی گاڑیوں میں بھلا یہ کیا معلوم کہ سڑک کہاں سے خراب ہے اور کہاں سے بہتر؟ البتہ آتے وقت اُنہوں نے کئی بار اس سڑک کی تعریف کی تھی۔ اور بس یہی سہارا تھا جس کی بنا پر اپنے آپ کو سمجھا رہے تھے۔

شیشہ جب بہت زیادہ دُھندلا گیا تو اُنہوں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی، انجن اسٹارٹ رہنے دیا اور کپڑا لے کر شیشہ صاف کرنے لگے۔ مگر یہ چیز اُس وقت کارآمد ہوتی جب بارش بند ہو چکی ہوتی۔ واپس آ کر بیٹھے اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد شیشہ پھر دُھندلا گیا تھا۔ سامنے سے اگر کوئی گاڑی آتی تو وہ رفتار سست کر کے فوکسی ویگن کو سڑک کے آخری کنارے پر کر لیتے۔ اور اس کے بعد سست رفتاری سے آگے بڑھ جاتے۔

سب کو اس بارش میں سفر کرتے ہوئے لطف آرہا تھا۔ کمال نے کئی بار مسکراتی نگاہوں سے ثریا کو دیکھا تھا۔ اور ثریا کے چہرے پر شفق کے رنگ اُتر آئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں شرم کی کیفیت تھی۔ بیگم صاحبہ توقیر صاحب کی بدذوقی پر دل میں کڑھ کر خاموش ہوگئی تھیں۔ ویسے بھی ساس اور بچے ساتھ تھے۔ باسی کڑھی میں اُبال ضرور آرہا تھا لیکن اب ان سب کی موجودگی میں وہ توقیر صاحب کو وہ گزرے ہوئے لمحات کیا یاد دلاتیں جب ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہوتی تو توقیر صاحب کی نگاہیں اُنہیں تلاش کرنے لگتی تھیں۔

اور پھر چھت پر کھڑی چارپائی پر بیٹھ کر جو لمحات گزرتے وہ جاوداں ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت توقیر صاحب کو وہ گزرے ہوئے مناظر یاد نہیں آرہے تھے۔ کیونکہ اُن کے سامنے ہولناک مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ سڑک پر کہیں کہیں نشیب میں پانی جمع ہو گیا تھا۔ جب فوکسی ویگن اس پانی میں سے گزرتی تو، توقیر صاحب کو یہی خوف رہتا کہ اب بند ہوئی، تب بند ہوئی۔

نجانے کتنا فاصلہ اُنہوں نے اسی طرح طے کیا۔ پانی اب بھی کافی زوردار برس رہا تھا اور شیشے کے سامنے دیکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ توقیر صاحب نے لائٹیں جلالیں۔ تاکہ کم از کم اندھے کی لالٹین بن جائے اور وہ کسی کو نہ دیکھ سکیں لیکن کم از کم دوسرے تو اُنہیں دیکھ کر کترا کر نکل جائیں۔

نجانے کتنا فاصلہ طے ہوا...... لیکن جب توقیر صاحب کی ہمت جواب دے گئی تو اُنہوں نے فوکسی ویگن ایک مناسب جگہ کھڑی کر لی۔ سڑک کے کنارے ایک بڑا سا گھنا درخت نظر آیا تھا اور درخت کے نیچے ذرا صاف ستھری جگہ تھی۔ اور توقیر صاحب فوکسی ویگن کو وہاں لے گئے اور ایک صرف ستھری جگہ پر اسے کھڑا کر کے انجن بند کر دیا۔

تمام بچے دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئے۔ بیگم صاحبہ نے خوش ہو کر کہا۔

"ارے تم یقین کرو، خود میرا دل بھی یہی چاہ رہا تھا کہ کہیں رُک کر بارش کا مزا لیا جائے۔ اے اللہ کیسی دُھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔"

توقیر صاحب نے خونخوار نگاہوں سے بیوی کو گھورا، لیکن کچھ بولے نہیں۔ سب لوگ نیچے اُتر آئے اور پانی میں بھیگنے لگے تو توقیر صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔

"اب تم میں سے اگر کسی کو نمونیہ ہو جائے تو خود ہی ہسپتال جا کر کسی بستر پر لیٹ جانا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تمہارے علاج بھی کراتا پھروں۔"

"نہیں ابو...... بھلا ہمیں نمونیہ کہاں ہوگا؟" چھوٹے بیٹے ناصر نے کہا۔

توقیر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمال، ثریا کے ساتھ درخت کے تنے کے دوسری جانب چلا گیا تھا۔ ہما بھی اُس کے ساتھ تھی۔ بھلا ہما کے بغیر صرف ثریا کو ساتھ لے کر وہ دوسرے لوگوں سے کیسے دُور جا سکتا تھا؟ دادی اماں بھی درخت کے نیچے جا بیٹھیں۔ لیکن جب سرد ہواؤں نے اُنہیں چھوا تو واپس فوکسی ویگن میں آگئیں۔ توقیر صاحب لطف لینے کے لئے نیچے نہیں اُترے تھے بلکہ بارش کی وجہ سے اُنہیں باہر کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ اس لئے رُک گئے تھے کہ بارش تھمے تو آگے کا سفر کریں۔

یہاں ان لوگوں کو لطف آرہا تھا۔ مزے ہو رہے تھے۔ پکنک منائی جارہی تھی۔ کپڑے زیادہ بھیگ گئے تو ایک ایک کر کے سب واپس فوکسی ویگن میں آ بیٹھے۔ لباس بدلنے کا موقع کہاں تھا؟ شام ہوتی جارہی تھی۔ ویسے تو گہرے سرمئی بادلوں کے نیچے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لیکن گھڑی کی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ شام تیزی سے جھک رہی ہے۔ توقیر صاحب خاموشی سے اسٹیئرنگ پر جا بیٹھے۔ پریشان تھے اور سوچ رہے تھے کہ اگر بارش زیادہ دیر جاری رہی تو پھر یہ سفر مصیبت بن جائے گا۔ سب سے زیادہ دادی اماں پر غصہ آرہا تھا جو دوپہر کے کھانے کے لئے رُک گئی تھیں۔ کیا موت آجاتی اگر کھانا وہاں نہ کھایا جاتا؟ دن

ہی دن میں سفر طے ہو جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔ اب یہ مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ اور سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ سب اس مصیبت سے خوش تھے۔ وہ واحد آدمی تھے جنہیں مستقبل کا خوف کھائے جا رہا تھا کہ یہ باقی سفر بڑی مشکل سے طے ہوگا۔

آدھ گھنٹہ، پون گھنٹہ اور پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ تب کہیں جا کر بارش کا زور ٹوٹا اور وہ سست ہونے لگی۔ توقیر صاحب نے دروازے بند کرائے اور دھڑکتے دل سے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ انجن اسٹارٹ ہو گیا تو اُنہوں نے گہری سانس لی۔ فوکسی ویگن واقعی اپنی کوالٹی کا ثبوت دے رہی تھی۔ وہ اسے سڑک پر لے آئے اور پھر قدرے سست رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ اگر اس طرح بھی سفر جاری رہے تو دو تین گھنٹے میں با آسانی شہر پہنچ جائیں گے۔ فوکسی ویگن چلتی رہی اور تقریباً چھ بجے تک اس نے بڑے صبر و سکون سے سفر کیا۔ لیکن چھ بج کر ایک منٹ پر شاید اُس کا ٹائم ختم ہو گیا...... پہلے ایکسیلیٹر سے رابطہ منقطع ہوا اور پھر انجن ہچکیاں لے کر بند ہو گیا...... توقیر صاحب کی رُوح فنا ہو گئی تھی۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ سب لوگ اُنہیں دیکھنے لگے۔ کمال کہنے لگا۔

''کیا ہوا ابو؟''

''جو ہونا چاہئے تھا۔'' توقیر نے پریشان لہجے میں کہا۔

''کوئی گڑبڑ ہو گئی؟''

''بالکل ہو گئی۔''

''تو ابو، انجن دیکھا جائے۔ ہو سکتا ہے ڈسٹری بیوٹر میں پانی آ گیا ہو۔''

توقیر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمال اپنی انجینئرنگ کا ثبوت دینے لگا۔ ڈسٹری بیوٹر کو صاف کیا گیا۔ لیکن انجن کو اسٹارٹ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ بڑی دیر تک مختلف پرزوں پر طبع آزمائی کی جاتی رہی۔ لیکن سمجھ میں نہ آسکا کہ کیا ہو گیا؟ ناصر نے پریشانی سے کہا۔

''اب کیا ہوگا ابو؟ ہم نے تو آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا۔''

''عیش کرو...... دوپہر کا کھانا کھا کر نکلو اور پکنکیں مناؤ۔ یہ تو تمہاری دلی خواہش پوری ہوئی ہے۔''

''اے میرے مولا، اس جنگل بیاباں میں...... ارے اب ہوگا کیا؟ یہاں تو کوئی مستری بھی نہیں ملے گا۔'' دادی اماں نے کہا۔

''کھانا تو مل جائے گا اماں جی۔ میں نے کہا تھا دن ہی دن میں نکل لو۔''

''ارے بھیا سب پیچھے پڑ گئے تھے۔ میں اکیلی نگوڑ ماری کیا کرتی؟ تم خود ہی منع کر دیتے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اس طرح بارش ہو جائے گی۔''

''ہونی ہو کر رہتی ہے اماں جی۔ اب آپ لوگ آرام کریں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کہ اب میں کیا کروں۔ گاڑی کے تمام کل پرزے دیکھ لئے، کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اب تو مستری ہی کو شہر جا کر لانا پڑے گا۔''

''ارے بھیا تو پھر شہر چلو۔ اس گاڑی کو وہاں سے سیدھے مستری کے پاس لے جانا۔''

''اماں جی، آپ آرام سے بیٹھیں۔ خوامخواہ میرا دماغ خراب نہ کریں۔ شہر کیسے لے چلوں اس گاڑی کو؟''

''اے ہاں، یہ تو ہے۔'' اماں جی نے ٹھوڑی پر اُنگلی رکھ کر کہا۔ اور اس کے بعد خاموش ہو گئیں۔ سب لوگ پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اچانک ناصر نے ایک طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا۔

''ابو، وہ اُس طرف دیکھئے...... شاید کوئی پرانی عمارت ہے۔ قدیم نوادرات کا شاہکار۔ یہ کون سی جگہ ہے ابو؟''

''جہنم......'' توقیر صاحب غرا کر بولے۔

''اوہو...... کمال ہے۔ بھائی دیکھئے، بڑے تذکرے سنا کرتے تھے اس کے۔ آج نگاہوں کے سامنے آگیا ہے۔ مگر یہاں روشنی وغیرہ تو نظر نہیں آ رہی۔'' ناصر نے سرگوشی کے انداز میں کمال سے کہا۔

''جوتے کھاؤ گے برادر...... ابو سخت غصے کے عالم میں ہیں۔ اور واقعی بات بھی صحیح ہے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے نکل لیتے تو بہتر تھا۔'' کمال نے ناصر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ توقیر صاحب پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ہما کہنے لگی۔

''ابو، اب کیا کریں گے؟''

''مستری لے کر آؤں گا شہر سے، تب گاڑی ٹھیک ہو گی۔ دیکھو کوشش کرتے ہیں کہ تم لوگوں کو شہر بھجوانے کا بندوبست کر دیا جائے۔ مگر اتنا لمبا سفر طے کیا ہے میں نے۔ کوئی بس وغیرہ بھی نہیں گزری۔ پرائیویٹ گاڑیوں والے بھلا اتنے لوگوں کو کہاں بٹھائیں گے؟''

''ابو، ان کی گاڑیاں کیسے چل رہی ہیں؟'' محمود نے پوچھا۔

''تم لوگ بکواس کئے جاؤ گے یا مجھے کچھ سوچنے کا موقع بھی دو گے؟'' توقیر صاحب بدستور جھلائے ہوئے انداز میں بولے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔ اب بہت منی منی سی بوندیں برس رہی تھیں۔ لیکن یہ ناخوشگوار نہیں تھیں۔ بسیں وغیرہ شاید بند ہو گئی تھیں۔ ویسے بھی یہاں ایک ہی بسیں چلا کرتی تھیں جو تین تین، چار چار گھنٹے کے وقفے سے آتی جاتی تھیں۔ توقیر صاحب کی پریشانی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں انجن میں کیا خرابی ہو گئی؟ کافی دیر تک وہ اسی انتظار میں کھڑے رہے کہ کوئی بس آئے تو ان لوگوں کو یہاں سے روانہ کر دیں۔ لیکن اِکا دُکا پرائیویٹ گاڑیوں کے علاوہ کوئی بس وغیرہ نہیں آئی۔ پرائیویٹ گاڑیوں والے بھی سفر کی جلدی میں تھے۔ چنانچہ کسی نے توقیر صاحب کے اشارہ کرنے پر گاڑی نہیں روکی اور آگے بڑھ گئے۔ توقیر صاحب نے واپس آ کر ایک بار پھر اگنیشن میں چابی گھما کر انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ فوکسی ویگن باقاعدہ ناراض ہو گئی تھی۔ بالآخر اُنہوں نے اعلان کیا۔

''اب شہر جائے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا لے۔ شہر جاؤں گا اور وہاں سے مکینک کو لے کر واپس آؤں گا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کتنا وقت لگ جائے گا۔''

''مگر ابو، یہاں ہم اکیلے رہیں گے؟'' ہما بولی۔

''تو میں کیا کروں...... تمہیں اپنے کاندھے پر بٹھا کر تو شہر لے جا نہیں سکتا۔ آرام سے گاڑی میں بیٹھے رہو۔''

''ابو، کیوں نہ ہم اس عمارت کی طرف چلے جائیں؟ سڑک سے زیادہ دُور بھی نہیں ہے۔ اور پھر وہ ایک اچھی پناہ گاہ بھی ہو سکتی ہے۔ گاڑی کو ہم دھکیلتے ہوئے وہیں لے جاتے ہیں۔ آپ مکینک کو لے کر اسی جگہ آجایئے۔''

''جیسے تمہارا دل چاہے کرو۔ لیکن سنبھال کر۔ کہیں گاڑی اُلٹ ہی مت دینا۔''

''نہیں ابو...... آپ اطمینان رکھیں۔''

''ارے بھیا، یہیں گاڑی میں بیٹھے رہو۔ عمارت ومارت میں جا کر کیا کرو گے؟ ویرانے میں ایسی عمارتیں اچھی نہیں ہوتیں۔'' دادی اماں نے کہا۔

''کمال ہے دادی اماں...... آپ کی باتوں نے تو واقعی دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ بھلا انسان کی بنائی ہوئی عمارتیں ایسی ویسی کیسے ہو سکتی ہیں؟ ابو، آپ کوشش کیجئے۔ اور اطمینان رکھئے، ہم دونوں یہاں موجود ہیں۔'' کمال اور ناصر نے کہا۔ توقیر صاحب برا سا منہ بنا کر پھر سڑک کے کنارے آ کھڑے ہوئے تھے۔ کمال وغیرہ گاڑی کو سنبھال کر دھکا دینے لگے۔ سڑک سے نیچے ایک چوڑی پگڈنڈی نظر آ رہی تھی جس پر گاڑی لے جانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اسٹیئرنگ ناصر نے سنبھالا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دھکا بھی لگاتا جا رہا تھا۔ تمام لوگ اُس کے پیچھے پیچھے عمارت کی جانب چل پڑے تھے۔ توقیر صاحب نے ایک نگاہ اُس عمارت کو دیکھا۔ اُن کے علم میں یہ نہیں تھا کہ یہ کون سی عمارت ہے؟ کس نے بنوائی تھی؟ ظاہر ہے وہ تاریخ دان نہیں تھے۔ لکھوری اینٹوں سے بنی ہوئی عظیم الشان عمارت کے صدر گیٹ پر چھوٹے چھوٹے چند خودرو درخت اُگے ہوئے تھے۔ دروازے کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا۔ دوسرا اپنی جگہ باقاعدگی سے بند تھا۔ اندر ویرانی نظر آ رہی تھی۔

اُن لوگوں نے فوکسی ویگن عمارت کے باہر کھڑی کر دی اور پھر کمال نے ناصر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یار ناصر، جگہ واقعی کچھ گڑبڑ نظر آ رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ناصر نے کمال کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''بڑی ویرانی ہے اندر۔''

''تو کیا آپ کے خیال میں یہاں باقاعدہ آبادی ہوگی؟ آیئے، اندر تشریف لایئے۔'' ناصر بولا۔ دادی اماں، امی وغیرہ کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ یہ صورتحال اب ذرا پریشان کن لگ رہی تھی۔ لیکن مجبوری تھی۔ کیا، کیا جا سکتا تھا؟ کمال اور ناصر آگے چل رہے تھے۔ باقی افراد اُن کے پیچھے تھے۔ ہما، ثریا سے بولی۔

''ثریا باجی...... کیا خیال ہے اس عمارت کے بارے میں؟''

''بڑی دلکش ہے۔ بالکل پُراسرار کہانیوں کی مانند۔''

''اور اگر یہاں بھوت وغیرہ ہوئے تو؟''

''بیکار باتیں مت کرو۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟ بھوتوں کی حیثیت صرف کہانیوں کی حد تک ہے۔ انسانی زندگی سے ان کا کیا تعلق؟ یہ ہمارے عقائد کے خلاف ہے۔''

''پتہ نہیں کیوں مجھے کچھ ہول سا چڑھ رہا ہے۔''

''لاحول پڑھو، ہول دُور ہو جائے گا۔'' ثریا نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ کمال نے مسکرا کر اپنی منگیتر کی ...ف دیکھا اور ثریا بھی مسکرا دی۔

سب لوگ عمارت میں داخل ہو گئے۔ اب اُن کی کیفیت تحقیقات کرنے والوں کی سی تھی۔ عمارت کا ...ایک گوشہ دیکھا جا رہا تھا۔ کمرے، دالان، صحن...... عمارت واقعی کافی وسیع تھی۔ لیکن اس ویرانے ...اس کا وجود کیا حیثیت رکھتا تھا؟

دادی اماں کہنے لگیں۔ ''ارے ہو سکتا ہے یہاں کبھی کوئی شہر آباد ہو۔ پھر زلزلے نے اس شہر کو تلپٹ کر دیا ...ر صرف ایک عمارت رہ گئی ہو۔''

''کیوں دادی اماں...... یہ ایک عمارت کیوں رہ گئی؟''

''اللہ جانے میاں...... رہ گئی۔ اب میں کیا کروں؟''

''ہاں مجبوری تھی۔'' کمال آہستہ سے بولا۔ اور سب لوگ ہنس پڑے۔

ایک جگہ آرام کے لئے منتخب کر لی گئی۔ توقیر صاحب کو پتہ ہی تھا کہ یہ لوگ کہاں مقیم ہیں۔ پھر ٹریڈ ...یعنی فوکسی ویگن یعنی جھگڑے کی جڑ عمارت کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر توقیر صاحب اندر آ ...تے۔ چنانچہ فکر نہیں تھی۔ جس جگہ کو انہوں نے قیام کے لئے منتخب کیا تھا وہ ایک مضبوط کمرہ تھا جو تین ...وں کے بعد تھا اور اندر سے بالکل صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ عمارت کا عقبی حصہ بھی تھا اور دائیں بائیں بہت کچھ بنا ہوا تھا اس میں۔ لیکن کسی انسان کا کوئی وجود نہیں تھا۔ جانور وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہے ...۔ عمارت کی ہولناک ویرانی شباب پر تھی اور سبھی کے دل اس سے متاثر تھے۔ لیکن سب اپنے آپ کو ...الے ہوئے تھے اور کوئی کسی پر اپنے خوف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ محمود نے سیما سے کہا۔

''آؤ سیما، باہر کھیلیں گے۔ یہاں تو چھوٹے چھوٹے درخت بھی ہیں جن کی شاخوں پر چڑھا جا سکتا ...''

''اے اے، بکواس مت کرو۔ یہ کھیلنے کی جگہ نہیں ہے۔ بوسیدہ عمارت ہے، کسی بھی جگہ کوئی دیوار گر ...ہے۔'' امی جان نے بچوں کو ڈانٹا۔

''تو امی جان، دوسرے کمرے ہی میں چلے جائیں۔ یہاں بیٹھ کر کیا کریں گے؟''

''جانے دیجئے امی جان...... اب تو یہ ہماری قیام گاہ ہے۔ بچوں کو گھوم لینے دیجئے، کیا فرق پڑتا ہے؟ ...و تیز بارش بھی نہیں ہو رہی۔'' ناصر بولا اور پھر خود ہی بچوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کمرے میں کمال، ...یا، اماں اور دادی اماں رہ گئے تھے۔ وہ لوگ خاموش بیٹھ گئے تھے۔ دادی اماں بھی بالکل خاموش تھیں۔ ...دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر بیگم توقیر نے کہا۔

''پتہ نہیں، اُنہیں شہر جانے کے لئے کوئی سواری ملی یا نہیں؟''

''ارے ہاں، ذرا دیکھ کر آئیں۔ آؤ ہما، چلیں۔ کیا خیال ہے؟ ثریا، تم بھی آ جاؤ۔''

''ارے نہیں، لڑکیاں کہاں جائیں گی؟ ویران جگہ ہے۔ پتہ نہیں آس پاس کوئی موجود ہو۔ بھیا، کان دبائے پڑے رہو اب۔ یہ بپتا پڑ گئی ہے تو اس سے نمٹنا ہی ہے۔''

''ہائے ہائے...... میرا بچہ اس بارش میں، اس خراب موسم میں شہر جائے گا، پھر واپس آئے گا۔ کیا حشر ہوگا اُس کا؟ اے کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم بارش شروع ہونے سے بہت پہلے دوپہر کا کھانا کھائے بغیر وہاں سے چل پڑتے۔ اب تو تک گھر پہنچ بھی گئے ہوتے۔ وہ تو رؤف کی اماں جان نے جان کھا لی اور کہنے لگیں کہ زندگی بھر کے لئے تعلقات ختم کر دیں گی اگر میں کھانا کھا کر نہ نکلی۔ تو بھیا، مجبور ہونا پڑا۔ اب کوئی ہماری پریشانی دیکھے۔''

''اب جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔ رونے پیٹنے سے کیا فائدہ؟ ذرا دیکھ کمال، جا کر۔ کیا صورتحال ہے؟''

کمال برا سا منہ بنا کر باہر نکل گیا تھا۔ لیکن باہر پہنچ کر وہ رُکا۔ اُسے کچھ اُمید تھی اور اُس کی یہ اُمید غلط ثابت نہ ہوئی۔ ثریا ٹہلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ کمال نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر اُسے اشارہ کیا۔ ثریا تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

''دوڑ چلو اُستاد...... عقب سے کوئی حملہ آور ہو گیا تو مشکل ہو جائے گی۔'' ثریا ہنستی ہوئی آگے بڑھ آئی تھی۔ ''منع کیا تھا دادی اماں نے۔ اگر اُنہیں پتہ چل گیا تو......؟''

''زیادہ سے زیادہ ڈانٹ لیں گی ثریا، کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ حسین موسم اور فوکسی ویگن کی خرابی تو یوں سمجھو کہ ہمارے لئے قدرت کا عطیہ ہیں۔ آہ، تم نہیں سمجھتیں ثریا، میں کتنا پریشان تھا۔''

''ارے تو مجنوں صاحب، آگے تو بڑھیں۔ آپ کی یہ آہ اور واہ کہیں دوسروں کو اس طرف متوجہ نہ کر دے۔ اور پھر کم از کم مجھے تو ضرور اندر لے جایا جائے گا۔ ویسے بھی بری بات ہے۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ میں کوئی تمہارے پاس آنے کے لئے تھوڑی باہر نکلی تھی؟''

''اور میں بے وقوف تھا کہ باہر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''تمہیں یقین تھا کہ میں آ جاؤں گی؟''

''مجھے؟ نہیں۔''

''پھر......؟''

''دل کو......'' کمال سینے پر انگوٹھا رکھ کر بولا اور ثریا اُسے غصیلی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''مجھ سے ان فضول چیزوں کے بارے میں مت کہا کرو۔ دل...... دل...... دل۔ آخر جذبات و احساسات کا تعلق دل ہی سے کیوں کر دیا گیا ہے؟ یہ تحقیق کہاں سے ہوئی مسٹر کمال کہ جذبات دل ہی میں ملتے ہیں۔ کیا دل کے کسی آپریشن میں جذبات کا کوئی خانہ بھی نظر آیا؟ دل تو خون کو پمپ کرنے کی مشین ہے۔ بھلا ہم اس مشین کے ذمے اتنی ساری ذمہ داریاں کیوں لگا دیں؟''

''ارے ارے...... تم تو منطقی ہو گئی ہو بھئی۔''

''منطقی ہونے کی کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ، انسان خواہ مخواہ ایک چیز کو اپنے طور پر منتخب کر لیتا ہے اور

ب اُس کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ دل کے کسی آپریشن میں جذبات و حساسات کا کوئی خانہ نظر آیا؟ یا اس خانے میں جذبات و احساسات کا ذخیرہ نظر آیا؟ جب نہیں تو پھر ہم یہ یوں کہتے ہیں کہ محبت دل ہی میں ہوتی ہے۔''

''چلو دل کا قصور معاف کر دو۔ جس میں بھی ہوتی ہو۔ ذرا تیز قدم اُٹھاؤ، کہیں پیچھے سے کوئی نہ آ ائے۔'' کمال نے کہا اور ثریا تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ وہ دونوں سڑک کے کنارے پہنچے اور پھر ور تک نگاہیں دوڑائیں۔ شام کے جھٹپٹے اب تاریکی میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ لیکن دُور دُور تک کوئی نظر ہیں آ رہا تھا۔ کمال بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمارے پیارے ابا جان کو کوئی ایسی گاڑی مل گئی جس میں بیٹھ کر وہ شہر روانہ ہو ئے۔''

''ہاں کمال، اگر یہاں بہت رات ہو گئی تو کیا ہوگا؟''

''لطف آ جائے گا...... سب لوگ سو جائیں گے اور ہم جاگیں گے۔ کیا سمجھیں؟''

''تم تو پاگل ہو۔''

''کیا کروں، خود تو پاگل نہیں ہوا تھا۔'' کمال نے کہا۔

''تو پھر کس نے کیا تھا؟''

''وہ، جو یہ سوال کر رہا ہے۔''

''میں نے کیا، کہا تھا؟''

''منگنی جو کر لی تھی؟''

''میں نے کی تھی؟''

''جس نے بھی کی تھی بہر طور میرے پاگل پن کا ذمہ دار وہی ہے۔'' کمال نے کہا اور ثریا ایک ٹھنڈی نس لے کر تیکھی سی نگاہوں سے اُسے گھورنے لگی۔ پھر بولی۔

''حضور واپس چلئے۔ میں اچانک غائب ہو گئی ہوں۔ تلاش میں کہیں ساری قوم ادھر نہ چل پڑے۔ ریف لائیے۔''

''ثریا، ایک بات سنو۔ رات کو کسی تنہا اور ویران گوشے میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ بار بار ایسے قع نہیں ملتے۔ یہ تو اُن لوگوں نے کمال فراخ دلی سے کام لیا تھا کہ تمہیں ہمارے ساتھ بھیج دیا۔ ورنہ یہ ھے لوگ جس حد تک دو محبت بھرے دلوں پر ستم ڈھا سکتے ہیں، ڈھا لیتے ہیں۔ آخر یہ کیا بیہودہ رسم ہے نگیتر کو منگیتر سے اتنی دُور رکھا جائے؟''

''واپس چلئے جنابِ عالی...... واپس چلئے۔ آپ واقعی جذباتی ہو رہے ہیں۔'' ثریا نے کہا اور واپسی لئے قدم بڑھا دیئے۔

ماحول کچھ اور تاریک ہو گیا تھا۔ بادل آسمان پر لدے کھڑے تھے اور اُنہوں نے جو تھوڑی بہت روشنی وہ بھی ہڑپ کر لی تھی۔ اندر داخل ہوئے تو ہما نظر آئی جو دونوں ہاتھ سینے پر باندھے نچلا ہونٹ بھینچے

اُنہیں دیکھ رہی تھی۔

"تشریف لے آئے آپ لوگ؟ میں نے تو سوچا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ہمارے چنگل سے نکل گئے ہیں۔ اور اب جب واپس آئیں گے تو شادی شدہ ہوں گے۔"

"کس چیز سے تیرا منہ میٹھا کروں ہما...... بہرطور تیرا اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ہمارے دل کو ٹھنڈک پہنچ گئی ہے۔"

"پھر دل کا نام لیا؟" ثریا نے کمال کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی، ہم پھیپھڑوں سے تم پر عاشق ہیں۔ چلو بس، اب تو سکون ہوا؟"

"جنابِ عاشق، اندر تشریف لے جایئے۔ ابھی تک تو میں حالات سنبھالے ہوئے ہوں۔ لیکن آگے نہیں کہہ سکتی۔ جایئے اور اپنی "ان" کو یہیں چھوڑ جایئے۔" ہما نے کہا اور کمال اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوا اندر پہنچ گیا۔ دادی اماں اور امی جان بیٹھی ایک دوسرے سے گزرے ہوئے لمحات کی باتیں کر رہی تھیں۔ کمال کو دیکھ کر اماں نے پوچھا۔

"کچھ پتہ چلا بیٹا؟"

"ہاں دادی اماں...... ابو جا چکے ہیں۔ کسی نیک بندے نے اُنہیں شہر پہنچنے کی پیشکش کر دی ہوگی۔"

"دیکھو کب واپس آتے ہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات اسی شہر میں گزارنی پڑ جائے۔"

"ہو سکتا ہے...... یہ ناصر وغیرہ کہاں ہیں؟"

"گھومتے پھر رہے ہیں۔ اس ویران گھر میں مجھے تو بھیا سچی بات ہے ہول چڑھ رہا ہے۔ ارے تم لوگ جو یہ دنیا کے باشندے ہو، تم نے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں دیکھی۔ ہمارے وقتوں کی بات کچھ اور ہے۔ ہم نے تو نجانے کیا کیا دیکھا اور سنا ہے۔" دادی اماں کہنے لگیں۔

"کیا دادی اماں...... ہمیں بھی کچھ سنایئے۔ کچھ ہمیں بھی دکھایئے۔" کمال بیٹھ گیا۔ اور پھر چونک کر بولا۔ "یہ ہما وغیرہ کہاں گئیں؟"

"باہر ہیں...... میں تو کہتی ہوں کہ اب ناصر اور بچوں کو بھی بلا لو بھیا، ایک جگہ سب لوگ جمع ہو کر بیٹھ جائیں تو زیادہ اچھا ہے۔ پتہ نہیں میرا بچہ کب واپس آئے گا؟"

"میں آواز دے لیتا ہوں۔" کمال نے کہا اور باہر نکل گیا۔ پھر اُس نے ہما کو دو تین آوازیں لگائیں اور ہما اور ثریا اندر آ گئیں۔ چند ہی لمحات کے بعد ناصر، محمود اور سیما وغیرہ بھی آ گئے۔ ناصر کہنے لگا۔

"عجیب و غریب عمارت ہے۔ ہم لوگ اس پر ریسرچ کر رہے تھے کہ آخر اس کی تخلیق کس طرح وجود میں آئی؟ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس ویرانے میں یہ عمارت تعمیر کی؟ آس پاس تو کوئی عمارت نہیں ہے جس سے یہ اندازہ ہو کہ یہاں کوئی باقاعدہ آبادی تھی۔ اچھی خاصی عمارت ہے۔ کیوں بھائی جان، سرپھرے لوگ نہیں تھے وہ جنہوں نے یہاں اس ویرانے میں یہ عمارت تعمیر کی؟"

"ہو سکتا ہے...... ہو سکتا ہے۔ لیکن میں آپ سے اس عمارت کے بارے میں کوئی بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"بے شمار کمرے ہیں۔ اوپر چھت پر بھی ایک بڑا سا کمرہ بنا ہوا ہے۔ ہر چیز کا معقول انتظام کیا گیا ہ۔ لیکن اب کچھ موجود نہیں ہے۔"

"دادی اماں، آپ کچھ سنا رہی تھیں، کچھ دکھا رہی تھیں۔"

"اللہ نہ دکھائے بیٹا۔ بیکار باتیں مت کرو۔ ایسی جگہوں پر بیٹھ کر ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔" دادی اں کہنے لگیں۔

"کمال ہے...... جس جگہ بیٹھ کر جو بات یاد آ جائے اس سے زیادہ موزوں اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟ یں دادی اماں، آپ ہمیں سنایئے وہ واقعات جو آپ کی زندگی میں پیش آئے۔"

"اے بیٹے، مت ڈراؤ ہمیں۔ کیسی بیکار باتیں کر رہے ہو؟"

"کمال ہے دادی اماں...... آپ اس عمر میں ڈرتی ہیں تو ہمارا کیا حال ہوگا؟"

"موضوع کیا تھا؟" ناصر نے کہا۔

"دادی اماں کہہ رہی تھیں کہ ایسی ویران، پراسرار اور سنسان عمارتوں میں نجانے کیا کیا کچھ ہوتا ہے۔ نے کچھ نہیں دیکھا، لیکن دادی اماں بہت کچھ دیکھ اور سن چکی ہیں۔"

"ہمیں بھی سنایئے دادی اماں...... ہمیں بھی سنایئے۔" بچے بھی ضد کرنے لگے۔

"کمال ہے بھئی۔ تم لوگ دراصل ناواقف ہو اس لئے کوئی بات خاطر میں نہیں لا رہے۔ اچھا یہ بتاؤ ہیں اس ویران عمارت میں ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

"ہمیں تو نہیں لگ رہا دادی اماں۔ آخر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت ۔ پہلے لوگ اس میں رہتے ہوں گے، اب نہیں رہتے۔ آخر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

دادی اماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ "ٹھیک ہے...... بہادری ہے۔ جیو بیٹا، مگر ویرانوں بھی آبادیاں ہوتی ہیں۔ ایسی جگہوں پر بھی کچھ ہستیاں رہتی ہیں۔ ان میں اچھی بھی ہوتی ہیں، بری بھی ہیں۔ روحوں سے تو تمہیں واقفیت ہوگی۔"

"آہ...... رُوح ایک لطیف حقیقت ہے اور محبتوں کے تمام رشتے اسی سے وابستہ ہیں۔" کمال نے یدہ نگاہوں سے ثریا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس رُوح کی بات نہیں کر رہی۔ میں خبیث ارواح کی بات کر رہی ہوں۔ وہ جو ویرانوں میں سکن بنا لیتی ہیں اور زندہ انسانوں کو پریشان کرتی ہیں۔"

"دادی اماں، کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ ڈرا رہی ہیں ہمیں۔" ہما خوفزدہ ہو کر تھوڑی سی امی کی ب کھسک گئی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہوں بیٹی۔ اب ان لوگوں نے مجبور کر دیا ہے تو کچھ قصے سنا دیتی ہوں۔ کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی۔"

"سنائیں سنائیں دادی اماں سنائیں...... آپ کو اللہ کا واسطہ......" کمال نے مسکراتے ہوئے کہا اور ثریا ا کو گھورنے لگی۔

''نہیں دادی اماں۔ کوئی خوفناک بات نہ بتائیں۔ مجھے تو ڈر لگے گا۔'' ثریا کہنے لگی۔

''اسی لئے تو منع کر رہی ہوں بیٹی۔ مگر یہ پیچھے ہی پڑے جا رہے ہیں۔''

''دادی اماں، آپ سنائیے۔ کیا فضول بات ہے ثریا، کچھ سننے دو۔''

''تاج محل کا نام سنا ہے بیٹا تم نے؟''

''ضرور سنا ہے۔ یہ تو محبت کی عظیم الشان یادگار ہے۔'' کمال بولا۔

''محبت کی اس عظیم الشان یادگار کے عقب میں ہمارے منجھلے چچا ایک دفعہ ایک عجیب وغریب حادثے کا شکار ہو گئے۔'' دادی اماں نے کہا۔

''کیسا حادثہ؟''

''رات کا وقت تھا۔ تاج محل سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک خوانچے والا کمبل اوڑھے بیٹھا ملا۔ کوئی چیز فروخت کر رہا تھا۔ ہمارے چچا نے خوانچے پر گلاب کی مہک میں بسی ہوئی ریوڑیاں دیکھیں اور سوچا کہ چلو ریوڑیاں خرید کر کھاتے ہوئے گھر جائیں گے۔ اُنہوں نے خوانچے والے کے پاس رُک کر کہا۔

''بھائی دو آنے کی ریوڑیاں دے دو۔'' لیکن خوانچے والا سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اُنہوں نے پھر اُس سے کہا کہ میاں سو رہے ہو؟ ریوڑیاں کیوں نہیں دیتے؟ تو خوانچے والے نے گردن اُٹھائی اور پھر دونوں ہاتھ سامنے کر کے منمناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میرے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں......''

منجھلے چچا نے اُس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو دو موٹی موٹی رسیاں جھول رہی تھیں۔ چہرے پر نگاہ اُٹھائی تو اُس کے نہ ہونٹ، نہ ناک، نہ آنکھیں۔ بس انڈے جیسا سپاٹ چہرہ تھا۔ اب جو منجھلے چچا کی چیخ نکلی تو آسمان کو چھو گئی۔ بری طرح دوڑے اور پیچھے مڑے بغیر بھاگتے رہے۔ راستے میں اُنہیں ایک پولیس کانسٹیبل ملا جو کانسٹیبل کی وردی پہنے ہوئے شاید گشت کر رہا تھا۔ منجھلے چچا اُسے دیکھ کر رُکے، اُنہوں نے سوچا کہ اسے صورتحال بتا دی جائے۔ بری طرح ہانپ رہے تھے بے چارے۔ پولیس والے کے قریب پہنچ کر اُسے جھنجھوڑا تو وہ اُن کی طرف مڑ گیا۔

''میں نے...... میں نے وہاں ایک خوانچے والے کو......'' منجھلے چچا نے ہانپ ہانپ کر کہنا شروع کیا اور کانسٹیبل خاموش کھڑا رہا۔ منجھلے چچا نے اُسے پوری کہانی سنائی اور پھر کانسٹیبل سے کہا۔

''چلو دیکھو، کون ہے وہ؟ کون ہو سکتا ہے؟''

لیکن جب کانسٹیبل کا چہرہ دیکھا تو ایک بار پھر اُن کے حلق سے دلخراش چیخ نکل گئی۔ یہ تو وہی تھا...... کانسٹیبل نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''میرے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں۔'' وہی منمناتی ہوئی آواز تھی۔ منجھلے چچا مضبوط اور بہادر آدمی تھے جو اس دوسرے وار کو بھی سہہ گئے۔ وہاں سے بھاگے تو اپنے گھر پہنچے۔ گلی میں باہر چارپائی پر دادا میاں سوتے تھے۔ اس وقت بھی وہ چادر اوڑھے چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ منجھلے چچا ہانپتے کانپتے اُن کے اوپر سے گزرے۔ اُن کی حالت بری طرح خراب تھی۔ دادا میاں نے چہرے سے چادر ہٹائی اور آہستہ سے بولے۔

''کیا کر رہے ہو؟ میرے ہاتھ نہیں ہیں۔''

یہ بھی وہی چہرہ تھا...... اور اس کے بعد بیچارے منجھلے چچا کو اکیس دن تک بخار چڑھا اور بائیسویں دن اللہ کو پیارے ہو گئے۔''

امی جان کی آنکھیں خوف سے سکڑ گئیں۔ ہما اور ثریا بھی دہشت زدہ ہو گئیں۔

''عجیب وغریب کہانی تھی۔'' ناصر نے کہا۔ ''اگر اُس کے ہاتھ نہیں تھے تو آپ کے منجھلے چچا کو کیا لیف تھی اُس سے؟''

''ارے بیٹا نہیں سمجھے۔ بری رُوح تھی وہ...... بری رُوح۔''

''بس دادی اماں، بس...... اب اپنے خوفناک قصے مت سنائیں۔'' ہما منمنا کر بولی۔

''کیوں...... کیا تمہارے بھی ہاتھ نہیں ہیں؟'' ناصر نے اُس کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''ناصر بھائی، خاموش ہو جاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''نہیں دادی اماں...... اور کوئی قصہ سنائیے...... اور کوئی قصہ سنائیے۔'' سیما ضد کرنے لگی۔

''بیٹی چلّہ کشی، جادو ٹونے ہمارے زمانے میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اب تو ان کی اہمیت کچھ ہو گئی ہے۔ لیکن طرح طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک قصہ میں تمہیں اور سناؤں۔ ایک ب جمنا کے کنارے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ چالیس دن کا وظیفہ تھا۔ وظیفہ بتانے والے نے یہ بھی بتا تھا کہ تم جن بری ارواح کو قابو میں کرنا چاہتے ہو وہ تمہیں خوفزدہ کریں گی۔ ان سے خوفزدہ نہ ہونا۔ ہ پڑھنے والے کے انتالیس دن آرام سے گزر گئے۔ لیکن چالیسواں دن جو اُن کی مراد پوری ہونے کا تھا، اُس دن وہ جمنا کے کنارے بیٹھے اپنا عمل دہرا رہے تھے کہ دفعتہً اُنہوں نے سامنے کی طرف ا، ایک دھوبی بھینس پر کپڑوں کا گٹھر لادے آ رہا تھا۔ گٹھر پر تین بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ میں بیوی اور دھوبی خود تھا۔ جمنا کنارے کپڑوں کا گٹھر اُتارنے کے بعد دھوبی نے بیوی سے کہا کہ مجھے بھوک رہی ہے۔ بیوی نے بہت ساری روٹیاں اور دوسری چیزیں نکال کر دھوبی کے سامنے رکھ دیں جنہیں وہ کی آن میں چٹ کر گیا۔ پھر کہنا لگا، مجھے اب بھی بھوک لگ رہی ہے۔ تو دھوبن غرا کر بولی۔

''اب کیا دُوں تمہیں؟ یہ بھینس کھا لو۔''

دھوبی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بھینس کے سینگ پکڑ کر اُسے نیچے گرایا اور چمٹ گیا اُس کی گردن سے۔ ذرا ر میں وہ اُس کا خون پی گیا۔ چاروں پائے چٹ کر گیا۔ گوشت کھا گیا۔ منوں گوشت پیٹ میں نے کے بعد اُس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''مجھے تو اب بھی بھوک لگ رہی ہے۔''

جواب میں دھوبن نے تینوں بچے اُس کے سامنے کر دیئے اور کہا کہ وہ انہیں کھا لے۔ دھوبی نے کو مروڑ کر بھنبھوڑ دیا۔ اور پھر دھوبن سے بولا کہ مجھے اب بھی بھوک لگ رہی ہے۔ تو دھوبن نے وظیفہ نے والے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اور اب کیا دُوں تجھے؟ اُسے کھا لے۔''

دھوبی وظیفہ کرنے والے کی طرف بڑھا۔ اب بھلا وظیفہ کرنے والے میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ دھوبی کا سامنا کر سکے؟ ایسا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا کہ بری طرح ایک سڑک پر گرا اور وہیں جاں بحق ہو گیا۔

''یہ کیا بات ہوئی دادی اماں...... وہ تو وظیفہ کر رہا تھا اُن لوگوں کو قبضے میں کرنے کے لئے۔'' کمال نے کہا۔

''بیٹا، یہی عملیات کے گر ہیں۔ اگر وہ ہمت کر جاتا تو دھوبی اُس کے پاس پہنچ کر کہتا، کیا حکم ہے میرے آقا؟ اب تو وہ قابو میں آ ہی گیا تھا۔ صرف ڈرا رہا تھا اُسے۔''

''دادی اماں خاموش ہو جایئے...... خدا کے لئے خاموش ہو جایئے۔'' ہما نے پریشان لہجے میں کہا۔

''ہاں دادی اماں...... یہاں بیٹھ کر ایسی باتیں نہ کریں۔ واقعی ڈر لگ رہا ہے۔'' ثریا بولی اور دادی اماں گہری سانس لے کر خاموش ہو گئیں۔ بچے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے تھے۔ غالباً اسی موضوع پر بات کر رہے تھے کہ اگر کسی کے ہاتھ نہ ہوں تو اُسے دیکھ کر ڈر کیوں لگتا ہے؟

وقت گزرتا گیا۔ سب کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ سبھی کو تو قیر صاحب کی واپسی کا انتظار تھا۔ دادی اماں نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

''کمال میاں، اگر توقیر میاں شہر پہنچ کر واپس آئیں تو کتنی دیر لگ سکتی ہے اُنہیں؟''

''میں نہیں کہہ سکتا دادی اماں۔ ہم لوگ اس وقت یوں سمجھ لیجئے کہ دونوں شہروں کے بیچوں بیچ ہیں۔ اگر تیز رفتار گاڑی رُکے بغیر ان کے درمیان سفر کرے تو کم از کم تین گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ گویا پونے دو گھنٹے آدھا راستہ طے کرنے کے اور پھر مکینک کی تلاش اور اس کے بعد وہاں سے روانگی۔ کم از کم پانچ چھ گھنٹے تو رکھ ہی لیجئے۔''

''ہائے میرے مولا۔ اس کا مطلب ہے پوری رات ہی یہاں گزر جائے گی۔''

''اسی کے امکانات ہیں۔'' کمال نے سنجیدگی سے کہا اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

دفعتہً ہی کوئی آہٹ سنائی دی...... اور اس کے بعد ہلکی ہلکی سرگوشیاں۔ سب چونک کر سنبھل گئے تھے۔

''یہ آہٹ باہر سے آئی ہے کیا؟'' کمال نے ناصر کو اشارہ کیا اور دونوں اُٹھ کر دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا تو دُور دُور تک ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ کہیں کوئی سایہ تک متحرک نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن سرگوشیاں اور ہلکی ہلکی آہٹیں اب بھی گونج رہی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اب دونوں ہی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ دادی اماں، امی جان، ہما اور ثریا ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔ دونوں بچے اونگھنے لگے تھے۔ دادی اماں نے آہستہ سے کہا۔

''کیسی آوازیں ہیں یہ؟''

''پتہ ہی نہیں چل رہا دادی اماں...... باہر تو کوئی نہیں۔'' کمال کسی قدر متاثر لہجے میں بولا اور دادی اماں کا رنگ فق ہو گیا۔ امی جان کے چہرے پر بھی دہشت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ ہما اور ثریا ایک دوسرے سے چمٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔ اچانک ہی کہیں دُور کوئی چیز گرنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر دیر تک یہ آواز کھنکتی رہی۔ غالباً پیتل کا کوئی برتن تھا جو نیچے گرا تھا۔ اور اس کے بعد دائرے میں گھوم رہا تھا۔

ادی اماں نے بمشکل تمام اپنی چیخ روکی تھی۔ امی جان، دادی جان سے چمٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''یہ...... یہ...... یہ سب کیا ہے؟ کچھ ہے ضرور...... میں دعوے سے کہتی ہوں کہ کچھ ہے ضرور۔ سب ہاں موجود ہیں۔ پھر یہ آہٹیں؟'' دادی اماں کی آواز لرز رہی تھی۔

''خدا کے واسطے دادی اماں...... کیوں ہمیں خوفزدہ کر رہی ہیں؟ خدا کے واسطے خاموش ہو جایئے۔'' ہما ی بھنچی بھنچی آواز اُبھری۔ آہٹیں اب بھی آ رہی تھیں۔ اور پھر اُن کا مرکز بھی معلوم ہو گیا۔ یہ آہٹیں اور رگوشیاں چھت پر کی جا رہی تھیں۔ بعض عجیب عجیب سی آوازیں تھیں۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ لن یوں لگتا تھا جیسے بہت سے لوگ ہوں اور آپس میں کچھ گفتگو کر رہے ہوں۔ ناصر ان سب لوگوں میں ب سے زیادہ بہادر تھا۔ اُس نے چند لمحات خاموشی سے یہ آوازیں سنیں اور پھر کمال سے بولا۔

''کمال بھیا، کیا خیال ہے؟ معلوم کریں کچھ؟''

''کیا فضول باتیں کر رہے ہو ناصر...... چپکے بیٹھے رہو۔ خواہ مخواہ بہادری دکھانے کی کوشش مت کرو۔'' ں نے ناصر کو ڈانٹ دیا۔

''نہیں امی...... ایک جگہ بیٹھ کر خواہ مخواہ کسی مصیبت......'' ابھی ناصر کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ فضا ں ایک ہلکی سی آواز اُبھری۔ سیٹی کی سی آواز...... جیسے کوئی کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔ یہ آواز تیز ہوئی اور پھر م ہو گئی۔ دوسری بار پھر وہی آواز سنائی دی۔ پھر تیسری اور چوتھی بار...... دفعتہً ہی یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نا رو رہا ہو۔ دادی اماں کا بدن اب تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ وہی ان واقعات سے سب سے زیادہ متاثر تھیں۔ ہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو.... کیا کریں؟ اے اللہ، کیا کریں؟ پھنس گئے.... پھنس گئے یہاں۔''

امی کہنے لگیں۔ ''اماں، کک...... کیا خیال ہے؟''

''بیٹی، اب بھی خیال پوچھ رہی ہو؟ آسیب زدہ ہے یہ عمارت...... سو فیصد آسیب زدہ ہے۔''

''نن...... نن...... نکلیں...... نکلیں یہاں سے؟''

''باہر قدم بھی مت رکھنا۔ اب ان کا وقت شروع ہو گیا ہے۔ تمہیں پتہ ہے ایسی بری رُوحیں رات کی ریکیوں میں باہر نکلتی ہیں۔''

ہما نے چیخ کر بری طرح ثریا کو بھینچ لیا۔ ثریا بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ناصر کھڑا ہو گیا۔

''میں ان آوازوں کا راز معلوم کروں گا.... میں دیکھوں گا کہ بری ارواح اور بھوت کیسے ہوتے ہیں۔''

''ناصر، تمہارا دماغ خراب ہوا ہے کیا؟'' امی جان نے کہا۔

''امی جان، کمرے میں قید رہنا بھی تو مناسب نہیں ہے۔ اگر کوئی آفت ہم پر ٹوٹ پڑی......'' ناصر خاموش ہو گیا۔ کتے کے رونے کی آواز پوری قوت سے فضا میں اُبھری تھی۔ باہر تیز ہوائیں چلنے لگی ں۔ کمال بھی بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ثریا کے لئے جو جذبات تھے اب وہ م پڑ گئے تھے اور محبت بھری نگاہیں، خوف بھری نگاہوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ ایک بار پھر ناصر اپنی جگہ ، اُٹھ کھڑا ہوا۔

''آیئے بھائی جان...... آیئے، ذرا دیکھیں آخر کون ہے؟''

امی اور دادی اماں منع کرتی رہ گئیں لیکن ناصر نہ مانا۔ اُس نے کمال کو ساتھ لیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ امی جان بھنچی بھنچی آواز میں چیخیں۔

''ہمیں یہاں اکیلا چھوڑے جا رہے ہو...... ہم پر یہاں اگر...... اگر'' ناصر نے کمال کو اشارہ کیا اور کمال بھی آگے بڑھ گیا۔

''کمال بھائی، اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اوپر ایک کمرہ موجود ہے۔ میرا خیال ہے یہ آوازیں اسی کمرے سے آرہی ہیں۔''

''لیکن ناصر، ہم...... ہم کسی کا کچھ بگاڑ بھی تو نہیں سکتے۔ ہمارے ہاتھ تک خالی ہیں۔''

''دیکھتے ہیں بھائی جان آخر چکر کیا ہے؟'' ناصر نے کہا اور کمال کو ساتھ لئے ہوئے کافی دُور نکل آیا۔ ایک ٹوٹا سا زینہ بل کھاتا ہوا اُوپر جا رہا تھا۔ سیڑھیاں جگہ جگہ سے اُجڑی ہوئی تھیں۔ بہرحال اوپر پہنچنے کے لئے رابطہ کا کام دے سکتی تھیں ورنہ ان کی پائیداری پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ناصر ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتا اوپر کی منزل تک پہنچ گیا۔ اور جب وہ چھت پر پہنچے تو ایک بار پھر اُن کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں...... بادل چھٹ چکے تھے۔ آسمان پر چاند نمودار ہو گیا تھا اور اُس کی انتہائی پراسرار روشنی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اس روشنی کے علاوہ بھی ایک روشنی تھی جو چھت پر بنے ہوئے کمرے کے ٹوٹے دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ خاصی تیز روشنی تھی۔ کمرے میں کوئی تھا۔ یقیناً کوئی کمرے میں موجود تھا...... لیکن کون؟

سرگوشیوں کی آوازیں اندر ہی سے آ رہی تھیں۔ عجیب سی کھڑکھڑاہٹ ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ لوگ مصروفِ عمل ہوں...... ناصر نے آہستہ سے کہا۔

''بھائی جان...... ڈاکوؤں کے چھپنے کے لئے بھی یہ عمارت بہترین ہے۔''

''اگر ایسا ہوا تو کیا وہ لوگ ہم سے بے خبر ہوں گے؟''

''خدا جانے۔''

''اگر کچھ لوگ ہم پر ٹوٹ پڑے ناصر، تو کیا کریں گے پھر ہم لوگ؟''

''صبر کریں گے بھائی جان۔ اور کیا کر سکتے ہیں؟ اب جو مصیبت پڑ گئی ہے اسے تو......'' ناصر اتنا ہی بولا تھا کہ دفعتہً نیچے سے ایک بھیانک چیخ سنائی دی اور یہ بھیانک چیخ یقیناً انہی کے ساتھیوں میں سے کسی کی تھی۔ دونوں پاگلوں کی طرح نیچے کی جانب دوڑے اور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے صحن میں آ گئے۔ صحن کے اُس کمرے میں جہاں دادی اماں، اماں اور ہما اور دوسرے لوگ موجود تھے سب چیخ رہے تھے۔ اور اب چیخوں کی آوازیں باقاعدہ سنائی دے رہی تھیں۔ دونوں ہی دوڑتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور دہشت زدہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگے۔

دادی اماں، امی کے اوپر ڈھیر تھیں۔ ہما، ثریا کی گود میں گھسی ہوئی تھی اور ثریا نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ لئے تھے۔ بچے البتہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ غالباً صورتحال کو سمجھ نہیں

ئے تھے۔ ناصر اور کمال آہستہ آہستہ اُن کے پاس پہنچ گئے۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا......؟'' ناصر نے کسی قدر متاثر لہجے میں پوچھا۔

''وہ..وہ...وہ......'' دادی اماں نے اُنگلی سے دروازے کی جانب اشارہ کیا لیکن آنکھیں نہ کھولیں۔

''ارے یہ تو ہم ہیں...... آپ لوگ کیوں چیخے تھے؟ کیا ہو گیا آپ لوگوں کو؟''

''چلا گیا...... وہ چلا گیا......؟'' دادی اماں نے بمشکل چہرہ اُٹھا کر پوچھا۔

''کون دادی اماں...... کون؟''

''چائے مانگ رہا تھا۔ منمناتی آواز میں پوچھ رہا تھا چائے ہے ہمارے پاس؟''

''کون تھا......؟'' ناصر چونک پڑا۔

''اے اللہ، کیا بتاؤں...... پھٹے کپڑے، بھیانک چہرے، ہاتھ بھر لمبی داڑھی، بکھرے ہوئے بال۔ شیطان تھا پورا شیطان...... میں کہتی ہوں نکل چلو یہاں سے۔ آسیب زدہ ہے یہ عمارت۔ یہاں بری رواح رہتی ہیں۔ نکل چلو بھیا، باہر کھلی جگہ پڑے رہیں گے۔ مگر...... مگر......''

''دادی اماں...... کون تھا؟ آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟''

''دلہن تم بتاؤ، مجھے غلط فہمی ہوئی ہے؟'' دادی اماں نے امی جان سے کہا۔

''نہیں نہیں......'' امی جان بولیں۔ ''وہ چائے مانگ رہا تھا۔ بڑی بھیانک صورت تھی اُس کی۔ بدن پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ ہم چیخے چلائے تو غائب ہو گیا۔'' ناصر اور کمال کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔ اوپر جو کچھ دیکھا تھا اس نے اُن کے بھی حوصلے پست کر دیئے تھے۔

پھر دفعتہً وہی سیٹی دوبارہ سنائی دی اور پھر کتے کے رونے کی آواز اُبھری۔ جب کہ دُور دُور تک کوئی کتا نظر نہیں آیا تھا۔ کتا اتنی بھیانک آواز میں رو رہا تھا کہ رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔

''آؤ باہر چلیں...... سب لوگ اُٹھ جاؤ'' کمال نے کہا۔ اور ہما نے دادی اماں کو سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔ اب سب پر دہشت طاری تھی۔ اُنہوں نے کمرے کے دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ چھت پر دوڑتے قدموں کی آوازیں اُبھریں اور اُن کے بدن ٹھنڈے ہو گئے۔ پھر کسی کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اور پھر کوئی خوخو کر کے اُنہیں ڈرانے لگا...... انداز ایسا ہی تھا جیسے ان کے اس طرح ڈر کر بھاگنے کا مذاق اُڑایا جا رہا ہو۔

''نکلو...... خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو'' ہما رُندھی آواز میں بولی۔

امی جان زور زور سے درود پڑھ رہی تھیں۔ وہ کمرے سے باہر آ گئے۔ ہوا تیز ہو گئی تھی اور صحن میں پتے اُڑتے پھر رہے تھے۔ ابھی وہ صحن کے دالان تک بھی نہ پہنچے تھے کہ ثریا دہشت بھری چیخ مار کر امی جان پر الٹ پڑی۔ اُس کی بتیسی بھنچ گئی تھی۔ آنکھیں چڑھ گئی تھیں اور اُنگلی اشارے کے انداز میں ایک طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ جس طرف وہ اشارہ کر رہی تھی وہ عمارت کا ایک بغلی حصہ تھا اور جس شے کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا وہ ایک انسانی وجود تھا...... سفید لباس میں ملبوس، سر سے پاؤں تک کفن جیسا لباس۔ دونوں ہاتھ فضا میں پھیلے ہوئے...... وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ انداز سے عورت ہی معلوم ہوتی تھی......!

بادلوں کے ایک ٹکڑے نے چاند کو آغوش میں لے لیا اور وہ اچانک نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔ ہوائیں ایک دم تیز ہو گئیں اور کتا زور زور سے رونے لگا...... چھت پر قیامت آ گئی تھی جیسے بھوتوں میں جنگ شروع ہو گئی ہو......

''باہر...... کسی طرح باہر نکلو......'' کمال کی گھٹی گھٹی آواز اُبھری اور ہما اور ثریا، دادی اماں کو باہر گھسیٹنے لگیں۔ چھت سے قہقہے اُمنڈ رہے تھے۔

وہ سب گرتے پڑتے باہر آ گئے۔ گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ لیکن...... دفعتہً کمال نے گردن جھٹکی اور پریشان لہجے میں بولا۔

''چابی...... چابی کہاں ہے گاڑی کی؟''

''وہ تو ابو کے پاس ہے۔'' ناصر بولا۔

''اب کیا کریں گے......؟''

''کھلے آسمان کے نیچے رہنا پڑے گا۔''

''آہ...... کیا مصیبت ہے۔ ابو ابھی تک نہیں آئے۔''

''الٰہی، میرے بچے کی خیر...... کون سی بری گھڑی تھی وہ؟'' دادی اماں نے روتے ہوئے کہا۔

''اماں، حوصلہ رکھیں۔ آپ ہی حوصلہ چھوڑ دیں گی تو کیا ہو گا؟'' امی نے خود بھی روتے ہوئے کہا۔

جھاڑ جھنکاڑ اُڑنے لگی تھی۔ ہوائیں خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھیں۔ دادی اماں بولیں۔

''دُلہن، یہ ہوائیں تو میری ہڈیوں میں گھسی جا رہی ہیں۔ میں مر جاؤں گی...... آہ میں مر جاؤں گی۔''

''گاڑی کی چابی ہمارے پاس ہوتی تو شاید اتنی مشکل نہ ہوتی۔ باہر رُکنا بے کار ہے۔ کوئی حادثہ ہو جائے گا۔'' ناصر نے کہا۔

''مگر اندر بھی نہیں رہا جا سکتا۔'' کمال نے کہا۔

''مجبوری ہے...... آؤ کمال بھائی، اندر ہی چلیں۔''

''میں نہیں جاؤں گی...... میں نہیں جاؤں گی۔ خدا کے لئے مجھے یہیں چھوڑ دو...... میں نہیں جاؤں گی۔'' ثریا نے زور سے ہما کو بھینچ لیا۔

''ثریا، حوصلہ رکھو۔ ہم سب ساتھ ہیں۔ کچھ ہو گا تو سب کو ہو گا۔ تم خود کو ہم سے الگ کیوں سمجھ رہی ہو؟'' کمال نے کہا۔ آندھی اب اور شدید ہو گئی تھی۔ عمارت میں چیخنے چلانے کی آوازیں بڑھ گئی تھیں۔ وہ صحن میں واپس آ گئے۔

''میرا خیال ہے کوئی دوسرا کمرہ تلاش کر لیں۔ اب اس کمرے میں نہیں جاتے۔'' کمال بولا۔

اس بار وہ ایک اور کمرے میں آ گئے تھے۔ یہ کمرہ پہلے کمرے کی نسبت چھوٹا تھا۔ لیکن دروازہ اس میں بھی نہیں تھا۔ ناصر نے ان لوگوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آپ سب آرام سے بیٹھیں۔ میں اور کمال بھائی دروازے پر موجود رہیں گے۔''

''نہیں...... زیادہ بہادر بننے کی کوشش مت کرو۔ آؤ، اندر آ جاؤ۔'' امی نے کہا۔ اور پھر اُن کی آواز حلق

گھٹ گئی......

کسی عورت کے چیخنے کی آواز سب نے سنی تھی۔ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ تیز ہواؤں کے شور میں ں کے الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ سب ساکت ہو گئے۔ سب کے چہرے دہشت سے سفید پڑ گئے ۔ تھوڑی دیر کے بعد آواز بند ہو گئی۔

''جن بھوتوں کے غول میں سفر کرتے ہیں تو تیز آندھیاں چلتی ہیں۔ ضرور ان کا کوئی قافلہ آس پاس ۔'' دادی اماں پُراسرار لہجے میں بولیں۔ ''خدا خیر کرے...... یہ قافلہ خیریت سے گزر جائے۔''

''مجھے تو یہ رات زندگی کی آخری رات معلوم ہوتی ہے۔ صبح کو جب ابو آئیں گے تو انہیں ہم سب کی مسخ ں ملیں گی۔ اور پھر پرسوں کے اخبارات میں ہماری تصویریں چھپی ہوں گی۔'' کمال بولا۔

''میری تصویر بھی اخبار میں آئے گی بھائی جان؟'' محمود نے پُرمسرت آواز میں پوچھا۔

''میری تصویر تمہارے اوپر ہو گی۔'' سیما بولی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تم سے بڑا ہوں۔'' محمود نے کہا۔

''تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ چھوٹوں کی تصویر ہمیشہ اوپر ہی ہوتی ہے۔''

''میری اوپر ہو گی......''

''نہیں میری اوپر ہو گی۔''

''ارے کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے...... کیا فضول بات پر لڑ رہے ہو؟''

''لڑنے دیں امی...... اس وقت یہ دونوں ہمیں ایک سبق دے رہے ہیں۔ یہ ہم سب سے زیادہ با لہ ہیں۔ ہمیں بھی ان کی طرح ہمت سے کام لینا چاہئے۔'' کمال بولا۔

''بات واقعی درست ہے۔ یہ ناواقفیت بھی کیا عظیم چیز ہوتی ہے۔ کاش انسان بچپن سے بڑھاپے تک ی معصوم ہوتا۔'' ناصر بولا۔

''زیادہ باتیں مت کرو۔ وہ ہماری آوازیں سن کر اس طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔'' دادی اماں بولیں۔ اور اموشی چھا گئی۔

ناصر کسی سوچ میں گم تھا۔ اُس کا ذہن لاتعداد اُلجھنوں میں اُلجھ گیا تھا۔ چھت پر اب خاموشی طاری ۔ دادی اماں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھیں۔ ناصر نے محمود اور ہما سے کہا۔

''تم لوگ بھوتوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''بھوت...... بس وہ بھوت ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ نہیں ہوتے اور وہ بھینس کھا جاتے ہیں۔''

''اگر وہ تمہارے سامنے آ جائیں تو تم اُن سے ڈرو گے؟''

''پتہ نہیں......'' محمود نے جواب دیا۔

''تب آؤ، بھوت تلاش کریں۔'' ناصر بولا اور سب چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔ ''چل رہے ہو میرے ؟'' ناصر نے کہا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟ فضول بکواس کر رہے ہو؟'' کمال نے کہا۔

"بس ابھی واپس آتے ہیں کمال بھائی۔ آپ ان لوگوں کی نگرانی کریں۔ خاص طور سے ثریا باجی کی۔" ناصر نے کہا اور محمود اور سیما کو اشارہ کر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

"اب تک تو خیریت تھی۔ اب کچھ ضرور ہو جائے گا۔ اسے روکئے امی، یہ بالکل پاگل ہے۔" کمال بولا۔ لیکن ناصر دروازے سے دُور نکل گیا تھا۔ اُس نے محمود سے کہا۔

"پہلے ہمیں کوئی ہتھیار تلاش کرنا چاہئے محمود، تاکہ اگر ہمارا بھوتوں سے مقابلہ ہو جائے تو ہم خالی ہاتھ نہ ہوں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہتھیار؟"

"صحن میں، میں نے بہت سی لکڑیاں پڑی دیکھی ہیں۔ آؤ۔"

ناصر بچوں کے ساتھ صحن میں نکل آیا۔ خشک ٹہنیوں کے انبار تھے۔ ان میں سے تین مضبوط لکڑیاں اُٹھا لی گئیں اور پھر وہ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ سیٹیاں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ ناصر ایک جگہ رُک کر ان سیٹیوں کی سمت کا اندازہ لگانے لگا اور پھر وہ محمود کو سیما کو اشارہ کر کے چل پڑا۔ سیٹیوں کی آوازیں اسی سمت سے آ رہی تھیں۔ اینٹوں کے ایک ڈھیر پر چڑھ کر وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں گری ہوئی چھت کی کڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ناصر غور سے ان کا جائزہ لینے لگا۔ ٹوٹی ہوئی لکڑیوں کی کڑیوں میں سوراخ بنے ہوئے تھے۔ لکڑی کی یہ کڑیاں بارش کے پانی سے بھیگ گئی تھیں اور تیز ہوائیں ان سوراخوں سے اندر داخل ہوتیں تو سیٹیوں کی سی آوازیں اُبھرتیں۔ اور جب ہوا کا کوئی زبردست جھونکا ایک بڑے سوراخ سے گزرتا تو لگتا جیسے کوئی کتا رو رہا ہے۔ ناصر اچھی طرح ان سوراخوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ہوا اب بہت آہستہ ہو گئی تھی۔ اُس نے گردن ہلائی اور پھر جیب سے رومال نکال کر اس کے کئی ٹکڑے کر لیے۔ یہ ٹکڑے اُس نے چھوٹے سوراخوں میں ٹھونس دیئے۔ بڑے سوراخ میں اُس نے ایک اینٹ پھنسا دی تھی۔

"آؤ دوستو، اب چھت کے بھوتوں سے نمٹ لیں۔" ناصر بولا اور بچے اُس کے ساتھ چل پڑے۔ ناصر آگے تھا۔ وہ زینے طے کر کے اوپر آ گئے۔ کمرے میں اب روشنی نہیں تھی۔ ناصر چند لمحات سوچتا رہا، پھر وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ دروازے کے سامنے پہنچا تو اندر ہلچل مچ گئی۔ محمود اور سیما حلق سے ہا ہا کی آوازیں نکال کر زمین پر لکڑیاں مارنے لگے۔ بہت سے بندر کمرے کے روشندان سے نکل بھاگے تھے...... وہ خوخیا رہے تھے، طرح طرح کی آوازیں نکال رہے تھے۔ اور پھر کمرہ ان سے خالی ہو گیا۔ ناصر کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ اُس نے محمود اور سیما کو اشارہ کیا اور تینوں اندر داخل ہو گئے۔ فرش پر بہت سی چیزیں پڑی ہوئی تھیں، سڑے ہوئے پھل، تربوز کے چھلکے، پھٹے ہوئے کپڑے، ٹن کے ڈبے۔ انہیں چیزوں میں ایک ٹوٹا ہوا آئینہ بھی پڑا تھا۔ ناصر اُچھل پڑا۔ یہی مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ گڈ...... ویری گڈ...... اُس وقت جب ہم اوپر آئے تھے، چاند نکل آیا تھا اور اس روشندان سے چاندنی اس شیشے پر پڑ رہی تھی۔ کیا سمجھے بھوت شکنو؟

"اب ہماری تصویریں اخبار میں چھپیں گی نا؟"

"ضرور چھپیں گی۔ مگر ابھی آخری مرحلہ باقی ہے دوستو...... اور یہ ذرا مشکل مرحلہ ہے۔"

ناصر نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا......!

"ابھی تک واپس نہیں آیا...... بچوں کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔ یہ لڑکا بالکل ہی سنکی ہے۔ اب کیا روں، اُسے دیکھنے جاؤں؟" کمال پریشانی سے بولا۔

"پاگل ہے بالکل۔ بہادری کا بے تکا مظاہرہ۔ دیکھو بھیا، بچوں کو کچھ ہو نہ جائے۔" دادی اماں بولیں۔

"ثریا، تم ذرا میرے ساتھ آ جاؤ۔"

"میں......؟" ثریا دھک سے رہ گئی۔

"زندگی بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کئے ہیں اور ذرا سی دُور تک چلنے سے ہچکچا رہی ہو؟" کمال نے گوشی کے انداز میں کہا۔ اسی وقت دروازے پر ایک پھٹی پھٹی آواز اُبھری۔

"اب تو چائے ضرور بنا لی ہو گی۔" کمال اُچھل کر ثریا سے ٹکرایا۔ ثریا توازن نہ سنبھال پائی اور امی ن پر گر پڑی۔ دادی اماں دہشت سے چیخنے لگیں اور پھر سب حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگے۔ لیکن ناصر کا ہہ اُن کی چیخوں پر بھاری تھا۔ محمود اور سیما بھی ہنس رہے تھے۔

"تم...... یہ بکواس تم کر رہے تھے؟"

"عزت سے جناب...... عزت، احترام سے گفتگو کریں۔ ہم وقت کے کولمبس ہیں۔ آپ حضرات تین یسے لوگوں کے سامنے ہیں جنہوں نے انتہائی خطرناک بھوتوں سے ایک پُر وقار معاہدہ کیا ہے۔ آرام سے ھ جائیں۔ اب اس کھنڈر کے تمام بھوت ہمارے دوست ہیں۔ کیوں دوست محمود؟"

"جی سرکار......" باہر سے آواز آئی اور کوئی سامنے آ گیا۔ دادی اماں ایک بار پھر دہشت سے چیخ پڑی یں۔

"اُوں ہوں دادی اماں...... اس کے دونوں ہاتھ موجود ہیں۔ اور یہ بھینس اور بچے کھانے والا دھوبی ں ہے۔ اس کا نام دوست محمد ہے اور یہ اپنی بیوی کے ساتھ ہماری طرح یہاں ٹھہرا ہے۔ یہ دونوں بھیک نگتے ہیں۔ پیدل ہی شہر جا رہے تھے، بارش کی وجہ سے یہاں رُک گئے۔ بے چارہ اس لئے آپ کے ں آیا تھا کہ شاید ایک پیالی مل جائے۔ آپ کے چیخنے چلانے سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا۔ اس کی بیوی ھی ہے۔"

دادی اماں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگیں۔

"تم پیدل شہر جا رہے تھے......؟"

"ہاں بی بی جی...... اللہ عزت دے، زندگی بنائے رکھے جی، ہم ایسے ہی سفر کرتے ہیں۔ غریب لوگ ں جی۔ کچھ مل جائے اللہ کے نام پر۔" دوست محمد نے کاروبار شروع کر دیا۔

"کتنے دن میں شہر پہنچ جاؤ گے؟" امی جان نے پوچھا۔

"جتنے دن بھی لگ جائیں۔ دے دیں کچھ اللہ کے نام پر۔"

"آپ فکر نہ کریں دادی جان۔ یہ عادتاً بول رہا ہے۔ ورنہ اسے اس وقت کچھ نہیں چاہئے اللہ کے نام پر۔ اس کی گدڑی میں سب کچھ موجود ہے۔ پھل، فروش، ڈبل روٹیاں اور نہ جانے کیا کیا الا بلا۔ اگر آپ کو کچھ چاہئے تو میں لے آؤں؟" ناصر نے کہا اور دوست محمد گھبرا کر باہر نکل بھاگا۔ کمال بے اختیار ہنس پڑا۔
"یار، اب تو تمہیں ڈانٹتے ہوئے بھی شرمندگی ہوگی۔ مگر وہ دوسری آوازیں، چھت پر گڑ بڑ، کمرے میں روشنی؟" کمال نے کہا اور ناصر تمام صورتحال بتانے لگا۔ پھر بولا۔
"قصور ہمارا نہیں تھا، بزرگوں کا ہے جنہوں نے تاج محل کے بغیر ہاتھوں والے خوانچے فروش اور بھینس کھا جانے والے دھوبی کی کہانیاں گھڑ رکھی ہیں۔ ورنہ اس دور میں انسان سے بڑا بھوت اور کون ہو سکتا ہے؟"
صبح کی روشنی کے ساتھ ہی باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی تھی۔ یقیناً توقیر صاحب مستری کو لے کر آ گئے تھے۔ سارا کھیل ہی ختم ہو گیا۔ سب نے لاحول پڑھی اور شیطان کا پورا منصوبہ فیل ہو گیا......!

۞

شیطان کے برے دن تھے۔ ہر طرف سے مایوسی ہو رہی تھی۔ انا زبیدہ نے پانسہ ہی پلٹ دیا تھا۔ رجنی کو اُس کا محبوب مل گیا تھا اور انا زبیدہ نے اُسے ستارہ بنا کر روشن کر دیا تھا۔ ساحل اُس کا محبوب اُس کا مجازی خدا بن گیا تھا۔ ایمان علی نے اُنہیں اپنے ایمان کی روشنی دی تھی۔
ادھر راگنی بھی ایمان کی روشنی سے منور ہو گئی تھی۔ گلزیب کے عشق نے اُسے بھی مسلمان کر دیا تھا۔ راگنی نے اُنہیں اپنی بہنوں کے بارے میں بتایا تو حکیم ارشاد علی نے کہا۔
"میں ایک جگہ چلّہ کروں گا اور وہ شیطان کے سحر سے آزاد ہو جائیں گی۔"
اور اللہ کے کلام کے کرشموں کے سامنے شیطان لعین کی کیا مجال؟ جوں جوں حکیم ارشاد کا چلّہ پورا ہوتا جا رہا تھا روپا، رما، رادھا کی کیفیت بدلتی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن تینوں نے طے کیا کہ یہ شیطانی عمارت چھوڑ دی جائے اور شیطان کے اس مندر کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ تینوں کدالیں لے کر چل پڑیں۔ اور جب وہ مندر پہنچیں تو راگنی اور رجنی کو بھی وہیں پایا۔
تمام بہنیں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ ایمان علی، انا زبیدہ، ساحل اور گلزیب کے علاوہ حکیم ارشاد علی بھی وہاں موجود تھے۔ اتنے اللہ والوں کے سامنے شیطان کی بھلا کیا چلتی؟ سب نے اُس کا مندر مسمار کر دیا اور خیر و شر کے اس مرحلے میں شیطان کو بدترین شکست ہوئی۔ تینوں لڑکیوں نے بھی ایمان قبول کر لیا۔ اور شیطان وہاں سے بھاگ کر نئی شکار گاہوں کی تلاش میں چل پڑا......!

(ختم شد)